نقوش

سال نامہ سنہ ۱۹۵۰ء

آٹھ آنے



کے تھال اور پلاؤ کا سامان خرید کر گھر پہنچا۔ اور تین پتیلے بھر کر آگ پر رکھ دیئے۔ اتنے میں تمام لڑکے اکٹھے ہو گئے۔ سب نے مل کر مٹھائی کھائی۔ آج لڑکے بڑے خوش تھے۔ گاتے بجاتے اور ہنستے کھیلتے رہے اور بھگو چمار بانسری بجاتا رہا۔

بادشاہ سادھو کا بھیس بدلے آیا۔ بھگو چمار نے آؤ بھگت کی۔ بادشاہ نے پوچھا کہ آج تم بہت خوش نظر آتے ہو۔ اور پھر تین پتیلے پلاؤ کے پکائے جا رہے ہیں۔ کیا وجہ ہے؟ کیا کوئی خزانہ ہاتھ لگا ہے؟



بھگو چمار نے کہا۔ سادھو جی! بات دراصل یہ ہے کہ آج بادشاہ کے ہاں نوکری کی ہے اور اُنھوں نے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ میں نے اُن کی دی ہوئی چاندی کی تلوار بیچ کر ایک ٹین کی تلوار خرید کر اُسے نیام میں رکھ لیا ہے۔ اور باقی پیسوں سے کھانے پینے کا سامان خرید لایا ہوں۔ اللہ کی قدرت بے نیاز ہے۔

بادشاہ یہ سب کچھ سُن کر گھر کو روانہ ہوا اور بھگو چمار کی دل ہی دل میں تعریف کرتا رہا۔

صبح ہوئی۔ بھگو چمار اپنی ڈیوٹی پر تھا اور بادشاہ سلامت دربار میں۔ بادشاہ نے سوچا۔ آج بھگو چمار کی تلوار دیکھی جائے اُنھوں نے بھگو چمار کو بلایا۔ اور دو ایسے قیدی جنھیں قتل کے مقدمہ میں گردن سے اُڑا دینے کی سزا ملی تھی۔ دربار میں لائے گئے۔ بادشاہ نے بھگو چمار سے کہا۔ کہ ان دو قاتلوں کی گردنیں اپنی تلوار سے اُڑا دو۔ بھگو یہ حکم سُن کر بہت ڈرا کہ اب کیا کیا جائے۔ چاندی کی تلوار تو بازار میں بیچ آیا ہوں اور ٹین کی تلوار سے گردن تو کیا اُڑائی جا سکتی ہے گھاس بھی نہیں کاٹی جا سکتی اور اگر بادشاہ سلامت کو یہ علم ہو جائے کہ میرے پاس چاندی کی تلوار کے بجائے ٹین کی تلوار ہے تو مجھے ہی گردن زدنی کی سزا دے دیں۔

کچھ دیر کے بعد اُس نے جان کی امان پاتے ہوئے بادشاہ سے گذارش کی کہ بندہ پرور! میرے ہاتھوں کسی کی گردن نہ اڑائی جا سکیگی کسی کی گردن کاٹنا ایک طرف مجھے ایسے واقعات دیکھ کر ہی ڈر لگتا ہے جب بادشاہ نے سخت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ بھگو چمار نے اِدھر تلوار کو میان سے نکالا اُدھر بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں آیا تو بادشاہ سلامت نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ڈرو مت اس وقت تو تمہارا امتحان لیا جا رہا تھا۔ میں تمہارے سارے حالات جانتا ہوں اور تمہارے کام سے خوش ہوں۔ اب تمہیں کوئی نہیں ستائے گا۔ ہمارے خزانے سے روزانہ پانچ روپے تمہیں ملا کریں گے۔ اور تم مزے سے اپنا جشن مناتے رہو۔

بھگو چمار روزانہ پانچ روپے بادشاہ کے خزانے سے لاتے اور شہر کے تمام لڑکوں کو اکٹھا کرتے۔ مزے سے کھاتے پیتے۔ اور ایک ساتھ بانسری بجاتے ہوئے بادشاہ کی درازیٔ عمر کی دعا کرتے۔

Date 17.11.76

جگت سنگھ

حرارت اور اُس کے ماخذ

۔ مادے کی تینوں حالتیں صرف حرارت کی کمی بیشی قبول کرنے
۔ باعث ہیں۔ برف کی مثال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حرارت
ے سبب سے عملِ تبخیر ہو کر آبی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ سورج
ِ حرارت کے طفیل ہر پودا کاربانک ایسڈ گیس کو جذب کرتا اور
س سے اپنے ریشوں کی طیاری کا کام لیتا ہے۔ اگر آگ دریافت
ہوتی تو دنیا کی سطح کا بہت سا حصہ انسانی بود و باش کے بالکل
قابل ہوتا۔ بہت سی اشیاء جن کو اچھے کھانے اور لذیذ غذا
سے نامزد کیا جاتا ہے نکمی اور بے کار ثابت ہوتیں۔ ہم اپنے
روگرد، قرب و جوار میں جس قدر کاروبار، حرکت اور طاقت کا
ہورہ دیکھتے ہیں وہ سارے کا سارا حرارت کے اثر سے یا اُس
ِ متعلقہ دیگر منعکس ہونے والی طاقتوں کے وسیلے سے ہے۔
رارت مادی شے نہیں ہے بلکہ حرارت یا گرمی کسی چیز کے اجزاء
لی اس طرح کی حرکت کا نتیجہ ہے جس کا اثر صرف چھونے کی طاقت ہی
سوس کرتی ہے اور جس کے زیر اثر مادے کی حالت تبدیل ہو
تی ہے۔ اس عمل کے نہایت تیزی اور پھرتی کے ساتھ ہونے
سے حرارت روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

۲۔ اس کے قدرتی ماخذ سورج، زمین اور آگ ہیں۔ ان
۔ سوا رگڑ، ٹکر، دباؤ، عمل کیمیائی اور قوت برقی کے ذریعے
۔ بھی حرارت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ قدرتی ماخذ کو چھوڑ کر سب سے زیادہ دلچسپ طریق
ٹکا ہے۔ رگڑ یا کھردرے پن کی رکاوٹ سے وہ مزاحمت مراد
لی جاتی ہے جس کی وجہ سے ایک چیز کا دوسری چیز پر گھسیٹنا
مشکل ہوتا ہے۔

رگڑ سے پیدا ہونے کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سردیوں میں ہاتھوں کو رگڑنا، تختے پر بٹن کو رگڑنا، پیسے
کو صاف کھڑے ہوئے تختے پر رگڑ رگڑ کر ذرا دبائیں تو وہ نیچے
نہیں گرتا۔ کیونکہ رگڑنے سے وہ گرم ہو جاتا ہے اور اُس کے
نیچے کی ہوا گرم ہو کر نکل جاتی ہے اور باہر کی ہوا اس پر دباؤ
ڈالتی ہے۔ گاڑیوں کے پہیے زمین سے رگڑ کھا کھا کر گرمیوں
میں اُتر جاتے ہیں۔ سر پر زور سے تیل کی مالش کی جائے تو
ہتھیلی اور سر گرم ہو جاتے ہیں۔ ایک رسّے پر سے نیچے اُتریں
یا کلہاڑے، کسی اور پھاوڑے سے کام کریں تو ہاتھوں میں چھالے
پڑ جاتے ہیں کیونکہ رگڑ سے گرمی پیدا ہو کر ہتھیلی کا چمڑا اُچھل جاتا
اور آبلہ پڑ جاتا ہے۔ نئی جوتی پہن کر سفر کرنے سے پاؤں میں چھالے
پڑ جاتے ہیں۔ برمے (ورمے) سے کسی لکڑی میں سوراخ ڈالتے
وقت برما سخت گرم ہو جاتا ہے۔ یہ آگ پیدا کرنے کا پرانا طریق
ہے۔ ٹوٹنے والے ستاروں کا جل اُٹھنا اور روشن ہونا رگڑ کے
باعث ہے۔ بندوق کی گولی جس قدر تیزی سے پھینکی جائے اُسی
قدر زیادہ گرم ہوتی ہے۔ چلتی مشینوں کے پرزوں کا گرم ہونا
اور جل اُٹھنا اکثر رگڑ کی وجہ سے ہی ہوا کرتا ہے۔ آتش باز
جب بارود بناتے ہیں تو بے احتیاطی سے رگڑ کھا کر سارا
سامان جل اُٹھتا ہے۔

۴۔ ٹکر سے حرارت کا پیدا ہونا۔ ہتھوڑے کا آہرن پر مارنے سے گرم ہو جانا، گھوڑے کے سموں سے چنگاریاں نکلنا ہڈیوں کی فاسفورس کا ہوا سے ٹکرا کر آگ لگنا۔ تیز آندھی کے وقت درختوں کی خشک شاخوں کے ٹکرانے سے آگ کا پیدا ہونا خاص کر چنار سے آگ کا پھونک مار کر یا پنکھے سے ہلا کر جلانا (آکسیجن گیس کے ذرات لکڑی کی کاربن سے متواتر ٹکرا کر حرارت پیدا کرتے اور آگ پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں) رئی سے دہی کا بلوتا اور مکھن نکالنا۔ دہی بلونے سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور وہی گرم ہو کر مکھن نکلتا ہے۔ جو سرد پانی ڈالنے سے منجمد ہو جاتا ہے۔ مائعات کو ایک برتن سے دوسرے میں بار بار الٹائیں تو گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی شے کو پانی میں حل کرنے کیلئے ہلاتے ہیں آبشاروں میں اوپر سے پانی گر کر صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ رات کے وقت مصری کی ڈلی توڑنے سے چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ طوفان کے وقت سمندر کا پانی ٹکرا ٹکرا کر گرم ہو جاتا ہے وغیرہ۔

۵۔ دباؤ کے ذریعے سے حرارت کا پیدا ہونا۔

کولہو کے مشاہدے سے یہ امر ثابت ہے۔ تل یا سرسوں پیلتے وقت لاٹھ کے دباؤ سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ تیل اور کھلی دونوں گرم ہو جاتے ہیں۔ آدمیوں کے بہت نزدیک نزدیک کھڑے ہونے یا سر پر بوجھ اٹھا کر چلنے سے عام حالات کی نسبت زیادہ گرمی محسوس ہوتی ہے۔

۶۔ عمل کیمیائی کے ذریعے سے حرارت کا پیدا ہونا۔

اگر سرد پانی میں گندھک کا تیزاب ڈالیں تو پانی گرم ہو جاتا ہے۔ تمام اشیاء جو کہ کیمیائی طور پر بنتی ہیں۔ ان کے بننے سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔

۷۔ قوت برقی سے بھی حرارت پیدا ہوتی ہے۔

اگر کسی برقی مورچے کے دونوں تاروں کو آپس میں ملا دیا جائے تو گرمی محسوس ہوتی ہے۔ یا اُن تاروں کے درمیان پلاٹینم کا تار رکھا جائے تو وہ روشن ہو جاتا ہے۔ یا بارود پر دونوں تار ملا کر رکھ دئے جائیں تو وہ بھڑک اُٹھتا ہے۔ غرضکہ مہذب دُنیا میں آج کل بہت سے کام بجلی کی حرارت کے ذریعے سے ہی انجام دئے جاتے ہیں۔

کیا آپ کو معلوم ہے

(۱) ہندوستان میں ۱۴۷ زبانیں بولی جاتی ہیں۔

(۲) گرین لینڈ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ نیز اس جزیرے کے میں دُنیا میں سب سے زیادہ مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔

(۳) ہندوستان میں سونے کی سب سے بڑی کان ریاست میسور میں ہے جس کا نام "کولر" ہے۔

(۴) میکسیکو میں سب سے زیادہ چاندی پائی جاتی ہے۔

(۵) ہندوستان کی ہاکی کی ٹیم دنیا کی بہترین ٹیم ہے۔

(۶) دنیا کا سب سے بڑا صحرا شمالی افریقہ کا صحرا ہے جس کا رقبہ اندازاً تیس لاکھ مربع میل ہے۔

(۷) دنیا میں لندن کے بعد ہمبرگ (جرمنی) سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔

(۸) ریڈیم کو سب سے پہلے میڈم کیوری نے معلوم کیا تھا۔

(۹) وینس (جو اٹلی میں واقع ہے) ایک سو بیس جزائر کا مجموعہ ہے۔

(۱۰) دنیا کا سب سے بڑا سمندر بحر الکاہل ہے۔ اس کا رقبہ چھ کروڑ چالیس لاکھ مربع میل ہے۔

(دیا پرکاش گوئل)

صنعت
کی امداد میں



صنعت کی ترقی کا راز صنعت کی پیداوار کے جدید طریقے اختیار کرنا ہے۔ اور انکے لئے مختلف قسم کی دستکاریوں، کے تجربہ کار کاریگروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایمپلائمنٹ ایکسچینج نہ صرف صحیح آدمیوں کو صحیح نوکری ہی نہیں دلاتے بلکہ انکے ٹریننگ سنٹرز (جو کہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا خاص جزو ہیں) سیکھے ہوئے کاریگروں کو جو کہ صنعت کا سرمایہ ہیں، مسلسل طور پر مہیا کرتے ہیں۔

ایمپلائمنٹ دفتر بغیر کسی معاوضہ کے نوکری تلاش کرنے والوں اور نوکر رکھنے والوں کی بے لاگ خدمت کرتے ہیں۔ اور قوم کی ترقی کے لئے قوم کی خدمت کرتے ہیں۔

ہند سرکار کی منسٹری آف لیبر کے ڈائریکٹر جنرل ریسٹلمنٹ اینڈ ایمپلائمنٹ نے شائع کیا۔

AC 127

سالنامہ ۱۹۵۵ء

آج کل

دہلی

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

ایڈیٹر:— جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹرز:— عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۹ —— نمبر ۱
سالانہ چندہ —— چھ روپے
فی پرچہ —— آٹھ آنے

اگست ۱۹۵۵ء

ترتیب

بچّوں کا آج کل

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

جوش ملیح آبادی

پند نامہ

(برائے اصلاحِ میاں مجاز و دیگر جوانانِ بے پروا)

اے مجاز اے ترادِ بار مجاز — زندہ پیغمبرِ بہار مجاز
اے بہ روئے سمن شمائل گل پوش — اے بہ کوئے مغاں تمام خروش
اے پرستارِ مہ رخانِ جہاں — اے کماں دارِ شاعرانِ جواں
تجھ سے تاباں جبینِ مستقبل — اے مرے سینۂ امید کے دل
اے مجاز اے مبصرِ خد و خال — اے شعورِ جمال و شمعِ خیال
اے ثریا فریب و زہرہ نواز — شاعرِ مست و رندِ شاہد باز
ناقدِ عشوہ و شباب ہے تو — صبحِ فردا کا آفتاب ہے تو
تجھ کو آیا ہوں آج سمجھانے — حیف ہے تو اگر برا مانے
خود کو غرقِ شرابِ ناب نہ کر — دیکھ اپنے کو یوں خراب نہ کر
شاعری کو تری ضرورت ہے — روحِ فردا کی تو امانت ہے
صرف تیری بھلائی کو اے جان — ہو کے آیا ہوں "ناصحِ نادان"
ایک ٹھیرا ہوا کمان ہے تو — دیکھ کس درجہ دھان پان ہے تو
ننگ ہے محض استخواں ہونا — سخت اہانت ہے ناتواں ہونا
استخوانی بدن دخانی پوست — ایک سنگین جرم ہے اے دوست
شرم کی بات ہے وجودِ سقیم — ناتوانی ہے اک گناہِ عظیم
جسم اور علم طرفہ طاقت ہے — یہی انسان کی ثبوت[1] ہے
جو ضعیف و علیل ہوتا ہے — عشق میں بھی ذلیل ہوتا ہے
ہر ہنر کو جو ایک دولت ہے — علم اور جسم کی ضرورت ہے
کثرتِ بادہ رنگ لاتی ہے — علم اور جسم کو گھٹاتی ہے
خوش دلوں کو رلا کے ہنستی ہے — شمعِ اختر[2] بجھا کے ہنستی ہے
اور جب آفتِ جگر[1] پہ لاتی ہے — رند کو مولوی بناتی ہے
مے سے ہوتا ہے مقصدِ دل فوت — مے ہے بنیادِ مولویت و موت
کان میں سن یہ بات ہے نشتر — مولویت ہے موت سے بدتر
اس سے ہوتا ہے کارِ عمر تمام — اس سے ہوتا ہے عقل کو سرسام
اس میں انساں کی جان جاتی ہے — اس میں شاعر کی آن جاتی ہے
یہ زمین آسمان کیا شے ہے — آن جائے تو جان کیا شے ہے
گوہرِ شاہوار چن پیارے — مجھ سے اک گُر کی بات سن پیارے
غم تو بنتا ہے چارِ دن میں نشاط — شادمانی سے رہ بہت محتاط
غم کے مارے تو جی رہے ہیں ہزار — نہیں بچتے ہیں عیش کے بیمار
آن میں دل کے پار ہوتی ہے — پنکھڑی میں وہ دھار ہوتی ہے
جوئے عشرت میں غم کے دھارے ہیں — یخ و شبنم میں بھی شرارے ہیں
ہاں سنبھل کر لطافتوں کو برت — ٹوٹ جائے کہیں نہ کوئی پرت
دیکھ کر شیشۂ نشاط اٹھا — یہ ورق ہے دمق ہے سونے کا
کاغذِ بادیہ نگینہ ہے — بلکہ اے دوست آبگینہ ہے
ساغرِ شبنم خوش آب ہے یہ — آبگینہ نہیں حباب ہے یہ
روک لے سانس جو قریب آئے — ٹھیس اس کو کہیں نہ لگ جائے
تیغِ مستی کو احتیاط سے چھو — ورنہ ٹپکے گا انگلیوں سے لہو
مستیوں میں ہے تابِ جلوۂ ماہ — اور سیہ مستیاں خدا کی پناہ
خوب ہے ایک حد پہ قائم نشہ — ہلکا پھلکا شبک ملائم نشہ
ہاں ادب سے اٹھا ادب سے جام — تا کہ آبِ حلال ہو نہ حرام
جام پر جام جو چڑھاتے ہیں — اونٹ کی طرح بل بلاتے ہیں
زندگی کی ہوس میں مرتے ہیں — مے کو رسوائے دہر کرتے ہیں

---

[1] طاقت کی ثبوت علم و جسم پر قائم ہوتی ہے۔
[2] اختر شیرانی مرحوم کہ بادہ خواری کی کثرت اُن کی موت کا باعث ہوئی۔

---

[1] حضرت جگر مرادآبادی کہ بادہ خواری کی کثرت اُن کی موت کا باعث ہو چکی۔

یاد ہے جب جگر چڑھ جاتے تھے
کیا اُف ہو کے ہم ہنہناتے تھے

میری گردن میں بھر کے چند آہیں
پاؤں سے ڈالتے تھے وہ باہیں

عقل کی موت، علم کی پستی
الاماں لعنتِ سیہ مستی

اُف گھٹا ٹوپ نشّے کا طوفان
بھوت، عفریت، دیو، جن، شیطان

لات گھونسا، چھڑی، چھری، چاکو
لب لباہٹ، لعاب، کف، بدبو

لڑکھڑاہٹ، بلوتے، بڑ، ہذیاں
بےکلی، نیند، بےخودی، نسیاں

طنز، آوازہ، برہمی، افساد
طعن، تشنیع، مضحکہ، ایراد

شور، ہُو حق، ابے تبے، ہے ہے
سنسنی، کپکپی، دھماکے، قے

مَس مَساہٹ، غشی، تپش، چکر
سوز، سیلاب، سنسنی، صرصر

استحالہ، اہانت، استحقار
احتراق، احتباس، اشکبار

چل چخے، پخ، چناں چنیں، چنگھاڑ
چخ چخ، چھنے، چاؤں چاؤں، چیل چلپاڑ

معرکہ، مفسدہ، محاذ، مصاف
گونج، گالم گلوچ، گڑ گڑ، گزاف

دُر، دبک، دو دو، دھر پخ، دوڑ دل
غل، غپاڑا، غنن غنن، غوں غوں

لیا ڈُگی، لتاڑ، لام، لڑائی
ہَول، ہیجان، ہانک، ہاتاپائی

اودھم، اندوہ، آگ، اُف، آزار
اونگھ، آشفتگی، عرق، ادبار

کھل بلی، کاؤں کاؤں، کھٹ منڈل
ہونک، ہنگامہ، ہمہمہ، ہلچل

پینترے، پیچ، پشتکیں، پھنکار
ڈگ ڈگے، دھائیں دھائیں، ڈینگ، ڈکار

اُلجھن، آوارگی، اُدھم، اینٹھن
بھونک، بھوں بھوں، بھنن بھنن، بھن بھن

دھول دھپّا، دھکڑ پکڑ، دھتکار
تہلکہ، تو تڑاق، تُف، تکرار

بُو، بھبک، بھٹے، بکس، برر، بھونچال
دبدبہ، دَن، دناہٹیں، دھمال

بل بلاہٹ، بخار، بھنّاٹا
غلغلہ، غل، غریو، غناٹا

تشنگی و تکان و تندی و تاب
گردش و گرد و گرمی و گرداب

غم کے سیلاب، غیظ کے دھارے
آبلے، آگ، آنچ، انگارے

گاہ خوں خواری و جفا کوشی
گاہ پابوسی و ہم آغوشی

گاہ نرمی و لطف و مہر و سلام
گاہ تلخی و ترشی و دشنام

گاہ وجہِ فساد و باعثِ ضیق
گاہ اشکِ غلیظ و حرفِ رقیق

گاہ یہ پیچ تان کر مجھا لا
"اُف یہ کس نے مجھے کہا سالا"

عقل کی موت، علم کی پستی
الاماں لعنتِ سیہ مستی

صرف نشّے کی بھینٹ دے مسّیں
اُن کو بخشے نہ دے کبھی ہو نہیں

الاماں خوفناک کالا نشّہ
اوہ ریش و بروت والا نشّہ

اژدرِ مرگ و دیوِ خوں خواری
الاماں نشّہ جٹا دھاری[لہ]

نشّے کا جھٹپٹا ہے نورِ حیات
جھٹ پٹے کو بنا نہ کالی رات

نشّے کی تیز روشنی بھی غلط
چودھویں کی سی چاندنی بھی غلط

ذہنِ انساں کو بخشتا ہے جمال
نشّہ ہو جب بہ قدرِ نورِ ہلال

غرفۂ عقل بھیڑ تو اکثر
پر اسے پرکھ، کچا کے بند نہ کر

رات کو لطفِ جام ہے پیارے
دن کا پینا حرام ہے پیارے

دن ہے عفریتِ آز کی جھنکار
رات، پازیبِ ناز کی جھنکار

دن خم و پیچ جادۂ تدبیر
رات، زلفِ دراز و یارِ صغیر

دن ہے خاشاک، خاک، دھول، دھواں
رات، آئینہ، انجمن افشاں

دن ہے دریائے اکتساب کی لہر
رات، چنگ و رباب و کشتی و نہر

دن، سپہرِ سحاب، دودِ بخار
رات، شہرِ ثوابت و سیار

دن مسلح، دواں، کمر بستہ
رات، طاق و رواق و گلدستہ

دن ہے کف، سنگلاخ، پتھر، سِل
رات، بلور و آبگینہ و دل

دن ہے دُمچی، لگام، زین، رکاب
رات، شمع و شراب و شعر و شباب

دن ہے فولاد، سنگ، تیغ، علم
رات، کمخواب، پنکھڑی، شبنم

دن ہے شیون، دہائیاں، دکھڑے
رات، مست انکھڑیاں، جواں مکھڑے

دن ہے فریاد، آہ، شورش، غل
رات، زانوئے ناز و تختۂ گل

دن ہے طغیانِ جہد و سیلِ شعور
رات، انگور و طور و حور و قصور

دن ہتھوڑا، کدال، چھینی، جال
رات، عود و اگر، عبیر و گلال

دن کڑی دھوپ کی بد آہنگی
رات، پچھلے پہر کی سارنگی

دن بہادر کا بان، بیر کی رتھ
رات، چمپا کلی، انگوٹھی، نتھ

دن ہے اک کوہِ گرم و گردِ ہوس
رات، تتلی کا رنگ، پھول کی اوس

دن ہے دوکان، دمدمہ، دلدل
رات، محراب و مستی و مشعل

دن ہے تحقیق، جستجو، ایجاد
رات، بربط، بنفشہ، بادِ مراد

دن ہے تسخیرِ بزمِ آب و گِل
رات، تصویرِ لیلیٰ و محمل

لہ اگر کوئی صوتی اکراہ پیدا نہ ہو تو ہندی الفاظ کے ساتھ عطف و اضافت کو مَیں روا سمجھتا ہوں

دن ہے تلخی پردوش و ترش اوقات　　رات، شہد و شکر، شمیم و نبات
دن ہے شہرِ علوم و بابِ کتاب　　رات، بوئے حبیب، رنگِ شراب
دن ہے تنقید و فکر و درس و نظر　　رات، سوسن، گلاب، نیلوفر
دن ہے طوفانِ جنبش و رفتار　　رات، میزانِ کاکل و رخسار
دن ہے نبّاضِ جبر و ناقدِ بر　　رات، تسنیم و چشمۂ کوثر
دن ہے شمشیر و تیغ و سیل و سموم　　رات، طاؤس و ماہ و عود و نجوم
دن ہے گرداب، گونج، گرمی، گرد　　رات، ساکن، سُبک، سہانی، سرد
دن، دماغ و دلیل و دفتر و داب　　رات، ریحان و رقص و رنگ و رباب
آفتاب و شراب ہیں بیری　　تو لیں دن کو ہیں چھل پیری*
کر نہ پامال حرمتِ اوقات　　رات کو دن بنا نہ دن کو رات
پی، مگر صرف شام کے ہنگام　　اور وہ بھی بقدرِ یک دو جام
وہی انساں ہے خرّم و خورسند　　جو ہے مقدارِ وقت کا پابند
میرے پینے ہی پر نہ جا مری جان　　مجھ سے جینا بھی سیکھ میں قربان
اُس کے پینے میں ننگ آتا ہے　　جس کو جینے کا ڈھنگ آتا ہے
یہ نصائح بہت ہیں بیش بہا　　جلد سو، جلد جاگ، جلد نہا
باغ میں جا طلوع سے پہلے　　تا نگارِ سحر سے دل بہلے
سرو و شمشاد کو گلے سے لگا　　ہر چمن زاد کو گلے سے لگا
منھ اندھیرے فضائے گلشن دیکھ　　ساحل و سبزہ زار و سوسن دیکھ
گاہ آوارہ ابر پارے دیکھ　　اُن کی رفتار میں ستارے دیکھ
جیسے کُہرے میں تابِ بُوئے نکو　　جیسے جنگل میں رات کو جگنو
گل کا منھ چوم اک ترنم سے　　نہر کو گدگدا تبسم سے
جسم کو کر عرق سے نم آلود　　تا کہ شبنم پڑھے لپک کے درود
پھینک سنجیدگی کا سر سے بار　　ناچ، اُچھل، دندنا، چھلانگیں مار
دیکھ آبِ رواں کا آئینہ　　دوڑ ساحل پہ تان کر سینہ
دُور دریا کی شافتیں شہری　　پھول کو سونگھ، سانس لے گہری
جھوم گل ریز شاخساروں میں　　گھوم افسانہ بیز تاروں میں
سرپر الوان کی روانی دیکھ　　سرو و سنبل کی نوجوانی دیکھ

مست چڑیوں کا چہچہانا سن　　موجِ نو مست کا ترانہ سن
بوستاں میں صبا کا چلنا دیکھ　　سبزہ و سرو کا مچلنا دیکھ
شبنم آلود کر سخن کا لباس　　چکھ دھندلکے میں بھیگے گل کی مٹھاس
شاعری کو کھلا ہوائے سحر　　اُس کا نفقہ ہے تیری گردن پر
رقص کی لہر میں ہو گم لبِ نہر　　یوں ادا کر عروسِ شعر کا مہر
جلب کر بوستاں کے نقش و نگار　　ذہن میں کھول مصر کا بازار
یوں کرا اپنی سحر روی کو شروع　　ہو پلٹنے میں آفتاب طلوع
آسمانوں سے سرخیوں کا ہبوط　　دیکھ کرنوں کے دیدہ زیب خطوط
کھینچ کرنوں میں سازِ دل کے تار　　مانگ کُندن کے تھال سے جھنکار
مہر کا تخمِ رنگ بونا دیکھ　　افق و آبِ جُو کا سونا دیکھ
دیکھ امواجِ سرخ کی تزئین　　جیسے مُقیش کا رواں قالین
آتے جاتے سُن لے ترانہ نواز　　دُور سے زاغ و مرغ کی آواز
دیکھ چڑیوں کی آبِ جُو پہ امنگ　　چہچہاتے، پھدکتے، اُڑتے رنگ
کھینچ تخئیل میں نمِ گلشن　　صبحِ شب خیز کا سہانا پن
نرم جھونکوں کا آبِ حیواں پی　　بوئے گل، رنگِ شبستاں پی
گن گنا کر نظر اُٹھا کر پی　　صبح کا شیر و غذا کر پی
تا کہ تجھ کو آئیں کل برکات　　دولتِ جسم و علم و عقل و حیات
یہ نہ طعنہ نہ یہ اُلہنا ہے　　ایک نکتہ بس اور کہنا ہے
غیبتِ نور ہو کہ کثرتِ نور　　ظلمتِ تام ہو کہ شعلۂ طور
ایک سا ہے وبال دونوں کا　　تیرگی ہے مآل دونوں کا
در خورِ صاحبِ کمال نہیں　　ہر وہ شے جس میں اعتدال نہیں
شادمانی سے پی نہیں سکتا　　جس کو ہوکا ہو جی نہیں سکتا
اے پسر، اے برادر، اے ہمراز　　بن نہ اس طرح دُور کی آواز
کوئی بیمار تن نہیں سکتا　　خادمِ خلق بن نہیں سکتا
خدمتِ خلق فرض ہے تجھ پر　　دورِ ماضی کا قرض ہے تجھ پر
عصرِ حاضر کے شاعرِ خوددار　　قرض داری کی موت سے ہشیار
ذہنِ انسانیت ابھار کے جا　　زندگانی کا قرض اتار کے جا
تجھ پہ ہندوستان ناز کرے　　عمر تیری خدا دراز کرے

* وہ چڑیلیں جن کے پاؤں پیچھے کی طرف مڑے ہوتے ہیں

مسعود حسن رضوی

فائز دہلوی

شمالی ہند میں اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر

نواب صدرالدین محمد خان بہادر دہلی کے ایک امیر تھے جو اورنگ زیب کے آخری عہد سے محمد شاہ کے زمانے تک موجود تھے۔ خاندانی اعزاز اور ذاتی وجاہت کے علاوہ علم و فضل کی دولت سے بہرہ مند اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فائز ان کا تخلص تھا۔ شمالی ہند کے رہنے والے اردو زبان کے جن شاعروں کا حال اب تک معلوم ہو چکا ہے اور جن کا کلام معتد بہ مقدار میں دستیاب ہو چکا ہے ان میں شاید کوئی بھی اتنا قدیم نہیں ہے جتنا فائز دہلوی۔

بعض لوگ شاہ حاتم کو دہلی میں اردو کا پہلا شاعر قرار دیتے ہیں مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ حاتم کی شاعری کی ابتدا کا ذکر دو جگہ ملتا ہے، ایک دیوان زادہ حاتم کے دیباچے میں دوسرے مصحفی کے تذکرۂ ہندی میں۔ ان دونوں بیانوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حاتم سنہ ۱۱۲۸ھ سے فارسی میں شعر کہہ رہے تھے مگر جب محمد شاہی عہد کے دوسرے سال یعنی سنہ ۱۱۳۲ھ میں ولی کا دیوان دہلی آیا اور ان کا کلام ہر طبقے میں مقبول ہوا تو حاتم نے ناجی مضمون اور آبرو کے ساتھ اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ فائز اپنا کلیات جس میں اردو دیوان بھی شامل ہے۔ ۱۱۲۷ھ میں مرتب کر چکے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فائز کا کلیات مرتب ہو چکنے کے ایک سال بعد حاتم نے فارسی میں اور پانچ سال بعد اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ اس طرح حاتم اور ان کے ساتھ اردو شاعری شروع کرنے والے تمام شاعروں پر فائز کا تقدم ثابت ہے۔

غلام مصطفیٰ خاں یکرنگ بھی حاتم کے ہم عصروں میں شمار کیے جاتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ حاتم سے بہت پہلے اردو میں شعر کہنے لگے تھے فائز نے اپنی ایک غزل کے مقطعے میں یکرنگ کا ایک مصرعہ تضمین کر دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یکرنگ کی غزل پہلے سے موجود تھی اور اسی غزل پر فائز نے غزل کہی ہے۔ فائز کے ایک ہم عصر میر جعفر تھے جو زٹل یا ٹلی کی صفت کے ساتھ آج بھی مشہور و معروف ہیں۔ ان کا اردو کلام کافی مقدار میں موجود ہے، مگر وہ زیادہ تر ہجو اور فحش پر مشتمل ہے۔ بہرحال اردو کے سنجیدہ شاعروں میں قدامت کے اعتبار سے فائز کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ قدامت کے علاوہ ان کی شاعری اپنی خصوصیتوں کی بنا پر بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔

فائز نہایت ذی علم اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی جن تصنیفوں کا میں اب تک پتہ لگا چکا ہوں ان کی تعداد بائیس[۲۲] ہے اور ان میں سے بیس میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ فائز کا فارسی کلیات کافی ضخیم ہے۔ اس کی فہرست مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بیس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ مگر موجودہ نسخے میں متعدد نظمیں موجود نہیں ہیں اور اس کی ضخامت کچھ اوپر چودہ ہزار بیت ہے۔ کلیات کے اس نسخے میں فائز کا دیوان ریختہ بھی شامل ہے مگر قرینہ کہتا ہے کہ ان کا اردو دیوان کلیات سے علیحدہ بھی شائع ہوا تھا۔ گارساں دتاسی نے اپنی تاریخ ادبیات ہندی اور ہندوستانی میں لکھا ہے کہ صدرالدین محمد فائز پسر زبردست خاں کا ہندوستانی دیوان

اس شمارے میں
لکھنے والے



ڈاکٹر محی الدین قادری زور



اوپندر ناتھ اشک



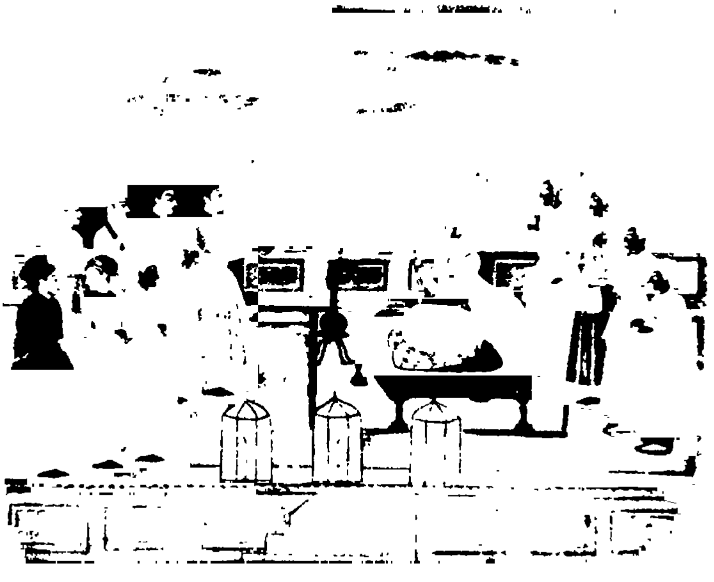
سید مسعود حسن رضوی
صدر شعبۂ اردو و فارسی
لکھنؤ یونیورسٹی

بلونت سنگھ

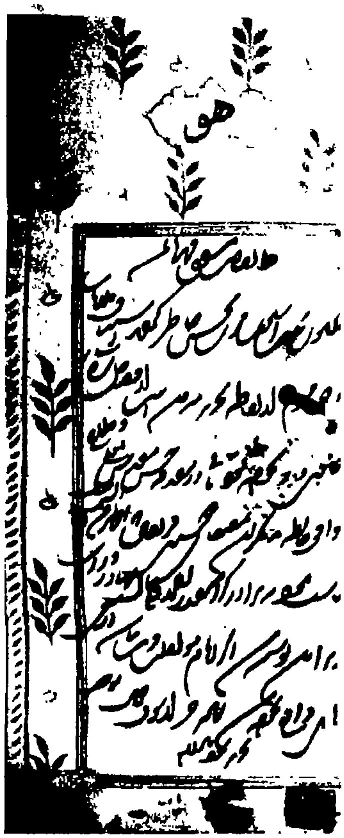


ڈاکٹر مسعود حسین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ





فائز دہلوی مع خدام بارگاہ کے



۱

نواب برہان الملک بہادر بنام نواب صدرالدین محمد خاں بہادر (فائز)

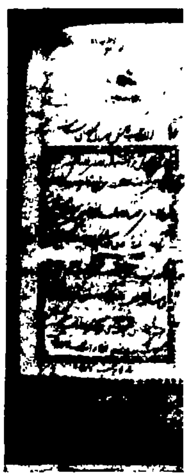
ھو

[illegible]

والسلام

مہر

برہان الملک بہادر



مکتوب امیر الامرا صمصام الدولہ خان دوران بہادر
بنام
نواب صدرالدین محمد خان بہادر (فائز)

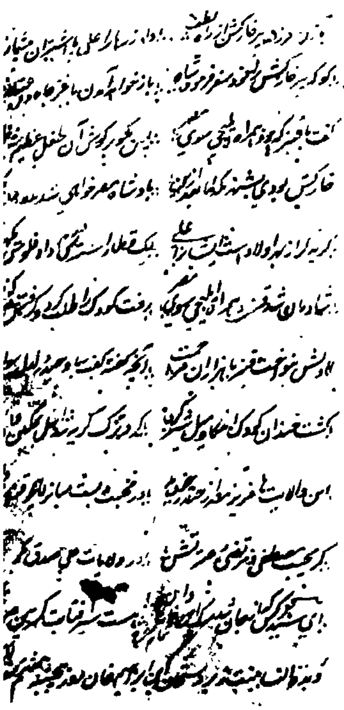
ھوالمعز

نواب صاحب مشفق مہربان مخلصان سلامت

بعد (؟) گزارش مراسم آرزومندی ادراک گرامی ...... آنصاحب (؟) لازم است. مرفوع خاطر خطیر گردانیدہ می آید کہ نمیقہ (؟) سامی چہرۂ وصول افروخت و بر مضامین مندرجہ آگہی داد. بمکتوب (؟) خان عالی شان سید صلابت خان بہادر سلمہ اللہ تعالی مفصل بر جمیع احوال من کل الوجوہ آگاہ ساخت. انشاء اللہ المعین المستعان باقتضائے وقت آنچہ باید مراتب سعی و کوشش بعمل می آید خاطر شریف مطمئن باشد و مخلص را در مقام اتحاد و اخلاص تصور فرمایند. زیادہ ایام جمعیت و کامرانی باد.

مہر

خان دوران بہادر
فدوی بادشاہ غازی
محمد فرخ سیر
سنہ احد ۱۱۲۵



عکس تحریر زبدۃ النسا ہمشیر فائز

غزلیں، قصیدے اور چھ مثنویوں پر مشتمل ہے۔ مثنویوں میں پنگھٹ، جوگن، مالن، گوجری اور بھنگیڑن کا بیان ہے اور ایک رقعہ ہے۔ گارساں دتاسی نے فائز کی ایک مثنوی کا فرانسیسی نثر میں ترجمہ بھی کیا ہے جس کا عنوان ہے "وصف بھنگیڑن دیگا۔ قطبؔ" منشی کریم الدین نے اپنے تذکرے طبقات شعرائے ہند میں فائز اور ان کے دیوان کے متعلق صرف اتنا ہی لکھا ہے:۔

"صدرالدین محمد فائز فرزند زبردست خاں کا۔ اس نے ایک دیوان غزلیات اور قصیدے اور چھ مثنویات کا لکھا ہے۔ ایک مثنوی بیان پنگھٹ اور دوسری جوگن، تیسری مالن چوتھی گوجری پانچویں بھنگیڑن چھٹی رقعے ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے کہ فائز کا دیوان کریم الدین کی نظر سے نہیں گزرا اور انہوں نے فائز کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ گارساں دتاسی کے بیان سے ماخوذ ہے۔

گارساں دتاسی نے فائز کے اردو دیوان کا جو نسخہ دیکھا تھا اس میں غزلوں اور مثنویوں کے علاوہ قصیدے بھی تھے۔ مگر اس کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے اس میں کوئی قصیدہ نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اردو دیوان کے اس نسخے میں ان کا کل کلام شامل نہیں ہے۔ اس بات کا ایک کھلا ہوا ثبوت اور بھی ہے۔ گارساں دتاسی اور کریم الدین نے جن چھ مثنویوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک کا موضوع مالن اور ایک کا گوجری تھا۔ یہ دونوں مثنویاں اس نسخے میں موجود نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ پیش نظر نسخے میں جہاں چند چیزیں گارساں دتاسی کے نسخے سے کم ہیں وہاں گیارہ نظمیں زیادہ بھی ہیں۔ ان میں نو مثنویاں ہیں، ایک مخمس ترجیع بند ہے اور ایک بحر طویل ہے۔

کلیات فائز کی فہرست منظومات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں غزلیات ریختہ کے چار سو اکاون شعر اور مثنویات ریختہ کی پانچ سو تین بیتیں شامل تھیں مگر حقیقتہً اس میں غزلوں کے صرف ایک سو چھہتر شعر اور مثنویوں کی تین سو سرسٹھ بیتیں ہیں۔ غزلوں کے شعروں کی کمی کا سبب یہ ہے کہ ان کے درمیان میں دو جگہ سے کچھ ورق غائب ہو گئے ہیں جیسا کہ ترک پر نظر کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ مثنویوں کی بیتیں کیونکر کم ہو گئیں۔ بہرحال فائز کا موجودہ اردو دیوان ان کے کل اردو کلام پر مشتمل نہیں ہے۔ اس کے پیش نظر نسخے میں اٹھائیس مکمل غزلیں، چار غزلوں کے ایک ایک دو دو شعر، ایک مخمس ترجیع بند، ایک بحر طویل اور تیرہ مثنویاں شامل ہیں۔

فائز اپنی ہر تصنیف میں اپنا نام صدرالدین محمد اور اپنے والد کا نام زبردست خاں ضرور لکھتے ہیں۔ صرف اپنی ایک کتاب انیس الوزرا میں انہوں نے اپنے دادا کا نام بھی بتایا ہے جو علی مردان خاں ہے۔ اس مختصر نشان دہی پر تاریخ کی کتابوں کی سیر کی تو معلوم ہوا کہ فائز ایک عالی خاندان، ذی عزت اور خوشحال شخص تھے۔ اُن کے بزرگ کئی پشتوں سے ایران اور ہندوستان میں بڑے بڑے منصبوں پر فائز ہوتے چلے آتے تھے۔ اس طرح عزت اور دولت ان کو ورثے ہی میں ملی تھی۔

فائز کا پردادا علی مردان خاں ایران کے بادشاہ شاہ صفی صفوی کی طرف سے قندھار کا حاکم تھا۔ شاہ جہاں بادشاہ قندھار کا قلعہ حاصل کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ ایک موقعے پر حالات سے مجبور ہو کر علی مردان خاں نے قندھار کا قلعہ شاہ جہاں کے حوالے کر دیا اور خود اس کی پناہ میں آ گیا۔ شاہجہان نے لاہور میں بڑی عزت کے ساتھ اسے دربار میں بلایا اور ایک بیش بہا خلعت، طلا کا رچارقب، کلغی، مرصع خنجر، مرصع تلوار، دو گھوڑے اور ایک ہاتھی مرحمت کیا اور شش ہزاری منصب عطا کر کے کشمیر کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔ یہ واقعہ شاہ جہاں کے جلوس کے بارھویں سال یعنی ۱۰۴۸ھ کا ہے۔ اس کے دوسرے سال علی مردان خاں کو ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب ملا اور کشمیر کے علاوہ لاہور کی صوبہ داری بھی عنایت ہوئی تین سال بعد وہ امیرالامرا کا خطاب پا کر کل شاہجہانی منصب داروں سے بڑھ گیا۔ کوئی بیس سال تک اس کے تدبر اور شجاعت سے بڑے بڑے کام بنتے رہے اور بڑی بڑی مہمیں سر ہوتی رہیں، اور سرکار شاہجہانی سے اس پر انعام و اکرام، اعزاز و احترام کی بارش ہوتی رہی۔ علی مردان خاں کے خلوص و عقیدت، دانائی و کاردانی نے شاہ جہاں کے دل میں ایسا گھر کر لیا تھا کہ وہ اس کو یار وفادار کے الفاظ سے خطاب کرتا تھا۔

امیرالامرا علی مردان خاں کا بڑا بیٹا ابراہیم خاں شاہجہاں کے عہد میں چار ہزاری سہ ہزار سوار کے منصب تک پہنچ چکا تھا۔ عالمگیر کے

عہد میں اس نے بہت ترقی کی۔ اس بادشاہ نے اپنے جلوس کے دوسرے سال اس کو پنج ہزاری پنج ہزار سوار کا منصب دے کر کشمیر کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔ اس کے بعد مختلف صوبوں کی حکومت اس کو تفویض ہوتی رہی جلوس عالمگیر کے انچاسویں سال اس کے منصب میں اور اضافہ ہوا۔ اور وہ شش ہزاری شش ہزار سوار کے منصب پر فائز ہوا۔ عالمگیر کے بعد بہادر شاہ کی سرکار سے اس کو علی مردان خاں کا خطاب اور کابل کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ مگر اس کے کچھ ہی دن بعد وہ پیرانہ سالی کی وجہ سے واپس آیا اور لاہور سے کوئی تیس کوس کے فاصلے پر ابراہیم آباد سودھرا میں مقیم ہو گیا۔ اور وہیں چند مہینے کے بعد اس نے انتقال کیا۔

ابراہیم خاں کا بیٹا زبردست خاں عالمگیر ہی کے عہد میں جلوس کے بیالیسویں سال یعنی سنہ ۱۱۰۹ھ میں صوبۂ اودھ کا ناظم مقرر ہوا اور سہ ہزاری دو ہزار و پانصد سوار کے منصب پر فائز ہوا۔ اور عالمگیری عہد کے انچاسویں سال سنہ ۱۱۱۶ھ میں اجمیر کا صوبہ دار رہا اور چار ہزاری سہ ہزار سوار کا منصب پایا۔ بہادر شاہ کے عہد میں اس کا انتقال ہو گیا۔ فائز انہیں نواب زبردست خاں کے فرزند اور اسی دودمان عالی شان کی یادگار تھے۔

فائز کے آباد اجداد کے حالات تو تاریخ کی کتابوں سے بہت کچھ معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن خود ان کا حال مجھے اب تک کسی تاریخ میں نہیں ملا۔ اردو اور فارسی شاعروں کے کثیر التعداد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکرے جو میری نظر سے گزرے ہیں وہ سب بھی فائز کے حال میں خاموش ہیں۔ گارساں دی تاسی اور منشی کریم الدین نے صرف فائز کا نام صدر الدین محمد اور ان کے باپ کا نام زبردست خاں لکھا ہے۔ مگر ان دونوں کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ فائز کس زمانے میں گزرے ہیں۔ کریم الدین نے میرؔ، سوداؔ، دردؔ اور سوزؔ کو اردو شاعروں کے طبقہ اول میں رکھا ہے اور فائز کو میر حسنؔ، انشاؔ اور جراتؔ کے ساتھ طبقۂ دوم میں جگہ دی ہے۔ اور اس طبقے کے متعلق لکھا ہے۔

"اس میں اُن شعرا کا ذکر ہے جو مصلح اردو اور مروج اس زبان کے تھے اور انہوں نے الفاظ کریہہ کا استعمال یک قلم زبان ریختہ سے موقوف کیا۔"

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ فائز کا دیوان کریم الدین کی نظر سے نہیں گزرا ورنہ اس کا ہر صفحہ بتا سکتا تھا کہ انشا اور جراٗت کا کیا ذکر فائز تو میرؔ اور سوداؔ سے بھی کہیں پہلے گزرے ہیں۔

فائز کی زبان کے علاوہ ان کی بعض تحریریں بھی ان کا زمانہ معین کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ ان کے کلیات کے خطبے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا کلیات مرتب کرنے کے پندرہ سال بعد سنہ ۱۱۴۲ھ میں اس پر نظر ثانی کی تھی اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اپنا کلیات سنہ ۱۱۲۷ھ میں یعنی فرخ سیر کی سلطنت کے پانچویں سال میں مرتب کر چکے تھے۔ فائز کے رسالہ مناظرات میں وہ مکالمے درج ہیں جو فائز اور بعض علما میں امیر الامرا صمصام الدولہ کے مکان پر مختلف اوقات میں بعض مذہبی مسائل کے متعلق ہوئے تھے۔ صمصام الدولہ کو فرخ سیر کے عہد میں امیر الامرا حسین علی خاں کی نیابت ملی اور محمد شاہ کی سرکار سے امیر الامرا کا مستقل منصب عطا ہوا۔ اسی بادشاہ کے عہد میں وہ نادر شاہ کی فوج سے جنگ کرتے ہوئے مارا گیا۔ فائز نے اپنی ایک فارسی مثنوی میں بادشاہوں کے عبرت ناک انجام کا ذکر کیا ہے اور جن بادشاہوں کا انجام انہوں نے دیکھا تھا ان کا نام بنام ذکر کیا ہے یہ فہرست اورنگ زیب سے شروع ہو کر محمد شاہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس مثنوی کا آخری شعر یہ ہے

من انہا کہ دیدم بسا سال نیست
تماشش بجز چاردہ سال نیست

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مثنوی محمد شاہ کے عہد کی ابتدا میں لکھی گئی اور یہ کہ فائز نے اورنگ زیب کا آخری زمانہ بھی دیکھا تھا۔

فائز کے زمانے کی طرح ان کے وطن کا پتہ بھی انہیں کی تحریروں سے لگتا ہے۔ انہوں نے اپنے وطن کا ذکر صاف صاف تو کہیں نہیں کیا ہے لیکن ان کے کلام میں دہلی کا ذکر اس انداز سے اور اس کثرت سے ملتا ہے کہ دہلی کو ان کا وطن قرار دینے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا۔ فائز کے دہلوی ہونے کا سب سے زیادہ کھلا ہوا ثبوت ان کی اس مثنوی سے ملتا ہے جو انہوں نے شاہجہان آباد کی تعریف میں لکھی ہے۔ اس میں دہلی کے بازاروں کے بیان میں دریبہ۔ گنذری۔ نخاس مغل پورہ اور قاضی کی حوض کا ذکر کیا ہے اور اسی سلسلے میں لکھا ہے۔

میلے راکہ تماشش مشتاقی بود   زجنس نکورو شتاقی بود

مراغانہ بودہ است دریں طرف   زنہراست ودراسرامر شرف

مٹھائی کا پل دہلی میں اب بھی موجود ہے ۔سعادت خاں کی نہر اس کے نیچے سے گزرتی ہے ۔ یہ نہر بہت کچھ پاٹی جا چکی ہے مگر اس کے آثار ابھی موجود ہیں اور اس کا نام باقی ہے ۔سعادت خاں (برہان الملک) محمد شاہی عہد کا مشہور منصب دار تھا جو بعد کو اودھ کی سلطنت کا بانی ہوا ۔ ظاہر ہے کہ اس کی بنوائی ہوئی نہر فائز کے سامنے تیار ہوئی ہوگی اور اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے منقولۂ بالا شعروں میں اسی نہر کا ذکر کیا ہے ۔غرض کہ یہ دو شعر صاف بتلاتے ہیں کہ فائز کا مکان دہلی میں مٹھائی کے پل کے قریب سعادت خاں کی نہر کے کنارے واقع تھا ۔

فائز اصل نسل کے ایرانی اور پشتہا پشت کے امیر تھے ۔قیاس کہتا ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں کے اچھے اور چہرے مہرے کے وجیہہ ہوں گے ۔ اس قیاس کی تصدیق بھی فائز ہی کے بیان سے ہو جاتی ہے ۔ وہ اپنے کلیات کے خطبے میں ایک جگہ لکھتے ہیں : ۔

"حسن ظاہر بہترین صفات است و دلیل خوبی باطن چنانچہ
درحدیث وارد شدہ اطلبوا الخیر عند حسان الوجوہ ازیں جا
پیدا است کہ قبح منظر دلیل سوء باطن است نعوذ باللہ منہا"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ فائز خوبصورت آدمی تھے ۔ اگر وہ خود بدصورت ہوتے تو بدصورتی کو بدباطنی کی دلیل قرار نہ دیتے اور اس سے پناہ نہ مانگتے ۔اس سلسلے میں انہوں نے یہ شعر بھی لکھا ہے ۔

زشت رو البتہ می باشد شریر   قول و فعل او نباشد دلپذیر

اس شعر سے اس خیال کو اور تقویت پہنچتی ہے ۔

فائز خود حسین تھے ، اور حسینوں کی طرف فطری میلان رکھتے تھے انہوں نے اپنے کلیات کے خطبے میں اپنی "گرفتاری دل و تعلق بخوباں طاقت گسل" کا ذکر کیا ہے ۔ اور رسالہ مناظرات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ امیر الامرا نے ان سے شکایت کی کہ آپ نے یہ کیا طریقہ اختیار کیا ہے کہ نہ دربار میں شرکت کرتے ہیں نہ میرے یہاں آتے ہیں اس سلسلے میں مزاحاً یہ بھی کہا کہ کیا کہیں عاشقی کر لی ہے جو گھر سے باہر نہیں نکلتے ۔فائز نے جواب دیا کہ فی الواقع میں ہمیشہ سے عاشق پیشہ تھا لیکن ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق   کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس لئے اب عشق و عاشقی کا ہوش نہیں ۔

فائز کی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر طرح کی صحبتوں میں بیٹھتے تھے ، ہر قسم کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے ، میلوں ٹھیلوں کی سیر کرتے تھے اور کھیل تماشے ناچ رنگ سب کچھ دیکھتے تھے ۔مگر آخر عمر میں اُنہوں نے رقص و سرود کی محفلوں میں شرکت ترک کر دی تھی اور شراب سے ہمیشہ پرہیز کیا تھا ۔یوں تو فائز کو اُن تمام مشغلوں سے کچھ نہ کچھ دلچسپی تھی جو اس زمانے میں امیری کے لوازم سمجھے جاتے تھے ، مگر اُن کو خاص شوق دو چیزوں سے تھا ، ایک کتابوں کا مطالعہ دوسرے شکار ۔ ایک مرتبہ اثنائے گفتگو میں امیر الامرا نے فائز سے پوچھا کہ "مطالعہ تو موقوف ہوا اب کیا شغل رہتا ہے" فائز نے جواب دیا "کچھ نہیں ۔ اس لئے کہ دو ہی چیزوں کی طرف طبیعت مائل تھی ، ایک مطالعہ وہ طبیبوں کے کہنے سے ترک کر دیا دوسرے شکار وہ دار الخلافت میں کسی کو میسر نہیں" (رسالہ مناظرات)

فائز کے حالات معلوم نہیں ۔ مگر ایسے قرینے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاندانی اعزاز کے علاوہ ذاتی امتیاز کے بھی مالک تھے نوابی اور خانی کے خطاب پائے ہوئے تھے ۔صاحب جاگیر تھے اور دربار شاہی میں رسائی رکھتے تھے ۔ رسالۂ مناظرات سے فائز کی باعزت شخصیت کا حال یوں بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ امیر الامرا کے حضور میں بلکہ خود انہی سے خطاب کر کے بے تکلفانہ اور بے باکانہ گفتگو کر سکتے تھے اور گفتگو بھی ایسی جس میں امیر الامرا کی ذات اور اُن کے مذہب پر حملے تک ہوتے تھے ۔ باوجود اس کے امیر الامرا فائز کی ملاقات کے مشتاق رہتے تھے ۔

فائز کے باپ دادا کئی پشتوں سے جس دولت و ثروت کے مالک چلے آتے تھے اس کا کچھ حصہ تو فائز تک ضرور ہی پہنچا ہوگا ۔خود اُن کی بعض تحریروں سے بھی اُن کی خوشحالی کا اظہار ہوتا ہے ۔ فائز کی جو تصویر دستیاب ہوئی ہے اور اس مقالے کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے وہ بھی ان کی خوشحالی کا ثبوت دے رہی ہے ۔لیکن خوش بختی اور خوش حالی تو ایک اضافی چیز ہے ۔ہم جس حالت کو خوشحالی سمجھ رہے ہیں وہ خود فائز کے نزدیک خوش حالی نہ تھی کیونکہ نہ اُن کی مالی حالت وہ تھی جو ان کے بزرگوں کی رہ چکی تھی ، نہ اُن کو وہ منصبی اعزاز حاصل تھا جو اُن کے خاندان میں کئی پشتوں سے چلا آتا تھا

اُن کی زندگی کا کچھ حصہ ایسا ضرور گزرا ہے جب وہ کسی منصب پر فائز رہتے انہوں نے اپنے خطوں میں یہ شکایت بھی کی ہے کہ اس عہد میں نامور خاندانوں کے افراد بے روزگار اور نیچے گھرانوں کے لوگ برسرِکار رہیں۔ ہر کس و ناکس کسی نہ کسی منصب پر فائز ہے۔ مگر حقدار اپنے حق سے محروم ہیں اور غیر مستحق لوگ یکایک بڑے سے بڑے منصبوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ فائز نے اپنی نظموں میں جگہ جگہ اپنی بیکاری، اہلِ کمال کی ناقدری، اور اربابِ اختیار کی بے اعتنائی کا شکوہ کیا ہے۔

فائز کی علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ فارسی زبان پر اُن کو جو عبور تھا وہ ان کی متعدد تصنیفوں اور ضخیم فارسی دیوان سے ظاہر ہے وہ فارسی ادب بالخصوص فارسی شاعری میں بہت وسیع نظر رکھتے تھے۔ اپنے کلیات کے خطبے میں ایک جگہ لکھا ہے "فقیر قریب پنجاہ دیوان از قدماء و استادان بمطالعہ درآوردہ احوال ہر یک و مراتب کلام ایشان سنجیدہ"۔ اس کے بعد فارسی کے باون شاعروں کا ذکر کیا ہے اور اُن کے خصوصیات نہایت اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے "طور و طرز ہر ایک جدا است۔ کسے کہ مدتہا مطالعہ کتب ہر یک نمودہ باشد بر او پوشیدہ نہ خواہد بود"۔ اسی خطبے میں دوسری جگہ اپنے متعلق لکھتے ہیں "اکثر مطالعہ کتب اشعار استادان می نمود۔ زینے کہ خوش آمد دراں فکر نظم می نمود"۔

فائز کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا اور فارسی نظم و نثر میں وہ اپنے ہم عصروں میں سے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کا ایک خط جو "بیکے از مردم خطہ" یعنی کسی کشمیری کے نام ہے جس نے ان کے شعر کو اصلاح طلب کہہ دیا تھا ان کی اس خود پسندی کی غمازی کر رہا ہے۔ اسی خط کا ایک جملہ بتاتا ہے کہ فائز اپنے کو فارسی میں اہلِ زبان سمجھتے تھے۔ وہ اصلاً تو ایرانی تھے ہی ممکن ہے ان کے گھر میں اب تک فارسی بولی جاتی ہو۔ فائز عربی زبان اور ادب پر بھی کافی عبور رکھتے تھے۔ وہ اپنے رسالوں میں حمد و نعت وغیرہ عربی میں لکھتے ہیں اور اپنی فارسی تحریروں میں عربی کے اشعار و اقوال وغیرہ بے تکلف لاتے ہیں اور بعض اوقات لمبی لمبی عبارتیں عربی میں لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے کئی خط بھی عربی زبان میں ہیں۔ عربی زبان کے علاوہ عربی علوم میں بھی فائز کو اچھا خاصا دخل تھا۔ وہ قرآن کی آیتیں پیش کرتے ہیں اور اُن کے معانی و مطالب بیان کرنے میں اجتہادی شان دکھاتے ہیں رسول کی حدیثیں راویوں کے حوالے کے ساتھ نقل کرتے ہیں اور اسلامی عقاید، فقہ اور تاریخ کے نزاعی مضمون پر عالمانہ بحثیں کرتے ہیں۔ انہوں نے امیر الامرا کے یہاں اہلِ علم کے مجمعے میں مختلف مسائل پر جو مناظرے کئے اور اپنے حریفوں کو جن مدلل بحثوں سے لاجواب کر دیا اُن پر نظر کرنے سے فائز کا یہ دعوےٰ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ

صدرِ اصحاب معینم بجہاں   برتری حق خاندان من است
سرِ دشمن جدا کنم ز سخن   تیغ ہندی ہمیں زبانِ من است

مناظروں کے سلسلے میں فائز جن مصنفوں کے قول پیش کرتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فریقین کی مستند کتابیں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ رسالہ مناظرات کے علاوہ ان کے دوسرے رسالوں میں بھی علوم عربی کی بڑی بڑی کتابوں اور ان کے مصنفوں کے حوالے جگہ جگہ ملتے ہیں۔

ریاضیات کے مختلف شعبوں میں خاص کر علم ہیئت میں فائز کو اچھی دستگاہ حاصل تھی۔ انہوں نے اپنے کئی خطوں میں ریاضی اور ہیئت کے مختلف مسائل بیان کئے ہیں۔ انہوں نے علم نجوم میں ایک رسالہ نجم الصدر اور علم حساب میں ایک رسالہ تحریر الصدر لکھا۔ ان رسالوں کے دیباچوں میں لکھتے ہیں۔

"فقیر را از صغرِ سن میل بہ علوم غریبہ بسیار بود چنانچہ بقدر وسع در تحصیل آں خود را معاف نمی داشت" (نجم الصدر)

"فقیر را شوق بسیار بہ علم عدد بودہ ولیکن ایں فن شریف در عنفوان شباب نمودہ" (تحریر الصدر)

فائز کو طب، منطق، فلسفہ اور کلام میں کافی دخل تھا۔ انہوں نے علم طب میں دو رسالے فوائد الصحت اور رسالۂ مالیخولیا کے نام سے لکھے ہیں وہ علم رمل اور علم قیافہ سے بھی واقف تھے۔ موخر الذکر موضوع پر ان کا ایک رسالہ بھی ہے جس کا نام ہدایت الصدر ہے۔ تاریخ سے فائز کو جو دلچسپی تھی اس پر ان کی کتاب "ارشاد الوزرا" شاہد ہے۔ عروض، قافیہ، معنی، بیان اور بدیع میں فائز کو جو مہارت تھی وہ ان کے کلیات کے خطبے سے ظاہر ہے جس میں انہوں نے ان فنون کے اہم مسائل سے بحث کی ہے۔ عربی صرف و نحو سے وہ بخوبی واقف تھے۔

فائز نے جو علوم حاصل کئے تھے اُن کے مسائل اور اصطلاحات انہیں اس قدر مستحضر تھے کہ ان کی رعایت اور تلازمے کے ساتھ لمبی لمبی عبارتیں لکھتے چلے جاتے تھے ۔

فائز کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں اس لئے ان کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا ۔ اُن کے کلام سے بھی ان کے سن کا حال نہیں کھلتا ایک مثنوی میں انہوں نے جوانی کا گزر جانا ۔ طبیعت کا افسردہ ہونا ۔ دنیوی لذتوں سے کنارہ کشی کر لینا اور موت کا ناگزیر ہونا بیان کیا ہے ۔ اس مثنوی کے چند شعر یہ ہیں ۔

آہ کہ ایّام جوانی گذشت   موسم تعلیم ستانی گذشت
خندۂ تفریح فراموش شد   آتش عشقم ہمہ خاموش شد
رقص و طرب گاہ نیاید بیاد   خواہش وحدت بہ دلم شد نیاد
ہیچ طرف دل نہ کشد بہر سیر   نے سوئے مسجد روم و نے بدیر
طبع ولی غمزدہ پژمردہ شد   خاطر پر عیش من افسردہ شد

ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ فائز بڑھاپے کی سرحد میں ضرور داخل ہو گئے تھے ۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ کس عمر تک زندہ رہے ۔

فائز کی شاعری

فائز نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں ۔ ان کے فارسی کلام کی مقدار اردو سے کہیں زیادہ ہے اور دونوں زبانوں میں غزلوں کی مقدار غزلوں سے زیادہ ہے ۔ شعر کی اور صنفیں بھی ان کے کلیات میں موجود ہیں مگر وہ مقدار میں بہت کم ہیں ۔ ان کی مثنویاں بالعموم مختصر ہیں اور زیادہ تر خارجی چیزوں سے متعلق اور بیانیہ شاعری میں شمار ہونے کے قابل ہیں ۔ مقدار کے لحاظ سے مثنویوں کے بعد غزلوں کا نمبر ہے ۔

فائز نے اپنی غزل گوئی کے محرکات خود بتائے ہیں ۔ وہ انہیں کی زبان سے سنئے ۔

(۱) "در عنفوان شباب حدتے در مزاج و شوخیئے در طبیعت به مرتبۂ تمام بود ۔ معہذا گرفتاری دل و تعلق به خوبان طاقت گسل علاوۂ آن گردیده ۔ اکثر در وصف حسن خوبان شعرے و غزلے طرح می شد ۔ رفتہ رفتہ مجموعۂ گردید"۔

(۲) "چوں اکثر مطالعہ کتب استادان می نمود ز بسکہ خوش می آمد و آں فکر نظم می نمود بعد مدتے بہ ترغیب یکے از رفقا بہ ترتیب آں متفرقات متوجہ شده دیوان مرتب ساخت"۔

ان اقتباسوں سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ فائز نہ مشاعروں کی طرحوں میں غزلیں کہتے تھے نہ مشاعروں میں اپنا کلام سناتے تھے ۔ غالباً یہی سبب ہے کہ وہ شاعر کی حیثیت سے مشہور نہ ہوئے اور شعرا کے تذکرے ان کے ذکر سے خالی رہے ۔

فائز نے قصیدہ گوئی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ۔ ان کی خودداری معمولی انسانوں کی مداحی کو خواہ وہ کسی درجے کے ہوں جائز نہ رکھتی تھی اور صلے کی امید پر شعر کہنے کو وہ ایک طرح کی گدائی سمجھتے تھے ۔ انہوں نے اپنے کلیات کے خطبے میں ایک جگہ قصیدہ گوئی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے ۔

"میں نے لوگوں کی مدح نہیں کی کہ اس سے گدائی کی بو آتی ہے قدما اس معاملے میں مجبور تھے ۔ اس لئے کہ بادشاہوں کی فرمائش سے شعر کہتے تھے یا ان کی مدح میں تاکہ تقرب کا ذریعہ ہاتھ آئے میں ان دونوں باتوں سے بری ہوں کہ اپنی نشانی چھوڑ جانے کے سوا کوئی غرض اور مطلب نہیں ہے ۔ بادشاہ حقیقی کے سوا کوئی مدح کے قابل نہیں ہے ۔ یا ائمہ ہدا کی مدح کرنا چاہیئے کہ موجب ثواب اور کار خیر ہے ۔ دنیوی اغراض کے لئے اپنے مثل کو سراہنا عقل کے نزدیک مستحسن نہیں ہے ۔ ہاں حسینوں کی تعریف کرنا اور اُن کے خط و خال کے وصف میں مبالغہ کرنا تیزیٔ طبع کا باعث اور اہل دل کے نزدیک جائز ہے (ترجمہ)

اس خطبے میں ایک دوسرے مقام پر فائز نے قصیدہ گویوں کو تفصیل کے ساتھ مفید ہدایتیں کی ہیں ۔ ان ہدایتوں سے قصیدے کے متعلق فائز کا معیار تنقید معلوم ہو جاتا ہے ۔

فائز سچے آدمی تھے اور سچائی کے دلدادہ ۔ وہ شاعری میں بھی جھوٹ کو جائز نہ رکھتے تھے ۔ گویا وہ عرب کے اس شاعر کے ہمنوا تھے جس کا یہ قول مشہور ہے کہ سب سے اچھا شعر وہ ہے جس کو سُن کر لوگ کہیں کہ سچ کہا ۔ وہ اپنے کلیات کے خطبے میں کہتے ہیں ۔

" مجھ کو باکمال شاعروں پر تعجب ہوتا ہے کہ جھوٹی کہانیاں

اور غلط باتیں کیوں نظم کرتے ہیں"
ذرا آگے بڑھ کر پھر کہتے ہیں ۔

"عقلمند آدمی کو کیا ضرورت ہے کہ جھوٹی باتیں نظم کرنے میں اوقات صرف کر کے اپنے کلام کو عاقلوں کی نظر میں بے قدر کرے اور جاہلوں کو گمراہی میں مبتلا کرے کیونکہ وہ ان باتوں کو سچ سمجھ لیتے ہیں ۔ اگر خدا کسی کو موزوں طبیعت عطا کرے تو وہ سچی باتیں اور سچی حکایتیں کیوں نہ نظم کرے کہ جھوٹی باتوں میں مشغول ہو کر اپنے کلام کو بے رتبہ بنائے"

اپنے اصول کے مطابق فائز اپنی شاعری میں جھوٹ سے بچتے ہیں، حد سے گزرے ہوئے مبالغے سے کام نہیں لیتے' لفظوں کی مناسبت پر کلام کی بنیاد نہیں رکھتے' اور خیالی مضامین کے طلسمی گلدستے نہیں بناتے وہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھتے ہیں' کانوں سے سنتے ہیں اور دل سے محسوس کرتے ہیں اسی کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دیتے ہیں ۔

فائز کے کلام میں غور و فکر کے آثار نہیں پائے جاتے ۔ نہ وہ مضمون کی تلاش میں کوئی خاص کوشش کرتے ہیں نہ لفظوں کے انتخاب میں غیر معمولی کاوش ۔ سیدھی سیدھی باتیں سادے سادے لفظوں میں کہتے چلے جاتے ہیں ۔ ان کی راستی پسند طبیعت نے اپنے کلام کی اس خصوصیت کا خود اعتراف کر لیا ہے ۔ اپنے کلیات کے خطبے میں انہوں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میں نے دوسرے شاعروں کی طرح مضمون کے لئے کوشش اور فکر کبھی نہیں کی ۔ شوق کے غلبے میں جو کچھ دل میں آیا بے توقف لکھ دیا ۔ چنانچہ ایک ایک دن میں سوا سوا سو شعر اور طبیعت حاضر ہوئی تو اس سے بھی زیادہ کہہ ڈالے ۔

فائز نے اپنے کلام کی بے ساختگی کا ذکر ایک شعر میں بھی اس طرح کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو کلام کی ایک پسندیدہ صفت سمجھتے تھے ۔ وہ شعر یہ ہے ۔

بے ساختہ باشد غزل و شعر تو یکسر
فائز چہ خوش آیند سخنہائے تو مارا

فائز کی سادگی پسندی کا اظہار ان کے اس شعر سے بھی ہوتا ہے ۔

حسن بے ساختہ بھاتا ہے مجھے   سرمہ انکھیاں میں لگایا نہ کرو

فائز نے اپنے کلیات کے خطبے میں شعر کے محاسن اور شاعر کے اوصاف بھی بیان کئے ہیں اور شاعروں کو کچھ ہدایتیں بھی کی ہیں ۔ ان کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی پوری توجہ صحت زبان اور حسنِ بیان کی طرف ہے' نفس شاعری کی طرف بالکل نہیں ۔ اور ایک انہیں پر کیا منحصر ہے ان کے زمانے کا حال یہی تھا کہ جو کلام صرف و نحو' معنی و بیان' بلاغت و بدیع عروض و قافیہ کے اعتبار سے جس قدر بے عیب ہو اسی قدر اچھا سمجھا جاتا تھا ۔ شاعری کی حقیقت اور اس کے موضوع و مقصد کے متعلق واضح تصورات لوگوں کے ذہن میں نہ تھے ۔ یہ چیزیں ذوقی اور وجدانی سمجھی جاتی تھیں جن کا اظہار لفظوں میں ناممکن تھا ۔ اس زمانے کے حالات کے مطابق فائز کے پیش نظر بھی شعر کا کوئی بلند معیار نہیں ہے ۔ نہ ان کے سامنے شاعری کا کوئی خاص مقصد ہے

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں فائز کا فارسی کلام مقدار میں اردو سے کہیں زیادہ ہے ۔ اس کی نوعیت کا کچھ اندازہ ذیل کے نمونوں سے کیا جا سکتا ہے ۔

بر رہ عشق تا قدم زدہ ایم   پشت پاے بہ ملک جم زدہ ایم
ہر دم از نالۂ جہاں آشوب   در صف عاشقاں علم زدہ ایم
محو یاریم و آرزوئے نیست   بر خط مدعا قلم زدہ ایم
سخن ماست جملہ درد آلود   فائز از جوش عشق دم زدہ ایم

با خماریں نگہے من سروکارے دارم
خار در سینہ ز مژگان نگارے دارم
رنگ گاربیت بہ حیرت سروکارے دارم
ہمچو آئینہ نظر بر رُخ یارے دارم
گر تو با پیر مغاں دی زدہ رطل گراں
من ہم از بادۂ چشم تو خمارے دارم

گرچہ در بزم تو گفتند ز ہر جا سخنے
کاش می گفت کسے ہم ز دل ما سخنے
روے دل با دگرے داشتی و چشم بما
زانکہ با خود سخنے گفتی و با ما سخنے

اس مقالے کے ابتدائی حصے میں بتایا جا چکا ہے کہ فائز کا اردو

دیوان کی اصناف سخن پر مشتمل ہے اور ان کے اردو کلام کی مقدار کیا ہے۔ اُن کی شاعری پر مختصر عمومی تبصرہ بھی کیا جا چکا ہے۔ اب ان کے اردو کلام پر ذرا گہری نظر ڈالی جائے گی اور ان کی شاعری کی خصوصیتیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کی جائیں گی۔

فائز کی غزلوں کا عام موضوع ظاہری حسن ہے یا مجازی محبت خدائی محبت کا تو شاید کہیں ذکر ہی نہیں، انسانی محبت کا تصور بھی کچھ بلند نہیں ہے۔ ان کے یہاں جس محبت کا بیان ملتا ہے اسے حسن پرستی کہہ سکتے ہیں، عشق کے نام سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ شاید دو ہی چار شعر ہوں گے جو عشق کے اعلےٰ تصور پر مبنی ہوں۔ مثلاً

خاک میتی سجن اٹھا کے کیا   عشق تیرے نے سربلند مجھے

اس طرح فائز کی غزلوں میں دو چار شعر ایسے بھی مل سکتے ہیں جن میں حسن و محبت کے علاوہ کوئی اور مضمون باندھا گیا ہو۔ مثلاً

جاگیر اگر بہت نہ ملی ہم کوں غم نہیں

حاصل ہمارے ملک قناعت کا کم نہیں

محبوب کی توصیف اور محبت کے اظہار میں وہ محبوب سے براہ راست خطاب کرتے ہیں۔ بعد کے شاعروں نے غزل میں معشوق کا ذکر اکثر ضمیر غائب کے ساتھ کیا ہے لیکن فائز کی غزل سخن از معشوق گفتن کا نہیں بلکہ سخن بہ معشوق گفتن کا مصداق ہے۔

شمالی ہند میں اردو غزل گوئی کا ابتدائی دور ایہام گوئی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے لیکن فائز کو ایہام گوئی کا شوق نہ تھا۔ وہ کبھی کبھی صنعت ایہام سے کام ضرور لیتے ہیں، مگر بالعموم اپنے کلام کی بنیاد دوسرے معنوں کے لفظوں اور فقروں پر نہیں رکھتے۔ ان کی زبان میں وہ سادگی، نرمی اور لوچ ہے جو غزل کے لئے ضروری ہے۔ وہ اپنا مطلب تمثیل کے پیرائے میں یا استعارے کے پردے میں بیان نہیں کرتے۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے سیدھے سادے بے تکلف انداز میں کہہ دیتے ہیں۔ مگر اسلوب بیان کچھ ایسا اختیار کرتے ہیں کہ ان کی سادی سادی باتیں بھی لطف اور اثر سے خالی نہیں ہوتیں۔ آزاد مغفور دہلی کے دور اول کے اردو شاعروں کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں۔ جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے دل میں جو خیالات گزرتے ہیں وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ اینچ پیچ کے خیال دور دور کی تشبیہیں نازک استعارے نہیں برتتے۔ اس واسطے اشعار بھی صاف اور بے تکلف ہیں .... اس میں شک نہیں کہ ان کے محاورات قدیمی اور مضمون بھی اکثر سبک اور متبذل ہوں گے۔ مگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی ایسی دل کو بھلی لگتی ہے جیسے ایک حسن خداداد ہو کہ اس کی قدرتی خوبی ہزار بناؤ سنگار کا کام کر رہی ہے" (آب حیات)

آزاد کا یہ بیان فائز کے کلام پر حرف بہ حرف صادق آتا ہے۔ مثال کے لئے ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

تیری گالی مجھ دل کوں پیاری لگے   دعا میری تجھ من میں بھاری لگے
تری قدر عاشق کی پیچھے سجن   کسی ساتھ اگر تجھ کوں یاری لگے
بھنواں تیری شمشیر و زلفاں کمند   پلک تیری جیسے کٹاری لگے
نہ جانوں تو ساقی تھا کس بزم کا   نین تیری نکھوں خماری لگے
وہی قدر فائز کی جانے بہت   جسے عشق کا زخم کاری لگے

چند متفرق شعر اور سنئے۔

جب سجیلے خرام کرتے ہیں   ہر طرف قتل عام کرتے ہیں
مرغ دل کا شکار کرنے کوں   زلف و کاکل کو دام کرتے ہیں

گل باغ جنوں ہے رسوائی   عزت ملک عشق خواری ہے
خون دل بادہ و جگر ہے کباب   نغمہ بزم وصل زاری ہے
لیلیٰ مجنوں کا ذکر سرد ہوا   اب تمہاری ہماری باری ہے
یار میرا میاں گلشن ہے   غرق توں پھول تا بہ دامن ہے

دور اول کے اور شاعروں کی طرح فائز کی غزلوں میں بھی درد و الم، سوز و گداز، رندی و سرمستی، جوش و خروش کم ہے۔ لیکن محبوب کی اداؤں کے بیان اور عاشق کی محبت کے اظہار میں کبھی کبھی ان کے کلام میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً

ترچھی نگاہ کرنا، کترا کے بات سُننا

مجلس میں عاشقوں کی انداز ہے سراپا

بعض لوگ غلط فہمی سے اردو غزل پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں معشوق ہمیشہ مذکر ہوتا ہے۔ لیکن فائز کے یہاں محبوب کی نسوانیت بالکل

ظاہر ہے۔ وہ اس کو کبھی کبھی "نار" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں جس کے معنی ہیں عورت اور اس کی ساری، اوڑھنی وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً

سورج کا جلانے کوں جگر جیوں دل فائز
اے نار تو کیوں دھوپ میں سر کھول کھڑی ہے

تجھ بدن پر جو لال ساری ہے   عقل اس نے مری بساری ہے
اوڑھنی اودی پر کناری زرد   گرد شب کے سورج کی بھاری ہے

مگر کبھی کبھی وہ مردانہ حسن کا بیان بھی کرتے ہیں اور اس سلسلے میں قبا اور چیرہ یعنی پگڑی کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ مثلاً

کیا خوب ترے سر پہ لگے چیرہ ساؤ   کیا زیب دیوے بسمہ تری سبز قبا پہ
کرناں کا بنا ہے نور رخ سوں   چیرہ ہے جو سر پہ تجھ زری کا

فائز کی غزلوں کے اس مختصر مجموعے میں کئی غزلیں ایسی ہیں جن کا موضوع شروع سے آخر تک ایک ہے یعنی وہ غزل کی شکل میں مسلسل نظمیں ہیں۔ ایسی ایک غزل یہاں نقل کی جاتی ہے، جس میں عالم فراق کا بیان ہے۔

مجھ پاس کبھی وہ قد شمشاد نہ آیا   اس گھر منے وہ دلبر استاد نہ آیا
گلشن مری انکھیاں میں لگے گلخن دوزخ   جو سیر کو مجھ ساتھ پری زاد نہ آیا
سانجھ آئی دیو دن بی ہوا فکر میں آخر   وہ دلبر جادو گر صیاد نہ آیا
آیا نہ ہمن پاس کیا وعدہ خلافی
فائز کا کچھ احوال مگر یاد نہ آیا

اردو شاعری پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ مقامی رنگ سے خالی ہے مگر فائز کا کلام اس اعتراض کی زد سے دور ہے۔ وہ تشبیہوں استعاروں اور تلمیحوں میں خاص ہندوستانی چیزوں سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً پلک کو کٹاری سے، نرم نازک گول بانہوں کو کنول کی ڈنڈی اور کیلے کے گابھے سے، بڑی بڑی آنکھوں کو کنول کے پھول سے، سونتواں ناک کو چنپے کی کلی سے، دلکش رفتار کو مور اور مست ہاتھی کی چال سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ان تشبیہوں کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

بھنواں تیری شمشیر و زلفاں کمند   پلک تیری جیسے کٹاری لگے
کنک سوں صفا دار ہے وو بدن   کنول ڈال سے ہاتھ گل سے چرن
کیلے کے گابھے سے ملائم دو رات   دیکھ کے مرجھاتے تھے کیلے کے پات

رنگ سوں ہیں پیرہن سب گل سے لال   نین ہیں نرگس کنول سے از گلال
نین دو کنول اور دو گل ہیں گال   کلی چنپے کی ناک کو ہے مثال
ترچھی نظروں سے دیکھنا ہنس ہنس   مور سے چال تجھ نیاری ہے
مست ہاتھی چلتی تھی زجو بن   نہ آہٹ پلتے گر بجتی نہ پیجن

تشبیہ اور استعارے کے استعمال میں فائز خاص امتیاز رکھتے ہیں وہ مقررہ استعاروں اور رسمی تشبیہوں پر قناعت نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے مشاہدے سے نئی تشبیہیں اور نئے استعارے پیدا کرتے ہیں مثلاً

چاند جیسا ہے شفق بیچ عیاں   چہرہ سب کا از گلال آتش فشاں

یعنی روشن چہرے پر گلال ملا ہوا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شفق کے اندر سے چاند نمودار ہے۔ ایک حسین جوگن کے متعلق لکھتے ہیں۔

نہیں چھپا تن بھبوت میں سارا   راکھ میں حسن کا ہے انگارا

یعنی جوگن کے بدن میں بھبوت نہیں ملی ہوئی ہے بلکہ حسن کا انگارا راکھ میں چھپا ہوا ہے۔ ایک حسین میوے والی کی تصویر یوں کھینچتے ہیں۔

پھرتی وو سورج سی دن کوں در در
میواں سوں لے سر پہ تارے چندر

یعنی میووں کے چاند تارے سر پر رکھ کر وہ سورج کی طرح دن بھر گھر گھر پھرا کرتی ہے۔

دل کی شکل بادام سے مشابہ ہوتی ہے اور بادام کے چھلکے پر باریک باریک سوراخ کثرت سے ہوتے ہیں۔ ان دونوں باتوں پہ نظر کر کے فائز نے ایک اچھوتی تشبیہ پیدا کی ہے۔

چھیدتی سب کے دل کوں جیوں بادام
کرتی تجھ پلک کام سوزن کا

فن بلاغت کے مسلمات سے ہے کہ تشبیہ مرکب تشبیہ مفرد سے زیادہ پر لطف ہوتی ہے۔ اور اگر وجہ شبہ میں حرکت شامل ہو تو تشبیہ کا لطف اور بڑھ جاتا ہے۔ ان دونوں باتوں کو نظر میں رکھیے اور ایک نادر تشبیہ ملاحظہ کیجئے۔ دریا کے کنارے میلہ لگا ہوا ہے۔ سفید چمکتی ہوئی ریت پر حسین عورتیں رنگ رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ادھر سے ادھر آجا رہی ہیں۔ فائز اس متحرک منظر کو تشبیہ دیتے ہیں ایک چاندی کی تھالی سے جس پر مختلف رنگوں کے جواہرات ڈھلک رہے ہیں۔ کہتے ہیں۔

ندی پر نمایاں ہیں سیمیں بدن   جیوں روپے کی تھالی ہیں ڈھلتے رتن

یہ سب تو حسی تشبیہوں کی مثالیں تھیں - اب ایک عقلی یا تخیلی تشبیہہ بھی دیکھئے -

اوڑھنی اودی پہ کناری زرد   گرد شب کے سورج کی دھاری ہے

فائز ہندوؤں کے مذہبی عقیدوں اور معاشرتی طریقوں کی طرف اکثر اشارہ کرتے ہیں - مثلاً بالوں کی لٹوں کو سہس ناگنی' جوڑے کو کنہیا کا گیند' خوبصورت عورت کو اندر کی اپسرا' حسینوں کے مجمع کو اندر کی سبھا' شب ہجر کے ایک پل کو برہما کی گھڑی قرار دیتے ہیں - ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں -

جوڑا نہیں گیند ہے کنہیا کی   یا سہس ناگنی ہے دریا کی
ہر ایک پنہاروں اک اپچھراتی   کنوئیں کے گرد اندر کی سبھاتی
دلفریبی کی ادا اس کی انوپ   روپ میں تھی رادھکا سوں بھی سروپ
ہے اندر کی ما نو سبھا جلوہ گر   کہ ہر نار دستی ہے رمبھا سوں دُر

اے جان شب ہجراں تری سخت بڑی ہے
ہر پل مگر اس تن کی برہما کی گھڑی ہے

اسی طرح رام رام کرنا' نمو نراین کہنا' تپ یا تپسیا کرنا وغیرہ یہ چیزیں بھی فائز کے یہاں نظر آتی ہیں - مثلاً

خوبرو آشنا ہیں فائز کے   مل سبھی رام رام کرتے ہیں
جب کرے تپ سورج کی ٹھاڑی رہ   چرخ نہوڑے نمو نراین کہہ
رہ کھڑا ایک پاؤں پر بگلا   ہے تپسی وہ بحر جوبن کا

فائز کے یہاں مسلسل نظمیں بھی ہیں اور مقدار میں غزلوں سے بہت زیادہ ہیں - ان کے عنوان مختلف ہیں مثلاً تعریف پنگھٹ وصف بھنگیڑن' تعریف جوگن' بیان میلہ بہتا' تعریف تہاں تکمبود مگر فائز کی غزلوں کی طرح ان سب میں بھی زیادہ تر حسن اور اس کے تاثرات کا بیان ہے - صرف دو نظمیں ایسی ہیں جن کے موضوع دوسرے ہیں - یعنی ایک مناجات ہے ایک منقبت - یہ سب نظمیں مثنوی کی شکل کی ہیں - صرف دو نظمیں ایسی ہیں جن کی شکل دوسری ہے یعنی ایک مخمس ہے اور ایک بحر طویل - یہ مسلسل نظمیں ثابت کرتی ہیں کہ جس طرح ہماری موجودہ معلومات کی بنا پر فائز دہلی کے پہلے اردو غزل گو قرار پاتے ہیں اسی طرح وہ دہلی کے پہلے اردو نظم گو بھی ٹھہرتے ہیں -

فائز ولی دکنی کے ہم عصر تھے - ان کے اردو دیوان کے موجودہ نسخے میں صرف تینتیس[۳۲] غزلیں ہیں اور ان میں انیس غزلیں ایسی زمینوں میں ہیں جو ولی کے دیوان میں بھی موجود ہیں - اس حد کی مطابقت کو صرف اتفاقی بات سمجھنا مشکل ہے - ولی کا دیوان بقول حاتم جلوس محمد شاہ کے دوسرے سال دہلی میں آیا اور فائز کا کلیات اس سے چند سال پیشتر فرخ سیر کے عہد میں مرتب ہو چکا تھا - اس سے بادی النظر میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ولی نے فائز کی غزلوں پر غزلیں کہیں - مگر امکان اس کا بھی ہے کہ ولی کے دیوان سے پہلے اُن کی غزلیں دہلی پہنچنے لگی ہوں اور فائز نے ان کے جواب میں غزلیں کہی ہوں - بہرحال سردست یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ہم طرح غزلوں میں تقدم کا شرف کس کو حاصل ہے - یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے بعض غزلیں فائز نے پہلے کہی ہوں اور بعض ولی نے - ہمارے ادب کی تاریخ میں یہ مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے - امید ہے کہ ادبی تحقیق کرنے والے اس کو حل کرنے کی کوشش کریں گے - ذیل میں فائز اور ولی کی چند ہم طرح غزلیں درج کی جاتی ہیں -

فائز

خوباں کے بیچ جانا ممتاز ہے سراپا   اندازِ دلبری میں اعجاز ہے سراپا
پل پل پلک کے دیکھے ٹوک ڈگ چلے لٹک کر   وہ شوخ چھل چھبیلا طناز ہے سراپا
ترچھی نگاہ کرنا' کترا کے بات سننا   مجلس میں عاشقوں کی انداز ہے سراپا
نینوں میں اس کے جادو لفاں میں اس کی بجا   دل کے شکار میں وہ شہباز ہے سراپا
غمزہ' نگہ' تغافل' انکھیاں سیاہ چنچل   یارب نظر نہ لاگے انداز ہے سراپا

ولی

وہ نازنیں ادا میں اعجاز ہے سراپا   خوبی میں گل رخاں سوں ممتاز ہے سراپا
اے شوخ تجھ نین میں دیکھا نگاہ کر کر   عاشق کے مارنے کا انداز ہے سراپا
جگ کے ادا شناساں جن کی ہے فکر عالی   تجھ قد کوں دیکھ بولے یو ناز ہے سراپا
کیا ہو سکیں جگت کے دلبر ترے برابر   تو حسن ہور ادا میں اعجاز ہے سراپا
گاہے اے عیسوی دم یک بات لطف سوں کر   جاں بخش مجھ کوں تیری آواز ہے سراپا

مجھ پر ولی ہمیشہ دلدار مہرباں ہے
ہر چند حسب ظاہر طناز ہے سراپا

فائز

تری گالی مجھ دل کوں پیاری لگے   دعا میری تجھ من میں بھاری لگے

تری قدر عاشق کی بوجھے سجن — کسی سات اگر تجھ کوں یاری لگے
بھلا دیوے وو عیش و آرام سب — جسے زلف سیں بے قراری لگے
نہیں تجھ سا او شوخ اے من ہرن — تری بات دل کوں نیاری لگے
بھنواں تیری شمشیر و زلفاں کمند — پلک تیری جیسے کٹاری لگے
ہووے مرد بازار دامن کا دیکھ — اگر گرد دامن کناری لگے
نہ جانوں تو ساقی تھا کس بزم کا — نین تیرے مجھ کوں خماری لگے

وہی قدر فائز کی جانے بہت
جسے عشق کا زخم کاری لگے

ولی

جسے عشق کا تیر کاری لگے — اسے زندگی جگ میں بھاری لگے
نہ چھوڑے محبت دم مرگ تک — جسے یار جانی سوں یاری لگے
نہ ہووے اسے جگ میں ہرگز قرار — جسے عشق کی بے قراری لگے
ہر اک وقت مجھ عاشق زار کوں — پیارے تری بات پیاری لگے

ولی کوں کہے تو اگر یک بچن
رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

فائز

دھوپ سا یو کپول ناری ہے — کرن سورج کی وو کناری ہے
چھپ رقیباں سوں آ نا نہیں تجھ چاند — کیا رین ہجر کی اندھیاری ہے
نہیں اثر کرتا صبر کا مرہم — دلِ عاشق میں زخم کاری ہے
گل باغِ جنوں ہے رسوائی — عزت ملکِ عشق خواری ہے
خون دل بادہ و جگر ہے کباب — نغمۂ بزم وصل زاری ہے
لیلیٰ مجنوں کا ذکر سرد ہوا — اب تماری ہماری باری ہے
ملنا عاشق سوں ہے بھلے سوں — یہ نصیحت تمن ہماری ہے
مجھکوں مت جانو یاد سوں غافل — رات دن دل کوں تو تماری ہے

دل بندھا سخت تیری زلفاں پر
عقل فائز کی ان بساری ہے

ولی

دل کوں تجھ باج بے قراری ہے — چشم کا کام اشک باری ہے
شب فرقت میں مونس و ہمدم — بے قراری و آہ و زاری ہے

اے عزیزاں مجھے نہیں برداشت — سنگ دل کا فراق بھاری ہے
فیض سوں تجھ فراق کے ساجن — چشم گریاں کا کام جاری ہے
فوقیت لے گیا ہوں بلبل سوں — گرچہ منصب میں وہ ہزاری ہے
عشق بازی کے حق میں قاتل — ہر نگہ خنجر و کٹاری ہے

آتشِ ہجر لالہ رو سوں ولیؔ
داغ سینے میں یادگاری ہے

فائز

جب سجیلے خرام کرتے ہیں — ہر طرف قتل عام کرتے ہیں
مکھ دکھا چھب بنا لباس سنوار — عاشقوں کو غلام کرتے ہیں
گردش چشم سوں سریجن سب — بزم میں کارِ جام کرتے ہیں
یہ نہیں نیک طور خوباں کے — آشنائی کو عام کرتے ہیں
مرغِ دل کے شکار کرنے کوں — زلف و کاکل کو دام کرتے ہیں
شوخ میرا بتاں میں جب جاوے — اس کو اپنا امام کرتے ہیں

خوب رو آشنا ہیں فائز کے
مل سبھی رام رام کرتے ہیں

ولی

خوب رو خوب کام کرتے ہیں — یک نگہ میں غلام کرتے ہیں
دیکھ خوباں کو وقت ملنے کے — کس ادا سوں سلام کرتے ہیں
کیا وفادار ہیں کہ ملنے میں — دل سوں سب رام رام کرتے ہیں
کم نگاہی سے دیکھتے ہیں ولے — کام اپنا تمام کرتے ہیں
کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کوں — صبح عاشق کو شام کرتے ہیں
صاحب لفظ اس کوں کہہ سکئے — جس سوں خوباں کلام کرتے ہیں

دل لے جاتے ہیں اے ولیؔ میرا
سرو قد جب خرام کرتے ہیں

فائز اور ولیؔ کی غزلوں کا مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزل گوئی میں فائز کا مرتبہ ولی سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ فائز کے اردو کلام میں نظموں کی تعداد غزلوں سے زیادہ ہے اور نظمیں زیادہ تر مثنوی کی شکل کی ہیں۔ نمونے کے طور پر ان کی ایک نظم ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

تعریف جوگن

حسن کا کل کیا بنارس سیر — ماہ رویاں کا ایک دیکھا دیر
آئی مجھ چک دِسی میں اک جوگن — مت میں مجھ کھٹ کی ہی لبا جوبن
وہ چہ جوگن ہزار چھند بھری — جوڑے میں باندھے اس کے دیو پری
بیٹھی تھی مرگ چھالے کے اوپر — مرزخاں بیچ اسے نہ تھا ہمسر
کم ہے اس مکھ سوں جوت چندر کی — چیری اس اچھرا ہے اندر کی
جوڑا بالوں کا باندھ کر جوگن — بیٹھی تھی کنڈلی مار اک ناگن
جوڑا نہیں گیند ہے کنھیا کی — یا سہس ناگنی ہے دریا کی
سرو تھا دلبری و قامت کا — بن میں جوگی ہے کہک اس گت کا
تن چڑھا راکھ گل میں سٹ سیلی — قمری اس سرو کی ہے اک چیلی
مور اس داغ کا پہن کنٹھا — نٹوا اس بزم کا ہے کنوٹا
کوئل اس عشق کا بیچ لے براگ — کوک سنگی بجا کے گاتی راگ
وہ کھڑا ایک پاؤں پر بگلا — ہے تپسی دو بحر جوبن کا

مرگ سی چک سوں کھینچ ہرن کی کھال — پگ تلیں بیٹھی مرگ چھالا ڈال
نہیں چھپا تن بھبھوت میں سارا — راکھ میں حسن کا ہے انگارا
جب کرے تپ سورج کی ٹھاڈی رہ — چرخ نہوڑے "نمو نراشن" کہہ
نہ پری تھی نہ حور وہ جوگن — راکھ میں ایک شعلۂ جوبن
کرتی تالاب میں وہ جب اشنان — سب کنول ہوتے نرگس حیران
اس کوں دل دیکھ ہوا ہے براگی — اس میں سیماب سی ہے بے تابی

برق جانسوز ہے وہ چنچل نار

وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارِ

فائز شمالی ہند میں اردو کے پہلے باقاعدہ غزل گو اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔ مخصوص موضوعوں پر مسلسل نظمیں کہنے میں بھی اُن کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ قدامت کے علاوہ ان کی شاعری اپنی خصوصیتوں کی بنا پر بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ان وجوہ سے اردو ادب کے آئندہ مؤرخ فائز کو نظر انداز نہ کرسکیں گے۔

فضا ابن فیضی

برسات آئی

رُو پہ پھر مستیٔ ہنگامۂ جذبات آئی — جوش میں سرخوشیٔ بادہ لذات آئی
نکہتِ طرّۂ رُبیلائے خرابات آئی — پھر وُہی رُت وہی فصل طرب اتفاقا آئی

بادہ کش! ہوش میں آ دیکھ وہ برسات آئی

بادۂ ناب کے پینے کا زمانہ آیا — دلِ صد چاک کے سینے کا زمانہ آیا
مرنے والے ترے جینے کا زمانہ آیا — کھول آنکھیں تو ذرا فصلِ خوش اوقات آئی

بادہ کش! ہوش میں آ دیکھ وہ برسات آئی

ہوئے بادہ میں بسے رہنے کے دن ہیں میکش — میکدے ہی میں پڑے رہنے کے دن ہیں میکش
یہ بھلا گھر میں ترے رہنے کے دن ہیں میکش — روزِ عید آیا، شبِ قدرِ خرابات آئی

بادہ کش! ہوش میں آ دیکھ وہ برسات آئی

آج پانی کو میسّر ہے گلابی ہونا — آج انساں کو مبارک ہے شرابی ہونا
بندۂ گیسو و رخسارِ شہابی ہونا — حاصلِ عمر گرانمایہ تھی جو رات آئی

بادہ کش! ہوش میں آ دیکھ وہ برسات آئی

صاحبِ طلعتِ گیسو ہے بہ آغوش نہ پُوچھ — ایک خوش وضع و سیہ مُو ہے بہ آغوش نہ پُوچھ
دلبرِ غیرتِ آہو ہے بہ آغوش نہ پُوچھ — لذتِ سرخوشیٔ عہدِ ملاقات آئی

بادہ کش! ہوش میں آ دیکھ وہ برسات آئی

سبزے پر اوس ہے، اور اوس پہ مہتاب کی ضو — پھول کا حُسن، شرارے کی چمک، برق کی رَو
شورِ نوشیدنِ مے از لبِ ساغر بشنو — صوتِ مرغِ چمن آیت و نغمات آئی

بادہ کش! ہوش میں آ دیکھ وہ برسات آئی

سبزہ و آبِ رواں و شبِ ماہ و لبِ جو — ابرِ گل ریز بہ باغ و مئے کہنہ بہ سبو
دلبرِ مہ صفت و شاہدِ مشکیں گیسو — اے خوشا! دولتِ بیدار ترے ہات آئی

بادہ کش! ہوش میں آ دیکھ وہ برسات آئی

شمیم کرہانی

مذاق

مرے جوان ساتھیو! ہنسو بجاؤ تالیاں
ہنسو ہر ایک دل ہے منتظر ہنسی کے واسطے
کہ غم کی زندگی ترس گئی خوشی کے واسطے
مری طرف سے مسکراتی چوٹوں کو پھیر لو
کہ میری زندگی تو جیسے ڈبڈبائی آنکھ ہے
زمانہ ہے سیاہ میری آبگوں نگاہ میں
تمہیں ہنسی کے دیپ رکھ دو آنسوؤں کی راہ میں
سمیٹ کر سیاہیاں، بکھیر دو اجالیاں
ہنسو بجاؤ تالیاں

مرے جوان ساتھیو!

ہنسو کہ اشک و آہ میں یہاں کسے تمیز ہے
ہنسو کہ آج زندگی ہی اک ہنسی کی چیز ہے
فضا میں آبدیدہ آتمائیں کانپتی ہوئی
اتھاہ تیرگی کی وسعتوں کو ناپتی ہوئی
کسی کرن کی آس میں لپکتی ہانپتی ہوئی
سیاہیوں سے ادھ کھلے بدن کو ڈھانپتی ہوئی
سناؤ ایسی زندگی کو بے شمار گالیاں
ہنسو بجاؤ تالیاں

مرے جوان ساتھیو!

ہنسو جوان عہد کی جوان بیٹیو! ہنسو
چمن میں تم کھلی ہو مسکراہٹوں کے واسطے
مگر تمہاری انکھڑیوں میں سرخ سی نمی ہے کیوں
گلاب کے سے عارضوں پہ گرد سی جمی ہے کیوں
تمہارے دل بھی سنگباریوں سے پاش پاش ہیں
تمہارے جسم بھی ہماری طرح زندہ لاش ہیں
مگر ہنسو کہ تم پہ کل ہنسیں گی ہنسنے والیاں
ہنسو، بجاؤ تالیاں

مرے جوان ساتھیو!

ہنسو ہنسو کہ بے چراغ زندگی کا طاق ہے
ہنسو کہ اس نظام کی ہر ایک شے مذاق ہے
مگر تمہارے قہقہے، تمہاری گنگناہٹیں
کھنڈر میں جیسے ٹوٹے برتنوں کی کھن کھناہٹیں
ہنسو تو اس طرح ہنسو کہ آسماں دہل پڑے
گھٹاؤں کی سیاہیوں سے روشنی ابل پڑے
چھلک پڑیں زمیں پر نئی سحر کی لالیاں
ہنسو بجاؤ تالیاں

مرے جوان ساتھیو!

بلونت سنگھ

فلمی انٹرویو

(ایک المیہ)

مَیں وہ سہانی شام کبھی نہیں بھول سکوں گا جب سرتاج ہوٹل کی خوابناک فضا میں چائے پارٹی کے بعد ہم سینما کے چند مشتاقوں کی بعض فلمی گتھیوں کو سُلجھانے کے لئے بمبئی کے مشہور عالم (جنتری نہیں) ہستی، یعنی پروڈیوسر ڈائریکٹر جناب ل۔ب گگل، یا شاید گگلت یا غالباً گرگٹ نے ایک دل دہلا دینے والا مگر دلچسپ انٹرویو دیا تھا ——— سردست میں انھیں ل۔ب گرگٹ کے نام ہی سے یاد فرماؤں گا ——— جی تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ انٹرویو کی شام کبھی نہیں بھول سکتا...... یہ کوئی رسمی بات نہیں ہے فی الحقیقت متعدد شعوری، لاشعوری بلکہ بدشعوری کوششوں کے باوجود وہ شام میرے ذہن سے محو نہیں ہو سکی

اس روز یہ پہلے ہی سے طے ہو چکا تھا کہ گرگٹ صاحب اپنی اعزازی پارٹی کے بعد فلم کے شیدائیوں کے انٹ شنٹ سوالوں کے برجستہ بلکہ ہو سکا تو مُنہ توڑ جوابات عنایت فرمائیں گے۔

جناب ل۔ب گرگٹ بوڑھے نہ جوان، موٹے نہ پتلے، لمبے ڈھینگے قسم کے انسان...... ہاں ہاں انسان ہی تو تھے۔ چہرے کے خدوخال یعنی پیشانی، ناک، ہونٹ، کان وغیرہ بھی چھوٹے نہ بڑے، البتہ مونچھیں ضرورت سے زیادہ لمبی تھیں، معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے یہ حرکت سراسر شرارتاً کی تھی ورنہ ایک شریف انسان کے لئے چھوٹی چھوٹی مونچھیں بھی کافی ہیں۔ صورت کا بھی کچھ یہی حال تھا یعنی صورت سے نہ شرافت کا اظہار ہوتا تھا اور نہ ذہانت کا سیگرٹ بیڑی وغیرہ جلانے کے بعد حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا:۔ جناب کوئی اور بات کرنے سے پہلے میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں، کیا اجازت ہے؟

مسٹر گرگٹ، نہیں۔

اس پر سب لوگ ہکا بکا رہ گئے۔

ل۔ب گرگٹ جی کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پیدا ہوئی جو پھر معدوم نہیں ہو سکی۔ بولے :۔ "آہا کیا میں نے غلط کہا؟ کیا مجھے اثبات میں جواب دینا چاہیئے تھا۔ اچھا تو میں 'ہاں' کہتا ہوں۔

حاضرین کی جان میں جان آئی۔

گرگٹ جی بولے:۔ اسے 'سائی کولوجی' کہتے ہیں میں نے ان صاحب کا سوال سُنے بغیر آپ کے چہروں کی کیفیت سے بھانپ لیا کہ میں نے غلط جواب دے دیا ہے۔ یاد رکھیئے اس چیز کی فلم میں خاص ضرورت پڑتی ہے

پہلے شخص نے پھر کہنا شروع کیا:۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کے نام میں گرگٹ (گگل یا گگلت) سے پہلے دو حروف ل۔ب کا کیا مطلب ہے؟

گرگٹ جی "آپ دونوں حروف کی بابت الگ الگ دریافت کیجئے"

"بہتر ——— تو 'ل' سے کیا مراد ہے"

جواب "لل"

سوال "اور ب کا مطلب"؟

جواب۔ "ببکڑ"

سوال۔ یعنی لال ٹپ ٹپ......؟

گرگٹ جی۔ بس بس، یہیں پر ختم کر دیجئے اپنا فقرہ ـــ تھینک یو

دوسرے صاحب۔ کیوں جی فلم میں پہلی چیز کہانی ہے نا جس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

شری گرگٹ جی نہیں یہ آخری چیز ہے اس کا خیال رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

تیسرے صاحب۔ فلمی کہانی بنائی کیسے جاتی ہے؟

شری گرگٹ (تامل کے بعد) دیکھئے آپ نے بڑا گہرا سوال کر دیا ہے.. اصل بات یہ ہے کہ فلمی کہانی بنائی نہیں بگاڑی جاتی ہے

چوتھے صاحب..... وہ کیسے؟ کہانی تو اس فن کے ماہرین ہی لکھتے ہوں گے اسے بگاڑنے کی ضرورت؟

شری گرگٹ۔ جس طرح زلف برہم ہی میں عاشق کا دل اٹکتا ہے اسی طرح فلمی کہانی بگاڑنے ہی سے سنورتی ہے۔

تیسرے صاحب۔ اچھا تو اس کام کے لئے خاص ماہرین کی خدمات حاصل کرنی پڑتی ہوں گی۔

شری گرگٹ۔ اس سوال کے جواب کے لئے زیادہ وقت درکار ہے لیکن فی الحال یہ کہنا کافی ہوگا کہ اسٹوڈیو کے دربان سے لے کر سیٹھ جی تک سب اس فن میں استاد ہوتے ہیں تاہم یہ کام سیٹھ جی بذاتِ خود ہی کرتے ہیں۔

چوتھے صاحب۔ فلمی گیت کون لوگ لکھتے ہیں کسی اچھے شاعر کا نام تو میں نے سنا نہیں کبھی۔

شری گرگٹ۔ فلمی گیت 'ہماکوئی' لکھا کرتے ہیں۔

پانچویں صاحب (چند فلمی گیتوں کے بول گنگنا کر) اس قسم کے گیت لکھنے کے لئے اچھی خاصی نا اہلیت کی ضرورت ہوتی ہوگی۔

شری گرگٹ (چہرے پر غور و تفکر کے آثار پیدا کر کے) جی نہیں زیادہ اہلیت کی ضرورت بھی نہیں ہے، بس ذرا انسان کا ہتھ چھٹ ہونا ضروری ہے پھر جہاں قلم پکڑا گیت گھسیٹ ڈالا۔ اس پر سب کو تعجب ہوا۔ چنانچہ سب کو ششدر و ششدر حیران پاکر شری گرگٹ نے ارشاد کیا: ـ دیکھئے یہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمائیے میں نے تازہ فلم کے لئے بزعم خود ـــ میرا مطلب ہے بقلم خود ایک گیت لکھا ہے چند

بول سنئے:-

ہیرو — آؤری سجنی (منتظر نے)
— میٹھوری سجنی
— سوچی ری سجنی
چار دن کی چاندنی (الاپ نے)
پھر یہ بے رُخی کیسی؟ (لفظ کیسی کو خوب لٹکا کر گایا جائے گا)

ہیرو کی زبانی دوسرا بول سنئے:-

تم بھی راضی
ہم بھی راضی
کرے کیا قاضی
اب بتلاؤ سجنی
پھر یہ بے رخی کیسی؟ (لَے حسبِ سابق)

اب اسی چیز کو ڈوئیٹ یعنی دوگانا بھی بنایا جا سکتا ہے مثلاً ہیروئن ہیرو کو پرے دھکیل کر کہے۔

تم ہو کالے
لالے کے لالے
بھینسے کے بھینسے
پھر سوچو ساجن
تمری ہمری پیت کیسی

حاضرین۔ (دانت دکھا کر) واہ وا واہ وا

شری گرگٹ (آنکھیں دکھا کر) دوستو! آج کل ہماری مشکلات بہت بڑھ گئی ہیں۔ پہلے زمانے میں ہیرو ہیروئن کو دیکھتے ہی دھڑام سے فرش پر گر پڑتا تھا لیکن اب جذبۂ عشق میں وہ شدت نہیں رہی۔ البتہ ہیرو پہلی ملاقات میں ہیرو ہیروئن کے چہرے پر نظریں گاڑ کر بغیر آنکھیں جھپکائے اسے گھور گھور کر دیکھتا رہتا ہے۔ گھریلو قسم کی شرمیلی ہیروئن مارے حیا کے زمین میں گڑ جاتی ہے۔ اسی اثنا میں آرکسٹرا بجنے لگتا ہے۔ ہیروئن کے شیریں لب ہلتے ہیں اور وہ تیز و بلند آواز میں یوں گاتی ہے۔

ٹمک ٹک دیکھتے ہو (یہاں وہ قدرے تامل کرتی ہے لیکن آرکسٹرا بجتا رہتا ہے)

ٹک دیکھتے ہو

ضرور کوئی بات ہے (اس مصرعے سے جس بھولپن کا اظہار ہوتا ہے وہ قابلِ دید بھی ہے اور قابلِ داد بھی)

(مکرر) ٹمک ٹک دیکھتے ہو

ضرور کوئی بات ہے

(اب سوال کرتی ہے)

آخر کیا بات ہے؟

آخر کیا بات ہے؟

اس کے بعد ہیروئن تیز طرار ہرنی کے مانند اُچھل کر خس و خاشاک کی طرح گردابِ رقص میں کھو جاتی ہے اور فضا میں 'ضرور کوئی بات ہے' اور 'آخر کیا بات ہے' کے بول گونجنے لگتے ہیں۔

چھٹا ہوا شخص (ہوا حذف کر کے پڑھئے) ایک بات اور یاد آ گئی۔ ابھی ابھی آپ نے گیت کے بول سنائے تھے۔ "بھینے کے بھینے" وغیرہ۔ آخر ہمارے ہیرو اس قدر موٹے، بھدّے اور ہٹے کٹے کیوں ہوتے ہیں؟

شری گرگٹ۔ ان میں وٹامنز زیادہ ہوتے ہیں

سوال۔ پھر انھیں ہیرو کے پارٹ کے لئے کیوں چُنا جاتا ہے؟

شری گرگٹ۔ عاشق کو مضبوط اور طاقت ور ہی ہونا چاہئے۔ یہ کام کسی کمزور انسان کے بس کی بات نہیں۔ ایک مثال یاد آ گئی۔ مشہور عاشق رانجھا سادھو کے بھیس میں اپنی شادی شدہ محبوبہ ہیر سیال کے سسرال میں بظاہر خیرات لیکن بباطن اس کے درشن کرنے کے لئے اس کے گھر پہنچا ہے تو محبوبہ کی نند سہتی اُس سے کہتی ہے:

ہاتھی وانگ ٹنگاں تیرا ڈھڈ کُپّا (سید وارث علی شاہ)

یعنی تیری ٹانگیں ہاتھی کے مانند اور پیٹ کُپّے کی طرح ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے عاشق ڈنڈ پیل کر اور سے جوان ہوتے تھے۔

سامعین حضرات! بات یہ ہے صاحب کہ ہم سب فلمی دُنیا سے قطعاً ناواقف ہیں اس لئے فلمی باریکیاں ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہمیں موٹی چیزوں مثلاً کہانی، پلاٹ، گیت، موسیقی وغیرہ کی بابت سرسری اور غیر فنی معلومات بہم پہنچایئے۔

شری گرگٹ۔ فنی تو میری گھٹی میں پڑ چکا ہے، بہرکیف میں کوشش کروں گا کہ غیر فنی انداز میں فنی چیزیں بتا سکوں۔ کہانی کی بابت گفتگو ہو چکی ہے، آپ یہ بات یاد رکھئے کہ ہر فلم کا پلاٹ بنیادی طور پر ایک ہی ہوتا ہے اور اگر "کہانی نویس" ادھر اُدھر بھٹک بھی جائے تو پھر سیٹھ صاحب بنفسِ نفیس اس پر نظرثانی کر کے اسے راہِ راست پر لے آتے ہیں۔ گیتوں کے مواقع بھی یکسر ملتے جلتے ہوتے ہیں اس لئے اُنھیں بھی اسی انداز سے لکھا جاتا ہے۔ مثلاً ایک گیت وہ ہوتا ہے جو ہیروئن فلم کے آغاز میں گلستان، ہندوستان، پاکستان، ریگستان، نخلستان یا قبرستان وغیرہ میں ناچ ناچ اور کود کود کر گاتی ہے مثلاً

خرمستی کے دن آئے ری سجنی!

بعد میں اُس کی سکھیاں مل جل کر آس دیتی ہیں ― ہاں خرمستی کے دو تین داورے ہوتے ہیں یعنی ناچ اور گانا مثلاً گھنگھروؤں کی چھم چھم کے ساتھ ؎

اُوئی رے

ہائے رے

نہیاں مرو د گیو رے

چوڑیاں تڑو د گیو رے

سکھیاں پُرمعنی نثر میں پوچھتی ہیں:― اری کون؟

(رقاصہ اس بات کا صاف صاف جواب دینے سے شرماتی ہے البتہ کولھے مٹکا مٹکا کر کہتی ہے

اُوئی رے

ہائے رے

تیسری قسم کے گانے المیہ ہوتے ہیں۔ ہیرو فلم کی طوالت اور ہیروئن کے گانوں سے پریشان ہو کر غائب ہو جاتا ہے، ہیروئن اس کا ہومیوپیتھک یعنی علاج بالمثل کرتی ہے۔ زیادہ واضح لفظوں میں وہ المیہ گیت گاتی ہے، کیوں کہ اس اصول کے تحت گانے کا مارا ہوا گانے ہی سے بچ سکتا ہے۔ مثلاً

بادل آئے ― تم نہیں آئے

جیا اڑ جائے — تم نہیں آئے
گھاس بڑھ جائے — تم نہیں آئے
مینڈک ٹرّائے — تم نہیں آئے

اس گیت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یا تو ہیرو اور بھی دور چلا جاتا ہے یعنی مر جاتا ہے یا اسے واپس آنا پڑتا ہے

سب لوگ۔ آپ دھنیا ہیں مہاراج آپ دھنیا ہیں

شری گرگٹ۔ آداب عرض کرتا ہوں۔

آٹھواں شخص۔ (مؤدبانہ) اب موسیقی کی بابت زبان دراز کیجئے۔

شری گرگٹ (برجستہ) لیجئے

حاضرین ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں

شری گرگٹ۔ آپ میں سے بہت کم حضرات فلمی موسیقی کی فنی نزاکتوں کو سمجھ سکتے ہیں لیکن چونکہ آپ فنی باریکیوں میں نہیں پڑنا چاہتے اس لئے میں سرسری باتیں شدید اختصار کے ساتھ بیان کروں گا۔

فلمی موسیقی کا کلاسیکی موسیقی سے کوئی تعلق نہیں ہے جتنی دیر میں استاد فیاض خاں یا کوئی اور استاد صاحب بمشکل ایک تان لے سکتے ہیں اتنی دیر میں فلمی گانا ختم ہو جاتا ہے۔ پہلے استاد لوگ موسم بہار کا منظر یوں کھینچتے تھے:۔

ہے سانوریا! پھولوں کی رُت آئی

لیکن یہ الفاظ پندرہ منٹ کے الاپ کے بعد ادا کرتے اور پھر انھیں الفاظ کو توڑتے، مروڑتے اور نچوڑتے اور پلٹ پلٹ کر اسی ایک بول پر ایسے شدید حملے کرتے کہ گانے اور سننے والے دونوں کی وحشت میں دم بدم اضافہ ہونے لگتا یہاں تک کہ یا تو سامعین جدھر اُن کے سینگ سماتے اُدھر اُٹھ بھاگتے یا پھر ریڈ کراس والے استاد جی کو عالم نزع میں لے کر چمپت ہو جاتے۔ آجکل یہ بات نہیں ہے۔ مثلاً کسی باغ کے گوشے میں سے دفعتاً چند لڑکیوں کی ٹولی نکلتی ہے اور ساتھ بڑی تیزی سے پکار اٹھتی ہے

آئی آئی

ایک اور ٹولی باغ کے دوسرے گوشے سے نکل آتی ہے اور اس بول کو یوں پورا کرتی ہے

آئی بہار آئی

اب ملاحظہ فرمائیے کہ اس بول کے کل پانچ الفاظ میں آئی چار عدد اور بہار فقط ایک عدد یہ فن اس درجۂ کمال تک پہنچ گیا کہ اب بڑی آسانی سے فلمی گیتوں کے مجرب نسخے تیار کئے جا سکتے ہیں مثلاً

ھو الشافی

عنوان:۔ ایک بہاریہ گیت

گت:۔ ' دُر گت

لفظ آئی:۔ بیس یا بیسوں عدد

لفظ بہار:۔ بوقت یا بشرط ضرورت

لفظ جیا:۔ چار عدد ' لفظ پیا (برا)۔ آٹھ عدد

علاوہ ازیں قسم قسم کا پوّرن سوراج۔ اگر لفظ 'ہائے' کا عام استعمال کریں تو سونے پر سہاگے والی مثل صادق آئے۔ ان سب اشیا کو کوٹ چھان کر چہار مغز شربت روح آرکسٹرا (روح افزا نہیں) میں گھول کر مریضوں کے کانوں میں ٹپکائیں۔ انشا اللہ روح قفسِ عنصری سے بالا بالا رہے گی۔

حاضرین (سر پیٹ کر) آپ پھر فنی باریکیوں میں پڑ گئے

شری گرگٹ (دانت پیس کر) آئی ایم سوری

حاضرین:۔ بیان جاری رہے

شری گرگٹ۔ جی۔ آرکسٹرا میں بڑی خوبیاں ہیں۔ اس سے 'مہاکوی' کو بڑی مدد ملتی ہے جس جگہ 'مہاکوی' کا قلم لاچار ہو کر رہ جاتا ہے وہاں آرکسٹرا آڑے آتا ہے اور پھر 'مہاکوی' جو منہ میں آئے سو کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں مثلاً مندرجہ ذیل بول ملاحظہ فرمائیے جو آرکسٹرا کی مدد سے لفظ 'ہو' پر کس خوبی سے ختم کر دیا گیا ہے

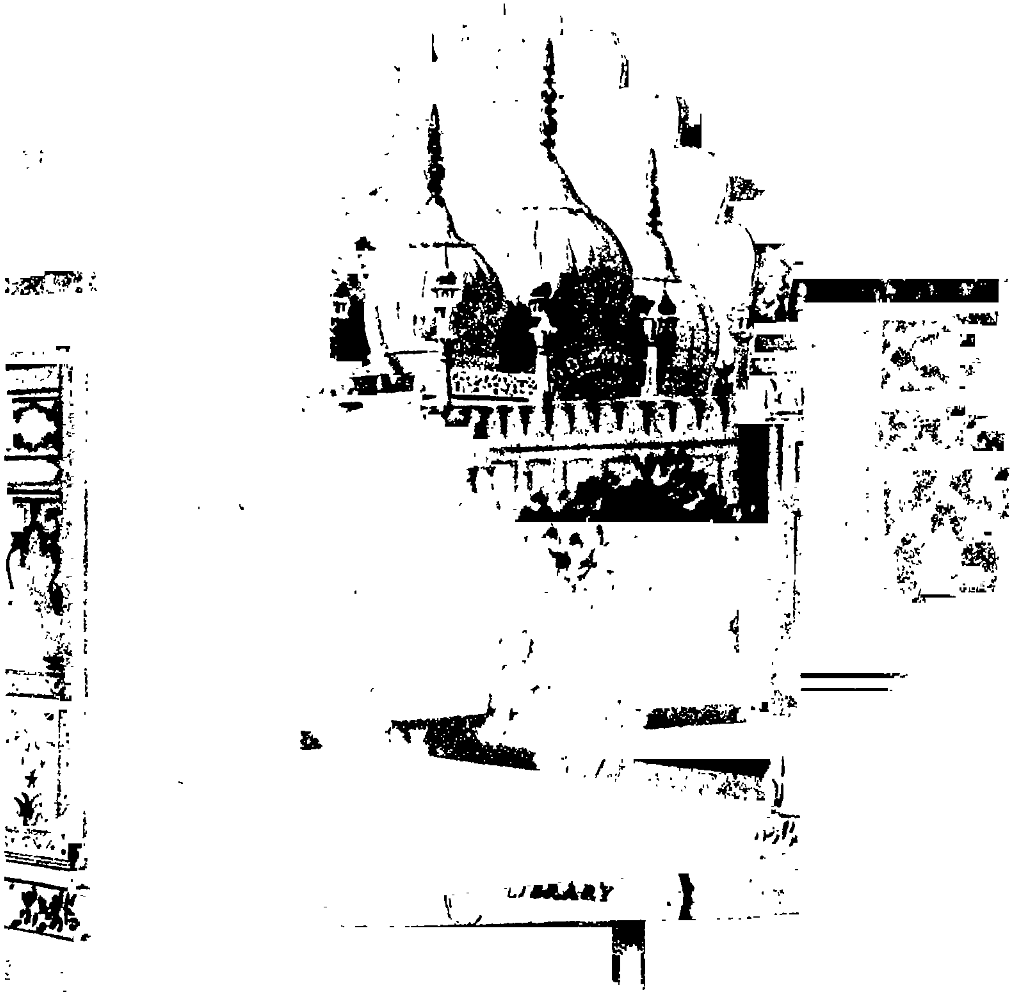
جوہڑ کا کنارا ہو
آکاش تارا تارا ہو
سماں پیارا پیارا ہو
(آخری مصرعے کی جدت ملاحظہ ہو) ہو ہو، ہو ہو، ہو

اسی سے ملتی جلتی ایک اور مثال:۔

جیا مورا ڈولے
نیا پیرا تولے
پپیہا را بولے

پی۔ پی۔ پی

چنانچہ اس طرح سراج ہوٹل کی خوابناک فضا میں جب گرگٹ صاحب کا انٹرویو ختم ہوا تو حاضرین میں بھگدڑ مچ گئی۔ سب لوگ بڑی سرعت اور تپاک سے رخصت ہوئے اور پھر انھوں نے اپنے اپنے گھر پر پہنچ کر ہی دم لیا۔


LIBRARY

عرش ملسیانی

تغزل

(۱)

اللہ کیا یہ جَور کے انداز ہو گئے
بزمِ عدو میں وُہ مرے دم ساز ہو گئے

خاموش لب بھی درد کے غمّاز ہو گئے
پردے یہ اور پردہ درِ راز ہو گئے

اظہارِ غم سے باز نہ آؤں تو کیا کروں
سب اہلِ بزم گوش بر آواز ہو گئے

ہر چند مصلحت نے کیا دِل پہ اِحتساب
جذبات پھر بھی زخمہ زنِ ساز ہو گئے

باقی رہی نہ جب کوئی اُلجھن خیال میں
ہم خود ہی ایک سلسلۂ راز ہو گئے

سمجھا تھا جن کو میں سر و سامانِ آشیاں
وُہ خار و خس بھی حائلِ پرواز ہو گئے

اِک ضربِ میرِ دل پہ بھی اے ذوقِ جستجو
اہلِ جہاں تو محوِ تگ و تاز ہو گئے

حُسنِ بیاں سے عرش مٹی اِنفرادیت
سب اہلِ بزم میرے ہم آواز ہو گئے

(۲)

تیرا کرم نہ ہو تو فغاں میں اثر کہاں
بے التفاتِ خاص غمِ معتبر کہاں

غربت کہاں، وطن کے وُہ شام و سحر کہاں
وُہ لُطفِ کوئے دوست وُہ دیوار و در کہاں

وُہ اہتمامِ راحتِ قلب و جگر کہاں
پہلی سی وُہ تمہاری کرم کی نظر کہاں

بے تابیاں بجا مرے ذوقِ سجود کی
لیکن اُس آستانے کے لائق وُہ سر کہاں

اُن کا کرم ہوا تو گئیں غم کی عشرتیں
اے دوست اب وہ لذّتِ آہِ سحر کہاں

ہم کو قفس سے حکمِ رہائی تو مل گیا
اُڑنے کے واسطے ہیں مگر بال و پر کہاں

رہبر تو کیا نشاں کسی رہزن کا بھی نہیں
گم گشتگی گئی ہے مجھے چھوڑ کر کہاں

چشمِ طلب کے واسطے آساں ہے سیرِ عرش
فرصت خیالِ دوست میں اتنی مگر کہاں

خواجہ احمد فاروقی

ذکرِ میر، خودنوشت کی حیثیت سے

انکشافِ ذات یا اظہارِ حال کا شوق، انسان کے خمیر میں داخل ہے اسی وجہ سے ادب کے وہ اصناف جن کے ذریعے سے ہم کسی شخصیت کے پورے خط و خال معلوم کرسکیں، ہمیشہ دلچسپی کا باعث بنے رہیں گے۔ خودنوشت کے ذریعے سے ہم مصنف کی روزمرہ کی زندگی، اس کے جذبات و احساسات، اس کے اعمال و اشغال کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ ہم دوسروں کی زندگی معلوم کرکے خاص طور پر دلچسپی محسوس کرتے ہیں۔ اس کی دراصل وجہ یہ ہے کہ ہم خود اپنی ذات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ دوسروں کی محبت و نفرت، ان کا رنج و غم، ان کی کامیابی و ناکامیابی ہمارے لئے کوئی غیر چیز نہیں ہے۔ انسانی فطرت تقریباً ہر جگہ ایک ہی سی ہے۔ اس آئینے میں ہمیں دوسروں کی صورت کے ساتھ اپنی صورت بھی نظر آتی ہے۔ اس لئے اچھی خودنوشت یا خودگزشت وہی سمجھی جائے گی جس میں زندہ شخصیت یا فردیت پورے طور پر جلوہ گر ہو۔

خودنوشت کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس سے ہم تاریخی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈائری، خودگزشت اور خطوط سے جتنے مستند تاریخی واقعات معلوم ہوسکتے ہیں، اتنے کسی دوسرے ذریعے سے معلوم نہیں ہو سکتے۔ انگلستان کے عہدِ اعادۂ شاہی کی تاریخ PEPYS اور اٹھارویں صدی کے فرانس کو ST. SIMON کی تحریروں کے بغیر سمجھنا تقریباً ناممکن ہے اسی طرح سلاطین ترکی اور شاہانِ صفویہ کے تعلقات منشآت السلاطین یا منشآت فریدوں کے بغیر واضح نہیں ہوسکتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ براؤن نے ان کو تاریخ ادبیات ایران میں بہت فراخ دلی سے استعمال کیا ہے[1] لیکن ان چیزوں سے اسی وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، جب مصنف کا مشاہدہ وسیع ہو، اس میں قوت نقد و تمیز موجود ہو اور ساتھ ہی ساتھ وہ بے لوث، غیر جانب دار اور بے تعصب ہو۔

نفسیاتی اعتبار سے بھی خودنوشت کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں جب ان کے مصنفین دوسروں کا ذکر کرتے ہیں تو خود ان کے خلوت کدۂ خاص کا حجاب بھی اٹھ جاتا ہے اور اس "حدیث دیگراں" سے "سِرِّ دلبراں" باسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ خوں گشتہ تمناؤں اور چھپی ہوئی آرزوؤں کا ذکر ان کے ذہن اور دماغ کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کر دیتا ہے اور اس طرح ان کے امیال و عواطف کے بہت سے سربستہ راز کھل جاتے ہیں میر خودپوشی اور خودنمائی کے درمیان برابر جھولتے رہتے ہیں۔ اس لئے محمد حسین، خان آرزو، میر جعفر عظیم آبادی، سعادت امروہوی، راجہ جگل کشور، راجہ ناگرمل اور نواب آصف الدولہ وغیرہ کے متعلق ان کے بیانات دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ دوسروں کی سیرت نگاری کی کوشش میں خود ان کی سیرت کے بھی بہت سے پہلو بے نقاب ہوگئے ہیں۔

خودنوشت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک داخلی یا نفسی، جس میں اشیاء یا خیالات اپنی اصلی صورت میں نہیں بلکہ مصنف کے نقطۂ نظر اور ذاتی رجحانات کے مطابق پیش کئے جاتے ہیں، دوسری قسم، خارجی یا معروضی ہے۔ جس میں حالات و واردات، واقعیت پسندانہ طور پر، جیسے کہ وہ فی الحقیقت ہیں، قلم بند کئے جاتے ہیں۔ میر کی خودنوشت میں یہ دونوں طرز شیر و شکر ہوگئے ہیں۔ بعض حصے البتہ معروضی ہیں۔

خودنوشت میں سب سے اہم چیز کردار نگاری ہے۔ وہ نہ تو اپنے

---

[1] تاریخ ادبیات ایران ج ۴ ص ۶۶-۶۷

پندارہی کا صنم کدہ ہو اور محض اپنے مخصوص فلسفے ہی کا تذکرہ اگر ایسا ہوا تو وہ خود نوشت تو ہوگی لیکن لطف سے محروم میر کی خود نوشت کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے کس خوبی کے ساتھ اس اعتدال و توازن کو برقرار رکھا ہے۔ شروع میں انھوں نے کچھ بہکی بہکی (؟) کے غیر معقول کارنامے بیان کئے ہیں۔ لیکن اُن کو صرف بیان کر دیا ہے ہمیں ماننے یا نہ ماننے پر مجبور نہیں کیا۔ دوسرے ان واقعات کو اس زمانے کے مخصوص معاشرتی حالات کی روشنی میں دیکھنا چاہئے جب ہماری زندگی کی تھکی اور سسکتی ہوئی قوتیں تصوف کے دامن میں پناہ لے رہی تھیں اور جس وقت خود روبہ انحطاط اور زوال پذیر تھا۔

ذکر میر میں شفیق بزرگوار کا انتقال، میر محمد علی کی وفات، آرزو کی بدسلوکی، میر کی مجنونانہ حالت، امیر خاں کی حویلی کا قیام، میر کی پریشان حالی روزگار کی نیرنگی، دُرّانیوں کی غارت گری، مرہٹوں کے پے بہ پے حملے ـــ یہ تمام واقعات ایسے ہیں۔ جو بڑے پُرسوز طریقے سے بیان کئے گئے ہیں۔ اور ہمارے دل میں ہمدردی کی ایک لہر پیدا کر دیتے ہیں۔ میر نے اپنی شخصیت کی تمام تہیں نہیں کھولی ہیں لیکن اس کم گوئی اور سرسری آشنائی کے باوجود اس سے میر کے رجحانات اور احساسات کا جتنا اندازہ ہوتا ہے، اتنا غالباً کسی اور تصنیف سے ممکن نہیں۔ انسان اپنے لئے خود ایک معمّہ ہے اُس کا پندار ذاتی گتھیوں کے سلجھانے میں معاون نہیں ہو سکتا اس لئے میر نے جتنا بھی اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے وہ کچھ کم قابل قدر نہیں ہے پھر اُس زمانے میں اصحاب درد و ذوق کا یہ شیوہ نہیں تھا کہ اپنے متعلق ہر بات لکھتے پھریں اور اپنی چھپی ڈھکی باتیں منظر عام پر لے آئیں، لیکن "سِرّ ایں شیشہ فرو بند" اور اخفائے حال کی کوشش کے باوجود ذکر میر میں کہیں کہیں یہ شراب تیز و تند صراحی سے باہر آ گئی ہے۔

میر اور خان آرزو کے تعلقات[1] تاریخ ادب کا ایک بڑا نزاعی مسئلہ ہے۔ اس خود نوشت سے ان پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس میں میر کی سیرت کے بعض ایسے پہلو نظر آ جاتے ہیں جو اب تک تاریکی میں تھے۔

باپ کے مرنے کے بعد میر کو تلاش معاش کی فکر ہوئی۔ شروع میں وہ اطراف اکبر آباد میں پھرتے رہے لیکن جب کوئی صورت کامیابی کی نظر نہیں آئی تو دلی کا رُخ کیا یہاں امیر الامرا صمصام الدولہ کے دربار میں رسائی ہو گئی اور انھوں نے میر کا روزینہ مقرر کر دیا۔ میر لکھتے ہیں۔

آں روزینہ را یافتم۔ نان و نمک می خوردم و بسری می بردم[2]

لیکن یہ آسائش دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ امیر الامرا نادرشاہ کے ہنگامۂ و آشوب میں مارے گئے اور میر پھر بیکار اور پریشان روزگار ہو گئے۔ اس لئے مجبوراً اکبر آباد آئے۔ لیکن وطن میں جو لوگ اُن کی خاکِ پا کو سُرمہ سمجھ کر آنکھوں میں لگاتے تھے۔ انھوں نے یک بارگی آنکھیں پھیر لیں[3] (ارباب وطن کی اس روش پر استغناقی معنی خیز ہے) ناچار میر دوبارہ دلی آئے اور سراج الدین علی خاں آرزو کے ساتھ رہنے لگے لیکن وہ بھی ان کے سوتیلے بھائی محمد حسین کے لکھنے پر کہ میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے۔ اُن کے درپئے آزار ہو گئے میر لکھتے ہیں۔

"آں عزیز دُنیا دار واقعی بود، نظر بر خصومت ہمشیر زادۂ خود بدمن اندیشید...... جمعی او اگر بہ تفصیل بیان کردہ آید، دفترے جداگانہ می باید۔ خاطر گرفتہ من گرفتہ تر شد سودا کردم۔ دل تنگم تنگ تر گردید، وحشتے پیدا کردم..... شائستہ کنارہ گیری شدم۔ زندانی و زنجیری شدم"[4]

حیرت ہے کہ خان آرزو، جن کا ذکر تمام تذکرہ نویسوں نے ادب کے ساتھ کیا ہے اور جن کے متعلق خود میر نے تذکرۂ نکات الشعرا میں "اُستاد و پیر و مرشد بندہ" لکھا ہے[5]، اس درجہ ظلم و ستم پر آمادہ ہو جائیں کہ میر کی حالت بالکل مجنونانہ ہو جائے اور وہ زندانی و زنجیری کر دیئے جائیں۔ میر نے بھی کوئی معقول سبب اس کشیدگی و دیوانگی کا ظاہر نہیں کیا ہے۔ یہ خاموشی بھی "معنیٰ دار" کے تحت آتی ہے۔

---

[1] نیز ملاحظہ ہو میر اور خان آرزو کے تعلقات (از خواجہ احمد فاروقی) مطبوعہ نگار لکھنؤ ستمبر ۱۹۴۸ء

[2] ذکر میر ص ۶۳۔ [3] ذکر میر ص ۶۳۔ [4] ذکر میر ۶۴ - ۶۵۔
[5] نکات ص ۴۔

تذکرۂ بہارِ بے خزاں میں لکھا ہے کہ میر ایک پری تمثال لڑکی سے جو ان کی قرابت دار تھیں، در پردہ عشق و تعلق خاطر رکھتے تھے "آخر عشق او خاصیتِ مشک پیدا کردہ، می خواست کہ ہمیہ بہ چہار سوئے رسوائی کشد حسن بے پردہ بہ جلوہ گری در آید" بہارِ بے خزاں کا لب و لہجہ میر کے ساتھ کافی دردمندانہ اور ہمدردانہ ہے۔ اس میں مجموعۂ نغز کی سی تلخی اور عصبیت نہیں ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس بیان کو صحیح نہ مانا جائے۔ پھر میر کے کلام کی اندرونی شہادت بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔

بہت ممکن ہے کہ خان آرزو کو اسی تعشق کی بناء پر آزردگی ہوئی ہو۔ بھائی نے اسی لئے میر کو "فتنۂ روزگار" لکھا ہو اور "خاطر گرفتہ من، گرفتہ تر شد، سوداکردم" کی وجہ یہی ہو اور اکبر آباد والوں کی یک لخت بے التفاتی اور بے رُخی کا بھی ایک سبب یہی ہو۔ اس زمانے میں جو بھی میر کے حال پر عنایت کرتا تھا وہ اسی رشتے سے کہ میر ایک بڑے صوفی صافی اور درویش دل ریش کے بیٹے تھے۔ سید مکمل خان، خواجہ باسط، امیر الامرا ان رئیسوں کے علاوہ معمولی آدمی بھی ان کی بزرگ زادگی کا بڑا پاس لحاظ کرتے تھے۔ اب جو محبت کے سارے چشمے ایک دم خشک ہو گئے۔ اس کا کوئی قوی سبب ہونا چاہئے۔ بہت ممکن ہے اس کا سبب وہی عشق کا واقعہ ہو جس نے اب خاصیتِ مشک اختیار کر لی تھی۔

میر تیس برس کے بعد پھر آگرہ گئے ہیں۔ اور چار مہینے رہے۔ اس وقت لوگوں نے یہ بے رُخی نہیں برتی۔ مانا کہ ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا لیکن ان پر قربان ہونے والوں میں شاعروں کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ انسانی حافظے یوں بھی بہت قوی نہیں ہے۔ بات رفت گزشت ہو گئی تھی۔ لوگ مر کھپ گئے تھے۔ اور آگرہ بھی وہ آگرہ نہیں رہا تھا۔ میر لکھتے ہیں:۔

"....مژگاں سیاہاں، خوش ترکیباں، جامہ زیباں، پاکیزہ طینتاں، موزوں طبیعتاں، مراثی گزاشتند و بعزت می داشتند، و سہ بار سراسر شہر رفتم، حکماء، فقراء، شعرائے آنجا را دیدم، مخاطبے کہ از و دل بیتاب تسلی شود نیافتم۔"[1]

میر نے اپنی سوانح عمری میں خان آرزو کو اپنا اُستاد بھی تسلیم نہیں کیا، حالانکہ سعادت امروہوی، میر جعفر عظیم آبادی اور دیگر بہت سے شہرت یافتہ کا اعتراف کیا ہے۔

میر حسن اور قائم دونوں اس کے معترف ہیں کہ میر، خان آرزو کے شاگرد ہیں۔ مجموعۂ نغز میں تو یہاں تک لکھا ہے:۔

"نسبت تلمذ ہم بہ جناب افادہ انتساب خان مشار الیہ دارد اما بنا بر نخوتے کہ در سرش جا گرفتہ از یں امر کیفی الحقیقت فخرِ وے ست ابائے کلی بہ میان آرد۔"

تذکرۂ نکات الشعرا، تذکرۂ میر حسن، تذکرۂ مخزنِ نکات، اور تذکرۂ قاسم کے بیانات اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ میر نے دیدہ و دانستہ خان آرزو کی شاگردی سے انکار کیا ہے۔ ممکن ہے اب وہ اپنے آپ کو خان آرزو سے بڑا سمجھتے ہوں اور ان سے نسبتِ تلمذ کو دونِ مرتبت۔ حالانکہ علمائے عصر ان کو امام المتاخرین کے لقب سے یاد کرتے تھے اور ایک طالب علم اپنے علم میں مکمل ہی نہیں ہوتا تھا جب تک وہ خان آرزو کے آگے زانوئے ادب تہ نہ کر لے۔

پھر ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ذکر میر، خان آرزو کے انتقال کے بعد، اور نکات الشعرا ان کی حیات میں لکھی گئی ہے۔ اس زمانے میں اکثر یہ ہوا ہے کہ اگر شاگرد کو شہرت کا موقع مل گیا تو اُستاد کا ذکر غیر ضروری سا ہو گیا۔ مرزا غالب کی تعلیم کے متعلق تذکرۂ گلشن بے خزاں میں لکھا ہے:۔

"اُستادان باشعور مثل خلیفۂ معظم جو بڑے معظم و مکرم اور ہادی الشعرا تھے انھوں نے نظیر اکبر آبادی سے جو بے نظیرِ زمانہ تھے تعلیم پائی تھی۔ ایام صباوت بہ برکتِ انفاس متبرکہ ان استادوں کے برتبۂ علم پہنچے۔ تب ان کی فکرِ رسا نے یہ صورت دکھائی، کیوں نہ خوش گو ہوں، جن کے اُستاد وہ ہوں چونکہ وہ اُستاد مر گئے، یہ جدِ دہلی و آگرہ) سے ادھر گئے اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاہد و قرار۔"

بعد میں غالب نے اس پر زور دیا ہے کہ ان کو سوائے عبد الصمد کے اور کسی سے تلمذ نہیں لیکن جب قاطع برہان پر ہنگامہ برپا ہوا

[1] ذکر میر ص ۱۰۴

اور لوگ اُن کے چُپ کہنے سے چُپ نہ ہوئے۔ تو انھوں نے "محاماسب عہد" اور "بزرجمہر عصر" ملّا عبدالصمد کا نام لینا شروع کیا۔ حالانکہ ذکاء، کریم الدین، صہبائی، سرور، باطن اور سید احمد خاں کسی کے یہاں بھی اُس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ بلکہ حکیم غلام رضا خاں نے تو اس کے وجود خارجی ہی سے انکار کیا ہے۔ اس سلسلے میں میر اور خان آرزو کی تصانیف کا تقابلی مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ میر نے بہت سے الفاظ مثلاً بے تہ، بے ٹِکا، دل زدہ، پلئے لنگردار، سرنشین، طفلان تہ بازار، جن کو خان آرزو نے خصوصیت کے ساتھ چراغ ہدایت میں درج کیا ہے، اپنے کلام میں بے تکلف استعمال کئے ہیں۔ خود ذکرِ میر کے بہت سے الفاظ اور محاورے محض خان آرزو کی لغت کی مدد سے حل ہو سکتے ہیں۔ یہ سب باتیں اس کی غمازی کرتی ہیں کہ میر نے خان آرزو سے کسب فیض کیا ہے اور ان کی شاگردی سے اِبا اُس وقت کیا جب وہ یہ کہنے کے قابل ہو گئے :-

اوّل تو میں سند ہوں، پھر یہ مری زباں ہے

ذکرِ میر کے مطالعے سے یہ نظریہ بھی باطل ہو جاتا ہے کہ میر بالکل قانع اور قطعی متوکل آدمی تھے اور ان کی لوحِ دل پہ آرزو کا کوئی نقش تھا ہی نہیں۔ دلّی میں ان کے محسنین کی فہرست کافی طویل ہے اور وہاں اس قسم کے واقعات بھی پیش آئے ہیں کہ دربان نے اندر جانے سے روکا ہے (ترآمدم و برآمدم) راجہ بہادر سنگھ کے بھائی سے ملنے گئے وہاں بھی دربان مانع ہوا "ناچار برگشتہ آمدم"۔ اس طرح بھی ہوا ہے کہ وہ ان رئیسوں کے درباروں میں دو دو پہر رات تک ملازموں کی حیثیت سے حاضر رہے۔ لکھنؤ میں میر کی بڑی قدر کی گئی اور تین سو روپے ماہانہ مقرر ہو گئے۔ آزاد کے اس بیان کا ابطال کہ آخری عمر میں ان کی تنخواہ بند ہو گئی تھی۔ مرزا علی لطف کے تذکرے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ یہ اتنی بڑی تنخواہ ہے۔ کہ غالب کو دُعا گوئی اور ثنا گستری کے باوجود دلّی اور رامپور سے دستیاب نہ ہو سکی۔ غالب کا ابتدائی زمانہ بڑے عیش و آرام میں گزرا تھا اور وہ شاہد شراب کے خوگر ہو چکے تھے میر دردِ کش نادے تھے، فقر و فاقہ کی تعلیم ابتدا سے حاصل کی تھی ان کے لئے یہ تین سو کم نہیں تھے۔ پھر بھی وہ ساری عمر شاکی رہے کہ

دست کوتاہ تا سبو نہ گیا

خواجہ میر درد نے "موج خون سر سے گزر جانے" کے باوجود دلّی نہیں چھوڑی لیکن میر نے ایک کمزور لمحے میں لکھنؤ کا ارادہ کر لیا حالانکہ جب خان آرزو نے یہی قصد کیا تھا۔ تو میر نے اپنے طنز و تشنیع کا سارا ترکش ختم کر دیا تھا :-

"خالوئے من بادیہ پیمائے طمع شد۔۔۔۔ خیرباد بدستش نیا۔
لکد زمانہ خوردہ ہم آں جا مُرد"

طرفہ لطیفہ ہے کہ میر کو لکھنؤ بلانے والے بھی خان آرزو کے یہی مُربّی اور قدر دان تھے۔

ہمیں ہرگز اس سے انکار نہیں کہ میر فطرتاً خوددار، باہمت اور آزاد منش واقع ہوئے تھے۔ ان کو خوئے گدایانہ چھو کے بھی نہیں گزری تھی۔ انھوں نے اُس زمانے میں اپنی دستار کو سنبھالا۔ جب وہ دونوں ہاتھوں سے بھی نہ سنبھلتی تھی، اگر انھوں نے ہاتھ پھیلایا ہے تو بڑی مجبوری ہیں، اور کسی کے سامنے مفلسی کا دکھڑا رویا ہے۔ تو یہ سمجھ کر کہ یہ جانِ غیور پر بڑا ستم ہو رہا ہے۔ لیکن ایک غیر جانب دار وقائع نگار ان باتوں کو قطعی نظر انداز بھی نہیں کر سکتا کہ انھوں نے قصیدے بھی لکھے، شکار نامے بھی موزوں کئے، ستائش گری اور مداحی بھی کی۔ تلاشِ معاش میں صفتِ جام بھی پھرے اور اہلِ دہلی کی قدر دانی اور اہلِ لکھنؤ کی سرپرستی کے باوصف وہ شکایتِ روزگار سے باز نہیں آئے[1]

اِن حقائق کے سامنے آنے سے میر کی عظمت کم نہیں ہوتی، بلکہ اور بڑھ جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے اُسے ایک ریشمی محل کا باشندہ قرار دیا ہے۔ جس نے کبھی اپنے پائیں باغ پر بھی نظر نہیں کی بعض نے اُسے فوق البشر کا مرتبہ دیا ہے جو اس خاک دانِ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "میر کی زندگی کے چند نئے پہلو" از خواجہ احمد فاروقی مطبوعہ آجکل ۱۵ جنوری ۱۹۵۲ء۔

ارضی کے رہنے والوں پر بھی کبھی نظر ڈالتا ہے تو اس طرح جیسے احسان کر رہا ہو۔ بعض نے اسے ایک مریض غم سمجھا ہے جو صرف اپنے زخموں سے کھیلتا رہتا ہے۔ ان میں سے ایک بات بھی صحیح نہیں ہے۔ ذکر میر کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقلیم سخن کا یہ "تاج دار" انسان ہے ہزاروں لاکھوں سے اچھا انسان۔ وہ ولی اور فرشتہ نہیں ہے بلکہ اسی عالم آب و گل کا رہنے والا اور اسی گوشت و پوست کا بنا ہوا ہے ہم اس کا بت نہیں بنا سکتے اور اگر بنا لیں تو وہ اتنا بڑا ہوگا کہ کسی شوالے میں نہیں آ سکتا۔ میر شاید اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے شرف انسانی پر اتنا زور دیا ہے۔ دردمندی جو لازمۂ انسانیت ہے، اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے وہ اپنی عزت بھی کرتا ہے اور دوسروں کی بھی۔ یہی انداز کلیات میں ہے اور یہی سوانح عمری میں بھی۔

ذکر میر سے میر کے مذہبی معتقدات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی پرورش ایسے خاندان میں ہوئی جو صوفیوں کا ملجا و ماوا اور رشد و ہدایت میں کافی مشہور تھا۔ ذکر میر اور فیض میر دونوں تذکرے اس کے گواہ ہیں لیکن میر کو اہل بیت سے والہانہ محبت تھی۔ کلیات میں اس کی شہادتیں جا بجا ملتی ہیں۔ ذکر میر کے ایک واقعے سے ان کو شیعہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ میر جب بیس برس کے بعد آگرے گئے ہیں تو ایک عالم کی خدمت میں پہنچے۔ انھوں نے میر کی "تسبیح خاک شفا" پر اعتراض کیا اور پوچھا آپ شیعہ تو نہیں ہیں میر صاحب نے فرمایا:-

"مرا نیز ہمیں تردد بود۔ الحمد اللہ کہ صاحب سنی برآمدند"

اس کے بعد میر صاحب لکھتے ہیں کہ وہ احمق میرے کنائے کو نہ سمجھا اور بہت خوش ہوا "شبلے من تر شدم و برخاستہ آمدم" (ص ۱۰۳)

ذکر میر سے میر کی معاشرت اور خانگی زندگی کے متعلق زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ اس میں جد کلاں، والد ماجد، "عم بزرگوار" بھائی محمد حسین، بھائی محمد رضی، چند دوستوں اور نور چشم میر فیض علی کا تذکرہ ہے لیکن انھوں نے میر محمد علی متقی میر امان اللہ اور محمد حسین کے علاوہ کسی کے کردار پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی فیض میر سے اتنا اور معلوم ہوتا ہے کہ میر کے پاس ایک غلام اور ایک بوڑھی خادمہ تھی۔ ہاتھ منہ دھونے کے لئے طشت اور آفتابہ تھا۔ شہسواری جانتے تھے لیکن گھوڑا نہیں تھا (فیض میر حکایت اول)

ذکر میر تاریخی معلومات کا گنجینہ ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے مورخوں نے ابھی تک اس کو تاریخی ماخذ کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ اس میں محمد شاہ کے انتقال سے لے کر غلام قادر روہیلہ کے جور و ستم تک تمام واقعات دیئے ہیں۔ آخری دور مغلیہ، مرہٹوں سکھوں جاٹوں اور انگریزوں کے متعلق اس میں ایسی معلومات درج ہیں۔ جو دوسری جگہ اس انداز سے نہیں ملتے۔

اس زمانے میں سیاسی انقلابات کے باوجود ہماری معاشرت کتنی مضبوط تھی، ہندو اور مسلمان کس محبت سے رہتے تھے[1]، فوج کس طرح عامۂ و عالم کے لئے ملجا و ماوا بن گئی تھی۔ یہ سب باتیں بھی ذکر میر کے مطالعے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

اس عجیب و غریب تاریخی پس منظر میں میر کی حیثیت درویش زادے کی بھی ہے، طالب علم کی بھی، عاشق کی بھی، شاعر کی بھی، مصاحب کی بھی، دہلی کی بھی ——— جس طرح شراب، کبھی کبھی کھنچ کے تلوار بن جاتی ہے۔ ایسے ہی یہ تاریخی پس منظر، میر کے یہاں "غزل" میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ؎

کس کس طرح سے میر نے کاٹا ہے عمر کو
اب آخر آخر ان نے ہے یہ ریختہ کیا

ذکر میر کا انداز بیان موثر، دل آویز اور بے باکانہ ہے قافیوں کا اہتمام ہے لیکن اس سے روانی میں فرق نہیں آیا۔ جملوں کی ساخت پختہ اور بے رخنہ ہے۔ ان کی نثر، غالب کی فارسی نثر سے سلاست اور سادگی میں زیادہ اور رخشندگی و شگفتگی میں کم ہے۔ اس فارسی میں وہ غرابت اور ثقاہت بھی ہے جس سے غالب خفا تھے۔ میر حسن نے ان کے متعلق لکھا ہے:

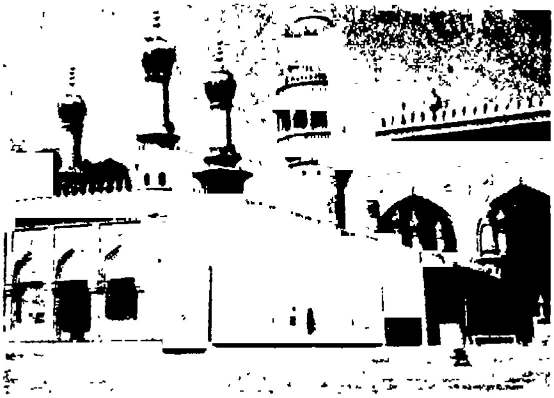
چو باغ نثر ش روشن و ساخت نظمش گلشن[2]

اور یہ رائے مجموعی حیثیت سے صحیح ہے۔ چھوٹی بحر کی غزلوں کی طرح ان کا مکمل مرقع نگاری میں نظر آتا ہے۔ جہاں انھوں نے چھوٹے چھوٹے فقروں اور اشاروں میں ایک جہان معنی کو پیش کر دیا ہے۔

---

[1] نیز ملاحظہ ہو "آجکل" دہلی یکم ستمبر [illegible] میں مضمون "میر کے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ" از خواجہ احمد فاروقی
[2] تذکرہ میر حسن ص ۱۷۵

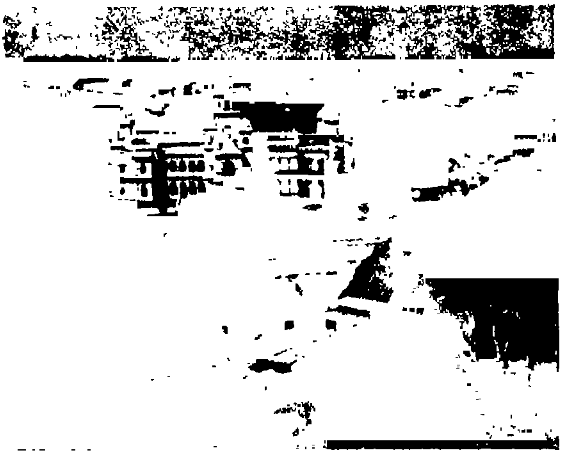
حیدرآباد پر ایک نظر



مکہ مسجد۔ یہ حیدرآباد کی سب سے بڑی مسجد ہے جسے قطب شاہی خاندان کے بادشاہ محمد قطب شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔



فتح میدان۔ اس خطۂ زمین کے ساتھ قطب شاہی بادشاہوں پر اورنگ زیب کی فتح کی یادگار وابستہ ہے۔



الیکشن کا دفتر۔ آج کل اس عمارت میں حیدرآباد میونسپل کمیٹی کے دفاتر ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی قابل دید عمارت





قلعۂ گولکنڈہ ـ ھاں اے دل عبرت بیں !



عثمانیہ جنرل ھسپتال۔ یہ جنوبی ھند کا سب سے بڑا ھسپتال
ھے جو موجودہ نظام حیدرآباد کے عہد میں تعمیر ھؤا ھے۔



لیکشن کے دفتر کا ایک اور رخ



مشیرآباد مسجد
یہ تعمیر قطب شاھی خاندان کے زمانہ کی یادگار ھے۔



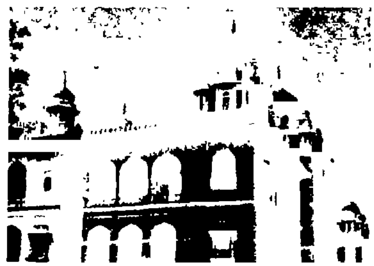
معظم جاھی مارکیٹ
حیدرآباد کا سب سے بڑا بازار

ارمینار۔ جو ۱۵۹۱ء میں
لیگ کے خاتمے کی یادگار
کے طور پر تعمیر کیا گیا

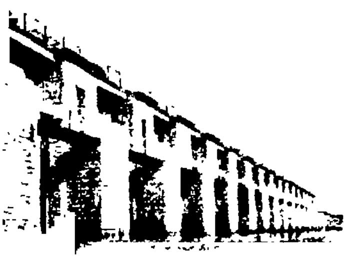




ھائی کورٹ کی عمارت



عثمان ساگر کا بند۔ شہر سے چودہ
میل کے فاصلے پر یہ بند موسیٰ ندی
کے پانی کو استعمال میں لانے کے
لئے بنایا گیا ھے





بی بی کا مقبرہ جو اورنگ آباد کا مشہور ترین مقبرہ ہے۔
یہ مقبرہ اورنگ زیب نے اپنی بیگم کی یاد میں
تعمیر کرایا تھا۔



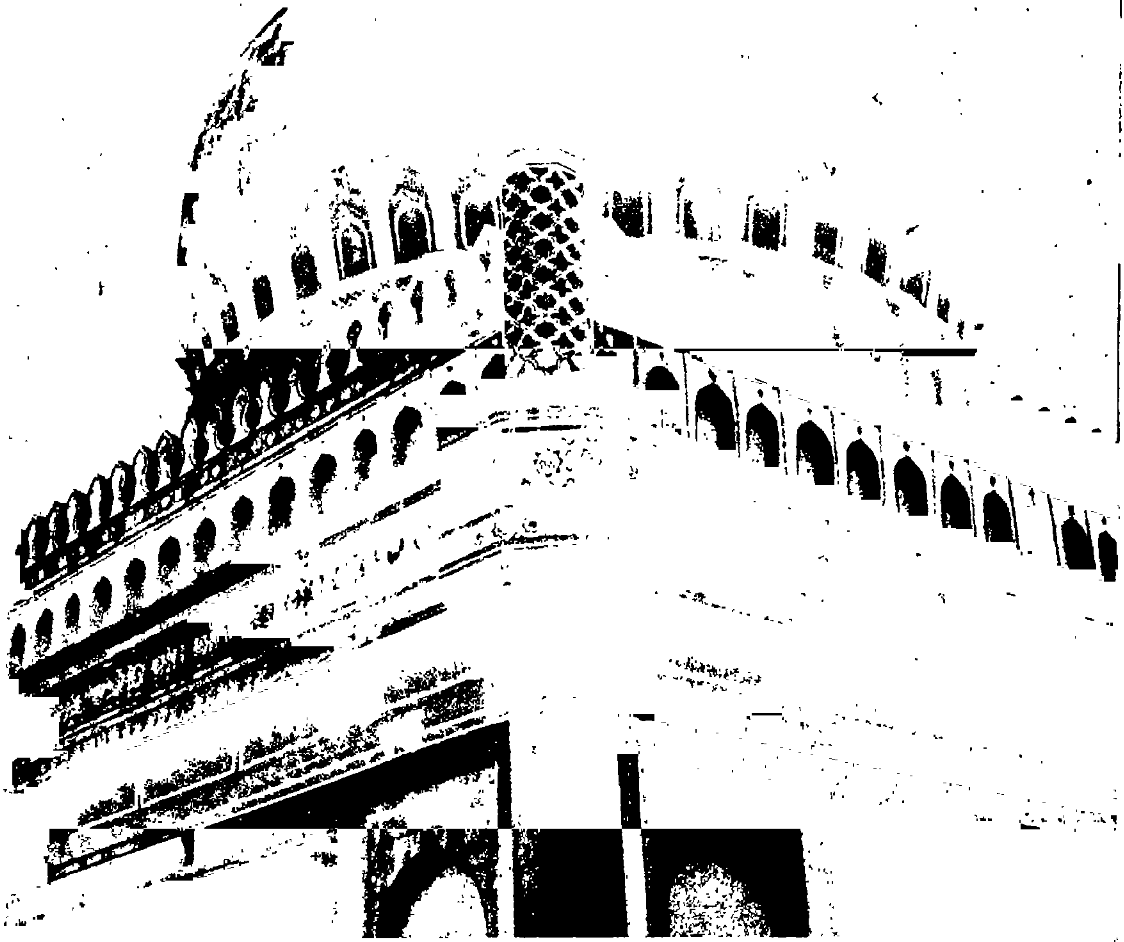
مقبرے میں پانی کا تالاب، عقب میں ایک درویش
شاہ مسافر کا مزار نظر آ رہا ہے۔

مقبرے میں استعمال شدہ سنگ مرمر پر کھدائی اور نقاشی کا کام









قطب شاہی خاندان کے پانچویں حکمران سلطان محمد قطب شاہ کا مقبرہ۔ یہ مقبرہ قطب شاہی خاندان کے دیگر بادشاہوں کے مقابر کے ساتھ گولکنڈے میں واقع ہے۔

اوپندر ناتھ اشک

مرد کا اعتبار کیا؟

اپنی بیوی شانتا کی وفات کے ایک ماہ بعد پروفیسر گپتا ہمارے گھر آئے تو بڑے اُداس اُداس تھے۔ جب چاچی جی نے باتوں باتوں میں کہا کہ شانتا بہن کی عدم موجودگی میں اُنھیں شدید تنہائی کا احساس ہوتا ہوگا، بچّوں کی دیکھ بھال میں بھی دشواری ہوتی ہوگی اور اشارہ کیا کہ اُنھیں دوسری شادی کر لینی چاہیئے تو پروفیسر صاحب بِل بلا اُٹھے۔ "شانتا کی سی بھولی بھالی، خوبصورت سلیقہ شعار، نیک اور ہمدرد بیوی اب کہاں ملے گی؟" اُنھوں نے کہا "میں جب کبھی سوچتا ہوں کہ شانتا کو کھو کر میں نے کتنی بڑی دولت کھو دی ہے تو دل بے ساختہ بھر آتا ہے......"

اور پروفیسر صاحب جب تک بیٹھے رہے اپنی ازدواجی زندگی کے خوش گوار اور شیریں واقعات سنا کر شانتا جی کی سلیقہ شعاری، اُن کے حسن، اُن کی نیک سیرت، اُن کی ہمدردی اور محبت کی باتیں کرتے رہے۔

اُن کے جانے کے بعد دیر تک چاچی جی بیوی سے اُن کی محبت اور اُن کی کامیاب ازدواجی زندگی کا ذکر کر کے ان سے ہمدردی کا اظہار کرتے رہے اور پھر جب تک پروفیسر صاحب دوبارہ نہ آئے وہ دن میں ایک نہ ایک بار ضرور اُن کا ذکر کرتے رہے۔

جب پندرہ بیس دن بعد پروفیسر صاحب پھر آئے تو میں نے دیکھا کہ ہرچند اُن کے چہرے پر اُداسی کی جھلک موجود تھی تاہم اُس کی گہرائی چھٹ گئی تھی۔ چاچی جی کے پاس غالباً بات کرنے کو دوسرا موضوع ہی نہ تھا، اُنھوں نے پھر پروفیسر صاحب کے احساسِ تنہائی اور بچّوں کی خورد و پرداخت کی بات چھیڑ دی۔

چاچی جی کے پاس بیٹھے میں نے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ بادلوں کو چیر کے آفتاب خواہ پوری آب و تاب سے نہ چمکا ہو، تاہم ایک لمحے کے لیئے اُس کی چمک، بادل کے باوجود پورے آسمان پر دوڑ گئی۔ اُنھوں نے مسکرا کر کہا۔ "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مَیں نے بھی یہی طے کیا ہے، ایک جگہ بات پکّی کر لی ہے ......"

"کہاں؟" چاچی جی نے فرطِ مسرّت سے چونک کر اشتیاق آمیز لہجے میں کہا۔ "اور ہمیں بتایا تک نہیں؟"

"میرے ایک ساتھی پروفیسر ہیں۔" گپتا صاحب بولے "اُنھیں کی بہن ہے شکنتلا نے اسی سال بی' اے کیا ہے۔ شانتا کا مقابلہ تو کیا کریگی لیکن میرے دوست نے زور دے کر پھانس لیا ہے۔ مَیں نے بھی سوچا کہ پڑھی لکھی ہے، بچّوں سے نفرت و کدورت نہ روا رکھے گی۔"

"بی اے پاس ہے پھر تو بہت اچّھا ہے۔" چاچی جی نے مسرّت کا اظہار کرتے ہوئے تائید کی۔

"نہیں، اچھّا تو کیا ہے۔" پروفیسر صاحب بولے۔ "شانتا کی جگہ تو کہاں پُر ہو سکتی ہے، یہ زخم تو کبھی بھر ہی نہیں سکتا۔ لیکن لوگوں کی آنکھوں سے بچا رہے یہی کوشش کر رہا ہوں۔" اُنھوں نے ایک لمبی سانس لی اور بڑے پُر درد لہجے میں یہ دوہا پڑھا۔

"کہتی ہیں سچ سہیلیاں مرد کا اعتبار کیا!" (رفتار)

کبیرا اپنے من کی بتھا، من ہی میں راکھو گوے
سن اٹھیلیہیں لوگ سب، بانٹ نہ لیہیں کوے ؂

رات کو چاچی جی لیٹیں تو اُنھیں نیند نہ آئی۔ وہ ذرا رومانی مزاج کی عورت ہیں۔ چاچا جی کی بے پروائی کا دُکھڑا روتے ہوئے پروفیسر گپتا کی تعریف کرنے لگیں کہ اُنھیں شانتا سے کتنا پیار ہے۔ ہم مر جائیں گے تو ہمیں کوئی یاد بھی نہ کرے گا۔

اُنھوں نے ایک سرد آہ بھری۔

لیکن جب گپتا صاحب شادی کر کے آئے تو نئے ماہتاب کے نور کی جھلملاتی لہروں میں کہیں بہت نیچے ڈوب جانے والے چھوٹے سے بے مایہ ستارے ——— شانتا کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔

جب تک پروفیسر صاحب بیٹھے رہے، شکنتلا جی کی تعریفوں کے گیت گاتے رہے — اُن کی تعلیم، اُن کی تہذیب، اُن کی خوش اخلاقی غرض کہ اُن کی ایک ایک ادا کا نہایت تفصیل سے ذکر کر کے سننے والوں کو حیرت زدہ کرتے رہے۔ چاچی جی کا دل اُنھوں نے شکنتلا کی باتوں سے ایسا لبھایا کہ اُنھوں نے گپتا صاحب سے دوسرے ہی روز شکنتلا جی کو ساتھ لے کر آنے اور کھانا کھانے کا وعدہ لے لیا۔

اُن کے جانے کے بعد ہی چاچی جی نوکر کو کھانے کے بارے میں ہدایات دینے لگیں۔ اُنھیں شکنتلا کی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ چاچا جی پیسے کمانے کے فن میں خواہ کتنے ہی طاق ہوں لیکن گھریلو زندگی کو کامیاب بنانے کے فن میں وہ گپتا کے پاسنگ بھی نہ تھے۔ چاچی جی کی باتوں اور لمبی لمبی آہوں سے کم از کم میں اسی نتیجے پر پہنچی۔ چراغ جلے چاچا جی گھر آئے تو اپنی فطرت کے مطابق بچوں کو کھلانے، پلانے، ریڈیو کے گانے، راجہ رانی کی کہانیاں سُنا کر اُنھیں سلانے میں محو ہو گئے۔ اور چاچی جی کی لمبی آہیں اور بھی لمبی ہوتی گئیں۔

دوسرے دن پروفیسر صاحب اپنی دُلھن کے ساتھ کھانا کھانے آئے تو اُن کا چہرہ اُس آئینہ کے مانند چمک رہا تھا جس پر سورج کا سیدھا عکس پڑ رہا ہو۔ شکنتلا جی کے وجود کی روشنی میں گویا وہ جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ شکنتلا جی کی ہر ایک ادا، ہر مسکراہٹ اور ہر بات کا عکس پروفیسر صاحب کے چہرے پر جھلک اُٹھتا تھا۔

چاچی جی نئے شادی شدہ جوڑے کی خاطر تواضع میں جس بے پناہ مسرت کا اظہار کر رہی تھیں، اس کے باوجود میں نے اُن کے چہرے پر کئی بار جذبۂ رشک کی ہلکی سی جھلک بھی دیکھی اور ایک دو بار اُن کی دبی سانس بھی سُنی۔ جب کھانا کھانے کے بعد پروفیسر صاحب شکنتلا جی کے ساتھ رخصت ہوئے تو چاچی جی نے شکنتلا کی قسمت کو سراہا جنھیں ایسا پیارا ساتھی مل گیا ہے۔

اور شکنتلا جی کی قسمت تھی بھی سراہنے کے قابل، کیونکہ جب پروفیسر صاحب پھر آئے تو شکنتلا جی کی خوبیوں کی تعریف کرتے ہوئے اُنھوں نے شانتا کے اُن عیوب کا بھی ذکر کیا جو اب تک اُن کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اونٹ والا اس وقت تک اونٹ کی مستانی چال ہی کا گرویدہ رہتا ہے جب تک اُسے ہاتھی کی سواری نہ ملے ہاتھی کے ہودے پر بیٹھ کر اسے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کتنا ٹھگنا تھا اور اس میں کیا کیا عیب تھے۔ پروفیسر صاحب کی حالت بھی کچھ اُس اونٹ والے کی سی ہی تھی۔ ہاتھی کی مستانہ چال کے آگے اونٹ کی بے ڈھنگی رفتار، ہاتھی کی پہاڑ سی پیٹھ کے مقابلے میں اونٹ کا بھدا سا کوہان اور ہاتھی کی ذہانت اور ہوشیاری کے مقابلے میں اونٹ کی بے وقوفی کتنی کھٹکتی تھی کہ اُنھیں تکلیف دے رہی تھی۔ اُنھیں افسوس تھا کہ اُنھوں نے یہ سب پہلے کیوں نہیں دیکھا۔

شکنتلا جی کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا کتنا خیال ہے اس بات کو بھی بڑی تفصیل کے ساتھ پروفیسر صاحب نے بیان کیا۔ بڑے بچوں کو ہوسٹل میں اور بچی کو نرسری اسکول میں اُنھوں نے داخل کرا دیا تھا ہفتے میں دو بار اُنھیں دیکھنے جاتی اور اُن کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتی ہیں۔

"لیکن آپ کے بچے تو خاصے چھوٹے ہیں" چاچی جی نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

اور اُس کے جواب میں پروفیسر صاحب نے بچوں کو بچپن ہی سے ہوسٹل میں رکھنے کے فوائد پر چھوٹا سا لیکچر دے ڈالا کہ کس طرح ہوسٹل میں رہ کر بچے خود اعتمادی کا سبق سیکھتے ہیں اور کس طرح بچوں کے وہ اوصاف اُبھر آتے ہیں جو والدین کے لاڈ پیار میں دبے رہتے ہیں۔

؂ کبیرؔ اپنے من کا دُکھ من ہی میں چھپا کر رکھو۔ سُن کر لوگ ہنستے ہیں بٹاتا کوئی نہیں۔

لیکن شکنتلا جی پروفیسر صاحب کے بچوں کے پلے ہوئے اوصاف کو ابھارنے کا موقع نہ پا سکیں اور اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے ایک دن بعد ہی پروفیسر صاحب کو اپنی رفاقت کی لامحدود خوشی سے محروم کر کے سورگ کو سدھار گئیں۔

اُن کی موت کے بعد جب پروفیسر صاحب پہلی بار ہمارے گھر آئے تو اُن کی غم زدہ صورت دیکھ کر چاچی جی آبدیدہ ہو گئیں پروفیسر صاحب کا چہرہ بالکل سیاہ پڑ گیا تھا معلوم ہوتا تھا گویا سورج کے عکس سے چمکنے والے آئینے پر ایک دم سیاہی پوت دی گئی ہو۔ کس طرح آکر اُس نے بچوں کو سنبھال لیا تھا، کس طرح اُن کی تعلیم و تربیت کے لئے اُس نے شہر بھر کے اسکول اور ہوسٹل دیکھ ڈالے تھے، کس طرح وہ اُن کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ ان سب باتوں کا بار بار ذکر کر کے وہ بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ چاچی جی نے بچوں کے مستقبل کو لے کر اشارہ کیا تو پروفیسر صاحب نے جس مایوسی سے سر ہلایا اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ دوسرے جنم میں ممکن ہو تو ہو، لیکن اِس جنم میں شکنتلا کی سی لڑکی کا ملنا قطعی ناممکن ہے۔

لیکن ابھی شکنتلا جی کو مرے ہوئے ایک ماہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ پروفیسر صاحب نے کسی سیتا جی کا ذکر کیا جو اسکول میں مسٹریس تھیں اور جنہوں نے پروفیسر صاحب کو پہلی بار بتایا تھا کہ بچے ہوسٹل میں کبھی ٹھیک نہیں رہ سکتے۔ ہوسٹل کے بڑا اور نوکر بچوں کی خورد برداخت سے وہ دلچسپی لے ہی نہیں سکتے جو والدین اپنے بچوں کی دیکھ بھال لیتے ہیں۔ کچھ دن پروفیسر صاحب نے سیتا جی کی دُور اندیشی، سلیقہ شعاری اور عقلمندی کی بڑی تعریف کی دو ماہ بعد جب وہ سکول چھوڑ کر مسز گپتا ہی گئیں تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی چاچی جی تو اُن کا خیر مقدم بڑی دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھیں مگر یہ آرزو وہ پوری نہ کر سکیں، اُنہیں قلب کی بیماری بہت مدت سے تھی۔ اس بار جو دورہ ہوا تو چاچی جی کی ساری تیمارداری اور ڈاکٹروں کی تمام دواؤں اور انجکشنوں کے باوجود وہ بچ نہیں سکیں۔

اُن کے مرنے کے بعد چاچا جی نے پھر شادی نہیں کی۔ بہت جگہ سے پیغام آئے دوستوں نے بھی بہت کہا مگر چاچا جی نہیں مانے۔ "تمہارے ساتھ اتنے دن گزارنے کے بعد کسی اور کے ساتھ رہنے میں کوئی تک ہی نہیں"۔ اُنھوں نے ایک بار کہا اور پھر دوسری بات ہی نہیں کی۔

پروفیسر گپتا اب بھی کبھی کبھی آتے ہیں شکنتلا جی کی روشنی مدھم پڑ چکی ہے اور سیتا جی کی چمک دن دونی رات چوگنی بڑھ رہی ہے مجھے کبھی کبھی چاچی جی کی سرد آہیں یاد آ جاتی ہیں اور خود میرے ہونٹوں سے کبھی کبھی آہ سرد نکل جاتی ہے۔۔

جگن ناتھ آزاد

دردِ انساں لے کے آیا ہوں

خس و خاشاک میں روحِ گلستاں لے کے آیا ہوں
خزاں کے دوش پر ابرِ بہاراں لے کے آیا ہوں
جہاں بے دردیوں سے ربط ہے درماں سے نفرت ہے
وہاں بہرِ مداوا دردِ انساں لے کے آیا ہوں
جہاں نفرت ہمکتی ہے جہاں کینے لپکتے ہیں
محبت کی وہاں جنسِ فراواں لے کے آیا ہوں
جہاں گفتار کی جرأت پہ فردِ جرم لگتی ہے
وہاں گل بانگ شرحِ دردِ پنہاں لے کے آیا ہوں
جہاں ہیں صرف کنکر اور پتھر بیچنے والے
میں اُس بازار میں لعلِ بدخشاں لے کے آیا ہوں
مرا مُنہ تک رہی ہیں ہمتیں اربابِ عالم کی
رہِ مرمر میں قندیلِ فروزاں لے کے آیا ہوں
خبر کر دو کوئی یہ تشنہ کامانِ تمنّا کو
کہ اپنے دوش پر خُم کیا خمستاں لے کے آیا ہوں
ارے او ظلمتِ پُر ہول میں سر پھوڑنے والے
اِدھر آ میں شعاعِ مہرِ تاباں لے کے آیا ہوں
جہاں صرصر گرجتی ہے جہاں شعلے بھڑکتے ہیں
وہاں رقصِ نسیم و شبنمستاں لے کے آیا ہوں
جہاں ظلمت کا مرکز آندھیوں کا آشیانہ ہے
وہاں آزاد پیغامِ چراغاں لے کے آیا ہوں

مسعود حسین خاں

آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

فرائڈ نے آرٹ کا مقام قوتِ واہمہ اور حقیقت کے درمیان متعین کیا ہے۔ فن کار نفسیاتی اعتبار سے مطالعۂ باطن کا عادی ہوتا ہے۔ اس میں اور خللِ اعصاب کے مریض میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اس کی شخصیت جبلی تصادم اور تلاطم کی آماجگاہ ہوتی ہے۔ وہ عزت، شہرت، دولت اور محبت کا بھوکا ہوتا ہے لیکن عجب بے بسی ہوتی ہے کہ اپنے جسم و روح کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس کے پاس وسائل اور ذرائع نہیں ہوتے۔ ناکام و نامراد وہ حقیقت سے "خود میں" گریز کرتا ہے۔ اور اپنی تمام تر دلچسپیوں کو تخیلی عمل اور عالمِ خیال میں منتقل کر دیتا ہے۔ حقیقت کے اس مفرور کا انجام اکثر و بیشتر خللِ اعصاب یا خللِ دماغ (عشق) پر ہوتا ہے۔ خللِ اعصاب کے کئی وجوہ ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں فنکار کی نفسیاتی رکاوٹوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جو اسے بھرپور زندگی بسر نہیں کرنے دیتیں۔ اغلب ہے کہ اس کی جسمانی ساخت اس نوعی کی ہوتی ہے کہ اس کے اندر تصعید یا ارتفاع کی غیر معمولی صلاحیتیں ہوں۔

جبلی تصادم کی وجہ انھیں اپنے جذبات پر غیر معمولی جبر کرنا پڑتا ہے۔ اس کی روح مسلسل کڑی کمان بنی رہتی ہے۔ اس لئے وہ بچہ کی طرح اپنے ہی نفس سے اپنی گرہِ دل کھولتا رہتا ہے۔ بچپن کے نفسیاتی الجھاؤ اور ذہنی [illegible] کا اظہار اس کا واحد مقصد ہوتا ہے۔ جدید سماجی تنقید کا یہ نعرہ کہ شاعر معروضی ہوتا ہے اور وہ اپنے عہد کی نمائندگی کرتا ہے محض ایک مغالطہ ہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر اپنے کو بعض اوقات عقیدت کا دعویدار اور تمدن کا ترجمان ثابت کرنا چاہتا ہے لیکن یہ بھی اس کی داخلیت کے اظہار کا ایک انداز ہے۔

عالمِ خیال سے حقیقت کی طرف دوبارہ گریز فنکار کے یہاں آرٹ کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی قابلِ غور بات یہ ہے کہ تنہا فنکار کی ذات واہمہ کا شکار نہیں ہوتی۔ قوتِ واہمہ ان تمام نامرادوں کی پناہ گاہ ہے جو حرماں نصیب ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ غیر فنکار قوتِ واہمہ سے بااندازۂ ظرف ہی متمتع ہو سکتے ہیں یعنی محدود پیمانے پر۔ ان کے جذبات کا شدید دباؤ انھیں قوتِ واہمہ کی رنگارنگ دلچسپیوں سے محروم کر دیتا ہے۔ اور اُن کی آنکھیں عالمِ خیال سے محض بیداری کا خواب چرا سکتی ہیں۔ برعکس فنکار کا دائرۂ عمل اس سے کہیں زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنے بیداری کے خوابوں کو اس طرح شرح دے سکتا ہے کہ اُن میں سے ذاتی اور نجی عناصر زائل ہو کر ایک ایسی عمومیت آ جاتی ہے جو معاملات میں من و تو سے پرے ہوتی ہے۔ اس میں یہ بھی ملکہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے خوابوں میں ایسی حسن کارانہ ترمیم و تنسیخ کر سکتا ہے کہ دوسروں کے لئے اُن کے ماخذ کا پتہ لگانا دشوار ہو جائے۔ مزید برآں وہ فن کی چھڑی سے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے مخصوص مواد کو نئی شکلیں عطا کر دیتا ہے۔ ان نئی شکلوں میں وہ اپنی قوتِ واہمہ سے مسرت کی ایسی تیز برقی رو میں دوڑا دیتا ہے کہ جذباتی دباؤ کے مقابلے میں مسرت کا پلڑا جھک جاتا ہے۔ فن کی پُرپیچ راہوں سے گزرنے کے بعد وہ دوسروں کے لئے بھی حسن اور نشاط کے دروازے کھول دیتا ہے۔ مجروح دل اور بھوکی آتما کو یہاں تسکین ملتی ہے۔ لاشعور میں خفی لذتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو جبلی تسکین کا باعث ہوتی ہیں۔ لوگ فن کار کو اس احسانمندی

کا صد ستائش اور استحسان کی شکل میں دیتے ہیں۔ فن کار کبھی بھی صلہ یا ستائش سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ یہ غالب کی محض طرزِ ادا ہے کہ ؏

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا

اس طرح فن کار واہمہ کے ذریعے وہ سب حاصل کر لیتا ہے جس سے وہ اب تک محروم رہا ہے یعنی شہرت، دولت، عزت اور محبت!

تحلیلِ نفسی کا ایک بنیادی مفروضہ نظریہ جبلت ہے جس کے ذریعے نفسیات کو حیوانیات اور دیگر علوم سے ہم آہنگ کیا گیا ہے تحلیلِ نفسی کی رو سے جبلت کسی بیرونی تحریک یا ہیجان کا فعل جبلی نہیں بلکہ جبلت کی روایتی تعریف سے قطعِ نظر یہ ایک مخصوص قوتِ عمل، ترنگ اور "ہمہ گیر دباؤ" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اسی دباؤ کے ردِ عمل کے طور پر تحریکات بیرونی پیدا ہوتی ہیں۔ جبلت بیرونی تحریکات سے اُبھر سکتی ہے لیکن بذاتِ خود اس لفظ میں بیرونی تحریکات کا مفہوم شامل نہیں۔ اسی لیے جبلی تحریک احساس سے نہیں "تقاضے" سے عبارت ہے۔ تحلیلِ نفسی میں جبلت وہ توانائی ہے، جو "از خود" ہے۔ شعلۂ حیات اس سے بھڑکتا ہے۔

نظریۂ جبلت تحلیلِ نفسی کا وہ مفروضہ ہے جو مشاہدات شعور، لاشعور اور عضویات کو ایک سہل اور سادہ قانونِ جبلت پر لا ختم کرتا ہے۔ یہ نظریہ بنیادی طور پر نفسیاتی ہے۔ کیونکہ اس کے تحت ذہن اور شخصیت کا حسبِ ضرورت صوریاتی اور عضویاتی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ مشاہدات کی نوعیت خالصتہً نفسیاتی ہوتی ہے۔ تاہم دوسرے علوم کے پس منظر میں دیکھنے سے اس مفروضہ کے تھوڑے بہت حیاتیاتی پہلو بھی نظر آ جائیں گے۔

جبلی تصادم کا قانون اُن کا مسلسل کھنچاؤ اور تناؤ ہے۔ یہ کھنچاؤ لابدی ہے۔ اسی سے حیات میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اس کھنچاؤ کا زائل کرنا آرٹ کا اصل مقصد ہے۔ فنکار اسی لیے مسرت بخش عناصر کا کھیل کھیلتا ہے۔ نشاط اور مسرت کا لازوال خزانہ جنسی جبلت ہے۔ اس لیے تحلیلِ نفسی میں جنسی جبلت کے مختلف مسائل خنثویت، جبر، اخراجِ مقصد، بازخمیدگی اور تصعید پر کافی وقت صرف کیا جاتا ہے۔ جنسی جبلت خودی کی جبلت سے ان معنوں میں متضاد ہوتی ہے کہ یہ مسرت اور لذت حاصل کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ جوں جوں اس کا تناؤ کم ہوتا جائیگا حظ کی مقدار بڑھتی جائیگی۔ خودی کی جبلت جو اخلاق اور تمدن کی بنیاد ہے۔ ہمیشہ جنس سے تصادم میں رہتی ہے اور اس طرح ہر فنکار انفرادیت اور اجتماعیت میں دو نیم رہتا ہے۔ اس تصادم کا انجام بالآخر خللِ اعصاب کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ جسے تصعید یا ارتفاع کے ذریعہ رد کیا جا سکتا ہے۔ تصعید کا سب سے اچھا مظہر آرٹ ہے۔

جنسی جبلت کی تسکین کے بڑے وسیلے لہو و لعب تخلیق اور فن ہیں۔ فنکارانہ تخلیق اور جنسی محبت کے ہیجانات بالکل ایک ہیں۔ ناکام محبت کو اکثر فنکارانہ تخلیق میں مصروف پایا ہے۔ وہ جنسی قوت جو اب تک محبت کے دام میں گرفتار رہی ہے۔ آخر جمالیات اور آرٹ کے پیمانوں میں چھلک اٹھتی ہے، اور اصلاح و تسکینِ جذبات کا موجب بن جاتی ہے جنسی تسکین اس طرح ذوقِ نظر میں تبدیل ہو جاتی ہے ؏

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے (غالب)

تسکین اور لذّت کا ذوقِ نظر میں تبدیل ہو جانا، تحلیلِ نفسی کی رو سے جنسی جبلت کا ارتفاع ہے۔

اس طرح آرٹ بنیادی طور پر شدید جنسی جبر اور بے راہی کی تخئیلی تکمیل ہے۔ قدیم نفسیات تخئیل کے بارے میں تلازمِ خیالات کے نظریہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ یہ تلازم کبھی مقارنت اور کبھی مماثلت کے ذریعے قائم کیا جاتا تھا۔ لیکن اس نظریئے سے تحقیق میں زیادہ مدد نہیں ملتی۔ مماثلت کے لیے مختلف چیزوں کی وجہ انتخاب سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا یہ معنوی تقاضے کی ماتحت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یا محض من کی موج اور ترنگ پر؟ اس کا جواب قدیم نفسیات نہیں دیتی۔ تخیل کا کوئی نظریہ اس وقت تک تشفی بخش نہیں ہو سکتا۔ جب تک ہم جدید نفسیات کے اس رمز کو نہ سمجھ لیں کہ تخیل کا تمامتر انحصار زندگی کے جذباتی پہلو پر ہے یعنی ان جبلتوں اور احساسات پر جو تمثال کے جلو میں آتے ہیں۔ انھیں محور پر خیالی تصویریں گھومتی ہیں۔ ہر تمثال کے اندرون میں جذباتی گرہیں ہوتی ہیں۔ اس طرح تخیل جذبہ کو چمکاتا ہے اور جذبہ تمثال کو گرماتا ہے۔ شاعر کا ذہن اس دو عملی کے رموز سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ اس میں تخیلی اور جذباتی دونوں صلاحیتیں اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں۔ خیال میں مستی اور مستی میں خیالی پیکر ہوتے ہیں۔ غالب نے ذیل کے مصرع میں اسی نفسیاتی

حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال

جذبہ اور تخیل کے ربطِ باہمی پر قدیم زمانے سے قیاس آرائی ہوتی آئی ہے۔ شاعرانہ ذہن دونوں کی وحدت کو تسلیم کرتے ہوئے دونوں میں خطِ فاصل کھینچ سکتا ہے۔ وہ جذبہ اور خیال کی تکثیف پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے برعکس انتقالِ جذبات سے کام لے کر وہ جذبہ کو تمثال کا محور بننے کی بجائے اسے مختلف تمثال پر پھیلا دیتا ہے جس طرح غالب کے تصورِ محبت کو محبوب سے ہٹا کر اس کے "انگشتِ حنائی" پر منتقل کر دیتے ہیں۔ تکاثف اور انتقالِ جذبات کے یہ عمل نہایت پوشیدہ طور پر واقع ہوتے ہیں۔ ان کا بہت کم حصہ شعور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس طرح تحلیلِ نفسی میں لاشعور کا تصور لازمی طور پر آجاتا ہے جو ایک طرح سے جذباتی زندگی کی خفیہ کارگاہ ہے۔ فرائڈ کا تصورِ زیر تحت الشعور کی کارفرمائی کو سمجھنے کا بہترین وسیلہ ہے۔ اس تصور پر غیر معمولی زور اس لئے بھی دیا گیا ہے کہ اس وقت تک تکاثف اور انتقالِ جذبات کے نظریے پیشِ نظر نہ آسکے تھے۔

تحلیلِ نفسی کی رو سے شاعر اپنی اذعدِ انفعالیت کی وجہ سے اذیت پسند بھی ہوتا ہے۔ اس طرح فنی تخلیق کی تہ میں تکلیف اور محن کی کسک کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ فن کار کے لاشعور میں اس کے احساسِ گناہ کو بھی دخل دیتا ہوتا۔ اپنے معتقدات کو دوسروں سے منوانے کے لئے اسے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ضمیر کو احساسِ گناہ سے ہلکا کرے۔ وہ آرٹ کے ذریعے سے مخاطب کو اپنا ہم رائے بنا لیتا ہے۔ تاکہ وہ اس کی دبی اور چھپی ہوئی خواہشاتِ نفسی اور حرمان نصیبی پر گواہی دے سکے۔ اس کے درد کو اپنے درد میں تبدیل کرلے بجنسہٖ کہ اس کے احساسِ گناہ میں برابر کے شریک بن کر اس کی روح کو سبکبار کرے۔ اس طرح فن کار کی نجات اور دیگر اشخاص کی مسرت کا وسیلہ بن جاتا ہے۔



بہو (عمل رانی چندا)

اشرف صبوحی

بُدّھو

دنیا میں ایسی بستیاں بھی ہیں جہاں کے پانی اور ہوا میں عقل کی کھیتی ہی نہیں اُگتی۔ چھوٹے بڑے عورت۔ مرد سب سمجھ کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں۔ صورت کے خاصے۔ کمانے میں ہیٹے نہیں مگر بے وقوفی کی ایک نہ ایک لٹک بھی ضرور ہوتی ہے۔ بدھوا کی گڑھی کا نام سنا ہو یا نہ سنا ہو وہاں بھی خدا نے اسی قسم کی مخلوق اُگائی ہے۔ اور مزہ یہ کہ سارے کے سارے اپنے کو لال بجھکڑ سمجھتے ہیں۔

ایک دفعہ کا قصہ سنو۔ بدھو رام کوئی بنیا تھا۔ بڑا مال دار۔ خوب موٹا تازہ۔ گاؤں بھر میں جتنا اناج ہوتا آدھا اس کی توند میں چلا جاتا۔ گیہوں چنوں سے کوٹھے کے کوٹھے بھرے ہوئے تھے۔ کھیتی کے دن آتے اسی کے آگے سب ہاتھ پسارتے اور وہی بیج دیتا تو ہل چلتے۔ گیہوں بونے کا زمانہ تھا۔ زمینیں طیار تھیں۔ لوگ بیج لینے کے لئے لالہ جی کے گھر پہنچے۔ لالہ جی بڑے نخرے سے بہی لئے گھر کے باہر آئے۔ اور نوکروں کو آواز دی "ارے خوبی! گروں کا دو دھڑ نکال لیا ہو تو آجا۔ تڑکے ہی تڑکے ان لنگاڑوں نے تو مجھے باؤلا کر دیا ہے۔ دے دلا کر ان کا منہ کالا کر۔"

خوبی۔ تجھے تو جلدی پڑی رہے ہے۔ دن تو ہو جانے دے۔ ابھی ہاتھ خالی نہیں

لالہ۔ نا بھائی پہلے ادھر کو چلا آ۔

خوبی۔ تو بھی حاتم کا سالا ہے بول؟

لالہ۔ کوٹھا کھول۔ پر دیکھیو بنر وار رکھیو۔

خوبی دھوتی کو سمیٹ کوٹھے کے پاس گیا۔ اور چاہتا تھا کہ دروازہ کھول کر اندر اترے کہ دھڑ سے پیچھے گر پڑا۔ اور چلایا۔ کھا لیو رے کھا لیو۔ باپ رے یا میں تو کوئی بلا پڑ گئی ہے۔

لالہ جی۔ (خفا ہو کر) ارے تیرے ہی کو تو ملا کھلنے کو بیٹھی ہے نا۔ اتنا بڑا ڈھینگ کا ڈھینگ مرا ہی جائے ہے۔

خوبی۔ (ڈر کے مارے کانپتے ہوئے) گالی نہ نکال۔ بڑا مرد ہے تو کوٹھے میں تو ہی نہ بڑ جا۔

لالہ نے بڑے بہادر بن کر لٹھ ہاتھ میں لے "لا میں جاؤں ہوں ایسا ہی کوئی شیر بیٹھا ہے نا"۔ کہتا ہوا ڈرتے ڈرتے کوٹھے میں جھانکا۔ بلی کے سے بڑے بڑے چمکتے ہوئے دیدے دیکھے تو گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ "ارے باپ رے۔ سچوں ہی۔ یا میں تو کوئی بلا ہے۔"

دوسرے لوگ بنئے کو گھبرایا ہوا دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

ایک۔ ارے کوئی سانپ ہو گا۔

دوسرا۔ نا رے نیول کہیں سے آ پڑا ہے۔

تیسرا۔ چھدا! کیا کھڑا دیکھے ہے۔ مار دے نا۔

چھدا۔ باہر نکلے تو دیکھ لوں۔ بچھو! تو نے تو پرکے دو بلاڑیاں ماری تھیں چلیو میرے بھیا۔

بچھو۔ باہر نکال دے پھر دیکھ ایک ہاتھ میں نہ لٹا دیا ہو۔

اتنے میں آس پاس دہائی مچ گئی کہ بدھو رام کے گھر میں کوئی بلا گھس

آئی ہے۔ سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا کسی کے ہاتھ میں مدھانی ہے تو کسی کے ہاتھ میں گنڈاسا۔ کوئی کدال اٹھائے ہوئے ہے تو کوئی ہل کی پھال ہی لئے چلا آتا ہے، سارے بد حواس ہیں۔ لیکن کوٹھے میں منہ ڈال کر جھانکنے تک کی ہمت نہیں پڑتی۔

ایک۔ بھوانی ڈرے کا ہے کو ہے۔

بھوانی۔ ڈروں ناہوں . . . پرتو آگے کیوں نہ بڑھے۔

دوسرا۔ لٹھیا پھراتا چلا جا۔

تیسرا۔ اور جو بانگ ہوا؟

چوتھا۔ سارا گاؤں جو کھڑا ہے۔

پانچواں۔ واہ رے بہادر دھدا ہی ناچ کے کوٹھے میں لام بندھا ہوا ہے۔

لالہ۔ شاباش بلونت کسّی لے لے۔ سیر دودھ پلاؤں گا۔

بلونت گاؤں والوں کے بڑھاوے چڑھاوے میں آگیا۔ ادھر اس نے کوٹھے میں منڈالا اُدھر لوگوں نے غل مچایا۔ "مار لے مرے جوان۔ بلونتا کی جے۔" بلونت نے بھی بھیانک آواز سے للکارنا شروع کیا۔ "اب نا نکلے بیٹھ گیا گنڈلی منڈلی مار کے۔ آدو دو ہاتھ ہو جائیں۔" یکایک اندر سے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز آئی۔ اور ایک چیخ سنائی دی۔ پھر کیا تھا۔ پھر کیا تھا۔ جوان کے ہاتھ سے لٹھ اور کسّی دونوں چھٹ کر کوٹھے کے اندر ہی گر گئے گھگھیاتا ہوا بھاگا اس کے بھاگتے ہی جتنے سورما کھڑے تھے ان کے اوسان جاتے رہے۔ بھاگنے کو پاؤں نہیں اٹھتے۔ شیر سے نہیں جان کا خوف۔ جس کو دیکھو کھڑا تھر تھر کانپ رہا ہے۔ اب گاؤں کے بڈھے سر جوڑ کر بیٹھے۔

ایک۔ تھانے میں رپٹ لکھادو۔ سرکار بندوبست کر دے گی۔

دوسرا۔ بھولو تیری تو عقل ماری گئی ہے تھانے والوں کی لال لال پگڑیاں دیکھ کر جو وہ اور بگڑ گیا۔

تیسرا۔ تو بڑا افلاطون کا سالا آیا ہے۔ نہیں تو کلکٹر کے ہاں عرضی ڈال دے۔

لالہ۔ دادا۔ پنچایت کی سی باتیں نہ ملاؤ کوئی کو تک ایسا سوچو کہ یہ بلا کوٹھے سے نکل جائے۔ نہیں تو سارے گاؤں کا لہو پی لے گا۔

چوتھا۔ تجھے پنچایت ہی دکھائی دے ہے۔ تلادم تو لے۔ ابھی کام ہوا جائے ہے۔ ٹھالی تو نا بیٹھے۔ منتر لڑا رہے ہیں۔

پہلا۔ ارے خوب یاد آئی۔ او جیار کے جا یو۔ رام لال کا چھورا ابھی گھر میں ہی ہے بلا یو۔ کہیو۔ اپنی بلم ٹیر کی وردی لگا کر آئے۔

دوسرا۔ شادی چودھری تیری کیا بات ہے۔

تیسرا۔ رام لال کا چھورا کون ہوا؟ ۔ وہی نا! جو دوالی پر چھاؤنی سے بھاگ آیا تھا۔

لالہ۔ ہاں دادا۔ اب کانگریس کا بلم ٹیر بن گیا ہے۔

چوتھا۔ گبرو جوان ہے۔ پولس بھی تو اس سے دبے ہے۔ دیکھا نہیں۔ حوالدار کے آگے کیسا چھاتی تان کر کھڑا ہوا تھا۔

کئی لڑکے دوڑ گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں بلم ٹیر صاحب وردی پہنے کمر کسے بلم ہاتھ میں لئے اکڑتے خاں بنے تشریف لائے۔ اور آتے ہی کڑک کر بولے۔ "ارے واہ رے میرے شیرو۔ ذرا سی بلا سے ڈر گئے۔ کوٹھے میں کوئی توپ تو رکھی نہیں جو کھا جائے گی۔ گاؤں میں کبھی لام بندھ گیا تو میں جانوں۔ گھر ہی چھوڑ بھاگ جاؤ گے۔

ایک۔ ارے تو کہیں بلا سے بھی لڑا جائے ہے۔

دوسرا۔ ہماری بہادری کبھی دیکھے تو غدر مچا کے دیکھ۔

تیسرا۔ اب تو اپنی جی داری دکھانا۔ بڑا بلم ٹیر بنا پھرے ہے۔

بلم ٹیر۔ بھائی تم لوگوں نے تو شکارپور والوں کو بھی مات کر دیا

لالہ۔ تو تو شہر شہر کا پانی پی آیا ہے۔ تیری ریس کون کرے۔

بلم ٹیر۔ اچھا کیا بات ہے۔ کون ایسا جرمن کا قیصر آگیا ہوگا کہ ٹھیر کے قبضے میں نہیں آتا۔

لالہ۔ خوبی کہے ہے کوئی بلا کوٹھے میں گھس پڑی ہے۔

بلم ٹیر۔ تم نے بھی دیکھا؟

لالہ۔ رجپوتوں کا جب دم نکلا پڑے ہے تو غریب بنیا کیا دیکھتا۔

بلم ٹیر۔ ارے بھئی آخر معلوم تو ہو۔ ہے کیا؟

لالہ۔ کیا جانے۔ پر ہے کوئی بڑی جبر۔ بلا بلونتا بچ گیا۔ یا جیسے نہ گرتا تو بس کھا ہی گئی تھی۔

بلم ٹیر۔ جانور ہے یا کوئی آدمی؟

ایک۔ اے بھیا یہ بھی پڑ گیا۔ جُٹا آیا تھا تیس مار کھاں کا سالا بن کر۔

بلم ثیر بھی آخر بدھوا کی گڑھی ہی کا تو رہنے والا تھا۔ گھمنڈ میں آکر
جب کوٹھے کی کھڑکی کے پاس پہنچے اور جھانک کر دیکھا تو ایک جگادری
اندر بیٹھا ہے ۔ وہیں سے قہقہہ لگایا۔ لوگوں نے پوچھا: کیوں بھیا کیا مار لیا؟
بلم ثیر۔ اس کا مارنا کون مشکل ہے (مگر نام حضرت کو بھی معلوم
نہ تھا)۔

بلم ثیر کا باپ ۔ کون ہے چھورے ؟

بلم ثیر۔ تمھیں نام سے کیا۔ میں جانوں یہ جانے۔ تو ماردوں نا؟

لالہ۔ پوچھے کیا ہے ۔قابو چل جائے تو مار ہی گرا۔

بلم ثیر صاحب سونٹا بنے ہوئے تھے۔ آدھا دھڑ اندر ڈال کے دونوں ہاتھوں سے بلم گھمانے۔ اُنھوں نے جو یہ نئی آفت دیکھی کہ ایک ڈراؤنی صورت کا آدمی آنکھیں بند کئے بانس پھٹکار رہا ہے ۔ ایکا ایکی پھڑ پھڑا کر اڑا اور جھپٹ کر جو پنجہ مارتا ہے تو بلم ثیر بہادر کی ایک آنکھ نکال لی ۔ ہائے مار ڈالا۔ ارے مر گیا؟ کہتا ہوا رام لال کا بانکا جوان اور دیہاتی سپہ سالار چت گرا۔ آنکھ لہو لہان ۔ حواس غائب ۔

رام لال (روتے ہوئے) ارے رام یہ کیا ہوا ؟

ایک شخص۔ یہ تو بڑا غضب آ گیا ۔ رام لال کی تو کمائی لٹ گئی ۔

لالہ۔ ایسا کیوں کہے ہے۔ لڑائی دنگے میں چوٹ چپٹ آ ہی جائے ہے۔

دوسرا۔ رام لال چودھری چھورے کو تھانے میں لے جا ۔

تیسرا۔ کیا پگلوں کی سی باتیں کرے ہے، ارے بدھوا کی گڑھی میں رہنا ہے کہ نہیں ۔ چھورے کا کیا ہے ۔ لام پہ کام نہ آیا یہاں کام آیا۔ اس بلا کا تو کوئی انتظام سوچو۔

پھر سارے لال بجھکڑ سر ملا کر بیٹھے ۔ بڑی چخ پخ کے بعد سب کا گرو گھنٹال بڈھا بولا ۔ "بھائیو! تم سب کی شرت تو جانی رہی ہے ۔ مجھے تو یہ پڑی ہے کہ میں اگر مر گیا تو تمھیں عقل دینے کون آئے گا؟

لالہ۔ دادا ! پھر تو ہی کچھ بتانا ۔ ہم تو سب تیرے بالک ہیں ۔

بوڑھا۔ لے جبھی تو بتا ہی دوں۔ کوٹھے میں سے پھڑ پھڑانے اور ٹھک ٹھک کی آوازیں آنی شروع ہوئیں ۔

لالہ۔ دادا جلدی بتا ۔ بلا باہر نکل آئی تو ایک کو بھی جیتا نہیں چھوڑے گی ۔

بوڑھا۔ تو جانے ہے میرے بال دھوپ میں دھولے ہوئے ہیں۔ وہ ترکیب بتاؤں کہ پاپ ہی کٹ جائے ۔

لالہ۔ پھر تجھے دادا کون کہے ۔

بوڑھا ۔ رام لال تیرا پوت تو ہار گیا۔ بھگوان نے اس کی یونہی لکھی تھی پر اس بلا سوری کا کھوج ہی کھو دوں نا ۔

رام لال ۔ ارے تو بتا بے بھی ۔

بوڑھا ۔ اچھا تو چھودو۔ کوٹھے میں آگ لگا دو۔

ایک ۔ ارے دادا پہلے کیوں نہ بتایا۔ بات تو ٹھکانے کی ہے۔ گوپالا چلیو میری چوپال سے آگ تو لے آ۔



لوگ دوڑ پڑے۔

کوئی پولیاں لایا۔ کوئی گھاس پھونس کچھ اندر ڈالا کچھ باہر انبار لگا کر آگ دے دی۔ کوٹھا دھڑ دھڑ جلنے لگا۔ کوٹھے کا دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا۔ اُلّو صاحب تو پھڑ پھڑاتے ہوئے یہ جا وہ جا کہیں ویرانے میں جا بیٹھے۔ قصے کا معاملہ چھپروں کے مکان شعلے جو بھڑکے تو ادھر آگ لگی اُدھر آگ لگی۔ یہ چھپر جلا، مکان بھسم ہو۔ تھوڑی دیر میں تقریباً ساری بستی خاک سیاہ ہو گئی۔

صادقین صدق

رُباعیات

ہیں جلوہ میں وہاں کے نظارے دو دو
فطرت کے ہیں مخصوص اشارے دو دو
مٹ جائیں گے یہ چاند ستارے جس وقت
اُبھریں گے نئے چاند ستارے دو دو

بن بن کے نجوم ہوتے جاتے ہیں بھسم
تخلیق کا آتا ہی نہیں ناک میں دم
ماضی میں بنے لاکھوں کروڑوں ہی جہاں
آئندہ ابھی بنیں گے اربوں عالم

تکمیل شدہ دور بھی ہوگا تخلیق
ہستی کا نیا طور بھی ہوگا تخلیق
مٹ جائے گا جس وقت نظامِ شمسی
اک تازہ نظام اور بھی ہوگا تخلیق

ہر عہد پہ تنقید کرے گی یہ نسل
انسان کی تجدید کرے گی یہ نسل
جو نسل کی تفریق سے بالا ہوگا
اُس دور کی تمہید کرے گی یہ نسل

فرمان یہ دیتا ہے زمانے کا نقیب
تعمیر کی زلفوں کو سنوارے تخریب
اُٹھو! کہ تمدّن نے اُٹھایا وہ علَم
جاگو! ابدی خواب سے جاگی تہذیب

طبقاتِ زمانہ میں ہے کیا کیا بے شک
ہر گام پہ ہاں بڑھتی ہی جاتی ہے چمک
تہذیب کے الماس تمدّن کے نگیں
فردا کی چٹانوں میں ہیں پنہاں اب تک

ہیں ناچتے بادل تو دھنک رقص میں ہے
گردوں پہ ستاروں کی چمک رقص میں ہے
انساں وہ مغنی ہے کہ جس کی لے پر
گیتی ہے غزل خواں تو فلک رقص میں ہے

تنویر احمد علوی

زوالِ آدم

گاؤ اے معصوم پرندو!

موت کی اس غمگین وادی میں
زیست کی شمعیں روشن کر دو
اپنی دل کش موسیقی سے
ایک مقدس مستی بھر دو

تیرہ و مسموم فضا میں
نغمہ و نور کے پھول کھلا دو
اپنی شیریں آوازوں سے
امرت کی بوندیں ٹپکا دو

یہ بے باکی یہ آزادی
فطرت کے پیغمبر ہو تم
دُنیا کے معصوم فرشتو
انسانوں کے رہبر ہو تم

اس ارضی جنّت میں ہر سُو
پھیلے ہیں زہرا ور ناپاکی
باغی ہے اللہ کا نائب
یہ آدم یہ پُتلا خاکی

آدم و حوّا عاصی بن کر
نکلے تھے فردوسِ بریں سے
یوں ہی چھُٹ جائے گی شاید
یہ جنّت اس خاک نشیں سے

بھیگ رہی ہے خونِ شفق سے
ہر شے اس تاریک فضا میں
مَوت کے ہونٹوں پر ہے تبسّم
چیخیں ہیں خاموش ہوا میں
گاؤ اے معصوم پرندو!

محی الدین زور قادری

اُردو کے علمی و ادبی رسائل

یہ موضوع اتنا وسیع اور دلچسپ ہے کہ اس پر ایک مبسوط کتاب قلم بند کی جا سکتی ہے اور اس کی اب ضرورت بھی ہے۔ اس لئے کہ اردو میں علمی و ادبی رسائل کا آغاز ہوئے ایک صدی سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے اور اس اثنا میں سینکڑوں رسائل مختلف مقامات سے جاری ہوئے اور اپنی اپنی زندگی گزار کر ختم ہوتے گئے۔ ان میں سے بعضوں نے تو عمر طبعی پائی اور بہت سے بن کھلے ہی مرجھا گئے۔ ہندوستان میں کم سنی کی اموات زیادہ ہوتی رہیں۔ اس لئے اس ملک کی اس عام اور شائستہ زبان کے رسالے بھی شاید اس کلیہ کی زد میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔

ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانے میں اس پوری صدی کے جن اردو رسالوں کی جلدیں اور مختلف شمارے اس وقت تک فراہم ہو سکے ہیں ان کی فہرست مرتب کرنے پر اندازہ ہوا کہ ہماری زبان میں اب تک پانچ سو سے زیادہ رسائل مختلف شہروں میں مختلف اوقات میں نکل چکے ہیں۔ اس فہرست کو سنین اشاعت کے لحاظ سے ترتیب دیا جا رہا ہے لیکن ابھی یہ کام نامکمل ہے۔

اردو رسائل کو ان کی خصوصیات کے پیش نظر پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس مضمون میں ہر دور کی عام خصوصیات اور اہم رسائل کا سرسری ذکر کیا جائیگا۔ بشرط فرصت (خاص کر پہلے دور کے رسائل کی نسبت) تفصیلی مضامین پیش کئے جائیں گے۔

پہلا دور

پہلے دور میں وہ رسائل و جرائد شامل ہیں۔ جو آج سے ایک سو سال قبل یعنی ۱۸۵۰ء سے پہلے اردو میں شائع ہوتے تھے۔ اس زمانے میں اگرچہ کچھ زیادہ رسالے جاری نہیں ہوئے لیکن اس عہد کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس وقت بعض جرائد ایسے نکلتے تھے جو اخبار اور رسالہ دونوں کا کام دیتے تھے۔ ان میں دہلی اردو اخبار، اخبار الحقائق، خیر خواہ ہند، محب ہند، نور علی نور، تحفۃ الحدائق، تعلیم الخلائق، زبدۃ الاخبار، سراج الاخبار، سید الاخبار، مظہر الاخبار اور اعظم الاخبار وغیرہ خاص کر قابل ذکر ہیں لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس دور میں خالص علمی و ادبی رسائل کا وجود ہی نہ تھا۔ اس قسم کے رسالے بھی جاری ہوئے جن میں ماسٹر رامچند کے فوائد الناظرین۔ منشی دھرم نرائن کے قرآن السعدین اور ڈاکٹر فلیمنگ کے رسالۂ طبی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ مؤخر الذکر ایک فنی رسالہ تھا جو حیدرآباد سے شائع ہوتا تھا لیکن اول الذکر دونوں رسالوں میں نہ صرف عام دلچسپی کے سماجی۔ تاریخی اور تنقیدی مضامین ہوا کرتے تھے بلکہ ان میں علوم جدیدہ کی طرف بھی کافی توجہ کی جاتی تھی اور سائنسی موضوعوں پر باتصویر مضامین التزام کے ساتھ شائع کئے جاتے تھے۔

فوائد الناظرین اور قرآن السعدین دونوں دہلی سے نکلتے تھے اور اگرچہ ان کی زبان میں اب کچھ قدامت محسوس ہوتی ہے لیکن طبیعیات

ہیئت، کیمیا اور انجینری کے مسائل پر بھی ان میں تصویروں اور نقشوں سے مدد لے کر جس وضاحت اور خوش اسلوبی سے جدید ترین معلومات پیش کی گئی ہیں وہ اس زمانے کے لحاظ سے بہت قابل قدر اور لائق ستائش تھیں - ان کے مہتمم یعنی مدیر اور اکثر مضمون نگار دہلی کالج کے فیض یافتہ تھے - افسوس ہے کہ اس کالج اور اس کے سپوتوں کو بہت جلد کسی کی بری نظر کھا گئی ورنہ اگر یہی فضا کچھ اور دن باقی رہتی تو اردو رسالے اپنی ارتقائی منزلوں کو اور زیادہ سرعت کے ساتھ طے کر لیتے -

دہلی کے اس قسم کے رسائل و جرائد کی چند مکمل جلدیں اور ان کے ساتھ مدراس کے عمدۃ الاخبار اور اعظم الاخبار کی فائلیں بھی حسن اتفاق سے حیدرآباد میں محفوظ حالت میں مل گئیں - دیگر اقطاع ہند میں اب تک اس عہد کے رسائل و جرائد کے چند ہی شمارے دستیاب ہوئے ہیں اور انہی سے مدد لے کر بعض صاحبوں مثلاً پنڈت کیفی دہلی ڈاکٹر عبدالحق مدراس اور ڈاکٹر ابولیث صدیقی علی گڑھ نے اس موضوع پر مفید مضامین بھی لکھے ہیں - ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے شمالی ہند میں جو تھلکہ مچایا اور وہاں کے سرکاری اور نجی کتب خانوں کو تباہ و برباد کیا اس کی وجہ سے اردو کی کئی مطبوعات تو سرے سے ناپید ہو گئیں یا ایسی نامکمل حالت میں دستیاب ہو رہی ہیں کہ ان کی مدد سے اس رستخیز بیجا سے قبل کی اردو کتابوں اور خاص کر رسائل و جرائد کی تاریخ مکمل اور قطعی طور پر نہیں لکھی جا سکتی - یوں تو مشہور فرانسیسی محب اردو گارساں دتاسی کی تحریروں میں اس دور کے رسائل کی نسبت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں لیکن وہ بھی اس درجہ ناکافی ہیں کہ ان کے مطالعے کے بعد ہماری تشنگی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے -

دوسرا دور

اردو رسائل کا دوسرا دور ۱۸۵۷ء سے شروع ہو کر ۱۹۰۰ء تک ختم کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اردو رسائل کی دنیا میں ایک بڑا انقلاب آیا جس کا ذکر ۱۹۰۰ء کے بعد کے رسائل کے سلسلے میں کیا جائے گا -

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب امن و اطمینان نصیب ہوا تو اکثر مقامات سے اردو میں رسالے جاری ہونے شروع ہوئے ان میں اسباب بغاوت ہند، فرح القلوب، تہذیب الاخلاق، کارنامہ اور حیدرآباد کے افسر، فنون، رفیق، رکن، حسن، معلم نسواں، نسیم دکن، مخزن الفوائد، منتخب روزگار، جلوہ، محبوب، دبدبۂ آصفی۔ مدراس کا جلوہ، سخن، علی گڈھ کا معارف، واحد علی بسمل کا دامن گلچیں لکھنؤ سید علی حیدر کا اصلاح پٹنہ - سید محمد مصطفیٰ خورشید کا انتخاب لکھنؤ - قادر شریف صابر کا دلسوز بنگلور - محمد حامد کا خیالات احباب جے پور - محمد ظفریاب کا نور بصیرت کلکتہ - فضل الدین کا اشاعت لاہور - اور قطب الدین احمد قمر کا نور قمر کوٹہ راجپوتانہ بہت اچھے رسالے تھے -

اس دور کے تقریباً پچاس رسالوں کا پتہ چلا ہے - اور عجیب بات یہ ہے کہ ان میں زیادہ تعداد حیدرآباد ہی سے شائع ہونے والے رسالوں کی ہے - جن میں سے بعض کی نسبت اتنا کہنا کافی ہے کہ افسر ۱۸۵۷ء میں محب حسین کی ادارت میں جاری ہوا - اس کا سالانہ چندہ چار روپے تھا - بعد کو جب یہ بند ہو گیا تو ۱۹۱۰ء سے اسی نام کا ایک دوسرا رسالہ ممتاز یار جنگ کے اہتمام سے جاری ہوا - جس میں مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو نے اپنے قیام حیدرآباد کے ابتدائی زمانے میں کام کیا تھا - افسر سے پہلے ایک صاحب رسالہ' فنون شائع کیا کرتے تھے جن کا نام ایم جونس اور رونق تخلص تھا - یہ رسالہ ۱۸۸۳ء میں جاری ہوا اور کئی سال جاری رہا - چنانچہ اس کے ۱۸۸۶ء کے شمارے بھی دستیاب ہوئے ہیں - اس کا سالانہ چندہ تین روپے چھ آنے تھا - افسر کے بعد محب حسین نے معلم نسواں جاری کیا جو سالہا سال تک حیدرآباد میں طبقہ اناث کی تعلیم و تہذیب کے لئے کام کرتا رہا - اسی زمانے میں محمد عزیز الدین مدرس سررشتہ تعلیمات نے ایک رسالہ رفیق دکن بھی جاری کیا تھا - جو زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکا - رفیق دکن کے مقابلے میں نسیم دکن تقریباً دس سال تک شائع ہوتا رہا - اس کے مدیر میر نادر علی برتر تھے پنڈت رتن ناتھ سرشار

کا دبدبۂ آصفی دراصل مہاراجہ کشن پرشاد کے ابتدائی ذوقِ انشاپردازی کا نتیجہ تھا۔ اسی ذوق کے باعث مہاراجہ بعد میں بھی کئی رسائل مثلاً محبوب الکلام، جلوہ، محبوب اور جشنِ عثمانی وغیرہ خود مرتب کرتے اور دوسروں سے مرتب کراتے رہے

اس زمانے کے ابتدائی رسائل میں مخزن الفوائد اور حسن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اول الذکر کے ایڈیٹر سید حسین بلگرامی عماد الملک تھے۔ اس کی سالانہ قیمت نو روپے تھی اور اس میں ادب کے علاوہ سائنسی موضوعوں پر بھی مضامین درج کئے جاتے تھے۔ موخر الذکر کے ایڈیٹر حسن بن عبداللہ عماد نواز جنگ تھے۔ یہ مسلسل سات سال تک جاری رہا۔ اس کا سالانہ چندہ بارہ روپے تھا۔ اور اس کی یہ خصوصیت اب تک ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے کہ اس کے ہر اچھے مضمون پر لکھنے والے کو ایک اشرفی انعام میں دی جاتی تھی۔

اردو رسائل کے اس دوسرے دور میں حیدرآباد سے باہر جو رسالے شائع ہوتے تھے ان میں اسبابِ بغاوتِ ہند اور مشہور و معروف تہذیب الاخلاق کے بعد معارف علی گڑھ بھی خاص اہمیت کا مالک تھا۔ اس کا چندہ چار روپے سالانہ تھا اور اس کے مدیر مولوی وحید الدین سلیم نے بعد کو اردو کی علمی دنیا میں خاص شہرت حاصل کی۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ آجکل مولانا سید سلیمان ندوی جو رسالہ معارف نکالتے ہیں وہ بہت بعد میں جاری ہوا اور اس کو مولانا سلیم کے معارف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس دور کا گل سرسید کا تہذیب الاخلاق ہے جس نے نہ صرف رسالوں بلکہ اردو نثر کی تاریخ میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ یہ رسالہ اتنا مقبول اور مفید ثابت ہوا کہ نہ صرف اس کے جواب میں کئی رسالے نکالے گئے بلکہ اس کی جلدوں کو بار بار چھپوایا بھی گیا۔ اردو صحافت کی تاریخ میں ایسی مثال کوئی اور نہیں ملتی کہ کسی رسالے کے جملہ شماروں کو بہ تمام و کمال چھپوایا گیا ہو۔ البتہ بعض رسالوں کے انتخابات شائع ہوئے ہیں جن میں شیخ عبدالقادر کے رسالہ "مخزن" کے انتخاب خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔

تیسرا دور - اردو رسائل کا تیسرا دور سنہ ۱۹۰۰ء کے اختتام سے شروع ہوتا ہے اور سنہ ۱۹۲۰ء پر ختم۔ اس مدت کا تعین اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کے اندر اردو کے بعض نہایت بلند پایہ رسائل جاری ہوئے سالہا سال تک چھپتے رہے اور بند بھی ہو گئے۔ مولانا ظفر علی خاں کے رسائل افسانہ، دکن ریویو، اور پنجاب ریویو، سید ناظر الحسن بلگرامی ہوش یار جنگ کا ذخیرہ۔ پیارے لال شاکر میرٹھی کے ادیب اور العصر خان بہادر میر ناصر علی کا صلائے عام، خواجہ غلام الثقلین کا عصرِ جدید خواجہ حسن نظامی کا نظام المشائخ، شیخ عبدالقادر کا مخزن، محمد عباس قادری کا تمدن، محمد نصیر الدین ہجود کا المغمون، ممتاز یار جنگ کا افسر، حسرت موہانی کا اردوئے معلّٰی، احسن مارہروی کا فصیح الملک، محمد امین زبیری کا ظل السلطان، علامہ شبلی کا الندوہ، حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر یار جنگ کے القاسم اور الرشید، نظام شاہ لبیب کا افادہ، مولانا عبداللہ العماری کا البیان، غلام محمد وفا کا تلخ تاجور نجیب آبادی کا تاج الکلام، عبدالحلیم شرر کا دلگداز، اکبر علی کا صحیفہ اور ظفر یاب خاں کا ادیب اور ان کے علاوہ متعدد رسالے اسی زمانہ میں جاری ہوئے اور اپنا اپنا وقت پورا کر کے ختم ہوتے گئے۔

اس زمانے میں واقعہ یہ ہے کہ اردو صحافت اور انشا پردازی معراجِ کمال کو پہنچ گئی اور دلی۔ آگرہ۔ لکھنؤ۔ مدراس اور حیدرآباد کے علاوہ متعدد دوسرے مقامات سے بھی اردو رسالے اور اخبار نکلنے شروع ہوئے۔ یہ اردو رسائل کا ایک زرین دور تھا اور اسی زمانے میں بعض ایسے رسالے بھی نکلے جو اس دور کے بعد برسوں تک جاری رہے اور بعض اب تک بھی جاری ہیں۔ ان میں معارف۔ زمانہ۔ اردو سہ ماہی شباب اردو۔ الناظر وغیرہ خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔

اس دور کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جن اصحاب نے رسالوں کی باگ اپنے ہاتھ میں لی ان میں سے اکثر اعلےٰ پایہ کے ادیب تھے اور انہوں نے ایڈیٹر ہونے کے علاوہ مصنف، انشا پرداز، مورخ اور نقاد کی حیثیت سے بھی اردو دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی۔

یہ دراصل ایک انقلابی دور تھا اس سے قبل کے دور میں سر سید احمد خاں اور ان کے معاصرین نے اردو صحافت اور انشاپردازی کے جو بیج بوئے تھے وہ اس اثنا میں بڑے بڑے تناور درختوں کی شکل میں منتقل

ہو چکے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں جو رسالے شائع ہوئے وہ انہیں درختوں کے پھل اور پھول تھے ۔ اس عہد کے جو رسالے مدت تک اردو ادب کی خدمت کرنے کے بعد بند ہو گئے ان میں دکن ریویو حیدرآباد' مخزن لاہور' صلائے عام دہلی' الندوہ لکھنؤ' ذخیرہ حیدرآباد' دلگداز لکھنؤ' ادیب الہ آباد' البیان لکھنؤ' العصر الہ آباد' تاج حیدرآباد کے نام اردو رسائل کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے ۔ ان رسالوں نے اپنے مختلف شماروں میں اردو نثر و نظم کا ایسا اچھا معیار پیش کیا اور ترتیب و دیدہ زیبی میں ایسی شائستگی کا ثبوت دیا کہ اردو صحافت نے ہندوستان کی علمی و ادبی تاریخ میں صدیوں کے لئے ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ۔

چوتھا دور

اردو رسائل کا چوتھا دور ۱۹۲۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی زمانہ پر مشتمل ہے ۔ اس دور کو ۱۹۴۰ء پر اس لئے ختم کر دیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد بھی اردو ادب کی تاریخ میں نئے نئے رجحانات شروع ہونے لگتے ہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں وہ ہماری نظر میں اتنا نیا اور اہم نہ ہو جتنا کہ ہماری آنے والی نسلوں کو نظر آئے گا ۔

اردو رسائل کے چوتھے دور کو ۱۹۴۰ء پر ختم کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں سینکڑوں رسالے حشرات الارض کی طرح پیدا ہوئے اور ان میں سے اکثر پھر اس طرح ناپید ہو گئے کہ ان کے وجود و عدم کا احساس بھی نہ ہونے پایا ۔ اس زمانہ میں زیادہ تر زندہ دلان پنجاب نے اردو رسالوں کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی ۔ اور ان کی دیدہ زیبی وضع قطع' حجم' اور خاص شماروں کی اشاعت میں وہ رنگا رنگی اور جدت و شگفتگی پیدا کی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اردو رسائل اب انگریزی رسالوں کے ہم پلہ ہو گئے ہیں ۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے رسالوں کی یہ درخشانی ایک دولت مستعجل ثابت ہوئی اور ان کا وہ طمطراق زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکا ۔ بلکہ اسی دور کے اندر ایسا ختم ہوا کہ شاید اب مدت تک پھر اس کے چمکنے کی توقع نہیں ۔

اس دور میں جو اچھے رسالے جاری ہوئے ان میں نیاز فتحپوری کے نگار' میاں بشیر احمد کے ہمایوں' حافظ محمد عالم کے عالمگیر' شوکت علی فہمی کے دین و دنیا' ضامن کنتوری کے لسان الملک' محمد جیب کے شمع' حکیم یوسف حسین کے نیرنگ خیال' مرزا رفیق بیگ کے نمائش' شاہد احمد کے ساقی' انجمن ارباب اردو سرونگر کے تحفہ' بیگم خویشگی کے ہمجولی وغیرہ نے اردو رسائل کے ترقی یافتہ معیار کے قائم رکھنے میں بہت بڑا حصہ لیا ۔ لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیسرے دور میں اردو رسائل بحیثیت مجموعی جس اعلیٰ معیار تک پہنچ چکے تھے چوتھے دور کے رسالے اس معیار سے آگے نہ بڑھ سکے ۔

اس واقعے کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے کہ کثرت تعداد کے لحاظ سے ہمارے رسالوں کا چوتھا دور بہت نمایاں ہے اور ان بیس سالوں کے اندر جو پچاسوں اردو رسالے جاری ہوئے ان کی فہرست ہی کے لئے کئی صفحات درکار ہوں گے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں نصف سے زیادہ تعداد ایسے رسائل کی ہے جن کے صرف نام ہی نام رہ گئے ہیں ۔ عجیب عجیب ناموں کا یہ طومار ہمارے نوجوانوں کی اس ہوس ناک ذہنیت کا آئینہ دار ہے کہ خدا خدا کر کے جہاں پڑھنے لکھنے کے سلیقے سے روشناس ہوئے اور چلے رسالہ نکالنے ۔ اگر کوئی اس عہد کے رسالوں کی طویل فہرست پر نظر دوڑانے کی زحمت گوارا کرے تو اس کو محسوس ہوگا کہ اکثر و بیشتر رسائل کے ایڈیٹروں کے نام ان رسائل کے ناموں سے زیادہ غیر معروف ہیں ۔ جن لوگوں نے کبھی کوئی مضمون کسی رسالے میں نہیں چھپوایا اور اپنی انشا پردازی کا آغاز اپنے ہی ذاتی رسالے سے کرنا چاہا تو ظاہر ہے کہ ان کا رسالہ کیونکر چل سکتا ہے ۔ جو شخص ایک سوار بن کر رسالوں کے میدان میں اترنے سے پہلے ہی شہسواری کے کرتب دکھانا چاہتا ہو تو اس کا جو حشر ہو سکتا ہے وہی ان ایڈیٹروں کو بھی نصیب ہوا ۔ چنانچہ اس قسم کی جرأت رندانہ سے کام لینے والوں کے سارے رسالے اڑیل ٹٹو ثابت ہوئے ۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ایڈیٹر ایک ادبی شہسوار بن سکا اور نہ رسالہ کی گاڑی آگے بڑھ سکی ۔

پانچواں دور

اردو رسائل کا پانچواں دور دور حاضر ہے جس پر ابھی کچھ عرصہ بعد تفصیل سے کہا جا سکے گا ۔ اتنا تو اس وقت بھی واضح ہے کہ ۱۹۴۰ء کے بعد سے ایک نیا دور شروع

ہو چکا ہے جس کو اگرچہ ہم میں سے بعض پہلے پہلے ناپسند کرتے رہے لیکن اب پسند اور ناپسند کا زمانہ نہیں رہا تھا۔ مجبوراً زہر کے گھونٹ بھی بعض وقت گوارا کرنے پڑتے ہیں۔ اور کیا تعجب کہ بعض نیم مردہ جسموں کے لئے یہ زہر ہی تریاق کا کام کر جائے۔ جب چور مارکٹ بند ہو جاتے ہیں تو مجبوراً سب کو لال چاول ہی کھانے پڑتے ہیں۔ اور اس تبدیلی سے پرانے پرانے روگیوں کو بعض وقت فائدہ ہی پہنچ جاتا ہے۔

یوں تو اس عہد کے اکثر و بیشتر رسائل کا رنگ بدلتا رہا ہے اور ادب برائے زندگی کے نظریہ کی طرف میلان ترقی پذیر رہا لیکن خصوصیت کے ساتھ نیا ادب، آج کل، نیا دور، ادب لطیف، ساقی، منزل اور ایشیا بدلتے ہوئے رجحانات کی علمبرداری کرتے رہے۔ اور چونکہ یہ رنگ ابھی پختہ نہیں ہوا ہے اس لئے بعض دفعہ رسالوں میں ترقی پسندی کے بہانے سے ایسی نظمیں، افسانے، اور مضامین بھی شائع ہوتے رہے جو ترقی پسندوں کے مسلک کو نقصان پہنچاتے رہے۔ اور قدامت پسندوں کے جذبات اور احساس شائستگی کو ٹھیس لگتی رہی۔

جو رسالے اپنی قدیم روش پر قائم ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں جو خاص خاص طبقوں اور گروہوں کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر کافی سے زیادہ بدنام ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے ہی صوبے یا حلقے کے ادیبوں کے نام اور کاموں کو چمکانے میں منہمک رہے۔ اور دوسروں کے بہتر سے بہتر کارنامے ان کے رسالے کے چشمے میں انہیں حقیر ہی نظر آتے رہے۔ یہ ایک سفر رجحان تھا جو گزشتہ دس پندرہ سال میں رونما ہوا اور اس رجحان نے اردو کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

اس قسم کے بدنام رسالوں میں پنجاب کے بعض اوسط درجے کے رسائل کے ساتھ ساتھ پٹنے کا معاصر، لکھنؤ کا نگار، اور انجمن ترقی اردو کا اردو بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں بعض ایسے رسالوں کا تذکرہ غیر ضروری سمجھا گیا جو کسی بک ڈپو یا اشاعت گھر کی مطبوعات کی شہرت کے لئے شائع ہوتے رہے اور اس رجحان میں اضافہ کرتے رہے۔ ان حالات کے پیش نظر تقسیم ہند سے قبل صرف چند ہی رسائل ایسے نظر آتے رہے جن سے اردو صحافت کا وقار قائم رہا اور توقع ہے کہ آئندہ بھی باقی رہے گا۔ ان میں معارف، زمانہ، آجکل، جامعہ، عصمت، سیاست، شاعر، سب رس اور نئی زندگی کے نام مدت تک یاد رہیں گے

تقسیم ہند کے بعد سے اردو رسائل کی دنیا بھی بدل گئی ہے اور اب ان کی تاریخ کا چھٹا دور شروع ہو رہا ہے۔ لیکن یہ دور ابھی بن رہا ہے اور دو تین سال کے اس عبوری زمانے میں جہاں بعض رسائل بند ہوئے چند نئے ماہ نامے جاری بھی ہوئے ہیں اس لئے اس دور کی نسبت صحیح اندازہ کچھ زمانے کے بعد ہی ہو سکے گا۔

کچھ اپنے متعلق

اس سال نامے کو ملاحظہ فرمائیے اور اس کے باب میں اپنی رائے سے ادارے کو مطلع فرمائیے۔ ضخامت سے غالباً آپ کو مایوسی نہ ہوگی۔ لیکن اس پر بھی عام شماروں سے اس شمارے کی ضخامت زیادہ ہے۔ رنگین تصویریں، رنگین سرورق۔ آرٹ پیپر پر تصویروں کے آٹھ صفحے سال نامے کو دیدہ زیب بنا رہے ہیں۔ قیمت وہی عام شماروں جتنی ہے۔ "آج کل" کی توسیع اشاعت ہر بہی خواہ اردو اور ہر بہی خواہ ملک کا فرض ہے۔ "آج کل" کی دلچسپیوں اور اس کی ادبی شان میں اضافے کے منصوبے اب زیر عمل ہیں۔ ہر اچھی اور مخلص تجویز پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔ اپنے احباب سے اس رسالے کی خریداری کی فرمائش کیجئے۔ "آج کل" آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ یہ فرقہ داری کی لعنت کا مخالف، ہندوستان کی آزادی کا علمبردار اور ادبی گروہ بندی سے بے نیاز ہے۔

(ادارہ)

دیوندر ستیارتھی

میلے بھی آتے رہیں

چل چلیے جڑک دے میلے
نی منڈا تیرا میں چُک لوں

یہ ایک پنجابی لوک گیت ہے جو آج بھی میرے ذہن میں انگڑائی لے رہا ہے جی ہاں، یہ کچھ کم دلدار تصویر نہیں۔ میلے کے انتظار میں کتنے دن بیت گئے آخر یہ دن آ گیا۔ جڑک گاؤں میں میلہ لگتا آیا ہے۔ برسوں سے صدیوں سے۔ اب کے بھی تو یہ میلہ ضرور لگے گا۔ جب دور و نزدیک کے دیہات سے لوگ یہاں کھنچے چلے آئیں گے۔ ننھے کی ماں سوچتی ہے کہ اب کے وہ میلے میں شامل نہ ہو سکے گی۔ ننھے کو اٹھا کر میلے کا راستہ طے کرنا آسان نہیں۔ پاس سے کوئی منچلا کہہ اُٹھتا ہے۔ چلو جڑک کے میلے چلیں ناری تیرے ننھے کو میں اٹھا لوں گا۔ گیت اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ ننھے کی ماں نے کیا جواب دیا ہوگا شاید وہ اس شرط پر جڑک کے میلے میں چلنے پر رضامند ہو گئی ہوگی۔

ہندوستان کے ہر صوبے میں اجتماعی تفریح اور سرود کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ رواداری اور ربط و تعاون کے پیش نظر جہاں سماجی شعور نے گاؤں کو ایک مدت تک خودنگر اور خودکفیل بنائے رکھا، وہاں بہت سے اداروں کا تصور قائم کیا۔ جن کی بدولت دھرتی کے بیٹے کو اس کی حقیقی شکل میں دیکھا جا سکے۔ جنتا کے خواب و ارمان دیس دیس میں جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن تیوہاروں اور میلوں کا رُوپ ہر کہیں یکساں طور پر اُجاگر ہوتا ہے۔ اور جہاں تک رائے عامہ کا تعلق ہے ان تفریحی اداروں کا مستقبل بہت روشن نظر آتا ہے۔

گرد و نواح کے لوگ کسی ایک مرکزی مقام پر کھنچے چلے آتے ہیں۔ زندگی کی تکلیفوں کو فراموش کرتے ہوئے وہ امن چین کے جذبات سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ گانا، بجانا، ناچنا، ہنسنا اور دو گھڑی موج کر لینا یہی جنتا کی تفریحی گہما گہمی کا سندیسہ معلوم ہوتا ہے۔ گاؤں گاؤں کی چال ڈھال اور بولی ٹھولی اس موقع پر بہترین آئینہ داری کرتی ہے۔ جیسے ایک مرد دوسرے مرد سے ملتا ہے اسی طرح ایک گاؤں دوسرے گاؤں سے اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے ملتا ہے۔ میلوں پر ہوئی یہ ملاقاتیں زندگی کی یکسانی میں تبدیلی کا عنصر پیدا کرتے ہوئے جنتا کے فلسفۂ حیات میں نئے خیالات اور مشاہدات کا اضافہ کرتی ہیں بلکہ یوں کہنا ہوگا کہ انھیں تیوہاروں اور میلوں کی بدولت جنتا زندگی کا ذائقہ بدلتی رہتی ہے۔

ہاٹ بازار

صداقت اور خلوص کی گھلاوٹ کے بغیر کسی اجتماعی تفریحی ادارے کا اصل مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ مختلف میلوں کی الگ الگ نوعیت دیکھنے میں آتی ہے۔ کس میلے کی ابتدا کیسے ہوئی۔ یہ ایک لمبا مضمون ہے۔ ہاں جہاں تک ان کی نوعیت کا تعلق ہے۔ بیشتر ہندوستانی میلے ایسے ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی دیوی دیوتا یا کسی دھارمک، سماجی یا موسمی تیوہار سے جوڑ دیا گیا ہے۔ بہت سے میلے مویشیوں اور دیہاتی دستکاری یا دیگر پیداوار کی خرید و فروخت کی غرض سے وجود میں آئے۔ ابھی اگلے ہی روز

ایک صاحب سے جو اس سلسلے کی صحیح معلومات رکھتے ہیں، پتہ چلا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مویشیوں اور دیہاتی دستکاری یا دیگر پیداوار کی خرید و فروخت کی غرض سے کل سترہ سو میلے لگتے ہیں۔ اور اگر ان چیدہ چیدہ بازاروں کی تعداد بھی ان میں شامل کر لی جائے جن کا رواج خاص طور پر آسام، بنگال، اڑیسہ اور جنوبی ہند میں پایا جاتا ہے تو ان کی گنتی کے مقابلے میں دھارمک میلوں کی تعداد کم نظر آنے لگے گی۔ یہ بازار ہر ہفتہ لگتے ہیں اور چیدہ چیدہ بازاروں میں گرد و نواح کے پانچ پانچ دس دس اور کبھی کبھی بیس بیس دیہات کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ مرد، عورتیں بچے، جوان اور بوڑھے سب نظر آتے ہیں۔ یہاں طرح طرح کی چیزیں بکتی ہیں اور گاؤں کا تمدنی اقتدار بڑھتا ہے۔ یہاں بھی میل جول کی بنسری بج اٹھتی ہے اور آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ گاؤں والوں کی پیشانیوں پر چمک آجاتی ہے۔

جنگلوں اور پہاڑوں میں جہاں ہندوستان کے آدی باسی قبیلے بسے ہوئے ہیں، یہ بازار اور بھی محبوب اور عجیب ہوتے ہیں۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ دو دلوں کی محبت سونے کی ترازو میں تلتی نظر آجائے اور والدین کی صلاح پوچھے بغیر ہی لڑکا اپنی محبوبہ کو کہیں بھگا لے جائے۔

قبائلی لوگ گیتوں میں اغوا کا ذکر کرتے ہوئے بازار کا پس منظر نہایت احتیاط سے اجاگر کیا جاتا ہے۔ اغوا کا نتیجہ ہمیشہ لڑکے لڑکی کے حق میں نکلتا ہے۔

وہ گاؤں جہاں بازار لگتا ہے، خوش قسمت سمجھا جاتا ہے اگر اس گاؤں کو آپ بیتی لکھنے کا موقع ملے تو وہ ایک مشہور ادیب کے الفاظ میں کہہ سکتا ہے:۔ "میں گویا شہد کا چھتہ ہوں۔ جس طرح شہد کی مکھیاں شہد لے کر آتی ہیں۔ سیدھے سادے اور گمنام انسان اپنے تجربے اور مشاہدے لے کر میرے پاس آتے ہیں۔ اور اپنے تحفوں سے میری روح کو مالا مال کرتے ہیں۔"

اُمید کی کرن چمک اُٹھتی ہے

دھارمک میلوں کے ساتھ صدیوں کے سماجی شعور کی داستانیں وابستہ ہیں۔ کبھی کبھی تو کسی دریا کے کنارے میلے کا ٹھاٹھ دیکھ کر جی کہہ اٹھتا ہے کہ جگہ کے انتخاب میں کلام نہیں دیوی یا دیوتا کا نام لے لے کر لوگ اشنان کرتے ہیں۔ اور پھر پنڈوں اور پجاریوں کی معرفت دیوی یا دیوتا کی مورتی کے سامنے پرارتھنا کے بول لب پر لاتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مورتی زندہ انسان کی طرح مسکرا اٹھی ہے۔ اور اس نے پرارتھنا کرنے والے کی پرارتھنا قبول کر لی ہے۔ اس کے بعد کھیل۔ تماشے اور ناچ گانے کا دور شروع ہوتا ہے۔ بچے، بوڑھے۔ جوان سب خوش نظر آتے ہیں ایک بچہ کھلونے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے، کبھی ایک بڈھے کی آنکھوں میں اپنا بچپن پھر جاتا ہے۔ جب خود اس کے ہاتھ بھی کسی ایسے ہی میلے میں کھلونے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ کبھی ایک لڑکی کی آنکھوں میں پُرجوش نشے کی جھلکیاں جھلک اٹھتی ہیں۔ اور پاس کھڑی اس کی ماں کو جوانی کے دن یاد آجاتے ہیں۔ جیسے وہ کہنا چاہتی ہو کہ میں نے بہت کچھ کھو دیا۔ لیکن دیوتا کا لاکھ لاکھ دھنیہ باد ہے۔ میں نے بہت پایا بھی تو ہے۔ مندر کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے بڈھے کی آنکھیں یہ کہتی نظر آتی ہیں کہ یہ آخری میلہ ہے۔ جو میں دیکھ رہا ہوں۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں امید کی کرن چمک اٹھتی ہے اور وہ یہ سوچ کر جی ہی جی میں مسکراتا ہے کہ اگلا میلہ بھی وہ دیوتا کے آشیرباد سے ضرور دیکھنے آئے گا۔

زندگی کی نئی ترازو

سماجی میلوں میں رونق کا یہ عالم ہوتا ہے کہ یہ بات بار بار لب پر آتی ہے کہ انسان کا حقیقی و بنیادی تو اجتماعی تفریح ہے۔ اور اس کے بغیر انسان اپنے اجتماعی دکھ درد سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ حق تو یہ ہے کہ جدید انسان کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قدامت اور روایت کو سراسر مٹا ڈالنا درست نہیں۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ روایت اور جدت کے سنگم پر نئی زندگی کا تصور قائم کیا جائے۔

لوک گیت اور لوک ناچ میلوں میں والہانہ زندگی کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ یہی تو جنتا کی اصل پونجی ہیں۔ اس پونجی سے اور بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ نئے حالات کے پیش نظر نئے گیت اور ناچ وضع کئے جانے چاہئیں۔

بہترین سماجی میلے آدی باسیوں کے دیہات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ میلے لوک ناچ کے جشن ہوتے ہیں۔ قبائلی جنتا کے ہاں لوک ناچ

بھی قبائلی عقیدے کا جزو خاص ہے۔ اور دنیا کے بیشتر آدی باسی قبیلوں کی طرح ہندوستان میں بھی گاؤں کی بہبود اور فصلوں کی بہتری کے لئے لوک ناچ سے جادو ٹونے کی حقیقتیں وابستہ سمجھی جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی لوک ناچ سے منکر ہو جائے تو دیوتا ناراض ہو جائیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ گاؤں اجڑتا چلا جائے گا۔ اور وہی دھرتی جو نئے اناج کے دانے اگلنے سے کبھی انکار نہیں کرتی۔ بانجھ عورت کی طرح نظر آنے لگے گی۔ یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

ہمارے آدی باسی قبیلے نئے حالات سے بے بہرہ ہیں۔ اور زندگی کا بوجھ ان کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ بھاری ہو گیا ہے۔ اور اس بات سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ اگر ہم اجتماعی طور پر ملک کو آگے لے جانا چاہتے ہیں تو آدی باسیوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ ہم انھیں قدم بڑھانے کے لئے آواز دیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہم نئے مطالبات میں انھیں برابر کا شریک سمجھیں۔ اگر تھوڑی کوشش کی جائے تو آدی باسیوں کے لوک ناچ اور میلے ٹھیلے بہت معاون ثابت ہو سکتے ہیں ملک کے فن کاروں کو چاہیئے کہ لوک ناچ کے بہترین نمونے شہروں کی رنگ بھومی پر دکھا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کے عوض وہ آدی باسیوں کے وہاں بھی جائیں اور اس لوک ناچ کی نوک پلک سنوار کر اور انھیں نئے معانی سے سرفراز کر کے دکھائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود بخود یہ نئے ناچ قبائلی جنتا میں رائج ہو جائیں گے۔ یہ کام ایسے ناچوں کے فلم دکھا کر بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قبائلی جنتا زندہ ربط و تعاون کو زیادہ پسند کرے گی۔ بہت جلد ہم دیکھیں گے کہ آدی باسی بچے بوڑھے اور جوان زندگی کو نئی ترازو میں تولنے لگے ہیں۔ ان کا معیار بلند ہو جائے گا۔ اور ان کے لوک ناچ اور میلے نئے تقاضوں اور مقصدوں کی آئینہ داری کرتے نظر آئیں گے۔

خوشی کا فلسفہ

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں گھوم پھر کر میں نے بہت سے میلے دیکھے ہیں۔ آج میرے ذہن کے کلا بھون میں بہت سی اہم اور غیر اہم تصویریں ابھرتی ہیں۔ ایسا کوئی میلہ میرے دیکھنے میں نہیں آیا جہاں عورتیں شامل نہ ہوئی ہوں۔ عورتوں کو گاؤں سے ایک ساتھ چلنا چاہیئے۔ کسی بڑھیا کا یہ اپدیش فضا میں گونج اٹھتا ہے۔ لیکن سب عورتیں بھلا ایک جھنڈ میں کیسے چل سکتی ہیں۔ ایک کے دو دو بلکہ تین تین جھنڈ نظر آتے ہیں۔ ہر جھنڈ الگ الگ گیت چھیڑ دیتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کوئی انھیں اتنا تو سمجھا دے کہ یوں تو تینوں کے تینوں گیت متضاد آوازوں کے شور میں ڈوب جاتے ہیں۔ لیکن کسے اتنی فرصت کہ انھیں سمجھائے۔ جلد جلد قدم اٹھ رہے ہیں۔ راستے پر دھول کا بادل اٹھتا ہے۔ دبتا ہے اور پھر اٹھتا ہے۔ کسے اتنی فرصت کہ انھیں دھول کا دھیان دلائے۔ کپڑوں کے پکے بنیادی رنگ دھول کے باوجود نظروں میں اجاگر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ گیت اور قہقہے اور سب رنگ کا رچاؤ توانائی کے اعتبار سے قلم برداشتہ تحریر کا لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ خوش کامیوں اور دل شگفتگیوں کے ہزاروں منظر سمٹ کر کسی نہ کسی دلہن کے مکھڑے پر متحرک اٹھتے ہیں۔ جب کہ اس کی پائل کسی نئی گت سے بج اٹھتی ہے۔ وہ کیوں کسی سے پیچھے رہ جائے۔ وہ چونک کر پیچھے کی طرف دیکھنے لگتی ہے جیسے کسی نے اس کا دامن ناز تھام لیا ہو۔ بار بار گھونگھٹ الٹ کر وہ پیچھے کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔ جیسے نظارۂ حسن کی دعوت دینے کے ڈھنگ کی مشق کر رہی ہو۔ ساتھ ساتھ بڑھیا چلی جا رہی ہے۔ جو جیتے جی دل کو مرنے دینا نہیں چاہتی۔ سوچتی ہے۔ میرے بھاگ میں یہ میلہ دیکھنا بھی بدا تھا۔ اپنی غبار آلودہ پیشانی کو وہ بار بار صاف کر لیتی ہے۔ اور اس کی پیشانی کی جھریاں جو کھیت میں ہل کی لکیروں کی یاد دلاتی ہیں اور بھی اجاگر ہو جاتی ہیں۔ وہ بار بار دلہن کی طرف دیکھتی ہے۔ جیسے اس سے کہہ رہی ہو کہ بیٹی یہ جیون اور جوبن بھی ایک میلہ ہے اور اس میلے میں سب سے بڑا بھاگیہ شالی وہی ہے جو سب سے زیادہ آنند منائے ایسے ایسے بیسیوں منظر ذہن میں ابھرتے ہیں۔ ذہن کی دیواریں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ فن کار بڑھ بڑھ کر ہاتھ چلا رہا ہے رنگ ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔ اور موقلم ہے کہ کبھی پرانا نہیں ہوتا۔

دور جدید کے فرانسیسی ادیب آندرے ژید نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں۔ بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔ یعنی ہماری انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر ہم ہی تک محدود

نہیں رہتا۔ وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے۔ اس لئے ہمارا اخلاقی فرض ہوا کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد آئندہ سے ذہد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت سینکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر بھی غبار آجائے گا تو سینکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے۔ وہ پورے مجموعے کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے۔ لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوتی ہم جو کچھ اپنے لئے کرتے ہیں اس میں بھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکٹھا ہو جائیں گے ہم خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں "

"بھگوریاہاٹ"

اس وقت بھیلوں کے بھگوریاہاٹ کے ڈھول کی آواز میرے ذہن میں گونج رہی ہے۔ یہ میلہ ہولی سے پہلے لگتا ہے۔ جس میں مرد بہترین لباس پہن کر آتے ہیں اور ہاتھوں میں کمان سنبھال کر گھیرے میں ناچتے ہیں۔ اس ناچ میں عورتیں شامل نہیں ہوتیں۔ اگرچہ میلے میں عورتیں بہت بڑی تعداد میں آتی ہیں اور وہ تماشائیوں کے حلقے میں کھڑی ہو کر ناچ کا لطف اٹھاتی ہیں۔ ڈھول کی آواز ناچ کی گت قائم کرتی ہے۔ خوشی، غم اور خوف کا رنگ ڈھول پر الگ الگ دکھایا جاتا ہے۔ مثلاً اگر خوشی کا ٹھاٹھ دکھانا منظور ہو تو ڈھولکیا دونوں ہاتھوں سے ڈھول بجاتا ہے۔ غم کی کیفیت طاری کرنا ہو تو وہ صرف ایک ہاتھ سے ڈھول بجائے گا۔ خوف کے موقع پر بھی دونوں ہاتھوں سے ڈھول بجاتے ہیں۔ لیکن اس وقت ہاتھ بہت جلد اور الٹی گت پر چلائے جاتے ہیں۔ بھیلوں کی روایتیں ڈھول کی مرہون منت ہیں خوف اور خطرے کا ڈھول جب ایک گاؤں میں بج اٹھتا تھا تو اس کی آواز گرد و نواح تک جا پہنچتی تھی اور جب ہر طرف قبائلی ڈھول اسی گت پر بج اٹھتا تھا تو لوگ یہ محسوس کرتے تھے کہ ہم اکیلے نہیں ہیں اور مل کر ہر بلا سے نمٹ سکتے ہیں۔ بھگوریاہاٹ کا ناچ عروج پر پہنچنے سے پہلے کبھی کبھی لڑکیاں ناچنے والے جوانوں کے چہروں کا جائزہ لیتی ہوئی اپنے لئے دولہا چن لیتی ہیں۔ اگرچہ بڑے بوڑھے ہمیشہ اس قسم کی شادیوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ زندگی ہے کہ دریا کی طرح اپنے ہی راستے پر بہتی ہے۔ بھگوریاہاٹ کا بھیلوں کی قبائلی زندگی کی نشو و نما میں بہت ہاتھ ہے ہر بھیل یہ سمجھتا ہے کہ "بھگوریاہاٹ کا ناچ قبیلے کی یک جہتی کا نغمہ ہے"

جنتا کا عقیدہ

آخر میں گاؤں کے میلے ٹھیلے کی زندہ تصویر دکھلانے کی بات فراموش نہیں کی جا سکتی اس تصویر میں خوشی اور تفریح کے علاوہ کچھ لوگوں کی ہاتھا پائی اور شراب پی کر ایک دوسرے کی آزادی پر ڈاکہ ڈالنے کی جھلکیاں بھی شامل ہیں۔ اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے اندر نیکی اور بدی کی صفات پنہاں رہتی ہیں۔ کبھی نیکی ابھر آجاتی ہے تو کبھی بدی۔ تصویر کے دوسرے رخ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جنتا کی اجتماعی آواز نہ کبھی شرابیوں کا ساتھ دیتی ہے، نہ اُن کا جو برابری اور آپس داری کے فلسفے سے منہ موڑ کر ایک دوسرے کی آزادی چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔

صداقت اور خلوص کی گھلاوٹ کی بدولت جنتا کا یہی عقیدہ ہے انسان بنیادی طور پر نیک واقع ہوا ہے۔ اور صرف بری صحبت کے باعث وہ بدی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ اور سو برائیوں کے باوجود اسے پھر سے سدھارا جا سکتا ہے۔ یہی عقیدہ جنتا کو یہ حق بخشتا ہے کہ وہ تیوہاروں اور میلوں کے موقع پر خوب گہما گہمی دکھلائے۔ اور نیک اور امن پسند انسان کا چہرہ اس پس منظر میں ابھرتا چلا جاتا ہے جو بآواز بلند پکار کر کہنا چاہتا ہے۔ میلے بھی آتے رہیں۔

نئی کتابیں اور رسالے

کتابیں

مرزا شوق لکھنوی دو تنقیدی مقالوں کا مجموعہ ہے۔ جو خواجہ احمد فاروقی نے مثنوی زہرِ عشق اور مثنوی بہارِ عشق پر لکھے ہیں۔ مقدمہ جناب نیاز فتحپوری نے لکھا ہے اور دیباچہ حضرت جوش ملیح آبادی نے۔ شوق کے متعلق جناب احسن لکھنوی خواجہ الطاف حسین حالی، حضرت مجنوں گورکھپوری اور جناب آل احمد سرور کے مقالات کے مختصر اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں۔

ان چند سطور میں جنھیں نہ تبصرہ کہا جا سکتا ہے نہ تنقید۔ ہمیں فقط یہ کہنا مقصود ہے کہ خواجہ احمد فاروقی نے ان مقالوں کو کتابی صورت میں پیش کر کے ایک بہت بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔ انیسویں صدی کے لکھنؤ کی شاعری میں جب رعایت لفظی کا جادو بے جا استعمال گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ مرزا شوق کی مثنویاں ایک معجزے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ہمارے ادب کی بدقسمتی ہے کہ اس دور کے نقادوں نے یہ کہہ کر کہ یہ مثنویاں اخلاقی معیار پر پوری نہیں اترتیں انھیں نظر انداز کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک شوق کی مثنویاں اس انداز سے منظرِ عام پر نہ آ سکیں جس طرح سے انھیں آنا چاہیئے تھا۔ شعر میں تو یہ دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کہنے والے نے کس طرح کہا ہے نہ یہ کہ کیا کہا ہے۔ اگر اندازِ بیان شاعرانہ نہیں تو پھر شعر کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسلوب پر نگاہ ڈالے بغیر ادب کی کسی صنف کو غیر اخلاقی کہہ کر نظر انداز کر دینا تو بہت بڑی بے انصافی ہے۔ اور مرزا شوق کی مثنویاں اسی بے انصافی کا شکار ہوئی ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی نے مرزا شوق کو ایک فن کار کی صورت میں پیش کیا ہے اور ایک فن کار کی حیثیت سے ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔ آپ نے مندرجہ بالا دونوں مثنویوں کا موازنہ بھی کیا ہے۔ اور اس ذمہ داری کو بڑی کامیابی سے نباہا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ چھوٹی سی کتاب فاروقی صاحب کے اور ضخیم مجموعوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ اور کتابوں کی صورت میں فن کے ایسے گوشوں کو بے نقاب کرتے چلے جائیں گے جو طلبا کے ادب کی نگاہوں سے ابھی تک پوشیدہ ہیں۔ صفحات ۸۸ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ مندرجہ ذیل پتوں سے مل سکتی ہے۔ محمد اسلم ۴ عماد الملک روڈ، یونیورسٹی علی گڑھ۔ اردو بک ڈپو بچھراؤں ضلع مراد آباد۔ یو۔ پی۔

تلخیاں مصنفہ ساحر لدھیانوی۔ قیمت تین روپے آٹھ آنہ۔ ناشر مکتبہ شاہراہ۔ اردو بازار۔ دہلی۔ ساحر موجودہ دور کے محبوب ترین شاعروں میں سے ہے۔ "تلخیاں" کا یہ چھٹا ایڈیشن تقسیم ہند کے بعد پہلا ہندوستانی ایڈیشن ہے۔ جس میں ساحر کی وہ تمام نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو اس نے اس وقت تک کہی ہیں۔ "تلخیاں" کی بعض نظموں سے اگرچہ ہمیں نظریاتی طور پر اختلاف ہے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کہ ساحر کی نظمیں اردو کے شعری ادب میں ایک بہت بڑا اضافہ ہیں۔ ساحر نے ہیئت کی پابندیوں کو برقرار رکھتے ہوئے اردو شاعری کو ایک نیا اسلوب اور نیا اندازِ بیان دیا ہے۔ اور اس کا ہر اہلِ نظر کو اعتراف ہے۔ کتاب آرٹ پیپر پر شائع ہوئی ہے۔ جو مکتبہ شاہراہ کی خوش مذاقی کی دلیل ہے۔ کتابت۔ طباعت۔ جلد اور جلد پوش (جسے نہ جانے بعض لوگ کیوں گرد پوش کہتے ہیں) کی نفاست اس امر کا ثبوت ہے کہ مکتبہ شاہراہ معیاری مواد کو سلیقے سے پیش کرنے کے فن سے بھی واقف ہے۔

۱۹۴۹ء کا بہترین ادب مرتبہ چودھری برکت علی۔ میرزا ادیب اور قتیل شفائی۔ گزشتہ برس کی طرح اب کے بھی مکتبۂ اردو لاہور نے ۱۹۴۹ء کے ادب کا انتخاب اس مجموعہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اردو کی ٹھوس خدمت کرنے والے اداروں میں مکتبۂ اردو لاہور کا نام پیش پیش ہے اور یہ مجموعہ جو قریباً ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے اسی ذوق کا ایک مظہر ہے۔ مرتبین کا ذوقِ ادب اور خوش مذاقی اس کتاب کے معیاری ہونے کی دلیل ہے۔ یہ کہنا تو آسان نہیں کہ ۱۹۴۹ء کا تمام معیاری اور منتخب شعری اور نثری ادب اس مجموعے میں موجود ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو نظمیں

غزلیں۔ مقالے اور افسانے اس میں شامل کئے گئے ہیں وہ ایک کڑے انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ قیمت چھ روپے ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ اردو لاہور۔

جہاں میں رہتا ہوں مصنفہ مہندر ناتھ۔ صفحات ۲۱۵ قیمت تین روپے۔ ناشر مکتبہ سلطانی بمبئی۔

مہندر ناتھ کا شمار اردو کے ممتاز ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس سے قبل ان کے افسانوں کے پانچ مجموعے چھپ چکے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ ان کے نئے افسانوں پر مشتمل ہے۔

دکھتی رگیں مجموعہ ہے عادل رشید کے افسانوں کا۔ عادل رشید کو متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کی عکاسی کرنے میں خاص مہارت حاصل ہے اور اس مجموعے کے اکثر افسانوں میں ان کی یہ عکاسی اپنے پورے عروج پر نظر آتی ہے شروع میں مہندر ناتھ کا ایک مختصر سا دیباچہ شامل ہے جس میں عادل رشید کے فن پر سرسری تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ سلطانی بمبئی ۳۔

رسالے

ماحول (دوماہی سلسلہ) محترمہ حمیدہ سلطان اور ظفر ادیب کی زیرِ ادارت دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ پہلا شمارہ تابناک مستقبل کا پتہ دے رہا ہے۔ مقالہ نگاروں۔ شعراء اور افسانہ نگاروں میں بر ج موہن کیفی۔ جوش ملیح آبادی۔ فارغ بخاری۔ اثر لکھنوی۔ مخمور جالندھری۔ آنند نرائن ملّا۔ عرش ملسیانی۔ احسان دانش۔ بلونت سنگھ۔ سہلادیوی۔ اور پرکاش پنڈت کے نام نظر آتے ہیں۔ ایک ہی شمارے میں اتنے اچھے فن کاروں کو جمع کر لینا بڑی ہمت کا کام ہے۔ اور اس کامیابی پر ادارہ مستحق مبارکباد ہے۔ ایک حصہ دوسری زبانوں کے ادب کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ جس میں غیر زبانوں کی نظموں کے منظوم ترجمے شامل ہیں۔ امید ہے کہ ماحول ادارے کی کوششوں سے اپنے ارتقائی مدارج بہت تیزی سے طے کرنے گا۔ قیمت فی شمارہ ایک روپیہ۔ سالانہ قیمت چھ روپے۔ ناشر مکتبۂ قصرِ اردو۔ اردو بازار دہلی۔

نوائے ادب انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (۹۲ بابنی روڈ) بمبئی کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ جسے جناب ظہیر الدین مدنی مرتب کرتے ہیں۔ اس وقت تک اس کے دو شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اور دونوں شماروں سے یہ بات ظاہر ہے کہ نوائے ادب کو اردو کے مقتدر ادیبوں کا تعاون حاصل ہے "مقالہ نما" نوائے ادب کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ غالباً نوائے ادب سے پہلے اس قسم کا سلسلہ اردو کسی رسالے میں شروع نہیں ہوا۔ اگر یہ سلسلہ جاری رکھا جائے تو اس سے اردو کی ایک بہت اچھی انسائیکلوپیڈیا تیار ہو سکتی ہے۔ قیمت ایک پرچہ ایک روپیہ۔ ششماہی دو روپے۔ سالانہ تین روپے۔ بیرونِ ہند چار روپے۔

دنیا کے ستون یہ ماہنامہ لڑکے لڑکیوں کے لئے ضیاء الاسلام نگمی ظفر مرادآبادی اور ملک ثالہ کی ادارت میں بمبئی سے شائع ہونا شروع ہوا ہے بچوں کی دلچسپی کا کافی مواد اس میں موجود ہے۔ ہلکی پھلکی کہانیوں۔ نظموں اور چٹکلوں کے ساتھ لتھو کی تصویروں نے رسالے کو زیادہ دلچسپ اور زیادہ مفید بنا دیا ہے قیمت چھ آنہ سالانہ قیمت ساڑھے چار روپے پتہ درویش محل ۱۵۲ محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳۔

(ج۔ ن۔ ا)

علی گڑھ میگزین غالب نمبر یہ نمبر حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اسے کل کے معزز مقالہ نگار مختار الدین احمد صاحب آرزو نے اسے مرتب کیا ہے۔ محترمی پروفیسر رشید احمد صدیقی صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی اس میگزین کے نگراں ہیں۔ موصوف کا نام ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ غالب نمبر اپنی مثال آپ ہوگا۔ غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن غالب کی زندگی اور اس کی ادبی مصروفیتوں کے باب میں تحقیق ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے اسی شمارے کو لیجئے کتنی نئی باتیں علم میں آئیں گی۔ غالب کا مقدمہ۔ امراؤ بیگم۔ برہان قاطع کا قضیہ۔ غالب کا فرضی استاد نہایت دلچسپ مضامین ہیں لکھنے والوں میں ملک بھر کے وہ ممتاز ادیب شامل ہیں جو غالب کے محض عقیدتمند ہی نہیں بلکہ موضوع غالب پر انھوں نے قابلِ تحسین تحقیق بھی فرمائی ہے، مثال کے طور پر غلام رسول مہر۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود، مولوی مہیش پرشاد۔ پروفیسر حمید احمد خاں عبدالمالک آروی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ غالب کی نادر تصویریں بھی اس شمارے میں شامل ہیں۔ جناب نیاز فتح پوری کا ایک گرامی نامہ بھی اس شمارے میں ملے گا۔ جس میں موصوف نے اس ضرورت پر توجہ دلائی ہے کہ غالب فہمی کی صحیح فضا پیدا کی جائے۔ اور کوئی اکاڈمی قائم کی جائے محض ریسرچ کے لئے نہیں۔ بلکہ ذوق پیدا کرنے کے لئے۔ جو غالب کا وجدان سامنے رکھ کر غالب کو سمجھ سکے۔ ۲۷۴ صفحوں پر مشتمل تنقیدی مضامین کے بعد ۶۸ آثارِ غالب پر صرف کئے گئے ہیں۔

اس کا بہت بڑا حصہ یا تو قلمی کتابوں سے لیا گیا ہے یا ایسے مطبوعات سے جو عام دسترس سے باہر ہیں۔ ادارہ ایسے اچھے نمبر کی اشاعت پر مبارکباد کا مستحق ہے۔ قیمت درج نہیں۔ غالباً منیجر علی گڑھ میگزین علی گڑھ کے پتے سے مل سکے گا۔

(ع۔ م)

پنڈت نہرو جنوب مشرقی ایشیا کے دَورے پر

آزادی حاصل کر لینے کے بعد بھارت نے بین الاقوامی سیاست میں جو ممتاز درجہ حاصل کر لیا ہے اس کا تمام تر سہرا دیش کے پردھان منتری پنڈت جواہر لال نہرو کے سر ہے۔ پنڈت جی نے اپنی خداداد قابلیت اور عظیم الشان قربانیوں کے باعث دنیا بھر کے رہنماؤں میں ایک ایسا مقام حاصل کر لیا ہے جو بہت کم مُدبّروں کو حاصل ہے اور اسی وجہ سے دنیا کے جس کسی حصے میں بھی پنڈت جی کو جانے کا اتفاق ہوا وہاں کی جنتا نے ان کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں۔ ایک ایک بھارتی جب اپنے محبوب نیتا وزیر اعظم کی عزت افزائی کی خبریں سُنتا ہے تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ عزت افزائی صرف پنڈت جی کی ذات کی ہی نہیں بلکہ سارے بھارت ورش کی ہے۔

انڈونیشیا کی تحریک آزادی کا جس گرم جوشی کے ساتھ بھارت نے ساتھ دیا اور جس بے باکی اور جرأت کے ساتھ پنڈت نہرو نے آواز بلند کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھارت اور پنڈت جی کے تئیں انڈونیشیا کے عوام میں بے پناہ جذبۂ عقیدت پیدا ہو گیا اور انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ایک دفعہ ان کے ملک میں آئیں چنانچہ عوام کی اس خواہش کے پیشِ نظر پریذیڈنٹ سکارنو نے پنڈت جی کو انڈونیشیا آنے کا دعوت نامہ بھجوایا لیکن نہرو جی اپنی گوناگوں معروفیات کے باعث اس دعوت نامے کو جلد قبول نہ فرما سکے۔ آخر جب یہ مطالبہ بہت زور پکڑ گیا تو پردھان منتری کے لئے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا چنانچہ اپنی تمام معروفیات کو پس پشت ڈال کر وہ ۳ رجون کو بحری جہاز 'دہلی' پر انڈونیشیا کے لئے روانہ ہو گئے اور ۷ رجون کو صبح وہاں پہنچ گئے۔

انڈونیشیا کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی جس شان و شوکت اور گرمجوشی سے وہاں کے عوام نے پنڈت جی کا استقبال کیا وہ تاریخ میں ایک یادگار رہے گا۔ ایک غیر ملک کی جنتا کی بھارت کے وزیر اعظم کے لئے اتنی خیر سگالی یقیناً بھارت کے لوگوں کے لئے فخر کی بات ہے۔ پولیس کے بہترین انتظامات کے باوجود اکثر مرتبہ وہاں کے لوگوں نے جذبۂ عقیدت میں سرشار ہو کر پولیس کے گھیرے کو توڑ ڈالا اور پنڈت جی کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ اپنے اس دورے میں پنڈت جی بہت سے مقامات پر تشریف لے گئے جن میں مغربی جاوا کی راجدھانی بانڈونگ، جزیرہ بالی اور ملکہ قابل ذکر ہیں۔ بانڈونگ میں پانچ لاکھ سے زائد اشخاص ان کے سواگت کے لئے موجود تھے۔ جزیرہ بالی میں پنڈت جی کی آمد پر وید منتروں کا اچارن کیا گیا اور مانتی کے دوہے پڑھ کر سنائے گئے۔ اپنی پرانی تہذیب کے اس مرکز کو دیکھ کر نہرو جی بے حد محظوظ ہوئے۔

انڈونیشیا اور اس کے ملحقہ جزائر کا دورہ ختم کرنے کے بعد ۱۷ رجون کو پنڈت جی سنگاپور پہنچے اور ۱۸ رجون کو ایک بھاری پبلک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے دہشت پسندوں کی تخریبی سرگرمیوں کی مذمت کی اور اسے انسانیت کا عظیم نقصان بتایا۔ مہاتما گاندھی کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے بتایا کہ گاندھی جی کا بھارت کو دیا ہوا درس ساری دنیا کے لئے بھاری اہمیت رکھتا ہے۔

ملایا کے دورے کے بعد ۲۰ رجون کو برما سرکار کی دعوت پر پنڈت جی رنگون پہنچ گئے۔ ہوائی اڈے پر دس ہزار اشخاص موجود تھے۔ ۲۱ رجون کو وزیر اعظم برما کی طرف سے دئے گئے ایک ڈنر میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے کہا کہ اگرچہ بھارت اور برما کو سیاسی آزادی حاصل ہو گئی ہے لیکن ابھی ہم نے اقتصادی طور پر ترقی کرنی ہے تاکہ عوام صحیح معنوں میں آزادی کی نعمت کا پھل چکھ سکیں۔

۲۲ رجون کو ایک عظیم الشان جلسے میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے بھارتیوں سے اپیل کی کہ ہر ایک بھارتی اپنے آپ کو ملک کا سفیر سمجھے اور وہ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرے

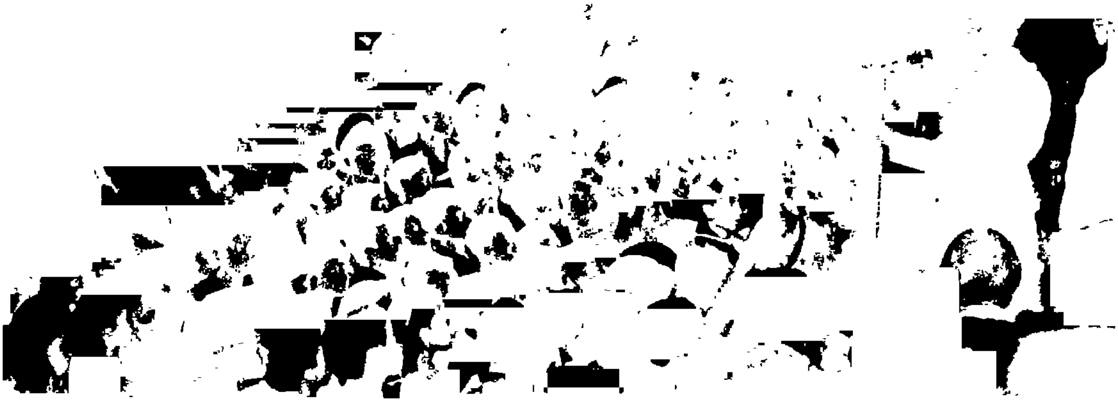
۲۳ رجون کو پنڈت جی تھاکن نو سے ایک خاص ملاقات کر رہے ہیں جس میں بھارت اور برما کے متعلق کئی مسائل پر بات چیت ہوگی



نڈت نہرو
ونیشیا میں

ت کے پردھان
ی جب ۱۱ جون
بندنگ میں پہنچے
اس قسم کے بےشمار
بار ان کے
قبال کے لئے
معال کئے گئے۔

ت نہرو بندنگ
ایک پبلک جلسے
ے تقریر کر رہے
ے۔





جکارتا کے ایک پبلک جلسے میں تقریر



دورۂ انڈونیشیا کے دوران میں
پنڈت نہرو مندوت کے مقام
پر بدھ مندر کی یاترا کر رہے
ہیں۔

گُل کدہ

ہندوستانی زبانوں کا ادب

ہندی (نظم)

تمہارے نت نئے حسن کو زندگی بھر اپنے بازوؤں میں جکڑ لوں۔
اور تمہاری مسحور کن موسیقی کو ہر ایک کے دل میں بھر لوں۔

دنیا کے جھنجھٹوں سے ستائے ہوئے دلوں میں تم اپنی خوشیاں برپا
سکو، اور دنیا کے لوگوں کو راحت پہنچانے والی جو تمہاری دیوتاؤں
کی سی صفات ہیں وہ اس دنیا کی زندگی کا ایک حصہ بن جائیں۔

انسان کا پتھر جیسا دل تمہارے کرم کی نظر سے سرسبز و شاداب
ہو جائے۔ میں نے زندگی بھر میں جتنے کام کئے ہیں وہ سب تمہاری بخشش
کرتا ہوں۔

اس انتہائی تاریکی کے پہر میں میرے دل کے جذبات زیادہ اُبھر
رہے ہیں اور ماضی کے دبے ہوئے خیالات سامنے آ رہے ہیں۔

درختوں کے سر پر پھولوں کے تاج ہیں اور جس طرح ہوا کے سینے سے
وجد آور خوشی نکلتی ہے اسی طرح میرے دل سے تمہاری خوبصورتی
پھوٹ پھوٹ کر باہر آ رہی ہے۔ (سمترانندن پنت)

سنسکرت (کمار سمبھو کالیداس)

مایۂ ناز سرافراز ہمالہ پربت — سب پہاڑوں سے ہے ممتاز ہمالہ پربت
اسکے دامن کا ہے یوں کرۂ نما شغل — اک عجب شان سے ہے انجمن آراستہ شال

کسی پربت کا نہیں ہو جو وقار اسکا ہے — دیوتاؤں میں ہمیشہ سے شمار اسکا ہے
اسکے مشرق میں بھی تا جی ہے بحرِ ذخار — اسکے مغرب میں بھی ہو اکیم دلکش کی بہار
ان محیطوں کے لئے ایک ہی مرکز ہے
دونوں اطراف کے مابین زمیں کا گز ہے
رنگ مرباف ہمالہ کی ہر اک چوٹی پر — صاف شفاف ہمالہ کی ہر اک چوٹی ہے
نظر افروز ہے دنیائے جمادات اسکی — قرمزی رنگ کی آتا ہے کرامات اسکی
جب سفید ابر کے ٹکڑوں میں جھلکتا ہے رنگ — دوپہر روشن میں بھی آتے ہیں نظر شام کے ڈھنگ
یہ سماں آتشِ جذبات کو بھڑکاتا ہے — اپسراؤں کو یقیں شام کا آ جاتا ہے
جلد بازی میں عجب اس کا اثر کرتی ہیں
اُلٹا پلٹا ہی سنگار اپنا یہ کر لیتی ہیں
بوٹیاں اسکی ضیا بخش نظر میں کیسی — جلوہ گستر صفتِ مہر و قمر ہیں کیسی
دور ان سے جو ہو جائے وہ ظلمت ہی نہیں — ان چراغوں کیلئے تیل کی حاجت ہی نہیں
روشنی ان کی جھلکتی ہے جہاں رات کو وقت — اک عجب لطف کا ہوتا ہے سماں رات کے وقت
ذکر ہوتا ہے جو محبوب سے یکجائی کا — جاگ اٹھتا ہے مقدر کسی صحرائی کا
دولتِ جلوۂ بیدار لٹا دیتی ہیں
انجمن محفلِ خلوت کو بنا دیتی ہیں
آبِ شفاف سے لبریز ہیں جھیلیں اسکی — کیا روانی میں جنوں خیز ہیں جھیلیں اسکی
ایک دنیائے لطافت ہیں نہفتہ جن میں — ہر طرف پھول کنول کے ہیں شگفتہ جن میں
ڈھیر ہیں حلقۂ صد رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول — سپت رشیوں کے یدِ پاک کے توڑے ہوئے پھول
رنگ آمیز ہوئی کرنوں کے جو کچھ جا ہیں — اور ڈھلتے ہوئے سورج کی یہ کھیل انوکھے ہیں
ان پہ شیرازۂ انوار بکھر جاتا ہے — اور بھی رنگِ تہِ شام نکھر جاتا ہے

(ترجمہ از سنسکرت)

بنگالی (نظم) ——— نعرۂ بغاوت

مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں سب کو توڑ پھوڑ کر چکنا چور کر دیتا ہوں۔ میرا کوئی قاعدہ نہیں۔ جتنے بھی قاعدے اور رسم و رواج کے بندھن ہیں میں انھیں پاؤں تلے روند کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔

میں انقلاب کو بلاتا ہوں۔ میں بغاوت پھیلاتا ہوں۔ میں ناچ ناچ کر موسیقی پر تاؤ دیتا ہوں۔

میں بغاوت کرنے والا انسان ہوں۔ میں خدا کے سینے پر اپنے پاؤں کا نشان جما دوں گا۔

میں توڑ پھوڑ کرنے والا ہوں۔ دُکھ اور تکلیف سے بے پرواہ ہو کر اپنے بنانے والے کے سینے کو توڑ پھوڑ ڈالوں گا۔ (قاضی نذر الاسلام)

پنجابی (نظم) ——— اِک ٹکا

ایک ٹکا تیرے آگے رکھ کے
اے میرے دل کا ہر بھید جاننے والے
میں تیری درگاہ میں
سُرخرو ہو رہا ہوں۔

یہ میرا ایک ٹکا
میری ریاضت اور میری نفس کُشی کا ثمر ہے
میری پیٹھ پر پڑی ہوئی خراشیں
گواہی دے رہی ہیں
کانٹوں کی
لکڑیوں کے گٹھوں کی
پتھروں کی
..... اور اِن ہاتھوں میں جو گلٹیاں
پڑ گئی ہیں سمجھتا ہوں
کہ وہ قبر میں بھی مشکل سے گل سکیں گی
..... اور یہ میری تندرست اور مضبوط گردن
اک زمانے سے جھکی جھکی رہتی ہے

دیکھ میں ایک ٹکا آخر کار بچا
لایا ہوں۔ میری ننھی بچی
بلکتی رہی
ترس ترس گئی
اُس اجل نصیب کی آنکھیں
کبھی سیر ہی نہیں ہوتیں
..... اور پنواڑی کے چبوترے
کے پاس سے بھی میں گزر آیا ہوں
اگر کوئی ایک دن بیڑیاں نہ پیے
تو کیا مر جاتا ہے!

ایک ٹکا۔ اور مجھے یوں معلوم ہوتا تھا
کہ میرے سر پر زمانے بھر کا بوجھ پڑا
ہوا ہے اور قدم قدم پر مجھے کوئی
یاد کراتا رہتا تھا
تیرا مقروض ہونا
انتہائی اذیت ناک ہے
اے بھرے ہرجائی! ہر جگہ تیرا ہی کھاتہ
لیے ہوئے لوگ کھڑے ہوتے ہیں
پتھر رکھے ہوئے ہوتے ہیں
خانقاہیں دکھائی دیتی ہیں

ایک ٹکا
دیکھ کر اپنا اطمینان کر لے
اور میرے جھوٹ
میرے گناہ تجھے بھلا دیتے ہیں
اور اگر کل یہ تیرا بُرا بندہ
کسی بُرے پڑوسی کے ساتھ
کوئی بُری بات کر بیٹھے
تو اے میرے دل کے بھید جاننے والے
تُو مجھے بخش دیجو

مجھے بچا لیجو
اپنی اِس دُنیا میں
اور اپنی اُس دُنیا میں

تامل (کہانی) ———— کس کی دیوالی (کرتا رسنگھ دگل)

ماں جب میں گائے کے پاس جاتا ہوں تو وہ مجھے سینگ دکھاتی ہے، مگر گردہن کے سامنے چُپ چاپ کھڑی رہتی ہے۔ ایسا کیوں؟

وہ اُسے پہچانتی ہے، اس لئے چپ رہتی ہے۔ تمہیں وہ نہیں جانتی اس لئے سینگ دکھاتی ہے۔

کیا میں بھی اُس کے ساتھ جان پہچان پیدا کروں

نہیں نہیں، تم تو کھیل کود سکتے ہو۔ گردہن اچھوت ہے۔ اُسے گائے چرانے لے جانا پڑتا ہے۔ آؤ یہ لڈو کھا لو۔

شُبتو چار برس کا تھا۔ وہ باتونی بہت زیادہ تھا، اور ماں باپ کا لاڈلا بیٹا تھا۔

"اچھوت کیا ہوتا ہے ماں؟ گردہن ہمارے گھر کے اندر کیوں نہیں آتا؟ باقی سب تو آتے ہیں"۔

وہ اچھوت جو ٹھہرا۔

لیکن اچھوت کیا ہوتا ہے ماں؟

یہ تم نہیں سمجھوگے۔ سوال پوچھنا چھوڑو اور اپنا لڈو کھاؤ۔

میں نہیں کھاؤں گا۔ گردہن گھر کے اندر کیوں نہیں آسکتا؟

میرا ناک میں دم مت کرو۔ جاؤ۔ دیکھتے ہو وہ کتنا گندا ہے۔ اگر وہ گھر کے اندر گھس آئے تو ہم بھرشٹ (ناپاک) ہو جائیں

بھرشٹ ہونے کا کیا مطلب ہے ماں؟

اُس کا بدن گندا ہے وہ کبھی نہاتا نہیں وہ اچھوت ہے

تو کیا میں گردہن سے کہوں کہ وہ ہمارے گھر آکر نہا لے۔

کیسی باتیں کرتے ہو، بھاگو یہاں سے۔ اور اُس سے اب کبھی مت کھیلنا۔

میں تو اُسی کے ساتھ کھیلوں گا، اور کسی کے ساتھ نہیں۔ اُس کے لئے بھی مجھے ایک لڈو دو۔

نہیں کبھی نہیں، اچھوت اور لڈو۔ اگر میں اُسے لڈو دیدوں تو ہمارے گھر کے سارے لڈو بھرشٹ ہو جائیں۔ جاؤ تمہارے چچا تمہیں باہر بلا رہے ہیں۔ دیکھو کیا کہتے ہیں۔

پہلے مجھے لڈو دیدو پھر جاؤں گا۔ اُسے میں ضرور دوں گا۔ اُسے میں ضرور کھلاؤں گا۔

جاؤ گے بھی! لڈو یہیں کھا لو، اور پھر جاؤ۔ مگر گردہن کے پاس مت جانا۔

تب مجھے بھی نہیں چاہیئے۔ یہ کہہ کر لڈو اُس نے رکھ دیا، اور باہر جانے لگا کہ اتنے میں چچا کرشنا آنز آ پہنچے۔

شُبتو! ادھر آؤ، میں تمہارے لئے پھلجھڑیاں لایا ہوں۔

شُبتو خوشی کے مارے اُچھل پڑا اور چچا کے کندھے پر چڑھ گیا۔

کرشنا آنز نے اُسے پیار کیا اور پھر پھلجھڑیاں اُس کے ہاتھ میں پکڑا دیں۔

تمہیں پھلجھڑیاں جلانی آتی ہیں

جی ہاں آتی ہیں۔ اُس نے ڈبے کی پھلجھڑیاں زمین پر گرا دیں...

...آدھی گردہن کو دے دیں۔

"اچھوت لڑکے کو کیا کرنی ہیں پھلجھڑیاں؟"

اُس کی بھی تو دیوالی ہے چاچا جی۔

نہیں نہیں گردہن کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ چلو اندر چلیں۔

اور پھر اچھوت لڑکے کی طرف دیکھ کر گرجے۔ ابے اچھوت چھوکرے تو بڑا کمینہ ہے۔ ہمارے بچے کے پاس مت آ۔ جا بھاگ جا یہاں سے۔

گردہن بھاگ کر کچھ دُور جا کھڑا ہوا۔ مگر اُس کی لالچ بھری آنکھیں پھلجھڑیوں پر ہی لگی رہیں۔

شُبتو کی ماں باہر آئی تو کرشنا آنز بولے...... دیکھتی ہو ساوتری اپنے لاڈلے کو، آدھی پھلجھڑیاں اُس اچھوت لڑکے کو دینا چاہتا ہے۔

اس اثنا میں شُبتو کی بہن پاربتی بھارتی کا ایک گانا گاتے ہوئے آنکلی.......

اچھوت آزاد ہوں گے۔ ہٹیا بھی آزاد ہوں گے، اور پلیا بھی سب کے سب آزاد ہوں گے آزاد۔

ماں تم نے آج اخبار دیکھا ہے۔ لکھا ہے کہ سب مندر اچھوتوں کے لئے کھول دئے جائیں گے۔

ساوتری بولی، پتہ نہیں دُنیا کدھر جا رہی ہے۔

کرتنا آزاد ہوئے۔ تم نہیں جانتیں۔ قیامت کی طرف جا رہی ہے
قیامت کی طرف۔ (جگر دری مادگر پال آتا ہے)

کشمیری (نظم) ——————— دھسّا

اور خدا جو ترے کندھوں سے شالے جا رہا ہے۔
کہیں میرے دل کے داغ اوروں کو تو نہیں دکھائے۔
میں ایک دُنیا آزما کے آ رہا ہوں۔
کہیں میرے دل کے داغ اوروں کو تو نہیں دکھائے

بھوکی بڑھیا اپنے بچوں کو سُلا کر
پشمینہ صاف کر رہی ہے
وہ دئے میں جگر کا خون جلا کر کام کر رہی ہے
کہیں میرے دل کے داغ اوروں کو تو نہیں دکھائے

کنواری لڑکیوں نے پیٹ بھرنے کی آشا میں
آنکھوں کی روشنی کو کھو دیا
انار کے پھولوں کے سے گالوں کا رنگ ہلدی کا سا کر ڈالا۔
کہیں میرے دل کے داغ اوروں کو تو نہیں دکھائے

معصوم آنسوؤں کے موتیوں کو دھاگے میں پرو کر
دھاگوں کو آنسوؤں میں نہلا کر
عاجزی کے خون سے رنگا گیا ہے
کہیں میرے دل کے داغ اوروں کو تو نہیں دکھائے۔

پھول جیسے ہاتھوں کو کنگھیوں سے چھید کر
عورتوں نے کیسر کے پھولوں ایسے پشمینے کی صفائی کی۔
اس محنت میں گردن توڑ کر کچھ کوڑیاں اُن کے ہاتھ لگیں
کہیں میرے دل کے داغ اوروں کو تو نہیں دکھائے

پیٹ خالی بدن پر چیتھڑے
کاتے ہوئے تاگوں کو جوڑوں میں طیار کر کے
ساری محنت بے فائدہ پشمینے کے دوکان دار کے سپرد کر دی۔
کہیں میرے دل کے داغ اوروں کو تو نہیں دکھائے

ابھی کتنی دیر غریبوں کو محتاج رکھ کر
انتقام کو سلایا جائے گا
باڑھ کو جھاج سے کتنی دیر روکا جا سکتا ہے
کہیں میرے دل کے داغ اوروں کو تو نہیں دکھائے۔

نیا یگ سینے پر پھول لئے ہوئے آئے گا۔
پھولوں کو سلائے رکھنا برداشت نہیں کرے گا۔
اُن کے کان میں زندگی کا راز پھونک دے گا
کہیں میرے دل کے داغ اوروں کو تو نہیں دکھائے

(مرزا عارف)

گجراتی (نظم) ——————— اناج کو نمسکار

اناج بھگوان کو بار بار سلام۔ آغاز سے پیدا شدہ اناج بھگوان کو بار بار سلام جس کی مہربانی سے بنی نوع انسان کی روح کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ روپ رنگ اور خوشبو ملتی ہے۔ جو سب مخلوقِ خدا کا واحد سہارا ہے۔ بنی نوع انسان میں روح کے قائم رکھنے کی طاقت بھی اُس ہی کی وجہ سے ہے۔ اور خاک سے پیدا شدہ بندگانِ خدا کے لئے یہی سب سے بڑی دوا ہے۔ اُس اناج بھگوان کو بار بار سلام
یہ اناج ہی تو ہے جس کے باعث ریگستان میں جنگل میں اور برفیلے مقامات پر جا کر لوگ بس گئے ہیں۔ اناج ہی کے لئے انسانوں کے قافلے پُرانے ملکوں کو چھوڑ کر نئے ملکوں کی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ کھانے کی اشیا کا سراغ ملتے ہی وہ نئے نئے مقامات پر ڈیرہ جا لیتے ہیں پھر فرصت کے وقت وہ تہذیب و تمدن کو حاصل کرتے اور اُس کا پرچار کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوتا ہے اُس اناج دیوتا کو بار بار سلام۔
اس دنیا میں اناج کے لئے کتنا شور و غل مچایا جاتا ہے۔ اناج کا

انے والے لاپھیوںکی بربادی کا بیج بھی اسی اناج میں موجود ہے۔ اناج
رپ کرنے والوں کو اناج کھا جائے گا۔ لوبھی اور لالچ کے ماروں کو
ا جانے کے بعد اناج بھوکے انسانوں کی تلاش کرے گا۔ اناج کے
منوں کو کوئی نہیں بچائے گا۔ تہذیب و تمدن کا واسطہ دینے والوں
اُن کی تہذیب نہیں بچائے گی۔ مزدور اور محنت کش عوام برابر اناج
، پوجا جاری رکھیں گے۔ اناج بھگوان کو بار بار سلام۔

(اماشنکر جوشی)

ہٹی (نظم) ————— یہ بھی ہم جیسے

ہلانے ڈُلانے سے کوئی کیا جاگے گا
صرف دھکا دینے سے کوئی کیا آگے بڑھے گا
اُٹھنے کو کہنے سے کوئی کیا کھڑا رہے گا
کتھا اور پرانوں سے کیا عوام میں بیداری پیدا ہوگی
اگر صحیح معنوں میں دُنیا کی بہتری و ترقی مطلوب ہے
تو یہ دقیانوسی نقطۂ نظر چھوڑ دو۔
دُنیا کے کیچڑ بھرے محنت کش ہاتھوں سے ہاتھ ملا کر اُن کی پیٹھ ٹھونکو۔
یہ بھی ہم جیسے ہی ہمارے گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں۔
اگر یہ بات ہمارے من میں ایک بار بیٹھ جائے۔ (ریشونت)

ملیم (گیت) ————— مچھلیوں کے گیت

دریا میں ایک واگا مچھلی رہتی ہے
اُس کی اُچھل کود تو دیکھو
او منوا میرے لئے ایک مچھلی پکڑ لا
او ایوا قوم کے میرے دوست

مچھیرے کے ہاں بچے کی پیدائش ہوئی ہے
سنگھنی مچھلی زار زار رو رہی ہے
میری زندگی کے لئے موت کا سامان پیدا ہو گیا
ہائے ہائے میری زندگی کو ختم کرنے کے لئے ملک الموت پیدا ہو گیا۔

ماری (تنقید) —————

پچھلے چالیس برسوں سے کناری کے ناول نویس ترقی کی راہ پر
مزن ہیں۔ ان میں سے کم و بیش پندرہ یا بیس ناول نویس ایسے ہیں
جو کناری ادب کے لئے ایک نیا راستہ کھولنا چاہتے ہیں۔ کناری ادب
سے ناول کو نکال دیا جائے تو ایک بہت بڑی کمی کا احساس ہونے
لگتا ہے۔ ناول نگاری کا فن کناری زبان کی ایک بہت بڑی نعمت
ہے۔ ایسے ناول نویسوں میں ہم ماستی وینکٹیش آئنگار اور شِورام کارنت
کا نام لے سکتے ہیں۔ ماستی کے افسانے نسبتاً مختصر ہوتے ہیں۔ اس لئے
اُسے کناری زبان میں فنِ افسانہ نویسی کا جنم داتا کہا جا سکتا ہے۔
اُس نے دو مشہور ناول لکھے ہیں جن کے نام ہیں "چِنّا بسو نائیکا" اور
"سبھنا"۔ پہلا ناول تاریخی ہے اور اُس کا تعلق میسور کے زمانہ حکومت
سے ہے "سبھنا" ایک سماجی ناول ہے جس میں اداکاروں کی زندگی کا
آئینہ بڑی خوبی سے طیار کیا گیا ہے۔ یہ اپنے ڈھنگ کا ایک ہی ناول
ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اگر ماستی اس طرح کے چند اور ناول تحریر کریں گے
تو فنِ افسانہ نویسی میں بہت ممتاز جگہ حاصل کر لینے کے بعد ناول نویسی
میں ایک بہت بڑی جگہ پیدا کر لیں گے۔ شورام کارنت نے پندرہ کے
قریب ناول لکھے ہیں۔ آپ کا پہلا ناول "چتر کوٹ" ہے جو جاسوسی ناول
کہا جا سکتا ہے۔ بعد کے سب ناول سماجی ہیں "کنیا بلی" ایک "دھوا"
عورت کی کہانی ہے۔ ودھوا کی زندگی میں جو مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے
ہیں اُن کا ذکر ایسے دردناک پیرائے میں کیا گیا ہے کہ پڑھتے وقت
آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ (رام لکشمی راگھون)

آسامی (نظم)

خاموشی میں ہی میں آتا ہوں اور خاموشی میں ہی چلا جاتا ہوں
خاموشی میں تمہارے پیش کئے ہوئے تحفے کو قبول کرتا ہوں
خاموشی ہی میں شام کے تارے کو تکتا ہوں
خاموشی میں ہی میرے آنسو کائنات میں جذب ہو جاتے ہیں
خاموشی میں قدرت مجھے یکا یک اُبھارتی ہے
خاموشی میں ہی میں قابلِ تعظیم بن جاتا ہوں
خاموشی میں مجھے زندگی پُر مسرت معلوم ہوتی ہے
خاموشی ہی میں میں رات کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا ہوں۔
خاموشی ہی میری شکست اور فتح کی پہنچان ہے
خاموشی میں ہی میں مرتا اور خاموشی میں ہی جنم لیتا ہوں
(جتیسوری گھنٹیار)

کشمیر کی صنعتِ چوب کاری

کشمیر جنگلوں اور تناور درختوں کا مسکن ہے۔ اس لئے یہاں کی صنعتوں میں لکڑی کے کام کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ کشمیری کاریگروں کو جو فنی قابلیت یہاں کے دلفریب اور لاتعداد قدرتی مناظر سے نصیب ہوئی ہے اس میں کشمیری بڑھئی بھی اپنے حصے سے محروم نہیں ہے۔ کشمیری نجار اپنے احساسِ حسن کا اظہار لکڑی کے کام کے ذریعے اس طرح کرتا ہے جس طرح یہاں کا نقاش یا سوزن کار۔ وہ اپنے فن پاروں سے وہی اثر پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے جو ایک حسین مجسمے یا ایک حسین تصویر سے کیا جاتا ہے۔

کشمیر کے لکڑی کے کام میں بے حد تنوع ملتا ہے۔ اس میں آپ کو صرف لکڑی کی بنی ہوئی خانقاہِ معلیٰ کی مسجد جیسی بڑی عمارتیں ہی ملتی ہیں۔ بلکہ گلمرگ اور پہلگام کے جنگلوں سے مستور چوبی جھونپڑے، ڈرائنگ روم کا فرنیچر اور روزانہ استعمال کی لاتعداد چیزیں بھی ملتی ہیں۔

کشمیر کو "ختم بندی" قسم کی چھت گیری کے طریقے میں ملکہ حاصل ہے۔ اب تک اس طریقے کو ہندوستان کے کسی حصے میں استعمال نہیں کیا گیا۔ اس میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے منقش مربع اور مستطیل ٹکڑے ہوتے ہیں۔ جن کو چھوٹے چھوٹے چوکٹوں میں جڑ دیا جاتا ہے۔ ان ٹکڑوں کو اس طرح ترتیب دی جاتی ہے کہ اس سے چھت پر مختلف قسم کے نقش و نگار بن جاتے ہیں۔ کشمیر کے تقریباً ہر متمول شخص کے گھر میں ایسی چھتیں ملتی ہیں۔ ایسی چھتیں ایسی جگہوں کو بھی بہم کی گئی ہیں جہاں کا موسم لکڑی کے کام پر مخالف اثر نہیں ڈالتا۔

مقامی ضروریات کے لئے کرسیاں، صوفہ سیٹ، میزیں، تپائیاں اور فرنیچر کی دیگر چیزیں وسیع پیمانے پر بنائی جاتی ہیں۔ لیکن اخروٹ کی لکڑی سے جو اشیا تیار کی جاتی ہیں ان میں کشمیری کاریگروں کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس لئے جو سیاح کشمیر آتے ہیں وہ ضرور اخروٹ کی لکڑی کی بنی ہوئی حسین چیزیں خریدتے ہیں۔ کشمیر میں اخروٹ کے درخت بہتات سے ملتے ہیں

اس لکڑی کی مضبوطی اور قدرتی دھاروں کی وجہ سے اس سے بہت ہی حسین چیزیں تیار کی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس لکڑی کی سطح نقش ابھارنے اور پالش کے لئے بہت اچھی ہوتی ہے۔ اس لکڑی کو استعمال سے پہلے پختہ کیا جاتا ہے۔ اس غرض کے لئے عام طور پر لکڑی کو مختلف موسموں میں مختلف حرارت میں رکھا جاتا ہے۔ لکڑی کا جو حصہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا اس کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ لیکن چونکہ اکثر لوگ سستی چیزیں چاہتے ہیں اس لئے کاریگر نیم پختہ یا غیر پختہ لکڑی کو بھی استعمال کرتے ہیں۔

اخروٹ کی لکڑی سے بنے ہوئے سگرٹوں اور زیورات کے ڈبوں کشتیوں، میزوں کے اوپری حصوں، پیالوں اور رومال اور سگار رکھنے کے ڈبوں پر دیدہ ریزی سے نقاشی کی جاتی ہے۔ اشیا پر ہر قسم کے پھولوں اور پودوں کو منقش کیا جاتا ہے یا ابھارا جاتا ہے۔ یہ نقش و نگار تفاصیل میں اس قدر مکمل ہوتے ہیں کہ رنگوں کے بغیر بھی آپ مختلف اقسام کے پھولوں کو پہچان سکتے ہیں۔ ابھارے ہوئے نقوش جو اکثر تفصیلی پودوں جھاڑیوں یا ہندسی اشکال پر موقوف ہوتے ہیں۔ بہترین کاریگری کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ان میں کبھی کبھی کوئی شاخ دھاگے کے برابر پتلی ہوتی ہے۔ اس لکڑی سے کرسیاں، چھوٹی الماریاں، لکھنے اور کھانے کے میز بھی بنائے جاتے ہیں۔ جن کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔

کشمیری کاریگروں سے متأثر بعض صاحبِ ذوق ان سے جدید کشور یہ یا کسی اور زمانے کا فرنیچر بھی بنواسکتے ہیں۔ کشمیری کاریگر اپنی جاذبیت اور بہتری کی وجہ سے دنیا کی بہترین کاریگری میں شمار کی جاتی ہے۔ ان اشیا میں اس قدر تنوع ہے کہ آپ کشمیر کی وادی سے چند آنوں کی چیز یا ہزاروں روپوں کی اشیا بطور یادگار خرید سکتے ہیں۔



بچّوں کا آج کل

شام سندر

ہماری عجیب دُنیا

پَروں والی بلّی

پیارے بچو! کیا تم نے کبھی کوئی پروں والی بلّی دیکھی ہے؟ ہو نہہ! اگر بلّیوں کے بھی پَر ہوتے تو بیچاری چڑیوں کا تو دُنیا سے نشان ہی مٹ جاتا۔ تم یہ سُن کر حیران ہو گے کہ سپین کی راجدھانی میڈرڈ میں ایک مزدور کے پاس ایک ایسی بلّی ہے جس کی پیٹھ پر دو ننھے منّے سے پَر ہیں۔ اگرچہ یہ بلّی اُڑ نہیں سکتی پھر بھی دوسرے پرندوں کی طرح کبھی کبھی اپنے پروں کو پھڑپھڑاتی ہے ایک امیر آدمی نے بلّی کے مالک کو دو لاکھ روپے تک دینے کو کہا۔ لیکن وہ اُسے کسی بھی قیمت پر بیچنے کو تیار نہیں۔

پیٹ میں درخت

پچھلے دنوں فرانس کے ایک شخص مسٹر بوتی سن کے پیٹ کا اپریشن کیا گیا تو اس کے اندر سے کھجور کا ایک چھوٹا سا پیڑ نکلا بھئی سچ مانو، چھ انچ لمبا سخت اور نوکیلا درخت۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ اُس شخص نے کھجور کی ایک گٹھلی نگل لی تھی، جو اندر جا کر معدے کی دیواروں سے چپک کر بڑھنے لگی۔ جب بیچارے کی تکلیف بہت بڑھ گئی تو وہ ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس گیا جس نے آپریشن کر کے اُس کی جان بچائی۔

"زیادہ مسکراؤ" ہفتہ

خوش رہ کر ہی انسان صحت اور زندگی کا پورا لطف اُٹھا سکتا ہے۔ ۱۳ جون سے ۱۹ جون تک مانچسٹر کے لوگوں نے "زیادہ مسکراؤ" ہفتہ منایا جس کے دوران میں سب لوگوں سے کہا گیا کہ وہ دن میں کئی بار مسکرائیں۔ اس تحریک کو چلانے والوں کا ارادہ ہے کہ اسی قسم کے طریقوں سے عام لوگوں کی زندگیوں کو زیادہ خوشگوار بنایا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم لوگوں کو خوش رہنا سکھا دیں تو وہ زیادہ اور اچھا کام کر سکیں گے۔ پیارے دوستو! تمھیں بھی چاہیے کہ ہر وقت مسکراتے رہو۔

محمد شفیع الدین نیرؔ

آؤ سہیلی باغ چلیں ہم



باغ میں چل کر جی بہلائیں   سرد ہوا کا لطف اُٹھائیں
گھاس پہ لوٹیں، دوڑ لگائیں   اُچھلیں، کودیں، شور مچائیں
آؤ سہیلی باغ چلیں، ہم
آؤ سہیلی باغ چلیں ہم

پودوں کی ہریالی دیکھیں   ان کی شان نرالی دیکھیں
کوئل کالی کالی دیکھیں   مست، مگن، متوالی دیکھیں
آؤ سہیلی باغ چلیں، ہم
آؤ سہیلی باغ چلیں، ہم



باغ کی کیاری کیاری دیکھیں   کلیاں پیاری پیاری دیکھیں
چڑیاں نیاری نیاری دیکھیں   سب کچھ باری باری دیکھیں
آؤ سہیلی باغ چلیں ہم
آؤ سہیلی باغ چلیں ہم

دل کے سب ارمان نکالیں   تھوڑا سا پکوان پکالیں
جھولا ڈالیں تان اُڑائیں   میٹھا سا اک گانا گالیں
آؤ سہیلی باغ چلیں، ہم
آؤ سہیلی باغ چلیں ہم



کھانا بھی لے جائیں گے ہم   خوب مزے سے کھائیں گے ہم
دن بھر دل بہلائیں گے ہم   شام کو گھر آجائیں گے ہم
آؤ سہیلی باغ چلیں ہم
آؤ سہیلی باغ چلیں، ہم

چاند کا سفر

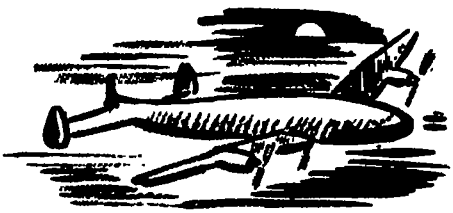
محمد امین

ابھی تو نہیں مگر پچاس ساٹھ سال میں ہم غالباً چاند کی سیر کرسکیں گے۔ آپ کو اتنی بات تو معلوم ہوگی کہ چاند ہم سے کتنی دور ہے ۲۴۰۰۰۰ میل۔ اچھا خاصا لمبا سفر اسے طے کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ آج کل کے ہوائی جہاز تو ابھی اتنے تیز اڑتے نہیں کہ انھیں کی مدد سے ہم اتنا اوپر اڑ سکیں۔

بہرحال جب ہم ایٹمی طاقت (ایٹامک انرجی) کو اپنی ضرورتوں کے لئے استعمال کرنے کے قابل ہو جائیں گے تو پھر اسے ہوائی جہاز چلانے میں بھی استعمال کریں گے اور ایک گھنٹہ میں ہزاروں میل اُڑ سکیں گے۔ انگلستان کے ایک سائنس داں کا خیال ہے کہ راکٹ کی مدد سے ہم امریکہ اور انگلستان کے درمیان سفر کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ستاروں کا سفر نہ کر سکیں۔

عام طور پر یہ خیال ہے کہ پہلے پہل انسان چاند پر قدم رکھے گا تو اسے بس لاوا دکھائی دے گا یا ٹھوس اور نوکیلی چٹانیں۔ کوئی جاندار نظر نہ آئے گا۔ نہ پودے نہ نباتات، مگر ایک بات ہے دھاتیں یا معدنیات اسے کثرت سے ملیں گی۔ اور بھی کیا عجب جو کوئی ایسی دھات بھی مل جائے جس کی مدد سے انسان آکسیجن بنا سکے۔ اور پھر اپنی زندگی دیر تک قائم رکھ سکے یا موت کے چنگل سے بالکل ہی چھٹکارا پالے۔

مگر یہ تو [illegible] معلوم ہے کہ ہماری زمین میں کشش یا اپنی طرف کھینچنے کی طاقت بہت زیادہ ہے، پھر ہم کوئی ڈھائی لاکھ میل اوپر کیسے پہنچ جائیں گے۔ تو بھئی زمین کی حکومت تو ایک خاص اونچائی تک ہے۔ اس سے آگے اس کے کھینچنے کی طاقت جواب دے جاتی



ہے۔ جب ہم اس خاص حد یا سطح سے اوپر اٹھ جائیں گے تو پھر ہمارا ہوائی جہاز آپ سے آپ اٹھ کر چاند تک پہنچ جائے گا۔ بس ہمیں رخ ٹھیک رکھنے کے لئے اس کے کل پرزوں کو اِدھر اُدھر گھمانا پڑے گا۔

لگ بھگ سو برس کی بات ہے۔ حکیموں، ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ ساٹھ میل فی گھنٹہ کی اڑان میں انسان

کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ جہاز کے ایجاد کے بعد بڑے بڑے فوجی کہتے تھے کہ فوجی کاموں کے لئے تو یہ ہوائی جہاز استعمال ہو ہی نہیں سکتے۔ پر یہ باتیں تو غلط ثابت ہوئیں۔ ہوائی جہاز ایک ہزار میل فی گھنٹہ تک اُڑ لیتے ہیں۔ اور ان میں بیٹھ کر انسان کا دل جوں کا توں رہتا ہے۔ اور پچھلی بڑی لڑائی میں تو تم نے خود دیکھا کہ لڑائی کی ہار جیت ہی ہوائی جہازوں پر تھی۔ اسی طرح آج سے پچاس سال



بعد ہم چاند تک آسانی سے آجا سکیں گے۔ اس وقت لوگ اس خیال پر ہنستے ہوں تو ہنسا کریں۔

امریکہ میں بہت سے لوگوں نے وہاں کی حکومت کو درخواست دی ہے کہ آئندہ جب کبھی چاند پر آنا جانا ممکن ہو جائے تو چاند پر بسنے کے لئے سب سے پہلے انھیں موقع دیا جائے۔ امریکہ کے لوگ بڑے دور اندیش ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس کی دنیا میں اب بہت جلد لوگ چاند پہ آباد ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ سب سے پہلے وہاں جاکر آباد ہونے کی اسکیمیں بنا رہے ہیں۔

ہمارے دیش میں بھی ایٹمی طاقت کے متعلق سائنس دان



تجربہ کر رہے ہیں۔ ہم سب کو مل کر کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم بھی ایٹمی طاقت سے چلنے والا ہوائی جہاز طیار کرلیں۔ ہم بھی پھر چاند کا سفر کریں گے۔ اور سب سے پہلے وہاں اپنے دیش کا جھنڈا لہرائیں گے۔

رات کو سوتے وقت سوہن پرارتھنا کر رہا تھا کہ ایشور بمبئی کو ہندوستان کا دار الخلافہ بنا دے۔ یہ سن کر اس کی بہن نے پوچھا، بھائی یہ کیوں؟

سوہن نے کہا، بہن کیا بتاؤں۔ آج امتحان کے پرچے میں یہی لکھ آیا ہوں۔

بابو۔ (تھانیدار سے) میرا سو روپے کا نوٹ چوری گیا ہے

تھانیدار۔ کیا آپ نے اس کا نمبر نوٹ کیا تھا؟

بابو۔ جی ہاں۔ تھانیدار۔ کیا نمبر تھا؟

بابو۔ وہ تو میں نے اس کی پشت پر ہی نوٹ کیا تھا۔

اظہار ملیح آبادی

جھم جھم کرتی برکھا آئی



جنگل میں ندیا لہرائی　　مست گھٹا نے لی انگڑائی
دریا، ندی، نالے، کھائی　　سب نے اپنی بین بجائی
جھم جھم کرتی برکھا آئی



رنگ برنگی چٹکیں کلیاں　　خوشبو سے پھر مہکیں گلیاں
پھولوں کی بھر بھر کے ڈلیاں　　باغوں سے پھر مالن لائی
جھم جھم کرتی برکھا آئی



آڑی ترچھی مست پھواریں　　پھولوں کی بیلوں کو سنواریں
باغ میں ہیں ہر سو چہکاریں　　برکھا نے وہ دھوم مچائی
جھم جھم کرتی برکھا آئی

نکلے اصغر اور منوہر　　پھینکا اِک تالاب میں پتھر
مینڈک بولے ٹر ٹر، ٹر ٹر　　گردن سارس نے بھی اٹھائی
جھم جھم کرتی برکھا آئی



پاؤں منوہر کا جو پھسلا　　ڈگمگ کر کے لاکھ وہ سنبھلا
کیچڑ میں گر کر چلّایا　　دوڑو دوڑو اصغر بھائی
جھم جھم کرتی برکھا آئی

ظہور بخش

رنگ چوں چوں

ایک تھا کسان۔ اُس نے اپنے کھیت میں بوئی تھی کنگنی۔ ڈھیرے ڈھیرے پودے بڑے ہوئے، اور اُن میں بالیں نکلیں۔ اب کیا تھا، چڑیاں جھنڈ باندھ کر آتیں، کھیت میں خوب کلیلیں کرتیں اور مزے سے پیٹ بھر دانا چگتیں۔

کسان چڑیوں کو دانا چگتے نہ دیکھ سکا۔ ایک دن اُس نے کھیت میں جال پھیلا دیا۔ اور تو سب چڑیاں نکل بھاگیں۔ صرف ایک چڑیا جال میں جا پھنسی اور کسان کے ہاتھ میں پڑ گئی۔ اتنے میں وہاں سے ایک گھوڑے والا نکلا۔ چڑیا اُس سے رو کر بولی۔

"ہن ہن والے بھیا جی!
رنگ چوں، چوں۔
سب مل کھائیں کانگولی، رنگ چوں، چوں۔
ہم پر پڑ گئیں پھانسولی، رنگ چوں، چوں"

گھوڑے والے کو چڑیا پر رحم آیا۔ اس نے کسان سے کہا۔ "بھائی اسے چھوڑ دو۔ بیچاری نے تمہاری کتنی کنگنی کھائی ہوگی؟ بہت کرو ہمارا گھوڑا لے لو۔"



کسان نے بگڑ کر جواب دیا "نہیں چھوڑتے۔ بیچ میں بولنے والے تم کون؟ ہم تو اسے مار ڈالیں گے۔"

گھوڑے والا چلا گیا۔ اتنے میں وہاں سے ایک اونٹ والا نکلا۔ چڑیا اس سے بھی رو کر بولی۔

"بل بل والے بھیا جی، رنگ
چوں، چوں۔
سب مل کھائیں کانگولی
رنگ چوں، چوں۔
ہم پہ پڑ گئیں پھانسولی رنگ
چوں، چوں۔"

اونٹ والے کو چڑیا پر رحم آیا۔ اُس نے کسان سے کہا "چھوڑ دو بھائی اسے بیچاری نے کتنی سی کنگنی کھائی ہوگی تمہاری۔ جی چاہے تو ہمارا اونٹ لے لو۔"

کسان نے اسی طرح بگڑ کر جواب دیا "نہیں چھوڑتے جی! تم بیچ میں بولنے والے کون ہوتے ہو؟ ہم تو اسے جان سے مارے بنا نہ مانیں گے۔"

اونٹ والا چلا گیا تو وہاں ایک ہاتھی والا آ پہنچا۔ چڑیا اُس کے سامنے بھی روتی۔ روتی بولی۔

"بعد بعد والے بھیّا جی، رنگ چوں، چوں۔
سب مِل کھائیں کانگولی، رنگ چوں، چوں۔
ہم پر پڑ گئیں پھانسولی، رنگ چوں، چوں۔
ہاتھی والے کو چڑیا پر رحم آیا۔ اس نے کسان سے کہا۔
"چھوڑ دو بھائی بے چاری کو، اس نے تمہاری کتنی کنگنی کھائی ہوگی؟ اگر چاہو تو ہمارا ہاتھی لے لو۔ بولو۔ کیا کہتے ہو؟"
کسان بُری طرح بگڑا اور بولا "بڑے آئے ہاتھی دینے والے نہیں چھوڑتے، نہیں چھوڑتے۔ تم ہمارے بیچ میں نہ بولو۔ ہم تو اسے جان سے مار کر ہی رہیں گے۔"
ہاتھی والا چلتا ہوا تو وہاں ایک بنیا آنکلا۔ وہ گُڑ کی بھیلیاں لئے جا رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی چڑیا رونے لگی، اور بولی
"ہے گُڑ والے بھیّا جی رنگ چوں، چوں۔
سب مل کھائیں کانگولی، رنگ چوں، چوں۔
ہم پر پڑ گئیں پھانسولی، رنگ چوں، چوں۔"
بنیے کو چڑیا پر رحم آیا۔ اُس نے کسان سے کہا۔ لو بھائی یہ گُڑ کی بھیلیاں چھوڑ دو اسے۔ بیچاری نے ذرا سی تو کنگنی کھائی ہوگی۔"
کسان نے بگڑ کر جواب دیا "جاؤ، جاؤ، اپنا کام دیکھو، ہمیں نہیں چاہیئے تمہاری گُڑ کی بھیلیاں۔ بڑے آئے چڑیا کو چھڑانے والے۔ ہم تو اسے جان سے مار ڈالیں گے، تب ہی مانیں گے۔"
بنیا بے چارا چُپ چاپ وہاں سے لمبا ہوا۔ اتنے میں ایک حلوائی آتا دکھائی دیا۔ وہ ڈھیر بھر پیڑے لئے تھا۔ اُس پر نظر پڑی تو چڑیا آنسو بہاتی ہوئی بولی۔
"پیڑوں والے بھیّا جی، رنگ چوں، چوں۔
سب مِل کھائیں کانگولی، رنگ چوں، چوں۔
ہم پر پڑ گئیں پھانسولی رنگ چوں، چوں۔"
حلوائی کو چڑیا پر رحم آیا۔ اُس نے کسان سے کہا۔
"بے چاری نے کتنی سی کنگنی کھائی ہوگی تمہاری، پھر اسے کیوں پکڑ رکھا ہے؟ چھوڑ دو بھائی چھوڑ دو۔ اچھا ہو تو ہم سے یہ ڈھیر بھر پیڑے لے لو۔"
لیکن کسان کو رحم نہ آیا۔ اس نے بگڑ کر وہی جواب دیا۔
کیوں چھوڑ دیں؟ بڑے آئے پیڑوں کا لالچ دینے والے۔ ہم تو اسے جان سے ماریں گے اور خوشی منائیں گے۔ لے جاؤ اپنے پیڑے۔ ہمیں ضرورت نہیں۔"
حلوائی گیا تو وَن سے ایک سپاہی آ پہنچا۔ اُسے دیکھتے ہی چڑیا لگی بلک بلک کر رونے اور کہنے۔
"سنو سپاہی بھیّا جی، رنگ چوں، چوں۔
سب مل کھائیں کانگولی، رنگ چوں، چوں۔
ہم پر پڑ گئیں پھانسولی، رنگ چوں، چوں۔"
سپاہی کو چڑیا پر رحم آیا، اُس نے کسان سے کہا۔

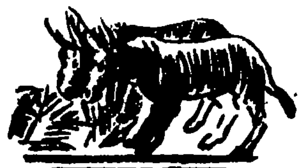


"ابے تُو نے اسے کیوں پکڑ رکھا ہے؟ بے چاری نے ذرا سی کنگنی کھائی ہوگی، یہی نا؟ لیکن یہ ایسی بات نہیں ہے کہ تو اسے پکڑے اور مار ڈالے۔ چھوڑ چھوڑ دیر مت کر۔"

کسان بھلا کیونکر مانتا! اس نے بگڑ کر سپاہی کو بھی جواب دیا۔ "بڑے آئے وہاں سے لاٹ صاحب بن کر! بھگوان اُتر آئیں تو بھی ہم نہ مانیں گے۔ چھوڑنا تو دور رہا ہم اسے کچا کھا جائیں گے۔ نمک، مرچ بھی نہ مانگیں گے۔ آپ ہیں کس خیال میں؟"

اب تو سپاہی آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے دے لات، دے گھونسے۔ کسان کی دل کھول کر مرمت کی۔ لات، گھونسے پڑتے ہی کسان کے ہوش بگڑ گئے۔ اُسے یہ بھی خبر نہ رہی کہ چڑیا کب اُس کے ہاتھ سے چھوٹی، اور کب پھُر سے اُڑ گئی، وہ ایک درخت کی شاخ پر جا بیٹھی اور لگی مزے سے گانے۔

"ہَن ہَن کو ہاں تو نے چھوڑا، رنگ چوں، چوں۔
بَل بَل کو بھی تو نے چھوڑا، رنگ چوں، چوں۔
بھَد بھَد کو پھر تو نے چھوڑا، رنگ چوں، چوں۔
میٹھا گُڑ بھی ناحق چھوڑا، رنگ چوں، چوں۔
پیڑوں کا وہ ڈھیر گنوایا، رنگ چوں، چوں۔
بیوقوف تو منہ میں آیا، رنگ چوں، چوں۔
لاتیں کھائیں، گھونسے کھائے رنگ چوں، چوں۔
ہوش ٹھکانے تیرے آئے، رنگ چوں، چوں



۱۵۔ اگست کا مبارک دن

پیارے بچو! کونسا ایسا ہندوستانی ہے جو ۱۵ اگست کے تاریخی دن کی یاد اپنے دل میں نہ رکھتا ہو۔ اس مبارک دن ہم نے ڈیڑھ سو سال کی غیر ملکی غلامی سے چھٹکارا حاصل کیا اور ۱۴ اگست کو انگریز ہمارے حاکم تھے وہاں ۱۵ اگست کو اپنے پیارے وطن کے آپ مالک بن گئے، اور بھارت کی حکومت ہمارے اپنے ہاتھوں میں آ گئی۔

نونہالو! بھارت کو آزاد ہوئے تین سال ہو گئے ہیں [illegible] مدت میں ہمارے دیش نے بہت ترقی کی ہے۔ غیر ملکوں کے ساتھ ہماری دوستی کے تعلقات بڑھ گئے ہیں۔ ملک میں پیداوار بڑھ رہی ہے۔ نئی نہریں، ریلیں اور سڑکیں بن رہی ہیں۔ دریاؤں سے بجلی پیدا کرنے کے لئے بڑے بڑے بند تعمیر ہو رہے ہیں۔ وہ دور نہیں جب بھارت ایک بہت ہی ترقی یافتہ ملک ہو اور ضرورت کی ہر چیز یہاں بنے گی۔ ریل کے انجن، موٹریں، نئے اوزار، مشینیں اور سینکڑوں قسم کا سامان تو ابھی بننا شروع بھی ہوگیا ہے۔

جس طرح پچھلے تین سال میں اتنی ترقی ہوئی ہے۔ آگے بھی اسی طرح ترقی کی اُمید ہے۔

نونہالو! یہ سب کچھ مِل جُل کر ہوتا ہے۔ تم بھی اپنے بڑوں کا ہاتھ بٹاؤ۔ علم پڑھو۔ ہنر سیکھو اور اُسے ملک کی خدمت کے کام میں لاؤ۔

بھارت دیش سب کا دیش ہے۔ اس میں کسی خاص فرقے کی [illegible] نہیں۔ سب کو اپنا بھائی سمجھو اور ایک آواز سے گاؤ۔

سب ہندی ہیں بھائی بھائی   ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی

وناسپتی

ایک صحت بخش، نہایت ضروری چکنائی ہے

پھر اسکی تیاری پر ممانعت کیوں؟

سائنس والوں نے تصدیق کی ہے کہ یہ صحت بخش ہے،
لاکھوں گھر اسے پسند کرتے ہیں اور انہیں اسکی ضرورت ہے،
ملکی فوجوں کو اس کی ضرورت ہے،
ہسپتالوں اور ہوٹلوں کو اس کی ضرورت ہے،
کیمپوں میں مہاجرین کو اسکی ضرورت ہے،
بسکوٹ بنانے والوں اور بیکری والوں کو اسکی ضرورت ہے۔

کیونکہ وناسپتی زیادہ ترین کھانوں کو بنانے کیلئے موزوں ہے، جبکہ رقیق تیل نہیں۔ یہ تیل سے زیادہ دیر تک تازہ رہتا ہے۔ یہ دیکھنے میں اور ذائقہ میں اچھا ہوتا ہے۔ یہ حکومت کی سخت ہدایات کے مطابق بنایا جاتا ہے مختصراً یہ ان لوگوں کیلئے جو گھی خرید نہیں سکتے ایک اعلیٰ درجہ کا صحت بخش بدل ہے اور پھر بھی ان سب فوائد کے ہوتے ہوئے بھی 'وناسپتی کی تیاری کو ممنوع قرار دینے کیلئے ایک ممبر کا بل پارلمنٹ میں پیش کیا گیا تھا لیکن حکومت نے صحیح طور پر فیصلہ کیا ہے کہ رائے عامہ حاصل کئے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔

حکومت کو مطلع کیجئے کہ آپ کو وناسپتی کی ضرورت ہے!

یہ آپ اس طرح سے کر سکتے ہیں:

۱ جس سے آپ وناسپتی خریدتے ہیں اس دوکاندار سے ملئے۔ وہ آپ کو حکومت کو پیش کئے جانیوالا درخواست نامہ دکھائیگا جس پر آپ کو دستخط کرنے چاہئیں۔ اسے زیادہ سے زیادہ دستخط چاہئیں۔ وہ آپ کو دلچسپ لٹریچر بھی دکھائے گا جو کہ ذمہ دار حاکموں کو بھیجے جا رہے ہیں اور جن میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وناسپتی مفید ہے۔

۲ آپ خود اپنے دستخطوں میں اپنے صوبہ کی حکومت کے چیف سیکریٹری کو لکھئے کہ آپ کو وناسپتی کی ضرورت کیوں ہے۔ لفافہ پر لفظ 'وناسپتی' لکھئے۔

لیکن یہ معاملہ جلد توجہ دینے کے قابل ہے
یہ کام آج ہی کیوں نہیں کر دیتے؟

مشتہر کردہ:- دی وناسپتی مینوفیکچررس ایسوسی ایشن آف انڈیا

VMA 18-69 UD

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting.
Govt. of India, Old Secretariat, D...

Regd. No. D.—21

۲۹/۱/۶۰

ونا سپتی صحت بخش اور ضروری ہے

اگر ونا سپتی نہ ہو تو آپ کیا کریں گے؟

(۱) گھی کیلئے تین گنا زیادہ قیمت دیں گے؟
(۲) غیر صاف شدہ تیلوں کا استعمال کرینگے جنہیں آپ پسند نہیں کرتے؟
(۳) اپنے کھانوں کو فقط اُبال کر ہی کھائیں گے؟

ایک ممبر نے ونا سپتی کو ممنوع قرار دینے کیلئے پارلمنٹ میں ایک بل پیش کیا ہے۔ لیکن حکومت نے صحیح طور پر فیصلہ کیا ہے کہ رائے عامہ لئے بغیر کوئی قدم بھی نہیں اٹھائیں گے۔

تو اب اس کا دارومدار آپ پر ہے!

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ونا سپتی قائم رہے تو اس سے حکومت کو مطلع کیجئے۔

یہ آپ اس طرح سے کر سکتے ہیں:

(۱) اس شخص سے ملئے جس سے آپ ونا سپتی خریدتے ہیں۔ وہ حکومت کو پیش کئے جانیوالے درخواست کے دستخط کرا دیگا۔ اسکے پاس فارم تیار ہیں اور اسے جلد از جلد زیادہ سے زیادہ دستخط کی ضرورت ہے کہ ونا سپتی
(۲) اور آپ اپنے صوبہ کی حکومت کے چیف سیکریٹری کو سادہ الفاظ میں لکھئے کہ آپ نے اسے صحت بخش ثابت قائم رہے کیونکہ اسے آپ پسند کرتے ہیں اور ہندوستان کے مشہور سائنسدانوں نے ونا سپتی، لکھئے۔ کیا ہے اور اسلئے بھی کہ اس کے بغیر آپ کا گزارہ نہیں ہے

لیکن دیری مت کیجئے!

یہ موقع وقت گنوانے کا نہیں ہے!

پھر آج ہی یہ کام کیوں نہیں کر دیتے؟

ونا سپتی مینوفیکچررس ایسوسی ایشن آف انڈیا

مشتہر کردہ ۱-دی

VMA. 14-60 UD


LET TH
ROSE BLOOM
عورت کا حسن اس کا سب سے بڑا کمال ہے۔ اسے مرجھانے سے بچایئے چہرہ کو کیل اور چھائیوں
اور جسم کو خارش سے بدنما نہ بنایئے۔ صافی کے استعمال سے خون کو صاف رکھیے۔ شفاف
خون کو رخساروں پر جھلکنے دیجئے۔ اور وقت کی جھریوں کو چند سال اور روک رکھیے
صافی
نہ صرف خون کو صاف کرکے چہرہ کو داغوں سے پاک اور سرخ و
رعنا بناتی ہے۔ بلکہ معدہ کو قوت دے کر شفاف خون پیدا کرتی ہے
چستی اور بدن میں رعنائی پیدا کرتی ہے۔
ہر جگہ بکتی ہے
قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ
ہمدرد دواخانہ۔ وقف۔ دہلی
amdard

آج کل دہلی

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹرز:- عرش ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

جلد ۹ —— نمبر ۲

سالانہ چندہ —— چھ روپے

فی پرچہ —— آٹھ آنے

ستمبر ۱۹۵۰ء

ترتیب

بچّوں کا آج کل

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

میرزا یگانہ چنگیزی

یگانہ آرٹ

(۱)

فطرت کا تقاضا ہے بشر سے لغزش
میدانِ عمل میں ناموَر سے لغزش
پیدا کتنے ہیں، کتنے معنی پنہاں؟
کب تک نہ ہو اربابِ نظر سے لغزش؟

(۲)

بازار میں جب کوئی بھی گاہک نہ رہا
دُکھتے دل سے کسی نے کیا خوب کہا!
آغاز وہ تھا حُسن کا انجام یہ ہے
ساری وہ رنگ و بُو ہوا ہو گئی، ہا ہا!

(۳)

پٹتا اپنے ہی دیس میں کیوں نہ سہے
بیچارہ غریب کیا کہے کس سے کہے؟
رہنا ہے یہیں اچھی بُری سہنا ہے
دل میں اُن کے جگہ رہے یا نہ رہے

(۴)

نیرنگیِ دُنیا سے وفا چاہتا ہے!
سادہ لوحی تو دیکھو کیا چاہتا ہے؟
دیکھیں کس کس کو راس آتی ہے بہار؟
ہر نخلِ ہوس نشو و نما چاہتا ہے!

عبدالماجد دریابادی

ترانۂ شوق

شوق قدوائی غریب کو اب تو کون جانتا ہے۔ زندگی ہی میں گمنام ہو چلے تھے۔ انتقال کو دن ہی کتنے ہوئے، ۱۹۲۵ء کی تو بات ہے۔ حسن و دولت اور زندگی و صحت کی طرح شہرت بھی انسان کے اختیار میں کب ہے! چندروزہ حاصل ہوئی بھی تو ٹکنا اور جمنا اور بھی دشوار۔ ایک پھلجھڑی تھی کہ چھُٹ کر رہ گئی۔ ایک آندھی تھی کہ اُٹھی اور گزر گئی۔

لیکن تاریخ اس معاملے میں ہے بھی بے درد اور نامنصف مزاج سی۔ کتنوں کو جنھیں شہرت کا تاجدار اور ناموری کے دربار کا مسند نشین ہونا چاہیئے تھا، یوں ہی روندتی، پھاندتی اور پامال کرتی چلی جاتی ہے! ——— انھیں گمنام ناموروں میں منشی احمد علی شوق قدوائی (شاگرد اسیر) کا بھی شمار ہے۔ وطن جوار لکھنؤ میں قصبہ جگور، لیکن لکھنویت میں امیر مینائی، ریاض خیرآبادی، سجاد حسین کاکوروی، صفی جائسی کی طرح کسی لکھنوی سے پیچھے نہیں۔ غزلوں کا ایک پورا دیوان موجود۔ لیکن غزل گوئی میں تو کچھ یوں ہی سے تھے۔ ناسخ کی طرح نرے زبان کے شاعر۔ اور زبان و لغت ہی کی تحقیق میں اپنی طویل عمر کا نصف آخر بسر کر دیا۔ اُن کی شاعری کے اصلی جوہر مثنوی میں کھلے۔ قاسم و زہرہ۔ عالم خیال اور نیرنگ جمال وغیرہ متعدد مثنویاں کہہ ڈالیں۔ سب پڑھنے کے قابل اور سب پر انھیں ناز۔ اور بڑی حد تک بجا ناز بھی تھا۔ لیکن ان کی شہرت اور شاعرانہ عظمت کی اصل ضامن اُن کی سب سے پرانی مثنوی ان کے زمانۂ شباب بلکہ آغازِ شباب کی کہی ہوئی ترانۂ شوق تھی۔[1]

لکھنؤ میں مثنویات اور عاشقانہ مثنویات بے شمار کہی گئیں۔ لیکن اپنے دل کو ان میں سے تین ہی لگی ہیں۔ ایک میر حسن کی سحرالبیان (بے نظیر و بدر منیر) دوسری پنڈت دیاشنکر نسیم کی گلزارِ نسیم۔ تیسری نواب مرزا شوق لکھنوی کی زہرِ عشق۔ شوق قدوائی کی ترانۂ شوق انھیں کے جوڑ اور انھیں کے ٹکر کی بلکہ انصاف کی عدالت سے فیصلہ عجب نہیں جو یہ ہو کہ جو خوبیاں ان تینوں میں الگ الگ ہیں ان سب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے، ان سب کا عطر اپنے میں بسائے ہوئے اور اس طرح ان تینوں سے بھی کچھ بیس ہی ہے۔ حیف ہے اردو زبان کے شیدائیوں اور پرستاروں پر اگر وہ اپنے خزانے کے اس انمول موتی کو یوں ناشکری کا شکار اور کس مپرسی کی نذر ہو جانے دیں۔

سب سے پہلا ایڈیشن ۱۸۸۳ء میں نکلا۔ شوق اُس وقت ایک ہفتہ وار اخبار آزاد لکھنؤ سے نکال رہے تھے۔ آزاد اپنے وقت کے معیار سے اسم بامسمی سیاست میں بڑا آزاد خیال پرچہ تھا۔ سرسید اسکول کے برعکس مشترک قومیت یا نیشنلزم کا نقیب اور اودھ پنچ کا ہم نوا۔ مثنوی کی ضخامت خاصی، سیاست و صحافت کے مشغلوں کے ساتھ اتنی بڑی نظم کہنے میں ایک زمانہ لگا ہوگا۔ بہرحال شائع ۱۸۸۳ء مطابق ۱۳۰۱ھ میں اردو پریس گولا گنج لکھنؤ سے ہوئی۔ میں نے کل شعر گنے تو ڈھائی ہزار سے کچھ کم یعنی دو ہزار چار سو پینسٹھ پائے۔

آخر میں اُس وقت کے حسبِ رواج قطعاتِ تاریخ بہت سے ہیں اور بعض استادوں کے قلم سے مثلاً امیر مینائی۔ افضل (چھوٹے بھیا) حکیم (بڑے بھیا) فصاحت وغیرہ۔ مشہور نعت گو محسن کاکوروی کا قطعۂ تاریخ آنا لطیفہ اور ایسے لکھنوی رنگ میں ہے کہ اُس کا نقل کرنا بھی ایک ظلم ہے۔ ملاحظہ:

اس قدر شوخ مثنوی محسن — کسی نے سُنی نہ دیکھی ہے
رو برو اس زبانِ اردو کے — فارسی کی تمام ترکی ہے
کس بلندی پہ ہے زمینِ شعر — فلکِ ہفتمیں پہ کرسی ہے

ستمبر ۱۹۵۰ء

[1] دیوانِ شوق (موسوم بہ فیضانِ شوق) پر مفصل مقدمہ شوق کے نواسے داماد حسین الدین انصاری عزیزی ایم اے، ایل ایل بی، بیرسٹر ایٹ لا کے قلم سے ہے۔ اس میں یہ درج ہے کہ یہ مثنوی شوق نے ۲۰ سال کی عمر میں کہی تھی، اور اسے دیکھ کر استاد اسیر نے انھیں داد بھی دی تھی۔ لیکن یہ روایت ناقابلِ یقین اس لئے ہے کہ مثنوی طبع اول کی تاریخ ۱۳۰۱ھ ہے اور اسیر کا انتقال ۱۲۹۹ھ میں ہو چکا۔

آجکل دہلی

سحر و افسوں ہے بول چال انکی　　فتنۂ حشر لفظ و معنی ہے
اڑے جاتے ہیں لفظ سے مضموں　　سطر صفحہ پہ لوٹی جاتی ہے
دونوں مصرعے ہیں کیا تُلے تُلے ہوئے　　ایک سیماب ایک بجلی ہے
ہاتفِ غیب بھی یہ کہتا ہے　　بارک اللہ عجیب شوخی ہے

۱۳۰۵ھ

یہ زمانہ وہ تھا کہ انگریزی تہذیب و تعلیم کا تسلط پوری طرح ہندوستان پر ہو گیا اور پُرانے مذاق کی مثنویاں لکھنے لکھانے کا چلن ہی اٹھ چکا تھا۔ اس دور میں بدرِ منیر و بے نظیر کی قسم کی مثنوی کہہ ڈالنا شوق ہی کا دل و جگر تھا۔ خدا جانے انھیں اس وقت اس کی ہمت ہوئی کیسے؟ اور خیر وہ زمانہ تو پھر غنیمت تھا۔ دورِ قدیم نہ سہی، دورِ قدیم سے متصل تو تھا۔ کمال یہ ہے کہ اس کے برسوں بعد بھی شوق اس کے ایڈیشن پر ایڈیشن نکالتے رہے۔ چنانچہ دوسرا ایڈیشن نظرِ ثانی اور ترمیم کے بعد ۱۷ سال بعد کر ۱۹۰۲ء میں مطبع شام اودھ لکھنؤ نے نکالا۔ اشعار کی مجموعی تعداد اب کی کچھ برائے نام بڑھ گئی۔ یعنی میزان دو ہزار چار سو اکتیس تک پہنچی۔ اور اس درمیان میں جو تنقیدیں نکل چکی تھیں شاعر اب کی ان سے بھی مستفید ہوا ہے۔ مثنوی کی بحر وہی گلزارِ نسیم کی ہے۔ اور شاعر اپنے کمالات کو خالص مشرقی انداز میں اپنے استاد کی جانب منسوب کر رہا ہے۔ خاتمے کا شعر طبعِ اوّل کی طرح اس طبعِ ثانی میں بھی یہی ہے ؎

جتنی میرے سخن کی ہے دھوم　　سب ہے فیضِ امیرؔ مرحوم

۱۹۰۲ء کو بھی پیچھے چھوڑ کر زمانے کا قدم دس گیارہ سال اور آگے بڑھا اب شاعر کی دوسری مثنویاں عالمِ خیال۔ نیرنگِ جمال وغیرہ جو عاشقانہ ہونے کے باوجود جدید رنگ کی رعایتیں لیے ہوئے تھیں حسنِ قبول حاصل کر رہی تھیں۔ ایسے میں شاعر کو خدا معلوم کیا خیال آیا کہ اس نے پُرانی مثنوی پر ایک بار پھر تمام و کمال نظرِ ثانی کر ڈالی۔ نظرِ ثانی کا سنہ مجھے ایسا سنا یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۱۳ء تھا۔ بہرحال یہ تیسرا ایڈیشن نکلا تو اس کے بھی کئی سال بعد ۱۹۲۰ء میں منیر صاحب (صاحبِ نور اللغات) کے منیر پریس واقع قیصر باغ لکھنؤ سے۔ اس میں اشعار کی تعداد بڑھ کر دو ہزار پانسو ستائیس ہو گئی ہے ـــــــ ۱۹۲۱ء تو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں خاص ہیجان اور ہلچل کا سال گزرا ہے۔ ساری فضا "خلافت" اور ترک موالات کے نعروں سے معمور۔ اس وقت اس قماش کی مثنویوں کو پوچھتا کون؟ جیسے آج ۱۹۵۰ء میں ان تبرکاتِ قدیم کے تذکروں اور تبصروں کا پوچھنے والا کون ہے؟

آج ان تینوں پریسوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں اور نہ شاید کتاب ہی اب بازار میں کہیں آسانی سے مل سکے۔ بہرحال آگے جو کچھ عرض ہوگا اس تیسرے ایڈیشن کے حوالے سے ہوگا۔

داستان کی بسم اللہ، آغازِ داستان سے قبل تمام پُرانے مثنوی گو حمدِ باری سے کرتے ہیں۔ شوق کی حمد ملاحظہ ہو۔ اا میں چھ شعر ؎

اللہ کی حمد ہے زباں پر　　ہے آج دماغ آسماں پر　　۱
وصف اس کے لکھیں جو لکھنے والے　　کونین کے دو ورق ہوں کالے　　۲
دی منھ کو زباں، زباں کو تقریر　　پُتلی کو نظر، نظر کو تسخیر　　۳
شب کو کیا روز، روز کو شب　　لب کو دئے حرف، حرف کو لب　　۷
پُھول اس نے کھلائے، کھیلتے ہیں روز　　دو وقت ملائے، ملتے ہیں روز　　۹
خامہ یہ تھکا کہ رُک گیا ہے　　سر لوح پہ رکھ کے جھک گیا ہے　　۸

اتنی سلیس "نیچرل" اور دل نشین حمد کمتر کسی شاعر کے نصیب میں آئی ہوگی اور نعت بھی ایسی ہی سادہ اور مؤثر ؎

ہے وصفِ جناب احمدِ پاک　　لولاک لما خلقت الافلاک　　۱۲
کونین کا حصر دم پہ اُن کے　　معراج کا سر قدم پر اُن کے　　۱۳
منظورِ نظر جو چار تھے یار　　کاشانۂ دیں کے تھے ستون چار　　۱۶
افلاکِ رضا کے چار اختر　　دیوانِ قضا کے چار [illegible]　　۱۸
لازم ہے ثنائے اہلبیت اب　　تھے دیں کے شجر کے پھول [illegible]　　۱۹
گویا قدِ مصطفےٰ شجر تھا　　اس میں کوئی گل کوئی ثمر تھا　　۲۰

مناجات میں شاعر اپنے دل کے ولولے عرض کر رہا ہے۔ پڑھتے جائیے اور گلزارِ نسیم کی بہترین صنعت کاریاں ایک ایک کرکے خیال میں لاتے جائیے ؎

یا رب مجھے قوتِ بیاں دے　　منہ میں شمشیر کی زباں دے　　۴۰
بازو مرے قلم میں دو دیں ہو　　قبضہ میں قلم و سخن ہو　　۴۶
دیکھے جو بیان کی روانی　　شو کے بحرِ رواں کا پانی　　۴۷

گہرا یہ ہو رنگ شاعری کا — رنگ لبِ سرخ شہرےاں کا ۴۸
ہو رشک یہ چستیِ سخن پر — ڈھیلی ہو قبائے نازتن پر ۴۹
بندش پہ ہو موئے بندشیا — چوٹی میں ہو پیچ و تاب پیدا ۵۰
اس نسخہ کو کھینچ پہ ہو فوق — سرمہ ہو یہ بہرِ دیدۂ شوق ۵۱

پلاٹ میں کوئی خاص جدّت یا ندرت نہیں۔ قصّہ وہی ہے جس کے خدوخال سے ہم آپ سب اہلِ مشرق مانوس ہیں۔ ملکِ عجم کا ایک بادشاہ ہے، بڑا پُر قوت و صولت لیکن اولاد سے محروم۔ آخر گلشنِ اُمید میں بہار آتی ہے ؎

دانے سے ہوئی شجر کی اُمید — قطرے سے پڑی گہر کی امّید ۷۰
گِن گِن کے کٹے جو نو مہینے — مژدہ دیا شاہ کو کسی نے ۷۱

بادشاہ کی مسرّت اور جشنِ مسرّت کا کیا پوچھنا۔ اپنے چاند کا نام ماہِ عالم رکھا ؎

ٹوٹے سے نہال ہو گیا شاہ — تارے نے کیا ہلال کو ماہ ۷۶
لعل و زر و سیم سب منگایا — بانٹا، بخشا، دیا، لٹایا ۷۹
تھا وہ نورِ نگاہِ عالم — رکھا گیا نام ماہِ عالم ۸۱

شہزادے کے جمال و کمال دونوں کی تصویر ملاحظہ ہو ؎

حصّے میں تھی آبرو کی ہر شے — تھا رزم میں تیغ بزم میں مے ۸۶
دانش میں خیالِ نکتہ یاباں — بینش میں نگاہِ بے حجاباں ۸۷
اندیشہ میں وسعتِ شبِ ہجر — افکار میں گرمیِ تپِ ہجر ۸۸
رنگینیِ سخن میں لعلِ احمر — شیریں دہنی میں حوضِ کوثر ۸۹
نور اس کا فروغِ دیدۂ طور — حسن اس کا چراغِ محفلِ نور ۹۱
اوج اس کی جبیں کا اک پرتو — شان اس کے چراغِ بخت کی لَو ۹۲
رفعت کوٹھے کا ایک زینہ — دولت خاتم کا ایک نگینہ ۹۳
طاقت چٹکی میں صورتِ تیر — نصرت قبضے میں مثلِ شمشیر ۹۴
عقل اتنی بڑھی کہ زلف گھٹ جائے — عمرِ خضر و مسیح کٹ جائے ۹۵

لطیف و نادر تشبیہیں اتنی دل نشیں اور یوں مسلسل اور پے در پے آپ نے کسی دوسری مثنوی میں دیکھی ہیں؟ —— قصّہ آگے بڑھئے۔ ایک تاجر صاحب وارد ہوتے ہیں اور حسبِ دستور حسن کے دلال ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے زمانے کا رواج۔ اُس وقت "رومانس" یوں ہی لڑا کرتا تھا ؎

تاجر کوئی مال لے کے آیا — اس نے اک تازہ گل کھلایا ۱۰۴
یہ چیز دکھائی، وہ دکھائی — بھی جو شے پسند آئی ۱۰۵
قصّہ کوتاہ آخر کار — تصویریں دکھائیں اس نے دو چار ۱۰۶

ایک پیکرِ جمال پر شہزادے کا دل آگیا ؎

بولا شہزادہ چشمِ بد دور — ہے یہ کس کی نگاہ کا نور ۱۱۵
کس برج کے چاند کی یہ ضو ہے — کس گھر کے چراغ کی یہ لو ہے ۱۱۶

آپ بھی اس تصویرِ نور کی جھلک عالمِ خیال میں دیکھ لینا چاہتے ہیں؟ بہتر ہے ؎

برجِ شرف قمر ہے وہ سر — یا نخل ہے قد، ثمر ہے وہ سر ۱۲۶
یا سر ہے حبابِ بحرِ اسود — زلفیں سیلابِ بحرِ اسود ۱۲۸
تن میں جو ہے بوئے بادۂ حسن — وہ سر ہے سبوئے بادۂ حسن ۱۲۹
ہے جلوہ نما وہ مانگ سر پر — گویا شمشیر ہے سپر پر ۱۳۰
کاکل شبِ ہجرِ خستہ حالاں — یا ہے بختِ شکستہ حالاں ۱۳۳
بال اس کے جو آنکھوں سے نظر آئیں — قسمت میں بلا کے پیچ پڑ جائیں ۱۴۲
چہرہ میں ہے جنّتِ منوّر — یا باغِ جناں میں حوضِ کوثر ۱۴۸
کیا رنگ کہوں شگفتگی کا — اک پھول کھلا ہے چاندنی کا ۱۴۹

سراپا نگاری تو ہمارے مثنوی گویوں کا خاص موضوع ہی ہے۔ خوب خوب اُن کے جوہر اسی میدان میں آکر چمکتے ہیں۔ شوق کو دیکھئے پامال تشبیہوں سے بچ بچ کر کیسی کیسی جدّتیں اور ندرتیں پیدا کر رہے ہیں اور سراپا نگاری کا کمال ایک ایک سطر میں دکھاتے جاتے ہیں —— ابھی تو آپ آنکھوں تک بھی نہیں پہونچے۔ ابھی بہت سی منزلیں طے کرنا ہیں ؎

آنکھیں ہیں بیاضِ سحر خوانی — یا ساغرِ بادۂ جوانی ۱۵۵
جادو ڈالیں تو صاف چل جائے — رنگ ابلقِ دہر کا بدل جائے ۱۵۶
چتون سے عیاں ہے خوش کلامی — کہئے آنکھوں کو شرحِ جامی ۱۵۸
بینی اللہ کا الف ہے — یا شمع ہے یا صراحیِ مے ۱۶۱
بینی رخِ باصفا میں کیا ہے — پشتہ قرآں کی جلد کا ہے ۱۶۳
لب ایک ہے "با" تو دوسرا "تا" — دونوں جو ملیں تو "بت" ہو پیدا ۱۶۹
بت بن کے وہ سنگدل نہ بولے — عیسیٰ بھی جو بولیں لب نہ کھولے ۱۷۰

کیا وصفِ دہن میں کیجیے فکر   جو چیز نہیں ہے اس کا کیا ذکر ۱۷۳
ہاں چوک یہ ہی نکلتی ہے بات   سانچا ہے وہ جس میں ڈھلتی ہے بات ۱۷۴
ہیں دانت دہانِ صاف میں بند   سیپارے ہیں یا غلاف میں بند ۱۷۷
ہیرا ہے تو شعر یہ گفتگو ہے   موتی کی ذرا سی آبرو ہے ۱۸۰
عینِ آنکھ کو کیجیے جو تسلیم   شک اس میں نہیں کہ ہے دہن میم ۱۸۳
کہتی ہے نظر کی نکتہ یابی   ہے پارۂ عم رُخِ کتابی ۱۸۴
شانے جو ہیں دونو بازوؤں پر   وہ ہیں مینا تو وہ ہیں ساغر ۱۹۱
گورا ہے بدن تو نہر کہیے   ہر ہاتھ کو ایک لہر کہیے ۱۹۳

انگشت نمائی کا ڈر نہ ہو تو لیجیے اور انگلیوں کی بھی تشبیہیں ملاحظہ کرتے چلیے ؎

کیا کیجیے وصفِ پنجۂ نور   ہے پنجۂ آفتاب مشہور ۲۰۰
آنکھوں کو کہا جو نرگسِ جامی   پنجہ ہے خمسۂ نظامی ۲۰۲
پوروں سے ہی ہیں شکر انگشت   فوارۂ نور ہر سر انگشت ۲۰۳

بلور کے برجوں کا ذکر ناگزیر تھا۔ فارسی اور اردو کی شاعری اُن کی تشبیہات سے پٹی پڑی ہے۔ شوق یہاں بھی جدّتِ تخیل کا ثبوت دیتے ہیں ؎

یا میوۂ نخلِ زندگانی   یا محملِ ناقۂ جوانی ۲۰۸
بےخود تھے شراب پینے والے   مستی میں اُلٹ دیے پیالے ۲۰۹

تشبیہات کی جدت کے لحاظ سے شوق کی مثال مابعد کے شاعروں میں اگر کہیں ملتی ہے تو بس جوش ملیح آبادی کے وہاں —— کمر کا مضمون تو دیکھیے رہا ہی جاتا ہے۔ کیا نیستی سے ہستی ثابت کی ہے ؎

موہوم ہے وہ کمر بیانِ شک   صانع نے دیا ہے نقطۂ شک ۲۱۹
اک زلف کا بال ہے کمر کیا   شاعر کا خیال ہے کمر کیا ۲۲۰
ستّارِ عیوب کی قسم ہے   دو ہستیوں میں نہاں عدم ہے ۲۲۸

بس ایک دو شعر اور، اور اس عنوان کو ختم کیجیے ؎

رانیں ہوس میں ہیں مستور   شمعیں فانوس میں ہیں مستور ۲۳۰
نہاں بادل میں بجلیاں ہیں   مضمون الفاظ میں نہاں ہیں ۲۳۱
ساقوں پہ یقیں ہو شاعروں کو   مصرعے ہیں یہ بیتِ حسن کے دو ۲۳۲

پلاٹ میں کیا رکھا ہے۔ اصل شے تو یہی سراپا نگاری تھی۔ پلاٹ وہی ڈھیلا ڈھالا جیسا پرانے افسانوں کا ہوا کرتا تھا۔ مثنوی کا لطف جو کچھ ہے وہ حسنِ بیان و شستگیِ زبان میں ہے —— بادشاہ کو پرچہ لگا کہ شہزادے صاحب پر عشق کا جن سوار ہوا ہے۔ ہوش اُڑ کر رہ گئے ؎

رفتہ رفتہ اُڑی ہوا یہ   قمری کسی سرو کا ہوا یہ ۲۹۷
باتوں باتوں سنا پدر نے   دل دیکے لیا ہے غم پسر نے ۲۹۸
ہوش اُس کے اُڑے قمری کی صورت   آنسو ٹپکے شرر کی صورت ۲۹۹

باپ نے بلایا۔ صاحبزادے زار و نزار با دیدۂ تر حاضر ہوئے۔ باپ نے ڈانٹا پھٹکارا۔ کچھ اثر نہ ہوا ؎

آغوشِ طلب پدر نے وا کی   پہلو میں جگر کی طرح جا کی ۳۱۰
صدمہ تھا، ملال تھا، قلق تھا   آنکھیں نیچی تھیں رنگ فق تھا ۳۱۱
سلطاں نے غبار اس کا تاڑا   دامن کی مثال خوب جھاڑا ۳۱۵
بیتابیِ دل ابھارتی تھی   غیرت مگر آنکھ مارتی تھی ۳۱۶
دل تنگ ہوا تو عقدہ کھولا   گرمی دیکھی تو جل کے بولا ۳۱۷
غم خار نہیں جسے نکالوں   دکھ پیڑ نہیں کہ کاٹ ڈالوں ۳۱۸
عشق آگ نہیں کہ بجھ کے جائے   رنج آب نہیں کہ بڑھ کے بہ جائے ۳۱۹
دیکھا جو یہ اضطراب کا رنگ   تیور کی طرح بدل گیا رنگ ۳۲۰

سب کی عقلیں چکرائیں کہ اب کیا کیا جائے۔ ایک پیر مرد مشیرِ باتدبیر بن کر نمودار ہوئے۔ اور پیامِ عقد بھجوانے کی رائے سجھائی ؎

مجمع میں تھا ایک پیرِ دانا   دیکھے ہوئے آنکھوں سے زمانہ ۳۳۱
کوچے میں جو رہبری کے آئے   ہو خضر تو راستہ بتائے ۳۳۳
صورت میں کمان، فکر میں تیر   ہر شب غم سحر تھا وہ پیر ۳۳۴

ہم نشینوں نے شہزادے کو سمجھایا بجھایا کہ خط جا رہا ہے۔ کامیابی ہوگی ؎

رخ برگ نہیں ہے زرد کیوں ہے   دل برف نہیں ہے سرد کیوں ہے ۳۵۸
چہرے پہ غبار چھا گیا کیوں   آئینے پہ زنگ آ گیا کیوں ۳۵۹
تصویر کی حیف دل میں جا ہو   بُت ساکنِ خانۂ خدا ہو ۳۶۰
پھل نخلِ جنوں کے پل رہے ہیں   کلیوں میں شگوفے کھل رہے ہیں ۳۶۲
برسے گا اگر گھرا ہے بادل   پھولا ہے شجر تو لائے گا پھل ۳۶۸
غنچہ ہی تو ہوگا پھول کر کھل   سلجھے گی اُلجھ گئی جو کاکل ۳۶۹

نامہ بری کی خدمت انہیں سوداگر صاحب کے سر پڑی۔ خط اور شہزادے کی تصویر اور بےشمار تحائف کے ساتھ یہ زبانی ہدایتیں بھی ملیں اور یہی شوق کی فنکاری کا اصل میدان ہے ؎

خسرو کو شبیہ و نامہ دینا — کہنا سننا جواب لینا ۳۹۰
ہو سخت تو بولنا بہ نرمی — ٹھنڈا کرنا کرے جو گرمی ۳۹۱
کچھ راگ جو لائے ساز رکھنا — پرواز کرے تو باز رکھنا ۳۹۲

ہزار حسینوں کا ایک حسین تو خود یہ شہزادہ تھا۔ دیکھنے والے تصویر دیکھیں تو بت بنے ہوئے دیکھتے رہ جائیں ؎

صورت کا بناؤ چشم بد دور — سائے میں تھا آفتاب کا نور ۴۰۷
زاہد کیسا ہی بت شکن ہو — اس بت کو جو دیکھے برہمن ہو ۴۰۸

قاصد جواب باصواب پا کر شاداں و فرحاں روانہ ہوا۔ ذیل کے مصرعوں میں اس پر شاعر صاحب کے ذہن کی پرواز ملاحظہ ہو۔ قاصد کے پر لگا دئے ہیں ؎

کاغذ جو ملا، ہوا اتھا قاصد — لیکن آہ سے کچھ سوا اتھا قاصد ۳۶۱
دم چلنے پہ منفعل ہوا اس سے — عمر گزران خجل ہوا اس سے ۳۶۲
جنگل جو پڑا ہوا اتھا راہی — دریا جو ملا بنا وہ ماہی ۳۶۳
گو گرم روی بہت جتائے — سورج کی کرن نہ اسکو پائے ۳۶۴

شہزادہ بہت خوش خوش بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ دیارِ حبیب کو چلا۔ راہ کی ایک منزل میں ایک رات کیا آئی کہ ایک بلا آئی ؎

اک شب کہ تھی کاکلِ سرِ غم — ہم رنگ لباس اہلِ ماتم ۵۱۷
یا بختِ سیاہ اہلِ زنار — یا فردِ حساب عمر کفار ۵۱۸

پریوں کا تخت ادھر سے گزرا۔ مشتری پری سوتے ہوئے شہزادے پر سو جان سے فریفتہ ہو کر اسے اپنے ساتھ اڑا لائی۔ آنکھ کھلی تو کارخانہ ہی دوسرا نظر آیا ؎

آنکھیں جو کھلیں نصیب سویا — کانپا سہا غریب رویا ۵۴۶

اور مشتری کو اپنے حق میں زحل سے کم نہ پایا۔ لیکن یہ پری بھی اڑتی چڑیا کے پر گننے والی تھی ؎

سوچی ابھی جال میں پھنسا ہے — بچ کر کے مجھ سے تو دور کیا ہے ۵۵۸
ہو دام وہ سلسلہ نکالو — دم دھاگے کا جال اس پہ ڈالو ۵۶۱

چھیڑا اسے جس میں ساز ہو جائے — چھینٹے دئے تا غبار دب جائے ۵۶۳

پری کی لگاوٹ اور انسان کی کس مساہٹ کا بھی ایک منظر دیکھتے چلئے ؎

باہر ہوئی جامے سے ہوس میں — لیں اس کی بلائیں دیکھ کمیں ۵۷۳
یاں دل کو ہوا جو اور رکا تھی — کانا بچی پری کھٹک رہی تھی ۵۷۲
پھیلی وہ تو یہ سمٹ کے بیٹھا — آگے جو بڑھی تو ہٹ کے بیٹھا ۵۸۰

شہزادے کو آخر قید خانہ کی ہوا کھانی پڑی۔ اس کے قبل مشتری کی زبان سے جو عتاب سننا پڑا وہ بھی قابلِ دید ہے۔ مشتری آگ کی بنی ہوئی مخلوق ہے مشتعل ہو کر آگ ہی ہو جاتی ہے۔ گرما گرمی اس کے لہجے میں نہ ہوگی تو اور کس کے لہجے میں ہوگی ؎

آمادہ ہوئی جفا پہ جی سے — مریخ بنی وہ مشتری سے ۶۲۱
غصہ تھا کہ قہر تھا خدا کا — چتون تھی کہ قہر تھا جفا کا ۶۲۲
گیسو تھے کہ دام تھے بلا کے — ابرو تھے کہ نیچے قضا کے ۶۲۳
دیدے آنکھیں بدل رہے تھے — خنجر سے وہ ہونٹ چل رہے تھے ۶۲۶
پلکوں سے چبھوئے خار پر خار — قد سرو کے بڑھ کے بنا دار ۶۲۸
دھن اور رہتی اور راگ نکلا — پانی تجھے سمجھی آگ نکلا ۶۳۳
تو کیا، تجھے دھن ہی کی وہ کیا — بنی برق وہ منہ اتنا جل گیا ۶۳۱
تو مجھ سے نہ اڑ کہیں پری ہو — روشن ہو کہ آگ سے بنی ہو ۶۳۷
پاؤں تو اسے ہلاک کر دوں — بھڑکوں تو جلا کے خاک کر دوں ۶۳۸

کلام کی حلاوت و دلآویزی متقاضی ہے کہ کوئی شعر بے نقل کئے نہ چھوڑئیے اور بیان کی رنگینی اور دل کشی سفارشی کہ ورق کے ورق دوہراتے چلے جائیے۔ لیکن اگر تبصرے کو تبصرے کے حدود کے اندر لکھنا ہے اور شرح حاصل المتن و مساوی الحجم بنا دینا منظور نہیں ہے تو بہر حال بہت کچھ چھوڑنا اور بہت کچھ سے قطع نظر کرنا لازمی ہے —— اچھا تو ادھر ماہ عالم کو ایک درویش کی مدد سے قید طلسمات سے نجات ملی۔ ادھر اس کی خبر مشتری کو لگی۔ جو دیو پاسبانی کے کام پر کھڑے تھے ان پر آگ برس گئی ؎

میں آئی گہن میں چاند چھوٹا — ان دیووں پر آسماں نہ ٹوٹا ۸۲۱
ناچ ان کو نچاؤں تو پری ہوں — دنیا سے اڑا دوں تو پری ہوں ۸۲۲

کسی نے جا کر مشتری کی ان کو خبر کر دی کہ ؎

انسان کی چاہ ہے پری کو — یوسف ہے عزیز مشتری کو

جل تو جلال تو بنی ہوئی آڑی اور باغ میں آکر مشتری پر برسی ؎

گم بار بھی بھولی مشتری تو — کیا باغ کے ہاتھ بک گئی تو ۸۷۰

ہے فصل اس باغ میں تو کیا کام — شاخیں نکلیں گی ہو گی بدنام ۸۷۱

رکا لے آتش صاف مکر گئی۔ بولی یہ نیا گل کس نے کھلایا ہے؟ مجھے پارسائی سے کیا واسطہ؟ پتا پتا بوٹا بوٹا میرا گواہ ہے ؎

آنکھوں سے نہیں کسی کو دیکھا — دیکھا بھی تو آدمی کو دیکھا ۸۷۵

اس باغ میں کوئی گل جو کھلتا — پتی کو پتہ مزور ملتا ۸۷۶

نرگس کچھ دیکھتی تو کہتی — سوسن کی زبان چپ نہ رہتی ۸۷۷

بو پائی ہو کچھ تو کیتکی بول — گلبرگ اپنی زبان تو کھول ۸۷۸

آنکھوں سے عیاں ہے سرخی قہر — لو پاکس لس کی گا نٹھ لے زہر ۸۷۹

ں پہونچ کر گلزار نسیم کا وہ مقام یاد کر لیجئے۔ جہاں بکاؤلی اپنے پھول کو ب پاکر اپنی سہیلیوں اور پیش خدمتوں پر برس رہی ہے ؎

سنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد اسے سولی پر چڑھانا

نرگس تو دکھا کدھر گیا گل — سوسن تو بتا کدھر گیا گل

ں چاہ کے پھیر میں تو شہزادے کو ابھی خدا معلوم کتنے اور کنوئیں جھانکنے جنگل کے بعد طلسمات میں گرفتار رہا۔ وہاں سے بھی رہائی پائی ایک رجنگل میں تھا کہ سیاہ آندھی آگھیرا۔ سب ساتھی چھوٹ گئے ——

یک رفیق کی دشت پیمائی، صحرا نوردی کی عکاسی ؎

سارے جنگل کی خاک اڑائی — شہزادے کی گرد تک نہ پائی ۱۱۷۴

تلوؤں میں پڑ خشک کانٹوں کا حال — ہوں جیسے برش میں سینکڑوں ڈال ۱۱۷۵

خری مصرعہ میں تشبیہ میں جو ندرت ہے یہ حصہ یا تو آج جوش ملیح آبادی ا ہے۔ اور آج سے ۶۰۔ ۶۵ سال قبل شوق قدوائی کا تھا۔

آخرکار ماہِ عالم نے دیارِ حبیب میں قدم رکھا۔ شہر والوں کو خبر ہوئی اور سب پیشوائی کو امنڈ پڑے ؎

دو نکلے ادھر سے چار ادھر سے — دوڑے کہ بلائیں لیں نظر سے ۱۳۶۱

تھے راہ میں جمع شہر والے — یا مانگ بھری تھی موتیوں سے ۱۳۶۲

صنعت گری کی افراط کے ساتھ سلاست کی یہ مثالیں جمع ہوتے کم ہی کہیں دیکھنے میں آئی ہیں۔

شہزادی کا نام یاسمن تھا۔ ایک سہیلی گلشن تھی۔ اس کے اور ایک پیرزن مشاطہ کے توسط سے ایک باغ میں ماہ عالم اور یاسمین کی چند لمحے کی ملاقات کا انتظام ہو جاتا ہے۔ اب دونوں کے ملنے کی ادائیں ملاحظہ ہوں۔

یاں پردۂ چشم ہو گئی شرم — پہلو وہاں شوق نے کیا گرم ۱۴۹۷

یاں جھک کے نظر زمیں پہ پہنچی — واں چشم ہوس جبیں پہ پہنچی ۱۴۹۸

یاں شرم سے پھول شبنم آلود — واں کوششِ عاشقانہ مقصود ۱۴۹۹

یاں موئے مژہ نظر ہو چلمن — واں دست ہوس کو شوق دامن ۱۵۰۰

ملتے ہی کھلیں ہوس کی راہیں — للچائی ہوئی پڑیں نگاہیں ۱۵۰۲

شہزادہ تھا ولولوں سے پرجوش — جیسے مے کی ہوس میں مے نوش ۱۵۰۴

شہزادی گو حیا کی پتلی لیکن بہرحال عصمت مآب ہے۔ کن تیوروں سے جواب دیتی اور افشائے راز سے ڈراتی ہے ؎

آمادہ ہو شر پہ، خیر ہے کچھ — میری عزت سے بیر ہے کچھ ۱۵۲۲

مریم کی قسم ہوں پاک دامن — چھو لے نہیں پاتی خاک دامن ۱۵۲۳

مجھ پر ابھی حق نہیں تمہارا — کیا غیر پہ غیر کا اجارا ۱۵۱۴

کھٹکا تھا کہ بھید کھل نہ جائے — ایسا نہ ہو پھول کھلکھلائے ۱۵۲۵

نرگس دیکھے تو کیا عجب ہے — سوسن نہ کہے یہ کیا غضب ہے ۱۵۲۷

کانٹا نہ کہیں خلش نکالے — سنبل نہ کہیں بلا میں ڈالے ۱۵۲۸

پتے نہ کہیں پتا بتا دیں — چڑیاں نہ کہیں خبر اڑا دیں ۱۵۲۹

لب نہر کے کچھ سیئے نہیں ہیں — چشمے کمبخت دوربیں ہیں ۱۵۳۴

مثنوی کہتے کہتے شاعر بیچ میں ایک غزل لے آتا ہے۔ اس مثنوی کی بحر میں۔ اور اُسے عاشق کی زبان سے گواتا ہے۔ غزل شستہ پھبتی اور بیجان ہے —— زبان کے مزاج کا اب کیا علاج کہ وہی لفظی صناعیاں جو مثنوی کی جان ہیں غزل میں آکر وبالِ جان ثابت ہونے لگیں۔ سات شعروں کی غزل میں سے تین شعر نمونے کے سن لیجئے ؎

کیا جانیں انھیں پڑھا گئی کیا — اُلٹی پٹی پڑھانے والے

جھگڑے کو بڑھا نہ مثلِ گیسو — او گیسوؤں کے بڑھانے والے

جلنے کے واسطے ہیں دل سوز — ٹھنڈے رہیں جی جلانے والے

درمیان کی منزلیں چھوڑتے ہوئے اب محفلِ وصال میں قدم رکھئے۔ اس منزل میں جو ہر شاعر کے لئے معراجِ سخن کا حکم رکھتی ہے، اور جہاں پہنچ کر بڑے بڑے متین اور ثقہ سخنور عریاں نگاری کے جوہر دکھانے لگتے ہیں۔

لیکن پہلے ساقی نامے کے سلسلے میں ایک سرسری نظر صحنِ گلشن کے نظاروں پر بھی ہوتی چلے ؎

پھولے نہ سماتے تھے گلِ باغ — تھی مست ترانۂ بلبلِ باغ ۱۸۷۲
کلیاں مئے رنگ سے بھری تھیں — یا عطر کی شیشیاں دھری تھیں ۱۸۷۵
یوں تھی ہر شاخ سر جھکائے — ہو جیسے دلہن نظر جھکائے ۱۸۷۶
پھولوں کا وہ چپکے مسکرانا — پتوں کا وہ تالیاں بجانا ۱۸۷۷
عشاق کے آگے گل جو پھولیں — مسکی ہوئی چولیاں وہ بھولیں ۱۸۷۸
سنبل کھولے بلا کا وہ جال — لیلیٰ کہے اب وبال ہیں بال ۱۸۷۹
برگِ گلِ تر پہ شبنم اس طرح — معشوق کے لب پہ دانت جس طرح ۱۸۸۳
پھیلا ہوا تھا بنفشے کا جال — گویا حبش نے کھولے تھے بال ۱۸۸۵

بارات کا اگر پورا منظر نقل ہو تو صفحوں کا غذ خود ایک بزم نشاط بن جائے۔ تاہم آتشبازی کا سماں کچھ تھوڑا بہت تو دیکھتے ہی چلئے ؎

آتشبازی وہ رنگ لائی — چھوٹی مہتاب پر ہوائی ۱۹۲۳
دیتے تھے انار پھول اس طرح — کرتے ہیں حسین باتیں جس طرح ۱۹۲۴
گولے کی صدا سے توپ حیراں — بہرے ہوں سنیں جو رعد کے کان ۱۹۲۵
چرخی لیلیٰ کی چشمِ بیباک — چکر یا بختِ قیسِ غمناک ۱۹۲۶
قلعے پہ گمان بے ستوں تھا — شیریں کا دہن تھا پہ بتا سا ۱۹۲۸
اونچے گئے اس قدر غبارے — کچھ بڑھ گئے آسماں کے تارے ۱۹۲۹

اب ایک ہلکی سی نظر محفلِ رقص و سرود پر ؎

رقصاں ہوئیں نڈیاں وہ آکر — پریوں کو نچائیں گت بنا کر ۱۹۳۰
زہرہ کو یہ چوٹ یہ جلن ہو — ٹھپے کا تنی پھرے شرن ہو ۱۹۳۱
بلبل گائے ہزار جی سے — منہ بند کریں وہ کنکری سے ۱۹۳۲

منظر مواصلت میں جو فحش نگاری یوسف زلیخا والے ملا جامی نے کی ہے۔ اور پیمبر کے مرتبہ تک کا لحاظ نہ رکھ کر اخلاق، تہذیب اور مذہبیت کا جس طرح گلا گھونٹا ہے اس کی تو مثال بھی مشکل سے ملے گی اُ

شوق بچارے تو اس میدان میں اُن سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ پھر بھی دو چار شعروں سے اُن کی نوعیتِ کلام کا اندازہ ہو جائے گا ؎

دونوں مئے شوق سے تھے سرمست — یا تھا پالی ہوئی سر دست ۱۹۴۴
طالب میں کشش تھی انتہا کی — صحبت ہوئی کاہ و کہربا کی ۱۹۴۵
دیکھا جو حجاب کا قرینہ — کی شمع نے بند چشمِ بینا ۱۹۴۹
بستر پہ تھے دونوں ماہ پیکر — زیر و زبر بیاضِ بستر ۱۹۵۱

یاسمن اور ماہِ عالم کے اصل قصے کے ضمن میں ایک دوسرا قصہ زہرہ اختر کے عشق کا چل رہا ہے۔ اختر شہزادہ کے رفیق اور وزیرزادے تھے۔ وہ زہرہ نامی ایک پری پیکر کے مشتری ہے۔ یہ زہرہ ایک شہر کی ملکہ تھیں۔ شوق کو سراپا نگاری پر جو قدرت ہے اس کا پرتو زہرہ کے بھی آئینۂ جمال میں نظر آ رہا ہے ؎

کاکل وہ بلا کہ بڑھ کے دل لے — وہ مانگ کہ سر پہ چڑھ کے دل لے ۲۲۹۵
تھی مانگ کہ سواری کبلی بن کی — سرحد یا چین اور ختن کی ۲۲۹۶
ماتھے کی چمک سے ماند سورج — دونوں رخسارے چاند سورج ۲۲۹۷
تلواریں بھوؤں کی کاٹ میں طاق — دیدے دونوں بلا کے قزاق ۲۲۹۸
ایسی دنیا میں ہوگی کم ناک — تھی عطرِ گلاب کی قلم ناک ۲۲۹۹
نیچے اوپر جو دونوں لب تھے — زیر و زبرِ کلامِ رب تھے ۲۳۰۰
چہرہ اس کا تھا آفتابی — ہلکا بادل لباس آبی ۲۳۰۱
دانت اُس کے تھے نشۂ صبح طرب — ہیرے کے تھے دانت لعل کے لب ۲۳۰۲
گالوں میں تھی جوشش پر جوانی — جیسے ہانڈی میں گرم پانی ۲۳۰۳
حیرت تھی کہ لوچ کس قدر ہے — ہر بال کمانی یا کمر ہے ۲۳۰۵

عیب و خطا سے مفر کس بشر کو ہے۔ حضرت غالبؔ تک آخر کبھی مغلوب نظر آئے ہیں اور استاد امیرؔ تک پر کبھی فقیر کا گمان گزرتا ہے۔ جناب شوق نے لفظ "دیدہ" کا استعمال آنکھ اور نظر کی جگہ جس اسراف کی حد تک کیا ہے اس پر ذوقِ سلیم ذرا آنکھیں دکھاتا ہے، اور یہاں ان دو شعروں کے پہلے مصرعے بھی ذرا اس نافہم کی فہم سے باہر نکلائیں ؎

واں دخترِ رز کو فکر سے زشتی — یاں صورتِ بادہ شوق کو جھنش ۱۳۲۵

لہ پہلے ایڈیشن میں یہ شعر یوں تھا ؎

حاصل وہ ہوا انار سے لطف — پستاں کے انار سے ملے بالطف

لہ شاعر ہے ۱۹۲۱ء تک ۳۳ سال ہوتے ہیں۔ ماحول اور مذاقِ سخن کہاں سے کہاں پہنچ چکا تھا۔ کلام میں اتنی متانت پیدا ہو جانا قدرتی تھی۔ کسے خبر تھی کہ چند ہی سال میں زمانہ پھر پلٹا کھائے گا اور عریانی نئے نئے ناموں سے سکۂ رائج الوقت بن جائے گی۔

آجکل دہلی

لہ پہلے ایڈیشن میں۔ تھا

پستاں میں تھی جوشش پر جوانی

ستمبر ۱۹۵۰ء

گلشن میں کھلا چلی ہوا پھول — دے بادہ کشوں کو ساقیا پھول ١٢٧٧

لیکن ظاہر ہے کہ حالی ہزار سے اوپر اشعار میں ان دو شعروں بلکہ دو مصرعوں
ل لمبا کیا ہوگا؟ فی ہزار ایک کا بھی تو پتا نہیں پڑتا! قابلِ ذکر دلالت دو ادیبو
یں کتاب کا خاتمہ ہے کسی دوسرے حصے سے کم نہیں۔ ذرا جی لگا کر سنئے کہ

نیرنگِ سخن دکھا چکا تو — سرسجدے کو اے قلم جھکا تو ٢٥٠٠
اللہ کا شکر آج ادا کر — ماتھا رگڑ اور التجا کر ٢٥٠٩
مقبول ہو یہ فسانۂ شوق — ہر بزم میں ہو ترانۂ شوق ٢٥١٠
شائقین نکلیں نہ اس بیان میں — بوٹے بیچے گلشنِ جہاں میں ٢٥١١
رکھیں رکھنے کو طعنہ زن حرف — لیکن رکھیں نہ اہلِ فن حرف ٢٥١٢
نکلے یہ زبانِ اہلِ فن سے — لعل اگلے ہیں شوق نے دہن سے ٢٥١٣
یہ رنگِ شفق جو دیکھ پائے — شب کی چادر میں منہ چھپائے ٢٥١٥
روشن ہو یہ خوبیٔ معانی — قصۂ یوسف کا ہو کہانی ٢٥١٦
ہو لفظ میں حسنِ معنی خوب — جیسے کہ گھونگٹ میں روئے محبوب ٢٥٢١
آنکھوں میں سمائے یہ نور بن کر — جا دل میں کرے سرور بن کر ٢٥٢٢
عاشق اپنا خیال سمجھے — معشوق اپنا جمال سمجھے ٢٥٢٣
اربابِ سخن کریں مری قدر — چمکا کے بنائیں ذرہ کو بدر ٢٥٢٤
میں ملکِ سخن میں کچھ نہیں ہوں — ہاں کشتِ سخن کا خوشہ چیں ہوں ٢٥٢٥
جتنی میرے سخن کی ہے دھوم — سب ہے فیضِ اسیرِ مرحوم ٢٥٢٦

تعلّی اور انکسار، دعویٰ اور باز دعویٰ، شرافت و عبدیت، اتنی سموئی ہوئی، ایسی گھلی ملی کمتر ہی کسی دوسرے فن کار کے صفحات میں ملے گی۔



پرکاش پنڈت

طوفانوں کے بیچ

چوپٹ کے چاروں کونے چِت لیٹے ہوئے تھے۔ سبز، سرخ، سیاہ اور زرد گٹیاں مختلف سمتوں سے ایک ہی مخصوص راہ پر گامزن تھیں۔

متواتر ایک گھنٹے سے ہر پلڑے کی جانب سے کوڑیاں اچھال اچھال کر اور چہرے بدل بدل کر وہ اکتا سا گیا تھا —— راجی نہ جانے کب آ چکے گی، انتہائی بیقراری کے عالم میں ہر لمحہ اس کا ذہن اس خیال میں اُلجھ کر رہ جاتا اور اُلجھے سلجھے ڈانواڈول سے خیالات اس کے ذہن کو کہیں سے کہیں پھینکا دیتے۔ ہر لحظہ اس کی آنکھیں دروازے کی طرف گھوم جاتیں، اور ذرا سی آہٹ پر وہ چونک اٹھتا اور غیر اختیاری طور پر اس کے ہاتھ چوپٹ کی طرف اُٹھ جاتے جس کی شکنیں وہ ان گنت بار سنوار چکا تھا اور اسے اپنے اندر کوئی چیز بیٹھتی ہوئی سی محسوس ہونے لگتی۔ اس ایک گھنٹے میں اس نے ترتیب سے کوڑیاں پھینکنے کے کئی ڈھب جان لئے تھے، اور اپنے اس احساس کے تحت اُسے یک گونہ مسرت بھی محسوس ہو رہی تھی کہ اب راجی اُسے ہر موقع پر مات دینے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔

..... طویل تر ہوتے ہوئے انتظار کی شدت سے جھنجھلا کر ایک بار اس نے سوچا کہ وہ اپنے میزبان کو چوپٹ پر بیٹھنے کے لئے بلائے کہ اس طرح کچھ وقت تو آسانی سے کٹ جائے گا مگر اس کے ساتھ ہی جب اُسے خیال آیا کہ اس کا میزبان اگر ایک بار چوپٹ پر جم گیا تو شام سے پہلے اٹھنے کا نام نہ لے گا۔ جو ہے اس نے تنہا بیٹھنے میں ہی مصلحت سمجھی —— اس وقت یہ قیاس بھی اس کے لئے ناقابل قبول تھا کہ اس کا میزبان یا کوئی اور شخص راجی اور اس کے درمیان حائل ہو۔

کل بھی وہ کسقدر چاہتا تھا کہ میزبان اور اس کی بیوی کسی طور چوپٹ سے اٹھ جائیں۔ راجی کے کنائے، استعاروں کی گفتگو اُسے بے طرح بے قرار کر رہی تھی۔ مگر وہ تو اس نئے کھلاڑی کے ہرانے کا گُر جاننے کے لئے گویا بہت ہی بے تاب تھے۔ ہر حکم پر ان کی آنکھیں اس کے چلتے ہوئے ہاتھ پر جھگڑے کھانے لگتیں اور کوڑیاں الٹتے ہی وہ بے اختیار آہ یا واہ کا شور مچانے لگتے۔ ان کی ہر مخلصانہ حرکت پر وہ دل مسوس کر رہ جاتے اس کے علاوہ اس کے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ برابر کوڑیاں اچھالتا رہا۔ چہرے بدلتا رہا اور اپنی جھنجھلاہٹ کو دبانے کی کوشش کرتا رہا ——

ادھر راجی کی آنکھیں موقع پاتے ہی اس کے چہرے پر جم جاتیں —— اس کی اس چوری کو اس نے کئی بار پکڑا۔ نہ جانے وہ وہاں سے کیا ڈھونڈنا چاہتی تھیں۔ ہر مرتبہ ان آنکھوں میں عجیب عجیب لہریں تھرک اٹھتیں۔ کبھی وہ معصوم بچے کی آنکھوں کی طرح دلفریب، چنچل اور پاکیزہ ہو جاتیں، کبھی ان میں کنواری دوشیزاؤں کی آنکھوں سی خاموش اور بے باک شرمیلی جھومنے لگتیں اور کبھی وہاں عمر بھر غموں میں پستی رہی کسی بڑھیا کی آنکھوں سی سنجیدگی اور ریاکاری دھرنا دے بیٹھتی۔ زندگی کی ان تین مختلف کیفیتوں کا بیک وقت مکمل امتزاج اسے از حد ناگوار گذرا۔ مگر بعد میں اسے یہ دیکھ کر اور بھی حیرت ہوئی کہ وہاں کی کسی بھی عورت میں زندگی کی ان تین مختلف حالتوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ دیکھ سکنا ناممکن ہے۔ کیا بچپن، کیا جوانی اور کیا بڑھاپا —— چوپٹ کی گٹیوں کی طرح اپنے چہروں اور خانوں میں بے طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

—— راجی کی آنکھیں مختلف رنگ بدل رہی تھیں۔ خاموش لیکن بے باک فریاد کرتے ہوئے ان میں کتنا درد کتنی امید اور التجا بھر جاتی۔ جانے ان میں کیا کیا شکوے کیا کیا فریادیں مضمر تھیں۔ ان پُر ملال اور بے چین نگاہوں کی اوٹ میں اُسے کئی کمسن روحوں کی پھڑپھڑاہٹ محسوس ہوئی جنہیں کئی صدیاں، کئی تہذیبیں کند چھری سے ذبح کرتی آئی تھیں۔ اس ماحول اور زندگی کے خلاف بغاوت کے آثار، دل کے

نہاں خانے میں برسوں سے چھپائی ہوئی خلش آنکھوں میں ہمیشہ کی پہلی ملاقات میں ہی ایک ایسے پردیسی کی آنکھوں میں انڈیل رہی تھی جو پہلی مرتبہ وہاں آیا تھا اور جسے شائد پھر کبھی وہاں نہ آنا تھا۔ عجیب دل لگی ہے، اس نے سوچا، کسی ان دیکھے بالم کے انتظار میں فرشِ راہ کی ہوئی یہ آنکھیں ہر پردیسی کو اپنا بالم سمجھ بیٹھتی ہیں۔

راجی ان کے یہاں اس کے ساتھ چوپٹ کھیلنے کی غرض سے یہاں آئی تھی۔ اس کے میزبان نے اُسے ایسا ہی بتایا تھا۔ شائد یہ بھی یہاں کا کوئی دستور ہوگا، اس نے سوچا، کیونکہ وہاں کا ہر رواج ہر روائت اس کے لئے ناقابلِ فہم تھی۔ جس وقت سے اس کا پیر اس علاقے میں پڑا تھا وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہاں کی ہر شے، ہر شخصیت اس کے لئے عجیب و غریب تھی۔ جھلسے ہوئے پژمردہ چہرے، بے نور لہجہ، بے نور زندگی، نہ کوئی لطافت نہ رنگینی ــــ بغیر کسی آرزو کے جینا اور بے مقصد جیتے جانا۔ ہر بشر کی آنکھوں میں اور درح میں ایک والہانہ پھٹکار رچی ہوئی تھی اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسا وہ ہزاروں سال قبل کے اس زمانے میں جا پہنچا ہو جب انسانی نسل اپنے ابتدائی دور میں تھی اور وہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ وہ زمانہ بھی کیا زمانہ ہوگا ــــ نہ حقیقت و خیال سے جنگ نہ کوئی تنگ و دو ــــ یہ صدہا لوازمات سے عاری، فرسودہ زندگی ــــ یہ مجرادہ کیفیت ــــ آخر یہاں کے لوگوں کے لئے سوالیہ نشان کیوں نہیں بنتی؟

اور وہاں آنے سے قبل کافی دنوں تک وہاں قیام کرنے کی جو گرہ اس نے اپنے دل میں باندھی تھی وہ پہلے روز ہی ڈھیلی ہو کر کھل گئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی اپنی زندہ دلی اور رومان پسندی کو اس مغمومیت اور افسردگی میں گھل جانے کی اجازت نہیں دے سکتا اور عین ممکن تھا کہ دوسرے ہی دن وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ لیتا کہ راجی سے اس کی ملاقات ہو گئی اور اُسے یکلخت اپنے ارادے کو ملتوی کرنا پڑا۔ راجی ہی کے سبب اس کے دل میں اس مجرم سرزمین پر بسنے والے مظلوم لوگوں کے لئے ہمدردی کا ایک دیا جل اُٹھا۔ مجرم اور مظلوم کی یہ خوف ناک ہم آہنگی ــ اس کے خیالات یکسر بدل گئے ــ کیا یہ بے چارگی کسی حیلے فنا نہیں ہو سکتی؟ یہ بے سروسامانی دیوانگی، ان گنت صدیوں کی جہالت محدود زندگی کو جس میں فقط ہمیشہ کی تھکن کا کوئی لوازم نہیں۔

راجی کے علاوہ کئی اور لڑکیاں بھی اس کے دیکھنے میں آئیں جن سے ایک سے چوپٹ کھیلنے کا موقع بھی ملا مگر ان سب میں ایک ہی طرح کے جذبات وہی غمناکی اُسے دکھائی دی کہ جس کا اپنی صنف کے متعلق راجی کمزور تعارف کرا گئی تھی ــ کسی لڑکی کی آنکھوں میں کاجل نہیں تھا۔ وہ سوچتا، یہ تو بالکل ناممکن ہے کہ یہ آنکھیں کاجل رچانا پسند ہی نہ کرتی ہوں۔ ان کے سوکھے پھیکے ہونٹ، زرد خشک رخسار دیکھ کر اس کی آنکھوں میں وہ منظر گھوم جاتا جب اس علاقہ کی سرحد شروع ہوتے ہی جھکڑوں کی صورت میں اڑتی ہوئی بے پناہ ریت نے اس کا استقبال کیا تھا ــ روح کے ویرانوں سے نکلتی ہوئی وہ مظلوم مسکراہٹیں جب اپنے اندر ٹھہر آ گئیں، چمک سمونے کی کوشش کرتیں تو عجیب اجنبیت کا مظاہرہ ہوتا ــ بجلیوں کے کوندے مستعار لینے کی کوشش میں ان کی آنکھوں کی گہرائیوں کا الم یہ بھول جاتا کہ اس سرزمین پر پھیلے ہوئے مٹیلے آسمان پر تو کبھی بادل ہی نہیں اُمڈتے ــــ من کھیلنے کی خاطر وہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا فیصلہ نہ دے سکا کہ وہاں کی لڑکیوں میں جوانی آ کر خود پشیمان ہو جاتی ہے ــــ عورت کی زندگی کا یہ مختصر مگر عظیم حصّہ تو ماحول ہی کا رہینِ منت ہوتا ہے اور یہاں بادل نہیں اُمڈتے، رم جھم جھڑیاں نہیں لگتیں، آندھیاں آتی ہیں، چاروں طرف لق و دق سنسان ریگستان ــــ اور ملک میں یہی ایک بدنصیب سرزمین ہے جس پر سورج دیوتا حد سے زیادہ مہربان ہیں۔

اُسے وہاں کی ہر شے فریاد کرتی ہوئی دکھائی دی ــ وہاں کی زمین، وہاں کا آسمان سبھی فریادی تھے ــــ وہ سوچتا، زندگی چاہے جس دور میں بھی ہو کوری فریادیں چارہ گر نہیں ہو سکتیں۔ محض آہ و زاریوں پر آس جمائے رکھنا تو سراسر خود فریبی ہے ــــ خود فریبی اور جہالت اور جاہل چاہے کوئی فرد ہو چاہے ساری قوم کبھی اپنا نصب العین نہیں پا سکتی۔

اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے جھونپڑی نما مکانات ان کی طرزِ معاشرت کا المناک منظر پیش کر رہے تھے۔ بس سر چھپانے کی جگہ تھی کہ ہر کوئی چھپائے بیٹھا تھا۔ عورتیں کہ جن کی زندگی میں گھر سجانے اور بناؤ سنگھار کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے وہاں بے طرح کھو کھلی ہو گئی تھیں۔ کسی بھی دوسری طرف

مائیں ہونے کے بہانے انہیں چوپٹ ہی سے وابستہ علق تھا۔ کھر گھوٹو گھر بھی محدود نہ تھا وہاں کے تو ہر بشر کی زندگی کا چلن ہی جیسے چوپٹ تھا۔ سودکا نداروں کے ہاں ایک بار سودا سلف ختم ہوتا کہ وہاں بہنوں کے لئے چوپٹ کا اکھاڑہ بن جاتا۔ دوبارہ لانے کی نہ وہ خود ضرورت محسوس کرتے نہ خریدار زور دیتے۔ کھیت سوکھے پڑے یوں معلوم ہوتا تھا برسوں سے ہل سہاگے کی شکل کو ترس رہے ہوں۔ جا بجا خود رو سر کنڈے اور آک بھانگ اُگ رہی تھی۔ مٹی سونا اگلنے کو تیار تھی مگر کوئی اس طرف رجوع نہ دیتا تھا۔ وہاں کی ہر شے گویا اپنے آپ ہی کو حیرت سے تک رہی تھی۔ دن ڈھلتے ہی گلی بازار سب سونے ہو جاتے اور طوفان آنے سے قبل جو خاص قسم کا اس فضا میں بکھر جاتا ہے وہی کیفیت طاری ہو جاتی — اور وہ بے بس ہو کر سوچنے لگتا، یہاں کی زندگی سے طوفان کس قدر وابستہ ہیں۔ ٹھیک ہی تو ہے آخر کیا فائدہ؟ کون جانے کس وقت دریا میں طغیانی آجائے اور جس طرف منہ اُٹھے بھاگنا ہو قضا سر پر منڈلا رہی ہو تو غلے دولت کے بھنڈار کس کام — سب کیا دھرا رہ جائے گا پھر حرص وطمع سے جی کو روگ لگانے سے حاصل!

اس وقت وہ قصبہ دریائے سندھ سے دو کوس کے فاصلے پر تھا طغیانی آنے کی صورت میں لوگ گھروں کو خیرباد کہہ کر پانی کے آگے آگے اُوپر کی طرف بڑھنا شروع کر دیتے تھے لیکن ایک طوفان سے بچاؤ کی خاطر وہ دوسرے طوفان کے اور قریب چلے جاتے تھے — اُوپر منہ زور خونخوار بلوچوں کا علاقہ تھا جو میلوں کی مسافت کے باوجود رہی سہی کسر پوری کرنے چلے آتے تھے۔ اس کے میزبان نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ سندھ کا طوفان تو چھوٹے بڑے، عورت مرد سب کے لئے یکساں تباہی کا باعث ہے مگر اُوپر کی طرف سے اُٹھنے والا یہ طوفان صرف نوجوان لڑکیوں ہی کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے —

ان دو طوفانوں کی پیہم زدوں میں گھرے ہوئے گھربار اور عزت لٹائے ہوئے وہ لوگ مایوسیوں اور مجبوریوں کی تہوں میں کرب آمیز جھنجھلاہٹ لئے ہوئے گویا زبردستی جی رہے تھے طوفانوں نے ان کی زندگی پر بے طرح چھاپا مارا تھا — دلوں پر منڈلاتے ہوئے مستقل خطروں کی دہشت نے ان کی زندگی بے رنگ، دبو اور مفلوج کر دی تھی — اور وہ سوچتا اصیلوں سے سینہ بہ سینہ چلی آرہی بے کلی اور بے بسی نے جو ہر چہرے پر اپنے نقش کندہ کر دیئے ہیں۔ انہیں مٹانے کے لئے شاید کوئی وقت معین نہیں کیا جا سکتا اور یہ لڑکیاں — اپنی زندگی کی زبوں انجامی کے خوف سے ان کے جذبات چٹکنے سے قاصر ہیں۔ یہ نوخیز شباب کی قدرتی تحریکیں ہیں جو متحرک ہونے کے لئے مچل رہی ہیں ورنہ جوانی اور خوبصورتی تو ان کی زندگی کی سب سے بڑی لعنتیں ہیں۔

دل میں ایک بے بضاعت قسم کا ہمدردانہ لگاؤ جاگ اُٹھنے سے اُسے اس سرزمین کے ہر ذرے میں سینکڑوں التجائیں بلکتی ہوئی معلوم ہونے لگیں اور اُسے محسوس ہوا کہ صرف راجی یا اُس کی صنف ہی نہیں بلکہ وہاں کی ہر شے کنائے اور استعاروں سے ماورا کسی دوسرے عالم سے بے بہرہ ہے کچھ ایسے عالم میں کہ جب انسان کوشش کے باوجود ماحول کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا اُسے وہاں کی زندگی، وہاں کا ماحول اپنے ذہن کی صاف شفاف تختی پر کچھ لکھتا ہوا محسوس ہوا — چاہیے جو ہے، اُنے گنے افراد کی ملکیت تو نہیں۔ سبھی کو ٹھلے بیٹھنے یا چوپٹ کھیلنے کا یکساں حق حاصل ہے۔ جب زندگی کے اختتام پر چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں رہ جاتی تو زندگی کے دوران میں کسی قسم کی تفریق کیوں! کیا قدرت کو یہ تمدنی، نظام قبول ہے جو چھوٹے بڑے کی تمیز کا جھنڈا لئے انسان کو گمراہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ یا پھر اس کا علاج کیا یہ ہے کہ انسانی نسل اپنے ابتدائی دور کی طرف پلٹ جائے۔ جاہل، بیوقوف ہو جائے پھر زندگی کی از سر نو تشکیل کے لئے بھی نوکل کا اعتبار لازم ہے۔ کل کی آس انسانی زندگی سے کیونکر جدا کی جا سکتی ہے۔ بیداری، تگ ودو مشکلوں کا حل اور گتھیوں کے سلجھانے کا نام ہی تو زندگی ہے سنبھالی ہوئی راہیں یقیناً ان دیکھی راہوں سے ہیچ ہیں۔

اس قسم کے تمام خیالات کا منبع دراصل راجی کی خاموشی ہی تھا اس کے بعد اپنے ان خیالات کو تقویت پہنچانے کے لئے اُس نے گاؤں کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے بعد راجی کو اس کی حقیقی شکل میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا اور اس وقت بھی جبکہ وہ چوپٹ پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بار بار اپنے تخیل کی پوری قوت کے ساتھ راجی کی صحیح تصویر اپنے ذہن میں ابھارنے کی کوشش

کی تا کہ کم ازکم اس وقت وہ صرف اور صرف راجی کی بابت سوچ سکے اور کوئی اندازہ قائم کرنے کے قابل ہو جائے لیکن دوسرے ہی لمحے جگر سوز حسرت بھری نگاہ کا غیر مرئی سا عکس چھوڑتی ہوئی وہ تصویر گویا یہ کہہ کر غلط ملط ہو جاتی ـــــ تم تو دیکھ ہی رہے ہو، میں کس ماحول میں پل رہی ہوں ـــــ اور اس ماحول کے متعلق اب وہ زیادہ نہ سوچنا چاہتا تھا۔

غیر ارادی طور پر وہ کرے میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا ـــــ راجی سے وابستہ ان تمام تلخ حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اس تذبذب سے چھٹکارا ناممکن ہے، ایک مرتبہ پھر اُس نے اپنے ذہن کی باگ اس کی طرف موڑ دی۔ شاید گھر والوں نے اُسے نہ آنے دیا ہو ـــــ ہو سکتا ہے وہ میرا ارادہ بھانپ گئی ہو اور اب پشیمان ہو کر کل اُس نے خواہ مخواہ ایک پردیسی کو اپنے غلط سلط سوچنے میں مدد دی ـــــ یہ محض دل لگی بھی ہو سکتی ہے ـــــ آخر اس نے اپنی زبان سے تو کوئی اقرار نہ کیا تھا۔ صرف اس کی آنکھوں سے میں نے وہ نتیجے اخذ کر لئے تھے ـــــ مگر نہیں ـــــ یہ ناممکن ہے۔

تو پھر ممکن کیا ہے؟ اس کے اندر کوئی چیز بول اٹھی ـــــ وعدہ کے باوجود وہ نہیں آئی ـــــ تم بھی عجیب احمق واقع ہوئے ہو ـــــ ذرا سا کسی نے تمہاری طرف گھور کر دیکھ لیا کہ تم ہوائی قلعے تعمیر کرنے لگے ـــــ الف لیلے کی داستانوں کو عالم وجود میں لانے سے پہلے پیٹ پوجا تو کر لو صبح سے انتڑیاں چیخ رہی ہیں ـــــ اور وہ سوچنے ہی لگا تھا کہ اُٹھ کر اندر چلا جائے کہ معاشرات کا واقعہ بجلی کے کوندنے کی طرح اس کے ذہن کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لپک گیا۔ اس کے قدم وہیں کے وہیں جم گئے ـــــ عجیب خالی خالی نظروں سے وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

پچھلی ہی رات ڈھولوں کے بے ہنگم شور سے وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا تھا۔ لگا تار ایک گھنٹہ تک ڈھولوں کی آواز کانوں کے پردے پھاڑتی رہی تھی۔ اس دوران میں گھر کے تمام افراد جاگ کر اس کے پاس آ اکٹھے ہوئے تھے۔ میزبان سے اُسے معلوم ہوا کہ یہ ڈھول دو ہی موقعوں پر پیٹے جاتے ہیں۔ سندھ میں طغیانی آنے یا بلوچوں کے گھیرا ڈال دینے پر ـــــ ہر کسی کے چہرے سے خوفناک ترین صورت میں ڈر اور سہم ٹپک رہا تھا۔ خود میزبان بھی بے حد بدحواس تھا ـــــ بظاہر تو وہ تسلی آمیز الفاظ میں گھر والوں کو دم دلاسا دئے جا رہا تھا کہ ان ڈھولچیوں کو دھوکا بھی تو ہو جاتا ہے ـــــ بارہا ایسا ہو چکا ہے کہ ڈھول پیٹے جانے کے بعد بھی نہ تو دریا کی لہروں کا شور سنائی دیتا ہے نہ ہی بلوچوں کی خرابے کی کوئی اطلاع ملتی ہے مگر اس کے حلق میں ٹوٹ ٹوٹ کر رہ جاتے ہوئے الفاظ ساتھ ہی ساتھ اس بات کی گواہی دئے جا رہے تھے کہ یہ جھوٹی تسلیاں محض دل بہلاوے کا سامان ہیں اور خود دل بہلانے والا اس کی اہمیت سے منکر ہونے کی ناکام کوشش کر رہا ہے ـــــ مگر نہیں میزبان کا کہنا درست ہی ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ کچھ ہی دیر بعد کسی قسم کے خطرے کی خبر نہ ملنے سے سب اپنی اپنی جگہ سونے کو چلے گئے تھے اور وہ اس واقعہ کو کوئی خاص اہمیت دئے بغیر طنزیہ انداز میں سوچتا رہا تھا کہ ڈھولچیوں کی نیند پر دریا کی لہریں اور بلوچوں کے خنجر اس طرح مسلط ہیں کہ ذرا سی آہٹ پر وہ چونک اُٹھتے ہیں اور بے تحاشا ڈھول پیٹنے لگتے ہیں یا پھر یہ کھیتوں میں بہتات سے اگی ہوئی بھانگ کا اثر ہوگا ـــــ

مگر اس وقت ایک نئے انداز سے سامنے آ کر اس واقعہ نے اس کی کل پریشانیوں کو سمیٹ کر ایک ہی نقطے پر مرکوز کر دیا اور وہ سر سے پاؤں تک لرز اٹھا ـــــ کہیں سچ مچ ہی تو کوئی قہر نازل نہیں ہو گیا ـــــ اپنے میزبان کی بتائی ہوئی باتیں اُسے پھر سے یاد آنے لگیں کہ اُوپر کی طرف کا طوفان صرف نوجوان لڑکیوں ہی کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے اور صبح تو خاص طور پر رازدارانہ لہجہ میں اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان کا کوئی وار خالی نہیں جاتا۔ کشت و خون تو ایک طرف بعض اوقات کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی اور وہ ـــــ اور یہ راجی عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے وہ کہے جا رہا تھا ـــــ کئی مرتبہ بلوچ خاص اسی کو اٹھانے کی نیت سے آ چکے ہیں مگر اس چھوکری کے نصیب شاید نرالے ہیں جو کسی بار بھی ان کی زد میں نہیں آ سکی ـــــ اور پھر اُس نے آسمان کی طرف دیکھا ـــــ میں کہتا ہوں راجی قصبے پر ایک بہت بڑی آفت ہے . . . .

غیظ و غضب کے مقام اوج تک جا پہنچنے کے باوجود اپنے

ارادے کو ذرا سی شہہ ملتے ہی اس کا ذہن اس طرف گھوم گیا — بے شک، راجی کے نصیب انوکھے ہیں۔ وہ ان تپتے ہوئے ریگستانوں میں رہنے کے قابل نہیں وہ اپنی زندگی کے اونچ نیچ دیکھنے کی خاطر طوفانوں کا انتظار نہیں کر سکتی۔ پوری رعنائی اور دلکشی کے ساتھ ایک علیحدہ دنیا اس کی منتظر ہے کہ جہاں وہ اپنی نیند آپ سو سکے گی، اپنی نیند جاگ سکے گی، جہاں اس کے قلب کو پر سکون رفتار نصیب ہوگی — بلاشبہ وہ اس سرزمین کی پہلی خوش بخت جوانی ہے جس میں بچپن اور بڑھاپا ایک ساتھ دخل انداز نہ ہو سکیں گے۔ بس اسے اس ماحول میں گھٹ گھٹ کر نہ مرنے دوں گا — آج ہی کی رات — ہاں آج ہی رات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ذرا دیر کے لئے اس کا خیال اپنے اس غضبناک ارادے کی طرف بھی پلٹا — کیا وہ خود ایک طوفان نہیں — ان جانا، جو چھپ کر وار کر رہا ہے — جس کی آمد پر ڈھول نہیں پیٹے گئے۔ راجی کیا اس بھیانک طوفان میں بہہ جانے کو رضامند ہوگی؟ مگر اس جانب وہ زیادہ دیر تک توجہ نہ دے سکا۔ اس کے دل میں بڑھتا ہوا خدشہ شدید ترین صورت اختیار کر گیا اور اُسے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس وقت اسے کیا کرنا چاہئے اور پھر اس انتہا بے قراری سے نجات حاصل کرنے کا اُسے وہی طریقہ سوجھا — کیوں نہ وہ اپنے میزبان سے قصبے میں ہر طرح کے امن و امان کی خبر سننے کے لئے اُسے چوپٹ پر بلا لے لیکن پھر اس تسکین دہ پیغام سے پیدا ہونے والے حیران کن نتائج اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے — نہیں، اس وقت وہ کسی حالت میں بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میزبان یا کوئی اور ہی راجی اور اس کے درمیان حائل ہو — نڈھال سا وہ پھر چوپٹ پہ آن بیٹھا اور از سرِ نو راجی کے نہ آنے کے بارے میں سوچنے لگا — چوپٹ کے چاروں کونے چت بیٹھے ہوئے تھے اور گویا افق سے ملتی ہوئی ان راہوں کے چوراہے میں سبز، سرخ، سیاہ اور زرد گٹھیاں حسرت بھری نگاہوں سے کوٹھڑیوں کی طرف تک رہی تھیں۔

فراق گورکھپوری

غزل

بہ فیضِ عشق یہ راز آج آشکارا ہے
شہود و غیب و وجود و عدم ہمارا ہے

وہ صبحِ نور ہوں ہے چاند جس کا ایک حباب
وہ آگ ہوں جس کا یہ خورشید اک شرارا ہے

زماں مکاں تو ہیں گردابِ موج کے خم و پیچ
کہیں بھی قلزمِ ہستی ترا کنارا ہے؟

جو اتنی بات نہ سمجھے تو آہ کیا سمجھے
کہ حسن و عشق تو اے دوست اک اشارا ہے

اجل تو مفت میں بدنام ہے زمانے میں
اب اُن سے پوچھ جنہیں زندگی نے مارا ہے

ستم تو خیر ستم ہے، اُٹھے اُٹھے نہ اُٹھے
یہ سوچتا ہوں کرم بھی ترا گوارا ہے؟

نہ پوچھ معرکۂ حسن و عشق کی روداد
دو عالم اُس کے ہیں میدان جس نے ہارا ہے

یہ سوز و سازِ محبت کی آنچ ہے جس نے
تپا تپا کے ترے حسن کو نکھارا ہے

وہ اپنے دل کی صدا ہو کہ تیری آہٹ ہو
سکوتِ دشت و جبل نے مجھے پکارا ہے

کروں تو کیسے کروں دردِ عشق کا شکوہ
کہ زندگی کو اسی درد نے سنوارا ہے

بچے زمانے کی زد سے تو بس عوام بچے
کہ اب زمانے میں جو شے ہے نہ دلارا ہے

لئے بہت ہی روادار ہے یہ مذہبِ عشق
کہو نہ کفر کی، ایمان تک گوارا ہے

یہاں ہے شورِ تلاطم سلامتی کا پیام
کہ بحرِ عشق میں منجدھار ہی کنارا ہے

اب ایسے میں بھی کہیں نیک و بد کو دیکھتے ہیں
فراق جو بھی ہے جیسا بھی ہے ہمارا ہے

مسعود صدیقی

انڈونیشی ناچ اور ناٹک

انڈونیشیا کے ناٹکوں کی سب سے اہم قسم ویانگ ہے۔ اس کی نمائش پردے پر ہوتی ہے۔ اس میں چمڑے کے بنے ہوئے مجسموں کی مدد سے ڈلانگ (کہانی بیان کرنے والا) کہانی پیش کرتا ہے۔ ڈلانگ چمڑے کے مجسموں کی جگہ بولتا ہے۔ گانے گاتا ہے اور سازندوں کو ہدایات بھی دیتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ڈلانگ ناٹک کا منیجر، پراپیٹر، موسیقار، ہدایت کار اور سب کچھ ہوتا ہے۔ ڈلانگ کے سامنے ایک قندیل لٹکی ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ چمڑے کے مجسموں کا عکس پردے پر ڈالتا ہے۔ جس کے پیچھے تماشائی بیٹھے ہوتے ہیں: ان ناٹکوں میں مہابھارت، راماین اور عربی اور فارسی کے قصے پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کئی قسم کے ویانگ ہوتے ہیں جیسے (۱) ویانگ پور (۲) ویانگ کورسیل (۳) ویانگ بی ڈوگ (۴) ویانگ گولوک وغیرہ۔ ان میں ویانگ پاؤرا سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ ایک ہزار سال سے انڈونیشیا میں مقبول ہے۔ اور اب تک عوام اس کو ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں۔ ویانگ پاؤرا پہلے کھجور کے پتوں پر نقش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد درختوں کی چھال پر نقش کیا گیا۔ جسے ایک قسم کا کاغذ سمجھا جاتا تھا۔ ایک صدی بعد [illegible] میں اس کہانی کے مناظر پرانے کاغذ پر کھینچے گئے، اور ان کو ایک دوسرے سے ملا کر گول کر لیا گیا۔ اس قسم کے ویانگ کو ویانگ بیبر کہتے تھے۔ (بیبر یعنی پھیلانا) انڈونیشیا میں اسلام پھیلنے کے بعد (جو تصویر کشی کی ممانعت کرتا ہے) ویانگ میں زبردست تبدیلی ہو گئی۔ اس میں چمڑے کے مجسمے اور آدمیوں کی تصویریں ختم ہو گئیں — انسان کے جسم کے مجسموں کی جگہ نفسیاتی مجسمے بنائے گئے۔ محمد سلطان نظام اکبر شاہ و دیمک کے عہد حکومت میں ویانگ پاؤرا بھینس کے چمڑے کے بنائے گئے تھے۔ ان میں باریک خطوط بھی بنہایت صفائی سے پیش کئے جاتے تھے۔ اس کے بعد [illegible] تک مختلف تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اور آخر ویانگ نے مکمل فنی ترقی کر لی۔ اب یہ مستند اور تاریخی ہو چکا ہے۔ ویانگ کی دوسری قسمیں وہ ہیں جو لکڑی سے بنائی جاتی ہیں۔ لکڑی کے مجسموں کو کردار کی مناسبت سے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ اُسے ویانگ گولیک کہتے ہیں اس کا عکس پردے پر نہیں دکھایا جاتا۔ بلکہ یہ بغیر پردہ اور قندیل کے دن کی روشنی میں بتائے جاتے ہیں۔ جدید ترین ویانگ (ویانگ یعنی عکس) کو ویانگ ونگ کہتے ہیں۔ اس میں مجسموں کے عوض فنکار اداکاری کرتے ہیں۔ یہ ویانگ جدید انڈونیشی فن ناٹک کا بہترین نمونہ ہے۔

اس طرح انڈونیشیا میں ناٹک مجسموں کے عکس سے ترقی کر کے اسٹیج اداکاری تک پہنچا ہے۔ پردوں پر دکھائی جانے والی کہانیوں میں گانے اور ساز بنہایت مناسبت سے کہانی کا جزو بنا دئے جاتے ہیں۔ کہانی کے مکالموں کے ساتھ فلسفے کے اقوال بھی ملا دئے جاتے ہیں۔ لڑائی اور مزاح کے مناظر موسیقی کے ذریعے سے پیش کئے جاتے ہیں۔ ویانگ عام طور پر تمام رات دکھایا جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر بچے، بڈھے، لڑکے، لڑکیاں، عورت، مرد سب ساتھ آتے ہیں۔ اکثر نزدیک کے گاؤں سے بھی لوگ آکر ویانگ سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ اپنے پسندیدہ ناٹکوں کو بار بار دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ بہادر اور جانباز کشتریا جب ناپاک روحوں اور جنوں پر فتح حاصل کرتا ہے تو یہ لوگ خوش ہوتے ہیں۔

ویانگ کے متعلق عام طور پر یہ خیال ہے کہ یہ ہندوستان سے شروع ہوا ہے۔ انڈونیشیا کے قدیم باشندے ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ مہابھارت اور راماین کے بہادروں کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ کئی سو سال پہلے جب ہندوستان اور انڈونیشیا کے تعلقات ختم ہو گئے اور تہذیبی

تہذیبی ٹوٹ گیا۔ تو ہندوستان کی تہذیب کی خصوصیتیں (خاص طور پر ادب۔ ناچ۔ ناٹک۔ فن تعمیر مثلاً مندر اور لباس وغیرہ) ایک علیحدہ انڈونیشی تہذیب میں تبدیل ہو گئیں۔ مہابھارت اور رامائن کی کہانیاں بھی خاص انڈونیشی رنگ میں رنگ گئیں۔ انڈونیشیا کے پہاڑ۔ دریا اور جنگل اب تک قدیم ہندوستانی ناموں سے موسوم ہیں۔ ان کا ذکر اکثر کہانیوں میں ہوتا ہے۔ ان کہانیوں سے یہ خیال پختہ ہو جاتا ہے کہ یہ انڈونیشیا میں قدیم زمانے سے موجود ہیں۔ لیکن انڈونیشیا کے اچھے دماغوں نے بہت جلد غیر ملکی ادب سے مدد لے کر اپنے ماحول کے مطابق اپنا ذاتی ادب اور آرٹ پیدا کر لیا۔ اور اس میں اپنے ملک اور اپنی قوم کے تمام خصوصیات کو پورے طور پر سمو دیا۔

ممکن ہے کہ عکسی ناٹک کی ابتدا انڈونیشیا میں ہوئی ہو۔ ہندوستان۔ چین اور ہند چینی میں اس قسم کے ناٹک موجود تھے۔ لیکن ان میں اور انڈونیشیا کے ناٹکوں میں بنیادی فرق ہے۔ ان میں اصطلاحات خالص انڈونیشی ہوتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ موسیقی اور نغمات میں قطعی مختلف ہوتے ہیں۔

ویانگ کی ابتدا غالباً بزرگوں کی عقیدت سے ہوئی تھی۔ چمڑے کے مجسمے عام طور پر بزرگوں، قوم کے محبوب رہنماؤں اور بہادر مرد اور عورتوں کے ہوتے تھے۔ جو اپنی قوم اور اپنے شہنشاہ کے وفادار تھے۔ جنھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ ویانگ میں تاریخ پیش کی جاتی تھی۔ مگر اس تاریخ میں علم الاصنام کے کردار ملے ہوئے ہوتے تھے۔ اس میں پرانی کہانیوں کے جانور شیطان۔ بھوت، ارواحِ خبیثہ وغیرہ کے کردار ملا دیے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے انڈونیشی آرٹ میں مذہب اور تاریخ ساتھ ساتھ نظر آتی ہے۔ ان کا آرٹ پرانی تہذیب کی بنیادوں پر قائم ہے جس کا موجودہ انڈونیشی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ قدیم تہذیب سے اتنی گہری وابستگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں سے عقیدت رکھتے ہیں۔ قدیم رسموں کی پابندی کی وجہ سے ویانگ ایک ہزار سال تک کوئی ترقی نہ کر سکا۔

جمہوریۂ انڈونیشیا کے نوجوانوں کی کانگریس نے عوام میں تعلیم پھیلانے اور سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لئے جاوانی ویانگ میں جدید ترین اصلاحات کی ہیں۔ انھوں نے وقت کے ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے کہانیوں کو بھی بدل دیا ہے۔ اس جدید ویانگ کو ویانگ سولوح (یا نور کا شیڈو پلے) کہتے ہیں۔ اسے جمہوریۂ انڈونیشیا کے محکمۂ اطلاعات نے کافی ترقی دی ہے۔ یہ قدیم جاوانی شیڈو پلے سے قطعی مختلف ہے۔ ویانگ سولوح دورِ حاضر کے مسائل پر روشنی ڈالتا ہے۔ اسکی کہانیاں دورِ حاضر کے واقعات سے متعلق ہوتی ہیں۔ اس کے مجسمے نئی زندگی پیش کرتے ہیں۔ کہانیوں کے ان مجسموں میں حکومت کے بڑے افسر، رہنما، مزدور، کسان اور انڈونیشیا کی قومی فوج کے سپاہیوں کے مجسمے بھی ہوتے ہیں۔ کہانی کو حقیقت سے قریب تر لانے کے لئے ہوائی جہاز، مشین گنیں، اینٹی ایر کرافٹ گنیں اور بم وغیرہ بھی چمڑے کے بنائے جاتے ہیں۔

عام طور پر چمڑے کے ان مجسموں کی لمبائی دس انچ سے سولہ انچ تک ہوتی ہے۔ یہ لمبائی موزوں سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ پردے سے کافی دور ہونے پر بھی یہ دکھائی دیتے ہیں۔ دوسری چیزوں کی لمبائی زیادہ نہیں ہوتی۔ تاکہ ان کے عکس سے پردہ نہ بھر جائے۔

اکثر موقعوں پر تماشائیوں کو اپنے دماغ سے کام لینا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی مجسمے کو سفر کرتا ہوا بتانا ہو تو اس کے نزدیک موٹر بنائی جاتی ہے۔ مجسمہ پردے پر سے ہٹا لیا جاتا ہے۔ اور موٹر اپنے فرضی مسافر کو لے کر بڑھتی ہے۔ اس میں موسیقی عام شیڈو پلے کے مانند ہوتی ہے۔ اس موسیقی کو عوام بہت پسند کرتے ہیں۔ گیملن موسیقی پیتل کے سازوں پر بجائی جاتی ہے۔ مجسموں کی آواز کے ساتھ مل کر یہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ویانگ سولوح کا تصور جدید ترین ہے۔ اس لیے اس میں آواز کے نئے اثرات ڈالے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہوائی جہاز کی آواز پیتل کی گھنٹیاں بجا کر پیدا کی جاتی ہے۔

مجسموں کی تعداد کہانی کے مضمون پر منحصر ہوتی ہے۔ ویانگ سولوح میں پچاس سے لے کر پچھتر تک مجسموں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کبھی یہ تعداد طویل کہانی کی وجہ سے بڑھ بھی جاتی ہے۔ جنگ کرتا سے متعلق ایک اچھی بھلی کہانی میں زیادہ مجسموں کی ضرورت ہوتی ہے اور گاؤں سے متعلق کسی کہانی میں کم مجسمے استعمال کئے جاتے ہیں۔ کہانی کے پس منظر میں جب بعض اہم چیزیں پیش کی جاتی ہیں تو مجسموں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔

عام شیڈو پلے کی مانند و یانگ سولوح میں ایک سفید پردہ لگایا جاتا ہے۔ اس کے سامنے ایک قندیل ہوتی ہے جس سے مجسموں کا عکس پردے پر ڈالا جاتا ہے۔ ویانگ سولوح کی کہانیاں مسائل حاضرہ سے متعلق ہوتی ہیں۔

ان دو مثالوں سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ویانگ سولوح قوم کے لئے کتنا مفید اور کارآمد ہے۔

پہلی کہانی انڈونیشیا کی آزادی سے متعلق ہے۔ یہ جاپانی فوجوں کے ہتھیار ڈالنے سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ انڈونیشیا کے جوانوں کی جدوجہد کی وجہ سے جاپان نے ہتھیار ڈالے تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور کہانیاں تحریک آزادی سے متعلق ہیں۔ ان کہانیوں میں انڈونیشی رہنماؤں۔ جوانوں اور جاپانی فوجیوں کے مجسمے ہوتے ہیں۔

دوسری کہانی ہندوستان کو چاول بھیجنے سے متعلق ہے۔ اس کہانی میں انڈونیشی عوام کی انسانیت دوستی کی روح سمو دی گئی ہے۔ اس میں انڈونیشی کسانوں کا محنت سے کاشت کرنا۔ بڑے رہنماؤں کا گاؤں میں جانا اور کسانوں کو زیادہ غلہ پیدا کرنے کی ترغیب دینا پیش کیا گیا ہے۔ اس سے تماشائی ہندوستان کو چاول بھیجنے کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

ایسی کہانیاں جن میں خدمت۔ انسانیت۔ قومیت۔ جمہوریت اور صدر جمہوریہ ڈاکٹر سوئیکارنو کی انصاف پسندی کو پیش کیا جاتا ہے۔ عوام پر گہرا اثر کرتی ہیں۔ یہ وہ کہانیاں ایسی ہیں جن میں قومی شعور بیدار کیا گیا ہے۔ اور اہم مسائل کو سمجھایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ دوسری کہانیاں بھی ہیں جن میں عوام کو جمہوری اصول کی تعلیم دی جاتی ہے۔

اسٹیج پلے ویانگ ونگ شیڈو پلے کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ عام ویانگ کو ملٹ کا مفہوم انگریزی لفظ "ڈرامہ" سے ادا کر سکتے ہیں۔ حالانکہ انڈونیشی ناٹک اور انگریزی ڈرامہ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ انگریزی ڈرامہ اداکاری سے پیش کیا جاتا ہے اور قدیم انڈونیشی ناٹک ناچ کے ذریعے سے پیش کیا جاتا ہے ہم شیڈو پلے ویانگ کو "تاریخ بیان کرنے کا نام" دے چکے ہیں۔ اسی طرح اسٹیج پلے ویانگ ونگ کو ناچ میں کہانی پیش کرنا کہہ سکتے ہیں۔ یہ بلا گفتگو کے سوانگ کو (Pantomime) ڈرامے سے ملاتا ہے۔ ناٹک کی کلاسیکل دنیا کے کسی ملک میں نہیں پائی جاتی۔ ان ناٹکوں کی کہانیاں بھی مہابھارت۔ رامائن اور سلاطین جاوا و سماترا کے واقعات سے متعلق ہوتی ہیں۔ یہ کہانیاں انڈونیشیا میں اپنی اخلاقی قدروں کی وجہ سے صدیوں سے مقبول ہیں۔ خاص طور پر مکالموں جن میں فلسفے اور دانشمندی کی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ ناٹک "انجیل انڈونیشیا" (اخلاقی کتاب) سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ اسلام پھیلنے کے باوجود اب تک اس کتاب کا عوام پر گہرا اثر ہے۔

ظاہر ہے کہ جس ملک کے ۹۰ فی صدی باشندے جاہل ہوں اُن کا اخلاق کتابوں سے نہیں بلکہ ڈراموں سے بلند کیا جا سکتا ہے۔ قدیم طرز کے انڈونیشی ناٹک گانے سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ گانا ڈلانگ گیمیلن موسیقی کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد اداکار ناچتے ہوئے اسٹیج پر آتے ہیں۔ پہلے بادشاہ اپنے وزیروں کے ساتھ آتا ہے۔ اس کے بعد شاہی خاندان کے افراد داخل ہوتے ہیں۔ ان کے بعد سپاہی اور ملازم وغیرہ آتے ہیں۔ بادشاہ اپنے ملک کے متعلق گفتگو کرتا ہے اور پہلا منظر ایک درباری کے آنے پر ختم ہوجاتا ہے۔ جو یہ منحوس خبر لاتا ہے کہ ایک غیر ملکی حکومت نے اُن کے ملک پر حملہ کر دیا ہے۔ اس کی فوج میں بھوت دیو اور بدروحیں شامل ہیں۔ بادشاہ فوراً فوج کی تیاری کا حکم دیتا ہے۔

ایک دوسرے منظر میں جنگل میں ایک بوڑھے زاہد کو بتایا جاتا ہے جو دنیا ترک کر کے عبادت میں مشغول ہے وہ اپنے پوتے سے کہتا ہے "اب تیری تعلیم ختم ہوچکی ہے جا اور شاہ کی خدمت کر" یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ زاہد قدیم مفہوم میں صرف روحانیت کی تعلیم ہی نہیں دیتا تھا بلکہ فوجی تعلیم ہتھیار چلانا۔ گھوڑے کی سواری۔ رتھ کھینچنا اور میدان کارزار کے نشیب و فراز کو سمجھنے کی تعلیم بھی دیتا تھا۔ انڈونیشیا میں "کشتریا" کا تخیل تقریباً وہی ہے جو دور وسطیٰ کے یورپ میں نائٹ کا تھا۔

بوڑھا زاہد جو دادا اور معلم بھی ہے کشتریا کو (جو اس کا پوتا ہے) آخری نصیحت کر کے الوداع کہتا ہے۔ جیسے ہی وہ لڑکا جانے لگتا ہے، دوسرے منظر کے اختتام کے لئے پردہ گر جاتا ہے۔

تیسرے منظر میں جنگ دکھائی جاتی ہے۔ بادشاہ کی فوج کے ہزاروں سپاہی قتل ہو جاتے ہیں، اور فوج پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ یہ لڑائی ناچ کے ذریعے سے بتائی جاتی ہے۔ ناچنے والے اپنے ہاتھوں اور کبھی ہتھیاروں سے لڑتے ہیں۔ گیمیلن کی موسیقی لڑائی کا خوفناک

اثر پیدا کرتی ہے۔ آخر کار بادشاہ کی فوج کے کمانڈر بھاگ جاتے ہیں اور بادشاہ کو واقعات سے مطلع کرتے ہیں۔ بادشاہ کا مشیر خاص اسے میدان چھوڑ دینے کا مشورہ دیتا ہے۔

چوتھے منظر میں ایک جنگل میں بادشاہ شاہی خاندان کے افراد اور کچھ سپاہی دکھائے جاتے ہیں۔ وہاں اُن سے ایک اجنبی ملتا ہے جو بادشاہ کے دربار میں جانا چاہتا ہے۔ جب کشتریا کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اس کے سامنے موجود ہے تو وہ گھبرا جاتا ہے۔ لیکن فوراً ہی سنبھل کر اپنی خدمات شاہی فوج کے لئے پیش کرتا ہے۔ اگر بادشاہ اجازت دے تو وہ اپنی قسمت میدانِ جنگ میں آزمائے۔ وہ منتشر فوج کو جمع کرتا ہے اور دشمن پر اچانک حملہ کر دیتا ہے۔

پانچویں منظر میں پھر گھمسان کی لڑائی دکھائی جاتی ہے۔ موسیقی اور مکالموں سے اس کا اثر اور بڑھایا جاتا ہے۔ کبھی دورانِ جنگ میں لڑنے والے گاتے بھی ہیں۔ اکثر جنگ کے دوران میں ایسی گفتگو ہوتی ہے۔

دیو۔ جہنم کی قسم یہ کون ہے جس نے میرے سامنے کھڑے ہونے کی جرأت کی۔

کشتریا۔ دیو! میں تمہاری زندگی کو ختم کرنے والا ہوں۔

دیو۔ اپنا کام کرو۔ اور اگر زندگی چاہتے ہو تو فوراً بھاگ جاؤ۔

کشتریا۔ کوئی کشتریا دشمن کو اپنی پشت نہیں دکھاتا۔ بہتر ہے کہ تم یہ ملک چھوڑ دو۔ ورنہ میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔

دیو۔ اوہو۔ اتنی بڑی بات۔ لیکن تم اپنی چالبازی اور شیخی سے مجھے مات نہیں دے سکتے۔

کشتریا۔ میری مراد وہی ہے جو میں نے کہا ہے۔

دیو۔ اوہو، کیا واقعی؟ میرے ہتھیار دیکھو۔ میں تمہاری کمر اپنے گھٹنے پر رکھ کر ایک ہی ضرب میں توڑ سکتا ہوں۔

کشتریا۔ تمہاری طاقت تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گی۔

دیو۔ خبردار! میں تجھے زندہ کھا جاؤں گا۔

کشتریا۔ یہ تمہاری موت کا باعث ہوگا۔ کیوں کہ میں تمہارا پیٹ اندر سے چاک کر دوں گا۔

دیو۔ اچھا تو پھر اپنی موت کے لئے تیار ہو جاؤ۔ تمہیں دعا مانگنے تک کی مہلت نہیں ملے گی۔

کشتریا۔ میں تیار ہوں اگر تم چاہتے ہو تو حملہ کرو۔

اس موقعہ پر بڑے بڑے ڈھول بجائے جاتے ہیں۔ یہ مکالمے تماشائیوں کے دلوں پر اثر کرتے ہیں۔ یہ سلیس زبان میں ادا کئے جاتے ہیں۔ حقیقت ہے کہ یہ عوام کی زبان نہیں ہوتی۔ بلکہ ڈلانگ کی خاص زبان ہوتی ہے۔ لیکن یہ تماشائیوں کے لئے زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔

پھر کہانی اس طرح آگے بڑھتی ہے۔ کہ کشتریا دیو کو مار ڈالتا ہے۔ چھٹے اور آخری منظر میں بادشاہ۔ شاہی خاندان کے افراد اور بہادر سپاہی محل میں دکھائے جاتے اور "بہادر" کشتریا کو انعامات دئے جاتے ہیں۔ اور بادشاہ کی حسین لڑکی سے اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ کیونکہ اُس نے ملک کو خطرے سے بچایا تھا۔ اس کے بعد شادی کی دعوت ہوتی ہے۔

اس قسم کی کہانیاں عوام میں بیحد مقبول ہیں۔ دورِ حاضر کے سیاسی مسائل بھی ناچ کے ناٹکوں میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ڈیسا مونیکا جس کے دس سر ہوتے ہیں بدی۔ بُرائی، ظلم اور تشدد کا دیو سمجھا جاتا ہے۔ سیاسی واقعات میں اسے فسطائیت کے نمائندہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

ناٹکوں کے ذریعے سے انڈونیشی عوام کو ملک کے صحیح سیاسی حالات سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ انھیں فسطائی طاقتوں سے لڑنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انڈونیشی ناٹک عوام کی اخلاقی قدروں کو بلند کرتے ہیں۔ یہ انکی بائبل ہے جس سے وہ فلسفۂ حیات کے مفہوم اور مطلب کو سمجھتے ہیں۔ زندگی کے بہتے ہوئے دریا میں غموں اور خوشیوں کو سمجھتے ہیں۔ غموں اور دکھوں کی اونچی لہروں۔ خوشی و خرمی کی نیچی لہروں اور زندگی میں بھڑکتے شعلوں اور دہکتے لاووں کو سمجھتے ہیں۔ ان ڈراموں میں انسان کی بدکاریاں اور اچھائیاں مختلف زاویوں سے پیش کی جاتی ہیں۔ بہادری اور بزدلی۔ وفاداری اور دغابازی۔ بہادری اور ظلم۔ قربانی اور خودغرضی۔ پاکبازی اور بدکاری۔ عفت اور بیحیائی اور فرض اور کاہلی عام مضامین ہیں۔ جن پر ناٹک دیکھنے کے بعد انڈونیشی عوام بحث کرتے ہیں۔ ناٹک اخلاق بڑھانے میں اہم درجہ رکھتا ہے۔ موسیقی اور ناچ قدیم انڈونیشی ڈراموں کی روح ہے۔ موسیقی ناچ میں وقت کا تعین کرتی ہے۔ اور نغمے سے ناچ کا لطف دوبالا

ہو جاتا ہے۔ موسیقی سے جو کام فلموں میں لیا جاتا ہے بالکل وہی ناچوں میں بھی لیا جاتا ہے۔ موسیقی کے بعد ڈلانگ کی اہمیت ہے جو مختلف حرکات کی تشریح کرتا ہے۔ اور دوسرے منظر کا اعلان کرتا ہے۔ اس قسم کے ناٹک میں بھی ڈلانگ منیجر مُغنّین اور موسیقی کا ہدایت کار ہوتا ہے۔ ان ڈراموں میں اداکاری ناچ میں ہوتی ہے۔ جب انسانی جذبات کا اظہار اداکاری میں ہونے لگا اور اس کی خوبیاں اور امکانات مستند سمجھے جانے لگے تو ناچ نے ناٹک سے آزادی اختیار کر لی۔ اور ایک علیحدہ فن بن گیا۔

قدیم ناٹکوں میں گانے بہت کم ہوتے تھے۔ کچھ ناٹکوں میں منظوم مکالمے ہوتے تھے۔ شہزادہ مانگ کنی گورو کے دربار میں جو سولو (وسط جاوا) میں تھا ایک مخصوص قسم کا ناٹک لین جین ڈری یا" ہوتا تھا۔ اس میں موسیقی ناچ اور نغمے بڑی خوبی سے پیش کئے جاتے تھے۔

انڈونیشی ناچ اور ناٹک دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ مذہبی اور تاریخی۔ مذہبی قسم میں "مندر کے ناچ "سنگھا یانگ۔ بارس کیتجاک۔ اور باردنگ وغیرہ ہیں۔ یہ ناچ مندر کے تہواروں کے موقعوں پر مندروں اور گاؤں کی سڑکوں پر ہوتے ہیں سنگھا یانگ میں ناچنے والیوں کو خوشبو اور موسیقی سے بیخود کر دیا جاتا ہے۔ کیتجاک میں ناچ سے زیادہ گانے ہوتے ہیں۔

باردنگ ایک مخصوص ناٹک ہے۔ اس میں ایک عجیب الخلقت دیو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ دیو چینی شیر کی مانند ہوتا ہے۔ اس کی کہانی پرانے قصّوں سے ماخوذ ہے۔ اس میں سفید اور سیاہ جادو کا ذکر ہے۔

تاریخی ناٹکوں میں "ٹوپینگ" "دیانگ" "کیبیار" "میگونگ" اور "ڈگنیگر" مشہور ہیں۔

موسیقی اور نغمہ انڈونیشی ناچ کی بنیاد ہے۔ جو ناٹک کا بھی نمروری جُز ہے۔ اس کے بعد ناچ نے اس قدر ترقی کی کہ بذاتِ خود اظہارِ جذبات کا ایک فن بن گیا۔

مایا رنگ ناچوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ آدمیوں اور عورتوں کا ناچ۔ آدمیوں کے ناچ سادے اور عورتوں کے ناچ پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ان ناچوں میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ صرف باریک بین نگاہیں اس فرق کو محسوس کر سکتی ہیں۔ تقسیم کردار کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔

ناچنے والے یا ناچنے والیاں اپنے کردار کی مناسبت سے ناچ کی قسم کو پسند کرتے ہیں۔ اس قسم کے ناچ انڈونیشی عوام میں بیحد مقبول ہیں۔ اسے کپرات ناچ بھی کہتے ہیں۔ اس میں سنگھار کا ناچ، فتح کا ناچ اور محبت کے ناچ بھی شامل ہیں۔

یہ ناچ جاوانی فن کی روح سمجھے جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے ایک مرتبہ ان ناچوں کو دیکھا ہے وہ زندگی بھر انھیں بھول نہیں سکتے۔

نئے انتظامات اور جدّت طرازیوں نے ناچوں کے اندازِ اظہار اور اشکال میں خاصی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ جدید ناچوں میں گوریک۔ بونڈن۔ گیم گونگ خاص ہیں۔ ان میں صرف عورتیں ناچتی ہیں۔

گوریک انڈونیشی عوام کا محبوب ناچ ہے۔ اس میں ایک دوشیزہ کو سنگھار کرتا ہوا پیش کیا جاتا ہے۔ وہ کس انداز سے بال سنوارتی ہے۔ آئینہ دیکھتی ہے۔ ہونٹوں پر سرخی لگاتی ہے چہرے پر غازہ ملتی ہے۔ اور بھنویں بناتی ہے۔ یہ ناچ قدرتی معلوم ہوتا ہے۔ اس میں جذبات کے اظہار کی کافی قوت ہے۔ بونڈن ناچ میں گاؤں کی زندگی پیش کی جاتی ہے۔ کبھی اس میں کسی لڑکے کو لڑکی کے لباس میں پیش کیا جاتا ہے، اور کبھی چھتریوں کا ناچ دکھایا جاتا ہے۔

گیم گونگ تفریحی ناچ ہے۔ اس میں ایک یا ایک سے زیادہ ناچنے والیاں ہوتی ہیں۔ اس کے آخری منظر میں اقلیدس کے مختلف اشکال نہایت آزادی سے دکھلائے جاتے ہیں۔

جمہوریہ انڈونیشیا کے دوسرے جزائر میں کئی قدیم ناچ موجود ہیں ان میں "تجا کلیلی" (لڑائی کا ناچ) سولوکس میں۔ رومال کا ناچ سیلیبس میں اور چھتری کا ناچ سماترا میں قابل ذکر ہیں۔

جمہوریۂ انڈونیشیا کے تمام جزائر میں "پیٹ جاک" سب سے مشہور ناچ ہے۔ اس میں نہایت اچھے انداز میں اور نظم و ضبط سے لڑائی پیش کی جاتی ہے۔

انڈونیشی قوم انتہائی جذباتی ہے۔ جیسے قدرت نے آرٹ کی بخشایش پیشہ اصول منتظم ہے لیکن تہذیبی طور پر ابھی صدیوں پرانی روایات باقی ہیں۔

کملا دیوی چٹو پادھیائے

نئے فلمی رجحانات

ہندوستانی صنعت نے ابھی تک کم و بیش مغربی طرز کی اندھادھند پیروی کی ہے اور شاید یہ بات تھی بھی ناگزیر۔ تمام مشینی صنعتوں کے میدان میں مغرب اور خاص کر انگلستان نے پیش قدمی کی۔ ہم نہ صرف جسمانی طور پر مغرب کے پنجے کے نیچے تھے بلکہ اُس کا ہم پر نفسیاتی غلبہ بھی تھا۔ صرف پچھلی نصف صدی میں اس پنجے کی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی۔ گو اُس کی سابقہ کشش کا اثر ابھی زائل نہیں ہوا۔ ہم مادی اور ذہنی طور پر مغرب کے اس صنعتی طاقت کے احساس سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ باوجود اس بات کے کہ ہماری گذشتہ روایات اس سے متضاد ہیں اور ہم اپنے خصوصی اخلاقی معیاروں کے متعلق لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں۔ ہم آج بھی مغربی طرز کی پیروی کرنے پر قانع ہیں ہمارے نزدیک یہ تقلید نہ صرف پسندیدہ ہی ہے بلکہ ہمارا منتہائے مقصود ہے لہٰذا اس کے اثر سے گریز محال ہے اور ہم نیم شعوری طور پر اس کا سواگت کرتے ہیں۔ کئی لحاظ سے مغرب کے متعلق ہمارا علم سطحی ہے۔ جو لوگ مدت دراز تک غیر ممالک میں رہے اور جو قلیل مدت کے لئے بھی سیاحت پر گئے ہیں وہ مکمل طور پر مغربی سحر کے تابع ہو چکے ہیں۔ یہ سحر ہندوستان کے مقابلے میں بے شمار فوائد پیش کر سکتا ہے اور ان فوائد کے باعث غیر معمولی طریقے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جس زاویے سے دیکھیں اور جس معیار پر بھی پرکھیں ہندوستان مغرب کے مقابلے میں کم تر معلوم ہوتا ہے اور برابری کی تاب نہیں لا سکتا۔ مغرب کی دنیا پر حکومت ہے اگر بھارت اپنی قسمت کا خود حاکم بننا چاہتا ہے تو ہم اس سلسلے میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ ہوبہو مغرب کا نمونہ بن جائے۔ بہت کم لوگ مغربی زندگی کی سماجی بناوٹ کا اس غرض سے گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں کہ اُس کی انسانی قدروں کی جانداری اور وسعت کی جانچ کی جائے۔ اگر کوئی ایسا کرے تو ہر بار یہی نتیجہ نکلے گا کہ اُن کی قدروں کی حیثیت اتنی پست اور ناکافی ہے جتنی کہ ہماری قدروں کی، اور یہ کہ درحقیقت اہلِ مغرب اپنے بنیادی مسائل کو ہم سے کچھ زیادہ حل نہیں کر سکے ہیں۔ اگرچہ رفتہ رفتہ ہم پر یہ بات روشن ہوتی جا رہی ہے کہ صرف صنعتی اور حرفتی ترقی کی بڑھائی ہی انسانی ارتقاء اور مسرت کے لئے صحیح معیار نہیں تاہم ہم ابھی تک اس کے جارحانہ چنگل میں گرفتار ہیں۔

گذشتہ عالمگیر جنگ کے اثرات مغربی ممالک میں وسیع پیمانے پر زندگی کی ماہیت کو تبدیل کر رہے ہیں۔ مغرب کی معین زندگی میں شگاف پڑ چکے ہیں اور ترقی کی سماجی قوتیں ایک نیا ماحول پیدا کرنے کے لئے اُبھر رہی ہیں۔ موجودہ زمانے میں اس امر کا یقین بے جان چیز نہیں ہے کہ جمہوریت کو آزادی کی قدروں اور سوسائٹی کے انضباط کے مابین مطابقت کی ضرور سعی کرنی چاہیئے بلکہ یہ ایک زندہ تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔

وہ سب قوتیں جن کا سماج کے بنانے میں ہاتھ ہے مساوی طور پر بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس امر کا بھی پوری اہمیت سے احساس کیا جا رہا ہے کہ تمدنی مظاہر عوام کی جذباتی زندگی کا ایک لازمی جزو

ہے لہٰذا اس زندگی کے ہر ایک رُخ کے سماجی موضوع کی اہمیت مسلّمہ ہے چاہے وہ فلم ہو یا ڈرامہ، نقاشی ہو یا سنگ تراشی، نظم ہو یا افسانہ۔

متحرک تصویر اب ایک انڈسٹری کہی جاتی ہے کیونکہ اس میں مشینی ہتھیار وسیع پیمانے پر استعمال ہوتے ہیں۔ یہ صنعت مقابلتاً ہندوستان کی صنعتوں میں سب سے زیادہ نوعمر ہے۔ فلم سازی میں ہم قدرتی طور پر ہالی وڈ سے اثر پذیر ہوئے ہیں جسے متحرک تصاویر کا گھر کہا جاتا ہے۔ ہمیں ہالی وڈ بذات خود اپنی منزل مقصود نظر آیا جب تک پہنچنا ہمارا اوّلیں مدّعا ہے۔ ہالی وڈ کے نگارخانوں کی اعلیٰ اہلیت، میکنیکل ترقی میں حیران کن پیش قدمیاں اور ہالی وڈ کی تصاویر کی ہمہ گیر ہر دل عزیزی وغیرہ ان عناصر نے ہمارے سامنے ایک معیار قائم کر دیا ہے۔ ان کے پست سماجی موضوع، قومی مسائل پر ان کا عام رجعت پسندانہ نظریہ، ان کے غیر حقیقی کردار، امریکی عوام کی روزمرہ زندگی سے دُوری، اُن کی قوم کی فطرتی اُمنگوں اور معاشرتی جدوجہد کو ظاہر کرنے میں ناکامی وغیرہ کو عام طور پر نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ اصل میں ہالی وُڈ کی بہت سی تصاویر کا عموماً سماجی طور پر رذلیل پلاٹ یعنی مسلح دشمن عناصر کو دل کش ڈرامہ کے انداز میں پیش کرنا، غنڈہ گردی کو بہادری کے رنگ میں، بدمعاشوں کو قابلِ پرستش بھیس میں ظاہر کرنا اور انسانی کمزوریوں کی کمینہ ترین اور سب سے معیوب باتوں کو رنگینی اور نفرہ سے چمکانا امریکی زندگی کی سماجی ٹریجڈی ہے۔ ہم نے ہالی وڈ کی گندی اور غیر مہذب ہزلیات کی جو بیہودہ اور بعید از عقل گپ شپ ہوتی ہے، اندھادھند نقل کرنے سے گریز نہیں کیا اور اسے ہم نے فلمی جرنلزم کا نام دیا ہے اور ہم نہایت فخر کے ساتھ ہالی وڈ کی سرکردہ شخصیتوں کی رائے ہندوستانی ہالی وڈ ازم میں پیش کرتے ہیں۔ ان حالات میں ہالی وُڈ متحرک تصاویر کے تمام شعبوں کا انتہائی نمونہ تصوّر کیا جاتا ہے۔

روایتی طور پر ہالی وڈ نے فلموں کو ایک "تخیلی" چیز قرار دیا ہے جس کا واحد مقصد محض اپنے حاضرین کا دل بہلانا ہوتا ہے اس لئے ہالی وڈ کے ایک عام فلمساز کو کبھی دوسری سماجی ترغیب کی تحریک نہیں ہوئی اور اس نے سوسائٹی کے لئے اس سے زیادہ کام سرانجام دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی، اُن موقعوں پر بھی جہاں کہ روزمرہ کے اہم موضوعات پیش کئے جاتے ہیں چاہے دلی سے یا پریشانی کی حالت میں زیادہ تر غلط تعامد پر دیا جاتا ہے یا واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر اُن میں سے کسی ایک کی اظہار صداقت پر زور دیا جائے تو اس کا یہ جواب ملتا ہے کہ آخر یہ ایک فلم ہی تو ہے، جس کا دوسرے لفظوں میں یہ مطلب ہے کہ یہ جھوٹ موٹ کا کھیل ہے، جس کے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اس کا روزمرہ کی ضرورتوں سے کوئی تعلق نہیں، ہاں گاہے بگاہے معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے جیسے کہ "گریپس آف راتھ" نامی پکچر میں۔

جنگ کی ضرورتوں کے باعث سماجی اظہار خیالات کے ذرائع کو جن میں فلم بھی شامل ہے نیا روپ اختیار کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ہالی وُڈ کے کامیاب فلم سازوں کو مجبوراً آہستہ آہستہ اس امر کا احساس ہو رہا ہے کہ آخرکار فلم ایک سماجی تحریک کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ ہر وقت "محض فرار" کے بہانے کی آڑ نہیں لے سکتے اور اس نام نہاد صنعت کے لیڈروں پر یہ ابتدائی امر واضح کرنے کے لئے ایک قسم کی جدید جنگ کی تمام تر سفاکی اور انتہائی بے رحمی کی صورت ہے۔

پہلی چیز جس نے ہالی وڈ کی اوپری سطح میں شگاف پیدا کرنے میں بارود کا سا کام کیا ہے وہ نازیوں کے ہاتھوں امریکی تصاویر کا خلاف توقع استعمال ہے۔ خاص کر ڈکیتی وغیرہ کے متعلق فلمیں جن میں چند کو دوبارہ ترتیب دے کر امریکی لوگوں اور اُن کے حکمرانوں کے حالات کے مرقع کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان میں جنگ سے پہلے ہوئے اور نازیوں کے غلبے سے اثر انداز ہوئے ہوئے یورپ کے لوگوں سے یہ سوال کیا گیا کہ "کیا یہی آزادیاں ہیں جن کی طرف تم آنکھیں لگائے ہوئے ہو؟"

ہالی وڈ کے فلم سازوں نے ڈاکومینٹری فلموں سے نفرت کی تھی اور تصاویر کی سماجی قدروں پر دھیان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اب یہ دیکھ کر اُن کی آنکھیں کھل گئیں کہ اُن کی جھوٹ موٹ اور دل بہلاوے کی فلموں کو غیر ممالک میں امریکی زندگی کے مرقع کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ تصاویر امریکی عوام تک بھی پہنچنے میں قطعی ناکام رہیں کیونکہ امریکی عوام نفسیاتی اور مادّی طور پر اُس درہم شدہ نظام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے جو کہ شکست پرل ہاربر اور اُس کے بعد جنوب مشرقی ایشیا میں امریکی پسپائی کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا تھا۔

اس زمانے کی طیّار کردہ تصاویر دونوں مقاصد پورا کرنے میں ناکام رہی ہیں فلمیں جنگی محاذ کو تقویت دینے میں بھی ناکامیاب رہیں کیونکہ یہ فلمیں پبلک کو جنگ کے لئے ہر امکانی کوشش کا پیغام نہ دے سکیں اور گھریلو محاذ پر بھی عوام سے براہِ راست مخاطب نہ ہو سکنے کی وجہ سے ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ جنگ میں ایک عام آدمی ہی ہیرو ہوتا ہے کیوں کہ یہ اُس کی جفاکشی اور وفاداری ہی ہے جن پر تمام جنگی کوششوں کا انحصار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس امریکی تصاویر میں گھریلو محاذ پیروڈی کی ایک قسم بن کر رہ گیا اس کے ساتھ "کامیڈی" کا سا برتاؤ کیا گیا۔ ریڈ کراس اور ہوائی حملے کے کارکنوں کا مذاق اڑایا گیا، بلکہ دراصل تمام شہری بچاؤ کی سرگرمیاں وسیع یا کم تر پیمانے پر مذاق کا موضوع بن گئیں۔ اس قسم کی فلموں کو ایسے ممالک میں بھیجنا جہاں گھریلو محاذ جنگی محاذ کی بہ نسبت خونخوار تر لڑائی کا منظر پیش کر رہے تھے زخمیوں کی توہین میں اضافہ کرنے کے مترادف تھا۔ دیگر تصاویر بھی جو دشمن کے متعلق طیّار کی گئی تھیں کچھ زیادہ بہتر نہ تھیں۔ اُس وقت جب کہ تمام باتوں سے زیادہ عوام کو اس بات کی ضرورت تھی کہ اُن کو دشمن کی طاقت اور کمزوری کا صحیح صحیح حال معلوم ہو جائے۔ دشمن کو ایک "جنگلی درندہ" یا مکار ظاہر کر کے مضحکہ اڑانا بالکل لاحاصل تھا۔ جاسوسوں اور غنیم کے کالموں کی بچکانہ کہانیوں کا عام رواج ہو گیا۔ سال ۱۹۴۳ء میں ہالی وڈ میں جو ۴۸۶ تصاویر طیّار کی گئیں۔ ان میں سے ایک چوتھائی سے زائد جنگی فلمیں تھیں۔ ان جنگی فلموں میں سے ۵۰ فیصدی اور تمام فلموں میں سے ۱۵ فیصدی کی کہانیاں جاسوسی کہانیاں تھیں۔ جنگ سے فائدہ اُٹھانے اور ہاتھ رنگنے کا سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ جنگی جذبات کو مشتعل کیا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ جنگی موضوع پر جو بھی ہیجان خیز فلم طیّار کر لیا جائے اُسے ہالی وڈ کی مخصوص کشش حاصل ہوگی، اس بات سے ہماری نقصان پہنچا خاص کر اُس وقت جب کہ فوجی زندگی کا روشن پہلو دکھایا جانے لگا۔ ان تصاویر سے امریکی فوجیوں میں سخت ناخوشی پھیلنی شروع ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ جب محاذ پر اُن میں سے چند تصاویر کی نمائش کی گئی تو فوجی غصّے میں آ کر واک آؤٹ کر گئے۔ یہ لوگ ہولناک تاثرات سے گھبرے ہوئے تھے اپنے آپ کو ان مضحکہ خیز حالات میں دیکھنا کیسے گوارا کر سکتے تھے؟ پردیس میں اس کے خلاف مسلسل احتجاج کیا گیا۔ ان فلموں میں غیر ملکیوں کے سامنے لڑائی کے متعلق امریکہ کے ردِّ عمل کا کمزور خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ اُس وقت خوراک کے لحاظ سے تمام یورپ فاقہ کشی کر رہا تھا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ امریکی عوام تو شاہانہ خوراک پر پل رہے تھے اور ہر جگہ کھانا ہی کھاتا تھا جبکہ وہ فاقے کاٹ رہے تھے، اس کے علاوہ وہ تو چیتھڑوں میں ملبوس پھرتے تھے اور امریکی فیشن کی نمائش نہایت طمطراق کے ساتھ دکھائی جا رہی تھی اور فلموں میں بڑے کرداروں کو دن میں چھ چھ مرتبہ لباس تبدیل کرتے ہوئے دکھلایا گیا تھا غرضکہ امریکی تصاویر کے باعث "انکل شام" کے خلاف غیر ملکی عوام کے غصّے میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔

کئی سال سے ہالی وڈ نے تمثیلی فلمیں بنانے کا تہیہ کر رکھا تھا اور اب یہ تصاویر معلومات بہم پہنچانے میں مایوس کن طور پر ناکام ثابت ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد بھی ان تصاویر میں وضاحتی رنگ بھر کر مختلف طریقے اختیار کرنے کی کوشش کی گئی۔ مثلاً "ویک آئی لینڈ" اور "ولسن" وغیرہ فلموں میں حتیٰ کہ اصلی اشخاص اور صحیح واقعات کے متعلق بھی یہ معلوم ہونے لگا کہ ان پر غیر حقیقی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ یہ واقعات اُن کے نزدیک سب سے اوّل افسانہ اور بعد ازاں کچھ اور تھے۔ ہالی وڈ کا حقیقی واقعات پر تخیلی رنگ چڑھانے کا طریقہ کار ایک دن میں رد نہ کیا جا سکا۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ کافی مدت تک امریکہ کے سینما بین اس قدر غیر یقینی حالت میں تھے کہ وہ حقیقی اور غیر حقیقی واقعات میں تمیز نہ کر سکتے تھے۔ ہالی وڈ کی ایک مشہور تبصرہ نگار خاتون "ڈارتھی جونز" یوں رقمطراز ہے

دسمبر ۱۹۴۲ء سے دسمبر ۱۹۴۳ء تک ۱۲۱۳ تصاویر نمائش کے لئے بھیجی گئیں اور ہر دس فلموں میں سے تین فلموں کی مرکزی کہانی جنگی محور کے گرد پھرتی ہے۔ تاہم ۱۰۰ جنگی فلموں کے مجموعے میں سے صرف نصف درجن اس قسم کی ہوں گی جو ملک کی جنگی کوششوں کے بارے میں کوئی امتیازی چیز پیش کرتی ہوں یا ملک کے باہر فوجیوں کے حوصلے اور جوش میں اضافہ کرتی ہوں۔ اگر متحرک تصاویر کی صنعت جنگ کے متعلق اپنے فرائض پورا کرنے میں ناکام رہی ہے تو اس ناکامی کی تہ میں کیا چیز ہے؟ اور آئندہ امن کے قیام میں اس صنعت کا کیا حصّہ ہوگا؟

اوّل تو یہ کہ متحرک تصاویر بھی دوسرے ذرائع کی طرح اُس اہم کام

کے لئے جو جنگ نے اُن پر لاحق کر دئے تھے تیار نہیں تھیں کئی سال سے ہالی وڈ ایک سال میں چھ یا سات سو تصاویر تیار کر رہا تھا۔ اُن تصاویر میں اکثریت کامیڈی، رومانی، پُر اسرار قتل اور مافوق القیاس اسی قسم کے دیگر فرسودہ موضوعات کے متعلق تھیں۔ کئی سال سے فلم سازوں کا یہ یقین چلا آرہا تھا کہ امریکی پبلک سب سے بڑھ کر یہ چاہتی ہے کہ اُن کی دلچسپی کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ لہٰذا یہ امر حیران کن نہیں کہ جب ہالی وڈ کے فلم سازوں کے سر پر پبلک کو جنگ کی تربیت دینے کا کام آ پڑا تو وہ یہ بات سمجھ ہی نہ سکے کہ اس کام کو کس طرح انجام دیں، اس بارے میں اُن کی معلومات اور تجربہ نفی کے برابر تھا اس کام کے کرنے کے طریقے سے وہ نا آشنا تھے اور ساتھ ہی ساتھ امریکہ کے دیگر عوام کی طرح وہ جنگ کا اصلی مفہوم سمجھنے سے بھی عاری تھے۔

لیکن "میلو ڈرامہ" کے چکر کو اپنی طاقت صرف کرنا پڑی اور جوں جوں جنگ ہولناک تر اور تیز تر ہوتی گئی صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے لڑائی کے نظریوں کی چھان بین کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان میں سے جن لوگوں نے اپنے سابقہ طریقۂ کار کی تجدید کا پکا ارادہ کیا۔ ان میں ہالی وڈ کے چند مصنف، کچھ آرٹسٹ، فلم ساز اور سٹوری ایڈیٹرز تھے لیکن غالب گروہ مصنفین کا تھا۔ شروع شروع میں ان کے خیالات میں ۱۹۳۱-۳۲ء کے بھاری دباؤ کے زمانے میں انتشار رہا اور جنگ کے شروع سے پہلے بھی اس گروہ کے کامیاب ترین ممبروں کو گاہے بگاہے ایک آدھ ایسی فلم بنانے کا موقع مل ہی جاتا تھا جو اپنی سماجی خصوصیات کے لحاظ سے قومی اہمیت کا درجہ رکھتی تھی، لیکن مجموعی طور پر جو کچھ کامیابی اُن کو حاصل ہوئی وہ سماجی مسائل کے نقطۂ نظر سے کم اور ناکافی تھی۔ اگرچہ اُن کی تنخواہیں بڑے بڑے ہندسوں میں لکھی گئیں اور اُن کو اس صنعت میں اعلیٰ ماہرین کے طور پر جگہ ملی لیکن اُن کا جذبۂ اظہار تنقید اور اُن کی تصاویر کا میدان محدود ہو گیا۔ اُن پر نا اُمیدی اس طرح چھا گئی جس طرح کہ شام کے وقت دُھند یا کہر چھا جاتی ہے جس کو صرف شعاعوں کا گرم غبار ہی دور کر سکتا ہے۔ ان مردوں اور صنفِ نازک کے اس گروہ نے اس موقع کو جو جنگ نے پیدا کیا تھا، دفعتاً اپنے خوابوں کی تعبیر کے لئے بھانپ لیا اور اسی دوران میں اُنھوں نے اپنے معیار سے گرتے ہوئے ہالی وڈ کو اس قابل بنا دیا کہ وہ جنگ فتح کرے اور امن قائم کرنے میں اہم اور ترقی پسندانہ پارٹ ادا کرے۔

۱۹۴۳ء میں تصاویر کی ایک نئی قسم کا ظہور ہوا جس کو قومی مسائل کے پردے پر زیادہ حقیقی اور زیادہ سنجیدہ رنگ میں پیش کرنے کا امتیاز حاصل تھا اور اس قسم کی تصاویر مثلاً "ہٹلرز چلڈرن" "دس لینڈ از مائن" "واچ آن دی رائن"، "نارتھ سٹار" کو ایک نئی قسم کا وقار حاصل ہوا نازی آدرشوں کو اُن کے صحیح پس منظر کے مطابق مطالعہ کرنے کی پہلی بار کوشش کی گئی۔ اس کے بعد "دی ہیومن کامیڈی" کی سی تصاویر پیش ہوئیں جو امریکہ کے چھوٹے چھوٹے شہروں کی گھریلو زندگی کا ایک صحیح مرقع تھیں "فلم جو سمجھتے" اوسط درجے کے امریکی مزدور کی زندگی کا ایک خاکہ تھی ان فلموں میں زندگی کی حقیر چیزوں کی قدروں کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ فلم "آکس باکس انسی ڈینٹ" کا مقصد شہری آزادی کے سوال پر پوری پوری روشنی ڈالنا تھا۔ اسی طرح "پچر پاور آف دی پریس" کا مدعا یہ تھا کہ پریس کی آزادی سے جو ذمہ داریاں عاید ہوتی تھیں اُن کو عوام پر ظاہر کیا جائے۔ یہ فلموں کے بذاتِ خود کئی فوائد تھے، کیونکہ واقعاتی تفصیلات سے آزاد ہونے کے باعث یہ فلمیں اپنے موضوع کو واضح کر سکتی تھیں اور "ڈاکومینٹری" فلموں کی بہ نسبت کسی نکتے کو زیادہ آسانی سے بیان کر سکتی تھیں۔ علاوہ ازیں عوام کے دلوں میں ذہنی اداکاروں کے بارے میں بدگمانی نہ ہونے کی وجہ سے مسائل کی پیچیدگی کے سمجھنے میں آسانی رہتی ہے اور اس طرح حقیقت کا رنگ بغیر کسی کوشش کے واقعات کے ایک خاص سلسلے کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

پرل ہاربر کے وقوعے کے ایک ہفتہ بعد ہالی وڈ کے فلم ساز، ادیب وغیرہ نے طے کر لیا کہ اپنے فطرتی جوہروں کو اخلاقی حالت کے واسطے تعمیری مواد کے فراہم کرنے کے لئے وقف کریں اور ایک ادارہ جو ہالی وڈ کے مصنفین کی "لام بندی" کے نام سے مشہور ہوا، قائم کیا گیا۔ اس ادارے نے نہ صرف استعداد کے مہیا کرنے کے لئے سرکاری ایجنسی کے طور پر کام کیا بلکہ اُس نے نئی فلموں کی کہانیوں پر قابل قدر اثر ڈالا جو جدیدیت کے تحت لکھی جا رہی تھیں۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں یونیورسٹی آف کیلیفورنیا سے مل کر مصنفین کے اس ادارے نے لاس اینجلیز کے مقام پر مصنفین کی ایک کانفرنس طلب کی جس میں تقریباً ۱۲۰۰ اشخاص نے شمولیت کی جنگ کے فوری دباؤ نے موقع مہیا کر دیا تھا۔ اور جو مصنفین اکٹھا ہوئے

انھوں نے فیصلہ کیا کہ فلم روزمرہ کے سماجی مسائل سے بالکل الگ تھلگ نہیں رہ سکتی۔ بعدازاں اس انجمن نے لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں مصنفین نے سماجی مسائل کو پردۂ سیمیں پر لانے کے بارے میں بحث کی ان لیکچروں کی ہر دل عزیزی کا ثبوت اُس بھاری حاضری سے ملتا تھا جو ان لیکچروں میں ہوا کرتی تھی۔ یہ لیکچر معلومات اور اطلاعات کا ایک بھاری ذریعہ ثابت ہوئے اور ان کے تعمیری غور و فکر پر ایک تازیانہ ثابت ہوئے۔ اس سے رفتہ رفتہ سماجی اظہار خیالات کا ایک نیا ڈھنگ ظاہر ہونے لگا۔ نیز مصنفین نے موجودہ واقعات کے متعلق اپنے خیالات واضح کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس نئی تحریک میں جن لوگوں نے رہنمائی کی، اُن میں آرسن ویلز، کیتھرین ہیپ برن، ایڈورڈ رابنسن، دی وارنرز، ڈڈلی نکلز، ڈلٹن ٹرمبو، ہنرچ کوچ اور دیگر چوٹی کے فن کاروں کی ایک جماعت شامل ہے۔

اس تحریک سے یہ بھی مطلب تھا کہ غیر ملکیوں اور اقلیتوں کے متعلق پرانے بوسیدہ رویے میں بنیادی تبدیلی کی جائے۔ جیسا کہ جنگ کے دوران میں یہ امر ضروری ہو گیا کہ دشمن کو حلق میں بات کرنے والے جرمن یا ترچھی آنکھوں والے جاپانی کے روپ میں پیش کرنا بند کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ضروری ہو گئی کہ نیگرو حبشیوں کو گھریلو نوکر کے طور پر چینیوں کو دھوبی، امریکن انڈینز کو پر لگانے والے جنگلی آدمی کے طور پر اور میکسیکو کے لوگوں کو اُٹھائی گیروں کے طور پر نہیں دکھانا چاہیئے اور اسی طرح دیگر باتیں بھی تھیں۔ پرانے کارٹونوں والی تصاویر کی بجائے نئی تصاویر رکھی پڑیں جن میں ابتدائی طور پر ہر ایک تصویر میں یہ دکھلایا گیا کہ کوئی بنی نوع انسان بھی متوسط درجہ کے گوری نسل کے امریکن مرد اور عورت سے مختلف نہیں جن کو حاضرین اپنی سوسائٹی کے ممبر کے طور پر منظور کر سکتے ہیں نہ کہ کسی قسم کے غیر ملکی یا اجنبی نظر آنے والے افراد کے طور پر، اور اُن کے اپنے سماجی نظام میں کوئی اس قسم کی مثال نہیں۔ آج رفتہ رفتہ ہالی وڈ کی صنعت فلم سازی میں بڑھتی ہوئی اور مکمل ترقی کے کئی ثبوت دکھائی دیتے ہیں۔

تصاویر کے متعلق نئے نظریوں کے رواج سے مختلف صلاحیتوں والے گروہ آگے بڑھے تاکہ سوسائٹی کے متعلق عام طور پر اور متحرک تصاویر کے متعلق خاص طور پر اپنی سماجی اور سیاسی ذمہ داریوں کو سنبھالیں، اس کے علاوہ یہ نظریہ بھی قائم ہو گیا کہ فلم کے حاضرین زندہ سوسائٹی کی مثال ہیں۔ مزید برآں کہ ہمارے [illegible] کے گذشتہ ایام ہوا ہو گئے۔ آج عملی طور پر ہر ایک ملک پردۂ سیمیں کی طاقت کا احساس کر رہا ہے اور [illegible] سے اپنے قومی مفادات کی انجام دینے کا کام لینا چاہتا ہے، لہذا اس امر کے لئے پوری پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ قومی صنعت فلم سازی کو ترقی دی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اس اثر کا بھی مطالعہ کیا جائے، جو غیر ملکی خاص کر امریکن تصاویر کا عوام کے دلوں پر قومی روایات فلاسفی اور ضروریات کے متعلق پڑتا ہے۔ اس طرح سے ہر ایک ملک اپنے سماجی فرائض کے متعلق زیادہ آگاہ ہو رہا ہے اور پراپیگنڈا مشینری سے مساوی طور پر نہایت زیادہ اثر قبول کر رہا ہے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک سے زیادہ موقعوں پر امریکہ اور جنوبی امریکہ کے ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات ہالی وڈ کی تیار کردہ "ڈاؤن ارجنٹائن" کی سی تصاویر کے باعث کشیدہ ہو گئے۔ غرض کہ بین الاقوامی معلومات کا علم نیک خواہشات کے ساتھ ہی اثر پذیر ہوتا ہے کیونکہ تنہا خلوص دلی ہی سے پڑوسیوں میں بہتر تعلقات پیدا ہو سکتے ہیں۔

ماضی میں ہالی وڈ کی رہنمائی فلموں کے فروخت کنندگان کے ہاتھ میں تھی جہاں تک ڈالر کے بل کا تعلق ہے انھوں نے اس کیلئے بہت کچھ کیا یعنی خوب ہاتھ رنگے لیکن کل کی ضرورت پوری کر دینے سے آئندہ آنے والے کل کی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔ آج اُن لوگوں کی ضرورت ہے جو صرف فروخت کے واحد مسئلے سے ہی تعلق نہ رکھیں بلکہ بین الاقوامی تعلقات کا بھی خیال رکھیں اور مشترکہ مفادِ انسانی پر مبنی وشواس کی جستجو کریں کیوں کہ سیاسی میدان کی طرح فلم سازی کے میدان میں بھی قوموں میں یک جہتی صرف دانستہ اور کوشش سے پیدا کئے ہوئے تعاون سے لائی جا سکتی ہے اور یہ یک جہتی مشترکہ آدرشوں اور قدروں کی ترغیب کے لئے ہو گی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ہالی وڈ کی دنیائے فلم میں ایک مسلسل انقلاب ہوتے رہنے کا خیال محض خوش فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب جنگ خاتمے کے نزدیک پہنچی اور پہلے طریقے پر بازرفت کرنے کی تجاویز پر عمل شروع کیا گیا تو ان میں قبل از جنگ کے نیم شناسا نازیوں کی طرح رجحان ثانی پایا جاتا تھا۔ اور ایک بار پھر ہکر کی فیچر، ہلکے راگ والی، پُراسرار قتل اور اسی قسم کی دیگر فراریہ فلمیں بننی شروع ہو گئیں۔ تاہم ایک بھاری تبدیلی غیر مبہم اور صاف طور پر دکھائی دے رہی ہے کیونکہ یہ نیا اثر نہ صرف فلموں کی تیاری کے سلسلے میں ظاہر ہو گا بلکہ اُن فن کاروں کے ذریعے سے بھی ظاہر ہو گا جو سماجی طور پر اپنی ذمہ داریوں کے متعلق زیادہ باخبر اور آگاہ تھے۔ مثال کے طور پر مصنفین کی انجمن تمدنی مرکز کے طور پر کام کرے گی کیونکہ فلمی ادیب فلم کے سوشل اور سیاسی اُلجھاؤ سے دلچسپی رکھتے ہیں اور یہ فلمی ادیب دوسرے ملکوں کے فلمی ادیبوں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کے کام کو مزید ترقی دینگے۔

اے وائے مولانا صفی

آخر کار مسلسل بیماریوں، ناچاریوں اور ناقدریوں سے تنگ آکر مولانا صفی بھی اس ادب سوز اور شاعر بیزار دنیا کو چھوڑ کر وہاں چلے گئے، جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا

حضرت لسان القوم مولانا صفی لکھنوی کون تھے اور ادب کی محفل میں ان کا پایہ کس قدر بلند تھا، اس دور کے نوجوانوں کو اس کی کیا خبر، وہ بیگانۂ ادب نوجوان جن کے دائرے میں اُن کی موت ایک ہلکی سی جھنکار بھی پیدا نہ کر سکی۔

صفی صاحب کے سوگواروں پر یہ المناک فریضہ بھی عاید ہوتا ہے کہ وہ اپنی جوان نسل پر بھی ماتم کریں۔ جو ماضی کے کارناموں سے بیگانہ اور ادب کی قدروں سے ناواقف ہے۔

اور اسی کے ساتھ ساتھ مجھے تو لکھنؤ کے ان ارباب اقتدار کے مجرمانہ تغافل پر بھی خون کے آنسو بہانا ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ وہ قدیم ادب کے پرستار اور حقیقی شاعروں کے ناز بردار ہیں۔ انہوں نے بھی کیا کیا؟ حالانکہ ان میں سے بعض مقتدر حضرات کو میں نے لکھا بھی تھا کہ صفی صاحب کی جانب توجہ مبذول فرمائیں، لیکن کس کو اتنی پڑی تھی کہ ایک باکمال شاعر کی طرف توجہ مبذول کرنے کی زحمت گوارا فرماتا۔

میں ع "موت کا ایک دن مقرر ہے" کا قایل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک مناسب غذا، بہتر فضا، اور صحیح دوا سے زندگی کو طویل بنایا جا سکتا ہے، اور ہر چند صفی صاحب نوے برس کے ہو چکے تھے، لیکن ان میں حیات کی توانائی اس قدر ضرور باقی تھی کہ اگر حالات کو بہتر بنا دیا جاتا تو وہ ابھی چند سال اور بھی جی لیتے۔ لیکن ارباب لکھنؤ کی محبت و غیرت انہیں کب اجازت دے سکتی تھی کہ وہ ایسی نیکی کے ارتکاب کا تصور بھی کر سکتے۔

صفی صاحب وہ پہلے شاعر تھے، جنہوں نے لکھنؤ کی رسمی شاعری کے دھارے کو حقیقت نگاری کی جانب موڑا تھا، اور اپنے قلم سے سوسائٹی کو اتنے فائدے پہنچائے تھے، جن کا شمار بھی مشکل ہے۔

افسوس صد افسوس صفی صاحب وہ سب کچھ بچا کھچا اپنے ساتھ قبر میں لے کر چلے گئے جس نے لکھنؤ کو لکھنؤ بنایا اور جس پر لکھنؤ کو ناز تھا اب رہ کیا گیا ہے غریب لکھنؤ میں کہ کوئی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے۔ ع از دل ما چہ بجا ماند کہ باز آید؟

دہلی مرحوم میں تو مدت سے اندھیرا چھایا ہوا تھا، لکھنؤ میں ایک آخری شمع باقی تھی، سو وہ بھی گل ہو کر رہ گئی۔ ع اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

مولانا صفی سے میرے تہرے رشتے تھے، وہ میرے استاد کے استاد، میرے باپ کے دوست اور میرے شفیق چچا تھے کس کس رشتے کو روؤں میں نامراد۔

صفی صاحب اب اس شاعر کش دنیا میں نہیں ہیں، لیکن اُن کی یاد کم سے کم میرے کاشانۂ دل میں ایک شمع کی طرح روشن رہے گی اور اس وقت تک ایک سوگوار روشنی کے ساتھ باقی رہیگی جب تک کہ میرا چراغ حیات گل ہو کر نہیں رہ جائیگا، کسی کو کیا معلوم کہ اپنے چراغ حیات کے گل اور جلد تر گل ہو جانے کا میں کس قدر آرزومند ہوں۔ وہ چراغ کس کام کا جس کی روشنی اب ان چہروں پر نہیں پڑ سکتی جو شعر و ادب کے آفتاب و ماہتاب تھے، اور جن میں آخری چہرہ تھا مرحوم صفی صاحب کا جس کا میرے آخری سفر لکھنؤ کے موقع پر آخری تبسم مجھے اب تک یاد ہے وہ تبسم جس میں میں نے صفی صاحب کی موت کی جھلک دیکھی تھی اور مجاز سے کہا تھا کہ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ مرنے والے کا وہ بزرگانہ اور مردانہ تبسم نشتر بن کر میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ اور ہمیشہ دوڑتا رہے گا۔

یاں چھپٹی دھوپ ہے گلابی سایا　　رہتا ہے سحاب ابدیت چھایا
جوش آؤ کہ منتظر ہے بزم ارواح　　آیا، یاران رفتہ، آیا، آیا!! اپنے وطن میں غریب الدیار

جوش



اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

ن القوم حضرۃ صفی لکھنوی (مرحوم)

ش سنہ ۱۸۶۲ء وفات سنہ ۱۹۵۰ء

نغز گو، معجز بیاں، شیریں مقال
۰۷ بکرمی ۲۰

عقلمند و نکتہ سنج و نکتہ داں
۶۹ ہجری ۱۳

زیب باب شاعری، جان سخن
۶۹ ہجری ۱۳

ماہر فن، زیلت، باغ جناں
۵۰ عیسوی ۱۹

فخر دنیا، فخر دیں، اوج صفی
۵۰ عیسوی ۱۹

ہمکنار آدم خلد آشیاں
۵۷ فصلی ۱۳

راقم الحروف ڈاکٹر شفا گوالیاری
۵۰ عیسوی ۱۹

(ماخوذ از "سرفراز" لکھنؤ)

انڈونی

اس موضوع پر جناب مسعود صدیقی



جکارتا میں ایک درباری ناچ

جاوا کی ایک رقا



جاوا کے ناچ کا ایک اور رخ





جاوا کا ایک رقص

چ

ے میں شائع ہو رہا ہے

ے پہلے

جزیرہ بالی کا ایک رقاص







شاه جهان

کی ایک مذهبت کار تصویر

اس تصویر کے متعلق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا مقاله
اسی شمارے میں ملاحظه فرمائیے

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

شاہ جہان کی ایک مُنبَّت کار تصویر

جہانیا میں کئی برس رہنے کے بعد جب میں وطن واپس آنے لگا تو ارادہ ہوا کہ انگلستان جاتے ہوئے ولندیز (ہالینڈ) کے تاریخی اور خوشنما شہر لائڈن میں کچھ دن رہ کر اس کے مشہور مشرقی کتاب خانے سے فائدہ اٹھاؤں۔ ستمبر ۱۹۱۹ع کے اواخر میں لائڈن پہنچا اور ۳۱۔ اکتوبر تک وہیں رہا۔ لائڈن یونی ورسٹی نہ صرف ولندیزی دانش گاہوں بلکہ تمام یورپ کی یونی ورسٹیوں میں ممتاز ہے، خاص کر مشرقی علوم کی تعلیم و تحقیق میں۔ یہاں کے اہل علم سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اُن کے الطاف و کرم کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔

انھیں میں سنسکرت اور ہندیات کے پروفیسر ڈاکٹر فلپ نوغل تھے[1] جو آثار قدیمہ کی تحقیق کے سلسلے میں کئی برس ہندوستان میں بسر کر چکے تھے۔ اکثر صحبت رہا کرتی۔ ایک دن کہنے لگے: "تمھیں ایک چیز دکھاؤں، دیکھوں تم کیا کہتے ہو"۔ یہ کہ کر ایک تصویر مجھے دی جو کسی پرانی تصویر کی عکسی نقل تھی۔ میں بلا تکلف پہچان گیا کہ کس کی شبیہ ہے، لیکن تصویر کی نوعیت نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر نوغل نے پوچھا: "یہ کس کی تصویر ہے؟" میں نے کہا: "شاہ جہان کی"۔ انھیں اس کے ماننے میں تأمل تھا اور یہ اصرار کہ یہ تو اورنگ زیب ہے۔ میں نے بعض کتابوں کا حوالہ دیا جن میں مغل بادشاہوں کے درباری مصوّروں کی بنائی ہوئی تصویروں کے بہت اچھے عکس ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب وِن سِنٹ اسمتھ کی "ہندستان اور لنکا کے فنونِ لطیفہ کی تاریخ"[2] پروفیسر صاحب کے ہاں نکل آئی۔ زیرِ بحث تصویر کا مقابلہ اُن عکسوں سے کر کے کسی قدر تفصیل سے بحث ہوتی رہی۔ آخر ڈاکٹر نوغل ہنس کر بولے: "مجھے یقین تھا کہ تم میرے ہم خیال ہو گے، مگر اب دیکھتا ہوں کہ تمھاری رائے بھی وہی ہے جو وِنسنٹ اسمتھ کی ہے اور جو دلائل اُن کے ہیں وہی تم پیش کر رہے ہو۔ میں نے انھیں ایک نقل اِس تصویر کی بھیجی تھی اور لکھا تھا کہ یہ شبیہ اورنگ زیب کی ہے۔ اُنھوں نے نہ مانا۔ میرے دل میں چور رہا اسی سے میں نے تمھاری رائے پوچھی۔"

میں نے کہا: "یہ بحث تو اپنی جگہ رہی۔ یہ بتلایئے کہ وہ اصل کہاں ہے جس کا یہ عکس ہے؟ یہ تو ایک مُنبَّت تصویر کا عکس ہے اور وہ غالباً پتھر پر کھُدی ہوئی ہے۔ میرے لیے یہ ایک نئی بات ہے کہ مغل دربار کے ہُنروَر مُنبَّت کار صورت طرازی یا مُجَسّمہ تراشی بھی کرتے تھے۔ اس ایک تصویر نے ثابت کر دیا کہ اُنھوں نے ہُنر کی اِس قسم کو بھی نہیں چھوڑا۔ ممکن ہے اِس طرح کے کام کی قدر زیادہ نہ ہوئی ہو اور اِس ڈھنگ کی دو ہی چار تصویریں بن کے رہ گئی ہوں"۔ ڈاکٹر نوغل نے اِس خیال سے اتفاق کیا اور بتایا کہ اِس کی اصل ایک مرمر کی مُنبَّت کار تختی، امشتردام (ولندیزی پایۂ تخت) کے اسٹیٹ میوزیم (سرکاری نوادر خانے) میں ہے۔ امشتردام کے نوادر خانے (عجائب گھر) کی سیر میں پانچ برس پہلے کر چکا تھا مگر یہ بقامت کہتر بقیمت بہتر تختی اُس وقت میرا

---

[1] J. Philip Vogel (جے۔ فلپ نوغل)۔ حرف J کا تلفظ یورپ کی بیشتر زبانوں میں ی کیا جاتا ہے صرف انگریزی میں ج کی، فرانسیسی میں ژ کی، ایتالوی میں ہمزہ کی سی آواز دیتا ہے۔ شمالی یورپ کی زبانوں میں V کا تلفظ ف ہوتا ہے چنانچہ ولندیزی Van "فان" اور جرمن Von "فون" ہے۔ G کی آواز ولندیزی زبان میں غ کی ہے جو بعض صورتوں میں خ ہو جاتی ہے اور یہ غ اور خ ولندیزی میں اُسی شدت سے حلق ہی سے ادا کیے جاتے ہیں جیسے عربی میں۔

[2] Vincent. A. Smith, A History of Fine Arts in India and Ceylon جو ۱۹۱۱ع میں شائع ہوئی تھی اور جس کی لوح ۱۲۴ میں برٹش میوزیم کی اُس تصویر کا عکس ہے جو مغل دربار کے ممتاز مصوّر محمد نادر سمرقندی کے قلم کی ہے۔

نظر سے نہیں گذری تھی۔

دوسرے ہی دن صبح کی ریل پر میں ایمسٹرڈام چلا گیا اور رِکزمیوزیم کی تختی کو دیکھا جو ۶ء۴ اِنچ لمبی اور ۳ء۶ اِنچ چوڑی ہے۔ یہ تو عکسی نقل ہی سے معلوم ہو گیا تھا کہ تختی میں دو جگہ بال پڑ گیا ہے۔ اب یہ بھی دیکھا کہ اس مُنبّت تصویر پر رنگ آمیزی بھی کی گئی تھی۔ رنگ اُڑ گیا ہے، اُس کا خفیف اثر اب بھی باقی ہے اور معلوم ہوتا ہے رنگ آمیز نے کئی رنگوں سے کام لیا تھا۔ یہ رنگ آمیزی دلیل ہے اِس بات کی کہ یہ تصویر کسی ہندستانی صنّاع کی بنائی ہوئی ہے۔ نوادر خانے کے کاغذات میں بھی اِسے شاہ جہاں کی شبیہ لکھا ہے۔ یہ بھی وہیں دریافت ہوا کہ نوادر خانے میں داخل ہونے سے پہلے یہ ایک درزی کے قبضے میں تھی اور یہ روایت بھی مشہور ہے کہ یہ تصویر کسی زمانے میں ولندیزی مُصوّر ریم برانٹ[1] کی ملک تھی۔ تختی کے گرد ایک پرانا، ولندیزی ساخت کا چوکھٹا لگا ہوا ہے۔ نوادر خانے کے کارپردازوں کی مہربانی سے میرے لیے اِس تصویر کا عکس کھنچوانے کا سامان ہو گیا جو اس وقت "آج کل" کے پڑھنے والوں کے سامنے ہے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ وِنسنٹ سمتھ نے اِس تصویر پر ایک چھوٹا سا مقالہ لکھا ہے جو آثارِ قدیمہ کی ولندیزی انجمن کے رسالے ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا ہے۔ پروفیسر فوغل کی عنایت سے مجھے اُس کا ایک تراشہ بھی مل گیا۔ اِس میں وِنسنٹ سمتھ نے علاوہ اپنی فنونِ لطیفہ کی تاریخ کے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، شاہ جہان کی کئی اور تصویروں کے حوالے[2] دے کر بخوبی ثابت کیا ہے کہ یہ شاہ جہان کی شبیہ ہے، اورنگ زیب کی یا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ تصویر کے بنانے والے کے بارے میں لکھا ہے کہ غالباً اُن اٹالوی ہُنروروں میں سے جو شاہ جہان کے دربار میں ملازم تھے کسی نے ایک چھوٹی قلمی تصویر کو سامنے رکھ کر یہ مُنبّت نقل تراشی ہو گی، البتہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کام کسی ہندستانی ہنرور کا ہو جس طرح بہت سے ہندستانی نقاشوں اور مُصوّروں نے یورپی طرز اور تخیل کو اختیار کر لیا تھا، کیا عجب کسی ہندستانی بُت تراش نے مُنبّت کاری میں مغربی طرز کی پیروی کی ہو۔ آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ رنگ آمیزی کا جو اثر اس پر نمایاں ہے اُس سے بھی یہی پایا جاتا ہے کہ یہ ہندستان میں بنائی گئی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ سترھویں صدی عیسوی میں ہندستان اور ایران کی مصوّری مغربی خیالات اور اسلوب سے متاثر ہوئی اور اسی زمانے سے ان ملکوں میں بعض مغربی اُصولِ فن پر عمل ہونے لگا۔ اُدھر یورپ کے لوگوں کو مشرقی ہُنر کے نمونوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ریم برانٹ کو ان چیزوں کا بہت شوق تھا اور خاص کر ہندستانی مصوّری کے نمونوں کا۔ بعض ہندستانی تصویروں کی اس نے نقلیں اُتاری ہیں اور وہ اصل تصویریں اور وہ نقلیں دونوں محفوظ ہیں[1]۔ مگر اس بات کا قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ زیرِ بحث تصویر بھی اُس کے ہاتھوں میں رہ چکی ہے، ہاں امکان اس کا ہے۔

ریم برانٹ ۱۶۰۶ء میں شہر لائڈن میں پیدا ہوا اور ۱۶۶۹ء میں مرا۔ اٹھائیس بلکہ اٹھارہ ہی برس کی عمر میں اس نے کمال حاصل کیا۔ ۱۶۲۷ء میں پہلے پہل اس کی کھینچی ہوئی تصویریں عام منظر پر آئیں۔ اور یہیں سے اُس کی شہرت کا آغاز ہوا۔ کچھ ذاتی شوق، کچھ فن کی ضرورتوں سے اس کا گھر بڑے خوشنما اور بیش قیمت ساز و سامان سے سجا ہوا تھا۔ صنّاعی اور ہنرمندی کے عالی نمونے جمع تھے اور اس کی بیش قرار آمدنی کا بہت بڑا حصہ انھیں چیزوں کی خریداری میں صرف ہوتا تھا، مگر ۱۶۴۲ء میں اس کی بیوی کی موت نے سلسلۂ کارخانہ درہم برہم کر دیا۔ اس پر بھی خریداری کی رفتار میں فرق نہیں آیا۔ وہ بہت جلد مقروض ہو گیا اور ۱۶۵۶ء میں عدالت نے اُسے دیوالیہ قرار دے دیا۔ اگلے دو برس میں دو بار کر کے اُس کا اثاثہ نیلام ہوا۔ گھر بھی قرق ہو گیا۔ اگر یہ چھوٹی سی تصویر اُس زمانے میں تھی تو بہت آسانی سے کہیں کی کہیں جا پہنچی ہو گی۔ اس سے تو یہ نکلتا ہے کہ ریم برانٹ کے پاس یہ آئی ہو گی تو ۱۶۵۶ء سے پہلے۔

اِس لحاظ سے کہ شاہ جہان فروری ۱۶۲۸ء میں تخت پر بیٹھا اسی وقت سے اس کی تصویریں (بہ حیثیت بادشاہ کے) بننے لگی ہوں گی۔ لیکن یہ تصویر اُس زمانے کی نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ اس تصویر میں اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان معلوم ہوتی ہے۔ اگر ۴۴ برس فرض کر لیے جائیں تو تصویر کے بنائے جانے کا زمانہ ۱۶۳۵ء قرار پاتا ہے۔ اور ریم برانٹ کے خلاف قرقی کے مقدمے ۱۶۵۶ سے کچھ پہلے ہی دائر ہو گئے ہوں گے۔ اس حساب سے یہ تصویر اگر اس کے پاس پہنچی تو ۱۶۳۵ اور ۱۶۵۵ء کے درمیانی زمانے میں کسی وقت پہنچی ہو گی۔ یورپ کے ملکوں کے لوگ اکبر کے وقت سے زیادہ تعداد میں آنے لگے تھے اور یہاں کی صنعت کی چیزوں کو بڑے شوق سے اپنے وطن لے جاتے تھے۔ انھیں میں اس تصویر کو شمار کرنا چاہیے۔

---

[1] Rembrandt، سترھویں صدی کا مشہور ولندیزی مُصوّر جو یورپ کے بڑے مُصوّروں میں شمار ہوتا ہے۔

[2] آرکیولوجیکل سروے (ہند) کی شائع ہوئی کتاب Loan Collection of Antiquities, Coronation Darbar 1911, XLIIB , XLIVB., XLVIIIB., سیاحت نامۂ برنیر (۱۹۱۶ء) اور اسی کتاب کی اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی اشاعت (۱۹۱۴ء)؛ وِنسنٹ سمتھ کی اوکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا (۱۹۱۹ء)۔ یہ سب شاہ جہان کی تصویریں ہیں جن کی نسبت مصنفوں کے نوٹ ہیں جو شاہی دربار سے متعلق تھے

[1] جیسے ایک اصل ہندستانی تصویر، جس میں تیمور تخت پر بیٹھا ہوا ہے، برلین کے ایک نوادر خانے میں اور ریم برانٹ کی کھینچی ہوئی اس کی نقل پیرس کے نوادر خانے لوور (Louvre) میں۔

شمشاد احمد

چھتیس گڑھ کے دیہاتی گیت

یہ کہا گیا ہے کہ ہر ملک اور قوم کا ادب اُس کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، نفسیاتی اور جنسی رجحانات اور نظریات کا آئینہ دار ہوتا ہے یہ قول لوک گیتوں پر بھی بالکل صادق آتا ہے۔

چھتیس گڑھ کے دیہاتی گیت مدھیہ پردیش کے جنوبی مشرقی علاقے کی غریب اور پچھڑی ہوئی جنتا کے جذبات، احساسات اور ذہنی کیفیات کی بہت خوبی سے عکاسی کرتے ہیں۔ تین درجن قلعوں کی سرزمین جو رائے پور، بلاس پور، دُرگ اور بالاگھاٹ کے اضلاع اور اُن کے قرب و جوار کے علاقوں پر مشتمل ہے مختلف ذاتوں اور قبائل کے لوگوں سے آباد ہے جن میں سے راوت، تیلی، ست نامی، گونڈ، بنجھواڑ، دھنواڑ اور کورواقابل الذکر ہیں۔ ان لوگوں کا رہن سہن، طرزِ معاشرت اور اُن کے رسم و رواج کسی حد تک غیر معمولی لیکن قدیم اور دلچسپ تہذیب کا نمونہ ہیں اور اُن کے گیت اُن کے پچھڑے ہوئے تمدن، اُن کے تخیلات، اُن کے غم و نشاط اور اُن کی اُلجھنوں کا ایک دل کش لیکن اصلیت سے مطابقت رکھنے والا خاکہ پیش کرتے ہیں۔

یوں تو شادی، بیاہ، تیوہار، ولادت اور دوسرے خاص موقعوں کے لئے خاص اور موزوں گانے ہیں لیکن چھتیس گڑھی دادریا بے حد مقبول عوام گیت ہے جس کو ہر شخص ہر موقع پر گا سکتا ہے۔ راوتوں کے بعض گانے مثلاً ڈنڈا گیت اور بانس گیت اُن کی ذات کے لئے مخصوص ہیں، اسی طرح سے کچھ اور گیت صرف ناچ کے ساتھ ہی گائے جاتے ہیں لیکن دادریا کے ساتھ اس قسم کی کوئی بندش نہیں ہے۔ کھیتوں میں ہل چلانے والے جوانمرد چولہے کے پاس کام کرتی ہوئی سہاگنیں، سر پر بوجھ لادے ہوئے دوشیزائیں، سب اس کو الاپتے ہوئے سُنے جا سکتے ہیں۔ دادریا کی ہر دل عزیزی کا سبب ان جذبات کی عالمگیر اثر انگیزی اور تاثرات کی شدّت ہے جو اس کے بول بن کر لوگوں کے ہونٹوں پر مچلنے لگتے ہیں۔

دیہاتی شاعری میں ہر جگہ برہا کے گیتوں کو ایک ممتاز جگہ حاصل ہے ہجر کی ناقابل برداشت تلخیاں اور برہن کے دل کی آگ جس طرح ان گیتوں میں بیان کی گئی ہیں وہ شاید اپنی مثال آپ ہے۔ افلاس کی تکالیف اور زندگی کی ناکامیاں ان دیہاتی مرد اور عورتوں کے لبوں سے نغمہ بن کر پھوٹ نکلتی ہیں۔ ان گیتوں میں بعض جگہ عمدہ، پُر خلوص نفسیاتی تجزیہ اور باریک مشاہدہ پایا جاتا ہے جو کہیں کہیں بڑے موزوں اور چبھتے ہوئے استعارے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ حالانکہ زیادہ تر گیت افسردگی اور مایوسی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن ایسے بھی گانے ہیں جن سے زندگی کی مسرتیں چھلکی پڑتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چھتیس گڑھ کے لوگ اس بات سے خوب واقف ہیں کہ رنج و خوشی، غم و نشاط، آنسو اور قہقہے سے ہی جیون کا تار پود بنا ہے۔

چند گیتوں کے ترجمے ملاحظہ فرمائیے:—

زندگی

دُنیا میں جب جنم لیا ہے

ہنستے گاتے یہ دن گذاریں
یہ دلچسپ زندگانی
اُف! کتنی مختصر ہے
کوئی مفر نہ ہوگا
جب موت سر پہ ہوگی

دلِ مضطر

کیا میں بالم سے مل سکوں گی؟
کون جانے
سولہ سنگار کرکے
بالوں کو سجا کے
اپنے حسن پر نازاں ہوں
پر بھگوان ہی جانے
کہ میں اپنے بالم سے مل سکوں گی

شباب

چراغ بتی کا محتاج
اور بتی تیل کی۔
نیند بنا یہ نیناں تڑپیں
اور پریم بنا جوانی!

تیز قدم

سورج کے ڈوبنے میں
ابھی ایک گھڑی باقی ہے
مجھے اور تیز قدم رکھتا ہوا
میرا ساجن گھر کی طرف آرہا ہے!

دوستی

سخت لکڑی کی طرح
آسانی سے نہ ٹوٹنے والی
ہماری پرانی دوستی۔
موت بھی ہمیں جدا نہ کرسکے گی۔

خوش قسمت آدمی

✓ کھیتیاں پکی ہوئی تیار ہیں
ہر شام کو ڈھولک بجتی ہے
گاؤں خوشی سے سرشار ہے
کس قدر خوش قسمت ہے وہ آدمی
جس کی حسین اور جوان بیوی
✓ بھرپور شباب میں ہو!

دردِ فراق

اے سکھی! میرا بالم دور دیس میں ہے
نہ وہ مجھے سندیسہ بھیجتا ہے
نہ چٹھی لکھتا ہے۔
میں کس کے لئے بال سنواروں
کس کے لئے مہندی لگاؤں
اے سکھی! مجھے اپنی سسرال کیوں کر بھائے
جب میرا بالم دور دیس میں ہے

اشکِ باراں

برکھا کے دنوں میں
چاروں طرف ہریالی چھا جاتی ہے
او نادان!
آنسوؤں سے سینچنے کے بعد ہی
محبت بارور ہوتی ہے!

تیرے انتظار میں

او پردیسی، او دُور مرخول کے رہنے والے
میرے دل پر
تو نے ایسا نین بان چلایا
تیرے انتظار میں
میرا انگ انگ تڑپ رہا ہے
اپنی عزت اور آبرو
میں نے تیرے قدموں پر رکھ دی
لیکن تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا
میرے راجہ! تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔
صرف تیری ایک جھلک کے لئے

میرا روم روم بے قرار ہے
میں سرکار کو جرمانہ دوں گی
اور پنچایت کو دنڈ میں دعوت
لیکن ساجن میں تیرا دامن کبھی نہ چھوڑوں گی
او پردیسی، او ڈومرغول کے رہنے والے
تیرے انتظار میں
میرا انگ انگ تڑپ رہا ہے

شمع سوزاں

جیسے چونگی[1] تھوڑی تھوڑی کرکے جلتی ہے
میرے محبوب! تیری یاد میں
میں رفتہ رفتہ گھل رہی ہوں۔

انگریزی راج

پیپل کے پتوں کی طرح
پیہم مضطرب
انگریزی راج میں
ہر شخص بے چین ہے!

مجھے پاگل بنا دیں گے

شیروں کی گرج
ہرنوں کی چھلانگ
میری محبوبہ کا بھرپور شباب
مجھے پاگل بنا دیں گے اے دوست!

ماہیٔ بے آب

تجھ سے دور اے بالم
کھانے میں کوئی لذّت نہیں
اُف! مجھے معلوم نہ تھا
کہ ہجراں نصیب پر ایسی گزرتی ہے
میں دھان کے اُس پودے کی طرح ہوں
جسے پانی نہ ملا ہو،
میں وہ کمزور پتا ہوں
جو درخت سے گر پڑا ہو۔

سنسان

بغیر درخت کا صحن
بغیر کتّے کا گاؤں
اور برہن کا دل
— سب سنسان ہیں

بھوک

اپنا اچھا دادریا
اپنا پیارا ناچ
اس بھوک میں سب کچھ بھول گئے۔
افلاس سے جیون اجیرن ہوا
اور چڑھتی جوانی ہی میں
رومان بھلا بیٹھے!

انمول جیون

یہ شکستہ چونگی
بس ایک ہی دفعہ پی جا سکے گی۔
ہمارا انمول جیون
اور اُس کی گراں بہا مسرتیں
پھر لوٹ کے نہ آئیں گی

چھتیس گڑھ کے دیہاتی گیت وہاں کے عوام کے دل کی دھڑکنیں ہیں اور وہاں کی زندگی کے عمدہ ترجمان۔ وہ "پرانی[1] المیہ بیتی ہوئی باتیں" بھی کو تقریباً سو برس قبل انگلستان کے ایک رومانی شاعر نے دہقانی دوشیزہ کو گاتے ہوئے سُنا تھا۔ چھتیس گڑھ کے میدانوں میں وہاں کی بھولی بھالی غریب اور نادان کنیائیں آج بھی گنگناتی ہوئی نظر آئیں گی۔

۱؎ نرم اور نشیلی پتیوں سے بنا ہوا ایک قسم کا دیہاتی سگار۔

۱؎ of old unhappy far off things and battles long ago

ورڈسورتھ اپنی نظم The Solitary Reaper میں

كرتار سنگھ دُگل

شاہی

جیسے کسی زمین پہ تازہ ہل چلا دیا گیا ہو شاہی کا چہرہ بالکل اسی طرح باقاعدہ جھرّیوں سے بھرا ہوا تھا۔ گوری گوری کھال، زرد زرد جھرّیاں، اُن میں بل، میل اور مٹی۔ شاہی کے بال کہیں بالشت بھر اور کہیں مٹھی بھر بھڑ بُون[1] کی طرح بکھرے رہتے۔ اُن میں سے آدھے بال سپید ہو گئے تھے اور آدھے ابھی کالے ہی تھے۔ دیہاتی عورتوں کی آنکھوں کو دُور ہی سے اُن بالوں میں جوئیں بھری دکھائی دیتیں۔ جوئیں چل کر کبھی کبھی اُس کی گردن تک آ جاتی تھیں اور اس سے پہلے کہ کوئی شاہی کو بتلائے "یہ جوں۔" وہ جوں سے نصیب جلی شاہی! جوں پھسلتی ہوئی اُس کے کپڑوں میں گم ہو جاتی۔ شاہی کی آنکھیں اُداس اُداس سی تھیں۔ ہر وقت اُن میں سے پانی رِستا رہتا تھا۔ اُس کے تھکے ماندہ ابرو گرے ہوئے پرندوں کی طرح اُس کی پلکوں پر ڈھلک آئے تھے۔ شاہی کی گردن اور ہاتھوں پہ میل کی موٹی تہ تھی۔ اُس کے ناخن آپ ہی آپ بڑھتے، آپ ہی آپ مُڑتے، آپ ہی آپ ٹوٹتے اور آپ ہی آپ گھس جاتے۔ اُس نے اُنہیں کبھی کترا یا نہیں تھا۔ اُس کے ہاتھوں کی رگیں ایک ایک کر کے صاف دکھائی دیتی تھیں۔ شاہی کے پیروں پر تو جیسے کسی نے میل کا لیپ کر دیا تھا۔ اُس کی ایڑیاں ننگے پیر چلتے چلتے جیسے پچک سی گئی تھیں۔ اُس کے پیروں کی اُنگلیاں عجیب بے ڈھنگے پن سے اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی تھیں۔ گرمیاں ہوں کہ سردیاں شاہی نے پیر میں کبھی کچھ نہیں پہنا تھا۔

شاہی کے چیتھڑوں میں سے جب کبھی اُس کا ننگا پن جھلکتا تھا تو اُس کی سوکھی ہوئی اور تھیلیوں کی طرح لٹکتی ہوئی چھاتیاں، تیلیوں کی طرح پتلی ٹانگیں دیکھ کر کئی عورتوں کو اپنی آبرو کا خیال کپکپا سا دیتا اور وہ ترس کھا کر کوئی پُرانی اُتری ہوئی قمیض یا شلوار اُس کو دے دیتی تھیں۔ شاہی اِن کپڑوں کو اکٹھا کر کے لے جاتی۔ لیکن پھر دو چار دن کے بعد جب گلی میں سے گزرتی اُس کے کپڑوں کی حالت بدستور وہی ہوتی۔

اُس کی اِس عادت کو دیکھتے ہوئے کئی عورتیں اُس کو سامنے کپڑے بدلوا دیتیں۔ لیکن جب پھر کبھی اُس سے ملتیں تو اُس کے تن پر وہی چیتھڑے ہوتے۔ جس میں سے اُس کا نسائی جسم جھانک رہا ہوتا تھا۔

شاہی کسی کے گھر بیٹھ کر روٹی نہ کھاتی جب کبھی اُسے کھانے کے لئے کچھ ملتا وہ اُسے پلّو میں باندھ کر چل دیتی اور اِس طرح سارا دن چیزوں کو اکٹھا کرتی اور شام کو تھیلا اُٹھائے اپنی ڈھوک کی طرف چلی جاتی۔

"اے شاہی ناس پیٹی! ان بالوں کو کبھی دھو تو لیا کر۔" کبھی کبھی کوئی عورت اُسے جھڑک دیتی۔

شاہی آگے سے ناک سکوڑ کر کہتی "یہ کا کہتی ہو چودھرانی۔ اس پیٹ کے لئے تو کچھ ملتا نہیں، . . ." اور باقی جملہ اپنے گِنے چُنے آٹھ دس دانتوں اور جبڑے کے خلا میں گنگنا کر چھوڑ دیتی۔

اپنی ڈھوک میں شاہی کی کسی کے ساتھ بنتی نہیں تھی۔ کسی کے ساتھ اس کا لین دین نہیں تھا۔ اُس نے اپنے دُور کے رشتہ داروں کو آج کئی سال ہونے کو آئے منہ نہیں لگایا تھا۔ اُسے شکایت تھی کہ اُن کے کُتے اُس پر بھونکتے تھے: "اُن کے دل میں اگر میرے لئے چاہ ہو تو اُن کے کُتے اور کتوریوں کی مجال ہے کہ میری طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھ پائیں۔" وہ شکایت کیا کرتی تھی۔

گاؤں کی کئی بوڑھی عورتوں نے شاہی کی جوانی دیکھی تھی۔ ہر علاقے میں خوبصورت لڑکی کبھی کبھی پیدا ہُوا کرتی ہے۔ اور لوگوں کی نظروں میں شاہی کی سی حسین لڑکی ابھی تک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے عشق

---

[1] ایک خاص قسم کی گھاس

میں قتل و خون ہوئے۔ اس کے ماں باپ نے اُس کا بیاہ زبردستی ایک پچھیڑے سے کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں۔ اُس نے اپنے خاوند کو چار دن کے اندر اندر جادو سے بھسم کر دیا۔ وہ اُس کے پاس ایک دن کے لئے بھی نہ رہی۔ غریب ماں باپ جن کی یہ اکلوتی لڑکی تھی کُڑھتے اور جلتے ہوئے مر گئے۔ شاہی نے اپنے دل کی بات کسی سے نہیں کہی۔ نہ اُس کا بھید کوئی پا سکا۔ اُس نے بڑے بڑے امیروں کے مُنہ پر تھوکا تک نہیں۔ بڑے بڑے ساہوکاروں کی داڑھیاں اُس نے نوچیں۔ اور اس طرح اپنی جوانی اور اپنی خوبصورتی پر اُٹھی ہوئی للچائی للچائی نظروں سے وہ لڑتی جنگ کرتی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ کپڑوں پہ کپڑے پہنتی اور جو کوئی اُس کے نزدیک آتا اسے پتھر اُٹھا اُٹھا کر مارتی۔ آخر لوگ اُسے پکڑ کر پاگل خانے میں لے گئے۔

اور اس پاگل خانے میں وہ بوڑھی ہو گئی۔

جب وہ اچھی ہو کر واپس آئی تو اس کی جوانی بیت چکی تھی۔ لوگ اُسے بھول چکے تھے۔ ایک شام کو شاہی نے اپنے "ڈھارے"[1] کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنے رشتے داروں کے ڈھور ڈنگر نکال باہر کر دئے۔ پاگل خانے کی تیس سال کی نظربندی نے شاہی کو ایک وحشی شیرنی کے عوض ایک مسکین بڑھیا بنا دیا تھا۔ لیکن رشتے داروں کے لئے اُس کے دل میں نفرت ویسی کی ویسی ہی رہی۔

پھیپھڑوں کی آٹھ دس گھروں پر مشتمل ڈھوک میں شاہی کا کسی کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں تھا۔ سارا دن بستی کے پار وہ گاؤں میں گذارتی اور رات کو اپنی جھونپڑی میں پڑ رہتی۔ ہر چند وہ ایک کھوسٹ بڑھیا تھی لیکن وہ مانگنے اور ہاتھ پھیلانے پر ہی صبر نہ کرتی۔ کسی گھروالی کو وہ چولھا بنانے کے لئے چکنی مٹی لا دیتی۔ کسی کے کپڑے دھلواتی۔ کسی کے دالان میں جھاڑو دے دیتی اور جوان جوان لڑکیوں کو باہر سے چوری چھپے کئی چیزیں مہیا کر دیتی۔ کسی کے گھر کوئی بچہ ہوتا تو اس کا میل اُٹھانے میں دو چار دن مصروف رہتی۔ اور اس طرح پیسہ پیسہ کر کے کچھ نہ کچھ کما لیتی تھی۔

جب صبح سویرے ڈھوک سے آ رہی ہوتی اور ساگ کی بہار ہوتی تو کھیت میں سے توڑ لیتی۔ سرسوں کے ساگ کے دنوں میں وہ گٹھڑیوں کی گٹھڑیاں لا کے بیچتی۔ اور ایک ایک گھر سے کتنے کتنے پیسے بٹور لیتی۔ کمتروں کی بیویاں لڑ جھگڑ کر اُوپر کی چٹکیاں ہتھیا ہتھیا کے اسے لوٹنے کی کوشش کرتیں لیکن یہ کسی کے ہتھے نہ چڑھتی۔ شاہی کے حربے بڑے کارگر ثابت ہوتے۔ جب کوئی عورت اُسے بہت ستاتی تو وہ اُلٹا کر اپنے آپ کو گالیاں دینے لگتی "کیوں کسی بے ماں باپ کی یتیم عورت کو ستاتی ہے اے چودھرانی! کیوں غریب آزاری کرتی ہے۔ ہائے مجھ نصیبوں جلی کا سُننے والا کوئی نہیں"

کئی جوان لڑکیاں شاہی کو محض ہنسی ٹھٹھول کے لئے تنگ کرتیں۔ "اور جو عورت اُس سے ساگ مول لے لیتی تھی۔ اُس سے کہتی تھیں کیوں جنم بھرشٹ کر رہی ہے۔ یہ ساگ تو شاہی صبح سویرے اس کھیت میں سے توڑ رہی تھی۔ جہاں بنیوں کا سارا محلہ رفع حاجت کے لئے جاتا ہے"

شاہی اتنا سُنتے ہی چراغ پا ہو جاتی۔ من من بھر کے کوسنے دیتی۔ سُوئر اور گدھے کی ہڈیاں ان کے مُنہ میں دیتی۔ دوہتڑ مار مار کر پیٹنے لگتی۔ بال نوچ ڈالتی۔ ساگ کا پتہ پتہ گلی میں بکھیر دیتی۔ اور ساگ کے پیسے اُن لڑکیوں سے پورے کر کے دم لیتی۔

اور دوسرے دن بدستور مسکین صورت بنائے بھولی اور بلبلاتی اس حویلی میں پھر آ مرتی۔

اور سب کو اس پر ترس آ جاتا۔

بہت مدت تک لوگوں کو شک رہا کہ شاہی چوٹی ہے۔ چور ہے جس ڈیوڑھی میں سے یہ گذر جاتی تو کبھی کوئی کچھ نہ ملتا۔ کبھی کوئی کٹوری نہ ملتی کبھی کسی بچے کا کوئی کپڑا روپوش ہو جاتا۔ لیکن اس کے افلاس کو دیکھ کر کسی کو اعتبار نہ آتا کہ وہ اتنی جرأت بھی کر سکتی ہے۔ ایک دفعہ اُسے کسی نے اپنے ساگ والے جھولے میں ایک کٹوری چھپاتے ہوئے پکڑ لیا۔ ایک اور محلے میں ایک چاقو اور بچے کا ایک کھلونا اُس کے نیفے میں تھا جب وہ اُٹھنے لگی نیچے گر پڑا۔ گاؤں کی عورتیں دو چار دن اُسے صلواتیں سُنا لیتیں اور پھر شاہی اُن کی زندگی میں ذر۔

---

[1] ایک ذات کا نام۔

[illegible] دہلی

ستمبر ۱۹۵۰ء

طرح گھل مل جاتی۔ جیسے اُس کے بغیر اُن کا گزارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر شاہی بھک منگی نہ ہوتی تو وہ اپنے پُرانے اُترے ہوئے کپڑے کس کو دے کر ہنچ آتما کو کچھ سکون کرتیں؟ عاقبت کیسے سنوارتیں؟ شاہی چاہے چور تھی لیکن اُس کے بغیر شریف زادیوں کے سندیسے کون میل کے پیچھے انتظار کرتے ہوئے کانوں تک پہنچاتا۔

ایک شام کو میں دُھندلکے میں ذرا تاخیر سے سیر کے بعد گھر پلٹ رہا تھا کہ گاؤں کے باہر تھوریوں[1] کے پڑاؤ پر گدھوں کے جمگھٹ سے ذرا پرے شاہی کے جھگڑنے کی آواز آ رہی تھی۔ روٹیوں کے ڈھیر کی وُہ اُسے دوّنی دے رہے تھے اور وہ تین آنے مانگ رہی تھی۔

تھوری کہتے "آخر دس پر چار روٹیاں ہی تو ہیں۔ شاہی! کیا دوّنی تجھے تھوڑی نظر آتی ہے؟"

شاہی آگے سے رونی سی صورت بنا کر اُونچی آواز میں بول رہی تھی۔ "ہائے چودھری کچھ تو انصاف کر۔ چھ کم بیس روٹیاں ہیں۔ کیا ان کی قیمت تین آنے بھی نہیں ہو سکتی؟"

جب یہ سَودا ختم ہُوا تو شاہی نے بغل میں چھپائی ہوئی ایک شلوار نکالی "اِس کا کیا دو گے؟" وہ مظلومانہ آواز میں بولی جیسے پہلے سودے میں وُہ لُٹ چکی ہو۔

میں یہ کہ کہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا گھر چلا آیا۔ میں نے شاہی کی اس تجارت کا ذکر کبھی سے نہیں کیا۔

مجھے یُوں معلوم ہونے لگا کہ شاہی اپنے علاقے کی سب سے دولتمند عورت ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ پیسے جمع کرنے کی اُسے لت سی ہے۔ تمام رات وہ پیسوں کو گنتی اور سنبھالتی رہتی ہوگی۔ شاید اُس کی خواہش ہوگی کہ کبھی نوٹوں کے پلندوں کی سیج پر سو جائے یا اُس کی قبر میں نیچے اُوپر پیسے ڈالے جائیں۔ پیسوں کی چھناچھن میں اُسے کوئی سنگیت سا سُنائی دیتا ہوگا۔ اور وہ اپنی کڑی محنت بھول جاتی ہوگی۔ نقدی کی چمک میں اُسے کوئی حُسن دکھائی دیتا ہوگا۔ پیسوں کا احساس اُس کے لئے گرمی کا باعث ہوگا۔ اور اس طرح میرا قیاس کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔

اگلے روز شاہی اُسی طرح بال بکھیرے بیریوں کی ایک گٹھڑی چیتھڑوں میں کرکراتی ہمارے دالان میں آ گئی "لالہ چودھرانی یہ اُس کھیرے[2] بیری کے بیر تمہارے بیٹے کو بہت پسند ہیں۔" اپنے پلّو کی گرہ سے کھول کر اُس نے بیر میری ماں کی جھولی میں ڈال دیئے۔ اُسے پتہ نہیں تھا کہ میں پیچھے کرسی پر بیٹھا ہُوا پڑھ رہا تھا۔ میری ماں کے بتانے پر اُس نے نزدیک آ کر مجھے پہچانا "اے بیٹا۔ بولتا کیوں نہیں؟ شاید بہت پڑھ گیا ہے اِس لئے۔" اُس نے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ شاہی کو کسی نے بتا دیا تھا کہ میں وہ تعلیم حاصل کر رہا تھا جو آج تک اس گاؤں میں کسی نے حاصل نہیں کی تھی۔ وہ کچھ چاپلوسی اس لئے بھی کرتی کہ مجھ لاڈلے بیٹے کی ماں خوش ہو کر اُسے نہ جانے کیا کیا کچھ دیدیا کرتی تھی۔

جب وُہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی تو مجھے موقعہ مِل گیا کہ شاہی سے بات چیت کرنے کے بعد میں اپنے قیاس کی پڑتال کر سکوں۔ میں نے بات چیت کا آغاز کرنے کے لئے اُس سے پُوچھا "اے شاہی تجھے نہائے ہُوئے کتنے سال ہو چکے ہیں؟ یہ قمیض جو تو پہنے ہوئے ہے تجھے کس نے دی تھی؟ ان پھٹے کپڑوں میں تجھے سردی نہیں لگتی؟ رات کو تو چارپائی پر سوتی ہے کہ زمین پر؟ اپنے گھر میں تو تیل کا دیا جلاتی ہے کہ مٹی کے تیل کا لمپ؟"

اور اس طرح چھوٹے چھوٹے سوالات کرتا میں ایسی بلندی پر پہنچ گیا کہ پُورے بھروسے کے ساتھ آگے ہو کر دبی زبان میں اُس سے میں نے پُوچھا "اے شاہی میں نے آج صبح خواب دیکھا کہ تُو نے پیسوں کا ڈول دبا رکھا ہے؟"

شاہی حیرت سے گُم صُم رہ گئی۔ اُس کا رنگ اُڑ گیا۔ اُس کی آنکھیں پھٹ کر باہر آ گئیں۔ میں نے اپنے اندازِ گفتگو کو برقرار رکھتے ہوئے کہا "صبح کا خواب کبھی جھوٹا نہیں ہوتا شاہی۔ چاہے تو مان یا نہ مان!"

میری ماں مجھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے دیکھ کر دیر سے اُٹھ کر چلی گئی تھی۔ شاہی! چھپاتی کیوں ہے؟ دو نہیں چار نہیں۔ میں نے جو یہ سوُنڈ

---

[1] بوجھ ڈھونے والے۔

[2] جن کے بیر ذرا کھٹے ہوں۔

جانتیں پڑھی ہیں۔ اُس سے میں لوگوں کے دلوں کی بات جان لیتا ہوں۔"

میں نے شاہی کو اپنے جال میں جکڑا ہوا دیکھ کر اپنی بات پر اور رنگ چڑھایا۔ شاہی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا جواب دے وہ۔ بالکل بے بس ہو گئی۔ پوری طرح بے بس۔ وہ اچانک اس بات پر پھنس گئی تھی کہ صبح کا خواب کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔

شاہی کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہنے لگے۔ اور وہ میرے قدموں پر گر گئی "چودھری! میری رسوائی نہ کرنا چودھری۔ میرے سفید بالوں کو دیکھ" وہ روتی رہی، روتی رہی۔

آخر میرے تسلی دینے پر اُس نے مجھے بتایا "جب وہ جوان تھی اُس کی محبت مادو کمہار سے ہو گئی تھی۔ لیکن مادو کمین ذات پیچھروں سے ڈرتا ہوا اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ پھر مادو نے کاشاں سے نکاح کر لیا اور شاہی اسی امید کی چوٹ سے پاگل ہو گئی۔ جب وہ تیس سال کی نظربندی کے بعد باہر آئی۔ تو اُسے پتہ چلا کہ مادو کی بیوی کاشاں مر چکی ہے۔ اُس کے بعد مادو نے کتنے ہی اور بیاہ کئے لیکن اُس کی کوئی بیوی نہ بچی۔ شاہی نظربندی کے بعد آتے ہی سیدھی مادو کے گھر گئی۔ مادو لنظروں کا کمزور چڑچڑا بوڑھا چارپائی پر پڑا تھا۔ شاہی نے اُس سے کہا "ہمارا عشق ازلی ہے۔ میں نے پہلی نظر میں تجھے اپنا جیون ساتھی منتخب کر لیا تھا۔ اگر میں کسی کے انگ کے ساتھ لگی ہوں تو وہ تو ہی تھا مادو! تُو نے میری جوانی کو برباد کر دیا ہے۔ اب یہ بڑھاپا خراب نہ کر۔ ایک ہی تمنا دل میں ہے کہ میری قبر تیری قبر کے ساتھ بنے" اور مادو نے اُکتا کر کہا تھا "اے سُسری! مجھے اب کھانے کے لئے بٹھا چھوڑ لگی بیویوں سے جو بڑا آرام پایا ہے" اور شاہی نے بار بار اُس کی منت سماجت کی تو اُس نے کہا:

"جا اپنے رشتے داروں سے کہہ کر کہ اُن کے پاس پچیس کا پیپہ ہے۔ میں نکاح کر لوں گا۔ تب مجھے کوئی اعتراض نہیں"۔

اُس دن کو آج پورے دو سال ہو چکے تھے۔ شاہی نے محنت کر کے چرخا کے چھین کے ایک سو پندرہ روپے جمع کر لئے تھے اور اب جو میں اُسے باقی رقم دے دوں تو شاہی کے جیون کی تنہا مراد پوری ہو سکتی تھی۔

شاہی کو باقی روپے دے کر میں اُس کا ہمراز بن گیا۔

اُس رات کو گھر جا کر شاہی نے ریشم کا ایک رکھا ہوا جوڑا نکال کر پہنا۔ اپنے بے طرح بڑھے ہوئے پیروں میں جوتی پہن لی۔ اور چکی کے پیچھے سے دبا ہوا ڈول نکال کر مادو کے گھر کی طرف چل دی۔ تن تنہا مادو کے گھر۔

گزارش

بعض مقالہ نگار حضرات "آجکل" کو مضمون بھیجنے کے فوراً بعد وہی مضمون کسی اور رسالے کو بھیج دیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر وہ مضمون "آجکل" کے ساتھ ہی ایک اور رسالے میں یا "آجکل" میں شائع ہونے سے پہلے ہی کہیں اور چھپ جاتا ہے۔ ہمارے پاس قبول شدہ مضامین کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ نئے مضامین کے چھپنے کی باری جلد نہیں آسکتی۔ لہٰذا جب تک ادارے کی طرف سے مضمون کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے متعلق کوئی چٹھی موصول نہ ہو جائے وہ مضمون کسی اور رسالے کو نہ بھیجا جائے۔

اس قباحت کو ختم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب تک ادارہ "آجکل" کی طرف سے مضمون کی درخواست نہ کی جائے مقالہ نگار حضرات مضمون بھیجنے کی زحمت نہ فرمائیں۔

بعض مدیران کرام حوالہ دیئے بغیر "آجکل" کے مضامین اپنے جریدے میں نقل کر لیتے ہیں اُن سے درخواست ہے کہ وہ "آجکل" کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ حوالہ دینے سے مضمون نقل کرنے والے اخبار یا رسالے کا وقار کم نہیں بلکہ زیادہ ہوتا ہے۔

جو حضرات اپنے مضامین واپس منگوانا چاہیں وہ اس مقصد کے لئے ٹکٹ بھیجیں ورنہ ادارہ مضمون واپس بھیجنے کے لئے پابند نہیں ہوگا۔

ادارہ

ل۔ احمد اکبر آبادی

ہماری کہاوتیں

کہاوت یا مثل اصل میں زندگی کے کسی پہلو سے متعلق بے شمار انسانوں کے صدیوں کے تجربے کا نچوڑ یا دوسرے لفظوں میں انسانی عقل اور تجربے کا جوہر ہے۔ لغت کی کتابوں میں مثل یا کہاوت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے

"کم سے کم لفظوں اور دل میں بیٹھ جانے والے انداز میں کہی ہوئی معنی خیز، پرمغز اور سبق آموز بات جو مسلسل طور پر عام زبانوں پر جاری ہو۔ یا ایک چھوٹا سا فقرہ یا جملہ جو عام طور پر مشاہدے یا تجربے میں آئی ہوئی بات کی ایسی حقیقت و صداقت کو استعارے میں بتاتا ہو، جو عام لوگوں کے علم میں ہو، مختصراً ایک حکیمانہ قول کو مثل یا کہاوت کہا جائے گا۔"

عرفی نے ضرب المثل کے اثر کو تلوار کی کاٹ سے زیادہ اثردار کہا ہے:۔

"در مقالے کہ کند شرے کنایہ بہ عدو ضرب شمشیر نہ دارد اثر ضرب المثل"

بعض نے کہاوت کو "عوام کا فلسفہ" بھی کہا ہے۔ مگر یہ تعریف نہ تو جامع ہے اور نہ پوری طرح صحیح۔ کہاوت کے تھوڑے سے شبدوں میں جو بظاہر معمولی ہوتی ہے۔ مثل کے مختصر لفظوں میں جو حکمت بند ہوتی ہے۔ عام طور پر وہ انسانی زندگی کی کسی نہ کسی حقیقت کا بیان ہوتی ہے۔ عام اور خاص، تمام لوگوں کی زندگی کی صداقت کا بیان! انسانی نسلیں جب ایک بات کا ایک ہی نتیجہ نکلتا دیکھتی رہتی ہیں۔ تو کبھی وقت کسی ایک آدمی کے منہ سے چند ایسے ڈھلے ڈھلائے لفظ نکل جاتے ہیں جو پورے سماج میں مقبول ہو کر زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں۔

کہاوت کی صورت یا تو تجربہ و عقل کی بنا پر ایک بیان واقعہ کی شکل میں ہوگی۔ یا پھر اس میں کسی ایسی بات کی طرف استعارہ ہوگا جو کہاوت کے لفظوں میں تو ظاہر ہوتا ہو مگر اس کا مجازی مفہوم سمجھ میں فوراً آجائے۔ یا پھر اس کے اندر آدمی کے چال چلن اور طور طریق پر طنز یا کوئی مفید مشورہ ہوگا

لغت کی کتابوں میں کہاوت کی تعریف و تصریح کے باوجود یہ فرق دشوار بات ہے۔ کہ کس جملے یا فقرے کو کہاوت مانا جائے اور کس کو نہیں۔ اس لئے کہ ہماری زبان میں ایسے جملے بہت ہیں جو ضرب المثل کا کام دیتے ہیں لیکن لغت کی کتابیں ان کو مثل کی تعریف میں نہیں رکھتیں۔ بلکہ انہیں کنایہ کہتی ہیں کنایہ محاورے سے بھی الگ مانا جاتا ہے۔ مگر شاید ایسی حد بندی کر دینا کچھ مفید بھی نہ ہو

کسی ضرب المثل کا وجود میں آنا کسی کہاوت کا بن جانا دو ذریعوں سے ہوتا ہے۔ ایک عوام کے ذریعے سے اور دوسرے پڑھے لکھے طبقے کے ذریعے سے عوام جن کہاوتوں کو بناتے ہیں۔ وہ سوچ بچار کا نتیجہ نہیں ہوتیں بلکہ اضطراری طور پر وجود میں آتی ہیں۔ اور ان میں وہ تمام عقل کی بات بیان ہوتی ہے۔ جس کا انسان کو بار بار تجربہ ہو چکا ہے۔ عوام کے پاس غور و فکر کے لئے نہ تو وقت ہوتا ہے۔ اور نہ انہیں عقل و خرد کی روشنی ملتی ہے کہ وہ زندگی کی کٹھنائیوں اور انسانی بپتاؤں کی حقیقت پر غور کر کے نتیجے نکال سکیں۔ عوام کی بنائی ہوئی کہاوتیں عام زبانوں پر چڑھ کر نسلوں میں منتقل ہوتی اور اہل قلم کی کتابوں میں جگہ پا کر مستند بنتی ہیں۔ اور علماء و حکماء کے ذریعے سے جو مثلیں وجود میں آتی ہیں وہ زندگی کے مسئلوں پر فکر و تامل کا نتیجہ ہوتی اور پہلے ان کی تحریر و تصانیف میں جگہ پاتی۔ پھر عوام میں مقبول ہو کر زبان زد ہو جاتی ہیں۔ یعنے پہلی صورت میں زبان زد عام ہو کر کتابوں میں جگہ پاتی ہیں اور دوسری صورت میں کتابوں میں سے عوام تک پہنچتی ہیں۔ عوام و خواص میں کہاوتوں کا یہ لین دین بالکل مساویانہ شکل میں ہوتا ہے۔ عام بول چال میں آنے والی کہاوتوں کو پڑھے لکھے قبول کر لیتے ہیں۔ اور کتابوں میں لکھے ہوئے ذہانت آمیز اقوال عوام میں پہنچ کر روزمرہ بن جاتے ہیں۔ جو بات دونوں قسم کی کہاوتوں میں مشترک ہے وہ آہستہ آہستہ قبول عام حاصل ہوتا ہے۔

کہاوت کے لئے اس کا قومی چلن لازمی ہے۔ لیکن خاص پیشوں اور خاص حلقوں میں جو کہاوتیں بن جاتی ہیں، وہ قومی کہاوتیں نہیں کہی جائیں گی۔

دُنیا کی کوئی زبان یا بولی ایسی نہیں جس میں کہاوتیں نہ ہوں۔ اور مختلف قوموں کی کہاوتیں اپنے موضوع اور بناوٹ کے اعتبار سے اتنی ہی مختلف ہوسکتی ہیں جتنا اختلاف ان قوموں کے اندر ہو۔ لیکن اس قومی و وطنی اختلاف کے باوجود زندگی کی حقیقتیں انسان میں مشترک ہیں۔ ان کے متعلق مزاج و رسوم کے اختلاف کے فرق کے علاوہ ہر زبان میں ملتی ہیں بعض صورتوں میں تو لفظوں کی ترکیب بھی ایک سی ہوتی ہے۔ یعنی ان میں فرق کے ساتھ مماثلت اور مماثلت کے باوجود فرق ہوتا ہے۔

کہاوت جتنے کم لفظوں میں بیان ہوگی وہ اتنی ہی زیادہ مقبول اور اتنی ہی زیادہ با اثر ہوگی۔ مثلاً

"کاریگر سے کام پیارا ہے"۔ یا "نفع میں بھول ہے"! یا "ایک کی دوا دو"! یا "غرض باؤلی ہوتی ہے"! یا "مان کا پان بہت ہے"! یا "گھر گھوڑا نخاس مول"! یا "آدمی کا شیطان آدمی ہے"! یا "صبر کی دوا خدا کے ہات"! یا "کام چھوڑا سے خاطر"! یا "زبان شیریں ملک گیری!" وغیرہ

اوپر کہا گیا ہے کہ کہاوت عوام اور پڑھے لکھے، دونوں طبقوں میں ملتی ہے۔ ذیل کی چند مثالیں بتاتی ہیں کہ ان کے بنانے والے پڑھے لکھے لوگ تھے

• "قرض محبت کی قینچی ہے"
• "نادان کی دوستی جی کا جنجال"
• "پانی پیجے چھان کر پیر کیجے جان کر"
• "تل اوٹ پہاڑ"
• "ٹھنڈا لوہا گرم لوہے کو کاٹتا ہے"
• "خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا ہے"
• "روزگار اور دشمن بار بار نہیں ملتے"
• "احسان لیجے جان کا نہ لیجے جہان کا"
• "اونٹ پہاڑ تلے آکر اپنے آپ کو پہچانتا ہے"
• "ایک انار سو بیمار"
• "ایک تھا دیوانہ اوپر سے آئی بہار"
• "حمام میں سبھی ننگے"

• "ایک فقیر مارے اور سو گیدڑ کھائیں"
• "بازار کی تھالی کس کی جو دیکھے اُس کی"

پڑھے لکھے طبقے میں بننے والی کہاوتوں میں کویوں کے دوہے اور چند اور شاعروں کے شعر بھی مقبول ہو کر کہاوت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جیسے:۔

• "اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"
• "ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے"
• "تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو"
• "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"
• "اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی"
• "ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے"

ذیل کی چند کہاوتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے بنانے والے پڑھے لکھے لوگ نہیں۔ بلکہ عوام کا طبقہ ہے۔

• "جتنے کی بُڑھیا نہیں اتنا سر منڈائی"
• "تمھارا بنیا کیا کرے، اس کوٹھی کے دھان اُس کوٹھی میں"
• "اندھیر نگری چوپٹ راجا، ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا"
• "اوچھے کی پیت بالو کی بھیت"
• "بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا"
• "بنئے کی گون میں نون کا دھوکا"
• "بھاری پتھر چوما اور چھوڑ دیا"
• "جس کے مول لیے"
• "بھس میں چنگی ڈال جمالو الگ کھڑی"
• "بیاہ نہیں کیا پر براتیں تو دیکھی ہیں"

ان کہاوتوں کی بعض مثالیں یہ ہیں جو بنتی خاص حلقوں اور پیشوں میں ہیں۔ مگر ان کا چلن قومی ہو جاتا ہے۔

"ایک پر لیسوئے دوسرا پچکی دیکھ" — شراب فاتحوں کی بنائی ہوئی ہے۔
"ملنے کر پیچھے بھاگتے کے آگے" — زرح ہی میں بن سکتی ہے۔
"جیٹھ پڑے وہ سونا جس ٹوٹے کان" — عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔
"اپنا من چنگا تو کٹھوتی میں گنگا" — اغلب یہ ہے کہ بنگیسر بیلدوں میں نئی چلی
"پگڑی کہ گن دن کہا جو پڑی کیا میلا" — مست قلندروں کے حلقہ کی بات ہے۔

"آیا تجے سوہرکا ہوسے" — سنیاسی صوفیوں کے سوا کون بنا سکتا ہے

"دھوبی جانے لوہار جانے، ڈھونکنے والے کی بلا جانے" — اپنی بناوٹ سے ظاہر ہے

"حساب جو بو بخشش سو سو" — دو کا ندار ہی کہہ سکتا ہے۔

"جو بوئے سو کاٹے" — دیہات ہی میں بن سکتی ہے۔

"ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے" — ایضاً

ایسی کہاوتیں جن کے مفہوم اور مطلب کی مناسبت سے تشبیہیں پیدا کی گئی ہیں یعنی جو مفہوم استعارے کا ہے وہی لفظوں سے بھی نکلتا ہے۔

- "کیا پدی کیا پدی کا شوربہ"
- "بھیڑ کی لات گھونٹو تک"
- "ندی میں رہنا مگرمچھ سے بیر"
- "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی"
- "باندی کو باندی کہا رو دی، بیوی کو باندی کہا ہنس دی"

انسانی زندگی کی عالمگیر حقیقتیں جن کے مفہوم کی کہاوتیں تقریباً ہر زبان میں ملیں گی۔

- "الٹی گنگا بھی کہیں بہی ہے"
- "اندھا کیا چاہے دو آنکھیں"
- "اوس چاٹے پیاس نہیں بجھتی"
- "ایک میان میں دو تلواریں نہیں سماتی ہیں"
- "مونہہ سے نکلی ہزار میں پڑی"
- "بلی گرتی ہے تو پنجوں کے بل"
- "ایک پنتھ دو کاج"
- "تالی ایک ہات سے نہیں بجتی ہے"
- "سیر کی ہانڈی سوا سیر پڑا ہوا گھی"
- "سیر کو سوا سیر ہر جگہ موجود ہے"
- "قاضی کے مرنے سے شہر سونا نہیں ہو جاتا"
- "قاضی نیائے نہیں کرے گا تو گھر تو آنے دیگا"
- "گودڑ کا کھونا گودڑ میں نہیں رہتا"
- "گنے کا گڑ کھٹا نہ میٹھا"

- "ہاتھی مارے پانی نہیں پھٹتا"
- "نکلے دانت پھر اندر نہیں جاتے"
- "آدمی اناج کا کیڑا ہے"
- "آدمی جانے بسے سونا جانے کسے"
- "کاٹے باڑ نام تلوار کا، لٹے فوج نام سردار کا"
- "پھوٹیاں پھوٹیاں تالاب بھرتا ہے"

ہر قوم اور ملک میں کچھ کہاوتیں ایسی ہوتی ہیں جو اس قوم و ملک ہی کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ اور ان کے ہم معنی کسی دوسری زبان میں نہیں مل سکتیں

- "ابھی دلی دور ہے"
- "بھوکا بنگالی بھات ہی بھات پکارے"
- "ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور"
- "الٹے بانس بریلی کو"
- "پٹھان کا پوت، گھڑی میں اولیا، گھڑی میں بھوت"
- "دونوں دین سے گئے پانڈے، حلوا ملا نہ مانڈے"
- "تیلی کے بیل کو گھر ہی پچاس کوس"
- "جس نے بیٹی دی اس نے کیا اٹھا رکھا"
- "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا"
- "بھولے بامن گائے کھائی اب کھائے تو رام دوہائی"
- "بھینس کے آگے بین بجائی، بھینس کھڑی پگرائے"
- "بیوی وارے باندی کھائے، گھر کی بلا گھر میں جائے"
- "شیخوں کی شیخی، پٹھانوں کی تیوری"
- "نائی کی برات میں سب ٹھاکر"
- "گئے نماز بخشوانے روزے گلے پڑے"
- "فقیر کی جھولی میں کیا نہیں ہے"

ہر زبان میں بعض ایسی کہاوتیں بھی ہوتی ہیں جو دیکھنے میں بے جوڑ غیر منطقی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر غور کرنے پر ان کی صحت اور عقلمندی ظاہر ہو جاتی ہے۔ ایسی کہاوتوں کے بنانے والے شاید یہ الجھا ہوا انداز بیان جان کر اختیار کرتے ہوں تاکہ سمجھنے کے لئے لوگ خاص توجہ سے کام لیں۔ اپنی زبان کی ان چند مثالوں کو دیکھئے۔

• لالچ کی آنکھ جہاز سے بھاری۔ — یعنی مشکل ہی سے اُٹھتی ہے۔
• نہ میں دوں نہ دے خُدا۔ — ایسا کنجوس جو خُدا کا دینا بھی گوارا نہ کرتا ہو۔
• کالا منہ کریل کے دانت۔ — ساری ہی باتیں غلط اور بے ڈھنگی۔
• باتوں ہاتھی پائے۔ باتوں ہاتھی پاؤں۔ — باتوں پر خوش ہو کر بادشاہ نے ہاتھی انعام دیدیا اور باتوں ہی پر خفا ہو کر ہاتھی کے پاؤں سے بندھوا دیا
• لگائے ڈوبیں پتھر تریں۔ — جھوٹا سچا ٹھہرے اور سچا جھوٹا ہو جائے
• شوق میں خوق وستوری میں لڑکا۔ — ایک کام کرنے جائیں دوسرا فائدہ ہو جائے۔
• قاضی کے موسل میں تاڑا۔ — جس کو عقل مند سمجھ لیا ہو اس کی بات سمجھ میں نہ آئے تب بھی عقل کی بات ہے۔

ہندوستانی زبان کی کہاوتوں کے مطالعے میں دو باتیں خاص طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک مقدر پرستی اور بھگوان کی اچھا پر راضی ہو جانا اور دوسرے عورتوں کا طنز و تنقید۔ بے شمار کہاوتیں، کنائے اور محاورے ایسے ہیں جو عورتوں ہی کی زبان پر ہیں، اور زیادہ تر دوسری عورتوں کے رنگ ڈھنگ کی تنقید کرنے والے ہیں۔ یہ خصوصیت شاید ہماری زبان کے سوائے کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں کہ مردوں اور عورتوں کی بولی اور محاورے جدا جدا ہیں

• بوڑھی گھوڑی لال لگام۔
• صُورت چڑیلوں کی مزاج پریوں کا۔
• گھر چھوٹا سمدھیانا بڑا۔
• جورو کا نام بہو بیگم رکھ لینے سے ہوتا کیا ہے۔
• گھر نہ بار میاں محلہ دار۔
• آپ میاں منگتا باہر کھڑے درویش۔
• کاجل کی کجلوٹی اور پھولوں کا سنگھار۔
• اپنا پوت پرایا ڈھینگڑا۔
• کان پیارے تو بالیاں، جورو پیاری تو سالیاں۔
• کپڑا نہ لتّا مستی ملیں البتہ۔
• سُوکھے ٹکڑوں پر کتے اُڑانا۔
• کھائیں تو گھی سے نہیں جائیں جی سے۔
• دائی سے پیٹ نہیں چھپتا ہے۔
• ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے۔

• دبی بلی چوہوں کان کٹائے۔
• دیکھتے چوٹ کتو بندے بھینٹ۔
• (؟) نہ میں تیرا، آنکھوں میں ٹھیکرا۔
• بی بی کو نہ پیر کو، پہلے فقیر کو۔

کہاوتیں نئی بنتی اور پرانی چلتی بھی رہتی ہیں۔ اُن کی مقبولیت اور استعمال گھٹتا بڑھتا بھی ہے۔ لیکن پرانی کہاوتوں کا ٹکسال باہر ہو جانا اور نئی کہاوتیں بننا خاص حالات کے تقاضے ہی سے ہوتا ہے کہ کسی سماج میں جب کوئی بڑی تبدیلی ہوتی ہے۔ اس وقت پرانی کہاوتیں بھلا دی جاتیں اور نئی بننے لگتی ہیں۔ اور یہ صرف کہاوتوں کا ہی نہیں۔ لوک گیتوں کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی زمانہ ایسا بھی آتا ہے جب نئی کہاوتیں نہیں بنتیں اور پرانی بھلا دی جاتی ہیں۔ ہماری زبان کی جو کہاوتیں اب زبانوں پر نہیں ہیں۔ اُن کی چند مثالیں یہ ہیں۔

• تلوار پیٹ پڑی، نیمچہ کام کرے گا۔
• شہد سہاگ گھی، مری دھات کا جی۔
• شیر شاہ کی ڈاڑھی بڑی کہ سلیم شاہ کی۔
• شیر کھائے نہ کھائے مونہہ لال۔
• مدرہ پڑھ کے بھی احمق رہے۔
• قاضی جی اپنا آگا ڈھانکو پھر نصیحت کرنا۔
• کالا منہ نیلے ہاتھ پاؤں۔
• کچھ گوشہ چھکے کچھ گمان۔
• ککڑی کے چور کی گردن نہیں ماری جاتی۔
• کمائیں میاں خانخاناں اڑائیں میاں فہیم۔
• گاڑی بھر آشنائی جو بھر ناتا۔
• جڑ سے بیر پتوں سے یاری۔
• خدا سر پر دو سینگ دے تو وہ بھی سہے جائیں گے۔
• سوکھے ساون رُوکھے بھادوں۔
• اندھا لاٹو ٹی مسجد۔
• ایک ڈوبے تو جگ سنبھالے، یہاں تو جگ ہی ڈوبا جائے۔
• بلی لڑتی ہے تو منہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے۔

"بہرے کے آگے گانا، گونگے کے آگے گل، اندھے کے آگے ناچنا سب کل بل"

ہماری زبان میں لوک گیتوں کی ریسرچ پر تو دھیان دیا جانے لگا ہے ۔ کہاوتوں کی طرف بالکل توجہ نہیں کی گئی ہے ۔ بہت سی کہاوتیں ہیں جن کے پیچھے کہانیاں ہیں ۔ مگر بھولی جا رہی ہیں ۔ لغت کی کتابیں بھی ایسی تمام حکایتوں کو محفوظ نہیں کر سکی ہیں ۔ بعض مثالیں یہ ہیں :۔

"کچھ تم سمجھے کچھ ہم سمجھے"

ایک مسافر کی کمر سے ہزار روپے بندھے تھے ۔ اور بوجھ محسوس ہو رہا تھا پیچھے سے ایک گھوڑ سوار آیا ۔ پیدل مسافر نے اس سے کہا کہ ذرا ہمارے روپے اٹھا کے چلو ۔ سوار نے انکار کر دیا ۔ اور بڑھ گیا ۔ پیدل نے دل میں سوچا کہ سوار اگر اٹھا لیتا اور چل دیتا تو میں کیا کر لیتا ۔ سوار نے سوچا کہ بڑی حماقت کی کہ ملتی ہوئی رقم کو ٹھکرا دیا ۔ سوار اگلی منزل پر رک گیا ۔ یہاں تک کہ پیدل مسافر بھی پہنچ گیا ۔ اور جب پھر چلنے کو ہوئے تو سوار نے کہا لاؤ تمہارا بوجھ اٹھا لیں ۔ اس وقت پیدل مسافر نے کہا کہ وقت گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے"

ایک دعوت میں اندھے حافظ جی لڑکے کو ساتھ لے کر پہنچے پوچھا کھانا کیا ہے ۔ لڑکے نے بتایا کھیر ہے ۔ ۔ حافظ جی نے کھیر کبھی کھائی نہ ہوگی ۔ پوچھا کھیر کیسی ہوتی ہے ۔ لڑکے نے کہا سفید ۔ حافظ جی کو سفید رنگ کا اندازہ نہ تھا ۔ پوچھا سفید کیسی ۔ لڑکے نے کہا بگلا سی ۔ حافظ صاحب نے پوچھا بگلا کیسا ہوتا ہے ۔ لڑکے نے ہتھیلی پر کہنی ٹیک نیچے سے چونچ بنا کر کہا ۔ کہ ایسا ۔ حافظ صاحب نے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا تو بولے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"ہم بھی ہیں پانچوں سواروں میں"

دلی سے چار سوار دکن کو جا رہے تھے ۔ راستے میں ایک کمہار بھی گدھے پر سوار ان کے پیچھے ہو لیا ۔ اس زمانے میں سواروں کی بڑی عزت اور آدر ہوتا تھا سرائے میں ٹکے تو کمہار سے لوگوں نے پوچھا ۔ کہ یہ کہاں کے سوار ہیں ۔ کمہار بولا ہم پانچوں سوار دکن کو جا رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"آب آب کرتے مر گئے سرہانے دھرا پانی"

لالہ صاحب ایران گئے ۔ فارسی زبان پسند آئی ۔ سیکھ آئے اور بیمار پڑ گئے پیاس لگی تو آب آب فارسی میں پانی مانگا ۔ کوئی سمجھا نہیں اور لالہ صاحب چل بسے ۔ ۔ تب سے یہ کہاوت وجود میں آئی ۔ ۔ ۔

"آپ دونوں لڑ لیں"۔۔

ایک بولی ۔ ڈلو، دوسری نے کہا ارے میری پیزار ۔ پہلی بولی بڑی آئی تو پیزار والی ۔ بس پھر کیا تھا ۔ لڑائی ہو پڑی ۔

"بڑے باپ کی بیٹی ہے تو سمجھ کر لے"

کوئی خان صاحب ایک کوٹھے پر چڑھ گئے ۔ اتفاق کی بات کہ فیل ہو گئے عورت بولی واہ خان صاحب ۔ خان صاحب بگڑ کر بولے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"آٹا ہے، دال ہے، اور الو بھی ہے"

کسی پر لالہ جی کے روپے آتے تھے ۔ تقاضا سخت ہوا تو وہ آدمی ایک الو پکڑ کر لایا اور ہاتھ پر بٹھا کر ادھر سے گذرا ۔ لالہ جی نے پھر تقاضا کیا ۔ بولا یہ بک جائے تو ادا کر دوں گا ۔ لالہ نے پوچھا ۔ کیا ہے ۔ بتایا یہ شاہین ہے ، بہت قیمتی جانور ہے ۔ پھر ادھر سے گذرے اور لالہ جی نے ٹوکا تو کہا کہ اس کی اتنی قیمت لگ چکی ہے ۔ مگر یہ کم ہے ۔ زیادہ دام کو بیچوں گا ۔ اس وقت تمہارا حساب کر دوں گا ۔ پھر ایک دن تقاضا ہوا تو جھلا کر بولے کہ لالہ جی تم نے تو ناک میں دم کر دیا ۔ ایسا ہی ہے ۔ تو تم خرید لو ۔ لالہ جی نے سوچا کہ اس میں بھی کچھ کما لیں گے ۔ اس سے وہ الو خرید لیا ۔ اور اپنی رقم کاٹ کر باقی ادا کر دی جب گھر لے کر پہنچے تو بیوی نے بتایا کہ شاہین نہیں الو ہے ۔ تو لالہ جی بہت جھینپے اور اسے دکان پر ٹانگ دیا ۔ اب جو کوئی آتا اور پوچھتا تو لالہ جی بتلاتے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"آٹھ جولاہے نو حقہ، پھر بھی تھکم تھکا"

جولاہوں کی برات میں آٹھ آدمی جمع تھے ۔ اور حقہ پینے پلانے پر تکرار ہونے لگی گنے گئے تو اس جگہ آدمیوں کی تعداد سے ایک حقہ زیادہ تھا ۔ مگر حجت ہوئے بغیر نہ رہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"بلی کی میاؤں کو کون پکڑے گا"

بلی کے ظلم و زیادتی سے تنگ آ کر چوہوں نے پنچایت جوڑی ۔ ہر ایک نے اپنی بہادری اور مردانگی دکھانے کو ایک ایک کام اپنے ذمے لیا کہ بلی اور اس کے مظالم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں ۔ ایک بڈھا چوہا چپ بیٹھا سب کی سن رہا تھا ۔ کسی نے کہا بڑے میاں تم بھی تو کچھ کہو ۔ وہ بولا احمقوں کی مجلس میں کیا بات کی جائے ۔ کوئی بلی کے کان پکڑے گا ۔ کوئی اس کی دم ۔ پر یہ کسی نے نہیں کہا کہ جب وہ میاؤں کہے گی تو اس میاؤں

کو کون پکڑے گا میاؤں کا لفظ سنتے ہی سارے چوہے بھاگ گئے۔

"تیلی خصم کیا پھر بھی سوکھی کھائی"

ایک چودھری عورت آخر میں تیلی سے بیاہ کر کے سمجھی اب اسے تر نوالہ ملتا رہے گا۔ مگر جب اُس کے ہاں بھی فاقے ہوئے تو بولی۔۔۔۔۔۔

"شیخ نے چھوے کو بھی دغا دی"

ایک شیخ صاحب کو دریا اُترنا تھا۔ کشتی کوئی تھی نہیں۔ ایک کچھوا بولا میں اُتار دوں تو کیا دو گے۔ بولے ایک بکرا۔ کچھوے نے انھیں اپنی پیٹھ پر بٹھا لیا۔ اور دوسرے کنارے پر اُتار کے کہا، وعدہ وفا کیجئے۔ شیخ جی نے اپنی مرزئی اُتاری اور ایک جوں ڈھونڈھ کر ناخن پر رکھی اور مار دی گویا وعدہ پورا کر دیا۔۔۔۔۔۔

"سوت نہ کپاس کولی سے لٹھم لٹھا"

کسی صاحب کے گھر روئی رکھی تھی۔ اور اُسے کتانے والے تھے جاتے جاتے ایک کولی سے بھاؤ تاؤ پوچھا۔ کمی بیشی پر جھگڑنے لگے۔ تو یہ کہاوت بن گئی

"قاضی کی مونچھ"

قاضی جی کے یہاں مونچھ کی ضرورت پڑ گئی۔ بازار سے ملی نہیں۔ ایک صاحب جو اس وقت حاضر دربار تھے۔ اُن کے ہاں مونچھ تھی۔ اور انہوں نے منگوا دی۔ وہ مونچھ رجسٹر میں درج ہو گئی۔ دوسرے قاضی صاحب آ گئے مکان میں سفیدی ہونا تھی۔ اس کے لئے مونچھ درکار تھی۔ رجسٹر میں ان حضرت کا نام نکلا بس کر لگ گیا۔ اور وہ مونچھ مفت سپلائی کرنے پر مجبور ہو گئے۔

"نوکر تو آپ کا ہوں بینگنوں کا نہیں ہوں"

بادشاہ نے بینگن کی تعریف کی تو حضور نے صاحب نے پورا قصیدہ پڑھ ڈالا اور بینگن میں ساری دنیا کی خوبیاں گنا دیں۔ دوسرے موقعہ پر بادشاہ نے بینگن سے ناپسندیدگی ظاہر کی۔ تو وہی حضور اُس کے عیب گنانے لگے بادشاہ نے حیرت سے کہا کہ اس روز تو تم نے بینگن کی تعریف کی تھی۔ آج اُسی کی برائی کر رہے ہو۔ اس پر جواب دیا۔۔۔۔۔۔

"تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو" "ابھی دیکھو اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے"

یہ دونوں کہاوتیں ایک حکایت سے نکلی ہیں شہر لوہے کے چار لنگوٹیا یار تھے ایک مولوی صاحب کا لڑکا تھا، دوسرا ایک سپاہی زادہ، تیسرا تیلی کا اور چوتھا بقال کا لڑکا تھا۔ شاہزادہ بادشاہ ہوا تو ان چاروں کو اس نے وزیر بنا دیا۔ ایک دفعہ سرحد پر بادشاہ نے چڑھائی کر دی۔ یہاں کیبنٹ بیٹھی۔ تو سپاہی نے کہا کہ فوراً فوجیں طیار ہوں اور سرحد پر ہی مقابلہ کر کے دشمن کو پسپا کر دیا جائے۔ مُلا جی کے صاحبزادے بولے کہ فوج کشی ہوگی۔ بندگان خدا کا خون بہے گا۔ اس کی ذمہ داری بادشاہ کی گردن پر رہے گی۔ سپاہی بولا کہ دشمن آئے گا تو خون تو وہ بھی بہائے گا۔ مُلا صاحب نے کہا کہ اس کا قبضہ ملک پر ہو سکتا ہے۔ مگر اخلاقی فتح تو ہماری ہوگی۔ بقال وزیر سے پوچھا تو بولا دیکھو تو اونٹ بیٹھتا کس کروٹ ہے۔ اور تیلی وزیر کا مشورہ تھا کہ ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔

الفاظ کی طرح کہاوتیں بھی اپنے سماج کا آئینہ ہوتی ہیں۔ اور اس تاریخ و معاشرت کو ظاہر کرتی ہیں جس دور میں وہ بنی تھیں ہندوستان میں سامنتی سماج (جو انگریز کے جانے کے ساتھ بالکل ہی ختم ہو گیا) کی یادگار ضرب المثلیں بھی ترک ہو چکی ہیں۔

"کالا مُنہ نیلے ہاتھ پاؤں"

سامنت شاہی عہد میں کالا مُنہ کر کے اور نیلے ہاتھ پاؤں رنگ کر گدھے پر بٹھایا جاتا اور مجرم کو تشہیر کیا جاتا تھا۔

"پھر کون جیتے کس کا راج"

اس بات کی دلیل ہے کہ سامنت شاہی میں کوئی راج مستقل یا دیرپا بھی نہیں سمجھا جاتا تھا

"تاج کی بڑا نعمت"

اس عہد کے افلاس کا ثبوت ہے کہ چاول کچے پکے ہی نعمت سمجھی جاتی تھی۔

"اپنے مُنہ کا اگال ہمارے پیٹ کا ادھار ہے"

سامنت شاہی میں وقار انسانیت باقی نہیں رہ گیا تھا اور عوام ایسی باتیں بلا تکلف کہہ سکتے تھے

"ایک منہ موتیوں سے بھر لیا جائے، سو منہ خاک سے بھی نہیں بھرے جاتے"

ہر زمانے میں خیال و فکر کا رجحان ترقی پسندانہ رہا ہے۔ سامنت شاہی میں ایسا سوچنا بغاوت و غداری میں شمار ہونا چاہیے۔ مگر سوچنے اور لکھنے کے مقفود نہ تھے

"چھب گٹھری میں اور صورت طباق میں"

اس کہاوت سے اس عہد کی معاشرت کے ساتھ یہ تصور بھی سامنے آتا ہے کہ لباس گٹھڑیوں میں رکھے جاتے تھے اور چھب لباس سے نکلتی تھی حسن و صورت طباق یعنی غذا کے ہاتھ میں سمجھا جاتا تھا۔ یہ تصورات آج بھی اتنے ہی صحیح ہیں۔

مختصر یہ کہ ہندوستانی زبان کی کہاوتوں پر ریسرچ ہونا چاہیئے، اور بحالات موجودہ انجمن ترقی اردو اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے بلکہ کہنا چاہیئے کہ وہ اپنے وجود کا ثبوت اسی قسم کے کام شروع کر کے دے سکتی ہے۔

ستمبر [illegible]

آجکل دہلی

ذکر و فکر

شاہد صدیقی :-

اگر حالات کے ہمراہ تدبیریں بدل جائیں — ذرا سی دیر میں قسمت کی تحریریں بدل جائیں
مجھے خواہش ہے محفل میں نئی شمعیں جلانے کی — مگر تو چاہتا ہے صرف تنویریں بدل جائیں
بہار آئی نئی کلیاں کھلیں لیکن مزا جب ہے — کہ ہر جھالے میں بھونروں کی تقدیریں بدل جائیں
رہائی مل گئی لطفِ رہائی کو ترستے ہیں — تو کیا ہم نے یہ چاہا تھا کہ زنجیریں بدل جائیں
کچھ ایسے سلسلۂ نظر بھی ہیں جنہیں فکر اسکی رہتی ہے — جہاں ملے نہ ملے چند تعمیریں بدل جائیں
مری آہوں میں ساری انجمن کا دل دھڑکتا ہے — بہت ممکن ہے اب آہوں کی تاثیریں بدل جائیں
سحر کے وقت خوابوں کے بھیانک پن سے ڈرنا کیا — یہ کوشش کر کہ ان خوابوں کی تعبیریں بدل جائیں

کوئی تصویر رنگِ نو سے بچ کر رہ نہیں سکتی
مصور کا اشارہ ہے کہ تصویریں بدل جائیں

بریج لال رعنا :

غم کی شیریں تلخیاں جینے کا ساماں ہو گئیں — بجلیاں خونِ رگِ جاں گلستاں ہو گئیں
ان کا جلوہ دیکھتے ہی اڑ گئے ہوش و حواس — کشتیاں ساحل سے لگ کر نذرِ طوفاں ہو گئیں
ایک وہ ہیں جن کے ویرانے بنے ہیں بستیاں — ایک ہم ہیں بستیاں بھی جن کی ویراں ہو گئیں
حادثوں نے کر دیا پیدا خیالِ حفظِ جاں — بجلیاں ہی وجہِ تنظیمِ گلستاں ہو گئیں

چھٹ گئیں رعنا خنک آہوں سے غم کی ظلمتیں
بدلیاں ٹھنڈی ہواؤں سے پریشاں ہو گئیں

پروفیسر آغا صادق :-

ہل ہل کے شوخ شوخ اشارے بچھڑ گئے — نظریں تڑپ رہی ہیں نظارے بچھڑ گئے
جتنے بھی ہم سفر تھے ہمارے بچھڑ گئے — جب صبح ہو گئی تو ستارے بچھڑ گئے
چلتے رہے چمکتے رہے دیکھتے رہے — پہلی کرن سے پہلے ہی تارے بچھڑ گئے
سرمایۂ وفا ہی غنیمت ہے اے ندیم — پیاروں کی یاد رہ گئی پیارے بچھڑ گئے
عمرِ گریز پا میں کہاں فرصتِ نگاہ — نظریں اٹھی ہی تھیں کہ نظارے بچھڑ گئے

احسن طباطبائی :-

انساں کے لیے جہاں میں راحت ہی نہیں — آلام و مصائب سے فراغت ہی نہیں
محرومی و بے بسی کی کوئی حد ہے — غم ملتا ہے مشکل سے مسرت ہی نہیں
جو راہ کی سختیوں سے گھبراتے ہیں — چلنے میں قدم انہیں کے تھراتے ہیں
عزم و ہمت پہ ہے بھروسا جن کو — مثلِ موجِ صبا گزر جاتے ہیں

جعفر گلزاری :-

ہر الم مسرور ہے اور ہر خوشی رقصاں ہے آج — زندگی رقصاں ہے بزمِ زندگی رقصاں ہے آج
مشرقِ امید سے پھوٹی شعاعِ صبحِ نو — آفتابِ زیست کی مشعل بھی رقصاں ہے آج
پھول برساتی ہے ہنس ہنس کر عروسِ کائنات — سرخ آنچل میں شبابِ زندگی رقصاں ہے آج
حسن کی رنگینیوں میں مسکراتی ہے حیات — عشق کی محفل میں کیفِ بے خودی رقصاں ہے آج
سحر انگیز انکھڑیوں کی یاد ہائے التفات — ہر اشارے پر جہانِ زندگی رقصاں ہے آج
جبینِ ناز کی شبنم یہ رخساروں کی آگ — حسنِ ماہ و مہر کی تابندگی رقصاں ہے آج
یہ نگاہوں کا سلونا پن یہ ہونٹوں کی مٹھاس — عطر میں ڈوبی ہوئی تازہ کلی رقصاں ہے آج
غرقِ نغماتِ طرب ہے منظرِ کون و مکاں — سانس کی لے پر صدائے زندگی رقصاں ہے آج
روحِ عالم تیرتی ہے بحرِ احساسات میں — موجِ عشرت میں سرودِ زندگی رقصاں ہے آج
مستیاں اٹھلا رہی ہیں گلشنِ جذبات میں — روحِ بدمست خرامِ زندگی رقصاں ہے آج
ساری قدرت ہے مری ہمنوائے امکاں میں — حکم سے میرے نشاطِ زندگی رقصاں ہے آج
دعوتِ نظارہ دیتا ہے جمالِ جلوہ گاہ — شمعِ زریں کی سنہری روشنی رقصاں ہے آج

گونج اٹھا منزلِ تخیل کا رفعت کدہ
فکر کے رنگیں محل میں شاعری رقصاں ہے آج

خلیق قریشی :-

افق کے پاس کہیں اک کرن سی پھوٹی ہے — فرازِ کوہ سے نیچے اسے گزر ہی نہ
جہاں پناہوں نے بیچا قدم قدم پہ اسے — گدائے خاک نشیں کو مگر خبر ہی نہ
جو تل کے آئی نہ ہو سیم و زر کے کانٹے پر — نگاہ و سر میں وہ بات معتبر ہی نہ
قفس کا در تو کھلا ہے مگر اسیرِ قفس — اڑیں تو کیسے اڑیں کہ بال و پر ہی نہ

تیرے کلام میں ہے طرفہ یہ کمال خلیق
کہ دلفروز بھی ہے محض مختصر ہی نہیں

حکیم محمد صدیق حسن درد بریلوی :-

محبت کی غلط افتادہ ہوں میں — حدیثِ دردِ بے بنیاد ہوں
بتاتی ہے مری برگشتہ بختی — ابھی تک آسماں کو یاد ہوں
مجھے فرصت ہی کب ہے بے خودی سے — کہ مانوسِ غمِ بیداد ہوں
پیامِ زندگی آتا ہے اب بھی — محبت کو ابھی تک یاد ہوں
محبت کا مزا لے درد یہ ہے — کہ ان کو ہر جفا پہ یاد ہوں

خلیق احمد نقوی

یونانی المیہ

یونانی المیہ ان ڈراموں کا ایک عام نام ہے جو پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان کے ایک شہر اتھنس میں لکھے گئے۔ اتھنس اس زمانے میں یونان کا عروس البلاد تھا۔ اس شہر میں سو سال کے زمانے میں تقریباً ۹ سو المیہ ڈرامے لکھے گئے۔ جن میں سے صرف تینتیس زمانے کے دست برد سے بچے ہیں۔ یہی بچے کھچے ڈرامے یونان کی شاندار ادبی کاوشوں کے آئینہ دار ہیں۔ دنیا کے ادب میں ناقدین نے انھیں بہت بلند مرتبہ دیا۔ ہر زمانے اور ہر ملک کے لوگوں نے ان کو پڑھا ہے، لطف اٹھایا اور اثر لیا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کس حد تک ہمارے خیالات اور تاثرات پر یونانی المیہ کا اثر پڑا ہے۔ کیونکہ ہم نے غیر شعوری طور پر ان اثرات کو قبول کیا ہے۔ لیکن اتنا تو بلا خوف ابطال کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے ادب پر عام طور پر اور ڈرامائی ادب پر خاص طور پر ان کا اثر بہت گہرا ہوا ہے۔ ہر زبان میں ڈرامہ لکھنے والے ان المیہ ڈراموں کو ایک معیار تصور کرتے ہیں جس سے وہ خود اپنی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ لگاتے ہیں۔

یونانی المیہ کا ترجمہ لگ بھگ ہر تہذیب یافتہ زبان میں ہو چکا، بلکہ کئی زبانوں میں تو لاتعداد ترجمے موجود ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اب اردو میں ان المیہ ڈراموں کا ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ عزیز احمد صاحب نے ارسطو کی مشہور و معروف کتاب "بوطیقا" کا ترجمہ کیا ہے۔ جسے "فن شاعری" کے نام سے انجمن ترقی اردو نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اردو داں طبقہ یونانی المیہ کی طرف رجوع نہ ہوا۔ اس مختصر مضمون میں ہم اردو پڑھنے لکھنے والوں کو ان ڈراموں سے متعارف کرانا چاہتے ہیں تاکہ ان سے دلچسپی پیدا ہو۔ وہ ان ادبی شہ پاروں کا ترجمہ کریں اور اردو داں طبقہ بھی ان سے لطف اندوز ہو سکے۔

پانچویں صدی ق م کے آغاز میں ایس کیلس نے ڈرامے لکھنا شروع کئے۔ اس کا پہلا ڈرامہ ۴۹۹ ق م میں پیش ہوا۔ یہی ڈرامہ نگار یونانی المیہ کا موجد ہے۔ اس نے کل نوّے ڈرامے لکھے تھے جن میں سے صرف سات باقی بچے ہیں۔ ان ڈراموں میں سب سے زیادہ شاندار ڈرامہ "قیدی پرومیتھیوس" ہے۔ پرومیتھیوس زمین اور آسمان کا بیٹا ہے، وہ انسانی نسل کو تباہ ہونے سے بچاتا ہے۔ اسے ہر طرح کا علم و ہنر سکھاتا ہے اور آخر میں جنت سے آگ چرا کر انسانوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ یونانی دیوتاؤں کا سردار زیوس اس جرم کی پاداش میں اسے کوہ قاف میں گرفتار کر دیتا ہے لیکن وہ سر نہیں جھکاتا۔ جب اسے دھمکی دی جاتی ہے کہ اسے اور بھی سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر اس نے زیوس کی جبروت کو لبیک کہنے سے انکار کیا تو وہ جواب دیتا ہے: "ایک دشمن کے ہاتھوں مصائب کا شکار ہونا کوئی شرم کی بات نہیں۔ مجھ پر بجلی کی دو منہ والی لہر گرنے دو۔ ہوا کو کڑک اور طوفان کے دھماکے سے غصے میں بپھرنے دو۔ طوفان کو زمین کی بنیادیں ہلا دینے دو۔ سمندر کی لہروں کے طوفانی سیلاب کو اتنا بلند ہونے دو کہ وہ ستاروں کے راستے سے ہم آغوش ہو جائیں۔ سخت مجبوری کے عالم میں میرے جسم کو تاریک تحت الثریٰ میں پٹک دینے دو۔ زیوس مجھے کسی طرح نہیں مار سکتا۔"

پرومیتھیوس بغاوت کا علم بردار ہے۔ ہزاروں مصائب میں گھر کر بھی وہ سر نہیں جھکاتا۔ جد و جہد اور کشمکش سے گریز نہیں کرتا۔ تلخ حقیقت سے فرار نہیں کرتا۔ المیہ کا اختتام پرومیتھیوس کے ان الفاظ پر ہوتا ہے۔ "دھمکی کے الفاظ اب حقیقت بن چکے ہیں۔ زمین سکڑ رہی ہے۔ ہر طرف طوفان کا سیلاب تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ہواؤں میں جنگ ہو رہی ہے۔ آسمان اور زمین ایک ہو گئے ہیں۔ دیکھو، یہ طوفان زیوس نے مجھے

ڈرانے کے لئے بھیجا ہے۔ او میری مقدس ماں! او جنت، جو ہر بلندی کے حلقے سے ہر چیز کو منور کرتی ہے۔ مجھے دیکھو اور میرے ان مصائب کو دیکھو"

بدقسمتی سے تین سلسلہ وار ڈراموں میں سے صرف پہلا حصہ بچا ہے۔ اگر تینوں حصے ہمارے سامنے ہوتے تو ہم ان کی صحیح عظمت کا اندازہ لگا سکتے جبکہ جس حالت میں یہ بچا ہے وہ بھی ایک ادبی شاہکار ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس کے ڈراموں میں ہمیں زبردست اصول کی کشمکش کی تصویر ملتی ہے۔ ایک ایسی سادگی اور عظمت جو ہمیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اکثر ڈراموں میں کہانی کا فقدان ہے۔ ڈرامائی عنصر کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پلاٹ کی ترقی اور کہانی کی پیچیدگی ایسکلیس کے بعد کے دو ڈرامہ نگار سوفوکلیس اور یوریپڈیس کے ہاتھوں پیدا ہوئی۔

سوفوکلیس ایتھنس میں ۴۹۶ ق۔م میں پیدا ہوا، اور نوّے سال زندہ رہا۔ اس نے بھی لگ بھگ سو ڈرامے لکھے ہیں۔ جن میں سے صرف سات باقی بچے ہیں۔ اس کا سب سے کامیاب ڈرامہ شاہ ایڈیپس ہے۔ ارسطو نے اس المیہ کو یونانی المیہ کا شاہکار کہا ہے۔ اس کی کہانی یوں پیش کی گئی ہے کہ تھیبیز شہر کے بادشاہ اور ملکہ کے ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے جس کا نام ایڈیپس رکھا گیا۔ اپالو کے دارالاستخارہ نے اس بارے میں پیش گوئی کی کہ وہ اپنے باپ کو قتل اور اپنی ماں سے شادی کرے گا۔ ماں باپ بچے کو ایک چرواہے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ تاکہ وہ اسے کسی پہاڑی پہ مرنے کے لئے چھوڑ آئے۔ چرواہے کو بچے پر رحم آتا ہے اور اسے اپنے دوست کارنتھ کے چرواہے کے حوالے کر دیتا ہے۔ جو اسے اپنے ملک لے جاتا ہے۔ کارنتھ کے بادشاہ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اس بچے کو گود لے لیتا ہے بیس برس بعد ایڈیپس کے سامنے پھر وہی پیش گوئی دوہرائی جاتی ہے ــــ کہ وہ اپنے باپ کو قتل اور ماں سے شادی کرے گا۔ ایڈیپس کارنتھ کے بادشاہ اور ملکہ کو باپ ماں سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ کارنتھ سے بھاگ کر تھیبیز کی طرف آتا ہے۔ راستے میں تھیبیز کے بادشاہ یعنی اپنے باپ سے اس کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ اور وہ بادشاہ اور اس کے نوکروں کو مار ڈالتا ہے، صرف ایک چرواہا بچتا ہے جو تھیبیز میں آکر خبر دیتا ہے کہ ڈاکوؤں نے بادشاہ کو مار ڈالا۔ اب ایڈیپس تھیبیز پہنچتا ہے اور وہاں کی آبادی کو آدم خوروں سے نجات دلاتا ہے۔ جس کے صلے میں وہاں کے عوام اسے بادشاہ مان لیتے ہیں۔ اور اس زمانے کے قاعدے کے مطابق مرے ہوئے بادشاہ کی بیوہ سے اس کی شادی ہو جاتی ہے اور بچے ہوتے ہیں۔ اب ایک بار پھر وبا آتی ہے۔ اور ڈلفی کا دارالاستخارہ بتاتا ہے کہ مرے ہوئے بادشاہ کے قاتل کو اگر سزا نہ دی گئی تو تھیبیز تباہ ہو جائے گا۔ اب قاتل کی ڈھونڈھ شروع ہوتی ہے۔ ایک نجومی اور چرواہے کی گواہی سے ثابت ہوتا ہے کہ ایڈیپس ہی وہ قاتل ہے۔ اس کے بعد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس بادشاہ کو اس نے مارا تھا وہ اس کا باپ تھا۔ اس کی بیوی اس کی ماں تھی۔ اس کے اپنے بچے اس کے بھائی بہن تھے۔ ایڈیپس کی بیوی ــــ یا ماں خودکشی کر لیتی ہے۔ ایڈیپس اپنی آنکھیں پھوڑ لیتا اور دیس چھوڑ دیتا ہے۔ ڈرامے کے آخر میں کورس کہتا ہے

"تھیبیز کے بیٹو اور بیٹیو! دیکھو، یہ تھا ایڈیپس، انسانوں میں سب سے بلند مرتبہ! وہ سب رازوں کا محرم تھا۔ اس کی خوش حالی کی وجہ سے ہر شخص اس سے حسد کرتا تھا۔ دیکھو کیسی بدقسمتی کا سیلاب اسے بہا لے گیا یاد رکھو کہ فانی انسان کو اپنا انجام یاد رکھنا چاہئے۔ صرف اسی کو خوش سمجھنا چاہیئے جو اپنی خوشی اپنے ساتھ قبر میں لے جا سکے۔ اور سکون سے مر سکے"

یہ تھا ہر کمالے را زوالے کا فلسفہ جو یونان میں پانچویں صدی قبل مسیح کی فکر کا لازمی جزو تھا۔ اسی کے تحت سوفوکلیس نے ایک اور جگہ کہا ہے: ہر چیز تولنے اور پرکھنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سب سے زیادہ خوش بختی تو یہ ہے کہ انسان پیدا ہی نہ ہو۔ اس سے کم تر خوش بختی بلاشبہ یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد جہاں سے آیا ہے وہاں واپس چلا جائے" اسی قنوطیت کو ایک دوسرے مفکر نے یوں پیش کیا ہے "میری عمر ساٹھ سال کی ہے اور میں نے شادی نہیں کی ہے۔ کاش میں اپنے باپ کے بارے میں بھی یہی کہہ سکتا"

یوریپڈیس کی عمر سوفوکلیس سے کم تھی۔ وہ ۴۸۰ ق۔م میں پیدا ہوا، اور ۴۰۶ ق۔م میں مرا۔ سوفوکلیس کے ایک قول کو ارسطو نے

کیا ہے میں انسانوں کو اس طرح پیش کرتا ہوں جیسا اُن کو ہونا چاہیئے۔ یوریپیڈیس انھیں اس طرح پیش کرتا ہے جیسے وہ ہیں یہ آج کل ہم اسی بات کو اس طرح کہیں گے "میں تصوریت پسند ہوں۔ یوریپیڈیس حقیقت پسند ہے"۔

یوریپیڈیس بچپن سے آزادی اور مساوات کے گہوارے میں پلا تھا۔ جب اُس کو احساس ہوا کہ قول اور فعل میں تضاد ہے، آزادی، مساوات کے نام پر آزادی اور جمہوریت کا خون ہو رہا ہے تو اس کا حساس دل تڑپ اُٹھا۔ اس کے دماغ نے بغاوت کی۔ جب اس نے دیکھا کہ ایک ہی دیوتا کے پوجنے والے آپس میں متضاد مفاد رکھتے ہیں، جو ریاستی مذہب کی بنیادیں کھوکھلی کر رہے ہیں تو اس نے مذہب سے بغاوت کی۔ اس نے دیکھا کہ عورتوں کی غلامی کی وجہ سے خاندانی زندگی تباہ ہو رہی ہے، تو اُس نے روایتی خاندانی رشتوں سے بغاوت کی، اس نے جمہوریت کے نام پر دوسرے ملکوں کو غلام بنتے دیکھا، اور اس پالیسی کے تباہ کن نتائج دیکھے تو اُس نے سامراجی پالیسی کی مخالفت کی۔ اُس نے غلام اور آقا کے فرق پر بھی تنقید کرنے کی ہمت کی، جو اس زمانے کے لئے ایک بہت بڑی بات تھی۔ خود سقراط، افلاطون اور ارسطو اس کی ہمت نہ کر سکے۔ افلاطون اپنی خیالی اشتمالی جمہوریت میں بھی غلاموں کو قائم رکھتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس کے ڈراموں میں ایک انفرادیت ہے۔ اس کے المیہ میں جو ڈرامائی تکنیک کا تجزیہ اور فکر کی بے ربطی ملتی ہے وہ انھیں اسباب کا نتیجہ ہے۔ وہ نئی راہیں ڈھونڈھتا ہے۔ مذہبی اور اخلاقی، سماجی اور سیاسی مسائل پر نڈر ہو کر اپنے نظریے کو پیش کرتا ہے۔ یوریپیڈیس ایک جمہوریت پسند تھا، جس نے دیکھا کہ جمہوریت خودکشی کر رہی ہے۔ یہ تضاد اس کے المیوں کی بنیاد ہے۔ اس نے اپنے زمانے کی سماج کی خرابیوں کو دیکھا اور بے دھڑک ہو کر اُن کو سرعام پیش کیا اس طرح اس کا اثر تخریبی تھا۔ جس عمارت کو ایس کیلس نے کھڑا کرنے میں ہاتھ بٹایا تھا، اس کے شگاف چھپانے کی سوفوکلیس نے ناکام کوشش کی۔ یوریپیڈیس نے اُسے ڈھانے میں مدد دی۔ تینوں المیہ نگار ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور ان کے ڈرامے ایک مکمل حیثیت رکھتے ہیں۔

یوریپیڈیس اور سوفوکلیس کے انتقال کے بعد (۴۰۶ ق۔م) کوئی بھی قابلِ قدر المیہ نہیں لکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یونان میں المیہ کی داغ بیل جمہوریت کے ساتھ پڑی، اسی کے ساتھ ساتھ وہ پھلا پھولا، اور جمہوریت کے خاتمے پر المیہ بھی ختم ہو گیا لیکن پانچویں صدی کی شاندار جمہوریت کا زریں عہد ادب کے خزانے کے لئے انمول شاہکار چھوڑ گیا ہے۔

"آج کل" کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کی اشاعت بڑھانے میں مدد کرنا اُردو کی خدمت کرنا ہے

ادارہ

چارو لال مکرجی

ہندوستان کے قدیم باشندے

ہندوستان کی ۶½ فی صدی آبادی قدیم باشندوں پر مشتمل ہے۔ آجکل یہاں تین واضح قسم کے قدیم باشندے پائے جاتے ہیں۔

جنوبی الاصل

جنوبی زبانیں بولنے والے جنوبی الاصل منڈا فرقے پچاس لاکھ افراد پر مشتمل ہیں اور ہندوستان کی وسطی پٹی میں رہتے ہیں۔ یہ اوسط قد کے قوی الجثہ اور مضبوط ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ ہلکے بھورے سے لے کر آبنوسی تک ہوتا ہے ان کی ناک چوڑی ہوتی ہے۔ بانسہ دبا ہوتا ہے اور بال گھونگھر والے۔

ان کے آبا و اجداد۔ ہند میں شمالی مغربی دروں سے آنے کے قبل شاید کاکیشین (گورے چمڑے والے) نسل کی ایک نچلی شاخ میں سے تھے۔ منڈا خاندان کے موجودہ افراد اپنے آپ کو مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ مثلاً ہو، ہونڈ یا ہو، ان سب کے معنی "آدمی" کے ہیں۔ گویا یہ اپنے آپ کو دوسرے بنی آدم سے علیحدہ کرتے اور انہیں گھٹیا قسم کے آدمی تصور کرتے ہیں۔ انہیں منڈا لوگوں کو آریوں نے نشاد، سوار، پلی دا، اور بھیل کے نام سے یاد کیا ہے یا اس سے بھی زیادہ تحقیر آمیز طور پر کول یا ڈھنگر کہہ کر پکارا ہے

ان میں سے برہور اور پہاڑی کھاریا آج تک نیم وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور کم و بیش جنگلی پیداوار ہی پر گزر بسر کر لیتے ہیں لیکن دوسرے قبیلوں مثلاً ڈھیلکی کھاریا اور پادری بھوئیا کا مدار جھوم کی کاشت پر ہے جو جگہ جگہ گھومنے والی غیر فائدہ مند زراعت ہے۔ سنتال منڈا۔ ہو۔ اڑیسہ ریاستوں کے بھوئیا اور دودھ کھاریا نے مستقل زراعت پیشہ زندگی اختیار کر لی ہے۔ جنگلوں کو صاف کر کے اور پہاڑیوں پر جھاڑ باندھ کر کھیتی کر کے ان لوگوں نے جھارکھنڈ اور چھوٹا ناگپور کے بنجر علاقوں کو لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کر دیا ہے ان میں سے تقریباً سبھی۔ کچھ پرانی وضع کی صنعت و حرفت سے اپنی آمدنیوں میں اضافہ کرتے ہیں۔

ان کا سب سے بڑا قبیلہ سنتال ۲۷ لاکھ آدمیوں پر مشتمل ہے اور سنتال پرگنہ اور بہار، بنگال اور اڑیسہ کے بعض علاقوں میں بستا ہے۔ منڈا (ساڑھے چھ لاکھ) رانچی (بہار) کے گرد مرکوز ہیں۔ ہو (ساڑھے چار لاکھ) چیباسا اور اس کے گرد و نواح میں رہتے ہیں۔

یہ سبھی قبیلے ٹکڑیوں میں منقسم ہیں۔ عام طور پر یہ اپنے خاندان کی عورت سے شادی نہیں کر سکتے۔ بالغوں کی شادی کا رواج ہے اور شادی کے قبل بڑی جنسی آزادی پائی جاتی ہے۔ سیندور دان یا دلہن کی پیشانی پر سیندور لگانا۔ شادی کی رسم کا ایک ضروری حصہ ہے۔ برہور اس رسم کو سیندور ریک کہتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک مزید دستور یہ ہے کہ دولہا اور دلہن ایک ساکھی (خون آلودہ چیتھڑے) کے ذریعے سے ایک دوسرے کو اپنا خون بھیجتے ہیں۔ سنتال اور پہاڑی کھاریا لوگوں میں اک ٹٹ یا زبردستی ٹیکہ لگا کر شادی کر لینے کی بھی اجازت ہے۔ سنتال بیوائیں اپنی پسند کے مرد کو ایک جبری شادی (نر بولوک) پر مجبور کر سکتی ہیں۔

عام طور پر شادیاں دوسروں کے ذریعے طے پاتی ہیں۔ حالانکہ زیادہ تر شادیاں محبت کی بنا پر ہوتی ہیں کیونکہ جنسوں میں بڑی حد تک آزادی ہوتی ہے۔ منڈا اور سنتال بیواؤں کی شادی کو مقدس تصور کرتے ہیں طلاق کی اجازت ہے اور مطلقہ کی دوبارہ شادی ہو سکتی ہے۔

برہور پہاڑی بھوئیا اور سنتال اپنے مُردوں کو جلاتے

ہیں۔ لیکن بابور بھنج کے کول اور گونڈ اپنے مُردوں کو دفن کرتے ہیں۔

منڈا اور سنتال دونوں نے دیہاتی وفاقی حکومتیں قائم کرکے حیرت انگیز تنظیمی اہلیت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کا پنچایتی طریقہ ان کے جذبہ شہریت کا مظہر ہے اور دیہی افسروں کے عہدے ان کے اداروں کی جمہوری فطرت کا پتہ دیتے ہیں۔

یہ قبائلی بڑے مضبوط رگ و ریشے کے آدمی ہیں اور بہت اعلیٰ اخلاقی معیار کے حامل ہیں۔ ان کی صفائی پسندی۔ جمالیاتی ذوق اور سادہ مزاجی کی اکثر تعریف ہوتی ہے۔ اب ان کے مذہب کو محض بھوت پریت کی پوجا نہیں کہا جاتا۔ سرت چندر رائے نے بیان کیا ہے کہ یہ لوگ کس اعلیٰ جذباتی پائے پر اپنی قابل پرستش روحوں (بونگ) سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان میں ایک ہاتھ پیر نہ ہلانے والے خدائے اعلیٰ کا اونچا تصور موجود ہے۔ اس خدا کو سنتال ٹھاکر جیو اور منڈا سنگھ بونگ کہتے ہیں۔

منڈا کی لوک کہانیاں ان لوگوں کے رومانی کردار کا پتہ دیتی ہیں ان کے لوک گیت ہمیں چینی اور جاپانی شاعری کی یاد دلاتے ہیں پادری ہاف مین کے جمع کردہ دیوان میں سے ایک منڈا گیت کا نمونہ ملاحظہ کیجئے :۔

تو کس پھول میں پھولی کنواری
تجھ میں پھولوں کی خوشبو ہے
تو کس ٹہنی میں کس مالا میں پروان چڑھی کنواری
تجھ سے نوشگفتہ پھولوں کے گچھوں کی مہک آرہی ہے

اور سنتال کا ایک عشقیہ اس طرح پر ہے

لڑکا - پریم - پریم - پریم اے بھابھی
اس لفظ کے معنی کیا ہیں - بتا ہی دے مجھے
لڑکی - پریم کوئی اچھی چیز نہیں
جب کوئی پریم کا برابر دھیان کرتا ہے
تو نیناں نیر ہی نیر بہاتے ہیں
سامنے کھانا رکھا ہے - اے لڑکے
لیکن کھانے کو کوئی خواہش ہی نہیں ہوتی
جب میں (اس کی) یاد کرتی ہوں
تو میں ڈھیلے جوڑے کو باندھ نہیں سکتی
جوڑا کھلا ہے - اور میں باندھ نہیں سکتی
گگری بھرتی ہوں اٹھا کر ران پر رکھ لیتی ہوں
لیکن جی نہیں چاہتا کہ اسے سر پر رکھ لوں
ارے پریم - مرے اچھے بھائی - پریم تو کسی طرح اچھی چیز نہیں۔

دراوڑی

دراوڑی نسل کے قدیم باشندے جنہیں رگ وید کے زمانے کے آریہ اسُر، دسیّت اور دانو کے نام سے جانتے تھے۔ ہندوستان میں شمال مغربی دروں سے آئے اور یہاں انہوں نے تہذیب کا ایک اعلیٰ معیار حاصل کیا۔

لسانیاتی شواہد کی رو سے اوراؤں اور پہاڑیا کبھی ایک ہی قبیلہ تھے۔ اوراؤں اپنی زبان میں خود کو کورکھ کہتے ہیں۔ اوراؤں کا نام راونا پوت (لنکا کے راکشش راجہ راون کا بیٹا) سے نکلا ہے۔ دراوڑی پہاڑیوں کی طرح اوراؤں کا قبیلہ جاتی نشان (جس کی پوجا ہوتی ہے اور جس سے ڈرا جاتا ہے) بندر ہے۔ ان لوگوں کا فخریہ دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے بیل کا استعمال کیا اور روہتاس کے مرتفع علاقے میں ایک پتھر کا قلعہ بنایا۔

ان کے پنچ (دیہاتی بزرگ) دیہاتی قبرستانوں میں جمع ہو اپنے اجداد کی ہڈیوں پر برابر پہرہ دیتے ہیں۔ اوراؤں میں موسم بہار کا شکار صرف جوانوں تک محدود رہتا ہے لیکن گرمی کے شکار کی اجازت عام ہے۔

بعض مقتدر مؤرخین نے اوراؤں کی جفاکشی کی صلاحیت کو بہت سراہا ہے۔ ڈبلیو۔ جی۔ آرچر نے اوراؤں کے کردار پر ایک نوٹ لکھتے ہوئے یاد کیا ہے کہ ان میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ جذبے کو عمل کی صورت میں دیکھتے ہیں اور اسے لیت و لعل میں ڈال کر الجھاتے نہیں اس سلسلے میں ان کے لوک گیت (مترجمہ ایس سی رائے مرحوم) سے ایک اقتباس حاضر ہے۔

آؤ ہم دونوں اے لڑکی۔ ٹیکو چشمے پر چلیں

آؤ ہم دونوں اے لڑکی - اپنے جنگل جائیں
اپنے جنگل میں اے لڑکی - ہم پتی جمع کریں
ٹیکو چشمے میں اے لڑکی - ہم مچھلی پکڑیں

اس کھڑکھڑاتی لاری سے جو راج محل پہاڑیوں سے پاکور کی
طرف جاتی ہے کبھی کبھی خرید و فروخت کرتی ہوئی دوشیزاؤں کی جھلکیاں
دکھائی دیتی ہیں - یہ حسین شکلیں جن میں ایک خاص آن بان پائی
جاتی ہے - پہاڑیا لوگوں کی ہوتی ہیں جو اس پہاڑی میں بستے ہیں
ان کے مردوں کی ناک چوڑی - چہرے بیضوی - آنکھیں کھلی اور
بڑی ہوتی ہیں - یہ اپنے بالوں کو لال پگڑیوں کے پیچھے گرہ دے کر باندھ
لیتے ہیں - جب یہ قومی مرد نشیبی بازاروں میں سرخ مونگے کے
گلو بند پہنے پہاڑی حسیناؤں سے چھیڑ چھاڑ کرتے چلتے ہیں تو
بازار میں ایک عجیب رونق آجاتی ہے - یہ لوگ بانس کے ٹھٹھوں کے جھونپڑوں
میں رہتے ہیں اور اس شکار پر گزارا کرتے ہیں جو وہ اپنے زہر آلود
تیروں سے کرتے ہیں - یہ صرف اجنبیوں سے شرماتے ہیں - یہ زندگی اور
زندہ دلی کے دلدادہ ہیں اور تیز شرابوں کے حد سے زیادہ شوقین
قبیلے میں متعدد شادیوں کی اجازت ہے یہ اپنے مُردوں کو دفن کرتے
ہیں - اور آواگون کے معتقد ہیں - ان کے اخلاق اعلےٰ ہیں - وہ مر جائیں گے
لیکن جھوٹ نہیں بولیں گے

منگولی

منگول نسل کے لوگ کئی دفعہ کر کے رفتہ رفتہ ہمالیہ
کے شمالی اور شمال مشرقی خطوں میں گھس آئے -
آریہ انہیں کِراتا کے نام سے جانتے تھے - آج یہ تبتی برمی اور تبتی
چینی لسانیاتی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں -

لیپچا (لفظی معنی بد زبان) جو دارجلنگ ضلع کے مشہور قدیمی
باشندے ہیں خود کو رونگ (زبردستی گھس کر بیٹھنے والے) کہتے ہیں
اور اپنے ملک کو غاروں کا دیس کہتے ہیں - وہ دوسری قوموں سے
آزادی کے ساتھ شادی بیاہ کرتے ہیں - ہوم کی سی بیکار کاشت
کے عادی ہیں - اور جنگلی زندگی کے دلدادہ - نرم مزاجی سست طبعی
سخت یا باقاعدہ کام سے اکراہ - یہی ان کی نمایاں خصوصیات ہیں -
بنگال کے تپ پیرا - پہاڑیوں کی چوٹیوں پر رہتے ہیں - اور
اپنی جھونپڑی کے خاص کھمبے میں غلے کی بالیاں باندھتے ہیں - وہ ہندو
بنگالی ہو گئے ہیں - دھوتی اور پگڑی باندھتے ہیں اور ان کی عورتیں
گہرے نیلے رنگ کے ساڑھی پہنتی ہیں -

آسام میں ہزارہا بانکے ترچھے منگولی قدیم باشندے پائے
جاتے ہیں - نچلے آسام میں آبور اور میری ہیں اور آسامی برمی
شاخ میں بودو گارو اور کچھ شامل ہیں - یہ سب اور ان کے
ساتھ می کِر (ناگا کی جماعت) اور ناگا جماعتیں مطالعے کے
کے لئے دلکش مواد مہیا کرتے ہیں -

گورو جو پہلے انسانی سروں کا شکار کیا کرتے تھے جن کی تاریخ میں ہمیشہ
پُر خطر تجربات نئی مہموں کا افتتاح - جنگ اور آزادی لکھی ہوتی ہے آجکل بس
کر زراعت کرنے اور تعلیم سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں - ہادی اور ہاجونگ قبیلے
جن سے گورو کا قریبی تعلق ہے - ہندو رنگ میں رنگے جا رہے ہیں -

کسی زمانے میں ناگا قبیلے میں دختر کشی اس قدر عام تھی کہ
ناگا جھونپڑوں میں کوئی لڑکی شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی - اب
سروں کے شکار کی طرح یہ رسم بھی غائب ہوتی جا رہی ہے

قدیم باشندوں کے کئی رواج ہمیں افعال قبیحہ معلوم ہوں گے
لیکن انہیں اپنی قدروں سے جانچنا درست نہیں - ان کے معیار بالکل
مختلف ہیں اور بعض اوقات ہم انہیں پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتے - ان
کی روحوں کی نجات کی خاطر ان کو جدید بنانے کی کوشش کا یہی نتیجہ نکلا ہے
کہ وہ اپنی دلی خوشی سے بھی محروم ہو گئے - ان کو معاشرے میں ملانے کی خاطر
مہذب دنیا نے انہیں ایسی "پست اقوام" بنا دیا ہے جن کے پاس اپنا اگلا
وقار بھی نہیں اور جو زندگی کو خود اپنی اصطلاحوں میں سمجھنے سے قاصر ہیں -
ریورس - سرت چندرائے اور ہٹن کے سے ماہرین علم الانسان نے
ان قدیم باشندوں کی اصلاح کے سلسلے میں پھونک پھونک کر قدم
رکھنے کی التجا کی ہے - ان کا کہنا ہے کہ ان قدیم باشندوں کے لئے
تہذیب ایک مشتبہ نعمت ہے - اس میں خود اپنی ہلاکت کا سامان
موجود ہے - آج ہمارے سامنے ان قدیم باشندوں کو سیاسی نظام
میں کھپانے کا سوال ہے (نہ کہ ان کو مہذب بنانے کا)
(مارچ آف انڈیا)

فرحت اللہ انصاری

کدمبہ کی چھاؤں

ہندوستان کی قدیم تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ساری تہذیب درختوں کے سائے اور کھیتوں کی گود میں پل کر جوان ہوئی ہے کہیں ایک خوشحال اور فارغ البال راجا جنگل میں منگل منا رہا ہے تو کہیں ایک خوش خیال و نیک خصال شہزادہ راج پاٹ کو چھوڑ بستی سے جنگل کو منھ موڑ تیاگ اور تپسیا کی دھونی رما رہا ہے۔ کہیں مرلی والے شیام پریم اور پریت کی بنسی بجا رہے ہیں تو کہیں سیتا اور رام بن بن میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ کہیں آریاؤں کے ڈیرے جمے ہوئے ہیں تو کہیں مغلوں اور یونانیوں کے غول اتر رہے ہیں۔ کوئی بھولا بھٹکا ادھر آنکلا ہے تو کوئی سوچ بچار کر دہاں سے یہاں پہنچا ہے۔ کسی کے ہاتھ خالی ہیں تو کوئی سارا علم و ہنر ساتھ ہی لیتا آیا ہے بہرحال جو قافلہ بھی یہاں کسی نہ کسی طرح پہنچ گیا ہے وہ یہاں کے لہلہاتے کھیتوں گنگناتے دریاؤں چھپاتے جنگلوں، لق و دق میدانوں اور فلک بوس پہاڑوں کے حسن و رعب سے ایسا متاثر ہوا ہے کہ ہمیشہ کے لئے یہیں کا ہو گیا ہے۔ اس نے ایک اطمینان کی سانس لی ہے، چمن آرائی قدرت کی داد دی ہے۔

قدرت کی یہ مہربانیاں اور فیاضیاں صرف فخر و مباہات کے لئے نہیں بلکہ اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ جغرافیائی حالات ہر ملک کی تہذیب کو بنانے میں اک بڑا دخل رکھتے ہیں جو خطۂ ارض نوازشاتِ قدرت سے محروم رہا ہے۔ مثلاً مغرب وہاں انسان اور طبعی حالات میں مسلسل کشمکش ہوتی رہی ہے، چنانچہ وہاں تسخیر فطرت ہی انسان کا مقصد حیات بن گیا ہے۔ مگر جو ان نوازشات سے مالا مال رہا ہے جیسے ہندوستان وہاں موسم کی موافقت، زمین کی زرخیزی اور جوش نمو کی برکتوں کی وجہ سے انسان کو فطرت سے بہت کم جنگ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ اس کا بنیادی شعور قدرت سے لڑنا نہیں بلکہ اس کے گیت گانا ہے۔ ہندوستان ایک ایسا خوش نصیب خطہ ہے جس میں وہ چیزیں جو انسان کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتی ہیں مثلاً آتش فشاں پہاڑ سرے سے موجود ہی نہیں ہیں اور وہ جو انسان کی اعانت کرتی ہیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ موسم بھی وقت سے آتے ہیں، وقت سے جاتے ہیں اور اعتدال کی حد سے تو کہیں بھی نہیں گذرتے۔ اس لئے ہندوستان کے ذہن میں قدرت کے جتنے مظاہرات ہیں وہ سب خدا کی رحمتیں ہیں۔ پہاڑ ہیں تو ایذا رسانی کے لئے نہیں پاسبانی کے لئے دریا ہیں تو طغیانی کے لئے نہیں، آبیاری کے لئے جنگل ہیں تو خوف و دہشت کے لئے موسم میں اعتدال لانے اور پریم اور پریت کی بنسی بجانے کے لئے۔

جب طبعی ماحول سازگار ہوتا ہے تو انسان محنت کے بجائے فکر کی طرف مائل ہوتا ہے چنانچہ مشرق و مغرب میں جو تضاد ہے وہ قدرت کی انہی مہربانیوں اور نامہربانیوں کا نتیجہ ہے جب کہ مغرب کا انسان نامہربان قدرت سے لڑتا رہا ہے اور اس طرح محنتی جفاکش اور مادہ پرست بنتا گیا ہے، مشرق کا انسان چاروں طرف شکر و احسان کے سجدے کرتا رہا ہے اور مظاہر قدرت سے عقیدت و محبت کے نت نئے رشتے جوڑتا رہا ہے، چنانچہ ہندوستان کی تہذیب میں مذہب اور مذہب کے معتقدات میں شجر کو ایک بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ویدوں اور پرانوں تعلیمات درختوں اور پودوں کے ساتھ ایسے برتاؤ کی ہدایت کرتی ہیں جیسے ذی روح ہیں۔ متسیہ پران میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ ایک درخت دس بیٹے پیدا کرنے کے برابر ہے۔

جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اس کا فلسفہ تو ذہن سے اترتا گیا۔ اور اس جگہ توہم پرستی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ اب شجر و حجر کی جو کچھ قدر کی جاتی ہے وہ سمجھی پرستش سے زیادہ نہیں ہے لیکن پرانے زمانے میں جب ہماری زندگی آج کی سی بیوپارانہ ذہنیت سے آلودہ نہیں ہوئی تھی انسان پیشے کے لحاظ سے بھی درختوں کے مرتبے کو سمجھتا تھا اور عقیدے کے

سے بھی پہنچا ہے۔ ہندوستان کی تہذیب میں صدیوں ایک غیر معمولی حیثیت حاصل رہی ہے۔ بودھ آرٹ کا تو مستقل موضوع برگد کا درخت ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ مہاتما بدھ نے ایک برگد ہی کے نیچے تپسیا کی تھی۔ اور نروان حاصل کیا تھا بلکہ اس لئے بھی کہ برگد کو ہندوستان میں ہمیشہ سے ایک خاص تقدس و عظمت حاصل رہی ہے۔ ہندو عقیدے میں برگد ہی وہ درخت ہے جو ساری دنیا کے فنا ہو جانے کے بعد بھی باقی رہ گیا۔ شاید اس روائتی عظمت نے مہاتما بدھ کو برگد کے نیچے تپسیا کرنے پہ مائل کیا ورنہ وہ کسی اور درخت کو بھی چُن سکتے تھے۔ بہر حال جب سے مہاتما بدھ نے برگد کو ایک نئی عزت بخش دی اس وقت سے اس کی شہرت و پرداخت پر خاص توجہ کی جانے لگی یہاں تک کہ اشوک نے تو متعدد فرمانوں میں درختوں کے بارے میں عموماً اور برگد کے درخت کے بارے میں خصوصاً احکام صادر کئے ہیں۔ ایک جگہ اشوک نے لکھا ہے کہ ایک راجا جتنے بھی اچھے کام کر سکتا ہے ان میں سب سے اچھا کام درخت لگانا ہے۔ جب سکندر ہندوستان آیا تو یہاں اتنے بڑے بڑے برگد کے درخت تھے کہ انھیں دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ آج بھی بعض درخت قابلِ دید ہیں۔ ایک کلکتہ کے بوٹینیکل گارڈن میں اور دوسرا وہ جو کولمبو میں ہے اور اتنا بڑا ہے کہ اس کے نیچے ہزاروں خیمے نصب کئے جا سکتے ہیں۔

ساوتری اور ستیہ وان کی داستانِ محبت

ساوتری کی جاں نثاری

بھی برگد ہی سے وابستہ ہے۔ کہتے ہیں کہ جب موت کے دیوتا نے ستیہ وان کی روح سلب کر لی اور وہ اُسے لیکر اپنے مستقر نرک (جہنم) کی طرف چلا تو ساوتری بھی اس کے ساتھ ستی ہونے کے لئے چل کھڑی ہوئی۔ موت کے دیوتا نے کہا "جا اپنی راہ لے اس کا پیچھا نہ کر"۔ ساوتری نے جواب دیا "ان کے بغیر یہ دنیا میرے لئے جہنم سے بدتر ہے میں ساتھ ہی چلوں گی"۔ دیوتا نے کہا "جو مانگ میں تجھے دینے کو تیار ہوں مگر ساتھ نہ آ"۔ ساوتری نے پہلے تو ستیہ وان کے ماں باپ کی آنکھیں مانگیں پھر ان کا راج پاٹ مانگا (یہ دونوں نعمتیں ان سے ایک سراپ کے نتیجہ میں چھین لی گئی تھیں) آنکھیں بھی روشن ہو گئیں اور راج پاٹ بھی مل گیا مگر ساوتری نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا یہاں تک کہ وہ دونوں نرک کے دروازے پر پہنچ گئے جب موت کے دیوتا نے دیکھا کہ یہ تو سائے کی طرح پیچھے لگ گئی ہے تو اسے خیال ہوا کہ کہیں ساوتری نرک کے اندر نہ چلی آئے جس کے نتیجے میں نرک بھی سورگ بن جائے۔ چنانچہ اس نے ساوتری سے ایک اور مانگ پوری کرنے کا وعدہ کیا۔ اب کے ساوتری نے لڑکا مانگا۔ دیوتا نے جھنجھلا کر کہا "جا تجھے لڑکا بھی دیا"۔ ساوتری بولی "جب تم نے لڑکے کی مانگ پوری کر دی تو پھر میرے پتی کو کہاں لئے جاتے ہو؟" موت کا دیوتا لاجواب ہو گیا اور اس نے ستیہ وان کی روح کو آزاد کر دیا۔ اس سب میں چودہ دن لگے۔ غالباً جیٹھ یا بیساکھ کی پہلی کو ستیہ وان مرا تھا۔ اور چودھویں کو اپنی ساوتری کی کوششوں سے زندہ ہو گیا۔ چنانچہ گجرات کی طرف اُس مہینے کی پہلی سے پورنما تک اب بھی عورتیں برگد کی پوجا کرتی ہیں اور لڑکے کی مرادیں مانگتی ہیں۔

پیپل کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اس کی جڑ سے لے کر پھنگی تک ہر چیز مقدس ہے۔ اور اس کی ایک ایک پتی میں ایک ایک دیوتا رہتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب پیپل اپنے انتہائی نمو کو پہنچ جاتا ہے تو اس میں تینتیس کروڑ پتیاں ہوتی ہیں اور اتنے ہی ہندوؤں میں دیوتا مانے گئے ہیں۔ چنانچہ پیپل کو کاٹنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ منتادین کا کہنا ہے کہ پیپل ہر قسم کی چڑیوں کا محبوب ترین نشیمن ہے اور ہوا کو صاف کرنے میں بھی تمام درختوں سے زیادہ کام کرتا ہے

تلسی کو غالباً سوشرت اور چرک کے زمانے سے پاکیزگی عطا ہوئی ہے یہ ہند قدیم کے دو عظیم المرتبت حکیم تھے۔ ان میں سے چرک علم الجراحت میں مشہور تھے۔ اور سوشرت علم المعالجہ میں۔ سوشرت کی تصنیفات کے مطابق تلسی نہ جانے کتنے امراض کی دوا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خاصیت یہ بتائی گئی ہے۔ کہ یہ ہر قسم کے متعدی جراثیم کو فنا کر دیتی ہے چنانچہ دواؤں میں استعمال ہونے کے علاوہ آج تک یہ رواج چلا آ رہا ہے۔ کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو اسے سب سے پہلے جو پانی پلاتے ہیں۔ اس میں تلسی کی پتی ضرور ڈالتے ہیں۔ اور جب کوئی مرنے لگتا ہے۔ اس وقت بھی اس کے حلق میں اسی طرح پانی ٹپکاتے ہیں۔

کدمبہ اور کدمبہ کنج کا نام ہر اس شخص نے سُنا ہو گا جو رادھا اور کرشن کے عشق حقیقی کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ہے "مسریہ کدمبہ کی چھیاں مُرلیا باجے" بہت ہی مشہور بھجن ہے۔

یہ گنجان اور لہکدار درخت شاید پیدا ہی اسی لئے کیا گیا تھا۔ کہ اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں کرشن جی پریم اور پریت کی بنسی بجائیں

اور ان کی گوپیاں اٹھکیلیاں کریں۔ جب کرشن جی بندرابن چلے گئے۔ اور رادھا کی دنیا ہمیشہ کے لئے تاریک ہو گئی۔ تو ان کا واحد مشغلہ کدمبہ کی سیوا رہ گیا تھا جس کی ہر چھاؤں میں انہیں کرشن جی اپنی مرلی بجاتے نظر آتے تھے

اسی طرح اشوک کا درخت سیتا اور رام کی محبت سے وابستہ ہے جب راون سیتا جی کو اٹھا لے گیا۔ تو اس نے انہیں اشوک ہی کے جنگل میں نظر بند کیا تھا۔ وہ سارا زمانہ جس میں سیتا کو دوہری اذیتیں اٹھانا پڑیں۔ ایک رام کے انتظار بے حساب کی اذیت دوسرے راون کے پے در پے اصرار کی اذیت اشوک ہی کے بن میں کٹا

مہوے اور آم کے درختوں کو بھی سیتا اور رام کی خدمت کی سعادت حاصل ہے وہ اس طرح کہ جس پنچ کٹی میں سیتا اور رام بن باس کے زمانے میں رہا کرتے تھے۔ اس میں ایک ایک درخت مہوے اور آم کا بھی تھا۔

نیم کی افادیت تو اتنی ظاہر ہے کہ اس کے بارے میں کچھ کہنا ہی بیکار ہے خون کی صفائی کے لئے نیم کی کونپل پینے اور پھوڑے پھنسی میں نیم کی پتیاں باندھنے کا رواج آج تک چلا آ رہا ہے۔ اسی طرح "نمولے" ڈلوا کر دے مسافر آئی سون کی بہار دے "شمالی ہند کا ایک مقبول عام ساون ہے۔

مختصر یہ کہ ماضی کے جتنے ورق الٹتے جائیں ہندوستان کے مذہب آرٹ اور ادب میں درختوں کی اتنی ہی اہمیت واضح ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ جب کچھ نہیں تھا صرف پانی ہی پانی تھا۔ اس وقت بھی بھگوان ایک پتی ہی کی کشتی پر سوار عالم آب میں تیرتے پھرتے تھے۔ موہنجوداڑو اور ہڑپا کی کھدائی میں جو آریوں سے بھی پہلے کی ہندوستانی تہذیب کے نمونے ملے ہیں۔ ان سے ان کی قدامت اور عظمت کا تو پتہ چلتا ہی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ کی مصوری اور نقش نگاری میں پتیوں اور درختوں کو کتنی معنویت حاصل تھی۔ ایک نقش ایسا ملا ہے جس میں دکھایا گیا ہے۔ کہ شیر جھوک سے زمین کرید رہا ہے۔ اور انسان اطمینان کے ساتھ درخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ کالیداس نے اپنی مشہور عالم تصنیف شکنتلا میں ہندوستان کے درختوں اور بنوں کو حیات جاوید عطا کر دی ہے۔ شاعر اعظم ٹیگور کا کہنا ہے کہ شکنتلا سے بن نکال دیئے جائیں تو اس کا حسن آدھا رہ جائے گا قدیم ہند میں جتنے شبھ کام ہوا کرتے تھے۔ مثلاً لڑائی کے بعد صلح وہ سب درختوں کے نیچے انجام دیئے جاتے تھے۔ آج بھی شادی کے گھرانے میں معاذہ کی پیشانی پر ہری پتیوں کی ایک لڑی لگا دی جاتی ہے۔ اور شادی کی تقریب درخت ہی کے نیچے ادا کی جاتی ہے۔ خواہ وہ مصنوعی درخت کیوں نہ ہو۔

جب مسلمان آئے تو وہ بھی اپنے ساتھ درختوں کا ایک حسین تصور لے کر آئے۔ بظاہر وہ گلابی تہذیب جو مسلمانوں کے ساتھ یہاں آئی ہندوستان کی زراعتی تہذیب سے بہت مختلف تھی۔ مگر بنیادی شعور دونوں کا ایک ہی تھا یعنی قدرت کے گیت گانا۔ گیارہویں صدی میں یہ یکسانیت اور بھی گہری ہو گئی تھی چنگیز خان کی غارتگری نے مسلمانوں کے زعم شجاعت پر ایسی ضرب کاری لگائی تھی۔ کہ وہ اللہ اللہ کرنے لگے تھے۔ عام قاعدہ ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے۔ تو انسان خدا کو یاد کرتا ہے۔ چنانچہ مسلمان بھی یاد اللہ میں ڈوب گئے۔ اور شجاعت و بہادری کی جگہ تصوف کے گیت گانے لگے۔ ہندوستان میں یہ ساز پہلے ہی سے چھڑا ہوا تھا۔ اس لئے یہاں کی بھگتی اور وہاں کے تصوف میں کوئی تصادم نہیں ہوا۔ بلکہ امیر خسرو جیسے شاعر اور حضرت نظام الدین جیسے اولیا پیدا ہوئے۔ اس امتزاج نے ملکی اور نو وارد تہذیب پر کیا اثر ڈالا یہ ایک طویل داستان ہے۔ اور یہاں اس کا بیان بے محل بھی ہوگا۔ اس لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ مسلمانوں کی لائی ہوئی تہذیب میں بھی سبزہ و گیاہ کو بڑا دخل حاصل تھا۔ انہیں درختوں سے عقیدت تو نہ تھی مگر محبت بہت تھی۔ ان کی روایات میں نہ حضرت آدم شجر ممنوعہ کے قریب جاتے نہ یہ لغزش انسان کو عالم وجود میں لانے کا بہانہ بنتی۔ مگر فارسی شاعری میں جو اس وقت مسلمانوں کا اک بڑا سرمایہ تہذیب تھی مجرد درختوں کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ کمی سب سے پہلے امیر خسرو نے پوری کی جنہوں نے ہندوستان کے بیشمار درختوں اور پہاڑوں کی تعریف کی ہے۔ ان کا رومان ابھی درختوں سے محض سرو قد اور صنوبر بے قامت کی حد تک وابستہ ہے بن اور جنگل کی جگہ فارسی شاعری میں باغ اور چمن ہیں۔ رادھا اور کرشن کا سا رومان فارسی ادب کو نہیں میسر تھا۔ اس لئے فارسی شاعری میں درختوں کا ذکر اسی حد تک محدود رہا۔ جہاں تک وہ معرفت کردگار کا وسیلہ بن سکتے تھے

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اردو شاعری نہیں کی گھنی چھاؤں میں ایک سنہری بیل کی طرح نکلی اور پھلتی چلی گئی۔ اسی لئے اس میں درختوں کا تذکرہ جتنا زیادہ ہے۔ اور بر او راست ہے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں کم کم باد و باران ہے
چلتے ہوں تو چمن کو چلئے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

غرض چمن و بہار کے تذکروں اور شاخ بارآور کے نصیحت آموز حوالوں سے اردو شاعری بھری پڑی ہے۔

پٹھانوں میں شیر شاہ کو درختوں کے سلسلے میں اشوک کی سی اہمیت حاصل ہے مغلوں میں تو شاید ہی کوئی ایسا بادشاہ گذرا ہو جس نے کہیں نہ کہیں باغ نہ لگائے ہوں۔ پرانے امرا کی ہر حویلی کے ساتھ ایک پائیں باغ کا ہونا قریب قریب ضروری تھا یہ محض شانِ امارت نہیں تھی بلکہ پردے کے رواج کو دیکھتے ہوئے اس وقت کی ایک اچھی خاصی ضرورت تھی۔

عوام جو ہمیشہ سے مشترکہ تہذیب کے حامل ہیں، ان تمام روایات کو سنبھالے رہے جو انھیں ترکے یا ورثے میں ملی تھیں۔ آج بھی ہرے بھرے درخت کو کاٹنا یا شام کے بعد اُسے چھیڑنا مسلمان گھرانوں میں اتنا ہی برا سمجھا جاتا ہے جتنا ہندو گھرانوں میں۔ ظاہر ہے کہ یہ اُسی عظمت و تقدس کا اثر ہے جو ہندو تہذیب میں درختوں کو صدیوں سے حاصل رہا ہے چنانچہ خانقاہوں اور درگاہوں پر نظر دوڑائیے جن کی ساری رونق عوام کے دم سے ہے تو قریب قریب ہر خانقاہ میں ایک نہ ایک املی یا نیم کا درخت ایسا ضرور ملے گا جس کے بارے میں عجیب عجیب روایتیں مشہور ہوں گی کسی درخت پر جن رہتے ہوں گے تو کسی پر بھتنیاں آتاری جاتی ہوں گی یہ توہمات کتنے غلط ہیں اور ان کا جلد از جلد دور ہونا کتنا ضروری ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر ساتھ ہی اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے ذہنوں میں درختوں کو ان کی افادیت کے علاوہ بھی ایک دلچسپ حیثیت حاصل ہے۔

اگر ہندو کے حلق میں مرتے وقت تلسی کا پانی ٹپکانا ایک شبھ کام ہے تو مسلمان کی قبر پر کھجور کی ہری شاخ کھڑی کرنا ایک مستحسن فعل ہے۔ اگر ہندوؤں کا خیال ہے کہ تلسی کی پتی ایک مرنے والے کو پاک و صاف کر دیتی ہے تو مسلمانوں کا خیال ہے کہ جب تک کھجور کی ٹہنی ہری رہتی ہے وہ درود پڑھا کرتی ہے اور صاحبِ قبر کو ثواب بخشتی رہتی ہے۔

باقر رضوی

"— درندگی نہ مٹی"!

مزاجِ حضرتِ انساں کی قاہری نہ مٹی
نظامِ دہر سے رسمِ ستمگری نہ مٹی
ادائے لیلیٰ دوراں بدل گئی لیکن
نگاہِ حُسنِ دل آرا کی دلبری نہ مٹی
غمِ جہاں نے دقیقہ اٹھا نہیں رکھا
کسی طرح سے محبّت کی زندگی نہ مٹی
قدم قدم پہ تجسّس نے ٹھوکریں کھائیں
کشودِ رازِ دو عالم کی تشنگی نہ مٹی
غرور و کبر نے فرمانِ سرکشی لکھا
جبیں عجز سے تحریرِ بندگی نہ مٹی
بشر نے نور سے معمور کر دیا عالم
خود اس کے قلب کی دنیا تھی تیرگی نہ مٹی
سنواری دستِ تمدّن نے شکلِ انساں کی
طبیعتوں میں جو تھی وہ درندگی نہ مٹی
بھٹکتا پھرتا ہے جنگل میں کاروانِ حیات
ہزار راہ نما آئے گمرہی نہ مٹی

ستمبر ۱۹۵۰ء

نئی کتابیں اور رسالے

کتابیں

۱۹۴۹ء کا بہترین ادب یہ کتاب جسے مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی نے اپنی روایتی خوش سلیقگی کے ساتھ پیش کیا ہے، بلامبالغہ تاباں، کمال احمد صدیقی، پرکاش پنڈت اور گوپال متل نے مرتب کی ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں مقالات، منظومات، افسانے اور خاکے۔ ہر حصے کے مضامین نظم و نثر کے انتخاب میں خاصی محنت صرف کی گئی ہے جن فنکاروں کے مقالات نظمیں اور افسانے منتخب کیے گئے ہیں اُن میں احتشام حسین، عبدالعلیم، محمد حسن، ممتاز حسین، ندیم قاسمی، مجاز، جوش، ساحر لدھیانوی، عدم، تاباں، فراق، فیض، محمود جالندھری، جلیلی، میراجی، راشد، ابراہیم جلیس، پرکاش پنڈت، عصمت چغتائی، کرشن چندر، اور کنھیا لال کپور کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس انتخاب میں شامل کی ہوئی اکثر فنی تخلیقات سے نظریاتی طور پر اختلاف ہے لیکن انکی بلند ادبی حیثیت سے انکار نہیں ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ انتخاب ادبی حلقوں میں پسند کیا جائیگا۔ اور یہ مجموعہ اسی انداز کے دوسرے مجموعوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ قیمت چار روپے ضخامت تین سو صفحات سے زیادہ۔

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ شاہراہ۔ اردو بازار دہلی۔

پچھتاوے "شگوفے"، "پرواز"، "مد و جزر" کے مصنف شفیق الرحمن نے تھوڑی مدت میں فنی ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں۔ اور اب اردو کے افسانوی ادب میں انہیں ایک منفرد افسانہ نگار کا مقام حاصل ہو چکا ہے۔ پچھتاوے ان کے افسانوں کا نیا مجموعہ ہے جس میں شفیق الرحمن کا فن اپنے پورے عروج پر نظر آ رہا ہے۔

شفیق الرحمن کے پیش نظر بالعموم سماج کا وہ طبقہ رہتا ہے جسے ہم اپنے برصغیر کے اقتصادی معیار کے مطابق اونچا طبقہ کہہ سکتے ہیں۔ اس طبقے کی زندگی کی عکاسی وہ نہایت ماہرانہ انداز سے کرتے ہیں

شفیق الرحمن کا لہجہ بہت پُرسکون ہے اسلوب ایک عجب انداز کے مزاح کا حامل ہے اور اس مزاح میں جب ہلکے پھلکے مزاج کی چاشنی شامل ہو جاتی ہے تو انداز بیان میں ایک نہایت حسین اور لطیف قسم کی کیفیت جھلکنے لگتی ہے۔ محبت شفیق الرحمن کا خاص موضوع ہے لیکن یہ محبت ایک ذاتی پس منظر کے باوجود اپنے اندر ایک ہمہ گیر پھیلاؤ اور عالمگیر وسعت رکھتی ہے۔

یہ مجموعہ نہایت خوبصورت انداز سے مکتبہ جدید لاہور نے شایع کیا ہے۔ کتابت طباعت کاغذ دیدہ زیب ہیں جلد مضبوط اور حسین ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنہ

کلام شاد (ایک روپیہ چار آنے) **جذبات شاد** (چھ آنے) **لقائے سخن** (ساڑھے چار آنے) **نالۂ دل خراش** اور **پنجۂ پنجتن** ــــــ نظم کی یہ پانچوں کتابیں منشی المتاپرشاد شاد میرٹھی مصنف میر رسول نگری کی تصانیف ہیں جو مندرجہ ذیل پتہ سے مل سکتی ہیں۔ یال پی خانقاہ حسن

رسالے

اردو ادب یہ مکتبہ جدید کا دو ماہی رسالہ ہے جسے سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری مرتب کرتے ہیں۔ زیر نظر پرچہ اس رسالے کا دوسرا شمارہ ہے جس میں بھارت اور پاکستان کے تقریباً تمام بلند پایہ فنکاروں کے نام نظر آتے ہیں۔ حصہ مضامین میں محمد حسن عسکری، باری (جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے)، عزیز احمد اور مختار صدیقی، حصہ نظم میں راشد، سلام، یوسف ظفر، قیوم نظر، اختر، فراق اور عدم، طنز و مزاح میں منٹو، کپور اور شوکت تھانوی اور افسانوں میں ممتاز مفتی، اشفاق احمد، منٹو، عزیز احمد اور ابوسعید قریشی کی تخلیقات پیش کی گئی ہیں۔ عشرت رحمانی نے اپنی کوششوں سے آغا حشر کاشمیری کا ایک ڈرامہ "رستم و سہراب" بھی "اردو ادب" کے لیے کہیں سے ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس ڈرامے کے چند حصے مدت ہوئی نیرنگ خیال میں چھپے تھے۔ اب ادارہ "اردو ادب" نے اسے مکمل صورت میں پیش کیا ہے۔ آغا حشر کے ڈراموں کو اس طرح مکمل صورت میں کہیں سے ڈھونڈ نکالنا اور انہیں دنیائے ادب میں پیش کرنا ایک بہت بڑی ادبی خدمت ہے۔ اور ادارہ اردو ادب اس کے لیے مستحق مبارکباد ہے۔ ناشر مکتبہ جدید لاہور۔ قیمت ایک شمارہ دو روپے آٹھ آنہ سالانہ قیمت بارہ روپے۔

چٹان عید نمبر مرتبہ شورش کاشمیری۔ اس خاص نمبر کی تکمیل میں فاضل مدیر کے علاوہ عبدالمجید سالک، حمید نظامی، غلام رسول مہر، مولانا ظفر علی خان، علامہ محمد اسد اور پاکستان کے دیگر معتبر اہل قلم نے حصہ لیا ہے۔ قیمت ۸ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ منیجر چٹان میکلوڈ روڈ۔ لاہور۔



بچوں کا آج کل

گراموفون سُن کر

آغا صادق

کس نے یہ ریکارڈ بجائے — میٹھے میٹھے راگ سُنائے
راگ سُریلے ساز رسیلے — کس کا گیت ہے "پی رے پی رے"
کون چھپا ہے ساز کے اندر — بجلی ہے آواز کے اندر
کس کی یہ ایجاد ہے باجا — کس موجد کی یاد ہے باجا
کوئی بھی ہو اس سے کیا مطلب! — کیوں پوچھیں ہم قوم اور مذہب
مر کر بھی وہ زندہ رہے گا — نام اُس کا تابندہ رہے گا
باجے میں کیا سحر بھرا ہے — کانوں پر احسان کیا ہے
فاش ہوئے ہیں راز کہاں تک — عقل کی ہے پرواز کہاں تک
رمزیں ہیں ہر بات کے اندر — من ہے موتی تن ہے سمندر
ہم بھی ہیں ریکارڈ خدا کے — جیتے جاگتے چلتے پھرتے
سانس بھرا ہے ہم میں اسی کا — نغمہ ہے ہر دم میں اُسی کا
اُس نغمے کا ساز ہمیں ہیں — مولا کی آواز ہمیں ہیں

اندرجیت رانجھو

پہلی تنخواہ

ایک ایکٹ کا ڈرامچہ

کام کرنے والے

گوپال ...... بارہ برس کا ایک لڑکا
بڑھیا ...... گوپال کی بوڑھی ماں
بوڑھا ...... گوپال کا ضعیف باپ
جگہ .... گوپال کا مکان
وقت .... پانچ بجے شام
تاریخ .... یکم ستمبر ۱۹۵۰ء

نظارہ

اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان میں بوڑھا اور بڑھیا ایک چٹائی پر بیٹھے ہیں۔ اُن کے سامنے کھانا رکھا ہے۔ اور وہ کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ دونوں بہت خوش و خرم نظر آ رہے ہیں۔

بڑھیا۔ آج میرا گوپال پہلی تنخواہ لے کر آئے گا۔ بیس روپے۔ پورے بیس روپے۔ بس وہ اب آتا ہی ہوگا۔ اس وقت ہر روز آ جاتا ہے

بوڑھا۔ ہاں واقعی۔ آج انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ ہے۔ گوپال کو تنخواہ ملے گی۔ میں تمباکو بھی خرید سکوں گا اور جوتا بھی۔ تین دن سے میں نے تمباکو نہیں پیا۔

بڑھیا۔ تمہارے تمباکو ہی نے تو اس گھر کو برباد کیا ہے۔ تمباکو کے دھوئیں کے ساتھ ہماری ساری خوشیاں اُڑ گئیں۔

بوڑھا۔ تم کیا جانو تمباکو کے فائدے۔ میں اسی تمباکو ہی کے بل بوتے پر ساٹھ سال کی عمر میں بھی چوکیداری کرتا رہا ہوں۔ پانچ منٹ تمباکو پی کر میں پانچ گھنٹے کھانسا کرتا تھا۔ اور نیند آنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اور کمیٹی کے سب چوکیداروں سے میرا کام اچھا ہوتا تھا۔

بڑھیا۔ اور اگر تم تمباکو نہ پیتے تو آج بھی جوان ہوتے۔ دیکھئے نہ جگو کو۔ آپ سے عمر میں بڑا ہی تو ہے اور آج بھی چوکیداری کر رہا ہے۔ اور تمہیں کمیٹی والوں نے اس لئے نوکری سے علیحدہ کر دیا ہے کہ تم اتنے بوڑھے ہو گئے ہو کہ کام کرنے کے قابل نہیں رہے۔

بوڑھا۔ (کھانستے ہوئے) انسان آخر بوڑھا ہی ہو جاتا ہے۔ اگر نوکری چھوٹ گئی تو کونسا طوفان آ گیا۔ لڑکا جوان ہے ہمیں کھلائے گا۔ آج ہی تمباکو، جوتا، کرتا اور شکر سب لے آؤں گا۔ پورے بیس روپے لائے گا گوپال

بڑھیا۔ تو گویا وہ تمام روپے تمہیں ہی دے دے گا ذرا مُنہ تو دیکھو۔ ہر روز بچارے کو پیٹا کرتے تھے۔ وہ تو اپنی پہلی تنخواہ آتے ہی میرے حوالے کر دے گا۔



بوڑھا - کھوں کھوں - ابھی تک میں زندہ ہوں - تمام روپیہ میرے پاس رہے گا - تم کون ہوتی ہو تنخواہ لینے والی -

بڑھیا - ان روپوں سے نہ تو جوتا آئے گا نہ کرتا - نہ تمباکو آئے گا نہ شکر - ان سے تو میں گوپال کے کپڑے سلواؤں گی - اور باقی روپے جمع کروں گی - آخر اس کی شادی بھی تو کرنی ہے - گھر کا خرچ تو میں خود ہی چلا لوں گی - ایک گھر کے اور برتن لے لوں گی - سیٹھ جی بھی کہہ رہے تھے - کہ اگلے ماہ میری تنخواہ سات روپے کر دیں گے -

اتنے میں دروازے پر دستک ہوتی ہے - اور دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں - اور خود دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں - اور بوڑھا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو جاتا ہے -

بڑھیا گوپال کو دیکھتے ہی اس کا سر چوم لیتی ہے

بڑھیا - گوپال آج تم نے بڑی دیر کر دی -

گوپال - آج تنخواہ کا دن تھا - اس لئے دیر ہو گئی ہے

بڑھیا - آؤ بیٹا پہلے کھانا کھا لو -

بوڑھا - آج تمہیں بھی تو تنخواہ ملی ہو گی -

گوپال - جی ہاں -

بوڑھا - لاؤ تنخواہ میرے حوالے کرو -

بڑھیا - بیٹا! تنخواہ اپنی ماں کو دینا -

بوڑھا - ہرگز نہیں - دیکھو گوپال تنخواہ فوراً مجھے دے دو -

گوپال - لیکن ....



بوڑھا - لیکن ویکن کچھ نہیں سنوں گا میں - سیدھے ہاتھوں تنخواہ نکال کر مجھے دے دو -

بڑھیا - نہ بیٹا - تنخواہ مجھے دینا - اپنی ماں کو

بوڑھا - (گوپال پر جھپٹتے ہوئے) کیا تم نے ابھی تک نہیں سنا - نکالو تنخواہ - جلدی نکالو -

گوپال - (ڈرتے ہوئے) تنخواہ - وہ تو کھو گئی ہے -

بوڑھا - بیوقوف - کھو کیسے سکتی ہے - بھلا تنخواہ بھی کھو سکتی ہے ؟

گوپال - شاید راستے میں کہیں گر گئی ہے -

بوڑھا - کیا تم نے اسے تلاش نہیں کیا ؟

گوپال - بہت تلاش کی - لیکن نہ ملی - اسی لئے آج دیر ہو گئی ہے -

یہ سُن کر بڑھے کو بہت غصّہ آجاتا ہے۔
اور حقّے کی نلی نکال کر اُسے مارنے لگتا
ہے۔ بڑھیا اُسے چھڑاتی ہے۔ اور
وہ بسورتے ہوئے چارپائی پر جا گرتا
ہے۔ اس کے بعد بوڑھا جلدی جلدی
کھانا کھاتا ہے۔ اور دونوں کی جانب
گھورتے اور کھانستے ہوئے باہر نکل
جاتا ہے۔

بڑھیا۔ (گوپال کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے)
بیٹا تنخواہ کے کھو جانے کا فکر نہ کرو۔ آؤ پہلے
کھانا کھالو۔

گوپال۔ (روتے ہوئے) اوں۔ اوں۔ پتا جی

بڑھیا۔ فکر نہ کرو۔ وہ کھانا کھا کر چلے گئے
ہیں۔ آؤ اب ہم دونوں مل کر کھانا کھائیں۔

گوپال۔ (مسکراتے ہوئے) لو ماں! آج تمہیں
ایک چیز دیتا ہوں۔

بڑھیا۔ (حیرت سے) کیا چیز؟

گوپال۔ پہلے ہاتھ نکالو۔

بڑھیا۔ (ہاتھ پھیلاتے ہوئے) آخر ہے کیا؟

گوپال۔ تمہارے گوپال کی پہلی تنخواہ۔

اور اتنا کہہ کر دس دس کے دو نئے
نوٹ ننھا گوپال ماں کی ہتھیلی پر رکھ
دیتا ہے۔ اور ماں اس کا منہ چوم
لیتی ہے۔

[پردہ]

دہلی کی نندن ناصح

پیٹو مل

پیٹو مل ہے میرا نام — دن بھر کھانا میرا
کھاتا ہوں اِملی امچور — چٹ کرتا ہوں سیب ا
کیلا جامن آم انار — کھا کر لینا نہیں ڈ



روٹی سالن اور اچار — کھاتا ہوں دن میں دس
موٹا ہوں لیکن کمزور — دودھ ملائی کا ہوں چ
پڑھنا لکھنا مشکل کام — کیوں کر لوں میں اُن کا ن
لاؤں مٹھائی چھوڑ کے کام
امّی دے دو تھوڑے دام

آگ

سعید اختر

انسان کی ساری تہذیب اور ساری زندگی کی بنیاد آگ ہی پر ہے۔ آگ ہمیں سردی سے بچاتی ہے۔ اندھیرے کو اُجالے میں بدلتی ہے۔ ہم اس سے کھانا پکاتے ہیں، اور اسی کے ذریعہ دھاتوں کو پگھلا کر اوزار، ہتھیار اور مشینیں بناتے ہیں۔ اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ انسان کو آگ کہاں سے ملی؟

خیال یہ ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے انسان کو سردی سے بچنے کے لئے کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہوگی۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکا ہوگا کہ وہ کیا چیز ہو سکتی ہے پھر کبھی یا تو ایسا اتفاق ہوا ہوگا کہ جنگل کے درختوں کے باہم رگڑ کھانے سے۔ پہاڑ سے کسی پتھر کے لڑھک جانے یا بجلی کے گرنے سے آگ لگ گئی ہوگی اور اس نے سمجھا ہوگا کہ سردی سے بچنے کے لئے اُسے اسی چیز کی ضرورت ہے۔

شروع میں تو وہ اس سے خوف زدہ بھی ہوا ہوگا لیکن آہستہ آہستہ اُس نے ہمت سے کام لے کر درخت کی کسی جلتی ہوئی شاخ کو اُٹھا لیا ہوگا۔ اور چونکہ انسان کو اس وقت آگ جلانے کا طریقہ معلوم نہیں تھا اور اسے اس بات کا اندیشہ تھا کہ ہوا یا بارش اس آگ کو بجھا دے گی۔ اس لئے اس نے اوّل تو اُسے کسی غار میں محفوظ رکھا ہوگا۔ دوسرے اس پر گھاس پھونس ڈال کر اُسے برابر جلائے رکھنے کی کوشش کی ہوگی۔

یہ انھیں کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج تمام دنیا آگ جلانے کے آسان طریقوں سے واقف ہے۔ لیکن جو لوگ دیا سلائی یا لائٹر سے ناواقف ہیں وہ آج تک پُرانے ہی طریقہ سے آگ جلاتے ہیں۔



آؤ اب ذرا یہ دیکھیں، کہ آگ کیا چیز ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آگ ہوا میں موجود آکسیجن کے ساتھ کچھ اور اجزا کے مل جانے کا اور اس طرح ان اجزا کے ایک نئی شکل اختیار کر لینے کا نام ہے۔ ہم کوئلہ، لکڑی، تیل وغیرہ کی صورت میں جن چیزوں کو جلاتے ہیں ان میں کاربن ہوتا ہے۔ اور جب کاربن کو ایک خاص حد تک گرم کر دیا جاتا ہے تو وہ ہوا میں ملی ہوئی آکسیجن کے ذروں سے مل کر کاربونک ایسڈ گیس پیدا کرتے ہیں۔

اِس تمام عمل سے وہ گرمی پیدا ہوتی ہے جسے ہم آگ کہتے ہیں۔ اور گرمی کے زمانے میں آگ لگنے کی جو بڑی بڑی وارداتیں ہوتی ہیں اُن کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس موسم میں اوّل تو سورج کی گرمی کی وجہ سے وہ کاربن جو بہت سی چیزوں میں ہوتا ہے، خود ہی گرم ہو جاتا ہے، دوسرے جب کسی ایسی چیز کو جس میں کاربن ہوتا ہے، تھوڑی سی گرمی بھی پہنچتی ہے، تو وہ جلنے لگتی ہے، اور آس پاس کی چیزوں کے کاربن کو گرم کرکے انھیں بھی جلا ڈالتی ہے، اور چونکہ یہ عمل جاری رہتا ہے۔ اس لئے آگ بہت جلد پھیل جاتی ہے۔

دنیا میں نظر آنے والی ہر چیز ہی نہیں، بلکہ ہر ذرّے کی کہانی بہت لمبی ہے، اور دلچسپ ہے، اور آگ کی کہانی تو قدرت کی کہانیوں میں بہت ہی زیادہ لمبی اور دلچسپ ہے۔ لیکن میں اسے یہیں ختم کرتا ہوں۔

قہقہے

دن

موہن۔ کیوں بھئی اسلم، آج کونسا دن ہے؟

اسلم۔ جمعرات

موہن۔ ارے دوست میں دن پوچھ رہا ہوں رات نہیں۔

لیٹر بکس

مالک۔ کیا تم نے لیٹر بکس کا نام سُنا ہے؟

نیا نوکر۔ حضور! کریم بخش۔ خدا بخش۔ رحیم بخش اور ستار بخش کی طرح یہ بھی کوئی نام ہوگا۔

مالک۔ نہیں، تم نہیں سمجھے، میرا مطلب پوسٹ بیگ سے ہے۔

نیا نوکر۔ تو حضور عظیم بیگ، سلیم بیگ اور ندیم بیگ کی مانند یہ بھی کوئی مشہور آدمی ہوں گے۔

امتحان

باپ۔ کہو بیٹا امتحان کیسا رہا؟

بیٹا۔ بہت خوب ابّا جان، میرا صرف ایک سوال غلط ہے۔

باپ۔ شاباش، کل کتنے سوال تھے؟

بیٹا۔ سوال تو سات تھے لیکن میں نے صرف ایک کیا ہے۔

کیچڑ

اُستاد۔ گوپال، آج تم آدھ گھنٹہ دیر سے آرہے ہو۔

گوپال۔ جناب راستے میں بہت کیچڑ تھا، ایک قدم آگے بڑھاتا تھا تو جوتا لانے کے لئے دو قدم پیچھے جانا پڑتا تھا۔

اُستاد۔ تو پھر تم اسکول کیسے پہنچ گئے؟

گوپال۔ میں نے اسکول کی طرف پیٹھ کرلی تھی اور گھر کی طرف منہ۔

فاطمہ جاوید

دادا میاں نے عید منائی

ہمارے دادا میاں بھی پُرانے زمانے کے آدمیوں میں عجیب ہی آدمی تھے۔ ایسی ہی ایک عید کا ذکر ہے کہ رمضان شریف کی انیسویں تاریخ تھی۔ مغرب کے وقت سبھی نے گھور گھور کر آسمان پر چاند دیکھا لیکن چاند نظر نہ آیا۔ سب مایوس ہو گئے۔ لیکن دادا میاں دس بجے رات کو گھر سے چل دیئے۔ اللہ جانے کب تک گھومتے پھرتے رہے۔ یکایک ایک بجے ہانپتے کانپتے گھر میں داخل ہوئے، اور خوشی خوشی زوردار آواز میں نعرے لگانے لگے "ارے چاند ہو گیا سُنتی ہو، چاند ہو گیا۔ ریڈیو سے خبر آئی ہے۔ دادی نے بستر پر کروٹ بدل کر کہا کہ چاند ہو گیا تو کون سا غضب ہو گیا۔ صبح سورج بھی نکلے گا مطلب یہ کہ اب سو جاؤ۔ مگر دادا میاں کب ماننے والے تھے۔ ایک ایک بچے کو اُٹھا دیا۔ دادی بھی جھنجھلا کر اُٹھ بیٹھیں، دادا میاں نے کہنا شروع کیا میں کہتا ہوں چاند ہو گیا۔ میرے کپڑے وپڑے ٹھیک کر دو۔ کچھ پیسے دیدو تو دودھ والے کو پیشگی دے آؤں۔ تاکہ صبح سب سے پہلے اپنے ہاں دودھ آ جائے۔ بچوں کی خوشی ہو جائے گی۔ دادی جل کر بولیں، بچوں کا نام کیوں لیتے ہوں۔ اپنا ہی کہو۔ دادا میاں بگڑ گئے۔ کہنے لگے تم تو سال کے سال تہوار کے دن بھی لڑائی جھگڑے کی باتیں کرتی ہو، لو میں یہ چلا۔ دادا میاں نے جانے کے لئے اپنی لاٹھی اُٹھائی، دادی نے جھٹ لاٹھی اُن کے ہاتھ سے لے لی، اور دودھ کے لئے ایک روپیہ دے دیا۔ دادا میاں روپیہ لے کر چلے گئے۔ پھر دجانے کب آئے اور سو گئے۔ تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے پھر شور مچایا، اری نصیبا او نصیبا، اُٹھ تو جلدی نہانے کے لئے پانی تو رکھدے چولہے پر۔ نصیبا ہمارے ہاں کی نوکرانی تھی۔ دن بھر کام کر کے تھک جاتی تھی بیچاری۔ مگر دادا میاں کے خوف سے جلد ہی اُٹھ بیٹھی۔ اور جب اُس نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی دیکھی تو کہا، ابھی تو چار بجے ہیں۔ دادا میاں نے ڈانٹ کر کہا چپ



چڑیل کہیں کی، میں جو کہتا ہوں وہ کر۔ صبح مجھ کو عیدگاہ نماز کو جانا ہے دیر ہو گئی تو نصیبا نے چولہا سُلگایا اور پانی رکھدیا کوئی چھ بجے کے قریب بلکہ چھ بجے سے پہلے ہی پھر دادا میاں کی آنکھ کھُل گئی۔ اور اُنھوں نے سب سونے والوں کو اُٹھا دیا اور اپنے نئے کپڑے لے کر غسل خانے میں چلے گئے۔ کچھ دیر ہوئی ہوگی۔ کہ غسل خانے کے اندر سے آواز آئی۔ نصیبا اری

او نصیبا، جلدی آ، دوڑ کے آ۔ نصیبا دوڑی ہوئی آئی، اور دادا میاں کو دیکھکر حیرت میں پڑ گئی۔ اُن کے انگوٹھے سے خون بہہ رہا تھا۔ جلدی میں اُن کے ہاتھ سے پیتل کا وزنی لوٹا چھوٹ گیا اور پیر پر گر پڑا جس سے ناخن ٹوٹا اور سخت چوٹ آئی۔ دادا میاں سیدھے شفاخانے پہنچے۔ وہاں مرہم پٹی ہوئی، پھر واپس گھر آئے۔ اچکن میں بٹن ٹکوائے۔ شیر خورمہ کھایا۔ چھتری اُٹھائی۔ اور عیدگاہ کا ارادہ کیا۔ مگر یکایک اُنھیں خیال آیا، دادی سے بولے ذرا پانچ روپے تو دیدو۔ تہوار



کا دن ہے، بچوں کو عیدی دے دوں۔ میں پھر تمھیں یہ روپے لوٹا دوں گا۔ دادا میاں روپے پیسے کے معاملے میں بھی بڑے حضرت تھے، اپنی پنشن اور بھائی جان کی تنخواہ گھر کے خرچ کے لئے دیتے تھے، اور اُن کے مکان کا جو کرایہ آتا تھا وہ خود اپنے خرچ کے لئے رکھتے تھے۔ اُس میں سے ایک پیسہ کسی کو نہ دیتے تھے، اور جب اُنھیں روپیہ پیسہ لینا ہوتا تھا تو دادی سے باتیں بنا کے اُدھار کے نام سے لے لیتے تھے، دادی نے پانچ روپے دے دئے۔ وہ جانتی تھیں کہ اگر روپیہ نہ دیا جائے گا تو نئے کپڑے اُتار دئے جائیں گے۔ لاٹھی اُٹھا لی جائے گی اور کہا جائے گا کہ اچھا تو میں یہ چلا۔

دادا میاں نے پانچ روپے کے پیسے منگوائے، اور چار چار آنے بچوں کو تقسیم کئے، بقیہ اپنی جیب میں رکھے۔ اور عیدگاہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستے میں اُنھیں خیال آیا کہ مولوی حشمت علی اُن کے پُرانے دوست ہیں۔ انھیں بھی ساتھ لے لو۔ دادا میاں مولوی حشمت علی کے مکان پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ جا چکے ہیں۔ لیکن اُن کے لڑکے نے دادا میاں کو روک لیا، اور کہا کہ تھوڑا سا شیر خورمہ چکھ لیجئے۔ دادا میاں کمرے میں بیٹھ گئے۔ لڑکے نے ایک کٹورے میں شیر خورمہ اور ایک پلیٹ میں سوّیاں لا کر سامنے رکھدیں۔ دادا میاں نے شیر خورمہ اور سوّیاں کھا لیں۔ لڑکا بہت ظریف طبع تھا۔ کہنے لگا کہئے مزاج کیسا ہے۔ کئی دن میں اِدھر آنا ہوا۔ دادا میاں نے کہا، ہاں بھئی سب خیریت ہے۔ آج ہی صبح صبح نہلاتے وقت پیر پر لوٹا گر پڑا۔ سارا انگوٹھا زخمی ہو گیا۔ لڑکے کو دادا میاں کا چہرہ دیکھکر ہنسی آ رہی تھی مگر وہ جان بُوجھ کر اپنی ہنسی روک رہا تھا۔ دادا میاں نے الائچی دار پان کھایا اور عیدگاہ کی طرف چل دئے لیکن جب عیدگاہ پہونچے تو اُنھیں بہت ہی دُکھ ہوا۔ کیونکہ نماز ہو چکی تھی۔ دادا میاں غصے میں واپس آئے اور سیدھے گھر پہنچے لیکن جیسے ہی دادا میاں نے گھر کے اندر قدم رکھا، گھر کے اور محلّے کے بچّے کھِل کھِلا کر ہنس پڑے۔ دادا میاں بچّوں کی اس ہنسی کا مطلب نہیں سمجھے اور ان پر خفا ہونے لگے، تب دادی نے بھی دیکھا اور کہا اے تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ ذرا آئینہ تو دیکھو، دادا میاں نے آئینہ میں جو اپنی صورت دیکھی تو جھینپ کے رہ گئے، انھوں نے ڈاڑھی پر خضاب لگا کر جو کپڑا باندھا تھا وہ بندھا کا بندھا رہا اور دادا میاں عیدگاہ ہو کر آ گئے۔



آج رات کو...

اپنے مہمانوں کی خاطر
ڈالڈا
میں بنے ہوئے
ٹماٹر مہاشا سے کیجئے!

ٹماٹروں میں فولاد ہوتا ہے جو خون کیلئے مفید ہے۔ انہیں صحت بخش وٹامن بھی رہتے ہیں۔ ٹماٹر تازے بھی کھائے جاسکتے ہیں یا انہیں اس طریقہ سے لذیذ بنا کر بھی۔ چھ اچھے ٹماٹروں کے سر کاٹ دیجئے اور انہیں کھوکھلا کر لیجئے۔ ڈالڈا میں کترے ہوئے پیاز تلئے۔ نصف چائے کی پیالی بھر اُبلی ہوئی گلی مسور کی دال یا اُبلا ہوا قیمہ، اُبلے ہوئے کچلے آلو، کتری ہوئی سبز مرچیں اور نمک ملا کر ٹھنڈا کر لیجئے۔ اس مصالحہ کو ٹماٹروں میں اچھی طرح بھر دیجئے اور کھلے حصہ کو میدے سے ڈھکئے۔ ڈالڈا کو توے پر گرم کر کے ٹماٹروں کو پہلے میدے والے حصہ کی طرف سے تلئے۔ جب سُرخ پڑ جائیں تو انہیں پلٹ کر سب اطراف سے آہستہ آہستہ تلئے۔ ڈالڈا میں بنے ہوئے کھانے کا مزہ برقرار رہتا ہے اور کھانا ٹھنڈا ہو یا گرم، لذیذ ہوتا ہے۔ ڈالڈا ایک خالص نباتاتی چکنائی ہونیکے، یہ ایسے کھانوں کو تلنے کیلئے موزوں ہے جن کیلئے زیادہ وقت درکار ہے اور اسی بنا پر انہیں اچھی طرح سے پکا دیتا ہے۔

گھر پر لذیذ مٹھائی بغیر زیادہ محنت کے کیسے بنائی جائے!

مفت صلاح کیلئے آج ہی لکھئے — یا بوقت ضرورت!

دی ڈالڈا
ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳، بمبئی ۱



HVM. 129-172 UD



Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D.—31

آج

نومبر [illegible]

آٹھ آنے



ڈالڈا سے

لذیذ بالوشاہی بنائیے



تین بالوشاہی بنانے کیلئے دو چمچ بھر ڈالڈا کو ایک چائے کی پیالی بھر میدے میں ملا کر گوندھئے، بعد ازاں اسکے چپٹے دائرے بنائیے اور بیچ میں خفیف سا گڑھا کر دیجئے۔ ڈالڈا کو خوب گرم کر کے آنچ سے اتار لیجئے اور بنائے ہوئے دائروں کو ابلتے ہوئے ڈالڈا میں سرکر تلئے۔ جب ڈالڈا ابلنا بند ہو جائے تو کڑھائی کو پھر آنچ پر چڑھا دیجئے! اسی طرح سے اتارتے چڑھاتے رہیے جب تک بالوشاہی چاروں طرف سرخ نہ ہو جائے اور پھول نہ جائے۔ اسکے بعد انہیں نکال کر چھلنی پر رکھئے اور گاڑھی گرم چاشنی میں ڈبو کر ٹھنڈا کر لیجئے۔

ڈالڈا ایک خالص نباتی چکنائی ہونے سے یہ ایسے کھانوں کو پکانے کیلئے موزوں ہے جن کے لئے زیادہ وقت درکار ہے اور اسی بنا پر انہیں اچھی طرح سے پکا دیتا ہے۔



کون سی غذائیں آپ کے نمون کیلئے مفید ہیں؟

مفت صلاح کیلئے آج ہی لکھئے - بالوقت ضرورت!

دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس

پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳، بمبئی ۱

HVM 139A-172 UD

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل دہلی

ایڈیٹر: — جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹرز: — عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۹ — نمبر ۴

سالانہ چندہ — چھ روپے
فی پرچہ — آٹھ آنے

نومبر ۱۹۵۵ء

ترتیب

بچوں کا آجکل

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

بسمل سعیدی

غزل

اے ہم نشیں نہ پوچھ وہ کیفیتِ نشاط
باہم دگر جو دلبری و دلبری رہی

اُن کا جمال اور مرے آغوشِ شوق میں
ذرّے کو دل کے مہر کی تابندگی رہی

طغیانِ ناز و عشوہ و انداز الاماں
کشتیٔ شوق ساحلِ دل پر رُکی رہی

میری نگاہِ شوق بھی شرما کے رہ گئی
کچھ یوں وہ چشمِ مست مجھے دیکھتی رہی

اس طرح جذبِ روح ہوئی وہ نگاہِ ناز
رگ رگ میں پھلجھڑی سی کوئی چھوٹتی رہی

محجوب مجھ کو شوقِ فراواں پہ دیکھ کر
خود طبعِ نازنیں پہ گراں نازکی رہی

پھر سوچ کر کہ فرطِ خوشی سے بھی مر نہ جائے
پنہاں سپردگی میں بھی پہلو تہی رہی

اک موجِ بوئے گل تھی کہ لہجے کا لوچ تھا
جس میں شراب اور بھی رس گھولتی رہی

بہکے ہوئے وہ لفظ لبِ نازنیں پہ ہائے
معنے پہ جن کے چھائی ہوئی خامشی رہی

حالانکہ چاندرات بھر اس شب نہیں رہا
ان پر تمام رات مگر چاندنی رہی

صبحِ حریمِ حسن کی کیفیتیں نہ پوچھ
چھائی ہوئی فضاؤں پہ وارفتگی رہی

سب ہو چکی تھی جذب ان آنکھوں میں بن کے نیند
تاروں میں آسماں پہ نہ کچھ روشنی رہی

جب تک وہ محوِ خواب رہے گُل نہ ہنس سکے
طاری تمام باغ پہ اک خامشی رہی

بیدارئ شباب کا انداز کیا کہوں
کیفیتِ شگفتگی و غنچگی رہی

اُٹھ کر وہ خوابِ ناز سے کچھ اس طرح چلے
موجِ نسیمِ صبح قدم چومتی رہی

گلرنگ رُخ پہ تھی وہ صباحت کی اک جھلک
صبحِ بہارِ باغ بھی منہ دیکھتی رہی

زلفِ سیاہ عارضِ تاباں پہ دیکھ کر
صحنِ چمن پہ مست گھٹا جھومتی رہی

میری نگاہِ شوق کو اس رُخ پہ دیکھ کر
شبنم کو برگِ گل سے کرن چوستی رہی

انفاس میں شراب کی خوشبو کو دیر تک
دیوانہ وار نکہتِ گل سونگھتی رہی

ہر چشمِ ناکشودہ بھی مشتاقِ دید تھی
دل سے ہر اک کلی کے کرن پھوٹتی رہی

بسمل آمشیں نہ اُن کی نگاہیں کسی طرف
پھولوں کی جلوہ گاہ انھیں دیکھتی رہی

جوش ملسیانی

امیر مینائی

میر تقی کے بعد جو باکمال شاعر خدائے سخن کے لقب سے یاد کیا گیا وہ حضرت امیر مینائی لکھنوی ہیں۔ اساتذہ لکھنؤ کی غزل گو جماعت میں سے اگر سربرآوردہ شعراء کو منتخب کیا جائے تو آتش اور ناسخ کے بعد تیسرا نمبر حضرت امیر ہی کا ہوگا۔ یہ نواب مظفر علی خاں اسیر کے شاگرد تھے۔ مگر حق یہ ہے کہ حضرت اسیر کا نام بھی انھیں کی تنویرِ سخن سے چمکا ہے۔ بہت بڑے عالم، محققِ زبان اور ضروریاتِ شاعری سے کماحقہ باخبر تھے۔ لکھنؤ میں جلال، تسلیم، شمشاد ان کے بلند پایہ ہم عصر اُستاد ہو گزرے ہیں۔ ان بزرگوں کی تحقیقِ فن اور مسلّم الثبوت حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر حضرت امیر کا پایۂ سخن ان کے مقابلے میں بہت بلند اور بہت امتیازی ہے۔ غزل کے علاوہ ان کی قصیدہ گوئی بھی اپنے تمام ہم عصروں میں اُنھیں ممتاز کیے جانے کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ مرزا سودا، سید انشا اور ذوق کے بعد کسی چوٹی کے قصیدہ گو کو منتخب کیا جائے تو کمالِ سخن گوئی حضرت امیر ہی کا نام انتخاب کرے گا۔ یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ قصیدہ کی صنف میں حضرت امیر اُردو شاعری کا چوتھا ستون ہیں۔ مدح کی منزل میں تو ہر قصیدہ گو پھیکا پڑ جاتا ہے۔ قصیدہ گو کی شاعرانہ قابلیت کا اندازہ یا تو قصیدے کی تشبیب سے ہو سکتا ہے یا مدح کی طرف گریز کرنے کے مقام سے۔ یہ دونوں چیزیں حضرت امیر کے قصائد میں بہت ہی قابلِ داد ہیں۔ معنی آفرینی، جدّتِ ادا اور نزاکتِ خیال کے لحاظ سے ہر تشبیب میں ان کی طبیعت دریائے مواج نظر آتی ہے۔ نئے نئے مضامین، نئی نئی بلیغ تشبیہات و تمثیلات کی اتنی کثرت ہے کہ اُنھیں دیکھ کر مصحفی کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے ؎

کہتا ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

جدت آرائی بھی ان کی تشبیب کا ایک خاص وصف ہے۔ دو قصیدے ایسے ہیں جو مناظرے سے شروع کیے ہیں۔ ایک مناظرہ دانش اور وہم کا ہے دوسرا شانے اور آئینے کا۔ دونوں بہت ہی دلچسپ ہیں۔ اُنھیں پڑھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ مصنف نے کوئی نکتہ کسی اور کے لئے باقی نہیں چھوڑا۔ لفظی مناسبات کا پورا التزام رکھ کر وہ طلسم بندی کی گئی ہے کہ ذوقِ سخن مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ صرف چند شعر ملاحظہ ہوں۔ آئینہ کہتا ہے

آئنہ شانے سے کہتا ہے کہ سرچڑھ نہ بہت
منہ کی کھائے نہ کہیں چاک نہ تیرا ہو جگر
آب تاں مجھ کو نہیں ہے کسی مہماں سے عزیز
دشمن و دوست کے منہ پہ ہے کشادہ مرا در
ہاتھ سے دامنِ دولت نہ کسی دن چھوٹا
اہلِ دولت ہی کے زانو پہ ہوئی عمر بسر

یہ تو اپنی تعریف تھی۔ کئی شعر اسی مضمون کے کہہ کر شانے کی مذمت میں کہتے ہیں ؎

بال بیکا ہو حسینوں کا تو توڑیں ترے دانت
دانت ایذا لگے دینے تو شکستہ بہتر
پنجۂ شل سے نکلتا نہیں ہرگز کوئی کام
خشک ہو شاخ تو اس سے نہیں اُمیدِ ثمر
کر کری تیزیِ دنداں سے ہوئی اور تری
جس میں دندانے پڑیں تیغ ہے ڈوبے جوہر

شانہ جواب میں کہتا ہے ؎

رُتبہ میرا تجھے معلوم نہیں سُن مجھ سے
منحصر ہے صفتِ عقدہ کشائی مجھ پر
کہتے ہیں پنجۂ مژگاں کو جو شانہ شاعر

اس کو آنکھوں پہ جگہ دیتے ہیں اربابِ نظر
اس میں بھی نقطہ ہے شانے کا نہ ہے عزّ و شرف

جلّ شانہٗ جو ہے توصیفِ خدا نے اکبر
آئینے کی مذمت میں کہتا ہے ؎

روبرو اور ترا حال ہے غیبت میں کچھ اور
صاف عالم کی دورنگی کا ہے تجھ میں بھی اثر

خود نمائی کے سوا تجھ میں نہیں کچھ بھی وصف
سادہ لوحی کے سوا تجھ میں نہیں کوئی ہنر

سوجھتا خاک نہیں کور دلی سے تجھ کو
سخت جاں تیرہ دروں اصل ہے تیری پتھر

ان اشعار سے جن میں حقیقت و مجاز دونوں کی بزم آرائی باغ و بہار سے کم نہیں ہے۔ حضرت امیر کی بے پناہ قوتِ بیانیہ اور قادر الکلامی کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ تقریباً پچاس شعر اس مناظرے میں اسی رنگ اور اسی شان کے کہے ہیں۔ اس قسم کے مناظروں میں مدح کی طرف گریز کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مگر بہ قول مصنف ؎

جس زمیں پر کہ مرا ابرِ طبیعت برسا
گردِ ہنگامۂ پیشیں وہیں بیٹھ گئی

یہ گریز بھی قابلِ ستائش ہے مثلاً آئینہ و شانہ کی بحث جب جنگ و جدل تک پہنچ گئی تو دونوں کے طرف دار بھی آ پہنچے۔ ان طرف داروں کا انتخاب بھی شاعرانہ نوعیت کا ہے۔ رُخِ صاف آئینے کا طرف دار ہوا۔ زلف نے شانے کی حمایت پر کمر باندھی۔ چاند سورج آئینے کے مددگار ہوئے اور سایہ شانے کا ایک طرف شام اور ایک طرف صبح کا نور۔ پھر زلف کی حمایت کے لئے سنبل اور شب بو کی فوج میدان میں آ گئی اور لالہ و گل کا لشکر روئے انور کی حمایت میں نکل آیا۔ معرکۂ رستخیز گرم ہو گیا۔ یہ رنگ دیکھ کر پیرِ گردوں نے کہا کہ اس طرفہ قیامت میں جہاں زیر و زبر ہو جائے گا۔ اس لئے بیچ میں پڑ کر کہا کہ یہ فساد اچھا نہیں اس جنگ سے صلح بہتر ہے۔ تم دونوں کو چاہیئے کہ اس جھگڑے کو نپٹانے اور صحیح فیصلہ حاصل کرنے کے لئے اس کی عدالت میں پہنچو۔ جو بڑا انصاف کرنے والا حکمران ہے۔ اس کا نام کلب علی خاں بہادر ہے جو بخشش کا منبع ہے جو علم و ہنر کو زینت دینے والا ہے وغیرہ وغیرہ

ایک قصیدے میں تمہید عزاداری کے مضمون کی ہے۔ مدح کے لئے اس قسم کی تمہید دو خاص حادثوں کی وجہ سے شامل کرنی پڑی۔ ورنہ مضامین میں اس قسم کے مضامین کو مربوط کرنا بہت مشکل کام ہے خاص کر اس صورت میں کہ عزاداری کے مضامین بہت دردناک ہیں۔ مثلاً ؎

وہ برق وش ہوئے آزار کھینچ کر معدوم
کہ جن کی خاک پہ روتا ہے ابرِ آزاری

جو دن کو مرتے ہیں ہر شام ان کے ماتم میں
پہن کے آتی ہے شب جامۂ عزاداری

ہجومِ غم کا ہوا نیند ہو گئی پامال
وہ آئی آنکھوں میں طالع میں تھی جو بیداری

ہر اک سوار ہے پا در رکاب عالم میں
سمندِ عمر میں کتنی ہے تیز رفتاری

مسافر اس میں روانہ ہیں آنکھ بند کئے
عدم کی راہ میں دیکھو ہے کتنی ہمواری

لحد میں ان پہ پڑا بوجھ سیکڑوں من کا
کسی کی جن سے نہ ہوتی تھی ناز برداری

اس رنگ کے ۲۵-۳۰ اشعار کہہ کر ہر شعر میں مضمون آفرینی کی داد دی ہے۔ پھر دو تین شعروں میں حادثوں کا اشارۃً ذکر کر دینے کے بعد مدح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں ؎

جگر پہ حضرتِ آقائے نامدار کا تھا
کہا یہ داغ اُٹھا کر جو مرضیِ باری

جنابِ کلب علی خاں بہادرِ ذی جاہ
کہ جس سے امن میں ہے خلقتِ خدا ساری

عرفی کی زمین میں جس کا ایک مصرع یہ ہے۔ ع
اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل

سودا نے بھی مرکے کا ایک قصیدہ کہا ہے اس کی تشبیب بہاریہ اور بہت رنگین ہے۔ اس قصیدے کا پہلا مصرع یہ ہے ع
اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل

سودا نے اس کی تشبیب میں کئی شعر معرکے کے کہے ہیں مثلاً جدل

کا قافیہ یہ ہے ؎

آب جو گردِ چمن لمعۂ خورشید سے ہے
خطِ گلزار کے صفحے پہ طلائی جدول

حضرت امیر نے بھی اس زمین میں ایک سیر حاصل قصیدہ کہا ہے تمہید بھی بہاریہ ہے مگر عالمِ خواب کی ہے اور عالمِ خواب میں باغ و بہار کا وہ منظر پیش کیا ہے کہ باید و شاید۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

لالہ آتا تھا نظر یوں پسِ دیوارِ چمن
جس طرح شیش محل میں کوئی روشن مشعل
دستِ مژگاں سے سنبھالے تھیں نگہ کو آنکھیں
پھر بھی دیوار پہ چڑھتی تھی تو جاتی تھی پھسل
سینے تانے ہوئے پھرتے تھے چمن میں طاؤس
اس تمنا میں کہ لگ جائے گلے سے بادل
رہ کھڑا آتا تھا جو مستی میں کہیں پائے نسیم
غنچہ کہتا تھا چٹک کر کہ خبردار سنبھل
گلِ نسریں پہ تھا یوں عکسِ شعاعِ خورشید
جیسے سونے کو کریں ساغرِ الماس میں حل

سودا نے قوتِ نامیہ کے اثر سے گاؤ زمیں کی شاخ میں کوپل پھوٹی ہوئی دکھائی تھی۔ حضرت امیر نے اسی سلسلۂ بیان میں ایک نئی شاخ تلاش کر لی ؎

اور شاخوں کا تو کیا ذکر یہ ہے فیضِ نمو
نکلے گر بات میں بھی شاخ تو پھوٹے کوپل

ہوش۔ گوش وغیرہ قوافی میں ایک قصیدہ کہا ہے۔ اس میں ایک بزم آراستہ کی ہے۔ اس بزم میں مشاہیر شعرا و ردنق افروز ہیں۔ ہر ایک کے تعارف میں مناسبات کا پورا لحاظ رکھا ہے مگر سعدی کا تعارف تو بہت ہی عجیب ہے۔ اس تعارف میں قافیے کی تلاش بھی قابلِ داد ہے۔ فرماتے ہیں ؎

یہ شیخ سعدی ہے جس نے کہ چشم روشن کو
کیا ہے نظمِ گلستاں کی بیت میں چش روش

اس شعر کی شانِ نزول سعدی کا یہ مشہور شعر ہے ؎

پیرے ہنقتا سلہ جنی کمنا
کور مترے بہ خواب نی چش روش

سید انشا اور مصحفی نے کروٹ، تلپٹ، آہٹ وغیرہ خاص ہندی قافیوں میں قصیدے کہے ہیں حضرت امیر نے بھی ان قوافی میں ۱۰۵ شعر کا قصیدہ کہا ہے جو درحقیقت انشا اور مصحفی کے مذکورہ قصائد کا جواب ہے۔ تمہید میں خود ہی اُنھوں نے یہ بات ظاہر کر دی ہے ؎

پی چکے گو کہ مئے صافِ سخن کو مے نوشش
رہ گئی ساغر و مینا و سبو میں تلچھٹ
خم ہے مے خانے میں ایسے بھی کہ ٹوٹی نہیں مُہر
کھول منہ بھر کے صراحی کو لے پی جا غٹ غٹ
دو قصیدے جو سُنے مصحفی و انشا کے
واقعی سکۂ رائج ہیں و لیکن سلپٹ
ذائقہ ہے تو فقط گرمی و بے باکی کا
پر فصاحت سے یہ کہتے ہیں کہ چل دُور ہو ہٹ
سخت پتھر سے جو تھے قافیۂ نامانوس
کچھ بھی کاٹا نہ گئی تیغِ زباں ان کی اچٹ
ہمتِ فکر نے باندھی جو کمر بہرِ جواب
اوّل اوّل تو طبیعت کو ہوئی گھبراہٹ
آخر آخر یہ ہوئی نظم کی قوت پیدا
کر لیا ملکِ مضامیں کا علاقہ کورٹ

اس کے بعد تشبیب شروع ہوتی ہے۔ عالمِ خواب میں ایک حور کا منظر پیش کیا ہے ؎

کچھ عجب فتنہ کہ اس کی جو نظر جائے پلٹ
ساتھ ہی چرخ پھرے لے یہ زمانہ کروٹ
شعلہ رخسار جفا کار قیامت آفت
شوخ عیار غضب قہر تیھ‌لاوا نٹ کھٹ
پختہ کار اس کو جو دیکھیں طمعِ خام کریں
قدِ پیش رسِ حسن میں وہ گدرابٹ
پُتلیاں آنکھوں کی در پردہ اشاروں سے کہیں
ناچنے ہی کو جو نکلے تو کہاں کا گھونگھٹ

اس قصیدے میں شاید ہی کوئی قافیہ چھوڑا ہو۔ مرگھٹ۔ ریٹ۔ کوڑا کرکٹ

کٹ۔ ڈپٹ۔ رہٹ۔ پنگھٹ۔ جوٹ (حوصلہ) وغیرہ۔ کس کس کا ذکر کیا جائے گوٹ، کورٹ اور پرمٹ کے انگریزی الفاظ بھی ان میں شامل ہیں۔ ایک قافیہ تریاہٹ (عورتوں کی ضد) ہے۔ پھبتی کے مضمون میں پالٹ کا مزہ بھی ہے۔ مگر جو ہے اپنی نشست میں فرد ہے۔ بطور نمونہ صرف پٹ کے قافیے ملاحظہ ہوں ؎

جلوہ گر مردمِ چشم و صفِ مژگاں سے یہ صاف
حور بیٹھی ہے درِ خلد پہ کھولے ہوئے پٹ

حور کے دامن کو پکڑنے کی کوشش کی مگر ہاتھ خالی گیا۔ اس محرومی سے دل پر بھی چوٹ لگی۔ یہ کیفیت اس طرح بیان کی ہے ؎

چوٹ سی دل پہ لگی ! ہاتھ گیا جب خالی
تازیانے سے نہیں کم وہ پڑی تیغ جو پٹا
چپ رہی پہلے کہا تو یہ کہا دیر کے بعد
تھی ملاقات کہاں کی کہ یہ تیزی جھٹ پٹ
دیکھ کر ابروئے پیوستہ یہ ہوتا تھا گماں
پہلواں دو ہیں کہ کشتی میں ہوئے ہیں غٹ پٹ
ناطقہ خانۂ دولت ہے مرا نام صنعت
میں مکیں ہوں تو مکاں جانے زر و سیم سے پٹ
جس کا تو دوست ہوا اُس نے خزانہ پایا
خط لکھا جس کو اُسی شخص کی ہنڈی گئی پٹ
درِ دولت سے عجب فیض کی چوپڑ کہ جہاں
کبھی پڑتا نہیں پانسا کسی تقدیر کا پٹ
عدل وہ ہے کہ زمانے میں نہیں ہوئے فساد
ہو تو ہتک جو مسکینوں میں کبھی ہو کھٹ پٹ

ان قصائد کو تازہ مضامین اور تازہ تشبیہات، تلازمات اور مناسباتِ شعری کی کثرت سے گنج قارون کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اگرچہ حضرت امیر کے شاگردوں کی جماعت میں بڑے بڑے بلند پایہ شعراء شامل ہیں۔ مثلاً جلیل، ریاض، کوثر، مضطر، وسیم، برہم اور دل شاہجہان پوری وغیرہ۔ ان کے علاوہ ان کے صاحبزادے بھی برگزیدہ شاعر تھے مثلاً اختر مینائی جن کا پایۂ سخن ذیل کے دو شعروں سے ظاہر ہے ؎

صبح کو کلیاں چٹک کر بار کی
اُن کو چونکاتی ہیں خوابِ ناز سے
غنچے چٹکیں گل ہنسیں اے باغباں
ہم کراہیں بھی دبی آواز سے

مگر قصیدہ گوئی کے دشوار گزار رستے میں حضرت امیر کی گرم رفتاری کسی شاگرد کو ساتھ لے کر نہیں چل سکی۔ بہ قول مرزا غالب ؎

ما ہمہ لئے تیز پروازیم فیض از ما مجو
سایہ ہمچوں دود بالا می رود از بالِ ما

ان نامور شعراء میں حضرت جلیل نے ضرورتِ وقت کے لحاظ سے البتہ چند قصیدے کہے ہیں مگر اُن میں حضرت امیر کی معنی آفرینی اور نزاکتِ خیال کا عنصر کم ہے۔ جو کچھ ہے وہ بیان اور زبان کی صفائی اور روزمرہ کی چاشنی ہے۔ حضرت داغ کے قصائد بھی اسی نوعیت کے ہیں اور انھوں نے بھی یہی دو تین چیزیں اپنا عنوانِ بیان قرار دی ہیں۔

اگرچہ زمانہ حال کے مذاقِ سخن سے قصیدہ گوئی اب خواب و خیال بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ آج کل ادب برائے زندگی کا نعرہ زوروں پر ہے۔ غزل ابھی تک زندہ ہے۔ اس کے زندہ رہنے کا سبب یہ ہے کہ کچھ تو شعرائے حال زمانہ حال کے مذاقِ سخن کا پورا لحاظ کر رہے ہیں اور رنگِ قدیم کے عریاں مضامین کو قطعی طور پر ترک کر چکے ہیں۔ اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ غزل میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی دونوں جوہر موجود ہیں۔ غزل کا ہر شعر ادب برائے ادب تو ہوتا ہی ہے مگر اس میں بہت معقول تعداد ایسے اشعار کی بھی ہوتی ہے جنہیں ادب برائے زندگی بھی کہا جا سکے۔ مثلاً ؎

اب زباں پر بھی نہیں آتا کبھی اُلفت کا نام
اگلے مکتوبوں میں کچھ رسمِ کتابت ہو تو ہو
اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
بس کہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

لیکن قصیدہ ایسی صنف ہے کہ اس کا وجود ادب برائے ادب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے اس صنف کا اتنا نامقبول ہو جانا کہ سب کی نظروں

سے گر کر اپنی موت مرجائے۔ قابلِ تعجب نہیں ہو سکتا۔ یہ زمانے کے انقلابات ہیں ان کے اثر سے اُن لوگوں کے کمالِ فن میں کوئی فرق نہیں آ سکتا جنہوں نے اپنے زمانے کے مذاقِ سخن یا وقتی ضروریات یا حسنِ عقیدت کے اقتضا سے اس صنعت کو اختیار کیا اور اس میں اتنی دماغ سوزی کی کہ جہانِ معنی کو تجلّی گاہِ طور بنا دیا۔

اب ہم قصیدے کی بحث کو اسی جگہ چھوڑ کر حضرت امیر کی غزل گوئی پر جو اُن کی شاعری کا سب سے بڑا میدان ہے متوجہ ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ہمیں ایک ایک غزل میں گل زارِ معنی اتنا سرسبز و شاداب نظر آتا ہے کہ ذوقِ سخن چشمِ تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔ قدم قدم پر بہارِ بے خزاں فردوس نظر معلوم ہوتی ہے اگرچہ یہ بہارِ رنگِ قدیم کی آخری بہار ہے مگر اتنی دل کش، اتنی مرغوب اور اتنی جاذبِ نظر ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ تازہ مضامین، نئی تشبیہات، نئے اسلوبِ بیان کی اتنی کثرت اور فراوانی کے باوجود پُرگوئی کا یہ عالم ہے کہ بہت سی زمینوں میں دو غزلہ سہ غزلہ بلکہ بعض زمینوں میں چار چار پانچ پانچ غزلیں کہہ ڈالی ہیں اور کوئی شعر ایسا نہیں جسے محض قافیہ پیمائی کہا جا سکے۔ ع پوچھا گیا نہ حال تمہارے شہید کا

اس زمین میں پانچ غزلیں کہی ہیں ع

بے فائدہ غریب کی مٹّی خراب کی

اس زمین میں بھی پانچ غزلیں مرآۃ الغیب میں موجود ہیں اور ہر ایک غزل اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ تازہ اور نئے مضامین کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

نئی تقریب پریوں کے بلانے کی ہے دیوانو
کسی صحرا میں عرس اک دن کریں قیسِ کرسلیماں کا

کہاں سامان تھا وحشت میں کہ نامہ یار کو لکھتا
دیا قاصد کو پرزہ پھاڑ کر میں نے گریباں کا

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جل اُٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

تری نیچی نگاہیں سایۂ مژگاں میں پھرتی ہیں
پرے میں جیسے بانکے پینترے ہر سُو بدلتے ہیں

وزدِ سخن سے معنیٔ رنگیں کو کیا خطر
مہندی لگائے گا کوئی کیوں کر لگی ہوئی

دیکھ کر آئینے کو عکس سے کہتا ہے وہ شوخ
کچھ اگر حُسن کا دعوےٰ ہے تو باہر آ تُو

اس قسم کے صدہا اشعار منتخب کئے جا سکتے ہیں۔ کوئی غزل اس تازہ گوئی سے محروم نہیں رہی۔ اب تازہ تشبیہات اور دل چسپ تمثیلوں کو ملاحظہ فرمائیں ؎

نہ ہوگا بند جب تک نقدِ جاں باقی ہے قالب میں
سخی کے گھر کا دروازہ ہے چاک اپنے گریباں کا

اس تشبیہ کی جدت اور بلاغت کا کیا کہنا۔ داد کے لئے الفاظ نہیں مل سکتے کمالِ فن اور خوش بیانی کا اندازہ کرنے کے لئے یہی ایک شعر کافی ہے۔ پورا دیوان ایک طرف اور یہ شعر ایک طرف ؎

سرو و گل سے تمہیں تشبیہ میں کب دیتا ہوں
لال آنکھیں نہ کرو آگ بگولا ہو کر

اس حسنِ سخن اور اس نئے اسلوبِ بیان کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ تشبیہ سے انکار بھی کیا جاتا ہے اور پھر ایک نہیں دو دو تشبیہیں انکار کے پردے میں پیش کر دی جاتی ہیں ؎

حسد سے طرۂ مضموں مرا یگانہ ہُوا
عدو کے خندۂ دنداں نما سے شانہ ہُوا

جب بلندی پر پڑے دیکھے کہیں ہوتے کا پھول
ڈھیر سمجھے ہم کسی بادہ کشِ مغفور کا

دل مرا کشتہ ہے یارب کس شہادت گاہ کا
ہر شگافِ زخم دروازہ ہے بیت اللہ کا

تو یہ کرنی تھی کہ بوچھار ملامت کی ہوئی
خوب ہی مجھ پہ برستے ہوئے بادل آئے

نہیں ہے مہر لفافہ پہ خط کے اے قاصد
یہ داغ ہے مری قسمت کی نارسائی کا

باغ سے ہم کو نکالا تو ہماری آنکھیں
رہ گئیں رخنۂ دیوارِ گلستاں ہو کر

جل گیا اُگتے ہی دانہ جو مری قسمت کا
آسیا رہ گئی انگشت بدنداں ہو کر

یہی حیرت کا عالم ہے کہ نظارہ کہاں مجنوں
نکل بھی آئے محمل سے تو پھر لیلیٰ ہے محمل میں

جان جاتی ہے خیالِ عارضِ پُر نور میں
ڈوبتی ہے میری کشتی چشمۂ کافور میں

جس پری کی آنکھ مجھ سے پھر گئی بولا جنوں
تو مبارک اور اک حلقہ بڑھا زنجیر میں

وقتِ فرصت تھا میں عبرت کدۂ ہستی میں
کفِ افسوس ملی جس نے کیا گم مجھ کو

اس شعر میں تشبیہ کی جدت کے علاوہ اعزازِ نفس کا مضمون کتنا شاندار ہے ؎

بیڑیاں دیوانۂ گیسو کو پہناتے ہو کیوں
رشتۂ اُلفت کا پھندا سخت ہے زنجیر سے

حسن التعلیل اور مذہب الکلامی کی بھی اچھی اچھی مثالیں بہت سی غزلیات میں ملتی ہیں۔ جذباتی شاعری اور سوز و گداز نسبتاً کم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مضمون آفرینی اور تازہ گوئی پر توجہ زیادہ مبذول کی گئی ہے۔ پھر بھی ہر ایک غزل میں ایک ایک دو دو مثالیں مل جاتی ہیں مثلاً ؎

بات رکھ لی مری قاتل نے گنہ گاروں میں
اس گنہ پہ مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

غم اُٹھانے کو بہت تھے ترے بندے یا رب
کیا کمی تھی اگر اک مجھ کو نہ پیدا کرتا

تم کو پھولوں کی چھپر کھٹ ہمیں کانٹے ہیں نصیب
غیر قسمت وہ تمہاری ہے یہ تقدیر اپنی

پھینک دوں کاٹ کے جڑ نخلِ تمنا کی امیر
پھول کم بخت میں آئے نہ کبھی پھل آئے

اتنی نسبت بھی کفایت ہے یہاں بخشش کو
کاش وہ اپنا گنہگار ہی جانے مجھ کو

تیر پہ تیر لگاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
سینہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

نہ عنایت نہ تلطف، نہ مروّت، نہ وفا
تمہیں کہ دو کہ رہے پھر کوئی کس کا ہو کر

بعض اشعار میں چند الفاظ کا حذف وجدانی کیفیت رکھتا ہے ؎

دوزخ میں مجھ کو پھونک چکے تھے مرے عمل
قربان شانِ رحمتِ پروردگار کے

حلقۂ زلف میں پھنس کر کوئی نکلا ہے کبھی
موت کے منہ سے چھڑایا ہے قضا نے ہم کو

اس شعر کو پڑھ کر حضرت داغ کا یہ مطلع جو بالکل اسی انداز اور اسی رنگ کا ہے یاد آ جاتا ہے ؎

جا کر اس کوچے میں آ جاتی ہے شامت کیسی
میرے اللہ نے رکھ لی مری عزت کیسی

الانے ہم کو، قضا نے ہم کو۔ اسی زمین میں ایک اور شعر اسی سے ہے ؎

آس کس کو تھی شبِ غم کی سحر ہونے کی
مسے بتوں یہ دکھایا ہے خدا نے ہم کو

نخجِ صبر کہاں یار جفا پیشہ کہاں
ملک الموت سے ہے چشمِ ترحم مجھ کو

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں حذف کا لطف قابلِ داد ہے۔ اُس حذف کا کیا کہنا جو صراحت سے زیادہ واضح ہو۔ غرض اُستادانہ شان الاشلوا عظمت کی کون سی خوبی ہے جو پورے جاہ و جلال سے آپ کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ ایسے باکمال اُستاد پر خدائے سخن کا اطلاق پوری مناسبت رکھتا ہے کہاں تک انتخاب کیا جائے۔ ہر ایک شعر میں یہ عالم ہے کہ

کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا ایں جاست

گر فصاحت و بلاغت کے اس دریائے بے پایاں میں لفظی اور معنوی تکلفات اور استعارہ در استعارہ کے گرداب بھی جا بجا نظر آتے ہیں جس طرح متاخرین فارسی نے جدت طرازی کے شوق میں رنگینیٔ کلام اور خیال بندی کے طلسم بنائے۔ متاخرین اُردو نے بھی اُنھیں کی تقلید میں اسی راہ پر چلنا شروع کر دیا۔ الجھے دریچ استعاروں کا سلسلہ آتش اور ناسخ کے عہد سے شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ آتش ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

فصلِ گل ہے چار دن ساقی تکلف ہے مزید
پیجو ابر کے بڑھے کو لگا یا چپا ہیئے

دلی والوں میں مومن نے کسی حد تک اور غالب نے آخری حد تک یہی
رنگ قبول کیا۔ لکھنؤ میں بھی اس کا اثر کم نہ تھا۔ اُن میں تو ابن اور امیروں کے صحن میں
آب گوہر کا چھڑکاؤ ہونے لگا۔ حضرت امیر بھی اسی رنگ میں بہتے رہے۔ چونکہ
خیال بندی کے ان طلسمی مضامین میں حقیقت کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ اس لئے
زمانۂ حال کا مذاقِ سخن اس قسم کی رنگینی کلام اور اس قسم کے لفظی و معنوی تکلفات
کو گوارا نہ کر سکا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

میں وہ غم دوست ہوں تجویز کی غم سے دوا غم کی
جو آیا مُنہ چبالی چھال میں نے نخلِ ماتم کی
مناہی کوچۂ محبوب میں ہے نالۂ غم کی
غضب ہے اب تو وہ جڑ کاٹتے ہیں نخلِ ماتم کی
بہے بحرِ فنا میں جلد یا رب لاش بسمل کی
کہ بھوکی مچھلیاں ہیں جوہرِ شمشیر قاتل کی
نہال اس کو ہمیشہ کرتی ہے بالیدگی غم کی
الٰہی دل ہے یا کوئی کلی ہے نخلِ ماتم کی
عشقِ ابروئے بتاں میں دل نے کی ایسی طپش
زلزلہ آیا زمیں کوچۂ شمشیر میں
کشتِ خوں ایسا ہی رہتا دور ترکاں میں اگر
روند عزرائیل پھرتے کوچۂ شمشیر میں
عشقِ ابرو میں جو چِلّاتا ہوں کہتا ہے وہ ترک
کون دیتا ہے دہائی کوچۂ شمشیر میں
چوری ہے کب ثبوت مرے نقدِ ہوش کی
مفتیِ شہر قطع نہ دستِ سبو کریں

مگر حق یہ ہے کہ دستِ سبو کے مضمون میں ناسخ کے شاگرد خواجہ وزیر کا یہ
شعر اپنا جواب نہیں رکھتا ؎

ہوں وہ مے کش جب نہ آیا مے کدے میں ابرِ تر
ہر سبو نے ہاتھ پھیلائے دعا کے واسطے

اپنی وحشت سے ہے روشن خانۂ زندانِ غم
مردمک ہے پاؤں اپنا دیدۂ زنجیر میں
ہوں زار اس قدر کہ تری جلوہ گاہ میں
چھپ جاؤں گا میں پردۂ گردِ نگاہ میں
نیزۂ قاتل سرِ بسمل پہ خنداں زخم تھی
کیا اُگا ہے نخلِ ماتم قہقہہ دیوار پہ

مصرعِ اوّل میں بھی تصنع سے کام لیا گیا ہے۔ اس مضمون میں اس
کے سوا چارہ ہی نہ تھا ؎

اُمیدِ قتل ترکِ چشم سے کچھ کچھ تو پڑتی ہے
بڑھا کر دستِ مژگاں رکھ دیا ہے تیغِ ابرو پر

اس شعر میں بھی مصرعِ اوّل پر تصنع کا رنگ چھایا ہوا ہے ؎

مرگیا ہوں اُلفتِ قامت میں آہیں کھینچ کر
شامیانہ ہو مرے مرقد پہ دودِ آہ کا
ہُوا یہ کس قدِ موزوں کا باغ میں جلوہ
کہ تنگ قافیہ ہے مصرعِ صنوبر کا
مل گیا بوسہ جو اس کے عارضِ پُرنور کا
ہم یہ سمجھے پھول ہاتھ آیا نہالِ طور کا
تھا کسی کی ابروئے خم دار کا یہ انتظار
دیدۂ جوہر میں اٹکا آ کے دم شمشیر کا

اس شعر کا مصرعِ اوّل تصنع کے بوجھ سے پوری طرح دبا ہوا نظر آتا
ہے۔ مصرعِ ثانی میں استعاروں کے پیچ نے مصرع کو ایک ہوائی قلعہ بنا دیا ہے

حلقۂ گیسو میں پائی نقدِ دل دے کر جگہ
دے دیا پہلے کرایہ خانۂ زنجیر کا
ظالموں کو بھی ہُوا ماتم ترے نخچیر کا
روتی ہے مُنہ پر کماں رکھ رکھ کے پلّہ تیر کا
اے معلم تیز ہے اس طفل کی تیغِ نگہ
دیکھ ہو جائے نہ بسمل مرغِ بسم اللہ کا
پیاسا ہوں اس قدر کہ مرا دل جو گر پڑا
پانی ابل کے چاہِ ذقن سے نکل گیا

لے کے بیٹھے ہیں پاسِ رازِ الفت دیکھ اے قاتل
سِیا ہے منہ تیرے تارِ کمر سے زخمِ پنہاں کا

د بھولے آپ کو بھولے جو دنیا کو تو کیا بھولے
یہ منت ہو اگر پوری تو بھریئے طاقِ نسیاں کا

ان اشعار میں نخلِ ماتم کی چھال اور پھر منہ آنے پر اسے بطور دوا چبانا جوہرِ شمشیر کو مچھلی کہنا (آبِ تیغ کو دریا مان کر) اور پھر اس مچھلی کو بھوکی ظاہر کرنا۔ نخلِ ماتم میں کلیوں کا پھوٹنا اور پھر ان کے لئے لفظ نہال بطور ضلع استعمال کرنا۔ نخلِ ماتم کی جڑ بھی فرض کر لینا اور پھر اس جڑ کو کاٹ کر رکھ دینے کا خیال۔ کوچۂ شمشیر میں زلزلہ پیدا کرنا۔ اسی کوچے میں دہائی دینا اور وہاں عزرائیل کا روند پھرنا۔ دستِ سبو کو بطور سزا کاٹنا۔ پاؤں کو دیدۂ زنجیر کی پتلی کہنا۔ خانۂ زنجیر کا کرایہ ادا کرنا۔ گردِ نگاہ کو پردہ قرار دینا اور خود اس پردے میں چھپ جانا۔ دیوارِ قہقہہ پر نخلِ ماتم کا اُگنا۔ دستِ مژگاں کو بڑھانا اور بڑھا کر تیغِ ابرو کی باڑھ دیکھنا۔ قدِ آہ کو شامیانہ کہنا۔ صنوبر کو مصرع کہہ کر اس مصرع کا قافیہ تنگ کرنا۔ نہالِ طور کے پھول توڑنا۔ شمشیر کے دم کا دیدۂ جوہر میں اٹک جانا۔ تیر کے پلے کو منہ پر رکھ کر کمان کا رونا۔ بسم اللہ کے مُرغ کا بسمل ہونا۔ چاہِ ذقن سے پانی کا ابل ابل کر نکلنا اور پھر اس پانی سے دل کی پیاس بجھانا۔ محبوب کے تارِ کمر سے زخمِ پنہاں کا مُنہ سی دینا۔ طاقِ نسیاں کو بھرنا وغیرہ حضرتِ امیر کی خیالی طلسم بندیوں اور ہوائی قلعوں کے چند نمونے ہیں جن کا تتمہ ان کے شعر مندرجہ ذیل کو کہنا چاہیئے

تم سے شہسوارِ حُسن ہو لگ جائے گی نظر
گھوڑے سے اترو آنکھ بچا کر رکاب کی

مگر حضرت امیر کا کیا قصور۔ اس زمانے کا مذاقِ سخن اس قسم کے مضامین اور تکلفات کو جدت طرازی اور تازہ گوئی قرار دیتا تھا۔ ان کے ہم عصروں کے کلام میں بھی یہ تکلفات بیشتر موجود ہیں۔ اس عہد میں آتشِ گل کا دھواں بامِ فلک پر پہنچ رہا تھا۔ اس دھوئیں سے منزلِ خورشید کی چھت میں کاجل جم جاتا تھا۔ بلبلوں کے شعلۂ آواز سے چراغِ گل روشن ہو جاتا تھا۔ آتشِ گل سے محبوب کے ہاتھ میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ تیر کے پروں کو سرخاب کے پر سمجھا جاتا تھا۔ اسی تازہ گوئی کے جنوں میں مومن نے یہ مطلع کہا

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گلِ شمعِ شبستاں ہوں گے

اور مرزا غالب نے تو یہ شعر کہہ کر اس جنوں کی تکمیل کر دی

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

اگرچہ عمر کا بیشتر حصہ حضرت امیر نے انھیں تکلفات میں بسر کیا۔ مگر ان کے ذوقِ صحیح اور مذاقِ سلیم کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ آخر کار انھوں نے اس طلسمی مجاز نگاری کو قابلِ ترک خیال کیا۔ اور ہر قسم کے لفظی و معنوی تکلفات کو چھوڑ کر حضرت داغ کے رنگ میں طبع آزمائی کے جوہر دکھانا پسند کیا۔ اگرچہ اس کوشش میں انھیں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ طبیعت پر جو رنگ غالب آ چکا تھا۔ عمر کے آخری حصے میں اُسے یک دم چھوڑ دینا ممکن نہ تھا پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تازہ کوشش معقول حد تک بارور ہوئی جس کا ثبوت ان کا دوسرا دیوان صنم خانۂ عشق ہے اور تبصرے کے لئے علیحدہ مضمون کا متقاضی ہے۔

زبان کی بے تکلفی۔ بیان کی صفائی۔ مضامین کی سادگی اور جذبات کے لحاظ سے اس دوسرے دیوان کو بھی سلاستِ کلام کا بہترین نمونہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

ان کا تیسرا دیوان نعتیہ ہے۔ اہلِ نظر کا یہ قول بالکل بجا ہے کہ نعت میں اتنا بلند پایہ کلام اُردو کے کسی شاعر نے نہیں کہا اور اس میدان میں کوئی ان کا مدِ مقابل نہیں ہے۔ اس دیوان پر بھی کوئی تبصرہ علیحدہ مضمون کا محتاج ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ قصیدہ اور غزل ہر دو اصنافِ سخن میں حضرت امیر منیر کا پایۂ شاعری ان کی نعت گوئی کی طرح نہایت ممتاز، نہایت گراں قدر اور مستغنی عن التوصیف ہے۔ مرزا سودا کا اگر یہ قول تسلیم کر لیا جائے کہ پورا شاعر وہی ہوتا ہے جو اچھا قصیدہ کہہ سکے تو حضرتِ امیر کی اُستادانہ عظمت اور بھی زندۂ جاوید ہو جاتی ہے اور وہ بلاشبہ خدائے سخن کہے جانے کے مستحق ہیں۔

سلام مچھلی شہری

عمر خیام کی ایک رات

رات

منتظر۔ اس حسین چاند کا تقاضا ہے کہ آج رات فضا میں جلدی سو جاؤں۔

ناہید۔ ۔ آپ کو منع کس نے کیا ہے۔

منتظر۔ لیکن تمہارے بغیر یہ چاندنی.....

ناہید۔ مجھے تو آپ بخشئے۔

منتظر۔ تو پھر میں تمہارے تصور کے سہارے نیندوں کی دنیا میں جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ناہید۔ ضرور۔

خواب

(پس منظر سے عمر خیام کی روح گنگناتی ہے)

ساقی قدحے کہ ہست عالم ظلمات ۔۔۔ جز روئے تو نیست در جہاں آب حیات
جان و جہاں ہرچہ در عالم ہست ۔۔۔ مقصود توئی و بر محمد صلوات

(ذرا دیر بعد ایک مرد اور ایک عورت کے چہرے نمودار ہوتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ خراماں ہو کر باہم گفتگو کرنے لگتے ہیں۔

مرد۔ سنا تم نے شب ماہ میں عمر خیام کی روح ہمیں کیا پیغام دے رہی ہے؟

عورت۔ تم شاعر مزاج لوگوں کی تو یہ عادت سی ہو گئی ہے۔ جب کوئی سہارا نہ ملا تو خیام کی رباعیوں کی پناہ لے لی۔

مرد۔ یہ پناہ لینے کی بات نہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ دنیا کے تمام حسینوں کو خیام کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔

عورت۔ وہ کیوں؟

مرد۔ اس لئے کہ خیام نے ان کے حسن کو غیر فانی بنا دیا ہے۔

عورت۔ یا حسینوں نے شیشۂ شراب میں اپنی جھلک دکھا کر خیام کی رباعیوں میں روح ڈال دی ہے۔

مرد (ہنس کر) تو بات ختم ہوئی۔

عورت۔ کیا مطلب؟

مرد۔ یعنی تمھیں یہ رباعی پسند ہے۔

عورت۔ کونسی رباعی!

مرد۔ یہی رباعی جسے اگر نغمے میں ڈھالا جائے تو.....

(اس وقت بربط پر نغمے کی ایک آواز آتی ہے)

نغمہ

دنیا اک تاریک مقام ــــــ ساقی
دنیا اک تاریک مقام ــــــ!!
اس دنیا کے دن اندھیارے ناگن ایسی کالی رات
ایسے میں تیری صورت، تیرا چہرہ ہے آب حیات
تیرا ہی آئینہ ہے، میرے ہاتھوں کا جام!
دنیا اک تاریک مقام ــــــ ساقی
دنیا اک تاریک مقام ــــــ!!
تیری صورت تیرا چہرہ میرے لئے ہے آب حیات
تجھ کو دیکھ کے پڑھتا ہوں میں ہوئے محمد پر صلوات
مقصد ہستی تو ہے ساقی، میں ہوں تیرا ایک غلام
دنیا اک تاریک مقام ــــــ ساقی
دنیا اک تاریک مقام ــــــ!!

(ذرا دیر بعد اس جوڑے کی گفتگو پھر شروع ہو جاتی ہے)

مرد۔ (شراب انڈیلتے ہوئے) ۔ اور یہ کوئی گناہ بھی نہیں۔

عورت۔ کیسی باتیں کر رہے ہو؟

مرد۔ ہاں ہاں ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔ اگر میں تمھاری یاد میں، یا تمھیں دیکھ کر یہ سوچ لیتا ہوں کہ تم ہی میرا حاصل دین و ایمان ہو تو ظاہر ہے کہ میں کوئی گناہ نہیں کر رہا ہوں۔

سوال اپنے اپنے عقیدے کا ہے اور میرا عقیدہ یہی ہے۔

عورت۔ تو تم اپنے عقیدوں میں مجھے کیوں شامل کرتے ہو۔

مرد۔ میں اپنے تئیں یہ سمجھ رہا ہوں۔ تمھیں شامل نہیں کر رہا ہوں اور حقیقت تو یہ ہے کہ (اس وقت پس منظر سے عمر خیام کی روح گنگناتی ہے۔)

رباعی

مے خوردن من نہ از برائے طرب است ــ نے بہر فساد و ترکِ دین و ادب است
خواہم کہ بہ بےخودی برآرم نفسے ــ مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

مرد (ذرا وقفے بعد گفتگو جاری رکھتے ہوئے) اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آلام دنیا سے تھوڑی دیر کے لئے بےخبر ہو جاؤں اور اسی لئے۔۔ [اچانک ساقی سے (جس کا نام گلفام ہے) مخاطب ہوتا ہے] لیکن گلفام! تم اس طرح خاموش کیوں بیٹھی ہوئی ہو۔ تمھاری پازیب میرے خیالات کا ساتھ نہیں دے رہی ہے ۔۔۔ لو اب یہ جام و صراحی تمھیں سنبھالو تمھیں گنگناؤ۔ اپنی سہیلیوں میں مل کر ایک ایسا نغمہ چھیڑو۔ جو میرے دل کی آواز بن کر پوری فضا پر چھا جائے۔ کچھ اس طرح کہ یہ بھی (محبوبہ) میری ہم خیال بن جائیں۔

گلفام۔ میں تو آپ کے اشارے کی منتظر تھی۔ لیجئے نغمہ حاضر ہے۔

نغمہ

جام شراب لو، جام شراب لو۔
شیشے میں ہنستا ہوا تازہ گلاب لو
جام شراب لو ــــــــ !
جام شراب کا مقصد سرور نہیں
چھوٹ جائے دنیا
چھوٹ جائے عقبیٰ
یہ تو ضرور نہیں ــــــ !
جام شراب کا مقصد سرور نہیں !
ہستی حباب ہے ــــ تم یہ جواب لو!
جام شراب لو!
شیشے میں ہنستا ہوا تازہ گلاب لو!!
سارا زمانہ غم سے نڈھال ہے
جینے کو جیتے ہیں پھر بھی بُرا حال ہے
شب مہتاب ہے اُجالے میں ڈوب جا
صہبائے رنگیں کے پیالے میں ڈوب جا
تھک کر نڈھال ہو، پیغام خواب لو
جام شراب لو۔

مرد۔ (ساقی سے) زندہ رہو گلفام! تمھارا رقص ایک جیتا جاگتا نغمہ ہے اور نغمہ شراب ــــــ اور شراب اگر مجسم ہو جائے تو ۔۔۔۔۔

گلفام۔ تو کیا ہو سرکار!

مرد۔ یہ تم شب ماہ کی ملکہ سے پوچھو۔

گلفام۔ میں کیسے جرأت کر سکتی ہوں۔ آپ ہی پوچھئے۔

مرد۔ (محبوبہ) اچھا بتا ہی دو۔ شراب اگر مجسم ہو جائے تو اس کی کیا صورت ہوگی۔

عورت۔ میں کیا جانوں۔

مرد۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا ــــ!

عورت۔ تم بہت زیادہ تخیل پرست ہوتے جا رہے ہو۔

مرد۔ لیکن اس وقت تو تخیل کو مجسم کرنے کی بات آگئی ہے۔

گلفام (بات کاٹ کر) حضور! میں بتاؤں؟

مرد۔ ہاں بتاؤ۔

گلفام۔ شراب اگر مجسم ہو جائے تو ۔۔۔۔۔

عورت۔ چپ رہو گلفام! اب تم بھی شرارت کرنے لگیں۔۔۔۔

(اسی وقت عمر خیام کی روح پس منظر سے گنگناتی ہے) رباعی

آں بادہ کہ قابلِ حیات ست بذات ــ گہ حیوان می شود، گاہ نبات
تا ظن نہ بری کہ ہست گردد ہیہات ــ موصوف بذات ست اگر نیست صفات

مرد۔ (بات جاری رکھتے ہوئے) گلفام کو کیوں ڈانٹ رہی ہو۔ خیام کی روح بھی تو یہی بات کہہ رہی ہے۔

گلفام۔ جی سرکار آپ نے ٹھیک کہا ہے۔

عورت۔ کیا ٹھیک کہا ہے؟

گلفام۔ یہی اور کیا — (فوراً نغمہ چھیڑ دیتی ہے)

نغمہ

جامِ شراب میں اتنی تاثیر ہے — اتنی تاثیر ہے
الفت ہے خواب یہ اس کی تعبیر ہے!
جیسی بھی بات تیرے دل میں ابھی آئی ہو
جیسی بھی صورت خیالوں میں چھائی ہو
جلوۂ انساں ہو
یا گل و ریحاں ہو
صہبا کے شیشے میں وہی تصویر ہے
جامِ شراب میں اتنی تاثیر ہے — اتنی تاثیر ہے

مرد۔ (بات جاری رکھتے ہوئے) تم اچانک رک کیوں گئیں۔ گائے جاؤ گلفام! ہماری زندگی کو سراپا شراب کر دو اور ہمارے لئے پوری دنیا کو بہشت بنا دو۔ اور . . . (اسی وقت خیام کی روح پس منظر سے گنگناتی ہے)

رباعی

ساقی قدحے کہ آں کہ ایں خاک سرشت — خط بر سرِ ما ز مستی و عشق نوشت
معمور بود بہ شاہد و بادہ جہاں — موعود بود بہ کوثر و حور بہشت

گلفام۔ (بات جاری رکھتے ہوئے) سرکار بہشت دنیا سے الگ کوئی چیز نہیں۔

مرد۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ اور اب یہ کل مستی و عشق میرا مقدر بن چکا ہے۔ میرے لئے یہ دنیا ہی اگر بہشت نہیں تو پھر اس کی حقیقت بھی کیا ہو سکتی ہے۔

گلفام۔ حور و کوثر تو ایک نہ پورا ہونے والا وعدہ ہے۔ صرف وعدہ اور — اور پھر . . . . . .

مرد۔ ہاں ہاں کہو نا۔

گلفام۔ (شرارت کے ساتھ) اور پھر گستاخی معاف، حور و کوثر تو آپ کے پاس ہی ہے۔

عورت۔ گلفام! تم بہت زیادہ شوخ ہوتی جا رہی ہو۔

گلفام۔ میں معافی تو مانگ چکی ہوں ملکۂ عالم۔

مرد۔ میرا خیال ہے ملکۂ عالم تمہیں معاف کرتی ہیں . . . . . اچھا تو ایک نغمہ اور سنا دو۔ رات ڈھلتی جا رہی ہے۔

گلفام۔ لیکن ایک شرط ہے۔

مرد۔ وہ کیا۔

گلفام۔ ابکی آپ کو بھی میرے ساتھ گانا پڑے گا۔

مرد۔ چلو منظور ہے۔

گلفام۔ تو لیجئے میں شروع کرتی ہوں۔ (فوراً نغمہ چھیڑ دیتی ہے)

نغمہ

گلفام۔ "تم ہاتھوں میں پیمانہ لو + میں اک نغمہ گاتی ہوں"
مرد۔ پیتا ہے اک فرزانہ لو + صبح افق سے بول رہی ہے
جلد پیو میں آتی ہوں
گلفام۔ تم ہاتھوں میں پیمانہ لو + میں اک نغمہ گاتی ہوں
مرد۔ جب دنیا تعمیر ہوئی تو +
گلفام۔ جب دنیا تعمیر ہوئی تو
مرد۔ میری یہ تقدیر بنی
گلفام۔ تیری کیا تقدیر بنی
مرد۔ مستی و الفت۔ مستی و الفت
گلفام۔ مستی و الفت تیری قسمت
مرد۔ مستی و الفت میری قسمت
دنیا ہی ہے میری جنت
دنیا حور و طہور
میں کیوں جاؤں اس دنیا کو چھوڑ کے آخر دور
دنیا حور و طہور
گلفام۔ ٹھیک ہے دنیا ہی جنت ہے، تم کیوں جاؤ دور
قسمت حور و طہور تمہاری۔ پھر کیوں ہو رنجور
تم ہاتھوں میں پیمانہ لو
میں اک نغمہ گاتی ہوں

مرد۔ پیتا ہے اک فرزانہ لو
صبح افق سے بول رہی ہے
جلد پیو میں آ ئی ہوں

مرد۔ (مرد تھوڑی دیر بعد بات جاری رکھتے ہوئے) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ع
"آنکھیں ہیں نیم باز یہ کیا خواب ناز ہے"

عورت۔ اب برخواست کرو یہ خیالی محفل ۔ مجھے نیند آرہی ہے۔

مرد۔ لیکن اب تو نقاب افق سے عروس سحر کی آمد آمد ہے۔

عورت۔ پھر وہی شاعری۔ میں ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ خیام کی رباعیوں کو روزانہ کی زندگی سے ۔ ہماری زندگی سے کوئی نسبت نہیں یہ گریز پسندی انسان کی موت ہے اور ۔ ۔ ۔ ۔ (اسی وقت پس منظر سے خیام کی روح گنگناتی ہے)

رباعی

آمد سحرے ندا ز مے خانہ ما ‏ ‏ کائے رند خراباتی و دیوانہ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ زمے ‏ ‏ زاں پیش کہ پر کنند پیمانہ ما

مرد۔ (بات جاری رکھتے ہوئے) ۔ سنا تم نے خیام کی روح عروس صبح بن کر پردۂ افق سے کیا کہہ رہی ہے۔

عورت۔ کیا کہہ رہی ہے ، وہی خواہ مخواہ کا فلسفۂ شراب ۔

گلفام۔ (بات کاٹ کر) فلسفۂ شراب ہی نہیں ملکۂ عالم! بلکہ ۔

مرد۔ بلکہ ۔

گلفام ۔ (بس ایک گیت چھیڑ دیتی ہے)

گیت

شرابی! جلدی جلدی پی
شرابی! جلدی جلدی پی
دولھن اوشا کی مسکائی
کرن کومل سے اونٹھوں کی
یہاں مے خانے تک آئی
پیالوں کے سہارے جی ۔۔۔ !
شرابی جلدی جلدی پی !!
ذرا یہ جام بھی بھر لے ۔
کہیں جیون کا پیالہ بھر نہ جائے سوچ تو کر لے !
ذرا یہ جام بھی بھر لے
وہ دیکھ آکاش پر اوشا نے اک انگڑائی بھی لے لی !!
شرابی! جلدی جلدی پی !
شرابی! جلدی جلدی پی ۔۔۔۔ ! !

(طربیہ ساز پس منظر میں ڈوب جاتا ہے اور صبح ہو جاتی ہے)

سویرا

منظر۔ (بیدار ہوتے ہوئے) ۔ خواب۔ عمر خیام کی رباعیوں کا سنوارا ہوا ایک حسین ترین خواب ۔

ناہید۔ کیسا خواب۔ سویرے سویرے یہ کیا بڑبڑا رہے ہو۔

منظر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے دیکھا کہ چاندنی رات میں ہم اور تم ایک پر فضا مقام پر چھوٹی سی محفلِ نشاط آراستہ کئے ہوئے ہیں ۔

ناہید۔ پھر؟

منظر۔ ۔۔۔ اس محفل میں ساقی بھی ہے۔ شراب بھی اور رقص بھی او ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔

ناہید۔ اور ؟

منظر۔ اور کسی نامعلوم مقام سے خود خیام اپنی رباعیوں سے ہمیں برکتیں پہنچا رہا ہے ۔

ناہید۔ اور اس کے بعد؟

منظر ۔۔۔ میں اس فضا کو ایک حقیقت سمجھ کر اس میں ڈوب گیا ہوں ، تم ہو کہ بار بار میری تخیل پرستی پر بگڑ رہی ہو اور ۔ ۔ ۔ ۔

ناہید۔ کہو نا ۔

منظر۔ اور ساقی ۔۔۔۔ وہی گلفام اپنے نغموں سے ، ہمارے لئے یہ جذبات کی نمائندگی کر رہی ہے لیکن ۔

ناہید۔ لیکن ۔

منظر۔ میری بدقسمتی کہ بہت جلد سویرا ہوگیا ۔

ناہید۔ (ہنس کر) لو سویرا تو ہو ہی گیا ہے یہ رہی تمہاری چائے ۔

منظر۔ (ہنس کر) کہاں عمر خیام کی محفل کا جام شراب اور کہاں یہ کڑوی چائے ۔

ناہید۔ کہاں تخیل ۔ کہاں حقیقت! (دونوں ہنستے ہیں) ۔

قوم کے نام پیغام

خوراک کے متعلق پردھان منتری نے ۲۲ اگست ۱۹۶۵ء کو ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی۔ اس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

خوراک کی تشویشناک صورتِ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا مقابلہ جنگی سرگرمیوں کے جذبے سے کیا جانا چاہیئے۔ اور یہ پختہ عہد کر لینا چاہیئے کہ اس راہ میں جو بھی مشکلات حائل ہونگی۔ ان پر لازماً غلبہ پا لیا جائے گا اگرچہ یہ درست ہے کہ خوراک کی حالت بہت نازک رہی ہے اور اس وقت بھی تشویشناک ہے، لیکن قحط کی باتیں کرنا حماقت اور لغویت ہے۔ ہمارے پاس فی الحال اپنے گذارے کے لئے کافی خوراک موجود ہے۔ لیکن سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ذرائع رسل و رسائل پر بہت بھاری بوجھ پڑ رہا ہے۔ لوگوں کو روزمرہ کی ادنیٰ اور فروعی سیاسیات سے الگ ہو کر حکومت کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر اس نازک صورتِ حالات کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ لوگوں کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ خوراک کے مسئلے کو حل کر سکتے ہیں اور ان میں ایسا کرنے کی پوری اہلیت موجود ہے۔ اس لئے کسی قسم کا خوف و خطرہ نہیں ہونا چاہیئے۔ لوگوں کو کان کھول کر یہ سن اور سمجھ لینا چاہیئے کہ اس وقت یا آئندہ کنٹرول ہٹانے کا کوئی سوال نہیں ہے۔

پچھلے دو تین مہینوں کے دوران میں قدرت ہم پر سخت نامہربان رہی ہے۔ آخری بہار میں پیش از وقت بارشوں نے فصلوں کو برباد کر دیا۔ اس کے بعد دریائے کوسی میں سیلاب آیا۔ مدراس کے کچھ اضلاع میں تین سال سے متواتر موسمی بارشیں نہ ہونے سے خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا ہے سوراشٹر میں سیلاب سے تباہی ہوئی تو بمبئی کے تین اضلاع میں بارش کی ایک بوند نہیں پڑی۔ قدرت کی ستم ظریفی نے ان علاقوں میں خوراک کی صورتِ حالات کو اچانک ہی پلٹ دیا ہے۔

کچھ میں جنگ چھڑ جانے سے ڈرپوک اور بے ایمان لوگوں نے اناج کو چھپا کر رکھنا اور بھاؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی بنگال اور آسام میں شرنارتھیوں کی بہت بڑی تعداد کو خوراک مہیا کرنے کا بوجھ بھی آ پڑا۔ آسام میں بھیانک بھونچال آیا۔ جس سے فصلیں برباد ہو گئیں۔ سڑکیں اور ریل کی پٹڑیاں زمین میں دھنس گئیں۔ اور آمد و رفت کا تمام سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے بنگال اور بہار میں قحط پڑ جانے کا خوف پھیلانا شروع کر دیا۔ اس سے مشکلات اور بھی بڑھ گئی ہیں۔ میں سب کچھ آپ کے سامنے اس لئے بیان کر رہا ہوں۔ کیونکہ آپ کو اصل صورتِ حال سے پورے طور پر باخبر کرنا اور کوئی بات چھپا کر نہ رکھنا ہی موجودہ حالات کا مقابلہ کرنے کا بہترین طریقہ ہے

نہ صرف بھارت ہی میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی چاول کی قلت ہے۔ آسام جو باقی ملک کو دس ہزار ٹن چاول مہیا کرنے والا علاقہ تھا اب قلتِ اناج کا علاقہ بن گیا ہے۔ دنیا بھر میں اناج کے نرخ چڑھتے ہی جا رہے ہیں، اور اناج حاصل کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ بین الاقوامی صورتِ حالات حد درجہ نازک ہو رہی ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ اس لئے ہمیں غیر ملکوں سے اناج کی درآمد پر چنداں بھروسا نہیں کرنا چاہیئے

وزیروں کی کانفرنس کے فیصلے

آپ کو معلوم ہے کہ چند روز پہلے نئی دہلی میں ریاستوں کے بڑے منتریوں کی کانفرنس ہوئی تھی جس نے مندرجہ ذیل فیصلے کئے تھے۔ (۱) خوراک کی فراہمی اور پیداوار کا کام جنگی سرگرمیوں کے جذبہ کی مانند منظم کیا جانا چاہیئے۔ اور مرکز اور

ریاستیں اس معاملہ کو اہم ترین ترجیحی معاملہ تسلیم کرکے عمل کریں۔ (۲) جہاں کہیں انتظامیہ مشینری کمزور ہو، اس کو از سر نو مکمل طور پر مرتب کرکے مضبوط بنایا جائے۔ (۳) وافر اور فاضل اناج والے علاقوں میں فراہمی غلّہ کی مہم کو زیادہ تیز کر دیا جائے۔ یہ مسئلہ بھارت میں رہنے والے ہر ایک بشر پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ اس لئے اس کو سیاسی اختلافات سے الگ تھلگ رکھنا چاہیئے۔ بدقسمتی سے کچھ لوگ اس میں سیاسیات کو داخل کر رہے ہیں اور اس صورت حال کو سیاسی اغراض کے استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور ملک میں خوف و ہراس پھیلانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

جو لوگ اناج کے ذخیرے جمع کرنے۔ ملک میں خوف و ہراس پھیلانے اور نرخ بڑھانے میں مدد کر رہے ہیں، وہ سارے ملک کے خلاف سخت قسم کا جرم کر رہے ہیں۔ بیدار رائے عامہ کو یہ ہرگز برداشت نہ کرنا چاہیئے۔ اب اناج کے بہت بڑے ذخیرے جمع کرنا قابل تعزیر سنگین قسم کا جرم قرار دیا جا چکا ہے۔ ضروری اشیا کی بہم رسانی میں جو لوگ رکاوٹ بنتے ہیں ان کو نظر بند کر دینے کے اختیارات مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو دے دیئے گئے ہیں۔ پولیس افسروں اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ خوراک کا بندوبست کرنے میں اگر انھوں نے کسی طرح کی کوتاہی کی تو یہ ان کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ اور ان کے خلاف ریکارڈ کیا جائے گا۔ میں نے آپ کے سامنے تمام حالات پوری طرح وضاحت سے رکھ دیئے ہیں کیونکہ مشکلوں پر صاف دلی جرأت و ہمت اور تعاون سے قابو پا سکتے ہیں۔ ہمیں مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے غیر ملکی امداد کا آسرا چھوڑ کر ہمت و حوصلہ۔ پختہ عہد اور اکھٹے مل کر کام کرنا چاہیئے۔ جے ہند۔

دریائے مہاندی کا پُل

اڑیسہ کے عوام کے لئے اس سال کا یوم آزادی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سنبل پور کے مقام پر دریائے مہاندی پر جو نیا پُل تعمیر کیا گیا ہے وہ اس متبرک موقع پر عوام کے لئے کھول دیا گیا ہے۔ اڑیسہ میں دریائے مہاندی پر یہ پہلا ریلوے پل ہے۔ اس پُل کی تعمیر ہیراکڈ پروجیکٹ کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اڑیسہ کی ریاست مقابلتاً کم ترقی یافتہ ہے اور اس کی آئندہ خوشحالی کا دار و مدار ہیراکڈ پروجیکٹ پر ہے جس پر ۴۵ کروڑ روپے لاگت آئے گی۔

یہ پُل آدھ میل سے زیادہ لمبا ہے اور اس پر اندازاً پچاس لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔ پُل کے اوپر ۲۴ فٹ چوڑی سڑک گزرتی ہے جس کے دونوں جانب پیدل چلنے والوں کے لئے پانچ فٹ چوڑے راستے رکھے گئے ہیں۔ پُل کے ستونوں کی بنیادیں ساڑھے چار لاکھ مکعب فٹ پتھر کی چٹان کو کھود کر تیار کی گئیں اور ان میں ساڑھے سات لاکھ مکعب فٹ کنکریٹ ڈالا گیا۔ یہ پل ریلوے اور سڑک دونوں کے لئے ہے۔

ہیراکڈ پروجیکٹ اڑیسہ کو بھارت کی سب سے زیادہ دولت مند ریاستوں کی صف میں کھڑا کر دیگا۔ اس سے کئی طرح کے فائدے حاصل ہوں گے۔ گیارہ لاکھ ایکڑ اراضی کی آبپاشی ہوگی جس کے نتیجہ کے طور پر تین لاکھ چالیس ہزار ٹن زائد اناج پیدا ہوگا۔ اس پروجیکٹ سے ساڑھے تین لاکھ کلو واٹ بجلی حاصل ہوگی۔ توقع کی جاتی ہے کہ اتنی بڑی مقدار میں اور بہت سستی برقی قوت دستیاب ہونے کی وجہ سے فولاد، ایلومینیم، کاغذ، سیمنٹ اور سوتی کپڑے وغیرہ کی کئی صنعتیں سنبل پور کے گرد و نواح اور اڑیسہ میں دیگر مقامات پر شروع ہو جائیں گی اور فروغ پائیں گی۔

اس پروجیکٹ کے ذریعہ سیلاب اور طغیانی پر مکمل کنٹرول کر لیا جائیگا۔ مہاندی کے خوفناک سیلاب کی وجہ سے جو مصیبت نازل ہوتی ہے اس سے دائمی ریلیف حاصل ہو جائیگا۔ جب سردی اور گرمی کے موسموں میں دریا کے پانی کو کنٹرول میں رکھا جا سکیگا تو اس دریا میں جہازرانی کے امکانات بہتر ہو جائیں گے۔ زمین کی زرخیزی کا تحفظ، مچھلیوں کی پرورش اور آبی کشتیوں کے لئے ایک نہایت موزوں بحری اڈہ حاصل ہو جائیگا۔ یہ سب فائدے اس اہم پروجیکٹ کی تکمیل پر حاصل ہوں گے۔

غزلیں

تلوک چند محروم

کیا اور آبرو تجھے اے چشمِ تر ملے
ملتے ہیں کس صدف میں جو تجھ کو گہر ملے

کوئی نہ ساتھ منزلِ مقصود تک گیا
راہِ فنا میں گرچہ بہت ہمسفر ملے

پھینکا ہے مجھ کو وادئی وہم و گماں میں کیوں
جس میں ترا سُراغ، نہ اپنی خبر ملے

یُوں زندگی سے مل کے جوانی جُدا ہوئی
جیسے کسی سے کوئی سرِ رہگذر ملے

دیتا ہمارے نالۂ خُونیں کی داد کون
سب اپنی حسرتوں کے یہاں نوحہ گر ملے

پیری سے ہے اجل کو تقاضا رحیل کا
دل چاہتا ہے لذتِ خوابِ سحر ملے

محرومؔ لاجواب ہے غالبؔ کی وہ غزل
تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے

آرزو لکھنوی

یہی اک نباہ کی شکل ہے وہ جفا کریں میں وفا کروں
اگر اس پہ بھی نہ نبھی تو پھر مرے کردگار میں کیا کروں

کوئی پھانس ہو تو نکال لوں کوئی درد ہو تو دوا کروں
جو یہ کچھ نہیں دلِ مضطرب تو علاج تیرا میں کیا کروں

ہے محبت ایسی بندھی گرہ جو نہ ایک ہاتھ سے کھل سکے
کوئی عہد توڑے کرے دغا مرا فرض ہے کہ وفا کروں

ہیں ہزار باتوں میں ایک بھی کبھی ان سے کھل کے نہ کہہ سکا
اگر ایک طرح کی بات ہو تو ہزار طرح ادا کروں

اب اگرچہ یاس ہی یاس ہے مجھے اپنی بات کا پاس ہے
وہ ہزار آنکھ سے دور ہو نہ مگر میں دل سے جُدا کروں

جو کیا کیا - جو ہوا ہوا - جو دیا دیا - جو گیا گیا
میں کروں تو دل سے بھی صبر ہی جو نہ آئے صبر تو کیا کروں

مری منتوں پہ ہیں تہمتیں، مری التجاؤں پہ ٹھوکریں
جو دوا سے اور مرض بڑھے تو علاج اس کا میں کیا کروں

وہ اگرچہ ان کی ہو دل لگی یہ سُنا تو جاں سی آ گئی
ادھر آ قریب مرے ذرا ترے درد کی میں دوا کروں

جو ہنسا تو صورتِ زخمِ دل کہ لہو کے قطرے ٹپک پڑے
میں ستم رسیدہ ہوں آرزوؔ نہ بہاؤں اشک تو کیا کروں

اسرار احمد آزاد

جنوبی مشرقی ایشیا

دنیا کی سیاسی اصطلاحات میں جنوبی مشرقی ایشیا کی اصطلاح ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے، اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اُس کے دائرے میں ایشیا کے کن کن ملکوں کو شامل کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک اس اصطلاح کے دائرے میں شامل ممالک کا تعین نہ کیا جائے اس خطۂ ارض کے سیاسی، اقتصادی اور معاشی حالات نیز اس کے باشندوں کی ضروریات کے متعلق کچھ لکھنا بھی دشوار ہے۔

جنوبی مشرقی ایشیا سے مراد ہے وہ ممالک جو برِاعظم ایشیا کے جنوبی مشرقی حصّے میں آباد ہیں، اور وہ ممالک ہیں ہندوستان، پاکستان، برما، نیپال، سیلون، انڈونیشیا، انڈوچائنا، ملایا، فلپائن، کوریا، تھائی لینڈ (سیام) چین اور جاپان۔ اس خطۂ ارض کا مجموعی رقبہ ۲،۰۲۹،۱۴۸ مربع میل ہے۔ اور اس میں کم و بیش ۶۹۹،۴۴۹۶۰،۴۰۱ افراد آباد ہیں۔ پھر یہ تمام ممالک نہ تو طبعی حالات اور کیفیات کے لحاظ سے ایک جیسے ہیں اور نہ تہذیبی، تمدنی اور لسانی اعتبار سے ان میں یگانگت کا کوئی رشتہ قائم ہے۔ اس لئے اختلاف احوال کے اعتبار سے اُن کی ضرورتوں اور اُن کے قومی مسائل کو بھی ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہیئے۔ یا پھر اُن کی علاقائی ضرورتیں تو ایک دوسری سے مختلف ہونی ہی چاہئیں۔ لیکن چونکہ یہ تمام ممالک برِاعظم ایشیا کے اجزاء ہیں، اور آج کی دنیا میں قومی ضرورتوں، اور داخلی مسائل کے علاوہ بین الاقوامی ضرورتوں اور خارجی مسائل کو بھی مدِّنظر رکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے اس خطۂ ارض کی کچھ ایسی ضرورتیں اور چند ایسے مسائل بھی منظرِ عام پر آ گئے ہیں جنھیں مشترک ضرورتوں اور مسائل کی حیثیت حاصل ہے۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ دنیا کا یہ خطّہ صدیوں تک مغرب کی محکومیت یا نیم محکومیت میں مبتلا رہا ہے۔ اور جاپان کے علاوہ جسے ماضی کے تلخ تجربات کے بعد اور مستقبل کے جنگی تقاضوں کے پیشِ نظر تقریباً نیم محکوم ملک بنا لیا گیا ہے، جنوبی مشرقی ایشیا کے باقی ماندہ تمام ممالک کسی نہ کسی عنوان سے مغربی قوموں کی نفع رسانی کا وسیلہ بنے رہے ہیں۔ اور اگرچہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد اس خطۂ ارض کے بیشتر ممالک صدیوں کی غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں، لیکن اس کے کچھ حصّے ایسے بھی ہیں جہاں قومی آزادی کی جد و جہد جاری ہے۔ اور اگر اس جد و جہد نے کسی جگہ اعتدال کی راہ سے انحراف کیا ہے تو اس کی وجہ بھی صرف یہی ہے کہ ان حصّوں کے غیر ملکی حکمراں اپنی ناجائز نفع اندوزی سے دستکش ہونے کے لئے تیار نہیں۔ پھر یہ بات بھی ظاہر ہے کہ دنیا کے محکوم اور نیم محکوم ممالک تعلیم، صنعت اور تجارت سے محروم رہا کرتے ہیں، ان کے قدرتی اور صنعتی وسائل حکمران قوموں اور طبقوں کے قبضے میں ہوتے ہیں۔ اور یہ امور ایسے ملکوں کے باشندوں کی اقتصادی اور معاشی زندگی کو پراگندہ کر دیتے ہیں۔

جنوبی مشرقی ایشیا کے ملکوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان ملکوں کا تعلیمی تناسب مغرب کے آزاد ملکوں کے تعلیمی تناسب سے بہت کم ہے۔ اور اگرچہ آج کے بین الاقوامی حالات نے اقتصادی اور معاشی اعتبار سے دنیا کے مضبوط سے مضبوط ممالک کو بھی پراگندگی میں مبتلا کر دیا ہے۔ لیکن اس خطۂ ارض کی اقتصادی اور معاشی بدحالی عالمگیر اقتصادی بدحالی سے کہیں زیادہ ہے۔ زرعی پیداوار اور خام معدنیات کی کثرت کے باوجود ایک طرف تو دنیا کے اس حصّے کے باشندے قحط اور قلّتِ خوراک کی مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں اور دوسری طرف اُن کے یہاں اپنے معدنی اور دوسرے قدرتی وسائل سے حقیقی فائدہ

اٹھانے کا کوئی معقول انتظام نہیں حتیٰ کہ دوسری عالمگیر جنگ نے ہمیں اس ہولناک حقیقت سے بھی روشناس کرادیا ہے کہ ایک ارب سے زیادہ انسانوں کا یہ ہجوم غیر خارجی امداد کے بغیر اپنی اور اپنے اپنے ملک کی حفاظت اور مدافعت بھی نہیں کرسکتا۔

پھر اسی قدر نہیں بلکہ مغرب کی متعدد قومی ضرورتوں اور بعض بین الاقوامی تقاضوں کی بدولت یہ خطۂ ارض قومی اور بین الاقوامی چپقلش اور کشمکش کا میدان بنا ہوا ہے۔ اور نئے سیاسی، اقتصادی اور معاشی نظریات اور معتقدات کی پیدائش اور افزائش نے دنیا کے اس حصے میں آباد اقوام کی بحالی اور تعمیر جدید کی راہوں کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے۔

ان حالات میں جنوبی مشرقی ایشیا کی مقدم ترین ضرورت یہ ہے کہ اس خطۂ ارض کے باشندوں کو اس قومی اور بین الاقوامی تخریبی کشمکش سے نجات حاصل ہو جائے، جو اس کے تقریباً ہر حصے میں کسی نہ کسی شکل میں برپا ہے۔ کیونکہ جس طرح ہم زمین کو قابل کاشت بنائے بغیر اس میں تخم ریزی نہیں کرسکتے۔ اسی طرح تخریبی جد و جہد کے ختم ہونے سے قبل قوموں کی تعمیری کوششوں کو بھی شروع نہیں کیا جاسکتا، اور اگر تخریب کے ساتھ ساتھ تعمیری مشاغل کو جاری بھی رکھا جائے تو اس کے نتائج محدود ہی رہیں گے۔

آج دنیا زندگی کے جس دور سے گذر رہی ہے وہ بین الاقوامی دور ہے اور دنیا کا کوئی طاقتور ترین ملک بھی اپنے گرد و پیش کے حالات کو نظر انداز کر کے یا دنیا کے دوسرے چھوٹے بڑے ملکوں سے قطع تعلق کر کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جنوبی مشرقی ایشیا آج جس قومی اور بین الاقوامی کشمکش کا میدان بنا ہوا ہے اُسے ختم کرنے کے سلسلے میں کوئی دانشمند انسان اس خطۂ ارض کے باشندوں کو مغربی طاقتوں یا دنیا کے دوسرے ملکوں سے قطع تعلق کا مشورہ نہیں دے گا اور جب ہم جنوبی مشرقی ایشیا کو مذکورۂ بالا تخریبی کشمکش سے نجات دلانے کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ مغربی ممالک اس خطۂ ارض کے متعلق اپنی مستعمرانہ حکمت عملی کو تبدیل کردیں۔ اسے اس کی قومی تعمیر کی جد و جہد میں ہر ممکن امداد دیں، اور اس کے ساتھ اپنے روابط حاکمانہ بنیادوں پر قائم رکھنے کی بجائے مساوی اور دوستانہ نہج میں تبدیل کر دیں۔ اس طرز عمل کا منطقی اور قدرتی نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ ایک جانب تو بین الاقوامی حالات کی وہ پیچیدگیاں بہت بڑی حد تک دور ہو جائیں گی جو جنوبی مشرقی ایشیا کی بعض خامیوں اور کمزوریوں کے باعث پیدا ہوتی جا رہی ہیں، اور جن کی وجہ سے امن عالم کو شکست کے قوی تر خطرات لاحق ہو رہے ہیں۔ اور دوسری طرف اس خطۂ ارض میں وہ بین الاقوامی مفاد بھی محفوظ ہو جائیں گے جن کے تحفظ کا مسئلہ بجائے خود بین الاقوامی کشیدگیوں کا ایک قوی سبب بنا ہوا ہے۔ پھر اس تغیر سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ آج ریاست ہائے متحدہ امریکہ یا بعض یوروپی ممالک جنگی بنیادوں پر جو گرانقدر مالی اور دوسری اقسام کی امداد دے رہے ہیں، اور اس غیر ضروری فیاضی کی بدولت خود اُن کی قومی اقتصادیات پر تباہ کن اثرات پڑ رہے ہیں وہ قطعاً مسدود ہو جائیں گے، اور ان ممالک میں محنت و سرمایہ داری کے مابین جو کشمکش برپا ہے وہ اگر ختم نہیں تو بہت بڑی حد تک کم ضرور ہو جائے گی۔

زندگی کے تمام چھوٹے بڑے مسائل کے حل کا انحصار صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ لوگوں کو اُنھیں حل کرنے کے لئے مہلت اور فرصت حاصل ہو جائے، اور جہاں تک قومی اور اجتماعی مسائل کو حل کرنے کا تعلق ہے انھیں پرسکون حالات اور تعمیری ماحول پیدا کرنے کے بعد ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے اگر جنوبی مشرقی ایشیا میں مذکورۂ بالا ماحول پیدا ہو جائے تو اس کے تعلیمی، اقتصادی، معاشی اور سماجی مسائل بھی آسانی کے ساتھ حل ہو سکتے ہیں۔

جیسا کہ ابتدا میں بیان کیا جا چکا ہے جنوبی مشرقی ایشیا دنیا کا ایک وسیع خطہ ہے۔ اس میں ایک ارب سے زیادہ انسان آباد ہیں۔ اس خطۂ ارض کے طبعی حالات اور یہاں بسنے والے لوگوں کی عام ضروریات اور تقاضوں نے انھیں محنت پسند اور جفاکش بنا دیا ہے اور اس محنت و جفاکشی کے باوجود جہاں تک ان کے معیار زندگی کا تعلق ہے وہ اسے مغربی ممالک کے باشندوں کے مقابلہ میں قلیل تر آمدنی میں قائم رکھ سکتے ہیں۔ پھر جنوبی مشرقی ایشیا میں ان قدرتی وسائل اور بنیادی اشیاء کی بھی کمی نہیں جو قومی اقتصا

کو ترقی یافتہ اور خودکفیل بنانے کے لئے ضروری تصور کی جاتی ہیں اور بحیثیت مجموعی اس خطۂ ارض میں ان تمام معدنیات کے وافر ذخائر موجود ہیں جن کے بغیر دنیا کا کوئی ملک اور کوئی حصہ بھی امن یا جنگ کے زمانے میں ترقی اور کامیابی کا تصور نہیں کرسکتا۔

ان حالات میں کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی کہ تعمیری جدوجہد کی فرصت اور مہلت حاصل ہو جانے کے بعد اس خطۂ ارض کے باشندے اپنے اپنے ملک کے قدرتی وسائل سے وہ فوائد حاصل نہ کرسکیں جو انجام کار انھیں طاقتور اور ترقی یافتہ بنا سکتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جنوبی مشرقی ایشیا کے جو ممالک مغربی اقتدار اور نفع اندوزانہ گرفت سے نجات حاصل کرچکے ہیں وہ اپنے قدرتی وسائل کو قومی تعمیر کیلئے وقف کردینے اور اپنے قومی مسائل کو حل کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟ لیکن اس سوال کا جواب ہی منزلِ مقصود کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا اور منظم ترین ملک بھی صرف اپنے قدرتی وسائل کی بدولت اپنی قومی ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتا اور اجتماعی زندگی کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ہم اپنی انفرادی اور قومی زندگی کی ضرورتوں کو بین الاقوامی تعاون اور اشتراک کے ذریعے سے پورا کریں۔ لیکن ایسی حالت میں جبکہ جنوبی مشرقی ایشیا کے تمام ممالک ابھی تک بیرونی اثرات سے پورے طور پر نجات حاصل نہیں کرسکے، اور ہنوز اُن کے قدرتی اور قومی وسائل سے دوسری قومیں فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک یا دو چار ممالک کیلئے خود اپنے وسائل اور ذرائع سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنا ناممکن ہے لیکن اگر پورا جنوبی مشرقی ایشیا آزادی اور خودمختاری کی مساوی سطح پر آجائے تو اس وسیع خطۂ ارض کے تمام تر وسائل بحیثیت مجموعی اُس کے باشندوں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے کفایت کرسکتے ہیں، اور اگر اس کے بعد بھی کوئی کمی محسوس کی جائے تو اُسے مساوی بنیاد پر بین الاقوامی تعاون اور اشتراکِ عمل سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ طریقۂ کار صرف جنوبی مشرقی ایشیا کو صنعتی اور تجارتی اعتبار ہی سے ترقی یافتہ اور خودکفیل بنا سکتا ہے بلکہ اس کی مدافعت کے مسئلہ کو بھی بہت بڑی حد تک حل کرسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ان کوششوں کی جانب اشارہ کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، جو ادارۂ اقوام متحدہ کے مختلف ماتحت ادارے اور دولت مشترکہ کے ساتھ وابستہ ممالک اس خطۂ ارض کی اقتصادی فلاح و بہبود کیلئے کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک جنوبی مشرقی ایشیا کے باشندوں کو اس امر کا اطمینان حاصل نہیں ہوگا کہ اس قسم کی مساعی کے پس پردہ امداد کرنے والوں کے سیاسی اور تجارتی مقاصد کارفرما نہیں ہیں، ان تمام مساعی کو شک اور شبہہ کی نظروں سے دیکھا جاتا رہے گا اور حالات کی اصلاح ہونے کی بجائے ان میں مزید اُلجھنیں پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔

مختصر یہ کہ آج بیسویں صدی کے عین وسط میں دنیا کے ہر گوشے سے قوموں کی آزادی، خودمختاری اور جمہوری نظامِ زندگی کے تحفظ کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ جنوبی مشرقی ایشیا کے باشندے اپنے صدیوں کے تلخ تجربات کی بناء پر ان نعروں میں صداقت اور حقیقت کے بہت کم تھوڑے سے عنصر کو مستور پاتے ہیں، اور بقول وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اب وہ اس بات کا عزم کرچکے ہیں کہ اس خطۂ ارض پر محکومیت کا کوئی نشان اور نیم محکومانہ زندگی کی کوئی علامت باقی نہیں رہنی چاہیئے، اور اگر آج انھیں آزادی اور خودمختاری کی فضا میں سانس لینے کا موقع حاصل ہوجائے تو وہ اپنے تمام مادی اور ذہنی وسائل کو منظم کرکے اپنے اقتصادی، معاشی، سماجی، سیاسی اور دفاعی مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کرسکتے ہیں، اور یہ طریقہ نہ صرف وقت کے اہم ترین تقاضوں ہی کو پورا کرسکے گا بلکہ ادارہ اقوام متحدہ اور اس کے منشور کے عین مطابق بھی ہوگا۔

مضمون نگار حضرات سے

مضامین اور نظمیں بہت بڑی تعداد میں جمع ہوگئی ہیں۔ اس لئے غیر طلبیدہ مضامین اور نظمیں قبول نہیں کی جائیں گی۔ اور صرف واپسی کے لئے ٹکٹ آنے کی صورت ہی میں واپس کی جائیں گی۔

(ادارہ)

کوثر چاندپوری

مصوری عہدِ اکبری میں

خاندانِ مغلیہ کا نامور شہنشاہ اکبر جس کو متحدہ ہندوستانی قومیت کے تصور کا بانی کہنا چاہیئے دوسرے علوم اور فنون کی طرح مصوری سے بھی کافی دلچسپی رکھتا تھا، اس نے اپنے عہدِ حکومت میں اس فن کو نمایاں ترقی دی اور تصاویر کا بہت زیادہ رواج ہو گیا۔ اگرچہ اس وقت نظامِ حکومت پر مذہبی رجحانات اثر انداز نہ تھے پھر بھی عوام ابھی ان تصورات میں جکڑے ہوئے تھے، اور ان کے شعور پر پوری طرح مذہبی قدروں کا تسلط تھا۔ سرکاری اداروں کے باہر ہر چیز اسی نقطۂ نظر سے دیکھی جاتی تھی، تصویر کشی کا فن آرٹ کے اعتبار سے کتنا ہی قابلِ قدر کیوں نہ ہو۔ اس کے متعلق مذہب کے احکام بالکل جداگانہ ہیں جن سے اس فن کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں ہوتی چنانچہ علماء نے مصوری پر بھی اعتراضات کیے ہوں گے اور اس سلسلہ میں علمی موشگافیوں کی نوبت بھی آئی ہوگی، اکبر کے کانوں میں بھی یہ باتیں ضرور پہنچی ہوں گی، اسی لئے وہ اپنی اس رائے کے اظہار پر مجبور ہوا، اس نے ایک جلسہ میں کہا۔

مصوری کی جو مذمت کی جاتی ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آتی، میرا خیال تو یہ ہے کہ مصور سے بڑا خدا شناس کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ جب وہ کسی جانور کی تصویر بناتا ہے تو اس کا جوڑ جوڑ نمایاں کر دیتا ہے، لیکن چونکہ اس پیکر تصویر میں روح نہیں پھونک سکتا اس لئے اپنے عجز کا اعتراف کر کے خدا کی طاقت کا قائل ہو جاتا ہے اور یہی خدا شناسی ہے، عوام سلطنت کے نظریات سے بہت زیادہ متاثر ہوا کرتے ہیں اکبر کے اس فطری رجحان نے بھی مصوری کی ترقی کے دروازے کھول دیئے اور ہندوستانیوں کے دماغ تصویر کشی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اکثر مصور اپنے آرٹ کے نادر نمونے دربار میں پیش کرتے اور بڑے بڑے صلے حاصل کرتے تھے، جلد ہی ملک میں ایسے ماہران فن پیدا ہو گئے جن کا آرٹ اہلِ فرنگ کے آرٹ سے بھی بڑھ گیا۔ ان کا موقلم نہایت صفائی، چابکدستی اور عمدگی سے نقوش بناتا اور ان میں رنگ بھرتا تھا۔ یوں تو مصوروں کی تعداد کافی تھی مگر سترہ مصور ایسے تھے جو کمال فن کے اعتبار سے بہت ممتاز سمجھے جاتے تھے۔

اکبر نے دوسرے محکموں اور صنعتوں کی طرح خطاطی اور تصویر کشی کا بھی ایک محکمہ قائم کر دیا تھا جو بہت مہذب اور باضابطہ تھا۔ اس میں مصوروں کے دوش بدوش خوش نویس، جلد ساز، نقاش اور لکیریں کھینچنے والے فن کار بھی ملازم تھے۔

کاتب نظم و نثر کی جو کتابیں لکھتے تھے مصور ان میں مناسب مقامات پر تصاویر بنا دیتے تھے، اور دوسرے اہلِ فن کتاب پر اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے تھے، نقاش بیل بوٹے بناتا تھا، مذہب سونے کے ورق چڑھاتا تھا۔ اور صحاف جلد سازی کا کام انجام دیتا تھا

اس محکمہ میں جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں یہ کتابیں خاص طور باتصویر تھیں:۔

قصہ امیر حمزہ، چنگیز نامہ، ظفر نامہ، اقبال نامہ، رزم نامہ، رامائن، نل دمن، کلیلہ و دمنہ، عیار دانش

قصہ امیر حمزہ کو بارہ دفتروں میں تقسیم کر کے ان میں مصوری اور رنگ آمیزی کرائی گئی تھی، ان سب دفتروں میں ایک ہزار چار سو تصاویر تھیں اور یہ سب مشہور آرٹسٹوں نے تیار کی تھیں۔ جن کتابوں کو مصور کرنے کی ضرورت ہوتی تھی ان کے متعلق اکبر خود ہی مصوروں کو ضروری ہدایات کرتا تھا اور جس جگہ تصویر کی ضرورت ہوتی تھی وہاں اپنے قلم سے نشان لگا دیا کرتا تھا۔

تصویر خانہ میں جو لوگ ملازم تھے ان میں سے بعض منصب د

اور جاگیردار تھے، بعض احدی اور سوار کے عہدے پر ممتاز تھے، احدی یعنی پیادے کی تنخواہ پندرہ روپے سے تیس روپے تک تھی، سوار اپنے رتبہ کے لحاظ سے اس سے زیادہ مشاہرہ پاتا ہوگا

تصویر خانہ میں بہت سے مصوّر ملازم تھے ان میں سب سے بڑا اور مشہور مصوّر جو یقیناً اپنے کمال فن کے اعتبار سے اس شعبہ کا نگراں اور افسر اعلیٰ ہوگا میر سید علی تھا یہ تبریز کا رہنے والا تھا اور وہیں اپنے باپ سے مصوّری سیکھی تھی ہندوستان پہنچ کر تصویر خانہ میں ملازم ہوگیا تھا

خواجہ عبدالصمد بھی اس شعبہ کا مشہور مصوّر تھا اس کو شیریں قلم کا خطاب بھی ملا تھا۔ خواجہ شیراز کا باشندہ تھا اور ملازمت کرنے سے پہلے ہی مصوّری سے واقف تھا مگر اکبر کے فیضِ تربیت سے اس فن میں زبردست ترقی کرلی تھی۔

دسونتہ ہندوستان ہی کا باشندہ تھا، یہ ایک کہار کا بیٹا تھا اور اپنے گھر میں دیواروں پر تصاویر اور نقش و نگار بنانے کی مشق کیا کرتا تھا۔ اتفاق سے بادشاہ کی نظر پڑ گئی، اس نے دسونتہ کے فطری جوہر کو بھانپ لیا اور اسے خواجہ عبدالصمد کے سپرد کردیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ مصوّری کے آرٹ کا ماہر ہوگیا[1]

مادھو بھی اس فن کا زبردست ماہر تھا بلکہ تصویر کشی اور نقاشی میں اسے عہدِ اکبری کا بہزاد سمجھنا چاہیئے۔

ماسٹر رحیمی کے مصنف نے ماسٹر رحیمی میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مادھو عبدالرحیم خان خاناں کے کتب خانہ میں بھی ملازم رہ چکا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ وہیں سے بادشاہ کے تصویر خانہ میں آیا ہو۔ کیونکہ اکثر اہلِ کمال پہلے خانخاناں کی سرکار میں نوکری کرلیا کرتے تھے۔ پھر اس کی سفارش سے شاہی محکمات میں منتقل ہوجاتے تھے۔ خان خاناں نے مادھو کو جاگیر بھی دی تھی۔ ماسٹر رحیمی کا مصنف لکھتا ہے کہ اس نے مادھو کو دیکھا تھا اور اس کی بنائی ہوئی تصاویر بھی خانخاناں کے یہاں دیکھی تھیں، واقعی یہ اپنے فن میں یگانہ تھا[2]

ان مصوّروں کے علاوہ تصویر خانہ میں اور بھی بہت سے مصوّر ملازم تھے، جن میں بساون، کیسولال، مکند، جگن، مہیس، کھیم کرن، تارا، سانولہ، ہرنس، رام، مسکین، فرخ اور قلماق کو بھی اس فن کا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا، اور

ضاقین صدق

رُباعیات

سائے میں فلک کے رقص کرتی ماتا!
ہر لمحہ سنورتی اور نکھرتی ماتا!
اِک طفل سہ ماہی کی طرح پلتا ہے
انساں، تری آغوش میں دھرتی ماتا

کروٹ لیتا ہے گاہے گاہے یہ فلک
گھٹتی، بڑھتی ہے اِن ستاروں کی چمک
مٹ سکتے ہیں اک حرفِ غلط کے مانند
یہ شمس و قمر پختہ نہیں ہیں اب تک

قرنوں میں نمودار ہوا ہے یہ نقش
اک عمر میں بیدار ہوا ہے یہ نقش
انسان بتدریج ہوا ہے پیدا
قسطوں میں نمودار ہوا ہے یہ نقش

بساون نے تو مصوّری، نقاشی اور رنگ آمیزی وغیرہ میں اتنی ترقی کرلی تھی کہ اہلِ فن اسے دسونتہ پر ترجیح دینے لگے تھے۔

تصویر خانہ کی نگرانی میں جن کتابوں کو مصوّر کیا گیا تھا نہیں کہا جاسکتا کہ اب ان کا کوئی نسخہ باقی ہے یا نہیں، جو اقبال نامہ (آئینِ اکبری) اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس کی تصاویر مصنف کے وقت کی نہیں ہیں۔ بلکہ اس کتاب کے حاشیہ نگار کی روائت کے مطابق اس کی بعض تصاویر نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر کی تیار کرائی ہوئی ہیں انھوں نے اسلحہ خانہ سے پرانے ہتھیار اور جواہر خانہ سے پرانے زیورات نکال کر ان کی تصاویر بنوائیں اور انھیں موجودہ کتاب میں شامل کردیا اس کے بعد خود حاشیہ نگار نے نہائت کوشش سے دوسری تصاویر مہیا کیں اور انھیں کتاب میں چسپاں کیا، حاشیہ نگار کا دعویٰ ہے کہ جو تصاویر اس نے کتاب میں لگادی ہیں وہ خود ابوالفضل کو بھی اتنے وسیع اختیارات کے باوجود میسّر نہ آئی ہوں گی۔ آئینِ اکبری جو میرے پیشِ نظر ہے مہاراجہ مہندر سنگھ بہادر فرمانروائے ریاست پٹیالہ کے حکم سے مطبع نول کشور میں چھپی ہے۔ غالباً نواب ضیاء الدین اور حاشیہ نگار کا تعلق بھی ریاست پٹیالہ ہی سے ہوگا۔

[1] آئینِ اکبری جلد اوّل صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۴ [2] ماسٹر رحیمی جلد سوم مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۱۶۹۲

ظہیر الدین مدنی

گُربا

رقص انتہائی جوش و مسرت کے وقت کا ایک اضطراری فعل ہے جس طرح غصّے کے عالم یا رنج و الم کی حالت میں انسان کے رونگٹے رونگٹے سے غضب اور رنج و الم کا اظہار ہوتا ہے۔ چہرے پر ایک رنگ آتا ہے ایک جاتا ہے۔ آنکھوں سے شعلے نکلتے ہیں۔ اعضا میں ایک قسم کی اضطراری حرکت پیدا ہوجاتی ہے۔ زبان اور دل و دماغ پر سے قابو جاتا رہتا ہے۔ اسی طرح چونکہ خوشی و مسرت کا بھی جذبات سے تعلق ہے۔ ایسے موقعوں پر بھی یہی حالت اور ہمارے اعضا میں ایک قسم کی حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہرچند یہ حرکت بے ترتیب ہی سہی چند لمحوں کے لئے ہی سہی لیکن اگر اس بے ترتیبی کو ترتیب دیا اور اصول کی زنجیر میں جکڑ لیا جائے تو یہ ایک فن ہوجاتا ہے حقیقت میں یہ جذبات کا اظہار ہے جو الفاظ میں ادا ہونے سے پہلے حرکات سے ظاہر ہوجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے بچّہ خوشی کے مارے اگر بول نہیں سکتا تو ناچنے لگتا ہے۔ بچّے تو کیا بڑے بھی یہی کرتے ہیں۔ صوفی کا کسی شعر تصوف پر تڑپ اٹھنا، عاشق کا کسی شعر پر جھوم جانا۔ اور مولانا روم کے پیرووں کا مثنوی پر وجدانی حالت میں رقص کرنا اسی اصول کے تحت ہوتا ہے۔

دنیا میں کوئی ملک یا قوم، متمدن یا وحشی ایسی نہیں جو فن رقص سے ناواقف ہو۔ متمدن اور غیر متمدن دونوں قوموں میں ناچ سوسائٹی کا جزو لاینفک ہے۔ اگر فرق ہے تو یہ کہ وحشیوں کے ناچ ان کے ماحول کے مطابق ہیں۔ اور متمدن ممالک کے ناچ ان کے اپنے ماحول سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔ اول الذکر میں سادگی، جسمانی صرف قوت، اصلیت اور ایک قسم کا اکھڑ پن ہوتا ہے۔ تو موخرالذکر میں پیچیدگی، نزاکت، تصنع اور شہوانیت ہوتی ہے۔ افریقہ کے وحشیوں کے ناچ ہوائی ناچ۔ ہندوستان کے بھیلوں کے ناچ بھی اتنی ہی اہمیت رکھتے اور دل خوش کن ہوتے ہیں جتنے روس کے بیلے، یورپ کے کیبرے اور ہندوستان کے بھرت ناٹیم (؟) اوڈیسی یا کتھک کے ناچ ہوتے ہیں۔

ہر ملک میں دو قسم کے ناچ ہوتے ہیں۔ ایک انفرادی۔ دوسرا اجتماعی ہندوستان میں بھی انفرادی اور اجتماعی دونوں ناچ رائج ہیں۔ ہندی ناچوں کا مذہب اور عبادت سے گہرا تعلق ہے۔ قدیم زمانے میں مذہبی جذبات اور عقیدت کے اظہار کے لئے سب سے زیادہ مناسب آلہ ناچ تصور کیا گیا ہے۔ اور ناچ بھی عبادت کا ایک طریقہ قرار پایا ہے آج ہم دراوڑی قوم کے ناچ دیکھتے ہیں۔ جن کی نمائندگی ہندوستان میں اودے شنکر، سیکی، گوپی ناتھ، سادھنا بوس۔ اور رکمنی دیوی وغیرہ کر رہے ہیں۔ یہ اصل میں ہندوستان کے مذہبی ناچ ہیں، جن کو مذہبی روایات کے معلوم کئے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔ ہندوستان میں شمالی ہند کے ناچ ایسے ہیں جن کو مذہب سے زیادہ تعلق نہیں۔ انھیں تمدن کی پیداوار کہہ سکتے ہیں۔

ہندوستانی ناچوں کا سراغ ہمیں ہندوستانی موسیقی میں ملتا ہے لہٰذا ہندوستانی ناچوں کی تاریخ کے لئے پہلے ہمیں موسیقی کی

تاریخ دیکھنی ہوگی۔ ہندوستان میں موسیقی کی تاریخ ایک ہزار سال قبل مسیح چار ویدوں میں سے سام وید میں ملتی ہے۔ سام وید کے شلوک کسی قربانی کے موقع پر ترنم کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ اور ایسے ترنم کے ساتھ پڑھنے والے شاستریوں کو گاندھرو کہتے تھے۔ اس ترنم میں کھرج، مدھم، اور رشبھ ایسے تین چڑھاؤ اُتار یعنی سپتکیں تھیں۔ جو گانے بجانے کا اصل اصول ہیں۔ موسیقی کے دوسرے دور یعنی ایک سو قبل مسیح سے ایک ہزار بعد مسیح میں متفرق ساز، تال، ٹھیکے وغیرہ وجود میں آئے۔ اوراں میں کافی ترقی بھی ہوئی۔ یہی دور ڈرامے کے جنم کا بھی ہے۔

ایک سو قبل مسیح میں موسیقی کے آرکیسٹرا جلسوں میں ہوا کرتے تھے اسی دور میں تار اور منہ سے بجانے کے ساز ایجاد ہوئے۔ اس دور میں بھرت نے راگ دھاری (پکا) گانا ایجاد کیا۔ اور موسیقی نے اتنی ترقی کی کہ فن موسیقی (گانا) دو بڑے حصوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک بھرت کے نام سے بھرت مت اور دوسرا "ہنومان مت" (کرناٹکی) کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہی وہ دور ہے کہ جس میں کلاسیکل سے نیچے (سائنٹیفک ناچ) وجود میں آیا۔ تیسرا دور وہ ہے جو مسلمانوں کی ہند میں آمد سے لے کر مغلوں پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں موسیقی کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اسی دور میں خیال، ٹھمری، ٹپہ وغیرہ ایجاد ہوئے۔ یہ وہ دور ہے جب موسیقی مذہبی حدود سے نکل کر ہندو اور مسلمانوں کا مشترک ترکہ ہو گئی۔ اور خواص سے نکل کر عوام میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ چوتھا دور موجودہ دور ہے۔ اس میں راگ دھاری گانے کے ساتھ ایک جدید طرز کے گانے ایجاد ہوئے ہیں۔ جن کو ریڈیو کی زبان میں ہلکے پھلکے ڈرامے کی زبان میں فلمی گانے اور عام طور پر بنگالی طرز کے گانے کہا جاتا ہے اس موجودہ دور میں ناچ کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے، مذکورہ بالا تقسیم "فن موسیقی کے ادوار وغیرہ" ایک سرسری جائزہ ہے، ممکن ہے اہل فن زیادہ ادوار میں تقسیم کر سکتے ہوں۔

ہم نے دیکھا کہ ایک سو قبل مسیح سے ناچ پایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس سے بہت پہلے سے ناچ موجود ہوگا۔ لیکن یہ وہ زمانہ ہے کہ جب ناچ کو باقاعدہ ترتیب دیا گیا۔ اور اس با ترتیب ناچ کی وقعت و مقبولیت بڑھتی گئی۔ جس طرح ایک زبان جب تک بازاری ہوتی ہے تو کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ لیکن یہی زبان جب ادبی صورت اختیار کر لیتی ہے تو زبان کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ چار سو صدی عیسوی میں پراکرت میں جو ڈرامے ملتے ہیں ان ڈراموں میں شاعری، موسیقی، ناچ، تال اور لے ہوتی تھی۔ وہ موسیقی اس دور میں ہوئی۔ دیوالی یا بسنت کے مہینے میں غرض ہر خوشی کے موقعے پر ناچ رنگ کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔

ناچ کا دوسرا حوالہ ہمیں بھاگوت اور برھما پُران میں ملتا ہے، بھاگوت کے دسویں باب میں کرشن اور گوپیوں کے ناچ میں پایا جاتا ہے۔ کرشن اور گوپیوں کے ناچ کی نوعیت یہ ہوا کرتی تھی کہ کرشن جی ایک جگہ کھڑے ہو جاتے اور گوپیاں ان کے ارد گرد ایک خاص انداز اور ترتیب کے ساتھ ناچتی اور گاتی تھیں۔ ان ناچوں کو لاسیہ کہتے تھے۔ ایسے ناچوں کا دوسرا حوالہ ہم کو جنیدر آچاریہ سے ملتا ہے۔ وہ اپنی تصنیف "ویش نام مالا" میں لکھتا ہے کہ جس ناچ کو سب مل کر ناچیں اور ان میں ایک شخص گانے میں پیشوائی کرے جیسے گوپیوں میں "ہری" تو اس کو راسک کہتے ہیں۔ اس طرح "سنگت رتناکر" کا بیان ہے کہ پاروتی نے اوشا نامی لڑکی کو ناچ سکھایا۔ اوشا نے دوارکا کی گوپیوں کو اور گوپیوں نے سوراشٹر (کاٹھیاواڑ) کی ناریوں کو سکھایا۔ اور کاٹھیاواڑ سے ہندوستان کے دوسرے خطوں میں پہنچا۔ اس حوالے کی سند پر شاید موجودہ دور کے گجراتی ادب کے ممتاز شاعر کوی نانالال آنجہانی نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا ہے کہ گجرات ہندوستان کا راس تیرتھ ہے۔

الغرض لاسیہ، راسک یا راس ہندوستان میں کسی نہ کسی طریقے پر ناچا جاتا ہوگا۔ لیکن چونکہ کاٹھیاواڑ میں اس ناچ کو فروغ حاصل ہوا لہٰذا یہ ناچ اس علاقے کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔ کاٹھیاواڑ میں اس نے لوک ناچ کی صورت اختیار کر لی۔ یہ مشترک عورتوں اور مردوں کا ناچ آج بھی اس علاقے میں اسی طرح ناچا جاتا ہے۔

اس راس نے گجرات میں آکر "گربا" کی شکل اختیار کر لی۔ گربا بھی راس کی طرح پہلے پہل ایک قسم کا مذہبی ناچ تھا۔ یعنی یہ ایسے ہی موقعوں پر ناچا جاتا تھا، اسی وجہ سے گربا کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ گربا لفظ گربھ سے مشتق ہے، اگربھ گھڑے کو کہتے ہیں۔ گھڑے میں سوراخ کئے جاتے ہیں اور اس کے اندر دیا جلایا جاتا ہے۔ اس دیئے والے گھڑے کو گربھ دیپک کہتے ہیں۔ نوراتری کی پوجا کے دنوں میں اس گربھ دیپک کو ایک جگہ رکھ کر یا سر

پر اٹھلاتے ناچتی ہوئی گول حلقہ بناکر ناچتی ہیں۔ اور اپنے جوشِ عقیدت کا اظہار کرتی ہیں۔ الغرض یہ بھی عبادت یا اظہارِ عقیدت کا ایک طریقہ قرار پایا جو خصوصاً گجرات میں اب تک رائج ہے۔

راس یا گربا صرف جسمانی حرکات کا نام نہیں ہے۔ حرکات، شاعری اور موسیقی مل کر راس یا گربا ہوتا ہے۔ گربوں میں جو گانے گائے جاتے ہیں ان گانوں میں گربا، گربی، راس، راسڑا، ایسے چار نام ملتے ہیں۔ عوام تمام گانوں کو گربا کہتے ہیں۔ لیکن ادب میں ان گانوں کو راس یا گربی کہتے ہیں۔ جس طرح اُردو ادب میں غزل ایک خاص صنف ہے اسی طرح گجراتی شاعری میں راس ایک الگ اور قابلِ قدر صنف ہے۔

ہمیں لفظ گربا (بحیثیت ادب) پہلے نرسینہ مہتا اور میرا بائی کے ہاں ملتا ہے۔ نرسینہ مہتا اور میرا بائی نے عبادت اور اظہارِ عقیدت کی غرض سے صوفیانہ رنگ میں ایسے گربے یعنی رقصی گیت لکھے ہیں۔ نرسینہ مہتا نے بھجن اور پربھاتیے بھی لکھے ہیں۔ جو قریب قریب گربا کی قسم کی مسلسل نظمیں ہیں جن میں بھگتی، محبت، دلی جذبات و قلبی واردات ہیں، سترھویں صدی عیسوی میں گجرات میں ایک شاعر دیارام گذرا ہے۔ جس نے راس اور گربوں کی طرح رقصی گیت لکھے ہیں۔ اور انھیں گربا کی بجائے گربی نام دیا ہے۔ جس طرح ریختہ سے ریختی وجود میں آئی اس طرح گربا سے گربی بنا لیا گیا۔ گربی مختصر مسلسل نظم ہے۔ گربی میں غزلیت زیادہ ہوتی ہے اس کو مسلسل غزل بھی کہہ سکتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی میں گربے لکھنے والے کوئی شاعر گجرات میں پیدا ہوئے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں گجرات میں انبا جی اور بھیرا جی دیویوں کی پوجا عام ہونے لگی تھی۔ اور اس پوجا میں عبادت اور اظہارِ عقیدت کا ایک طریقہ گربا بھی تھا۔ اس دور کے شاعروں میں ولبھ بھٹ خصوصیت رکھتا ہے۔ ولبھ بھٹ نے صرف گربے ہی لکھے، ان گربوں میں اگلے زمانے کی تمام خصوصیات کے علاوہ ایک جدت یہ پائی جاتی ہے کہ گربوں میں بھگتی، شکتی، مناظرِ قدرت وغیرہ کے علاوہ سماجی موضوعوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ گربا مندروں سے نکل کر چوراہے پر آگیا۔ یعنی سماجی موضوعوں کے شامل ہونے سے ان ناچوں اصلاحی ادب میں اتنی وسعت پیدا ہو گئی اور اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ گھر گھر راس اور گھر گھر گربا ہونے لگا۔ انیسویں صدی گربے کے لئے مبارک ثابت ہوئی۔ ایک طرف گربے لکھنے والے شاعر جیسے نرمدا شنکر (سورت) نول رام (سورت) پیدا ہوئے جنھوں نے بڑی جدت کے ساتھ گربے لکھے۔ دوسری طرف تھیٹر گھروں میں گربوں ہی نے ڈراموں کو چمکایا۔ اور ان کے نقائص پر پردہ ڈالا بلکہ یہ کہ گربوں نے ڈرامے میں ایک درجہ حاصل کر لیا۔ کوئی ڈرامہ گربے سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح تمام مذہبی تہوار، شادی بیاہ کی تقاریب اور سماجی جلسے گربے کے بغیر پھیکے سمجھے جاتے تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل سے اس فن میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ اس دور کے شعراء میں احمد آباد کا ایک شاعر کوی نانالال (انتقال ۱۹۴۵ء) قابلِ ذکر ہے جس نے کئی تصانیف اس صنف میں یادگار چھوڑی ہیں۔

قدیم زمانے میں گربے (ناچ) میں ایک قسم کی سادگی تھی۔ یہ ناچ تصنع اور بناوٹ سے بالکل پاک تھے۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اور ناچوں میں تراش خراش ہوتی گئی۔ اسی طرح اس کے گیتوں میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں۔ موجودہ دور میں زیادہ زور تخیل پر صرف کیا جاتا ہے، ان میں انوکھی تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے جاتے ہیں۔ کوی نانالال نے فلسفہ کو بھی شامل کر دیا۔ اور اس طرح گربے کی ایک قسم وہ ہو گئی جو ناچے جاتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو صرف پڑھے جاتے ہیں۔ بہاریہ (مناظرِ قدرت) گربوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں خیال ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کو پہلے شعر میں بیان کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد کے چار چھ اشعار اسی خیال کے جزئیات پر لکھے جاتے ہیں اور آخری شعر ماحصل ہوتا ہے۔ گربوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے، بہاریہ گربوں کے خاص خاص موضوع شرد پونم، بسنت، برشگال ہوتے ہیں۔ اور سماجی موضوع بھی ہوتے ہیں۔

یہاں ان رقصی گیتوں کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

دیارام:—

اس گربی میں دیارام نے رادھا کرشن کے ناز و نیاز کو پیش کیا ہے ہندو مذہب میں تصوف میں ہر جگہ خدا کو عاشق اور بندے کو معشوق کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

مندرجہ ذیل گربی میں رادھا کی سہیلی رادھا سے چند سوالات کرتی ہے۔ رادھا جن کے جواب دیتی ہے۔

گربی:- اے سجنی! مجھے یہ بتا کہ آج تو کہاں کھل کھیل آئی
یہ پیشانی پر پسینے کے قطرے کیسے ہیں۔ یہ بھویں کیوں بھیگی ہوئی ہیں

سن:- میں آج جنگل میں راستہ بھول گئی تھی اور اس وجہ سے میں وہاں بہت گھبرائی۔
اور یہی وجہ ہے کہ میری جبیں پر پسینہ ہے اور ابرو بھی بھیگی ہے

کہہ:- کل ہی تو میں نے تیرا گجرا گوندھا تھا آج یہ کس طرح ٹوٹ گیا
اور ایسی کیا عجلت میں تھی کہ تو بالوں کا جوڑا بھی برابر نہ باندھ سکی۔

سن:- سیاہ بھونرا میرے سر پر آ بیٹھا اس کو اڑاتے ہوئے جوڑا چھوٹ گیا
اور گجرے کو باندھتے ہوئے اس کی لڑیاں ٹوٹ گئیں

کہہ:- یہ تیری اطلس کی انگیا جس کی سہیلیاں بہت تعریف کرتی تھیں
اس کے بند کیسے ٹوٹ گئے۔ یہ تجھے کس نے نوچ لیا

سن:- میرے دل میں درد اٹھا تو میں بیکل ہو گئی
اور میں نے جو انگڑائی لی تو اس کے بند ٹوٹ گئے

کہہ:- راستے میں یہ خوشنما پھول تجھے کس نے دیئے
ایسا چھیل چھبیلا کون ملا تھا جس نے تجھ سے اظہار الفت کیا

سن:- صبح کو جب میں جاتی تھی تو کرشن جی راستے میں ملے
اور مجھے قسم دے کر یہ پھول دیئے۔ تو میں نے لے لئے

کہہ:- تیرے جسم سے یہ مشک کی مہک کیسی آ رہی ہے
تو تو اس وقت جنگل سے آ رہی ہے تیرے پاس اس کا کیا جواب ہے

سن:- جنگل میں اتفاق سے ایک غزال بیٹھا ہوا تھا پیار سے میں نے اسے دبوچ لیا۔
یہ اس کے مشک کی خوشبو ہے جو چھپائے نہیں چھپتی

کہہ:- معلوم ہوتا ہے کہ تجھے راستے میں شام سندر ملے تھے
یہ جو کچھ جواب تو دے رہی ہے یہ محض تیری چالاکی ہے

سن:- جس راستے پر ہری نے مجھے گھیرا ہو اس راستے سے نہ جاؤں
اگر مجھے ہری ملے ہوں تو کہہ دیسی قسم کھاؤں۔

سن:- میں نے تو عہد کیا ہے کہ غیر مرد میرے باپ اور بھائی ہیں
خدا کی عبادت سے اس بندہ دیارام کے سب دکھ دور ہو جائیں گے

دیارام کی ایک اور گربی ملاحظہ فرمایئے اس گربی میں معشوق سیاہ رنگ سے خوف زدہ ہے کیونکہ عاشق بے وفا ہے اور بے وفائی کو سیاہ رنگ سے تعبیر کیا ہے۔ گربی میں لفظ کپٹ (کینہ) استعمال کیا ہے لیکن اس کے معنے دھوکا اور بے وفائی لیے گئے ہیں کرشن جی کا رنگ بھی سیاہ تھا یہ بھی تصوف سے مملو ہے۔

میں اب سیاہ رنگ کے قریب نہ جاؤں گی
جو چیزیں سیاہ ہیں ان میں میرے عاشق جیسا ہی کپٹ ہوگا۔
نہ عنبر کا قشقہ کھینچوں گی نہ آنکھوں میں کاجل آنجھوں گی
نہ کوئل کی کوک سنوں گی نہ کاگا کی آواز
نہ تو سیاہ رنگ کی چولی پہنوں گی نہ جمنا میں اشنان کروں گی
نہ بندرا اور سیاہ بادل کی طرف دیکھوں گی نہ جامن اور بینگن کھاؤں گی
میں نے دیارام کے پریتم سے نہ ملنے کا عہد کیا ہے۔ لیکن دل کہتا ہے اک لحہ بھی ایسا نہ ہوگا

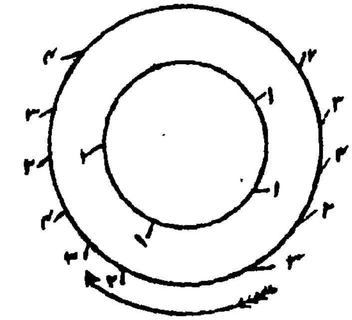
"بسنت"

بسنت کے ساتھ خوشی آئی
اور دنیا پر مسرتیں چھا گئیں
بسنت کا عجیب سہاگ ہے
بسنت آئی اور سب بادل چھٹ گئے
اور ہر طرف روشنی پھیل گئی
بسنت کا عجیب سہاگ ہے
بسنت آئی اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی
اور لوگوں کو فرحت بخشنے لگی
بسنت کا عجیب سہاگ ہے
فصلوں کی وجہ سے کھیت لہلہاتے ہیں
کسانوں کے دلوں کو لبھاتے ہیں
بسنت کا عجیب سہاگ ہے
چاند پوری بہار کے ساتھ نکلا
اپنے پورے جوبن کے ساتھ چلا
بسنت کا عجیب سہاگ ہے
سکھیوں کے دل مچلے

(انھوں نے) بسنت کے اس کھیلے
بسنت کے عجیب سہاگ ہیں

آرٹ:-

گربا دوسرے ناچوں سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ گربا صرف حلقہ میں کھڑے ہوکر ناچا جاتا ہے۔ اگر حلقہ میں گول گول نہ ناچیں تو پھر یہ ناچ ہی نہیں کہا سکتا۔ لہٰذا اس ناچ کی بڑی شرط یہ ہے کہ اس کو حلقے میں ناچا جائے۔ گربوں میں جدت پسندوں نے بیسیوں طریقے ایجاد کئے ہیں لیکن ان سب کا اصل اصول قریب قریب ایک ہی ہے۔ اس ناچ کا تمام تر دارو مدار قدموں اور ٹھیکہ پر ہے۔ گربے میں ناچنے والوں کی تعداد کی کوئی خاص قید نہیں ہوتی۔ مگر عام طور پر کم از کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ بیس افراد ہوتے ہیں۔ ہم یہاں اس کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں جس سے قارئین کو اس کا اندازہ ہوگا۔



نمبر ا تر تال کا سم ہے۔ اس کے بعد نمبر ۲ دوسری تال ہے۔ اس تال پر سب ناچنے والے اندرونی حلقے سے بیرونی حلقے میں چلے آئیں گے نمبر ۳ تال کی خالی ہے۔ اس وقت بیرونی حلقے میں ایک قدم اندر ہٹ کے چھوٹا حلقہ بنالیں گے۔ بس اس طرح پورا گیت ختم کر دیں گے۔ یہ تو ہوا تال اور سم۔ سم سے اٹھ کر دوسرے سم تک جاتے جاتے بڑی منزلیں طے کرنا ہوتی ہیں۔ کبھی دو دو بالمقابل ہوں گے، کبھی ایک دوسرے کے سامنے تھوڑا جھک جائیں گے۔ کبھی دو حلقوں میں تقسیم ہوجائیں گے غرض بے شمار طریقے ایجاد کئے گئے ہیں۔ ہم نے اوپر صرف تین تال کی مثال دی ہے۔ لیکن موجودہ دور میں متفرق تالوں میں گربے چیاں

کئے گئے ہیں۔ پہلے گربوں کو آسان اور مروج راگوں میں بٹھلایا جاتا تھا مگر اب مشکل راگوں اور راگنیوں میں بٹھلایا جاتا ہے۔ بعض اہل ذوق اس رجحان کو پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے گربوں کی اصلیت اور سادگی خاک میں مل جاتی ہے۔ تصنع اور بناوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ اس طرح فن کی حیثیت سے ترقی ضرور ہوتی ہے۔ مگر ان گربوں میں جذبات کی جو فراوانی کارفرما ہوتی ہے وہ مفقود ہوجاتی ہے۔ اور ایک مشین کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔

کاٹھیاواڑ کے راس اور گجرات کے گربے میں تھوڑا سا فرق ہے۔ راس میں عورت اور مرد دونوں ساتھ مل کر ناچتے ہیں۔ اس کے برخلاف گربے میں صرف عورتیں ہوتی ہیں۔ راس کے گیتوں میں بعض اوقات مذہبی قصے ہوتے ہیں۔ لیکن گربوں میں نزاکت، متانت اور فن کاری ہوتی ہے۔

لباس:-

گربوں میں لباس کو بڑا دخل ہے۔ لباس سے گربے کی بہار میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ گربے میں ایک قسم کی نقل و حرکت ہوتی ہے۔ اس وقت رنگ برنگ کے کپڑوں کا فضا میں اڑنا، حلقوں میں رنگوں کا دوڑنا ایسا منظر پیش کرتا ہے جیسے رنگ کی لہریں دوڑ رہی ہوں۔ رنگ کی یہ لہریں زنجیر جمال پیش کرتی ہیں۔ گربوں کو دیکھنے میں جہاں ہمارے کان نغمے میں ڈوب جاتے ہیں، جہاں تال کا ہر جھٹکہ سامعین پر کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ جہاں زرق برق لباس صاعقہ ریزی کرتا ہے وہاں آنکھیں بھی رنگوں کی دنیا میں گم ہوجاتی ہیں اور ان سب کے ایک ہوجانے سے ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ کہنا پڑتا ہے کہ:-

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

پہلے گربا کھیلتے (ناچتے) وقت عام طور پر پشواز پہنی جاتی تھی کاٹھیاواڑ میں اب تک بھی زیادہ تر پشواز ہی پہنی جاتی ہے مگر گجرات میں ساری باندھتے ہیں۔ بعض اوقات لہنگا، دوپٹہ اور چولی بھی ہوتی ہے۔ عام طور پر شوخ رنگ اور چھپتے گوٹے ٹنکے ہوئے کپڑے گربے کے لئے مناسب سمجھے جاتے ہیں مگر گربا کھیلنے والوں کے کپڑوں میں خاص طور پر تناسب اور ترتیب ہوتی ہے۔

گربوں میں قدیم زمانے میں مٹی کے گھڑے اور بجانے کے لئے ڈنڈے استعمال کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ اور اب جست یا تانبے پیتل کے گھڑے یا چھوٹے چھوٹے لوٹے ہوتے ہیں۔ اس طرح دوسری بہت سی اشیاء سے جا بجا گربوں میں کام لیتے ہیں۔

المختصر، اس یا گربا کا گجرات کے ساتھ اتنا مخصوص ہے کہ گربا کا نام سنتے ہی ہر گجراتی کے تصور میں ایک سماں بندھ جاتا ہے اور اس کے جلسے، اس کے گیت، اس کے کپڑوں کی چمک دمک اور سب سے زیادہ فتنہ گر بتا گجرات کے سلونے اور ملیح چہرے گجراتیوں کے خیال میں رقص کرتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں اس ناچ کا رواج نہیں۔ اور اگر ہے تو بھی اس فن کو جو فروغ گجرات میں حاصل ہوا وہ اسے اس کی جنم بھوم یعنی کاٹھیاواڑ میں بھی نہیں ہوا۔ گجرات کے مہذب گھرانوں (ہندو اور مسلمان) میں اگر کسی عورت سے ناچنے کے لئے کہا جائے تو وہ ناک بھوں چڑھائے گی لیکن اگر گربا کھیلنے کی گذارش کی جائے تو فوراً ڈھول یا طبلہ پر تھاپ اور تال کی تالیوں سے فردوس گوش اور رنگ برنگ کی ساریوں سے جنت نظر کا منظر پیش ہو جاتا ہے۔ گربا تماشہ کا ناچ نہیں۔ اس کے گیت تان پلٹوں میں الجھے ہوئے نہیں۔ یہ ایک مہذب سوسائٹی کا مہذب ناچ ہے۔ جس پر حیا سایہ فگن رہتی ہے۔ اور اس وجہ سے یہ ناچ پیشہ وروں کے ناچ سے زیادہ ممتاز نظر آتا ہے۔

گجرات و کاٹھیاواڑ میں ہندو اور مسلمان دونوں کا یہ محبوب ناچ ہے اگرچہ ہندوؤں میں یہ زیادہ رواج پا گیا ہے۔ لیکن مسلمان رؤسا میں بھی اس ناچ کا رواج ہے۔ مسلمان عورتیں گجراتی گربے نہیں گاتیں بلکہ ٹھمری یا دادرے سے اپنا ذوق پورا کرتی ہیں۔ ان کے ساتھ طبلہ نہیں بلکہ کتا گھر گھر کی آنا دوا کوئی بڑی بوڑھی یا منجھی ہوئی ڈھول لے کر ایک جگہ بیٹھ جاتی ہے اور اس کے گرد بیگمات گربا کھیلتی ہیں۔ بہ زیادہ سائٹیفک نہیں ہوتا۔ کاٹھیاواڑ میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے رؤسا میں اس کا بہت زیادہ رواج ہے اور پیشہ وروں کے گربے کھیلنے والے باقاعدہ گروہ ہوتے ہیں۔ کاٹھیاواڑ میں انفرادی ناچ گھومر اور جمور بھی رؤسا میں ناچے جاتے ہیں۔ گویا گربا کاٹھیاواڑ کے رؤسا کی صحبتوں کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔





گنگور ناچ کا ایک نمونہ – ودیا بھون کلا منڈلی گروپ اودے پور کی طرف سے



جلوبی ہند کا بھارت نیٹن



شریمتی سکھی کتھک ناچ کے عالم میں – بطور رادھا کے جسے شری کرشن نے چھوڑ دیا ھے

شری رکمنی دیوی کا کلا کھشیتر (مد
بعض طالبات بھارت نتیام نا
مشق کر رہی ھیں







منی پور انداز کا ناچ – کرشن جی کی ایک گوپی ناچ رہی ہے



اروازی انداز کا ایک ناچ

دیوتاؤں

آسٹریلیا میں ہندوستانی
صاحب ہائی کمشنر کے
مائی عالم رقص



کتھاکلی ناچ کا ایک اور رخ



یا بھون کلا مندر گروپ اودے پور کا ایک
ر رخ – بھیلوں کا ناچ فصل پک جانے پر





بھیرو پوجا
(بھیلوں کا ناچ)



امر کلا ناچ



رکمنی دیوی عالم رقص میں



رگھوناتھ پرانجپے
ی ایک بچی
یں



نرتیا دیپکا — کلو وادی کا لوک ناچ



منی پور کا ایک اور ناچ





رادھا کرشنا
ناچ



جنوبی ھند کا
ایک ناچ

ہندوستان کا مشہور رقاص —— رام گوپال



شیام سندر پرویز

بچپن

سرندر نے تپائی پر ٹی سٹ کا ڈبہ رکھتے ہوئے کہا "دیکھو شوشی ہم تمہارے لئے کیسا اچھا ٹی سٹ لائے ہیں۔"

اور شیلا چڑ سی گئی۔ اس کا ایسا جی چاہا کہ وہ ٹی سٹ کو تپائی سے اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دے۔ "دیکھو شوشی ہم تمہارے لئے کیسا اچھا ٹی سٹ لائے ہیں" جیسے وہ ان کی بیوی نہیں۔ ننھی سی بچی ہے۔ جس کے کھیلنے کے لئے وہ کوئی خوبصورت سا کھلونا لائے ہوں۔ اسے سرندر کا باتیں کرنے کا یہ انداز ہمیشہ کھٹکتا تھا۔ وہ تو اس سے اس طرح باتیں کرتے تھے۔ جیسے وہ کوئی الہڑ سی معصوم سی لڑکی ہے جس کا دل بہلانا وہ فرض سمجھتے ہیں۔ جیسے خود اس کی کوئی رائے ہی نہیں۔ جیسے جو کھلونا اسے دیدیا جائے گا، وہ اسی کے ساتھ کھیل کر خوش ہو جائے گی۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے آج تک اسے کھلونوں ہی سے خوش کیا گیا ہے۔ "شوشی تمہارے لئے ہم نیا پلنگ لائے ہیں" ــــ "شوشی دیکھو آج ہم تمہارے لئے کیا لائے ہیں، کتنا گرینڈ ہے یہ ریڈیو سٹ" ــــ "شوشی دیکھو تمہارے لئے یہ پرنٹڈ سوٹ لائے ہیں ہم" ــــ جیسے ان چیزوں کو خریدنے اگر وہ بھی ان کے ساتھ چلی جاتی اور مختلف چیزوں سے اپنی پسند کی چیز خرید لاتی تو قیامت ہی آجاتی۔ وہ تو اس کے پہننے کے کپڑے بھی یوں خرید لاتے تھے۔ جیسے اس کا کوئی ٹیسٹ ہی نہیں، اسے خریدنے کی سمجھ ہی نہیں۔ جیسے وہ خود خرید لاتی تو بدذوقی کا ثبوت دیتی۔ اور اس خیال سے ہی اسے ٹھیس سی لگی۔ اور خود بخود اسے کالج کے وہ دن یاد آگئے جب کالج کی تمام لڑکیوں میں اس کی پسند کے چرچے تھے۔ جب وہ کسی نئے ڈھنگ سے سوٹ سلواتی تھی تو وہ فیشن بن جاتا تھا۔ وہ کسی نئے انداز سے بال بناتی تھی تو لڑکیاں اس کی نقل کرتی نہ تھکتی تھیں۔ اور اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ اپنے لئے کپڑا خریدے اسے دو سال ہو گئے تھے۔ اور اسے ان لمبے دو سالوں میں اپنی بے بسی پر جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ کسی نامعلوم سحر کے زیر اثر شوشیلا سے شوشی بن گئی تھی۔ شروع شروع میں اسے سرندر کے پکارنے کا یہ انداز کس قدر پیارا معلوم ہوتا تھا جیسے زندگی کی سب حلاوتیں اس انداز میں پنہاں تھیں۔ جیسے وہ ہلکی سیٹیوں سے اس کے کانوں میں سحر پھونک رہے ہوں۔ شوشی۔ شوشی۔ شوشی۔ اور وہ اس سحر کے زیر اثر اپنی ہستی تک سے فراموش ہوتی جا رہی تھی۔ اور سچ مچ جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنی انفرادیت کھو بیٹھی تھی۔ وہ شوشیلا سے شوشی بن چکی تھی۔ اور شوشی بھی ان کی شوشی۔ جیسے وہ جس انداز میں بٹھاتے تھے، وہ بیٹھتی تھی۔ جو لباس پہناتے تھے، پہنتی تھی۔ جو وہ لا دیتے تھے کھا لیتی تھی۔ اور ان کے آنے کی گھڑیاں گنا کرتی تھی۔

شروع شروع میں اسے اپنی یہ بے چارگی بے حد بھلی معلوم دیتی تھی وہ سوچتی تھی۔ کسی کے ہو جانے ہی میں مزا ہے۔ کسی کی انتظار ہی میں لطف ہے۔ کسی کے تصور ہی میں جنت ہے لیکن جب اسے اس جنت کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے دو سال ہو گئے۔ اور اس دوران میں وہ ایک ننھی سی پیاری سی بچی کی ماں بھی بن گئی۔ اور پھر بھی شوشی سے شوشی ہی رہی تو اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس سے فریب کھیلا جا رہا ہے۔ جیسے اس کی انفرادیت چھین کر اس کا کھلونوں سے جی بہلایا جا رہا ہے، جیسے محبت کی وہ سب رسمیں فریب تھیں۔ جیسے شوشی کے ان سحر انگیز الفاظ میں محبت کم تھی اور اپنی برتری کا خیال زیادہ۔ جیسے سرندر ان الفاظ کے ذریعہ شیلا پر اپنی برتری کا سکہ جمائے رکھنا چاہتا تھا۔ اور اس خیال سے ہی اسے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ اس کا جذبۂ خودداری سینہ میں کروٹیں سی لینے لگا۔ اس نے کنکھیوں سے سرندر کی جانب دیکھا۔ ایک پُروقار

مسکراہٹ اُس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ اور وہ ٹی سٹ کی ایک ایک چیز کو کول کر تولئے سے صاف کر کے اس اہتمام سے تپائی پر سجا رہا تھا جیسے اُسے کسی نمائش میں بھیجنا ہے۔ اس نے ایک اچٹتی نگاہ ٹی سٹ پر ڈالی ٹی سٹ واقعی بے حد دلکش تھا۔ پیالوں پر سمندر میں ہلکی ہلکی لہریں اُٹھنے کا منظر تھا کشتیاں چل رہی تھیں، بادبان لہرا رہے تھے۔ جیسے وہ ٹی سٹ نہ تھا کسی شاعر کا حسین خواب تھا اور اُسے سرمد کی پسند پر خود بخود پیار آنے لگا۔

سرمد نے آخری پلیٹ بھی صاف کر کے قرینے سے سجانے کے بعد خالی ڈبہ اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ پھر فاتحانہ انداز سے مسکراتے ہوئے اس نے شیلا کی جانب اس طرح دیکھا جیسے کسی جادوگر نے معجزہ کیا ہو۔ "کیوں پسند آیا میری شوشی کو؟"

اور اس کے الفاظ میں اس قدر مٹھاس تھی کہ شیلا مسکرائے بغیر نہ رہ سکی، لیکن دوسرے ہی لمحہ اُسے اپنی بے چارگی پر غصہ سا آنے لگا۔ وہ کیوں مسکرا دی، اُس نے کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ سٹ اُسے مطلقاً پسند نہیں۔ لیکن پھر وہ سوچنے لگی۔ وہ اپنے ساتھ ہی فریب کیسے کھیل سکتی تھی۔ جو چیز اُسے پسند تھی اُسے کیسے ناپسند کہہ سکتی تھی۔ اور وہ ایک بے بس ہرنی کی طرح دل ہی دل میں تڑپ کر رہ گئی۔

"دیکھو شوشی"۔ سرمد نے اُسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ "ذرا خادمہ کو کہہ آؤ کہ وہ چائے بنا دے۔ آج ہم اس ٹی سٹ کا ادگھاٹن کریں گے۔"

اُسے سرمد کے "ادگھاٹن کریں گے" پر بے اختیار ہنسی آگئی۔ جب سے اُردو اخباروں نے ہندی کے الفاظ استعمال کرنے شروع کئے تھے، سرمد بھی موقع بے موقع ہندی کے الفاظ کو اس طرح ٹھونسنے لگا تھا جیسے زبان کو ذبح کرنے کا اُسے بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ان اخبار والوں کو۔

وہ مسکراتی ہوئی اٹھی اور بغیر کچھ کہے باورچی خانہ کی جانب چل دی۔

(۲)

وہ جب خادمہ کو چائے بنانے کے لئے کہہ کر واپس لوٹی تو وہ سوچ رہی تھی۔ سرمد سے بلاشبہ وہ بے حد محبت کرتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ وہ اپنی ہر بات اس پر بلاوجہ ٹھونستے رہیں۔ جیسے وہ ننھی نادان بچی ہے۔ وہ اب اُن کی اس روش کو برداشت نہ کرے گی۔ اور موقع ملتے ہی ان پر ثابت کر دے گی، کہ وہ بھی ہر بات کو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کی بھی انفرادیت ہے۔ وہ بھی اپنے ڈھنگ میں سوچ سکتی ہے۔ اور جس ڈھنگ سے وہ سوچتی ہے، وہ کسی طرح بھی ان کے سوچنے کے انداز سے ہیٹا نہیں۔

اور اس بات کا موقع اُسے کمرے میں داخل ہوتے ہی مل گیا۔ سرمد ننھی "کوکو" کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر پلنگ پر کھڑا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ارے - ارے - ارے ——— کیا کر رہے ہیں آپ؟" اس نے کوکو ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا بات ہے"۔ سرمد نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جیسے آپ جانتے ہی نہیں۔ کوکو کی عمر تو صرف پانچ ماہ کی ہے اور آپ اُسے کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسا کرنے سے بچوں کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔"

"اوہ - اچھا - اچھا" ——— سرمد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ کونسی کتاب میں پڑھا تھا میری شوشی نے؟"

شیلا کو سرمد کا یہ لہجہ بے حد بُرا محسوس ہوا۔ اُس نے تیکھے انداز سے کہا "اس میں کتاب میں پڑھنے کی کیا بات ہے۔ آپ نہیں مانتے تو اپنے ڈاکٹر کھوسلہ سے پوچھ لیجئے۔"

"اجی کیوں نہیں مانتے"۔ سرمد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہماری شوشی کہے گی اور ہم نہیں مانیں گے؟"

اور شیلا کو سرمد کے اس ماننے میں بھی تضحیک کا پہلو نظر آیا۔ جیسے وہ ایک ننھی بچی کا جی بہلانے کے لئے مان رہے ہیں، جیسے وہ اس پر رحم کھا رہے ہیں۔ لیکن آج تو وہ اپنی قابلیت کا سکہ جمانے پر ادھار کھائے بیٹھی تھی، اُس نے تیزی سے کہا۔

"نہیں آپ میری وجہ سے مت مانئے۔ میں ابھی ڈاکٹر کھوسلہ سے کہلوا دیتی ہوں۔ اور سرمد کی طرف دیکھے بغیر اس نے بچی کو پالنے میں ڈال کر ٹیلیفون کا ڈائل گھما دیا۔ سرمد بھی مسکراتا ہوا شیلا کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

ہیلو ——— ڈاکٹر کھوسلہ ہیں .... جی میں شیلا بول رہی ہوں .... دیکھئے۔ کوکو کو وہ ابھی سے کھڑا ہونا سکھا رہے ہیں۔ ذرا انہیں سمجھائیے کہ ایسا کرنے سے بچی کی ٹانگیں ٹیڑھی ہونے کا خدشہ ہے۔ .... جی .... کیا کہا .... دس پندرہ منٹ کھڑا کرنے میں کوئی ہرج نہیں .... اچھا .... اور اس نے پریشان

ہوکر شیلا نے فون بند کر دیا۔ اور اس طرح نڈھال ہوکر آرام کرسی پر گر گئی۔ جیسے وہ برسوں کی مریض ہو۔ شرم سے اس کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ بہا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں، اور سر کرسی کی پشت سے لگا دیا۔

سرندر نے شیلا کے پاس ہی کرسی کے بازو پر بیٹھتے ہوئے کہا "میری شوشی کیوں پریشان ہوتی ہے، ہم ڈاکٹر کھوسلہ کی نہیں مانیں گے۔ ہم تو اپنی شوشی کے حکم کی تعمیل کریں گے۔"

اور شیلا کا ایسا جی چاہا کہ وہ منہ چھپا کر کمرے سے باہر بھاگ جائے، لیکن وہ وہیں کرسی میں گڑی سی رہی، اور اس کی پیشانی آنسو بہاتی رہی۔

(۳)

چائے پینے سے شیلا کو کچھ تسکین نصیب نہ ہوئی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ واقعہ ایک بوجھ بن کر اس کے سینہ پر مسلط ہو گیا ہے۔ وہ چائے پی کر پھر اسی آرام کرسی پر آ کر لیٹ گئی اور سوچنے لگی۔ آج ہی اس نے اپنی برتری کا اظہار کرنے کی کوشش کی تھی، اور آج ہی اُسے اپنا سا منہ لے کر بیٹھ جانا پڑا۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ وہ چپکے سے سرندر کی باتوں کو سنا کرتی اور کٹھ پتلی کی طرح اُس کے اشاروں پر چلتی رہتی۔ لیکن کٹھ پتلی بننے کے تصور سے ہی اُسے وحشت سی ہونے لگی۔ اس کی انفرادیت مجروح ہونے لگی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے کوئی آہستہ آہستہ اس کا گلا دبا رہا ہے۔ اور اس خیال سے ہی اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ سوچنے لگی۔ سرندر کیوں نہیں سمجھتے کہ میں شیلا ہوں شوشی نہیں۔ وہ کیوں میری انفرادیت ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کیوں میرے جسم میں شوشی کی روح پھونکنا چاہتے ہیں —— اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے سرندر میز پر پڑے فریم میں سے اس کا فوٹو نکال کر کسی اور کا فوٹو ڈال رہا ہے۔ وہ اس احساس ہی سے تڑپ اٹھی۔ اس نے گھبرا کر نگاہیں سرندر پر ڈال لیں۔ سرندر مزے سے کرسی پر ٹانگیں پھیلائے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا اور میز پر پڑا شیلا کا فوٹو خود شیلا کی جانب دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ جیسے وہ اس کی بے چارگی پر ہنس رہا ہو۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ فوٹو اس کا نہیں کسی اور کا ہے۔ کسی ایسی شیلا کا جس کی نفاست کے ہر جگہ چرچے تھے۔ جس کی انفرادیت کے سب قائل تھے۔ اور سچ مچ اُسے یوں لگا، جیسے وہ شیلا مر چکی ہے۔ اور اس کے جسم میں کسی شوشی نے جنم لیا ہے۔ وہ شوشی جو تصویر کی مسکراتی ہوئی شیلا سے بالکل مختلف ہے۔ اس نے حسرت بھری نظروں سے اپنے فوٹو کی جانب دیکھا۔ پھر کتنی ہی دیر ٹکٹکی باندھے اس جانب دیکھتی رہی، جیسے وہ اس تصویر کے آئینہ سے گزرے ہوئے وقتوں میں جھانکنا چاہتی ہو۔ جیسے وہ ماضی کو کھینچ کر حال سے ملا دینا چاہتی ہو جیسے وہ پھر سے وہی شیلا بن جانا چاہتی ہو جس کی سب سنتے تھے، سب مانتے تھے۔ اور اس خیال سے ہی اُسے اپنے سینہ پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں جیسے سچ مچ اس کے جسم میں تبدیلی ہو رہی ہو۔ اس نے گھبرا کر اپنے جسم پر نگاہ ڈالی۔ اُسے اپنے اعضا کچھ عجیب عجیب سے نظر آئے جیسے وہ اپنا جسم نہیں کسی اور کا جسم دیکھ رہی ہو۔ وہ جلدی سے آرام کرسی سے اٹھی اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور پھر خود بخود تسکین کی ایک گہری سانس اس کے دہن سے نکل گئی۔ ایک بچہ کی ماں بن جانے کے باوجود اس کے چہرہ پر وہی شادابی تھی، وہی تازگی تھی جیسے وہ ابھی ابھی کالج سے پڑھ کر آئی ہو۔ اور اب کلب میں ٹینس کھیلنے جا رہی ہو۔ وہ جی ہی جی میں اپنی دلکش صحت کے خیال سے مسکرا اٹھی۔ اور معاً اُسے خیال آیا۔ اگر اس نے یہ سوچنے اور فکر کرنے کی عادت چھوڑ نہ دی تو بہت جلد یہ رخساروں میں لہریں لیتا ہوا خون سرد پڑ جائے گا۔ یہ امڈتا ہوا دریا ساکن ہو جائے گا اور پھر وہ گاؤں کے اس جوہڑ کی مانند ہو جائے گی جس کا پانی پڑا پڑا خود بخود سڑنے لگتا ہے۔ اور اس تصور سے ہی اُسے جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ اُس نے خیال کیا۔ اس نے جو گذشتہ چھ ماہ سے کلب جانا چھوڑ رکھا ہے، تو یہ بہت بُرا کیا ہے۔ اور اس طرح تو سچ مچ وہ ایک جوہڑ بن کر رہ جائے گی۔ اُسے تو دریا کی امڈتی ہوئی لہروں کی طرح سیلانی ہونا چاہیئے۔ حرکت ہی میں زندگی ہے، اور سکوت تو موت ہے۔ اور اب "کوکو" بھی پانچ ماہ کی ہو گئی ہے۔ اُسے آیا سنبھال سکتی ہے۔ بچی میں ڈال کر سیر کے لئے جا سکتی ہے۔ وہ کس لئے اپنی جوانی کو جوہڑ کا پانی بنا رہی ہے۔ اور اس نے فیصلہ کیا، وہ آج سے ہی کلب جانا شروع کر دے گی۔ کچھ بھی ہو۔ چند لمحہ کے لئے تو اس کا دل بہلے گا۔ کچھ دم کے لئے تو یہ احساس اس کے دل سے دور ہو گا کہ وہ ننھی سی معصوم سی شوشی نہیں، شیلا ہے، جس کی اپنی بھی کوئی ہستی ہے۔ جو خود بھی کچھ سوچ سکتی ہے۔ اور جو سوچ سکتی ہے اس پر عمل بھی کر سکتی ہے۔ اور یہ فیصلہ کرتے ہی وہ سرندر کی جانب متوجہ ہوئی۔ اس نے دہیں

لڑے کھڑے پکارا۔

"سنئے تو"

لیکن سرِندر کتاب پڑھنے میں اس قدر محو تھا کہ اُسے شیلا کی آواز بھی توجہ نہ کر سکی۔ شیلا نے دوبارہ پکارا۔ لیکن اس بار بھی سرِندر متوجہ نہ ہُوا۔ شیلا کو ایسا محسوس ہُوا جیسے سرِندر جان بوجھ کر اس سے بے توجہی کر رہا ہے۔ جیسے وہ صرف اپنی سنانے کا قائل ہے۔ کسی کی سننے کا نہیں۔ اور اس خیال سے ہی وہ جھنجھلا سی اُٹھی۔ اس نے قریب پڑی کرسی سے گدیلا اُٹھایا اور کھینچ کر سرِندر کے مُنہ پر دے مارا۔ سرِندر بڑبڑا کر چونک پڑا۔ کتاب اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ اس نے فرش سے کتاب اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"اتنی بڑی ہو گئیں، لیکن بچپن نہ گیا"

شیلا اور بھی چڑ گئی۔ وہ سوچنے لگی تو سچ مچ وہ مجھے بچی ہی سمجھتے ہیں۔ اور اس خیال سے ہی اس کا ایسا جی چاہا کہ اپنا مُنہ نوچ لے۔ اس نے رعونت سے سر بلند کیا۔ اور میز پر بیٹھتے ہوئے مُنہ دوسری جانب پھیر لیا۔ کچھ اس انداز سے جیسے وہ کہہ رہی ہو "آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں۔ میں ایسی باتیں سننے کی عادی نہیں"

سرِندر نے شیلا کے اس انداز پر ایک پیار بھری نگاہ ڈالی اور پھر اس کے قریب آکر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"اوہ! یہ ٹھاٹھ ہیں اپنی شوخی کے۔ ہم تو بابا ڈر گئے"۔ اور پھر سرِندر نے آنکھیں شیلا کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

شیلا کو ایسا محسوس ہُوا جیسے سچ مچ وہ ایک ننھی سی الھڑ سی بچی ہے۔ جو بیٹھے بیٹھے شرارتیں کرتی رہتی ہے۔ اور سرِندر اس کی معصومیت پر رحم کھا کر مسکرا مسکرا کر اُس کی غلطیوں کو نظر انداز کرتا رہتا ہے۔ اور اس خیال سے ہی اُس کا مُنہ ندامت سے جھک گیا

پاکستان میں "آجکل" کے ایجنٹ

۱۔ میسرز ونڈسر بک اسٹال الفنسٹن اسٹریٹ کراچی۔
۲۔ میسرز پاک پبلسٹی سروس بیرون موری گیٹ لاہور۔

تمکین کاظمی

تارُودَت

ادبی دُنیا میں تارودت کے کارناموں کو خاصی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ سراڈ منڈگاس نے بالکل سچ لکھا ہے کہ "اس کا نام کسی تعلیم یافتہ مرد اور عورت سے پوشیدہ نہیں ہے"۔ وہ ہندوستان کی مایۂ ناز شاعرہ تھی۔ اس کی زندگی اور کارناموں نے اس کے وطن والوں کے دلوں میں دائمی جگہ حاصل کر لی ہے۔

اس مضمون سے ہمارا نہ تو یہ مقصد ہے کہ تارودت کی سوانح عمری لکھیں اور نہ یہ کہ اُس کے ادبی کارناموں پر تفصیلی تنقید کریں اس کا ایک مجموعہ "زندگی اور خطوط" مندرجہ بالا چیزوں پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ اس کے ہندوستانی ادب سے غیر معمولی ذوق کا پتہ اُس کے ایک اور کارنامے "قدیم گیت اور ہندوستانی کہانیاں" سے چلتا ہے۔

زندگی کی رفتار کے ساتھ ساتھ مشرقی اور مغربی فنونِ لطیفہ کے سنگم کا پتہ بھی چلتا ہے کہ مشرقی فنونِ لطیفہ اور مغربی فنون میں ایسے گیت اور کہانیاں موجود تھیں جو آگے چل کر دونوں ملکوں میں منظم شاعری کا باعث ہوئیں۔ یہ وہی گیت اور کہانیاں ہیں جو سینہ بہ سینہ نسل در نسل چلی آ رہی ہیں۔ یہی وہ گیت اور کہانیاں ہیں جو مشرق و مغرب میں شعراء کے خیالات میں ہیجان برپا کرنے کا باعث ہوئیں اور جنہوں نے اُن کا اظہار نہایت لطیف پیرائے میں کیا جن کے منجملہ ایک تارودت بھی ہے۔

بعض نقادوں کی رائے میں "قدیم گیت اور کہانیاں" تارودت کا بہترین انگریزی کارنامہ ہے جس سے اُس کی ذاتی قابلیت اور اُس تارودت پر فرانسیسی اور انگریزی فنونِ عالیہ کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا یہ کارنامہ سنسکرت میں یک سالہ محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے جب کہ وہ اپنے باپ کے ہمراہ انگلستان سے واپس ہوئی تھی۔ بائیس سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ اس کی اس کم عمری کے پیشِ نظر اُس کے کارنامے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر اس کی سنسکرت کی تعلیم مکمل ہو جاتی تو وہ اپنے ہندوستانی خیالات اور ادب کا احسن طریقے سے اظہار کرتی۔

"قدیم گیت اور ہندوستانی کہانیاں" رامائن اور مہابھارت سے ماخوذ ہیں۔ اور کچھ وشنو پُران سے بھی اخذ کئے گئے ہیں جن میں بادشاہوں اور اوتاروں کے قصص ہیں۔ جو قدیم ہندی فنونِ لطیفہ اور ہندی اعلیٰ تہذیب و تمدن کے حامل ہیں۔ تارودت کو سنسکرت کی تعلیم صرف ایک سال کے قلیل زمانے کے بعد خرابیٔ صحت کی وجہ سے ترک کر دینا پڑی۔ اس کے بہترین ادبی کارنامے اس کے آخری چند سالوں سے متعلق ہیں۔ جو اس نے اس زمین پر بسر کئے۔

سراڈون آرنلڈ اور سر آلفرڈ لیل کے کارناموں نے پُر اسرار مشرق کی نسبت مغربی دلوں میں ایک ہیجان برپا کر دیا تھا جو انگریزی نظم میں لکھے گئے تھے۔ مگر تارودت پہلی عورت ہے جس نے مشرق صحیح کو مغرب والوں کے سامنے پیش کیا۔

ہندوستانی ادیب پرنسپل شیشادری لکھتے ہیں کہ "تارو نے گیت اور ہندوستانی کہانیوں" میں مشرقی خیالات کو نہایت کامیاب طریقے پر مغربی زبان میں ادا کیا ہے۔ قصص پورے طور پر ہندی رنگ اور ہندی خیالات لئے ہوئے ہیں۔ اس کی شاعری بجا طور پر اس کی قوم اور وطن کی شاعری ہے"۔

ممکن ہے یہ رائے جو اس کے ایک ہم وطن کی ہے۔ اس رائے کے مخالف ہو جو اس کے بارے میں ایک انگریز نقاد کی ہے جو کہتا ہے کہ کم کثر نظمیں اوزان و صنعت کے لحاظ سے بالکل ٹھیک ہیں۔

ں نظمیں جیسا کہ مسٹر گوس کا خیال ہے" باوجود اس کے کہ بڑے
ے بڑے نقاد کو بھی بھلی معلوم ہوتی ہوں مگر کبھی ان کو انگریزی یا
دی ادب میں دائمی جگہ نہیں مل سکتی۔ کیونکہ ان قدیم گیتوں اور کہانیوں
ں وہ نمکین تاثرات اور دلکشی باقی نہیں رہی ہے جو زبانِ سنسکرت
ں پائی جاتی ہے۔ یا جو بنگالی زبان میں موجود ہے۔ شاعری اور منظر
ری میں نہ تو مشرقی رنگ باقی رہا اور نہ مشرقی آراستگی، جوشِ اظہار
ر خیالات میں غیر زبان میں منتقلی کی وجہ سے خاص بیگانگی پیدا ہو
ں ہے۔ اگر تارو دت کو انگریزی زبان پر کامل عبور بھی حاصل ہوتا
بھی وہ اس میں وہ خوبی اور نزاکت ہرگز پیدا نہ کر سکتی جو اس نے
سنسکرت میں کی تھی۔" مختلف ادیب اس کی شاعری کے متعلق
ا دوسرے سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ اس لئے ہم اس
ث کو یہیں چھوڑے دیتے ہیں تاکہ پڑھنے والے اس کی نظموں کا
ا لعہ کرکے خود ہی نتیجہ اخذ کریں۔

اس ضمن میں ہم ایک اور نقاد کی رائے پیش کرنا مناسب
ستے ہیں جو اپنی مشرقی دلچسپی اور لگاؤ کی وجہ سے ہندوستان میں
ہور ہے۔ ان کا نام سی ایف اینڈریوس ہے وہ لکھتے ہیں کہ
یسا کہ یونان اور روم کی شاعری عیسائی یوروپ میں فنونِ عالیہ کا
ِ حاصل کر چکی ہے اور اس پر مذہبی توہمات کے اثرات کے باوجود
ِ قیود عائد نہیں کئے گئے۔ اسی طرح قدیم سنسکرت ادب بھی دائمی
ر پہ اس ملک کے فنونِ عالیہ میں شامل رہے گا۔ اور اس کے
نص آنے والی صدیوں میں ہمیشہ لوگوں کو بہلاتے رہیں گے۔ تارودت
س عمدگی کے ساتھ ہندی زندگی کو عیسائی دنیا کے لئے اکٹھا کرنا
ں کے فطری جذبے کے تحت تھا۔ اپنے وطن کے عقاید سے اس کی
محبت جو اس کو اپنی ماں سے ورثے میں ملی تھی۔ کبھی اس کے عیسائی
ید سے نہیں ٹکرائی۔ ایسے زمانے میں جبکہ بنگال کا نام مغرب والوں
نظروں میں گر چکا تھا۔ تارودت نے اس کو مغربی قوموں میں بلند
۔ اور ایسے زمانے میں جب کہ بنگال والے خود سے اور اپنے وطن
ے ناامید ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے عمداً اپنے وطن کی
بیوں کا راگ سُنایا۔"

اب ہم اس کی دو ابتدائی نظموں کو لیتے ہیں۔ جو دو قصص
دھرو کا قصہ" اور "شاہی نادار اور ہرن" پر مشتمل ہیں اور جو شاعرہ
کی زندگی میں بنگال میگزین اور کلکتہ ریویو میں شایع ہوئی تھیں۔ ان دونوں
کا تعلق اس مجموعے کی دوسری نظموں سے جو اس میں درج ہیں۔ مذہبی
عقاید کی بناء پر ہے۔ اس مجموعے میں اور بھی نظمیں ہیں۔ جو شاعرہ کے
انتقال کے بعد اس کے کاغذات میں پائی گئیں۔

"دھرو کے قصے" میں دکھلایا گیا ہے کہ کس طرح ایک شہزادہ، رانی
کا لڑکا دُنیوی عزت کو روحانی بلندی کے مقابل حقیر سمجھتا ہے یہ نظم
درحقیقت دھرو کا کامل مرقع ہے۔ ایک دولہ غیر تیز لڑکا اپنے باپ
کی محبت کو حاصل کرنے کا متمنی۔ سروچی بادشاہ کی نورِ نظر رانی جو کبھی
اپنے لڑکے اُوتا ملے کے سوا کسی دوسرے کے لئے بادشاہ کے التفات
کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ایک دن دبے پاؤں ہال میں داخل ہوتی
ہے۔ دھرو کو اپنے لڑکے کے ساتھ بادشاہ کی عنایات کا شریک دیکھ
کر اس پر برس پڑتی ہے۔ وہ لڑکے کے تیور سے اس کا مقصد سمجھ
چکی تھی۔ اس سے اپنے دماغ سے بلند خیالات نکال دینے کو کہتی ہے دھرو
جو ایک دوسری رانی کا لڑکا تھا۔ اس کو کیا حق تھا کہ وہ مغرور سروچی
کے بیٹے کی برابری کا دم بھرے۔ غصے سے کانپتا ہوا غریب دھرو
دوڑا ہوا ماں کے کمرے میں جاتا ہے۔

مغرور سروچی نے جو کچھ
اس کے بارے میں کہا تھا،
سارا قصہ اپنی ماں کو
معصوم نے رو رو کے سُنا ڈالا

سُونتی (بادشاہ کی چھوٹی رانی اور دھرو کی ماں) نے سب کچھ
سُن کر ایک ٹھنڈا سانس لیا اور اپنے لڑکے کو تسلی دینے کی کوشش
کرتے ہوئے "کرما" کے مذہبی عقاید سمجھانے لگی۔

ماں نے اپنے لڑکے کو تسلی دیتے ہوئے بتلایا کہ اگر وہ موجودہ
زندگی کو بھی طرح گذارے تو اس کو آئندہ ضرور اچھا بدلہ ملے گا اور
اس کو تلقین کی کہ وہ ممکنہ نیک کام کرے اور اپنی زندگی مخلوق
اور حیوان کے ساتھ نیکی کرنے میں بسر کرے۔

دھرو کو محبت میں ناکامی کی وجہ سے اپنی ماں کے الفاظ سے کوئی تشفی نہیں ہوئی عجز و انکسار کو اختیار کرنے کے برخلاف اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ روئے زمین پر بلند مرتبہ اور ارجمند ہو کر رہے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے باپ کے گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا اور راہبوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے جنگل میں چلا گیا اور اپنے مقصد کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔

اس نظم کا اختتام تارک الدنیا راجہ کے فعل کی تائید اور راہبانہ زندگی کی تحقیر پر ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا دو نظمیں غیر مقفیٰ شاعری میں لکھی گئی ہیں۔ یہ بدقسمتی ہے۔ کہ تارودت نے اپنی ابتدائی انگریزی نظموں کے لئے اس قسم کی شاعری کا انتخاب کیا۔ یہ اس کا فطری انتخاب تھا انگریزی شاعری میں اس سے قبل اس کا استعمال کیا جا چکا تھا۔ غیر مقفیٰ شاعری ملٹن اور شیکسپیر کے سے شعراء کے ہاتھ میں ایک بہترین اور عمدہ ہتھیار تھی۔ اس قسم کی شاعری اپنی آزادی کی وجہ سے مبتدی کو اپنی طرف فی الفور مائل کر لیتی ہے مگر ایک ناتجربہ کار کے ہاتھ میں غیر مقفیٰ شاعری از حد بھدی اور بے رنگ ہو جاتی ہے۔ اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ تارودت کو انگریزی شاعری کی کس قدر کم مشق تھی۔ اس کا غیر مقفیٰ شاعری کو ان دونوں نظموں میں استعمال کرنا ایک قابل قدر چیز ہے۔ قاعدے کے تحت شاعری میں ایک روانی اور نزاکت ہے گو بعض جگہ قاعدے کے خلاف بھی لکھا گیا ہے،

تارودت کی ابتدائی نظمیں غیر مقفیٰ شاعری کے استعمال کی وجہ سے کامیاب نہیں رہیں۔ "دھرو کا قصہ" غیر مقفیٰ شاعری کے استعمال کے باعث کامیاب نہیں رہا۔ ہمارے دلوں پر ایسے لڑکے کا غیر معمولی اچھا اثر ہونا چاہئے تھا۔ جس نے اپنی کم عمری کے باوجود اس امر کو محسوس کیا کہ دراصل قابل قدر چیز رتبہ یا قوت نہیں بلکہ روح کی پاکیزگی ہے۔ اس کے برعکس ہم اپنے آپ کو ایک تشویش میں پاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ لڑکا جو اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا دفعتاً دنیا والوں کی نظروں میں ایک بلند ترین مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ چیز انتقام کی سی دنیوی تمنا کے بدلے تعجب خیز معلوم ہوتی ہے،

یہ ایک عجیب بات ہے کہ وہ تارک الدنیا راجہ اور برہمن بالکل

اس کے برعکس غلطی کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ اس نظم میں شاعرہ روشن خیال ہو گئی ہے اور اس کے خیالات بہت بدل گئے ہیں۔ کیونکہ اپنے خیالات کی رَو میں کچھ ایسی بہہ گئی ہے کہ اس کو اس کا کچھ خیال نہیں رہا کہ وہ ایک قدیم قصے کو بیان کر رہی ہے اور یہی اس کا اصل مقصد ہے۔ نظم کے اصل مقصد کا بہت کم خیال رکھا گیا ہے اور جہاں کہیں بھی اس کا خیال کیا گیا ہے وہاں یہ سنجیدگی پیدا کر دی گئی ہے۔

اب ہم ایک دوسرے قصے "ساوتری" کو لیتے ہیں۔ جو ہمیشہ ہندوستانیوں کے دلوں کو متاثر کرتا رہا ہے۔ ہیروین کی استقامت اس کی صداقت اپنے شوہر ستیاوان کے ساتھ اس کی غیر معمولی محبت آج تک ازدواجی زندگی میں بے نظیر خیال کی جاتی ہے۔ مہابھارت میں یہ ایک عمدہ قصہ ہے۔ جس میں بتلایا گیا ہے کہ کس طرح ساوتری نہایت موثر انداز میں موت سے استدعا کرتی ہے۔ کہ شوہر کو دوبارہ زندگی بخش دے اور اس کی صادق محبت تمام رکاوٹوں پر غالب آ جاتی ہے۔ ساوتری راجہ مدرہ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ جو زمانۂ قدیم کا ایک تاریخی راجہ گذرا ہے۔ حسین نازک اندام گل چہرہ خوب سیرت، خوبصورت، گھر کی روشنی اور شریف منشوں کی لڑکی تھی۔

بیتی تھیں لاکھوں راتیں
اور سینکڑوں دن ایسے جو گذرے روزہ رکھ کر!
وہ اپنے والدین کے لئے ایک مجسم نعمت تھی جس کی فطرت برف
کی طرح شفاف تھی اور جس کا چہرہ بے مثال
مظہر رب ذو الجلال تھی وہ!

جب ساوتری بلوغ کو پہنچنے لگی تو اس کے باپ کو اس کی شادی کا مسئلہ پریشان کرنے لگا مگر وہ اس کے لئے کوئی موزوں بَر نہیں پا سکا۔ رانی کے کہنے پر اس نے اس شادی کی فکر چھوڑ دی۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ دیوتا خود ساوتری کو اپنا بَر تلاش کرنے میں اس کی اعانت کریں گے۔

ایک مدت کے بعد ایک دفعہ ساوتری دھان کے کھیتوں میں سے ہو کر راہب کی جھونپڑی کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے کئی نوجوانوں کو آپس میں کھیلتے ہوئے دیکھا،

ایک ان میں تھا لمبا چھریرا
نازک اندام اور رنگیلا
نیک نہاد اور خوش منظر
واقعی گویا رشکِ قمر
دونوں کی نظروں میں
اور ———

نوجوان کا نام ستیاوان تھا جو دیومت سین سابق راجہ سالو کا لڑکا تھا۔ جس کو اس کے دشمنوں نے تخت سے اتار دیا تھا اور اب وہ بوڑھا اندھا ہو کر اپنی رانی اور اکلوتے لڑکے کے ساتھ راہبانہ زندگی بسر کر رہا تھا جب ساوتری گھر پلٹی تو اس کو اس نئی محبت کی وجہ سے ہر چیز میں سرسبزی اور شگفتگی نظر آنے لگی اور اس کے ان نئے احساسات کی خبر فی الفور اس کے والدین کو ہو گئی۔ تھوڑے ہی زمانے کے بعد مشہور صوفی راہب محل میں آیا۔

شمس و قمر اور ستاروں کی تخلیق
اس کے لئے کوئی راز نہیں تھی!

ساوتری کے باپ نے صوفی راہب سے اپنی لڑکی کے پریشان کن انتخاب کا تذکرہ کیا۔ اس کی تکلیف اور بڑھ گئی جبکہ صوفی راہب خود پریشان دکھائی دینے لگا۔ کئی دفعہ منتر پڑھنے کے بعد کہا کہ ستیاوان ایک سال کے اندر مر جائے گا۔ اس نے ساوتری کو اس بات کی ترغیب دینے کی کوشش کی کہ وہ اپنے لئے کوئی دوسرا بر پسند کرے۔ مگر اس نے صاف طور پر انکار کر دیا اور انتہائی سنجیدگی سے کہا

پہلی ہی نظر میں اسے دل میں لے دیا ہے۔
یہ جان میری جسم میرا ہو گیا اس کا!
جو ہوگا نہ واپس!
قسمت میں رنڈاپا ہی اگر ہے میرے لکھا
بدلے گا اُسے کون؟
رہبر ہو سچائی اگر اور فرض شناسی ایمان ہو اپنا
تو پار ہے بیڑا!

مجبوراً راہب نے شادی کی اجازت دیدی۔ جو نہایت تزک و احتشام سے رچائی گئی۔ دلہن کی رخصتی ہوئی۔ دولہا کے گھر پہنچ کر اندھے باپ اور ماں نے ساوتری کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ گھر کے روز مرہ کے کام کاج میں کئی ماہ گذر گئے ساوتری کے دل میں ہمیشہ راہب کی پیش گوئی کھٹکتی رہی۔ اس نے اپنا خوفناک راز کسی پر ظاہر نہیں کیا بلکہ رات دن دیوتاؤں سے التجائیں کرتی رہی۔ جو التجاؤں کے سننے والے ہیں آخرکار مقررہ دن آن پہنچا وہ دن ستیاوان کی موت کا مقرر تھا مگر وہ وقت گذر گیا اب ساوتری کو آس بندھی کہ دیوتاؤں نے اس کی التجاؤں کو قبول کر لیا ہے۔

دفعتاً اس کے شوہر نے جنگل جانے کا قصد کیا تاکہ میوہ اور لکڑی جمع کرے ایک غیبی آواز نے ساوتری کو اپنے شوہر کے ہمراہ جانے کے لئے کہا۔ لکڑی کاٹتے وقت کلہاڑی ستیاوان کے ہاتھ سے چھوٹی اور وہ کرب کے مارے چلا اٹھا۔ ساوتری انتہائی استقلال کے ساتھ اپنے دم توڑتے ہوئے شوہر کو سنبھالے رہی اور دونوں پر وہیں اسی حالت میں کئی گھنٹے گذر گئے اس دوران میں موت کے دربار میں ایک تہلکہ مچ گیا کہ ابھی تک شہزادہ ستیاوان نہیں آیا۔ موت کے فرشتے سے اپنے فرض منصبی میں کوتاہی ہو رہی تھی کیونکہ ستیاوان کا بچاؤ ایک ایسی ذات کر رہی تھی جس کی صداقت بڑی روح کو اس تک آنے سے روک رہی تھی۔ "موت" یہ جانتی کہ قسمت کا حکم ٹل نہیں سکتا اور وہ خود اس کے لئے روانہ ہوئی جب ساوتری نے موت کی خوفناک شکل کو نمودار ہوتے ہوئے دیکھا تو اس کا مقصد دریافت کیا موت نے اپنا مقصد بیان کیا اور ستیاوان کی روح لے کر چلتی بنی۔ ساوتری موت کی ہدایت کے باوجود کہ وہ اپنے مردہ شوہر کے جسم خاکی کی تجہیز و تکفین شاستر کے مطابق کرے۔ اس کے پیچھے ہو گئی۔ موت اور ساوتری کے درمیان ایک طویل اور موثر گفتگو ہوئی۔ جس میں اس نے ایک غیر معمولی اعتماد کے ساتھ موت کو اس کی قوت کا یقین دلایا کہ اگر وہ چاہے تو اس کے شوہر کو قسمت کے پنجے سے چھڑا سکتی ہے۔ موت پر اس کے الفاظ کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے نہ صرف ساوتری کی اس خواہش کو قبول کیا بلکہ مزید خواہش کرنے کی اجازت دی۔ ساوتری نے محسوس

کیا کہ یہ اُس کی دعاؤں کا نتیجہ ہے اور نہایت دلیری سے خواہش کی کہ

میرے سنتیاوان کو جلا دے۔
ہمیں ایسی اولاد بھی تو دلا دے۔
بہادر خردمند اور جنگ جو ہو

موت نے ستیاوان کی روح کو چھوڑ دیا اور ایک شعلے کی صورت میں غائب ہو گئی۔ ساوتری دوڑتی ہوئی اپنے خاوند کے پاس گئی اور اس کو زندہ پایا۔

وہ موت کے آغوش سے اس طور سے نکلا
جیسے کہ کوئی سویا ہوا نیند سے جاگے

حیران و پریشان!

وہاں سے ان دونوں نے جھونپڑی کی راہ لی۔ جہاں ان دونوں کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ موت نے جو کچھ وعدہ کیا تھا پورا کر دکھایا۔ ساوتری کی یاد اس وقت تک ہندوؤں کے دلوں میں تازہ ہے اس لئے کہ اب تک شادی کے وقت اُن کا نام لیا جاتا ہے۔ اور دُلھن سے اس کے والدین کہتے ہیں۔ کہ تو ساوتری کی طرح ہو جا دُلھن اور من میں۔

یہ نظم دوسری سابقہ نظموں سے بدرجہا بہتر ہے۔ ساوتری کی گفتگو جو نہایت فصیح و بلیغ ہے۔ تارو دت کے مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔ عام طور پر نظم کا معیار نہایت بلند ہے۔ ذیل میں ہم مثال کے طور پر ساوتری کے اس جواب کو تحریر کرتے ہیں جو اس نے اپنے باپ کو دیا تھا جب کہ اس نے اس کو اپنے بر کے انتخاب سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔

ایک ہی بار اور ایک ہی بار
عورت اپنا جسم اور روح ایک ہی شخص کو دیتی ہے۔
ایک ہی بار اور ایک ہی بار پیارا باپ
اپنی بیٹی بے بہا سمجھتا ہے
اگنی دیوتا کے آگے
سپرد کرتا ہوں اُس کو جو کہ مرا داماد ہوا۔
میں نے اپنا من اور تن

دے دیا اُس کو اب کیا ہے۔ واپس ہو نہیں سکتا یہ
دل سے مقابل کیا ہو کوئی
اس سے کسی کا مقابلہ کیا جو بھی کرے ناکام ہو وہ
میری قسم تھی حقیقی قسم
جو میں نے خوشی سے کھائی تھی اور ہے اب بے گناہ
اس سے اگر انکار کروں ہاں سے توڑنا چاہوں میں!

ذیل میں مناظر قدرت کی اس تصویر کو پیش کیا جاتا ہے۔ جو تارو دت نے کھینچی ہے۔

طلوع آفتاب ہے درخت اس سمے میں کیا ہی خوشنما ہیں واہ وا!
دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں کس قدر دلکش اور جاذب نظر ہیں یہ
غروب آفتاب پردہ بالا ہوگا اس کا حسن اور بھی
شفق اور اس کے ساتھ چاند، چاند بھی نیا نیا بدل ہی جاتا ہے یہ رنگ
سفید جب کہ چادر اک فضا پہ ہو محیط سی!

یہ نظم غلطیوں سے مبرا نہیں مگر عام طور پر پڑھنے والے پر اس کا اچھا اثر ہوتا ہے بعض غلطیاں شاعرہ کی ناتجربہ کاری اور کم سنی کے باعث ہیں۔ ہندوؤں اور برہمنوں میں جو اس قدر قریبی تعلق بتلایا گیا ہے وہ اس قصے کے لحاظ سے بالکل ٹھیک ہے مگر انگریزی کے منتہا سے بالکل غلط جیسا کہ ذیل میں بتلایا گیا ہے۔

یہی وہ ساوتری ہے جس نے دعائیں مانگی تھیں گڑگڑا کر
برہمنوں کو کھلایا کھانا ہندوؤں کو دی الا اس نے دانا۔

تارو دت نے اس نظم میں ایک اور غلطی کا ارتکاب کیا ہے وہ یہ کہ الفاظ کو کھینچ لکھا ہے۔ یہ مصرعے

موہوم سی موہوم اُمید بندھی تھی
ان کے اُوپر لٹاتے تھے ستارے روز بروز
نہیں ظاہر ہوا تھا لمبا دن ابھی تک ابھی۔

ابھر گا دیا۔ اُما اس سلسلے کی ایک اور نظم ہے۔ جو عوام کی کہانی پر مبنی ہے نظم کا آغاز اس بیان سے ہوتا ہے کہ خوبصورت دولا ملی الصباح فراقرم کی سڑک پر پکارتا جا رہا ہے ابھی اس قدر سویرا ہے کہ گھاس اور درختوں پر شبنم باقی ہے اور وہ برابر

چلاتے جا رہا ہے۔

سیپ کی ہیں چوڑیاں
لڑکیو، آؤ، آؤ لیتی جاؤ

صرف چند ہی لوگ جاگ رہے تھے جنہوں نے اس کی آواز کو سنا۔ خوانچہ والا سڑک کے نکڑ پر اس خوبصورت حوض پر پہنچا جو میوے کے درختوں سے گھرا ہوا تھا اس کے ایک کونے پر پتھر کی سیڑھیاں تھیں جو دخلے کی محراب سے لے کر پانی کی سطح تک پہنچتی تھیں ان سیڑھیوں پر مغرب کی طرف منہ کئے ایک حسین دوشیزہ بیٹھی تھی۔ جس کی آنکھیں خوبصورت اور سیاہ تھیں خوانچے والا اپنی چیزوں کو دکھلانے کے لئے وہاں ٹھہر گیا۔ اور اس دوشیزہ سے کہا کہ اس کی چوڑیاں ایسا جادو کا اثر رکھتی ہیں کہ چاہنے والا ہمیشہ چاہتا رہتا ہے۔ اور پہننے والی بیوگی سے محفوظ رہتی ہے جب دوشیزہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو خوانچے والے نے ایک چوڑی اس کی نازک کلائی میں پہنا دی۔ اور حیرت سے اس کے حسن کو دیکھنے لگا۔ جب اس حسین دوشیزہ نے اپنا ہاتھ اٹھا کر چوڑی کو روشنی میں دیکھنا شروع کیا تو خوانچے والا اس کے رعب حسن سے مرعوب ہو گیا اس پری جمال نے اپنے رخسار پر سے بکھرے ہوئے گیسو کو ہٹاتے ہوئے خوانچہ والے سے چوڑیوں کی قیمت دریافت کی اور کہا کہ چوڑی کی قیمت اس کے گھر پر جا کر لے لے۔ خوانچہ والے نے دریافت کیا کہ اس کا گھر کہاں ہے اور ساتھ ہی اس کی انگوٹھی سے اس نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ شادی شدہ ہے۔ اس پری جمال نے جواب دیا کہ اس کا شوہر غریب ہے اس لئے اس کا باپ چوڑیوں کی قیمت ادا کر دے گا جو ضعیف پجاری ہے اور مندر میں رہتا ہے۔ مندر کا آراستہ کلس دور سے دکھائی پڑتا ہے۔ اگر پجاری کہے کہ اس کے پاس اس کو دینے کے لئے رقم نہیں ہے۔ تو وہ پجاری سے کہے کہ مورتی کے قریب سرخ رنگ کا صندوق رکھا ہوا ہے۔ اس کو کھولے اس میں اس کو مطلوبہ رقم مل جائے گی۔ خوانچہ والا اس لڑکی کے کہنے کے موافق اس کے بتائے ہوئے پتے پر چلا گیا اور وہ لڑکی فوراً پانی میں ڈوبنے کی تیاریاں کرنے لگی،

خوانچے والا مندر کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں گھنٹوں کی آواز گونج رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس نے آواز لگائی "سیپ کی چوڑیاں" جس کے جواب میں ضعیف پجاری باہر آیا اور اس کو دیول کی دعوت میں شرکت کے لئے بلانے لگا۔ خوانچے والے نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا اور اپنے وہاں آنے کا مقصد بیان کیا۔ جس کے جواب میں بوڑھے پجاری نے کہا۔

اللہ نے دی ہی نہیں لڑکی مجھے کوئی
سرمایہ میری عمر کا ہے ایک ہی لڑکا!
بے شک کسی چنچل نے ٹھگا ہے تجھے اے دوست
لیکن میں پتہ اس کا لگاؤں گا کسی دن!

یہ سننے کے باوجود خوانچے والے کو یقین نہیں آیا کہ اس لڑکی نے اس کو دھوکا دیا ہے۔ اپنے اس خیال کے مزید ثبوت میں اس نے بوڑھے پجاری کو سرخ صندوق کا پتہ بتلایا۔ پجاری متعجب ہو کر اس صندوق کو اٹھا لایا اور اس کو کھولا اور اس میں درحقیقت اس قدر رقم موجود تھی۔ جس سے چوڑی کی قیمت ادا کی جا سکتی تھی۔ بوڑھے کو فی الفور اس بات کا یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو وہ خود دیوی مورتی تھی۔ جس کو وہ کئی سال شب بیداری کر کے اور بیلانے رکھ کر اور رو رو کر تلاش کیا کرتا تھا۔ اس خوانچے والے کو بغیر تلاش کئے مل گئی۔ جب خوانچے والے کے سامنے اس لڑکی کے حسن کے خیال کے ساتھ ہی ایک پر رعب روشنی نمودار ہوئی تو وہ خوانچہ کو وہیں پھینک اس حوض کی طرف لپکا اور ضعیف پجاری اس کے پیچھے تھا۔ مگر وہاں ان کو ناکامی ہوئی اس لئے کہ اس خاموشی میں صرف ایک بگلا کھڑا تھا۔ جب خوانچے والا اور پجاری وہاں سے نامراد پلٹے تو دیول کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوئیں اور پجاری حوض کی طرف مڑ کر مورتی سے التجا کرنے لگا کہ وہ پھر اپنی شبیہ دکھلائے اک لفظ ہی کہہ دے مجھے آواز سنا دے'
جھلکی ہی دکھا دے!

وہ منتظر کھڑے رہتے کہ دفعتاً کنول کے پھولوں میں حرکت ہوئی

جو پانی کی سطح پر تیر رہے تھے اور اُن کے درمیان سے ایک نازک کلی نمودار ہوئی۔ جس میں سیپ کی چوڑیاں تھیں اور پھر فوراً غائب بھی ہو گئیں۔ ان دونوں نے وہاں سے چلنے سے قبل ایک ایک کنول کا پھول لے لیا تاکہ وہ اس سے آج کے دن اور واقعے کی یاد کو تازہ رکھیں اس دن سے لے کر اب تک کئی سو سال ہوئے اس خوبصورت واقعے کے خاندان کے لوگ ہر سال مورتی کو پرانی وضع کی سیپ کی چوڑیاں چڑھاتے ہیں۔ اُن کو اس کا پورا یقین ہے۔ کہ اس مبارک دن سے لے کر اب تک مورتی برابر اُن کو ہر مقصد میں کامیاب کرتی ہے۔ تارو دت کی قابلیت اس نظم میں پوری پوری طور پر نمایاں ہے۔ اس قصے کے بارے میں خود اس کی رائے ان آخری دو سطروں سے ظاہر ہوتی ہے

ممکن ہے کہ یہ قصہ بیہودہ ہو جو میں لکھ رہی ہوں کیونکہ موجودہ
زمانے کے رنگ کے بالکل خلاف ہے؟

واقعتاً اس میں قدامت کا رنگ نمایاں ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ تارو دت نے کسی قصے کو اس قدر سلاست سے نہیں بیان کیا جس طرح اس نے اس قصے کو بیان کیا ہے۔

"کال چیلا" دوسری نظم ہے۔ جو ہندوستانی رنگ لئے ہوئے ہے۔ یہ مہابھارت کا ہر دل عزیز واقعہ ہے۔ جس میں نیچی ذات کے ایک شکاری کا لڑکا 'ہیرو' ہے۔

فن کے اعتبار سے یہ نظم اس کی دوسری نظموں سے بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں لغزشیں کم ہیں، جنگل کا منظر جس میں سے ہو کر وہ گزرتا ہے۔ طویل اور ایک حد تک غیر ضروری ہے۔ غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ پڑھنے والے کو یہ بتلایا جائے کہ قدرتی مناظر کا انسان کے تخیلات پر کتنا گہرا اثر پڑتا ہے۔ نظم میں بعد میں چل کر اس کا اثر زیادہ نمایاں اس واقعے سے ہو جاتا ہے۔ جبکہ بطین غیر ارادی طور پر اس سے ہمدردی کرنے لگتی ہیں اور جس کی وجہ سے بچو کے دل میں ایک نئی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ پوری نظم میں ہم کو اس کا احساس ہوتا جاتا ہے۔ کہ بچو درونا چاریہ کی غیر معمولی عزت کرتا ہے جو پرستش کی حد تک پہنچی ہے۔ اب ہم ایک کال چیلے سے سندھو کی طرف چلتے ہیں جو ایک کال بیٹا ہے۔ سندھو پنے سنیاسی ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ان دونوں کے ساتھ جنگل میں رہتا تھا۔ دونوں نابینا تھے۔ اور اُن کی زندگی کا دارومدار پورے طور پر سندھو پر تھا۔

اس نظم کی تصنیف کے زمانے کا پتہ بھی نہ چل سکا اور بعض جگہ اس نظم میں بحر بھی بدل گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سادگی نظم کی خوبی ہوتی ہے۔ مثلاً ورڈس ورتھ کو لیجئے۔ اسی طرح سادگی و پرکاری پر تارو دت کو خاصا عبور تھا۔ چنانچہ اسی نظم میں اس نے شکار کی منظر کشی بڑی کامیابی سے کی ہے۔ اور بڑے پاکیزہ خیالات ظاہر کئے ہیں مگر باوجود اس کے سندھو میں مجموعی طور پر شاعری کا معیار بلند نہیں ہے۔

ایک دوسری نظم "پرہلاد" ہے۔ جو مہابھارت ہی سے اخذ کی گئی ہے۔ یہ راجہ ہرن کا قصہ ہے۔ جو غیر معمولی شجاعت کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ دیوتا خود اس سے خائف تھے۔ اس کی فرعونیت مقدس چیزوں کی تحقیر تک پہنچ گئی تھی۔ اس لئے اس نے ویدوں کو پھاڑ کر پرزے پرزے کر ڈالا۔ قربانیوں کو موقوف کر دیا۔ مقدس لوگوں کو قتل کر ڈالا اور حکم جاری کیا کہ سب لوگ صرف اسی کی پوجا کیا کریں۔

اس کی آخری نظم "سیتا" ہے۔ جس میں شاعرہ نے اپنے بچپن کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ خود وہ، اس کا بھائی اور بہن اکثر اپنی ماں کے پاس اکٹھا ہو جایا کرتے اور سیتا کی مصیبت کے واقعات سنا کرتے تھے۔ سننے والے اور بہنے والے دونوں اس سے متاثر ہوا کرتے تھے۔

وہ روتی ہے۔
بے سود نہیں۔ اس سے کہ ہر آنسو کے لئے جو وہ گراتی ہے۔
تینوں کی کم عمر آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔
اور تین کم سن سر غم سے جھک جاتے ہیں۔

دوسری جلد میں سات بڑی نظمیں ہیں جو تقریباً سوانح حیات ہیں۔ ان پر ایک تفصیلی تنقید "تارو دت کی زندگی اور خطوط" میں آچکی ہے۔ مگر ہم یہاں ایک چھوٹی سی نظم "ہمارا کاسینکا درخت" پر لکھنا کچھ مناسب خیال کرتے ہیں جو انگریزی زبان کی ایک کامیاب نظم مانی جاتی ہے۔ یہ نظم عمدہ خیالات سے پُر ہے اور کیٹس

کی "بلبل سے خطاب" یا ورڈس ورتھ کی "نئے درخت کو یاد دلانے والی چیز ہے۔ اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اس درخت کا شاعرہ پر کس قدر اثر تھا۔

خوبصورتی کی وجہ سے
کا سینہ مجھ کو عزیز نہیں
اس کے نیچے، ہم کھیل چکے ہیں گو ایک زمانہ گذر گیا
او عزیز ساتھیو! صرف تمہاری خاطر سے یہ درخت مجھ کو عزیز رہیگا
تمہاری صورتوں کو پیش کرکے اس کا تصور
ہمیشہ میرے لئے آنسو بہانے کا باعث ہوتا ہے
وہ نوحہ کر رہا ہے میں سن رہی ہوں اور رحواس آواز کے مثل
جو سمندر کے کنارے لہروں کی ٹکر سے پیدا ہوتی ہے برابر چلی آرہی ہے
یہ درخت کا رونا ہے جو ممکن ہے کہ
دور دراز ممالک تک پہنچ جائے
آہ میں اس نغمے کو دور دراز ممالک میں بھی
جھیلوں کے کنارے سن چکی ہوں، ایسی جھیلوں پر جو درختوں سے گھری ہوئی ہیں۔
اور ایسی جھیلوں پر جن کی لہریں فراس اور اٹلی کے کناروں سے ٹکراتی ہیں
اور ایسے وقت جب کہ تمام دنیا بے ہوش پڑی ہو۔
اور ایسے وقت جبکہ راگ کانوں میں گونجتا ہے ایک شبیہہ میرے سامنے نمودار ہوتی ہے
اور درخت وہ شبیہہ تیری ہوتی ہے۔
جس کو میں اپنے بچپن کے زمانے میں وطن میں دیکھا کرتی تھی۔

انجم اعظمی

غزل

یہی تلخیاں سمٹ کر کبھی بن گئیں فسانہ
یہی تلخیاں جو پھیلیں تو بدل گیا زمانہ

مرے عزم کو جگا دے جو حیات کو بدل دے
مری سمت اُٹھ رہی ہے وہ نگاہِ کافرانہ

ترا جسم ہنس رہا تھا مری رات جاگ اٹھی تھی
مری انگلیاں بنی تھیں ترے گیسوؤں کا شانہ

یہ نہیں کہ تجھ سے مل کر مجھے کچھ خوشی نہیں ہے
یہ خوشی بھی ہے مگر کیوں مرے غم کو تازیانہ

کبھی وعدۂ وفا تھا کہ خزاں مٹائیں گے ہم
مگر اب بسا رہے ہو فقط اپنا آشیانہ

ابھی گلستاں ہے اپنا اُنھیں بجلیوں کی زد میں
کہ بدل سکیں ادائیں نہ تری ستمگرانہ

مرے دل پہ کچھ اثر ہے نہیں اب فسونِ شب کا
میں سنا رہا ہوں تم کو نئی صبح کا ترانہ

میں جفا نہیں سہوں گا میں وفا بھی چاہتا ہوں
ترے آستاں سے ہٹ کر بھی بنا ہے آستانہ

ذکر و فکر

عبدالمجید حیرت

صبح نے بخشا، نہ بخشا شام نے
پیس ڈالا گردشِ ایام نے

اپنے اپنے حال میں سب مست تھے
کون پھر اُٹھتا کسی کو تھامنے

اُن اسیروں کی رہائی ہو چکی
جن کو پھانسا ہے فریبِ دام نے

کتنے باغوں کی بہاریں لوٹ لیں
عیش و عشرت کے خیالِ خام نے

بات اُن کی بگڑ نہیں سکتی ابھی
ہے ابھی اُن کا مقدر سامنے

کچھ تو ملنا چاہیئے اس کا صلہ
غم اٹھائے ہیں بہت ظالم نے

عزمِ ترکِ آرزو بھی کچھ نہیں
یہ بھی کر دیکھا دلِ ناکام نے

اور ہی کچھ لطف پیدا کر دیا
دستِ ساقی سے گذر کر جام نے

ہم بھی حیرت ہو گئے اُن کی طرف
وہ اثر ڈالا کسی کے نام نے

شفیق صدیقی جون پوری

کس مپرسی کی تو کوشش کسی عنواں نہ گئی
تو مجھے چھوڑ کے اے شامِ غریباں نہ گئی

پوچھئے بے وطنیٔ اہلِ چمن نکہت سے
پھری آوارہ مگر سوئے گلستاں نہ گئی

شکوہ کرتے ہیں صبا والوں کی غربت والے
تو کبھی لے کے شمیمِ درِ جاناں نہ گئی

وسعتِ حوصلہ بھی وسعتِ تدبیر بھی ہے
میری قسمت سے مری تنگیٔ داماں نہ گئی

بزمِ انجم سے یہ کہتی ہوئی جائے فریاد
چاندنی بھول کے بھی سوئے غریباں نہ گئی

آنسوؤں نے تو بہت آگ بجھانا چاہا
شورشِ دل مگر اے دیدۂ گریاں نہ گئی

آج دریا کی جگہ کچھ نہیں جز ریگِ رواں
پھر بھی دل سے خلشِ کشتی و طوفاں نہ گئی

چند لمحوں کے لئے وہ کبھی آئے تھے شفیق
آج تک دل کشیٔ خانۂ ویراں نہ گئی

نازش پرتاب گڈھی

بھیگی آنکھ اور سونی رات
دیکھی ہے یوں بھی برسات

سر پہ کھڑی ہے ہجر کی رات
پھر بھی سہانے ہیں لمحات

کٹ بھی چکی ہو گی کتنی رات
کس سے پوچھیں رات کی بات

آج ہی بھیگی ہجر کی رات
آج ہی اٹھا دردِ حیات

حسن اور عشق ہیں دونوں چپ
کس کی جیت ہے کس کی مات

اور بہا لے دو آنسو
اور نکھارے غم کی رات

درد نے لی کروٹ دل میں
یاد آئی اک بھولی بات

غم ہی سب کچھ ہے نازش
ڈھونڈ نہ اپنے غم سے نجات

نہال سیوہاروی

ہمتوں پر اعتبارِ جاوداں رہنے دیا
تا ابد ہم نے ارادوں کو جواں رہنے دیا

مے علاجِ تشنگی کو میکدے میں کم نہ تھی
جانے کیوں ساقی نے مجھ کو سرگراں رہنے دیا

کون یہ نیرنگ سازِ بزمِ ہستی سے کہے
ایک صورت پر کیوں رنگِ جہاں رہنے دیا

لاج رکھی ہم نے کن مایوسیوں میں آس کی
کن اندھیروں پر اجالوں کا گماں رہنے دیا

مہربانی ہائے میرِ کارواں کو کیا کہوں
راہزن کو بھی شریکِ کارواں رہنے دیا

سردار جلیل

تلخیٔ زیست سے دو چار کروں یا نہ کروں
میں انھیں عشق کا بیمار کروں یا نہ کروں

تو بھی دل توڑ نہ دے ساتھ مرا چھوڑ نہ دے
سوچتا ہوں کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں

تیرے ہر نقشِ کفِ پا پہ لٹا کر سجدے
طالعِ خفتہ کو بیدار کروں یا نہ کروں

اب تو لے دے کے تو ہی مونسِ تنہائی ہے
اے غمِ دوست تجھے پیار کروں یا نہ کروں

دل کے ناسور دکھا کر میں انھیں آج جلیل
حالتِ دل سے خبردار کروں یا نہ کروں

عزمی خیرآبادی

نگاہِ مست سے پیغامِ آگہی تو نہ دے
مرے حبیب! مجھے اذنِ زندگی تو نہ دے

مری خودی کے تقاضے کچھ اور ہیں ساقی
مری خودی کے تقاضوں کو بیخودی تو نہ دے

نگاہِ دل کو دیا ہے جو ذوقِ نقد و نظر
نگاہِ دل کو تو پھر اتنی بے بسی تو نہ دے

صابر شاہ آبادی

جذبِ صادق، عزمِ کامل چاہیئے
ہمرہِ منزل ذوقِ منزل چاہیئے

ناخدا کی لاج ہے مدِ نظر
ورنہ کس ناداں کو ساحل چاہیئے

پی۔ پیام

گذر رہا ہے ساز کہ بج رہا ہے چنگ
فضائے منزلِ امکاں میں اٹھ رہی ہے ترنگ

نہ مانگ مجھ سے مرے پیار کے دنوں کی امنگ
نہ چھیڑ رعب میں جادو نہ ہے عشق میں ڈنگ

زمیں کے ذرّوں نے اٹھ کر وہ آگ چھیڑی ہے
کہ مہر و ماہ و ستاروں کا اڑ رہا ہے رنگ

سنبھال لے مرے نغموں کا بوجھ میری حیات
بجا رہا ہوں نوا ریز سازِ خوش آہنگ

سحر کا رعب لئے پھر ابھر رہی ہے جبیں
ابھی دراز ذرا اور گیسوئے شب رنگ

اقبال سکندر شاہین مرادآبادی

حدود سے مجھے تخیل کی نکلنا ہے
حیاتِ نو کے تقاضوں کے ساتھ ڈھلنا ہے

نشانِ راہ کہاں اور کہاں ابھی منزل
ابھی کچھ اور ہواؤں کے رخ پہ چلنا ہے

ظفر عالمگیر

پاگل

ایک روزنامہ کا جائنٹ ایڈیٹر ہونے کی بنا پر میں رات کو کافی دیر سے لوٹا کرتا۔ بارش کا موسم تھا۔ بوندیاں پڑ رہی تھیں میں کافی تھک گیا تھا آہستہ آہستہ قدم ڈالتا آ رہا تھا۔ راستے میں بارش آ گئی میں نے ایک ریستوران میں پناہ لی۔ اور اس پناہ کے معاوضہ کے طور پر چائے منگوائی ابھی گھونٹ پیئے تھے کہ دروازے پر شور ہونے لگا ——— "نکالو، اسے دھکیل دو" ———

میں نے پیالی رکھ دی اور دروازے پر جا پہنچا۔ دیکھا کہ ایک شخص سے شرابور ہو چکا ہے اور ہوٹل میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ لوگ اسے روک رہے ہیں چہرے پر گھنی داڑھی لمبے لمبے بال لیکن الجھے ہوئے، پرانے جا بجا سے پھٹ گئے ہیں۔ کوئی اسے دیوانہ کہہ رہا ہے کوئی پاگل سودائی۔ میں نے بھی اسے سڑکوں پر بار ہا دیکھا تھا لیکن وہ دیوانے کی کوئی حرکت کرتے نظر نہ آیا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ بیچارہ بارش میں کھڑا بھیگ رہا تھا۔ میں نے اسے بلا لیا اور اپنے ساتھ اندر لے آیا۔ سب خاموش ہو رہے۔ اس نے اپنے کپڑوں سے پانی نچوڑا اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے چائے منگوائی لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چائے ٹھنڈی ہو چلی تھی میں نے اسے متوجہ کیا۔ وہ چونک اٹھا "تم نے سمجھا کیا میں بھی پاگل ہوں بابو جی؟" اس کی آواز میں درد تھا۔

"نہیں دوست یہ دنیا خود ایک پاگل خانہ ہے یہاں کا ہر ایک اپنے طور پر پاگل ہے" میرا یہ جواب سن کر وہ خاموش ہو گیا لیکن اس کے الفاظ سے میں بے چین سا ہو گیا۔ کتنا درد اس کی آواز میں تھا۔ میں نے اس سے تفصیلات حاصل کرنے کی کوشش کی اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اسے اپنے موضوع پر لے آیا اور اپنی زندگی کے واقعات سنانے پر مجبور کر ہی دیا ———

"تو سنئے بابو جی" اس نے شروع کیا۔ میرے ہاتھ میں اخباروں کا پلندہ اور جیب میں ایک چھوڑ تین فونٹین پن دیکھ کر شاید وہ سمجھ گیا کہ میں کلرک یا اسی قسم کا کام کرتا ہوں اور اسی لئے اس نے مجھے بابو جی کہا ———

"آج سے دو سال پہلے میں علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ ماں باپ کے مر جانے کے بعد چچا نے میری پرورش کی وہ میرے اخراجات کے لئے کافی پیسے بھیجتے۔ بڑے سرمایہ دار تھے۔ ان کو کسی چیز کی کمی نہ تھی اور نہ کسی بات کی فکر۔ میں ان کا بہت زیادہ ادب کرتا تھا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں علی گڑھ سے ان ہی کے ہاں چلا جاتا۔ لیکن ان کی یہ محبت اور مروت غرض سے خالی نہ تھی۔ اپنی اکلوتی لڑکی زرینہ کے لئے ان کو ایسے شوہر کی تلاش تھی جو نہ صرف ان کا کاروبار سنبھال سکے بلکہ بے دام غلام بن کر رہے اور ان کی نظر انتخاب مجھ پر تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے زرینہ سے کوئی انس نہیں وہ اپنے ارادے پر اٹل تھے اور انہوں نے بار ہا مجھ سے اشارۃً اسی قسم کے تذکرے کئے تھے۔ زرینہ صورت شکل کی تو بری نہ تھی بلکہ ہمارے خاندان میں اپنے سلیقے، حسن صورت اور سیرت کی وجہ سے ہر دل عزیز تھی لیکن مجھے اس سے کوئی انس اس لئے نہ تھا کہ میری ویران سی زندگی میں سلطانہ ایک چاند کی مانند چاندنی بکھیر رہی تھی ——— سلطانہ ہمارے ایک پروفیسر کی لڑکی تھی اور خود پروفیسر صاحب مجھے اس لئے بہت زیادہ چاہتے تھے کہ میں یونیورسٹی کے مایہ ناز طلبا میں سے ایک تھا۔ ان کے گھر میں کوئی روک ٹوک نہ تھی اور میں آزادی سے آ جا سکتا تھا اگرچہ پروفیسر صاحب سلطانہ اور میرے حال سے واقف تھے لیکن ان کو ہم دونوں پر کامل اعتماد تھا ———"

میں نے پہلو بدل کر بیٹھنے کی کوشش کی اگرچہ کہ بارش زوروں پر تھی اور سردی ہو رہی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں پسینہ پسینہ ہو گیا، اس کی

باتوں میں مجھے اپنے ماضی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی اور میری آنکھوں میں میرا ایک کلاس فیلو یوسف گھوم رہا تھا جب میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا۔ میں نے صبر سے کام لیا اور سُننے لگا کچھ دیر رُک کر اس نے پھر سلسلہ جاری رکھا ——

"یُوں تو میرے کئی دوست تھے لیکن انور میرا انتہائی گہرا دوست تھا ایک بار گرمیوں میں میں اسے اپنے ساتھ لایا اور دو مہینے تک ہم دونوں چچا کے یہاں رہے۔ پردے کی اتنی سختی نہ تھی اور اسی لئے انور نے کہیں زرینہ کو دیکھ پایا۔ نظر ملتے ہی دل چلا گیا ——

ہم دونوں علی گڑھ واپس ہوئے بی اے کا آخری سال تھا میں اسٹڈی کرنے انور کے ہاں جاتا تھا۔ ایک دن میں حسب معمول گیا کئی آوازیں دیں دروازہ نہ کھلا۔ بڑی دیر کے بعد ایک بڑی بی نکلیں اور روتے ہوئے کہا" بیٹا انور نے آج چاقو دل میں مار لیا تھا کو دواخانے لے گئے ہیں" ——

میں سکتے کے عالم میں ان کو تکتا رہا۔ آخر کیوں اس نے ایسا اقدام کیا۔ اسے کسی سے محبت تو نہ تھی۔ آخر میں نے اس کا کمرہ کھلوایا اور اس کی ساری کتابیں دیکھ ڈالیں شاید کوئی پتہ چل سکے۔ آخر ایک کتاب میں زرینہ کی تصویر ملی میں سمجھ گیا کہ انور نے اب تک مجھ سے چھپائے رکھا ہے میں نے اس کے کوٹ کا جائزہ لیا۔ زرینہ کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا —"یوسف بھیا سے میری شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اور آپ ہیں کہ علی گڑھ میں غفلت کی نیند سو رہے ہیں" ——

اب مجھے یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ انور نے کیوں خودکشی کا ارادہ کیا۔ چند دنوں بعد وہ دواخانے سے آیا ——

میں بے چینی سے بار بار پہلو بدل رہا تھا میرے ماضی کے حسین منظر میری آنکھوں میں گھوم رہے تھے مجھے اپنے سینے میں درد سا محسوس ہونے لگا گویا وہ زخم ہرا ہو گیا ہو جو علی گڑھ میں چاقو مار لینے کی بنا پر میرے سینے پر زرینہ کی یادگار کی طرح موجود تھا —— وہ کہتا رہا۔

"مجھے تار دے کر چچا نے بلوایا میں نے امتحان کا بہانہ کیا لیکن امتحان کے بعد میں نہ بچ سکا۔ بہت ہاتھ پیر مارے حتیٰ کہ صاف صاف انکار کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انور اور زرینہ کی ملی جلی آرزوؤں کی کوشش پر میری شادی کے چراغ گلیں اور بیٹے جھلملائیں لیکن میری سُنتا کون تھا اور زرینہ کو میرے پلے باندھ دیا گیا۔ میں نے تعلیم چھوڑ کر کاروبار سنبھالا اور علی گڑھ کو بھولنے کی کوشش کی لیکن دوست میں علی گڑھ نہ بھول سکا۔ وہاں انور اور سلطانہ رہتے تھے جن کی زندگیوں کو میں نے خاک میں ملا دیا تھا۔ شادی کے بعد اکثر میں انور اور سلطانہ کی یاد میں مغموم اور افسردہ رہنے لگا۔ خدا خدا کر کے ایک مہینہ گذرا۔ چچا بھی میری اس حالت کو محسوس کر رہے تھے۔ علی گڑھ میں میں نے انور سے خودکشی کا سبب پوچھا تھا لیکن اس نے بتلانے سے انکار کر دیا تب میں نے وہ تصویر اور خط اسے دے کر کہا" انور میں تمہارے راستے میں نہ آؤں گا۔ اور تمہاری پوری مدد کروں گا" لیکن وعدے کے چند دن بعد ہی مجھے علی گڑھ چھوڑنا پڑا اور ساتھ ہی انور کو مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ انور کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہا ہوں ——"

میرے لئے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ میں بمشکل اپنے آنسو روک رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ اسے کچھ اندازہ نہ ہو سکے۔ وہ اسی طرح بیٹھے ڈوبی ہوئی آواز میں کہے جا رہا تھا۔

"دوسرا مہینہ گذر رہا تھا کسی کام سے زرینہ کے کمرے میں جانے کے لئے اجازت ہو گئی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرے کمرہ میں دھواں آ رہا ہے۔ میں نے نوکر کو آواز دی کہ اتنی رات کو کیا کر رہا ہے کیوں لکڑیاں جلا رہا ہے لیکن نوکر تو جا چکا تھا۔ میں نے زرینہ کو آواز دی لیکن ہر طرف خاموشی تھی۔ میں تیزی سے زرینہ کے کمرے کی جانب بڑھا۔ کمرہ بند تھا اور اندر سے دھواں نکل رہا تھا میں سمجھ گیا اور خوف و دہشت میں دروازہ توڑ ڈالا۔ دھوئیں اور مٹی کے تیل کی بُو سے میں چکرانے لگا۔ کمرے کے ایک کونے میں میں نے دیکھا کہ زرینہ شعلوں میں جلتی تڑپ رہی ہے۔ میں نے جوں توں کر کے شعلوں کو بجھا دیا لیکن زرینہ کی روح ابدی سکون کی تلاش میں جا چکی تھی۔ اس کے تکیے کے نیچے میرے نام ایک خط تھا۔ جسے اس نے خون سے لکھا تھا ——"

اس نے اپنی میلی سی شیروانی کے بٹن کھولے اور اندر سے ایک پیکٹ نکالی اس میں وہ خط جوں کا توں محفوظ تھا ——

میرے سرتاج!

میں دیکھ رہی ہوں کہ میری اور آپ کی زندگیوں میں میل ممکن نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کو سلطانہ سے محبت ہے اور اس لئے آپ نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کیا تھا۔ انور نے مجھ سے سب کچھ کہہ دیا تھا شاید آپ نہیں جانتے کہ انور میری رگ رگ میں بسے ہوئے ہیں اور ان کے بغیر میں دنیا میں رہ کر کیا کروں؟

اس نے کچھ دیر رک کر خط جیب میں رکھا اور پھر کہنے لگا ——

میں ایک منٹ بھی وہاں نہ رہ سکا۔ چچا کے تیور بدل رہے تھے میں نے گھر چھوڑ دیا اور کچھ عذر کئے بغیر علی گڑھ چلا آیا۔ انور کو تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ تقسیم ہند کے بعد حیدرآباد جا چکا ہے۔ سلطانہ کے متعلق صرف اس قدر معلوم ہوا کہ وہ لاپتہ ہے اور جس دن میری شادی کا جوت نامہ پروفیسر صاحب کو ملا اس رات وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ ان صدمات نے میری زندگی بدل دی۔ مجھے یہ دنیا ویران سی معلوم ہونے لگی میں آگرہ آ گیا یہاں تاج محل میرے زخموں کو کریدتا رہا گویا وہ میری محبت کا مذاق اڑا رہا ہو۔ جب بھی میں اس عمارت کو دیکھتا سلطانہ میری نظروں میں گھوم جاتی لیکن میرے دل کی ملکہ مجھے نہ مل سکی کسی مقصد کے بغیر میں یوں ہی ادھر اُدھر گھومتا پھرا۔ میں نے آخر حیدرآباد کا عزم کیا۔ راستے میں چند پرانے ساتھی ملے۔ میں ہر لحاظ سے بدل گیا تھا لیکن انہوں نے مجھ کو پہچان لیا۔ میں نے پروفیسر صاحب کے متعلق پوچھا کہ شاید مجھے سلطانہ کا پتہ مل سکے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ سلطانہ کے گھر سے غائب ہونے کے چند دن بعد ایک کنویں سے اس کی لاش برآمد ہوئی۔ میں یہ سن کر پاگلوں کی طرح چیخ اٹھا "سلطانہ! میں نے تمہیں مار ڈالا میں سلطانہ کا قاتل ہوں" اور نہ جانے کیا کیا کہہ گیا ——

پولیس نے مجھے پکڑ لیا اور پاگل سمجھ کر پاگل خانے میں بند کر دیا۔ چند ہفتوں بعد مجھے چھوڑ دیا گیا۔ میں انور کی تلاش میں حیدرآباد آ گیا۔ دو مہینوں سے اس کی تلاش میں ہوں لیکن وہ مجھے نہ مل سکا۔" وہ رک گیا میں نے غور کیا کہ یوسف اب تک نہ پہچان سکا کہ اس کا انور اس کے سامنے بیٹھا ہے۔ میں بھی کس قدر بدل گیا تھا۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "یوسف کیا تم جانتے ہو کہ ...."

وہ چونک پڑا —— "میں نے آپ کو اپنا نام تو نہیں بتلایا پھر ...." وہ خاموش ہو گیا اس کی نظریں میرے چہرے پر گڑ گئیں۔ میری آنکھوں سے آنسو تڑپ کر نکل پڑے ——

وہ چیخ اٹھا —— "انور"

دوسرے لمحے ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے —— دو پاگل ——!!

محمد جمیل احمد

ناہید

تو بتا دے مری ہمدم مری محرم ناہید!
آج کیا حال ہے میرا اسے کیا کہتے ہیں!

آج کیوں میرے چمن میں ہے ویرانی سی
آج کیوں شمعیں فلک کی بھی ہیں کچھ دھیمی دھیمی
آج کیوں چاندنی پھیکی ہے فضائیں بے کیف
آج کیوں پھول ہیں گلشن کے یہ کملائے ہوئے
آج کیوں صبح میں وہ کیف نہیں ہے باقی
آج کیوں شام سے دل ڈوبنے لگتا ہے مرا
آج کیوں صبح پہ اک بار لئے آنکھیں بوجھل
آج کیوں دل ہے ہر اک چیز سے اکتایا ہوا
آج کیوں زیست کی ہر راہ ہے ویران اداس
آج ہر سو یہ بھیانک سا خلا ہے کیسا

تو کہاں ہے مری ہمدم، مری محرم ناہید
تو نہیں پاس تو دنیا میں مری کچھ بھی نہیں
ہاں مگر میرے تنفس میں مہک ہے تیری
ہاں مگر تارِ رگِ جاں میں ہے تیری آواز
ہاں مگر تیرا تصور ہے ابھی تابندہ
ہاں مگر پیار ہے تیرا دلِ مایوس کی آس

تو جو آ جائے تو ہر درد کا درماں ہو جائے
دلِ تاریک بھی ناہید بداماں ہو جائے

سال نامہ ۱۹۵۰

مختلف آرا کے اقتباسات

★ آج کل کا سال نامہ غور سے پڑھا۔ اس دفعہ تنقیدی مضامین کا پلّہ بہت بھاری ہے نظمیں کم ہیں لیکن بہت اچھی۔ پھر جوش کا پند نامہ تو اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے۔ فائز دہلوی اور ذکرِ میر دونوں مضامین محض خشک تحقیقی مقالے نہیں ہیں۔ دل کش ادب پارے بھی ہیں۔ بچوں کا حصّہ پُر تکلف ہے۔

(احتشام حسین لکھنؤ یونی ورسٹی لکھنؤ)

★ آج کل کا سال نامہ بقامت کہتر اور بہ قیمت بہتر کی شکل میں موصول ہوا علمی و ادبی مضمونوں کے ساتھ ساتھ نظموں، افسانوں اور تصویروں کے شگفتہ انتخاب نے سال نامے کو ہر ذوق کی تشفی کے قابل بنا دیا ہے

(سیّد محی الدّین قادری زور پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

★ اصلی معیار قائم کرنا آسان مگر اس کا نباہ مشکل ہوتا ہے۔ کام کی قدر جاننے والے کہتے ہیں کم اور کرتے ہیں زیادہ۔ آج کل کا ادارہ اسی پر عامل معلوم ہوتا ہے۔ "آج کل" یہی نہیں کہ ماہانہ صحافت کا معیار بلند کر رہا ہے اور ادب کی انمول خدمت انجام دے رہا ہے بلکہ اس کے لئے ترقی کے نئے راستے کھول رہا ہے۔ اس کامیابی پر حضرات ادارہ کی خدمت میں ہدیۂ مبارک باد پیش کرنا مذاق سلیم کا فرض ہے۔

(برجموہن دتاتریہ کیفی)

★ آج کل کا سال نامہ مجموعی حیثیت سے اچھا ہے۔

(مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی)

★ یہ بات روشن ہے کہ عام طور پر "آج کل" نے طباعت کی خوبیوں، مضامین کے معیار اور ترتیب کے سلیقے کے سبب جو معیار قائم کر دیا ہے وہ دوسرے رسالوں کے لئے ایک آدرش بن گیا ہے۔ حضرت جوش کا "پند نامہ" ایک تاریخی چیز بن جائے گی تحقیقی مضامین میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی تحقیق اردو شاعری کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔ "گل کدہ" آج کل کا ایک اہم باب ہے جو ایک اہم ضرورت کو پورا کر رہا ہے

(عبدالقادر سروری جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

★ بہر نوع سال نامہ صوری و معنوی حیثیتوں سے ایک جواہر پارہ ہے۔ خوش رنگ بے عیب، سڈول اور سجیل۔ ادارۂ آج کل اس کی اشاعت پر ہر طرح مستحق تہنیت ہے۔

(سیّد علی عباس حسینی لکھنؤ)

★ آج کل کا سال نامہ مضامین نظم و نثر کا ایک قابل قدر سرمایہ لے کر اربابِ ادب کے ہاتھوں میں آیا ہے۔ اس کے معیار کو دیکھتے ہوئے کسی خاص مشورے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں ادارے میں ہوش مند لوگ ہیں اور ان پر ہر حیثیت سے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

(ادیب مالیگانوی)

وشال بھارت کا آرٹ

حال ہی میں واشنگٹن کے بھارتی سفارت خانہ کی زیر سرپرستی لاس اینجلز کنٹری میوزیم
ایک نمائش کا انتظام کیا گیا جس میں بھارت اور وشال بھارت کے آرٹ کی امریکہ کے
لوگوں کے سامنے نہایت شاندار طریقے پر نمائش کی گئی۔ اس نمائش کو بے حد پسند کیا گیا کیونکہ
نمائش نے دنیا کو بھارت اور وشال بھارت کے آرٹ کی بڑی روایات سے روشناس
کرانے کا ایک اعلیٰ ذریعہ ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ اس نمائش میں غالباً امریکہ میں
بار ایشیائی آرٹ کے ان شاہکاروں کو یکجا کر کے پیش کیا گیا جو امریکہ، کینیڈا اور
یورپ کے مجموعوں سے مستعار لئے گئے تھے۔

نمائش کے منتظمین نے ان شاہکاروں کی ایک بہت عمدہ باتصویر فہرست
شائع کی ہے جس سے ان لوگوں پر بھی نمائش کی قدر و قیمت بخوبی روشن ہو جاتی ہے۔
جنہوں نے اس نمائش کو نہیں دیکھا ہے۔ مورتیوں، سکوں اور آثار قدیمہ کی دیگر یادگاروں
کے سیکشن میں وادی سندھ کی تہذیب کی نشانیاں شامل ہیں۔ مثلاً ساہ ڈھیری
چارسدہ ضلع پشاور سے حاصل کی ہوئی اشیاء مہریں، مٹی کی بنی ہوئی دیوی ماتا کی مورتیاں
اور کھلونے، ٹیکسلا کی دیوی ماتا کی مورتیاں اور شمال مغربی بھارت، افغانستان
باختر کی قدیم سلطنت کے بھارتی یونانی، پارتھین اور کشن حکمرانوں کے سکے۔

بت تراشی کے سیکشن میں بھارتی آرٹ کے ہر ایک دور کی سنگتراشی اور دھات کاری
کے نمونوں کا مجموعہ پیش کیا گیا۔ اس میں مرکزی بھارت کے ابتدائی دور کی نشانی
سانچی کا یکشی کا بُت۔ گاندھارا سکول یا جیسے شمال مغرب کا انڈو گریک یا رومن بدھسٹ
آرٹ کہا جاتا ہے کی نمائندگی پتھر اور استر کاری کے مسالے سے تراشی ہوئی بدھ اور بدھ
ستوں کی مورتیاں اور دیگر بُت کر رہے تھے جو شمال مغربی سرحدی صوبہ پاکستان میں واقع
تخت باہی اور افغانستان میں ہڈہ سے حاصل ہوئی تھیں۔ متھرا آرٹ کے نمائندے
سرخ ریتیلے پتھر سے بنی ہوئی بدھ، بدھی ستو، یکش، یکشنی اور جین تیرتھنکروں کی
مورتیاں۔ دکن پوربی بودھ آرٹ کے نمونوں میں امراوتی، ناگرجونی کونڈا ضلع گنٹور سے
حاصل کی ہوئی بودھ تصویر کا سر جاوا سکند جاتکا اور ایک محل کا منظر بھی موجود تھے۔ بھارتی
سنگتراشی کے سنہری زمانہ یعنی گپتا عہد کی نمائندگی کے لئے کشمیر سے حاصل کیا ہوا
سارناتھ کے بدھ کے سر کا سرخ رنگ کا بُت۔ متھرا کے سُرخ ریتیلے پتھر کی بودھ مورتیاں اور
سارناتھ ضلع بنارس سے حاصل کی ہوئی مٹیالے خاکی رنگ کے پتھر کی بنی ہوئی بدھ اور بدھی ستو
کی مورتیاں وسطی زمانہ کے شمالی بھارت کی سنگتراشی کی مختلف روایات کی نمائندگی کے لئے
گیا، نالندہ اور پوربی بھارت۔ اڑیسہ، راجپوتانہ اور جنوبی بھارت کے دیگر مقامات سے حاصل
کی ہوئی ہندو اور بودھ دیویوں دیوتاؤں کی پتھر کی مورتیوں کے نادر نمونے پیش کئے گئے
کانسی کے مجموعوں میں بھی اس طرح ہر زمانہ اور قریباً قریباً ہر ایک سکول کے دھات
اور پلاسٹر کا آرٹ جس میں خاص کر کرشن، یکشی اور گاندھارا کا بدھ قابلِ ذکر ہیں پیش کیا گیا
ان کے علاوہ شمالی اور دکنی بھارت کے عام نمونے جو اس کے بعد
کے زمانہ کے ہیں بھی شامل تھے۔

نمائش میں جہاں قدیم بھارت کی تصویر کشی کا نمونہ اجنتا کی دیواروں پر نقش رد
نگاری کی ایک فوٹو کے ذریعہ دکھایا گیا تھا۔ وہاں وسطی زمانہ کی مصوری کے بھی بعد
مغل راجستھانی اور پہاڑی سکولوں کی ۵۰ تصویریں بھی پیش کی گئی تھیں۔ جن
میں سے مندرجہ ذیل خاص کر قابل ذکر ہیں۔ بھارت کی چمکدار رنگین تصویریں
مغل زمانہ کی بابر کے ہندوستان فتح کرنے کی تصویر۔ اکبر کے شکار کھیلنے کا
ایک منظر، جہانگیر اور شاہجہان کی قلمی تصویریں راجستھانی طرز کے راگ راگنی
سلسلہ کی تصویریں، پہاڑی دور کی رادھا کرشن لیلا، رام سیتا اور لکشمن کا بن باس
دودھ کے سمندر کی متھن، شِو پاربتی اور کرشن جی کی زندگی کے مناظر۔

وسطی زمانہ کی بھارتی دستکاری اور ہنرمندی کے نمونوں میں سے جیپور
اور لاہور کے زیورات، قالین اور غالیچے (خاص کر اکبر کے زمانہ کے حیوانات کی
تصویروں والے قالین) چندیری کی ساڑھیاں کرشن جی کی تصویروں والے چمبہ کے رومال
کشمیر کے شال اور جاوا اور لنکا کے پارچات دکھائے گئے تھے۔ سولہویں صدی کی بعد
پارچہ بافی کے نمونے جو فسطاط واقعہ مصر سے ملے ہیں وہ بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

مرکزی ایشیا، نیپال، کمبوڈیا، سیام، چمپا اور جاوا میں بھارتی آرٹ
کے نمونوں کو بھی اس نمائش میں موزوں جگہ دی گئی تھی۔ مرکزی ایشیا سے
بودھ یادگاریں (جن میں لکڑی کا ایک مندر بھی شامل ہے) مجمع الجزائر ہند اور
دکن پوربی ایشیا سے ہندو اور بودھ دیوی دیوتاؤں کی منقش مورتیاں زمانہ
قدیم میں بھارتی تہذیب کے بھارت کے ارد گرد کے ملکوں میں پھیلنے کی
داستان زبان حال سے بیان کر رہی تھیں۔

سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء میں غیر ممالک کے ساتھ تجارت کا جائزہ

غیر ممالک کے ساتھ بھارت کی جو تجارت ہوتی رہی ہے، اس میں بھارت مال برآمد کرنے کے بجائے زیادہ مال درآمد کرتا رہا ہے۔ لیکن اب اس صورت حال میں کافی فرق نمودار ہوا ہے، اور سنہ ۱۹۴۹ء میں سال گذشتہ یعنی سنہ ۱۹۴۸ء کی بہ نسبت ایک ارب ۴۲ کروڑ روپے کا مال زیادہ برآمد کیا گیا۔ اور اس طرح غیر ممالک کے ساتھ بھارت کا جو ناموافق تجارتی توازن چلا آ رہا تھا، اس میں کافی کمی واقع ہوئی ہے۔ اس بات کا انکشاف اس بلیٹن میں کیا گیا ہے جس میں سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء میں بھارت کے غیر ممالک کے ساتھ تجارت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور جو چند ماہ ہوئے بھارت کے اقتصادی مشیر نے شائع کیا ہے۔ اس بلیٹن سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء میں ناموافق تجارتی توازن ۲ ارب ۱۷ کروڑ ۴۴ لاکھ روپیہ کا تھا لیکن زیر جائزہ سال میں یہ صرف ۳۹ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے رہ گیا۔ اقتصادی مشیر نے بھارت کے تجارتی توازن میں بہتری کے تین اسباب بتائے ہیں۔ ایک درآمد پر پابندی، دوسرے خوراک کی درآمد میں کمی اور تیسرا روپے کی قیمت گھٹانے کے بعد تجارت برآمد میں اضافہ۔

روپے کی قیمت گھٹانے سے پہلے فی ماہ اوسطاً ۴۳ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کا مال باہر بھیجا جاتا تھا لیکن سکے کی قیمت کم کرنے کے بعد فی ماہ اوسطاً ۴۷ کروڑ ۸۶ لاکھ روپے کا مال باہر بھیجا گیا۔ اسی طرح تخفیف زر سے پہلے ۶۱ کروڑ ۵۴ لاکھ روپے کا مال درآمد کیا جاتا تھا لیکن تخفیف زر کے بعد صرف ۴۱ کروڑ ۸۵ لاکھ روپے کا مال فی ماہ درآمد کیا گیا۔

ڈالر دیشوں سے بھارت کی تجارت بہت بہتر ہو گئی اور ناموافق تجارتی توازن بالکل ختم کیا گیا۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں ڈالر دیشوں کے ساتھ بھارت کا ناموافق تجارتی توازن ۷۲ کروڑ ۳۰ لاکھ روپیہ تک رہا۔ لیکن سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء میں یہ فرق ۸۴ لاکھ روپے کا تھا۔ اقتصادی مشیر نے صورت حال کی اس بہتری کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اوّل تو ڈالر دیشوں سے درآمد پر پابندی لگائی گئی اور دوسرے روپے کی قیمت گھٹانے سے تجارت برآمد کی حوصلہ افزائی اور تجارت درآمد کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ روپے کی قیمت گھٹانے کے بعد خاص بات یہ ہوئی کہ ڈالر دیشوں سے جو ناموافق تجارتی توازن چلا آ رہا تھا وہ نومبر سنہ ۱۹۴۹ء سے بالکل ختم ہو گیا، اور اس کے برعکس تجارتی توازن موافق ہو گیا۔

اسی طرح کی بہتری اس تجارت میں بھی ہوئی جو بھارت مشکل الحصول سکے والے علاقوں اور سہل الحصول سکے والے علاقوں سے کرتا رہا۔ ذیل میں ان ممالک کے ساتھ پچھلے دو سال کے دوران میں بھارت کے ناموافق تجارتی توازن کی تفاصیل درج ہیں۔

	سنہ ۱۹۴۸ء	سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء
مشکل الحصول سکے والے علاقے	۲۶ کروڑ ۸ لاکھ روپیہ	۱۰ کروڑ ۸۲ لاکھ "
سہل الحصول سکے والے علاقے	ایک ارب ۹ کروڑ ۴۸ لاکھ "	۴۶ کروڑ ۴۵ لاکھ "

خوراک کی درآمد میں کمی

سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء میں جو تجارت بھارت نے بحری اور بری راستوں سے دوسرے ممالک سے کی اس کی مالیت ۱۱ ارب ۱۱ کروڑ ۹۶ لاکھ روپے تھی جبکہ سال گذشتہ اس کی مالیت ۱۱ ارب ۲۵ کروڑ ۸ لاکھ روپے تھی۔ تجارت درآمد کی مالیت ۶ ارب ۲ کروڑ ۷۵ لاکھ روپے تھی، اور تجارت برآمد اور ان اشیا کی برآمد کی مالیت جو دوسرے ممالک سے درآمد کر کے پھر برآمد کی گئیں، بالترتیب ۴ ارب ۹۶ کروڑ ۳۲ لاکھ اور ۱۳ کروڑ ۱۶ لاکھ روپے تھی۔

ذیل کے نقشے سے وہ خاص اشیاء اور ان کی قیمت ظاہر ہوتی ہے جو درآمد کی گئیں۔

خوراک جس میں اناج بھی شامل ہے	ایک ارب ۸۵ کروڑ ۲۷ لاکھ روپے
مشینیں وغیرہ	ایک ارب ۵ کروڑ ۵۲ لاکھ "
کپاس	۶۳ کروڑ ۸۳ لاکھ "
تیل	۵۹ کروڑ ۲۱ لاکھ "
دھاتیں اور خام دھاتیں	۳۱ کروڑ ۸۸ لاکھ "
موٹر گاڑیاں	۲۳ کروڑ ۶۴ لاکھ "
خام پٹ سن	۲۱ کروڑ ۱۷ لاکھ "
کپاس کا دھاگا اور مصنوعات	۱۸ کروڑ ۴۱ لاکھ "

ادویہ وغیرہ	۱۶ کروڑ ۴۴ لاکھ روپے
متفرق دھاگے اور سوتی دھاگے	۱۶ کروڑ ۲ لاکھ روپے
چھری کانٹے لوہے کا سامان وغیرہ	۱۵ کروڑ ۲۸ لاکھ روپے
بجلی کا سامان	۱۳ کروڑ ۲ لاکھ روپے
رنگ اور روغن	۱۱ کروڑ ۱۱ لاکھ روپے
پھل، میوہ اور سبزیاں	۹ کروڑ ۴۹ لاکھ روپے
کاغذ وغیرہ	۹ کروڑ ۱۷ لاکھ روپے

تجارت درآمد کے اعداد و شمار کے تجزیے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خام پٹ سن اور خوراک کی درآمد (جس میں دالیں اور آٹا بھی شامل ہیں) کی وجہ ہی سے ۱۹۴۸-۴۹ء کے مقابلے میں زیر جائزہ سال میں ۷۹ کروڑ روپے کی کمی واقع ہوئی۔ گذشتہ سال خام پٹ سن ۱۷ کروڑ ۲۵ لاکھ روپیہ کی مالیت کا، اور خوراک، دالیں اور آٹا ایک ارب ۴۳ کروڑ ۵۳ لاکھ روپیہ کی مالیت کا برآمد کیا گیا، جبکہ زیر جائزہ سال میں بھی اشیا بالترتیب ۲۱ کروڑ ۱۷ لاکھ اور ایک ارب ۸ کروڑ ۲۷ لاکھ روپیہ کی درآمد کی گئیں۔ اس کے برعکس مشینیں وغیرہ ایک ارب ۵ کروڑ ۲۵ لاکھ روپیہ کی برآمد کی گئیں، جبکہ ۱۹۴۸-۴۹ء میں یہ صرف ۴۲ کروڑ ۶۵ لاکھ روپیہ کی برآمد کی گئی تھیں۔

کپاس اور چائے کی برآمد میں اضافہ

زیر جائزہ سال میں گذشتہ سال کی بہ نسبت ۹۴ کروڑ ۱۸ لاکھ روپے کا زیادہ مال دوسرے ممالک کو بھیجا گیا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کپاس، سوتی اشیا، چائے، مسالہ جات، چمڑہ اور بیج کافی مقدار میں برآمد کئے گئے۔ کپاس اور سوتی اشیاء اس سال ۹۲ کروڑ ۸۶ لاکھ روپے کا برآمد کیا گیا۔ جبکہ گذشتہ سال صرف ۲۹ کروڑ ۹۳ لاکھ روپے کا باہر بھیجا گیا تھا۔ ۱۹۴۹-۵۰ء یعنی زیر جائزہ سال میں ۷۲ کروڑ ۵۳ لاکھ روپے کی چائے دوسرے ممالک کو بھیجی گئی، اور ۱۹۴۸-۴۹ء میں ۴۶ کروڑ ۲۳ لاکھ روپیہ کی چائے برآمد کی گئی۔ البتہ خام پٹ سن اور پٹ سن کی مصنوعات کی برآمد میں کمی ہوئی۔ ۱۹۴۸-۴۹ء میں ایک ارب ۲۷ کروڑ ۱۲ لاکھ روپے کی پٹ سن اور اس کی بنی ہوئی مصنوعات برآمد کی گئیں، جبکہ اس سال صرف ایک ارب ۴۳ کروڑ ۱۹ لاکھ روپے کی اشیاء دوسرے ممالک کو بھیجی گئیں۔ ذیل میں اُن خاص خاص اشیاء کا نقشہ درج ہے جو برآمد کی گئیں۔

خام پٹ سن اور مصنوعات	ایک ارب ۴۳ کروڑ ۱۹ لاکھ روپے
کپاس اور اس کی بنی ہوئی اشیا	۹۲ کروڑ ۸۶ لاکھ روپے
چائے	۷۲ " ۵۳ " "
مسالے	۱۹ " ۱۵ " "
چمڑہ	۱۸ " ۵۴ " "
بیج	۱۴ " ۹۷ " "
تمباکو	۱۴ " ۵۷ " "
تیل	۱۲ " ۸۳ " "

تجارت کا رجحان

برطانیہ نے حسب معمول بھارت کی سب سے زیادہ اشیا خریدیں اور سب سے زیادہ اشیا بھارت کو بھیجیں۔ اس کے بعد امریکہ اور پھر پاکستان کا نمبر آتا ہے۔ ذیل میں اعداد و شمار درج کئے جاتے ہیں۔

بھارت کی غیر ممالک سے تجارت

درآمد	۱۹۴۸-۴۹ء	۱۹۴۹-۵۰ء
برطانیہ	ایک ارب ۵۲ کروڑ ۴۳ لاکھ روپے	ایک ارب ۱۹ کروڑ ۳۲ لاکھ روپے
امریکہ	ایک " ۶ " ۳۶ " "	۸۶ " ۹۱ " "
پاکستان	ایک " ۷ " ۳۷ " "	۴۳ " ۹۳ " "

برآمد	۱۹۴۸-۴۹ء	۱۹۴۹-۵۰ء
برطانیہ	۹۷ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے	ایک ارب ۱۱ کروڑ ۴۲ لاکھ روپے
امریکہ	۷۰ " ۷ " "	۷۷ " ۶۰ " "
پاکستان	۴۷ " ۷۰ " "	۳۹ " ۷۷ " "

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ برطانیہ نے ۱۹۴۸-۴۹ء کی بہ نسبت ۱۹۴۹-۵۰ء میں بھارت سے زیادہ مال درآمد کیا، اور بھارت کو زیادہ مال برآمد کیا۔ پاکستان سے درآمد میں ۴۶ کروڑ روپے کی کمی ہوئی۔ اور بھارت سے جو مال پاکستان کو برآمد کیا گیا اس میں ۴۳ کروڑ روپے کی کمی ہوئی۔ ۱۹۴۹-۵۰ء میں خشکی کے راستہ پاکستان کو ۲۵ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے کا مال برآمد کیا گیا اور بحری راستے سے ۱۴ کروڑ ۳۹ لاکھ روپے کا مال بھیجا گیا۔

بھارت نے برطانیہ امریکہ اور پاکستان کے علاوہ مندرجہ ذیل ممالک کو بھی مال برآمد کیا۔ آسٹریلیا ۲۷ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے۔ لنکا ۱۵ کروڑ ۷۴ لاکھ روپے۔ برما ۱۳ کروڑ ۱۵ لاکھ روپے۔ ہانگ کانگ ۱۳ کروڑ ۲۱ لاکھ روپے۔ اور کنیڈا ۱۰ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے۔

بھارت میں شہری ہوابازی کی ترقی

بھارت میں ۳۱ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ۱۰ ہوائی جہاز کمپنیاں کام کرتی تھیں۔ ان کے ہوائی جہاز ایک طرف ۱۹۱۹۳ میل مسافت طے کرتے تھے۔ ہوائی جہازوں کی تعداد ۱۹۳ تھی، اور ان پر ۳۴۹ ہوا باز اور ۱۳۳ دیگر اشخاص پر مشتمل عملہ کام کرتا تھا۔ ان میں سے ۹ کمپنیاں لمیٹڈ تھیں اور ان کا منظور شدہ سرمایہ ۲۴ کروڑ ۱۴ لاکھ روپیہ تھا۔

جولائی سے دسمبر ۱۹۴۹ء کی مدت میں ان کمپنیوں کے ہوائی جہازوں نے ۸۹۳۱۱۷۷ میل مسافت طے کی جبکہ ۱۹۴۸ء کی دوسری ششماہی اور ۱۹۴۹ء کی پہلی ششماہی میں انہوں نے بالترتیب ۷۷۳۲۴۴۰ اور ۷۸۰۶۴۹۱ میل مسافت طے کی تھی۔ اس طرح پہلے کی نسبت مسافت میں ۱۴ اعشاریہ ۵ فیصدی اور ۴ اعشاریہ ۴ فی صدی اضافہ ہوا۔ اس دوران میں ۱۷۱۳۶۰ لوگوں نے ہوائی جہازوں سے سفر کیا، اور اس کے علاوہ ہوائی جہازوں نے ۵۳۱۴ ٹن مال (اس میں ۱۵۰۰ ٹن اخبار شامل نہیں ہیں) اور ۱۴۰۰ ٹن ڈاک ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائی۔ اس دوران میں گذشتہ ششماہی کی بہ نسبت ۸۷ فی صدی زیادہ مال اخبار اور ڈاک ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے گئے۔

زیر تبصرہ مدت میں اگرتلا گوہاٹی اور مدراس ترچناپلی مدورا کے راستوں پر بھارت ایرویز کمپنی اور دکن ایرویز کمپنی نے جہاز چلانے شروع کر دیئے تاہم دکن سروس بعد میں بند کر دی گئی۔ اس دوران میں ہمالین ایوی ایشن لمیٹڈ نے دہلی ناگپور مدراس اور بمبئی ناگپور کلکتہ کے راستوں پر رات کی ہوائی ڈاک کی سروس شروع کر دی۔ دالمیا جین ایر سروس کا لائسنس ختم ہونے کے بعد انڈین نیشنل ایرویز نے دہلی امرتسر جموں سری نگر کے راستے پر اپنی سروس شروع کر دی۔

ایسی ہوائی جہاز کمپنیوں کو جو باقاعدہ اپنی سروس چلاتی ہیں اجازت دی گئی کہ وہ فی مسافر فی میل ۳ سے ۴ آنے تک کرایہ وصول کر سکتی ہیں بشرطیکہ ایئر ٹرانسپورٹ لائسنسنگ بورڈ اس شرح کو منظور کرے۔ اسی طرح مال کا کرایہ بھی فی میل فی ٹن زیادہ سے زیادہ ۲ روپے بارہ آنے اور کم سے کم ۱۴ آنے فی ٹن فی میل مقرر کیا گیا۔ یکم اگست ۱۹۴۹ء سے فیصلہ کیا گیا کہ بھارت پاکستان اور بھارت برما کے راستوں پر ڈاک کے لئے صفر اعشاریہ ۴۵ پائیاں فی میل فی پونڈ شرح سے کرایہ لیا جائے۔

۱۹۴۳ء میں جو سمجھوتہ بھارت سرکار اور ٹاٹا سنز لمیٹڈ (جو اب ایئر انڈیا کہلاتی ہے) کے مابین کراچی کولمبو کی سروس کے متعلق ہوا تھا اس کی ۳۰ اگست ۱۹۴۹ء کو خاص طور پر ادائیگی کی بنیاد میں ترمیم کی گئی۔

ایئر انڈیا انٹرنیشنل لمیٹڈ سے جو سمجھوتہ ہوا تھا اس کے تحت بھارت سرکار نے اس کمپنی کو ۱۹ لاکھ ۹۷ ہزار روپیہ اس خسارے کی وجہ سے دیا جو کمپنی کو ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ عملے کی تربیت پر ۱۲ لاکھ ۷۰ ہزار روپے خرچ ہوئے لیکن صرف اس کا پانچواں حصہ یعنی ڈھائی لاکھ روپیہ ۱۹۴۸ء کے ۱۹ لاکھ ۹۷ ہزار خسارے میں شامل کیا گیا ہے۔ ۱۰ لاکھ کی باقی رقم چار سال میں ادا کی جائے گی یعنی اس طرح کمپنی کو ۳۲ لاکھ ۴۹ ہزار روپیہ کا خسارہ ہوا جس میں سے حکومت نے صرف ۱۹ لاکھ ۹۷ ہزار روپیہ ادا کیا۔

بھارت اور برطانیہ میں جو گفت و شنید سمجھوتے کے متعلق ہو رہی تھی وہ نئی دہلی میں ۳ جولائی ۱۹۴۹ء کو ختم ہوئی۔ حالانکہ سمجھوتے کی شرائط پر کافی حد تک سمجھوتہ ہوا تھا لیکن اس کو قطعی صورت بخشنا ممکن نہ ہوا۔ اس صورت کے پیش نظر فیصلہ کیا گیا کہ گفت و شنید ایک سال میں پھر شروع کی جائے اور فی الحال دونوں ممالک کی بعض سروسز کو عارضی طور پر کام کرنے کی اجازت دی جائے۔

بھارت اور جمہوریہ فلپائن کے مابین ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ہوائی سمجھوتے پر دستخط ہوئے۔ سویڈن ڈنمارک اور ناروے کی نمائندہ ہوائی جہاز کمپنیوں کو بھی

بھارت میں ہوائی سروس چلانے کی اجازت دی گئی

مانٹریل میں یکم نومبر ۱۹۴۹ء کو بین الاقوامی شہری ہوابازی کے ادارے کے اے، جی، اے ڈویژن کا جو چوتھا اجلاس ہوا، اس میں مسٹر ایم جی پردھان نے بھارت کی نمائندگی کی۔ مسٹر پردھان بین الاقوامی شہری ہوابازی کی کونسل میں بھارت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

دسمبر ۱۹۴۹ء کے آخر تک بھارت میں ۴۴۷ ہوائی جہاز رجسٹر کئے گئے جب کہ جون ۱۹۴۹ء کے آخر تک صرف ۶۳۷ ہوائی جہاز رجسٹر کئے گئے تھے ۲۴۴ جہازوں کو اس امر کے سرٹیفکیٹ حاصل تھے کہ وہ قابلِ پرواز ہیں۔ ان میں ۲۱۲ ایسے جہاز شامل تھے جن کے ایک سے زیادہ انجن تھے۔ ایسے جہازوں کی تعداد جون ۱۹۴۹ء کے آخر تک ۲۱۶ تھی۔ گراؤنڈ انجنیروں کی تعداد ۳۱ دسمبر ۱۹۴۹ء تک ۴۹۵ تھی۔ اس کے برعکس جون کے آخر تک ان کی تعداد صرف ۴۴۳ تھی۔ کمرشل پی لائسنس ہوابازوں کی تعداد ۳۲۶ سے ۳۵۶ ہوگئی۔ پرائیویٹ اے لائسنس ہوابازوں کی تعداد ۱۴۰۱ سے ۱۱۴۳ تک بڑھ گئی۔

محکمہ ہوابازی کے شعبہ تحقیق و ترقی نے ڈی سی بی قسم کے ہوائی جہازوں کے لئے مختلف حرارت ہوا کے مختلف دباؤ اور ہوا کی مختلف رفتار میں زمین پر اترنے اور پرواز کرنے کے لئے نقشے بنائے۔ ہوائی جہازوں کے اندر جو کپڑا وغیرہ استعمال ہوتا ہے ان کو مانع آتش بنانے کے لئے عارضی تفصیلات تیار کی گئی

زیرِ جائزہ مدت میں ہوابازی کے ایسے ۹ کلب کام کرتے تھے جن کو سرکار سے مدد ملتی ہے، اور ۳ کلب ایسے کام کرتے تھے جن کو سرکار سے مدد نہیں ملتی۔ پہلے زمرے کے کلبوں میں ۷۰۴۹۔۱۶ گھنٹے پرواز کی گئی جب کہ جون میں ختم ہونے والی ششماہی میں ۳۸۰۵۲ گھنٹے پرواز کی گئی تھی بھارت سرکار نے بمبئی کی انڈین گلائڈنگ ایسوسی ایشن کو ۲۴۰۰۰ روپیہ کی رقم بطور گرانٹ منظور کی اس کے علاوہ بھارت سرکار نے ۱۹۵۰ء کے لئے ایرو کلب آف انڈیا کے لئے ۲۵ ہزار روپیہ کی گرانٹ بھی منظور کر لی۔

الہ آباد کے فلائنگ اسکول میں ہوابازوں کو تربیت دینے والے اشخاص کو تربیت دی گئی۔ اس کے علاوہ اسی دوران میں ۱۲ ہوابازوں کو ۸ ہفتے کے لئے گراؤنڈ ٹریننگ دی گئی۔

سہارنپور کے مواصلاتی سکول میں ریڈیو کے کئی ماہروں اور اپریٹروں کو تربیت دی گئی۔ اس دوران میں تربیت دینے کے کئی ہوائی جہاز بھی منگوائے گئے۔ ہندوستان ایئرکرافٹ لمیٹڈ نے ۲۱ ٹائیگر مانع قسم کے ہوائی جہازوں کو مرمت کرکے ٹھیک کیا اور کینیڈا سے ۱۸ چپ منکس اور ٹائیگر مانع اور ۲۔ ایوروانسن منگائے گئے۔

زیرِ جائزہ مدت میں ۸۴ ہندوستانی ہوائی جہازوں اور دو غیر ملکی ہوائی جہازوں کو حادثے پیش آئے۔ اکثر حادثے معمولی تھے۔ صرف ۵ حادثوں میں ۵۔ اشخاص مارے گئے۔ سانتا کروز ہوائی اڈے کے قریب کے۔ایل۔ایم کے ایک ہوائی جہاز کو حادثہ پیش آیا۔ جس میں عملے کے ۱۱۔ اشخاص اور ۳۴ مسافر مارے گئے

رانچی کا اڈہ سول ایوایشن کے تحت کردیا گیا۔ اور اس طرح ایسے ہوائی اڈوں کی تعداد ۸۴ ہوگئی جو ہوابازی کے محکمہ کے تحت تھے۔

مدراس کلکتہ اور لکھنؤ کے ہوائی اڈوں میں ہوائی جہاز رکھنے کے شیڈ دہینگرز تعمیر کئے گئے۔ مالی مشکلات کی وجہ سے بمبئی مدراس دھلی اور پٹنہ کے ہوائی اڈوں میں رہائشی مکانات تعمیر نہیں کئے گئے احمد آباد ناگپور اور گوہاٹی میں رہائشی مکانات تعمیر کرنے کا کام زیرِ تکمیل ہے۔

۳۱ دسمبر ۱۹۴۹ء تک بھارت سرکار کے محکمہ ہوابازی کے تحت پیام رسانی کے ۶۳ مرکز تھے۔ اس کے علاوہ ۳ مرکز ہوائی جہاز کمپنیوں اور ۴ ریاستوں کے زیر انتظام کام کر رہے تھے۔

جنوب مشرقی ایشیا کی علاقائی نیویگیشن کی میٹنگ کے سفارشات کے مطابق یکم نومبر ۱۹۴۹ء سے موسم کے متعلق علاقہ وار پیشین گوئی نشر کی جانے لگی۔ اس کے علاوہ رات کو پرواز کرنے والے ہوائی جہازوں اور دیگر جہازوں کے لئے جدید قسم کے سائنسی تجربات کو عمل میں لایا گیا۔

نئی کتابیں

مُسدّسِ بے نظیر میر یار علی جان صاحب لکھنوی کی اس تصنیف کو جو ان کے دیوان میں شامل نہیں جناب محمد علی خان اثر رام پوری نے اپنے ایک طویل اور مبسوط مقالے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ یہ مسدس باغِ بے نظیر کے میلے کے متعلق لکھا گیا تھا اور اس کا ایک نسخہ نواب خلد آشیاں کے حضور میں پیش کرنے کو تیار کیا گیا تھا۔ یہ نسخہ کتاب خانۂ رام پور میں آج تک محفوظ ہے۔ اثر صاحب نے اس مسدس کے اسی مستند نسخے کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر جان صاحب کی کاوش اور میلۂ بے نظیر کی یاد دونوں کو زندہ کر دیا ہے۔

باغِ بے نظیر کے میلے کے نام سے تو آج اکثر لوگ آشنا ہوں گے لیکن اس میلے کی تفاصیل جاننے والے شاید انگلیوں پر گنے جا سکیں اور ان انگلیوں پر گنے جانے والوں کی تعداد بھی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ اگر حضرت اثر رامپوری محنتِ شاقہ سے کام لے کر اس موضوع پر روشنی نہ ڈالتے تو اس میلے کے حالات بدستور پردۂ خفا میں رہتے اور اردو ادب کا ایک بے بہا ذخیرہ ہماری بے التفاتی کی نذر ہو جاتا۔

حضرت اثر نے مسدس وغیرہ کی شخصیتوں کے حالات کی تحقیق و جستجو میں کافی محنت صرف کی ہے اور کسی ایک بیان کو اُس وقت تک اعتبار کا درجہ نہیں دیا جب تک کہ دوسرے معتبر بیانات یا تحریروں نے اس کی تصدیق و تائید نہ کر دی ہو۔ اثر صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے میر یار علی جان صاحب کے اس مسدس کو پہلی بار مطبوعہ صورت میں دُنیائے اُردو کے سامنے پیش کیا ہے اور اس کے ساتھ ایک سو تیس صفحات کا مقالہ پیش کر کے اس کی افادیت میں مستقل اضافہ کر دیا ہے۔

کتاب اسٹیٹ پریس رام پور میں چھپی ہے قیمت دو روپے چار آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ جناب اثر رام پوری خسرو باغ رام پور اسٹیٹ یو پی (ح ن ۱۰)

جرس وامق جونپوری کی نظموں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ سے تین روپے آٹھ آنے میں یہ کتاب مل سکتی ہے۔

اکمل عرشی

پیش لفظ سید احتشام حسین نے لکھا ہے۔ وامق نوجوان شعرا میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اس مجموعے میں رومانی نظمیں بھی ملیں گی لیکن آہستہ آہستہ ان کی شاعری شعور کی نئی منزلوں میں داخل ہو رہی ہے۔ وامق اس نظام کو پسند کرتے ہیں جس کی بنیاد عوام پر ہو۔ اس احساس کی جھلک آپ کو اس کتاب میں جا بجا ملے گی۔ دورِ حاضر سے متاثر ہو کر جو لوگ سمجھ بوجھ کر شعر کہتے ہیں وامق کو اُن میں ایک اچھی جگہ حاصل ہے۔ اردو شاعری سے ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ (ع۔م)

دستک ملنے کا پتہ:۔ نقوش جالندھر۔ قیمت دو روپے
نریش کمار شاد اردو ادب کے اُفق پر ایک اُبھرتا ہوا ستارہ ہے۔ دستک میں شاد کی ۳۵ نظمیں اور غزلیں شائع ہوئی ہیں جو کے متنوع عنوانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاد کا مطالعۂ حیات گہرا ہے۔ (ع۔م)

اشتراکیت روس کی تجربہ گاہیں مرتبہ اصغر علی عابدی۔ قیمت تین روپے۔
ناشر مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدر آباد دکن۔
اس کتاب میں جو روس کے متعلق مختلف مضامین کا مجموعہ ہے مؤلف نے روسی زندگی کے متعلق متعدد پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ روس کا اخلاقی سیاسی، علمی و ادبی، شہری، جنسی اور معاشرتی حالات کا سیر حاصل تجزیہ کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ روسی زندگی کا غیر جانبدارانہ طور پر مطالعہ کیا جائے۔ کتاب [illegible] کے قریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ (ع ل ۱۰)

جمہوریت اور مغربی تحریکیں۔ قیمت تین روپے۔ ناشر مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدر آباد دکن۔ یہ کتاب چیکوسلواکیہ کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر بینیس کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر بینیس ایک صحیح الخیال جمہوریت پسند اور چیکوسلواک سوشلسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ آپ کو یہ کتاب سیاسی دنیا میں ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے، عربی زبان میں اس کا ترجمہ جناب حسن صاحب مصری (نائب سفیر لبنان برائے استنبول) نے کیا تھا اور اردو میں عبدالوہاب ظہوری پروفیسر نظامیہ طبی کالج حیدر آباد دکن نے۔ اس کتاب کا شستہ اور رواں ترجمہ پیش کر کے اردو کی سیاسی کتابوں میں ایک قابلِ قدر کتاب کا اضافہ کیا ہے۔ (س۔ ع۔ ۱۰)

رفتارِ زمانہ

بھارت کے وزیر خوراک شری کے ایم منشی نے لکھنؤ میں کسانوں سے اپیل کی کہ وہ فی ایکڑ پیداوار بڑھانے اور اس طرح ملک میں خوراک کی دس فیصدی کمی کو دُور کرنے کے لئے پورے زور سے کوشش کریں۔ اس موقعے پر شری منشی نے زیادہ اناج پیدا کرنے والے کسانوں کو انعام بھی دئے۔ کسانوں کے مابین پیداوار بڑھانے کے مقابلے کا ذکر کرتے ہوئے شری منشی نے یو۔پی حکومت کی کوششوں کو سراہا۔ اس مقابلے میں زیادہ سے زیادہ گیہوں کی فصل فی ایکڑ ۵۸ من، آلو ۶۸۷ من، اور گنا ۱۹۰۰ من رہی۔ صوبے کی اوسط پیداوار گیہوں فی ایکڑ ۱۰ من، آلو ۲۵۰ من اور گنا ۴۵۰ من ہے۔

ناسک میں آل انڈیا کانگرس کی سبجیکٹس کمیٹی کے اجلاس میں بھارت کی خارجہ پالیسی کے متعلق قرارداد پر بحث کا جواب دیتے ہوئے پنڈت نہرو نے یہ اعلان کیا کہ بھارت بڑی بڑی طاقتوں کی جتھے بندیوں سے اپنے آپ کو الگ رکھے گا۔ اور ہر معاملے کی غیر جانبدارانہ نقطہ نظر سے جانچ کر کے اس کے متعلق فیصلہ کرے گا۔ آپ نے یہ بھی اپیل کی کہ کمیونسٹ چین کے نمائندے کو متحدہ اقوام کی کونسل میں جگہ دی جائے کیونکہ چین کی ساری سرزمین پر انہیں کا اقتدار ہے۔ دیش کی خارجہ پالیسی کے متعلق ریزولیوشن اتر پردیش کے پردھان منتری شری گووند بلبھ پنت نے پیش کیا اور اس ریزولیوشن پر جتنی بھی ترمیمیں پیش کی گئیں وہ یا تو واپس لے لی گئیں یا رد ہو گئیں۔

دہلی کی تمام ٹریڈ ایسوسی ایشنوں کے متحدہ چیمبر کی طرف سے پیش کئے ہوئے سپاس نامے کے جواب میں راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے جنتا سے بالعموم اور بیوپاریوں سے بالخصوص اپیل کی کہ وہ دیش سے بلیک مارکیٹ، چور بازاری و دیگر برائیوں کو دور کرنے کے لئے ایک عام آرگنائزیشن منظم کریں۔ آپ نے کہا کہ عوام کو منافع خوروں کے خلاف جہاد کرنے کے لئے کمربستہ ہو جانا چاہئے اور یہ بات ہمیشہ کے لئے بھول جانی چاہئے کہ صرف سرکاری احکام سے منافع خوری اور چور بازاری ختم کی جا سکتی ہے۔ راشٹرپتی نے حاضرین سے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ آج آپ بلیک مارکیٹ کو ختم کرنے کے لئے وہ جوش و سرگرمی نہیں دکھا رہے جو آپ نے جنگ آزادی کے وقت کانگرس کی پکار پر غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کے لئے دکھائی تھی۔ آج دیش کے لئے قربانی اور تیاگ کی وہ ذہنیت کیوں پس پشت ڈال دی گئی ہے۔ آج آپ کیوں منافع خوروں کی کمر توڑنے کے لئے سرکار کا پورا ساتھ نہیں دیتے۔ آپ نے فرمایا کہ آپ کو محسوس کرنا ہوگا کہ یہ بلیک مارکیٹ کرنے والے صحیح معنوں میں ملک کے دشمن ہیں اور ملک میں جو تکالیف اور مصیبتیں پیدا ہوتی ہیں ان کا واحد باعث یہی لوگ ہیں اس لئے آپ کو اپنے اندر ایسے اشخاص کو کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کرنا چاہئے۔

آسام کی پہاڑیاں اور قہر الٰہی۔ آسام ایک پہاڑی علاقہ ہے جس کی سرحد پر گھیرد پہاڑیاں ہیں۔ درمیانی حصہ میں کھاسی اور جنتیا پہاڑیاں اور پورب کی جانب ناقابل گزر پہاڑیوں کا وہ لمبا سلسلہ ہے جو برما اور بھارت کی سرحد کہلاتا ہے۔ اور جنہیں بھارت کے مختلف مشہور سرحدی قبیلوں کے نام پر ٹیگو۔ ناگا۔ لوشائی اور چن پہاڑیاں کہا جاتا ہے یہ پہاڑیاں دو ہزار سے دس ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ اور ایک دوسرے کے متوازی چلی گئی ہیں۔ ان کے درمیان میں بہت گہری وادیاں ہیں ایک سے دوسری وادی میں آمد و رفت نہایت مشکل ہونے کی وجہ سے وہاں بسنے والے قبیلوں کی بولی اور رسم و رواج ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ آسام کی سب پہاڑیاں سرسبز اور گھنے جنگلات سے ہمیشہ ڈھکی رہتی ہیں۔ دنیا بھر کی سب سے زیادہ بارش اس علاقہ میں ہوتی ہے جنگل دس دس فٹ لمبی گھاس سے اٹے رہتے ہیں۔ اس لئے شیر، چیتا، اژدہا اور جنگلی جانور بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں لوگوں کا اہم ذریعہ معاش کاشتکاری ہے اور بارش کی بہتات کی وجہ سے یہاں دلدل پیدا کرنے والوں کو اپنے کھیتوں سے فالتو پانی نکالنے کا انتظام کرنے میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں

چائے اور پٹ سن

پہلے پہل ۱۸۲۳ء میں یہ دریافت کیا گیا تھا کہ آسام میں دیسی چائے کے خودرو جنگلی پودے بڑی کثرت میں اُگتے ہیں لیکن آج چائے اس ریاست کی سب سے بڑی صنعت ہے اور آسام کو دنیا کا چائے کا باغ کہا جاتا ہے۔ ملک کے بٹوارے سے پہلے چائے اور پٹ سن بھارت کی سب سے بڑی برآمد تھی۔ آج بھی بلاشبہ یہی دونوں چیزیں سب سے زیادہ غیر ملکی سکہ پیدا کرنے والی اشیا ہیں۔ آسام میں چائے کے قریباً چار ہزار کھیت ہیں۔ جن میں ایک لاکھ مزدور کام کرتے ہیں۔ ہر سال قریباً چالیس کروڑ پونڈ چائے پیدا ہوتی ہے۔ چائے کے قریباً ایک ہزار کھیت ضلع لکھیم پور میں ہیں۔ جن کو ۱۵ اگست کے زلزلوں نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ بٹوارے کے بعد آسام کو بھارت کے سب سے زیادہ پٹ سن پیدا کرنے والے علاقے کی حیثیت سے بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس ریاست میں اس وقت کئی لاکھ ٹن پٹ سن پیدا ہوتی ہے۔

آسام کے بیچوں بیچ دریائے برہم پتر گذرتا ہے۔ اور اس ریاست میں سکونت اور زراعت کے قابل بہترین علاقہ وادیٔ برہم پتر ہی ہے، سبانسری، دیہانگ اور سیانگ آسام کے دریا برہم پتر ہی کے معاون ہیں۔ ان دریاؤں کے دونوں کناروں پر بیش قیمت عمارتی لکڑی پیدا ہوتی ہے۔ حال کے بھونچال نے عمارتی لکڑی کی کافی بڑی مقدار دریائے برہم پتر میں بہا دی ہے۔

آسام کے شمال مغربی حصے میں ڈگبوئی میں تیل کے چشمے دریافت کئے گئے تھے۔ یہ چشمے سات کروڑ گیلن پٹرولیم پیدا کرتے ہیں۔

آسام کی پہاڑیوں میں رہنے والے قبیلوں میں سے ناگا لوگ بہت مشہور ہیں۔ ان کے رسم و رواج، پوشاک اور ان کے عجیب و غریب ناچ بہت دلچسپ ہیں۔ منی پوری ناچ بھی جسے شری ادے شنکر نے سارے بھارت میں مشہور کر دیا ہے۔ اس وطن کا مشہور ناچ ہے۔

آسام میں بھونچال سے بے پناہ تباہی

خوبصورتی اور دولت سے مالامال بھارت کی ریاست آسام میں ۱۵ اگست کو خوفناک بھونچال کی صورت میں جو قہر نازل ہوا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ خدائی قہر کی لرزہ خیز اطلاعات ابھی تک زلزلہ زدہ علاقوں سے موصول ہو رہی ہیں کئی مقامات پر پہاڑیوں کا کل سلسلہ بھونچال سے ناپید ہو گیا۔ اور بہت سی پہاڑیاں بیش قیمت جنگلات سے قطعاً محروم ہو گئی ہیں۔ زمین پھٹ جانے سے زیر کاشت اراضی کے وسیع خطے تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔ کئی دیہات میں غلے کے ذخیرے زمین میں غرق ہو گئے۔ ڈبروگڑھ کے قریب ریلوے لائنیں بل کھا گئی ہیں اور کئی جگہ ٹوٹ کر زمین سے اکھڑ گئی ہیں۔ زمین پھٹنے سے بہت سی سڑکیں قطعی ناقابل گذر بن گئی ہیں۔ سعدیہ، شمالی لکھیم پور اور کئی دیگر مقامات پر ہزاروں مکان مسمار ہو گئے ہیں۔

اسی پر بس نہیں۔ زلزلے کے فوراً بعد دریائے دیہانگ کا نچلا حصہ بالکل سوکھنا شروع ہو گیا کیونکہ بالائی حصے میں پہاڑوں کے بڑے بڑے تودے گر پڑنے سے دریا کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ تین دن بعد دریا کا رکا ہوا پانی سیلاب بن کر بہہ نکلا جس سے ڈبروگڑھ کے قصبے کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ ایسی ہی حالت باقی تمام دریاؤں اور ندیوں کی ہوئی اور ہر طرف زلزلے کی تباہی کے ساتھ ساتھ سیلاب کے پانی نے مزید بربادی اور تباہی پھیلا دی۔ دریائے برہم پتر کا پانی اس قدر گدلا ہو گیا کہ تمام مچھلیاں مر گئیں۔ اندیشہ ہے کہ ایسی وادیوں میں جہاں عام حالات میں بھی انسان کا گذر مشکل سے ہوتا تھا تمام قبائل بالکل نابود ہو گئے ہیں۔

آسام میں بھونچال سے اس قدر ہیبت ناک تباہی اور بربادی ہوئی ہے کہ ابھی تک اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکا۔ اس لئے لازم ہے کہ اس مصیبت زدہ علاقے کو ریلیف اور امداد بہم پہنچانے کا کام بھی بہت بڑے وسیع پیمانے پر منظم کیا جائے۔ دوسرے علاقوں کے لوگوں کو جو اس خوفناک قہر سے محفوظ رہے ہیں بڑی فیاضی سے امداد پیش کرنی چاہئے کیونکہ ایسے موقع پر لوگوں کی لاپرواہی یا کوتاہی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قدرت کے ستم زدہ آسامی لوگ خوفناک قحط اور وباؤں کا شکار ہو جائیں گے۔ ہمارے راشٹرپتی، پردھان منتری، آسام کے گورنر اور دیگر سرکردہ اصحاب نے امداد کے لئے پُر درد اپیلیں کی ہیں۔ ان پر عمل کرنا قوم کا فرض ہے۔ توقع ہے کہ ان کی یہ صدا رائیگاں نہیں جائے گی۔

جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے اور ان کی صنعتی و اقتصادی ترقی کے لئے کامن ویلتھ ممالک کی مشاورتی کونسل کا اجلاس لندن میں منعقد ہو رہا ہے۔ یاد رہے کہ اس کونسل کا اجلاس پچھلے دنوں کولمبو میں ہوا تھا۔ بھارت کے وزیر مالیات شری سی۔ ڈی دیش مکھ بھی پیرس میں بین الاقوامی مانیٹری فنڈ کی صدارت کرنے کے بعد کونسل کے اجلاس میں شامل ہوں گے۔ سرکاری طور پر شری پی سی پٹناچاریہ جائنٹ سکریٹری وزارت مالیات بھارت کی نمائندگی کریں گے

اداں کے ساتھ ریزرو بنک آف انڈیا کے شری نارائن پرشاد بھی جائیں گے۔

آسٹریلیا میں مقیم پاکستان کے سفیر مسٹر یوسف ہارون نے کشمیر کے بارے میں ایک گمراہ کن بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ کشمیر کی وجہ سے ہی پاکستان کوریا میں اپنی فوج نہیں بھیج سکتا۔ بھارت کے ایک سیاسی ترجمان نے اس بیان کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ خود پاکستان نے ہی قبائلیوں سے کشمیر پر چڑھائی کروا کر حملہ آور کا پارٹ ادا کیا۔ اور اب بھی وہ آزادانہ استصواب رائے کرانے میں رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنی ماتحت اور نام نہاد آزاد کشمیر افواج کو توڑنے اور ان کو مقبوضہ کشمیر سے ہٹانے سے صاف انکار کر دیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کشمیر کے مسئلے کا خاطر خواہ تصفیہ کرنا نہیں چاہتا۔ ترجمان نے مزید کہا کہ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے وہ کسی ملک پر حملہ کرنے کا شروع ہی سے مخالف ہے۔ اس نے کوریا میں حملے کے خلاف متحدہ اقوام کی اسمبلی کا ساتھ دیا ہے۔ اور اس کی یہ کوشش ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے جنگ کی آگ زیادہ نہ بھڑکے۔ اور اگر پاکستان واقعی کوریا میں اپنی فوجیں بھیجنے کا خواہشمند ہے تو اس کے راستے میں بھارت کوئی رکاوٹ نہیں۔

بھارت میں کمیونسٹ چین کے سفیر جنرل یوان چنگ سین اپنے سٹاف کے ہمراہ ہندوستان پہنچ گئے ہیں۔

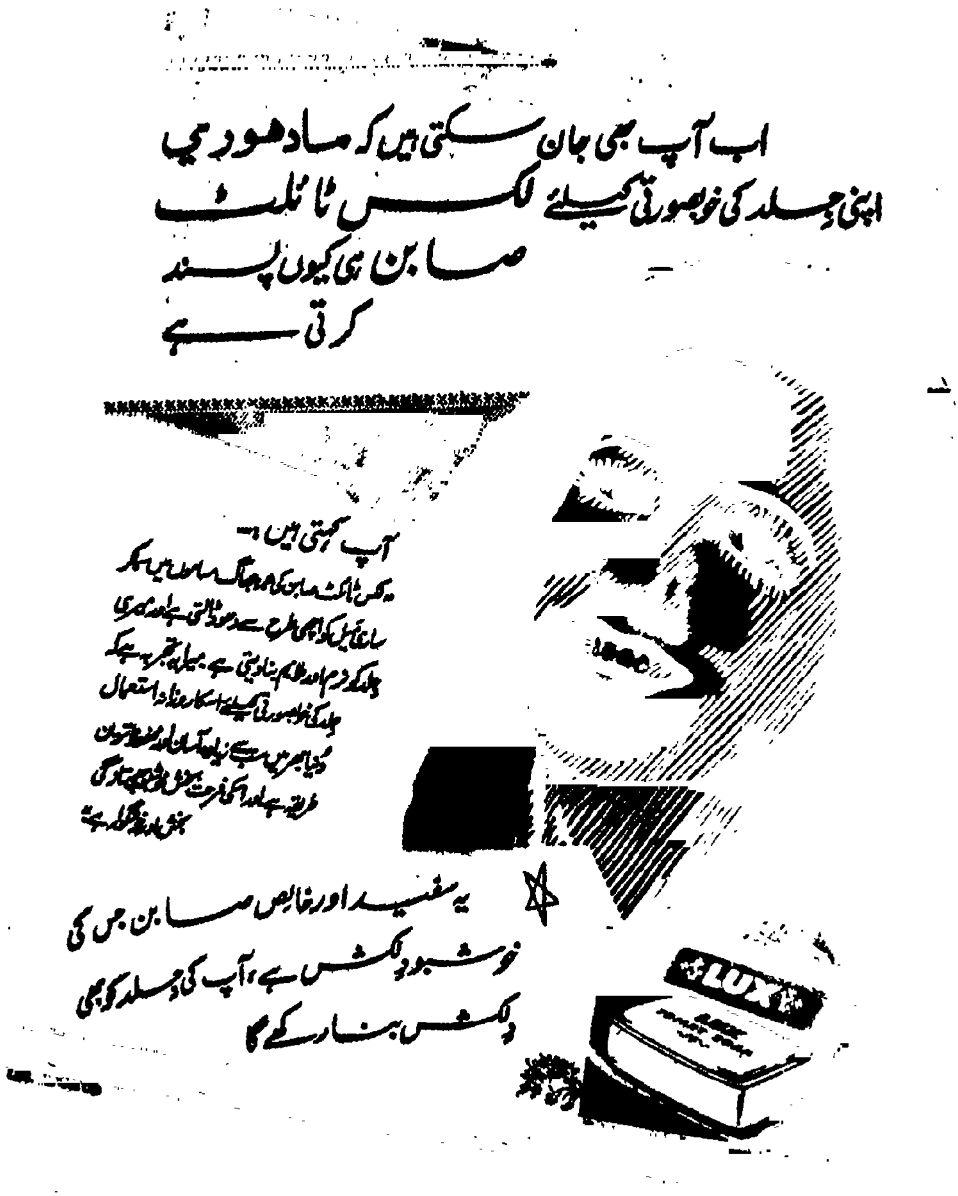
بھارت سرکار نے یہودیوں کی حکومت اسرائیل کو باقاعدہ طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ واضح رہے کہ ہندوستان سے پہلے دنیا کے دیگر ممالک کے علاوہ ترکی اور ایران بھی اس حکومت کو تسلیم کر چکے ہیں۔ اور اسرائیل متحدہ اقوام کی اسمبلی کا ممبر بھی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حکومت مصر نے بھارت سرکار سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اسرائیل کی حکومت کو تسلیم نہ کیا جائے۔ لیکن بھارت سرکار نے پورے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ جب ہر صورت سے اسرائیل کی حکومت قائم ہو چکی ہے اور اس کی ہستی اتنے ممالک تسلیم کر چکے ہیں تو ایک مسلمہ حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ اس سے بھارت اور مصر کے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس سے قبل بھی یو این او میں کئی مسائل پر بھارت اور مصر میں اختلاف رہا ہے لیکن اس سے دونوں ملکوں کی دوستی میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔

بھارت کے لوگوں کے لئے یہ فخر کا مقام ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد تھوڑی مدت میں ہی بھارت کا وقار دنیا کی نظروں میں تیزی کے ساتھ بڑھ گیا ہے اور یہ صاف طور پر عیاں ہو رہا ہے کہ قابلیت کے لحاظ سے ہندوستان کسی ترقی یافتہ مغربی ملک سے کم نہیں۔ غیر ممالک بھی ہندوستانیوں کی قابلیت کا اعتراف کر رہے ہیں چنانچہ اکثر بین الاقوامی کانفرنسوں کی صدارت ہندوستانیوں کے سپرد کی جاتی ہے۔ پچھلے دنوں جنیوا میں لیبر کانفرنس کی صدارت شری جگجیون رام لیبر منسٹر بھارت سرکار اور لندن میں ہیلتھ کانفرنس کی صدارت راجکماری امرت کور وزیر صحت بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے چکی ہیں۔ پیرس میں بین الاقوامی مانیٹری فنڈ اور بین الاقوامی بنک کے مشترکہ اجلاس کی صدارت شری سی۔ ڈی دیشمکھ وزیر مالیات ہند سرکار نے کی ہے۔ شری دیشمکھ اقتصادیات کے خاص ماہر ہیں اور دنیا بھر کے اقتصادی حلقوں میں ان کی قابلیت کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کانفرنس میں آپ نے جو صدارتی تقریر کی اس کی دنیا کے اقتصادی حلقوں میں تعریف کی جا رہی ہے۔

بین الاقوامی مانیٹری فنڈ اور بین الاقوامی بنک دونوں اس غرض کے پیش نظر قائم کئے گئے کہ مختلف ممالک کی غیر ملکی تجارت کو بڑھایا جائے اور ان کی اقتصادی ترقی کے لئے کوشش کی جائے۔ اس کی بنیاد جولائی ۱۹۴۴ء میں رکھی گئی تھی۔ اور دنیا بھر کے ۴۴ ممالک کے نمائندوں نے اس غرض کے لئے منعقد کئے گئے اجلاس میں شرکت کی تھی جن میں امریکہ۔ برطانیہ۔ روس۔ فرانس۔ چین، بھارت اور کینیڈا کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس اجلاس میں ہی یہ فیصلہ ہوا تھا کہ مختلف ممالک کی اقتصادی ترقی کے لئے یہ دو ادارے قائم کئے جائیں۔ تمام ممالک ان دونوں فنڈ میں روپیہ جمع کرتے ہیں اور اس روپے سے ضرورتمند ممالک کی امداد کی جاتی ہے۔

ایک اور اہم مسئلہ جس کے متعلق بین الاقوامی مانیٹری فنڈ کے اجلاسوں میں غور کیا جاتا ہے وہ مختلف ممالک کے سکوں کی قیمت کے متعلق ہے۔ قواعد کے مطابق ہر ملک کو فنڈ کا باقاعدہ ممبر بننے کے بعد سونے کے بین الاقوامی معیار کے مطابق اپنے سکے کی قیمت بتانی پڑتی ہے اور جو ملک فنڈ کے ممبر ہوں انہیں اپنی قیمتوں میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے سے پہلے مانیٹری فنڈ سے منظوری حاصل کرنی پڑتی ہے۔

جس وقت بھارت نے دیگر سٹرلنگ ممالک کے ساتھ اپنے سکے کی قیمت کم کی اس وقت پاکستان نے اپنے سکے کی قیمت برقرار رکھی لیکن پاکستان اس وقت بین الاقوامی مانیٹری فنڈ کا ممبر نہیں تھا۔ اب ۱۱ جولائی ۱۹۵۰ء سے وہ مانیٹری فنڈ کا ممبر بن گیا ہے اس لئے اپنے سکے کی قیمت کے متعلق اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مانیٹری فنڈ سے منظوری حاصل کرے۔ مانیٹری فنڈ کے موجودہ اجلاس میں پاکستانی سکے کی قیمت کے متعلق جو فیصلہ ہونا تھا وہ فی الحال ملتوی ہو گیا ہے


اب آپ بھی جان سکتی ہیں کہ سادھو دیپ
اپنی جلد کی خوبصورتی کیلئے لکس ٹائلٹ
صابن ہی کیوں پسند
کرتی ہے
آپ کہتی ہیں :-
یہ سفید اور خالص صابن جس کی
خوشبو دلکش ہے، آپ کی جلد کو بھی
دلکش بنا سکے گا
LUX

چندو کی دلیری



دی ٹاٹا آئل ملز کمپنی لمیٹڈ



گھڑی کی کہانی گھڑی کی زبانی

آغا صادق

سوئٹزرلینڈ میں پیدا ہوئی ہوں
یہاں پھرتی پھراتی آگئی ہوں
ذرا دیکھو تو کیسی دل نشیں ہوں
حسیں ہوں دلربا ہوں نازنیں ہوں
مرے ہاتھوں[1] سے ہوتے ہیں اشارے
جدا ہو کر بھی مل جاتے ہیں پیارے
مجھے لمحہ شماری سے رہا کام
نہیں لیتی کبھی آرام کا نام!
اگر ہے تو یہی ہے میری راحت
کسی نازک کلائی کی ہوں زینت
تعلق وقت سے گہرا ہے میرا
چراغ عمر پر پہرا ہے میرا
میں اسرار الٰہی کھولتی ہوں
ترازو ہوں میں عمریں تولتی ہوں
کلائی پر مجھے جو ہیں لگاتے
وہی ہیں وقت غفلت میں گنواتے
ہوں دانا کے لئے درس بصیرت[2]
مگر ناداں کو شانِ امارت[3]!

۱- سوئیاں، ۲- دانائی کا سبق، ۳- امیری۔

محمد امین

ساتواں برّاعظم

ایٹم بم - دنیا کی آب و ہوا

"بھیا' بھیا' ارے ذرا کتاب سے نظر ہٹا لیجئے نا !!"

"اونھ ! کیا ہے' بھئی تم پڑھتے وقت کرے میں نہ آیا کرو"۔

"اچھا اچھا بھیا آیندہ نہیں آئیں گے لیکن اب تو ایک بات بتا دیجئے"۔ "پوچھو نا بھئی' پوچھتے کیوں نہیں"؟

ارے ارے آپ تو کچھ خفا سے معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھئے بھیا اب تک تو ہم یہی پڑھتے آئے تھے نا کہ براعظم کل چھ ہیں لیکن ماسٹر صاحب کل کہتے تھے ایک براعظم اور ہے ساتواں براعظم۔ اس کا پتہ ابھی چلا ہے مگر وہ ابھی کچھ بتا نہیں پائے تھے کہ گھنٹی بج گئی تو بھیا یہ ساتواں براعظم کون سا ہے؟

سوال - تم نے اچھا کیا۔ لو سنو! آج کل دنیا میں ایٹم بم کا کتنا چرچا ہے۔ ہر شخص پر اس کا بھوت سوار ہے۔ اس خوفناک ایجاد نے لوگوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ روس اور امریکہ تو اس کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں۔ سنتے ہیں روس میں ایٹم بم بنانے کا مسالہ —— یورینیم دھات بہت افراط سے ہے مگر امریکہ میں نایاب ہے۔ کناڈا میں یہ تھوڑی بہت نکلتی ہے اور سب کی سب امریکہ کے ایٹم بم بنانے والے کارخانوں میں پھونک دی جاتی ہے۔ امریکہ بے چارا بہت پریشان ہے۔ کناڈا میں یہ دھات ختم ہو گئی تو پھر کیا ہوگا! اسی لیئے تو ادھر ادھر کے ملکوں میں یورینیم کی تلاش جاری ہے"۔



"تو کیا بھیا ساتواں براعظم ایٹم بم یا یورینیم دھات ہے؟"

ٹھیک ہے۔ شاید آپ اس وقت کتاب میں انہیں دونوں کا حال پڑھ رہے ہوں گے"۔

"آپ تو بالکل ہی بے وقوف معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں بیچ میں سے بات کاٹا کرتے ہیں۔ ذرا صبر سے سنتے رہو' اچھا لو میں قصہ مختصر کرتا ہوں۔ دائرۂ قطب جنوبی کا حال تو تمہیں کچھ معلوم ہوگا۔ جرمن' انگریز' سویڈش' نارویجین سیاحوں نے اس علاقے کا بار بار سفر کیا ہے۔ اس علاقے کا حال معلوم کرنے کے شوق میں یہ بھی تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ سردی وہاں کیسی غضب کی پڑتی ہے۔ سال کے نو مہینے برف

کی ایک موٹی تہہ زمین پر جمی رہتی ہے ۔ بس تین مہینے کچھ گرمی پڑتی ہے گرمی کیا بس یہ سمجھو کہ تھوڑی بہت برف پگھل پگھل کر ادھر ادھر بہنے لگتی ہے ۔ سیاحوں نے اس علاقے کا سفر اسی گرم موسم میں کیا ہے" ۔

" بار بار کے تجربوں اور تحقیق کے بعد ان سیاحوں نے ایک نئی بات معلوم کی ہے :۔ برف کے نیچے پانی کا سمندر نہیں زمین ہے" ۔

جنوری فروری میں جب وہاں برف پگھلنے لگتی ہے تو اس کے نیچے پانی تو ملتا ہے لیکن اس کی گہرائی بہت معمولی ہے پہلے یہ علاقہ بحر منجمد جنوبی کہلاتا تھا ۔ جاہوا جنوبی یا دکنی سمندر لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ سمندر و مندر کچھ نہیں ۔ بس زمین ہے" ۔

یہ بات معلوم کر کے سیاحوں میں تحقیق کا شوق اور بڑھا اور وہ نئی نئی باتیں معلوم کرنے کی دھن میں لگ گئے ۔ اس علاقے کے نقشے بنائے اور قدرتی خزانوں کی کھوج میں دن رات ایک کر دیا ۔

اب اس علاقے کا نام انہوں نے براعظم انٹارکٹکا رکھ دیا ہے ۔ اور صاحب یہی وہ ساتواں براعظم ہے جس کا تمہارے ماسٹر صاحب بس ذکر کر کے رہ گئے تھے" ۔

"واہ واہ ! یہ بات تھی !! مگر بھر بھیا ' ایٹم بم کیا ہوا" تو بھئی سائنس دانوں اور سیاحوں کو اپنی تلاش اور تحقیق کے سلسلے میں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں ۔ یہ بھی پتہ چلا کہ یورینیم دھات کا خزانہ بھی اسی زمین میں دفن ہے" ۔

" اب سوال اسے زمین سے نکالنے کا ہے ۔ بہت ہی ٹیڑھا سوال ۔ بھلا ہر موسم میں تو یہاں برف جمی رہتی ہے زمین کیسے کھودی جائے" ۔

ایک ترکیب امریکہ والوں کی سمجھ میں آئی ۔ دو چار ایٹم بم اس علاقے انٹارکٹکا پر گرا دئے جائیں ساری برف ورف ہوا بن جائے گی ' اچھی خاصی زمین نکل آئے گی ۔ پھر ایک یورینیم کیا بہت سی قیمتی دھاتوں کے لئے کھدائی شروع ہو جائے گی ۔

امریکہ والوں کے پاس ایٹم بم کی کیا کمی ہے وہ فوراً اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئے مگر سائنس دانوں نے کچھ سوچ سمجھ کر یہ کام کھٹائی میں ڈال دیا ۔ انہوں نے بتایا کہ اس تجربے میں بڑا خطرہ ہے بہت بڑا خطرہ ۔

"خطرہ ' بھلا خطرہ کیا ہوتا ۔ یہ سائنس دان بھی عجیب لوگ ہیں" !

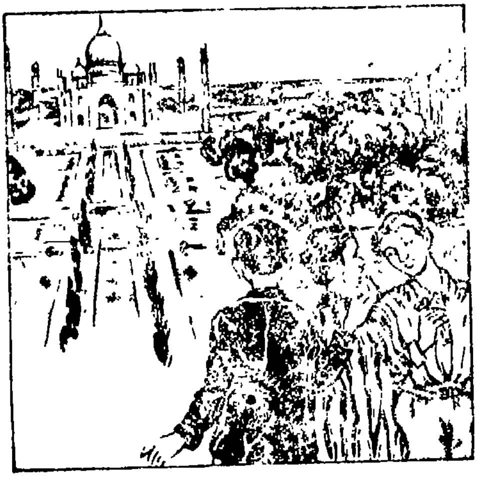
" اجی جناب خطرہ ہی خطرہ ۔ ذرا غور سے سنئیے اور سمجھ سے کام لیجئے ۔ سائنس دان کہتے ہیں دائرہ قطب جنوبی پر ایٹم بم گرانے سے کہیں وہاں کی آب و ہوا میں خلفشار نہ مچ جائے ۔ ایٹم بم کی گرمی سے یہاں کی آب و ہوا گرم ہو جائے گی یہ تو جانی بوجھی بات ہے کہ ہر خطے کی آب و ہوا کا اثر دوسرے خطے کی آب و ہوا پر پڑتا ہے اسی لئے قطب جنوبی اور انٹارکٹکا کی آب و ہوا بدلے گی تو ساری دنیا کی آب و ہوا درہم برہم ہو جائے گی اور بہت ممکن ہے کہ اس وقت جہاں گرمی ہو وہاں سردی پڑنے لگے اور جہاں سردی ہو وہاں گرمی شروع ہو جائے گی ۔

"بس اس خطرے کے مارے امریکہ نے اس تجربے میں ڈھیل کر دی ہے ۔ پر ایک نہ ایک دن یہ تجربہ ہوگا ضرور ۔ ایک تو تحقیق کا شوق دوسرے یورینیم کا لالچ ۔ کیا سمجھے" !

سونے کا گلاس

خورشید ظفر

جون ۲۰۰۴ء میں چھٹیاں گذارنے کے لئے تفریحی مقام ہم سب نے آگرے کو قرار دیا۔ چنانچہ ۲ رجون کو ہم لوگ اپنے ماموں کے یہاں پہنچے۔ سفر کی تکان کے خیال سے یہ دن آرام کے لئے وقف کیا گیا۔ سیر و تفریح کا پروگرام مرتب کرنے کے لئے صبح کی چائے کی میز طے پائی۔ کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کرکے ہم لوگ شب خوابی کے لئے اپنے اپنے پلنگوں پر چلے گئے۔ جو زیادہ تھکے ہوئے تھے فوراً غنیں ہو گئے۔ ہم سب بچے کچھ دیر اودھم مچا کر نیند کے سمندر میں یہ کہہ کر غوطہ لگا گئے کہ اب صبح بھائی صاحب سے طے کریں گے کہاں کہاں چلنا ہے۔



صبح کی سفیدی اپنی پوری دلفریبیوں کے ساتھ نمودار ہو رہی تھی۔ ہم میں سے دو ایک کو تو رات بھر چین کی نیند نہ آئی تھی۔ منہ اندھیرے سے پلنگ پر پڑے جاگ رہے تھے۔ کوشش تھی کہ کسی طرح سب جاگ جائیں۔ گر خدا بھلا کرے ان ابّا ماؤں کا جو نیند کو ہی سب کچھ سمجھ رہے تھے۔ جہاں ہم لوگوں کی آواز نکلی اور ایک زناٹے کی ڈانٹ پڑی۔ "ابھی سوؤ" سب سو رہے ہیں بکھتوں کو نیند بھی تو نہیں آتی۔ اس وقت دل چاہتا کہ جلدی سے آسمان چیر کر سورج ان سب کے سروں پر چمکا دیں۔ ہمیں تو جلدی تھی اپنا پروگرام بنانے کی اور ان کو پڑی تھی سونے کی۔ کیا بے موقع نیند کا شوق چرآیا تھا۔ دعائیں مانگنا شروع کیں۔ اے خدا جلدی دن نکلے۔ کافی سمجھدار ہوتے ہوئے اس وقت دل کی کیفیت اور ذہن کا عالم پانچ سال کے بچے سے زیادہ نہ تھا۔ اللہ اللہ کرکے دن نکلا۔ گھر کی ملازمہ نے باورچی خانہ کھولا۔ ہم سب زندہ ہو گئے ہر ایک نے دوسرے کو پلنگ سے گرگٹ کی طرح سر اٹھا کر دیکھا اور اشارہ کیا کہ کھڑے ہو جاؤ جوانو! چنانچہ تھوڑے ہی وقفے کے بعد ہم سب اٹینشن ہوئے کھڑے تھے۔ جلدی جلدی حاجات سے فارغ ہو کر رات کے کپڑے تبدیل کیے۔ آج ہر ایک اپنے فرض کو نہایت خوش اسلوبی سے بغیر بزرگوں کے تقاضے کے ادا کر رہا تھا۔ چھوٹے بہن بھائیوں کو ماں کے کہے بغیر بلکہ اُٹھنے سے پہلے طیار کر لیا تاکہ چائے کے وقت کوئی ایسا کام باقی نہ رہے جو پروگرام مرتب ہوتے وقت میز سے جدا کرنے کا باعث بنے۔

ہم سب تو طیار تھے۔ مگر آج خلاف معمول جلدی چائے کیوں ملتی۔ اور اگر دیر بھی ہو جاتی تو بغیر بزرگوں کے اُٹھے چائے کیونکر مل سکتی

ہ۔ آج دل چاہ رہا تھا کہ ان سب سونے والوں کی چارپائی اسی طرح
ٹ کر دیں جیسے اتوار کو دیر سے اُٹھنے پر آئندہ اتوار کے لئے الٹی میٹم
م کو ملتا ہے۔ مگر بھلا ہمیں یہ اختیارات کون دیتا۔ ہمارے کرتا
ھرتا ماموں زاد بھائی بہت دور علیحدہ کمپاؤنڈ میں سو رہے تھے
ن کو جگانا بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنا تھا۔ غرضکہ ہم سب بندگی
ہ چارگی کے مسئلے کو اس وقت صحیح مان رہے تھے۔

بہت دیر تک ہم لوگ لاوارثوں کی طرح اِدھر اُدھر مارے
مارے پھرتے رہے۔ آخرکار یہ خبر ملنا نصیب ہوئی کہ چائے کی میز تیار
ہے اور ہم لوگوں کو طلب کیا گیا ہے۔ چھلانگیں مارتے ہوئے کمرے
میں پہنچے۔ بزرگوں کا عالم یہ ہے کہ ہمارے پہنچتے پہنچتے چائے کا دور
شروع ہو چکا تھا۔ پوری میز اور اس کے چاروں طرف بچھی ہوئی
کرسیوں کا طواف نظروں سے کیا۔ مگر بھائی صاحب نظر نہ آئے



عجیب الجھن کہ معاملہ کیا ہے۔ ہم میں سے کوئی بولا کہ بھائی صاحب
کو تو بلاؤ۔ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ والد

صاحب کی گرجدار آواز نے حواس ٹھکانے لگا دیئے۔ ارشاد ہوا "تم
چائے سے فارغ ہو۔ شیر تسلیم خم ہے جو مزاج باپ میں آئے"۔ لگے چائے
پینے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سب چائے پی چکے اور محترم بھائی صاحب جمع عذر
واحد غائب والا مضمون میز پر پیش کر چکے تھے۔ اب رفتہ رفتہ بزرگان
اولاد اِدھر اُدھر ہو چکے تھے۔ لہٰذا ہم سب بہن بھائیوں نے ایک
مظلوم وفد کی شکل اختیار کی اور ڈرتے ڈرتے اُن کی مچھردانی اُلٹ
دی۔ ایک نے ہمت کر کے ہلکے سے آواز دی۔ خلاف امید وہ جلدی
سے اُٹھ بیٹھے اور فوراً منہ دھو کر چائے کی میز پر آ پہنچے۔ اُن کے اُٹھنے سے
ہم لوگ اس قدر خوش ہوئے کہ کسی نے یہ پوچھنے کی ضرورت ہی
محسوس نہ کی کہ سر پر پٹی کیسی بندھی ہے۔ قریب قریب آدھا
ناشتہ ہو چکا تھا تو میں نے پوچھا۔ "بھائی صاحب سر میں پٹی کیوں
باندھ رکھی ہے۔ وہ بولے۔ "ارے کچھ نہ پوچھو۔ کل تو ایک عجیب
ہی واقعہ ہوا"۔ ہم سب ہمہ تن گوش ہو کر بولے۔ "للہ بتا دیجئے جلدی
سے کیا ہوا"۔ کہنے لگے "کل تو عجیب چیز دیکھی"۔ "سچ ہم نے تو کیمیا گل
کر لی۔ ان کی یہ باتیں اس وقت ذرا نہیں بھا رہی تھیں۔ بہرحال
ان کو ناراض کرنا بھی منظور نہ تھا لہٰذا درخواست کی گئی کہ جلدی سے
اصل بات بتا دیں۔ ہم سب کو جلدی تھی کہ یہ بات ختم ہو تو سیر تفریح
کا ذکر نکلے۔ بہ ہزار دقت انھوں نے سنانا شروع کیا کہ "میں اور
میرا دوست ناصر کل ہاکی کھیلنے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک سپیرا
ملا جو کسی چیز کی تلاش میں تھا۔ ہم دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے
آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ تاج محل کے اندر پہنچ کر ایک
سیڑھی پر چڑھ گیا۔ ہم دونوں بھی پہنچے۔ وہاں دیکھا تو ایک تیز روشنی
تھی جس پر اس نے ایک ڈبہ ڈھک کر اس پر بھاری سی کوئی چیز رکھ
دی۔ بہت دیر تک اس ڈبے سے کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز آتی رہی
پھر جو سپیرے نے روشنی کی تو ایک سانپ مرا پڑا تھا۔ ہم دونوں سخت

پریشان کہ معاملہ کیا ہے۔ آخر بڑے وعدوں اور خوشامد کے بعد سپیرے نے بتایا کہ وہ روشنی اس سانپ کا من تھا۔ جو اب اس نے حاصل کرلیا ہے اور اس سے ہر چیز کو سونا بنا سکتا ہے۔ اس وعدے پر کہ ہم کسی سے نہ کہیں گے اس نے ناصر کے تہ ہونے والے گلاس کو سونے کا بنا دیا۔

اب تک ہم میں سے ہر ایک اس قصّے کو نہایت انہماک اور تعجب سے سُن رہا تھا مگر سونے کا گلاس طیّار ہوتے ہی سب چونک پڑے۔ اور یک زبان ہو کر بولے۔ "وہ گلاس دکھایئے ورنہ ہم یقین نہیں کریں گے"۔ بھائی صاحب بولے۔ بخدا جھوٹ نہیں۔ اگر غلط کہتا ہوں تو میری آنکھیں پھوٹیں۔ قسم خدا کی۔ یہ سب واقعہ میری نظروں کا دیکھا ہوا ہے۔ مسلمان کی قسم کا اعتبار کرنا چاہیئے۔ چنانچہ پھر ان کی روداد سُننے لگے۔ وہ بولے۔ میں نے تاج محل سے نکل کر ناصر سے کہا کہ دیکھو اس گلاس میں آدھا حصّہ میرا ہے۔ یہ سُنتے ہی ناصر میاں نے تو نیلی پیلی آنکھیں نکالنا شروع کیں۔ جب میں نے ان کی نیت خراب دیکھی تو گلاس چھیننا چاہا۔ مگر اس نے جلدی سے گلاس جیب میں رکھا اور قبل اس کے کہ میں اپنی کچھ حفاظت کروں بھرپور ہاکی کا وار میرے سر پر کیا۔ اتنی شدید چوٹ سے میری چیخ نکل گئی۔ اتنا کہہ کر بھائی صاحب کچھ دیر خاموش سر پکڑ کر بیٹھے رہے۔

اب تو ہم سب کی عجیب حالت ہو چکی تھی۔ سارے تفریح اور خوشیوں کے محل مسمار ہو گئے۔ اب کیا ہوگا۔ یہ تو بہت بُرا ہوا ہم سب ایک دوسرے کو سوالیہ نشان بنے دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں بھائی صاحب نے نگاہ اوپر اٹھائی اور بولے اس دردناک چیخ سے خود میری آنکھ کھُل گئی۔ دیکھا تو میں پلنگ پر تھا۔ البتہ سر میں بہت درد تھا چنانچہ سرہانے رکھا ہوا رومال باندھ لیا۔ یہ جملہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا اور ہم سب کچھ دیر تک اس سے لُطف اندوز ہوتے رہے۔

ریچھ کا ناچ

وجے موہن



ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ کرتا آیا
بھالو والا بھالو لایا
بیٹھے ہیں سب گھیرا ڈالے
خوش ہیں سارے لڑکے بالے
سُنتے ہیں بھالو کا گانا
ٹُھمک ٹُھمک کر ناچ دکھانا
گھُمر گھُمر کر چرخہ کاتا
بابُو بن کر اوڑھا چھاتا
مُردا بن کر چِت ہو جانا
کسرت کرنا کھیل دکھانا
لٹھ رکھ کر کندھے پر چلنا
پیسہ پیسہ لے کر ٹلنا
کِتنا سیانا یہ بھالو ہے
سب ریچھوں کا یہ خالو ہے

من موہن لال کپور

احسان مند طوطا

پرانے زمانے کی بات ہے۔ ایک راجہ تھا جس کی سلطنت بہت وسیع تھی۔ اس کی ایک رانی تھی جس کا نام چندا تھا۔ وہ بہت خوبصورت اور عقل مند تھی۔ راجہ بھی اُسے بہت چاہتا تھا۔ ایک دفعہ رانی کی سالگرہ پر راجہ نے اُسے بہت قیمتی ہار دیا جس پر لاکھوں روپے لاگت آئی۔ سالگرہ کے کچھ دن بعد وہ ہار چور چرا کر لے گئے۔ اس چوری کا راجہ اور رانی دونوں کو بہت غم تھا۔ انھوں نے دوسرے دن دربار منعقد کیا جس میں یہ اعلان کیا، جو آدمی اُس ہار کو لا کر دے گا اُس کو دس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ اس خبر کو سنتے ہی کئی لوگوں نے اُن چوروں کو پکڑنے کی ٹھان لی۔



لوگ گروہوں میں بٹ کر اُن کو پکڑنے کے لئے چل دیئے۔ محل سے کچھ دُور فاصلے پر ایک گاؤں تھا۔ اس میں ایک بڑھیا اور بوڑھا رہتے تھے۔ اُن کا ایک لڑکا تھا جس کی عمر بارہ سال تھی، بوڑھا اور بڑھیا بہت کمزور ہو گئے تھے، اس لئے وہ کما نہیں سکتے تھے۔ اُن کا لڑکا پاس کے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا، اور بیچ دیتا۔ اس طرح وہ اپنے ماں باپ کا اور اپنا پیٹ پالتا۔ ایک دن وہ لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ اُس نے کچھ فاصلے پر چند آدمیوں کی آواز سُنی۔ یہ لوگ وہی چور تھے جنھوں نے وہ ہار چرایا تھا، وہ آپس میں یوں باتیں کر رہے تھے۔

پہلا چور۔ اس ہار کو یہاں ہی دبا کر دوسری چوری کرنی چاہیئے۔

دوسرا چور۔ نہیں اس کو ساتھ لے چلتے ہیں، اگر کسی کو پتہ چل گیا تو وہ اسے لے جائے گا۔

تیسرا چور۔ نہیں اس کو اس درخت کے نیچے دبا دیتے ہیں۔

پہلے دو چوروں کو یہ صلاح پسند آئی اور انھوں نے اس کو دبانے کا فیصلہ کیا۔ تینوں نے اُس درخت کے نیچے گڑھا کھودا۔ جب ہار کو اُس میں دبانے لگے تو ایک نے کہا "دیکھو یہاں پر کوئی دیکھ تو نہیں رہا" دوسرے چور نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر دیکھا، اور کہا "کوئی نہیں" وہاں پر ایک طوطا بیٹھا تھا جس نے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ چور نے طوطے کو بھی ختم کرنے کی نیت سے اُس پر بندوق چلا دی۔ گولی اُس کے جسم پر تو نہیں لگی، لیکن پروں پر لگی، اور کچھ پر جھڑ گئے۔ وہ تھوڑی دُور اُڑا، اور اُس لڑکے کے پاس گیا، جو لکڑیاں باندھ رہا تھا۔ لڑکے نے طوطے کو اُٹھایا، اور اُس کی مرہم پٹی کرنے

کے لیے گاؤں کی طرف بھاگا۔

چور چوری کرنے کے لئے چلے گئے، اُنھوں نے کئی چوریاں کیں، اور تمام مال اُس گڑھے میں ڈال دیا۔

طوطے کو چند دن کے بعد آرام آگیا اور نئے پر بھی نکل آئے۔ ایک دفعہ جب وہ لڑکا طوطے کی پٹی کراکر واپس گھر کو آرہا تھا، تو



اُس نے ایک آدمی کو ڈھنڈورا دیتے ہوئے سُنا۔ وہ کہہ رہا تھا "بھائیو، آپ کو یہ تو پتہ ہوگا کہ ہمارے راجہ کی رانی کا ہار چور چرا کر لے گئے، آج راجہ نے پھر اعلان کیا ہے "جو آدمی اُس کو لاکر دے گا، اُس کو دس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا"۔

وہ اِس کو سُن کر گھر کو چل دیا، اور اُس نے وہ واقعہ اپنے ماں باپ کو سُنایا۔ جب وہ سنا چکا تو طوطے نے کہا "میرے آقا میں اُس جگہ کو جانتا ہوں جہاں وہ ہار دبا پڑا ہے۔ ہم کل شام کو اُس جگہ چلیں گے اور یہ گڑھا کھود کر ہار لے آئیں گے۔ دوسرے دن شام کو وہ لڑکا اور طوطا اُس جگہ کُدال لے کر گئے۔ جب وہاں پہنچے تو اُنھوں نے گڑھا کھودنا شروع کیا۔ کچھ دیر کے بعد اُنھوں نے اس گڑھے میں ایک گاگر دیکھی۔ جب اُسے نکال کر دیکھا اُس میں بہت سے روپئے تھے اور ہار بھی تھا۔

دوسرے دن صبح ہی وہ لڑکا اور طوطا راجہ کے محل میں حاضر ہو گئے۔ پہلے تو سپاہیوں نے بہت روکا۔ لیکن راجہ کا حکم ملتے ہی اُنھوں نے اُنھیں اندر جانے دیا۔ راجہ نے اُن کے آنے کا سبب پوچھا تو اُنھوں نے کہا "مہاراج آپ رانی صاحبہ کو بلائیں ہم اُن کے لئے تحفہ لائے ہیں"۔ جب رانی آئی تو اُنھوں نے اُس کو کھویا ہوا ہار پیش کیا۔ ہار کو دیکھتے ہی رانی کا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ اور اُس نے لڑکے کو شاباش دی، اور دس ہزار روپیہ انعام دیا۔ انعام دینے کے بعد اُنھوں نے لڑکے سے پوچھا کہ تمھیں اس ہار کا کیسے پتہ چلا؟ لڑکے نے طوطے کا قصہ بیان کیا تو رانی نے طوطے کو بھی انعام میں سونے کی مالا دی، جو لڑکے نے طوطے کے گلے میں ڈال دی۔ اب لڑکے کے پاس دس ہزار روپیہ تھا۔ وہ امیر بن گیا۔ ہار ملنے کی خوشی میں راجہ نے غریبوں کے لئے ایک لنگر کھولا، جہاں بہت سے غریب آدمیوں کو مفت کھانا کھلایا گیا۔ غریبوں نے بھی لڑکے کو بہت دعائیں دیں، اُس کے ماں باپ کو جب معلوم ہوا کہ اُن کے بیٹے کو دس ہزار روپئے انعام میں ملے ہیں تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔





Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi

Regd. No. D.—21


آج کل
دسمبر ۱۹۵۰ء
آٹھ آ


LET THE ROSE BLOO
عورت کا حسن اس کا سب سے بڑا کمال ہے۔ اسے مرجھانے سے بچائیے چہرہ کو کیل اور چھائیوں اور جسم کو خارش سے ہمنا نہ بنائیے۔ صافی کے استعمال سے خون کو صاف رکھیے شفاف خون کو رخساروں پر چھلکنے دیجیے۔ اور وقت کی جھریوں کو چند سال اور روک رکھیے
صافی
نہ صرف خون کو صاف کرکے چہرہ کو داغوں سے پاک اور سرخ و سفید بناتی ہے۔ بلکہ معدہ کو قوت دے کر شفاف خون پیدا کرتی ہے۔ اعضا میں چستی اور بدن میں رعنائی پیدا کرتی ہے۔
ہر جگہ بکتی ہے
قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ
ہمدرد دواخانہ۔ وقف۔ دہلی
Hamdard

اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل
دہلی

ایڈیٹر — جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹرز — عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۹ — نمبر ۵
سالانہ چندہ — چھ روپے
فی پرچہ — آٹھ آنے

دسمبر ۱۹۵۰ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

سیّد آصف علی

دانۂ سپند

یہ نظم ہز ایکسیلنسی سیّد آصف علی گورنر اڑیسہ کی تصنیفِ لطیف ہے۔ ادارہ اس عطیّے کے لئے موصوف کا شکر گزار ہے

(۱)

جگر میں میرے آگ تھی بہارِ بیقرار کی
مری نگہ میں تنگ تھی زمین مرغزار کی
شرابِ اُبل رہی تھی دل کے شیشہ سے شرار کی
ازل کے خوابِ حُسن کی نمود کے خمار کی
رہی دل میں تاب جب ابد کے انتظار کی
میں بزمِ آتشیں میں گرچہ دانۂ سپند تھا
جہانِ آرزو میں شعلہ سے بھی سربلند تھا

(۲)

فلک کے لاکھ دَور تھے خزاں کا ایک سرورق
مدام روز و شب وہی وہی الم وہی قلق
وہی ہمیشہ بے بسی، وہی سکوت کا سبق
رگِ نمودِ برق کی تھی میرے سینہ میں رمق
مرے گلِ سپید کی نظر میں تھا گلِ شفق
میں بزمِ آتشیں میں گرچہ دانۂ سپند تھا
جہانِ آرزو میں شعلہ سے بھی سربلند تھا

(۳)

جگر کے گوشہ گوشہ میں صدائیں بے قرار تھیں
رگوں کے ریشہ ریشہ میں اُمیدیں بے شمار تھیں
نگاہیں شوقِ دید سے حریفِ روزگار تھیں
مدام ابرِ شوق سے اُمنگیں مشکبار تھیں
نگاہیں اوجِ عرش پر فتیلۂ شرار تھیں
میں بزمِ آتشیں میں گرچہ دانۂ سپند تھا
جہانِ آرزو میں شعلہ سے بھی سربلند تھا

(۴)

جو دانۂ سپند بھی رِدا میں تنگ تھا
جو شعلۂ فراق عرضِ آرزو کا ننگ تھا
وہ شوقِ بے قرار صبر سے جو مثلِ سنگ تھا
وہ غنچۂ بہار ضبط سے جو ننگِ رنگ تھا
وہ ایک جستِ آخری میں بہدفِ خدنگ تھا
میں بزمِ آتشیں میں گرچہ دانۂ سپند تھا
جہانِ آرزو میں شعلہ سے بھی سربلند تھا

(مرقومہ ۹ فروری [illegible] قلعۂ احمد نگر)

قاضی عبدالغفار

ابلیس کے دیوتا

لافانی مگر بے روزگار دیوتا جب "ابلیس" کی چوٹیوں پر آ بیٹھتے ہیں تو وہ اپنے گذرے ہوئے زمانے کو کس قدر یاد کرتے ہیں! اب انھیں کام تو کچھ باقی نہیں رہا اور فرصت ہی فرصت ہے اس لئے وہ گذرے ہوئے زمانوں کی باتوں سے دل بہلاتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ گذری ہوئی صدیوں میں کیا شان تھی اور کیا دبدبہ تھا ان کا۔ بھوکے ان سے روٹی مانگنے آتے تھے۔ دولت مند اور بھی زیادہ دولت مانگتے تھے۔ بادشاہ فتح مانگتے تھے۔ حسین عورتیں اپنے حسن کی عمر بڑھوانے آتی تھیں ۔۔۔ اور آج؟ آج کچھ بھی نہیں سوائے اس کے کہ دنیا والوں کی قدیم تاریخوں میں کہیں کہیں ان کے نام لکھے ہوئے ہیں یا کوئی شاعر یا ادیب ان کو یاد کر لیتا ہے۔ اب نہ ان کی چوکھٹ پر کوئی پیشانی جھکتی ہے۔ نہ ان کے عتاب سے کوئی ڈرتا ہے۔ اور نہ ان کے الطاف و کرم کا کوئی امیدوار ہے۔ "ابلیس" کی چوٹیاں سونی پڑی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ یہ بیچارے دیوتا لافانی ہیں ۔۔۔ مر بھی نہیں سکتے۔

تھکا ہوا اور بوڑھا دیوتا "زی اس" اپنے ساتھیوں کے گھیرے میں خاموش اور سر جھکائے بیٹھا ہے۔ امرت اور موہن بھوگ کے خالی پیالے اس کے سامنے رکھے ہیں۔ ایک طرف ایک پرانا بربط پڑا ہوا ہے جس کے تار ٹوٹے ہوئے ہیں اور نغمے گم ہیں۔

"لعنت ہو ان انسانوں پر۔" وہ کہتا ہے۔ (لیکن اس کی آواز میں اب وہ کڑک نہیں ہے) "ہم نے ان کو نعمتیں عطا کیں۔ ان کے سجدوں اور ان کی دعاؤں کو قبول کیا۔ ہم نے انھیں اتنی بڑی دنیا دی کہ وہ اس میں بسیں۔ لیکن ان ناشکروں نے سب سے پہلے ہم ہی کو نظر انداز کیا۔ انھوں نے ہمارے بجائے اپنے دماغوں کی تاریک پرچھائیوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ پرچھائیاں بغض اور حسد کی، حرص اور ہوس کی۔ اب بتاؤ اے ساتھیو، ہم اس "ابلیس" کی بلندی پر بیٹھے ہوئے کیا کریں؟"

بھوری آنکھوں والی دیوی "اتھینا" جو کچھ اونگھ سی رہی تھی آخری سوال پر جاگ پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خوفناک بجلی چمکی۔ اس نے اپنے سینے کو تانا جس پر اس کے پستان فولاد کی طرح سخت تھے۔ اس لئے اس نے کبھی کسی بچے کو دودھ نہیں پلایا تھا۔ اس نے کہا "بابو "زی اس" اور سدا زندہ رہنے والے دیوتاؤ! اس انسان کی قسمت میرے حوالے کر دو۔ مجھے اس سے ناشکر گذاری کا انتقام لینے دو۔ میرے حسن سے زیادہ اسے کوئی چیز دھوکہ نہیں دے سکتی۔ میں پھر اسے ایک دفعہ "ابلیس" کی گھاٹیوں میں لاؤں گی۔ پہلے میں اس کے غرور ہی سے اسے برباد کروں گی۔ یہاں تک کہ وہ خود دیوتا ہونے کا دعویٰ کرے اور اپنی ہستی کو وہ "ابلیس" بنا لینا چاہے۔ پھر وہ ایک دفعہ اپنے اس غرور کی بلندی سے گرے۔ تب میں اسے اپنے آغوش میں لے لوں گی۔ میں اس کے گندے دل کو دھو ڈالوں گی تاکہ وہ حق سے محبت اور باطل سے نفرت کرنا سیکھے۔ پھر جو تھوڑا بہت علم اس کے حصے کا ہے وہ میں اسے دوں گی۔ اس کا دل ایک چھوٹا سا اور کمزور صدف ہے۔ دیوتاؤں کے سمندر اس میں نہیں سما سکتے۔ ان سمندروں کا ایک پیالہ بھر پانی بھی اس کے دماغ میں نشہ کی ترنگ پیدا کر دیتا ہے۔ یعنی وہ ایک چلو کو بھی سمندر سمجھنے لگتا ہے۔ پھر وہ اس چلو میں اپنی انانیت کا غرور ملا کر جھاگ پیدا کرتا ہے۔ وہ جھاگ جب پیالے میں نہیں سماتے تو ابل پڑتے ہیں۔ وہ اس کی کم ظرفی کا اعلان کرتے ہیں مگر اسے خبر نہیں ہوتی۔ بابا! میں اس کے پیالے کو تو بڑا نہیں کر سکتی، لیکن اس میں بقدر ظرف ایک بے قرار طلب کی موجیں پیدا کر سکتی ہوں۔ ان موجوں میں ایمان کے موتی پیدا ہوں گے ۔۔ وہ ایمان جو ہم جنسوں کے گناہوں کو بھی برداشت کر لیتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور دیوتاؤں کا گروہ سب ایک ساتھ بولنے

لگا۔ ہر دیوتا چاہتا تھا کہ پہلے وہ بولے۔ لیکن سنہری زہرو "اتھینا" کے قدموں پر گر گئی۔ اُس نے کہا، دیوی! میں تجھے انسانوں کی بستی میں جانے نہ دوں گی۔ اس بستی میں آگ لگی ہوئی ہے۔ تیرے خوبصورت بال جل جائیں گے۔ تیری پلکیں جھلس جائیں گی۔ تیری آنکھیں پھوٹ جائیں گی۔ انسان اس قابل نہیں ہے کہ تو اس کے لئے "المپس" کا لافانی سکون چھوڑے۔ اس کی ہر عورت اب "المپس" کی دیویوں کا نام حقارت سے لیتی ہے۔ "المپس" کے بوڑھے دیوتاؤں کی آبرو کو تو وہاں جا کر برباد نہ کر۔

"زی اس" جوان سب باتوں کو سن رہا تھا۔ خاموش تھا۔ اس نے "ایتھینا" کا سر اپنے کاندھے پر جھکا لیا، پھر وہ سوچتا رہا اور کچھ دیر بعد اس نے کہا:۔

"بیٹی! صرف یہی کافی نہیں کہ تیری آنکھوں کی روشنی انسانوں کے دلوں میں حق و باطل کا احساس پیدا کر دے۔ اور وہ اپنی ہی بے قرار تمنا کی آگ میں جلنے لگیں۔ ہاں تو محبت کا تخم بکھیرے گی۔ اور مادر گیتی کا رحم اُس تخم سے بھر جائے گا۔ خشک جنگل ہرے اور سوکھے پتے ترو تازہ ہو جائیں گے۔ سوکھے دریاؤں میں پانی آ جائے گا۔ اور تپتے ہوئے ریگستانوں میں ٹھنڈے پانی کے دریا بہنے لگیں گے زندگی انگڑائی لے گی ـــــ پر یہ سب بھی کافی نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ انسانوں نے دیوتاؤں کا جلال اور قہر تو چرا لیا لیکن وہ ان کا گیان گیہ نہ پا سکے! وہ سمجھے کہ عقل اور دانائی کا ایک "المپس" بنا کر وہ خود دیوتا بن بیٹھیں گے۔ اس میں کچھ بھلا بھی نہ تھا۔ پر وہ خسارے کو نفع سمجھے۔ وہ جوان کی فطرت میں حسن اعلیٰ سے ایک لگاؤ تھا اُس کے بندھن انھوں نے علم اور سائنس کی قینچیوں سے کاٹ ڈالے۔ اب وہ تیرے حسن کو بھی نہیں پہچان سکتے۔ اُن کے پاس وہ نظر ہی نہیں۔ وہ عرفان ہی نہیں!" "باپو نے سچ کہا"۔ سب دیوتا چلا اُٹھے۔ لیکن اتھینا نہ مانی۔ وہ ایک دن دیوتاؤں کی آنکھ بچا کر انسانوں کی بستی میں پہنچ گئی۔ وہ ایک ہوا کے جھونکے کی طرح مغرب کی وادیوں میں سرایت کر گئی۔ اس نے مغرب کے سمندر کی موجوں کو اُچھالا۔ وہ جگمگاتے ہوئے شبستانوں پر مسکرائی۔ وہ انسانی سماج کی رنگین تیتریوں سے کھیلی۔ اس نے تلاش عیش کی قوس قزح میں کتنے ہی نئے نئے رنگ سمو دیئے۔ وہ ان کی موسیقی کی راگنیوں میں سما گئی۔ وہ ان کی شراب کے پیالوں میں چھلکی ـــ اس طرح کئی صدیاں گذر گئیں۔ اور "المپس" کے دیوتاؤں نے انتظار کرتے کرتے تھک کر کہا۔ "اب وہ نہ آئے گی!"

"اتھینا" اپنا کام کرتی رہی۔ اکثر وہاں ہاری اور کہیں کہیں جیتی بھی ـــ صدیاں گذرتی جا رہی تھیں۔ اور وہ چاہتی تھی کہ جلد اپنے کام سے فارغ ہو کر "المپس" واپس جائے۔ لیکن ابھی تو اسے ایک بہت بڑی شکست کھانی تھی۔ انسانوں کی رنگین محفلوں سے مایوس ہو کر وہ ایک دن مندروں، مسجدوں، کلیساؤں کی دنیا میں پہنچ گئی۔ اس نے سوچا کہ انسانوں کے یہ قبیلے تو عرفان سے اتنی دور نہ ہوں گے جتنے کہ باقی انسان۔ اس نے صورتیں معصوم دیکھیں۔ نظریں شرمیلی دیکھیں۔ باتیں میٹھی سُنیں۔ عبا کے دامن اور جنیو کے ڈورے اور ماتھے کی بندی میں اس نے اپنے احساس کی ایک ہلکی سی پرچھائیں دیکھی۔ بس اس نے کہا، میں اپنی منزل پر آ گئی۔ یہی وہ انسان ہیں جنہیں میں پھر دیوتاؤں کے چرنوں میں واپس لے جا سکتی ہوں۔

مگر ایک رات کی خاموشی میں جب وہ مسجد کے تاریک حجرے میں داخل ہوئی تو وہاں اس نے مولانا کی عبا کے دامن پر حرص و ہوس کی پریوں کو ناچتے دیکھا پھر جب دوسری رات کو وہ مندر کے استھان پر گئی تو وہاں اس نے پنڈت جی کے جنیو میں پھانسی کے پھندے دیکھے، وہ جنیو ایک سانپ کی طرح پنڈت جی کے گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ پھر وہ گھبرا کر کلیسا کی طرف بھاگی۔ اُس نے سوچا کہ یہاں تو ضرور مجھے مسیح کی روح ملے گی۔ لیکن وہاں بھی لمبی عباؤں کے دامن شرابور تھے! ـــ اب وہ کیا کرے؟ ـــ اتنے میں مسیح کے پجاری نے اسے پکارا ادھر آ میری بیٹی۔ میں تجھے نجات کا راستہ بتاؤں۔ ساتھ ہی مندر سے پنڈت جی کی آواز آئی۔ اُدھر کہاں جاتی ہے، دھرم اور مکتی کی کنجیاں تو میرے جنیو میں بندھی ہوئی ہیں۔ مولانا بھی کہیں ایک گوشے میں کھڑے تھے۔ انھوں نے اپنی سُرخ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا۔ "ایمان بالغیب" مجھ سے لے میرے پاس یہ جنس سستی ہے۔

کئی صدیاں اور گذر گئیں۔ اور "المپس" کے دیوتا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو گئے۔ آخر "اپالو" نے کہا میں جاتا ہوں۔ دیکھوں تو وہ کہاں رہ گئی ـــ "اپالو" آیا اور عرصہ تک ڈھونڈتا پھرا۔ پوچھتا پھرا۔ لیکن دیوی کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ایک دن وہ کلوریم کی ٹوٹی ہوئی دیواروں کے سایہ میں سستا رہا تھا کہ یکایک بادل کا ایک ٹکڑا اس کے قریب آ کر ایک پرچھائیں کی صورت اختیار کرنے لگا۔ "اپالو" نے لیٹے ہی لیٹے اس پرچھائیں سے سوال کیا "تنہا بھائی تم کون ہو؟"

پرچھائیں نے کہا۔ میں انسانوں کی دنیا کا رکھوالا ہوں جو انھیں اس طرح زندہ رہنا سکھاتا ہے کہ ان کے مزے میں تاخیر نہ ہو۔ لوگ مجھے "اہرمن" کہتے ہیں۔ حالانکہ میں یزداں سے زیادہ طاقتور ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں قوت حیات ہوں میرا کام یہ ہے کہ میں انسانوں کو دائمی زندگی کے تصور سے دور رکھوں اور میں اپنا کام بہت کامیابی کے ساتھ انجام دیتا ہوں۔ کیا تم "المپس" سے اُتر کر آئے ہو؟ ــــ وہ ٹھٹھرے ہوئے۔ سوکھے بجھے، تھکے ہوئے بڈھے دیوتاؤں کی اجڑی ہوئی بستی! کیوں تکلیف فرمائی تم نے؟

اپالو نے کہا "میں اپنی بہن "ایتھینا" کو تلاش کرنے آیا ہوں جو یہاں انسانوں کو "المپس" کا بلاوا دینے آئی تھی مگر واپس نہیں گئی۔ نہ جانے کہاں ہے وہ؟" اہرمن مسکرایا "بڑے میاں" اس نے کہا "تم نے ناحق اس بوڑھاپے میں اتنا لمبا سفر کیا۔ وہ تو اب تمھارے ساتھ واپس نہ جائے گی۔ آؤ میرے ساتھ۔ میں تمھیں دکھا دوں کہ وہ کہاں ہے؟

اب اہرمن آگے آگے اور "اپالو" پیچھے پیچھے۔ بجلی کی روشنی سے جگمگاتے ہوئے بازاروں میں ایک محل سرا کے اندر داخل ہوئے۔ جہاں ہزاروں آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ایک اونچے چبوترے پر کوئی برہنہ عورت رقص کر رہی تھی۔ ایک انداز بے خودی کے ساتھ ایوان کے ہر گوشے سے بار بار واہ واہ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ناچنے والی اپنے ناچ میں مست ہے مگر دیکھنے والے اس کی جوانی میں ڈوبے ہوئے تھے! ــ وہ "ایتھینا" تھی! مگر اب وہ "المپس" کا راج بھول گئی تھی۔

اہرمن نے کہا۔ اب آیئے بھائی صاحب آپ کو ایک اور جگہ لے چلوں۔ یہ ایک مکان تھا جس کے دروازے پر سرخ قندیل ٹنگی ہوئی تھی۔ یہاں جنسی خواہشوں اور موری جسموں کا سودا ہو رہا تھا۔ اہرمن نے اشارہ کیا۔ وہ دیکھو، تمہاری دیوی بیٹھی ہے پھر اس نے کہا۔ کوئی ایک جگہ اور لے چلوں یہ ایک افلاس زدہ مزدور کا گھر تھا۔ جس کی بیوی آدھی درجن بھوکے بچوں کی بھوک کو تھپڑوں اور گالیوں سے تسکین دے رہی تھی۔ اس کا شوہر ابھی شراب خانے سے واپس نہ آیا تھا۔ مشابہت وہی تھی۔ البتہ مزدور کی بیوی کی چھاتیاں اب اس کے گھٹنوں تک لٹک رہی تھیں۔

گھبرا کر اپالو نے کہا۔ اہرمن مجھے جانے دو۔ "المپس" پر میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ اہرمن نے قہقہہ مارا۔ جاؤ میرے بھائی جاؤ! دو چار صدیوں تک پھر اپنے خاموش کوہستانوں میں سوتے رہو۔ اس وقت تک ادھر آنے کی زحمت نہ کرنا جب تک میں یہاں موجود ہوں۔ میں تہذیب اور تمدن کا دیوتا! جاؤ بھائی، تمھیں تمھارے تھکے ہارے دیوتاؤں کے سپرد کیا ــ یہ کہتے کہتے اہرمن غبار بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

"اپالو" گھبرا کر مڑا اور تیز تیز چلنے لگا۔ پھر وہ یکایک ٹھٹکا ــ میں کہاں ہوں؟ میں کدھر جا رہا ہوں؟ وہ اپنا سر کھجانے لگا۔ پھر اس نے سوچا "المپس" کا راستہ کدھر ہے؟ میں جس راہ سے آیا تھا وہ راہ کہاں ہے؟ ــــ بیچارہ "اپالو" عرصہ تک کھڑا سر کھجاتا رہا۔ اس لئے کہ وہ "المپس" کا راستہ بھول گیا تھا۔

مضمون نگار حضرات سے

مضامین اور نظمیں بہت بڑی تعداد میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس لئے غیر طلبیدہ مضامین اور نظمیں قبول نہیں کی جائیں گی۔ اور صرف واپسی کے لئے ٹکٹ آنے کی صورت میں ہی واپس کی جائیں گی۔

(ادارہ)

(جنرل) کے۔ایم کیری آپا

ہندوستانی فوج کے لئے افسروں کا انتخاب

کسی فوج کی خوبی کا دارومدار دراصل اس کے افسروں کی خوبی پر ہوتا ہے۔ اچھے افسر چاہے ان کے پاس جیسا بھی سامان ہو ایک اچھی فوج بنا سکتے ہیں۔ لیکن خراب افسر چاہے ان کے پاس اعلےٰ درجے کا سامان اور سپاہی کیوں نہ ہوں بہترین دستہ تباہ کر دینگے۔

ہندوستان کو ایک اول درجے کی فوج درکار ہے۔ اس واسطے نہیں کہ جو دوسروں کا ہے اسے وہ ہتیا لے بلکہ جو ہمارا ہے اسے ہمیشہ صحیح سالم اور محفوظ رکھنے کے لئے۔ ہندوستان کی کسی پر چڑھائی اور حملہ کرنے کی کوئی اسکیم نہیں ہے۔

اس بارے میں ہماری حکومت کی پالیسی کا ہمارے وزیر اعظم بار بار اعلان کر چکے ہیں۔ ہندوستان میں فوج رکھنے کا اصل مقصد ملک کا بیرونی حملے سے بچاؤ کرنا اور کسی ناگہانی ضرورت کے موقعے پر حکومت کے غیر فوجی افسروں کو امن و امان قائم رکھنے کے لئے مدد دینا ہے۔ اس فرض کے ادا کرنے کے لئے ایک واقعی اول درجے کی فوج ہونا لازمی ہے جو جدید ترین طریقۂ جنگ کے مطابق تربیت یافتہ اور سامانوں سے لیس ہو۔

ایک اچھی فوج بننے کے لئے یہ خوبیاں ضروری ہیں۔ ۱۔ انتہائی بلند قسم کا اقتصادی استحکام۔ ۲۔ ایسے باشندے جن کی اخلاقی حالت بلند ہو۔ ۳۔ اچھے قوی سپاہی۔ ۴۔ ایسی صنعت و حرفت جو عمدہ منصوبے کے مطابق قائم کی گئی ہو اور قابلیت سے چلائی جا رہی ہو تاکہ جہاں تک جنگی سامان کا تعلق ہے فوج کو خود کفیل بنا دیا جائے۔ ۵۔ ان سب سے اہم چیز اچھے افسر ہیں جو امن کے زمانے میں سپاہیوں کو تربیت دیں اور جنگ میں ان کی قیادت کریں۔

ایسی کوئی تقسیم نہیں ہے۔ میں اس مضمون میں آخری مد پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں یعنی افسر۔ لیکن یہ تبصرہ شروع کرنے سے پہلے میں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ سپہ گری کے نقطۂ نظر سے ہمارے ملک کے باشندوں کو دو حصوں۔ جنگجو اور غیر جنگجو۔ میں تقسیم کرنے والا پرانا زمانہ اب نہیں رہا۔ میں نے یہ ہمیشہ کہا ہے اور میں برابر کہتا رہوں گا کہ ہر ہندوستانی چاہے وہ پورب کا ہو یا دکھن کا یا پچھم کا یا اُتر یا وسطی علاقے کا ایک اچھا سپاہی بن سکتا ہے بشرطیکہ اس میں بعض وہ لازمی خوبیاں موجود ہوں جن کا سپاہیوں میں ہونا ضروری ہے اور اس کی کمان کے لئے اچھے افسر ہوں اور وہ جنگی سامان سے اچھی طرح لیس ہو۔

اس وقت ہماری فوج میں جو سپاہی کام کر رہے ہیں وہ جہاں تک میرا تعلق ہے بہت عمدہ ہیں۔ ان کی دو نمایاں خلقی خوبیاں ہیں جو اتنی بڑی حد تک اکثر دوسری فوجوں کے سپاہیوں میں نہیں پائی جاتیں جتنی ان میں پائی جاتی ہیں۔ وہ خوبیاں یہ ہیں — ایک تو یہ سپاہی میدان جنگ کے جانباز لڑنے والے ہوتے ہیں دوسرے یہ ہمیشہ بھل مانسی سے پیش آتے ہیں۔ خوبیوں کی یہ پونجی ہوتے ہوئے ہندوستان کے لئے یہ ممکن ہونا چاہئے کہ جب اس کی اقتصادی۔ زراعتی اور حرفتی پیداوار کی منصوبہ بندی مکمل ہو کر وہ خود کفیل ہو جائے تو اس کے پاس ایک ایسی فوج ہو جو دنیا میں بہترین کہی جا سکتی ہو۔ جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو سب سے اہم جزو درکار ہے وہ افسر ہے۔

ان نوجوانوں کی عام خوبی قطعی طور پر قابل اطمینان نہیں پائی گئی جنہوں نے حال کے برسوں میں اپنے کو فوج میں کمیشن حاصل کرنے کے لئے پیش کیا ہے۔ ان درخواستوں میں جو ہمیں اپنے

ترغیبی ادارہوں کی جگہوں کے لئے موصول ہوتی ہیں "کمیت" تو ہے لیکن "عام خوبی" سب امیدواروں میں نہیں پائی گئی۔ پرانے زمانہ میں سپہ گری روپیہ کمانے والا پیشہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ "رومان" اور "جانبازی" کا ایک ایسا پیشہ تھا جس میں زمانہ امن میں خدمت گذاری کی شادمانی حاصل ہوتی تھی اور لڑائی کے میدان میں جنگ آزمائی کی ناموری۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جیسا کہ دنیا کی دوسری متعدد فوجوں میں ہوا ہے اس اونچے معیار کو جو فوج کے کمیشن والے عہدوں کے امیدواروں کے لئے ضروری درکار ہوتا تھا افسروں کی زبردست مانگ کی وجہ سے نیچا کرنا پڑا۔ اور پھر بعد میں مالی وجوہ کی بنا پر افسروں کی تنخواہ گھٹانا پڑی۔ کارگزاری کے اعلیٰ معیار والے افسروں کا کوئی دستہ نہ ہونے اور تنخواہ کے گھٹ جانے کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ ہونہار نوجوانوں کے واسطے فوج میں ملازمت کے لئے کوئی دلکشی باقی نہیں رہی۔

اس جنگ کے بعد سے سپہ گری نوجوانوں کے لئے "رومان" اور "جانبازی" کے اس جذبے کے ساتھ جو پرانے زمانہ میں ہوا کرتا تھا اب کوئی دلکشی نہیں رکھتی۔ اقتصادی پستی کی وجہ سے والدین نے قدرتی طور پر یہ چاہا کہ ان کے لڑکے نفع بخش ذریعہ معاش تلاش کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت فوج کے کمیشن والے عہدوں کے لئے اتنی تعداد میں موزوں امیدوار نہیں مل رہے ہیں جتنے درکار ہیں۔ یہ بات ملک کے مفاد میں نہیں ہے۔ اگر لوگ ویسی فوج چاہتے ہیں جیسی فوج کے لئے وہ بظاہر بہت آرزومند ہیں تو اس صورت حال کو درست کرنے کے لئے جلد سے جلد کچھ نہ کچھ کرنا نہایت ضروری ہے۔ آج کل کی جنگیں بہت زیادہ مشینی اور بہت پیچیدہ طور پر فنی بن گئی ہیں پرانے زمانے میں شاید افسروں کے لئے ذہانت سے زیادہ جسمانی قوت درکار ہوتی تھی لیکن اس وقت یہ دونوں چیزیں مساوی طور پر اہم ہیں۔

حقیقی ضرورتیں

کس قسم کے نوجوان اچھے افسر بن سکتے ہیں؟

یہ وہ بعض ضروری خوبیاں ہیں جو افسر بننے والوں کے لئے درکار ہیں۔ ۱۔ جسمانی موزونیت۔ ۲۔ دماغی پھرتی ۳۔ اخلاقی درستی۔ ۴۔ پیش قدمی۔ ۵۔ احساس ذمہ داری۔ ۶۔ متفقہ کوشش کا شعور اور اعلیٰ پیمانے کی وفاداری۔ ۷۔ اپنے فرض کے ادا کرنے میں بے غرضی۔ ۸۔ انضباط کا احساس۔ ان دوسرے ملکوں کے نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد کو دیکھنے کے بعد جہاں جہاں میں جا چکا ہوں میری یہ رائے ہے کہ ہندوستان کے نوجوانوں میں ان خوبیوں میں سے اکثر مخفی طور پر موجود ہیں لیکن انہیں ان نوجوانوں کے والدین اور استاد ٹھیک طرح سے تکمیل کو نہیں پہنچاتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی طرف تعلیم کے ذمہ دار عہدہ داروں کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اس اثنا میں جب تک کہ ملک میں تعلیم کے نظام کی ایسی تشکیل نہ ہو جائے کہ نہ صرف فوج بلکہ ملک کے مختلف محکموں کی ملازمتوں کے لئے موزوں قسم کے نوجوان کافی تعداد میں دستیاب ہو سکیں فوج کے محکمے کو ان نوجوانوں کی اہلیت معلوم کرنے کے لئے جو فوج میں کمیشن پانے کے لئے درخواست دیتے ہیں کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ فی الحال یہ کام "سروسیز سلیکشن بورڈ" یعنی پبلک سروس کمیشن کی مدد سے انجام دے رہے ہیں۔ اور یہ اپنا کام اس طریقے سے کر رہے ہیں جس طریقے سے یونیورسٹیاں طالب علموں کو ڈگریاں دینے کے لئے امتحان لیتی ہیں۔ ان بورڈوں نے تحقیقات اور تجربے کے ذریعے جانچ کرنے کے ایسے طریقے معلوم کر لئے ہیں جن سے یہ پتہ لگ جاتا ہے کہ آیا یہ امیدوار اس بات کے اہل ہیں یا نہیں کہ انہیں افسر بنانے کی ٹریننگ دی جائے۔ جانچ کے ان طریقوں سے پتہ چل جاتا ہے کہ ان نوجوانوں میں یہ ضروری خوبیاں موجود ہیں اور پورا اطمینان کرنے کے بعد کمیشن محض ان نوجوانوں کو دئے جاتے ہیں جن کے ہاتھوں میں ان سپاہیوں کی زندگیاں بلاخوف وخطر دی جا سکتی ہیں جن کی وہ ملک کے لئے کمان کرتے ہیں۔

میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہیں کہتا کہ جانچ کے یہ طریقے فیصدی بالکل صحیح ہیں دنیا میں کوئی چیز بھی بے عیب نہیں ہے۔ محکمے کے ذمہ دار افسر جانچ کے ان طریقوں میں اصلاح کرنے والی اور کارآمد تجویزوں کا خیر مقدم کرنے کے لئے برابر مستعد ہیں۔ بعض یہ کہ کوئی امیدوار کسی امیر آدمی کا لڑکا ہے یا کسی ایسے آدمی کا لڑکا

جو حکومت میں کسی اعلیٰ عہدے پر ہے یا وہ کسی مشہور "فوجی" خاندان کا ہے یا اس کی بہت اعلیٰ تعلیمی قابلیت ہے اسے فوج میں کسی کمیشن والے عہدے کا اہل نہیں بنا دیتی۔ مہربانی کر کے یہ بات یاد رکھئے کہ کوئی ایسا نوجوان جس میں متذکرہ بالا قابلیتیں ہوں ایک اچھا پروفیسر۔ انجنیر۔ کلکٹر یا کمشنر بن سکتا ہے یا کسی دوسرے پیشے میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن اسے اس طرح سپاہیوں کی کمان کرنے کا فرض سونپا نہیں جا سکتا۔

جب تک کہ کسی نوجوان میں وہ لازمی خوبیاں نہ ہوں جو افسر بننے کے لئے ضروری ہیں اسے فوج میں افسر کے عہدے پر لے کر ان سپاہیوں کی جانیں جو اس کی کمان میں ہوں گے اس کے ہاتھ میں دے دینا ایک بہت بڑا گناہ ہوگا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ناقابلیت اور افسر کے عہدہ کے لئے اپنی ناموزونیت کی بنا پر جنگ میں ان سپاہیوں کو توپ کے شکار کے طور پر استعمال کر ڈالے۔ غیر فوجی اور شہری زندگی میں اگر کسی سے فیصلہ کرنے میں کوئی غلطی ہو جائے یا کوئی ناقابلیت کا عمل سرزد ہو جائے تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کسی کو تکلیف پہنچ جائے گی یا کسی کا کچھ مالی نقصان ہو جائے گا۔ لیکن کسی فوجی افسر کی ایسی غلطی کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے قیمتی جانوں کا نقصان ہو جائے یا لڑائی اور جنگ میں شکست ہو جائے یا کسی ملک کی سلامتی کو نقصان پہنچ جائے۔ اس بنا پر یہ بورڈ بہترین امیدواروں کو چنتے ہیں۔

میں چند لفظوں میں فوج کے افسر کی تنخواہ اور الاؤنس کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ جب تک کہ کسی افسر کے شوق خرچیلے نہ ہوں یا اس کی شادی جلدی نہ ہو گئی ہو یا اس کے بہت زیادہ بچے نہ ہوں یا وہ رئیسوں کی سی زندگی نہ بسر کرتا ہو میرے خیال میں اسے جو تنخواہ اور الاؤنس ملتا ہے وہ اس بات کے لئے بہت کافی ہے کہ وہ ایک افسر کی حیثیت سے آرام اور شان سے زندگی بسر کرے۔ میں جانتا ہوں کہ آجکل فوج کی زندگی کہیں بھی ویسی خرچیلی نہیں ہے جیسی بٹوارے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ فوج کی ملازمت کو کبھی بھی روپیہ پیدا کرنے والا پیشہ نہیں سمجھا گیا۔ لہٰذا میں خیال کرتا ہوں کہ جو کوئی شخص روپیہ کمانے کی غرض سے فوج میں ملازمت کرتا ہے وہ ایک غلط انتخاب کر رہا ہے اور میں اسے یہ مشورہ دوں گا کہ وہ کوئی اور پیشہ اختیار کرے۔

زمانۂ امن میں سپہ گری کی شادمانی اور لڑائی کے میدان میں اپنے ملک کی خاطر جنگ آزمائی کرنے میں ناموری فوجی زندگی کی مخصوص خصوصیات ہیں۔ کسی نوجوان کے لئے فوجی زندگی اعلیٰ درجے کے پیشوں میں سے ایک ہے۔ وہ زمانہ امن میں فوجوں کو اچھے سپاہی بننے کی تربیت دیتا ہے اور میدان جنگ میں ان کی قیادت کرتا ہے۔ کسی افسر کو اپنی ملازمت کے دوران میں اپنے کو بہت دلچسپی اور خوشی کے ساتھ مشغول رکھنے کے غیر محدود مواقع حاصل رہتے ہیں۔ اپنے ان سپاہیوں کی دیکھ بھال کرنے کے علاوہ جن کی وہ کمان کرتا ہے اسے انواع اقسام کی گاڑیوں اور جدید سامان جنگ کی دیکھ بھال کرنا ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں اسے مشینی معلومات حاصل کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ اسے مشینوں کی بابت ایسی معلومات حاصل کرنے کا کسی اور شعبہ میں سوائے کسی مخصوص فنی شعبہ کے ایسا موقع نہیں مل سکتا تھا۔

کمیشن یافتہ ہونے کی بدولت اسے کسی اور ملازمت کے مقابلے میں کہیں زیادہ سماجی روابط کے مواقع حاصل رہتے ہیں جو خود اس کے اور ملک کے لئے دلچسپ اور گرانقدر ہوتے ہیں۔ ڈیوٹی پر نہ ہونے کی حالت میں اسے تفریح کے موقعے ملتے ہیں۔ وہ اپنے سپاہیوں اور دوسرے لوگوں سے کھیل کھیلتا ہے۔ وہ جنگلوں میں جا کر شکار کھیل سکتا ہے یا کیمرا لے کر اس سے فوٹو اتار سکتا ہے۔ اگر وہ سمجھدار ہے اور فضولیات پر روپیہ ضائع نہیں کرتا تو وہ اپنے لئے گھوڑا خرید سکتا ہے اور گھوڑے والی ورزشوں میں حصہ لے سکتا ہے جیسے شکار یا پولو جو علاوہ اعلیٰ درجے کے کھیل ہونے کے تربیت کے نقطۂ نظر سے بھی بہت عمدہ ہیں۔ اسے مختلف فوجی تربیتیں حاصل کرنے یا سمندر پار کے متعدد سفارت خانوں میں بحیثیت ملٹری اٹیچی کے جانے کے سلسلے میں بدیسی ملکوں میں جانے کے بھی مواقع ہیں۔

اور کسی پیشے یا شعبہ زندگی میں کسی نوجوان کو ملک کے دوسرے مختلف حصوں کے اتنے متعدد افسروں سے اتنے قریبی روابط حاصل کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ فوج کی ملازمت ایک سچے ہندوستانی کی حیثیت

سے ہمیشہ ملک کی خدمت کرنے کے لازمی جذبے کو پیدا کرتی ہے اور حقیقتاً یہ جذبہ ہمارے ملک کی خوشحالی اور امن و امان کے لئے نہایت ضروری ہے۔

سماجی خدمت

ایک افسر کی حیثیت سے اسے اپنے دیش بھائیوں کی بہت کافی سماجی خدمت انجام دینے کا بھی موقع حاصل رہتا ہے۔ یہ بات یاد رکھئے کہ ایک افسر کی حیثیت سے اس کا اولین فرض ملک کے باشندوں کی خدمت کرنا ہے اور بحیثیت ایک شہری کے اس کے حقوق اور فرائض کا سوال بعد میں آتا ہے۔ لہٰذا اس کے دوہرے فرائض ہیں ایک تو اپنے ملک کے لئے اور دوسرے ملک کے باشندوں کے لئے۔ میں نے بتایا ہے کہ سماجی خدمت کے سلسلے میں وہ اپنے عہدے کے اعتبار سے متعدد طریقوں سے مدد دے سکتا ہے۔ زبردست مدد یا معمولی مدد۔

آخر میں ایک بات یہ یاد رکھئے کہ وہ جب ریٹائر ہوتا ہے تو اسے معقول پنشن دی جاتی ہے اور ریٹائر ہونے کے بعد بھی وہ فوج کا ایک ممبر رہتا ہے اور اسے فوج کی متعدد مراعات حاصل رہتی ہیں۔ حالانکہ اس کا نام برسرکار ملازموں کی فہرست میں نہیں ہوتا۔ میں بہت امید افزا صورت حال پیش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں اور نہ افسر ہونے سے جو بہتریاں حاصل ہوتی ہیں ان کے بارے میں بہت زیادہ مبالغے سے کام لے رہا ہوں میں ہندوستان کے نوجوانوں کے سامنے فوج کے بارے میں بحیثیت ایک دلکش ذریعہ معاش کے (مالی اعتبار سے نہیں بلکہ پیشے کے اعتبار سے) صرف بعض اصلی حقائق پیش کر رہا ہوں۔

اب مجھے امید ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے اور اس بات کی کوشش کریں گے کہ ملک کے بہترین نوجوان فوج میں افسر بن کر جائیں۔ یاد رکھئے کہ ہوسکتا ہے کہ جو کسی کے والدین یا استادوں کے لئے "بہترین" ہو ان وجوہ کی بنا پر جو میں پہلے ہی بیان کرچکا ہوں فوج کے لئے "بہترین" نہ ہو۔

ہم سب کو متحد ہو کر اس بات کی کوشش کرنا چاہئے کہ ہماری ایک ایسی فوج ہو جو دنیا میں بہترین ہو۔ یہ فوج دنیا میں صرف اس طرح بہترین ہوسکتی ہے کہ اس کے ان "عناصر" میں جن کا میں ذکر کرچکا ہوں اس کی کمان کرنے کے لئے — زمانہ امن اور زمانہ جنگ دونوں میں — بہترین نوجوان ہوں۔ اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہمارے اس وسیع ملک میں ہزاروں کی تعداد میں اعلیٰ درجے کے نوجوان ہوں۔

(جنرل کیری آپا اور اسٹیٹسمین دہلی کے شکریے کے ساتھ)

(مترجم حیدر حسن موسوی)

سروش عسکری طباطبائی

تاج محل

جاں گسل ہجر کا دل دوز فسانا کہئے — چاہنے والی نگاہوں کا تقاضا کہئے
شوق و حسرت کی لبھائی ہوئی دنیا کہئے — مرمریں خوابِ محبت! تجھے کیا کیا کہئے
حسن کے ذہن کی رعنائیِ تخیل ہے تو
سنگ میں عشقِ فسوں ساز کی تکمیل ہے تو

سیمِ سیال کا ٹھہرا ہوا چشمہ ہے کوئی — رنگ و نور میں قدرت کا صحیفہ ہے کوئی
قطرۂ اشک کہ ٹوٹا ہوا تارا ہے کوئی — باغِ فردوس کا کھویا ہوا جلوہ ہے کوئی
سنگ میں عشق کی حور کہاں سے آئی
تابشِ برقِ سرِ طور کہاں سے آئی

واہ ری قدرت و صناعیِ دستِ فنکار — مسترد کر دیئے آثارِ شکنِ وقت کے وار
نقش کر دی دلِ مرمر پہ صبا کی رفتار — سنگ میں ڈھال دیا چاندنی راتوں کا نکھار
ہر ادا حسن کی پائندہ و محکم کر دی
عشق کے خواب کی تعبیر مجسّم کر دی

آج مرنے کو ہیں قتّالِ زمانہ تنہا — شرط یہ ہے کہ بنے خاک پہ ایسا ہی مزار
واہ کیا بات ہے اے تاجِ حسیں کے معمار — حسن خود ہے تری رعنائیِ صنعت پہ نثار
کر دیا موت کی تلخی کو گوارا تو نے
صفحۂ دہر پہ کیا نقش ابھارا تو نے

فوقیت لے گئی اقوام پہ کاوش تیری — ہند بھولے گا نہ تا حشر نوازش تیری
اہلِ فن کرتے ہیں خاموش پرستش تیری — اللہ اللہ ہمہ گیری و کاوش تیری
پیکرِ سنگ میں بجلی کی تڑپ بھر دی ہے
چاندنی ساغرِ بلّور میں حل کر دی ہے

لی کرن چاند سے، ضو مہر سے، تاروں سے چمک — موجِ دریا سے سکوں، بحر سے موتی سے ڈھلک
لاج شبنم سے، ہنسی پھول سے، غنچے سے چٹک — دلکشی ناز سے، رم حسن سے، چاہت سے للک
پھر وفاؤں کے لہو میں انہیں تخمیر کیا!
سچ بتا تاج محل کیا یونہی تعمیر کیا؟

تاج! یا حسن کی معصوم ضیا ہے کوئی — یا کسی شوخ کا اندازِ حیا ہے کوئی
سازِ مہتاب کہ کوکب کی صدا ہے کوئی — عشوۂ ناہید کا، زہرہ کی ادا ہے کوئی
خاک پر ڈال دیا ناز سے ڈیرا جس نے
لے لیا گھاٹ پہ جمنا کے بسیرا جس نے

اے نئے روپ میں ڈھالے ہوئے قصرِ لبِ جو — تیری رفعت میں ملا فطرتِ انساں کو نمو
روح سے سجدہ طلب ہیں ترے طاق و ابرو — نام لینا ترا زیبا ہے ہمیں بعدِ وضو
تو محبت کی طہارت کا نمائندہ ہے
حسن کی پاکی و عظمت کا نمائندہ ہے

یہ ترے قوس و خد و خال، یہ نقش و نگار — یہ ترے کنگرہ و کرسی و عرش و مینار
یہ عبارات و اشارات و خطوط و ادوار — فن کے آیات ہیں صنعت کے اچھوتے شہکار
تیرے آئینے میں وہ تابش و گیرائی ہے
ملکۂ حسن کی تصویر اتر آئی ہے

یوں رواں ہے رگِ مرمر میں محبت کا لہو — جس طرح پھول کے ریشوں میں رواں ہو خوشبو
طرفہ مجموعۂ حسنِ حرم و دیر ہے تو — نورِ عرفاں سے چھلکتے ہیں ترے جام و سبو
تو نے یکرنگیِ صنعت کو ضیا بخشی ہے
وحدتِ مذہب و ملت کو بقا بخشی ہے

چاندنی رات میں اللہ رے تیرا جوبن   گھونگھٹ اُلٹے ہوئے بیٹھی ہے کوئی شوخ دلہن
اپسرا چاند کا یا دیکھ رہی ہے درپن   یا محبت کی ستائی کوئی الھڑ جوگن
باؤلے من کے تقاضوں سے جو گھبرائی ہے
تٹ پہ جمنا کے نہانے کو نکل آئی ہے

اللہ اللہ یہ خاموش ترنم تیرا   چاند تاروں سے پُراسرار تکلم تیرا
تند و گستاخ ہواؤں پہ تحکم تیرا   شوخ کرنوں سے یہ محبوب تبسم تیرا
صدرِ خوبانِ جہاں ہے وہ حسینہ ہے تو
خاتمِ دہر پہ ہیرے کا نگینہ ہے تو

سوزِ اُلفت سے دمکتا ہوا یہ شیشۂ مبیں   نورِ عفت سے چمکتی ہوئی یہ لوحِ جبیں
کُہر کی شال سے چھنتا ہوا جسمِ حسیں   یہ متانت، یہ تامل، یہ وقار و تمکیں
حورِ فردوس کی ملفوف خیالات میں ہے
روحِ ممتاز کی مصروف مناجات میں ہے

نہیں گوکل کا دلآویز فسانہ ہے کوئی   بندرابن کا جنوں خیز ترانہ ہے کوئی
کاشی و برج کا دیکھا ہوا سپنا ہے کوئی   مُرلی والے کا الاپا ہوا نغمہ ہے کوئی
نغمہ کیا پریم کی بنسی کا بجیّا تو ہے
گوپیاں چاند ستارے ہیں کنھیّا تو ہے

یا نہاں خانۂ تخلیق میں پاکر اکمال   چھُٹ پڑی ہاتھ سے صنّاع کے کوئی تمثال
یا یہ ہنگامِ تماشائے گزرگاہِ جمال   رہ گیا جم کے کسی شوخ فرشتے کا خیال
یا، شعاعوں نے بہ عرضِ نمائش کے لئے
بارگہ ایک بنالی ہے پرستش کے لئے

کہکشاں کی یہ پھبن، چاند کا یہ حسنِ کمال   یہ ہواؤں کے مدھر گیت، یہ اندازِ خیال
یہ برستا ہوا مخمور فضاؤں سے گلال   اور شفق میں یہ ترے پیکرِ سیمیں کا جمال
رادھا شرمائی ہوئی رنگ کی بوچھار میں ہے!
سیتا اٹھلائی ہوئی آگ کے گلزار میں ہے!

یہ لچکتی ہوئی شاخوں پہ چھلکتے ہوئے جام   آسمانوں سے برستا ہوا آبِ گلفام
بند کلیوں کو یہ نوخیز ستاروں کے پیام   اور آغوش میں جمنا کی ترا ماہِ تمام
کفِ ساقی پہ چھلکتا ہوا مینا ہے کوئی
رودِ تسنیم میں پھولوں کا سفینہ ہے کوئی

ایک اُبھری ہوئی موجِ مئے عناب شکن   ایک چھلکا ہوا پیمانۂ خورشید فگن
سینۂ ارض سے اُٹھی ہوئی اک جوئے لبن   فرش پر ایک حسیں پرتوِ انوارِ عدن
ٹھاٹھیں لیتا ہوا سیماب کا دریا ہے کوئی
آتشِ طور کا مچلا ہوا شعلہ ہے کوئی

سرو و شمشاد تلے مست ہوائیں رقصاں   تھرتھراتی ہوئی کنجوں میں کنواری کلیاں
یہ نئی رُت، یہ جواں رات، یہ دوشیزہ سماں   اور تلاطم میں ترا عکسِ سرِ آبِ رواں
چشمِ آفاق بصد شوق تماشائی ہے
جل پری سینۂ قلزم پہ اُبھر آئی ہے

سنگ و خشت میں لئے مرتبۂ حسن ادا   اے شعاعوں کے قفس، یا دلِ آئینہ بند
اجنبی حسن کے مرکز، حرمِ صدق و صفا   تجھ کو اپنی ہی امانت کی قسم یہ تو بتا
تیری تعمیر کے مقصد کا سرانجام تو ہے
تیرے پہلو میں حسیں روح کو آرام تو ہے

ہائے یہ حسن، یہ شوخی، یہ تبسم، یہ بہار   یہ نیا پن، یہ نزاکت، یہ نفاست، یہ نکھار
یہ سجاوٹ، یہ لگاوٹ، یہ تناسب، یہ ابھار   یہ اُمڈتی ہوئی مستی، یہ برستا ہوا پیار
عالمِ قدس سے لیلائے عدن رُوٹھ گئی
چاند سے یا کوئی آوارہ کرن رُوٹھ گئی

تنگ دل کہتے ہیں سرمائے کی لعنت ہے تو   نازشِ ملک ہے، سرمایۂ ملّت ہے تو
جس نے گھر پائے غریبوں کی وہ دولت ہے تو   زندگی فن کو عطا کی ہے وہ قدرت ہے تو
تجھ سا اس دہر میں تابندہ گہر کیا ہوگا
تجھ سے بڑھ کر کوئی محنت کا ثمر کیا ہوگا

اک نیا معبدِ تسلیم و عقیدت ہے تو   ایک تازہ حرمِ کفرِ محبت ہے تو
طینتِ خاک کا اعلانِ بغاوت ہے تو   یعنی آدم کی سجائی ہوئی جنت ہے تو
تا ابد حسنِ دل افروزِ تو تابندہ باد!
جذبۂ عشق و جنوں زندہ و پائندہ باد!

ابوالفضل صدیقی

چلے شیر مارنے کو

کچھ تو سو پشت سے پیشۂ آبا کی سپاہ گرانہ روایات کی توریث، اور کچھ اپنی کتابی معلومات! اور اس پر نطق کی خداداد صلاحیتیں، اور چاندماری کی بچپن سے لے کر اب تک کی مشق، خدا کے فضل سے دُور سے دیکھنے والے اور صرف سُننے والے دوستوں کو ہم پورے پورے شیر افگن نظر آتے تھے۔ اگرچہ اس زمانے میں جس زمانے کا یہ ذکر ہے ہم کچھ ایسے ہی ویسے سٹر پٹر قسم کے شکاری واقع ہوئے تھے۔ انھیں دنوں میں ہم اپنے ادبی دوست ذوقی کے یہاں مہمان ہوئے۔ یہ حضرت عمر میں ہم سے کافی بڑے اور اچھے خاصے شکاری تھے۔ انھوں نے ہماری گفتگو سن کر اور پھر شاید ہمارے اسلحہ دیکھ کر ہماری فن کاری کے متعلق کچھ بہت بلند رائے قائم کرلی، اور جب اُنھوں نے ہماری ادبی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ہماری شکاری قابلیتوں پر بھی اظہارِ اہمیت شروع کیا تو ہم دل ہی دل میں خوش ہو کر چپ ہو گئے۔ اگرچہ اس زمانے میں ہمارا چاقو قاز، مرغابی، ہرن، تیتر کے خون سے کبھی آلودہ نہ ہونے پایا تھا، اور شیر کے شکار پر گھنٹوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر فنی تقریر کرنے والے شکاری نے اگر شیر کہیں دیکھا تھا تو بس وہیں پاؤں تلے، اپنے ڈرائنگ روم کے قالین پر! —— اور ذوقی جن پر ادبی رسالوں میں ہمارے شکاری افسانے پڑھ کر پہلے ہی سے رعب جما ہوا تھا، اس ملاقات میں شیر کے شکار کی سائنٹیفک باتیں سن کر ہمیں پورا پورا ع

نوجوان و مثلِ پیراں پختہ کار

قسم کا استاد شکاری مان گئے۔ جوں جوں تبادلۂ خیال ہوتا گیا، ہماری فنی معلومات اور تجربے کی حدود مضبوط تر ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ ہمارے متواضع میزبان کو ہماری خاطر سے ایک شکار پارٹی ترتیب دینے کا خیال پیدا ہوا، اور جب ہم نے اپنی بے مائگی پر نظر کرتے ہوئے انھیں اس سے روکا تو اُنھوں نے اسے مشرقی تکلف پر محمول کیا، اور پھر جب ایک اسپورٹس مین کا جذبہ بیدار ہو چلے تو کہیں دبا کرتا ہے۔ میں مصلحتاً رکتا ہی رہا۔ مگر وہ گفتگو کے تازیانوں سے ایسے بیتاب ہو گئے تھے کہ جتنا میں ملے ڈکا اُتنا ہی اُن کا شوق تیز تر ہوا، اور اُنھوں نے اپنی تمام پارٹی کو مطلع اور مدعو کر دیا، اور چوبیس گھنٹے کے اندر ایک پروگرام مرتب کر کے سب کے پاس منظوری اور ترمیم و تنسیخ کو بھیج دیا۔ مقامی ساتھیوں سے ہر چیز بالمشافہ طے ہوئی اور ہفتے بھر کے اندر ہی اندر جملہ پروگرام مرتب ہو کر سامنے آگیا۔

اور اب یوں سمجھئے کہ جوں جوں وقت قریب آتا گیا مہماں کے دل کی دھڑکنیں اتنی رفتار سے تیز ہوتی گئیں جس رفتار سے میزبان کی آتشِ شوق۔ یا اللہ کیسے ٹھکانا ملے! ورنہ کیا ہوگا! کچھ سمجھ کام نہیں کرتی تھی۔ معینہ تاریخ قریب آتی جا رہی تھی بیٹھک ناسک والے موہنہ زرد، اور چوپتلے کل شکاری کے دل کی دھڑکنیں اختلاج بن رہی تھیں۔ مدتوں کی قلم اور زبان کی جمی جمائی آج سب اُکھڑ رہی تھی۔ دیکھئے بہت باتیں مارا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کیا گزرتی ہے۔

اور جب پروگرام مرتب ہونے کے بعد ایک روز چاندماری کے تختۂ مشق کرتے ہوئے میں نے "دو تین گُل مارے" تو میری قادر اندازی کی دھاک ساری پارٹی پر بیٹھ گئی اور سب سمجھ گئے کہ جیسا بولتا ہے اور لکھتا ہے اس سے بہتر مارتا ہے۔ مگر ہماری پارٹی کی آتشِ شوق وعدۂ وصل کی نزدیکی کے ساتھ جس رفتار سے تیز ہوتی جا رہی تھی اُسی رفتار سے ہمیں جاڑا چڑھ رہا تھا، اور روز افزوں تیاریاں اور سرگرمیاں دیکھ دیکھ کر ہماری حرارتِ غریزی گھٹ رہی تھی، اور کبھی تو ہمارے دل میں خیال آتا کہ چپکے سے میدان چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائیں، مگر اس کے لئے بہانہ اور جواز نہ تھا۔ اور آپ جانیں بخار اور دردِ گردہ کا دورہ، وہ بھلا ایسے وقت میں کیوں آتا، سر بھی نہ دُکھا، اور مرزا غالب کی طرح مرنے کی آرزو میں مرتے

بھی رہے اور موت نہ آنا تھی نہ آئی اور روانگی کا وقت آگیا۔ مرتا کیا نہ کرتا!
اب تمام دن دل خوش کن (اگرچہ دل میں مسخرے کا خوف ناپید ہوجانے والے) اسکیموں میں گذرتا اور ہم رات کو بستر پر پہنچکر اس ناگزیر وقت سے مقابلے کے لئے خود کو طیّار کرتے۔ یہاں تک روانگی سے ایک شب پیشتر ہم نے اپنی تمام تر ذہنی قوتوں کے ساتھ ساتھ اعصابی قوتوں کو بھی مجتمع کیا اور بستر پر لیٹے لیٹے ہی بہایت بہادری کے ساتھ اپنی متّیا دانہ صلاحیتوں کا جائزہ لیا۔ آخر اس میں کمال ہی کونسا ہے۔ یہ سب جو بڑے بڑے تیس مارخاں شکاری جمع ہوئے ہیں کل میری چاندماری دیکھکر میرا لوہا مان گئے۔ اُن کے پاس تو جرمن اور امریکن رائفل ہیں، اور میرے پاس سب انگلش۔ ایک سے ایک بڑھ کر، اور اپنے رائفلوں پر ایک سے ایک بڑھ کر میرا ہاتھ چڑھا ہوا ہے۔ اب تینوں کی چاندماری میں میں اپنا ۳۰ اسپرنگ فیلڈ، ۳۰۳ جیفرے اور ۵۰۰ کارڈائٹ ایک ایک رائفل ہر روز بدل کر لے گیا اور تینوں دن کی چاندماری کا میدان میرے ہاتھ رہا۔ سب انگلیاں دبا گئے۔ اور جب میں چاندماری پر دو دو سو تین تین سو گز سے اپنی کامیاب گولی چپکا لیتا ہوں، اور پھر ہر بڑے شکاری کی کتاب پڑھ چکا ہوں، اور پڑھتے پڑھتے دل ہی دل میں اس پر تنقید بھی کر چکا ہوں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ میں شیر نہ مار لوں۔ بھلا شیر کے شکار میں کمال ہی کونسا ہے۔ سب انتظام پہلے سے کر لیا جاتا ہے، اور بھلا میں تو ہرن، نیلا، مرغابی، اور چیتے کا شکار کھیل چکا ہوں۔ ہرن تو چار سو گز سے ادھر مار کھاتا ہی نہیں، اور مرغابی اور چیتے کی پرواز: بس جیسے گولی اُڑتی ہے، اور بھلا شیر کے شکار میں فنّی کمال کونسا ہے۔ پچاس ساٹھ گز کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اور پھر شیر کی شاہانہ اِتراتی چال، یہ بھی نہیں کہ ہرن چیتل کی طرح جستیں لگاتا آئے۔ بھئی سو گز کے رینج میں تو، کہو تو آنکھوں پر پٹّی باندھ کر ہنیں صاحب پیچھے کو نال کرکے گولی چپکا دوں" اور میرے سامنے مستند کتابوں کے صفحے کے صفحے اُلٹتے چلے جا رہے تھے اور درجنوں بورڈ چاندماری کے میدان میں چھلنی کی طرح سامنے آگئے۔ میری فنّی معلومات اور میری چاندماری کی پریکٹس جس نے سینکڑوں بورڈ چھلنی کر دئے۔ کیا وہ ایک گولی، بس ایک گولی، دس فیٹ کے شیر کے Top shoulder پر نہیں لگا سکتا۔ ابھی میں Top shoulder پر نہیں، تو آب قطب الدین کی طرح گردن پر جاؤں گا۔ یا بریندر کی طرح کھوپڑی پر ماروں گا تو کیا سو گز کے اندر اندر میرا ہاتھ خالی جانے کا بھی امکان ہو سکتا ہے؟ کیا ڈھائی تین سو گز پر چاندماری کے عمل سے بھی ساٹھ ستّر گز کے اندر شیر مارنا مشکل ہے؟ غرض انہیں پرانے مجرّب علمی و فنّی نسخوں کی الٹ پلٹ میں ہم نے آنکھیں بند کئے ہی کئے بستر پر کروٹیں بدل کر آدھی رات گذاری۔ یہاں تک کہ آخر کار وہم خیر کے شکاری چھوڑ پورے شیر بن کر نہایت بہادری کے ساتھ سو گئے۔ شیر کے شکار کو گیند چھوڑ اپنی چاندماری کے تختہ کا درجہ دے کر۔

ہمیں اپنی جائے قیام سے تیس چالیس میل ریل میں اور پھر دس بارہ میل بیل گاڑی میں چل کر اپنی شکارگاہ میں پہنچنا تھا۔ جو میرے اور ذوقی کے مشترک دوست مینا صاحب کے ممالک محروسہ میں واقع تھی، اور اسی وجہ سے شکار کیمپ کے جملہ اخراجات اور انتظامات اُنھیں کے سپرد تھے۔

تمام راستے میں اپنی شکاری ہمہ دانی کا رعب اپنی رائفل کی بجائے اپنی چاندماری کی سند میں پیش کر کر کے ساری پارٹی کی نس نس پر سوار کرتا چلا گیا۔ مگر جب شکارگاہ میں پہنچکر مینا سے ملاقات ہوئی تو میں بھی اُن کے حُسنِ انتظام اور جدّتِ طبع پر بے طرح مرعوب ہو کر رہ گیا، اور ساری پارٹی اور خود ذوقی جو بیسیوں مرتبہ والیانِ ملک کے یہاں اعلیٰ انگریزی عہدہ داروں کے ساتھ مہمان ہو کر شکار کھیل چکے تھے۔ انگشت بدنداں رہ گئے۔ مینا پُرگو اور خوش گو شاعر ہیں، اور جس طرح شعر کی ترتیب میں وہ انتہائی جدّتِ طبع سے کام لیتے ہیں اسی طرح شکار پارٹی اور شکار کی ترتیب میں اُنھوں نے ندرتِ فکر و حسنِ انتظام کا ثبوت دیا تھا۔ یعنی جس وقت سے انہیں اُن کے یہاں شکار کھیلنے کے ارادے کی ذوقی نے اطلاع دی تھی، اسی وقت سے اُنھوں نے ایک مخصوص اُو محدود قطعۂ صحرا میں دو شیروں کو مقیّد کر رکھا تھا، اور وہ اس طرح کہ ٹائیگر اور ٹائیگریس کی خواب گاہ میں باقاعدہ ذاتی دو بکرے چھوڑ دا کر اُنھیں فکرِ معاش سے بالکل بے نیاز کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ قطعۂ صحرا میں جگہ جگہ چھوٹے بڑے گڑھوں میں پانی بھروا کر شیر اور شیرنی دونوں کو اس

ندی تک پانی پینے کے لئے جانے سے روک دیا تھا، جو اس مخصوص جنگل کے ٹکڑے سے ڈیڑھ میل پر بہتی تھی اور جگہ جگہ جنگل کے چاروں حدود پر دیدبان بٹھا دیئے تھے اور اہتمام بالائے ستم یہ تھا کہ یہ سب شاہی انتظامات کرکے اپنے بھیل اور پاسی شکاری قلیوں کے ذریعہ سے نہایت خاموشی کے ساتھ سلطان و ملکۂ صحرا کی تمام تر نقل و حرکت کی رپورٹیں صبح شام منگا لیا کرتے تھے۔ غرض ہماری شکارگاہ میں جو ہمارے کیمپ سے دو تین میل کے فاصلے پر تھی۔ ہمارا شکار فکرِ معاش کے استغنا کی رسیوں اور محفوظ ہونے کے جہلِ مرکب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا آزاد قیدی تھا اور قفس کو آشیاں سمجھ رہا تھا۔

جو شام ہمارے شکار کے لئے منتخب ہوئی تھی اُس سے ایک یا دو روز پیشتر سے شیروں کی مقررہ خوراک دو بکرے یومیہ انھیں نہیں پہنچائے گئے تھے۔ ہمارے مچان ایک ہی قطار میں ایسے مقام پر باندھے گئے تھے جو اس جنگل کے ٹکڑے میں بلند اور موٹے درختوں کے درمیان گھاس کا ایک گول چکر سا تھا جس کے چاروں طرف درخت کھڑے تھے، اور اس مُدوّر درختوں کے سلسلے کے نصف دائرے میں ہمارے مچان تھے اور بقیہ نصف دائرہ سامنے بادشاہ اور ملکہ کی تشریف آوری کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ غرض یہ تھا نقشہ۔ جہاں ہمیں اور شیر کو شیر کے شکار کا ڈرامہ کھیلنا تھا۔ بالعموم شیر کے شکار کا جو طریقہ ہے اُس سے قدرے مختلف طریقہ پر ہمارے دوست مینا صاحب کے انتظام کے مطابق ہمارا شکار ترتیب دیا گیا تھا۔ یعنی اوپر مچان باندھ کر اور اس کے نیچے بھینسا باندھ کر کِل kill ہونے پر اور دوسرے روز اپنا پس خوردہ کھانے کے لئے آنے پر شیروں کو مارا جاتا۔ ان کو بکروں پر ایسا لگا لیا گیا تھا کہ نیچے بکرے باندھ کر پہلے ہی روز مچانوں پر جا بیٹھنے کی اسکیم تھی۔ چنانچہ شام ہوتے ہوتے ہم اپنے اپنے آشیانوں پر پہنچ گئے۔ مارچ کا مہینہ تھا، جب صحرا بھی گلستاں ہو جاتے ہیں۔ موسم خوشگوار تھا، شام بہاری خنکیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اور ہم نہایت آہستہ آہستہ کریپ سول شوز پہنے شکاری قلیوں کی رہنمائی میں اپنا راستہ طے کر رہے تھے۔ ذوقی میرے پارٹنر تھے۔ وہ اودھ فارسٹ اور نینی تال کی ترائی تک کھیلے ہوئے اور جم کاربٹ، بریڈر، نائٹ انگیل، قطب الدین اور کون کون سب کو پڑھے ہوئے اور سب سے کچھ مواد لے کر لکھے ہوئے

الا جانداری اور ادبی دنیا دونوں میدانوں کا یکساں مردِ میدان آج سچ مچ شکار کے میدان میں تھا۔ سرمئی شام کے خاموش دامن کی آڑ اڑ ہم دونوں بسیرا کرتی ہوئی چڑیوں کے چہچہوں میں اپنے آشیانوں پر پہنچ گئے۔ اور تمام جنگل شفق کی سرخ تابناکی سے جگمگا اٹھا۔ ہم درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ اور سینکڑوں مرتبہ کا پڑھا ہوا مچان آج آنکھوں کے سامنے اوپر لٹک رہا تھا۔ اوہ! مچان!! پہلی مرتبہ مچان دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی، بالکل ویسی ہی مایوسی، جیسی انگلستان کی ایک دیہاتی لڑکی کو ہوئی تھی اور وہ شاہ انگلستان کو دیکھ کر یک دم متعجب ہو کر چلا پڑی تھی۔

The king is but a man

"مچان! اے صاحب مچان!! یعنی ہزار ہا مرتبہ پڑھ کر اور لکھ کر پھینک دیا۔ یعنی ایسے ہی موقع پر تو کہا ہے کہ پوری زلیخا پڑھ گئے اور یہی نہیں معلوم کہ زلیخا مرد تھی کہ عورت تھا! مچان نہ تو مسہری ہوتا ہے اور نہ سوفا، نہ کوچ اور نہ آرام کرسی۔ اماں مچان تو کھٹولا ہوتا ہے، اور وہ بھی کچھ اُڑن کھٹولا قسم کا کھٹولا، جو اُڑتے اُڑتے پتاکر کسی سال ہل کے درخت کی اونچی ٹہنیوں میں اُلجھ کر رہ گیا ہو، اور نیچے سے دیکھ کر ہم غور کر رہے تھے کہ بھلا ہم قدرے بھاری بھرکم قسم کے دو مردِ شریف نفروں کی سمائی اس میں کیسے ہوگی کہ اپنے شکاری قلی کے اشارے پر رسی میں بندھے ہوئے ڈنڈوں کی لٹکتی سیڑھی پر نٹ کا سا کرتب دکھاتے اوپر چڑھے۔ بغیر جتنی بے تکی اس سیڑھی کی ساخت اور لٹکائی تھی اتنی دقت اس پر چڑھنے میں نہیں ہوئی۔ مگر جب مچان پر پہنچے تو ہمارا خیال صحیح نکلا، مچان تو ہمارے کمر کولہوں کیلئے بھی کافی نہیں تھا۔ اور ابھی ذوقی نیچے سے ڈارون کی تھیوری پر اُترتے ہوئے اوپر چڑھ رہے تھے۔ مگر جگہ تو دل میں ہونی چاہیئے، اور ذوقی جیسے پیارے کے لئے ادھر ہم نے غور کیا کہ ہم مرد ہو کر ان عورتوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ جو میلوں کو جاتے ہوئے ایک ایک یکہ اور بہلی میں پوری دو دو درجن مع آدھی آدھی درجن جلد سائز کے بچوں کے بخوبی سوار ہو جاتی ہیں، ادھر یہ خیال پیدا ہوا ادھر اعصاب پر سکرات سوار ہوئی، جوں جوں ذوقی اوپر چڑھتے گئے انھیں دیکھ کر گھٹنے پیٹ کو لپٹتے گئے۔ اور گنجائش دوستان در مچان کرکے ہم دونوں ٹھنس گئے۔ اب موقع واردات سامنے تھا اور آنے والی گھڑی بالکل قریب۔ کیونکہ ہمارے مچان کے نیچے شاہی

دسترخوان لگا ہوا تھا۔ دونوں بکرے چلا چلا کر دو دن کے بھوکے بادشاہ اور ملکہ کو دعوتِ طعام دے رہے تھے اور لطف یہ تھا کہ نشانات قدم کے اعداد و شمار کے مطابق ہمیں یہ بھی پہلے سے اندازہ کرا دیا گیا تھا، کہ حضور ملک معظم اور ملکۂ معظمہ کس پوائنٹ سے کورنش دیں گے۔ اب میں نے اپنا جائزہ لینا شروع کیا تو بفضلہ خود کو نہایت صحیح پایا، اور اس وقت تمام مستند شکاریوں کی کتابوں کا آموختہ یاد کر کے اور پھر اپنی چاندماری کے بورڈوں کی چھلنیاں آنکھوں میں گھما کر میں نے دل میں خیال کیا کہ بھلا جہاں یہ بکرا کھڑا ہے وہاں پر میری گولی سے شیر بچ کیسے جا سکتا ہے۔ اگر وہاں پر چاندماری کا تختہ لگا دیا جائے تو نہ معلوم کتنی میگزینیں ایک سوراخ پر خالی کر سکتا ہوں، اور مزہ تو جب ہے کہ کورنش دیتے ہی نذر کروں، بکرا جوں کا توں بندھا رہے اور میں شیر گرا دوں۔

بکروں کو ممیاتے پندرہ بیس منٹ ہو گئے۔ ہر سیکنڈ پر شیر کی آمد کا انتظار تھا کہ معاً ہمیں یہ خیال آیا کہ برینڈر نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چو راور شیر کی تعمیر ایک ہی مٹی سے کی ہے۔ اس کے مارنے کے لئے نہایت خاموشی کے ساتھ ساکن و جامد ہو کر بیٹھنا چاہیئے، اس کی قوت سامعہ اور جبلت غیر معمولی ذکی الحس ہوتی ہے۔ یہ ہلکی سے ہلکی آواز کافی دور سے، اتنی ہلکی آواز کہ جس کو ہم اپنے پندار میں آواز کا درجہ بھی نہیں دیتے اور اتنی دور سے کہ جہاں تک ہماری ہر بندوق کی ضرب بھی نہیں پہنچ سکتی، سنکر اپنے شکار کا اندازہ کر لیتا ہے، اور پھر اتنے دبے پاؤں اپنے شکار پر جاتا ہے کہ اُسے مطلق احساس نہیں ہوتا اور چور کی طرح موقع پر پہنچ کر ہاتھ صاف کر دیتا ہے۔ اسی طرح خطرہ پر اس کی غیر معمولی تیز سامعہ اس کو فوراً خبر دیدیتی ہے اور پہلی مرتبہ احساس ہونے پر شکارگاہ چھوڑ کر سرک جاتا ہے، اور یہ خیال کرتے ہوئے ہم نے اپنے تمام وجود کا جائزہ لیا، آیا ہم اس ماہر شکاری کی لکھی ہوئی ہدایات پر پورے اُترتے ہیں یا نہیں۔ تو ہم نے احساس کیا کہ ہمارے حلق میں ایک ہلکی سی لکیر محسوس ہو رہی ہے۔ ہم نے آہستہ سے حلق کو حرکت دیکر اور تھوک نگل کر اُسے صاف کرنا چاہا۔ مگر اس عمل سے اُسے مٹانے کی کوشش کرنے میں وہ تو اور گہری ہو گئی، اور چبھن میں تبدیل ہو گئی۔ بکرے اپنی فطری عادت کے مطابق زور زور سے چلا رہے تھے اور چلاتے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی، اور ہمارے دوسرے ساتھیوں کے مچانوں کے نیچے بھی اُن کے بکرے ممیا رہے تھے۔

مگر شکاری قلیوں کے قول کے مطابق بہترین چانس ہمارے مچان پر ہے۔ اور اب عنقریب شیر نمودار ہونا ہی چاہتا ہے۔ لہٰذا خاموشی اور سکوت۔ مگر ٹینٹوے کو حرکت دیکر اس حلق کی چبھن، بلکہ اب تو خراش؛ خیر جو کچھ بھی ہے اُسے تو صاف کرنا ہی ہے۔ مگر وہ تو کمبخت اور بھی زیادہ گندہ ہو گیا اور ہم نے ایک لمبی سانس لی، اور ذوقی نے نہایت آہستہ سے گردن موڑی۔ جیسے اُن کی آنکھوں میں جنرل نائٹ اینگل اور رحیم کارسٹ والے تیور ناچ رہے تھے۔ نظروں ہی نظروں میں ایک فنکارانہ جواب اپنے ہمعصر فنکار سے طلب کیا۔ مگر آپ جانئے حلق کی لکیر اعلیٰ کی لکیر چبھن اور چبھن اچھی خاصی خراش بن گئی۔ اور خراش وقت کی نزاکت کا اندازہ کیوں کر زبان کی حرکت، ہونٹوں کی حرکت، حلق کے بار بار اُتارنے چڑھانے کی کوئی بھی سودمند ثابت نہ ہوئی اور ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی مدتوں سے نزلہ تو ہوا نہ تھا، مگر اس وقت نہ معلوم کیوں، غالباً صاف کرنے کی کوشش میں بلغم میں تبدیل ہو گئی۔ یہ بڑا غلیظا حلق میں اٹک گیا سانس لینی دوبھر ہو گئی اور شیر کے شکار کی قانونی کتابیں پڑھا ہوا شکاری کھنکار کر حلق صاف کرنے کی خلاف قانون حرکت پر مجبور تھا۔

"اوں ہوں، اوں ہوں، اَق تھو!"

اور ذوقی نے نہایت قہر آلود نگاہوں سے گھورا، مگر ہم نے اپنی پلکوں کو سرنگوں کر کے اظہارِ ندامت اور طلب عفو کیا۔ ہم اپنی اس "اوں اوں ہوں اَق تھو" کی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے کہ اس کے متعلق کتابوں میں کیا آیا ہے۔ مگر صاحب مجبور تھے کیا کرتے۔ آپ سمجھئے جب ایک شخص کا حلق ہی رُک جائے، سانس بند ہونے لگے، تو مرتا کیا نہ کرتا۔ بیچارے کو سبھی کچھ کرنا پڑے گا۔ خیر گذشتہ را صلوٰۃ، آئندہ را احتیاط۔ اب کی مرتبہ پتھر کا بُت بن کر شیر کے شکار کے تمام و کمال آداب پوری طرح کے لئے طیار ہو کر بیٹھا بمشکل دو منٹ گزرے ہوں گے کہ میری گردن پر کوکچھ جیسے رد آہٹ کا احساس پیدا ہوا اور میں نے خیال کیا کہ شاید کوئی کیڑا درخت سے گر کر میری گردن پر رینگ رہا ہے۔ مگر جب ذرا ہوا تو دوسرے ہی منٹ وہ ہلکی کھجلی میں تبدیل ہو گیا: ہوں کھجلی ہو رہی میں نے دل میں کہا، ہونے دو ہرگز "کھجاؤں گا نہیں"، اگرچہ میں تہا سختی کے ساتھ چپ چاپ بیں و حرکت بیٹھنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ مگر اس

باوجود جتنی ضبط کرنے کی کوشش کی کم بخت اور بڑھتی گئی، اور جب ضبط کی حد سے باہر ہوگیا تو میں نے ہاتھ اُٹھا کر اور انگلیاں پیچھے لے جا کر کھجانا تو مناسب نہ سمجھا بلکہ کچھ کاندھا اُچکایا، کچھ گردن جھکائی اور کاندھے اور گردن کی رگڑ سے مطلب برآری کرنی چاہی۔ مگر افسوس کہ ہماری اس "بندر رویت" پر ذوقی صاحب بھی ادھر متوجہ ہوگئے اور کاندھا بھی کھجلی کی جگہ تک پہنچ نہ سکا۔ ہم سب کچھ جاننے کے باوجود بھی انجان بنے۔

حتیٰ کہ یہ بھی کہ ذوقی صاحب ہمارے متعلق اتنی ہی پست رائے قائم کر رہے ہوں گے جتنی کہ بلندی پر ہم اُن کے ساتھ براجمان تھے۔ مگر صاحب کھجلی کا تو یہ مشہور طریقہ ہے کہ جتنا بھول جانے کی کوشش کرو اتنی ہی اور تیز ہوتی ہے۔ اور آخر تا بکے۔ ایک دو چار منٹ بعد ہمیں ہاتھ پیچھے لے جا کر مقابلہ کرنا ہی پڑا۔ اس حرکت پر ہمارے شائستہ اور شاعر قسم کے شکاری ساتھی نے سخت نا ملائم اور غیر شاعرانہ نگاہوں سے دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم سے گویا کہا "نہایت ناشائستہ آدمی ہو جی!" خیر اب پتھر میں حرکت ہوگی مجھ میں حرکت نہ ہوگی۔ دیکھوں رونگٹا تو ہلے صبح تک!" مگر اب بھلا میں اسے کیا کروں کہ مچان پر چڑھتے وقت یا سکڑ کر بیٹھتے وقت میری ویسکوٹ کا بکسوا بل کھا کر کھڑا ہو گیا تھا اور میری پشت میں چبھ رہا تھا۔ خیر کچھ ہو جائے، چاہے یہ گوشت میں گھس ہی کیوں نہ جائے اب کی حرکت نکروں گا۔ اور میں تقریباً تین چار منٹ جی کڑا کئے بیٹھا رہا۔ بس جیسے تین چار صدیاں میری پیٹھ پر گذر گئیں عجیب سوزش تھی۔ پہلے تو صرف روپیہ برابر جگہ پر ہی محدود رہی۔ پھر چند باریک لال چیونٹیاں پیٹھ پر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر رینگتی معلوم ہوئیں خیر صاحب چیونٹیوں تک بھی بس تھا، اب تو پیٹھ پر جگہ جگہ کنکھجورے رینگ رہے تھے۔ "اونہ خواہ کچھ ہو جائے" اور ہم نہایت استقامت کے ساتھ صبر کی سل سینہ کے عوض پشت پر رکھے بیٹھے رہے۔ خیر صاحب اس وقت تک تو ہم دانتوں میں ہونٹ بھینچے بیٹھے رہے۔ جبتک کہ چیونٹیوں نے کنکھجوروں کا روپ دھارا۔ مگر جب کنکھجورے بجائے ہزار پایہ کے چوپایہ کا چولا بدل گئے اور ہماری پیٹھ "از کمر تا گردن" گھوڑ دوڑ کا میدان بن گئی تو اس ڈربی ریس کی تاب نہ لا سکے۔ بس ساری پیٹھ میدانِ حشر بنی ہوئی تھی اور بلا مبالغہ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے بکسوئے کی جگہ ببر یا شیر کا پنجہ گڑا ہوا ہے۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے۔ ایسی حالت میں اگر ہم نے اپنا ہاتھ پیچھے لے جا کر بکسوا درست کیا تو کیا قصور کیا، اور اگر ایسی صورت پیش آئی تو برینڈر، کاربٹ، نائٹ انگلیں، قطب الدین اور پرنس رنجیت سنگھ اور ہمارے پارٹنر میاں ذوقی صاحب بھی کیا کرتے۔ لیکن ہندی مقولہ کٹھور کاٹی اور سسرنگی کا معدا ہم نے بکسوا درست کرنے کی کوشش کی۔ مگر کچھ تو شکاری لباس میں کسے ہوئے، کچھ مچان پر تنگی، ہاتھ بھی بکسوئے تک پہنچ نہ سکا، اور اس حرکت میں مچان آہستہ آہستہ سے چرچرایا۔ ذوقی صاحب نے پھر ہماری جانب دیکھا۔ انداز اور تیوروں میں میزبانت اور مہمان والا حفظِ مراتب بالکل غائب، اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "میاں کہیں کھلے بندھے ہو کہ نہیں۔" اور پھر اسپورٹس مین کی مخصوص نا اُمیدی اور بیگانگی آنکھوں میں ناچ گئی۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا کہ اب خواہ کسی دوسرے "کل" پر تو چلے جائیں ہمارے "کل" پر آنے نہیں شیر، اور کچھ مکدر ہو کر منہ پھیر لیا۔

ہماری خفت کا کیا ٹھکانا تھا۔ تاہم پھر افسانۂ صبر و رضا کی تکمیل کرنے بیٹھ گیا اور تقریباً پندرہ منٹ مراقبہ میں بیٹھے گذرے، اور ذوقی حبسِ دم سا لگائے شیر کے منتظر تھے اور ہم اپنی مصیبت میں گرفتار۔ بتائیے اس کا کیا علاج تھا کہ باوجود کیمپ سے لیمنیڈ پی کر چلنے کے بھی محض بائیں جانب شاخ پر لٹکتے ہوئے کورے گھڑے کو دیکھ کر ہی ہماری پیاس مچل رہی تھی، اور ہم ضبط کئے ہوئے تھے۔ آن کی آن میں پیاس کے مارے تالو حلق اُٹھا اور پھاگن چیت کی پیاس آندھی کی طرح چڑھی ہے۔ بیچین ہو گئے ہم اور دو تین منٹ ضبط کی۔ مگر یہ کچھ ساون بھادوں کی پیاس تو ہے نہیں جو لگ کے مر جاتی ہے۔ یہ تو جیتے ہی بن پڑیگا "ہم نے دل میں کہا" اور پھر ضبط کی کوئی حد بھی ہو ـــــ رونگٹے رونگٹے سے شرارے چھوٹنے لگے "آخر یہ گھڑا پانی بھر کر کاہے کے لئے لٹکایا گیا ہے" میں نے دل میں سوال کیا "پانی پینے ہی کے لئے تو پھر کیا وجہ ہے کہ جب میں اتنا پیاسا ہوں پانی نہ پیوں!"

اور پیاس کی شدت سے بیتاب ہو کر اور ذوقی صاحب کی جانب سے آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر کلھڑ میں پانی اُنڈیلا۔ نہایت احتیاط کے ساتھ یہ خیال رکھتے ہوئے کہ گھڑے اور کلھڑ کے تصادم سے کوئی ادنیٰ سی بھی آواز نہ ہونے پائے۔ خیر صاحب: میں نے نہایت ہوشیاری سے بغیر

پانی کے گرنے یا گھڑے اور کلہاڑے کے ٹکراؤ کی آواز کئے بغیر پانی انڈیلنا شروع کیا۔ مگر آپ مانئے بڑے اور چھوٹے ظرف کا کیا ساتھ۔ گھڑا بھرا ہوا تھا اور کلہاڑ خالی، پانی بہت سا آ پڑا اور چھوٹا سا پیالہ چھلک پڑا۔ نیچے سال کے خشک پتّوں کا فرش جو ذرا سی ہوا چلنے پر بھی نقارے کی طرح بج اُٹھتے ہیں چھلک کر بلندی سے جو پانی گرا تو ٹپ ٹپ ٹپا ٹپ، ٹپ ٹپ ٹپا ٹپ جنگل کی خاموش اور پُرسکون فضا میں ہزاروں بے وقت کی شہنائیاں بج اُٹھیں، اور ذوقی نے مجھے ایسے زہریلے تیوروں سے دیکھا کہ جیسے مجھے مچان سے نیچے دھکا دینے والے ہیں۔ مگر ذوقی کے تیوروں کی پروا کون کرتا۔ ہم تو گھڑے کی خیر مانگ رہے تھے جو کلہاڑ چھلکنے کی وجہ سے سنبھالنے کی کوشش ناکام میں بدلگام ہو کر ہمارے ہاتھ کی گرفت سے آزاد ہو گیا تھا اور نہایت زور سے جھولا جھول رہا تھا اور بار بار شاخ سے ٹکرا جاتا تھا۔ ہم نے آنے والے خطرے کے احساس سے جلدی سے وہ رسّی پکڑ کر گھڑے کی حرکت پر قابو حاصل کرنا چاہا جس میں وہ جھول رہا تھا۔ رسّی پکڑ کر کلہاڑ والے ہاتھ سے گھڑے کو اک ذرا بیلنس کرنا چاہا تو بھرا کلہاڑ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا جیسے رائفل کا فیر ہوا اور کلہاڑ سنبھالنے کی تدبیر میں تدبیر الٹی، تقدیر اُلٹی سب کچھ اُلٹ گیا۔ گھڑے کی رسّی بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی، اور جھولتے ہوئے گھڑے پر ایک مزید تازیانہ سا لگا اور جمناسٹک کے فلٹتے ہوئے کھلاڑی کی طرح گھڑے نے ایک مزید جھٹکے کے ساتھ گلو خلاصی حاصل کی اور اس جست کے ردِّعمل میں شاخ سے ٹکرا کر درجۂ شہادت پا گیا۔ اڑا ٹاڑا ادوں۔ شاخ در شاخ ٹھیکرے ٹکراتے نیچے گرے۔ جیسے بادشاہ سلامت کو ایک سو ایک توپوں کی سلامی دی گئی۔ آواز اور اس کی صدائے بازگشت کی صدائے بازگشت سے دو تین منٹ تک جنگل گونجتا رہا۔ جھاڑیوں میں سے مور بول پڑے، اردگرد کے درختوں سے چڑیاں چڑچڑا کر اُڑ گئیں۔ ذوقی صاحب نے بیک محل کہ لاحول پڑھی۔ سیدھے ہاتھ والے مچان سے مینا صاحب نے خیریت دریافت کی۔ بائیں جانب سے اُستاد رضا خاں للکارے "کیا غدر مچایا ہے"۔ دور سے سردار ہنام سنگھ کی کرخت آواز سنائی دی۔ "شکار ہے کہ گدڑی بازار؟ غرض چڑی مار کا ٹولہ، بھانت بھانت کا بولا۔ ہم سب کی سُن رہے تھے۔ اور محسوس کر رہے تھے کہ نہ حلق میں بلغم ہے، نہ گردن پر

سید حرمت الاکرام

خندۂ شبنم

وقت کی گود سے خورشیدِ سحر کے مانند | زیست اُٹھی ہے نیا جذبۂ تعمیر لئے
خلدِ آدم کو بنانے کے لئے خلد بریں | ابنِ آدم کے ہر اک خواب کی تعبیر لئے

بجلیاں لرزہ براندام ہیں طوفاں خاموش | کون رکھے قدم انسان کی تکمیل کیساتھ
پستیاں مائلِ پرواز ہیں سوئے افلاک | "زندگی کیا ہے" اس اجمال کی تفصیل کیساتھ

آج شرمندہ ہے جاگے ہوئے انسان کا ضمیر | اپنے ماضی کی سسکتی ہوئی بے نوری پر
طعنہ زن آج ہے خود وارثِ آدم کا سکوت | اپنے "مختار" کی بخشی ہوئی مجبوری پہ

آج صدیوں کے ستائے ہوئے دل اور دماغ | نازفرما ہیں نئے دَور کی زینت بنکر
اور سرمایہ کی آنکھوں میں اتر آیا ہے | آج مفلس کا لہو اشکِ ندامت بنکر

اب نہ فقدان ہی کا چہرہ منوّر ہوگا | اب ضیابارِ شبِ غم بھی نظر آئے گی
کچھ گلوں کے ہی لئے وقف نہیں خندہ لبی | مسکراتی ہوئی شبنم بھی نظر آئے گی

کھجلی، نہ پشت پر بکسوا چبھ رہا ہے اور نہ پیٹ میں پیاس ہے۔ کچھ بھی نہ تھا مگر ہماری پیشانی پر ندامت کے قطرے ضرور تھے اور شیر کے شکار کے ڈرامہ میں ایکٹ شروع ہونے سے پہلے ہی ڈراپ سین ہو چکا تھا۔ رسی کے ٹکڑے میں بندھا ہوا گھڑے کے منھ کا ٹھیکرا اب بھی مزہ لے لے کر آہستہ آہستہ جھول رہا تھا اور درخت کے پتّوں پر سے پانی کے قطرے آہستہ آہستہ سال کے پتّوں پر طبلہ، نقارہ، ڈھول وغیرہ پیٹ رہے تھے، اور ہمارا بہرہ حافظ صاحب کے اُس مصرعہ کو یوں پڑھ رہا تھا ع

آں گھڑا بشکست و آں کلہاڑ نماند

سوہن لال سیٹھی

روس کا عظیم مصنّف چیخوف

روس کے عظیم مصنف چیخوف کو روسی ادب میں وہی درجہ حاصل ہے جو موپساں کو فرانسیسی ادب میں - روس میں چیخوف کا نام مختصر فسانے سے منسوب ہے اور اسے افسانہ نویسی میں ایک نئی طرز کا خالق تسلیم کیا جاتا ہے - انیسویں صدی کی دوسری ششماہی روس کی تاریخ میں روسی عوام کی ہمہ گیر پژمردگی اور سست روی کے لئے مشہور ہے - چیخوف نے اپنے افسانوں میں اسی دور کی ترجمانی کی - اس نے اپنی عظیم قوت مشاہدہ سے محنت کش اور متوسط طبقہ کی بے اطمینانی اور مایوسی اور خوشحال طبقہ کے تنزل کا جائزہ لیا اور ایک فنکار کی حیثیت سے اپنے مشاہدوں کو زینت قرطاس کیا -

ایک تجربہ کار، ہنرمند اور قابل ڈاکٹر کی حیثیت سے چیخوف نے روسی سماج کی بیماریوں کی تشخیص کی - گورکی اور ٹالسٹائی اس کے ہمعصر تھے اور وہ اس کی انتہائی سادگی، بے پایاں خلوص اور وسیع النظری کے قائل تھے - ایک موقعہ پر ٹالسٹائی نے کہا تھا کہ "چیخوف منفرد شخصیت اور خیالات کا مالک ہے اور اس کا کسی دوسرے مصنف سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کا ادب موپساں سے ملتا جلتا ہے"

چیخوف ۱۸۶۰ء میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا - اس کے باپ نے سخت محنت کر کے اپنے بچوں کو تعلیم دلائی - چیخوف کے والدین کو زندگی کی جد و جہد میں عظیم مشکلات سے دوچار ہونا پڑا - اس نے اپنی سوانح عمری میں ایک جگہ لکھا ہے - "روزمرہ کی پریشانیوں کا بار میرے کندھوں پر تھا - افلاس کے ساتھ جد و جہد میں میرا جی اکتا گیا اور میں نے رسالہ "نوودریمیا" کے ایڈیٹر سووورن کو لکھا کہ اس دنیا میں زندگی کی جد و جہد سے زیادہ تھکا دینے والی کوئی اور چیز نہیں - یہ جد و جہد تمام خوشیاں نچوڑ لیتی ہے"۔

اگرچہ چیخوف نے افلاس کے مصائب کو شدت سے محسوس کیا تاہم اس میں انہیں برداشت کرنے کی ہمت تھی - وہ اپنے باپ کی دوکان میں دل لگا کر کام کرتا یہاں اسے مختلف الطبائع انسانوں سے واسطہ پڑا اور اس نے اپنے ذہن میں اپنی زبردست قوت مشاہدہ سے ان کے عادات و خصائل - ان کی کمزوریوں اور ان کے دماغی اور جسمانی رجحانات کا ذخیرہ جمع کر لیا - سیکنڈری اسکول میں تعلیم پانے کے بعد وہ طب کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ماسکو یونیورسٹی میں داخل ہوا وہ کہا کرتا تھا کہ "میری بیگم تو دوائی ہے لیکن میری محبوبہ لٹریچر - اس کے باوجود اس نے دونوں پہلوؤں میں اپنے فن کے کمالات دکھائے - دراصل ڈاکٹروں کے پیشے نے اس کی ادبی تخلیقات میں اس کی مدد کی اور اس نے اپنے مریضوں کو تجزیاتی نقطہ نگاہ سے پرکھنے میں مہارت حاصل کر لی - اس کی قوت مشاہدہ کی روز بروز پرورش ہوتی رہی حتّٰی کہ اس نے زندگی کا ایک نیا اور جداگانہ نظریہ قائم کر لیا -

چیخوف ابھی طالب علم ہی تھا کہ اس نے اپنے خاندان کی مالی امداد کے لئے لکھنا شروع کر دیا - شروع میں ایک فرضی نام سے بہت سے رسالوں میں مزاحیہ کہانیاں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں - اگرچہ اس کی کہانیاں پڑھنے والوں میں اس کے مدّاح بھی تھے تاہم بہت سے ادیب اس کے ادب پر کڑی تنقید کرتے تھے - چیخوف غیر معمولی طور پر حساس تھا اس لئے اس تنقید کا اس پر گہرا اثر ہوا چنانچہ اس نے اپنے ایک ڈرامے میں جس کا ایک کردار ایک مصنف تھا اس امر کی وضاحت کی کہ مصنفین کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے - پچیس برس کی عمر میں چیخوف نے "زندگی بڑی عجیب ہے" کے عنوان سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جو پند و نصائح سے پُر ہے - اس کا

خیال تھا کہ ان پر عمل کرنے سے انسان اپنی زندگی کی تاریکیوں میں اُجالا پیدا کر سکتا ہے۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ کڑی سے کڑی آزمائش کے وقت بھی ہمت و استقلال کی باگ ڈور ہاتھوں سے نہیں چھوڑنی چاہئے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ خاردار گزرگاہوں کے باوجود دنیا دلچسپ ہے۔ مایوسیوں اور مصیبتوں کے باوجود دنیا عجیب ہے۔ جب چیخوف پر مایوسی اور ناامیدی کے جذبات طاری ہو جاتے تھے تو ان پند و نصائح سے اس کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔

چیخوف کی پہلی کتاب سنہ ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ تھی۔ اگرچہ ان کہانیوں میں ظاہرا طور پر مذاق اور قہقہے ہیں لیکن یہ قہقہے سماج کی دکھتی رگوں سے گندہ خون نکالنے کے لئے فصد کھولنے کا کام دیتے ہیں اور ان کی گہرائیوں میں غمگینیاں اور مایوسیاں پنہاں ہیں۔ سنہ ۱۸۹۰ء کے بعد چیخوف کے افسانوں کا رنگ روپ بدل گیا وہ زیادہ سنجیدہ اور پختہ بنتے گئے اور ان میں مزاحیہ پہلو رفتہ رفتہ ختم ہوتا گیا۔ چیخوف کے بہترین افسانوں میں "شرط" "معلم ادب" "کسان" "وارڈ نمبر ۶" "دھچکا" اور "اسٹیپ کے میدان" قابل ذکر ہیں اس کی طویل کہانی "زندگی" میں اس کا فن انتہائی عروج پر ہے۔

چیخوف کی کہانیوں کے ہیرو عام انسان ہیں جو بسا اوقات انتہائی مایوس اور آزردہ خاطر نظر آتے ہیں۔ وہ نیک امیدوں اور ارادوں کے مالک ہیں۔ آدرش وادی ہیں اور ایک خوشحال اور روشن زندگی کے خواب بنتے ہیں لیکن اپنی امیدوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی کوشش نہیں کرتے اُن کی زندگی پُر جوش نہیں۔ وہ مصمم ارادے کے مالک نہیں۔ عملی زندگی میں قریب قریب تمام بُری طرح ناکام رہتے ہیں۔ انہیں چیخوف کی ہمدردی حاصل ہے کیونکہ اس کے نظریے کے مطابق وہ حالات کا شکار ہیں اور ان کی ناکامی میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں۔ ان میں سے اکثر جن کے ذہنی رجحان کی چیخوف نے صحیح ترجمانی کی ہے اپنے غموں کو شراب ناب میں بہا دینا چاہتے ہیں اور جب وہ بالکل مایوس ہو جاتے ہیں تو خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو زمانے کو صلواتیں سناتے ہیں کیوں کہ وہ زمانے کو ہی اپنی مصیبتوں کے لئے ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اس قسم کے مایوس انسان چیخوف کی کہانیوں کے کردار ہیں اور انہی کی بدولت چیخوف اپنے دور کا کامیاب ترین اور ہردلعزیز مصنف ہے۔

چیخوف کے ڈرامے اپنے پس منظر اور مزاج اور سنجیدگی کے لحاظ سے اس کے افسانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ شروع شروع میں اس کے ڈرامے جنہیں سٹیج بھی کیا گیا چنداں کامیاب نہ ہوئے۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں جب اس کا ڈرامہ "سمندری پرندہ" اسٹیج کیا گیا تو اسے عظیم کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کے ڈرامے "چیری کا باغ" کے متعلق ایک برطانوی تنقید نگار نے کہا ہے کہ یہ چیخوف کا بہترین ڈرامہ ہے اور جس روز اسے اسٹیج کیا گیا وہ چیخوف کی زندگی کا کامیاب ترین روز تھا۔

اگرچہ چیخوف اپنے دور کی سماجی حالت سے مطمئن نہیں تھا تاہم وہ کوئی انقلاب پسند نہیں تھا وہ ایک فن کار تھا جس کے قلم نے کمینگی، کم ظرفی، خود پرستی، تنگ نظری اور تحمق کے خلاف جہاد کیا اور اپنی تصانیف میں ان برائیوں کا مضحکہ اڑایا۔

اپنی زندگی کے آخری ایام چیخوف کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے کریمیا کے جنوبی ساحل اور جرمنی کے دوسرے صحت افزا مقامات پر بسر کرنا پڑے۔ اس وقت اس کی صحت گر چکی تھی۔ ۲ جنوری سنہ ۱۹۰۴ء کو جنوبی جرمنی کے صحت افزا مقام بیڈن ویلر پر اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

گورکی کہا کرتا تھا: "چیخوف کی یاد ہماری زندگی میں ایک نئی روح پھونک دیتی ہے اور زندگی کا ایک صاف اور یقینی مقصد ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔"

اختر تاباں

ترقی پسند شادی

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب میں سینۂ ابھار کر چلا کرتا تھا۔ میری شادی کے تذکرے گھر گھر تھے۔ جس طرف دیکھیے میرا ہی ذکر تھا اور جس گھر میں گھس جائیے میرا ہی فوٹو لٹکا ہوا تھا۔ شادی ایک بہت ہی نازک مسئلہ ہے جس سے ہر نوجوان کو دلی محبت ہوتی ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر اس معاملے میں [illegible]نی غور و خوض کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر شادی میں ذرا بھی کسی قسم کی رکاوٹ [illegible] مشکل پیش آئے تو میری رائے میں ہر نوجوان مرد اور عورت کو کم از کم اس معاملے میں مردانہ جواں مردی اور جواں عورتی سے کام لینا چاہئیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس سلسلے میں جس قدر دلیری سے میں نے کام لیا تھا اس کی مثال انڈومان نکوبار میں بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ اور یہ ثابت قدمی میرے لئے ضروری بھی تھی کیونکہ شادی میری ہو رہی تھی۔ میرے والد صاحب کی [illegible]ہیں میں نے تنبیہ کر لیا تھا کہ اگر گھر والوں نے شادی کے سلسلے میں ذرا بھی [illegible]ون و چرا کی تو میں سیدھا یو۔ این۔ او پہنچوں گا۔ کیونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس سے بین الاقوامی امن کو خطرہ لاحق ہوتا تھا۔ والد صاحب بھی چراغ کی لو میں بال سیاہ نہیں کئے تھے میری بات کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے مجھکو فریڈم آف اسپیچ، پریس اینڈ تماش کے ساتھ ساتھ فریڈم آف چوائس بھی دے دی تھی۔ اور نہ صرف یہ [illegible]یا تھا بلکہ جتنی ہنرمند لڑکیاں نظر میں تھیں ان سبکے پیغام اور تصاویر کسی نہ کسی طرح حاصل کر لی تھیں۔ پیغاموں کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ والد صاحب کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ کتنے ہیں اور کہاں کہاں سے آئے ہیں۔ پیغاموں میں تصاویر کے علاوہ گورنروں اور وزیروں کی سفارشیں بھی شامل تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ ان تمام تصاویر کو ایک مرتبہ تو ضرور دیکھ لوں۔ چنانچہ ایک دن موقع ڈھونڈھ کر والد صاحب کی الماری سے نکال لیں اور سیدھا پہنچا دریا کے کنارے۔ کیونکہ وہاں دھوبیوں کے سوا اور کسی کے آنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ دل تشکر کے جذبات سے لبریز تھا، اس لئے سب سے پہلے دو رکعت نماز شکرانے کی ادا کی۔ اس کے بعد ایک سلسلے سے تصویریں دیکھنا شروع کیں۔

یہ عجیب بات تھی کہ تصاویر جغرافیے سے بہت متاثر تھیں یعنی ایک صاحبہ کی تصویر مدراس سے آئی تھی —— بھونڈے کا سا رنگ، ہونٹ بھٹے ہوئے۔ ناک پھولی ہوئی جامن کی طرح اور منہ ——؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھلے کی ناپ سے بنوائی گئی ہے۔

ایک تصویر پر نظر پڑی جو جودھ پور سے آئی تھی —— چہرہ مرجھایا ہوا، ہونٹ لٹکے ہوئے، پریشان حال۔ تصویر کیا تھی ریاس کا مجسمہ تھی جس کے ہر نقطے سے "واٹر پلیز" کی صدا نکل رہی تھی —— پہاڑ والی تصویر کا تذکرہ خطرے سے خالی نہیں۔ نہ معلوم کس کس سے دشمنی مول لینا پڑے۔

ایک صاحبہ کا پیغام دلی سے آیا تھا۔ اس کے متعلق صرف اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ اگر وہ تصویر کہیں شاعروں کے سامنے پیش کر دی جاتی تو وہ اسی روز سے معشوق کو سرو کے بجائے قطب مینار سے تشبیہ دینا شروع کر دیتے اور ہجر کی پہاڑ سی راتیں قطب کی لاٹ کی طرح طویل ہونے لگتیں۔

یوں تو ہر تصویر کو آب و ہوا سے گہرا تعلق تھا لیکن سب سے عجیب تصویر جو مجھے معلوم ہوئی وہ سرحد سے آئی تھی۔ فونٹین پن میں تو اتنی طاقت نہیں کہ اس کا صحیح نقشہ کھینچ کر سادہ کاغذ خراب کرے۔ بس یوں سمجھیے کہ اگر مجھ سے بڑا ریاضی داں مر بھی جاتا تو شاید اس کی باہوں اور میری رانوں میں کوئی فرق نہ نکل پاتا یعنی اقلیدس کی رو سے (اس کی باہیں) — (میری ران) = صفر بس یہی ثابت کرنا تھا

میں تقریباً تصویر کو بغور دیکھتا گیا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی شادی کے قابل نہیں تھی۔ وہ باتیں ہی دوسری ہوکر شوکیس کیلئے بھی موزوں تھیں۔ میں عجیب کشمکش وپیچ میں پڑگیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ ان تمام لڑکیوں میں مجھے کوئی بھی پسند نہیں تھی۔ اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ میری فریڈم آف چوائس انہیں تصویروں تک محدود ہے۔ والد صاحب نے تمام پیغام بڑی محنت سے جمع کئے تھے جس طرح سے عام طور پر لوگ ٹکٹ، سکے، تصویریں اور بیویاں جمع کرتے ہیں وہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ میں ان تمام امیدواروں کو ناامید کردوں جن کی درخواستیں ہندوستان کے تقریباً ہر کونے سے آئی تھیں۔ ایکبارگی ارادہ ہوا کہ اسی دریا میں کود پڑوں تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ ابھی کھانا تو کھایا ہی نہیں پس اس ارادے کو ترک کردیا۔

بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر سوچا، پھر سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن واہ رے دماغ، خوب ساتھ دیا ہے۔ فوراً خیال آیا کہ میرے اتنے دوست ہیں، اگر وہ اس آڑے وقت میں کام نہ آئیں گے تو پھر آخر وہ ہیں کس مصرف کے۔ انہیں کے ذریعے سے بھوک ہڑتال کروا دوں۔ پھر دماغ اس سے بھی زیادہ بلندی پر پرواز کرنے لگا۔ یعنی جب میں اس اسکیم کے دور رس نتائج پر پہنچا تو مجھے اس ارادے کو بھی ترک کرنا پڑا ——

ظاہر ہے کہ بھوک ہڑتال کے بعد لاٹھی چارج ضروری تھا۔ نتیجہ —— ؟

دو چار زخمی —— چار چھ گرفتار —— جیل —— مقدمہ ——

جیل —— اور ہم پھر کنوارے کے کنوارے —— یعنی ع

پھر آگئے وہیں پہ جہاں سے چلے تھے ہم

میں اسی فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اس وقت بڑی پرفریب چال کی ضرورت تھی رہ رہ کر غصہ آتا تھا کہ انگریزوں نے دوسو سال تک حکومت کی۔ اُن کی ہر اچھی بُری عادت کی تقلید کی۔ ان کے جاری کئے ہوئے ٹکٹ اور لفافے کارڈ سے کام چلاتے رہے لیکن افسوس اُن کی ایک خصوصیت اب تک اپنے اندر نہ پیدا کر سکے ——

عیاری اور چالبازی —— کاش میں اس ہنر سے واقف ہوتا تو آج کیوں اس قدر پریشانی ہوتی۔

پھر نہ معلوم کس طرح طبیعت نے پلٹا کھایا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پژمردگی کے آثار دور ہونا شروع ہو گئے۔ چہرے پر رونق آگئی۔ فوراً سائیکل سنبھالی اور ایک سمت روانہ ہو گیا۔ میں اب گھر جانے کے عوض ایک نہایت ہی خوش فضا بلکہ خوش مکان سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ دائیں طرف دیکھئے تو کوٹھی۔ بائیں طرف دیکھئے تو کوٹھی۔ سامنے تو خیر کوٹھیاں تھیں ہی لیکن جب میں نے پیچھے کی کوٹھیوں کا جائزہ لینے کے لئے اپنی گردن موڑی تو ایک بڑے سے نالے نے مجھے اپنی آغوشِ محبت میں لے لیا۔ لیکن شرمندگی نہیں اٹھانا پڑی کیونکہ سڑک پر کوئی بھی نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی سڑک پر جس کے کنارے بڑے بڑے مالدار لوگوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہوں، صرف موٹروں ہی کی گذر ہو سکتی ہے اور وہ بھی ایسی کہ آگے سے آئیں اور دوں سے گذر گئیں۔ پیچھے سے آئیں اور سرچ کا سوٹ گرد آلود کرتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں اہل کار. سینڈل سے کشتی لڑیں گے یا کسی غریب کو نالے سے اپنی سائیکل نکالتے ہوئے دیکھیں گے۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک کوٹھی پر جا کر رک گیا۔ میں مکان میں اندر جانے کے عوض اُس کی پشت پر جا نکلا، جہاں نوکروں کے مکانات تھے، کیونکہ وہاں خفیہ پولس کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا ہے۔ ایک رازدار نوکر کی معرفت انجم کو بلوایا۔ انجم وہ ہستی ہے جس کا تعارف خود بخود ہو جائے گا۔ وہ میرے دل کی کنٹرولر تھی۔ میں اسی کی وجہ سے زندہ تھا۔ اُسی کی وجہ سے میری سانس چلتی تھی حتیٰ کہ میری شریانوں میں خون کی روانی بھی اسی کے دم سے تھی۔ سگرٹ پیتا تو اسی کے لئے۔ پان کھاتا تو اسی کے واسطے اور کپڑے میں ٹھیک جائے اور نمک پارے اڑاتا تو اسی کی خاطر۔ غرض کہ میری ہر حرکت اس کے وجود سے اس طرح وابستہ تھی جس طرح اسٹیرنگ سے پہیے یا ٹیلیگراف آفس سے ٹیلی گرام یا آل انڈیا ریڈیو سے ہمارا ریڈیو۔

انجم آگئی۔ اس کی آمد نے مجھ پر معجون کا سا اثر کیا۔ میں نے ایک طرح کا سکون محسوس کیا اور اپنے آپ کو ایسی فضا میں تصور کرنے لگا جہاں فکر و پریشانی سے نجات تھی۔ جہاں صرف میں تھا —— میری انجم —— اور میری سائیکل۔

انجم نے میری آمد کی وجہ دریافت کی۔ میں نے کہا "انجم! اب تک

میں نے تم سے کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔ ایک شیو نگ سٹ کے سوا لیکن آج میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ تم کو میری مدد کرنا ہوگی۔ امید ہے کہ تم دھوکا نہ دوگی۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں نہ صرف ہم دونوں کی زندگیوں کا سوال ہے بلکہ جواب بھی اسی میں موجود ہے۔"

انجم میری علمی لیاقت اور تقریری قابلیت کی پہلے ہی سے قائل تھی اور انھیں خوبیوں کی وجہ سے اُس کو مجھ سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ بھلا اس لسانی کی کب تاب لا سکتی تھی۔ اپنی قومی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے فوراً آنکھوں میں آنسو بھرے اور بولی "لِللّٰہ کر اس ورڈس نہ مل کر آئیے صاف صاف بتائیے کہ معاملہ کیا ہے"؟

میں نے کہا "اچھا اگر تم میری گفتگو کی تاب لا سکتی ہو تو سنو، مجھے اس وقت تمہاری تصویر کی ضرورت ہے، اسی وقت!"

انجم نے اطمینان کی سانس لی۔ جیسے اس وقت وہ کسی بڑی فرمائش کی توقع رکھتی تھی۔ وہ شاید سمجھتی تھی کہ میں کسی ڈرامے کے سلسلے میں اس کی ساری مانگنے آیا ہوں جس کو جدا کرنا وہ دوسری عورتوں کی طرح کسی حالت میں گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ پھر بھی اُس نے حیرت کے ساتھ پوچھا "آخر آپ اس کا کیجئے گا کیا؟"

اور جب میں نے اُس کو یقین دلا دیا کہ اس کی تصویر اپنی تصویر کے ہمراہ السٹریٹڈ ویکلی میں نہیں بھیجوں گا تو اُس نے ایک بہت ہی عمدہ تصویر لا کر میرے حوالے کر دی۔ بھلا اس کے پاس تصویروں کی کیا کمی تھی۔ کوئی فوٹوگرافر ایسا نہ تھا جسے انجم کی تصویر اتارنے کا فخر حاصل نہ ہو، یا یوں سمجھئے کہ انجم کے بیگ سے اٹھکھیلیاں کھیلنے کا موقع نہ ملا ہو، اور یہ واقعہ ہے کہ فوٹوگرافروں کے علاوہ میرا اور کوئی دوسرا رقیب تھا بھی نہیں۔ تصویر دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے چاہا کہ تصویر کو گلے سے لگا لوں۔ لیکن انجم نے سیز فائر کا حکم دے دیا۔

میں نے گھر جانے کیلئے سائیکل سنبھالی اور انجم کی طرف مسکرا کر دیکھا —— انجم نے بھی مسکرا کر دیکھا —— میں دوبارہ مسکرایا —— انجم بھی دوبارہ مسکرا دی —— اور جب میں سہ بارہ مسکرایا تو سچ مچ انجم بھی سہ بارہ مسکرا دی۔

گرمیوں کی دوپہر تھی اور میں انجم کے گھر سے روانہ ہو کر اپنے گھر جا رہا تھا۔ خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مسرت کی لہر چہرے پر اتنی درخشاں تھی کہ ہر راہگیر مجھے مسکراتا دیکھ کر پاگل سمجھتا تھا۔ سائیکل ہوا سے گفتگو کر رہی تھی۔ میں سینۂ بازار کو چیرتا ہوا گھر کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ قبلہ والد صاحب گھر کی سمت خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں۔ کیا بتاؤں سائیکل تلے سے زمین نکل گئی۔ فوراً سائیکل موڑ لی اور دوسرے راستے سے گھر پہنچا۔ پسینے میں شرابور۔ ایک ایک جوڑ درد کر رہا تھا۔ لیکن ہوش کس کو تھا۔ سب سے پہلے انجم کی تصویر ان تصاویر میں شامل کر کے والد صاحب کی الماری میں رکھی تب کہیں جا کر کپڑے تبدیل کئے۔ پانسہ پھینک دیا تھا۔ نتیجے کا انتظار تھا۔

دوپہر کا کھانا میز پر لگا دیا گیا۔ والد صاحب، والدہ صاحبہ، بھائی جان اور بھابی جان صرف یہ چار اشخاص موجود تھے۔ میری شرکت نے ان حضرات کو اکابرِ خمسہ کی حیثیت دے دی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں؟ اس وقت کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی تھی کہ کہیں بھابی جان اس نازک موقعے پر جبکہ آنتیں قُلْ ھُوَاللّٰہ پڑھ رہی ہیں شادی کا تذکرہ نہ چھیڑ بیٹھیں۔ کچھ اُن کی شوخ طبیعت کی وجہ سے ڈر تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ اُن کی رشتے کی ایک بہن تھیں —— حسین —— جوان —— اور —— تندرست یعنی موٹی —— نسیمہ اُن کا نام تھا جس کے لئے وہ ایک فلم ایکٹرس کی مرہونِ منت تھیں۔ بھابی جان اُن کو بطور رانی کیس مجھے دینا چاہتی تھیں۔ مگر میں اُن سے بہت گھبراتا تھا۔ اور نہ صرف اُن سے بلکہ اُن کے تصور سے بھی، کیونکہ اُن کا تصور بھی اتنا ہی قوی ہیکل تھا جتنی کہ وہ۔ مجھے اُن کا فٹ بال جیسا گول اور سخت جسم قطعی ناپسند تھا۔ بھابی جان سے بذاتِ خود کسی معاملے میں اختلاف نہ تھا اور نہ ہی کسی شریف آدمی کو اپنی بھابی سے ہونا چاہیئے۔ میں نے کئی مرتبہ صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار کر بھی دیا۔ لیکن توبہ کیجئے۔ بھابی جان پکّی چار سو بیس تھیں۔ وہ سمجھی تھیں کہ نسیمہ کا بار بار تذکرہ میرے دل کو موم کر دے گا۔ شاید وہ نہیں جانتی تھیں کہ کسی چیز کی زیادتی بھی بُری ہوتی ہے اور جبر سے ہمیشہ نفرت کا جذبہ اُبھرتا ہے، محبت کا نہیں۔

ایک دن میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ بھابی جان! میں نسیمہ سے ہرگز

شادی نہیں کرسکتا۔ اگر آپ کو بہت زیادہ فکر ہے تو آپ خود کر لیجئے۔ یا بھائی جان کے لئے انتظام کرا دیجئے۔ لیکن وہ تو کسی نے کہا ہے کہ عورت کی ایک ہنسی دُنیا کی بڑی سے بڑی اٹل بات کو بھی ٹال سکتی ہے تو پھر بھلا میری کیا حیثیت تھی۔

کھانا سب نے ماتمی طریقہ پر کھایا یعنی خاموشی، سلیقے اور سنجیدگی کے ساتھ۔ بھابی جان نے دو ایک دفعہ اشارتاً کچھ کہنا بھی چاہا لیکن والد صاحب کی ایک "ہوں" نے سب کو خاموش کر دیا۔ اس کے علاوہ بھائی جان نے بھی اپنا حق سمجھتے ہوئے بھابی جان کو بہت تیز نظروں سے گھورا۔ اس لئے کہ ہم لوگوں کی موجودگی میں وہ اس سے زیادہ جرأت دکھا بھی نہیں سکتے تھے۔ کھانے کے بعد بھابی جان نے والدہ صاحبہ کو پھانسنا چاہا لیکن اُنھوں نے میرے حوالے سے والد صاحب کا نام لیتے ہوئے کہا۔ "میں اُن سے گفتگو کروں گی تب کوئی رائے دے سکتی ہوں"

دوسرے دن ناشتے کے بعد "چوکر میز کانفرنس" ہوئی۔ والد صاحب صدر تھے۔ سب سے پہلے اُنھوں نے ایک تحریک پیش کی جس کے ذریعے وہ ویٹو کے اختیارات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ تحریک کثرت آراء سے نامنظور ہو گئی۔ صرف والدہ صاحبہ نے اس تحریک کے حق میں ووٹ دیا۔ والد صاحب نے واک آوٹ کی دھمکی دی۔ مگر صاحب یہاں کوئی ڈرنے والے تھے! نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک واپس لے لی گئی۔

بھائی جان نے مختلف پیغامات پڑھ پڑھ کر سنائے جن میں سے اکثر اس وجہ سے رد کر دیئے گئے کہ اُن کی عبارت ٹکسالی اردو میں نہ تھی۔ کچھ اس وجہ سے رد کئے گئے کہ اُن کے نام عجیب عجیب سے تھے۔ جب نمبر آیا تو میں نے اُٹھ کر کہا "جناب صدر! ذرا ملاحظہ تو فرمایئے کیسا عجیب سا نام ہے ـــــ بالکل فلمی ہے ـــــ میرے خیال میں نہ صرف یہ پیغام روک دینا چاہیئے بلکہ ساتھ ساتھ نجمہ دیوی کو رائے بھی دینا چاہیئے کہ وہ اپنا نام فوراً تبدیل کر دیں"

یہ تحریک منظور ہو گئی۔ بھابی جان نے موافقت میں رائے دی تھی اور وہ کیوں نہ دیتیں۔ وہ تو چاہتی تھیں کہ تمام پیغامات نامنظور ہو جائیں۔ تاکہ اُن کو اپنا اڑنگا لگانے کا موقع ملے۔ "گیتی آرا" کا جب نام پیش ہوا تو میں بولا "معزز صدر! یہ نام آری اور کلہاڑی سے مشابہ ہے۔ آری کا شوہر آرا ہوتا ہے۔ دوسرے آرا چلانا خطرناک قسم کا محاورہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ نام اشتراکی قسم کا واقع ہوا ہے۔ گیتی۔ آرا۔ کلہاڑی۔ پھاوڑا، ہتھوڑا، یہ سب مزدوروں کی نشانیاں ہیں جن کی مدد سے وہ حکومتوں کے تختے، ٹھونکتے پیٹتے اور اُلٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔ ذرا آپ خود سوچئے کہ کسی مسلمان کے گھر میں کسی اشتراکی کا (کہ جس کا ماخذ شرک ہے) کیا کام!"

اس کے بعد متعدد نام پیش ہوئے اور رد ہوئے۔ اس میں میری اور بھابی جان کی کوششیں شامل تھیں۔ لیکن اب مقابلہ دو بڑی طاقتوں کا تھا بھابی جان اپنی قوم کی گھاگ یعنی کٹنی تھیں اور میں اپنے فرقے کا گھاگ یعنی سیاست داں۔ کانفرنس کافی دیر سے ہو رہی تھی۔ کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ بھوک کی وجہ سے عمدہ عمدہ نکات دماغ سے غائب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بحث کو ملتوی کرنے کا ذریعہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنے میں باورچی خانے سے ہماری "بڑی بی" تیزی کے ساتھ نکلیں اور آ کر صدر صاحب کی خدمت میں ایک تحریک پیش کی۔

"اس ایوان کی رائے میں یہ جلسہ بسلسلۂ خورد و نوش ایک گھنٹہ آدھ منٹ کے لئے ملتوی کیا جاتا ہے"

یہ تحریک منظور ہو گئی۔ کانفرنس کا پہلا اجلاس ملتوی ہو گیا۔ اور سب لوگ اپنی اپنی بغلوں میں فائلوں کا انبار دبائے پارلیمنٹ ہاؤس سے نکل کر ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے میں گھس گئے۔

کھانا کھا کر سب لوگ اپنی اپنی رپورٹ تیار کرنے لگے۔ دوپہر میں پھر اجلاس ہوا۔ واقعات کو طول دینا بیکار ہے۔ کیونکہ ایسے اہم ترین معاملات کا اظہار عوام کے مفاد کے خلاف ہے۔ کانفرنس ہوئی اور کامیاب ہوئی۔ بھابی نے شکست کھائی اور منہ کی کھائی۔ بس یوں سمجھئے کہ اگر وہ بھائی جان کے حلقۂ نکاح میں نہ ہوتیں تو کب کی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہوتیں۔ کانفرنس ہمیشہ کے لئے ملتوی کر دی گئی۔

میں نے سائیکل سنبھالی اور سیدھا انجم کے گھر پہنچا، تاکہ اُسے خوشخبری سناؤں۔ اب مجھے انجم سے چھپ کر ملنے کی ضرورت نہ تھی۔ انجم کے باپ مجھے بے حد سعادت مند سمجھتے تھے۔ میرا ان کے یہاں آنا جانا اکثر ہوتا تھا۔ البتہ جب انجم سے ملنا ہوتا تھا تو نوکروں کے گھر موجود تھے۔ ایک مرتبہ

فرمانے لگے "ارے بھائی تم جیسا سعادت مند لڑکا تو میری نظر سے آج تک گذرا ہی نہیں"

لیکن میں نے نہایت انکسار سے اُن کی بات رد کرتے ہوئے کہا "نہیں صاحب یہ بات نہیں ہے۔ دراصل یہ آپ کی آنکھ کی کمزوری ہے کہ مجھ سے اچھا لڑکا نہ دیکھ سکے"

"ہاں خوب یاد دلایا۔ مجھے اپنی آنکھ ٹیسٹ کرا کے چشمہ خریدنا ہے"

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ نہ صرف مجھے سلیم الطبع سمجھتے تھے بلکہ اپنا ہمدرد بھی تصور کرتے تھے۔

سائیکل کے پہیئے انجم کے گھر پر جا کر خود بخود بغیر کسی بریک کی مدد کے رُک گئے۔ میں بے دھڑک دیوان خانے کے اندر گھس گیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس وقت وہ اپنی لڑکی کا ٹیوشن کر رہے ہوں گے۔ دیکھا کہ کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہیں۔ فوراً ایک زوردار سلام جھاڑا۔ ایک دم گویا اُچک ہی تو پڑے "اخاہ تاباں صاحب! کہئے اس وقت کیسے آنا ہوا۔"

میں نے کانفرنس کی پوری روداد سنا دی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ اور مجھے خوش کرنے کے خیال سے بھابی جان کی غیر سماجی حرکتوں کی سخت ترین مذمت کی۔ اس کے بعد بولے "اب جبکہ تمہارے والد نے رضامندی ظاہر کر دی ہے، میں کوشش کروں گا کہ یہ بات ایک انٹر والدین کانفرنس کر کے پختہ کر لی جائے"

میں نے بھی یقین دلایا کہ کانفرنس سے پیشتر ہی ہم لوگ ایک گڈوِل مشن بھیجیں گے تاکہ ہونے والی کانفرنس پر اچھا اثر پڑے، اور انجم کو مجھ سے کنزرج کرنے کے سلسلے میں جو دشواریاں پیش آئیں اُسے بغیر کسی ڈیڈ لاک کے طے کر لیا جائے۔

اور جب اِس بات کی اطلاع انجم کو ملی تو جیسے وہ پاگل سی ہو گئی اُس کی مسرّت کا حال نہ پوچھئے۔ عالم انبساط میں شمشاد بیگم کے یکے بعد دیگرے سب ہی گانے گا ڈالے۔ اُس کی سریلی آواز صحیح معنوں میں اُس کے جذبات کی آئینہ دار تھی۔

دھرتی کو آکاش پکارے
آجا کرجا پریم دُوارے

وہ بیحد خوش تھی۔ جیسے کسی بیوہ کو اپنے نکاح ثانی پر، یا کسی ماں کو اپنے بیٹے کی ختنہ پر۔ یا پھر جیسے کسی دادی کو اپنے پوتے کی پیدائش پر

خدا خدا کر کے شادی کا زمانہ آگیا۔ سارے براتی موٹروں جیپ کاروں، سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں پر لد کر ایک جلوس کی شکل میں روانہ ہوئے۔ سب سے پیچھے سائیکل، اُس کے آگے موٹر سائیکل، پھر جیپ اور پھر موٹر کار، سب سے پہلی کار میں باڈی گارڈ تھے۔ اس کے پیچھے نوشہ آنکھوں میں شوہرانہ چمک لئے ہوئے بیٹھا تھا، جیسے ساری مارشل ایڈ اسی کے حصے میں آئی ہو۔ اور ان سب کے آگے آگے پریس کے نمائندے اور فوٹوگرافرس، پٹرول بچانے کی خاطر موٹروں کو ریل گاڑی کے ڈبوں کی طرح موٹے موٹے رسّوں کی مدد سے باندھ دیا گیا تھا۔ باجے گاجے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ البتہ موٹروں کے ہارن کچھ اس ترتیب سے بجائے جا رہے تھے کہ شہنائی کا لطف دے رہے تھے۔

"ان" لوگوں نے روشنی کا معقول انتظام کیا تھا۔ ہر طرف مشعل اور فانوس کے بجائے سرچ لائٹ اور ٹارچ روشن تھیں۔ دفعہ ۱۴۴ پہلے ہی پولس نے نافذ کر دی تھی۔ نکاح نہایت سادہ طریقے پر ہوا۔ میں نے چند ہزار سکہ رائج الوقت کے عوض تین بار "قبول کیا" کہہ کر انجم کا بھاؤ تاؤ کر لیا۔ نکاح کے بعد حاضرین پر چھواروں کے بجائے کیک پیسٹری کی بوچھار کی گئی۔ چھوارے تو وہ بانٹے جس کا دل سُکڑ کر چھوارہ ہو چکا ہو۔ دوسری طرف ایک غیر مسلح گارڈ نے گیارہ چھتوں کی سلامی دی، اور بینڈ نے مبارک سلامت کا نغمہ بلند کر کے شہر بھر میں زلزلے کا سا احساس پیدا کر دیا۔ نہ یہ سول میرج تھی اور نہ شرعی نکاح۔ یہ بیچاری تو ایک سیدھی سادی "ترقی پسند شادی" تھی۔



نیشنل ایمپلائمنٹ سروس

۱۹۱۹ء میں انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کے چارٹر پر ہندوستان نے سب سے پہلے دستخط کئے تھے جس میں یہ اصول تسلیم کیا گیا تھا کہ جملہ ممبر ریاستوں میں شہریوں کو ملازمت دلانے کے لئے گورنمنٹ کے ماتحت کوئی ادارہ ہونا چاہیئے۔ لیکن صحیح معنوں میں اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا کام ۱۹۴۵ء میں ہوا جب کہ حکومت ہند نے سابقہ فوجی ملازمین کو کام دلانے کی غرض سے ملک بھر میں ایمپلائمنٹ ایکسچینج قائم کئے۔ یہ ادارے ملازمت کے متلاشیوں کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔

یہ ادارہ ڈائرکٹر جنرل آف ری سیٹلمنٹ اینڈ ایمپلائمنٹ کے ماتحت کام کر رہا ہے جو کہ اس کی نگرانی اور نظم و نسق کے ذمہ دار ہیں۔ نظم و نسق کی سہولیت کے پیش نظر ملک کو دس علاقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ایک علاقہ ریجنل ڈائرکٹر کے تحت ہوتا ہے۔ ہر ایک علاقے میں ایک ریجنل ایمپلائمنٹ ایکسچینج چند سب ریجنل ایمپلائمنٹ ایکسچینجز اور ڈسٹرکٹ ایمپلائمنٹ آفس ہوتے ہیں۔ اس وقت ملک بھر میں ۸ ریجنل ایمپلائمنٹ ایکسچینجز، ۴۶ سب ریجنل ایمپلائمنٹ ایکسچینجز اور ۵۵ ڈسٹرکٹ ایمپلائمنٹ آفس موجود ہیں۔ جو اپنے ملحقہ علاقوں میں شہریوں کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ ہر ایک ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے لئے الگ الگ حلقہ مقرر ہے۔ بالفرض محال اگر کسی دوسرے حلقے سے ملازمت کے متلاشی پوچھ تاچھ کریں تو انہیں اپنے متعلقہ حلقے کے ایمپلائمنٹ ایکسچینج سے رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

امیدواروں کا انتخاب

جب کسی ادارے سے کسی آسامی کے لئے امیدوار بھیجنے کی مانگ آتی ہے تو تمام امیدواروں کو جو اس ٹریڈ کے لئے رجسٹر کئے گئے ہوں زیر غور رکھا جاتا ہے۔ چونکہ محدود تعداد میں امیدواروں کو بھیجنا ہوتا ہے اس لئے ادارہ ایمپلائمنٹ انڈکس کارڈوں کی دیکھ بھال کرتا ہے تاکہ مستحق امیدواروں کا انتخاب کیا جا سکے۔ اس کے بعد ان امیدواروں کو ادارے میں حاضر ہونے کے لئے اطلاع دی جاتی ہے۔ بعد میں انہیں ملازمت کی شرائط وغیرہ بتا کر متعلقہ دفتر میں بھیج دیا جاتا ہے۔ نیز ان امیدواروں کی ایک فہرست متعلقہ ادارے کو بھیج دی جاتی ہے۔

ٹریننگ سکیمیں

تقریباً ۱۵۰ ٹیکنیکل اور ووکیشنل ٹریننگ سنٹر ملک بھر میں کھولے گئے ہیں۔ جہاں ۵۰ مختلف پیشوں کی ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ گذشتہ سال تک صرف سابق فوجیوں اور شرنارتھیوں ہی کو ان سنٹروں میں ٹریننگ کے لئے بھیجا جاتا تھا لیکن اب یہ رعائتیں ہر ضرورت مند کے لئے مہیا کی گئی ہیں۔

دہلی میں بھی ریجنل ایمپلائمنٹ ایکسچینج اپنے حلقے کے لوگوں کی گرمی سے خدمت سر انجام دے رہا ہے۔ ذیل کے اعداد و شمار سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ یہ ادارہ کتنا مفید کام کر رہا ہے۔

	اوسط ششماہی	اعداد برائے ستمبر ۱۹۵۰ء
اُن امیدواروں کی تعداد جو رجسٹر کئے گئے	۴۴۸۸	۴۲۶۸
اُن امیدواروں کی تعداد جن کو ملازمت مل گئی	۵۱۲	۵۰۵
ان اسامیوں کی تعداد جو رجسٹر کی گئیں	۸۰۳	۶۹۹
ان اسامیوں کی تعداد جو پُر کی گئیں	۵۱۴	۵۰۵
ان اسامیوں کی تعداد جو منسوخ کی گئیں	۲۴۲	۲۸۹
ان اسامیوں کی تعداد جو ابھی خالی ہیں	۸۸۱	۸۶۴
ان مالکان کی تعداد جو ایکسچینج کی خدمت حاصل کر رہے ہیں	۲۳۶	۲۴۶

ذیل میں ڈاکٹر این داس پی۔ ایچ۔ ڈی۔ آئی۔ سی۔ ایس ڈائرکٹر جنرل ری سیٹلمنٹ اینڈ ایمپلائمنٹ کی ریڈیو تقریر کے اقتباسات ناظرین کی معلومات میں اضافے کے پیش نظر درج کئے جاتے ہیں۔ یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو

دہلی سے بدھوار مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۲ء کو براڈ کاسٹ کی گئی تھی۔

مجوزہ اقتصادی اسکیم میں ایمپلائیمنٹ سروس کا حصہ

.... پانچ سال کی مدت گذری جب کہ ہندوستان میں نیشنل ایمپلائیمنٹ سروس قائم کی گئی۔ اس مدت میں اس ادارے کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ ہندوستان میں یہ نئی قسم کا تجربہ تھا۔ لوگوں کو اس کی اہمیت ذہن نشین کرانی تھی یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ لوگوں کو ملازمت دلانے کے سلسلے میں تسلی بخش کام ہوا ہے۔ ذیل کے اعداد و شمار سے آپ پر بخوبی روشن ہو جائے گا کہ نیشنل ایمپلائیمنٹ سروس نے کتنا مفید کام اب تک کیا ہے۔

(۱) ان اداروں یا مالکان فرم وغیرہ کی تعداد جو ایمپلائیمنٹ ایکسچینجز کی خدمت حاصل کر رہے ہیں) جولائی ۱۹۵۲ء میں ۱۹۱۹،۶ تک پہنچ گئی جب کہ جولائی ۱۹۴۷ء میں یہ تعداد صرف ۱۰،۵۳ تھی (۲) ان لوگوں کی تعداد جنھوں نے اپنا نام بطور امیدوار رجسٹر کرایا جولائی ۱۹۵۲ء میں ۱۷،۰۱،۲۱ تھی جب کہ تین سال پہلے ان کی تعداد ۱۷،۵۶،۱۵ تھی۔ (۳) ان لوگوں کی تعداد جن کو ملازمت دلائی گئی۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں ۹۳،۲۹۲ تھی جب کہ جولائی ۱۹۴۷ء میں یہ تعداد محض ۶۸۳،۲ تھی۔ (۴) اس کے علاوہ تین ہزار سے زیادہ لوگوں کو مختلف پیشوں میں ٹریننگ دی گئی۔ مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ایمپلائیمنٹ سروس کی کارگذاری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ دراصل پبلک ایمپلائیمنٹ سروس محض صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں مثلاً امریکہ، فرانس، جرمنی وغیرہ ہی میں ملازمتوں کا انتظام کرنے کا کام نہیں بلکہ کم ترقی یافتہ ملکوں میں بھی اہم خدمت کر سکتی ہے۔

ملازمت دلانے کے یہ ادارے ملک میں بے روزگاری یا روزگار کے متعلق ہم کو اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔ ان اداروں کے تحت ٹریننگ سکیمیں بہت بنائی گئی ہیں۔ یہ منسلک ادارے کا بھی ہم نے اس مسئلے کے حل کا آغاز ہی کیا ہے اور بہت کچھ کرنا باقی رہتا ہے۔ ہمیں ہندوستان میں بے روزگاری اور کاریگروں کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ ان دونوں کا مقابلہ کرنے کے لئے موثر پروگرام بنانا ضروری ہے جسے آبادی کا جائزہ کہا جاتا ہے۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایمپلائیمنٹ سروس بھی اہم خدمت ادا کر سکتی ہے۔ مسٹر وینڈل ولکی نے کہا تھا۔ کہ "بے روزگاری" ایک قسم کی غلامی ہے۔ نیز یہ انسان کی تعداد قیمت کو کم کرتی ہے۔ اگر ہم اس نئی غلامی سے رہائی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو مین پاور پلاننگ ہماری مجوزہ اقتصادی اسکیم کا اہم جزو ہونا چاہیئے۔

آجکل دہلی

سہیل عظیم آبادی

جھوٹے وعدے

وعدوں کا جھوٹ ہونا کوئی نئی بات نہیں۔ مختلف لوگوں نے مختلف حالات میں مختلف قسم کے جھوٹے وعدے کئے ہیں۔ اگر ان جھوٹے وعدوں کی تحقیق کی جائے۔ تو اس کی بے شمار قسمیں نکل آئیں۔ اور تو اور سارے اردو ادب کا تعلق بھی جھوٹے وعدوں سے کچھ کم نہیں۔ اگر اردو شاعری کو لیجئے تو معشوق کے جھوٹے وعدے تو شاعروں کا خاص موضوع رہے ہیں۔ اور شاعروں نے مختلف پہلوؤں سے ان وعدوں پر روشنی پر روشنی ڈالی ہے۔ جو کبھی پورے نہیں ہوئے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غریب شاعروں کو تو جھوٹے وعدوں پر اعتبار کر کے سدا انتظار کرنا پڑا ہے۔

افسانہ نگاروں کے لئے یہ وعدے کبھی بھی مصیبت نہیں بنے ہیں۔ اور خاص کر زمانہ حال کے افسانہ نگار تو جیسے دو اور دو چار کا حساب جانتے ہیں۔ ان لغوتیوں میں پڑتے ہی نہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ انہیں بھی ان وعدوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مگر افسانہ نگاروں کے جھوٹے وعدے تو اب اردو ادب میں ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ آئندہ کا مورخ اور نقاد اس خاص موضوع سے بھی بحث کرنے پر مجبور ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ افسانہ نگاروں کے جھوٹے وعدوں کا شکار بے چارے ایڈیٹر صاحبان کو ہونا پڑتا ہے۔

اتفاق سے افسانہ نگار اور ایڈیٹر دونوں ہوں۔ ایسی حالت میں مجھے اندازہ ہے کہ یہ جھوٹے وعدے کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور یہ وعدے کتنی دلچسپ چیز ہیں۔ میں نے خود سینکڑوں جھوٹے وعدے کئے ہیں اور سینکڑوں جھوٹے وعدوں کا شکار رہا ہوں۔ البتہ اتنا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ان سارے وعدوں کی بنیاد صرف محبت ہے، خلوص ہے اور سچائی۔ خواہ وہ وعدے میں نے کسی ایڈیٹر سے کئے ہوں۔ یا کسی دوسرے افسانہ نگار نے مجھ سے۔

اگر ان تمام وعدوں کی تفصیل لکھوں۔ تو یقین جانئے کہ داستان امیر حمزہ ایسی ایک ضخیم داستان بن جائے۔ اس لئے اس کا موقع ہی نہیں البتہ اس سلسلے میں چند دلچسپ واقعات آپ کو سناؤں۔ تاکہ عام پڑھنے والے تو لطف اندوز ہوں۔ اور نئے افسانہ نگار پچھلوں کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔

میرا حلقۂ احباب خاص طور پر بہت پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے تقریباً سارے افسانہ نگار اور رسالوں کے ایڈیٹر میرے دوستوں میں ہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں۔ کہ بہت سے دوستوں سے میرا تجربہ زیادہ ہے۔

میں افسانے لکھنے کے بعد ایک دن بھی اپنے پاس نہیں رکھتا۔ ختم ہوا اور کسی رسالے کو بھیج دیا۔ اور اس طرح کہ بیسیوں وعدوں کے بعد۔ ایسا تو شاید کبھی نہیں ہوا کہ کسی کی فرمائش آئی۔ اور افسانہ لکھ کر بھیج دیا ہو۔ بلکہ ہوا ایسا کہ کسی دوست کا خط آیا۔ اور میں نے وعدہ کر دیا۔ لیکن موڈ غائب۔ نہایت ایمانداری اور خوش دلی کے ساتھ افسانہ لکھ کر بھیج دینا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ اور وعدوں پر ٹالتا جاتا ہوں۔ پہلے خط میں وعدہ کر دیا۔ تو دوسرا خط یاد دہانی کا آیا۔ پھر معذرت کر لی اور وعدہ کر دیا کہ جلد ہی بھیجتا ہوں۔ اس مدت میں کچھ اور فرمائشیں آگئیں۔ اور ساتھ ساتھ کچھ اور وعدے بھی ہو گئے۔ اور یاد دہانیوں فرمائشوں اور وعدوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیجئے دوسرا وعدہ بھی پورا نہ ہوا۔ تو یاد دہانی کے بعد تقاضے شروع ہوئے۔ اور لکھ دیا کہ بس آپ کے لئے افسانہ شروع کر دیا ہے۔ اسی ہفتے میں آپ کو افسانہ مل جائیگا حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ افسانے کا الف بھی شروع نہیں ہوتا۔

اور وقت ضروری کاموں یا گپ میں ختم ہو جاتا ہے۔ اور ہمارا ایڈیٹر دوست افسانے کے انتظار میں چشم براہ رہتا ہے۔

کسی وقت یکایک وعدہ یاد آیا۔ اور افسانہ لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور کاغذ قلم دوات لے کر بیٹھا بھی لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اور کام نکل آئے لیجئے صاحب افسانہ ختم۔ سوچا پھر لکھ لوں گا۔ اس وقت تو یہی ضروری کام ہے۔ اسے ختم کر لیا جائے۔ دو چار چھ دن اور گذر گئے اور کسی ایڈیٹر دوست کا شکایت نامہ پہنچ گیا "ارے بھئی جلد افسانہ بھیجو۔ کیوں پریشان کرتے ہو تمہارے انتظار میں رسالہ رکا پڑا ہے" اور اس شکایت کو پڑھ کر ہوئی وحشت۔ اور ارادہ کر لیا۔ خواہ کچھ ہو۔ لیکن آج وقت نکال کر افسانہ لکھ لینا اور بھیج دینا ہے لیکن شام تک کچھ بھی نہیں۔ البتہ رات کو لکھنے بیٹھا ضرور مگر نیند آ گئی۔ اور دوسرے دن لکھ بھیجا کہ "بھئی شرمندہ ہوں۔ افسانہ آدھے سے زیادہ لکھ چکا ہوں بس دو دن میں ختم کر کے بھیجتا ہوں۔

اسی طرح ہر شکایت نامے کا جواب محبت نامے کی شکل میں بھیجا جاتا رہا۔ اور احباب مطمئن رہے کہ بس افسانہ آتا ہی ہے حالانکہ حالت یہ کہ افسانہ ایک چوتھائی بھی تیار نہیں۔ اور روز وعدے بیسوں

آخر دوستوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ اور شکایتوں میں تیزی آنے لگی۔ اور وعدے کے نباہ کے لئے ادھر سے بہانے تراشے جانے لگے "بھئی کیا کہوں عجیب پریشانیوں میں گھر گیا ہوں۔ افسانہ تین چوتھائی لکھ چکا ہوں۔ مکمل کر کے بھیجنے کا موقع نہیں ملتا" اس میں سچ اتنا کہ پریشانیاں ہیں۔ اور آپ جانئے پریشانیاں کس کے ساتھ نہیں ہوتیں۔ لیکن یہ کہ افسانہ تین چوتھائی لکھا جا چکا ہے۔ سراسر جھوٹ۔

اب کچھ پریشانیوں کا حال بھی سُن لیجئے۔ سب سے پہلی پریشانی مکان کی۔ مکان کسی طرح نہیں ملتا۔ اور جس طرح زندگی گذارنی پڑتی ہے اس پر خود اپنی حالت پر رحم آنے لگتا ہے۔ بس ایک کمرہ۔ مشترک خاندان۔ ایک کمرہ جو مشکل سے پندرہ فٹ لمبا اور بارہ فٹ چوڑا ہوگا۔ اسی میں سارا اسباب۔ سوٹ کیس، بستر، کپڑوں کے بکس اور دوسری ضروری چیزیں۔ بیوی اور بچے۔ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں بیٹھ کر کچھ لکھا جائے

اگر ہمت کر کے بیٹھ گئے تو بچوں کے سوالوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کیا مجال۔ جو ختم ہو جائے۔ یہ سوالات اکثر چھوٹے بچے کی چاکلٹ اور ریمن چوس کی فرمائش سے شروع ہوتے ہیں۔ اور بڑے بچے کے کپڑوں اور فٹ بال پر آ کر ختم ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ کس کی فرمائش کب اور کس وقت تک پوری ہوگی۔

بچوں کی باتوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ تو بڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور یہ گفتگو آٹا چاول سے لے کر بچوں کی معمولی معمولی ضرورت تک کو گھیر لیتی ہے۔ پھر بھی پوری بات ختم نہیں ہوتی۔ باتوں کو جتنی جلدی ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ اسی قدر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور دوستوں کی فرمائش اور افسانے کی جذبات دھواں بن کر دماغ سے نکل جاتی ہیں۔؟

اسی الجھن میں دفتر واپس آنا ہوتا ہے۔ راستے بھر سوچتا آتا ہوں۔ کہ بس آج بیٹھ کر افسانہ ختم کرنا ہے لیکن کیا مجال کہ وہاں بھی افسانہ ختم ہو جائے۔ سب سے پہلے تو دفتر کے روزانہ کام۔ اس سے کسی حالت میں بھی بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ دنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے۔ اس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ بلکہ اگر دنیا میں کوئی نیا واقعہ ہوا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ کام بڑھ گیا۔ اب لکھئے اس پر مضمون۔ اور اس مسئلے پر مطالعہ شروع کیجئے۔

مضمون لکھنے کا مسئلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ دنیا کا کوئی کام کیجئے یا نہ کیجئے۔ لیکن اخبار کے لئے لکھنا ضروری۔ پھر اس پر یہ غضب کہ بے تکلف ملنے والے۔ شمالی کوریا نے جنوبی کوریا پر حملہ کر دیا۔ اور اس موضوع پر اخبار کے لئے مضمون لکھا جا رہا ہے۔ کہ ایک صاحب آ دھمکے۔

"السلام علیکم۔ آپ تو بہت مصروف نظر آ رہے ہیں"

"وعلیکم السلام۔ مصروفیت تو روز ہی رہتی ہے" میں نے اخلاقاً مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اور وہ صاحب ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ میز پر سے اخبار اٹھا کر پڑھنے لگے۔ اور میں کام کرتا رہا۔ پھر وہ اچانک بولے۔ "بھئی اب چلا۔ آپ کے پاس ٹائم ٹیبل تو ہوگا۔ کلکتہ جانے والی گاڑیوں کا وقت دیکھنا تھا سوچا چلوں آپ کے پاس"

دعوت افزائی۔ اخبار کے ایڈیٹر کے علاوہ آپ نے ریلوے انکوائری کا افسر بھی سمجھ لیا" دل میں سوچا۔ اور دل چاہا کہ ڈانٹ بتاؤں بقول صاحب

احمق۔ لیکن ہائے رے اخلاق۔ اور اسے کیسے چھوڑ دوں اب ہم بہاریوں کے پاس "اخلاق" کے علاوہ اور رہ بھی کیا گیا ہے۔ مسکراتے ہوئے بولا۔

"نہیں بھائی ٹائم ٹیبل تو نہیں۔"

میں سمجھا کہ بات ختم ہوئی اور اب رخصت ہوں گے۔ لیکن تو بہ بھلی ——— بولے۔

"آپ لوگوں کو دفتر میں ایک ٹائم ٹیبل تو رکھنا ہی چاہئے۔"

"جی ہاں رکھنے کی تو بہت سی چیزیں ہیں۔ لیکن مہیا نہیں ہوتیں رکھنے کو تو جی چاہتا ہے کہ موٹر بھی رکھوں اور ہوائی جہاز بھی۔ مگر کم بخت ریلوے ٹائم ٹیبل بھی میسر نہیں۔"

"اچھا کسی اور جگہ دیکھ لوں گا۔ خدا حافظ۔"

سمجھا بلا ٹلی۔ اور سوچا اخبار کا مضمون ختم کر کے افسانہ لکھنا شروع کر دوں گا۔ اپنی طویل خاموشی کا شدید احساس پیدا ہوتا جا رہا تھا ایک دوست نے لکھا تھا۔ یورپ میں لوگ اخبار نویسی سے ادب کی طرف جا رہے ہیں۔ اور تم ہو کہ ادب سے اخبار نویسی کی طرف جا رہے ہو۔ بات درست تھی۔ اور سوچا تھا کہ اخبار نویسی کے ساتھ ساتھ ادبی مصروفیتوں کو جاری رکھوں گا۔ لیکن یہ آسان کام نہیں۔

ہاں تو مضمون لکھتا رہا۔ یکایک آواز آئی۔

"آداب عرض ہے۔"

سر اٹھا کر دیکھا۔

"آداب عرض۔"

"میں حاضر ہوا تھا کہ آپ سے کچھ عرض کروں۔"

"آپ کو فرصت تو ہے؟"

"فرصت کہاں نصیب! لیکن فرمائیے۔ اسی طرح سارے کام ہوتے ہیں۔ اور ہوتے رہیں گے۔"

"جی عرض یہ ہے کہ میں اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کرانا چاہتا ہوں۔"

"مبارک ارادہ ہے۔"

"لیکن۔ آپ کو ذرا تکلیف کرنی ہوگی۔"

"فرمائیے۔"

"ذرا ایک نظر پورے مجموعے کو دیکھ لیتے۔ اور چند صفحوں میں مختصر سا تعارف" بھی لکھ دیتے۔"

"بھائی اتنی فرصت کہاں ہے آج کل۔"

"آپ کی مصروفیتوں کو تو جانتا ہوں۔ لیکن ہم لوگوں کا دل بڑھانا بھی تو آپ ہی کا کام ہے۔"

"بالکل درست مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ اگر یہ کام کر سکتا لیکن فرصت نہیں ملتی۔ آپ پروفیسر اختر اورینوی سے ملیں ——— میں بھی اُن سے کہہ دوں گا۔"

"اختر صاحب کے پاس دو بار گیا لیکن اُن سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"پھر جانے۔ وہ کہیں چلے تو نہیں گئے۔"

"جی۔ مگر میری اپنی خواہش تھی کہ آپ ہی تعارف لکھتے۔ اختر صاحب سے دیباچہ لکھوا لوں گا۔"

اور میں دل ہی دل میں کڑھ گیا۔ دونوں کو احمق بنانا چاہتے ہیں۔ زندہ باد۔ لیکن پھر ہم لوگ تو اخلاق برتنے پر کچھ مجبور سے بھی ہیں۔ بولا۔

"برادرم۔ اب دیباچہ اور تعارف پرانی چیزیں بن گئیں۔ آپ بغیر دیباچے اور تعارف کے اپنا مجموعہ شائع کر دیں۔"

"جی۔ آپ فرماتے تو ہیں درست۔ لیکن مجھے کون جانتا ہے۔ . . . "

"خیر دیکھا جائے گا۔ فرصت ملے گی تو ضرور لکھ دوں گا ———" ایک وعدہ اور وعدہ!

اور وہ صاحب خوش خوش روانہ ہوئے کہ تعارف لکھا جائے گا۔ اور میں خوش کہ وعدے پر کام نکل گیا۔" لیکن پھر روزانہ کی قلم گھس گھس جاری۔

وقت اسی طرح کٹتا جاتا ہے۔ اور ایک بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا۔ پریشانی تو اس وقت ہوتی ہے جب کسی ویلا بیڑ دوست سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ اور بڑی محبت کے ساتھ ملنے اور خاطر مدارت کرنے کے بعد جھوٹے وعدے کی شکایت کرتے ہیں۔ بالکل یہی حادثہ پچھلے دنوں دہلی میں میرے ساتھ پیش آیا۔ جب بھی عرش ملسیانی نے دو سال کے وعدے یاد دلائے۔ اور مجھے پھر ایک بار وعدہ کرنا پڑا۔ آج یہ مضمون اسی وعدے کی تکمیل ہے۔

ماؔئل ملیح آبادی

مالابار یا ملیبار

ہندوستان کے دکھن میں مغربی گھاٹ کا علاقہ مالا بار یا ملیبار کہلاتا ہے۔ اِس علاقے کے پچھم میں سمندر ہے اور پورب میں مغربی گھاٹ کا پہاڑی سلسلہ ہے۔ کنڑی اور تامل زبان میں اس کے نام کرلہ اور ملیالم ملتے ہیں جن کے معنی ہیں "پہاڑی سلسلہ"۔

ڈراویڈین زبان میں اس کا نام "ملئی" تھا۔ سنسکرت میں "ملیا" بولا جاتا ہے۔ چولا خاندان کے راجہ کیسری ورمن نے جو چھٹی صدی ہجری میں گذرا ہے۔ اپنے ایک کتبہ میں اس علاقے کا نام "ملئی ناڈو" تحریر کیا ہے جس کے معنی ہیں "پہاڑی ملک"۔

وہ سیاح جو عرب اور ایران سے اس علاقے میں آئے انھوں نے "ملئی" پر "بار" بڑھا کر اس ملک کا نام ملیبار یا مالا بار کر دیا۔ جیسا کہ انھوں نے دوسرے مقامات پر بھی کیا تھا جیسے کر زنجبار۔ امیر خسرو نے ۱۳۲۰ء میں اس علاقے کا ذکر ملیبار کے نام سے کیا ہے۔

ملیبار بہت زرخیز اور سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ یہاں بہت ہی قیمتی نباتات پیدا ہوتے ہیں۔ کالی مرچ۔ الائچی، جوز، جاوتری، لونگ، پان، دار چینی، ناریل، ہلدی، قہوہ، نیل، اسنکونا یہاں کی مخصوص پیداوار ہیں۔ کالی مرچ اور پان کے درخت خود رو ہوتے ہیں اور ان کی بے انتہا کثرت ہے۔ بانس اور ساگوان بھی یہاں بکثرت ہوتا ہے۔ اس علاقے کا اُتری حصہ ریتیلا ہے۔ قدیم زمانے میں اس حصہ کا نام پُوبی تھا۔ جس کے معنی ہیں "ریت"۔ بیچ کا علاقہ کرم کہلاتا تھا جس کے معنی ہیں "جھیلوں کا دیس" اور ان دونوں کے پورب کی زمین کیکا کہلاتی تھی۔ جس کے معنی ہیں "پہاڑیوں کا ملک"۔

سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں اس علاقے کی آبادی اٹھائیس لاکھ پچپن ہزار پانچ سو پچیس تھی۔

ملیبار میں مسیح سے پہلے ہی سے عربوں کی تجارت شروع ہو گئی تھی کیونکہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان کے زمانے میں اس ملک سے ساگوان، مور، بندر، سونا، چاندی، ہاتھی دانت اور صندل عرب جایا کرتا تھا۔ ملیبار کی تجارت عرب سے نکل کر یورپ تک پہنچتی تھی۔ پہلے عربی تاجر خلیج فارس کی راہ سے عرب کے دکھنی ساحل پر مال لے جاتے تھے۔ پھر وہاں سے عربوں کے کارواں یمن اور حجاز سے گذر کر شام میں تدمر اور مصر میں اسکندریہ تک لے جاتے تھے۔ یورپ کے تاجر ان مقامات سے یورپ کے دوسرے حصوں تک پہنچاتے تھے لیکن جب قیصر آگسٹس نے تیس سال قبل مسیح مصر کو فتح کر لیا تو بحر احمر پر رومیوں کا قبضہ ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد قیصر کلاڈیوس کے زمانے میں رومیوں کا ایک جہاز طوفان میں پھنس کر ساحل ملیبار پر آ لگا اور اس طرح رومیوں کو ملیبار تک پہنچنے کا بحری راستہ معلوم ہو گیا۔ اب وہ براہ راست اس علاقے سے تجارت کرنے لگے۔ بہت سے رومی پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں ملیبار کے بندرگاہوں میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ مقامی راجاؤں کی فوج میں بھی بھرتی ہوتے تھے۔ تامل کے ادب قدیم میں ان نو واردوں کو "یون" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ چیرا راجاؤں کی محافظ فوج میں ان کا نام "زبردست یون" اور "لنگوٹے بھیرے" رکھا گیا تھا۔

مالا بار اور رُوم کی تجارت عام طور پر مرچ، موتی اور پنا کی تھی۔ ۲۱۵ء میں شہر اسکندریہ تباہ ہو گیا اور رومیوں کی تجارت کا سلسلہ رفتہ رفتہ ملیبار سے ختم ہو گیا اور یہ تجارت پہلے کی طرح پھر عربوں کے ہاتھ میں آ گئی۔

ملیبار میں مسلمانوں کا آنا۔

جہاں تک پتہ چلتا ہے ۹۶ھ یعنی ۷۱۴ء یا ۷۱۵ء میں سب سے پہلے مسلمان عربوں نے ملیبار میں سکونت اختیار کی۔ یہاں کے ہندو راجہ نے کونکلور میں انہیں بود و باش کی اجازت دی اور باقاعدہ

زمینیں بھی دیں نیز ایک مسجد تعمیر کرنے میں بھی امداد دی۔ ان مسلمان عربوں نے ملیبار کے دوسرے شہروں کا بھی سفر کیا اور ہر جگہ مسجد بناتے رہے۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس ملک کا مفصل حال لکھا ہے ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ملیبار۔ وہ ملک ہے جہاں کالی مرچ پیدا ہوتی ہے۔ اس کی لمبائی دو مہینے کا راستہ ہے جو دریا کے کنارے کنارے سنداپور سے کولم تک چلا گیا ہے۔ سڑک پر دو رویہ سایہ دار درخت ہیں، ہر آدھے میل پر ایک مکان ہے جس میں ہر مسافر چاہے ہندو ہو یا مسلمان آرام کرتا ہے۔ اور ہر ہر گھر کے پاس ایک کنواں ہے جس پر ایک ہندو پانی پلانے والا موجود رہتا ہے۔

اس نے ایک شہر ابی سرور کا ذکر کیا ہے۔ اور اسے ملیبار کا سب سے پہلا شہر قرار دیا ہے جہاں ناریل کے درختوں کی افراط ہے۔

دوسرا شہر فاکنور بتایا ہے۔ جہاں گنا پیدا ہوتا ہے۔ اس شہر میں بھی مسلمان آباد ہیں۔ اُن کی ایک جامع مسجد بھی ہے۔ راجہ کی طرف سے شہر کا قاضی ایک شخص حسین سلاو ہے۔ راجہ کا نام باسدیو ہے۔ اُس کے پاس تیس جنگی جہاز ہیں جن کا افسر ایک مسلمان ہے۔

یہاں سے تین دن کے فاصلے پر منجلور (منگلور) کا ذکر کیا ہے۔ اسے بڑا شہر بتایا ہے۔ جہاں فارس (ایران) اور یمن کے سوداگر کثرت سے آتے ہیں۔

دو دن کے سفر کے فاصلے پر ایک اور شہر ہیلی کا ذکر کیا ہے۔ اس شہر کی عمارتوں کی تعریف کی ہے۔ یہاں چین کے بڑے بڑے جہاز ٹھہرتے ہیں۔

ہیلی کے بعد جرفتن شہر کا ذکر کیا ہے۔ یہاں کے راجہ کا نام کویل بتایا ہے۔ اس کے پاس بہت جہاز ہیں جو عمان، فارس اور یمن جاتے ہیں جب کوئی مسافر مر جاتا ہے تو اُس کا سامان کسی مسلمان کے پاس امانت رکھ دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اصل وارث آکر اپنا مال لے لیتا ہے۔

جرفتن کے بعد دہفتن کا ذکر کیا ہے۔ یہ دریا کے کنارے بڑا شہر ہے اس میں باغات بکثرت ہیں۔ ناریل، سیاہ مرچ، ڈلی اور پان بکثرت ہوتے ہیں کیلے اتنے اچھے اور سستے ہیں جیسے کہیں نہیں دیکھے۔ یہاں ایک بہت بڑا کنواں اور مسجد ہے۔ مسجد کی سیڑھیاں کنویں کے اندر تک بنی ہوئی ہیں۔ کنویں کی لمبائی پانچ سو قدم اور چوڑائی تین سو قدم لکھی ہے سرخ رنگ کے ترشے ہوئے پتھر سے بنا ہے۔ کناروں پر اٹھائیس بڑے بڑے گنبد بنے ہیں۔ یہ مسجد اور کنواں راجہ کا یل کے دادا نے بنوایا تھا۔

اس طرح ابن بطوطہ نے فندرینا، کالی کوٹ، بگوگری، کولم، شالیات وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور راجاؤں کا مسلمانوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

امیر تیمور کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ۱۴۰۵ء کے بعد سلطان شاہ رُخ کے نام سے خراسان کا حاکم ہوا اور بڑے جاہ و جلال سے حکومت شروع کی۔ سلطان شاہ رُخ کے سفیر جو بنگالہ سے بذریعہ سمندر ایران جا رہے تھے طوفان میں پھنس کر کالی کٹ میں لنگر انداز ہوئے۔ سفیر اور شیخ الاسلام نے کالی کٹ کے راجہ سامری سے ملاقات کی۔ راجہ سامری نے بھی سلطان شاہ رُخ سے تعلقات قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی اور خواجہ مسعود کو جو ایک بڑے عالم و فاضل تھے تحفے تحائف دے کر اُن کے ساتھ کر دیا اور شاہ رُخ سے خواہش کی کہ اگر حکم ہو تو کالی کٹ کے مسلمانوں کے جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں سلطان کا نام شامل کر دیا جائے۔

خواجہ مسعود نے ہرات میں شاہ رخ سے ملاقات کی۔ اس کے جواب میں سلطان نے خواجہ کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی کو کالی کٹ میں سفیر مقرر کر کے ۱۴۴۲ء میں روانہ کیا۔ شاہ رُخ نے سامری کے لئے ایک عربی گھوڑا، پشمینہ کا زردوزی جبہ، کلاہ زردوزی اور بہت سے قیمتی تحفے بھیجے۔ عبدالرزاق پانچ مہینے کالی کٹ رہا۔ وہاں سے بیجانگر کے راجہ دیورائے نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ عبدالرزاق بیجانگر جا کر دیورائے سے ملا۔ راجہ نے دو سفیر ساتھ کر کے سلطان سے تعلقات قائم کرنے کے لئے عبدالرزاق کے ساتھ روانہ کئے۔ سلطان نے بیجانگر میں بھی اپنا سفیر مقرر کیا۔

عبدالرزاق پانچ مہینے کالی کٹ میں رہا۔ اس نے اپنی تاریخ مطلع السعدین میں یہاں کے حالات لکھے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

"کالی کٹ ایک آباد و معمور بندرگاہ ہے۔ اس میں حبش، زنجبار، زیر باد، مکہ اور بلاد حجاز کے بے شمار تاجر مقیم ہیں۔ دنیا کے ہر ملک کی نفیس اشیا اس جگہ فروخت ہوتی ہیں۔ مسلمانوں نے راجہ کی اجازت

نے دو جامع مسجدیں بھی بنائی ہیں۔ جہاں پابندی کے ساتھ اذان اور نماز ہوتی ہے۔ زاجہ نے مسلمانوں کے لئے ایک قاضی بھی مقرر کردیا ہے۔ یہاں کے مسلمان زیادہ تر شافعی مذہب کے پیرو ہیں۔ شہر میں ہر طرح کا امن و امان ہے۔ تاجر جہازوں سے لاکر اپنا مال و اسباب بازاروں میں لاد دیتے ہیں۔ جس کی حفاظت حکومت کرتی ہے اور اس میں رتی برابر کمی نہیں ہوتی۔ جب تمام سامان بک جاتا ہے تو منافع کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ لے لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور محصول نہیں لیا جاتا۔ اگر کوئی سوداگر مر جاتا ہے یا کسی کی کشتی طوفان میں تباہ ہوکر بندرگاہ پر آلگتی ہے تو اس کے مال کی پوری پوری حفاظت کی جاتی ہے اور جب اس کا وارث آتا ہے تو تمام اسباب اس کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ کالی کٹ سے جو جہاز عرب اور عدن وغیرہ کو روانہ ہوتے ہیں۔ اُن میں عموماً کالی مرچ بھری ہوتی ہیں۔ کالی کٹ والے دریائی سفروں میں بڑے مشاق اور تیز و چالاک ہوتے ہیں۔ اس لئے انھیں "چینی بچہ" کا لقب دیا گیا ہے۔"

ملیبار ہندوستان کا وہ پہلا علاقہ ہے۔ جس کی وجہ سے ہندوستان ایران، عرب اور یورپ کے ممالک میں اپنی بیش بہا دولت اور پیداوار کے لئے مشہور ہوا اور ہر قوم نے اس مُلک سے تجارت اور اچھے تعلقات کی ضرورت محسوس کی۔ ہندوستان نے بھی باہر کی قوموں اور مذہبوں اور فرقوں کے ساتھ پوری رواداری کا برتاؤ کیا اور یہی چیز آج سے پہلے ہندوستان کی عظمت کی سب سے بڑی نشانی تھی۔ ہم اس عظمت کو نئے سرے سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور وہ ہمیں حاصل ہوکر رہے گی۔

ذکر و فکر

ابر احسنی گنوری

وصل کی موت نے بھی عشق کی مشکل تو کیا ہوگا — وہ اگر ہو گئے خود بیکل میں حائل تو کیا ہوگا
نہ آئی راس سعیِ ضبطِ دردِ دل تو کیا ہوگا — نکل آیا کوئی آنسو سرِ محفل تو کیا ہوگا
نہ خوش ہو تم محبت کو غمِ ہستی میں الجھا کر — محبت نے جو کر لی یہ بھی طے منزل تو کیا ہوگا
تلاطم سے گزر کر ناخدا خوش ہے، بہت خوش ہے — ڈبو دے اتصالِ کشتی و ساحل تو کیا ہوگا
کیا ہے حوصلہ ہوش و خرد نے عزمِ مطلب کا — لٹا یہ قافلہ جا کر سرِ منزل تو کیا ہوگا
یہ منزل کے چراغوں کی چمک، یہ آبلہ پائی — کہیں کہ پیش کو خود ہی آ گئی منزل تو کیا ہوگا

طبیعت کو بدقت جبر کے سانچے میں ڈھالا ہے
اب اس نے ابر سمجھا رحم کے قابل تو کیا ہوگا

عبدالمجید حیرت

از بس کہ ابھی گردشِ تقدیر وہی ہے — ہر گام پہ ناکامیٔ تدبیر وہی ہے
کیوں خانۂ صیاد میں لگتی نہیں پھر آگ — جب آہِ شرربار کی تاثیر وہی ہے
اتنے ہی پہ بس خوش ہیں کہ زنداں تو نہیں وہ — حالانکہ وہی طوق ہے زنجیر وہی ہے
جتنا کوئی بے لوث ہو جتنا کوئی بے لاگ — معلوم ہوا لائقِ تعزیر وہی ہے
جو دل میں اتر جائے، جو آنکھوں میں سما جائے — اپنا تو ہے یہ قول کہ تصویر وہی ہے
تسلیم، کہ تیرے لئے بدلی نہیں دنیا — بیتو بھی تو گھرائے دلِ دلگیر وہی ہے
دامنِ شفا خاک کی چٹکی بھی اگر ہو — آجائے اگر ہاتھ تو اکسیر وہی ہے
بیمار کی حالت میں ابھی کچھ بھی نہیں فرق — تکلیف و تعب تا دمِ تحریر وہی ہے

بھولے ہوئے بیٹھے ہیں جسے حضرتِ حیرت
سچ یہ ہے کہ اصلاح کی تدبیر وہی ہے

انجم اعظمی

آشاؤں کا ایسا سپنا جیون کو کیا دے گا

سوچ رہا ہے من ہی من میں پریت نگر کا مالی
اب کے ایسا موسم آئے جھومے ڈالی ڈالی
آئے کوئی آئے لیکن دیکھ ہو اس کی نرالی
ہونٹوں پہ مسکان لئے ہو رخساروں پہ لالی

آشاؤں کا ایسا سپنا جیون کو کیا دے گا

آجکل دہلی

من کو راہ نہ دکھلائے جو غم کو اور بڑھائے
ایسی باتیں یاد دلائے آنکھ مری بھر آئے
کیسے کیا ہو میں نہ سمجھوں جی اپنا گھبرائے

آشاؤں کا ایسا سپنا جیون کو کیا دے گا

ہاتھ بڑھا کر میں اپنانا چاہوں ایسی چیزیں
ہاتھ نہ آئیں لیکن میری سکھ کی گھڑیاں چھینیں

آشاؤں کا ایسا سپنا جیون کو کیا دے گا

اسلم مظفر نگری

ذوقِ خودی نواز اگر شاملِ بیخودی نہیں — سجدۂ بے ریا میں بھی لذتِ بندگی نہیں
جس کی نگاہ آفتاب ذرے میں دیکھتی نہیں — اس کا شعور آگہی حاصلِ آگہی نہیں
لطفِ نگاہ و ناز کا عیشِ دوام ہی سہی — لذتِ سوزِ عشق بھی لذتِ عارضی نہیں
کوئی بتائے کیوں مجھے جلووں کی تاب ہے تمنا — اپنے مذاقِ دید سے جب مجھے آگہی نہیں

گرمِ سفر رہو اسلم وقت نہیں قیام کا
سایۂ زلفِ حسن ہے شام ابھی ہوئی نہیں

اسلم افرقراولی

زمانہ بیت گیا ترکِ عشق کو لیکن — کسی کی یاد ابھی دل کو گدگداتی ہے
حسین راتوں کی پرچھائیاں لیے گل پر — طرب نواز بہاروں کو ساتھ لاتی ہے

ترے جمال کی تابانیوں میں گم ہو کر — میں اپنے درد کی تسکین کر نہیں سکتا
غمِ حیات کی تاریک رہگذار ہے — تری نظر کے سہارے گذر نہیں سکتا
ترے بغیر میں افسردہ ہو تو سکتا ہوں — مگر میں ترکِ محبت سے مر نہیں سکتا
مجھے یقیں ہے کہ دل کے یکسر یوں ہی بنے — کبھی تو ظلمتِ شب ہے گذر ہی جائیں گے
مرے بلند عزائم رباب ہستی پر — حسین جزیرۂ محبت کے گیت گائیں گے

زمانہ چاہیے لیکن ابھی فراغت کو — فضائیں راہ میں نہیں حوت نظر کے لئے
یہ زندگی کا تقاضا ہے مری محبوب — میں جانتا ہوں کہ منظر ہے تو ادھر کے لئے
ترے لئے میں امانت بدل نہیں سکتا — کہ زندگی ہے مری خدمتِ بشر کے لئے

رتن لال کھنہ

پنجابی کہاوتیں

کسی قوم یا طبقہ کی کہاوتوں کی اہمیت مسلمہ ہے۔ ارسطو نے یونانی لوک کہاوتیں اکٹھا کیں۔ کہاوتیں لوگوں کی روحانی زندگی کا آئینہ ہیں۔ ان کی مدد سے ہم متعلقہ لوگوں کے اطوار خصائل۔ اخلاقیات اور فلسفے کی منہ بولتی تصویر کھینچ سکتے ہیں۔ لوک نفسیات کے ادراک کے لئے کہاوتوں کا مطالعہ بڑا اہم ہے۔ گیٹے کا قول ہے کہ لوگ اپنے اخلاق کا بہترین انکشاف ان چیزوں سے کرتے ہیں جو پردہ ہنستے ہیں۔ کہاوتوں سے لوگوں کے مزاح اور ظرافت کا خوب پتہ چلتا ہے۔

پنجابیوں کی زندگی میں کہاوتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں پنجابی لوگ کہاوتوں کو بڑے ذوق شوق سے برتتے ہیں۔ اور گوناگوں موقعوں پر استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً بیان میں دلکشی پیدا کرنا۔ بات کو چٹ پٹ بنانا گفتگو میں چٹخارہ پیدا کرنا۔ دلیل کو پُر زور بنانا۔ دوسروں کی قوت ارادہ پر اثر ڈالنا۔ ظرافت کی پھلجڑیاں اور طنز کے تیر چلانا۔ شہر اور دیہات ہر جگہ کہاوتیں مقبول عام ہیں۔

ان کہاوتوں کے موضوعات متنوع ہیں۔ کاشتکاری، ساہوکارہ یا پرطنز، جاٹوں کی سادہ لوحی پرطنز، موسم، اونچی نمائش، حکمت عملی، اخلاقیات، فلسفہ، نفسیات، عورت، عشق و شادی، مزاح و ظرافت، مذہب اور روحانیت، معاشرتی رسم و رواج، خانگی زندگی کے مختلف پہلو خورد و نوش وغیرہ وغیرہ۔ گویا انسانی خیالات اور جذبات کا سارا حال کہاوتوں سے مظہر ہے۔ اس مقالے کے آخر میں ۱۰۵ کہاوتیں مختلف موضوعات کے لحاظ سے اکٹھا کر دی گئی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے لوک خیالات اور جذبات کی گوناگونی عمق اور کیفیت کا خوب پتہ چل سکتا ہے۔ کہاوت مختصر اور جامع مقولہ ہے۔ اس کا منبع عام لوگ ہیں۔ اس لئے کہاوت کو آوازۂ خلق کہا جاتا ہے۔ اختصار اس کا لازمی خاصہ ہے بلکہ بنیادی عنصر جتنی زیادہ مختصر ہوگی اتنی ہی زیادہ مقبول عام ہوگی۔ عربی کا مقولہ خیر الکلام ما قل و دل کہاوت پر راست آتا ہے۔ ایک اچھی کہاوت میں دو خوبیاں ضروری ہیں۔ ایجاز لفظ اور اعجاز معنی، لوک گیتوں کی طرح کہاوتوں کی زبان عام فہم ہوتی ہے۔ اور اسٹائل میں بناوٹ کا شائبہ نہیں ہوتا۔

پنجابی کہاوتوں میں مجاز تمثیل، استعارہ اور کنایہ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ زبان سادہ اور سیدھی سادی ہے تصنع نام کو نہیں یہ کہاوتیں پُر مغز اور پُر معنی ہیں۔ ما قل و دل ہیں۔ اختصار، نمکینی، عقل سلیم کہاوتوں کے تمام ضروری عناصر ان کہاوتوں میں پائے جاتے ہیں۔ کئی تو لفظی ایجاز اور کئی معنوی اعجاز اور کچھ لفظی اور معنوی اعجاز کے گوہر ہیں۔

ع جوہر شناس ہے تو انہیں موتیوں میں تول۔ ٹکسالی پنجابی زبان کے یہ نہایت مستند نمونے ہیں۔

ماہرین لوک ودیا۔ لسانیات۔ ادب کے مورخین کے لئے ان کا ملاحظہ اور مطالعہ پُر ثمر ہوگا۔ معاشرتی زندگی کے مورخین۔ فلسفہ اور نفسیات کے ماہرین بھی ان کے مطالعے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور پنجابیوں کی مسلمہ قدروں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس ضمن میں وان ڈی والڈری کا یہ مقولہ کہ لوگ اپنی قدروں کا مجسمہ ہوتے ہیں۔ یاد رکھنے کے قابل ہے۔

پنجابی کہاوت

کاشتکاری کے متعلق کہاوتیں

(۱) دبہ کے واہ، رج کے کھا
(۲) واہی بادشاہی نہ تھیو سے تے گل وچ پھاہی
(۳) ماڑا ڈنگر بہتے روگ
(۴) والیں راجہ ملیں کھیتی
(۵) جمین نوں واہ سے تے کھنڈ کھیر کھا
(۶) لگی اوڑ تے کھیتی چوڑ
(۷) جس دے گھر لویرا او سب تھوں چنگیرا
(۸) پکی کھیتی لائے لادے۔ جٹ کرے بادشاہی دے دعوے
(۹) اتم کھیتی مدھم بپار۔ نکھد چاکری بھکھ ندان

ساہوکاروں کی حرص پر

(۱۰) شاہ دے قابو آئے گھروں گھاٹوں جائے
(۱۱) لیکھا دکر شاہاں دے نال متاں کچھ دینا آوے
(۱۲) پہلے شاہ پچھے بادشاہ

جاٹوں پر طنزیہ کہاوتیں

(۱۳) جٹ دا ہاسیا تے غریب دا بھنے پاسا
(۱۴) جٹ دے جو بکے سٹے تکی ماں نوں مارے دھکے
(۱۵) جٹ توں نفع مول نہ بھال جٹ گنوائے مرشد نال
(۱۶) ہوچھے جٹ کٹوری لبھی پانی پی پی آپھریا

موسموں کے متعلق کہاوتیں

(۱۷) گھاہ پھلے تاں مینہ بھلے
(۱۸) جے مینھ نہ پوے لوہڑی ہاڑی ہووے گی تھوڑی
(۱۹) ساون ماہ دی رُت نہ چھاں بھاوے نہ دھپ

اوچھی نمائش کے متعلق کہاوتیں

(۲۰) ماں مرگئی ننگی دھی دا ناں پنگی
(۲۱) اِک ڈھکدی ناہیں میں دو پر نیساں
(۲۲) چنڑی دا چہرہ تے ناں نور بی بی
(۲۳) ککھاں دی جھگی دا اندخاں دا پرنالہ

اردو ترجمہ

خوب ہل چلاؤ اور سیر ہو کر کھاؤ
کھیتی باڑی بادشاہی ہے اگر فصل نہ ہو تو پھانسی کی رسی ہے۔
کمزور بیل کو تمام بیماریاں
کھیت کے لئے کھاد راجہ کے لئے نوج
زمین کو جوتو اور کھانڈ کھیر کھاؤ
جب خشک سالی آتی ہے تو کھیتی برباد ہو جاتی ہے
جس کے گھر دودھ وہ راجہ کا پوت
جب جاٹ کھیتی کاٹے راجہ کے مارے چانٹے
اتم کھیتی، مدھم بیوپار، چاکر ناچا، منگتا خوار

ساہوکار کے باٹ کا، نہ گھر کا نہ گھاٹ کا
ساہوکار سے معاملہ کیجئے، اپنی گانٹھ سے دے۔
پہلے شاہ پیچھے بادشاہ

جاٹ کی ہنسی غریب کی گردن پھنسی
جب جاٹ کے بھٹے پکتے سگی ماں کو بھی دے دھکے
جاٹ سے مانگ نہ مال، وہ دے مرشد کو بھی ٹال
اوچھا جاٹ کٹوری پائی پانی پی پی مرجائے۔

جب گھاس پھولے، مینہ بھولے
جب پولے نہ لوہڑی ہاڑی ہوے تھوڑی
ساون بھلائے نہ چھاؤں بھوپ نہ سوکھی دھوپ

ماں مرگئی ننگی بیٹی کا نام چنگی
ایک جورو کا کال اور دوسری کا خیال
منہ لنگور بی بی نام نور بی بی
پھوس کا مالا ہاتھی دانت کا پرنالہ

پنجابی کہاوت

(۲۴) اکھیاں نال مچھل تے دِ ٹھاتے ناں گل بی بی
(۲۵) پلے نہ کوڈی ناں لکھ پتی
(۲۶) ناں وڈا دیہہ سونجا
(۲۷) آندراں بھکیاں تے مچھاں نے چول

حکمت عملی

(۲۸) جدا کھائیے اودا گیت گائیے
(۲۹) جتھے ہووے پیار او تھے نہ کریئے وپار
(۳۰) گولا ہوکے کمادیئے ۔ میاں ہو کے کھاوئیے
(۳۱) نادِہ بیگانی گاں مارے لت تے بھنے باں
(۳۲) دریا وچ رہنا تے مگرمچھ نال ویر

اخلاقیات

(۳۳) بھلے دا بھلا
(۳۴) سخی دا بیڑا پار
(۳۵) کر بھلا ۔ ہو بھلا انت بھلے دا بھلا
(۳۶) بھیڑے کماں دا بھیڑا پھل
(۳۷) جیسی کرنی تیسی بھرنی
(۳۸) آپ بھلا جگ بھلا

لوک فلسفہ

(۳۹) جان نال جہان ہے
(۴۰) گھر دی کھنی باہر دی ساری نالوں چنگی ہے
(۴۱) کمینے دی یاری ڈھوئیں دا ڈنگ
(۴۲) بہوت بھلا نہ بولنا ۔ بہوت بھلی نہ چپ
بہوت بھلا نہ میگھلا ۔ بہوت بھلی نہ دھپ
(۴۳) جہدے ہتھ ڈوئی بھک مرے سوئی
(۴۴) سچ نوں کوئی آنچ نہیں
(۴۵) چنتا چکھا برابر

لوک نفسیات

(۴۶) سپ دا کھادا رسے تے ڈر دا

اردو ترجمہ

پھول بن کانٹے بنتی اور نام گل بی بی
پاس نہیں کوڑی نام لاکھ پتی
نام بڑا درشن تھوڑے (اونچی دکان پھیکا پکوان)
پیٹ میں پچل ۔ مونچھوں پر چاول

جس کا کھاتے، اسی کا گاتے
جہاں پیار ۔ وہاں کیسا بیوپار
چاکر روپ کماؤ مالک بن کر کھاؤ
ڈوہے جو بیگانہ گائے سزائیں کھائے
ندی میں رہنا مگرمچھ کو آنکھنا)

بھلے کا بھلا
سخی کا بیڑا پار
ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا ۔ (اونچا کام اچھے دام)
برے کاموں کا برا پھل
جیسی کرنی ویسی بھرنی
آپ بھلے جگ بھلا

جان ہے تو جہاں ہے پیارے
گھر کی آدھی باہر کی ساری
کمینے کی یاری بچھو کا ڈنگ
چپ، بدلی اور تخول
بے موقع ہو تو جھول
جس کے ہاتھ ڈوئی بھوکا مرے دوئی
سانچ کو آنچ نہیں
چنتا اور چتا برابر

سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے ۔

پنجابی کہاوتیں	اردو ترجمہ
(۴۷) رنی نوں چھچھڑیاں دے سپنے	بلی کو چھچھڑوں کے خواب
(۴۸) گدڑ دا کھ نہ اپڑے تھو کوڑی	انگور کھٹے ہیں
(۴۹) کمہاری اپنا بھانڈا سلاوندی اے	کمہاری اپنے ہی برتن پیاری
عورتوں کے متعلق	
(۵۰) پادے ہر کوئی ٹھنکا دے کوئی	چھاگل سب کو بھاتی، پر کوئی کوئی ٹھنکاتی
(۵۱) چودھر اچکا چودھری تے گنڈی رن پردھان	گنڈے نر شریمان، گنڈی ناری پردھان
(۵۲) کوہ نہ چلی بابا تہائی	کوس بھی نہ چلی داسی پھر بھی بابا پیاسی
پریم اور شادی کے متعلق	
(۵۳) پرناں خوشی نال نہ تاں مرنا	شادی جی سے کرنا، نہیں تو مرنا
(۵۴) پڑھی ہوئی دھی ان پڑھ نوں دینی گنو کھوتے نوں اکٹھا کرنا دسے	پڑھی ان پڑھ کے گھر جائے۔ گائے گدھے کو اٹھائے
(۵۵) بوہے آئی جنج ونوں کڑی دے کن	دروازے پر برات دیکھو تو دلہن کا کان چھیدو
(۵۶) اک وچھوڑا یار دا دوجی کالی رات	ایک تو برہا گھیری دوجے رین اندھیری
(۵۷) نچن لگی تے گھنگھٹ کیا	ناچنے نکلی تو خطاب کیسی
ظرافت	
(۵۸) ہاتھی دے دند دکھن دے ہور تے کھان دے ہور	ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور
(۵۹) اٹھ نہ سکے آپ پھٹے منہ گوڈیاں دا	اٹھ نہ سکے آپ پھٹے منہ گھٹنوں کا ۔
(۶۰) کڑی کچھڑ تے شہر ڈھنڈورہ	لڑکی بغل میں ڈھنڈورہ شہر میں
(۶۱) گھر نہیں دانے ۔ اماں پیہن گئی	گھر دانے نہیں ۔ اماں پیسنے گئی ۔
(۶۲) پٹیا پہاڑ نکلیا چوہا	کھودا پہاڑ نکلا چوہا (کوہ کندن کاہ برآوردن)
(۶۳) منہ سوئی تے پیٹ کھوئی	منہ سوئی اور پیٹ کنواں
(۶۴) سروں گنجی کنگھیاں دا جوڑا	سر سے گنجی اور کنگھیوں کا جوڑا
(۶۵) چور نالوں پنڈ کاہلی	چور سے گٹھڑی زیادہ اجل (شتاب)
(۶۶) نہ منہ نہ متھا تے جن پہاڑوں لتھا	نہ منہ نہ ماتھا اور پہاڑ سے جن اترا
(۶۷) ذات دی کوڑ کرلی شہتیراں نال جپھیاں	ذات کی چھپکلی اور شہتیروں سے ہم آغوشی
(۶۸) ہتھ نہ پلے تے کھیسا ہلے	نہ کچھ ہاتھ ہے نہ پلوا ہیں اور جیب ہلے
(۶۹) گھنڈوں خالی رب دے سوالی	جیب خالی ۔ رب کا سوالی
مذہب و روحانیت	
(۷۰) سماں بھیڑا پرکھے چار ۔ دھرم، دھیرج، متر، نار	برا وقت پرکھے چار ۔ دھرم، دھیرج، متر، نار

(۷۱) نرت دان مہاں کلیاں — نرت دان مہاں کلیاں

(۷۲) رب مہربان تے سبو مہربان — رب مہربان تو سب مہربان

(۷۳) بندہ جوڑے پلی پلی رب روڑا دے کپا — بندہ جوڑے پلی پلی رب گرائے پل

عقل کی اہمیت

(۷۴) عقل باجوں کھوں خالی — بغیر عقل کنواں خالی

(۷۵) انجان دا یا پرانان دا کھاؤ — عقل نادان خطرۂ جان

شیخی یا خالی خول دھمکی

(۷۶) جیہڑے گجدے ہین او وسدے نہیں — جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں

(۷۷) سکھنا تے ہولا بھانڈا بہت کھڑکدا ہے — جو ظرف ہو خالی وہ صدا دیتا ہے

بگلا بھگتوں پر طنزیہ کہاوتیں

(۷۸) دسن تو چنگا عملاں دا خراب — صورت مہتاب، اعمال خراب

(۷۹) چٹی قبر تے مردہ بے ایمان — مقبرہ جنت نشان مردہ بے ایمان

(۸۰) دسن دا بگلا تے مچھیاں دا ٹرکاؤ — دیکھنے کو بگلا مگر مچھلیاں ہڑپ کر جاتا ہے۔

(۸۱) داڑی شیخاں دی کم شیطاناں دے — داڑھی رحمان کی کام شیطانوں کا

(۸۲) گھر چوہڑیاں دا نام دھرم سالہ — گھر بھنگی کا کالا نام دھرم سالہ

(۸۳) شکل موماں دی اندر کافراں دا — شکل مومنوں کی۔ دل کافروں کا

(۸۴) کچھ تلے قران نظر ڈھگے تے — بغل میں قران نظر بیل پر (رام رام جپنا پرایا مال اپنا)

جس کی لاٹھی اُس کی بھینس

(۸۵) جہدی لاٹھی اس دی بھینس — جس کی لاٹھی اس کی بھینس

(۸۶) جہدی تیغ اس دی دیگ — جس کی تیغ اس کی دیگ

معاشرتی رسم راہ کے متعلق

(۸۷) اڈ کھائے سو ہڈ کھائے ونڈ کھائے سو کھنڈ کھائے — اکیلا کھائے تو ہڈی کھائے بانٹ کر کھائے تو کھانڈ کھائے

(۸۸) سوہرے گھر جنوا تراکتے دی مانند — گھر داماد سگ بنیاد

(۸۹) دو ہتھڑ تاڑی وجدی اے — دو ہاتھ سے تالی بجتی ہے

(۹۰) کولیاں دی دلالی تے مُنہ کالا — کوئلوں کی دلالی میں مُنہ کالا

(۹۱) سانجی چنگا نہیں او۔ چوری چپی کھادے کھو — اس ساجی پر دلائے جو چوری چوری کھائے

خانگی زندگی سے متعلق

(۹۲) کھٹو آوے ڈردا تے نکھٹو آوے لڑدا۔ — کماؤ لڑکا ڈرتا، نکما لڑکا بھرتا۔

(۹۳) ٹبر بھک مرے تے بنیرا سیلاں کرے۔ — گھر میں اڑتی دھول دولھا میاں باغوں باغوں پھول

پنجابی کہاوت	اردو ترجمہ
(۹۴) گھر دی آدھی باہر دی ساری نالوں چنگی اے	گھر کی آدھی باہر کی ساری
(۹۵) جو سکھ چوبارے نہ بلخ نہ بخارے	جیسے گھر پیارا وہ کیا کرے بلخ بخارا
(۹۶) میاں بیوی راضی تے کی کرے گا قاضی	میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی
خورد و نوش کے متعلق	
(۹۷) جو کرے گھیو نہ کرے ماں نہ کرے پیو	جو کرے گھی وہ نہ ماں کرے نہ پی
(۹۸) رکھے وی ڈھڈ تے اُجاڑے وی ڈھڈ	پیٹ ہی رکھے پیٹ ہی چکھے
(۹۹) کھان پین نوں چنگے بھلے تے کم کرن نوں ڈورے	کام چور نوالے حاضر
متفرق کہاوتیں	
(۱۰۰) باندر کی جانے ادرک دا سواد	بندر کیا جانے ادرک کا مزہ
(۱۰۱) عراقی نوں سینت ۔ گدھے نوں سوٹا	عراقی گھوڑے کو اشارہ، گدھے کو سونٹا
(۱۰۲) چھوٹا پانی دیکھ کے وڈا ٹپ نہ مار	پانی کم پاؤ تو لانبی چھلانگ نہ لگاؤ
(۱۰۳) کتا راج بہا لیا چکی چٹن جائے	کتا تخت پر بیٹھے پھر بھی چکی چاٹے
(۱۰۴) گاؤن بجونواے جوں بھانوے گلے ہون	ضرورت جو منوالیتی ہے، چاہے وہ گیلے ہی ہوں۔
(۱۰۵) ڈونگی واہی گجھ چلائے دو نتھانہ جائے	چرخہ کاتے اور ہل چلائے، محنت اکارت نہ جائے
(۱۰۶) چدر ویکھ کے پاؤں پسارو	چادر کے مطابق پاؤں پھیلاؤ
(۱۰۷) نامی شاہ کھٹ کھائے نامی چور ماریا جائے ۔	نامی ساہو کما کھائے نامی چور پکڑا جائے
(۱۰۸) جہی روح تہہ فرشتہ	جیسی روح ویسا فرشتہ
(۱۰۹) سچ مرچاں جھوٹ گڑ	سچ مرچیں جھوٹ گڑ
(۱۱۰) چٹی کتی جلیبیاں دی راکھی !	سفید کتیا جلیبیوں کی رکھوالی !
(۱۱۱) دیکھی ٹھوک وجا دنیا مطلب دی	ٹھوک وجا کر دیکھی دنیا مطلب کی
(۱۱۲) نانی خصم کیتا ۔ دوہتے نوں چٹی پئی	نانی نے شادی کی دوہتا کو جرمانہ پڑا
(۱۱۳) ست سو چوہے کھا کے بلی حج نوں چلی	سات سو چوہے کھا کے بلی حج کرنے چلی
(۱۱۴) سر قائم جنگ دائم	سر قائم جنگ دائم
(۱۱۵) خربوزہ خربوزے تھوں رنگ پکڑدا اے	خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے
(۱۱۶) سانچ نوں کوئی آنچ نہیں	سانچ کو آنچ نہیں ۔

محمد امین

آج کا روس

روس کا نظام حکومت دنیا کے تمام ملکوں سے مختلف اور نرالا ہے۔ یورپ اور ایشیا کے وسیع رقبے روس میں شامل ہیں۔ یہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ صنعت، زراعت اور تعلیم کے سلسلے میں پچھلے تیس سالوں میں اس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے — اس ترقی کے لئے اس کے قدرتی ذرائع اور اُن کا صحیح استعمال بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔

روس کی ترقی اور کامیابی کا راز اس کے پنج سالہ منصوبوں میں مضمر ہے۔ ۱۹۲۸ء سے چار پنج سالہ پروگرام کے ذریعے اُس نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ پہلے اس کی معاشی زندگی کا دارومدار کاشتکاری پر تھا لیکن اب روس کا شمار دنیا کے سب سے بڑے صنعتی ملکوں میں ہوتا ہے۔ سوائے امریکہ کے کوئی بھی اس کا ہم مقابل اور ہم پلہ نہیں۔ ۱۹۴۶ء سے اس کا چوتھا پنج سالہ پروگرام شروع ہوا ہے، اور اُمید ہے کہ آئندہ پندرہ سال کے اندر اندر وہ دنیا کا سب سے بڑا صنعتی، معاشی اور سیاسی ملک بن جائیگا۔

آج روس میں ہزاروں کارخانے ہیں۔ ہزاروں لوہے اور کوئلے کی نئی نئی کانیں ہیں۔ لاکھوں میل لمبی ریل ہے۔ سینکڑوں ایکڑ زمین پر آب پاشی کا انتظام ہے۔ بجلی کی طاقت حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے پاور ہاؤس ہیں، اور سمندر کے ساحل پر پچاسوں جدید اور عمدہ قسم کی بندرگاہیں ہیں۔

یہ زبردست کامیابی یوں ہی نہیں ہوئی ہے اور نہ کسی سرمایہ دار کی ذاتی کوشش سے بلکہ یہ سب کچھ ایک خاص منصوبہ بندی کے مطابق ریاست کے ہر ہر فرد کی پیہم کوشش کا نتیجہ ہے۔ سائنس، معدنیات، صنعت و حرفت، زراعت، تعلیم، ریلوے، سڑکیں، مکانات الغرض ہر چیز کو ترقی دینے کے لئے حکومت کمیٹیاں بناتی ہے۔ ہر کام کے لئے الگ الگ کمیسار (وزارتیں) ہیں۔ ہر شعبہ اپنا اپنا پنج سالہ پروگرام بناتا ہے، اور اس کے بعد سارے پروگراموں کو اکٹھا کر کے مرکزی حکومت تمام ملک کے لئے ایک مکمل منصوبہ تیار کرتی ہے اور ہر ری پبلک کیلئے الگ الگ کوٹا مقرر کرتی ہے۔ اس کے بعد سارا ملک ایک سرے سے دوسرے سرے تک کم سے کم وقت میں منصوبہ پورا کرنے کی کوشش میں منہمک ہو جاتا ہے۔

روس ایک بہت وسیع ملک ہے۔ اس کا رقبہ ۸۰ لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ ہے۔ یوں سمجھئے کہ امریکہ، کینیڈا، الاسکا، میکسیکو کے مجموعی رقبے سے بھی زیادہ ہے۔ اس کی سلطنت خشکی کے حصے پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک یورپ اور ایشیا میں ایک مسلسل قطعۂ زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔

یورپ اور ایشیا کے بہت سے ملکوں کی سرحد روس سے ملتی ہے۔ اور جنوب میں اس کی سرحد ۲۵ ہزار میل تک مسلسل پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی آبادی ۲۰ کروڑ ہے، جو امریکہ، کینیڈا، الاسکا، اور میکسیکو کی مجموعی آبادی سے تقریباً دو کروڑ زیادہ ہے۔ کاشت کا رقبہ ۹ لاکھ مربع میل ہے۔ اس کے مقابلے میں امریکہ میں صرف ۵ لاکھ مربع میل زمین کاشت کے قابل ہے۔ روسی ترکستان میں ۳۵ لاکھ مربع میل ریگستان ہے جو بہت جلد کاشت کے قابل ہو جائے گا خصوصاً جبکہ مصنوعی بارش اور سمندر کے کھاری پانی کو آب پاشی کے قابل بنانے کا طریقہ معلوم کیا جا چکا ہے۔

امریکہ کی طرح یہاں بھی معدنیات کی فراوانی ہے بعض معدنیات میں وہ امریکہ سے پیچھے ہے لیکن زیادہ تر معدنیات ایسی ہیں جن میں اس کا شمار دنیا میں اوّل درجے پر ہے۔

لوہے اور کوئلے کی یہاں بھی بہت افراط ہے ۱۹۲۸ء تک زیادہ تر کوئلہ اور لوہا اس کے یورپین علاقے سے نکلتا تھا۔ لیکن جوں جوں

اس کے پنج سالہ منصوبے کامیاب ہوتے گئے اسی لحاظ سے اُس نے نئے نئے علاقوں میں لوہا اور کوئلہ ڈھونڈھ نکالا۔

بحیرۂ اسود کے قریب صرف ڈونز بیسن میں پہلے کوئلہ نکالا جاتا تھا لیکن دورانِ جنگ میں جب اس علاقے کے تمام کارخانے یورال پہاڑ کے پیچھے منتقل کئے گئے تو معلوم ہوا کہ سائبیریا کی سرزمین قدرتی خزانوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس وقت ڈونز بیسن کے علاوہ مغربی سائبیریا میں کزنسک بیسن، قازقستان میں کراگندہ جو پہلے الشیپ کے ریگستانی علاقے میں پوشیدہ تھا، کاکیشیا، مشرق بعید اور التائی پہاڑیوں کے دامن میں لامحدود قدرتی وسائل ہیں۔ یورال کے علاقے میں بھی کوئلہ کا ذخیرہ موجود ہے اور مشرق میں دریائے آمور کی وادی میں بھی کوئلے کے امکانات ہیں۔ قیاس ہے کہ روس میں امریکہ کے مقابلے میں کوئلے کا ذخیرہ زمین کے اندر کئی گنا زیادہ ہے اور خرچ کی موجودہ رفتار کے حساب سے ہزاروں برس کے لئے کافی ہے۔ اور یہ سارا کا سارا کوئلہ لوہے کو گلانے کے لئے بہترین ثابت ہوا ہے۔

پہلے لوہے اور فولاد کی صنعتیں زیادہ تر ڈونز بیسن اور ماسکو کے علاقے میں تھیں لیکن جیسے جیسے لوہے کی نئی نئی کانیں معلوم ہوتی گئیں اسی لحاظ سے صنعت کا مرکز بھی منتقل ہوتا گیا۔ سائبیریا کے دو قصبوں — زادی برسک اور ارکوٹسک میں زمین کے اندر سے معدنیات نکالنے کے آلے بنائے جاتے ہیں۔ اسٹالے نسک میں انجن۔ یورال کے علاقے میں چلیابنسک میں ٹریکٹر، مشین، ونچ اور بجلی کے بڑے بڑے اوزار سورڈو دلسک میں، ڈیزل انجن اومسک میں کاشتکاری کی مشین۔ تاشقند میں آٹا پیسنے والی مشین سیمی پلٹنسک میں جو کہ قازقستان کے سٹیپ میں ہے۔ ماسکو، لینن گریڈ اور خارکو میں بجلی کی مشین تیار ہوتی ہے۔ یوکرین، یورال اور سائبیریا کا وسطی اور مغربی حصہ لوہے کی صنعت کا مرکز ہے۔

قازقستان، یورال اور وسطی ایشیا کے علاقے میں حکومت کی توجہ زیادہ ہے۔ یورال کے علاقے میں بہترین لوہا پایا جاتا ہے۔ اور اس سے ایک ہزار میل مشرق میں مغربی سائبیریا کے کزنسک بیسن میں بہترین کوئلہ دونوں علاقوں کے درمیان گورنمنٹ نے آمدورفت کا ایسا انتظام کیا ہے کہ ایک سمت سے کوئلہ جاتا ہے تو دوسری سمت سے لوہا آتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ کزنسک اور میگنی ٹوگورسک جو جنوبی یورال میں ہیں دونوں جگہوں میں لوہے اور فولاد کی صنعت نے تیزی سے ترقی کی ہے خوش قسمتی سے اب یورال کے علاقہ میں بھی عمدہ قسم کا کوئلہ مل گیا ہے اب کوئلہ سائبیریا سے لانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ بلکہ اپنے آپ بھروسہ کرے گا۔ دریائے آمور کی وادی میں بھی لوہا اور کوئلہ ساتھ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہاں بھی لوہے اور فولاد کی صنعت کو دی جارہی ہے۔ تاکہ بحرالکاہل کے ساحل پر ٹھیک جاپان کے جہاز بنانے کی صنعت تیزی سے ترقی کرسکے۔

پٹرول کی پیداوار کے لئے شروع شروع میں باکو کا علاقہ مشہور لیکن ۱۹۲۶ء کے بعد خاص طور سے نئے ذخیرے اور تیل کے چشمے سمع کی کوشش کی جارہی ہے۔ پچھلی جنگ عظیم چھڑنے سے چند سال پیشتر حکومت نے کئی ہزار سائنس دانوں کو اسی کام کے لئے متعین کیا تھا۔ وہاں چار ہزار سے زیادہ لوگ زمین کے اندر مختلف قسم کی معلومات تیل کے چشمے، یورینیم وغیرہ معلوم کرنے کے لئے دن رات کام کررہے تیل کے چشمے کا بہت بڑا ذخیرہ کاکیشیا میں گرازنی کے پاس معلوم علاوہ اس کے جنوبی یورال کے علاقے میں بھی ایک بہت بڑا خطہ بھرا پڑا ہے۔

علاوہ تیل کوئلہ اور لوہے کی صنعت کے روس میں بجلی کی طاقت بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کی ہے۔ ماسکو، لینن گریڈ اور مختلف میں بجلی کی طاقت کروڑوں کیلوٹ حاصل کی جاتی ہے۔ اور مختلف میں استعمال ہوتی ہے لیکن حکومت نے زیادہ توجہ اور مستعدی میں الگ الگ بجلی پیدا کرنے کا انتظام کیا ہے۔ دریائے نیپر نیی سی کی وادیوں میں اور کاکیشیا اور انگارہ کے علاقوں میں بھی کی بڑی بڑی اسکیمیں کام کررہی ہیں۔ سائبیریا اور وسطی ایشیا پیدا کرنے کے ذرائع لامحدود ہیں۔ سائبیریا کے پوشیدہ قدرتی کا راز معلوم کرنے کے لئے جوں جوں روسی حکومت دلچسپی لے بھی دن بدن نئی نئی بیش بہا دھاتیں دولت صنعت و حرفت پیداوار کے امکانات بڑھتے جارہے ہیں۔ دورانِ جنگ

بعد کے زمانے میں اس علاقہ نے تیزی سے ترقی کی ہے چنانچہ اب وہاں ہر قسم کی صنعت و حرفت، لوہے اور فولاد، بجلی اور ٹریکٹر، انجن اور زراعت کی مشینیں۔ کھاد اور کیمیکل ہر ایک کی بہتات ہے۔ اسی لئے سائبیریا موجودہ روس کے صنعتی ڈھانچے کا دل کہا جاتا ہے۔

جدید کوشش کی بنا پر ماہرین طبقات الارض کا اندازہ ہے کہ روس کی سرزمین خصوصاً سائبیریا اور وسطی ایشیا کے خطوں میں ان گنت معدنیات کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ نہ صرف کوئلہ، لوہا اور تیل کا بے شمار ذخیرہ موجود ہے بلکہ سونا، چاندی، پلیٹینم، ریڈیم، یورینیم، جواہرات، پوٹاش اور نمک، مینگنیز، ٹن جست، سیسہ، تانبہ اور پارہ کافی مقدار میں موجود ہے۔ اور اب ان میں سے تقریباً سبھی دھاتیں زمین سے نکالی بھی جانے لگی ہیں۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ روس جوں جوں اپنی منصوبہ بندی کو مکمل کرنے میں کامیاب ہوتا جائے گا ویسے ہی اس کی طاقت صنعتی، اقتصادی اور سیاسی بڑھتی جائے گی۔ اور روس پندرہ سال کے اندر اندر وہ ہر لحاظ سے نہ صرف ایک زبردست ملک ہو جائے گا بلکہ ہر چیز کی پیداوار میں وہ دنیا کے تمام ملکوں سے آگے بڑھ جائے گا۔

قدرتی نباتات زیادہ تر جنگلات کی شکل میں موجود ہیں۔ ویسے یہاں گھاس کا بھی ایک بہت بڑا میدان ہے جسے اسٹیپ کہتے ہیں۔ روس میں شمالی علاقہ جو ٹنڈرا یعنی شمال کے سرد خطے کے فوراً بعد ہے، جنگل کی دولت سے لدا پڑا ہے۔ یہاں نہ صرف ہزاروں قسم کی قیمتی لکڑیاں پائی جاتی ہیں بلکہ ان جنگلوں میں سمور والے جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا شکار پہلے تو بے ٹھکے طور سے ہوا کرتا تھا لیکن اب قاعدہ اور تنظیم کے ماتحت ہوتا ہے۔ جو جانوروں کی تعداد اور ان کی نسلوں کا خاص خیال رکھتی ہیں

جنگل کی لکڑیاں بڑے بڑے کارخانوں میں استعمال ہوتی ہیں، اور انہیں کچل کر نہ صرف کاغذ بنایا جاتا ہے، بلکہ مصنوعی ریشم کے لئے ایک مسالہ بھی۔ جنگلی حصہ کے جنوبی حصہ میں اس سرے سے اس سرے تک لکڑی کے بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ جو ضروریات کے مطابق مختلف کاموں کے لئے لکڑیاں فرنیچر مہیا کرتے رہتے ہیں۔

جنگل کے بعد اسٹیپ کا علاقہ ہے۔ جہاں کی مٹی سیاہ ہوتی ہے اور آب و ہوا کچھ کم سرد ہے۔ بارش تھوڑی ہی ہوتی ہے لیکن جو کچھ ہوتی ہے پھوار کی شکل میں۔ لہٰذا پانی رس رس کر زمین کے اندر جذب ہوتا رہتا ہے قدرتی ماحول گھاس کی پیداوار کے لئے بہت موزوں ہے۔ اس بڑے میدان میں ہزاروں لاکھوں مویشی پالے جاتے ہیں۔ جن سے دودھ مکھن، پنیر اور کریم وغیرہ بڑے پیمانہ پر حاصل کی جاتی ہیں۔ اس میدان کے بہت سے حصوں سے گھاس صاف کر دی گئی ہے اور زرخیز زمین پر گیہوں کی کاشت بہت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔

روس نہ صرف معدنیات اور قدرتی نباتات کے لحاظ سے خوش قسمت ہے بلکہ مختلف فصلوں کی پیداوار میں بھی وہ کسی ملک سے پیچھے نہیں ہے۔ روس کی سطح اور زمین کی ساخت کا نقشہ آپ اٹھا کر دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ اس سرے سے اس سرے تک وہاں میدان ہی میدان ہے۔ روس ... ڈگری شمالی عرض البلد سے ۷۰ ڈگری شمالی عرض البلد تک پھیلا ہوا ہے اور اس کی چوڑائی ۵ ہزار میل ہے۔ چنانچہ یہاں طرح طرح کی آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ گو سرد علاقوں کا خطہ زیادہ ہے۔ پچھلی جنگ عظیم سے پہلے کھیتی کا کل رقبہ ۹ لاکھ مربع میل تھا لیکن اب اس میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ سائبیریا روسی ترکستان اور دوسرے وسطی ایشیا کی ریاستوں پر پنج سالہ منصوبہ بندی کے پروگرام کے مطابق خاص توجہ کی گئی ہے نہ صرف یہ کہ ان علاقوں میں مختلف قسم کی فصلیں پیدا کی جاتی ہیں بلکہ حکومت نے ان کی آب پاشی کا بھی انتظام کیا ہے اور گیہوں، رائی اور جئی کی ایسی قسمیں معلوم کی ہیں جو سرد اور خشک دونوں علاقوں میں نہایت کامیابی کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ انہیں علاقوں میں ... کھاد کی صنعتیں بھی موجود ہیں اور تجربے کے لئے نئی ...

روس میں زراعت کی بنیاد جدید سائنس پر مبنی ہے ... نظام آپس کے میل اور اتفاق پر منحصر ہے۔ در اصل کلکھوز فارم ... جڑ ہے جو امریکہ کی طرح یہاں بھی ہر فصل کی پیداوار کے لئے ... علاقہ ہے۔ یہاں یوکرین میں گیہوں رائی اور جو کی پیداوار ہوتی ہے۔ چاول جنوب کے گرم خطوں میں آب پاشی کی مدد سے ہوتا ہے۔ آلو چقندر دریائے والگا کی وادی میں کثرت سے اور سائبیریا کے خطوں میں بھی اب کثرت سے پیدا ہونے لگا

کپاس کے لئے کاکیشیا کا علاقہ روسی ترکستان کا علاقہ اور وسطی ایشیا کے دوسرے علاقے بہت مشہور ہیں۔ یہاں کی کپاس بہت عمدہ اور اچھی ہوتی ہے اور اس علاقہ میں سوتی اونی اور ریشمی کپڑوں کے بڑے بڑے کارخانے بھی ہیں جنوب کے خشک اور پہاڑی علاقوں میں بکریاں اور بھیڑیں لاتعداد پائی جاتی ہیں۔ جن کا اُون نکال کر کارخانوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ سائبیریا اور یورپین روس کے شمالی سرد علاقوں میں روسی حکومت نے کم وقت میں پکنے والی جو گیہوں اور رجئی کی فصل کی کاشت جدید پیمانہ پر شروع کی ہے۔ اور ۹۵ فی صدی اس میں کامیاب ہے۔ ان علاقوں میں روسی حکومت کا نعرہ ہے کہ قدرتی غیر موافق ماحول پر انسان کو فوقیت حاصل کرنی ہے۔

کاشتکاری کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر ہر خطہ میں اپنی اپنی ایک تجربہ گاہ ہے۔ جہاں بیج، بہتر فصل اور ان کی مختلف قسموں پر دن رات تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ کئی سال کے تجربے کے بعد روسی حکومت نے گیہوں، جو، آلو، چقندر کپاس کی ایسی قسمیں معلوم کرلی ہیں جو بیماری کے حملوں سے بالکل محفوظ رہتی ہیں اور فی ایکڑ پیداوار غیر معمولی طور سے زیادہ ہوتی ہے۔ سال بسال اسی بیج کا استعمال بڑھتا جاتا ہے اور اس طرح ہر فصل کی پیداوار میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

روس صنعت، زراعت، تعلیم ہر میدان میں بڑے پیمانے پر تجربہ کررہا ہے۔ اس تجربے میں اُسے ممکن ہے کہیں کہیں پر ناکامی ہوتی ہو۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہے اور اس لئے وہ تیزی سے ہر چیز میں ترقی کررہا ہے۔ صنعت و حرفت کا کوئی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لوہے اور فولاد کی صنعت کے ساتھ ساتھ موٹر۔ انجن، ریل، جہاز، کاشت کاری کی مشین، ٹریکٹر، ریڈیو سٹ، اور جتنی بھی صنعتوں کا تعلق ہے سب ہی اس علاقے میں اُبھر رہی ہیں۔ اور تیزی سے ترقی کر رہی ہیں۔ زراعت کے معاملہ میں روسی حکومت اس بات کی قائل ہے کہ ایک انچ بھی زمین بے کار نہیں چھوڑنی چاہئے چنانچہ وہ دن رات بنجر اور بے کار زمین میں فصلوں کی کاشت بڑھاتی جاتی ہے اور اس کی کامیابی کیلئے بھی وہ چیزیں جو درکار ہیں وہ مہیا کرتی ہے جیسے ٹریکٹر، مصنوعی کھاد، مشین، آب پاشی، نئے اور بہترین بیج۔

صنعت و حرفت اور زراعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ روسی حکومت تعلیم سے بھی غافل نہیں ہے۔ تعلیم اور سائنس کے مختلف شعبوں میں نئے نئے تجربے کے لئے بہترین انتظام ہے۔ روس کا ہر فرد اپنے رجحانات اور دلچسپی کے بل بوتے پر زیادہ سے زیادہ اور اونچی سے اونچی تعلیم حاصل کرتا ہے اور اس کے بعد وہ روس کی بڑی تجربہ گاہ میں خود بھی محو ہو جاتا ہے، اور اپنے ملک اور قوم کو آگے بڑھانے میں مدد کرتا ہے۔

سیر و تفریح اور سنیما کا بھی بہت اچھا بندوبست ہے۔ ہر شہر اور ہر قصبہ میں سنیما اور ریڈیو کا استعمال بہت عام ہے لیکن یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ ان چیزوں کا جتنا اچھا استعمال روس میں ہوتا ہے کسی ملک میں بھی نہ

اختر سعید

غزل

رہِ حیات میں جب تیری رہگزر آئی　　زمین تھی مگر اک آسماں نظر آئی
قدم اُٹھے جو کبھی منزلِ حیات کی سمت　　اجل کے سائے میں بھی زندگی نظر آئی
اب آگے قافلۂ زیست کون روکے گا　　فنا کی راہ سے بھی زندگی گزر آئی
غمِ حیات نے پہلو ہزار ہا بدلے　　تمہاری یاد جو آتی تھی عمر بھر آئی
مجھے اصولِ محبت سے ضد نہیں لیکن　　تمہارا نام سُنا اور آنکھ بھر آئی
مری نگاہ سے چھپنا تو خیر ممکن ہے　　مگر وہ شکل جو دل میں مرے اُتر آئی
کسی نے پیچھے سے دل کا مزاج پوچھ لیا　　بہت دنوں میں طبیعت جو راہ پر آئی
ترا جمال کہ خوابیدہ روح جاگ اٹھی　　ترا شباب کہ آنکھوں میں نیند بھر آئی
یہ پچھلی رات ستارے نظر چرانے لگے　　حکایتِ دلِ ناداں نہ ختم پر آئی

نہ لُٹتا راہ میں پھولوں کا کارواں اختر
خزاں بہار کے دامن میں جلوہ گر آئی

سال نامہ ۱۹۵۰

مختلف آراء کے اقتباسات

★ "آج کل" بہت دنوں سے دیکھتا ہوں۔ رسالے کا معیار بلند ہے اور اُسے قائم رکھنے بلکہ ترقی دینے کی فکر ہر قدم پر نمایاں۔ ماہانہ رسالے کے علاوہ آپ کے ادارے نے سال نامے شائع کرنے کا دستور بھی جاری رکھا ہے اور ان سال ناموں میں بہت مفید مقالے، نہایت اچھی نظمیں، بڑی خوب صورت تصویریں ہمیشہ دیکھی گئی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ ملک کے کسی اور با تصویر رسالے میں اتنی خوبیاں جمع نہیں جتنی "آج کل" میں

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

★ رسالہ "ادبی" ہو اور پھر شریفوں کے ہاتھ میں جانے کے قابل رہ جائے ایسے رسالے اب دو ہی چار باقی رہ گئے ہیں اور ان گنے چنے رسالوں میں ایک ممتاز مقام "آج کل" کو حاصل ہے جس کا بہترین نمونہ اگست نمبر یا سال نامہ ۱۹۵۰ ہے۔ "فائز دہلوی" پر پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کا مضمون ایک تحقیقی مقالے کی شان رکھتا ہے۔ اور اسی کے ٹکر کا مضمون خواجہ احمد فاروقی کے قلم سے "ذکر میر خود نوشت کی حیثیت سے" پر ہے۔ تصویریں ان سارے عیبوں سے پاک ہیں جن کے لئے تصویریں بدنام ہو چکی ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی

★ سال نامہ حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دولت سے مالا مال ہے مولانا مسعود حسن رضوی کا ادبی مضمون "فائز دہلوی" کے عنوان پر بڑا قیمتی ہے اور اردو ادب میں تاریخی حیثیت کا مضمون ہے۔ "گل کدہ" کے عنوان پر ہندوستانی زبانوں کا ادب جو اردو نثر اور نظم دونوں میں شائع کیا گیا ہے بہت سی محنت اور تلاش کا نتیجہ ہے قیمتی باتوں کے لحاظ سے اسے بھی گنج شائگاں کہنا چاہیئے۔

حضرت جوش ملسیانی

★ اس مرتبہ "آج کل" کا سال نامہ ۱۹۵۰ کی خاص یادگار۔ تمام صوری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ۔ تصویریں بولتی ہوئی۔ مضامین بلند پایہ۔ اگر لکھنے کی طاقت ہوتی تو بہت کچھ لکھتا۔ اس وقت اتنا ہی لکھ سکتا ہوں کہ آپ کی کوششیں بار آور اور قابلِ داد ہیں۔

حضرت آرزو لکھنوی

★ میں نے "آج کل" کے سال نامے کو بڑے شوق سے پڑھا۔ ادارے کے حسنِ انتخاب اور حسنِ ترتیب کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر زور کا مضمون "اُردو کے علمی و ادبی مسائل" قامت میں مزور کم ہے لیکن قیمت میں کم نہیں۔ ڈاکٹر مسعود کا مضمون بہت دلچسپ ہے۔

خواجہ احمد فاروقی

★ "آج کل" کا سال نامہ ۱۹۵۰ جو حال ہی میں شائع ہوا ہے ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ تمام مضامین نظم و نثر معیاری ہیں۔ دلچسپی اور افادیت دونوں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

تلوک چند محروم

★ اُردو رسائل کی برادری میں "آج کل" کی آن بان نظر انداز نہیں کی جا سکتی اس کی صورت و سیرت پر ہر ادبی دیدہ ور کی نگاہ تحسین پڑتی ہے۔ اس کا سال نامہ اس مرتبہ بھی بقامت کہتر ہونے کے باوجود بہ قیمت بہتر ہے

اختر علی تلہری

★ ۱۹۵۰ء کا سال نامہ ہر پہلو سے اردو ادب میں ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ ہندوستانی زبانوں کے ادب سے ہندی، بنگالی، پنجابی، تامل، مرہٹی، ملیالم اور دوسری زبانوں کے ادبی نمونے ایک مضمون میں پیش کئے گئے ہیں۔ سال نامہ کی ترتیب کا یہ پہلو خاص طور پر قابلِ تحسین اور دوسروں کے لئے قابلِ تقلید ہے

"ہماری زبان" علی گڑھ

★ یہ خاص نمبر اپنے دل کش مضامین نظم و نثر، اپنی دیدہ زیب تصاویر، اپنے رنگین سرورق اور اپنے اہتمام کتابت و طباعت کے لحاظ سے نہایت قابلِ قدر چیز ہے۔

رہنمائے تعلیم دہلی

زمین، زراعت اور تہذیب

موجودہ زمانے کے انسان کو بعض اوقات یہ یقین دلاکر فریب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے کہ اگر وہ زمین سے برآمد ہونے والی دھاتوں اور دیگر معدنی اشیاء کو مشینوں میں تبدیل کر سکے تو وہ اپنی خوراک کے فکر سے آزاد ہو سکتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ ہم مشینیں نہیں کھا سکتے ہیں بلکہ ہم وہ خوراک کھاتے ہیں جو ان مشینوں کے ذریعے سے حاصل ہو سکتی ہے اور خوراک تو صرف درخیز زمین ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ قدیم کے لوگ بجا طور پر زمین کو "دھرتی ماتا" کہتے تھے۔ پس یہ لازم ہے کہ نوع انسان کی بقا کی خاطر زمین کی قوت بالیدگی کا تحفظ کیا جائے۔ کیونکہ خوراک ہمیں پناہ ہے اور زندگی کی دیگر ضروریات ہمیں اس سے حاصل ہوتی ہیں۔ اگر ہم زمین کی قوتِ بالیدگی اور زرخیزی کا تحفظ کرتے رہیں تو ہم اور ہماری اولاد ہی نہیں بلکہ ہماری آئندہ نسلیں سلامت اور خوش حال رہیں گی۔ خوراک پیدا کرنا تمام بنی نوع انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے اس لئے اس وقت ہم صرف اس ایک مسئلہ یعنی خوراک حاصل کرنے کے لئے زمین کو استعمال میں لانے کے معاملہ پر ہی غور و خوض کریں گے۔ اگر ہم یکے بعد دیگرے فصلیں کاشت کرتے جائیں اور زمین کی قوت بالیدگی کو پھر سے بھرپور کرنے کی طرف کوئی دھیان دئے بغیر فصلوں کا پھل حاصل کرتے رہیں تو نتیجہ کیا ہوگا۔ قدرت ہماری مدد نہیں کرے گی۔ زمین کی زرخیزی ختم ہو جانے کے باعث اس سے کچھ بھی پیدا نہ ہو سکے گا۔

ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ زمین میں فصلیں پیدا کرنے کے ساتھ ہی اس کی زرخیزی کو برقرار رکھیں اور یہ مقصد زمین کی ہیئت ترکیبی اور قوتِ بالیدگی کو بڑی احتیاط سے قائم رکھنے اور آبی ذرائع کا تحفظ کرنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مدعا یہ کہ ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن کے ذریعے سے زمین کی زرخیزی اور پیداواری طاقت کو اعلیٰ درجہ پر قائم و برقرار رکھا جا سکے۔ بھارت میں زرعی زمینوں کے ایک تہائی حصہ کو کسی نہ کسی طرح سے نقصان پہنچتا رہتا ہے اور ہر سال کئی لاکھ ایکڑ زمین بنجر ہو جانے کی وجہ سے بڑا بھاری قومی نقصان ہو جاتا ہے۔ گنگا کی وادی میں ہر سال اندازاً ایک فیصدی زمین کی زرخیزی گھٹ جاتی ہے اور اس میں سے پانچ فیصدی زمین ہر سال بنجر بن جاتی ہے۔

زمین کا کٹاؤ

ہوا اور پانی دو ایسے سرگرم عناصر ہیں جو زمین کی زرخیزی کو برباد کرتے ہیں۔ ویسے تو یہ دونوں ہمیشہ ہی سرگرم عمل رہتے ہیں لیکن ڈھلان اور ویران زمینوں پر ان کا اثر اور بھی زیادہ ہوتا ہے۔ سال کے تین مہینوں میں تیز و تند چلنے والی ہوائیں زمین کے ہلکے زرخیز ذرّوں اور ریت کو اپنے ہمراہ اڑا کر لے جاتی ہیں اور ان کو سینکڑوں میل دور جا پھینکتی ہیں۔ ریت پتھر کے ریزوں سے بنتی ہے۔ اسے سیلیکا کہتے ہیں۔ اور جس زمین میں ریت بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی پیداوار گھٹ جاتی ہے اور آخرکار کھیتوں کو بنجر بنا دیتی ہے۔

جب بارش برستی ہے۔ تو بارش کی بوچھاڑ سے زمین کے سطحی ہلکے زرخیز ذرّے اکھڑ جاتے ہیں۔ پہلے تو پانی زمین میں جذب ہو جاتا ہے لیکن جب ایک بار زمین سیراب ہو جاتی ہے۔ تو پھر بارش کا پانی بہنے لگتا ہے اور وہ اپنے ہمراہ زمین کے زرخیز ذرّے بہا کر دریاؤں میں لے جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ کھیتوں کی ساری سطحی زرخیز مٹی بہہ جاتی ہے۔ اس طرح پہلے زمین کی ایک تہ کٹ کر بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ زیادہ شدید نقصان پہنچتا ہے۔

زمین کے کٹاؤ کا انسداد

اس نقصان کا انسداد کرنے کے لئے زمین کو ڈھانپنا چاہیئے یعنی بنجر اور نیم بنجر زمینوں میں مقررہ فاصلوں پر حفاظتی قطعات "ریت اور مٹی کے ذرّوں کا زرخیز زمینوں میں بہاؤ روک دیتے ہیں۔ خالی زمینوں اور پندرہ فیصدی سے زیادہ کی ڈھلان زمینوں پر درختوں، جھاڑیوں اور گھاس کے ذریعے سے زمین کا بچاؤ کرنا چاہیئے۔ درخت چھتریوں کا کام دیتے ہیں اور بارش کی بوچھاڑ کی شدت کو کم کر دیتے ہیں۔ اگر سڑکوں کے کنارے کھیتوں کی مینڈوں پر اور پہاڑی علاقوں کی بلندیوں پر جنگل اُگائے جائیں۔ تو اس سے پانی کے بہاؤ کی طاقت گھٹ جائے گی اور بارش کا پانی پھر سے زمین میں واپس چلا جائے گا۔ اس طرح طغیانیوں کو بھی روکا جا سکے گا۔ جو اکثر اس ملک میں ہر سال بھاری تباہی و بربادی کا موجب ہوتی ہیں۔

زرعی زمینوں میں قدرت کی ان طاقتوں کا مقابلہ ایسے سادہ طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔ جن پر ہر ایک کاشتکار انفرادی طور پر عمل کر سکتا ہے فصل کاٹنے کے وقت کھیتوں میں چار سے چھ انچ تک لمبے پودوں کے ڈنٹھل کھڑے چھوڑے جا سکتے ہیں۔ جب تک نئی فصل نہیں بوئی جائے گی۔ یہ ڈنٹھل پودوں کے پتے اور ہنٹھل زمین کی زرخیز سطح کو جکڑے رکھیں گے۔ اور اُسے پانی اور ہوا کے زور سے کٹنے اور بہنے سے بچائیں گے۔ ہل چلانے کے وقت پودوں کے ڈنٹھل ہل کے ساتھ ہی زمین میں دل دیئے جائیں۔ اس سے زمین کے کٹاؤ کے تحفظ کے علاوہ زمین زیادہ نرم ہو جائے گی اور زمین کے زیادہ مسام دار ہو جانے کے باعث اس کی پانی جذب کرنے کی اہلیت بڑھ جائے گی۔

ڈھلان جگہوں پر کھیتوں میں نیچے سے اوپر کی جانب ہل چلانے کی بجائے ڈھلان کی چوڑائی کی جانب متوازی ہل چلانے سے نہ صرف بیلوں اور اوزاروں پر دباؤ گھٹ جائے گا بلکہ اس سے زمین کے پانی یا ہوا کے ساتھ بہہ جانے میں بھی کمی واقع ہوگی۔ ڈھلان زمین پر چوڑائی کی جانب چلائے ہوئے ہل سے جو نالیاں بنیں گی وہ سب کی سب چھوٹے چھوٹے بند سے بنتی جائیں گی اور زمین کی زرخیز سطح کا کٹ کر بہہ جانے سے روکنے کا موجب بنے گی۔

کئی پشتوں سے بھارت میں کیاریاں بنا کر فصلیں کاشت کرنے کا رواج چلا آتا ہے لیکن نہ تو کیاریوں کی چوڑائی سائنسی طور پر مقرر کی جاتی ہے، اور نہ ہی ان کیاریوں میں بوئی جانیوالی فصلوں کا انتخاب موزوں طور پر کیا جاتا ہے۔ عام طور پر پھل دار خوردنی سبزیاں اور غیر پھل دار فصلوں کی کیاریاں یکے بعد دیگرے بوئی جانی چاہئیں یا پھلی فصلوں اور گھنی بوئی جانے والی فصلوں کی کیاریاں ایک دوسری کے بعد ساتھ ساتھ بوئی جائیں۔ اس طرح کیاریوں میں فصلیں کاشت کرنے سے زمین کی عمدہ اور زرخیز مٹی پانی یا ہوا کے ساتھ بہہ کر نہیں چلی جاتی۔

زمانہ قدیم ہی سے بھارت کے کسان کھیتوں کے گرد منڈیریں باندھنے کا فائدہ جانتے ہیں۔ نیچی اونچی زمینوں کے گرد بٹ لگانے یا منڈیر بنانے سے پانی یکساں طور پر پھیل جاتا ہے جس سے ان بندوں پر پانی کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ جن مقامات پر زمین کی ڈھلان زیادہ ہے اور جہاں کاشتکاری لازماً کرنی پڑتی ہے وہاں پہاڑی کی ڈھلان کو کاٹ کر نیچے اوپر سیڑھیوں کی مانند کھیتوں کے تختے بنائے جاتے ہیں اور اس طرح چھوٹے چھوٹے ہموار کھیت کاشت کیلئے تیار کئے جاتے ہیں۔

جبتک کوئی بڑی فصل کاشت نہ کی جائے تب تک سبز کھاد کی فصلیں بونے سے بھی زمین کو کٹاؤ سے بچایا جاتا ہے۔ اس طریق عمل سے نہ صرف زمین کے کٹاؤ کا انسداد ہوتا ہے بلکہ زمین میں رطوبت قائم رہتی ہے۔ پودوں کی غذا زمین میں موجود رہتی ہے۔ اور بعض اوقات مویشیوں کیلئے کافی مقدار میں چارہ بھی میسر ہو جاتا ہے کیمیائی کھاد سے سب سے زیادہ فائدہ اسے پھل دار اناج کیلئے استعمال کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے استعمال سے فصلوں کی پیداوار بڑھتی ہے۔ زمین کی قوت بالیدگی کا تحفظ ہو جانے کی وجہ سے بعد میں بوئی جانے والی دوسری فصل کو بہت فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ زمین میں کچھ کیمیائی مادہ اور پودوں کی غذا زیادہ مقدار میں موجود رہتی ہے۔

نمدار اور دلدلی زمین سے پانی کا نکاس کر دینے سے بہت سی زرخیز زمینیں کہ جو ویسے تو بیکار پڑی رہتی ہیں پھر سے زیر کاشت لایا جا سکتا ہے۔ نمدار اور دلدلی زمین سے کھلی نالی کھود کر پانی نکال دینے سے اُسے پیداواری رقبہ بنایا جا سکتا ہے۔ مرتسمم ارادہ اور کھدائی کرنے سے کام بن جاتا ہے۔

پیداوار میں کافی سے زیادہ اضافہ اجاڑ کنوؤں اور تالابوں کی مرمت سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

آبپاشی کے جس قدر ذرائع میسر آسکتے ہیں ان تمام کو استعمال میں لانا فوری اور بہت موثر طریقہ ہے۔ صرف پانی کو استعمال کرنے کے عمدہ اور مستحکم طریقے اختیار کرنے سے ہی پیداوار کی مقدار کو بہت زیادہ بڑھایا جا سکتا ہے۔

نئی کتابیں اور رسالے

نوائے حیات

یحییٰ اعظمی صاحب نے اپنی نظموں کا یہ مجموعہ اضافہ و ترمیم کے بعد دوبارہ شائع کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مصنف کے باب میں لکھا ہے "اُن کی طبیعت شاعرانہ واقع ہوئی ہے۔ اس لئے جو کچھ کہتے ہیں مؤثر اور دل نشین ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے ان کا کلام عام طور پر مقبول ہوگا۔" علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے یحییٰ صاحب پرانے کہنے والوں میں سے ہیں اور آپ کا کلام ہر دور میں مقبول رہا ہے۔ علامہ شبلی اور اُن کے خوش گو شاگرد مولانا اقبال احمد سہیل سے آپ بہت متاثر ہیں۔ ان کے کلام میں قوت ہے۔ مذہب اور سیاست ان کے خاص موضوعات ہیں۔ محمد علی، ڈاکٹر انصاری، اقبال اور فانی کے دردانگیز اور مؤثر مرثیے یادِ رفتگاں کے عنوان کے تحت پڑھنے کے قابل ہیں۔ "دورِ وحشت" کے تحت دس نظمیں ۱۹۴۷ء اور اُس کے بعد کی انسانی بربریت کا نوحہ ہیں۔ نظموں میں زورِ بیان بھی ہے اور شدتِ خلوص بھی۔ کچھ فارسی نظمیں بھی کتاب کے آخر میں شامل ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ یحییٰ صاحب کا یہ مجموعۂ نظم حسبِ سابق اہلِ ذوق سے داد حاصل کرے گا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

رہے وہ عالمِ باقی ہوئی جانِ فانی — آج ماتم کدہ ہے بزمِ جہانِ فانی

کہیں صدیوں میں ہوتا ہے فیضِ خاص نیسانی — نہیں اُٹھتے ہمیشہ دہر میں شبلی نعمانی

دنیا بھر اس رنگ رنگیں کا اک اک نقشِ زیبائی — نگاہِ شوق اگر خود جا کے حسن آرا ہو جائے

تغافل اور یہ بیم تغافل اے معاذ اللہ — کبھی پیغام کیوں یہ مہربانی ہوتی جاتی ہے

ناشر دارالمصنّفین اعظم گڑھ۔ قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد ہے۔
تقطیع ۲۰×۲۶، ضخامت ۲۰۴ صفحے۔ کاغذ اچھا۔ کتابت و طباعت معقول۔

پکھراج

ناشر دیا مندر لمیٹڈ نئی دہلی۔ قیمت تین روپے چار آنے۔
کتاب مجلد ہے اور جلد پوش کی حامل۔

ہرکشن چند کپلا کے ہندی افسانوں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ کپلا صاحب انگریزی کے مشہور جرنلسٹ ہیں لیکن ہندی میں بھی اکثر لکھتے ہیں۔ اس مجموعے میں سترہ کہانیاں ہیں جن میں سے اکثر سنگم، ہندوستان اور نو بھارت میں چھپ چکی ہیں۔ پیش لفظ ہندی کے مشہور افسانہ نگار جینیندر کمار نے لکھا ہے کہ کپلا وارداتِ زندگی کو افسانوں کا روپ دیتے ہیں۔ وہ حیاتی نظیر کے ایک اچھے مبصر ہیں اور اسی وجہ سے جینیندر کمار کے قول کے مطابق ان کے اندازِ بیان میں کشادگی ہے۔ کپلا ایک خوددار ادیب ہیں چنانچہ کتاب کا انتساب ان لوگوں کے نام ہے جنہوں نے ان کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں۔ ان کہانیوں میں سے دیوزہ بچّے اور پکھراج خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سُرخ آنچل

مرتبہ پرکاش پنڈت، ناشر مکتبۂ شاہراہ اردو بازار دہلی
قیمت تین روپے بارہ آنے۔

یہ کتاب اُردو کی تیرہ ممتاز افسانہ نگار خواتین کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے اُردو ادب کی دُنیا میں خواتین کو اہلِ قلم کی حیثیت سے داخل ہوئے بہت مدت نہیں گذری لیکن اس تھوڑی سی مدت میں انھوں نے ادب میں جس طرح اپنی عظمت کا سکّہ منوا لیا ہے وہ ایک معجزہ نظر آتا ہے۔ اور افسانوی دنیا میں تو بعض خواتین نے وہ نام پیدا کیا ہے کہ اگر دو چار منتخب افسانہ نگاروں کا ذکر کرنا چاہیں تو انھیں کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

پرکاش پنڈت کی یہ کتاب جو دوگونہ ذوقِ انتخاب کی مظہر ہے۔ ایک افسانہ نگار خواتین کا انتخاب، دوسرا ان کے شہ پاروں کا انتخاب — ہماری افسانہ نگار خواتین کی اسی عظمت کا ایک اعتراف ہے۔

افشاں

ملنے کا پتہ احمد انوار صدیقی ۹۲۲ سینٹرا سٹریٹ مہو۔ وسط ہند
قیمت ۸ء ضخامت ۹۴ صفحے کتاب مجلد ہے اور جلد پوش کی حامل

مدھیہ بھارت کے ایک خوش فکر شاعر احمد وقار عاشقی کی رباعیوں کا یہ مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ وقار صاحب اچھی رباعیاں کہتے ہیں۔ کہیں کہیں دلکش طنز کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے

ہنگامۂ خوں ریز طلب ہے دُنیا — اک دستِ ستم خیز طلب ہے دُنیا

یہ امنِ مسلسل کی نہیں ہے قائل — ہر عہد میں چنگیز طلب ہے دُنیا
بدلی نہیں حالت وہ ہماری اب تک — ہر قلب میں ہے طاری سامانِ جنگ
وہ رسم جسے شرک کہا جاتا ہے — توحید کے عنواں سے ہے جاری اب تک

زندگی کے سائے پہلا بک اور اگینز پوسلوسکی کی کہانیوں کا مجموعہ جنھیں جناب بلال احمد نے ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ صاف شستہ اردو اں زبان میں ہے قیمت دو روپے پبلشرز لاجپت رائے اینڈ سنز اُردو بازار دہلی۔

تحریکِ پختونستان حضرت خان غازی کی تصنیف ہے جس میں آپ نے تحریکِ پختونستان کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ قیمت درج نہیں ملنے کا پتہ۔ خان غازی کابلی سکریٹری پختون جرگہ ہند کوچہ رحمان لال گلی متصل گھنٹہ گھر چاندنی چوک۔ دہلی۔

امن کیونکر ہو گا مرتبہ جناب واحد نیلوری۔ یہ کتاب "امن کیونکر ہو گا" کے مسئلے پر اردو کے بعض مشہور شعراء اور ادبا کے مقالات پر مشتمل ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ سید عبد الواحد واحد نیلوری۔ یونانی دواخانہ چھوٹا بازار۔ نیلور۔

رسالے

شاعر مشاعرہ نمبر شاعر اردو کا ایک ممتاز جریدہ ہے جو ہر ماہ آگرے سے جناب اعجاز صدیقی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ حال ہی میں اس کا مشاعرہ نمبر شائع ہوا جس میں ایک مصرع پر ہندو پاکستان کے ایک سو ستائیس شعراء کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں مقالات میں سید احتشام حسین کا مقالہ "مشاعرے اور ان کی افادیت" اپنی افادیت کے اعتبار سے ایک گراں بہا حیثیت رکھتا ہے۔ اس مشاعرہ نمبر میں تعجب خیز بات یہ نہیں کہ حضرت اعجاز نے اردو کے تمام بڑے شعراء کو کیونکر ایک ہی محفل میں جمع کر لیا ہے بلکہ یہ ہے کہ اس بزم میں بعض ایسے غیر معروف اور گمنام شعرا بھی موجود ہیں جن کی غزلیں ادبی اعتبار سے ایک بہت اونچا مقام رکھتی ہیں۔ اعجاز صاحب اس کامیاب تلاش و جستجو کے لئے مستحق مبارکباد ہیں۔ شعراء کی تصاویر نے اس مجموعے کی ادبی اور تاریخی اہمیت میں خاص اضافہ کر دیا ہے۔ تعداد صفحات ۱۹۲۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (سالانہ قیمت ساڑھے پانچ روپیے) ناشر مکتبہ قصر الادب۔ آگرہ۔

رفتارِ زمانہ

پیسیفک کانفرنس

لکھنؤ میں پیسیفک کانفرنس کے گیارہویں اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے بھارت کے پردھان منتری پنڈت جواہر لال نہرو نے زوردار الفاظ میں اپیل کی کہ ہمیں بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے جنگ کو ہر قیمت پر روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ آپ نے کہا کہ جب لوگ تیسری بڑی جنگ کی باتیں کرتے ہیں تو انہیں شاید یہ خیال نہیں رہتا کہ پچھلی دو بڑی جنگوں سے ہمیں نہ صرف عظیم نقصانات ہی برداشت کرنے پڑے بلکہ ہمارے لئے نئی الجھنیں بھی پیدا ہوگئیں اس لئے ہمیں کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیئے جس سے تیسری جنگ کے امکان کو تقویت حاصل ہو۔ پچھلے تین ماہ سے کوریا میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ امن پسند اشخاص کی یہ دلی خواہش ہے کہ یہ جنگ کم سے کم علاقے تک ہی محدود رہے اور اسے جلد از جلد ختم کر دیا جائے لیکن کچھ فوجی طاقتیں کوریا میں مزید آگے بڑھ کر یہ سمجھتی ہیں کہ وہ اس طرح کئی بنیادی مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ شاید وہ تاریخ سے یہ سبق حاصل نہیں کرتیں کہ اگر وہ بہت آگے بڑھیں گی تو ٹھوکر کھائیں گی اور اس سے انہیں کئی دوسری الجھنوں میں پھنس جانا پڑے گا۔

آئندہ انتخابات

بھارت کے الیکشن کمشنر شری سکمار سین نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا ہے کہ ملک میں انتخابات کرانے کے لئے تمام طیاریاں اپریل ۱۹۵۱ء کے وسط تک مکمل ہو جائیں گی۔ آپ نے بتایا کہ رائے دہندگان کی ابتدائی فہرستیں نومبر تک بن جائیں گی لیکن انتخابی حلقوں کے مطابق آخری فہرستیں اگلے سال ماہ فروری میں مکمل ہوں گی۔ شری سین کے اندازے کے مطابق ملک میں رائے دہندگان کی تعداد ۱۸ کروڑ ہوگی آپ نے یہ بھی بتایا کہ لگ بھگ دو ہزار رائے دہندگان کے لئے ایک بیلٹ بکس ہوگا اور آئندہ انتخابات میں کل ۱۷۵ اہم نشستوں کے لئے امیدوار کھڑے ہونگے۔

بھارت پاکستان خیر سگالی کانفرنس

اُتر پردیش کے پردھان منتری پنڈت گوبند بلبھ پنت نے لکھنؤ میں بھارت پاکستان خیر سگالی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہر دو ممالک کی ترقی کے لئے بھارت اور پاکستان میں باہمی دوستی کا ہونا نہایت ضروری ہے اور صرف اسی طریقے سے دونوں دلیشوں کی جنتا کی اقتصادی مصیبتیں دور ہو سکتی ہیں۔ پنت جی نے مزید کہا کہ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے وہ مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے راستے ہی پر چلے گا۔ اور امن پسندی اور شانتی کے مارگ کی پیروی کرتے ہوئے وہ اپنی دوستی کا ہاتھ ہمیشہ بڑھائے رکھے گا۔ ہند پاکستان خیر سگالی کنونیشن کے جنرل سیکرٹری شیخ مستقر اللہ نے لکھنؤ سے ایک نشری تقریر کے دوران میں بھارت کے آئین کو اقلیتوں کے حقوق کا چارٹر قرار دیا اور کہا کہ اب بھارت میں اقلیتوں کی پوزیشن کسی دوسرے سے کمتر نہیں۔ نہرو لیاقت پیکٹ کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے کہا کہ اس سمجھوتے نے نہ صرف اقلیتوں میں اعتماد کی روح پھونک دی ہے بلکہ دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کو یہ سوچنے کا موقعہ دیا ہے کہ نازک ترین معاملات بھی باہمی گفت و شنید سے کس خوش اسلوبی سے طے کئے جاتے ہیں۔ بھارت کی اقلیتوں کو اپنے فرائض کا احساس کراتے ہوئے آپ نے کہا کہ وہ بھارت ہی کو اپنا ملک سمجھیں اور باہر کے ملکوں پر آس لگانے کے فرسودہ خیال کو ترک کر دیں۔ اسی میں ان کی بہتری اور آئندہ ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔

کشمیر اور مسلمان

مدراس کے مشہور مسلمان لیڈر سر محمد عثمان نے کشمیر کے مسئلے پر ایک بیان دیتے ہوئے

کہا کہ بھارت سرکار کی کشمیر کے متعلق پالیسی سے ہندوستان کا ایک ایک مسلمان پوری طرح متفق ہے اور اس کی یہ خواہش ہے کہ کشمیر بھارت کا ہی ایک جزو بنا رہے۔ آپ نے مزید اعلان کیا کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو پورے شہری حقوق حاصل ہیں اور انہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔

افغانستان اور پاکستان

بھارت میں افغانستان کے سفیر سردار نجیب اللہ خاں نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران میں کراچی کی اس اطلاع کو بے بنیاد قرار دیا کہ افغان لشکر نے پاکستانی سرحد پر حملہ کیا ہے۔ آپ نے کہا کہ دراصل جھگڑا پختونستان اور پاکستان کا ہے۔ قبائلی علاقے کے لوگ پاکستان کے ماتحت رہنا گوارا نہیں کرتے۔ اس لئے آئے دن پاکستان اور آزاد پٹھانستان کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ حکومت افغانستان کی خواہش ہے کہ اس جھگڑے کا فیصلہ پُرامن طریقے سے ہو جائے لیکن وہ بالواسطہ طور پر اس جھگڑے میں دخل دینا پسند نہیں کر سکتی۔

حفاظتی کونسل اور کشمیر

ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ عوام کے دلوں میں سیکیورٹی کونسل کی قدر اسی صورت میں بڑھ سکتی ہے جب کہ وہ کوریا کی طرح کشمیر کے مسئلے کو بھی حل کرنے کے لئے تیزی سے قدم اٹھائے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ سیکیورٹی کونسل اس امر کا واضح اعلان کرے کہ کشمیر میں حملہ آور کون ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ جب سر اوین ڈکسن نے صاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستانی افواج نے کشمیر میں داخل ہو کر بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی ہے اور وہ حملہ آور ہے تو مجلس تحفظ کے لئے پاکستان کو حملہ آور قرار دینے میں کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہئے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ اگر کشمیر کے معاملے کا جلد فیصلہ نہ کیا گیا تو حفاظتی کونسل پر عوام کا اعتماد کم ہو جائے گا۔

کوریا

چین کی کمیونسٹ حکومت نے یہ اعلان کیا ہے کہ امریکہ کے کوریا پر حملے کے بعد ایک ایسی تشویشناک صورت حالات پیدا ہو گئی ہے جس کے متعلق چین کی حکومت چپ نہیں رہ سکتی چین کے عوام فطرتاً امن پسند ہیں لیکن امن کی حفاظت کے لئے حملہ آور دشمن کا مقابلہ کرنے سے نہ وہ کبھی پہلے ڈرے ہیں اور نہ اب ڈریں گے۔

متحدہ اقوام کی اسمبلی میں بین الاقوامی قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے بھارت کے نمائندے مسٹر بی۔ این راؤ نے ان وجوہ پر روشنی ڈالی جن کی وجہ سے بھارت غیر جانبداری کی پالیسی پر قائم رہنا چاہتا ہے۔ آپ نے کہا کہ سیکیورٹی کونسل میں جو بھی ریزولیوشن اب تک پاس ہوئے ہیں ان کا ماحصل یہ تھا کہ کوریا میں آزاد و غیر جانبدارانہ انتخابات کرا کر متحدہ کوریا کا قیام عمل میں لایا جائے اور اس کی اقتصادی ترقی کے لئے کوشش کی جائے۔ اگر اس اصول کو سامنے رکھ کر سب کمیٹی قائم کی جاتی تو قیام امن کے لئے مفید ہو سکتی تھی۔ مسٹر راؤ نے مزید کہا کہ بھارت مشرق بعید میں اپنی امن کی پالیسی پر کاربند رہنا چاہتا ہے۔ آپ نے کہا کہ متحدہ اقوام کی اسمبلی کو ایسے ذرائع عمل میں لانے چاہئیں جس سے جنگ کی میعاد لمبی اور اس کا حلقہ وسیع نہ ہو۔ بھارت قرارداد کی دیگر باتوں سے متفق الرائے ہے لیکن قرارداد کی چوتھی دفعہ ایسی ہے جس نے متحدہ اقوام کی افواج کو شمالی کوریا میں دخل دینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ ہمارا اس دفعہ پر اختلاف رائے ہے۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ کوریا کے متعلق بھارت کی کوئی فیصلہ کن پالیسی نہیں مسٹر راؤ نے کہا کہ ہم نے اپنی پالیسی بالکل صاف کر دی ہے اور میں اسے پھر دوہراتا ہوں کہ (۱) آزادانہ انتخابات کے ذریعے ایک آزاد اور متحدہ کوریا کا قیام اور (۲) ملک کی بربادی کو دور کرنا اور بے گھروں کی آبادکاری۔ ایسا اعلان کرنے کے بعد متحدہ اقوام کی افواج کے آگے بڑھنے سے پہلے ہم شمالی کوریا کی فوجوں کو ایک مقررہ تاریخ تک جنگ بند کرنے کے لئے کہہ سکتے ہیں۔ شمالی کوریا کی افواج ہماری بات نہ مانیں تو اس کے بعد ہی ہمیں اپنے طرز عمل کا فیصلہ کرنا چاہئے۔

تپ دق کا انسداد

بھارت میں تپ دق جیسے نامراد مرض کی روک تھام کے لئے حکومت نے ۲ اکتوبر سے ایک نئی مہم شروع کی ہے جس کا ایک خاص مقصد یہ ہے

کہ جنتا کو اس مرض کو دور کرنے کے طریقوں سے روشناس کرایا جائے۔ اس مہم کو ۲ اکتوبر سے کیوں شروع کیا جا رہا ہے اس کے متعلق ایک ریڈیو براڈکاسٹ میں بھارت کی وزیرِ صحت راج کماری امرت کور نے کہا کہ ۲ اکتوبر راشٹرپتا گاندھی جی کا جنم دن ہے اور باپو کی یہ دلی خواہش تھی کہ دیش سے بیماری اور وباؤں کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ اس لئے ان کی پوتر یاد منانے کا اس سے بہتر طریقہ دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا کہ آج کے دن ہر ہندوستانی نسل انسانی کے اس خوفناک دشمن کے خلاف اعلانِ جنگ کا حلف اُٹھائے۔

دس ہزار من چاول کی پیشکش

بھارت اور پاکستان کے مابین اقلیتوں کے تحفظ کے پیکٹ کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ دونوں دلیشوں کے باہمی تعلقات آہستہ آہستہ خوشگوار ہوتے جا رہے ہیں اور اُنہوں نے ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں شریک ہونا بھی شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ آسام میں جو بھیانک بھونچال آیا اس پر وزیرِ اعظم پاکستان نے ایک تار کے ذریعے نہ صرف آسام کے لوگوں کے ساتھ زبانی ہمدردی کا اظہار کیا بلکہ تکلیف زدہ علاقوں کے لئے دس ہزار من چاول کی پیشکش بھی کی۔ بھارت کے پردھان منتری نے اس تار کے جواب میں وزیرِ اعظم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُن کی پیشکش کو قبول کر لیا ہے۔

نئی سیمنٹ فیکٹری

صوبہ اڑیسہ کے ایک شہر راج گنگپور میں بھارت سرکار کے وزیرِ صنعت شری ہرکرشن مہتاب نے اڑھائی کروڑ روپے کے سرمایے سے قائم شدہ ایک سیمنٹ فیکٹری کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ سرکار کسی بھی شخص یا جماعت سے جو ملک میں صنعتی پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کرے پورا تعاون کرنے کے لئے طیار رہے ہے۔ یہ سیمنٹ فیکٹری ڈیڑھ لاکھ ٹن سیمنٹ ہر سال طیار کرے گی۔

چوربازاری

بھارت سرکار نے ناجائز منافع خوری اور بلیک مارکیٹ کے انسداد کے لئے جو آرڈیننس جاری کیا تھا صوبائی حکومتوں نے اس پر پوری طرح عمل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے چنانچہ مدراس اور بہار کے وزرائے اعظم نے بیوپاریوں کو سخت الفاظ میں تنبیہ کی ہے کہ وہ بلیک مارکیٹ سے باز آجائیں ورنہ اُن کے ساتھ سخت سلوک کیا جائے گا۔ بہار سرکار نے تو اس امر کے احکام بھی جاری کر دئے ہیں کہ جو بیوپاری ناجائز منافع کمانے کا جتن کرے اسے فوراً نظربند کر دیا جائے۔

شرنارتھیوں کی آبادکاری

پچھلے دنوں بھارت سرکار کے ایک پریس نوٹ میں دیہاتی شرنارتھیوں کی آبادکاری کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ ۳۰ لاکھ دیہاتی شرنارتھیوں میں سے ۹۷ فیصدی کو زمینیں الاٹ کی جا چکی ہیں اور مکانات یا تو الاٹ کر دئے گئے ہیں یا اُن کی تعمیر کے لئے قرضہ دیا گیا ہے۔

اب ایک نئے پریس نوٹ میں شہری شرنارتھیوں کی آبادی کا مسئلہ زیرِ بحث لاکر بتایا گیا ہے کہ اس باب میں حکومت کیا کیا کر رہی ہے۔ شہری شرنارتھیوں کی آبادی ۲۵ لاکھ تسلیم کی گئی ہے اس تعداد میں سے ۲۱ لاکھ ۶۵ ہزار اشخاص کو اس وقت یا تو مکان مہیا کئے جا چکے ہیں یا ان کے لئے مکان زیرِ تعمیر ہیں۔

باقی جن لوگوں کے لئے مکان مہیا کئے جانے ہیں۔ ان کی تعداد تین لاکھ ۳۵ ہزار رہ جاتی ہے۔ یقین کیا جاتا ہے۔ کہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے نئے مکان خود بنا کر یا موجودہ مکانوں میں اپنا انتظام خود کر لیا ہے۔ ایسے لوگوں کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم نہیں ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ ان میں سے بہت بڑی تعداد کو جن کے پاس اس وقت کوئی مکان نہیں ہے۔ ۱۹۵۱-۵۲ء کے آخر تک مکان مہیا کر دئے جائیں گے۔

دکانوں کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے۔ کہ بیوپاریوں اور تاجروں کو اٹھائیس ہزار نکاسی اور کاروباری احاطے الاٹ کر کے مدد دی گئی۔ اس کے علاوہ پچیس ہزار نئی دوکانیں تعمیر کی گئی ہیں۔ دہلی میں نکاسی جائدادوں کے کسٹوڈین کے سامنے چالیس ہزار مقدمات پیش ہوئے۔ ان میں سے اس وقت صرف تین ہزار زیرِ غور پڑے ہیں۔ اور ان کا جلد از جلد فیصلہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

بیواؤں، بوڑھوں اور محتاجوں کی امداد کا جو طریقہ ہماری سرکار نے اختیار کیا ہے اُس کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ شہری غیر منقولہ نکاسی جائدادوں کا جو کرایہ

وصول ہوا ہے۔ اس سے حکومت نے بیواؤں، بوڑھوں اور محتاجوں کو گزارہ الاؤنس دینا منظور کیا ہے۔ پہلے پہل اس گزارہ الاؤنس کی زیادہ سے زیادہ شرح ۲۵۰ روپے ماہوار مقرر کی گئی تھی۔ لیکن کرایہ کے طور پر جو رقم وصول ہوتی وہ چونکہ بہت کم رہی اس لئے گزارہ الاؤنس کے لئے دی جانے والی رقم ناکافی ثابت ہوئی۔ اور حکومت کو مجبوراً زیادہ سے زیادہ الاؤنس کی شرح کم کر کے پچاس روپے ماہوار کرنی پڑی۔ امید کی جاتی ہے۔ کہ شرنارتھی اور ان کی سبھا سوسائٹیاں کرایہ وصول کرنے کے کام میں حکومت کی مدد کریں گے۔ اس وقت تک ۶۲۳۴۳ بے گھر اشخاص کو اس سکیم کے ماتحت کل ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ ماہوار گزارہ الاؤنس تقسیم کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۴۵۴۱ بوڑھے، اور محتاج اشخاص اور لاوارث عورتوں اور بچوں کے ۳۸ آشرموں میں رہائش، خوراک، تعلیم اور تربیت مفت دی جاتی ہے۔

چونکہ ابھی تک عام شرنارتھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہوئے اس لئے ان کو حکومت کی طرف سے جو قرضہ جات دئے گئے تھے اُن کی شرائط کو بھی نرم کر دیا گیا ہے چنانچہ شہری قرضوں کی سکیم کے ماتحت جس پر ریاستی حکومتوں کے زیر انتظام عمل کیا جا رہا ہے۔ کل سات کروڑ اسی لاکھ روپے کی رقم ایک لاکھ بیس ہزار شرنارتھی کنبوں کو قرضہ کے طور پر تقسیم کی گئی ہے۔ ان قرضوں سے سات لاکھ بیس ہزار بے گھر لوگوں کو از سر نو آباد ہونے میں مدد ملی ہے۔ اس سکیم کے ماتحت زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار روپیہ قرضہ دیا جا سکتا ہے بہت سے درخواست کنندوں کو پانچ پانچ ہزار روپیہ قرضہ ملا ہے۔ قرضہ دینے سے قبل ہر ایک کنبہ کی اور امیدوار جو پیشہ یا کاروبار اختیار کرنا چاہتا ہے اس کی ضروریات پر غور کیا جاتا ہے۔

پچھلے دنوں شرنارتھیوں اور ریاستی حکومتوں کی درخواست پر ان قرضوں کی واپسی کی شرائط نرم کر دی گئی ہیں۔ دراصل شرط یہ تھی کہ قرضہ کے ایک سال بعد شرنارتھیوں کو قرضہ واپس ادا کرنا ہوگا بعد میں واپسی ادائیگی کی میعاد دو برس کر دی گئی۔ پچھلے دنوں یہ ہدایات جاری کی گئی ہیں۔ کہ قرضوں کی واپسی ادائیگی اجرا کی تاریخ سے تین برس کے بعد شروع ہوگی۔

اب باقی رہ جاتا ہے نوجوان شرنارتھیوں کو با روزگار بنانے کا سوال اس ضمن میں بھی حکومت اپنے فرض سے غافل نہیں چنانچہ نوجوان شرنارتھیوں کو روزگار حاصل کرنے کے قابل بنانے کے لئے ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تربیت دی جا رہی ہے۔ اس وقت تک ۲۵ ہزار سے زائد اشخاص تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ اور یقین کیا جاتا ہے کہ ان میں سے اکثر کو روزگار مل چکا ہے۔ اکثر ریاستوں میں اس وقت بہت سے تربیتی مرکز جاری ہیں۔ اور قریباً پندرہ ہزار اشخاص ان میں تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ پرائمری درجہ تک تعلیم کا تمام خرچ حکومت برداشت کرتی ہے سیکنڈری اور ہائی کلاسوں میں بھی قبل ازیں طلبا کو فیسیں ادا کرنے اور کتابیں خریدنے کے لئے قرضے دئے جا رہے تھے۔ یہ محسوس کیا گیا۔ کہ طلبا کو فیس کی معافی دی جائے۔ کیونکہ طلبا کے لئے قرضے واپس ادا کرنا مشکل ہوگا۔ اب ایک نئی سکیم کا اعلان کیا گیا ہے جس کی رو سے طلبا کو سیکنڈری اور ہائی سکولوں اور کالجوں میں فیسوں کی معافی دی جائے گی۔

سال ۱۹۴۹-۵۰ء کے خاتمہ تک طلبا کو ۴۷ لاکھ روپیہ کی رقم قرضوں کے طور پر تقسیم کی گئی تھی۔ سال رواں میں "بے گھر لوگوں کی تعلیم" کی مد میں ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی گئی ہے۔

شہری شرنارتھیوں کی آبادکاری کے متعلق بھارت سرکار کی ان تمام اسکیموں کو دیکھنے کے بعد یہ صاف طور پر عیاں ہو جاتا ہے کہ سرکار نے اس مسئلے پر بہت حد تک قابو پا لیا ہے اور جو تھوڑا بہت کام باقی رہ بھی گیا ہے اسے بہت جلد پورا کر لیا جائے گا۔

حال کے سیلاب اور ملکی پیداوار

پچھلے دنوں بھارت کے طول و عرض میں جو سیلاب آئے اور ان سیلابوں سے فصلوں کو جو نقصان پہنچا۔ اُن کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کے دل میں اس امر کے شکوک پیدا ہو گئے تھے کہ کہیں ۱۹۵۲ء تک خوراک کے سلسلے میں خود کفیل بننے کی اسکیم کو ضعف نہ پہنچ جائے لیکن وزارت خوراک کے ایک ترجمان نے ایک سوال کے جواب میں ان تمام شکوک کو رفع کر دیا اور ایک بار پھر بھارت سرکار کے اس عزم مصمم کو دہرایا کہ دیش کو ہر حالت میں ۱۹۵۲ء تک خوراک کے متعلق خود مکتفی بنا دیا جائے گا۔



زکام کو روکئے
اِس سے آگے خطرہ ہے!

● بار بار زکام کا لگنا چھینکیں آنا یوں ہی تکلیف دہ ہے لیکن زکام کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دینا بے حد خطرناک نتائج پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔ اس لئے زکام کا خطرہ محسوس ہوتے ہی اسے روکئے۔

سعالین

کی ایک ٹکیہ منہ میں رکھ کر آہستہ آہستہ چوسئے یہ نہ صرف زکام کو تسکین دے گی حلق کی خرابیوں کو دور کرے گی طبیعت کو سکون بخشے گی بلکہ سانس کی نالیوں کو صاف کر کے نظام میں توازن پیدا کرے گی اور سانس کو خوشگوار بنائے گی

قیمت فی شیشی صرف بارہ آنے



ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

Hamdard



پھول جیسے بچوں
کی پرورش نونہال پر ہونی چاہیئے

قیمت فی شیشی
بارہ آنے

نونہال

ننھے بچوں کو مضبوط بنانیوالا
اُن کا دل پسند ٹانک



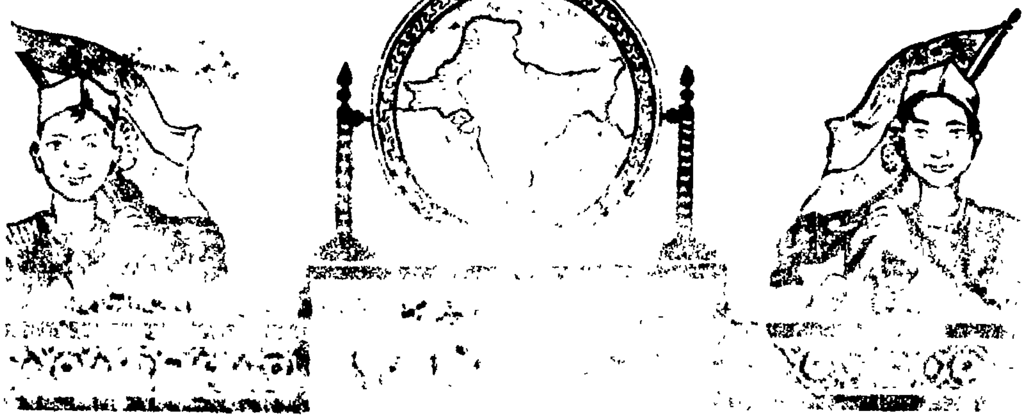
ہمدرد دواخانہ (وقف)
دہلی

Hamdard

چندو کی دلیری



دی ٹاٹا آئل ملز کمپنی لمیٹڈ



محمد شفیع الدین نیّر

اک بار موسم سردی کا آیا
سردی کی شدت ساتھ اپنے لایا

ایک ایک کپڑا بھاری جو پہنا
موہن یہ اپنی اماں سے بولا

اماں جو رہتا گرمی کا موسم
دن رات رہتے ہلکے سدا ہم

کپڑے نہ ہوتے اُونی ہمارے
بکسوں میں رہتے یہ بند سارے

بنیان اُونی، اُونی لبادہ
فرغل نہ بھاتا ہم کو زیادہ

سر پر نہ ہوتا رُومال اُونی
اوڑھے نہ رہتے ہم شال اُونی

ہر دم گلے میں رہتا نہ مفلر
لادے نہ پھرتے ہر وقت چسٹر

ہلکی سی ہوتی پوشاک ساری
ہوتے بدن پر کپڑے نہ بھاری

سردی نہ لگتی سی سی نہ کرتے
ٹھنڈی ہوا کے دُکھ سے نہ ڈرتے

کانپا نہ کرتے تھر تھر تھرا تھر
سردی سے ہوتی حالت نہ ابتر

سردی کا موسم جلدی یہ جائے
پھر گرم موسم دل کو بھائے



وی رام چندرا ریڈی

دادا بھائی نوروجی

ہندوستان میں ایسے بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اپنی قابلیت نیک نامی اور دیس سیوا سے کافی نام حاصل کیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہی کی وجہ سے آج ہمیں سوراج نصیب ہوا ہے۔

انہی میں سے دادا بھائی نوروجی ہیں جنہوں نے اپنے دیس کا درجہ دنیا کی نظروں میں اونچا کرنے کے لئے مشکل سے مشکل کام کیا اور بھارت کی آزادی کے لئے ہر تکلیف سہی۔ وہ ہندوستان پر ہندوستانیوں ہی کی حکومت چاہتے تھے اور اس کے لئے ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کے رہنے والوں میں ایکا اور اتفاق ہو اور وہ سچے دل سے مل کر آزادی کی لڑائی لڑیں۔

دادا بھائی نوروجی نے ۴ ستمبر ۱۸۲۵ء کو بمبئی کے ایک پارسی گھرانے میں جنم لیا۔ ابھی چار سال کے نہیں ہوئے تھے کہ ان کے پتا چل بسے اور ان کو پالنے کی پوری ذمہ داری ان کی ماں پر آن پڑی۔ ان کی ماتا جی بڑی دیالو اور سمجھدار استری تھیں۔ انہوں نے نوروجی کی نگرانی اور تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا بڑا ہو کر اپنے دیس کے لوگوں کی کچھ سیوا کرے۔

بچپن ہی سے نوروجی کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں اپنا سبق بہت جلد یاد کر لیتے تھے۔ حساب میں تو وہ ایسے تیز تھے کہ اکثر سوالات کاغذ پر لکھے بنا ہی زبانی حل کر کے بتا دیتے تھے۔ جب اسکول میں بڑا آدمی آتا تو وہ نوروجی کی لیاقت پر بڑا ہی خوش ہوتا۔ ا استادوں کو مبارکباد دیتا۔

پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ کھیلوں کے بھی بڑے شوقین تھے۔ وہ کئی کھیل بہت اچھی طرح کھیل لیتے تھے۔ کرکٹ ا کا سب سے پسندیدہ کھیل تھا۔ دوپہر کی کڑی دھوپ بھی جبکہ مدرسہ کو آدھ گھنٹے کی چھٹی ہوتی ہے وہ اپنے ساتھ کے ساتھ کرکٹ کھیلتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے تھے۔ ان کا رنگ بالکل انگریزوں کا سا تھا۔ اسکول کے ڈراموں میں جب سپاہی یا راج کمار کا بھیس بدل کر آتے تھے تو بڑے بھلے معلوم ہوتے تھے۔

پڑھائی اور کھیلوں میں اوّل رہنے کی وجہ سے لڑکے ا کو اپنا لیڈر سمجھتے۔

مدرسے میں وہ ہر ایک سے بڑی اچھی طرح پیش آتے تھے۔ ان کی ماتا جی نے انہیں بچپن ہی سے ہر ایک سے نرمی

سے بات کرنے کی عادت ڈالی تھی۔ اگر کبھی کوئی شریر لڑکا انہیں بُرا بھلا کہتا تو وہ جواب میں بالکل خاموش رہتے یا کہتے کہ "بھئی! تمہاری گالیوں سے تو خود تمہارا اپنا مُنہ ہی خراب ہوتا ہے"۔

اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ الفنسٹن کالج بمبئی میں شریک ہوئے۔ یہاں انہیں اپنی قابلیت کی وجہ سے کئی وظیفے اور انعام ملے وہ کالج کے سب سے اچھے ودیارتھی مانے جاتے تھے۔ ۱۸۴۵ء میں انہوں نے بی۔ اے پاس کیا اور کالج میں اوّل رہے۔ اس سے اس زمانے کے بمبئی ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے نوروجی کی ماتا کو کہلا بھیجا کہ اگر نوروجی بیرسٹری کی تعلیم کے لئے انگلستان جانا چاہیں تو وہ اس کے آدھے اخراجات اپنی جیب سے دینے کو تیار ہیں۔ لیکن نوروجی کے خاندان والوں نے یہ سمجھ کر کہ نوروجی انگلستان جاکر عیسائی بن جائیں گے۔ اس کی مخالفت کی اس طرح نوروجی اس سنہری موقعے سے فائدہ نہ اُٹھا سکے۔

کالج سے نکلنے کے بعد وہ اپنے ہی کالج میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

کالج میں لڑکوں کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے جنتا کی بھلائی کے لئے بھی بہت سے کام کئے۔ غریبوں کے لئے مدرسے کھولے۔ لڑکیوں کے لئے ایک مدرسہ بنوایا جو بمبئی میں اپنی قسم کا پہلا مدرسہ تھا۔ ایسے کلب کھولے جہاں مرد اور عورتیں سب مل کر ہندوستان کی بھلائی کے بارے میں سوچتے تھے انہوں نے انگریزی کی اچھی اچھی کتابوں کو ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کرنے کے لئے ایک سوسائٹی بھی قائم کی۔

۱۸۵۱ء میں انہوں نے گجراتی میں ایک اخبار "راست گفتار" جاری کیا جو پڑھے لکھے لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔

تجارت کے سلسلے میں نوروجی ۱۸۵۵ء میں پہلی بار انگلستان گئے۔ اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر انہوں نے انگریزوں کے سامنے ہندوستان کے حالات اور شکایات پیش کئے۔ لندن میں چند سال رہنے کے بعد ان کی دوکان کو بڑا بھاری نقصان ہوا۔ اس لئے ۱۸۶۹ء میں وہ اپنا کاروبار ختم کر کے ہندوستان واپس آ گئے۔

ہندوستانی جانتے تھے کہ نوروجی نے لندن میں ان کے لئے بہت کچھ کیا ہے اس لئے ان کا سواگت کرنے کے لئے ایک بڑا جلسہ کیا جس میں ان کی سیوا میں تحفے کے طور پر بہت سا روپیہ بھی پیش کیا گیا جسے انہوں نے جنتا کے کاموں میں لگا دیا۔

اس کے بعد ہی ۱۸۷۱ء میں ہندوستانیوں کی تکلیفوں کو انگریزی حکومت کے سامنے رکھنے کے لئے پھر انگلستان گئے۔ انہوں نے انگریزوں سے کہا کہ ہندوستانیوں کی حالت بہت گری ہوئی ہے اور وہ اتنے غریب ہیں کہ ان کی آمدنی سالانہ ۲۰ روپے بھی نہیں ہے اس لئے محصول کا بوجھ اُٹھانا بہت مشکل ہے پبلک سے جو روپیہ وصول کیا جاتا ہے وہ سب کا سب دیش سے باہر بھیج دیا جاتا ہے جس سے دیس کی دولت میں کمی ہو رہی ہے یہی نہیں بلکہ انہوں نے ہندوستان کی غریبی سے متعلق ایک کتاب بھی لکھی۔

انگلستان کی واپسی کے بعد وہ بڑودہ کے دیوان بنائے گئے اس وقت بڑودہ کی حالت بہت خراب تھی مگر نوروجی نے اپنی کوشش سے دو سال میں سب ٹھیک کر دیا اور بمبئی واپس آئے ۱۸۸۰ء میں وہ بمبئی کارپوریشن کے صدر بنے۔ اس کے علاوہ قانون بنانے والی سبھا کے بھی ممبر بنے۔

۱۸۸۵ء میں بھارت کو سوراج دلانے کے لئے ہندوستانیوں نے "انڈین نیشنل کانگرس" نام سے ایک سبھا بنائی۔ جواب

میں قائم ہوئی۔ اس سبھا کے قائم کرنے میں دادا بھائی نے بھی بڑا کام کیا۔

ہندوستانیوں کی مصیبتیں ختم کرنے اور انگریزوں کو ہندوستان کے صحیح حالات بتلانے کے لئے نوروجی انگریزوں کی پارلیمنٹ کے ممبر بننا چاہتے تھے۔ اس لئے ۱۸۸۶ء میں پھر انگلستان گئے مگر ناکام آئے۔

۱۸۹۲ء میں وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے اور پارلیمنٹ کے ممبر چنے گئے۔ اس طرح یہ پہلے ہندوستانی تھے جنہیں یہ عزت ملی پھر جب وہ ہندوستان آئے تو جنتا نے کانگرس کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے دی۔ نوروجی سے جنتا کو اتنا پریم تھا کہ وہ اس کے بعد بھی دو بار کانگرس کے صدر چنے گئے۔

صحت کی خرابی کی وجہ سے نوروجی کو ۱۹۰۷ء میں پھر انگلستان جانا پڑا۔ انگلستان جا کر ان کی صحت سدھر گئی۔ اور وہ جلد ہی ہندوستان واپس آ گئے کیونکہ وطن سے دور ان کا دل بے چین رہتا تھا

۱۹۱۷ء میں نوروجی پھر بڑے سخت بیمار پڑے۔ لیکن اس بیماری کی حالت میں بھی وہ لوگوں کو دیس کے متعلق مفید مشورے دیا کرتے تھے۔ آخر کار وہ ۳۰ جون ۱۹۱۷ء کو چل بسے۔

دادا بھائی نوروجی ہندوستان کے ایک بہت بڑے آدمی تھے جنہوں نے اپنے جیون کی آخری گھڑی تک کو دیس کی سیوا میں لگا دیا۔

قہقہے

باپ۔ اپنے استاد کا کہنا مانا کرو۔ وہ بڑے لائق آدمی ہیں۔

بیٹا۔ وہ تو کچھ بھی نہیں جانتے۔

باپ۔ کیا بک رہے ہو۔

بیٹا۔ سچ کہتا ہوں ابا جان۔ ہر بات لڑکوں سے پوچھتے ہیں۔ وہ شہر کہاں ہے۔ اس دریا کا کیا نام ہے، فلاں لفظ کے کیا معنی ہیں۔ انہیں تو کچھ بھی نہیں آتا۔

وکیل۔ دیکھو بھائی تمہارا دعویٰ جھوٹا معلوم ہوتا ہے۔

غریب۔ جناب اگر دعویٰ سچا ہوتا تو آپ کو وکیل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

جج۔ چور سے۔ تمہارا کوئی اور بھی ساتھی تھا یا تم نے اکیلے نقب زنی کی۔

ملزم۔ جی نہیں میں اکیلا ہی تھا ایسے کاموں میں کوئی دیانت دار آدمی نہیں ملتا۔

پہلا آدمی۔ ہسپتال جانے کا سب سے آسان راستہ کون سا ہے؟

دوسرا آدمی۔ سامنے آنے والی گاڑی کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔

محمد عباس ہارون بھوپال

ڈی۔ جے گپت

بھونچال

دھرتی کے ڈھنگ بڑے نرالے ہیں۔ اس کے پل بھر کے کانپنے سے لاکھوں انسان بےگھر ہو جاتے ہیں۔ دریا نہریں راستہ بھول جاتے ہیں۔ ریل کی پٹریاں زمین کے اندر دھنس جاتی ہیں نئے چشمے نمودار ہو جاتے ہیں اور انسان ڈر کر حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگ جاتا ہے۔ اسی طرح کا تباہ کن بھونچال حال ہی میں آسام میں آیا ہے ۱۵ اگست ۱۹۵۰ء سے آج تک سارے صوبے میں خاص طور پر ضلع ڈبرو گڑھ کے آس پاس کے دیہات میں بھونچال کے جھٹکے برابر محسوس ہو رہے ہیں خوش قسمتی سے جانی نقصان کی نسبت مالی نقصان ہی زیادہ ہوا ہے۔

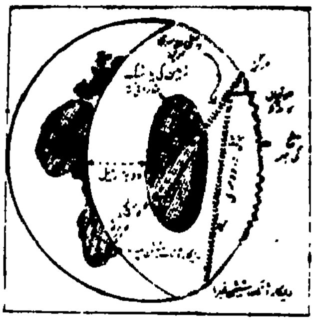
دنیا کے آغاز ہی سے زلزلے آتے رہے ہیں۔ اور نسل انسانی کو کافی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ بھونچال کے آنے کے متعلق ماہرین کی جانچ کے مطابق زمین کی تہ کے نیچے بہت بھاری ٹھوس چٹانیں ہیں۔ اوپر کی تہ پتلی ہے اور اس کے نیچے گرم چٹانیں ہیں لیکن ان گرم چٹانوں کے اوپر کی تہ سبھی جگہ ایک سی مضبوط نہیں ہے بعض جگہ یہ کمزور بھی ہے اور اس میں دراڑیں بھی ہیں۔ جب یہ پتلی تہ کمزور ہو جاتی ہے تو دباؤ کم ہونے پر اندر کے گرم لاوے میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ پگھلے ہوئے لاوے کی ہل چل سے اوپر کی چٹان کانپنے لگتی ہے جس سے روئے زمین پر بھونچال کے جھٹکے محسوس ہوتے ہیں کبھی کبھی یہ پگھلا ہوا لاوا جوالا مکھی کی طرح پھوٹ کر باہر نکل آتا ہے۔

اپنی خاص نوعیت کی وجہ سے بھونچال چار طرح کے مانے گئے ہیں (۱) راک فال۔ (۲) وال کینک۔ (۳) ٹیک ٹانک اور (۴) باطنی بزم

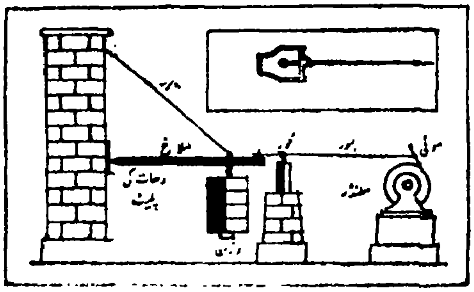
راک فال بھونچال اسے کہتے ہیں جس میں صرف چٹانیں اپنی جگہ کو چھوڑ دیتی ہیں۔ یہ معمولی قسم کا زلزلہ ہے۔ یہ زلزلہ جوالا مکھی کے آس پاس ہی ہوتا ہے۔ زیادہ تر ٹیک ٹانیکل بھونچال ہی آتے ہیں۔ اس کی وجہ زمین کی تہ میں چٹانوں کا ٹوٹنا ہے۔ ایسے زلزلے جوالا مکھی سے دور بھی آتے ہیں۔ باطنی بزم بھونچال زمین کے اندر زیادہ گہرائی میں پیدا شدہ ہل چل سے آتا ہے۔

بھونچال کے شروع میں گھڑگھڑ کی سی آواز آنے لگتی ہے۔ ایک دو منٹوں میں یہ گھڑگھڑاہٹ دور ہٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور پھر بند ہو جاتی ہے۔ ہر ایک گھڑگھڑاہٹ چند سیکنڈ ہی رہتی ہے۔ بھونچال اپنی تیزی کے مطابق پانچ سیکنڈ سے لے کر پانچ منٹ تک کی مختصر سی مدت میں ختم ہو جاتا ہے۔

جب کسی جگہ بھونچال آنے والا ہو تو زمین کی تہ میں اسی طرح کی لہریں پیدا ہوتی ہیں جیسی کہ تالاب میں پتھر پھینکنے سے۔ یہ لہریں تین طرح کی ہوتی ہیں۔ پہلی دو تو زمین کے اندر ہی شروع ہوتی ہیں اور تیسری زمین کی سطح پر اپنا اثر دکھاتی ہے۔



دوسری طرح کی لہر پہلی طرح کی لہر سے ذرا آہستہ چلتی ہے۔ زمین کی تہ سے ان لہروں کی ہل چل جس آلے کے ذریعے معلوم کی جاتی ہے اُسے سسموگراف کہتے ہیں۔ بھونچال کا یہ آلہ کس طرح کام کرتا ہے یہ تصویر نمبر ۲ میں دکھایا گیا ہے۔



جب ایک دیوار بھونچال سے ہلتی ہے تو اُس کی رفتار ایک خاص سوئی کے ذریعے سے آلے میں ظاہر ہوتی ہے۔ آلے کا لیور ایک خاص سوئی کے ذریعے سے بھونچال کی اطلاع دیتا ہے۔ یہ سوئی چکر کاٹتی ہوئی سلنڈر سے لگے ہوئے ایک خاص قسم کے کاغذ سموکڈ پیپر پر ٹیڑھی لکیریں بنانا شروع کرتی ہے۔ بھونچال نہ آنے کی صورت میں لکیریں سیدھی بنتی ہیں۔ اس طرح اس آلے سے بھونچال کی تصویر خود بخود بن جاتی ہے۔

یکم نومبر ۱۷۵۵ء کو لزبن میں زلزلہ آیا تین زبردست جھٹکوں کے بعد لزبن کے نچلے حصے بلکہ سارے گھر مٹی کا ڈھیر بن گئے۔ اس بھونچال کا اثر تمام پرتگال، سپین، جنوبی فرانس اور شمالی امریکہ تک ہزاروں میل تک پڑا جس کا اثر یہ ہوا کہ سمندر اپنی جگہ سے بہت پیچھے ہٹ گیا۔ ملک کے اندرونی حصوں میں دریاؤں تالابوں اور جھیلوں وغیرہ میں بھی عجیب و غریب ہل چل مچی رہی۔ اٹلی، سوئیٹزرلینڈ اور برطانیہ یہاں تک کہ سوئیڈن اور ناروے میں بھی ۱،۵۰۰ میل کے فاصلے پر جھیلوں، تالابوں اور دریاؤں میں تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی۔

ٹھیک ۳۰۵ سال پہلے آسام میں اس طرح کا زلزلہ آیا تھا جس میں ۱۷۵،۰۰۰ مربع میل کے رقبے میں لگ بھگ آدھے یورپ کے برابر حصّے پر اس کا اثر پڑا تھا۔ ۱۶،۰۰۰ مربع میل کے رقبے میں کے دُگنے کے برابر کے ایک ضلع میں جان و مال کا بہت زیادہ نقصان ہوا تھا۔

ذیل کے اعداد و شمار سے ان بھونچالوں سے نقصانات کا اندازہ ہو گا۔ ۱۷۵۵ء میں لزبن کے زلزلے سے پچاس ہزار انسان، ۱۹۲۰ء میں چین میں ایک لاکھ آدمی، ۱۷۰۳ء میں جاپان میں دو لاکھ انسان۔ ۱۷۳۷ء میں بھارت میں تین لاکھ انسان بھونچالوں سے مارے گئے۔ ممکن ہے ان اعداد و شمار میں کچھ مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ۱۹۲۳ء کے زلزلے میں جاپان میں ۹۳۳۳۱ لوگ مرے ۱۰۳۷۳۳ زخمی ہوئے اور ۴۳۴۷۶ انسان گم ہو گئے۔

اس وقت آسام کے جس بھونچال کا ذکر ہو رہا ہے وہ ٹیکٹانیکل زلزلہ ہے۔ آسام کے شمال میں پہاڑوں کی ایک قطار ہے۔ یہ پہاڑ بڑھتے جا رہے ہیں۔ جب یہ پہاڑ بڑھتے ہیں تو آس پاس کی چٹانوں پر بہت دباؤ ڈالتے ہیں۔ آسام میں بار بار بھونچال آنے کی یہی بڑی وجہ ہے۔ اور اس کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس کے جھٹکے مہینوں اور سالوں تک آتے رہتے ہیں۔ ۱۸۹۷ء کے آسام کے بھونچال کے جھٹکے دو سال تک محسوس ہوتے رہے تھے اور ان جھٹکوں کی کل تعداد ۵۶۳۳ تھی۔ آسام میں اس بھونچال کی سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ زمین کے بڑے بڑے حصّے اپنی جگہ سے ہل گئے۔ دریاؤں کے بہاؤ میں رکاوٹ پڑنے سے سیلاب آ گئے اور بھونچال سے زیادہ ان سیلابوں سے جانی نقصان ہوا۔

نفرت پر محبّت کی فتح

اندرکمار

کسی گاؤں میں منگت نامی ایک کسان رہتا تھا۔ وہ بڑا بدمزاج جھگڑالو اور شرارتی تھا۔ دوسروں کی باتوں میں خواہ مخواہ اُلجھنا۔ جھگڑے مول لینا اور بڑے سے بڑے آدمی کی پگڑی اُچھالنا اس کا شیوہ تھا۔ یہاں تک کہ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے اُس کے غصے کا نشانہ بنے بنائے رہتے اور وہ انھیں اکثر گالیاں دیتا رہتا۔ چنانچہ کوئی بچہ اُس کے گھر کے نزدیک نہ پھٹکتا۔ وہ شخص ہر وقت غصّے کی آگ میں جلتا رہتا اور جب کوئی دوسرا نہ ملتا تو کتوں اور بلیوں کو مارنے لگتا۔ جانور بھی اس کی عادات سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے اور اُن کو کتنی ہی بھوک کیوں نہ ستاتی وہ اس کے گھر سے دُور دُور ہی رہتے کہ کہیں ان کی شامت ہی نہ آجائے۔ غرضیکہ ہر وقت بک جھک کرتے رہنا اور ہر روز بلا وجہ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے رہنا اس کا معمول بن گیا تھا اور اسی وجہ سے اس کے ہمسائے اس سے سخت تنگ رہتے۔ کئی دفعہ اُسے سمجھانے بجھانے کی بھی کوشش کی گئی لیکن سب بے سود۔ اُس پر کسی کی نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا۔

اس کے دو ہمسائے سوہن اور موہن اس کی اس قسم کی حرکتوں سے تنگ آگئے۔ ایک دن کی بات ہو تو کوئی برداشت بھی کرلے یہاں تو ہر روز کی مصیبت تھی۔ کوئی وقت خالی نہ جاتا تھا جب کہ منگت کسی قسم کا غل غپاڑہ نہ مچاتا۔ ہمسایوں کی نیند حرام ہو گئی اور ان کا اس شخص کے کرتوتوں سے ناک میں دم آگیا۔

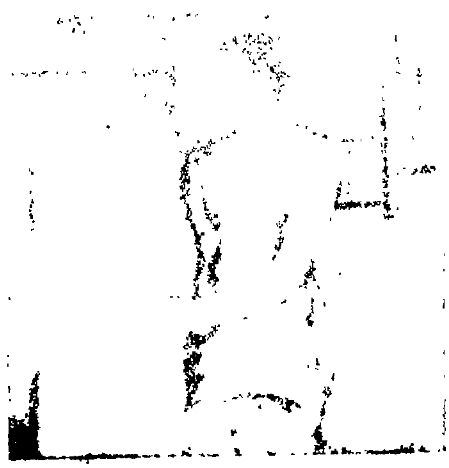
ایک دن سوہن اور موہن دونوں ایک جگہ اکٹھا ہوئے تاکہ منگت کو راہ راست پر لانے کی کوئی تدبیر سوچ سکیں اور کسی طرح ان کو ہر روز کے دردسر سے نجات ملے۔ موہن نے کہا کہ "میرے خیال میں منگت کو اس کی ناجائز حرکتوں کی سخت سزا دینی چاہیئے تاکہ وہ آئندہ کے لئے عبرت حاصل کرے اور



اپنے پڑوسیوں کے آرام میں مخل نہ ہو۔" سوہن نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس شخص کو پریم اور محبت سے قابو میں لایا جائے۔ اس لئے کہ جو کام نرمی سے نکل سکتا ہے وہ طاقت سے نہیں نکلتا۔ موہن کو سوہن کی یہ بات پسند نہ آئی۔ اس نے جواباً کہا۔ "لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اس لئے خواہ کچھ بھی ہو میں اس شخص کو سیدھا

کر کے چھوڑوں گا۔ چنانچہ ایک دن وہ سرِبازار منگت سے اُلجھ پڑا اور اسے خوب جلی کٹی سنائیں۔ ساتھ ہی اسے تھپڑ اور گھونسے بھی رسید کئے لیکن منگت پر اس سزا کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس کے چڑچڑے پن میں مزید اضافہ ہو گیا۔ موہن کا یہ وار خالی گیا تو وہ پھر سوہن کے پاس گیا۔ اور اعتراف کیا۔ کہ اس سے یہ شخص سیدھا نہیں ہو سکتا اس لئے اب سوہن اپنا طریقہ آزمائے۔

انہی دنوں منگت کو ایک خطرناک بیماری نے آگھیرا۔ اس نے ہر چند علاج کیا لیکن اس کی بیماری کی شدت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا۔ گھر والے بھی اس سے تنگ

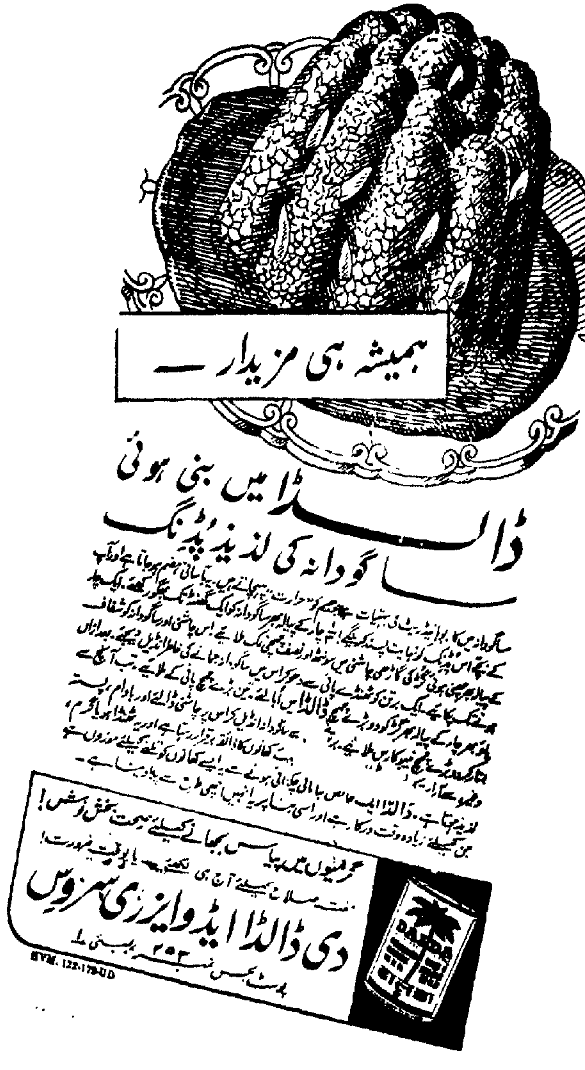


آگئے اور اس کی تیمارداری کرنا تو درکنار وہ اس کے نزدیک تک نہ پھٹکتے۔ اس موقع پر سوہن اس کی خدمت کے لئے آگے بڑھا اور اپنے تمام کاموں کو چھوڑ کر اس نے رات دن منگت کی سیوا کی۔ وہ آٹھوں پہر اس کے پاس بیٹھا رہتا اور اسے ہر طرح کی تشفی دیتا۔ سوہن کی اِس شب و روز کی محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ منگت کو آہستہ آہستہ افاقہ ہونے لگا۔ اور کچھ دنوں بعد وہ بستر



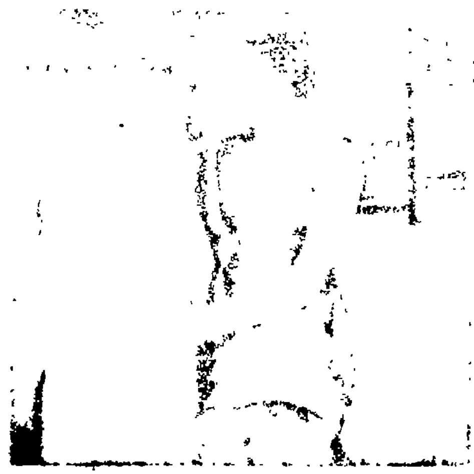
سے اُٹھ بیٹھا۔

لیکن بیماری سے افاقہ ہونے کے بعد منگت کی طبیعت ایک انقلاب آگیا۔ اس نے گالیاں دینا اور ہر روز کی بک بک قطعی بند کر دی اور ایک دن سوہن کے گھر جا کر کہا کہ آپ بےلوث سیوا نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ مجھے سخت دکھ ہے کہ اتنی مدت تک میں آپ اور دوسرے پڑوسیوں کے لئے مصیبت کا باعث بنا رہا۔ مجھے پچھلی غلطیوں کے معاف کیا جائے۔ میں آئندہ کے لئے اس طرح کا کوئی کام نہ کروں گا۔ سوہن نے اس پر منگت کو گلے سے لگا لیا اور اسے کہا کہ جہاں تک ہو سکے دوسروں سے نیکی کرنی چاہئے۔


ہمیشہ ہی مزیدار —
ڈالڈا میں بنی ہوئی
ساگو دانہ کی لذیذ پڈنگ
دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۲۵۳ بمبئی ۱
HVM. 122-179-UD

کرکے چھوڑوں گا۔ چنانچہ ایک دن وہ سرِبازار منگت سے اُلجھ
پڑا اور اسے خوب جلی کٹی سنائیں۔ ساتھ ہی اسے تھپڑ اور گھونسے
بھی رسید کئے لیکن منگت پر اس سزا کا کوئی اثر نہ ہوا اور
اس کے چڑچڑے پن میں مزید اضافہ ہوگیا۔ موہن کا یہ وار
خالی گیا تو وہ پھر سوہن کے پاس گیا۔ اور اعتراف کیا۔ کہ
اس سے یہ شخص سیدھا نہیں ہوسکتا اس لئے اب سوہن
اپنا طریقہ آزمائے۔

انہی دنوں منگت کو ایک خطرناک بیماری نے آگھیرا۔ اس
نے ہرچند علاج کیا لیکن اس کی بیماری کی شدت میں
روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا۔ گھر والے بھی اس سے تنگ

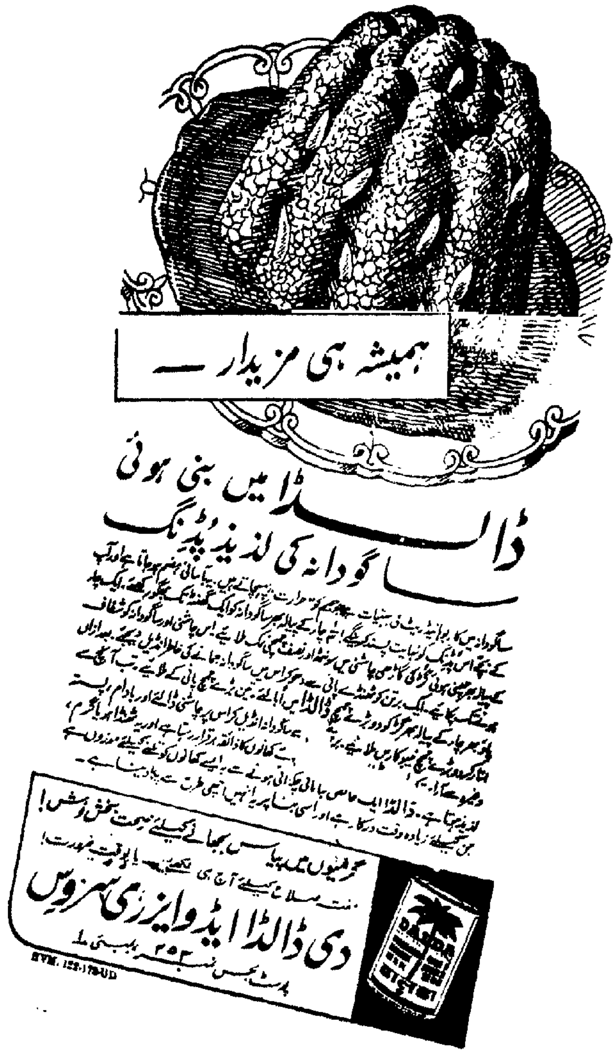


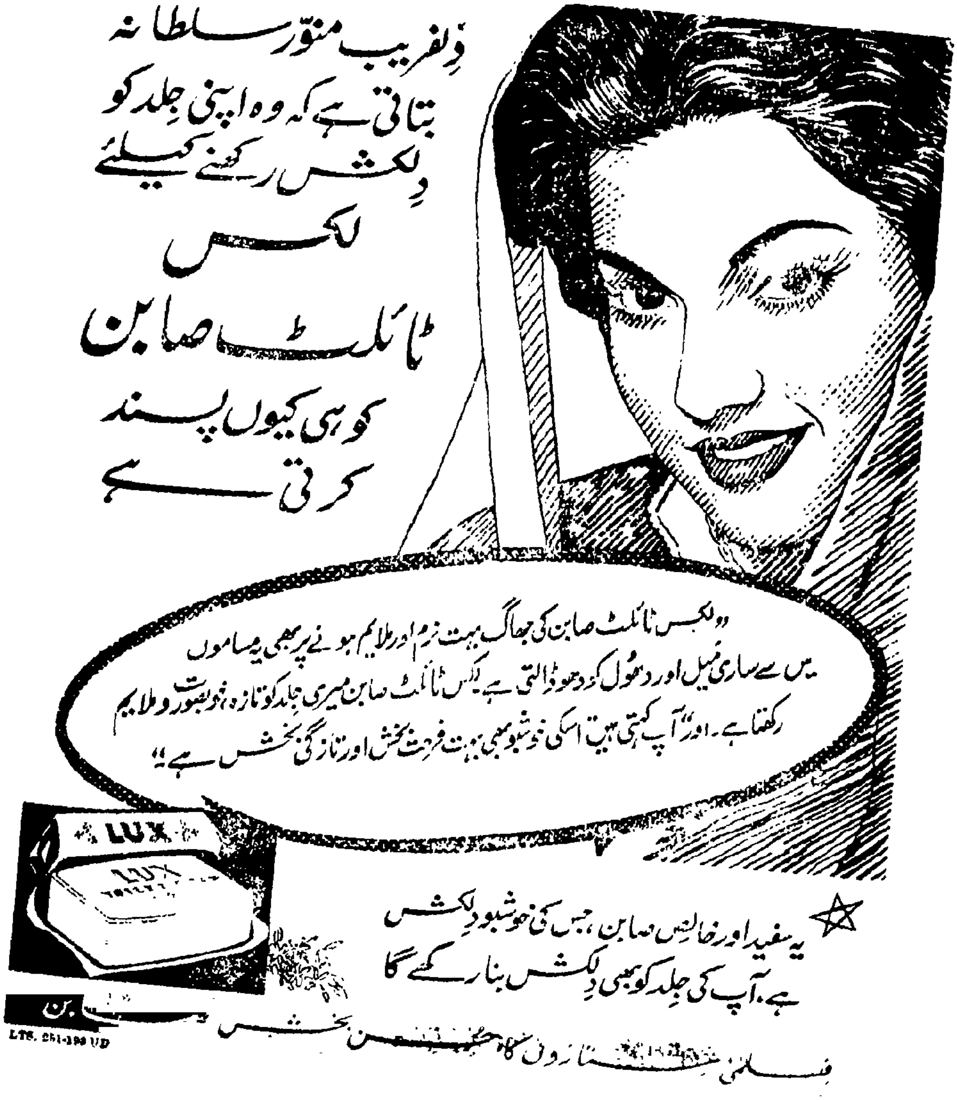
آگئے اور اس کی تیمارداری کرنا تو درکنار وہ اس کے نزدیک
تک نہ پھٹکتے۔ اس موقع پر سوہن اس کی خدمت کے لئے آگے
بڑھا اور اپنے تمام کاموں کو چھوڑ کر اس نے رات دن منگت کی
سیوا کی۔ وہ آٹھوں پہر اس کے پاس بیٹھا رہتا اور اسے ہر طرح کی تشفی
دیتا۔ سوہن کی اس شب و روز کی محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ منگت
کو آہستہ آہستہ افاقہ ہونے لگا۔ اور کچھ دنوں بعد وہ بستر



سے اُٹھ بیٹھا۔

لیکن بیماری سے افاقہ ہونے کے بعد منگت کی طبیعت میں
ایک انقلاب آگیا۔ اس نے گالیاں دینا اور ہر روز کی بک جھک
قطعی بند کردی اور ایک دن سوہن کے گھر جاکر کہا کہ آپ کی
بے لوث سیوا نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ مجھے سخت
دکھ ہے کہ اتنی مدت تک میں آپ اور دوسرے پڑوسیوں کے
لئے مصیبت کا باعث بنا رہا۔ مجھے پچھلی غلطیوں کے لئے
معاف کیا جائے۔ میں آئندہ کے لئے اس طرح کا کوئی کام نہیں
کروں گا۔ سوہن نے اس پر منگت کو گلے سے لگالیا اور اسے سمجھایا
کہ جہاں تک ہوسکے دوسروں سے نیکی کرنی چاہئے۔


ہمیشہ ہی مزیدار —
ڈالڈا میں بنی ہوئی
ساگودانہ کی لذیذ پڈنگ
دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۲۵۳ بمبئی ۱



Regd No D--21

Printed and published by the Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting Govt of India, Old Secretariat, Delhi

آج کل

9(6)



جنوری
۱۹۵۱ء

آٹھ آنے

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر: —— جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: —— عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۹ —— نمبر ۶
سالانہ چندہ —— چھ روپے
فی پرچہ —— آٹھ آنے

جنوری ۱۹۵۱ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

شاد عارفی

عورت

خندۂ قلقل - صدا کوئل کی - غنچوں کی چٹک ۔۔۔ تابشِ خورشید - نورِ ماہ - پانی کی جھلک
لرزشِ سیماب - بجلی کی تڑپ - شاخوں کا لوچ ۔۔۔ عقل کی تیزی - طبیعت کی اپج - شاعر کا سوچ
اضطرابِ موج - کانٹوں کی خلش - ناگن کے بَل ۔۔۔ تیر کی سُرعت - کماں کا عجز - شمشیروں کے پھل
آب موتی کی - چمک کُندن کی، ہیرے کی دمک ۔۔۔ اشرفی کا رُوپ - ٹکسالی محاصل کی کھنک
دامنِ کہسار کے منظر - نوائے آبشار ۔۔۔ شورِ دریا - کروٹیں موجوں کی - ساحل کا قرار
زمزمے کا عطر - کیفِ نغمہ - لَے کی پختگی ۔۔۔ شورشِ مَے - لغزشِ مَے نوش - جوشِ بیخودی
"آہوئے رم خوردہ" کی وحشت - طرارے - تیزیاں ۔۔۔ گائے کی سنجیدگی - جگنو کی آتش ریزیاں
وادیٔ کشمیر کی نزہت - گلوں کا رنگ و بُو ۔۔۔ سرو کا قد - کبک کی رفتار - قمری کا گلُو
ظلمتِ شامِ اودھ - صبحِ بنارس کا نکھار ۔۔۔ آگرے کے تاج کی عظمت - ہمالہ کا وقار
سومناتی رفعتیں - بھارت کی تہذیبِ قدیم ۔۔۔ پاٹلی پترا کی شہرت - مگدھ کی شانِ عظیم
دلپذیریٔ اذاں - دلداریٔ ناقوسِ دَیر ۔۔۔ صحنِ مسجد کا تقدّس - پرتوِ فانوسِ دَیر
ہر بھجن کا فیض حسنِ اعتقادِ برہمن ۔۔۔ کمبھ کے میلے کی زینت - وقعتِ گنگ و جمن
بربط و چنگ و سرود و ارغنوں کے زیر و بم ۔۔۔ دلکشی پردوں کی - آوازوں کے جادو - تال سَم
"تلخیٔ انجام" جب سب کوششیں ناکام ہوں ۔۔۔ "خوشنما سیبوں کی ہلکی ترشیاں" - جب خام ہوں

دیکھ کر یہ "اقتباس" کارگاہِ انس و جاں" ۔۔۔ "کارپردازانِ قدرت" میں ہوئیں سرگوشیاں
ایک بولا - امتزاج ان کا قیامت ساز ہے ۔۔۔ دوسرا کہنے لگا - خاموش! کوئی راز ہے

یہ عناصر۔ ایک مُدّت تک رہے گرمِ عمل — آخرش تحریکِ عصمت سے ہوئے آپس میں حل
صبحِ دم۔ جب گوشہ گوشہ مطلعِ انوار تھا — ذرّہ ذرّہ عالمِ نیرنگ کا سرشار تھا
اُس مُرکّب کو اصولی جنبشیں ہونے لگیں — جنبشیں اپنے مقاصد سے قریں ہونے لگیں
یہ ہیولیٰ۔ ارتقائی منزلیں طے کر گیا — شہپرِ پروازِ عفت سے بلندی پر گیا
"اعتدالِ عنصری" پر پالیا جب اقتدار — عینِ فطرت کے مطابق شکل کر لی اختیار
آئی اعضا میں گدازی اور نرمی جسم میں — آئی رُخساروں پہ سُرخی۔ اور گرمی جسم میں
پائۂ تکمیل کو پہنچا جونہی یہ "شاہکار" — دستِ قدرت نے ٹٹولی نبض اس کی بار بار
بسترِ نکہت پہ یہ پُتلی۔ جو محوِ خواب تھی — مست انگڑائی کے ہاتھوں جاگ اُٹھی شرما گئی

دیکھ کر شاعر نے اُس کو "نکتۂ حکمت" کہا
اور بے سوچے۔ زمانہ نے اُسے "عورت" کہا

ادیب مالیگانوی

جلوۂ نَو

اِک جلوۂ نَو سے ظلمت کے آثار بدلتے جائینگے — ویرانوں کی قسمت پلٹے گی گلزار بدلتے جائینگے
تو اپنے سفینے کو یونہی طوفانِ بلا میں کھیتا چل — موجوں کی روانی بدلے گی، منجدھار بدلتے جائینگے
تغیّر پسند انساں ہی نہیں، فطرت کا یہی دستور بھی ہے — حالات بہر صورت اپنی رفتار بدلتے جائینگے
بیتاب ہے سازِ شام و سحر لے دوست نئے نغموں کے لئے — جو تار پرانے ہو ہی چکے۔ وہ تار بدلتے جائینگے

ترمیم کا فن آجائیگا آئینِ وفا میں ہم کو بھی
اندازِ جفا کو یونہی اگر سرکار بدلتے جائینگے

برجموہن دتاتریہ کیفی

نئی اُردو نثر کے ابتدائی نمونے

اگرچہ ہماری تحقیق اور تلاش نئی اردو نثر تک محدود ہے لیکن سارے معاملے کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ اگر اردو نثر کا ایک مختصر تذکرہ قدیم زمانے سے متعلق پہلے کر دیا جائے تاکہ پتا چلے نئی نثر کس ماحول اور کن روایات کے زیر اثر ظہور پذیر ہوئی۔

اُردو بن تو گئی تھی مگر ابھی تک تنظیم و تدوین کے عمل سے محروم تھی کہ بعض لوگوں کو وہ بات سوجھی جو آج ہر ترقی پسند نوجوان کا وظیفہ ہے۔ یعنی ادب برائے زندگی۔ سوچا گیا کہ کیوں نہ اس لوک بھاشا سے کام لیا جائے۔ چنانچہ اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب کا موضوع اسی قسم کا ہے۔ یعنی اس کے مندرجات کا تعلق قصہ کہانی نہیں بلکہ مذہبی عقیدے کی اصلاح اور تلقین دینی ہے۔ میرا مطلب "معراج العاشقین" سے ہے جو حضرت گیسو دراز نے ۸۰۳ھ ہجری میں لکھی۔ یہ بزرگ دہلی کے رہنے والے تھے۔ بچپن میں دولت آباد گئے مگر پندرہ برس کی عمر میں واپس آگئے۔ پھر اسی برس کی عمر میں دکن گئے اور وہیں جاں بحق ہوئے۔ دکن کے آخری قیام میں معراج العاشقین لکھی گئی۔ جو اب چھپ گئی ہے۔ ذیل کے اقتباس سے اس کی زبان پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

"غفلت کے کان سوں پیر نہ سننا سو۔ وسواس کے نک سوں بدبوئی نہ لینا سو۔ بچلی کی زبان سوں غیر نہ بولنا سو۔ مغروری کی شہوت کوں غیر جاگہ نہ دوڑانا سو۔ غفلت ہور غلبۂ اہا پانچ خواہش کا مراقبہ کرنا۔ پیر کے مکن کا مشاہدہ قلم کرنا۔۔۔"

"سو" جو کئی جگہ جملوں کے آخر میں آیا ہے "ہے" کے معنی رکھتا ہے۔ "ہور" (اور) "نک" (ناک) پنجاب میں اب بھی بولے جاتے ہیں۔ "معراج العاشقین" کے بعد ممکن ہے اور نثر کی کتابیں لکھی گئی ہوں لیکن ہماری تلاش دو صدیوں کی ادبی تاریخ پر نظر ڈالنے کا موقع نہیں دیتی۔ اور ہم ایک دم سے گیارھویں صدی ہجری میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس کی مجمل کیفیت یہ ہے۔ عبداللہ قطب شاہ گولکنڈے کے بادشاہ نے ۱۰۳۵ ہجری سے ۱۰۸۳ھ تک سلطنت کی۔ ملا وجہی اس کے دربار کا شاعر تھا۔ وجہی نے اس بادشاہ کے عہد میں ایک نثر کی کتاب "سب رس" لکھی جس کی زبان کو وہ "زبان ہندوستان" کہتا ہے۔ یہ کتاب ۱۰۴۵ھ کی تصنیف ہے۔ "معراج العاشقین" کے مقابلے میں "سب رس" کی زبان منجھی ہوئی اور صاف ہے۔ اس مدت میں اردو نثر میں بہت کچھ لکھا گیا ہوگا۔ جو ہم تک نہیں پہنچا۔ وجہی حمد میں لکھتے ہیں۔

"۔۔۔۔ ہور گوا لیسر کے جا تران گن کے گراں۔ انوں بھی بات کو کھولے ہیں۔ یوں بولے ہیں۔

پوتھی سو کھوٹی بھئی پنڈت بھیا نہ کوئے
ایکی ابچھر پیم کا پڑھے سو پنڈت ہوئے

۔۔۔ خدا بڑا۔ خدا کی صفت کرے کوئی کتیک۔ وحدہ لاشریک۔ ماں نہ باپ۔ آپ میں آپ۔ پروردگار۔ سنسار کا سرجن ہار۔ جیتی جکوئی قدرت دکھلاتا ہے صفت اس کی اپنے پتے کرتا ہے۔ وہ بے حد۔ اس کی صفت کو کاں ہے حد بیت:۔

کسے ہے حد جو خدا کی صفت کی حد پاوے
ہر ایک بال کوں گر سو ہزار جیب آوے

دیکھیے یہ عبارت "معراج العاشقین" کی عبارت سے کتنی مختلف ہے۔ دکنیت نام کو نہیں "سب رس" کی زبان واقعی ہندوستان کی زبان ہے۔ جیسا کہ اس کے مصنف کا دعویٰ ہے۔

اب ہم محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں پہنچتے ہیں۔ اسی عہد میں فضلی نے "دہ مجلس" لکھی جو ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کی زبان کو بارھویں صدی ہجری کی اُردو نثر کا نمونہ سمجھنا چاہیئے۔ لکھا ہے۔

"۔۔۔ پھر دل میں گذرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیئے کامل۔ اور مدد کسو کی ہووے

شامل۔ کیونکہ یہ تائید صمدی و بے مدد جناب احدی یہ شکل صورت پذیر نہ ہووے اور گوہر مراد رشتۂ امید میں نہ آوے۔ لہذا کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت ہندی نہیں ہوا مستمع ...."

فضلی نے جب دہ مجلس لکھی تو ولی اورنگ آبادی زندہ تھے۔ یہ زمانہ علامہ سراج الدین علی خاں آرزو، رائے ٹیک چند بہار، شاہ حاتم، شاہ گلشن، یکرنگ، ناجی اور ناصر علی کے زمانے سے لگا کھاتا ہے۔ اردو میں اصلاح و ترمیم کی پہلی منزل ختم ہو گئی تھی۔ فارسی اگرچہ زوروں پر تھی مگر مرزا بیدل اور خان آرزو بھی قسم توڑنے کے لئے ہی سہی اردو کی سرپرستی عملی طور پر کرنے لگے تھے۔ مظہر جان جاناں اور شاہ حاتم سیکڑوں دکنی اور دوسرے دیسی الفاظ زبان سے نکال رہے تھے اور ان کی جگہ عربی فارسی الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرنے لگے تھے۔ ان کا اجتہاد اگرچہ نظم سے متعلق تھا مگر نثر بھی جب میدان میں آئی تو اسی نئے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ "دہ مجلس" کی مقتبسہ عبارت جو ابھی پیش کی گئی اس کا کافی ثبوت ہے۔ یہ ساری کتاب ظہوری کی سہ نثر کی طرح اول سے آخر تک مقفیٰ ہے۔ سب رس کے مضامین عموماً تصوف اور اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں۔ مصنف نے ندمان کے جبر جبرے پردے میں بہت سی کام کی باتیں بتا دی ہیں۔ جن کا انسان کی زندگی سے خاص تعلق ہے۔ غرض کہ یہ تینوں کتابیں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہیں۔ اور جسے ادب برائے ادب کہا جاتا ہے اس کی ذیل میں نہیں آتیں۔

اب ہم ۱۸۰۰ء کے آغاز میں پہنچتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۰۰ء کے شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرنگی افسروں کو ملکی زبان کی تربیت دینے کے لئے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ یہیں مذکورہ افسروں کے پڑھنے کے لئے کتابیں بھی لکھوائی جاتی تھیں۔ دہلی، لکھنؤ اور دوسرے مقامات سے قابل آدمی بلوائے گئے جن سے اردو اور ہندی نثر میں کتابیں لکھوائی گئیں۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس ادارے میں اول مرتبہ اردو کو ہندوستانی کا نام دیا گیا، اور جب اسی زبان سے فارسی اور عربی لفظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے لفظ رکھے گئے اور اسے دیوناگری حروف میں لکھا گیا تو اسے سرکاری طور پر ہندی کہا گیا۔ فورٹ ولیم کے اس ادارے میں جہاں تک اردو یعنی ہندوستانی کا تعلق ہے بہت سے آدمی کام کرتے تھے جنھوں نے متعدد کتابیں تیار کیں جو تعلیمی نصاب میں داخل کی گئیں۔ اس بحث میں ہمارا روئے سخن صرف تین کتابوں سے ہے۔ یعنی "باغ و بہار"، "آرائش محفل" اور "قصہ گل بکاولی" (مذہب عشق)۔

باغ و بہار باغ و بہار یعنی قصہ چہار درویش کے مصنف میر امن ہیں جو دہلی کے رہنے والے تھے وہ اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔ "اب خداوند نعمت۔ جان گلکرسٹ صاحب نے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔" چہار درویش کا قصہ امیر خسرو سے منسوب ہے۔ میر امن سے پہلے اس کا اردو ترجمہ "نو طرز مرصع" کے نام سے ہو چکا تھا مگر وہ مقبول نہ ہوا۔ میر امن نے اردو میں ایک اور کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام "گنج خوبی" ہے۔ یہ اخلاق محسنی کا آزاد ترجمہ ہے۔ میر امن شاعر بھی تھے اور لطف تخلص کرتے تھے۔ مگر باغ و بہار اتنی مشہور اور مقبول ہوئی کہ تذکرہ نویس لطف کو بھول گئے۔ یہ کتاب اب تک چھپتی ہے۔ اور شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ اور اردو کے اعلیٰ امتحانوں کے نصاب میں داخل ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ باغ و بہار کی زبان اپنے وقت کی دہلی کی زبان کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۲۱۷ھ میں پہلی دفعہ شائع ہوئی۔

آرائش محفل آرائش محفل کے مؤلف میر شیر علی افسوس ہیں ان کے بزرگ دہلی میں رہتے تھے اور وہیں یہ پیدا ہوئے۔ یہ گیارہ برس کے تھے کہ ان کا خاندان بہار کی طرف چلا گیا۔ کچھ مدت ادھر ادھر پھرتے پھراتے افسوس لکھنؤ آ گئے۔ اور وہیں اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد درس تدریس کے شغل میں پڑ گئے پھر لکھنؤ سے کلکتہ پہنچے اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو گئے۔ آرائش محفل آزاد اردو ترجمہ ہے ایک فارسی کتاب کا جس کا نام ہے "خلاصۃ التواریخ"۔ یہ کتاب پٹیالہ کے ایک بزرگ منشی سجان رائے نے سنہ ۱۱۰۷ھ میں تصنیف کی تھی۔ یہ ایک قسم کا قدیم طرز کا گزٹیر ہے جس میں صوبہ کی قید کے ساتھ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں اور دوسرے مقامات کا ذکر ہے۔ آخر میں قدیم ہندو راجاؤں کا مجمل تذکرہ ہے جو پرانوں سے ماخوذ ہے۔ باغ و بہار میں تو نظم سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔ آپ بیتی کہنے والا شخص شروع میں صرف دو شعر بطور تقریب کے پڑھتا ہے۔ داستان کے بیچ میں کہیں کہیں حسب موقع بھاشا کے کبت ضرور آ جاتے ہیں۔ مگر آرائش محفل میں اردو نظم کا استعمال اکثر پایا جاتا ہے چنانچہ برسات کا بیان کرتے ہوئے چودہ اشعار کی ایک مثنوی لکھ دی ہے اور جہاں ہندوستان کے پھولوں کا ذکر کیا ہے تو ڈیڑھ صفحہ کی لمبی نظم لکھ ڈالی ہے۔ جس زمانے میں اصل کتاب لکھی گئی یا یہ ترجمہ شائع ہوا تھا واقفیت عامہ کے لئے ضرور مفید ثابت ہوا ہوگا۔ اس کی زبان قریب قریب وہی ہے جو باغ و بہار

کی ہے ۔ یہ کتاب ۱۸۰۴ء میں پہلی دفعہ شائع ہوئی ۔ اس سے پہلے افسوس کا گلستاں کا اردو ترجمہ باغ اردو شائع ہوکر مقبول ہوچکا تھا۔

گل بکاؤلی

مذہب عشق معروف بہ گل بکاؤلی بھی فارسی سے ترجمہ ہے ۔ لکھا ہے کہ شیخ عزیز اللہ بنگالی نے اپنے ایک نوجوان دوست کے پاس خاطر سے یہ قصہ فارسی میں لکھا ۔ منشی نہال چند نے اس کو اردو کا لباس پہنایا ۔ منشی نہال چند پنجابی تھے ۔ مگر ان کی پیدائش اور تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی ۔ یہ بھی فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تالیف و ترجمہ میں ملازم تھے اور وہیں انھوں نے یہ قصہ گل بکاؤلی ترجمہ کیا ۔ بیچ بیچ میں نظم سے بھی بہت کام لیا ہے ۔ آخر میں دو قطعہ تاریخ بھی دیئے ہیں جس سے یہی سمجھنا چاہیئے کہ منشی نہال چند شاعر بھی تھے ۔ مذہب عشق " تاریخی نام ہے اور اس کی اشاعت کا زمانہ بھی وہی ہے جو دو پہلی مذکورہ کتابوں کا ہے ۔ ان سے اس کی زبان کا موازنہ کرتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ منشی نہال چند نے ترجمہ میں نہایت سہل انگاری سے کام لیا ہے ۔ اکثر جگہ تو صرف ربط کے حرف اور فعل اردو کے کر دیئے ہیں اور باقی فارسی ہی رہنے دی ہے ۔ ترجمہ کی زبان کی چاشنی کے لئے مسالا بہت ہی کم ہاتھ آتا ہے ۔ فارسی اور فارسیت اول سے آخر تک چھائی ہوئی ہے ۔ اور کیا غضب کیا ہے کہ شیخ عزیز اللہ نے قصہ کہتے کہتے جہاں اپنے دوست کو وعظ کے طور پر سمجھایا ہے وہ بچکانہ کچھ بھی منشی صاحب نے ترجمے میں لے لئے ۔ حالانکہ قصہ سے ان کا کچھ تعلق نہیں ۔ پہلی بات کی مثال میں ملاحظہ ہو ۔

۱۔ "میں نے تو کند سعی و تردد اپنے بازو کے زور سے میدان مطلب میں پھینکی ۔ اگر تیرا جوگان بخت مدد کرے تو شاید اپنے مطلب کو پہنچے "

۲۔ "جب مسافر آفتاب مغرب کی سیر کو گرم رفتار ہوا اور سیلاج ماہتاب رات کے مشکی گھوڑے پر سوار ہوکر مشرق کی طرف سے باگ اٹھا کر چلا "

۳۔ "تجھ سے جو یہ کام نمایاں ہو تو آخرت میں اجر فراواں ہو "

کچھ کا نمونہ ملاحظہ ہو ۔ لکھا ہے "جمالہ دیونی نے محمودہ کو تاج الملوک کے ساتھ بیاہ دیا ۔ اے عزیز روشنی چشم ظاہر کی سات پردوں میں ہے ۔ اور تجلی باری تعالیٰ کی نور دیدہ اولیا ہے " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مختصر یہ کہ زبان کے لحاظ سے یہ کتاب نہ یہ کہ باغ و بہار اور آرائش محفل سے بہت ادنیٰ درجہ کی ہے بلکہ اس میں اردو ہے ہی برائے نام ۔ فارسی ہی فارسی بھری ہوئی ہے ۔ منشی صاحب نے ترجمہ کرنے کی بہت ہی کم زحمت اٹھائی جب کہ وہ دو کتابیں ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتیں ۔

عام مماثلت

ان تینوں کتابوں میں بہت سی فروعی باتیں ملتی جلتی ہیں ۔ یعنی تینوں کے مصنف دہلی سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہیں ۔ تینوں کتابیں فارسی سے ترجمہ ہیں اور اگرچہ صرف دو کا موضوع پرانی قسم کا قصہ ہے ۔ لیکن دیو ۔ پری اور فوق العادت مضامین سے آرائش محفل بھی خالی نہیں ۔ تینوں میں عورت سے متعلق جنسی جذبات کی شدت ہے ۔ مگر ہم کو ان کی زبان کا تجزیہ کرنا ہے ۔ اس لئے ان باتوں کو چھوڑ دیا جائے گا ۔ زبان سے متعلق بھی ان تینوں کتابوں میں خاص کر "باغ و بہار" اور "آرائش محفل" میں بہت مشابہت ہے ۔ بلکہ کہیئے ان کی زبان ایک ہی ہے ۔ نہال چند کا مذہب عشق " (گل بکاؤلی) زبان کے بارے میں کوئی خصوصیت نہیں رکھتا جیسا کہ ابھی ظاہر کیا گیا ۔ ایک وجہ یہ ہوگی اور دوسری یہ کہ تسنیم نے اسے نہایت نفیس و بلیغ نظم کا خلعت پہنا دیا تھا ۔ یہ کتاب اصلی حیثیت میں اتنی نہیں چلی جتنی اس کی دو بڑی بہنیں ۔ پھر بھی جہاں منشی نہال چند نے ٹھیٹ اردو سے کام لیا ہے وہاں ان کی زبان وہی ہے جو میر امن اور شیر علی افسوس کی ہے ۔

لسانی مماثلت

تینوں کتابوں میں یہ لفظ یکساں معنی میں استعمال ہوئے ہیں ۔

رنڈی ۔ عام عورت کے لئے ۔

نپٹ ۔ نہایت ۔ بہت ہی ۔

ندان ۔

چنگا ہونا ۔ اچھا یعنی صحت یاب ہونا ۔

ہواؤ ۔ حوصلہ ، ہمت ۔

ہے گا ۔ ہے ۔

وے ۔ جمع وہ ۔

فعل کا جمع مونث صیغہ جیسے آتیاں جاتیاں ۔

باغ و بہار کی زبان

یہ چند لفظ اور فقرے وغیرہ جو باغ و بہار سے لئے گئے ہیں اس کی اور اس کے وقت کی زبان پر کافی روشنی ڈالتے ہیں ۔ بتس پر (جس کے بعد) وے (جمع وہ) عمدہ (امیر وزیر) اس محنت کا کیا ہوا ملک (اس محنت سے فتح کیا ہوا)

پرواگی (اجازت) اپنے جوگ کا کام (اپنے کرنے کے لائق کام) امراؤں (امیر کی جمع الجمع) پیکھنا (دیکھنا) ہم چاروں صورتیں ودبد خاک بسر ایک مدت پھرے۔ لڑکا "ان کے ہاں دو لڑکے پیدا ہوئے ایک تو یہی فقیر اور دوسری ایک بہن" (بچے) جس کو شادی کردی (جس کی) چاؤ چوپ (چاؤ چونپ) ودفرچی (فضول خرچی)، گزرانیاں (گزاریں)، عہدہ "سب آدمی اپنے عہدوں پر مستعد" (کام. خدمت یعنی کوئی گلاب پاش لئے تھا کوئی عطر دان) کام۔ خدمت خوش آنا (پسند آنا) رونق (چہرے کی رونق) بدھڑک (بے دھڑک) کہاؤ۔ "آخر اس کے کلام اور بہت کہاؤ سے یہ کھلا" (گفتگو) ہوا ہینا (ہوا اچھلنا) بہ حد (حد سے) "آشنا کا درد (دل کا لگاؤ) خون کا جوش" کدھو (کبھو کبھی)۔ اچنت (اچانک۔ یکایک)، جب تئیں (جب تک) ٹنڈریاں کسنا (مشکیں کسنا) سارے ڈیل میں زبان (سارے جسم میں) مرد آدمیت سے بعید ہے (شرافت سے) جایا چاہتے ہو (جانا چاہتے ہو) میں کہا (میں نے کہا) وہ ہیں (وہیں) پیٹی (صندوق بکس) سلاطینوں (سلطانوں) بہری کرکے (داکیں ہیں جنہ کرکے) اوجھل میں رکھنا (پردے میں) پھرچا (تخلیہ) میرا قصہ بہت دور و دراز ہے (طول طویل ہے) غث فوج کا کابل (بیمار) گلے سے لگ کر لاڈ کیا۔ ایسی کئی فوج روانہ ہوئی (جرار فوج)

آرائش محفل کی زبان

لفظ جدا کے الف میں اب تصرف نہیں کیا جاتا۔ پہلے کرتے تھے۔ جیسا کہ اس کتاب میں دیکھتے ہیں۔ جیسے یہ بات بدا ہے۔ سب لوگ جدے جدے بیٹھے۔ کمتی زیادتی (کمی بیشی) ٹک منہ لگا پھر نہ چھٹا۔ جاگہ (جگہ) آزاری (بیماری)۔ مثل اس کا یوں کہ ہے (اس طرح ہے)۔ دیاؤ (دریا)، نت (ہمیشہ) وغیرہ۔

ملہ یہ لفظ بول چال میں نہیں سنا گیا۔ ملہ پنجاب میں اب بھی بولتے ہیں۔

ملہ ڈنگل جماعت یعنی امراؤ کی بولی میں کسی فوج کو کہتے ہیں۔ چونکہ قدیم زمانے میں ایک تلوار ہی سپاہ کا بڑا ہتھیار تھی۔ اور تلوار کاٹتی ہے۔ اس لئے فوج کو کٹکی یعنی کاٹنے والی کہنے لگے۔ مرزا سودا نے یہ لفظ ایک جگہ استعمال کیا ہے۔ جیسے سید انشا نے دریائے لطافت میں ٹوکا۔ مگر یہ لفظ تلسی داس کی رامائن میں بھی آیا ہے۔ ٹوکنا فضول تھا۔

گل بکاؤلی کی زبان

چھارلی (دمکار عورت)، چوکی دینا (پہرا دینا) اور اس غم میں مانند حضرت ایوب کے تپ کو کہلا دیا (گھلا دیا) میری چھاتی پر پشاب کرتا ہے جلنے ضرورت بھی پھرتا ہے۔ آخر وہ لنکا شرقستان کی طرف دوڑ گئی (وہ دیوانی) چھنال گنگوٹے (چال بازی)، تلوار کرنا (تلوار سے لڑنا) پنجابی کہاوت۔ ہاتھوں مہندی۔ پاؤں مہندی اپنے لچھن اور مل دینڈی۔ اس کے ساتھ اور بھی دو کا فرین غارتگر ایمان ہیں۔ مکر بائی (مکار عورت)، اہل طرب (ارباب نشاط) وغیرہ۔

عبارت

ان تینوں کتابوں کی عبارت ہے تو سادی مگر جوش اور جذبات کے غلبہ کے وقت مقفیٰ ہو جاتی ہے۔ بادشاہ آزاد بخت کتے کے ساتھ خواجہ سگ پرست کا سلوک دیکھ کر بہت برہم ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے:-

"تیرا کیا دین ہے یہ کیا آئین ہے۔ تو کس پیغمبر کی امت ہے۔ اگر کافر بھی ہے تو یہ کیسی مت ہے۔ اور تیرا کیا نام ہے کہ تیرا یہ کام ہے۔"

میر علی افسوس الہ آباد کی سیر کر رہے ہیں کہ:-

ایک جھنڈ کا جھنڈ پریوں کا قضا را ادھر آ نکلا۔ ایک ان میں سے چمپئی رنگ نہایت چالاکی و بے باکی سے پیش قدمی کرتی تھی۔ اور انداز و ناز سے پاؤں دھرتی تھی۔ سراپا اس کا گویا سانچے میں ڈھلا تھا۔ ہر ایک عضو حسن و ادا سے بھرا تھا۔"

گل بکاؤلی کا قصہ خاتمہ پر پہنچنے کو ہے۔ روح افزا اور بہرام کا قضیہ پیش آتا ہے۔ معاملہ فیروز شاہ تک پہنچتا ہے۔ اور بہرام کے جسم پر سے قمری کا جامہ اتار پھینکا جاتا ہے۔ فیروز شاہ اسے دیکھ کر آگ ہو جاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔

"...اے بدذات نابکار تو غضب سلطانی سے نہ ڈرا۔ اور اپنے جی میں کچھ نہ سوچا۔ سچ کہہ تجھے یہاں کون لایا۔ اور بادشاہوں کے محل میں کس نے پہنچایا۔"

یہاں تک ہو چکا تھا کہ ایسٹ انڈیا کے اصحاب بست وکشاد نے فورٹ ولیم کالج کو ختم کردیا۔ وہ پہلے بھی اسے دل سے نہ چاہتے تھے۔ ادھر سیاسی اور مالی وجوہ سے ۱۸۱۹ء میں انگریزی حکومت نے اودھ کو دہلی کی برائے نام ماتحتی سے آزاد کردیا۔ غازی الدین حیدر جس کی حیثیت اب

تک نواب وزیر یعنی صوبہ داری تھی شاہ اودھ بنائے گئے۔ یہاں سے اُردو کے دوسرے مکتب کا جنم ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے پرانے اساتذہ میں سے میر ۱۸۱۰ء میں مصحفی ان کے ایک سال بعد اور انشا ۱۸۱۷ء میں وفات پاچکے تھے۔ اب ناسخ اور آتش دونوں کے اُبھرنے کا وقت آیا۔ چنانچہ وہ اُبھرے۔ اور خوب چمکے خصوصیت سے شیخ ناسخ اور رشک کے ترک و ترمیم کو لکھنؤ کے اس ابتدائی دور میں وہی قدر حاصل تھی جو پہلے دلی میں مظہر اور حاتم کا حصہ ہو چکی تھی۔ مختصر یہ کہ ناسخ کی ترمیم و تنسیخ کو لکھنؤ نے قبول کیا۔ اگرچہ اُن کا براہ راست تعلق اُردو کی نظم سے تھا مگر جب لکھنؤ میں نثر نے جنم لیا تو اس کا بھی وہی رنگ تھا۔

۱۸۴۳ء میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے لکھنؤ سے فسانۂ عجائب شائع کی۔ دہلی کی زبان میں جو تبدیلیاں پچھلی نصف صدی میں ہوئی تھیں ان سے آنکھ بند کر کے انھوں نے صرف ناسخ کی معیار کو سامنے رکھ کر اپنے دیباچہ میں باغ و بہار کی زبان پر اعتراض کئے۔ اس کے جواب میں سید فخر الدین حسین سخن تخلص نے سروش سخن شائع کی۔ ۔ وہی پرانا قصہ ان دونوں کتابوں کا موضوع ہے۔ اور عبارت اول سے آخر تک مقفیٰ اور مسجع ہے۔ پھر بوستان خیال اور طلسم ہوشربا کا طوفان بے تمیزی شروع ہوتا ہے۔ اب مغربی تعلیم ملک میں پھیلتی جاتی تھی اور لوگ پرانے قصے کہانیوں کو پڑھتے پڑھتے اور سنتے سنتے اکتا گئے تھے کہ قدیم دلی کالج میں علوم و فنون کی کتابوں کے اُردو میں ترجمہ کا کام شروع ہوا اور یہیں سے نئی نثر نے رنگ پکڑا جس کا چرچہ میر امن نے مہیا کر دیا تھا۔ اس کے بعد سر سید احمد خاں اور علی گڑھ کی تحریک کے کارنامے شروع ہوتے ہیں مگر ہمارا موضوع ہمیں یہیں روک دیتا ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

غزل

دل میں امید اگر نہیں آتی عمر کٹتی نظر نہیں آتی

جس میں پل بھر سکون حاصل ہو وہ گھڑی عمر بھر نہیں آتی

عشق جب تک کہ رہبری نہ کرے زندگی راہ پر نہیں آتی

وُہ نہ آئے نہ اُن کو آنا ہے موت کیوں چارہ گر نہیں آتی

مطرب گیت، ساقیا اک جام زندگی لوٹ کر نہیں آتی

دل تو مشکل پسند ہے لیکن کوئی مشکل نظر نہیں آتی

نالۂ دل کی دُھن وہ دُھن ہے سحر
جو کسی ساز پر نہیں آتی

کشمیری لال ذاکر

کنارے اور دیواریں

دس کینڈل پاور کا لیمپ مدھم سی روشنی دے رہا تھا۔ ایک پروانہ بار بار اُس سے آ ٹکراتا۔ کانچ کا وہ خول جس کے اندر تاروں کا کسی خاص اصُول کے تحت مختصر سا اُلجھاؤ چمک کر روشنی پیدا کر رہا تھا در اصل ایک دیوار تھی۔ ایک ایسی دیوار جو پتنگے کو جل کر راکھ ہو جانے سے روک رہی تھی۔ نہ جانے کتنے ہی پروانے ہر روز ایسی ہی اُجلی اور شفاف دیواروں کو عبور کرنے کی کوشش میں تھک کر ہار جاتے ہیں

"اتنا نزدیک ہو کر بھی یہ کتنا دُور ہے"

شمیر نے پروانے کی اس فضُول سی جدو جہد کو دیکھتے ہوئے کہا اور شکستہ سی پرانی آرام کرسی میں بیٹھے بیٹھے اُس کی آنکھوں کے سامنے پچھلے تین برسوں کے تمام واقعات تیزی سے گھوم گئے۔ اس کی زندگی ایک چٹیل میدان کی طرح تھی جس میں راستے کے پیچ و خم نہ تھے۔ ایک ہی ویران سی لکیر تھی جس پر وہ چلا جا رہا تھا اور آخر وہ لکیر بھی مستقبل کے اُفق میں کھو جاتی تھی جہاں موت کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں تیرتی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک ہی راستے پر چلتے چلتے اب وہ بُری طرح تھک گیا تھا۔ اُسے چند لمحے سستانے کی ضرورت تھی لیکن امید کا خنک سایہ کہیں بھی تو نظر نہ آتا تھا۔ اور نا امیدی کی جھلس دینے والی دھوپ میں ایک ہی جگہ رُک کر جلنے سے سفر کا کچھ حصّہ طے کر لینا بہتر ہے۔ وہ کہیں بھی نہ ٹھہر سکا۔ شائد اُسی پتلی سی پگڈنڈی کی طرح وہ بھی ایک دن اُفق کی پہنائیوں میں گم ہو جائے گا۔

وہ زیر لب بُڑبڑانے لگا۔

"میری شادی میری زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ شادی کا اصلی مقصد افزائش نسل نہیں بلکہ ایک ساتھی ڈھونڈنا ہے۔ ہر ایک انسان تنہائی سے گھبراتا ہے۔ زندگی میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب اُسے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اس کے خیالات و تصورات کو سمجھ سکے۔ جو اس کے سکھ دُکھ میں برابر کا شریک ہو اور سکھ دُکھ صرف جسمانی ہی تو نہیں ذہنی اور قلبی بھی تو ہوتے ہیں۔ اُسے ایک ایسے ساتھی کی چاہ ہونے لگتی ہے جو ارتقا کی مختلف منزلیں طے کرنے میں اس کی مدد کرے ——— لیکن یہ ازدواجی زندگی کے خلا کس قدر ناممکن ہیں! کس قدر بد قسمت انسان ہیں! کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ شائد لطیف جذبات شیاما کے پاس پھٹک تک نہیں جاتے۔ اس نے مجھے سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ شائد اس کا خیال ہے کہ کسی کو بغیر اچھی طرح سمجھے بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ نہ جانے ابھی کتنی دیر اور وہ اس غلط فہمی میں اُلجھی رہے گی۔ لیکن اگر کسی کو اپنانا ہی زندگی کا مقصد ہے جب بھی تو وہ ناکامیاب ہے۔ تین سال دن رات میرے ساتھ رہ کر بھی وہ مجھے اصلی روپ میں نہیں دیکھ سکی۔ اس نے کبھی کوشش بھی تو نہیں کی ایسا کرنے کی۔ اس لئے زندگی ایک دیوار ہے جس کے سائے میں آرام کرنا ہی سب سے بڑا مقصد ہے اُسے دیوار کو پھاند کر نئے مناظر دیکھنے کی خواہش ہی نہیں۔ وہ صرف سایہ چاہتی ہے۔ سائے کی ماہیت اور شکل سے اُسے کوئی غرض نہیں میں بھی تو سر پٹک پٹک کر ہار جانے والے اس پروانے کی طرح اپنے مقصد میں ناکامیاب ہوں گا۔"

شمیر نے دس کینڈل پاور لیمپ کی طرف ایک بار پھر دیکھا اور اُسے یُوں محسوس ہُوا کہ شیاما ایک ایسا کگارا ہے جس سے اُس کی زندگی کی کشتی آخر ٹکرا کر ٹوٹ جائے گی۔ وہ ساحل کے سکون اور آرام سے کبھی آشنا نہ ہو سکے گا ——— اور رینوا صبح سویرے آکاش کی نیلی جھیل میں موتی کی طرح چمکتا ہُوا ایک تارہ ہے جسے وہ صرف کنارے پر کھڑا ہو کر دیکھ ہی سکتا ہے حاصل نہیں کر سکتا۔

شمیر سیٹھ سکھ چین لال کے ہاں سو روپے کا کلرک تھا لیکن سبھی اُسے منیجر صاحب ہی کہتے تھے۔ حوادث کے ان گنت تھپیڑے کھانے کے بعد بھی آخر وہ بندے ہوئے پانی ہی کے ایک حصّے میں پہنچ سکا تھا۔ کنارہ تو اس کی قسمت میں تھا ہی نہیں۔ اس نے اسی کو غنیمت جانا۔ اُسے فقط سیٹھ صاحب کے کاروباری معاملات میں ہی نہیں بلکہ خانگی امورات میں بھی دخل دینے کی پوری پوری اجازت تھی۔ اپنے لئے تو زندگی کی مسّرت کے تمام دروازے اس نے خود ہی بند کر دیئے تھے۔ اس کی خوشی کا باعث اب صرف ایک چیز تھی دوسروں کو زیادہ سے زیادہ آرام اور خوشی پہنچانے کی کوشش۔ اس کی نا امیدی اور رنج سماج کے ارتقاء میں ذرہ بھر رکاوٹ نہ تھے۔ اسی لئے سیٹھ صاحب کو بھی اس پر پُورا پُورا بھروسہ تھا۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ وقت اور محنت صرف کر کے ان کی خدمت کرتا تھا۔ صبح بہت جلدی وہ گھر سے نکل آتا۔ اور شام کو اندھیرا ہو جانے پر واپس لوٹتا۔ اس کے لئے گھر میں بالکل کوئی کشش نہ تھی۔ کتنا مشکل ہے بغیر کسی کشش کے زندگی گذارنا۔ یہ وہ سمجھ چکا تھا۔ شیاما اس کے لئے ایک ایسی دیوار تھی جو اُسے گھر کے آنگن میں داخل ہونے سے سدا ہی روک دیتی تھی۔ کئی بار اُس نے چاہا بھی کہ وہ اس دیوار کو پھاند کر گھر کے سکھ اور آرام سے لطف اندوز ہو سکے لیکن ہر بار وہ جھجک گیا۔ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ اس ٹھوس دیوار کے ساتھ سر ٹکرا کر ختم ہی ہو جائے۔ لیکن اس سے یہ بھی تو نہ ہو سکا۔ وہ تذبذب اور وسوسوں میں ہی گھرا رہا۔ اور اپنے مستقبل کے لئے کوئی مستقل فیصلہ نہ کر سکا۔

سیٹھ صاحب کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتے اتنی بڑی جائداد کا کیا ہوگا؟ زندگی تو آخر کسی وقت بھی ساتھ چھوڑ سکتی ہے اس کا کیا بھروسہ۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر انھوں نے تین شادیاں کیں۔ لیکن کوئی بھی عورت دو سال سے زیادہ مدّت زندہ نہ رہی۔ شادی کی تو انھیں خاص ضرورت بھی نہ تھی۔ اپنے کاروبار سے ہی ان کا اصلی بیاہ ہو گیا تھا۔ انھیں اسی کی خوشنودی کی ضرورت تھی۔ اور وہ دن رات اسی کے ناز اٹھایا کرتے تھے۔ شاید اسی لئے قدرت نے تین انسانی پیکروں کو ان کے راستے میں حائل ہونے سے روک لیا تھا۔ اب بھی اگر وہ شادی کرنے پر رضامند ہو گئے تھے تو محض اولاد کی خاطر۔ شمیر کا پیہم اصرار بھی کسی حد تک اس کا موجب تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا مالک دُنیا میں کوئی نہ کوئی نام لیوا ضرور چھوڑ جائے۔ آخر ان کی چوتھی شادی ہو گئی۔

چوتھی بار سیٹھ صاحب دلہا بنے اور تصورات کے گھروندے بناتے ہوئے ریوا کو اپنے بانہوں کے حلقے میں لے کر مسرت سے جھوم اُٹھے۔ ریوا کے آتے ہی گھر میں ایک خاص قسم کی آراستگی اور سلیقہ نظر آنے لگا۔ جو عورت کی چار پانچ سال کی طویل غیر حاضری میں برہم ہو گیا تھا۔ شاید بے جان چیزیں بھی عورت کے لمس کو ترستی ہیں۔ اس سلیقہ اور آراستگی کو دیکھ کر شمیر کو اپنا گھر یاد آ جاتا۔ ایک سرائے جہاں وہ فقط شب بسری کے لئے چلا جاتا تھا۔ سیٹھ صاحب کے گھر کا سارا انتظام اُسی کے سپرد تھا۔ اس لئے اُسے ریوا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کے مذاق، مشاغل اور خیالات پر یاس کی ایک گہری چھاپ تھی۔ وہ کیوں؟ یہ اُسے بھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔

شادی سے پہلے ریوا سوچا کرتی شاید ازدواجی زندگی کی دلچسپیاں اور مصروفیتیں اس کے دل سے ایک ان جانا اضطراب دُور کرنے میں کامیاب ہو سکیں جو اس کے ذہن کو بُری طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔ شاید وہ اپنے درد پر امارت اور تکلفات کا پردہ ڈال کر اُسے کسی پر عیاں ہونے سے روک سکے لیکن اب اُسے یہ سب ایک خواب دکھائی دیتا تھا جو اس نے ادھ جگے میں دیکھا تھا۔ وہ ایک سراب تھا جس کے پیچھے وہ بھاگی تھی۔ وہ اب بھی پہلے ہی سی پیاسی تھی بلکہ اب تو اُسے اپنی تشنہ لبی کا احساس اور بھی شدید ہو گیا تھا۔ پیاسے انسان کو تو پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پانی طوفان میں ملتا ہے صحرا کی دہکتی ہوئی ریت میں نہیں۔ کیا اُس کی زندگی پھر کسی طوفان سے آشنا ہوگی! اور بعض دفعہ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک نوجوان شخص کی شکل گھوم جاتی جس کے چہرے سے بھوک ٹپکتی تھی، بھوک سے پیدا شدہ لاپرواہی اور لاپرواہی میں جھلکتی ہوئی کرختگی اور سنجیدگی۔ ایک ایسا انسان جو کبھی اُبلتا ہوا لاوا تھا۔ لیکن ماحول کی سرد اور تیز ہواؤں نے اب جیسے ٹھوس اور مضبوط پتھر بنا دیا تھا اور اُسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ بڑا سا پتھر ازدواجی زندگی کے اُونچے کگار سے اس کی جیون ندی میں گرنے والا ہے۔ تھکے ہوئے مسافر کو سفر کا اگلا حصّہ طے کرنے کے لئے اپنی پیاس بجھانا ہی تھی ——— اور ریوا کو اپنی بیاہتا زندگی ایک بڑے ویرانے کی طرح دکھائی دینے لگتی تھی جس میں دُور افق کے قریب ایک سیاہ دھبہ نظر آتا تھا۔ اس نے کئی بار چاہا کہ وہ دھبہ نزدیک آ جائے۔ ایک کالی گھٹا بنے۔ اور ایک بار کھل کر برس جائے، اس بڑے سے ویرانے

میں جل تھل ہو جائے، وہ جلتا ہوا صحرا ایک سندر گہری جھیل میں بدل جائے لیکن وہ وجبہ اپنی جگہ سے تل بھر نہ ہل سکا۔ ویرانے کا ہر ذرہ اس بھری نظروں سے اُسے تکتا رہا، تکتا ہی رہا۔

اور وہ سرد اور ٹھوس پتھر ——— !

سیٹھ سکھ چین لال شادی کے بعد پھر غافل ہو گئے۔ وہ لوہے کی مشینوں کی کھٹ کھٹ میں ایک ایسے نغمے کی لطافت محسوس کرتے تھے جو ان کی روح تک کو مسرور کر دیتا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لئے وقت اور فاصلے کی قید سے آزاد ہو کر اس مادی دنیا سے اوپر اُٹھ جاتے اور ایک ایسی جگہ پہونچ جاتے جہاں عورت اور مرد کے جنسی تعلقات اور ازدواجی زندگی کے بندھنوں کی کوئی ضرورت نہ رہتی۔ وہ اپنی خامیوں کو تخیل کی مدد سے قابلِ رشک نعمتیں بنانے کی کوشش کرتے۔ ریوا کے لئے ان کے پاس تیاگ، سادگی اور پتی ورتا دھرم کے پرچار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان کی بیوی کو محسوس ہوتا کہ وہ اپدیش نہیں ایک محروم روح کی پکار ہے۔ اور اس کے ہونٹوں پر ایک زہرخند پھیل جاتا اور اس کا خون کھول اُٹھتا۔ وہ اپنی اس ذلیل پہ تڑپ اُٹھتی اور چاہتی کہ اس ٹھوس اور سرد پتھر کو خود ہی پانی میں دھکیل دیا جائے۔ اس کے اپنی مرضی سے لڑھکنے کا انتظار نہ کرے۔ احساس کمتری کے تیز نشتر اس کی روح میں بری طرح کچوکے لگانے لگتے۔ اُسے طوفان کی ضرورت تھی، سکون کی نہیں ——— اس کی آگ اُگلتی آنکھیں لمحہ بھر کے لئے اپنے خاوند کے جھریوں بھرے چہرے پر جم جاتیں اور وہ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے کمرے سے باہر نکل جاتا۔

ریوا نے چاہا کہ وہ سمیر کے ان حالات کو یکسر بدل ڈالے جو اُسے ایک عرصے سے کچل رہے تھے۔ سمیر نے خود بھی کئی بار باتوں باتوں میں کہا تھا مفلسی ایک ایسی دیوار ہے جو ازل سے ہی ارتقا کی راہ میں حائل ہے اور جسے پھاند سکنا ممکنات سے نہیں ——— وہ اس دیوار میں لگی آخری اینٹ تک کو گرا دینا چاہتی تھی تاکہ ارتقا کو پھیلنے کے لئے وسعتیں مل سکیں۔ اس نے سمیر کی اقتصادی حالت کو سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سمیر اب دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ ہر تیسرے روز اُس کے ہاں قیمتی تحفے بھیجے جاتے تھے۔ مفلسی کی اونچی دیوار بہت حد تک شکستہ ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اونچے کنگارے سے ایک سرد اور ٹھوس پتھر ریوا کی زندگی کے دریا میں بھی گر گیا تھا۔ دریا کی سطح متلاطم ہو گئی تھی۔ اُس میں بیسیوں چھوٹے چھوٹے بھنور ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے تھے۔ سیکڑوں چھوٹی چھوٹی لہریں ایک بڑی سی لہر میں تبدیل ہو کر کنارے سے ٹکرانے لگی تھیں۔ دریا جو پہلے ساکن پانی کا ایک بڑا سا پھیلاؤ دکھائی دیتا تھا، اب ایک متلاطم سمندر بن گیا تھا۔ لیکن دریا کی خواہشیں پوری نہ ہو سکیں۔ وہ تو کناروں کو عبور کر کے اردگرد کے ویران اور سنسان چٹیل میدان کو سیراب کرنا چاہتا تھا، وہ چٹیل میدان جس میں صرف ایک پگڈنڈی تھی۔ دور افق کے دھندلکے میں تحلیل ہوتی ہوئی سیاہ رنگ کی ہلکی سی لکیر دریا کے بھنور اور لہریں اس کے اپنے کناروں کو ہی کرید رہی تھیں۔ طوفان اور کناروں کی یہ آپسی کشمکش ازل سے چلی آتی ہے۔ دریا کے کناروں کی قید سے آج تک آزاد نہیں ہو سکا۔ اس کی ان تھک کوششیں اسے کناروں کے بغیر زندہ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ تو کیا کناروں کی یہ اونچی اونچی دیواریں کبھی نہ گر سکیں گی۔

ریوا اپنے خوب صورتی سے سجائے ہوئے کمرے میں بیٹھی جانے کس سوچ میں غرق تھی۔ سامنے کینڈل پاور کا بلب کمرے کو جگمگا رہا تھا۔ اتنی احتیاط کے باوجود ایک پتنگا جانے کس طرح وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ بار بار بلب کے نزدیک جانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کے خول سے نکلتی ہوئی روشنی کی تیز شعاعیں اُسے اندھا کر دیتیں اور وہ اپنے مقصد میں ہر دفعہ ناکامیاب رہتا۔ ریوا کی آنکھیں اچانک اُس طرف آئیں اور دو موٹے موٹے آنسو اس کے خوبصورت چکنے گالوں پر سرکنے لگے۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ وہ خود بہت تیز روشنی والا ایک بلب ہے اور سمیر ایک کمزور سا پروانہ۔ مسلسل تگ و دو نے جس کے پروں میں بھرپور اُڑان کر سکنے کی قوت ہی نہ چھوڑی تھی۔ اس کی اپنی تیز روشنی ہی ایک ایسی دیوار ہے جسے سمیر پھاند نہ سکے گا۔ دیوار اونچی ہے اور پروانہ شکستہ پر اور نڈھال۔

"تم اتنے نزدیک ہو کر بھی کتنے دُور ہو ———" ریوا زیرِ لب بڑبڑائی اور اُس نے اپنا پریشان تھکا ہوا سر میز پر ٹیک دیا۔



گرجا پرشاد ماتھر

سُلطانِ عالم نواب واجد علی شاہ

حضرت جانِ عالم کے دور میں چونکہ میرے پردادا حسام الدّولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں گویا سلطنت کے ایک بڑے رکن اور شاہی محفلوں میں باریاب تھے، اس لئے میں نے اپنے والد اور اپنی دادی کی زبان سے حضرت واجد علی شاہ کی سیرت کے باب میں تواتر کے ساتھ جو باتیں سُنی ہیں اُن پر نظر کر کے یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس آخری تاجدار اودھ کو اُن تمام باتوں سے سخت پرہیز تھا جنھیں "خلافِ شرع" کہا جاتا ہے، اور عورتوں کے سلسلے میں ان کی احتیاط اور شرع پرستی کا یہ عالم تھا کہ نامحرم عورت کی طرف نگاہ اٹھانے کو بھی حرام سمجھتے تھے، اور اسی بنا پر اُن تمام عورتوں سے انھوں نے متعہ کر لیا تھا جو آئے دن گرد و پیش رہتی تھیں۔ یہ متعہ محض نگاہ کو جائز کرنے کی خاطر کئے جاتے تھے۔ اس تنہا مقصد کے علاوہ ان کی پسِ پشت اور کوئی جذبہ کارفرما نہیں تھا۔

اب رہا ناچ رنگ کا شوق، سو وہ انھیں تھا، اور ایک شاعر و فن کار کی حیثیت سے ہونا بھی چاہیئے تھا۔ لیکن ابتدا میں اس ذوق کے اندر غلو نہیں پایا جاتا تھا اور امورِ سلطنت میں اس سے کوئی خلل نہیں واقع ہوتا تھا۔ لیکن انگریزوں کی ہوسِ ملک گیری نے نہایت عیاری کے ساتھ انھیں غلو کی طرف دھکیل دیا تاکہ اس بہانے سے اودھ کو انگریزی قلمرو میں شامل کر لیا جائے۔ یہ داستان بڑی دردناک ہے۔

حضرت جانِ عالم کے باب میں اگر زندگی نے موقع دیا تو بہت کچھ حوالۂ قلم کروں گا۔ اور یہ دکھا دوں گا کہ ایک فن کار اور شاعر فرماں روا کی بے شمار خوبیوں پر انگریز کی دروغ بافیوں نے کتنے سیاہ پردے ڈال رکھے ہیں۔

جوؔش

نواب واجد علی شاہ تاجدارِ ملک اودھ پر ان کی رنگین مزاجی، خوش طبعی، نازک دماغی، جولانی اور جدّتِ مذاق کی بدولت ماہرانِ سیاست اور مورخین نے کیا کیا تہمت ڈھائے ہیں۔ کوئی بدست اور عیاش کہہ کر انھیں مطعون کرتا ہے تو کوئی گویا اور رنگیلا بتا کر ان کا مضحکہ اُڑاتا ہے اور بعض بعض یاراں طریقت نے کہاریوں، مغلانیوں، ڈومنیوں، بٹھانیوں، خواصوں، رنڈیوں اور محل میں آنے جانے والی چھوکریوں سے رشتۂ التفات و محبت قائم کر کے سلطنت اودھ کے فنا کر دینے کا اہتمام بھی انھیں کے سر تھوپا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ بسا اوقات ذی ہوش اور ذی فہم مسلمان مورخین نے بھی اودھ کی تباہی کے خاتمے کا ذمّہ اس رعایا پرور اور اولوالعزم بادشاہ کو ہی قرار دیا ہے۔ کیسے افسوس کا مقام ہے کہ ایک ذی مرتبت عالی وقار حکمرانِ سلطنت پر حربۂ نازیبا کہتے وقت لوگ اس قابلِ رشک زمانے کی تہذیب، اُس شائستگی اور اُس کے مذاقِ سلیم کو بالکل بھول جاتے ہیں حتّٰی کہ تاریخی واقعات کو بھی سہو کر دیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جس زمانے میں اودھ کی سرسبز اور شگفتہ سلطنت کو زندگی اور موت کی منازل طے کرنی پڑیں اُن دنوں ہندوستان کی ساری اچھی اور بڑی قومی قوتوں کو سرکار انگلشیہ یکے بعد دیگرے کسی نہ کسی بہانے سے چھین جھپٹ کر اپنی قلمرو میں شامل کر کے توسیعِ سلطنت کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ پنجاب میں سکھوں کا اور دکن میں مرہٹوں کا تختہ کیوں اُلٹا۔ دہلی میں سلطنتِ مغلیہ اور بنگالے میں نواب ناظم بنگالہ کیوں زیر و زبر ہو کر نیست و نابود ہو گئے۔ پیشواؤں کی سلطنت کیوں منہدم ہوئی۔ سلسلۂ رجواڑے کیوں یک قلم زیر ہو گئے۔ اور اب رہے سہے زمینداران اور تعلقہ داران کیوں جھٹکے کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں نہ تو کوئی واجد علی شاہ ہے اور نہ عیش پرست، قانونِ قدرت ہے کہ جب کسی سلطنت کا چراغ گل ہونے کو ہوتا ہے وہاں رفتہ رفتہ اشکال بطور خود پیدا

ہونے لگتی ہیں۔ چنانچہ واجد علی شاہ کے عہد سے پیشتر ہی نظم و نسق اودھ میں ابتری پھیلنی شروع ہو گئی تھی۔ اور مشکل یہ تھی کہ تمام عمال بدکار و بد باطن، بیکار اور خود غرض تھے۔ رعایا تباہ تھی۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا مسئلہ صادق آ رہا تھا۔ جابر اور ظالم کو سزا نہ ملتی۔ کوئی داد تھی نہ فریاد۔ خزانہ خالی۔ رشوت ستانی کی گرم بازاری اور آئے دن جو نئے نئے فتنے اور فساد برپا ہوتے وہ کسی کے مٹائے نہ مٹتے۔ پھر واجد علی شاہ کو اس آخری بربادی کا ذمہ دار قرار دینا کون انصاف کی بات ہے۔ سرکار انگلشیہ کی جانب سے یا بار فہمائش کا سلسلہ ان کے والد مرحوم کے زمانے سے ہی جاری تھا۔

سلطان واجد علی شاہ کو ان کے والد بزرگوار امجد علی شاہ نے قابل اتالیق، منشی، معلم اور لائق و فائق ادیبوں کی نگرانی اور علماء نامی گرامی کی صحبت سے بہرہ ور کر کے علمیت اور فضیلت کا گہرا رنگ جمانا چاہا تھا اور وہ چڑھا بھی مگر ولی عہد کا تو فطری رجحان عیش پرستی کی جانب مائل تھا پھر کوئی کرتا تو کیا کرتا۔ سلطان عالم نے کافی استعداد اور لیاقت علمی حاصل کر لی تھی چنانچہ وہ قریب قریب چالیس کتابوں کے مصنف ہیں مگر ان میں زیادہ تر عشق مزاجی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اور بعض بعض علم موسیقی کی گراں بہا تصنیفات ہیں اور بعض بعض گوہر نایاب ہیں جو اب ناپید اور مفقود ہیں کچھ کے نام حسب ذیل ہیں۔

شیوۂ فیض۔ قر مضمون۔ سخن اشرف، گلدستۂ عاشقاں۔ ماہ ملک نظم نامور۔ حزن اختری، خطابات محلات۔ دفتر غم و بحر الم۔ سرمایۂ ایمان۔ فصائد اردو و فارسی، مباحثہ بین النفس والعقل، نصائح اختری۔ عشق نامہ رسالۂ ایمان، دفتر پریشان، صورت المبارک۔ ہیبت حیدری۔ جوہر عروض ارشاد خاقانی، بنی۔ ناجو۔ دلہن۔ مثنوی در فن موسیقی وغیرہ وغیرہ، ان میں بہت تو اب ناپید ہو چکی ہیں اور کسی قیمت پر بھی ان کا حاصل ہونا ممکن نہیں چنانچہ علم موسیقی پر ان کی مستند کتاب "ناجو" کا ایک نسخہ راقم الحروف کے پاس اس کے خاندانی ورثے میں اب بھی موجود ہے۔ اصلاح سخن بالعموم نواب فتح الدولہ برقؔ سے لیا کرتے تھے۔ برقؔ کو بادشاہ سلامت سے سچی محبت تھی۔ چنانچہ اسی کشش سے بادشاہ کے ہمراہ کلکتے ہوئے کلکتے چلے گئے اور وہیں ۱۸۵۸ء میں چند ماہ بعد ہی انتقال کیا۔ اور یہ شعر حسب حال ہوا۔

برقؔ جو کہتے تھے آخر وہی کر کرا اٹھے — جان دی آپ کے دروازے پہ مر کر اٹھے

سلطان عالم کا تخلص اختر تھا۔ ور طرز کلام قطعاً لکھنوی یعنی رعایت لفظی کا نمونہ بہت ہے۔ نمونہ کلام آپ کی مثنوی "حزن اختری" جس میں تکالیف شہر کلکتہ کا حال ہے نہایت دل غریب اور پُر تاثیر نظم ہے۔ اس کی سلاست۔ فصاحت اور خوبیٔ زبان کی تعریف بیان سے باہر ہے۔ دیوانوں اور مثنویوں کے علاوہ ان کے خطوط بھی نہایت دلچسپ ہیں۔ جو انھوں نے قیام کلکتہ کے زمانے میں اپنی محبوب بیوی نواب زینت محل کے نام لکھے تھے۔ یہ خطوط مقفیٰ اور مسجع دیباچے کے ساتھ بھی چھپ چکے ہیں ان میں اکثر شاعرانہ مذاق کی بہترین تحریرات ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

کمر دھوکا۔ دہن عقدہ۔ غزال آنکھیں، پری چہرہ
شکم ہیرا۔ بدن خوشبو۔ جبیں دریا۔ زبان عیسیٰ

برائے سیر جو سارند میخانے میں گر آئے — گرے ساغر۔ لنڈھے شیشہ، بنے ساقی بھی

باپ کے خوف سخت تاکید اور نگرانی نے اگرچہ ولی عہد کے دل میں علمی ذوق و شوق ضرور پیدا کر دیا تھا لیکن ان کا فطری رجحان ہوگا نے بجانے۔ ناچ۔ میلے اور عیش پرستی کی جانب راغب تھا۔ وہ کسی کے روکے نہ رکا۔ جو لطف انھیں ڈوم ڈھاڑیوں۔ خوبصورت نوعمر عورتوں کی صحبت میں آتا وہ علماء کی صحبت میں نہ آتا تھا۔ ولی عہد کی پہلی شادی صغیر سنی میں بزمانہ ولی عہدی ہو چکی تھی۔ مگر تخت نشینی کے چوتھے سال ۱۸۵۱ء میں انھوں نے اپنی شادی اپنی مرضی اور خود سے رونق آرا بیگم سے رچائی جو نہایت خوش گلو ہونے کے علاوہ حسن اور خوبصورتی میں شہرۂ آفاق تھیں۔ موسیقی پر کمال عبور حاصل تھا جس ہم مذاقی کے باعث انھیں شاہ کو ان سے غیر معمولی محبت تھی اُن کے حسن و جمال کو انھوں نے حزن اختری میں اس طرح بیان کیا ہے۔

اودھ کی وہ ہے ملکۂ نیک نام — وہ گل مثل طاؤس ہے خوش خرام
غضب کی ہے چتون غضب کی ہے چال — کہ ٹھوکر سے ہو کبک تک پائمال
چمن عارض سرخ سے شرمسار — وہ جوبن ہے گلشن کی جس سے بہار
فدا لالۂ سرخ اُس لال پر — بصارت تصدق ہر اک گال پر
سر زلف منہ دیکھے کالے کا پھن — غضب گات ہے اور غضب ہے بدن
جو شعلے کہوں تھیلے نور کے — تو الماس سے ہاتھ ہیں نور کے
سبر مو نہیں فرق اس بات میں — کہ بالوں سے دھوکا ہوا رات میں
سراسر کرے پیچ در پیچ ہے — شٹولا بہت جب تو وہ ہیچ ہے

پھن ہوئے نگار رنگ سے شیر مسار — فندا خال عارض پہ مشک تتار
سرافراز ہے سرو قد سے نہال — وہ اٹھڑ پنے کی غضب بول چال
وہ سرپا وہ ہے بن وسال کی — نرالی پھبن پائی ہے چال کی

بادشاہ سلامت نے عہد سلطنت کے پہلے ہی سال میں حسین اور آوارہ عورتوں سے خوب رابطہ بڑھایا۔ ارباب نشاط کا بازار ہر وقت گرم رہنے لگا در تھوڑے ہی دنوں میں اراکین دولت اور معززین سلطنت بڑے بہی وگ تھے۔ حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی جوان حسین پری پیکر خوبرو لڑکیوں کی فوج کا پورا دستہ مرتب کیا جسے قواعد پریڈ بڑے شوق اور گرمجوشی سے خود کراتے۔ فوجی قواعد کے لئے پھڑکتے ہوئے کلمات اور اصطلاحات مقرر کیں۔ "راست رو" "دست چپ بگرد"۔ نوعمر لڑکیاں رنگ برنگے ریشمین کپڑوں میں زرق برق، نازک کلائیوں اور قواعد میں عضووں کی توڑ مروڑ اور پھڑکن رنگین طبع بادشاہ کے لئے اس سے زیادہ اور کیا لطف ہو سکتا تھا۔ آئے دن دور دراز مقامات کی خوبصورت لڑکیاں نذر میں پیش ہوتیں اور سائل اپنی منہ مانگی مرادیں پاتے۔ اکثر حسین چھوکریاں خود دربار میں حاضری بجا لاکر بادشاہ سلامت کی آنکھوں میں سماجانے کی خواہشمند رہتیں۔ ان کے علاوہ باندیوں وائفوں محل میں آنے جانے والی سیکڑوں عورتوں پر عاشق ہوئے اور چونکہ مالک ملک تھے کوئی وار خالی نہ جاتا تھا۔ عشق میں ہمیشہ کامیابی حاصل کرتے درجوانی کی امنگیں اور دل کے ولولے خوب دل کھول کر نکالتے جن کی بے باکانہ رعجیب وغریب پُرلطف داستانیں خود ان کی زبان سے اُن کی نظموں اور تحریروں میں سُنی جاسکتی ہیں۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ مورخین کو اُن کا کیرکٹر سب سے زیادہ ناپاک، گندا اور تاریک بنا کر عوام کے روبرو بے دھڑک پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ اور اقراری ملزم بن کر اب تک بدنام ہیں۔ انھوں نے عیب کئے مگر ہنر کو کام میں نہ لائے۔ ورنہ ہمارا قوی خیال ہے کہ اس رنگ میں اور بھی واجد علی شاہ بہت ملکوں میں ہوئے ہیں جن کے عیوب کی جھلک تک عوام دیکھ نہیں سکے۔ اور ان کی تمام حرکات نازیبا اب تک پردۂ راز میں مخفی ہیں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ اس فارغ البالی کے زمانے میں عیاشی کا عام رواج تھا بالخصوص لکھنؤ کے گلی کوچے، بازار اور بالاخانے رنڈیوں اور کسبی عورتوں سے بھرے پڑے تھے، اور لکھنؤ میں اب بھی ان کی کون کمی ہے۔ شاعروں کی وہ بھرمار تھی کہ صرف لکھنؤ کے شاعروں کی تعداد ایک طرف اور باقی ماندہ ہند کے شاعر

ایک طرف۔ رؤسا، امراء اور وزراء کے یہاں گھر گھر رقص و ناچ، مجرے اور محفلیں ہوا کرتیں۔ نت نئی نویلی خوبرو چھیل چھبیلی طوائفیں اپنا رنگ جماتیں اور دونوں ہاتھ سے دولت بٹورتیں۔ مگر کی کوئی تقریب یا تہوار ایسا نہیں ہوتا تھا جس دن صاحب ثروت اشخاص کے وہاں ناچ رنگ اور رقص و سرود نہ ہوتی کہ میلے ٹھیلوں میں آسمان ناچ گانے کے شور و غل سے گونج اٹھتا، محفلوں کا وہ رنگ کہ چاندنی مسند، قالین، شیشہ آلات سے آراستہ و پیراستہ وہ دلہن معلوم ہوتیں کہ ہر شخص اطلس، کمخواب، مخمل اور زردوزی ریشم اور نگینے میں زرق برق خوشبوؤں سے معطر چھیل چھبیلا ہی دکھائی دیتا۔ نواب صاحب خود خوبرو، خوش جمال، قوی ہیکل تندرست اور کڑیل جوان تھے۔ مے نوشی سے کوسوں دور، منشیات سے متنفر اور بھلا ہو مقویات اور ادویات کا جن کی بدولت اُن کی جسمانی تندرستی قابلِ رشک تھی۔

سرکار عالم کو عورتوں اور ناچ گانے کے شوق کے ساتھ عمارات، وحش و طیور کا شوق بھی کچھ کم نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے نہایت عالیشان عجیب وغریب خوبصورت ایسی عمارات تعمیر کرائیں جو اپنی پاکیزگی و نفاست کے بناؤ سنگھار میں کسی طرح دلہن سے کم نہ تھیں۔ قیصر باغ کو عمارات وایوانِ دل کشا، بارہ دری، نہر و پل، سنگ مرمر و تصاویر رنگی سے مزین کیا۔ مشہور ہے کہ دو کروڑ روپیہ اس عمارت میں صرف ہوا۔ یہ عمارتیں جہاں پناہ کی پری پیکر بیگمات اور دیگر پری جمال اور ماہ طلعت مستورات سے کھچا کھچ بھری رہتیں۔ ایک عمارت کو بادشاہ سلامت نے پری خانہ کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ یہ وہی پری خانہ تھا جو اب بھی پرستان ہے۔ کچھ دن اس عمارت میں کیننگ کالج رہا۔ اب اس میں بھٹکر کالج آف میوزک ہے جہاں ہر صبح و شام پچاسیوں لڑکیاں گانے بجانے کی تعلیم پاتی ہیں جن کے نغمے واجد علی شاہ کے زمانے کے نغموں کی یاد دلاتے ہیں۔ کیسا عجیب اتفاق ہے۔

سلطان عالم نے قیصر باغ میں ہر برسات کے موسم میں ایک انوکھے میلے کی بنیاد ڈالی جو مقبول عام ہوا۔ اس میلے کی خصوصیت یہ تھی کہ خود بدولت گیروے رنگ کے تنگری کپڑے زیب تن کر کے ایک سنگ مرمر کے گول چبوترے پر رونق افروز ہوتے تھے۔ دھونی رمائی جاتی تھی۔ میلہ دیکھنے کو باغ میں وہی شخص داخل ہو سکتا تھا جو خود جوگئے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہو۔ چنانچہ ہزاروں بچے، جوان، بوڑھے جوگی بنے ہوئے میلے سے لطف اندوز ہونے کو قیصر باغ

جمع ہوتے تھے۔ بیگمات چلمنوں کے پیچھے ہنستیں کو تیں چہلیں کرتیں اور یہ رنگیلا سماں دیکھ کر خوش ہوتیں۔ کیسا عظیم الشان میلہ ہوتا۔ اور کیا پیارا سماں ہوتا کہ رعایا کو ایوانات شاہی دیکھنے اور وہاں کی چہل پہل اور فیشن پرستیوں کے اندازے کا موقع مل جاتا تھا۔ حضور پر نور کو ہندوؤں کی راس لیلا کچھ ایسی پسند آئی کہ آپ نے کرشن اور رادھکا کے ساز و نیاز اور غمزوں کے انداز پر ایک ڈراما طیار کیا جس میں خود کنھیا بنتے اور مخدرات گلبدن و سیم تن کو رادھکا اور گوپیاں بنوا کر بجواتے۔ کبھی جوشِ جوانی سے خود جوگی بن جاتے۔ موتیوں کو جلا کر خاک بنائی جاتی جو بھبوت کا کام دیتی۔ اور فقیری میں شاہی کا کرشمہ نظر آتا۔ ان دنوں لکھنؤ کے گھر گھر ہر روز عید اور ہر رات شب برأت تھی۔ فارغ البالی کا زمانہ، کھانے پینے اور سامانِ عیش و عشرت کی افراط، اس پر طرہ یہ کہ بادشاہ کے ڈھنگ پر چلنے والی رعایا شوق میں غرق عاقبت سے بے فکر آئے دن روز میلے ٹھیلے۔ محفلیں، بادِ بہاری، ہر سو لطف ہی لطف تھا۔

سرکار انگلشیہ ان باتوں کو برداشت نہ کر سکی۔ ملک میں بدنظمی ہر طرف ڈکیتی چوری کا بادشاہ پر الزام لگایا گیا اور کہا گیا کہ بادشاہ کی نظامِ سلطنت سے عدم توجہی کے باعث اڑوس پڑوس کے انگریزی علاقوں تک بر بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ جہاں جرائم کی تعداد روز افزوں ہے۔ بار بار فہمائشیں کی گئیں۔ اور بادشاہ سے سلطنت کی باگ ڈور چھین لینے کی دھمکیاں بھی دی گئیں مگر جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو بالآخر ۳ر جنوری سنہ ۱۸۵۶ء کو انتزاعِ سلطنت کا حکم سنایا گیا اور چار چھ روز کے اندر ہی اندر بادشاہ سلامت سے تمام اختیارات لے لئے گئے۔ علاقہ انگریزی قلمرو میں شامل کر کے بادشاہ کو نظر بند بنا کر کلکتے روانہ ہونے کا حکم دیا گیا۔ بادشاہ نے بہت کچھ منت سماجت کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا اس متوحش خبر سے ہر چہار سو سناٹا چھا گیا۔ لکھنؤ کا ہر گھر ماتم کدہ بن گیا۔ اور اپنے ہر دل عزیز بادشاہ پر ایسے غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑنے سے ہر شخص آبدیدہ تھا۔ گھر گھر رونا پیٹنا اور گریہ و زاری تھی۔ جس وقت بادشاہ سلامت معہ اپنی خاص خاص بیگمات اور والدۂ ماجدہ کے قیصر باغ چھوڑ کر فینس میں سوار باہر نکلے ہیں اس وقت راستے کے کوٹھے اور بالاخانے مرد اور عورتوں سے پٹے پڑے تھے۔ سارا لکھنؤ گھر چھوڑ چھوڑ کر اپنے پیارے بادشاہ کے آخری دیدار کی خاطر باشاروں، نالوں، سڑکوں اور چھتوں پر جوق جوق جمع تھا۔ کہرام سے بادل پھٹا پڑتا تھا۔ بڑھیاں چیخ چیخ کر دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں اور بر ملا پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔ فرنگیو تمہارا ناس جائیو۔ خدا تمہارا بیج ناس کر دے تمہارا نام لیوا اور پانی دیوا باقی نہ بچے۔ انگریزوں کو خوف تھا کہیں واویلا نہ ہو جائے۔ ہر دل عزیز بادشاہ کو یہ شعر پڑھتے ہوئے لکھنؤ کو خیرباد کہنا پڑا۔

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں — رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

کلکتہ پہنچ کر بادشاہ سلامت سال ڈیڑھ سال قلعہ فورٹ ولیم میں نظر بند رہے۔ جہاں بیگمات کی نشانیاں دیکھ دیکھ کر اپنے دل کو تسکین دیتے تھے۔ کیا حسرتناک وقت تھا کہ اپنی ماہ طلعت۔ نور نظر بیگمات کی یاد میں اور وطن کے تخت و تاج سے دور بادشاہ ہر وقت آہ سرد کھینچتا اور بیگمات کی نشانیاں دیکھ دیکھ کر وقت کاٹتا۔ دلدار محل نے اپنی نشانی کو متی بھیجی۔ صغری بیگم نے دلائی اور دوپٹہ۔ قیصر بیگم نے ناخنوں کا چھلا۔ معشوق بیگم نے کٹے ہوئے ناخون اور اختر محل نے زلفوں کے بال بھیجے۔ اختر محل کے یہاں سے روزمرہ ایک خوان اور پانچ گلوریاں بھی جایا کرتیں۔ بعض بیگمات نے اغماز سے کچھ نہ بھیجا۔ بادشاہ نے بحالتِ مقیدی انھیں بیس ہزار روپے نقد مرحمت کئے۔ خود لکھتے ہیں۔

نہ بھیجی کسی نے مجھے کوئی چیز — کسی نے نہ کی دوستی کی تمیز
مگر ہاں اک اختر محل ہے شفیق — وہ زنداں میں میری ہوئی ہے رفیق
وہیں ہوئے سر مجھ کو بھجوا دیئے — بنا جس طرح مجھ کو پہنچا دیئے
رکھے ہوئے سر اپنے دل کے قریں — یہ سمجھا کہ دل میں ہے وہ مہ جبیں
وہ پہنچاتی ہے مجھ کو خوانِ طعام — تو آتا ہے ہر روز اک نیک نام
عجب اس میں کیا کس کی دختر ہے وہ — وہ اختر ہے مہرِ منور ہے وہ
اسی دن کو ہیں ذی حسب کام کے — اسی دن کو ہیں خوش نسب کام کے

فورٹ ولیم سے رہائی پا کر بادشاہ کو جب مٹیا برج میں آزادی سے رہنا نصیب ہوا تو وہ پھر کھل کھیلے تمام قرب و جوار کے خطے کو گل گلزار بنا کر رشکِ ارم کر دیا۔ ہر طرف صدہا مکانات۔ محلات عالی شان کی قطار۔ ہر سو فرحت بخش باغات اور پر فضا چمن۔ تمام مکانات فرش فروش۔ سنگین آلات تعیش اور فرنیچر سے آراستہ و پیراستہ۔ رفتہ رفتہ لکھنؤ کے مصور۔ شاعر، سیٹھ۔ ساہوکار۔ مہاجن۔ طبیب نفیس۔ گویے۔ میراثی۔ خوبرو عورتیں سبھی ڈھل ڈھل کر کلکتے پہنچ گئے۔ ان کوٹھیوں اور مکانات کو آباد کر کے عجیب دلکش نظارہ پیدا کر دیا۔ مٹیا برج میں اہلِ نشاط کا دلربا گروہ پھر موجود تھا۔ اور جلا وطنی میں بھی سلطنت کے سارے لطف موجود تھے۔ خوبصورت نازنینوں کی وہ بھرمار کہ جن کی محفلوں کو دیکھ کر راجہ اندر بھی

شرماۓ۔ ایک بیاہتن رنگیلی چھبیلی چھبیلی جو بادشاہ کے زنانے میں پانی لاتی تھی تنہ ہوکر نواب آب رساں بیگم بن بیٹھیں ۔ دوسری خوبرو جوان لڑکی قوم کی خاکروبن جو حضور کے سامنے آتی جاتی تھی منظور نظر ہوئی ۔ اور متوعات میں داخل ہوکر حصفا بیگم کے خطاب سے سرفراز ہوئیں ۔ ان رنگ رنگیلی عورتوں کی نئی نئی ٹولیاں بنائی گئیں ۔ اگر ایک ٹولی کا نام نتھ والیاں تھا تو دوسری کا نام گھونگھٹ والیاں کسی کا نام رہس والیاں رکھا گیا ۔ ان کے ناچ رنگ اور مجروں کی محفلیں دن رات اپنا رنگ جماۓ رہتیں ۔ مٹیا برج کے قریب ہی بہت بڑے رقبے میں سلطان عالم نے زندہ وحش وطیور کا بڑا ذی شان چڑیا گھر قائم کیا ۔ جو عجائبات عالم سے معمور ہندوستان میں اپنا آپ ہی جواب تھا ۔ بلکہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ ایسا مکمل عجائب خانہ روۓ زمین پر شاید ہی کوئی ہو ۔ چیتل ۔ ہرن ۔ شیر ۔ ہاتھی ۔ لومڑیاں شتر مرغ ۔ فیل مرغ ۔ سارس ۔ قازیں ۔ بگلے ۔ قرقرے ۔ ہنس ۔ مور ۔ چکور ۔ صدہا قسم کی مچھلیاں اور کچھوے ۔ چھ چھ گز لانبے سانپ ۔ قریب چالیس ہزار قسم کے کبوتر ۔ ریچھ ۔ بھیڑیئے ۔ سیاہ گوش ۔ چرخ ۔ سب کی دیکھ بھال اور صفائی کا معقول انتظام کر بایدوشاید ۔ تین سو کے قریب کبوتر باز ملازم تھے جو کبوتر اڑانے میں عجیب وغریب کمال دکھاتے ۔ آٹھ سو سے زیادہ دیگر جانور باز ملازم تھے ۔ عجائب خانے کے محکمے کے علاوہ بیسیوں چھوٹے چھوٹے محکمے اور تھے بگھی خانہ یا ورچی خانہ ۔ آبدار خانہ ۔ جنس خانہ اور خدا معلوم کیا کیا تھا ۔ ایک ہزار سپاہی ۔ پانچسو سے زائد مالی ۔ تقریباً سو اہل قلم ۔ پچاس کے قریب معزز مصاحبین اور سو سے زیادہ کہار تھے ۔ ایک فوج کی فوج بیگمات اور متوعات کے رشتہ داروں کی تھی ۔ جنھیں حسب مرتبہ ماہانہ ملتا تھا ۔ یہ سارے اللے تللے بادشاہ کی تین لاکھ روپیہ ماہانہ کی پنشن سے چلتے تھے ۔ بنگالے کے لوگ حیران تھے کہ اس قلیل رقم میں یہ شان کیونکر قائم ہے ۔ خیال تھا کہ بادشاہ کو کیمیا بنانا آتا ہے ۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ بادشاہ کے پاس پارس پتھر ہے جس سے سونا بنایا جاتا ہے ۔

مٹیا برج کے باغات کی دلکش ہوا ۔ سمندر کا نظارہ ، سہاونا منظر کیا دل فریب وقت اور کیا زمانہ تھا ۔ اگر محلات کی ڈیوڑھی تک کسی کو پہنچنے کا موقع نصیب ہوتا تو اکثر ایسی دل فریب صورتیں نظر آجاتیں اور ایسی فصیح اور دلکش زبان اور مزے کی پیاری پیاری باتیں سُنائی دیتیں کہ ساری زندگی ان کا لطف نہ بھولتا ۔ مگر حیف ہے دنیا کی بے ثباتی پر کہ وہ بادشاہ جس نے قید میں سلطنت کے کرشمے دکھاۓ بالآخر چند دن کی معمولی علالت کے بعد ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء کو عمر کے ارسٹھویں سال میں اس جہان فانی سے راہی عدم ہوا ۔

کیا بادشاہ تھا ۔ جس کا ثانی ہوا ہے اور نہ ہوگا ۔ جس کے دم قدم سے لکھو کھا خلق خدا کا رزق لگا ہوا تھا ۔ جو ہر وقت بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتا ۔ خود ہنستا اور سب کو ہنساتا ۔ نظر بندی میں بھی اپنا چشمۂ فیض بدستور بلکہ اور بڑھ چڑھ کر جاری رکھا ہاۓ رے زمانے تو نے کیا کیا بستیاں مٹائیں ۔ تو نے کیا کیا جورو ستم ڈھاۓ ۔ اے زمانے ! تو کیا وہ عیش کے دن ۔ وہ سہاونے منظر وہ دل فریب صورتیں ، وہ پیارے پیارے تماشے پھر کبھی ہمیں دکھاۓ گا ۔

ٹریکٹر آپریٹروں کی تربیت کے لئے اسکول

بھوپال کے قریب بیراگڑھ کے مقام پر ایک اسکول ٹریکٹر آپریٹروں کی تربیت کے لئے کھولا گیا ہے ۔

سرکاری وغیر سرکاری شعبوں میں باقاعدہ تربیت یافتہ ٹریکٹر آپریٹروں سے کام لینے کی ضرورت ایک مدت سے محسوس کی جا رہی ہے چنانچہ وزارت زراعت نے سب سے پہلے سرکاری کام کرنے والے ٹریکٹر آپریٹروں کی تربیت کے لئے تین تین ہفتے کے دو نصابوں کا انتظام کیا ہے ۔

تربیت کا پروگرام ۔ اس تربیت کے پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ آپریٹروں کو اس لائق بنا دیا جاۓ کہ وہ ان ٹریکٹروں کو زیادہ عمدگی سے چلا سکیں جنھیں آجکل بھلت سر جنگل کی صفائی اور کانس سے اٹی ہوئی زمین کو قابل کاشت بنانے کے لئے استعمال کرتا ہے ۔ سینٹرل ٹریکٹر آرگنائزیشن کے افسران کے تعاون سے تربیت کا پروگرام مرتب ہو چکا ہے ۔ اس پروگرام کے مرتب کرنے والوں کو ٹریکٹروں کی ان پانچ بڑی بڑی ایجنسیوں کے نمائندوں کا تعاون حاصل رہا ہے ۔ جن سے حکومت نے ٹریکٹر خریدے ہیں ۔ نیز پٹرولیم اور ٹائر کی کمپنیوں کی امداد بھی شامل ہے ۔

کملا چودھری

شور

یہ نظم شریمتی کملا چودھری ممبر پارلیمینٹ کی تصنیف ہے۔ آپ ہندی کی [illegible] اور کامیاب ادیبہ ہیں۔ آپ کی یہ اُردو نظم اس لحاظ سے اور بھی زیادہ قابلِ قدر ہے کہ آپ نے اپنے [illegible] زبان میں اظہار کیا ہے جو آپ کے دائرے سے باہر کی چیز ہے۔

اُف یہ کیسی چیخ تھی جو ابر میں بیتاب تھی — آسماں پر گونج تھی اور روح تک جھنکار تھی
بادلوں کی گھڑگھڑاہٹ میں بلا کا شور تھا — بجلیوں کی چمچماہٹ، آندھیوں کا زور تھا
بادلوں سے میں نے پوچھا یہ فغاں ہے کس لئے — آسمانوں پر یہ آہوں کا دھواں ہے کس لئے
کیوں تمہاری کروٹوں میں آگ کا انبار ہے — شور یہ کیسا بپا ہے جس سے دل بیدار ہے
بادلو کیسی صبا آئی تمہاری اور سے — آج یہ پیغام وہ لائی ہے کس کی اور سے
جس کا سننا تھا کہ دل کے تار ہل کر رہ گئے — حسرتوں کے آبلے جتنے تھے چھل کر رہ گئے
جس کی تجھ کو آرزو ہے اب وہ کیا ملتا نہیں — تیری اُمیدوں کا غنچہ کس لئے کھلتا نہیں
سچ بتا ابرِ رواں تو کس لئے ہے مضمحل — شور یہ کیا ہے کہ جاگا جا رہا ہے دردِ دل

ابر نے یہ بات سن کر ایک ٹھنڈی سانس لی — جس سے میری زندگی کی شمع لَو دینے لگی
پل میں روشن ہو گئے گویا فضاؤں پر چراغ — ابرِ دل نے کروٹیں لیں جل اُٹھے سینے کے داغ
میں نے پھر بادل سے پوچھا کہ یہ کیا راز ہے — کیوں یہ تیرے شور میں اس درجہ سوز و ساز ہے
سچ بتا ابرِ رواں تو کس لئے ہے مضمحل — شور یہ کیا ہے کہ جاگا جا رہا ہے دردِ دل

میرے یہ کہتے ہی سُرخی ابر پر چھانے لگی — جس میں اک تصویر دُھندلی سی نظر آنے لگی
رُوح کے گوشوں میں پھر ہلکی صدا بہنے لگی — وہ صدائے درد آگیں مجھ سے یُوں کہنے لگی
ہاں ازل کی ہوں صدا رُوحوں کو چونکاتی ہوں میں — ایک اک ذرّے میں نغمے کی راگنی گاتی ہوں میں
دھڑکنیں ہیں میرے دل کی بادلوں کے شور میں — مَیں ہی بَن میں گونجتی ہوں کوئلوں میں موروں میں
میں ہی ان ذرّوں کے ان تاروں کے گرماتی ہوں دل — میں ہی آدم زاد کے سینے میں دھڑکاتی ہوں دل
جادۂ گل ہو، بحر و بر ہو، آسماں ہو یا زمیں — کون محفل ہے جہاں میرا دیا جلتا نہیں
[illegible] بلاتی ہوں سفینوں کو [illegible] ساحل کی طرف — کھینچتی ہوں اک نامعلوم منزل کی طرف

تلملاتی رہتی ہے دنیا میرے سوز و ساز پر
کارواں جتنے ہیں چلتے ہیں مری آواز پر

ظفر حسین خاں

دستورِ ہند کا معنوی پہلو

صورت و معنی کا امتیاز فلسفے کا سب سے اوّل اور آخر سبق ہے۔ منطق کی ابتدائی بحثوں سے نکل کر، صورت و معنی کا فرق فلسفے کا ہمیشہ ایک معرکہ آرا موضوعِ بحث رہا ہے۔ ظاہر و باطن، نقل و اصل، فریب و حقیقت کے الفاظ صرف ہماری زبان ہی پر چڑھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ جب ہم انھیں برتتے ہیں، کچھ فرق بھی محسوس کرتے ہیں۔ عامی سے عامی اور جاہل سے جاہل انسان نقلی اور اصلی چیزوں میں امتیاز کرتا ہے۔ ریگستان کا جاہل بدوی، سراب و سمندر کا فرق سمجھتا ہے۔ مطلب کی دوستی اور سچی دوستی میں امتیاز کرتا ہے۔ آپ کے سامنے اس صفحہ پر کچھ الفاظ لکھے ہوئے ہیں اور دوسری طرف ان کی سیاہی کے پسِ پشت معانی کی ایک روشن دنیا آباد ہے۔

سب سے پہلے افلاطون نے اس بحث کو چھیڑا اور عالمِ صوری کے مقابلے میں ایک دوسرا عالم یعنی عالمِ معنوی آباد کیا۔ عالمِ صوری کی حقیقت نما اشیاء کو عالمِ معنوی کی حقیقتوں کی پرچھائیاں تصور کیا اور ان حقائق کا "اعیان" نام رکھا۔ محمود، موہن، میتھیو عالمِ صوری کے باشندے ہیں، ان کا "عین" "انسانیت" عالمِ معنوی کی حقیقت ہے جس کا یہ سب پرتو ہیں۔ "انسانیت" کو محض ایک تصور یا خیال نہ سمجھئے بلکہ وہ محمود، موہن، میتھیو کا وجودِ حقیقی ہے جس کی بود و باش عالمِ صوری میں نہیں بلکہ عالمِ معنوی میں ہے۔ حقیقی فلسفی کی دلچسپی کا سامان "اعیان" ہی ہیں۔ غالب نے اسی خیال کی عکاسی یوں کی:

ترے جواہرِ طرفِ کُلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

ہماری زبان میں "عالمِ ناسوت"، "عالمِ اجسام" کے لئے اور "عالمِ لاہوت" عالمِ بالا کے لئے پہلے سے مستعمل ہیں، لیکن چونکہ ان کے معنی میں اور بہت سی باتیں آجاتی ہیں جو ہماری بحث سے خارج ہیں، اس لئے ہم عالمِ صوری و عالمِ معنوی ہی کی اصطلاحوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ عوام کی نظر عالمِ صوری تک محدود رہتی ہے۔ چنانچہ "جمہوریت" سے افلاطون نے اس کی ایک مثال دی ہے جو فلسفے کی تاریخ میں ضرب المثل ہو گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عوام کی حالت ان قیدیوں کی سی ہے جو ہمیشہ سے ایک غار میں قید ہوں اور زنجیروں سے اس طرح جکڑے ہوئے ہوں کہ گھوم کر نہ دیکھ سکتے ہوں اور صرف [illegible] سامنے والی دیوار کو دیکھ سکتے ہوں۔ فرض کیجئے کہ غار کے باہر آگ روشن ہے اور قیدیوں کی پرچھائیاں اس دیوار پر پڑتی ہیں جو ان قیدیوں کے سامنے ہے۔ چونکہ یہ قیدی تمام عمر پرچھائیاں ہی دیکھتے رہے ہیں، اس لئے وہ انھیں کو حقیقت سمجھتے ہیں۔ فلسفہ ان کو اس قید و بند سے رہا کر کے آفتاب کی روشنی میں لاتا ہے جس سے ابتداً ان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ حقائق پر نظر جمنے لگتی ہے لیکن کبھی کبھی ہوشیار سے ہوشیار کا پاؤں اس طرح پھسل جاتا ہے کہ وہ پھر اپنے کو غار میں پاتا ہے۔ انسانی ذہن کی انھیں بلندیوں اور پستیوں کی جانب اکثر شعرا نے لطیف پیرائے میں اشارے کئے ہیں چنانچہ سعدی فرماتے ہیں۔

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

اقبال نے اسی حقیقت کو دوسرے انداز سے یوں کہا:

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

الحاصل صورت و معنی کا فرق ہماری حیات کے ہر گوشے میں کارفرما ہے، چنانچہ دستورِ ہند بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ جہاں تک نظم و نسق کا تعلق تھا دستور کو کما حقہٗ طور پر حاصل ہو چکی۔ معماروں نے اس کو

بطورِ ضمیمہ شائع کیا، مقالے لکھے گئے، ریڈیائی تقریریں ہوئیں اور اس کی "تمہید" Preamble کو تو ملک بھر کے اسٹیشنوں، سرکاری دفتروں پبلک مقامات پر چسپاں یا آویزاں ہے۔ لہٰذا صوری حیثیت سے دستور کے تعارف میں کوئی کسر باقی نہیں رہی لیکن معنوی حیثیت سے اُس سے واقفیت اور عدم واقفیت میں شاید تھوڑا ہی سا فرق ہے۔ اگر عوام دستور کی معنوی اسپرٹ سے بے بہرہ رہے تو آئندہ معاشرت کا خاکہ جو اس کے صفحات کے دامن میں پوشیدہ ہے اپنے کاغذی پیرہن میں ہماری غفلت شعاری کا نقشِ فریادی ہی بنا رہے گا۔

اس لئے شدید ضرورت ہے کہ مختلف زبانوں کے ذریعہ اس کے معنوی پہلو کی جانب رجوع کریں تاکہ سماج اس کا منشا صحیح صحیح سمجھ سکے اور پھر اس کو پورا کر سکے۔ اگر آپ دستور کو بالاستیعاب پڑھیں اور سب پڑھنے کے بعد اس کی تمہید پھر پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دستور کے مقاصد کا سارا سمندر اس کوزے میں بند ہے۔ لہٰذا بحث کے آغاز سے قبل ہم اس کا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں تاکہ وہ پیشِ نظر رہے۔

تمہید

"ہرگاہ کہ ہم ہندوستان کے لوگوں نے سنجیدگی کے ساتھ
یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کو خود مختار دستوری جمہوریت
بنایا جائے اور اس کے کل شہریوں کو عدل (معاشی،
اقتصادی و سیاسی) حریت (خیال، بیان، یقین و
اعتقاد و پرستش) مساوات (مرتبہ و موقع) بہم پہنچائی
جائے اور ان کے درمیان اخوت کو ترقی دی جائے
تاکہ افراد کی منزلت اور قوم کا اتحاد قائم ہو۔ لہٰذا آج
۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو اپنی دستور ساز مجلس میں اس دستور کو
منظور و وضع کر کے ہم اسے جاری کرتے ہیں۔"

اس تمہید سے صاف ظاہر ہے کہ ساری دستور کی عمارت چار ستونوں پر قائم ہے یعنی عدل۔ حریت۔ مساوات اور اخوت۔ لہٰذا ان چاروں اصولوں کو سمجھنا دستور کی معنوی اسپرٹ سمجھنے کا ضامن ہے۔ اگر کوئی چاہتا ہے کہ ان تصورات کا اُن کے تاریخی پس منظر کے ساتھ مطالعہ کرے اور عہد بہ عہد انسانی خیال کی ترقی کے ساتھ ان تصورات کے معانی کے اندر جو وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی ہے اُس کی سیر کرے تو اس کو جرمن فلسفی آئسلر Eisler کی مشہور عالم (Worterbuch Der Philosophischen Begriffe) (فرہنگ تصورات فلسفہ) کی جانب رجوع کرنا چاہئے جس کی تینوں جلدیں اپنی اشاعت کی تاریخ سے آج تک فلسفے کے ہر محقق کی زینت کار ہیں۔ افسوس ہے اس کتاب کا جرمن سے کسی دوسری زبان میں ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ اس مضمون میں سہولتِ فہم اور ان تصورات کے نفسِ مفہوم کو سمجھنے کے لئے صرف ان کے نمایاں خصوصیات کے اظہار پر اکتفا کیا جائے گا۔

سب سے پہلے ہم عدل کو لیتے ہیں۔ قدیم یونانی خیال کے مطابق جس کے مخصوص نمائندے انکسامینڈر اور ہیراقلیطس ہیں۔ ہر شے کے کچھ دائمی اور مستقل حدود ہوتے ہیں۔ ان حدود کے اندر رہنا عدل اور ان سے تجاوز کرنا عدم عدل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان حکماء کے نزدیک عناصر کے درمیان ایک طویل جنگ جاری ہے۔ آگ۔ پانی اور مٹی۔ ہر عنصر چاہتا ہے کہ اپنا دائرۂ حدود وسیع کرے۔ لیکن فطرت کا زبردست ہاتھ اُن کو اپنی حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کچھ دیر پہلے آگ کا زور شور تھا وہاں راکھ کا ڈھیر عنصر خاک کی فتح کا اعلان کر رہا ہے۔ حدود کے اندر رہنے کا تصور افلاطون بلکہ ارسطو تک عدل کا نفسِ مفہوم رہا ہے۔ چنانچہ افلاطون کی جمہوریت جس کا موضوعِ بحث ہی تمام تر عدل ہے۔ اور جس کی ماہیت کے خد و خال اُجاگر کر کے دکھانے کے لئے افلاطون نے اپنی تصویر کے لئے ایک خیالی ریاست کا وسیع اور کشادہ چوکھٹا منتخب کیا ہے، سماج کو تین طبقوں میں تقسیم کرتی ہے۔ (۱) محافظین یعنی حکمراں (۲) سپاہی اور (۳) مزدور پیشہ و تجارت پیشہ لوگ۔ اب عدل یہی ہے کہ وہ اپنا اپنا کام بہ احسن وجوہ انجام دیں اور دوسروں کے کام میں مداخلت نہ کریں۔ اسی مثال پر افلاطون روح کی تین قوتیں قیاس کرتا ہے۔ ایک عقل، دوسری عزم اور تیسری خواہشات اور ان کے باہمی توازن و ہم آہنگی کو عدل کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔

ارسطو کے نزدیک غلامی کی رسم عدل کے منافی نہیں تھی اور [illegible]

اس کے فلسفے کی جان ہے۔ بنتھم کے نزدیک یہی عدل ہے۔ عدل میں مساوات کا مفہوم بنتھم Bentham کے زمانے یعنی اٹھارہویں صدی عیسوی میں داخل ہوتا ہے۔ اس سے قبل ارسطو کا نظریۂ عدل ہی مانا جاتا تھا اور برابری عدل کا جوہرِ خاص سمجھا جاتا تھا۔

بنتھم کے مقلد افادی فلسفیوں کے نزدیک عدل کی کسوٹی یہ ہے کہ بہبود کی زیادہ سے زیادہ مقدار انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے لئے حاصل کی جائے۔ چنانچہ جب دو شخصوں کے مفادات میں تصادم ہو اُس وقت دیکھنا چاہئے کہ کس عمل سے زیادہ سے زیادہ مفادِ عام کا امکان ہے۔ پس وہی طریقِ عمل اختیار کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ جس طریقِ عمل پر کاربند ہونے سے بہبود کی فراوانی حاصل ہوتی ہے اس سے دونوں فریق بحصۂ مساوی مستفید ہو سکتے ہیں۔ کانٹ نے انسان کو انسان کا منتہائے نظر قرار دے کر مساوات کے مفہوم کو اور وسعت دی۔ چنانچہ حقوقِ انسانیت اور وقارِ انسانی کے نظریوں کی بنیاد کانٹ کے فلسفۂ عدل ہی پر ہے۔ اس فرق کو نمایاں کرنے کے لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ یونانی فلسفیوں کا سماجی تصور عمودی تھا اور افراد کے رشتوں میں پستی اور بلندی کے قائل تھے۔ اُن کے نزدیک فرقِ مراتب مسلّم تھا۔ غلام، غلام رہنے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا تھا۔ ہر نظامِ فلسفہ کے اندر جہاں اگر اجزا انقلابی اور مروجہ سماج کے علی الرغم اصلاحات کے حامل ہوتے ہیں وہاں کچھ اجزا ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں سماج کے مسلمات کا پرتو نظر آتا ہے۔ یہ مسلمات ضرور ایسے ہوتے ہیں جو سماجی ذہن پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں اور فلسفی کا نکتہ بیں ذہن بھی اُن کو مسلمات مان کر آگے بڑھتا ہے۔ یونانیوں کا سماجی تصور عمودی تھا۔ چنانچہ اس آئینے میں عدل بھی عمودی [illegible] اور فلسفۂ [illegible] نے فرقِ مراتب کی شکل اختیار کر لی۔

عمودی سماج کے نظریے کے برعکس افقی سماج کا نظریہ ہے جو سماج کے نشیب و فراز کو ہموار کر کے ساری انسانیت کو ایک سطحِ فرش پر جمع کرتا ہے جس میں مراتب کی بلندی و پستی کی ذراسی شکن بھی گوارا نہیں کی جا سکتی۔ بعض کے نزدیک یہ سب منظر کا پھیر ہے۔ گھڑی کو کھڑا کر دیا تو اس کے سب پرزے عمودی سمت میں چلنے لگیں، لٹا دیا تو افقی سمت میں گردش کرنے لگیں۔ جس نے کھڑی گھڑی کا تصور کیا وہ عمودی رفتار کا قائل ہو گیا جس نے لیٹی گھڑی کا تصور کیا وہ افقی رفتار پر ایمان لے آیا۔ بہر طور تاریخی حیثیت سے مروجہ عدل کا نقطۂ نظر یہ افقی ہے اور یہی ہمارے نزدیک عدل کا جوہرِ خاص ہے۔ چنانچہ دستورِ ہند میں عدل کا مخصوص مفہوم مساوات کے تصور ہی میں مضمر ہے۔

حریت اور عدل میں اس معنی کر کے فی الجملہ تضاد ہے کہ حریت روک ٹوک سے عبارت ہے اور عدل، قانون کی شکل میں طرح طرح کے قیود اور پابندیاں عاید کرتا ہے۔ سکندرِ اعظم کے وقت کے بعد سیاسی آزادی چھن جانے کا ردِ عمل تاریخِ عالم میں نہایت شدید ہوا۔ جس کے علمبردار کلبی Cynics اور رواقی Stoics فلسفی ہوئے۔ سترہویں صدی میں حریت کی تحریک نے ایک باقاعدہ شکل اختیار کی۔ ابتداءً اس کی مخالفت کا موضوع مذہب تھا جس کے نام پر صلیبی لڑائیاں لڑی جاتی تھیں۔ اور بے گناہوں کو دار پر چڑھایا جاتا تھا۔ اس تحریکِ حریت کے دامن کی پناہ میں تجارت اور سائنس نے خوب ترقی کی، اور اٹھارہویں صدی میں امریکہ اور فرانس کی تحریکِ آزادی، اسی تحریکِ حریت کی آوازِ بازگشت ثابت ہوئی۔

اسی زمانے کا ایک معرکۃ آرا سیاسی مقالہ "معاہدۂ عمرانی" کے نام سے مشہور ہے، جو روسو کے انقلابی قلم کا ایک نقش ہے۔ روسو نے انفرادی آزادی کو سماجی آزادی میں ضم کر دیا۔ چنانچہ فرانس کے مشہور اعلانات جو ۱۷۸۹ء اور ۱۷۹۳ء میں حقوقِ انسانی کے متعلق کئے گئے ان کی بنیاد "معاہدۂ عمرانی" ہی پر ہے۔

بنتھم فرانس کی تحریکِ آزادی سے متفق نہ تھا۔ چنانچہ وہ ان "اعلاناتِ حقوق" کے متعلق کہا کرتا تھا کہ یہ سر تا سر "مابعد الطبیعاتی" اور محض خیالی ہیں جنھیں واقعیت سے کچھ لگاؤ نہیں، وہ کہتا تھا کہ ان اعلانات کے دفعات تین قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ جو سر تا پا مہمل ہیں۔ دوسرے وہ جو محض غلط ہیں تیسرے وہ جو مہمل اور غلط دونوں ہیں۔ چنانچہ اس کے نظریے کے مطابق حکومت کے چار مقاصد ہیں (۱) خوراک کی افراط (۲) عام خوش حالی (۳) حفاظت (۴) مساوات۔ بنتھم کے فلسفے میں حریت کا کہیں ذکر نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انقلابِ فرانس سے پہلے کے زمانے کے خود مختار بادشاہوں اور [illegible]

کی فیاضیوں کو محفوظ یا نقصان رکھتا ہے۔

موجودہ زمانے میں انفرادی آزادی کی مقدار پیمانہ کی طرح ہے کہ جس قدر قلیل ہے اسی قدر گراں بہا ہے۔ انفرادی آزادی اور حکومت کے قانون میں ہمیشہ تصادم رہا ہے۔ مہاتما گاندھی نے اس کا حل عدم تشدد کے نظریے میں تلاش کیا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ عدم تشدد پر عامل شخص حکومت کے لئے زیادہ تردد کا باعث نہیں ہوتا لیکن بعض صورتوں میں اس پر بھی پابندیاں لگانا ہی پڑتی ہیں۔ بہرطور حریت کے موجودہ مفہوم کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں کہ ہر شخص اپنے نجی خیالات اور ذاتی عقائد کے باب میں آزاد ہے اور ان کا اظہار بھی کرسکتا ہے۔ حتیٰ کہ حکومتِ وقت کے اعمال پر آزادی کے ساتھ نکتہ چینی کرسکتا ہے۔ انفرادی آزادی کے لئے ایک شرط ضرور ہے اور وہ یہ کہ نقضِ امن نہ ہو جس سے دوسروں کی آزادی میں فرق آئے۔

حریت پرستی کا سب سے زہریلا عنصر ہوسِ دیگرے نیست کا خیال ہے۔ جو ملک و قوم کے کروڑوں افراد کی تعداد سے ضرب دئے جانے کے بعد مطلق العنانی کے دیو کی شکل میں رونما ہوتا ہے، جو کسی دوسری سلطنت کو خطرے میں نہیں لاتا۔ چنانچہ ہر ریاست کے سر پر مطلق آزادی کا بھوت سوار ہے۔ اور اُس کا اُتار وہی افسوں ہے جو ریاست کے مقابلے میں انفرادی آزادی پر دم کیا گیا تھا یعنی جس طرح انفرادی آزادی ریاست کی ہیئتِ اجتماعیہ میں ضم کردی گئی، اسی طرح مختلف ریاستوں کی آزادی ایک عالمگیر بین الاقوامی ریاست کی آزادی میں غرق کردی جائے تاکہ آئے دن کی باہمی جنگیں اور اتلافِ جان و مال جو قومی آزادی کا لازمی نتیجہ ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہوجائیں۔ رفتہ رفتہ عوام کا خیال اس جانب مائل ہو رہا ہے کہ قومی آزادیاں کو ایک عالمگیر ریاست کے اختیار میں دے دیا جائے جو ریاستوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں آزاد ہو۔ یہی عالمگیر حریت کا تصور ہے جو شاید تصورِ حریت کے ارتقاء کی تیسری آخری اور سب سے اعلیٰ شکل ہے۔ پہلی شکل انفرادی آزادی تھی۔ دوسری قومی آزادی اور تیسری یہ عالمگیر آزادی۔ چنانچہ ترقی پسند نظامِ اخلاق کا تقاضا اسی اعلیٰ معیارِ حریت کا پابند ہے جس کے اندر انفرادی و قومی آزادی کو فنا کر دیا گیا ہو۔

طاقت میں آتا ہو نہ دلچسپی کی ہاتک   دوسرے میں اول وہ کوئی لیکر حیثیت کو

ہندوستان تنہا وہ ملک ہے جو عدم تشدد پر ایمان رکھتا ہے، اور جس کے رہنماؤں کا نصب العین امن و امان اور اس کی عملی شکل میں ایک عالمگیر ریاست کا قیام ہمیشہ رہا ہے۔ دستورِ ہند پر ایک عام اعتراض یہ ہے کہ اُس نے صوبے کی حکومتوں (ریاستوں) کی آزادی سلب کرکے اُن کا گویا ملکوں کے درجے میں تنزل کردیا ہے۔ اصل میں اس پالیسی کے اندر حریت کا وسیع نظریہ اپنی پوری توانائی کے ساتھ کارفرما ہے۔ اس لئے کہ آخری منزل میں خود حکومت ہند اپنی آزادی کو ایک عالمگیر حکومت کے دیوتا کے سامنے قربان کرنے کے لئے تیار رہے۔ چنانچہ دستورِ ہند کی حریت کو اس کے تمام و کمال معنوی روپ میں دیکھنے کے لئے اسی نظریے کی خوردبین استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

حریت جب تک خوردبینی کی رسم و راہ ترک کر بین الاقوامی اقتدار کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرے گی جنگ کے شعلوں سے انسانیت سینۂ کائنات کا آبلہ ہی بنی رہے گی۔ بس وقت کے سوال کو مٹا کر ایک مرکزِ خیال پر قائم ہونا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم   ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

مساوات سے تصدیق ہمیں یہاں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ اوپر عدل کی تحلیل میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ عدل کے مفہوم کا جزو لاینفک ہے۔ تاریخ فلسفہ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر حکماء مساوات کے مسئلے پر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک وہ جو چند کے پاس دار رہیں، اور دوسرے وہ جو کثرت کے فدائی و طرفدار ہیں۔ اوّل الذکر طبقے کا سب سے بڑا فلسفی نیٹشے ہے، جو شکتی کا پیرِ اوّل ہے۔ آخر الذکر طبقے کا مارکس ہے جس کا نظریہ اشتمالیت **Communism** اور اشتراکیت **Socialism** کی شکلوں میں دنیا کے سامنے پیش ہے۔ دستورِ ہند میں مساوات اسی پورے اشتراکی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس کی رو سے ہر شہری برابر ہے۔ چنانچہ دستور میں انتخابات کے لئے سرمایہ داری کا معیار نہیں اختیار کیا گیا ہے۔ بلکہ ہر عاقل و بالغ اپنے اپنے ملک کے گورنمنٹ بنانے میں اپنی رائے کا آزادی کے ساتھ (ووٹ کی شکل میں) اظہار کرسکتا ہے۔

اخوت یعنی ہر شہری کا دوسرے شہری کو اپنا بھائی سمجھنا، دستور کی محراب کا کلیدی پتھر ہے۔ غور کیجئے تو ساری عمارت اسی ڈاٹ پر قائم ہے۔

عدل جو ہمدردی سے متصف ہو۔ مساوات جس کی بنیاد بھائی چارے پر ہو۔ حریت پرستی جس پر عذبۂ اخوت حاوی جو حقیقت میں جس معاشرت کی ترکیب یہ ہو۔ اس کا دوسرا نام زمین پر بہشت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر اخوت کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہی مساوات کا تصور ہے، جو اوپر مذکور ہوا جس پر اب محبت کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ علاوہ ازیں ہم اوپر یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ مساوات، عدل کا مرکزی تخیل ہے۔ لہٰذا مساوات، اخوت، اور عدل یہ تینوں ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں۔ اور اپنے درمیان ایک زبردست معنوی اتحاد رکھتے ہیں۔ انفرادی اتحاد رکھتے ہیں۔ انفرادی آزادی البتہ ایک نزع کشمکش تصور ہے، جو ماہرین سیاست کا ہمیشہ درد سر رہا ہے۔ لیکن اخوت کی آگ میں پگھل کر یہ بھی موم ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے اگر حریت کی باہر سے بادواد پذیرائی ہو اور خود اس کے اندر برادرانہ طاقت موجزن ہو تو حریت کی قلب ماہیت ہو گئی یا نہیں۔ اس کی سختی نرمی میں اور اس کی بیگانگی یکسر ملنساری پیار اور محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے یا نہیں؟ حریت اپنا جوہر آزادی قائم رکھتے ہوئے معاشرتی زندگی کے دیگر مطالبات و ترغیبات میں گھل مل کر عمرانی تاج کا وہ درخشندہ ہیرا ہے جس کی ضوفشانی میں آزادی کی چھوٹ کے ساتھ پابند معاشرت برادری کی دمک بھی پائی جاتی ہے۔ جو عزت نفس و اتحاد قومی کو باہم سمو دینے کا دوسرا نام ہے جس کا مذکورہ دستور کی تمہید میں ایک معیاری خیال کے طور پر کیا گیا ہے۔

یہاں تک عدل، حریت، مساوات اور اخوت کے تصورات کی تحلیل منطقی اصول پر کی گئی۔ لیکن یہ سوال کہ سماج کی بنیاد ان تصورات پر کس طرح قائم ہو۔ ہم کو منطقی حدود سے اخلاق و تربیت کے میدان میں لے آتا ہے، جہاں عدل، حریت، مساوات اور اخوت کے نام تصورات کے بجائے فضائل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مضمون ہذا کے باقی ٹکڑے میں ہم اُن کو فضائل اربعہ کے نام سے تعبیر کریں گے۔

ظاہر ہے اگر ہم سماج کے اندر ان صفات کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان فضائل کی داغ بیل افراد کی سیرت میں ڈالنا ہوگی جس کا واحد وسیلہ تعلیم و تربیت ہے اور جو طریق کار اس سیرت کی تشکیل کے لئے اختیار کیا جائے گا۔ اس کی توجیہ ایک نفسیاتی بحث کی محتاج ہے لیکن چونکہ یہ طریق کار اس قدر بدیہی ہے کہ دلیل کی حاجت نہیں۔ اس سے ہم اس کی نفسیاتی توجیہ کو نظر انداز کر کے براہ راست تعلیمی پروگرام پیش کرتے ہیں۔

(۱) ہر مدرس کا فرض ہے کہ اپنے ہر شاگرد کو یہ سمجھے کہ گویا وہ ری پبلک کا آئندہ پریسیڈنٹ ہونے والا ہے۔ اس اعلیٰ نصب العین کے تحت جب تعلیم ہوگی تو بچوں کے اندر خودداری پیدا ہوگی، اور اُن کی تمام جسمانی و روحانی قوتیں پورے کمال کے ساتھ بیدار ہو سکیں گی۔

(۲) ہر طالب علم کے ساتھ مساوی سلوک ہونا چاہئیے۔ عدل، مساوات، حریت اور اخوت اسکول کے ماحول کے اربعہ عناصر ہونا چاہئیں۔

(۳) اسکول کی دیواروں اور نمایاں مقامات پر ایسی تختیاں اور تصویریں آویزاں ہونا چاہئیں جن کا موضوع ہمارے "فضائل اربعہ" ہوں، اسکول کی مہر اور کاپیوں کے سرورق کا امتیازی طغرا دیدہ زیب طریق پر یہی فضائل ہونا چاہئیں۔

(۴) اسکول شروع ہونے سے پہلے انہیں فضائل پر مختلف پیرائے میں روزانہ تقریریں ہونا چاہئیں۔

(۵) ہر اسکول میں طلبا کی پارلیمان اور اس کی کابینہ ہونا چاہئیے کابینہ کے وزرا کا اسکول کی گورنمنٹ میں ہاتھ ہونا چاہئیے۔ مثلاً وزیر غذا کا یہ فرض ہونا چاہئیے کہ وہ دوپہر کے ناشتے کا انتظام کرے اور طلبا کو اپنی نگرانی میں ناشتہ تقسیم کرائے۔ وزیر داخلہ اسکول کے ڈسپلن کا ذمہ دار ہو۔ اس طرح کابینہ کے ممبروں میں ذمہ داری کے احساس کی نشو و نما ہوگی۔ اور پارلیمان کے ذریعے سے اپنے خیالات آزادی کے ساتھ ظاہر کرنے اور دوسرے کے آزاد خیالات رواداری کے ساتھ سننے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

(۶) ہر اسکول میں ایک عدالت بھی ہونا چاہئیے جس میں طلبا جج کی حیثیت سے نقض ضبط اور دیگر قواعد مدرسہ کی خلاف ورزیوں کے متعلق فیصلہ کریں۔ اس سے بچوں میں احساس عدل کی تربیت ہوگی۔

(۷) اخوت کی تربیت، اسکول کے کلبوں، کھیل تماشوں، پارٹیوں اور قومی تہواروں کو یکجائی طور پر منانے کے ذریعے سے دی جائے، فرقہ وارانہ جذبات کا اظہار، تعزیرات مدرسہ کا سب سے بڑا جرم سمجھا جانا چاہئیے، اور اس کے مقدمات اسکول کی عدالت میں سماعت اور فیصلہ کے لئے جانا چاہئیں۔

(۸) دستورِ ہند کی تعلیم ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے ہونا چاہیئے۔

(۹) تاریخ مذاہب بھی ایک مضمون کے طور پر پڑھانا چاہیئے تاکہ جملہ مذاہب کے اساسی اصول کا اتحاد طلبار کو معلوم ہو۔

(۱۰) فضائل اربعہ میں عدل، حریت، مساوات اور اخوت پر اخلاقی اسباق مرتب کرنا چاہئیں، اور ہر درجے کے لڑکوں کی قابلیت کے لحاظ سے جداگانہ پیرایۂ سبق اختیار کرنا چاہیئے۔

(۱۱) مختلف درسی مضامین کے ذریعے سے بھی ان فضائل کو ذہن نشین کرانا چاہیئے۔ مثلاً تاریخ وادب سے ان فضائل کی مثالیں اخذ کی جائیں، اور فلسفے اور سائنس کی تعلیم سے آزادیِ خیال و استقامتِ رائے میں بالیدگی پیدا کی جائے۔ جغرافیہ سے انسانی برادری کا خیال مستحکم کرنا چاہیئے۔ وقس علیٰ ھذا۔

(۱۲) بچوں کی تعلیم کے ساتھ بالغوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہونا ضروری ہے۔ سوشل تعلیم کا ایک مستقل محکمہ قائم ہونا چاہیئے جس کے مقامی اساتذہ سوشل درس گاہوں میں تعلیم دیں۔ اور دورہ کرنے والا عملہ جابجا سوشل مضامین پر لیکچر دے۔ ریڈیو پر تقریریں کرے اور فلم دکھلائے۔ نشر و اشاعت کے دوسرے وسائل بھی اس کام کے لئے استعمال کرنا چاہئیں۔

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ عبوری دور میں جس میں قومی تعمیر و تشکیل کی مشین کے کل پرزے درست کئے جائیں گے۔ اگر دستور کے مصنفین ہی اس پر عمل درآمد کرنے والے رہیں تو زیادہ مناسب ہے کہ تصنیف یا مصنف نیکو کند بیان۔ لیکن یہ سیاسی میدان ہے جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ ایک معلم دُوری سے معاملے کے تاریخی اقتضا کی معنوی سمت کی جانب اشارہ کر سکتا ہے اور بس

اثر لکھنوی

جوئے شیر

آنند نرائن مُلّا لکھنؤ کی متحدہ ہند و مسلم تہذیب و معاشرت کی یادگار ہیں۔ پیکرِ خلوص و مجسمۂ اخلاق۔ وہ لوگ جن کی آغوشِ عاطفت میں مُلّا نے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا، اپنے اپنے عقائد میں پختہ ہوتے ہوئے بھی مذہب سے قطعاً خالی الذہن ہو کر انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھتے تھے اور یہی اُن کی دوستی اور باہمی محبت و مودّت کا معیار تھا۔ یہ رشتۂ اتحاد و ارتباط اتنا مضبوط ہوتا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اُسے توڑ نہ سکتی تھی۔ یہ دوستی اتنی پختہ اور پائدار ہوتی تھی کہ زمانے کا کوئی تغیر اُس کے نقوش مٹا نہ سکتا تھا۔ آہ ؎

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں (سودا)

اب دوستی کیسی، دوستی کا لفظ بھی کہنہ و فرسودہ ہو گیا، اور اس کا بدل کامریڈشپ یا رفاقت بربنائے مصلحت ہے ؎

کام سے کام پھر نہیں کچھ کام   اب یہی رسم دوستداری ہے

یہی نہیں بلکہ گزشتہ انسانیت دوستی پر رجعت پسندی کا لیبل یا لائبل لگایا جاتا ہے! وائے بر ما و گرفتاری ما!

آغاز ۱۹۳۹ء میں چکبست ڈے کے موقع پر میں نے ایک مقالہ پڑھا تھا جس کے چند جملے یہ تھے۔

"آج چکبست ہم میں نہیں ہیں۔ مگر دل گواہی دیتا ہے کہ جس طرح لکھنؤ کی ادب سرشت زمین اور بشن نرائن در مرحوم کی تربیت و پرداخت نے ہم کو چکبست سا شاعر اور ادیب دیا، چکبست کی ادبیت اور شعریت مزید رنگینیوں اور گہرائیوں کے ساتھ آنند نرائن مُلّا میں جلوہ گر ہو گی......"

آج میں پھولا نہیں سماتا کہ میری پیش گوئی حرف بحرف صحیح نکلی۔ اور آنند نرائن مُلّا کا مجموعۂ کلام تمام صوری و معنوی خوبیوں کے ساتھ "جوئے شیر" کے نام سے "آنکھ کی ٹھنڈک اور کلیجے کی ٹھنڈک" کا مصداق ہے۔ اس مجموعے میں جو تقریباً چار سو صفحات پر ختم ہوتا ہے غزلیں، نظمیں، رباعیاں سبھی کچھ ہے، اور جو کچھ ہے وہ بقول نظیری ؎

ز فرق تا قدمش ہر کجا نظر فگنم   کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

مطالب و معانی کی خوبی و گیرائی کے ساتھ ساتھ زبان بھی اپنے جوہر دکھا رہی ہے۔ اسلوب ادا کے انوکھے پن سے کہیں کہیں اجتہادی شان پیدا ہو گئی ہے۔ منتخبہ اشعار میں اس کی مثالیں جابجا ملیں گی۔ سلیقۂ نظم اور انتخاب الفاظ کا سگھڑاپا قدم قدم پر دعوتِ نظر دیتا ہے۔

لذیذ حکایت شروع کرنے سے پہلے ایک تلخ حقیقت کا اظہار میرا فرض ہے۔ "جوئے شیر" میں خال خال زبان اور بیان کی خامیاں بھی نظر آئیں۔ نیز بعض ایسے اشعار ہیں جو شامل نہ کئے جاتے تو اچھا تھا۔ مگر ان امور پر کچھ وضاحت سے لکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔ جب مُلّا کے علم میں ہوتے ہوئے بھی وہ اُن کو دور کرنا نہیں چاہتے "کیونکہ اپنے ذوق کو مروجہ اصول شاعری پر ترجیح دیتے ہیں" وہ جانیں اور اُن کا کام۔ لیکن میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شاعری کو حتی الامکان ایسے اسقام سے پاک ہونا چاہئیے۔ شعر کہنے کے بعد اُس پر غور کرنا اور مانجھنا معیوب نہیں۔ بلکہ مستحسن ہے۔ بڑے بڑے شاعروں نے (ایک کے بھی) ایسا کیا ہے اور اس شبہ پر کہ "ذوق" کے پردے میں سہل انگاری کی ریشہ دوانی تو نہیں کسی ناقد نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ "شاعر کو محض اپنے خیالات کا بندہ نہ ہونا چاہئیے۔ بلکہ اُن خیالات کو محسوس بھی کرنا چاہئیے۔ یعنی اُس کے اعلیٰ درجہ ذہنی عمل میں اُس کا دل، اُس کا دماغ اور اُس کی روح مکمل طور پر شریک کار ہوں۔ تاکہ وہ خیالات سامع تک اس طرح

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔ قیمت پانچ روپے

بیٹھیں گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی "۔ بالفاظ دیگر شاعر میں یہ قدرت ہونا چاہیئے کہ اپنے مکمل ذہنی تجربے کو الفاظ سے اس طرح منسلک کردے کہ وہی کیفیت پڑھنے والوں پر طاری ہو۔

غیر صاحب۔ "تھا جنونِ عشق کا یہی تقاضا، ہوگیا!"

ابتدا "جوئے شیر" کے زیرِ عنوان اس قطعہ سے ہوتی ہے جس میں مُلّا کے مطمحِ شاعری کا لب لباب ہے۔

گر توں کو تھامے جو وہ کفِ دستگیر لا — تقدیرِ شب میں صبح کی روشن لکیر لا
مرہم نہیں نظر میں تو نشتر زنی نہ کر — یا تیشہ لے نہ ہاتھ میں یا جوئے شیر لا

اس کی بلاغت و معنویت کا کیا ٹھکانا ہے۔ "جوئے شیر" کی رمزیت درد اور مداوائے درد، محنت اور صلۂ محنت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ "خطِ ابیض" کی قدیم اصطلاح صرف ایک محدود خیال کی حامل تھی، اس کی جگہ "روشن لکیر" نے (حالانکہ خطِ ابیض کا قریب قریب لفظی ترجمہ ہے) کیا کیا نورانیت بکھرائی ہے اور معنی میں کس قدر وسعت پیدا کی ہے۔ اس میں تقدیر یا نوشتۂ تقدیر کا مفہوم بھی سما گیا۔ کیونکہ پیشانی کی لکیر بھی "قسمت کا لکھا" سمجھی جاتی ہے (یعنی) "خطِ ابیض" سپیدۂ سحر یا پَو پھٹنا ہے اور بس۔ "روشن لکیر" تقدیرِ شب کو جگاتی اور ضمیرِ شب کو منوّر کرتی ہے، تاریکی کو پیامِ نور اور نویدِ بصیرت و بصارت دیتی ہے۔ "روشن لکیر" اور "جوئے شیر" میں کیسا لطیف ربط، کتنی دلکش مماثلت ہے۔

قطعہ جدید اور قدیم شاعری کا فرق بھی نمایاں کرتا ہے۔ وہاں گرتے ہوؤں پر کفِ افسوس ملنا اور اُن کے ساتھ اظہارِ ہمدردی تھا۔ مگر اُن کے تھامنے اور منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہونے کی سعی و تدبیر نہ تھی بلکہ منزل تک متعین نہ تھی۔ جدید شاعری میں (کم سے کم مُلّا کی شاعری میں) دونوں باتیں موجود ہیں۔ یہی قطعہ نام نہاد ترقی پسند یا من مانے اصول اشتراکیت کی مبلغ شاعری کے مردہ دفنا دینے کو بھی کافی ہے۔ اس شاعری میں نشتر زنی اور جراحت ریزی تو ہے مگر مرہم یا اندمالِ زخم کی فکر مقصود ہے۔ تخریب ہی تخریب ہے۔ تعمیر کا شان گمان بھی نہیں۔ حالانکہ تیشہ زنی یا سخت کاوش اور محنت و مشقت کا مقصد جوئے شیر لانا یا زندگی کی توانائی اور برکتوں کو عام کرنا ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے جانکاہی درکار ہے نہ کہ جاہلوں اور نادانوں کی تربیت بغیر اُن کے بہیمی جذبات کو برانگیختہ اور قتل و غارت مطلق العنانی پر آمادہ کرنا اور نفرت کی آگ بھڑکانا تاہم یہ نعرہ لگانا کہ ہم عالمگیر امن کا پرچار کرتے اور دنیا بھر کو امن و امان کا پیغام دیتے ہیں۔ مارکسیت اور لیننزم انہیں خدا کو ماننا اور مذہب کا پیرو ہونا کفر ہے۔ ہندوستان میں مذہب سے الگ قومیت کا تصور وہم فلط کا بکا فریب ہے۔ ایسی حالت میں یہاں اشتراکیت کے راگ الاپنا شورِ بے ہنگام سے زیادہ نہیں۔ تحریک بالفرض کامیاب ہوئی بھی تو "پھول جیسیر چڑھتے" کے بجائے خون میں تربتر ہوں گے۔ صلح و عافیت کے بدلے درندگی برسرکار ہوگی اور بستیاں "رمنے" بن جائیں گی۔ کیونکہ مطلب ہے کھُل کھیلنا، اور چلّاتے ہیں آزادی کے لئے (License they mean when they cry for liberty) (Milton) ناآڑی کی بندوق، مزدور کا کندھا، اللہ اللہ خیر سلّا۔

دوسرا قطعہ شعر کی ماہیت پر روشنی ڈالتا ہے۔

کھینچتی ہے زندگی احساسِ شاعر پر نقوش — پھوٹتی ہیں جن سے کرنیں ہر دل پر پڑے
نطق اُڑا لیتا ہے ان کرنوں کا اک عکسِ لطیف — اور انہیں پرچھائیوں کا نام مُلّا شعر ہے

اس کا موازنہ آتش کے قطعہ سے کیجئے، اور دیکھئے کہ شاعری کے تخیل اور تصور میں کتنا فرق ہوگیا ہے اور یہی صحیح معنوں میں جدید ترقی پسندانہ شاعری ہے۔

کھینچ دیتا ہے شبیہ شعر کا خاکہ خیال — فکرِ رنگیں کام اُس پر کرتی ہے پرداز کا
بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں — شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش کے یہاں شاعری کا عمل یکسر داخلی ہے۔ خیال تحریک و تشکیلِ شعر کا باعث ہوتا ہے۔ مُلّا کے بموجب اس کا آغاز بیرونی اثرات سے ہوتا ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو یا واقعہ شاعر کی حسّاس طبیعت کو متاثر کرتا ہے اور یہ اثر اتنا گہرا ہوتا ہے کہ بیاضِ دل و دماغ پر اس کے نقوش مرتسم ہو جاتے ہیں۔ یہ نقوش چونکہ سطحِ احساس پر ہیں، اور یہ سطح جذباتی ہے۔

(The "field" is emotional)

لہٰذا جامد نہیں بلکہ متحرک اور ضیابار ہوتے ہیں، ان سے کرنیں پھوٹتی ہیں جن کی چھوٹ ذہن اور دل پر متواتر پڑتی رہتی ہے۔ نطق ان کرنوں کو اُڑا کر یا چُرا کر اپنی آرائش کرتا، نیز دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے اور ایک حد تک انعکاس میں کامیاب ہوتا ہے۔ نطق کے پردۂ سیمیں پر یہی نظر آنیوالی

Field سپر یا ڈھال کا سطح جس پر ازمنۂ وسطیٰ (یورپ) میں مختلف امتیازی نقوش کندہ ہوتے تھے اور ان میں رنگ آمیزی بھی ہوتی تھی۔ یہ مفہوم Chivalry سے مختص ہے۔ (اشر)

پرچھائیاں شاہد ان شعر ہیں اور اُن کی خاموش نغمگی کو حیات و آہنگ بخشنے والی شاعر کی روح پر ور قوت و قدرت گویائی ہے۔ تاہم بیکس دھندلا دھندلا ہوتا ہے کیونکہ شاعر محسوسات کی مکمل و باآب و تاب مصوری میں ناکام رہتا ہے۔ قوتِ نطق شدتِ احساس کا ساتھ نہیں دے سکتی، پھر بھی سامع کے ذوق و وجدان کو چھیڑ کر ایک نغمے کی صدائے بازگشت بن جاتی ہے یہیں سے ایک دوسری بہتم بالشان ہستی کا انکشاف ہوتا ہے۔ شاعر کے خیال کی اُس جذبے سے شیفتگی و وابستگی لازم ہے جو اس خیال کو وجود میں لایا اور جس کی تکمیل بعد ازاں خیال نے کی، لہٰذا خیال کا شعر کی شکل میں اپنی پوری رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہونا اس امر پر منحصر ہے کہ پورا ذہنی تجربہ یعنی خیال اور اُس کا جذباتی پس منظر بیک وقت الفاظ میں سمٹ آئے۔ یہ بھی دھیان رہے کہ مُلاّ کے قطعہ میں لفظ زندگی اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے، یہ زندگی مسلسل و بے پایاں عظیم و جاوداں ہے۔ وہ زندگی نہیں جو موجودہ دور میں چند بندھے ٹکے موضوعات میں گھر کر رہ گئی ہے جس کی نمایاں خصوصیت جنسی بھوک اور "بلبلاہٹ" "غارزہرہ کا طواف" ورنہ "ماری جو رہیا" ہے۔

اُردو زبان سے مُلاّ کو کس قدر اُنس ہے، اس رُباعی سے ظاہر ہوتا ہے۔

اک موت کا جشن بھی منالیں تو چلیں — پھر پونچھ کے اشک مسکرالیں تو چلیں
آ، تجھکو گلے لگا کے میٹھی اُردو — اک آخری گیت اور گالیں تو چلیں

"جوئے شیر" کی ترتیب بھی دل پذیر ہے۔ ابتدا میں پروفیسر آل احمد سرور کا "دیباچہ" ہے۔ مجھے اُن کے فرمودات سے بہت کچھ اختلاف ہے۔ مگر مُلاّ کے پاسِ خاطر سے فی الحال ان امور پر خامہ فرسائی سے باز رہتا ہوں۔

مُلاّ کی زبان (گنتی کے مستثنیات کے علاوہ) لکھنؤ کی صاف ستھری زبان ہے جس میں سادگی و نفاست کے باوصف تازگی و توانائی ہے۔ مثال میں خود سرور صاحب کے بعض نقل کردہ اشعار غزل لے لیجیے۔

بشر کو مشعلِ ایماں سے آگہی نہ ملی — دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی
لبوں پہ پھیل گئی آکے موجِ غم اکثر — بچھڑ کے تجھ سے ہنسی کی طرح ہنسی نہ ملی
ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظامِ چمن — فسردہ غنچوں کو جس میں شگفتگی نہ ملی
وہ قافلے کہ فلک جن کے پاؤں کا تھا غبار — رہِ حیات سے بھٹکے تو گرد بھی نہ ملی

وہ تیرہ بخت حقیقت میں ہے جسے "مُلاّ"!
کسی نگاہ کے سائے میں چاندنی نہ ملی

یہ زبان جس میں موجِ نسیم کی مستی و مست خرامی ہے۔ یہ لہراتی، بل کھاتی، سٹتی پھیلتی رو، یہی لکھنؤ کے بیٹل کلچر کی یادگار ہے، وہی معشوقۂ طنازِ ہے جس کی مشاطگی آتش اور انیس کے واسطے سے چکبست نے لی۔ اگر دل میں اُمنگ اور جذبات میں ہیجان ہے تو خیالات اس رچی ہوئی زبان کے سانچے میں ڈھل کر اُبی تلوار یا دو آتشہ شراب بن جاتے ہیں۔ اگر جذبات میں تڑپ اور گہرائی نہیں ہے تو فقط زبان کا چٹخارا رہ جاتا ہے۔

مُلاّ اردو اور فارسی کے ماسوا انگریزی کے بھی عالم ہیں۔ تعصب سے بری ہیں۔ اور دردآشنا دل رکھتے ہیں۔ ہر حقیقی شاعر کی طرح (قدیم و جدید کی قید نہیں) اپنے ماحول سے متاثر اور اپنے زمانے کے احوال و آثار کے ترجمان ہیں، تاہم جو کچھ ہے دہان شعر و نغمہ میں ہے۔ چیرپھاڑ کی میز پر مجھے نشتر کاٹ کے نہیں رکھتے۔

کتاب کی تدوین سے اندازہ ہوتا ہے کہ مُلاّ کی شاعری کا آغاز ۱۹۲۶ء میں ایک نظم سے ہوا جس کا عنوان ہے "پرستارِ حُسن"۔ اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں تلاشِ حُسن ودیعت ہے، اور اس کا منشا حُسنِ مطلق تک رسائی ہے۔ انسان ناکام رہتا ہے، کیونکہ عقل و دانش کی رہبری میں اس منزلِ دشوار تک پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن جہاں عقل کی تگ و دو ختم ہوئی اور وجدان سے کام لینا شروع کیا۔

"میں نے جس صورت میں چاہا تیری صورت دیکھ لی"

حُسن سے میری غرض جز خوبیٔ صورت نہیں — جز پرستش کے مرے دل کو کوئی حاجت نہیں
گرمیٔ شوق و تمنا سے مجھے رغبت نہیں — حُسن کے بندے جو ہیں وہ بندۂ الفت نہیں
پاک نیت ہو تو جھگڑے عشق میں پڑتے نہیں
شمع کی اُلفت میں پروانے کبھی لڑتے نہیں

میرا ذوقِ شعری کہتا ہے کہ نظم کو یہیں ختم کر دینا چاہیئے تھا۔ مندرجۂ ذیل بند کے اضافے نے اس کی قدر بڑھائی نہیں بلکہ کم کر دی۔

حُسن جس پر ختم ہو ایسی تو صورت ہی نہیں — جو نہ ہو محوِ طلب انساں کی فطرت ہی نہیں
ہر نہ گلشن میں جو آوارہ وہ نکہت ہی نہیں — ایک کی ہو کر رہے جو وہ طبیعت ہی نہیں
دل ہے شیدائے چمن اس کی محبت عام ہے
شہد کی مکھی ہے یہ ہر گل سے اس کو کام ہے

کاش اس میں "شہد کی مکھی" کا ٹکڑا نہ ہوتا، اس کے ہوتے حُسن سے کیف ہونے

کے عوض مخلوط ہونے کا خیال الگ نہیں کیا جا سکتا۔ غیر یہ ابتدائی نقوش ہیں۔ ۱۹۴۶ء کی یادگار دو نظمیں اور ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء کا یکجائی کلام ہے اور ۱۹۵۰ء لغایت ۱۹۵۰ء کا علٰحدہ علٰحدہ ہے۔ غزلوں کے اشعار کا ایک مختصر انتخاب حاضر ہے۔

غمِ حیات شریکِ غمِ محبت ہے ملائے ہیں کچھ آنسو بھی شراب کے ساتھ

غمِ حیات کا رونا سبھی نے رویا ہے۔ مگر شعر کے اندازِ بیان نے اس کو بالکل نیا کر دیا ہے۔ غمِ محبت میں شراب کی کیفیت ہے جس میں غمِ حیات نے تلخی گھول دی ہے۔ دوسرے شعر میں اس کا مداوا بتایا ہے کہ اوروں کا تڑپنا دیکھ کر تڑپو اپنا غم بھول جاؤ گے۔

اپنا درد دل سمجھنے کی یہاں فرصت کسے ہم تو اوروں کا تڑپنا دیکھ کر تڑپا کئے

ایک اور شعر۔

مرغِ آزاد اسیروں کو حقارت سے نہ دیکھ اُن کی طاقت بھی ترے بازوئے پرواز میں ہے

اس کی اشاریت بڑی معنی خیز ہے۔ آزاد اور محکوم، مختار اور مجبور اقوام و افراد کی حالت کا موازنہ و مقابلہ کرتے جایئے۔ سب کی شرح ملے گی تفصیل کی گنجائش نہیں۔

عالمگیر اخوت کا معیار اس شعر میں ہے۔

میں فقط انسان ہوں، ہندو مسلماں کچھ نہیں میرے دل کے درد میں تفریقِ ایماں کچھ نہیں

اس میں "میرے درد دل میں" کا ٹکڑا خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی جہاں تک انسانیت اور ہمدردی کا سوال ہے مذہب کی تفریق نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اس سے الگ اپنے اپنے مذہب اور عقائد پر قائم رہنا چاہیئے۔ یہی نکتہ ہے جسے نظر انداز کر کے خود فریبی مذہب سے بیگانہ یا لامذہب ہو جانے کی تلقین کرتی اور خود غرضی و نفس پرستی کی طرف لے جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خالی خولی زبانی جمع خرچ رہ جاتا ہے۔ ملّا کی تربیت جس ماحول میں ہوئی اُس نے یہ بلیغ ٹکڑا "میرے دل کے درد میں" اضافہ کرا دیا۔ ملّا مایوس نہیں اور توقع ہے کہ ایک دن ارتباطِ ملک و ملت عالمگیر ہو جائے گا ؎

بڑھے گا سلسلہ جب ارتباطِ ملک و ملت کا تو اس زنجیر کو اک روز عالم گیر دیکھیں گے

مجھے سرور صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ ملّا کے عشق میں وہ چمک دمک اور سپردگی نہیں جو جوش اور جگر کی یاد دلاتی ہے ..... ملّا کو جدید عاشق کی بے باکی نہیں آتی ..... اُن کا عشق ذرا سنبھلا ہوا مہذب عشق ہے۔ دقیقہ رس نگاہوں میں عشق کا نصب العین ایک شورشِ بے مدعا رہا ہے اور رہے گا۔ باقی جو کچھ ہے وہ بوالہوسی ہے یا بے حیائی ہے۔ ملّا نے یہی بلند معیارِ عشق اس مطلع میں پیش کیا ہے ؎

رمزِ الفت مثلِ میرے کوئی سمجھا ہی نہیں آج تک میں نے اُسے جی بھر کے دیکھا ہی نہیں

یا

تم جس کو سمجھتے ہو کہ ہے حُسن تمہارا مجھکو تو وہ اپنی ہی محبت نظر آئی

یا

نازو انداز نے شوخی نے نہ رعنائی نے حُسن کو حُسن کیا چشمِ تماشائی نے

یہاں خود حسن بھی عشق کا ایک ثمرہ ہے اور یہاں حیا کی و سپردگی کی گفتگو فضول ہے۔ اجتماعِ ضدین سے قطع نظر شاعر کا عشق بقول ملّا "نذرانۂ روح" ہے۔ جہاں یہ کیفیت ختم ہوئی اور حصولِ تمنا کی طرف قدم بڑھا عشق فنا ہوا جنسی خواہشات کی تسکین اور "دو دل ہوئے راضی تو کیا کرے گا قاضی" اس کے دائرے سے خارج ہیں۔ "ملیاتی لذتیت" سے اُسے کوئی سروکار نہیں۔ میرے مروضے میں قدیم یا جدید شاعری کی قید نہیں بیشتر انگریزی شاعری اور ناولوں کا مطالعہ بھی بتاتا ہے کہ معیارِ عشق اضطراب و التہاب و تشنگی ہے بمقدور ہوتے ہوئے بھی مقدور نہ ہوتا۔ مجھے مسرت ہے کہ ملّا نے ترقی پسندی کا سرٹیفکٹ "عطائے تو بلقائے تو" کہہ کر واپس کر دیا، اور اس مشورے پر بھی عمل نہ کیا کہ سوویٹ روس کے حلقہ بگوش ہو جائیں اور دوسرے نام نہاد ادیبوں اور شاعروں کی طرح اپنی شخصیت اور شاعری کو آزادی کے نام پر غلامی کی تبنیت میں دے دیں۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ:۔

"آخر میں ترقی پسند کس طرف سے ہو گیا؟ نہ تو میں مزدور کو فرشتۂ رحمت سمجھتا ہوں، نہ مزدور راج قائم کرنے کے لئے کشت و خون کی ترغیب دینے ہی کو شاعری کا اصل مقصد قرار دیتا ہوں۔ رہ گئی انسان دوستی تو اب یہ بھی مخصوص حلقۂ ادب میں جس پر لیبل کی مہر لگی ہے مشکوک نگاہوں سے دیکھی جانے لگی ہے"

آئیے ہم آپ ملّا کی غزلوں کے مزے مزے کے شعر سنیں۔ ایسی فضا میں سانس لیں جو کثافت اور کدورت سے پاک ہے۔ نظموں پر لکھنے کے لئے زندہ رہا تو پھر کبھی وقت نکالوں گا۔

تو خفا اور بہار کے دن ہیں اے ظالم یہ پیار کے دن ہیں

عہدِ شوخی کسی کا ختم ہوا — نگہِ شرمسار کے دن ہیں
میکشوں نے پی کے توڑے جام ہے — ہائے وہ ساغر جو رکھے رہ گئے
کانٹے سے کم خلش ہر نہیں وہ نظر مگر — جس کی جگہ ہو دل ہی اور کا نشا کا ہے
قفس کی تیلیاں سب شاخِ گل بن جائینگی — جو نظر ہی ہے، ابھی تک وہ بہار آئی نہیں

دل میں جہاں کھٹک سی رہ رہ کے ہو رہی ہے
شاید رُکی سی دم بھر اُن کی نظر یہیں پر

عرشِ بریں پہ چمکا آج اور اک ستارہ
کس نے خلوصِ دل سے سر رکھ دیا زمیں پر

مے رنگیں پسِ مینا سے اشارے کرتی — ایک دن ساغرِ رندانِ بلا نوش میں آ
نظامِ دہر کی بنیاد اس اصول پہ ہے — کہ اس میں فرد تو فانی ہو، انجمن باقی
اک ربطِ باہمی کا جو امکاں نہ ہو سکا — گل جمع بھی ہوئے تو گلستاں نہ ہو سکا

وہی ہے مردِ رہرو خارزارِ زیست میں جس نے
ذرا آسان تر پہلے سے راہِ کارواں کر دی

دونوں کو ساتھ گوندھ سکیں جب تو لطف ہے
اک تارِ زندگی کا لیں اک دل کا تار لیں

تُو نے پھیری لاکھ نرمی سے نظر — دل کے آئینے میں بال آ ہی گیا
آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار — گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی

تڑپ شیشے کے ٹکڑے بھی اڑا لیتے ہیں ہیرے کی
محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی

شبِ غم بھی بہک اٹھی خیالِ دوست کے صدقے
ہر اک آنسو کے قطرے میں مجھے بوئے گلاب آئی

یہ بھی درکار ہے رعنائی گلشن کے لئے — وہ جو یاد دیں اسیروں کے اک انگڑائی ہے

آخری مصرع پر ہزاروں دیوان قربان۔ کتنے ہی شہ پارے چھوٹ گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملّا نے اپنے لئے غزل اور نظم دونوں اصنافِ سخن میں ایک نیا راستہ نکال لیا ہے، اور اُن کے کلام میں وہ سب کچھ ہے جو اچھے کلام میں ہونا چاہیے، اور اس کے سوا کچھ اور۔ چنانچہ خود ہی کہتے ہیں اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ؎

وادیٔ شعر میں یہ جادۂ ملّا ہی نہ ہو
اک الگ ہٹ کے نشانِ کفِ پا ہے تو سہی

ایک اور چراغ گُل ہو گیا

حیف صد حیف کہ حضرتِ ناطق لکھنوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ کیسی عبرتناک صورتِ حال ہے کہ مولانا صفی کی موت پر رونے والی آنکھیں ابھی خشک نہیں ہونے پائی تھیں کہ مزید اشکباری کے واسطے یہ سانحہ پیش آگیا۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

اس سیاسی گرداب اور اس عمرانی بحران میں کسی کو پتا بھی نہیں چلتا کہ کون صاحبِ کمال دم توڑ رہا ہے، اور کون صاحبِ کمال رخصت ہو گیا۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام

حضرتِ ناطق جس علمی و فنی تبحر کے مالک تھے، اُس کی نظیر اب کہیں نہیں مل سکتی۔ ایک زمانے میں جب کہ انتقاد کا یہ انداز نہیں تھا، حضرتِ ناطق کی تنقیدیں حکمِ ناطق کی طرح مانی جاتی تھیں، اور اس سلسلے میں جو کچھ اُن کے قلم سے نکل جاتا تھا، اربابِ ادب اُسے ایک سند سمجھ کر سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔

کس قدر قلق کی بات ہے کہ ہماری قدیم بساط کے مُہرے ایک ایک کر کے اُٹھتے چلے جا رہے ہیں، اور نئی نسل میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اُن کی خانہ پُری کر سکے۔

کس سے کہوں ان جانے والوں کو دیکھ دیکھ کر میرا دل کیا کہتا ہے۔

بُوئے گل و رنگِ گُل ہوتے ہیں ہوا دم میں
کیا قافلہ جاتا ہے، ٹک تُو بھی چلا جاتا

جوش

ذکر و فکر

محمد علی خاں اثر رامپوری

یادِ جاناں بھی ہے یادِ غمِ ایام کے ساتھ — زندگی کٹتی ہے آرام سے آلام کے ساتھ
یہ تو ممکن ہی نہیں دل سے بھلاؤں تجھ کو — جان ہی جسم میں آتی ہے ترے نام کے ساتھ
دل کو بخشا ہے محبت نے فنا کا وہ مقام — اک قدم چل نہ سکا گردشِ ایام کے ساتھ
عزم محکم، دلِ مضطر، طلبِ منزلِ صدق — کارواں چلتا ہے گویا مرے ہر گام کے ساتھ
جب تھا آزاد تو وقعت نہ تھی آزادی کی — یہ تصور ہوا پیدا ہی اثر دام کے ساتھ

نریش کمار شاد

کوئی الم کا نشانہ نہ کوئی خوشی کا شکار — کسی کو راس بھی آیا ہے زندگی کا شعار
الم کشانِ محبت جو غور سے دیکھیں — نشاطِ حسن کے رُخ پر بھی ہے الم کا غبار
نگاہِ ناز تری سحر کاریوں کی قسم — ترے سکوت پہ ہے کیفِ نغمگی بھی نثار
دلوں میں یوں ترا احساس جاگ اٹھتا ہے — خموش رات میں جس طرح بج رہا ہو ستار
زمیں سے تا بہ فلک اٹھ رہے ہیں ہنگامے — یہ عصر نو بھی کسی شوخ کی ہے رہگزار
ترے جمال کی ٹھنڈک بھی سرد کر نہ سکی — غمِ حیات کے شعلے، غمِ جہاں کے شرار
یہ زندگی ہے کوئی دل فریب خواب نہیں — کرے تو کوئی کہاں تک حقیقتوں سے فرار

محمد جعفر حیات۔ فرزند حضرت عزیز مرحوم

نامرادی ہے نوجوانی ہے — یہ اجل ہے کہ زندگانی ہے
سُن کے روئے جسے زمین و فلک — ہمنشیں وہ مری کہانی ہے
نگہِ واپسیں ٹھہر کہ انہیں — شکوۂ مرگِ ناگہانی ہے
مجھ کو رسوائے دہر کر ڈالا — آپ ہی کی یہ مہربانی ہے
سبق آموزِ عالمِ فانی — میری ہی مرگِ ناگہانی ہے
تنگ آ کر حیات دنیا سے — میں نے مرنے کی جی میں ٹھانی ہے

خواجہ اسد لکھنوی

ان کے آنے میں بہت دیر ہے یا تھوڑی دیر — اے ہوا شمعِ سحر کو نہ بجھا تھوڑی دیر
دلِ مایوس کو ہوتا جو یقینِ تاثیر — ہم بھی کرتے کبھی تکلیفِ دعا تھوڑی دیر
آپ جب آئے تو دنیا نے ہمیں پہچانا — ایک کہرام جنازے پہ رہا تھوڑی دیر
عمر بھر کے ستم و جور و تغافل کے بعد — کاش کرتا کوئی تھوڑی سی وفا تھوڑی دیر
آنسوؤں آنکھ سے ہے پاس مرے تا دمِ چند — جس طرح کیفِ مئے ہوشربا تھوڑی دیر
لہٰ اسد کاتبِ تقدیر سے یہ پوچھے کوئی — مرے مٹنے میں بہت دیر ہے یا تھوڑی دیر

میر غلام رسول نازکی

اسرارِ ہست و بود کا محرم رہا ہوں میں — یعنی مدارِ گردشِ عالم رہا ہوں میں
ایسے بھی دل ہیں جن میں خلوص و وفا نہیں — ایسے ہی دل ہیں جن میں بہت کم رہا ہوں میں
جب سے کسی کی زلفِ پریشاں میں گم ہے دل — دنیا کے ہر مذاق سے برہم رہا ہوں میں
جنت کا رنگ ہیں ہوں جہنم کی آگ میں — رنگینیٔ فسانۂ آدم رہا ہوں میں

کلیم۔ لکچرر اردو اینگلو عربک کالج غازی پور

جو عدو ہے خود اک جوبن کو اس جسم کا دل کو کہے — تکلیف میں راحت ملتی ہے تسکین کا ساماں کون کرے
آنے کو بہار آتی ہے اگر اب کے بہار آ کوئی کہے — توہینِ جنوں تو ہو ہی چکی توہینِ گریباں کون کرے
یہ ہوش کی تلقین آج کے حسن بیگانے پہ رہنے دے واعظ — اب ایسے جنوں کے موسم میں اندیشۂ داماں کون کرے
معلوم ہے کوہِ سینا پر جو کچھ کہ کلیم کا حشر ہوا — جب سامنے ہی ہے جلوے کی دیدار کا ارماں کون کرے

طیب تنویر۔ ترچناپلی

میں تو کب کا مر چکا اُن کے لئے اپنے لئے — اور ہوں زندہ ابھی تو صرف اوروں کے لئے
منزلِ مقصود پر میں خود پہنچنے سے رہا — کر رہا ہوں رہبری تو صرف اوروں کے لئے
غم کے سانچے میں ڈھلے خوشیاں تھیں اک مدت ہوئی — اب جو ہے لب پر ہنسی تو صرف اوروں کے لئے
دل لگا کر میں نے جو پایا ہے وہ مجھ سے پوچھ — کر رہا ہوں دل لگی تو صرف اوروں کے لئے

محمد منشاء الرحمٰن خاں

آؤ خلوصِ دل سے یہ پیماں کریں گے ہم — جب تک ہے جان خدمتِ انساں کریں گے
علم و ہنر سے کر کے زمانے کو روشناس — ہر دردِ لاعلاج کا درماں کریں گے
خونِ جگر سے جان بہاروں میں ڈال کر — صحنِ چمن کو خلد بداماں کریں گے
تاریکیٔ حیات مٹانے کے واسطے — سینوں میں شمعِ عشق فروزاں کریں گے
حسنِ عمل کو اپنے بنائیں گے لاجواب — پیدا دلوں میں جذبۂ ایماں کریں گے
آفاتِ جاں گداز سے کھیلیں گے رات دن — دل کو حریفِ گردشِ دوراں کریں گے
رکھیں گے اپنے آپ کو مصروفِ جستجو — قلب و نظر کی عید کے ساماں کریں گے
اب خار و گل میں کوئی رہیگا نہ امتیاز — گلشن میں عام فیضِ بہاراں کریں گے
عزمِ بلند اور رہینِ قیود ہو؟ — برپا ہر ایک قطرہ میں طوفاں کریں گے

ظفر الاسلام بی اے

نہ سحر خیز تبسم نہ فسوں ریز نظر — تیری مانگ اور ہے کچھ تیرا خراج اور ہے کچھ
نہ تھرکتی ہوئی ساقی نہ چھلکتے ہوئے ساز — غمِ دنیا تری تلخی کا علاج اور ہے کچھ

کے۔ ایل۔ ثاقب

فرائیڈ کے نظریات

تحلیلِ نفسی[1] کے جنم داتا اور معروف ترین ماہر ڈاکٹر سگمنڈ[2] فرائیڈ کا نام ترقی یافتہ طبقوں میں اس قدر مشہور ہے۔ کہ کسی مزید تفصیلی تعارف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تاہم اُن حالات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جن میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے پرورش پائی کیونکہ "ہر انسان اپنے ماحول کا نمائندہ ہوتا ہے" اور ماحول کے اثرات سے ہی اس کے خیالات اور ہیجانات کی تعمیر ہوتی ہے۔ جو بعد میں اس کے ذاتی فلسفۂ حیات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر فرائیڈ ۱۸۵۶ء میں آسٹریا کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہُوا۔ تحصیلِ علم کے بعد اُنیسویں صدی کے اواخر میں جب اُس نے اپنی طبی پریکٹس شروع کی تو یورپ ایک ایسے دَور سے گذر رہا تھا۔ جسے بجا طور پر انحطاط اور زوال کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ سرمایہ دارانہ اِس وقت، جاں بلب سا تھا۔ بے روزگاری اور آفاقی بے چینی کا دَور دَورہ تھا۔ تمام پیداواری امکانات سلب ہوتے جا رہے تھے۔ سارا برِّاعظم ایک بہت بڑی اقتصادی کشمکش میں مُبتلا تھا۔ عوام کی اخلاقی حالت، مالی حالت سے بھی بدتر ہو چکی تھی۔ لوگ طرح طرح کی جسمانی، ذہنی، اور جذباتی بیماریوں میں مُبتلا ہو رہے تھے۔ سماج کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جنسی عوارض کی کثرت تھی۔ لوگ ہر طرح کی جنسی اُلجھنوں میں گرفتار تھے۔ اور ڈاکٹروں کی جانب رجوع کرتے تھے۔ اِس قسم کے دَورِ انحطاط میں ڈاکٹر فرائیڈ نے اپنی پریکٹس کی بنا ڈالی۔ اور اپنی دُوربین اور مُبصّر آنکھوں سے جو کچھ دیکھا۔ اسے اپنے علم و عمل میں شریک کر لیا۔ اُس کا منطق منفرد حالات سے ہمہ گیر نتائج اخذ کرتا چلا گیا۔ جو بہت حد تک، اُس وقت بھی، دلچسپ، نادر، مجیر العقول بلکہ ناقابلِ قبول ہونے لگے تھے (۱) اور آج بھی نصف صدی کے بعد، اگرچہ ان کی ندرت اور دلچسپی میں سرِ مُو فرق نہیں آیا، تاہم اُن کو بہ اعتبارِ اتمام حرزِ بازو نہیں بنایا جا سکتا۔

اُنیسویں صدی کے آغاز میں ہی ڈاکٹر فرائیڈ کی تحریروں اور تقریروں نے مُفکرینِ عالم کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ فرائیڈ کے نزدیک ہر انسان ایک خفیف ذہنی حجاب، اعصابی عارضے، یا جنسی اُلجھن میں گرفتار رہتا ہے۔ اور اُس کا ہر فعل اسی مذکورہ بیماری ہی کی وجہ سے سرزد ہوتا ہے۔

فرائیڈ کے اپنے متعلق بھی بعض مؤرخین کا قول ہے۔ کہ وہ خود ایک اعصابی مریض تھا۔ چونکہ فرائیڈ کے مفروضے، تمام تر "جنسیات" اور "غیر شعوری حجاب" ذہنی پر مبنی ہیں، غالباً یہ مؤرخین اپنے اس دعوے سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کہ ساون کے اندھے کو سب کچھ ہرا ہی ہرا معلوم پڑتا ہے!۔

بہرکیف ان مؤرخین کے اس عقیدے کی تردید یا تائید بہت مشکل ہے لیکن فطرت کی ستم ظریفی، اس کے علاوہ، فرائیڈ کی زندگی کے دیگر پہلوؤں سے بھی نمایاں ہے۔ مثلاً سماج کی تنظیم کے متعلق فرائیڈ کا یہ خیال تھا کہ کسی جماعت کی تنظیم صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اس جماعت کے سب افراد اپنے لیڈر کو وہی درجہ دیں۔ جو بچے اپنے گھر میں "باپ" کو دیتے ہیں۔ فاشزم کی بنیاد بھی کم و بیش انھیں اصُول پر رکھی گئی ہے۔ فرائیڈ کا یہ نظریہ یورپ میں بہت مقبُول ہُوا اور اسی کے زیرِ اثر جب موجودہ صدی میں، جرمنی میں، ایک ایسے "باپ" نے جنم لیا تو فرائیڈ کی ساری قوم یہود کو

یا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے!

والا معاملہ پیش آیا۔ اور بارہ ہزار پونڈ زرِ فدیہ کے عوض ڈاکٹر صاحب کی جان بخشی ہو سکی!!

ڈاکٹر فرائیڈ کے نظریات جس قدر انوکھے ہیں۔ اسی قدر دلچسپ اور فکر آموز بھی ہیں۔ "جنسیات" کا ذکر فرائیڈ کے مطالعے میں اکثر و بیشتر

ا۔ Psycho-Analysis

۲۔ Dr. Sigmond Freud

آتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ اصطلاح بہت وسیع اور مبہم ہے۔ وہ جنسیات سے وہ جبلی قوت مراد لیتا ہے۔ جس کا تعلق ہر قسم کی محبت سے ہے۔ ایک بچہ اپنے آپ کو (یعنی اپنے جسم اور اپنی ذات کو) پیار کرتا ہے۔ اسی طرح اس کے والدین اس سے پیار کرتے ہیں۔ اور وہ بھی اُن سے محبت کرتا ہے۔ وہ اپنے دیگر اعزہ سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔ غرضیکہ ہر قسم کے یہ تعلقات ایسی جنسی لذت کے مظہر ہیں۔ جسے "جنسیات" کا نام دیا جاتا ہے۔ فرائیڈ اسے انسانی زندگی کا "سنگِ بنیاد" قرار دیتا ہے۔ اگر یہ جذبہ کسی وجہ سے ہماری زندگیوں سے خارج کر دیا جائے۔ تو فرائیڈ کے نزدیک، زندگی موجودہ رنگ میں تو نظر نہیں آسکیگی۔ "جنسیات" سے ہمارے تمام افعال و اعمال کی تحریک ہوتی ہے۔ اور اس تحریک کی غیر حاضری میں دُنیا عشق کی رعنائیوں، جنگ کی لذتوں، آرٹ کی دلفریبیوں، ریسرچ کی رنگینیوں، غرضیکہ ہر شعبۂ حیات کی سب دلکشیوں سے محروم ہو کر رہ جائے گی۔

فرائیڈ کے نزدیک جنسی نشو و نما کی تین منزلیں ہیں:-

پہلی منزل: یعنی پیدائش سے پانچ سال کی عمر تک۔ اس عمر میں بچہ اپنے آپ پر عاشق ہوتا ہے۔ اور خود ہی اپنا مرکز ہوتا ہے۔ اس لئے یہ منزل بہت ہی اہم ہے۔ اور فرائیڈ کے نزدیک اس عمر کے بعد انسانی نشو و نما میں کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوتی۔ بعد کے تجربے، سابقہ تجربوں کا محض ردّ عمل یا ان کی مسخ شدہ صورت ہی ہوتے ہیں۔ انسان بقایا عمر میں بچپن کے ان تجربات کو محض دہراتا ہی رہتا ہے۔ ان تاثرات پر نہ سماج کا اثر ہوتا ہے۔ اور نہ ہی ماحول کا!!

یہ نظریہ، ہر ذی ہوش انسان کو کسی قدر عجیب بلکہ مضحکہ خیز معلوم ہوگا لیکن ڈاکٹر فرائیڈ کے پاس اس نظریئے کے جواز میں بہت مضبوط دلائل موجود ہیں۔ جن کو بخوفِ طوالت، ہم قلم زد کئے دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ نادر نظریہ کہ اسی عمر میں بچے کے دل میں اپنے باپ کے خلاف جذبۂ رقابت پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ محسوس کرتا ہے۔ کہ اس کے جنسی ہیجانات کی تشفی کا ذریعہ اس کی والدہ ہے۔ لیکن اس کا والد اس پر حاوی ہے۔ اور وہ اپنی بیچارگی کے باعث اس کے سامنے معذور ہے! لڑکی کے محسوسات اس سلسلے میں لڑکے سے قدرے مختلف ہوتے ہیں جب وہ اپنے اور اپنے بھائی کی جسمانی ساخت میں فرق معلوم یا محسوس کرتی ہے تو اپنی ساخت میں کچھ ایسی خامیاں پاتی ہے۔ کہ اس کا جذبۂ رقابت بدل جاتا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو بطور جماعت اپنے بھائی کی جماعت (یعنی مردوں) سے کمزور تصوّر کرنے لگتی ہے۔

دوسری منزل:- پانچ سے بارہ سال تک جنسی لحاظ سے اس دوران کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ اور بہر طور یہ وقفہ غیر اہم ہے۔

تیسری منزل:- بارہ سے اٹھارہ سال تک اس منزل میں بچپن کے تمام رجحانات ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ ان کا ہی از سرِ نو اعادہ ہوتا رہتا ہے۔ انسانی چلن جو اس وقت اپنی پختگی کے قریں ہوتا ہے۔ دراصل بچپن ہی کے محرکات کا رہونِ منت ہوتا ہے۔ ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج

کے مصداق کائنات کی ساری تعمیر اسی طرح ہوتی رہتی ہے۔ بچپن میں حاصل کئے ہوئے ہیجانات۔ تاثرات۔ محرکات اور محسوسات ساری بقایا زندگی کا سرمایہ کائنات بنتے ہیں۔ جو انسان کو سُدھار یا بگاڑ سکتے ہیں۔

انسانی ذہن کی ساخت کے متعلق بھی فرائیڈ کا مفروضہ کچھ کم دلچسپ نہیں۔ اس کے مطابق ہر شعوری عمل کی تہ میں ایک لاشعور Unconscious جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہ لاشعور قدرتی زندگی کا سرچشمہ اور نسلی ورثے کا منبع ہوتا ہے۔ یہاں سے ہی تمام ذاتی تجربے جاری ہوتے ہیں۔ جن کا تعلق بچپن کی زندگی سے ہے۔ اور جن کا موضوع "جنسیات" ہے۔

فرائیڈ نے ہماری چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی کمزوریوں کی ذمہ داری ان جنسی ہیجانات پر رکھی ہے۔ جو بچپن سے ہماری زندگی کا جزو بن چکے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ ایسے ہیں جو ناکام زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور کوششوں کے باوجود کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ فرائیڈ کے نظریئے کے مطابق یہ ناکام لوگ اپنے خاندان کی کسی کمزوری، یا اپنی جسمانی کریہہ صورتی وغیرہ کی وجہ سے بچپن ہی میں احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے۔ اور اس احساسِ کمتری نے ان کے غیر شعوری دماغ میں ایک حجابِ ذہنی کی شکل اختیار کر لی۔ اور اب یہ غیر شعوری احساس کسی حالت میں بھی ان سے جُدا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ لوگ کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے! یہ امر پوشیدہ نہیں کہ عملی زندگی میں یہ نظریہ کہاں تک درست ہے۔

انسانی شخصیت کو فرائیڈ تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے:-

اول- Id ایسے وحشیانہ تجربے یا غیر مہذب آرزوئیں جو سماجی خیال سے پوشیدہ رکھی جانی چاہئیں۔ غالباً ان غیر شائستہ خیالات سے مراد ہے جو ابھی ترقی کے مدارج طے نہیں کر پائیں۔ اسے فطری حرکتِ ارادی کہا جا سکتا ہے۔

دوم- (Ego) خودی- یہ خودی اقبال کی خودی نہیں۔ شاعر مشرق نے خودی کے ضمن میں لکھا ہے:- ؎

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی ست — ہر چہ مے بینی ز اسرارِ خودی ست!

فرائیڈ کی خودی کا تعلق مہذب سماجی زندگی سے ہے۔

سوم (Super - Ego) جو خودی سے بلند تر عنصر ہے۔ اس کا کام محتسب کا سا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک ضمیر بھی اسی عنصر کے مترادف ہے۔

"فطری حرکت ارادی" اور "خودی" کے درمیان ہمیشہ ایک گونہ جنگ جاری رہتی ہے۔ اوّل الذکر چونکہ غیر مہذب آرزوؤں اور تجربوں پر محمول ہے۔ اس لئے جب کبھی اس کی جیت ہوتی ہے۔ تو انسان عجیب و غریب صورتیں اختیار کرتا ہے۔ اور اس انسانی عمل کے مطالعہ کو فرائیڈ تحلیل نفسی کا ایک اہم جزو خیال کرتا ہے۔ فرائیڈ کے نزدیک جبلت حیات اور جبلت موت انسانی فطرت کے دو اہم رُخ ہیں۔ جبلتِ حیات ایک تعمیری چیز ہے۔ لیکن جبلتِ موت ایک تخریبی اور ایذا رساں صورت کا نام ہے دوسروں کو ایذا پہنچا کر خود راحت طلب کرنا اس کا پروگرام ہے فرائیڈ کے قول کے مطابق اگر ہم اس جبلت کے نکاس کی کوئی تدبیر نہیں کر سکینگے تو پھر ہم خود اپنے آپ کو برباد کر دینے پر مجبور ہو جائیں گے!

دُنیا میں یہ خون ریزیاں اور جنگ و جدل کیوں ہوتے ہیں؟ آئے دن کے یہ جنگی بادل ہمیں خائف اور مرعوب کیوں رکھتے ہیں؟ فرائیڈ کے عقیدے کے مطابق جبلتِ موت ہی اس کی ذمہ دار ہے۔ دُنیا کے کسی کونے میں ایک ایسا جابر انسان پیدا ہو جاتا ہے۔ جو ایذا رسانی سے ذاتی راحت حاصل کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا ایک گاؤں کے دو زمیندار اپنی ہنگامی مسرت حاصل کرنے کے لئے مُرغوں بٹیروں۔ سانڈوں وغیرہ میں لڑائی کا سامان پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ ان معصوم جانوروں کے خون کی ہولی میں ہی اپنی راحت کو پوشیدہ پاتے ہیں۔ اسی طرح جب دو بہت بڑے ڈکٹیٹر یا بادشاہ معصوم سپاہ اور رعایا کی خون ریزی سے ہی قلبی تشفی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو اسے جنگ کہا جاتا ہے جس میں لاکھوں بے گناہ بچے یتیم ہو جاتے ہیں اور ہزاروں سُہاگنوں کے سُہاگ لٹ جاتے ہیں۔ فرائیڈ کے نزدیک وہ ایسا کرتے ہی نہیں۔ بلکہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو جبلتِ موت کے مفروضے کے تحت وہ اپنی ذات کو برباد کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جنسی عوارض کے علاوہ فرائیڈ نے سماجی بیماریوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک بنیا جو صبح شام دھن دولت کے اکٹھا کرنے میں غرق اور بلیک مارکیٹ اور سیاہ بازی کی توسیع میں کوشاں رہتا ہے قوتِ شہوانی کی ایک شاخ کا جسے Oral Libido کہتے ہیں۔ شکار ہے اسی طرح وہ شخص جو غریب واقع ہُوا ہے۔ اور روپیہ پیسہ کی کمی کو بے حد محسوس کرتا ہے۔ وہ بھی قوت شہوانی کا مریض ہے لیکن اس بیماری کا نام (Anal Libido) ہے۔

علیٰ ہذا القیاس وہ آدمی جو ایک چیز سے متنفر ہے اور اس میں کوئی جاذبیت نہیں پاتا وہ جبلتِ موت کا مرہون ہے۔ ایک خود پسند انسان بھی اسی طرح قوت شہوانی کی ایک اور صنف میں گرفتار ہے جسے Narcissitic Libido کہتے ہیں۔ الغرض فرائیڈ کے ایمان کے مطابق۔

؎ سارا چمن ہے تابعِ قانونِ "جنسیات"!

اور ہمارے ہر قول و فعل کی تشریح "جنسیات" کی روشنی میں ہو سکتی ہے۔ ہونی چاہئیے۔ اور ہوتی ہے!

کوثر چاندپوری

ماتا تیری کوکھ جلے

رات کی کامیابی پر اتراتا اور اپنی بوجھل جیبوں کو سنبھالتا وہ بڑی احتیاط کے ساتھ ایک دو منزلہ کے اندھیرے زینہ کو طے کرکے سڑک پر آ گیا اور گھر کی طرف چل دیا۔ تیز، بہت تیز، اس کے دماغ پر جاگنے کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔ بلکہ جیبوں میں نوٹوں کی گڈیاں بھر لینے کے بعد وہ بالکل ہی تازہ دم ہو گیا تھا۔ تھکان کا نور ہو گئی تھی اور گھنٹوں تھر کیا یہ چٹان پر الٹا پڑے رہنے سے پسلیوں میں جو گھٹن پیدا ہو گئی تھی وہ بھی اب باقی نہ رہی تھی۔ معلوم نہیں نوٹوں کی ان گڈیوں میں کونسی ایسی طاقت تھی جس نے اعصاب سے خستگی اور ماندگی کو چوس لیا تھا اور اب ان میں ایک نئی امنگ پیدا ہو گئی تھی جیسے عمدہ شراب کی کئی بوتلیں ایک دم سے پلا دی گئی ہوں۔ روپئے اور شراب کے نشہ میں آخر فرق ہی کیا ہے، یوں تو دنیا کے سارے ہی نشے وقت کی ترخی تھامد یتے ہیں۔ مگر دولت اور شراب کے خمار سے بہلتا جلتا ایک عارضی سکون تو مل ہی جاتا ہے اور اتنے سے عارضی سکون میں بڑے بڑے کام ہو جاتے ہیں، پیٹ کا اپریشن ——— گردے کی پتھری کا اخراج، ٹوٹی ہوئی ہڈی کی درستی اور ایسے ہی دوسرے بڑے بڑے کام، تو بجنے والے تھے اور یہی وقت تھا جب بھائی کی شادی کے لئے اسے ایک بہت بڑی رقم ماں کی گود میں ڈال دینی تھی، وہ یہ سوچ کر خوشی سے ناچ اٹھا کہ اتنی بڑی رقم پاکر ماں کی کیا کیفیت ہو گی وہ کس قدر خوش ہو گی نوٹوں کی یہ موٹی موٹی گڈیاں دیکھ کر، اس نے جیبوں میں پڑی ہوئی گڈیوں کو یونہی سے ٹٹول کر دیکھا وہ بدستور اپنی جگہ موجود تھیں۔ اس نے سوچا ابھی گھر پہنچ کر سب دیئے دیتا ہوں ماتا کو ——— جو ہمیشہ ہی سے برا بھلا کہتی رہی ہے، نکما، کام چور، اور ایک دن تو اس نے یہاں تک کہہ دیا تھا "آگ لگے میری اس کوکھ میں جس میں تو نے جنم لیا ہے، ہر وقت جلاتا ہی رہتا ہے مجھے" تیری طرف سے کبھی میری تمنا کو سکھ ہی نہیں ملا۔ اور اس وقت ماتا کتنی خوش ہو گی ان نوٹوں کو دیکھ کر، شائد وہ اس مسرت کو ضبط نہ کر سکیں، اور ممکن ہے ان کا دل پھٹ جائے، چھاتی شق ہو جائے، اور وہ مر جائیں، تب تو دھیرے دھیرے ایک گڈی دوں گا میں اُن کے ہاتھ میں، شائد وہ اتنی دولت کو دیکھ کر ہنستے ہنستے دم توڑ دیں، وہ بہت تیز چل رہا تھا، اور وہ بہت جلد اپنے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا چلتے چلتے ایک بوڑھی عورت سے اس کی ٹکر ہو گئی وہ لوٹا لئے نل پر پانی لینے جا رہی تھی ڈنڈا ٹیکتی، پھٹے ہوئے جوتوں کو سڑک پر سڑ، سڑ گھسیٹتی، آنکھوں پر اس نے بہت موٹے آئینوں کی عینک لگا رکھی تھی، ٹکر لگتے ہی وہ لڑکھڑائی اور عینک کا ایک آئینہ جو پہلے ہی بہت ڈھیلا تھا سڑک پر گر کر چور چور ہو گیا وہ چلائی ——— ہائے مر گئی ——— وہ چونک سا گیا جیسے بڑھیا نے اس ہجوم میں اس کا ہاتھ پکڑ کر کہہ دیا ہو، "میرا بیٹا دو، تم نے اُسے مار دیا ہے، رات کو اس کا گلا کاٹ کر تم اندھیرے میں کہیں پھینک آئے ہو، لاؤ میرا بیٹا دو" ——— ایک ہی تو بیٹا ہے میرے، وہی میرے جیون کا سہارا ہے، میں اندھی ہوں میری آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا تھا۔ اور میرے بیٹے نے محنت مزدوری کر کے تھوڑے سے روپئے جوڑ لئے تھے پھر میری آنکھوں کا پانی نکلوا دیا تھا مگر عینک نہ لے سکا تھا وہ، جب ہی تو میں پرانی عینک لگائے ہوئے تھی جسے تم نے توڑ دیا، میری ایک آنکھ پھوڑ دی تم نے، میرا بیٹا ریل میں کوئلہ جھونکتا ہے تم نے اُسے بھی مار دیا، اب کون لا کر دے گا مجھے نئی عینک، ——— کون دے گا مجھے کھانے کو، ہائے تم نے میرے سارے سہارے توڑ ڈالے !

——— اس نے چونک کر نہیں سہم کر بڑھیا کی طرف دیکھا، اُسے محسوس ہوا واقعی وہ اس کے بیٹے کا قاتل ہے۔ ضرور رات کو کوئی کوئلہ جھونکنے والا مزدور بھی ہلاک ہوا ہو گا ریل الٹ جانے پر، اور وہی اس کا بیٹا ہو گا، تب تو ضرور میں پکڑا جاؤں گا، یہ اندھی بڑھیا میرے دل میں چھپی ہوئی باتوں میں سے ایک ایک کو ٹٹول رہی ہے، کتنی تیز ہیں اس اندھی بڑھیا کی نگاہیں، یہ میرے سارے بھید کھول دے گی، میں گھر تک بھی نہ پہنچ سکوں گا اتنے

ہی میں پکڑ لیا جاؤں گا۔ بڑھیا کانپتے ہاتھ میں پیتل کا لوٹا تھامے پوپلا مُنہ کھولے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی ایک آنکھ عینک کی کمانی کے گول حلقے کے اندر چمک رہی تھی، جیسے وہ پوچھ رہی ہو تم ہی قاتل ہو میرے بیٹے کے۔ تم ہی نے گاڑی الٹ کر اُسے ہلاک کر دیا ہے۔ تم نے میرے سب ہی سہارے توڑ ڈالے، وہ مجھے روٹی دیتا تھا، نل سے پانی بھر کر لاتا تھا۔ اور جب دمہ کا دورہ پڑ جاتا کبھی سردیوں کی کسی لمبی رات میں تو دوا لا کر دیتا مجھے، مگر اب تو تم نے یہ سارے ہی سہارے توڑ ڈالے اور اسی وقت اُسے اپنی ماں کے وہ کوسنے یاد آ گئے —— آگ لگے میری —

—— اور پھر جلدی جلدی وہ چلنے لگا۔ مختلف سی باتیں سوچتا لوگوں کی ٹکڑیوں کو ٹٹولتا سڑک پہ بے شمار آدمی اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے اور اُسے بار بار محسوس ہو رہا تھا ان سب کے سہارے اس نے توڑ ڈالے ہیں، ان سب کی آنکھیں پھوڑ دی ہیں، ان سب کے بیٹے اور بھائی اس نے مار ڈالے ہیں۔ کوئلہ جھونکنے والے مزدوروں میں ان کا بھی تو کوئی بھائی ہوگا —— یا بیٹا، اور اگر انھوں نے اپنے بیٹوں کو کچھ تعلیم بھی دلائی ہے تو وہ گارڈ ہو گئے ہوں گے، ٹکٹ چیکر ہوں گے، یہ بھی نہ سہی تو ڈرائیور ہی ہوں گے یا سیکنڈ، انٹر اور تھرڈ کے کسی ڈبے میں سفر ہی کر رہے ہوں گے، جب ہی تو مجھے ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرتے دکھائی دے رہے ہیں، یہ تو سب ہی رو رہے ہیں، شاید ان میں سے ہی ایک کا بھائی مر گیا ہے —— بیٹا مر گیا ہے یا بہن بیوہ ہو گئی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی، سواری گاڑی کوئی رکشا تو ہے نہیں کہ اس کے الٹ جانے سے صرف اس اندھی بڑھیا کا بیٹا ہی مرے، ضرور اس شہر کے سارے باشندوں کے بیٹے مر گئے ہیں، ان کے بھائی لولے ہو گئے ہیں۔ ان کی بہنوں کا سہاگ لٹ گیا ہے۔ اُسے اپنی بائیں پسلی کے نیچے کچھ درد سا محسوس ہوا، ایک گھٹن سی، ویسا ہی درد اور ویسی ہی گھٹن جیسی رات کو پتھر کی چٹان پہ مُنہ کے بل لیٹے ہوئے رات کو بھی چند بار اس نے محسوس کی تھی۔ اس نے پسلیوں پر ہاتھ پھیرا، اس کا دل جلدی جلدی دھک دھک کر رہا تھا، جیسے کسی موٹر کا انجن بگڑ جانے کے بعد ایک ہی جگہ کھڑا کھڑا سنسنایا کرتا ہے اور چاروں پہیے جام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ اُس ایک قدم آگے نہیں کھینچ سکتا

اُسے محسوس ہوا جیسے وہ گاڑی بھی بگڑ کر رک گئی ہے، جسے وہ آگے کھینچنے کی فکر میں تھا، اور اس کی ماں اس بگڑی ہوئی گاڑی میں بیٹھی اُسے کوس رہی ہے، اندھی پرانے کوسنے فضا میں گونج رہے ہیں۔ درد اب بہت زیادہ ہو گیا تھا، بائیں پسلیوں میں سے جیسے کوئی پسلی ٹوٹ کر اندر کود پڑی ہو اور اس نے جھلی کو پھاڑ کر دل کو بھی گھائل کر دیا ہو، درد کی ان سخت ٹیسوں کے ساتھ ہی رات کے واقعات اس کے ذہن میں گھوم گئے۔ اور اس نے محسوس کیا شاید یہ بگڑی ہوئی کار پھر چل پڑی، —— مگر نہیں وہ رکی ہوئی تھی، اور رات کے واقعات ذہن میں گھوم رہے تھے، رک رک کر، موٹر کے اس پہیے کی طرح جو انجن بگڑ جانے پر آپ ہی آپ گھومنے لگتا ہے —— رات کی گہری گھٹا ٹوپ اندھیری میں وہ پہاڑی کی ایک مخروطی چٹان پہ بیٹھا تھا اس کی آنکھیں دور پہاڑوں کے وسیع سلسلہ میں روشنی کی کرنیں تلاش کر رہی تھیں اور کان گاڑی کی آواز پہ لگے ہوئے تھے اور وہ شکاری چیتے کی طرح بدن سمیٹے اوندھے مُنہ چٹان پر پڑا تھا —— کن کھجورے کی طرح پتھر کی سطح پر چپک گیا تھا، پیچھے ذرا فاصلہ پہ نربدا کی دھار بڑے بڑے گول پتھروں سے ٹکراتی سنگین ساحل کی گود میں بہتی بہتی جا رہی تھی، سامنے ریل کی بل کھاتی پٹڑی تھی جو اب تاریکی میں لپٹی ہوئی تھی، چاروں طرف وندھیاچل کی پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان پر کھڑے ساگون، اچار، مہوے کے درخت اونگھ رہے تھے۔ دفعتہً گہرے اندھیرے میں ریل گاڑی کی لائٹ چمک اٹھی تھی اور لہراتی بل کھاتی پٹڑیاں صاف دکھائی دینے لگی تھیں۔ گاڑی کی بھیانک گڑگڑاہٹ نے سوتے ہوئے درختوں کو جگا دیا تھا۔ اس نے بدن کو اور اچھی طرح سمیٹ لیا تھا جیسے وہ آگ اور دھواں اگلتے ہوئے لوہے کے اس تیز رو اژدہا پر اب جھپٹنے ہی والا ہے۔ اور پھر ایک زبردست دھماکہ ہوا تھا، جیسے وندھیاچل کی ان پہاڑیوں میں کوئی خطرناک قسم کا بم پھٹ گیا ہے۔ پھر رونے چلانے کی ہزاروں ملی جلی آوازیں کانوں میں بھر گئی تھیں —— سینکڑوں مرد، عورتیں اور بچے ایک ساتھ چیخ رہے تھے۔ اور انجن کی پھیلائی ہوئی روشنی کو یک دم اندھیری نے نگل لیا تھا تب وہ پوری احتیاط سے چٹان سے کود کر پتھروں کے روڑوں پر پھسلتا

ایک بہت ہی تنگ پگڈنڈی پر دوڑنے لگا تھا اور چیخیں گونجتی رہی تھیں
پیچھے رو رہے تھے۔ مرد کراہتے رہے تھے اور عورتیں مایوسی کے ساتھ
تاریک خلاؤں کو تکتی رہی تھیں جیسے ابھی ابھی ان کی امداد کے لئے
فرشتے آسمان سے اترنے والے ہیں، وہ ان کے مردہ شوہروں کو جلانے
کے لئے کسی پربت کی چوٹی سے جیون بوٹی اکھاڑ لائیں گے، یا ان کی ٹوٹی
ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کی غرض سے شاہنامہ والا "تریاق" منگا لائیں گے کسی
سے، مگر حقیقت میں فرشتے اس اندھیرے میں آ ہی نہ سکتے تھے، اور
تریاق ——— تریاق کا اس زہر بھری فضا سے کیا تعلق؟ ———
وہ مایوسی کے ساتھ اسی طرح تاریک خلاؤں کو تکتی رہیں اور وہ پتھر کے
روڑوں پر پھسلتا، تنگ پگڈنڈی پر دوڑتا رہا۔ نربدا کی اس دھار کی
طرف جو سنگین ساحل کی گود میں چیخ چیخ رہی تھی، اسی پایاب گھاٹ
سے اتر کر اُسے دوسری طرف جانا تھا، اور اس سے دو آگے اس نے
پچھلی سنگرانت پر اشنان کیا تھا اُس کے سارے پاپ دُھل گئے تھے
جب وہ نربدا کی دھار کو پار کرنے لگا تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ اس سے
کچھ کہہ رہی ہو، چیخ چیخ کر ——— بہت دور دور سے ——— دیکھو اگلی سنگرانت
پر تم پھر آؤ گے، اور میں تمہارے بھائیوں، بہنوں اور ماؤں کا یہ خون تمہارے
دامن سے نہ چھڑا سکوں گی ——— کبھی نہیں چھڑا سکوں گی خون کے دھبے
صاف نہیں ہو سکتے، پاپ کی یہ سیاہی چھوٹ نہیں سکتی ——— تم نے بہت
سی ماؤں کی شہ رگوں کو ایک ساتھ چھید دیا ہے، بہت سی بہنوں کا سہاگ
لوٹ لیا ہے۔ بہت سے بھائیوں کو مار ڈالا ہے ——— تم نے ماؤں
کا کلیجہ چبایا ہے، بہنوں کی چھاتیوں پر پتھر برسائے ہیں، بھائیوں کا
خون پیا ہے، اور اتنے بہت سے پاپوں کو میں نہیں دھو سکتی، میں
خون کے اتنے دھبوں کو صاف نہیں کر سکتی؟ اس نے کئی بار گھوم کر
دیکھا تھا اور پھر غصہ میں بھر کر کہہ دیا تھا، نربدا کو اس معاملہ میں
بولنے کا کیا حق ہے ——— میرا اپنا معاملہ ہے ——— پھر مذہب
اور سیاست میں واسطہ ہی کیا، نربدا مذہب ہے اور دلی سیاست
میں نربدا کی دھار روکنا نہیں چاہتا۔ اس سیاست کا رخ پلٹنا
چاہتا ہوں۔ اور یہ میرا اپنا معاملہ ہے، مذہب کا نہیں، نربدا کا نہیں
اس کی یہ چیخیں سننے کے قابل نہیں ممکن ہے یہ میری ہی کوئی کمزوری

بول رہی ہو، دل کے کسی گوشہ سے، میرا دل بہت بودا ہے مگر میں
دماغ کو اس کے بودے پن سے متاثر ہی کب ہونے دیتا ہوں، حیات
میں دل کا مرتبہ ہی کیا ہے۔ سیاست دماغی چیز ہے، وہ سوچی جاتی ہے،
سمجھی جاتی ہے، اور میں اپنی ان باتوں کو خوب سوچ سمجھ چکا ہوں، میں
اپنے فیصلوں کو مذہب کے ان سوکھتے دھاروں پر بہانے کو تیار
نہیں، میں مذہب کو نہیں مانتا، میں اشنان کا قائل نہیں یہ سب فضول
باتیں ہیں، دل کی کمزوری کا نشان ہیں۔ اور پھر وہ چلتا گیا تھا ——— چلتا
گیا تھا، رفتہ رفتہ اندھیرا چھٹ گیا تھا اور افق پر سورج چمکنے لگا تھا،
ایک گھنے جنگل میں پہنچ کر اس نے اپنے کپڑے اتار ڈالے تھے اور
روزمرہ کے معمولی کپڑے پہن لئے تھے۔ اُسے یقین تھا وہ اپنے پاپ
ان کپڑوں میں چھپا لے گا، وہ سورج کی روشنی پر نقاب ڈالنے میں
کامیاب ہو جائے گا۔ اور خون کے بے شمار چھوٹے بڑے دھبے جن
کو نربدا بھی نہیں دھو سکتی، زمین کی اس خاکی وردی میں چھپ جائیں گے،
کوئی انہیں دیکھ نہیں سکیگا، میں بھی نہیں، میرا ضمیر بھی نہیں، اور
ایسی ہی باتیں سوچتا وہ شہر میں آ گیا تھا اور ایک دو منزلہ پر جا گھس گیا تھا
جو ویران سے ایک محلہ میں واقع تھا، پھر اُسے وہاں سے بہت سے
نوٹ مل گئے، اور ابھی ابھی نوٹوں کی یہ گڈیاں آپس میں رگڑ کر بول
سی اُٹھیں، رات کے واقعات کا یہ چکر اس کے ذہن سے نکل گیا، وہ
سڑک پر تیز تیز چلتا رہا، سڑک پر بہتے ہوئے آدمیوں کے اس سیلاب
سے وہ ڈر رہا تھا، وہ ان کی بھیگی آنکھوں سے اپنے ضمیر کی آوازیں سن
رہا تھا، اور بہت زیادہ گھبرا رہا تھا۔ اس کا جی چاہا شہر کے بے شمار
لوگوں کی آنکھوں سے بچ کر کسی سنسان سی گلی میں گھس جائے اور
پھر دوڑ کر اپنے گھر چلا جائے، وہ ایک گلی میں گھس گیا، مگر یہاں بھی
قدم قدم پر اُسے آدمی مل رہے تھے۔ عورتیں چل رہی تھیں اور بچوں
کا بھی ایک زبردست ہجوم تھا ان سب کی آنکھوں سے نربدا کی
دھاریں ابل رہی تھیں اور وہ کہہ رہی تھیں، جاتے کہاں ہو، ان کے
بیٹے، شوہر اور باپ انہیں دیتے جاؤ، یہ سب اور بہت کچھ تمہیں
ترس کیوں نہیں آتا، ماؤں کے بیٹے، شوہر اور ان کے باپ ان کے
حوالے کرتے جاؤ، دیکھو ان کے سہارے نہ توڑو، ان کے جیون

کی نیا کب تک یوں ڈولتی پھرے گی، —— ان بچّوں کے باپ مر گئے ہیں، ان عورتوں کے سہاگ لٹ چکے ہیں، اور ان بڈھوں کے بیٹے تم نے مار ڈالے ہیں، ان کا خون تمہارے مُنہ پر ملا ہُوا ہے اور میں کبھی ان سرخ دھبّوں کو نہ دھو سکوں گی، دیکھو یہ سب مرد بیٹھے ہیں، یہ بڈھے بچّے اور یہ غریب دُکھی عورتیں،۔ وہ سٹپٹا گیا، اسے یوں لگا جیسے یہ سب چلنے والے اس کے راز سے واقف ہیں، یہ نوٹوں کی اس سرسراہٹ کو سن رہے ہیں جو گڈیوں کے ٹکرانے سے پیدا ہو رہی ہے اس نے گھبرا کر زور سے آنکھیں بند کر لیں اور گھر کی طرف دوڑنے لگا، جیسے گھر پہنچتے ہی دل کی وہ آگ بجھ جائیگی جس کے شعلے اندر ہی اندر بھڑکتے جا رہے تھے اور بار بار دماغ کی ان بلندیوں کو چھُو لیتے تھے جہاں اس کی سیاست کا مسکن تھا، اس سیاست کا جو مذہب کے ٹھیکیداروں کی تھی اور جس نے ضمیر کو روند ڈالا تھا اُس کو مسل رہی تھی، اب وہ گھر کے قریب پہنچ گیا تھا۔ گلی کے دونوں کناروں کی نالیوں میں پانی بہ رہا تھا، اور ان کی مری مری دھاروں میں بھی نربدا کی وہی چیخیں گونج رہی تھیں، وہ اپنے راز کے کھل جانے سے ڈر رہا تھا، سمجھ رہا تھا اور جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا، دفعتاً اس نے دیکھا گھر کا دروازہ کھلا ہی ہے اور اندر غیر معمولی بھیڑ ہے، بہت سی عورتیں، مرد اور بچّے بھرے ہوئے ہیں گھر میں، قریب پہنچ کر اس نے دیکھا ان سب کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی ہیں۔ ان سے بھی نربدا کی دھاریں اُبل رہی ہیں۔ وہ اور زیادہ سہم گیا۔ شاید سب ہی پر کھل گیا میرا بھید، سب ہی کو نظر آنے لگے میرے جسم پر لگے ہوئے خون کے دھبے۔ وہ گھر میں لگی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا جلدی سے ماں کے قریب گیا، اور اس کے پاؤں چھونے کو جھکا، اس نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے، اور اُسے محسوس ہُوا جیسے واقعی نربدا نے اس کے بہت سے پاپ دھونے سے انکار کر دیا، ماں —— ماں

—— ماں —— میں آگیا ——

تو —— تو آگیا، اتنی دیر بعد اور میرا شنکر، وہ اپنا سینہ کوٹنے لگی، میرا شنکر مر گیا، ریل الٹ گئی، اور وہ مر گیا،

شنکر مر گیا —— ریل الٹ گئی۔ ایک مرتبہ وہی بات والا دھماکہ پھر اس کے احساس میں گونج گیا، اور کوئی بڑا سا بم پھٹ گیا، اُسے محسوس ہُوا جیسے جیب میں پڑے ہوئے نوٹوں کی گڈیاں پتھر کی سلوں میں تبدیل ہو گئی ہیں، اور وہ ان کا بوجھ اٹھانے سے عاجز ہے، —— دماغ دل کی طرف جھک رہا ہے، مذہب سیاست پر غالب آ رہا ہے۔ اور ضمیر کی آوازیں بہت زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہیں، ماں رو مت نہیں، چپ ہو جاؤ میری ماں! جلدی چپ ہو جاؤ ورنہ میں بھی مر جاؤں گا۔ میرے سینہ کی ہڈیاں نوٹوں کے بوجھ سے ٹوٹ جائیں گی، کاغذ کی یہ بھاری بھاری سلیں میری روح کو پیس ڈالیں گی، اور میں مر جاؤں گا ماں —— —— جلدی چپ ہو جاؤ!

میں بہت سارا پیسہ لایا ہوں شنکر کی شادی کے لئے،

پر شنکر تو مر گیا بیٹا، گاڑی الٹ گئی، اور وہ مر گیا۔

—— ماں چپ ہو جاؤ، میں نے مارا ہے شنکر کو، قاتل میں ہوں ماں تم میرا گلا گھونٹ دو، میرے ہاتھ کاٹ ڈالو، انہیں ہاتھوں سے میں نے مارا ہے شنکر کو، تمہارے شنکر کو، اپنے شنکر کو اور ان سب آدمیوں کے شنکروں کو جو ہمارے محلہ اور شہر میں آباد ہیں۔ ماں میں نے رات کو بہت سے شنکروں کے گلے کاٹ ڈالے ہیں، ان میں سے کوئی کوئلہ جھونکنے والا مزدور تھا، کوئی ڈرائیور اور کوئی گارڈ تھا۔ کوئی ماسٹر سیکنڈ اور تھرڈ کا مسافر تھا —— مرنے والے ان شنکروں میں ہر قسم کے آدمی تھے، ادیب، معزز اخبار نویس، مولوی، پنڈت —— محنت کش، —— بوڑھے، جوان —— مرد —— بچّے اور عورتیں، میں بہت سے شنکروں کا قاتل ہوں، ماں تم میرا گلا گھونٹ دو، جلدی گھونٹ دو ماں، اب میں اتنے بہت سے شنکروں کو مار کر زندہ نہیں رہ سکتا، مجھے مر جانا چاہیئے جلد بہت جلد، اور پھر اس نے نوٹوں کی گڈیاں جیب سے نکال کر پھینک دیں اور ماں کے پیروں میں گر کر چیخنے لگا، ماں جلدی گھونٹ دو میرا گلا، میں قاتل ہوں تمہارے شنکر کا، اور ان سب کے شنکروں کا جو ہمارے شہر میں، اور آس پاس کے بہت سے دیہات اور شہروں میں رہتے ہیں، پھر اس کا جی چاہا، آج، اس وقت وہ بھی ماں کے سامنے کو سینے اُسے لوٹا دے اور ایک مرتبہ خوب چیخ کر اپنی بوڑھی ماں سے کہہ دے —— ماتا تیری کوکھ جلے!

اطہر حسین جعفری

مصر میں اسلامی فنِ تعمیر

اگرچہ مصر میں اسلامی فنِ تعمیر کی ابتدا آٹھویں نویں صدی میں مقیاس النیل اور ابن طولون کی مسجد سے ہوتی ہے لیکن ابتدائی زمانۂ اسلام کے متعلق مختصر ذکر بغیر اس کا سمجھنا ممکن معلوم نہیں ہوتا۔

عہد پیغمبرِ اسلام میں عرب میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جو فنِ تعمیر سے منسوب کئے جانے کے قابل ہو سکے۔ مدینے میں ہجرت کے بعد پہلا مکان جو آپ نے تعمیر کرایا وہ تقریباً (۶۰) گز مربع کے ایک احاطے پر مشتمل تھا جس کی چہار دیواری (۱۰) (۱۱) فٹ سے زیادہ بلند نہ تھی۔ اس کا نیچے کا حصہ پتھر کے ٹکڑوں اور اوپر کا کچی اینٹوں اور مٹی کے گارے کا تھا۔ یہ صحن جو تعمیر کے بعد مسجد قرار پایا ابتدا میں بالکل کھلا ہوا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں نے شکایت کی کہ دوپہر کے بعد نماز پڑھتے وقت دھوپ کی تیزی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو ایک بڑا سا سائبان تعمیر کرایا گیا جس کے ستون کھجور کے تنوں کے تھے اور چھت کھجور کے پتوں کی جس کے اوپر مٹی کا پلاسٹر کیا گیا تھا۔ پہلے احاطے کے جنوبی مشرقی گوشے کی طرف باہری دیوار کے مقابلے میں بی بی عائشہ اور سودہ کے رہنے کے لئے کچی اینٹوں اور کھجور کی تنیوں کی چھت کے دو حجرے تعمیر ہوئے۔ اور بعد میں دوسری امہات المومنین کے لئے بھی اسی قسم کے بنائے گئے۔ ان حجروں کے دروازے صحن کی جانب تھے۔ اس زمانے میں روشنی کے لئے چراغ بھی نہ تھے اس لئے رات میں نمازیں کھجور کی تنیوں کی آگ کی روشنی میں پڑھی جاتی تھیں۔

۶۳۲ء میں پیغمبرِ اسلام کی رحلت کے بعد سے عظیم جنگوں کا دور شروع ہوتا ہے جہاں عرب علمبردارِ اسلام کی حیثیت سے اپنے ملک سے چاروں طرف ہوا کی طرح پھیل گئے۔ شمالی مغرب کی طرف ملک شام میں پہنچے جہاں ان کو شامی بزنطینی تمدن کا سامنا ہوا۔ شمال مشرق کی طرف عراق میں جب داخل ہوئے تو ساسانی سلطنت کے تمدن و تہذیب سے دوچار ہوئے۔ چنانچہ یہی بات اسلامی فنِ تعمیر کی ترقی کا زبردست سبب ہوئی جس کا اظہار ساتویں صدی کے آخری نصف حصے میں ہوا۔ اسلامی فوج میں خصوصیت کے ساتھ مشرقی عرب کے وسط کے ناتراشیدہ بدو شامل تھے جو پیغمبرِ اسلام اور قرآن سے برائے نام ہی شناسا تھے۔ ان جنگوں میں ان کی شرکت محض تبلیغِ اسلام کی غرض سے نہ تھی بلکہ حقیقت میں جو شے ان کے شمول کی محرک ہوئی وہ اُن کی لوٹ مار کی ہوس تھی۔ اسی وجہ سے خانہ بدوشوں کی طرح ان کو صنعت و تعمیر سے کوئی غرض و واسطہ ہی نہ تھا۔ اور نہ شہری زندگی بسر کرنے کی خواہش تھی۔ البتہ دو نسلوں کے بعد جب عربوں نے آباد ہونا شروع کیا اور انہیں مستقل بستیوں کی ضرورت لاحق ہوئی تو ساسانی معمار عراق کی جانب اور بزنطینی کاریگر شام کی طرف سے آنا شروع ہوئے۔

مجوف محراب (نماز کی سمت بتلانے کے لئے)، مقصورہ (خلیفہ یا صوبے کے والی کی سکونت کے لئے) اور منبر (وعظ کے لئے) یہ سب چیزیں ساتویں صدی کے آخر یا آٹھویں صدی کی ابتدا میں وجود میں آئیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی اصلاً عرب کی ایجاد نہ تھی۔

شام کی اکثر قدیم مسجدیں گرجوں کی بنیادوں میں تھوڑے تغیر کے بعد بنی تھیں اس طور پر کہ ان کے مغربی سمت کے دروازے بند کر دئیے گئے، شمالی سمت کی دیوار میں نئے دروازے بنائے گئے اور جنوبی دیوار کعبے کے رخ والی قبلہ قرار پائی۔

عراق میں جہاں آبادی کے خاص مرکز کوفہ و بصرہ کے نئے تعمیر شہر تھے مسجد کی تعمیر نے ایک خاص مختلف قسم کی شکل اختیار کی۔ بصرہ میں پہلی مسجد کی کوئی عمارت نہ تھی بلکہ زمین پر صرف خطوط کھینچے ہوئے تھے جن کے اندر کھڑے ہو کر مسلمان نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ کوفہ میں مسجد کے حدود اس طرح قائم کئے گئے تھے کہ مجوزہ مقام پر ایک شخص نے کھڑے ہو کر ایک تیر قبلہ کی جانب، دوسرا شمال کی طرف، تیسرا مغرب کی سمت اور چوتھا مشرق

کی طرف پھینکا۔ اس طریقہ سے دو تیر کے پٹہ کی لمبائی کے ضلع کا ایک مربع بن گیا جس کے گرد خندق کھود دی گئی۔ عمارتی شکل میں صرف وہ متعدد ستونوں والا سائبان (ظلّہ) تھا جو چاروں طرف سے کھلا ہوا تھا۔ اس کے لئے ستون حیرہ کے کھنڈروں سے کھود کر لائے گئے تھے۔ جنوبی پہلو کے مقابلہ میں سپہ سالارِ لشکر کا مکان تھا۔

۷۵۰ء میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا جس نے اسلام پر زبردست اثر ڈالا۔ یعنی بنی امیّہ کا زوال اور بنی عباس کا عروج تھا۔ اس عہد ثانی میں بغداد جسے المنصور نے ۷۶۲ء میں تعمیر کرایا تھا پائے تخت قرار پایا یہ تغیر ایسا ہی اصولی اور لازمی تھا جیسا سلطنت رومیہ کے دارالسلطنت کا روم سے قسطنطنیہ کو منتقل ہونا۔ خلاصہ یہ کہ دونوں سلطنتوں کا مرکز ثقل مشرق کی جانب کر دیا گیا۔ اس تغیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام کا اثر اسلامی صناعی پر گھٹ گیا اور ساسانی ایران اور وسطی ایشیا کے روایات کا اثر بہت بڑھ گیا۔ قیاس ہے کہ بغداد کی پہلی بڑی مسجد کا دور (۱۲۵) مربع گز ہوگا۔ جس کے وسط میں صحن تھا۔ اس عبادت گاہ میں جانب قبلہ پانچ چھتے تھے۔ باقی تین طرف بھی ایسے ہی چھتے تھے۔ ۸۳۶ء سے ۸۹۲ء تک سامرہ جو دجلہ کے کنارے بغداد سے ۶۰ میل کے فاصلہ پر ہے عراق کا پائیہ تخت رہا۔ یہاں قدیم زمانہ کی تعمیریں اب بھی نظر آتی ہیں۔

اب مصر کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جو دو سو سال سے زیادہ تک ایک مفتوح ملک ہونے کی وجہ سے تعمیری حیثیت سے مقابلتاً بہت پیچھے رہا۔ یہاں کے باشندے اُن ظالم فرمانرواؤں کے جور و ستم کی بدولت جن میں سے غالباً ایک نے بھی تیس سال سے زیادہ حکومت نہیں کی ناقابل برداشت خراج اور محصول اراضی کے اثر سے بالکل پسے ہوئے تھے۔ نتیجہ کے طور پر عہد بنی امیّہ کا اثر یہاں قریب قریب نہ ہونے کے برابر رہا۔ یہاں تک کہ مصر ایک خود مختار فرمانروا احمد ابن طولون کا دار الحکومت قرار پایا جو سامرہ ایسے عظیم الشان شہر سے وہاں کے تعمیری روایات اپنے ساتھ لایا۔ اس کی مسجد کا خاکہ بالکل بغداد کی مسجد کا اور اس کے نقش و نگار سامرہ کی یادگاروں کے نمونے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ سرزمین مصر میں یہ مسجد بالکل ہی غیر ملکی (عراقی) طرز کی ہے۔ مورخ ہرزفلڈ نے سامرہ کی عمارتوں کے نقش و نگار کی جو تین قسمیں قائم کی ہیں اُن میں سے ہر ایک جامع ابن طولون میں پائی جاتی ہے۔ علاوہ بریں اس میں عہد اسلام کے قدیم سیدھے سادے ہندسی نقوش کے نمونے بھی موجود ہیں۔ ساری تعمیر پختہ اینٹوں کی ہے۔

سلاطینِ مصر کے مختلف دوروں میں تدریجی تعمیری ترقی۔ عہد فاطمیین

(۹۶۹-۱۱۷۱ء) کا آغاز ۹۶۹ء میں فاطمی خلیفہ المعز کے جنرل گوہر کے فتح مصر سے ہوتا ہے۔ اسی سال القاہرہ شہر کی بنیاد فسطاط اور قطاعی (شہر ابن طولون) کے شمال غیر آباد زمین میں پڑی۔ ابتدا میں (۱۲۰۰) گز مربع کا ایک احاطہ تعمیر ہوا جس کے اندر دو محل ایک بڑا پورب کی طرف خلیفۂ وقت کے لئے اور دوسرا چھوٹا پچھم کی جانب اور سرکاری عمارتیں چھاؤنی۔ خزانہ۔ ٹکسال۔ کتاب خانہ۔ شاہی قبرستان۔ اسلحہ خانہ وغیرہ بنائے گئے۔

۱۱۷۱ء میں فاطمی سلاطین کے زوال کے زمانہ تک سوائے سلطنت کے اعلیٰ عہدہ داروں اور محافظ فوج کے سپاہیوں کے کسی کو بھی شہر کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

گو اس زمانہ میں اُس چار دیواری کا تو نشان بھی باقی نہیں رہا لیکن چھوٹے فاطمی محل کے چند چوبیں منقش پردے اب بھی عربی صناعی کے عجائب خانہ میں نظر آتے ہیں۔ گوہری نے جامعہ الازہر بھی بنوائی تھی جس کی تعمیر ۹۷۰ء میں شروع ہو کر دوسرے ہی سال ختم ہو گئی۔ اس میں بجائے پیل پایہ کے ستون قائم کئے گئے ہیں۔ اگرچہ اصل عمارت میں اب تک بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں لیکن پھر بھی بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اصل مسجد اور بغلی حصوں کے طول میں (۵) اور (۳) کی نسبت تھی۔ اس کی سب سے زیادہ جالب توجہ چیز اس کا ترچھا بلند ہے جو صحن سے محراب تک چلا جاتا ہے۔ اسی کے سامنے دونوں پہلو کے طاق ختم ہو جاتے ہیں۔ مصر کی مسجدوں میں ترچھے بازو کی یہ پہلی مثال ہے۔ لیکن اس سے پہلے شام میں اس کا پتہ چلتا ہے کیونکہ دمشق میں الولید کی تعمیر کردہ جامع کبیر میں اسی نمونہ کا ایک بلند معبد ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ طرز تعمیر مغرب میں بنی امیّہ کے آخری خلیفہ

عہد الجمالی کے ذریعے سے حاصل ہوا۔ اور شمالی افریقہ ہوتا ہوا مصر میں پہنچا جہاں جامع سیدی عقبہ واقع قیروان یا پایۂ تخت سلاطین فاطمی) میں اب بھی موجود ہے۔ غالباً جامع ازہر کی پشت کی جانب دونوں گوشوں میں بھی اسی شکل کے جیسے قاہرہ کی جامع الحکیم (بنا کردہ ۱۰۱۳-۹۹۰ء) میں نظر آتے ہیں ایک ایک قبہ بنا ہوگا۔

اس مختصر الذکر جامع کے تفصیلی معائنے سے معلوم ہوگا کہ اس طرز تعمیر کا خیال کیوں کر پیدا ہوا۔ اس کا قریب قریب مربع نقشہ اس کے متعدد دروازے اس کے حرم کی سترہ سترہ محرابوں والی پانچ گزرگاہیں اس کے پیل پائے اور اس کے اوپر کی چھوٹی چھوٹی محرابی ڈاٹیں جو اوپر کی عمارت کو سنبھالے رہتی ہیں یہ سب چیزیں عراقی ساخت کی ہیں۔ ترچھا باند اور شمال مشرق و جنوب مشرق کے وسطی در جواب بند ہو گئے ہیں شامی طرز کے ہیں۔ دونوں مناروں کے سامنے والی دو بڑی فصیلیں (چاروں طرف کی فصیلوں کے عوض) بھی عراقی ساخت کا پتہ دیتی ہیں۔ یہی شکل خاص کر بغداد اور سامرہ کی مسجدوں اور شمالی فارس کی بسطامی جامع کبیر میں جو بقول عربی مورخ المقدسی بازار کے وسط میں مثل قلعہ کے کھڑی تھی نظر آتی ہے۔

شہر قاہرہ کی آبادی رفتہ رفتہ اتنی بڑھی کہ اس کے قدیم ابتدائی احاطہ میں مزید آبادی کی گنجائش نہ رہ جانے کی وجہ سے بے شمار مکانات چہار دیواری کے باہر بن گئے۔ اسی وجہ سے بدر الجمالی کو ایک جدید شہر پناہ تعمیر کرانا پڑی (۹۲-۱۰۸۷ء) اس جدید تعمیر کے تین دروازے اب بھی اچھی حالت میں نظر آتے ہیں۔ باب النصر۔ باب الفتوح۔ باب زویلہ۔ اس کے علاوہ (۳۰۰) گز لمبی شہر پناہ بھی ابھی تک باقی ہے جس پر مربع منارے بنے ہیں۔ ہر دروازہ ایک خاص انداز کا اور ایک ماہر فن معمار کا بنایا ہوا ہے۔ ہر سہ معمار ادیسہ (اُرفہ) کے پناہ گزین ارمنی تھے۔ اُرفہ ایک سال پہلے یعنی ۱۰۸۶ء میں سلجوقی ترکوں کے ہاتھوں فتح ہو کر سلطنت میں شامل ہو گیا تھا۔ یہ تینوں دروازے مع شہر پناہ کی دیوار اور منارے حروب صلیبیہ سے پہلے کی فوجی تعمیر کی یادگار ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ باب النصر ایک خاص استحکامی تدبیر ہے جس کا وجود بارھویں صدی کے آخر تک یورپ میں نہ تھا محفوظ کر دیا گیا ہے۔ باب الفتوح اور باب زویلہ کے دونوں طرف ترشے ہوئے پتھر کے چوڑے چوڑے گنبد آویزاں ہیں جو مصر کی قدیم تعمیر کی یادگار ہیں۔ اس قسم کی سنگ بندی کی ہر تعمیری ساخت شمالی شام کی معلوم ہوتی ہے اور خود شہر پناہ یا سنگ بنانے کا خیال بُزنطینی ہے۔

عہد فاطمی کے تعمیرات کی خاص شان و شوکت ان کے نقش و نگار کی بدولت ہے جن کا ابھار اور جن کی نوعیت ہی ان کو عالمگیر ستائش کا مستحق بناتی ہے۔ ساری زینت و آرائش عجیب و غریب طغروں اور اعلیٰ قسم کے بیل بوٹوں پر مشتمل ہے جن کا خاکہ کبھی ہندسی اور کبھی معمولی اور سادہ ہوتا ہے۔ اس عہد میں ہندسی نقش و نگار کو کچھ زیادہ اہمیت دی تھی۔ اسی لئے ہم پیچیدہ ستارہ والا نقش جس میں بعد کے زمانہ میں دس۔ بارہ اور کبھی کبھی اس سے زیادہ نقطے ہوتے تھے صرف (۸) نقطوں کا اور وہ بھی سادہ شکل میں پایا جاتا ہے۔ عہد طولونی کے برخلاف جس میں عراقی اثرات غالب تھے عہد فاطمی شامی اثرات کے آغاز کے لئے قابل لحاظ ہے جنہوں نے کچھ زمانہ کے بعد ایوبی اور مملوکی عہد میں غلبہ حاصل کر لیا۔ آرائشی تحریر میں ایرانی اور شمالی عراقی اثرات جزو غالب نظر آتے ہیں۔ تحریر میں بعض امتیازی شکلوں کا وجود مثلاً حروف کے مرکزوں کا باہم پیچیدہ ہونا ان ملکوں میں مصر سے تقریباً ایک صدی پہلے کی چیز ہے۔ اس مسئلہ کا تجزیہ فی الحال ممکن معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ مصر کے علاوہ دوسرے ممالک کی ہم عہد یادگاریں کمیاب ہیں۔ چنانچہ یہی ایک بات عہد فاطمی کی ان حیرت انگیز یادگاروں کی اہمیت میں چار چاند لگا دیتی ہے جو اب تک قاہرہ میں محفوظ ہیں۔

عہد ایوبی کا آغاز سلطان صلاح الدین کے نظامی تعمیرات سے ہوتا ہے جس نے قلعۂ معلی کے علاوہ جو شہر سے بہت فاصلے سے نظر آتا ہے موجودہ شہر پناہ کے بہت بڑے حصہ کو تعمیر کرایا تھا۔ بدقسمتی سے اس کی بنا کردہ کوئی مذہبی عمارت اب باقی نہیں رہ گئی ہے۔ سلاطین فاطمی کے زمانہ کے برج مربع ہوتے تھے لیکن اس کے برعکس صلاح الدین نے ہمیشہ بیس فٹ چوڑے نیم مدور برج تعمیر کرائے جن میں تیر چلانے کے لئے دو شقوق ہوتے تھے۔ ایک دشمن کے بازو پر نشانہ کے لئے اور دوسرا سامنے کے رُخ پھینکنے کے لئے۔ صلاح الدین کے قلعہ کی بغلی

زیادہ تر یہاں اس شہر سے اس شہر تک ایک ہی فصیل چلی جا رہی ہے لیکن اس کی شہر پناہ میں یہ بات نہیں ہے۔ یا حصے مشرقی دیوار کے جن میں ہر برج کے متعلق چھوٹے چھوٹے چور راستے ہیں۔

صلاح الدین کی ایجاد کردہ قلعہ بندی کے متعلق سب سے زیادہ قابل ذکر چیز خمیدہ دروازہ تھا۔ قدیم زمانہ کے مصر میں بھی تقریباً قریب اس چیز کا سراغ ملتا ہے لیکن بابل۔ بزنطین، روم اور آغاز اسلام کے زمانہ میں اس کا وجود نہ تھا۔ باب المدرج متعلق قلعہ (جو محمد علی کے تعمیر کردہ باب الجدید کی پشت پر چھپا ہوا ہے) مشرقی متوسطین میں اس شان کا سب سے قدیم نمونہ ہے۔ اس قسم کے دروازہ کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ حملہ آور فوج کے ہجوم کو دبایا جا سکے۔ قلعہ کے مقابل باب القرافہ جو ۱۹۲۳ء میں زمین کے اندر سے برآمد ہوا تھا اسی زمانہ کا اسی قسم کا دوسرا نمونہ ہے۔

صلاح الدین کے بھائی العادل نے قلعہ میں مزید استحکام پیدا کیا یعنی بعض مقامات پر بڑے بڑے مربع برج بنوا دئے اور چند جگہوں پر نئے چند قطر والے نیم مدور برج تعمیر کرائے (مثلاً عباسیہ کے سامنے والے دو عظیم الشان برج) مصر میں صلاح الدین ہی نے مدرسہ (مذہبی درسگاہ) کی بنیاد ڈالی۔ خلاصہ یہ کہ دور ایوبی صلاح الدین کے عسکری تعمیرات۔ بنائے مدرسہ۔ عمارتوں میں تراشے ہوئے پتھر کے استعمال میں اضافہ۔ محرابوں کے لئے سنگ مرمر کی تختیوں کی بجائے (مثلاً الصالح ایوبی کی مسجد کی محرابیں) گچکاری میں اعلیٰ درجہ کے نقش و نگار، پہلے پہل پلاسٹر میں شیشہ کے ٹکڑوں کے بیل بوٹوں کی ساخت (مثلاً خلفائے عباسیہ کے مقبروں میں) کے لئے مخصوص و مشہور ہے۔

بحری مملوک (۱۲۵۰ - ۱۳۸۲ء):۔ (۱۳۲) سال کے دور میں اس خاندان کے ۲۵ سلاطین ہوئے جن میں سے بعض نے کئی کئی مرتبہ مختلف اوقات میں سلطنت کی۔ مملوک کے لغوی معنی غلام ہیں۔ یہ سلاطین مصر کے زرخرید غلام تھے جو فن سپہ گری کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حرس الملک (Body Guard) کے طور پر ملازم ہوتے تھے۔ [illegible] آخر میں یا پائینتہ فرق بہت ہی ترقی کر لئے جاتے تھے یہاں تک کہ غلام خود سلطان ہو گئے۔ بحری اس وجہ سے کہلائے کہ ان کی بارکیں دریائے نیل کے جزیرہ روضہ میں واقع تھیں۔ سلاطین کے دور حکومت میں مسجد کے قدیم طرز میں کچھ اضافہ ہوا۔ چنانچہ اس عہد کے مسجد کی خصوصیات (مثلاً مسجد حکیم میں) عموماً محراب کے آگے ہوتا تھا ایک بہت بڑا گنبد جس میں ۹ قاشیں ہوتی تھیں جیسا کہ مسجد کا جزو ہے (مثلاً بمقام عباسیہ بانی بیبرس اول کی بنا کردہ مسجد میں۔ یا قلعہ کے اندر محمد الناصر کی مسجد السلطانی میں) ان مسجدوں کے شامی مسجدوں کی طرح تین ہی در ہوتے تھے۔ اسی بانیان سلاطین نے مسجدوں کے دو شامی طرز کے بنوائے جو رفتہ رفتہ مصر میں عام ہو گئے۔ اس عہد کا کارنمایاں مدرسہ سلطان حسن ہے (۱۳۵۶-۶۳ء) اس کی ضخامت بہت بڑی ہے۔ طول (۴۹۰) فٹ اور عرض ۳۴۲ فٹ کے قریب ہے۔ اگر کوئی شخص صحن بزرگ کے داخلہ کے پھاٹک میں کھڑے ہو کر اجزائے عمارت کے عظیم الشان تناسب، اس کی اعلیٰ قسم کی آرائش، اس کے جسیم قبوں کی بلندی اور ... اس کے جنوبی مغربی گوشے کے خوشنما میناروں کو دیکھے تو اسے اقرار کرنا پڑیگا کہ یہ مدرسہ دنیا کے عجائبات میں سے ہے۔ اگرچہ بعد کے دور حکومت میں بعض اس سے زیادہ نفیس اور خوشنما یادگاریں تعمیر ہوئیں لیکن عظمت و جلالت کے اعتبار سے یہ مدرسہ اپنی نظیر آپ ہے۔

ان بحری مملوکوں کا عہد صلیبی طرز کے مدرسوں، دروازوں کی آرائش کے لئے گنجان کام۔ سنگ مرمر کے چوکے کے نقش و نگار کی انتہائی ترقی اور تدریجی زوال اور مختلف رنگوں کے سنگ مرمر کے فرش کے لئے بھی مشہور ہے۔

سرکیشیائی مملوک (۱۳۸۲-۱۵۱۷ء):۔ اس عہد کے فن تعمیر میں عہد سابق کے فن تعمیر سے ذرا بھی فرق واقع نہیں ہوا۔ سنگ مرمر کی گچ کے نفیس نقش و نگار کا رواج عہد سابق کے خاتمہ پر جاتا رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد ان کی جگہ کسی اور طرز نے نہ لی تھی۔ ابتدا میں پتھر کی سطح بالکل صاف اور سادہ ہوتی تھی۔ اور صرف سنگ مرمر کی تختیاں جڑی ہوتی تھیں لیکن جب

سے ایران نرم ایک مسالہ ایجاد ہوا تو پھر بہترین نقش ونگار کا رواج عام ہوگیا اس زمانہ میں گنبدی ساخت چوٹی پر پہنچ گئی۔ گنبد عموماً پتھر کے ہوتے تھے لیکن بے حد ہلکے۔ انتہائی درجہ خوبصورت اور نقش ونگار سے آراستہ۔ مثال کے لئے جامع برقوق کے گنبد پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اس عہد کے آخر میں مسجدوں نے مدرسوں کی شکل اختیار کرلی۔

عہد ترکیہ:- ۱۵۱۷ء میں ترکی فتوحات نے پہلے تو دستکاری کی ہر شاخ میں اندیشہ ناک تنزل پیدا کردیا۔ چنانچہ صناعوں کی ایک بڑی تعداد قسطنطنیہ کو روانہ کردی گئی حتیٰ کہ یہ بھی مشہور ہے کہ ان کے چلے جانے سے خود قاہرہ کی بہت سی صنعتیں مفقود ہوگئیں۔ کہا تو یہی جاتا ہے لیکن حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ صنعتوں کے فقدان کی خاص وجہ زر کی کمی تھی۔ اس لئے کہ سلاطین مملوک نے عمارتوں کو شاندار بنانے میں اتنا روپیہ صرف کیا تھا کہ اب اس پایہ کی تعمیر پر صرف کرنے کے لئے بہت ہی کم دولت رہ گئی تھی۔ اس رائے کی تائید میں قلعہ والی سیدی ساریہ کی۔ بولاق میں سنان پاشا کی اور ملکہ صفیہ کی چھوٹی چھوٹی مسجدیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ یورپی اثرات کے تدریجی تنزل نے بادشناسئے مصر کے ہر مقام پر تعمیر کو سخت صدمہ پہنچایا۔ چنانچہ قسطنطنیہ میں جامع نوری جس کی تکمیل ۱۲۶۳ء میں ہوئی اور دمشق پر ایک چشمہ جو ۱۴۹۵ء میں تعمیر ہوا اس بات کے شاہد ہیں کہ اس صدمہ کا اثر مصر میں ۱۸۲۰ء تک نہیں پہنچا تھا۔

مساجد:- اسلامی صناعی کی دو اہم قسمیں ہیں۔ جامع یعنی جمعہ مسجد۔ روزانہ نماز کی مسجد۔ ان دو کے علاوہ ایک اور قسم زاویہ یعنی چھوٹی مسجد ہے۔ قدیم ترین مصری جامع عراقی طرز کی ہے۔ ہر جامع کے مربع صحن کے چاروں طرف رواق ہیں۔ مکہ کے رُخ والے خاص رواق میں ۵ بغلی راستے ہیں۔ (مثلاً جامع ابن طولون جامع الحکیم۔ جامع الازہر میں) یا (۶) ہیں (مثلاً جامع باثبار اول میں) اور باقی دو سمتوں میں صرف د۔ ہیں (مثلاً جامع ابن طولون میں) یا تین ہیں (مثلاً جامع الازہر الحکیم یا باثبار اول میں)

مصر میں عموماً سواد اعظم کے چاروں امام ابوحنیفہ۔ مالک۔ شافعی۔ احمد ابن حنبل کے عقاید مروج ہیں۔ مدرسہ کی بنا گیارھویں صدی عیسوی میں سلاطین سلجوق کے عہد میں پڑی۔ مدرسہ کو ایک قسم کی فقہی درسگاہ سمجھنا چاہیئے جس میں مختلف مذاہب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یا حکومت کے لئے عمال تیار کئے جاتے تھے کبھی کبھی ایک ہی درسگاہ میں مختلف عقاید کی تعلیم ہوتی تھی۔ نورالدین نے مدرسہ کی بنیاد شام میں اور صلاح الدین نے فاطمیین کے زوال کے بعد مصر میں ڈالی تھی تاکہ اس تدبیر سے مخالف عقاید کی تردید کی جاسکے۔

تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں مصری مدرسہ کی ساخت کا یہ انداز تھا۔ وسط میں ایک مربع صحن اور اس کے ہر بازو پر صلیب کی شاخوں کی طرح ایک لوان (وسیع اور کشادہ کمرہ) ہوتا تھا جس کے گوشوں میں داخلہ کے دروازے۔ چھت پر جانے کا زینہ۔ ایوان۔ معلموں کے حجرے وغیرہ ہوتے تھے۔

قبہ دار مسجد میں ایک نقص یہ تھا کہ جب واعظ منبر پر بیٹھ کر وعظ کہتا یا خطبہ پڑھتا تھا تو قبہ کے ستونوں کی وجہ سے سامعین کی شکلیں اچھی طرح نظر نہ آتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چودھویں صدی میں مسجد کی ساخت مدرسہ کی طرز کی ہونے لگی۔

۱۵۱۷ء میں ترکوں کی فتح مصر کے بعد بزنطینی ترکی طرز کے اثر سے معبد نے یہ شکل اختیار کرلی کہ اس کے اوپر ایک بہت بڑا قبہ ہوتا تھا اور اس کے آگے ایک بڑا سا صحن جس کے چھتے میں متعدد گزیاں ہوتی تھیں۔ ابتدا کی مسجدوں کا بیرونی رُخ بالکل سادہ ہوتا تھا اور چہار دیواری میں کئی دروازے ہوتے تھے۔

اندر کی جانب صحن کے وسط میں ایک بڑا سا حوض (فسقیہ) ہوتا تھا جس کے اوپر لکڑی کا گنبد پتلے ستونوں پہ قائم رہتا تھا۔ معبد کی پشت پر محراب۔ منبر۔ دکہ (ستونوں پر قائم کیا ہوا تخت) جس پر مبلغین بیٹھتے تھے تاکہ حاضرین کو بخوبی دیکھ سکیں۔ لالٹین اور جھاڑ چھت سے آویزاں ہوتے تھے۔ جواب عجائب خانہ میں منتقل کردئے گئے ہیں۔

ابتدا میں مسجدوں میں منارے نہ ہوتے تھے اور اذان چھت پر کھڑے ہو کر دی جاتی تھی۔ ابن طولون کی مسجد کا پہلا منارہ غالباً سامرہ کی مسجد کی نقل میں بنایا گیا تھا۔

سلاطین اور اُمراء کے مقبرے عموماً انہیں کی بنا کردہ مسجدوں کے پہلو میں ہوتے تھے - لاش سفید کفن میں لپیٹ کر قبر میں رکھی جاتی تھی سر کعبہ کی طرف کیا جاتا تھا - قبر بالکل سادہ ہوتی تھی -

شاہی محلات کا زمینی فرش پتھر یا گچ کا ہوتا تھا - اور چھت لکڑی کے تختوں سے پٹی ہوتی تھی جس پر رنگین اور سنہرے نقش و نگار ہوتے تھے - محل میں متعدد درجے ہوتے تھے -

عام لوگوں کے مکانات عموماً دو درجے کے ہوتے تھے - نیچے کا درجہ سلاملق (مردانہ حصہ) اور اوپر حریم (زنانخانہ) کہلاتا تھا - پردوکار میں عموماً مشربیہ (یا بالاخانے) ہوتے تھے - آج کل اس طرز کے مکان بہت کم نظر آئینگے -

اب اس زمانہ کے مکانوں میں ذیل کی باتیں پائی جاتی ہیں - بڑے مکان کے عام طور سے دو حصے ہوتے ہیں اور ہر حصہ میں ایک صحن ہوتا ہے - خاص آرام کمروں کا رُخ جنہیں متدارہ کہتے ہیں بالعموم اُتر کی طرف ہوتا ہے تاکہ ہوا بآسانی آجا سکے - گلی کی سمت کی کھڑکیاں زمین سے کافی بلند ہوتی ہیں - باہر سے داخلہ کے در کے سامنے حجاب کی ایک دیوار ہوتی ہے - تاکہ راہ چلنے والوں سے بے پردگی نہ ہو - حرم میں داخلہ کا دروازہ دوسرے صحن میں سے ہوتا ہے - یا پہلے صحن سے بہت فاصلہ پر - مالک مکان کا ملاقاتی کمرہ - نوکروں کے حجرے - باورچی خانہ وغیرہ پہلے صحن کے اطراف میں ہوتے ہیں - صرف بیرونی ملاقات کے کمرہ میں آرائش کا سامان خصوصاً از قسم میز و کرسی وغیرہ اور ایک بڑی سی الماری بھی ہوتی ہے - جسے خزنہ کہتے ہیں - اس کے علاوہ پہلے حصہ میں نشستگاہ ہوتی ہے جسے مقعد یا تختبوش کہتے ہیں - اسے فرش سے ایک یا دو زینہ کی بلندی پر ایک قسم کا برآمدہ سمجھنا چاہئے - اس کے علاوہ سنگ مرمر کے فرش کا ایک چھوٹا صحن بھی ہوتا ہے - یہ سب سلاملق سے متعلق ہوتے ہیں اوپر کے درجہ میں قاعہ ہوتا ہے جسے گھر کے لوگوں کے رہنے کا خاص حصہ کہنا چاہئے - بعض مکانوں میں قاعہ نیچے کے درجہ میں ہوتا ہے (مثلاً بیت محب الدین پر جو اب بہت خستہ حالت میں ہے)

قاعہ کو دراصل ایک طویل مگر تنگ دالان سمجھنا چاہئے جو چھت کی شکل اور بلندی کی مطابقت سے (۳) حصوں میں منقسم ہوتا ہے - درمیانی مربع حصہ کا فرش جسے درقاعہ کہتے ہیں لوان (ایوان) سے ایک زینہ نیچے ہوتا ہے - جملہ ایوانوں کی چوڑائی یکساں نہیں ہوتی چنانچہ ان میں سے سب سے وسیع بڑے لوگوں کی نشست کے لئے مخصوص ہوتا ہے - درقاعہ کی چھت ایک چوبیں گنبد یا لالٹین کی شکل کی ہوتی ہے جس میں رنگین شیشوں والی کھڑکیاں ہوتی ہیں جن کو قمریہ کہتے ہیں - قمریہ پلاسٹر کے تختوں سے بنی ہوتی ہے جن میں سوراخوں کے ذریعہ سے گلدانوں کی شکل کے نقوش بنے رہتے ہیں اور باہر کی جانب ان میں رنگین شیشے جڑ دئے جاتے ہیں - درقاعہ میں عموماً سنگ مرمر کے تختے جڑے ہوتے ہیں اور وسط میں ایک حوض کے درمیان فوارہ ہوتا ہے - ایک جانب دیوار سے ملی ہوئی سنگ مرمر کی خوشنما الماری سی ہوتی ہے جس پر قہوہ کے ظروف رکھے جاتے ہیں - اسے صفہ کہتے ہیں -

ایوانوں کی دیواریں فرش سے (۶) سے (۱۰) فٹ کی بلندی تک سنگ مرمر کے تختوں سے جڑی رہتی ہیں - ان کے اوپر کا حصہ بالکل سادہ اور پلاسٹر کا ہوتا ہے - ایوان کی دیوار میں بھی اکثر دھات کے ظروف رکھنے کے لئے طاقچے بنا دیتے ہیں - ایوان کی چھت عموماً لکڑی کے تختوں کی ہوتی ہے جس پر سنہرے اور رنگین خوشنما بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں اور اسی قسم کی منقش کارنس پر لگی رہتی ہے - ہوا اور روشنی کا داخلہ کمرہ میں دیوار کے نیچے کے حصہ میں مشربیہ اور اوپر کے حصہ میں قمریہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے -

حمام:- حماموں کا بیرونی رُخ عموماً سادہ ہوتا ہے لیکن سوق السلاح والے امیر بشتاق کے حمام میں ایک خوشنما دروازہ ہے

وقالہ:- (گودام - کاروانسرای) :- جسے عموماً اوقالہ کہتے ہیں - کئی منزل کی ایک بہت بڑی عمارت ہوتی ہے جس کے وسط میں ایک وسیع صحن ہوتا ہے نیچے کے طبقہ میں چاروں طرف کمرے بنے ہوتے ہیں جن کے دروازے باہر گلی کی جانب ہوتے ہیں جن میں لوگ دکانیں رکھتے ہیں - اوپر کے درجہ کے کمرے مسافروں یا آبادی کے بعض کم حیثیت لوگوں کی سکونت کے لئے ہوتے ہیں - ان کے سامنے بالاخانے ہوتے ہیں -

موجودہ مصری اسلامی تعمیرات کے مطالعہ کی جانب جو اب تک کم توجہی رہی ہے اس کی خاص وجہ قدیم مصر کے زمانہ کی ہزار ہا برس کی عمارتوں کی کشش ہے کم سیاح ایسے ہوں گے جو اسلامی فن تعمیر کی خوبی کے سلسلہ میں چودھویں اور پندرھویں صدی کے مکانوں کے شاندار رنگ کاری اور بیشمار گنبدوں اور مناروں کی طرح طرح کی خوشنما شکلوں سے متاثر نہ ہوئے ہوں -

ل۔احمد اکبرآبادی

شکتی شالی مزدور

پتھر کی چٹان کاٹنا اس کا کام تھا، وہ ایک پتھر پھوڑ ا تھا۔ محنت سخت اور مزدوری کم، اور ان پر سیٹھ کی گالی گلوچ اسے بہت دکھی کرتی تھی۔ سیٹھ نے ایک روز اسے بہت برا بھلا کہا تو اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر خیال کیا کہ میں سیٹھ ہوتا تو یہ درد شانہ ہوپاتی

آسمانی فرشتہ آیا اور بولا "جا ایسا ہی ہوگا"

ٹھیکیدار ایک روز سیٹھ پر خفا ہوا اور اسے نکال کر اس کو سیٹھ بنا دیا۔ اب اس پر ٹھیکیدار کی مار رہنے لگی اور جب کام کم ہوتا تو ڈانٹ ڈپٹ سہنا پڑتی۔ پتھر پھوڑا سیٹھ بن کر بھی خوش نہ تھا۔ ایک روز ٹھیکیدار نے غصے میں اس کے ٹھوکر ماری۔ خون نکل آیا۔ پتھر پھوڑا دل مسوس کر رہ گیا اور خیال کیا جو میں ٹھیکیدار ہوتا تو ٹھوکریں نہ کھانا پڑتیں۔

آسمانی فرشتہ پھر آیا اور بولا۔ "جا ایسا ہی ہوگا"

پتھر پھوڑا اب ٹھیکیدار بن گیا۔ پیسہ بھی ہوگیا۔ مگر دن رات سرکار دربار میں دوڑنا، خوشامدیں کرنا اور رشوتیں دینا پڑتی تھیں۔ پتھر پھوڑا اب بھی سکھی نہ تھا۔ ایک روز اس نے راجہ کی سواری نکلتے دیکھی۔ آگے پیچھے فوج تھا اور بیچ میں راجہ کی چوکڑی۔ سونے کا چھتر لگا تھا۔ اور چاندی کی چونہریاں ہلائی جا رہی تھیں۔

پتھر پھوڑے نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اور سوچا کہ منتریوں اور انجینیروں کے ڈر نے تو روٹی پانی حرام کر رکھا ہے۔ میں راجہ ہوتا تو کیسا سکھی رہتا۔ پھر آسمانی فرشتہ اترا اور بولا۔ "جا ایسا ہی ہوگا"۔ وہ راجہ بن گیا اور ایک روز اس کی بھی سواری نکلی سونے کا چھتر لگا تھا۔ اور چاندی کی چونہریاں ہلائی جا رہی تھیں۔ مگر وہ بے آرام تھا۔ دکھی تھا کہ کپڑوں کے اندر پسینہ بہہ رہا تھا۔

اس نے سوچا راجہ بھی سکھی نہیں۔ راجہ سے تو سورج زیادہ شکتی مان ہے کاش میں سورج ہوتا! آسمانی فرشتہ پھر اترا اور بولا۔ "جا ایسا ہوگا"

پتھر پھوڑا سورج بن کر چمکنے لگا۔ اس کی کرنوں سے ساری دنیا میں گرمی پھیل گئی۔ ہریالی مرجھانے اور گھاس جلنے لگی۔ ایک روز اچانک بادل گھر آئے اور سورج کی کرنیں کمزور پڑ گئیں۔ پتھر پھوڑے سورج کو بڑا غصہ آیا کہ یہ بادل تو سورج سے بھی شکتی مان ہیں۔ یہ سوچ کر وہ بہت دکھی ہوا اور خیال کیا کہ میں بادل ہی ہوتا۔

آسمانی فرشتہ پھر آیا اور بولا۔ "جا ایسا ہی ہوگا"

پتھر پھوڑا بادل بھی بن گیا۔ پانی برسا۔ سوکھے جنگل ہرے ہوگئے۔ ندی نالے بھر گئے۔ ہوائیں چلیں اور طوفان آئے۔ چاروں طرف پانی ہی پانی ہوگیا۔ گھر، مکان اور آدمی اور جانور غرقاب ہونے لگے۔ لیکن ایک پہاڑی چٹان جیسی کی تیسی کھڑی تھی۔ اس پر پانی کا کوئی اثر نہ تھا۔ طوفان اسے ڈگمگا بھی نہ سکے۔

پتھر پھوڑا بہت دکھی تھا۔ یہ چٹان تو بادلوں سے بھی زیادہ شکتی مان ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ میں چٹان کیوں نہ ہوا۔

آسمانی فرشتہ پھر اترا اور بولا۔ "جا ایسا ہی ہوگا"

پتھر پھوڑا اب چٹان بن گیا۔ اب نہ اسے گرمی سے پسینہ آتا تھا نہ پانی کے طوفان بہا سکتے تھے۔ اب اسے اپنی شکتی پر گھمنڈ تھا۔ ایک روز اسی طرح پتھر پھوڑا ہتھوڑا ہاتھ میں لئے آیا اور چٹان کو توڑنے لگا۔

چٹان پتھر پھوڑے نے سوچا یہ کون ہے جو میرے ٹکڑے اڑائے دے رہا ہے! یہ تو چٹان سے بھی بڑی شکتی رکھتا ہے۔ وہ بہت دکھی ہوا اور ٹھنڈی سانس بھر کر سوچنے لگا میں تو پتھر پھوڑا ہی اچھا تھا"

آسمانی فرشتہ پھر اترا اور بولا۔ "جا ایسا ہی ہوگا"

وہ پھر پتھر پھوڑا بن گیا اسے اپنی شکتی کا گیان ہوگیا۔ اس کی محنت کٹھن تھی اور مزدوری کم، پر وہ اپنی طاقت کے علم سے خوش تھا۔ ساری شکتی اس کے ہات میں ہے۔ سکھ تو اس کا مقدر ہے۔ ساری طاقت کا مالک تو وہ ہے۔ وہ خوش نہ ہوگا تو کون ہوگا! (ماخوذ)

محمد مصلح الدین احمد

مسٹر ٹریگوی لی

روس کا اقوام متحدہ سے مقاطعہ جنگ کوریا اور "چینی عوامی حکومت" کی صیانتی مجلس میں شرکت نے اقوام متحدہ میں زبردست بحران پیدا کر دیا ہے۔ اس وقت اقوام متحدہ مجبور و بے بس ہے اور وہ اُسی موقف پر آ چکی ہے جس میں کہ مرحوم مجلس اقوام تھی جس کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اطالیہ نے حبشہ پر حملہ کیا تھا۔ اور آجکل دنیا دو کیمپوں میں منقسم ہو گئی ہے اور مستقبل قریب میں ان دونوں کے راست تصادم کے قوی امکانات پیدا ہو چکے ہیں۔ ان دونوں گروہوں کی خارجی پالیسی کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ دونوں متوازی راہوں پر گامزن ہیں۔ اور کوئی امید نہیں پھر انہیں ایک اسٹیج پر لایا جائے۔ اور نہ ہی ان دونوں میں مفاہمت کی کوئی صورت ہے۔ یہ نازک صورت حال کمزور اقوام و ممالک کے لئے زبردست الجھن کی باعث ہے۔ کمزور اقوام خصوصاً ایشیائی ممالک کے لئے اپنے غیر جانبدارانہ موقف کو برقرار رکھنا ناممکن ہے۔ اور انہیں لازماً کسی ایک کو ترجیح دینا پڑے گا۔ اب اختلافات کی خلیج دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اختلافات کی خلیج کو کس طرح پاٹا جائے۔

کوریا کی جنگ کے متعلق یہ اظہر من الشمس ہے کہ روس شمالی کوریا کی بالواسطہ اور امریکہ جنوبی کوریا کی بلا واسطہ مدد کر رہا ہے با الفاظ دیگر یہ حریف اقوام کے مفادات کی جنگ ہے۔ کوریا کی جنگ کی حیثیت ایک خانہ جنگی یا مقامی لڑائی کی نہیں بلکہ یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ بن گیا ہے۔ جس کے اثرات ساری دنیا پر مترتب ہوں گے۔ جنگ کے شعلے جو آجکل کوریا میں محدود ہیں ممکن ہے کہ کل ان کی لپیٹ میں ساری دنیا آ جائے۔ آجکل تمام بڑی و چھوٹی طاقتیں متفکر ہیں کہ کیا کیا جائے۔ ہندوستان نے بھی دنیا کو تیسری عالمگیر جنگ کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے مقدور بھر کوشش کی۔ اب تمام اقوام کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ جنگجو اقوام کی اس پھیلائی ہوئی تاریکی میں ہمیں ایک روشنی دکھائی دیتی ہے۔ جس کا سہرا مسٹر ٹریگوی لی کے سر ہے۔ مسٹر لی نے تیسری عالمگیر جنگ کے بادلوں کو ہٹانے اور ہمیشہ کے لئے امن قائم کرنے کے لئے حتی الامکان کوشش کی۔ انہوں نے کوشش کی کہ ان تمام روکاوٹوں کو دور کیا جائے جو ایک پر امن حل کی راہ میں حائل ہیں۔ امن عالم کی صیانت کے لئے آپ ماسکو بھی تشریف لے گئے اور وہاں مارشل سٹالن نے مسٹر وشنسکی سے قیام امن کے مسائل پر گفتگو کی اور واپسی میں فرانس کے صدر اور برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ایٹلی و مسٹر ٹرومین و ڈین ایچیسن سے تفصیلی ملاقات کی۔ اور انہیں ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی اور موجودہ تعطل کو دور کرنے کے لئے موزوں طریقہ کار کے انتخاب کا مسئلہ ان کے زیر بحث رہا۔ مسٹر لی اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے مصروف تھے ادھر کوریائی جنگ کا آغاز ہوا۔ اور دنیا کے عوام کی توجہ امن کے اس پر خلوص شیدا سے ہٹ کر کوریا پر مرکوز ہو گئی۔ لیکن مسٹر لی کو اب بھی اعتماد ہے کہ موجودہ تعطل کو پر خلوص طور پر دور کیا جا سکتا ہے اور مستقل امن کی راہ نکالی جا سکتی ہے۔

ہر وہ مصنف یا ادیب جو امن چاہتا ہے جس کو امن سے محبت ہے اس کا یہ اولین فرض ہے کہ اُن افراد کا ذکر کرے جو قیام امن کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ اسی لئے یہاں مسٹر لی کی سوانح اور ان کی کوششوں کا ذکر کیا جائے گا۔

مختصر حالات

مسٹر لی ناروے کے باشندے ہیں۔ قدرتی طور پر ناروے کے جغرافی و معاشی نقطہ نظر سے گہرے تعلقات سوویٹ روس و مغربی یورپ کے ممالک سے رہے ہیں۔ اس لئے آپ ان دونوں میں مفاہمت کا بہترین ذریعہ ہیں۔ مسٹر لی کا بچپن پردہ گمنامی میں بسر ہوا۔ آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ آپ نے کوئی پیشہ اختیار نہ کیا تھا۔ آپ ابھی پندرہ سال کے تھے کہ عمالی جماعت

کے رکن بن گئے -

مسٹر لی کا شمار دنیا کے اُن مشاہیر میں ہے جنہوں نے آغوشِ مفلسی میں پرورش پائی اور اپنی عمر کا بیشتر حصہ پردہ گمنامی میں بسر کیا مگر اپنی محنت ذہانت و تدبر سے ترقی و نیک نامی کے آسمان پر سورج بن کر چمکے -

غربت کا یہ عالم تھا کہ آپ اور آپ کی بیوہ والدہ کا گزر بہت مشکل سے ہوتا تھا - آپ صبح میں مدرسہ جاتے اور دوپہر میں مزدوری کرتے اور رات میں مطالعہ کیا کرتے - چنانچہ آپ کی اس محنت کا ثمر اس صورت میں ظہور پذیر ہوا کہ آپ نے میٹرک کے امتحان میں اعزازی کامیابی حاصل کی - اس لئے حکومت ناروے نے آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ منظور کیا - آپ زمانہ طالب علمی میں ٹریڈ یونین کے رکن بھی تھے -

وزیر اغذیہ ناروے

۱۹۳۹ء میں یہ غریب ماں باپ کا غریب بچہ ناروے کا وزیر اغذیہ و تجارت مقرر ہوا - آپ اس وقت وزیر تجارت بنے جبکہ ناروے کا جنگی موقف از حد کمزور تھا جب ناروے پر جرمنی کا قبضہ ہوا تو آپ نے بڑی دانشمندی یہ کی کہ کوئلہ اور گیہوں کو جرمنوں کے قبضہ میں جانے سے بچا لیا - آپ نے ناروے کی شکست کے بعد بھی ہمت نہ ہاری بلکہ برابر برطانوی حکمہ سے ربط قائم رکھے -

بحیثیت وزیر خارجہ

۱۹۴۰ء میں آپ کو ناروے کا عارضی طور پر "وزیر خارجہ" بنایا گیا - لیکن ۱۲ر فروری ۱۹۴۲ء سے آپ مستقل وزیر خارجہ کی حیثیت سے کام کرنے لگے -

بحیثیت مصنّف

مسٹر لی نہ صرف سیاستدان و مدبر ہیں بلکہ آپ ایک مصنّف بھی ہیں ۱۹۳۱ء میں آپ نے دو کتابیں تحریر فرمائیں ایک کتاب "مخالف مزدور قوانین کے خلاف جنگ" اور دوسری "مزدوروں کے مسائل کے حل کے لئے ایک نیا قانون" کے عنوان سے شائع ہوئیں - ان ہی ایام میں آپ نے "جوگن ہیں" نامی ایک بیوہ سے شادی کی جو ناروے کی وزیر بھی تھیں -

عورتوں کا بہی خواہ

مسٹر لی کو عورتوں کے حقوق کا بہت خیال رہتا ہے - آپ کی رائے یہ ہے کہ ہمیں عورتوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں کام کرنے کا کافی موقعہ دینا چاہیئے - جہاں کہیں بھی اور جس عہدے پر بھی آپ فائز رہے آپ نے عورتوں کو کامل حقوق دیئے اور مختلف محکمہ جات میں ملازمت دی -

اسپورٹس سے دلچسپی

مسٹر لی کو اسپورٹس سے بہت دلچسپی ہے چنانچہ آپ کا شمار فٹ بال ڈیٹنس کے بہترین کھلاڑیوں میں کیا جاتا ہے - ناروے سے جلاوطنی کے بعد آپ لندن آئے - فٹ بال سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ آپ ان پریشان کن ایام میں بھی پابندی سے فٹ بال کھیلا کرتے تھے -

معتمد عمومی اقوام متحدہ

مسٹر لی ناروے کے پہلے فرد ہیں جنہیں اقوام متحدہ کا "معتمد عمومی" مقرر کیا گیا ہے - مسٹر اسٹیٹ ٹی مین نے معتمدی کے لئے آپ کا نام پیش کیا جس کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے منظور کر لیا - یہ اقوام متحدہ کا کلیدی عہدہ ہے - آپ کی مدت ملازمت ستمبر ۱۹۵۰ء میں ختم ہو گئی - اس مہینے جب دوبارہ معتمد عمومی کا انتخاب ہوا تو اقوام متحدہ نے پھر آپ کو مزید تین سال کے لئے منتخب کر لیا - بڑی طاقتوں میں روس نے آپ کی مدت ملازمت میں توسیع کی مخالفت کی اور کہا کہ اگر اب کے پھر آپ کا انتخاب عمل میں لایا گیا تو حکومت روس اس انتخاب کو غیر آئینی قرار دے گی لیکن روس کی مخالفت کے باوجود آپ کا انتخاب عمل میں آچکا ہے اور مزید تین برس کے لئے معتمد عمومی کا عہدہ دوبارہ آپ کے سپرد کیا جا چکا ہے - مسٹر لی کے دوبارہ انتخاب کی مخالفت میں بعض مسلم ممالک بھی روس کے ہمنوا تھے -

مسٹر لی کے دوبارہ انتخاب سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آپ نے دُنیا میں امن قائم رکھنے کی جو دوڑ دھوپ شروع کی تھی اُسے آپ پوری کوشش سے جاری رکھیں گے اور مختلف ممالک میں تصادم کے جو امکانات نظر آتے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے -

مسٹر لی کا امن کیلئے بیس سالہ لائحہ عمل

مسٹر ٹرگوی لی نے نہ صرف بحث و تمحیص کے ذریعہ قیام امن کی ممکن کوشش کی بلکہ آپ نے قیام امن کے لئے ایک بیس سالہ

پروگرام بھی پیش کیا ہے۔ جس میں اُن تمام امور کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے جن کے حل کے بعد ہی مستقل طور پر امن کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ کا امن پروگرام دس نکات پر مشتمل ہے۔ جو درج ذیل ہیں۔

(۱) سلامتی مجلس کے موقتی یا خصوصی اجلاسوں کا انعقاد جس میں بڑی طاقتوں کے وزرا خارجہ شریک رہیں۔ ان اجلاسوں کے انعقاد کے لئے یورپی مقامات کی تجویز کی گئی ہے

(۲) جوہری توانائی کے کمیشن کے جدید اجلاس منعقد ہوں جس میں جوہری توانائی پر بین الاقوامی نگرانی سے متعلق دو سالہ تعطل کی از سر نو جانچ پڑتال کی جائے۔

(۳) دیگر ہتھیاروں کے بارے میں کمیشن کے اجلاس کئے جائیں۔ یاد رہے کہ بڑی طاقتوں کے غیر جوہری ہتھیاروں کی تخفیف کے مسئلہ پر تعطل پیدا ہو گیا تھا۔

(۴) مسدود شدہ ملٹری اسٹاف کمیٹی کو پھر سے بحال کرنے کی کوشش کی جائے جس کا فریضہ ایک بین الاقوامی پولیس جمعیت کے قیام کا ہے۔

(۵) اقوام متحدہ کی رکنیت کے لئے تمام نئے امیدواروں کا داخلہ جس میں مغربی دول نیز اس کے پیش کردہ نام شامل ہیں ان کی تعداد جملہ (۱۴) ہے۔

(۶) پسماندہ علاقوں کی امداد کے لئے اقوام متحدہ کے لائحہ عمل کی مزید حمایت۔

(۷) خصوصی اداروں مثلاً ادارہ عالمی صحت۔ غذائی و زرعی ادارہ کی حمایت جس میں اپنے لائحہ عمل کو روبہ کار لانے میں دقتیں پیش آرہی ہیں۔

(۸) حالیہ اعلان کردہ انسانی حقوق کو روبہ عمل کے لئے ایک طاقتور حکومتی محاذ قائم کیا جائے۔

(۹) تازہ مزید امداد ٹرسٹیشپ کونسل کو دی جائے تاکہ وہ غلام ممالک کے باشندوں کی مدد کرے۔

(۱۰) بین الاقوامی قانون میں ترمیم جو کہ اقوام متحدہ کے بین الاقوامی قانون کمیشن نے تیار کیا ہے۔



ہم امن چاہتے ہیں

بھارت پارلیمنٹ کے سرمائی اجلاس میں جو ۱۴ نومبر ۱۹۵۰ء کو شروع ہوا راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے مندرجہ ذیل تقریر کی۔

ممبرانِ پارلیمنٹ :۔

ساڑھے تین ماہ پہلے ہم یہاں پارلیمنٹ کے ایک خاص اجلاس میں بین الاقوامی معاملات میں پیدا شدہ اس نازک صورت حالات پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے، جس کے باعث متحدہ اقوام کو کوریا میں جارحانہ حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے کارروائی کرنا پڑی۔ بہت سی مشکلات اور آزمائشوں سے گذرنے کے بعد جارحانہ قوتوں کو روک کر پیچھے دھکیل دیا گیا۔ لیکن حال ہی میں واقعات نے صورتِ حالات کو زیادہ نازک بنا دیا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امن کی بھوکی دُنیا جنگ کے دہانے پر کھڑی ہے۔ ہمارے اپنے ملک میں بھی ہمیں بہت سے حادثوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ہمارے ملک کی شمال مشرقی ریاست آسام میں بھیانک زلزلہ اور اس کے بعد سیلاب تباہی کا موجب ہوا۔ دیگر کئی ریاستوں میں بھی خوفناک طغیانیاں تباہی اور بربادی پھیلانے کا باعث ہوئیں۔ بعض دیگر علاقوں میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں بلکہ آئندہ موسم کی فصلوں پر بھی نہایت بُرا اثر پڑا۔ مختصر یہ کہ آج ہم نہایت خطرناک اندرونی اور بیرونی آزمائش کے موقعے پر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ان مصیبتوں اور خطرات کا مقابلہ کرنے اور اپنے عوام کی بہتری اور انسانیت کے امن کے لئے ہمیں پوری دانشمندی جرأت اور احتیاط سے کام لینا ہوگا۔

۲۔ گذشتہ مشکل مہینوں میں میری سرکار دُنیا میں امن برقرار رکھنے اور کوریا کی جنگ کو پھیلنے سے روکنے کی مسلسل کوشش کرتی رہی ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ امن اس وقت انسانیت کی اولین ضرورت ہے، لیکن اس کے باوجود خوف کے زیر اثر دُنیا کی قومیں ایسی سمت کھنچی جا رہی ہیں جو امن کے لئے خطرناک ہے۔ امن عالم اس صورت میں یقینی ہو سکتا ہے جب دنیا کی بڑی قومیں اس کی تمنا اور اس کے لئے جدوجہد کریں۔ اگر ان میں سے ایک بھی جنگ کو ناگزیر خیال کرے تو جنگ شروع ہو سکتی ہے۔ اس پارلیمنٹ نے کئی مرتبہ امن کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ میری حکومت اپنی پوری قابلیت کے ساتھ اس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرتی رہے گی۔ میں صدق دل سے یہ امید کرتا ہوں کہ لیک سکسیس میں جو سیاست دان جمع ہیں۔ اور جو اقوامِ عالم کی خارجہ پالیسیوں کے ذمہ دار ہیں وہ جنگ کو پھیلنے سے روکنے کی کوششوں میں کامیاب ہوں گے۔ جارحانہ حملے کا مقابلہ ضروری ہے اور لڑائی کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ جنگ بذاتِ خود ایک ایسی لعنت ہے جو اپنے ہمراہ مزید بھیانک برائیاں لانے کا باعث ہوتی ہے۔ جس امن کے ہم متلاشی ہیں اور جو قابلِ پذیرائی ہے، وہ زندگی کا امن ہے قبر کا سکون نہیں۔ کوریا میں کشیدگی پیشتر ازیں ہی اس ملک اور اس کے عوام پر بھیانک تباہی نازل کر چکی ہے، اور اگر جنگ پھیل گئی تو دوسرے ممالک کا بھی یہی حشر ہوگا۔ میری یہ پر ارتھنا ہے کہ دنیا کی بڑی قوموں کے نیتا جن پر بڑی بھاری ذمہ داریاں ہیں مل بیٹھ کر دنیا کو بچانے کی کوئی راہ نکالیں گے۔

۳۔ میری حکومت ہمیشہ اپنے بڑے ہمسایہ ملک چین کے ساتھ دوستی کی پالیسی پر گامزن رہی ہے۔ لیکن ہمارے لئے یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ چین کی حکومت نے تبت پر فوج کشی کا راستہ اختیار کیا حالانکہ ان پر مصالحانہ گفت و شنید کا دروازہ کھلا تھا۔ تبت نہ صرف بھارت کا ہمسایہ ملک ہے بلکہ ہزارہا سال سے اس کے ہمارے ساتھ معاشی اور دیگر گہرے تعلقات قائم رہے ہیں۔ اس لئے لازمی امر ہے کہ تبت میں ہونے والے واقعات سے بھارت کو تشویش پیدا ہو۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اس پُرامن ملک کی اندرونی خود اختیاری کو برقرار رکھا جائے گا۔

۴۔ حال ہی میں مہاراجہ نیپال اور ان کی حکومت کے مابین بعض اختلافات پیدا ہو جانے سے ہز میجسٹی شاہ نیپال اور ان کے خاندان کو کھٹمنڈو میں ہمارے سفارت خانے میں پناہ لینی پڑی۔ اور انھوں نے بھارت آنے کی خواہش ظاہر کی۔ مہاراجہ اب دہلی آچکے ہیں اور ہم نے ان کا اپنے ایک معزز مہمان کے طور پر استقبال کیا ہے۔ نیپال ایسا ملک ہے جس کے بھارت کے ساتھ نہایت قریبی اور گہرے تعلقات ہیں۔ صرف چند ماہ پہلے ہی بھارت اور نیپال کے مابین دوستی کے معاہدے پر دستخط ثبت کئے گئے تھے۔ میری حکومت کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی کہ نیپال کی آزادی کی قدر کی جائے۔ اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات برقرار رکھے جائیں تاکہ اس کے عوام سیاسی اور اقتصادی ترقی حاصل کریں۔

۵۔ حال کے قدرتی حادثوں اور بربادیوں کی وجہ سے ہمارے ملک کی خوراکی صورت حالات پر نہائت خراب اثر پڑا ہے۔ پکی ہوئی فصلیں طغیانیوں کی وجہ سے تباہ ہو گئیں۔ اور کئی مقامات پر اناج کے ذخیرے بھی سیلاب میں بہہ گئے۔ اس سے بھی بڑھ کر تشویش انگیز امر یہ ہے کہ بہت وسیع علاقوں میں اور خاص کر بہار میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے آئندہ موسم کی فصلوں پر بھی نہائت برا اثر پڑا ہے۔ اس قدر بھیانک خشک سالی آج تک کبھی سنی یا دیکھی نہیں گئی۔ ان حالات نے مجبور کر دیا ہے کہ ہم غیر ملکوں سے بہت بڑی مقدار میں اناج درآمد کریں۔ بایں ہمہ اغلب ہے کہ اس سال کے آخری ہفتوں میں ہمیں خطرناک مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ ان حالات میں اشد ضروری ہو گیا ہے کہ بھارت میں جس قدر اناج ہمیں دستیاب ہو سکتا ہے ہم اس کو بہترین طریق پر استعمال کریں۔ ایسے موقعہ پر اناج کو نجی طور پر چھپا کر رکھنا سب سے زیادہ سنگین جرم ہے جن ریاستوں کے پاس کچھ بھی فالتو خوراکی جنس ہے انھیں وہ ان علاقوں کو دے دینی چاہیئے جن کے پاس خوراک کی کمی ہے۔ ہم سب کو خوراک کو بہر طور ضائع کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے اور حاجتمندوں کی مدد کرنی چاہیئے۔ صورت حالات سخت خوفناک ہے۔ اس کو کم خیال کرنا یا بڑھا چڑھا کر بیان کرنا اور اس بارے میں خوف و ہراس پھیلانے والا لب و لہجہ اختیار کرنا سخت نقصان رساں ہوگا۔ ہمیں حالات کو پوری طرح سمجھ لینا چاہیئے پختہ عہد اور مستقل ارادے سے ہر مشکل جھیلتے ہوئے ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

۶۔ ہماری خوراکی صورت حالات پر اثر انداز ہونے والے خوفناک حادثوں اور ان مشکلات کے باوجود جو آج ہمیں پیش ہیں۔ ہم خوراک کے بارے میں خود کفیل بننے کے پروگرام ترک نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم نے خوراک کی پیداوار بڑھانے کے بارے میں کافی ترقی کر لی ہے اور آئندہ برس ہم زیادہ بہتر کامیابی حاصل کرنے کی امید رکھتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمیں اسوقت خوراک کی جس نازک صورت حالات کا سامنا ہے اس کے ذمہ دار صرف چند غیر معمولی واقعات ہیں۔ اور اس امر کی ہرگز کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم مارچ ۱۹۵۲ء تک اپنے ملک کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی خوراک پیدا کرنے کے مقصد کو ترک کر دیں۔

۷۔ اشیا کا نرخ چڑھ جانے کے باعث جو حالات پیدا ہوئے ان کی وجہ سے میری حکومت نے گیارہ اشیا کی سپلائی اور نرخوں پر کنٹرول کرنے درآمد کی پابندیاں کو نرم کرنے اور غیر مجلسی حرکتوں کو روکنے کے لئے ضروری کارروائی کی ہے لیکن یہ اقدامات عوام کے سرگرم تعاون سے ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔

۸۔ مجھے افسوس ہے کہ بھارت اور پاکستان کے مابین تجارت زیادہ تر بند پڑی ہے۔ کیونکہ پاکستان کے روپے کی مساوی قیمت کے متعلق کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا ہے۔ یہ توقع تھی کہ بین الاقوامی مالی فنڈ کے حالیہ پیرس اجلاس کے فوراً بعد ہی اس مسئلے کا فیصلہ ہو جائے گا۔ لیکن اس پر غور کرنا ملتوی کر دیا گیا۔ میری حکومت نے بھارت اور پاکستان کے مابین دو بڑے اہم سوالات کا آخری فیصلہ کرنے کے متعلق حکومت پاکستان کو ایک تجویز پیش کی ہے کہ نکاسی جائدادوں اور نہروں کے پانی کے مسائل کا تصفیہ کرنے کا کام اعلیٰ ترین پائے کے ٹریبونل کے سپرد کر دیا جائے۔ مجھے بھروسہ ہے کہ یہ تجویز منظور کر لی جائے گی۔ اس طرح دونوں ملکوں کے مابین تنازعہ کے دو بڑے وجوہ دور ہو جائیں گے۔ نکاسی جائدادوں کا مسئلہ بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کے لوگوں کی بہت بڑی تعداد سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کا جلدی کوئی فیصلہ ہو جانے سے نہ صرف ان لوگوں کو سہولت مہیا کرنے کا باعث ہوگا بلکہ دونوں ملکوں کے مابین تعلقات کو بہتر بنانے کا باعث بھی ہوگا

۹۔ مجھے خوشی ہے کہ ۸ اپریل سنہ ۱۹۵۰ء کے بھارت پاکستان معاہدے سے حالات میں بتدریج اصلاح ہوئی ہے اور تارکان وطن مسلسل اپنے گھروں کو واپس جا رہے ہیں۔

۱۰۔ اب یہ پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم ملک کی ترقی کے لئے اپنے محدود ذرائع کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور ہر ایسے وسیلے کی چھان بین کریں

جو ملکی ترقی میں مدد دے سکے۔ اس ترقی کے بغیر ملکی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلے میں پلاننگ کمیشن مرکزی حکومت کی ونارتوں اور ریاستی حکومت کے تعاون سے ابتدائی اور طویل المیعاد منصوبہ طیار کرنے کی غرض سے بڑی جانفشانی سے کام کر رہا ہے۔ امید ہے کہ ابتدائی منصوبہ بہت جلد ملک کے سامنے پیش کر دیا جائے گا دریں اثنا بھاکڑہ۔ دامودر اور ہیراکُد کے بڑے دریائی منصوبے ترقی پذیر ہیں۔ سائنسی کھوج نے بھی کافی ترقی کی ہے اور کئی نئی تجربہ گاہیں قائم کر دی گئی ہیں۔

۱۱۔ بے گھر لوگوں کی بحالی کے کام میں ترقی ہوئی ہے۔ بعض نئی بستیاں مثلاً فریدآباد۔ نیلوکھیڑی۔ راجپورہ۔ کاندلا اور زولیا مکمل ہو گئی ہیں اور ان میں لوگ آباد ہو چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے بے گھر لوگوں کی صورت کچھ غیر یقینی ہے۔ کیونکہ وہ ادھر اُدھر آ جا رہے ہیں۔ ان میں سے گیارہ لاکھ بے گھر لوگوں کو مختلف اسکیموں کے تحت اراضی پر یا دکانوں میں بسا دیا گیا ہے۔ تاہم ابھی تک ڈھائی لاکھ لوگ کیمپوں میں ہیں۔ یہ زیادہ تر مغربی بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ۔ تری پورہ اور آسام میں ہیں کیمپوں کی اس آبادی کو بحال کرنے کے اقدام کئے جا رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان سے آنے والے لوگوں کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

۱۲۔ مغربی پاکستان سے آنے والے لوگوں کے متعلق اب زیادہ صحیح اعداد شمار دستیاب ہیں۔ ان کی کل تعداد قریباً پچاس لاکھ ہے۔ ان میں سے چھ لاکھ کنبوں کو جو قریباً تیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہیں اراضی کی الاٹ منٹ کے ساتھ کچھ امدادی سامان بھی دیا گیا۔ ان میں سے زمین حاصل کر لینے والے پانچ لاکھ لوگوں نے قصبوں میں رہنے کو ترجیح دی۔ اس طرح قصبوں میں بے گھر لوگوں کی تعداد قریباً پچیس لاکھ ہو گئی۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنے لئے خود انتظامات کئے۔ دوسروں کے لئے حکومت کو مکانات اور روزگار مہیا کرنے تھے چنانچہ بیس لاکھ ستر ہزار لوگوں کو نکاسی مکانوں۔ مرمت شدہ بارکوں اور نئے مکانوں میں رہنے کی جگہ دی گئی۔ اس کے علاوہ نجی تعمیر کے لئے قطعات اراضی کو قابل تعمیر بنایا گیا ہے اور ملک بھر میں مکان زیر تعمیر ہیں

۱۳۔ روزگار مہیا کرنے کے سلسلہ میں ۹۰ ہزار لوگوں کو دوکانیں اور تجارتی مقام الاٹ کئے گئے ہیں اور قریباً سترہ لاکھ لوگوں کو قرضہ یا ملازمت یا پیشہ ورانہ اور فنی تربیت کی صورت میں امداد دی گئی ہے۔ اس طرح مغربی پاکستان کے بے گھر لوگوں کی بحالی اور آبادکاری کے لئے بہت کچھ کیا جا چکا ہے۔ اگرچہ جو کچھ کیا گیا ہے اس کا معیار بدقسمتی سے بہت بلند نہیں۔ نکاسی جائدادوں کا مسئلہ حل ہو جانے سے اس مسئلے کے حل ہونے میں بہت مدد ملے گی۔

۱۴۔ میری حکومت نئے آئین کے مطابق پارلیمنٹ اور ریاستی مجالس قانون ساز کے جلد از جلد چناؤ کرانے کی خواہاں رہی ہے۔ جس پیمانے پر بھارت کے یہ چناؤ ہو رہے ہیں دنیا کی تاریخ میں کسی ملک میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اندازہ ہے کہ رائے دہندوں کی تعداد سترہ کروڑ سے بھی زیادہ رہے گی۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو رائے دہندوں کی فہرستوں کی طیاری اور حلقہ ہائے انتخابات کی حد بندی کے لئے بڑی محنت درکار ہے۔ اپریل مئی ۱۹۵۱ء میں انتخابات کرانے کی تمام طیاریوں کو مکمل کرنے کے لئے کوشش کی گئی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اس سلسلے میں ایک قطعی تاریخ مقرر کر دی جائے۔ کیونکہ بعد ازاں تبدیلی تمام متعلقین کے لئے پریشان کن ہو گی۔ صورت حال یہ ہے کہ چناؤ سے متعلق بہت سے معاملات کے بارے میں پارلیمنٹ نے ابھی اپنی کارروائی مکمل نہیں کی جو کام ہو چکا ہے وہ مختلف مفروضوں پر ہے جن کے ٹھیک ثابت ہونے کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرح یہ معاملہ غیر یقینی رہتا ہے کچھ ریاستوں نے ہمیں یہ اطلاع بھیجی ہے کہ ان کے لئے اپریل مئی ۱۹۵۱ء تک چناؤ کے لئے طیاری کر لینا ممکن نہیں۔ میری حکومت نے اس معاملے پر تمام پہلوؤں سے اور سرکاری و غیر سرکاری نقطہ ہائے نظر کے پیش نظر غور کیا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اپریل مئی کی کوئی تاریخ مقرر کرنے سے شدید مشکلات پیدا ہوں گی اور بحالات موجودہ اسے ایک قطعی تاریخ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ عام چناؤ کی قطعی تاریخ ۱۹۵۱ء کے نومبر کے پچھلے نصف یا دسمبر کے شروع میں ہوگی۔

۱۵۔ آپ کی منظوری کے لئے بھارت سرکار کی آمدنی اور اخراجات کے تخمینے کا ایک ضمنی بیان آپ کے سامنے رکھا جائے گا۔

۱۶۔ اس وقت اکیس بل پیش کئے جا چکے ہیں ان میں سے کچھ جو سلیکٹ کمیٹیوں کے زیر غور ہیں اس اجلاس کے دوران آپ کے سامنے مع سفارشات پیش کر دیئے جائیں گے۔

۱۷۔ پارلیمنٹ کے پچھلے اجلاس کے بعد آٹھ آرڈی نینس جاری کرنے کی ضرورت پڑی۔ ان میں چار کا تعلق ایسے معاملوں سے ہے جن کے بل آپ کے پاس زیر تکمیل ہیں باقی چار کو نئے بلوں کی صورت میں آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

۱۸۔ معاہدہ کے علاوہ متعلق قانون سازی کی کچھ اور مدیں اور تحریکیں ابھی ہیں جو اس اجلاس میں آپ کے سامنے پیش کی جائیں گی۔ ان میں سے مندرجہ ذیل نسبتاً زیادہ ضروری ہیں: نمائندگی عوام (ترمیم) کا بل۔ ٹیکس (ترمیم) کا بل اور مالیاتی کمیشن بل۔

ع۔م

نئی کتابیں اور رسالے

کتابیں

نیادور پبلشرز ایجوکیشنل اسٹور بازار دہلی۔

پریم چند مصنف ہنس راج رہبر۔ قیمت تین روپے بارہ آنہ۔

پریم چند اردو میں زندگی آموز اور زندگی بخش افسانے کے جنم داتا تھے۔ گھن کھائے ہوئے فرسودہ نظامِ معاشرت کے دشمن تھے۔ کسان اور مزدور کے لئے اپنے سینے میں ایک درد مند دل رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں یہ تمام باتیں ملتی ہیں۔ ان کی اپنی زندگی بڑے نشیب و فراز کی زندگی تھی۔ اس کا عکس ان کی تحریروں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ ہنس راج رہبر کی یہ پہلی تنقیدی کوشش محض پریم چند کے کارناموں کو اُجاگر کرنے کے لئے نہیں بلکہ غالباً زندگی اور ادب میں ہم آہنگی ثابت کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ مصنف نے بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ سید احتشام حسین نے پیش لفظ میں مصنف کی کاوش کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

"ہنس راج رہبر نے پریم چند کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے تو اس فضا کو ڈھونڈ نکالا ہے جس میں پریم چند پیدا ہوئے، پلے اور بڑھے اور جس کی کشمکش میں ان کی ذہنی نشو و نما ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے خود پریم چند کی زندگی کا عکس ان کے افسانوں میں تلاش کیا ہے۔ اس طرح پریم چند کی حقیقت نگاری کو ان خارجی حالات کا عکس بنانے کی کوشش کی ہے جن سے ان کے اصول کی تخلیق ہوئی تھی۔"

خود مصنف کو کتاب کی افادیت کا یقین ہے۔ اور یقینی طور پر کتاب کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک پریم چند کو جانچنے اور پرکھنے کا تعلق ہے یہ کتاب اس میں ضرور مدد و معاون ہوگی۔

سید عبدالرزاق بک سیلر عابد روڈ حیدرآباد دکن

رُباعیاتِ عمر خیام مترجمہ محشر نقوی۔ قیمت۔ درج نہیں۔

مترجم نے خیام کے مشہور مترجم Fitz Gerald کے انگریزی ترجمے کو پیش نظر رکھ کر رباعیوں کا اُردو نظم میں ترجمہ پیش کیا ہے۔ ترجمے میں اصل کی لطافت باقی نہیں رہتی لیکن ترجمہ در ترجمہ تو اصل سے بہت دُور چلا جاتا ہے۔ یہی حال بعض مقامات پر اس ترجمے کا ہے جس و زوائد کی بھرمار ہے۔ اصل رباعیوں کے عوض Fitz Gerald کا انگریزی ترجمہ ہی اردو کے ترجمے کے ساتھ ساتھ کتاب میں درج کیا گیا ہے۔ ساری کتاب پڑھ کر بھی خیام کے لطفِ بیان سے کیف اندوزی حاصل نہیں ہوتی۔

ایک مشہور رباعی اور اس کا ترجمہ ذیل میں درج ہے۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ ترجمے میں ابھی ترقی کی بہت گنجائش ہے۔

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
وانکس کہ گناہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

ہے ہستِ درازِ عصیاں سے ہر ایک گریباں چاک یہاں
یاں کون جیا نا کردہ گنہ ! یہ ہمارا ہے ناپاک جہاں
تجھ سے تھی امیدِ عفوِ خطا برعکس سزا ہوتی ہے عطا
پھر تجھ میں مجھ میں فرق کہاں اللہ اور مشتِ خاک کہاں

کتاب حسن ظاہر کی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ اور برمحل تصاویر سے بھی مزین ہے۔

ملنے کا پتہ۔ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن۔

اُردو ادب کے معمار قیمت دو روپے۔ کتابت طباعت اچھی۔

اردو ادب کے معماروں کے اس تذکرے کو اردو ادب کے معماروں ہی نے قلم بند کیا ہے۔ محمد قلی سے لے کر تلوک چند محروم تک چھتیس شعرا و ادبا کا یہ مختصر تذکرہ اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس کا لکھنے والا ایک نہیں۔ لکھنے والوں میں سب کے سب نام مستند اہل قلم ہیں۔ مشہور تصانیف کے دلچسپ اقتباسات کا یہ مجموعہ یقیناً بہت مقبول ہوگا۔

فتراک محترمہ جہاں بانو نقوی ایم۔اے (عثمانیہ)، ستائیس مختصر مضامین کا یہ مجموعہ حیدرآباد انجینئرنگ پریس سے شائع ہوا ہے۔ محترمہ کا اندازِ بیان سلجھا ہوا اور شگفتہ ہے۔ عیادت کے گُر، تعزیت کے اصول دلچسپ مضامین ہیں۔ ادب کے متعلق محترمہ کا نظریہ ان الفاظ سے واضح ہو جائے گا۔

"ہمارا منشا یہ کب ہے کہ ادب کو محض جذبات و فن کاری کے لئے ہی وقف کر دیا جائے۔ اس میں صرف تخیل ہی تخیل کی حکومت ہو۔ نہیں، بلکہ اس کا اصل مقصد تو یہ ہے اور یہ ہونا چاہیئے کہ اس کو زندگی سے قریب بلکہ قریب تر کر دیا جائے۔ مزدور، مفلس، کاشتکار، مظلوم کی سرگزشت بیان کر کے دنیا کو ان کا ہمدرد بنا دیا جائے۔"

قیمت اور ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔

شعر و نغمہ ملنے کا پتہ محمد یعقوب عثمانی محلہ گھاٹی اورنگ آباد (دکن) قیمت دو روپے۔ کتابت طباعت اوسط۔

محمد یعقوب عثمانی لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد دکن کی غزلوں کا یہ مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ موصوف ضلع بارہ بنکی (اودھ) کے رہنے والے ہیں اور چودہ پندرہ سال سے اورنگ آباد کالج میں معلم ہیں۔

کتاب کے شروع میں آپ نے مقصدِ شاعری کے متعلق ایک دلچسپ افتتاحیہ رقم فرمایا ہے۔ مختصر سا اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ "شاعری کے موضوع لاتعداد سہی لیکن مقاصد صرف دو ہیں۔ ایک شعری مقصد ایک افادی مقصد۔ شعری مقصد اس روحانی کیف کا نام ہے جو شعر کے ذریعہ حاصل ہوا کرتا ہے اور افادی مقصد سے مراد شعر کا وہ اثر ہے جو مادی زندگی کے مختلف شعبوں پر مترتب ہوا کرتا ہے۔"

یعقوب صاحب پاکیزہ غزل فرماتے ہیں چند اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

آفریں اے نگاہِ ذوقِ کرم — دے گئی پھر نوید حسرت کی
میں ہوں اور جوشِ ہمت پرواز — آشیانے کی آرزو نہ رہی
مرمٹے پردۂ فانوس کی رنگینی پر — جان دینے کا سلیقہ نہیں پروانوں میں
انھیں کو بناتا ہوں اب شعر و نغمہ — جو آہیں تھیں نا آشنائے ترنم

کتاب میں ایسے اشعار کی کمی نہیں بلکہ فراوانی ہے۔ امید ہے یہ مجموعہ شائقین ادب میں مقبولیت حاصل کرے گا۔

کربلا علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب قبلہ کامون پوری مجتہد العصر کی تصنیف ہے۔ سرفراز کتاب گھر لکھنؤ نے شائع کی ہے۔ قیمت ڈھائی روپے۔ سید محمد ثقلین ذی نہروی نے واقعہ کربلا سے متعلق موصوف کے مقالات کو مرتب کیا ہے۔

یہ کتاب تاریخ اسلام کے طلبا ہی کے لئے نہیں بلکہ تاریخ انسانیت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بھی مفید ہوگی۔

موصولات

لکیریں (مجموعۂ نظم) مصنف نازش پرتاپ گڑھی سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۱۰۰ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ ایس یو دواخانہ کچہری روڈ پرتاپ گڑھ اودھ۔

نالۂ عندلیب (مجموعۂ نظم) مصنف مولوی عظیم الدین ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر، مطبوعہ چن پٹن ملک میسور۔ قیمت درج نہیں۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$۔ ضخامت ۳۲ صفحے۔

رسالے

اردو ادب ناشر انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔ قیمت سالانہ دس روپے۔ کتابت طباعت اوسط۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ اردو کے مشہور نقاد آل احمد سرور کی ادارت میں علی گڑھ سے شائع ہوا ہے۔

زیر نظر شمارے میں مدیر محترم کے علاوہ احتشام حسین، برج موہن دتاتریہ کیفی، امتیاز علی عرشی، محمد احسن فاروقی ایسے اہل قلم کے مضامین زیر اشاعت ہیں۔ تقسیم ملک سے پہلے رسالہ اردو نے تحقیق و تنقید کا جو معیار قریب قریب ۲۵ برس تک قائم رکھا تھا "اردو ادب" کے پہلے شمارے ہی سے ظاہر ہے کہ وہ اس معیار کو قائم رکھے گا۔ بلکہ اب تو یوں کہنا چاہیئے کہ زمانے اور ماحول کے تغیرات کے ساتھ ساتھ یہ رسالہ ادب کی نئی قدروں کو اجاگر کرے گا۔ اس کے اندر پہلے شمارے ہی میں نظر آتے ہیں۔ آل احمد سرور صاحب کا نام ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ اردو ادب، ادب جدید کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کرے گا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ خود ان کے قول کے مطابق زندگی اور ادب میں توازن رکھے گا۔ زیر نظر شمارے میں "توازن۔ زندگی اور ادب میں" آل احمد سرور، "غالب کا تفکر اور اس کا پس منظر" از سید احتشام حسین۔ خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہیں۔

موصولات

پیشوا دہلی خاص نمبر قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ رسالہ پیشوا اردو بازار دہلی

گل خنداں خاص نمبر قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ ماہنامہ گل خنداں کشن گڑھ [illegible]

اشارہ گوتم بدھ روڈ گیا (بہار) سالانہ چندہ چھ روپے۔

رفتارِ زمانہ

نہرو جی اور کشمیر

سری نگر میں کشمیر نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کو خطاب کرتے ہوئے بھارت کے پردھان منتری نے کانفرنس کے اس ریزولیوشن کا سواگت کیا جس کے ذریعے سے ریاست جموں و کشمیر کے ہر بالغ کو رائے دینے کا حق دے کر ایک نمائندہ اسمبلی قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ آپ نے کہا کہ اس طرح سے نیشنل کانفرنس کو عوام میں مزید طاقت حاصل ہوگی۔ اور وہ اس طریق سے ریاست کے عوام کی خواہش کو سمجھ سکے گی۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ دیش اس بناء پر انتخابات کی مخالفت کریں کہ کشمیر کا مسئلہ متحدہ اقوام کی اسمبلی کے سامنے پیش ہے اور ابھی تک اس نے اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ ایک غلط دلیل ہوگی کیونکہ کشمیر کے عوام اپنے تمام کاموں کو پس پشت ڈال کر "انتظار کرو اور دیکھو" کا طرزِ عمل غیر معین مدت کے لئے اختیار نہیں کر سکتے۔ نہرو جی نے کہا کہ کشمیر ہمارے دل کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ جذبات کشمیری عوام کے جذبات پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہیں گے جس کا قدرتی طور پر نتیجہ یہ ہوگا کہ کشمیر کی آئین ساز اسمبلی ہمیشہ کے لئے ہندوستان کے ساتھ ملحق ہونے کا فیصلہ کر دے گی۔ دراصل کشمیر کے عوام ہی کو اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ اور کسی دوسری پارٹی یا طاقت کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ آپ نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ متحدہ اقوام کی اسمبلی ابھی تک اس مسئلہ کا فیصلہ نہیں کر سکی اور آپ نے صاف الفاظ میں یہ بھی کہہ دیا کہ پاکستان کے ساتھ شامل ہونے سے کشمیر بالکل تباہ و برباد ہو جائے گا۔

ہندوستانی فوج کے افسروں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے شری نہرو نے کہا کہ ہم جنگ نہیں چاہتے کیونکہ یہ بربادی کا راستہ ہے اور جن اصول کو لے کر ہم گذشتہ تیس سالوں سے کام کر رہے ہیں یہ اس کے خلاف ہے لیکن اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے ہمارے پاس ایک طاقتور اور جدید ترین فوج کا ہونا ضروری ہے۔ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے شری نہرو نے کہا کہ وہ سری تیس درست طریقے سے اس مسئلے کو حل کرنے میں مدد نہیں دے رہیں۔ اب مسئلہ کشمیر دنیا کی سیاست کے کھیل میں شطرنج کے پیادے کی طرح ہے۔ دنیا کی بعض طاقتیں پاکستان کی حمایت کرتی ہیں کیونکہ پاکستان ان کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہا ہے لیکن ہم قطعی طور پر ایسا نہیں کر سکتے۔

آل انڈیا سودیشی نمائش

بیسویں آل انڈیا سودیشی نمائش کی رسم افتتاح ادا کرتے ہوئے وزیر تجارت مسٹر سری پرکاش نے اس امر پر رنج کا اظہار کیا کہ آزادی حاصل کر لینے کے بعد ہمارے دلوں میں اپنے ملک کی بنائی ہوئی مصنوعات کی قدر نہیں اور ہم ولایتی اشیاء خریدنا اور استعمال کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ آپ نے تنبیہ کی کہ اگر ہم نے اسی پالیسی کو جاری رکھا تو ہماری آزادی بے معنی بن جائے گی۔ ملک کی برآمد اور درآمد کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر سری پرکاش نے کہا کہ جہاں ہمارا ملک چار ارب روپے کا مال باہر بھیجتا ہے وہاں اس کی درآمد چھ ارب روپے تک پہنچ جاتی ہے۔ کیا اس حقیقت سے یہ صاف عیاں نہیں ہوتا کہ گو ہم نے سیاسی آزادی حاصل کر لی ہے اقتصادی طور سے ابھی تک ہم آزاد نہیں ہوئے اور جب تک اقتصادی آزادی حاصل نہ ہو تب تک جنتا سوراجیہ کی خوشی حاصل نہیں کر سکتی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم مہاتما گاندھی کے بتلائے ہوئے راستے پر چلیں اور گھریلو صنعتوں کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ سودیشی اشیاء کا استعمال کریں۔

کشمیری عوام کا عزم بالجزم

ہندوستان کی طرف سے کشمیر کے مسئلے کو سیکیورٹی کونسل میں پیش ہوئے تین سال ہونے کو آئے ہیں لیکن سیکیورٹی کونسل ابھی تک اس مسئلے کا کوئی حل ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ کشمیر کے عوام کونسل کی اس بے بسی کو اب تک گوارا کرتے رہے۔ لیکن ان کے دل میں یہ شک ہمیشہ قائم رہا کہ بعض ممالک اپنی مصلحتوں کی خاطر خواہ مخواہ صحیح فیصلہ نہیں ہونے دیتے۔ ان کے شک کو اس امر سے بھی تقویت حاصل ہوئی کہ جب شمالی کوریا نے جنوبی کوریا پر حملہ کیا تو ۲۴ گھنٹوں کے اندر ہی سیکیورٹی کونسل نے شمالی کوریا کی فوجوں پر حملہ کرنے کے احکام جاری کر دیئے۔ لیکن دوسری طرف کشمیر پر حملہ آور کے خلاف تین سال میں بھی کوئی کارروائی نہیں کر سکی۔ کشمیر کے عوام کب تک اس غیر یقینی

صورت حالات کو برداشت کرتے اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہتے۔ اسی لئے اب انھوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ کسی دوسرے کی مدد کے بغیر ہی وہ اپنے گھر کے معاملے کو سلجھا لیں گے۔ چنانچہ تمام کشمیریوں کی واحد نمائندہ جماعت نیشنل کانفرنس نے اپنے جنرل اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعہ اس امر کا فیصلہ کیا ہے کہ بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر جلد سے جلد ریاست بھر میں عام انتخاب کا انتظام کیا جائے۔ اور اس طرح ریاست جموں و کشمیر کے لئے ایک نمائندہ اسمبلی منتخب کی جائے۔ نیشنل کانفرنس کا یہ ایک نہایت دور اندیشانہ فیصلہ ہے۔ اس سے یہ حقیقت دنیا کے سامنے کھلے طور پر آشکار ہو جائے گی کہ کشمیری عوام کیا چاہتے ہیں۔ ہندوستان آغاز ہی سے یہ اصول تسلیم کر چکا ہے کہ کشمیر کا مستقبل خود کشمیر کے لوگوں کو طے کرنا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر نیشنل کانفرنس کے اس ریزولیوشن کا اس نے خیر مقدم کیا ہے۔ چنانچہ پردھان منتری پنڈت نہرو نے اس فیصلے کے حق میں اپنی آواز بلند کی ہے۔

یو، این، او کی سالگرہ

۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اقوام عالم کی متحدہ مجلس کا قیام اس غرض اور مقصد کے پیش نظر عمل میں لایا گیا کہ جنتا ظلم۔ بے انصافی اور بربریت سے نجات حاصل کر کے سکھ اور شانتی کی فضا میں سانس لے سکے۔ متحدہ اقوام کی اس اسمبلی کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ مختلف اقوام و ممالک کے مابین جو اختلافات پیدا ہو جایا کرتے ہیں ان کو باہمی گفت و شنید سے ختم کیا جائے اور بے گناہ انسانوں کا خون ناحق نہ بہنے دیا جائے۔ گذشتہ پانچ سال سے یہ مجلس اپنے اس نصب العین کو پورا کرنے کے لئے ہر ممکن جتن کر رہی ہے۔ اور اس نے کئی ممالک کی الجھنوں کو نہایت خوبی سے سلجھایا بھی ہے۔ یا اس میں شک نہیں کہ کئی جھگڑے حل کرنے میں ابھی تک یہ کامیاب نہیں ہو سکی۔ لیکن یہ کوئی کم اہمیت کی بات نہیں کہ متحدہ اقوام کی اس اسمبلی کی بدولت بعض ملکوں کے اختلافات ختم ہو گئے ہیں ورنہ جنگ ہونے کی صورت میں نہ معلوم ان ممالک میں کتنی بڑی تباہی نازل ہوتی۔ یہ کچھ کم غنیمت نہیں کہ تقریب قریب دنیا کی تمام طاقتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اپنے جھگڑوں کو طے کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اسی لئے ہندوستان میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو مجلس متحدہ اقوام کی پانچویں سالگرہ پر کافی جوش و خروش کا اظہار کیا گیا۔ اسی دن شام کو آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر کرتے ہوئے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کہا کہ ہندوستان ہمیشہ سے اس مجلس کی حمایت کرتا رہا ہے، اور آئندہ بھی کرتا رہے گا۔ راشٹرپتی نے کہا کہ دنیا کے سبھی انصاف پسند اور امن پسند لوگوں سے میری یہ اپیل ہے کہ وہ اس کا ساتھ دیں اور اس بات کے لئے کوشش کریں کہ صحیح معنوں میں یہ قوموں میں انصاف اور دنیا میں امن قائم رکھنے کا واحد ذریعہ بن جائے۔ اسی دن شام کو ایک پبلک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے پردھان منتری پنڈت نہرو نے اس بین الاقوامی تنظیم کو امن عالم کے لئے نہایت ضروری بتایا اور کہا کہ باوجودیکہ اس میں کئی خامیاں ہیں پھر بھی اس کی پشت پر جو بنیادی اصول ہے وہ صحیح ہے اس لئے ہم سب کو مل کر مجلس متحدہ اقوام کی ترقی کے لئے کوشش کرنی چاہیئے۔

پریس مشاورتی کمیٹی کا اجلاس

کلکتے میں بھارت و پاکستان کے اخبار نویسوں کی مشترکہ مشاورتی کمیٹی کے اجلاس میں نہرو لیاقت سمجھوتے کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں مجموعی طور پر پریس کی کوششوں کو سراہا گیا۔ مشاورتی کمیٹی نے ہر دو ممالک کے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ اس سمجھوتے پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے کی کوشش کریں۔ اخبار نویسوں سے درخواست کی گئی کہ وہ آئندہ زیادہ محتاط رہیں اور کوئی ایسی خبر نہ چھاپی جائے جس سے اقلیتوں میں دہشت پیدا ہو۔ مشاورتی کمیٹی نے اپنی اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ اگر دونوں ممالک میں کوئی اختلاف پیدا ہو تو اسے باہمی سمجھوتے سے طے کیا جائے۔ اور یہ بھی امید ظاہر کی گئی کہ بھارت اور پاکستان اپنے تمام مسائل کو امن کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ اقلیتوں میں کسی طرح کی بے چینی پیدا نہ ہو اور وہ امن و امان سے زندگی بسر کر سکیں۔

بھارت میں ریلوے انجن بنانے کی فیکٹری

بھارت کو آزاد ہوئے تین ہی سال تو ہوئے ہیں لیکن اس قلیل مدت میں بھی صنعتی طور پر اس نے آگے بڑھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ جہاں بنگلور میں ٹیلیفون میں کام آنے والے سامان بنانے کا کارخانہ قائم ہوا ہے وہاں ہوائی جہازوں کے پرزے بنانے کی ایک فیکٹری بھی تیار ہو چکی ہے۔ غرض یہاں تک ہی نہیں بلکہ اب مغربی بنگال میں چترنجن کے مقام پر ریلوے انجن بنانے کے لئے بھی ایک فیکٹری مکمل ہو گئی ہے۔ اور اب اس امر میں کوئی شک نہیں رہا کہ تھوڑی مدت کے بعد بھارت اپنی ریلوں کے لئے ریلوے انجن بنانے کے قابل ہو جائے گا۔ یہ کارخانہ ایشیا بھر میں انجن سازی کا سب سے بڑا کارخانہ ہوگا۔ اور اس پر ۱۴ کروڑ روپیہ خرچ آئے گا۔ یہ کارخانہ ۴ مربع میل سے زائد رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک نیا شہر بھی تعمیر ہو

رہا ہے جب یہ کارخانہ پوری رفتار سے کام شروع کر دے گا تو یہ ہر سال ۱۲۰ بھاپ سے چلنے والے لوکوموٹو انجن اور پچاس بوائلر طیار کرے گا۔ اس کے علاوہ بھارت کی ریلوں کے لئے کافی تعداد میں فالتو پرزے طیار ہوا کریں گے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۹۵۳ء تک یہ کارخانہ پوری رفتار سے اپنا کام شروع کر دے گا اور اس میں دو ہزار کاریگر اور اتنے ہی مزدور اور انجنیئر کام کریں گے۔ یکم نومبر کو راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اس کارخانے کی رسم افتتاح ادا کی۔ آپ نے اپنی تقریر میں بھارت کی صنعتی ترقی کے روشن مستقبل پر نہایت خوشی کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی کہ اس باب میں بھارت دنیا کے دوسرے ملکوں میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔

سائنٹفک الفاظ کا ہندی میں ترجمہ

معلوم ہوا ہے کہ بھارت سرکار نے اہل زبان اور سائنس دانوں کا ایک بورڈ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو سارے دیش کے لئے سائنسی الفاظ و اصطلاحات کی ایک فہرست طیار کر کے ان کو ہندی الفاظ میں تبدیل کرنے کے اہم کام کو انجام دے گا اور ایسے اصول وضع کرے گا جن کے تحت بین الاقوامی اصطلاحات کو بھارت کی زبانوں میں تبدیل کیا جا سکے۔ امید کی جاتی ہے کہ حکومت کا یہ اقدام نہ صرف تعلیم کے لحاظ سے بلکہ سارے دیش کے اتحاد و تنظیم کے لحاظ سے بھی نہایت موزوں و مفید رہے گا۔ موجودہ سال کے بجٹ میں اس کام کے لئے ۹۰ ہزار روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

چوربازاری کے انسداد کی مہم

بھارت سرکار نے اب مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی بلیک مارکیٹ اور چوربازاری کو برداشت نہیں کرے گی چنانچہ ملک کے طول و عرض میں بیوپاریوں کی گرفتاریاں اور ان کے گوداموں پر چھاپے مارے جانے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ حکومت کے اس اقدام سے بلیک مارکیٹ بہت حد تک ختم ہو جائے گی اور جنتا کو کھانے پینے اور پہننے کی اشیا میں زیادہ تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

پاکستان میں نئی سیاسی پارٹی کا قیام

مغربی پنجاب کے سابق وزیر اعظم خان افتخار حسین خاں آف ممدوٹ نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر کے ایک نئی پارٹی بنائی ہے۔ جس کا نام جناح مسلم لیگ رکھا گیا ہے۔ یہ پارٹی آئندہ انتخابات میں سرکاری مسلم لیگ کا مقابلہ کرے گی۔

مسٹر لی کا دوبارہ انتخاب

متحدہ اقوام کی اسمبلی نے مسٹر ٹرگوی لی کو ایک بار پھر اپنا جنرل سکریٹری منتخب کر لیا ہے۔ روس مسٹر لی کے اس تقرر کے خلاف تھا اور اس نے صاف طور پر یہ اعلان کر دیا تھا کہ اس کے نزدیک مسٹر لی کا دوبارہ اس عہدے پر فائز ہونا سخت ناپسندیدہ ہے۔ لیکن رائے شماری کے وقت ۴۶ ممالک نے مسٹر لی کے حق میں ووٹ دیئے اور صرف ۵ نے اس کے خلاف سات ممالک غیر جانبدار رہے۔ جن میں آسٹریلیا، عراق۔ لبنان، شام اور مصر کا نام قابل ذکر ہے

جارج برنارڈ شا کا انتقال

بیسویں صدی میں انگریزی زبان کے سب سے بڑے ادیب اور ڈرامہ نویس جارج برنارڈ شا ۲ نومبر کو ۹۴ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ شیکسپیئر کے بعد ڈرامہ نویسوں میں مسٹر شا کا رتبہ سب سے بڑا مانا جاتا ہے۔ انھوں نے ۵۰ کے لگ بھگ ڈرامے لکھے اور وہ اتنے مقبول ہوئے کہ دنیا کی قریباً سبھی زبانوں میں ان کے ترجمے چھپ چکے ہیں۔ مرحوم ایک نہایت آزاد خیال ادیب تھے، مہاتما گاندھی کے لئے ان کے دل میں بڑی عزت تھی۔ اور وہ ہمیشہ ہندوستان کی آزادی کے حق میں آواز اٹھاتے رہے

بھارت میں روئی کی پیداوار

زیادہ اناج اگاؤ کی مہم کے علاوہ بھارت سرکار اس امر کے لئے کوشش کر رہی ہے کہ روئی کی پیداوار بھی بڑھائی جائے تاکہ روئی کے لئے بھی ہمارا دیش کسی غیر ملک کا محتاج نہ رہے۔ چنانچہ محکمہ زراعت کے ایک اعلان میں بتایا گیا ہے کہ سال ۵۱-۱۹۵۰ء کے لئے ۱۱۷ ایکڑ زمین میں روئی کی کاشت کی گئی ہے۔ یہ رقبہ گذشتہ سال سے ۱۵۱ ایکڑ زیادہ ہے۔ اس طرح روئی بوئے جانے والی زمین میں تقریباً ۱۰ فی صدی اضافہ ہوا ہے۔ اگر یہ اضافہ اسی رفتار سے جاری رہا تو امید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان روئی کے لئے کسی دوسرے ملک کا محتاج نہیں رہے گا۔

گڑ کے نرخوں کا تعین

پچھلے چند مہینوں سے ہندوستان کے تمام صوبوں میں گڑ کی بلیک مارکیٹ زوروں پر تھی۔ اس کے انسداد کے لئے ہند سرکار نے دیش کے مختلف حصوں میں گڑ کے نرخ مقرر کر دیئے۔ اڑیسہ۔ پنجاب۔ پیپسو۔ بھوپال اور دہلی میں زیادہ سے زیادہ نرخ ۲۰ روپے من۔ بمبئی۔ مغربی بنگال۔ حیدر آباد۔ مدھیہ بھارت

میسور، راجستھان، ٹراونکور، کوچین، اجمیر، بلاسپور، اور تری پورہ میں ۱۸ ماشے

من ۔ اور آسام، سوراشٹر، کورگ، ہماچل پردیش، کچھ، منی پور اور انڈمان

نکوبار میں ۲۲ روپے من سالانہ نرخوں سے گراں فروخت کرنے والوں کو قید

اور جرمانہ دونوں قسم کی سزا دی جاسکتی ہے ۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کا خاطر خواہ

اثر ہوگا ۔

بھارت کی تجارت برآمد میں ترقی

جس وقت بھارت نے اپنی کرنسی کی قیمت کم کی تھی اس وقت اقتصادیات کے بعض ماہرین تذبذب میں تھے اور وہ اس امر کا ٹھیک اندازہ لگانے میں قاصر تھے کہ اس اقدام کا ملک کی اقتصادیات اور مالی پوزیشن پر کیا اثر پڑے گا ۔ لیکن اب یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کرنسی کی قیمت کم ہوجانے کے بعد سے ہندوستان کی تجارت میں کافی بہتری ہوئی ہے ۔ اور جہاں ۱۹۴۹-۵۰ء میں ملک کی برآمد تین ارب ساٹھ کروڑ روپے کی تھی وہاں ۱۹۵۰-۵۱ء میں برآمد ۴ ارب ۵۰ کروڑ روپے ہوگئی ۔ یعنی اس میں لگ بھگ ایک ارب روپے کا اضافہ ہوا ۔ صرف کپڑے کی برآمد میں ہی ۶۰ کروڑ روپے بڑھے اسی طرح مصالحہ جات، تمباکو، کچا چمڑا، کھالیں اور چائے کی برآمد میں بھی کافی اضافہ ہوا ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کی تجارتی ساکھ مضبوط ہے اور اپنی کرنسی کی قیمت کم کرکے ہماری سرکار نے ایک درست قدم اٹھایا تھا ۔

نہرو لیاقت پیکٹ کی کامیابی

نہرو لیاقت پیکٹ کی کامیابی کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ جہاں پیکٹ کے نافذ ہونے سے پیشتر اقلیتیں ہر روز ہزاروں کی تعداد میں مشرقی بنگال سے بھاگ کر مغربی بنگال اور مغربی بنگال سے مشرقی بنگال کی طرف جارہی تھیں ۔ وہاں اب نہ صرف ان کا انخلاء ہی رک گیا ہے بلکہ اب وہ بے خوفی سے اپنے گھروں کو بھی واپس لوٹ رہی ہیں اور اعتماد پھر سے بحال ہورہا ہے ۔ یہ صورت حالات صرف دو بنگالوں تک ہی محدود نہیں بلکہ آسام میں بھی پوزیشن بہتر ہورہی ہے ۔ چنانچہ شیلانگ ریڈیو سے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے ہند سرکار کے اقلیتوں کے وزیر شری چارو چندر بسواس نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ آسام میں شرنارتھیوں کا آنا جانا پوری طرح جاری ہوگیا ہے ۔ آپ نے اپنے دورے کے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ سینکڑوں شرنارتھی اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے ہیں ۔ ہزاروں اشخاص اب تک واپس آچکے ہیں اور ان کو اپنے گھروں میں بسادیا گیا ہے ۔ آپ نے اس امر کا بھی انکشاف کیا کہ ضلع سلہٹ سے آئے ہوئے بہت سے ہندو بھی وہاں واپس جانے شروع ہوگئے ہیں ۔ اور ان کے راستے میں جو تھوڑی بہت رکاوٹیں رہ گئی ہیں وہ بھی دور کی جارہی ہیں ۔

کشمیر کا سب سے بڑا دوست

بھارت کے پردھان منتری شری جواہر لعل نہرو کی اکسٹھویں سالگرہ پر ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم نے ریاست کی جنتا اپنے ساتھیوں اور اپنی طرف سے مبارکباد کا پیغام بھیجا ہے ۔ اور کہا ہے کہ اس موقعے پر ہمیں ایک خاص خوشی حاصل ہوئی ہے کیونکہ اس دن کشمیر کا سب سے بڑا دوست پیدا ہوا تھا ۔ ہماری دعا ہے کہ آپ کی عمر دراز ہو اور ہم آپ کی قیادت و رہنمائی سے فیض یاب ہوتے رہیں ۔

مذہبی اختلافات کو ختم کرنے کا عہد

چین سے آمدہ ایک خبر میں بتایا گیا ہے شنگھائی کے چالیس سے زیادہ مذہبی رہنماؤں نے جن میں عیسائی، مسلمان اور بدھ شامل ہیں امن قائم رکھنے کے لئے آپس کے اختلافات کو ختم کردینے کا حلف اٹھایا ہے ۔ اپنے ایک بیان میں انھوں نے کہا ہے کہ دوسرے امور کی بہ نسبت ہمیں امن کی زیادہ ضرورت ہے ۔ اب چونکہ امن کو خطرہ درپیش ہے اس لئے ہم میں سے ہر ایک کسی بھی قیمت پر امن کی حفاظت کرنے کے لئے آمادہ ہے ۔ اور ہم اس غرض سے آپس کے مذہبی اختلافات کو ختم کرنے کا عہد کرتے ہیں ۔

بھارت میں جنرل انتخابات

بھارت پارلیمنٹ میں راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے زمینداروں اور عوام کی سہولت کے پیش نظر یہ اعلان کیا ہے کہ آئندہ انتخابات نومبر ۱۹۵۱ء کے آخر یا دسمبر کے آغاز میں ہوں گے اور اس امر کے لئے جلد ہی تاریخیں مقرر کردی جائیں گی ۔

فرانسیسی بستیوں میں لوک مت

ہند میں فرانسیسی نوآبادیوں کے کمشنر نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ پانڈیچری کاریکل اور ماہی کی بستیوں میں لوک مت کے طریقۂ کار کے متعلق ہند اور فرانس میں ابھی تک کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا لیکن امید ہے کہ بہت جلد اس مسئلے کا اطمینان بخش حل نکل آئے گا ۔

چندو کی دلیری



دی ٹاٹا آئل ملز کمپنی لمیٹڈ



بچوں کا آج کل



نئے سال کا پیغام

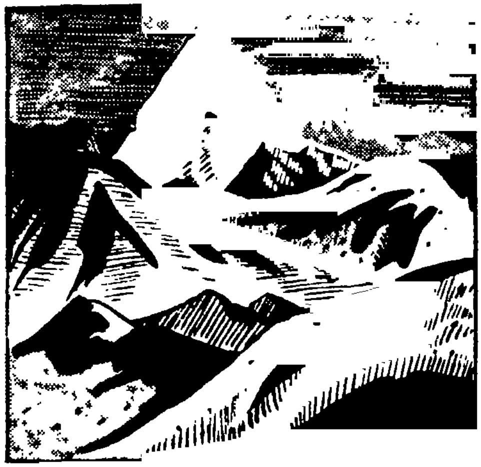
محمد شفیع الدین نیّر

نئے سال کا ہے یہ پیغام بچو! نئے سال میں ہو نیا کام بچو
اُٹھو تم قدم اپنا آگے بڑھاؤ کوئی کام اِس سال میں کر دکھاؤ
بلندی کے زینے پہ چڑھتے رہو تم ترقی کے رستے پہ بڑھتے رہو تم
زمانے کا اچھا بُرا جان لو تم بُرائی بھلائی کو پہچان لو تم
سدا نیک نامی کا ارمان رکھنا سدا لکھنے پڑھنے کا تم دھیان رکھنا
رہے وقت کا پاس دل میں تمہارے کہ بنتے ہیں سب کام اِس کے سہارے
اگر زندگانی کا مقصد ہو پانا تو محنت سے ہرگز نہ تم جی چرانا
جو محنت کرو گے تو پاؤ گے دولت بڑائی ملے گی اسی کی بدولت
خدا سے یہی بس ہماری دعا ہو دعا ہو یہی اور یہی مدّعا ہو
نہ چھوڑیں کبھی کام اپنے ادھورے
کریں اپنے سب کام اِس سال پورے

ایورسٹ کی چڑھائی

اختر جمال

ایورسٹ — اس نام میں ایک جادو ہے۔ تبت کے باشندے اسے دیوی سمجھتے ہیں۔ اُن کے لئے یہ ایک مقدس پہاڑ ہے لیکن دنیا کے دوسرے لوگوں کے لئے ایک معمہ — جس کی ہیبت ناک بلندی سے ابھی دُنیا ناآشنا ہے۔



آج سے اٹھارہ اُنیس برس پہلے دوسرے پہاڑوں کی طرح یہ بھی ایک معمولی پہاڑ تھا۔ لیکن آج اُسے سیکڑوں اشخاص اپنی منزلِ مقصود خیال کرتے ہیں — ایورسٹ خشکی کا ایک ایک ایسا حصہ ہے، جو ہر وقت اشرف المخلوقات کے انتظار میں خاموش دُنیا کی تبدیلیوں سے بے نیاز کھڑا ہے — سیکڑوں اشخاص اُس کی چوٹی تک پہونچنے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن ناکام رہے۔

۱۹۲۲ء میں بارہ انگریزوں کی ایک ٹولی نے جس کی قیادت جی بروس کے سپرد تھی، ہندوستان کی سرزمین سے بیسیوں میل دُور تبت کی سطحِ مرتفع سے اپنا سفر شروع کیا۔ یہ سطحِ مرتفع کم و بیش چودہ ہزار فٹ اونچی ہے۔ اسکے اس پار ہمیشہ سرد برفیلی ہوا چلا کرتی ہے۔ یہاں سے یہ لوگ آہستہ آہستہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔



تبت میں نہ تو ہندوستان کی طرح ریلیں ہیں نہ سڑکیں۔ اس لئے یہ لوگ ۔۔ یاک بیلوں پر زادِ راہ لاد کر چلے۔ سچ پوچھو تو بیل ہی اس علاقے کی زندگی ہے۔ اسکے بغیر ان لوگوں کیلئے زندگی گزارنا قریب قریب ناممکن ہے —— ابھی یہ وادی، اور گلیشیر بھی طے نہ کرنے پائے تھے کہ ان بیلوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ سامان خود ہی لاد کر انھیں پندرہ میل اور چلنا تھا جسکے بعد ایورسٹ کا سر بفلک پہاڑ شروع ہوتا تھا۔

تمام مصائب کے باوجود ان لوگوں نے گلیشیر اور وادی پار کرلی۔ یہ لوگ اکیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ چکے تھے، اور اُن کے سامنے برف کی ایک ہزار فٹ بلند دیوہیکل دیوار موجود تھی —— ذرا سوچو تو —— برف کی ایک ہزار فٹ اونچی دیوار —— عام لوگوں کے لئے ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ لیکن ان لوگوں سے کوئی پوچھے جو اسے پار کر کے آگے بڑھنے کا عزم کر چکے تھے۔

اس طرح کی کئی چڑھائیوں کے بعد وہ لوگ ۲۷ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے۔ یہاں انھوں نے اپنے خیمے گاڑے۔ رات بسر کی اور پھر صبح آکسیجن کے تھیلے لٹکائے ہوئے آخری لیکن فیصلہ کن چڑھائی کے لئے چل پڑے۔ پھر وہ لوگ اٹھائیس ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ گئے۔ یعنی اب اُن کی کامیابی میں صرف ایک ہزار فٹ کا فاصلہ تھا۔

دوربین کے ذریعے سے انھیں چوٹی سے چھ سو فٹ نیچے تک دیکھا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تندرست اور بخیر ہیں۔ اس کے بعد ایورسٹ کی چوٹی نے غالباً انھیں اپنے آغوش میں لے لیا —— اس کے بعد وہ کبھی نہ دیکھے جا سکے —— پھر کیا ہوا —— ؟ غالباً وہ لوگ چوٹی تک پہنچ گئے، اور واپسی میں اُن کی چند لمحوں کی نیند ابدی نیند میں تبدیل ہو گئی یا اور کوئی حادثہ پیش آیا، اور وہ لوگ ہمالیہ کی وسعتوں میں کھو گئے، کوئی نہیں جانتا۔ شاید کوئی کبھی نہیں جان سکے گا۔ ہمالیہ کی چوٹیاں بھی اس راز سے ناآشنا ہیں۔

ہندسوں کا کھیل

لو بچو! اب ذرا حساب کی مشق بھی کرلو، اور دل بھی بہلا لو۔ ہاں تو اپنی اپنی سلیٹیں نکالو، اور یہ رقم سلیٹ پر لکھو۔



۵۲۶۳۱۵۷۸۹۴۷۳۶۸۴۲۱۰

اب اس رقم کو ایک سے دس تک کسی بھی ہندسے سے ضرب دو، جواب میں یہی ہندسے آئیں گے۔ مثال کے طور پر آپ پانچ سے ضرب دیتے ہیں۔

۵۲۶۳۱۵۷۸۹۴۷۳۶۸۴۲۱۰
۵

۲۶۳۱۵۷۸۹۴۷۳۶۸۴۲۱۰۵۰

غور کیجئے، وہی ہندسے جواب میں آئے ہیں جہاں سے شروع ہوتے ہیں، ترتیب بھی وہی ہے۔ اب خود باری باری ایک سے دس تک کے ہندسوں سے ضرب دو، اور دل بہلاؤ۔ اس سے آپ کو پہاڑے بھی یاد ہو جائیں گے اور ضرب کے سوالوں کی مشق بھی ہو جائے گی۔

شمام سندر آزاد

بلّی کا بچّہ

اداکار

۱۔سلیم ۔ننھا مُنا پیارا سا بچہ ۔عمر کوئی آٹھ سال ۔بہت شریر ہے۔
۲۔رضیہ ۔سلیم کی چھوٹی بہن ۔عمر کوئی پانچ سال۔
۳۔خان صاحب ۔سلیم کے ابّا جان۔
۴۔امّی ۔سلیم کی امّی جان جسے اپنے بچوّں کا بہت خیال رہتا ہے۔

(پردہ اُٹھنے پر)

(ایک چھوٹا سا خوبصورت کمرہ ہے ۔کمرہ خاصا آراستہ ہے ۔دیواروں پر مختلف تصاویر آویزاں ہیں ۔بیچ میں ایک قیمتی قالین بچھا ہے جس پر سلیم کا قاعدہ اور تختی پڑے ہیں ۔ٹوٹے ہوئے قلم کے پاس کالی روشنائی کی دوات اُلٹی پڑی ہے ۔ دائیں طرف کھڑکی کے قریب ایک بڑا پلنگ بچھا ہے ، بائیں طرف ایک بڑی کتابوں کی الماری ہے ۔ کمرے کے ایک کونے میں میز رکھی ہے جس پر سبز رنگ کا کپڑا بچھا ہے ۔ میز پر تھوڑے سے کاغذ بکھرے ہوئے ہیں ۔ دروازہ کھلتا ہے ، سلیم اور رضیہ تیزی سے بھاگتے ہوئے کمرے میں گھستے ہیں)

سلیم ۔ننھی آج تو بس مزا ہی آگیا ۔تم نے دیکھا ہے نا ۔کتنا خوبصورت ہے وہ بچہ ۔

ننھی رضیہ ۔ ہاں بھائی جان ، بالکل دودھ کا سا سفید ۔ اُس کے سفید سفید ریشم کے سے بال بڑے اچھے لگتے ہیں ۔ (ابّا کی کرسی پر چڑھتے ہوئے) جب میں بڑی ہوں گی تو بالکل ایسا ہی فراک سلواؤں گی ۔

سلیم ۔ اور تم نے اُس کی چھوٹی سی گردن دیکھی رضیہ ۔جب تم آہستہ آہستہ میاؤں میاؤں کرتا ہے تو کتنی بھلی آواز لگتی ہے ۔

ننھی رضیہ ۔ میرا تو جی چاہتا تھا اُسے گود میں اُٹھا لوں ، اور خوب پیار کروں ۔

سلیم ۔ (فرش پر سے کتابیں اُٹھاتے ہوئے) جب یہ بڑا ہوگا تو میں اسے اپنا دوست بناؤں گا ۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھوں گا یہ میرا کام کیا کرے گا ۔

رضیہ ۔ (بات کاٹتے ہوئے) واہ جی واہ ، تم کون آئے ہو ، بڑے لاٹ صاحب ، اِس کو لینے والے ، اسے تو میں لوں گی میں نے پہلے دیکھا تھا ۔ (عجیب انداز سے مُنہ بناتے ہوئے) یہ مُنہ اور مسور کی دال ، اُوں ۔

سلیم ۔ (ذرا غصّے سے) رضیہ زبان بند کرو ، ورنہ ابھی گُدی سے کھینچ لوں گا ۔



رضیہ۔ (اطمینان سے) آپ کون ہوتے ہیں میری زبان کھینچنے والے۔

سلیم۔ اچھا نکالو، میری گولیاں، جو میں نے مسعود سے جیت کر دی تھیں۔ (مسکراتا ہے)

رضیہ۔ تم میری مٹھائی نکالو، جو صبح امی سے لیکر دی تھی۔

سلیم۔ پہلے تم ہماری گولیاں نکالو۔

رضیہ۔ پہلے تم ہماری برفی نکالو۔

سلیم۔ (ذرا اور غصے سے) ٹر ٹر کئے جا رہی ہو۔ (اور آگے بڑھ کر رضیہ کے ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

رضیہ (چیخ مار کر) امی، امی۔

(سلیم ہاتھ چھوڑ دیتا ہے، باہر سے امی کی آواز آتی ہے)

امی (باہر سے) کیا بات ہے بیٹی رضیہ

رضیہ۔ (سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے) امی، یہ سلیم بھائی مار رہے ہیں۔

امی (باہر ہی سے) ارے تم کو تمیز نہیں ہو گیا ہے، کھیل کھیل میں لڑتے ہو ادھر آؤ چائے پی لو۔ (رضیہ سلیم کا منہ چڑاتی بھاگ جاتی ہے سلیم آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)

(شام کا وقت، وہی خوبصورت کمرہ اور دونوں بہن بھائی)

سلیم۔ رضیہ، ابھی ابھی میں بچہ دیکھ کر آیا ہوں، اب تو اُس نے آنکھیں بھی کھول دی ہیں۔

رضیہ۔ آنکھیں تو جبھی کھول دی تھیں جب میں دیکھنے گئی تھی، آپ کونسی عجیب چیز دیکھی ہے۔ (سلیم کھسیانا سا ہو جاتا ہے)

سلیم۔ بڑا خوبصورت بچہ ہے۔

رضیہ۔ وہ تو ہے ہی۔

سلیم۔ (ذرا عاجزی سے) رضیہ۔ اب ہمیں معاف کر دو، اب کبھی نہیں ماریں گے۔

رضیہ۔ ہٹ جاؤ، ہم نہیں بولتے۔ پہلے مار لیتے ہو، اور پھر ——

سلیم۔ اچھا رضیہ ہم تمہارے بھائی نہیں۔

رضیہ۔ تو کیا ہم آپ کی بہن نہیں ہیں۔

سلیم۔ کون نہیں کہتا —— اچھی رضیہ۔

رضیہ۔ اچھا اب کے کان پکڑ کر معافی مانگو تو۔

سلیم۔ یہ لو۔ (کان پکڑتا ہے)



رضیہ۔ ایسے تھوڑا ہی۔

سلیم۔ اور؟

رضیہ۔ جیسے ماسٹر جی پکڑوایا کرتے ہیں۔

سلیم۔ (مرغا بن کر) یہ لو (رضیہ ہنستی ہے)

سلیم۔ اچھا رضیہ اب ہمیں کوئی ایسی ترکیب سوچنی چاہیے جس سے کہ بچے کو یہاں لے آئیں۔

رضیہ۔ ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ یہاں ہم اُس کا اچھی طرح خیال رکھیں گے۔

سلیم۔ وہاں تو تم جانتی ہی ہو، مسعود، احمد، سبھی اُسے تنگ کریں گے۔

رضیہ۔ اور بیچارہ رات سردی سے اکڑ جائے گا، چہ، چہ، چہ اس کی امی بھی کتنی گندی ہیں، غریب کو اکیلا چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔

سلیم۔ چلو تو اُسے لے آئیں۔ (دونوں جلدی جلدی کمرے سے نکل جاتے ہیں)

(بڑے دالان سے ہوتے ہوئے وہ اسٹور روم میں پہونچتے ہیں۔

جہاں دروازے کی آڑ میں ایک گھاس کے ڈھیر پر بیٹھا بچہ میاؤں میاؤں کر رہا ہے)

رضیہ۔ اُف بیچارے کو بھوک لگی ہے۔

سلیم۔ ٹھہرو میں جائے کا بچا ہوا کیک لے آتا ہوں۔

رضیہ۔ اور ہاں میرا بسکٹ بھی لیتے آنا۔ شاید کیک سے اس کا پیٹ نہ بھرے۔

سلیم۔ (بھاگتے ہوئے) اچھا، اچھا،

(تھوڑی دیر بعد)

سلیم۔ لو کھلاؤ۔ (دونوں آگے بڑھ کر اُس کا منہ پھاڑتے ہیں بچہ زور زور سے میاؤں میاؤں کرتا ہے، باہر سے امّی کی آواز آتی ہے)

امّی (باہر سے) ارے چمن دیکھیو کہیں اسٹور روم میں مُوا کتا تو نہیں گھُس گیا۔ (دونوں بچے ڈر کر وہاں سے بھاگ کر پھر اپنے کمرے میں آجاتے ہیں)

سلیم۔ لو، تم نے سارا کام خراب کر دیا، رضیہ۔

رضیہ۔ میں نے کیا کیا، تم نے ہی تو اُس کے منہ میں کیک ٹھونسا تھا۔

سلیم۔ کاہے کو جھوٹ بولتی ہو۔ میں نے منع بھی کیا تھا کہ ایکدم سارا منہ مت کھولو، تم کسی کی سنتی تھوڑا ہی ہو۔

رضیہ۔ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ (سسکیاں بھرتے ہوئے) میں ابھی جا کر امّی سے کہتی ہوں کہ بھیا سلیم نے ——

سلیم۔ (ڈرتے ہوئے) اچھا چلو ہماری ہی غلطی تھی۔

رضیہ۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) اور کیا تھی ہی۔

سلیم۔ اب کوئی ایسی ترکیب لڑائی جائے کہ بچے کو بھی لے آئیں اور امّی کو بھی پتہ نہ چلے۔

رضیہ۔ تم ہی بتلاؤ۔



سلیم۔ (سوچتے ہوئے چٹکی بجا کر) بالکل ٹھیک، یہ ترکیب ٹھیک رہے گی۔

رضیہ۔ (شوق سے) کیا؟

سلیم۔ ہم نہیں بتلاتے، تم کون ہو پوچھنے والی؟

رضیہ۔ (ذرا روٹھ کر) نا بتلاؤ ہم امّی کے پاس جاتے ہیں

سلیم۔ ارے نہیں نہیں، ابھی بتلاتے ہیں، دیکھو، رضیہ، را کو جب سب سو جائیں گے تو ——

رضیہ۔ (خوشی سے اُچھل کر) بھئی واہ! کمال کر دیا سلیم تمھیں بیوقوف کون کہتا ہے؟

سلیم۔ (منہ بنا کر) تم ہی تو کہتی ہو۔ (دونوں ہنس پڑتے ہیں)

(رات کا وقت، ہر طرف اندھیرا چھا گیا ہے اور مکان میں بجلی ہو رہی ہے۔ کھانے کی میز پر)

رضیہ، ابّا، آج ہماری بلّی نے بچہ دیا ہے۔

سلیم۔ ابّا جان، بالکل سفید دودھ سا۔

رضیہ۔ بڑا پیارا ہے، ایسا جیسے ہما را ننھا۔

(ابّا ہنستے ہیں)

امّی۔ آج ان بچوں نے بلّی کے بچے کو سارا دن تنگ کیا۔
ابا۔ بچو، اُسے آئندہ تنگ مت کرنا۔
رضیہ۔ ابا ہم نے اُسے کیک کھلایا تھا، وہ کھاتا ہی نہیں تھا۔
ابا۔ (ہنستے ہوئے) نہیں میری پیاری رضیہ، وہ کیک نہیں کھاتا۔
سلیم۔ تو پھر وہ کیا کھائے گا!
ابا۔ ارے وہ تمہارے ننھے کی طرح صرف اپنی امی کا دودھ پیتا ہے۔
(باہر سے "خان صاحب" کی آواز آتی ہے۔ ابا اُٹھتے ہوئے)
ابا۔ اچھا میرے بچو، اُسے تنگ مت کرنا نہیں تو خالہ بلّی تمہیں نوچ لے گی۔
(خاصا اندھیرا پھیل گیا ہے، دونوں بچے دبے پاؤں اسٹور روم میں گھستے ہیں، وہاں پہنچ کر سلیم نے جلدی سے بچے کو اُٹھا لیا، بچہ ایک دم میاؤں میاؤں کرتا ہے۔ سلیم گھبرا سا جاتا ہے۔ اتنے میں باہر سے رضیہ پکارتی ہے)
رضیہ۔ بھیّا، بھیّا خالہ بلّی آ رہی ہیں، بھاگ آؤ۔
(خالہ بلّی میاؤں میاؤں کرتی کمرے میں داخل ہوتی ہیں دونوں بچے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بلّی جھپٹ کر سلیم کے ہاتھ سے اپنا بچہ لے جاتی ہے، اور سلیم کا ہاتھ لہولہان ہو جاتا ہے۔ وہ زور زور سے رونا شروع کر دیتا ہے۔ خدیجہ بیگم گھبراتی اور ابا کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ اور سلیم کی یہ حالت دیکھ کر کہتے ہیں۔
تمہیں جو کہا تھا کہ معصوم بچوں کو تنگ نہ کیا کرو۔ مل گئی نا اپنے کئے کی سزا!

وشوا ناتھ درد

مانوتا کی جوت

دھرتی ماں کے کشٹ ہروگے نوجیون میں رنگ بھروگے
گُرجو بتائے ہیں باپو نے تم اُن کا اُپیوگ کروگے

نوجیون کی جوت جلاؤ
دھرتی ماں کی دھیر بندھاؤ

ہر دل پر ہے راج تمہارا دیش کی رکھشا کاج تمہارا
ننھے ننھے بالک ویرو تخت تمہارا تاج تمہارا

اِس کی آن اور شان بڑھاؤ
بڑھ کر دُنیا پر چھا جاؤ

اونچ نیچ کا بھید مٹا دو ہر مشکل آسان بنا دو
مذہب پر لڑنے والوں کو مانوتا کی راہ دکھا دو

مانوتا کا گیت سناؤ
مانوتا کی جوت جلاؤ

۱ انسانیت ۲ دُکھ ۳ نئی زندگی ۴ استعمال

دُنیا کے عجیب انسان

آؤ بچو، آج تمھیں دُنیا کے چند عجیب و غریب لوگوں کا حال سنائیں۔ ان میں سب سے پہلے "زارو آغا" کا ذکر آتا ہے جو ۱۹۳۴ء میں دُنیا کا سب سے بوڑھا انسان تھا۔ ۱۹۲۷ء میں جب اُس نے گیارھویں شادی کی تھی تو اس کی عمر ۱۵۳ برس کی تھی۔ اور اُس وقت اس کے ۷۷ بچے مر چکے تھے۔

اس شخص کی یادداشت بھی بلا کی تھی۔ وہ تمام گذشتہ لڑائیوں کے حالات زبانی سنایا کرتا تھا۔ وہ ترکی کا رہنے والا تھا، اور ہر سال کمال پاشا سے ملاقات کیا کرتا۔ اس کی بڑی قدر کی جاتی اور انعام بھی پیش کیا جاتا تھا۔

استنبول کے گورنر نے اسے ایک مکان بطور تحفہ پیش کیا تھا اور ساری عمر کے لئے میونسپل دربان مقرر کر دیا تھا۔

کالی کٹ میں کالی گھاٹ کے پاس دریا کے کنارے ایسے آدمی بھی دیکھے گئے تھے جو گذشتہ دس پندرہ سال سے ایک ہی جگہ پر کھڑے رہے تھے۔ انھوں نے بیٹھنے یا چلنے پھرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ان لوگوں کے جسم اور چہرے مٹی اور گندگی سے اَٹے رہتے تھے۔

اُنھوں نے اپنے سامنے سہارا لینے کے لئے دو لکڑیاں گاڑ رکھی تھیں، جن کے سہارے وہ کھڑے کھڑے آرام کیا کرتے تھے۔

لیجئے، اب ایک ایسے حیرت انگیز شخص کا حال سنیئے جو آنکھوں اور ہاتھوں سے محروم ہونے کے باوجود کتابیں بڑی آسانی سے پڑھ سکتا ہے، اور اُن کی ورق گردانی کر سکتا ہے۔

اس شخص کا نام ولیم مک فرسن ہے۔ یہ ۵۔ فروری ۱۸۶۶ء کو سکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ عام بچوں کی طرح اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اور پھر شادی کے بعد ۱۸۹۳ء میں امریکہ روانہ ہو گیا۔ ایک بارودی حادثے نے اِسے ہوا میں تیس فٹ اونچا اُڑا دیا۔ جب یہ نیچے گرا تو دونوں آنکھیں اور بازو غائب تھے۔

اس باہمت شخص نے اندھوں کے اسکول میں انگلیوں کے عوض زبان سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کی کوشش کامیاب ہوئی اور پڑھنے میں اپنے سب ساتھیوں سے بڑھ گیا۔

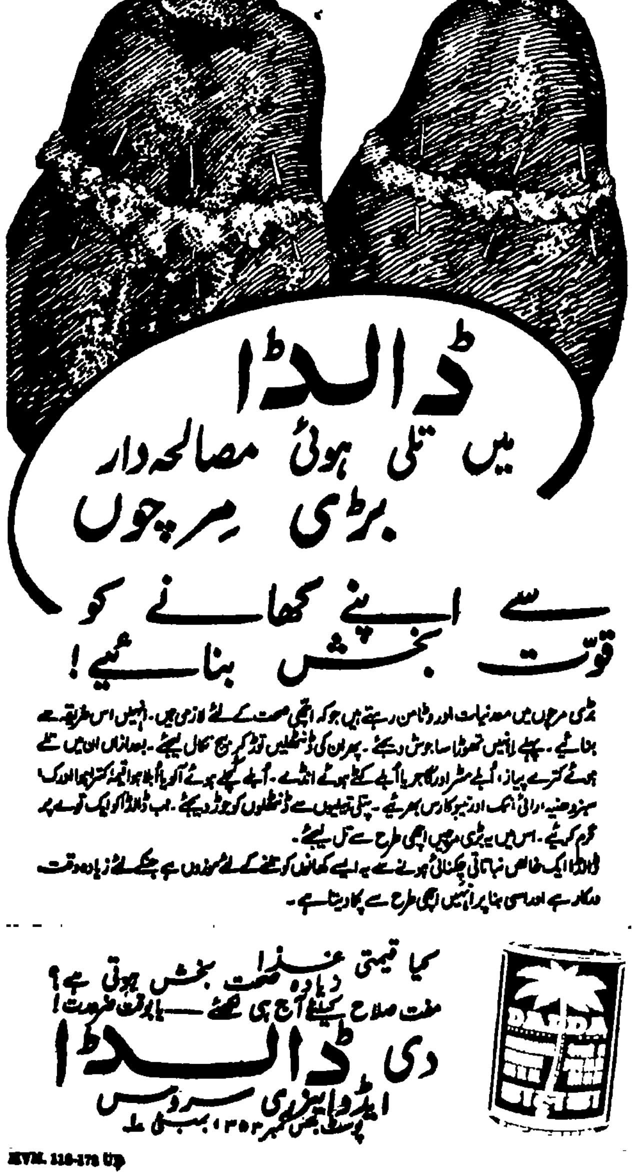
آج یہ بوڑھا شخص اندھیری دنیا میں رہنے کے باوجود کہتا ہے۔ "میں اپنے آپ کو خوش نصیب تصوّر کرتا ہوں، اور زبان کی مدد سے کتابیں پڑھ کر دُنیا بھر کے حالات سے واقفیت حاصل کرتا ہوں۔"

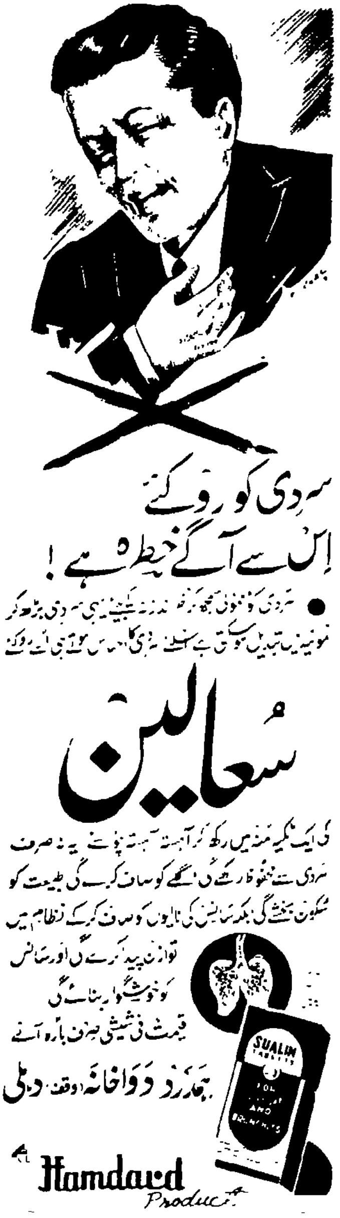
"جوزف کاسپر کارڈنیل میزوفینٹی" اٹلی کا باشندہ تھا۔ اس شخص کو دُنیا کی ۱۱۴ زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس شخص نے چینی زبان صرف چار ماہ میں سیکھی تھی۔ شائد اس زبان پر اسے زیادہ وقت صرف کرنا پڑا تھا۔ انگریزی زبان کے مشہور شاعر لارڈ بائرن کو بھی اس شخص نے منجلے طبقے کی زبانیں سکھائی تھیں۔

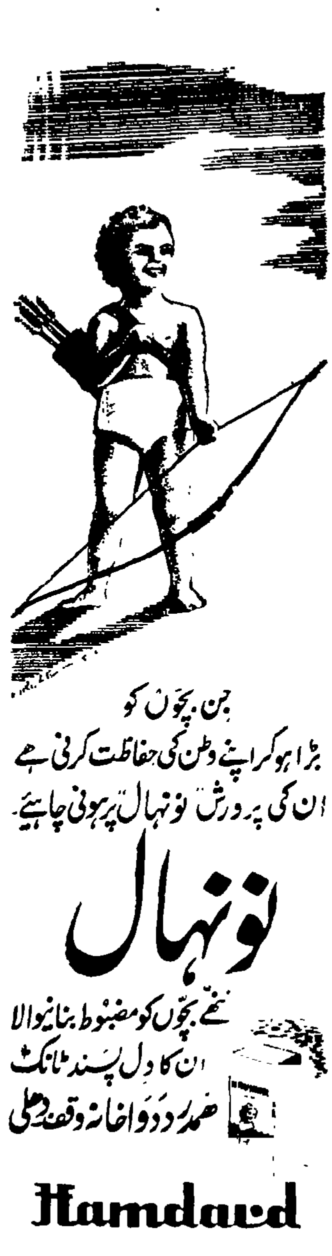


زارو آغا


سُپر بھا مکرجی بتاتی ہے کہ وہ اپنی دِلکش
جِلد کی حفاظت کیلئے لکس
ٹائلٹ صابن کو ہی
کیوں پسند کرتی ہے
LUX
LUX TOILET SOAP
آپ کہتی ہیں،-
"میں خوش ہوں کہ اب
مجھے اپنی جلد کے بارے میں کوئی فکر نہیں ہے کیونکہ
مجھے اسکو حسین رکھنے کی ایک سادی ترکیب
لکس ٹائلٹ صابن۔ مل گئی ہے۔ اسکی بالائی دار
جذب ہونیوالی جھاگ مساموں میں سماکر میل کو اچھی
طرح صاف کر ڈالتی ہے اور جلد کو صاف، ملیح اور ملائم
بنادیتی ہے۔ پھر، لکس ٹائلٹ صابن کی خوشبو بھی
بہت فرحت بخش اور تازگی بخش ہے"
یہ سفید اور خالص صابن،
جس کی خوشبو دلکش ہے
آپ کی جِلد کو بھی دِلکش
بنا سکے گا
فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن


ڈالڈا
میں تلی ہوئی مصالحہ دار
بڑی مرچوں
سے اپنے کھانے کو
قوت بخش بنائیے!
بڑی مرچوں میں معدنیات اور وٹامن رہتے ہیں جو کہ اچھی صحت کے لئے لازمی ہیں۔ انہیں اس طریقہ سے بنائیے۔ پہلے انہیں تھوڑا سا جوش دیجئے۔ پھر ان کی ڈنٹھلیں توڑ کر بیج نکال لیجئے۔ بعد ازاں ان میں تلے ہوئے کترے پیاز، اُبلے مٹر اور گاجر یا اُبلے کٹے ہوئے انڈے۔ اُبلے کچلے ہوئے آلو یا اُبلا ہوا قیمہ کترا ہوا ادرک سبز دھنیہ، رائی، نمک اور نیبو کا رس بھریئے۔ پتلی تیلیوں سے ڈنٹھلوں کو جوڑ دیجئے۔ اب ڈالڈا کو ایک توے پر گرم کیجئے۔ اس میں یہ بڑی مرچیں اچھی طرح سے تل لیجئے۔
ڈالڈا ایک خالص نباتاتی چکنائی ہونے سے یہ ایسے کھانوں کو تلنے کے لئے موزوں ہے جنکے لئے زیادہ وقت درکار ہے اور اسی بنا پر انہیں اچھی طرح سے پکا دیتا ہے۔
کیا قیمتی غذا زیادہ صحت بخش ہوتی ہے؟
مفت صلاح کیلئے آج ہی لکھئے — یا بوقت ضرورت!
دی ڈالڈا ایڈوائزری سروس
پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵۲، بمبئی ۱
DALDA
HVM. 110-178 Up





Regd No D.—21

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt of India, Old Secretariat, Delhi.


۱۹۵۱ء

اردو کا مقبول عام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر: — جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹرز: — عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۹ — نمبر ۷

سالانہ چندہ — چھ روپے
فی پرچہ — آٹھ آنے

فروری سنہ ۱۹۵۱ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

سلام مچھلی شہری

ایک چراغ اور بُجھا —!

"ایک عظیم داستان ختم ہو گئی ———"

جواہر لال نہرو

"مرحوم نئے ہندوستان کے معماروں میں سے ایک تھے۔"

لیاقت علی خاں

مادرِ ہند! ترا ایک چراغ اور بُجھا
مادرِ ہند! تری سُوجی ہوئی باہوں میں
ایک تیر اور لگا
مادرِ ہند! ترا پہلا ہی غم تازہ تھا
جب ہمیں چھوڑ گئے "راشٹریہ پتا"
ایک تیر اور لگا۔
غم و اندوہ کا اک کوہِ گراں اور گرا،
بیڑیاں کٹتے ہی سیلِ غمِ دوراں نے تجھے — جانے کیوں گھیر لیا
مادرِ ہند! ترا ایک چراغ اور بُجھا ——— !!!
——— دیکھ، ہمالہ کی طرف،
ایورسٹ آج سیہ پوش ہے، افسردہ ہے

ہند کے قصرِ فلک بوس سے آتی ہے صدا،
——— غم زدہ ماں! یہ ترے نالۂ خاموش کی گُونج
کشورِ ہند کے سالار سے کچھ کہتی ہے
——— دلِ مادر کے حسیں پیار! ابھی رُک جاتے
میری شمشیر کی جھنکار! ابھی رُک جاتے
اے نئے ہند کے معمار! ابھی رُک جاتے
اے مرے آہنی سردار! ابھی رُک جاتے
——— آگ جو مشرق و مغرب میں بھڑک اُٹھی ہے
وادیٔ گنگ و جمن تک نہ کہیں آ جائے!
تیرے مضبوط ارادوں ہی کی حاجت تھی مجھے
تیرے ہی آہنی بازو کی ضرورت تھی مجھے ——— !!!

—— مادرِ ہند! ترے درد بھرے دل کی پکار
ہم سمجھتے ہیں،
ہمیں بھی ہے ترے غم کا خیال۔
اور اسی واسطے اِس درد و اَلَم کے باوصف،
آج ہم پھر یہ قسم کھاتے ہیں
—— لال قلعے پہ "ترنگا" یونہیں لہرائیں گے
آج اس غم میں بھی "عزمِ دلِ نہرو" کی قسم
امن ہو، جنگ ہو، ہم فرض بجا لائیں گے
پھول بن جائیں گے، انگارے بھی بن جائیں گے
ایک کے بعد ترے لاکھ سپوت آئیں گے
آگ جو مشرق و مغرب میں بھڑک اٹھی ہے
وہ ترے باغ کو برباد نہ کر پائے گی!
ہم تغیّر کے تو حامی ہیں مگر اپنے تئیں
انقلاب آئے مگر غیر کی جانب سے نہیں ——!
آگ جو مشرق و مغرب میں کہیں بھڑکے گی
آگ جو مشرق و مغرب میں کہیں بھڑکی ہے ——
وہ ترے دامنِ رنگین کو نہ چھو پائے گی
اور آئے گی تو خود سرد سی ہو جائے گی ——!!!

مادرِ ہند! اجازت ہو تو تیرا شاعر
اپنے محبوب وطن والوں سے اتنا کہہ دے
—— غمِ سردار میں رونے والو!
اک ذرا صبر کرو۔

اپنے سردار کا پیغام ذرا یاد رہے
اس کا ہر قول بہ ہر گام ذرا یاد رہے!!
آنسوؤ! ٹھہرو،
فسردہ ترین نالو! رک جاؤ،
زرد شمعو! ذرا اک لمحہ مری بات سنو
آج قابو میں ذرا نالہ و فریاد رہے۔
ایک "سردار" کی میّت ہے تمہیں یاد رہے!!
اس کو لے جاؤ فلک بوس "ترنگے" کے تلے
شور میں "جَن۔گَن۔مَن" کے،
ہاتھ سے ہاتھ ملائے ہوئے اور پاؤں سے پاؤں،
شہر کے شہر سمیٹے ہوئے اور گاؤں کے گاؤں،
پھول کے ساتھ ہو شمشیرِ شجاعت کی بھی چھاؤں سے
غم میں بھی عزم کے پیکر بن کر
اس طرح نعش اٹھاؤ کہ تمہارا سردار
اپنے خاموش لبوں سے تمہیں شاباش کہے ——!!!
دیکھنا ہونٹ پہ آ جائے نہ دل کی فریاد
دیکھنا آنکھ سے آنسو نہ چھلکنے پائیں۔
میرے سردار کو آنسو سے بڑی نفرت تھی
اشک بھر آئیں تو ہنسنے کی اسے عادت تھی ——!
میں نے سردار کے پیغام سے یہ سمجھا ہے
اشکِ غم لاکھ مقدّس ہو مگر بہتر ہے
آدمی اس پہ بھی قابو پا جائے
مسکرا کر غمِ دوراں کے مقابل آ جائے ——!!!

نئے ہند کا معمار

۱۵۔ دسمبر ۱۹۵۰ء کی صبح کو ۹ بج کر ۳۷ منٹ پر نئے ہند کے معمار سردار پٹیل ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ ہندوستان کی سیاست میں جو جگہ خالی ہوگئی اُس کا پُر کرنا ناممکن ہے۔ سردار کی زندگی ملک اور قوم کی خدمت میں گزری۔ اُن کی قوتِ ارادی، جوشِ عمل، معاملہ فہمی اور نظم و ضبط کی سختی سے پابندی ایسے خصوصیات تھے کہ وہ ایک آدمی میں کہیں شاذ ہی ملتے ہیں۔

سردار پٹیل مہاتما گاندھی کے دستِ راست تھے۔ ستیہ گرہ کے اصول کو اُنھوں نے اپنا نصب العین بنایا تھا۔ بارڈولی کے کسانوں کی تنظیم ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو جنگِ آزادی کی تاریخ کا ایک زرّیں باب رہے گا۔ ہری پورہ کانگرس میں مجلسِ استقبالیہ کے صدر سردار پٹیل کے خاص معتمد دربار گوپال داس نے اپنے افتتاحی خطبے کو صرف چند استقبالیہ کلمات پر ختم کر دیا تھا۔ کیونکہ ان کے قول کے مطابق اُن کے علاقے میں سیاسیات پر لکھنے اور تبصرے کا حق سردار کے سوائے اور کسی کو نہیں پہنچتا تھا۔ عوام میں یہ مقبولیت اور نظم و ضبط کی یہ پابندی ہندوستان میں اور کہاں مل سکے گی۔

دوسری سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں (۱۹۳۱ء) سردار پٹیل کانگرس کے صدر تھے۔ روایت ہے کہ جب آپ جیل میں بیمار تھے تو آپ کو پیشکش کی گئی تھی کہ اگر آپ چاہیں تو علاج کے لئے ہندوستان سے باہر جا سکتے ہیں لیکن آپ نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ مرنے کے لئے وطن کی خاک سے بہتر اور کون سا مقام ہو سکتا ہے۔ جیل کی سختیوں اور بیماری کے ڈر سے میں اپنے وطن کو نہیں چھوڑ سکتا۔

اس آہنی انسان کے عزمِ استوار کی ہزاروں مثالیں ہیں۔ عمل و فراست کا یہ پیکر ہندوستان کی سیاسی بیداری کے بہت بڑے علمبرداروں میں سے تھا۔

حصولِ آزادی کے بعد سردار نائب وزیرِ اعظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ حقیقت میں جہاں بین الاقوامی معاملات اور اُن کی پیچیدگیاں خاص طور پر وزیرِ اعظم شری جواہر لال نہرو کی توجہ کا مرکز تھیں، ہندوستان کی اندرونی شیرازہ بندی کا بار سردار پر تھا۔

انگریزی حکومت ختم ہوئی تو ملک کتنے ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ ریاستیں اور ان کے معاہدات ایک ایسا معمّا تھا جس کا حل بہت مشکل تھا۔ یہ اسی مردِ جہاں بیں کا تدبّر تھا کہ اُس نے راجاؤں اور نوابوں کو اُن کی اصل حقیقت سے آگاہ کر کے جاگیرداری نظام کو ختم کرنے کی طرف ایک نہایت اہم قدم اُٹھایا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مشکل مرحلہ بڑی حد تک طے ہو چکا ہے۔

سردار مخلصوں کے سچے دوست تھے۔ عدم اخلاص کو معاف نہیں کرتے تھے۔ وہ اس اصول کے پابند تھے کہ کسی جماعت کی صحت مندی اور ترقی اس پر منحصر ہے کہ اس میں غلط قسم کے اور مریض عناصر نہ رہیں۔

آج وہ اس دنیا میں نہیں لیکن جو کام وہ کر گئے ہیں وہ مشعلِ راہ بن کر اہلِ ملک کو روشنی دکھائے گا۔ ہندوستان کے کروڑوں مرد و زن ہی نہیں دنیا کے ہر گوشے میں بسنے والے افراد نے سردار کی موت پر ماتم کیا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے سیاست دانوں نے اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اور یہ بات کتنی حوصلہ افزا اور تسکین بخش ہے کہ پاکستان کے وزیرِ اعظم مسٹر لیاقت علی خاں نے ان کی موت پر بے ساختہ انداز میں کہا کہ وہ نئے ہند کے معمار تھے۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

عرش ملسیانی

۲۰ر دسمبر ۱۹۵۰ء

مالک رام

میری پسند کی اُردو کتابیں

شعر کی طرح کسی کتاب کی پسند، ناپسند کا معاملہ بھی ہر ایک شخص کے ذاتی ذوق پر منحصر ہے بلکہ کسی شخص کی اپنی زندگی میں بھی یہ چیز مستقل نہیں رہتی۔ تعلیم اور تجربہ، گرد و پیش اور ماحول، جسمانی اور نفسیاتی رجحان، یہ سب باتیں انسان کے ذوق کی ساخت و پرداخت اور نشو و نما اور تغیر و تبدّل پر بہت حد تک اثر انداز ہوتی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ عمر کے ایک مرحلے میں آپ کو ایک کتاب پسند ہو اور کسی اور موقع پر آپ اسے پسند نہ کریں۔

میں نے جب ہوش سنبھالا، تو اپنے ارد گرد کتابیں دیکھیں۔ میرے بڑے بھائی، خدا اُن کی مغفرت کرے، کتابوں کے بڑے رسیا تھے۔ بلکہ کسی حد تک اردو اور پنجابی، دونوں زبانوں میں تُک بندی بھی کر لیتے تھے۔ پنجابی میں منظوم داستان یا حکایت کو قصّہ کہتے ہیں یا کم از کم میرے بچپن کے زمانے تک کہتے تھے۔ گھر میں ان قصّوں کا ایک اچھا خاصہ مجموعہ تھا۔ پورن بھگت، راجہ رسالو، قصہ شاہ بہرام، سسّی پنوں، سوہنی مہیوال، مرزا صاحباں، ہیر رانجھا، متعدد بارہ ماسے اور جانے کیا کیا الا بلا جمع تھی۔ ان کے علاوہ غلام قادر فصیح سیالکوٹی کے کچھ انگریزی ناولوں کے ترجمے تھے۔ داستان امیر حمزہ اور الف لیلے کا بھی ایک ایک نسخہ تھا۔ اب سب کے نام بھی یاد نہیں رہے۔

یاد ش بخیر، ہمارے گاؤں میں ڈسٹرکٹ بورڈ کا ایک مدرسہ تھا، جس میں آٹھویں درجے تک پڑھائی کا انتظام تھا۔ میری عمر پانچ برس سے کم تھی، جب میں تعلیم کے لئے اس مدرسے میں بھیج دیا گیا۔ مدرسے میں ایک کتب خانہ بھی تھا۔ کتب خانہ تو خیر کیا تھا۔ دو الماریوں میں نیچے اوپر کتابیں اٹی پڑی تھیں۔ میرا اندازہ ہے کہ پانچ چھ سو کتابوں سے کم نہیں ہونگی۔ ان میں سے نصف تو ایسی تھیں جو نصاب سے متعلق تھیں۔ بقیہ ڈھائی تین سو البتہ اردو فارسی کی عام کتابیں تھیں۔ قصّہ مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر سے پہلے پہلے میں نے گھر اور مدرسے کا یہ سارا ذخیرہ چاٹ لیا تھا۔ اردو کی بعض مشہور کتابیں میں نے اسی زمانے میں پڑھیں۔ فسانۂ آزاد، خدائی فوجدار۔ فورٹ ولیم کالج کی بعض کتابیں مثلاً قصہ چہار درویش، بیتال پچیسی وغیرہ اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسی بھی تھیں۔ جنہیں میں نے ایک سے زیادہ بار پڑھا تھا۔ چنانچہ مجھے خوب یاد ہے کہ فسانۂ آزاد میں نے تین مرتبہ پڑھا تھا

جب ہائی اسکول اور اس کے بعد کالج میں پہنچا۔ تو اب میدان وسیع ہو گیا۔ دونوں جگہ خصوصاً کالج میں بہت اچھی لائبریری تھی۔ یہاں سے بھی کتابیں مستعار لیتا۔ دوست احباب کے وہاں سے بھی اٹھا لاتا اور جب جیب میں دام ہوتے تو خود بھی خرید لیتا تھا۔ اگرچہ نون تیل کبھی مشکل ہی سے جمع ہوتا تھا

بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ شاید ہی اردو کی کوئی اچھی کتاب ہوگی جو نظر سے نہ گزرتی ہو۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان میں ایسی کتابیں واقعی بہت کم ہیں، جو زندہ رہنے والی ہوں۔

ناول — افسانوں اور ناولوں سے شروع کیجئے

سب سے پہلے میرامن کا قصہ چہار درویش یا باغ و بہار سامنے آتا ہے۔ کہنے کو تو یہ حضرت امیر خسرو کی فارسی سے ترجمہ ہے۔ لیکن یہ مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور بقول سرسید۔ اس کے سبب میرامن کا نام اردو نثر میں اسی مقام کا مستحق ہے جو نظم میں میر تقی میر کو حاصل ہے۔ اس کتاب کو لکھے آج ڈیڑھ سو برس ہو گئے، لیکن اس کی تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ذرا آگے بڑھئے، تو سرور کا فسانہ عجائب ہے یہ کتاب کسی زمانے میں بہت پڑھی جاتی تھی غالب کو بھی مصنف سے دوستی اور مروت کے مارے اس کی تعریف کرنا پڑی لیکن

آج اس کے مسجع اور مقفیٰ فقرے پڑھتے ہوئے الجھن ہونے لگتی ہے۔ افسانہ بھی پرانی قسم کا جنوں اور پریوں اور طلسمات کا مرقع ہے۔ وہ بھی کیا کرتے، اس زمانے کا ڈھنگ ہی یہی تھا۔ سرور نے دیباچے میں میرامن پر تعریض کی ہے اور دلّی کی زبان پر بھی کچھ اوچھا سا وار کیا ہے۔ اگرچہ خواجہ امان نے بوستانِ خیال میں اس کا منہ توڑ جواب دے دیا تھا اور سرور کی اپنی تحریر بھی ان کی نکتہ چینی سے نہیں بچی تھی، لیکن دہلویوں کی اس سے تسلی نہ ہوئی اور غالب کے شاگرد خواجہ فخرالدین حسین سخن دہلوی نے ایک افسانہ سروشِ سخن لکھ کر سرور اور اس کے ساتھ لکھنؤ کو بھی بن کے رکھ دیا۔ اب کے لکھنویوں کی وکالت جعفر علی شیون نے کی اور طلسمِ حیرت لکھ کر سروشِ سخن کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن آج ان کتابوں کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ سب طاقِ نسیاں کی نذر ہو چکی ہیں۔

فسانۂ عجائب کے بعد ہم سرشار کے فسانۂ آزاد سے دوچار ہوتے ہیں۔ سرشار نے متعدد کتابیں لکھیں لیکن جو قبولِ عام ان کے فسانۂ آزاد کو حاصل ہوا وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوا۔ اس کتاب میں کوئی ایک مسلسل افسانہ نہیں بلکہ یہ متعدد افسانوں کا مجموعہ ہے جو کتاب کے ہیرو میاں آزاد کے ساتھ کہیں اصلی اور کہیں نقلی تعلق ہونے کی وجہ سے ایک رشتے میں پرو لیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ کتاب آج سے ۶۰ - ۶۵ برس پہلے لکھی گئی تھی اور نقائص سے بھی بالکل پاک نہیں لیکن یہ واقع ہے کہ یہ کسی شجرِ سدا بہار کی طرح آج بھی ویسی ہی سرسبز ہے جیسی اس وقت تھی جب یہ لکھی گئی تھی۔ جیسی کردار نگاری اور لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کی تصویر کشی اس میں کی گئی ہے وہ پھر کسی سے نہ بن آئی۔ فیاض احمد نے ضمیمہ لکھا۔ یاروں نے اسے اچھالا اور چند دن اس کی شہرت بھی ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے محض فسانۂ آزاد کا منہ چڑایا ہے۔

سرشار کے بعد ڈپٹی نذیر احمد ہیں۔ نذیر احمد بہت زود نویس تھے اور زبان پر انہیں حیرت ناک قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے چھوٹی بڑی دو درجن کے قریب کتابیں لکھیں۔ اُن کا ترجمۂ قرآن ان کا زندۂ جاوید کارنامہ ہے۔ لیکن میں اس مضمون میں مذہبی کتابوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ ادبی میدان میں ان کے تین ناول مراۃ العروس، بنات النعش اور توبۃ النصوح ہیں۔ یہ تینوں کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔ ان کی زبان اور اسلوبِ بیان اور افادی حیثیت سے انکار ناممکن ہے۔ یہ تینوں ناول ہماری زبان کے افسانوی ادب میں مستقل مقام کے مالک ہیں۔ بلکہ میرے نزدیک بعض پہلوؤں سے نذیر احمد کو سرشار پر بھی ترجیح حاصل ہے۔

شرر نے تاریخی ناولوں کی ایک کھیپ الٹ کے رکھ دی ہے۔ لیکن ان کی دو تین چیزیں پڑھ لینے کے بعد طبیعت اکتا سی جاتی ہے۔ ان کے ہاں تنوع نام کو نہیں۔ ان کے پلاٹ، مناظر، واقعات اور انجام کی یکسانی سے جی متلانے لگتا ہے۔ میرے خیال میں ان کے تمام ناولوں میں فردوسِ بریں، فلورا فلورنڈا اور منصور موہنا سب سے اچھے ہیں۔ ان کی کتاب "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" بھی اردو کی اچھی کتابوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ شرر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہماری زبان کو ایک نئے اسلوبِ تحریر سے روشناس کیا اور انہوں نے ان موضوعوں پر لکھنا شروع کیا جنہیں اس سے قبل درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہی رنگ نکھر کر خواجہ حسن نظامی کے یہاں بہت دلآویز ہو گیا ہے۔

راشد الخیری کا بھی یہی حال ہے۔ ساری عمر روتے بسورتے گزر گئی مصورِ غم کہلائے، لیکن الا ماشاء اللہ شاید ہی اب کوئی ان کی کتابیں پڑھتا ہو۔ شامِ زندگی اور صبحِ زندگی غالباً ان کے بہترین ناول ہیں۔

ایک اور بزرگ فارسی سرفراز حسین تھے، جن کا دل پسند موضوع کسبی اور اس کی زندگی اور اس کی نایکہ کے ہتھکنڈوں کا بیان تھا۔

منشی پریم چند نے بہت سے ناول لکھے۔ ان میں سے چوگانِ ہستی، بازارِ حسن اور میدانِ عمل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اگرچہ غبن اور بیوہ بھی برے نہیں ہمارے معاشری اور سیاسی مسائل کا تجزیہ جتنی صحت اور مہارت سے پریم چند نے کیا اور جس سادہ اور دل نشین انداز میں اسے پیش کیا ہے وہ کچھ انہیں کا حصہ تھا۔

فنی لحاظ سے ہماری زبان کا سب سے اچھا ناول غالباً مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی کا "امراؤ جان ادا" ہے۔ اس کے متعلق خورشید الاسلام کا ایک بسیط مقالہ ابھی پچھلے دنوں چھپ چکا ہے۔ اس کا پلاٹ بہت مربوط ہے۔ کردار اسی دنیا کے گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسان ہیں اور ان میں انفرادیت ہے۔ رسوا نے بعض اور ناول بھی لکھے لیکن امراؤ جان ادا تک کوئی نہ پہنچ سکا۔

نیاز فتحپوری کا افسانہ "شہاب کی سرگزشت" بھی اردو کی اچھی کتابوں میں سے ہے۔ اسے جب آج سے ۲۵ - ۲۶ برس اُدھر پہلی بار شائع کیا گیا تو اس کے سرورق پر لکھا تھا کہ یہ افسانہ تحلیلِ نفسی کے اصول پر لکھا

گیا ہے۔ تحلیل نفسی تو اس میں واجبی ہی واجبی ہے۔ البتہ افسانے کے ہیرو فہما آب کی شخصیت بہت جاذب نظر ہے اور اس کے تیور ایسے ہیں کہ اسے اردو میں بطور تلمیح استعمال کرنا چاہئے۔

سراغ رسانی کے ناولوں میں صرف ظفر عمر بی اے کا ناول "نیلی چھتری" قابل ذکر ہے۔ جو انہوں نے فرانسیسی ناول نویس موریس لوبلاں کے کردار آرسین لوپن اور کانن ڈایل کے شرلک ہامز سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ چونکہ وہ خود پولیس میں ملازم تھے، اس لئے وہ اس میں بہت کامیاب ہوئے اور افسانہ واقعہ معلوم ہونے لگا۔ خود انہوں نے اس کے بعد بہرام کی گرفتاری' چوروں کا کلب' لال کھنڈر وغیرہ لکھے۔ ان کی دیکھا دیکھی بعض اور لوگوں نے بھی خامہ فرسائی کی لیکن سچ یہی ہے کہ نیلی چھتری آج تک اپنی جگہ پر وحدۂ لاشریک ہے۔

مختصر افسانے

کہانی کہنے کا رواج ہمارے یہاں خدا معلوم کب سے ہے۔ لیکن ہوتی یہ سب "ایک تھا راجہ" قسم کی اور ان میں ایک شہزادی اور کسی جن یا طلسم کی موجودگی بھی ضروری خیال کی جاتی تھی۔ اس میدان میں اصلاح کا سہرا منشی پریم چند کے سر ہے انہوں نے ایک نئی دنیا بنا ڈالی اور کہانی کے جسدِ بے جان کو روح عطا کی انہوں نے دو سو کے لگ بھگ افسانے لکھے ہوں گے۔ پریم پچیسی' پریم بتیسی اور کتنے اور مختصر مجموعے ان سے یادگار ہیں۔ یہ آج بھی بہت ذوق شوق سے پڑھے جاتے ہیں حالانکہ مذاق اور ماحول دونوں اس پندرہ بیس برس میں بالکل بدل گئے ہیں۔ بہت لوگوں نے جن میں مہاشہ سدرشن کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ پریم چند کی تقلید کی کوشش کی' مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ اصل اور نقل میں جو فرق ہوتا ہے۔ وہی پریم چند اور ان کے مقلدوں میں ہے۔ ان لوگوں نے سمجھ لیا کہ پریم چند کی کامیابی کا راز ان کی زبان کی سادگی اور دیہاتی معاشرت سے متعلق لکھنے میں ہے حالانکہ وہ ان کے علاوہ نفسیاتی مطالعے پر بھی مشتمل تھا۔ محض سر منڈوا لینے اور قلندری میں بڑا فرق ہے۔

نیاز فتحپوری ایک خاص طرز نگارش کے مالک ہیں۔ ان کی تحریر کی شگفتگی اور ان کے لطیف مزاح' کا ملح فی الطعام' ایسی چیزیں ہیں جو ان کی معمولی تحریر کو بھی بہت دلچسپ بنا دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "نگارستان" جو ان کے عنفوانِ شباب کی پیداوار ہے' بہت قابلِ قدر ہے۔ دوسرا مجموعہ "جمالستان" بھی خوب ہے لیکن "نگارستان" کو نہیں پہنچتا۔ کے علاوہ انہوں نے اصلاحی افسانے بھی لکھے ہیں۔ جن میں "نقاب اٹھ جانے کے بعد" زیادہ مشہور ہے۔

مجنوں گورکھپوری اور خواجہ حسن نظامی بھی مشہور لکھنے والے مجنوں کی اپنی حیاتِ معاشقہ کی ناکامی اور اس پر ہارڈی کے مطالعے نے ان پر خاص اثر کیا اور انہوں نے ایک خاص انفعالی رنگ میں بعض اچھے افسانے لکھے مختصر بھی اور طویل بھی' طبع زاد بھی اور اپنائے یا ہتیائے ہوئے بھی' لیکن ان میں قائم رہنے والی ایک چیز بھی نہیں۔ مجنوں کا نام اردو ادب میں افسانہ نویس کی حیثیت سے شاید ہی رہے۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر کی دلاویزی مسلم ہے۔ انہوں نے شرر اور آزاد اور سر سید کی طرزوں کے امتزاج سے ایک علیحدہ اسلوب وضع کیا جس میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی۔ انہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں اور ایک زمانے میں ان کی بہت مانگ تھی۔ ممکن ہے کہ ان کے بعض غدر کے افسانے زندہ رہ جائیں۔

موجودہ لکھنے والوں میں کرشن چندر سب سے اچھے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں تجزیہ بھی ہوتا ہے اور گہرائی بھی اور ان کا طرز بیان بھی بہت شگفتہ ہے۔ منٹو اور عصمت چغتائی دونوں اچھے لکھنے والے ہیں۔ لیکن دونوں کے دماغ پر الٹا چھاپ لگ گیا ہے۔ وہ ہر ایک چیز کو ایک خاص زاویے سے دیکھنے کے عادی ہیں خصوصاً منٹو کو پڑھ کر ڈی۔ ایچ لارنس اور فرینک ہیرس یاد آ جاتے ہیں۔ اپیندر ناتھ اشک' ندیم قاسمی۔ بیدی۔ ممتاز مفتی خواجہ احمد عباس اور اس کے گروہ کے چند دوسرے لکھنے والوں کے بعض افسانے بھی اچھے ہیں۔

مزاحیہ ادب

ہمارے یہاں مزاحیہ ادب کی بہت کمی رہی جس ملک میں سنیاس اور چلہ کشی کو روحانیت کی معراج تصور کیا جاتا ہو' وہاں اس سے زیادہ کی توقع بھی کیا ہو سکتی ہے۔ بہرحال اردو میں اس کی ابتدا "اودھ پنچ" سے ہوتی ہے خود منشی سجاد حسین بہت اچھے لکھنے والے تھے ان کی کتابیں "حاجی بغلول" "احمق الذی" "میٹھی چھری" ان کی فطری ظرافت اور بذلہ سنجی اور قدرتِ کلام کا اچھا نمونہ ہیں۔ خوش قسمتی سے انہیں نامہ نگار بھی اچھے مل گئے تھے۔ شروع شروع میں سرشار بھی "اودھ پنچ" میں لکھتے رہے۔ بعد میں جب انہوں نے اودھ اخبار

کاادارت کا بار سنبھالا تو "اودھ پنچ" میں لکھنا چھوڑ دیا۔ "اودھ پنچ" کے دوسرے لکھنے والوں میں مچھو بیگ عاشق (ستم ظریف) اور نواب سید محمد آزاد (مصر میں ہمارے پہلے سفیر ڈاکٹر سید حسین مرحوم کے والد) اس رنگ کے کامیاب لکھنے والوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔

سنجیدہ مزاح کا ایک کامیاب نمونہ سرشار کے "فسانۂ آزاد" میں بھی ملتا ہے۔ ان کا کردار میاں خوجی اس بات کا مستحق ہے کہ وہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر جائے

کسی زمانے میں مولانا محمد علی اور ولایت علی بمبوق اور ملا رموزی بھی مزاحیہ نگاروں میں گنے جاتے تھے لیکن آج کوئی انہیں جانتا بھی نہیں۔ یہ سب لفظوں کے الٹ پھیر سے مسخرگی کرتے ہیں۔ اردو میں صحیح معنوں میں مزاح نگار صرف (احمد شاہ بخاری) پطرس پیدا ہوئے۔ ان کے مضامین کا مختصر مجموعہ بقامت کہتر و بقیمت بہتر کے مصداق بڑی بڑی ضخیم جلدوں پر بھاری ہے۔ امتیاز علی تاج نے اگرچہ چچا چھکن کا تخیل جیروم کے جیروم سے لیا لیکن اس کے تتبع میں انہوں نے اپنی ذہانت اور طبعی اپچ سے اردو زبان کو ایک ضرب المثل کردار عطا کر دیا۔ ان کی کتاب "چچا چھکن" اس رنگ کی بہت اچھی چیز ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے بھی بعض بہت اچھے مضمون لکھے ہیں۔ ظرافت کے علاوہ ان کے دہاں کوثر کی دھلی ہوئی زبان کا چٹخارہ بجائے خود ایک دل کش چیز ہے۔ ان کے مضامین کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں، لیکن ان کے انتخاب کی ضرورت ہے۔ ان کا مضمون "مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی" بڑا بلند پایہ مضمون ہے اور اگر وہ اور کچھ نہ لکھتے تو اس ایک مضمون کے سہارے بھی وہ اردو مزاح نگاروں میں ممتاز جگہ پانے کے مستحق تھے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی مزاح نگار سے زیادہ طنز نگار ہیں۔ آپ رشید صاحب کا مضمون پڑھ کے کھلکھلا کے ہنس نہیں دیتے۔ زیادہ سے زیادہ منہ کھول کے مسکرا دیںگے۔ ان کے وہاں ایک پڑھے لکھے اور سنجیدہ شخص کا مزاح ہے اور اس سے ہر شخص لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ ان کی کتاب "مضامین رشید" ہماری اچھی کتابوں میں سے ہے۔ "خنداں" بھی خوب ہے، لیکن چونکہ یہ مضامین اصل میں ریڈیو کی تقریریں ہیں، جہاں وقت کی قید ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں انہیں کھل کھیلنے کا موقع نہیں ملا۔

یہاں عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت کا ذکر بھی کر دینا چاہئے دونوں فطری مزاح نویس ہیں۔ اگر سالک کے گزشتہ ربع صدی کے افکار و حوادث کا انتخاب کیا جائے تو اول درجے کی مزاح کی کتنی جلدیں تیار ہو جائیں۔ لیکن ایک روزانہ اخبار کے ساتھ ہی سستی نے جو ان کی "تعمیر میں مضمر" ہے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ یہی حال حسرت کا ہے۔ سالک کی طرح انہیں بھی صحافت نے ڈبو دیا تاہم انہیں سالک سے زیادہ اپنے جوہر دکھانے کا موقعہ ملا۔ ان کا ہفتہ وار پرچہ "شیرازہ" بڑے کام کی چیز تھا۔ "اودھ پنچ" کے بعد ہم نے اس نوع کی یہی ایک قابلِ ذکر چیز پیدا کی۔ لیکن افسوس کہ خورشید دولے دولتِ مستعجل بود۔ حسرت نے دو تین چیزیں بھی (مثلاً "کیلے کا چھلکا" "پنجاب کا جغرافیہ" "دو ڈاکٹر" وغیرہ) شائع کی ہیں۔ لیکن وہ روزانہ حرف و حکایت کا جو کالم لکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ اس سے بہت زیادہ کے اہل ہیں۔

اس کے بعد بس اللہ ہی اللہ ہے۔ شوکت تھانوی نے خدا معلوم کتنے افسانے اور مضمون اور کتابیں لکھی ہیں لیکن میرے خیال میں ان کا افسانہ "سودیشی ریل" ان سب پر بھاری ہے لیکن اس حالت میں جس طرح کہ یہ سب سے پہلے "نیرنگ خیال" میں چھپا تھا۔ بعد میں انہوں نے اس میں جا بجا اضافے کر کے اسے غارت کر دیا۔ اسی طرح عظیم بیگ چغتائی مرحوم نے بھی اگرچہ بیس کے قریب کتابیں لکھیں اور کتنے ہی افسانے بھی۔ لیکن ان کا افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" ایک طرف اور ان کا دوسرا تمام رطب و یابس دوسری طرف۔ یہ افسانہ ہماری زبان کے بہترین مزاحیہ افسانوں میں سے ہے۔

سوانح

اب سوانح عمری کو لیجئے۔

اس میدان میں حالی اور شبلی کے نام پیش پیش ہیں۔ حالی کی "حیات سعدی" اور "یادگار غالب" اور "حیاتِ جاوید" ہماری زبان کا مایۂ ناز سرمایہ ہیں غالب پر تو اس کے بعد بھی بہت کام ہوا ہے لیکن سعدی اور سرسید سے متعلق وہ جو کچھ لکھ گئے ہیں، اس پر کوئی قابلِ قدر اضافہ اب ناممکن ہے۔ غالب پر ان پچھلے دس بارہ برس میں تین کتابیں لکھی گئی ہیں۔ "غالب نامہ" (اس کا دوسرا ایڈیشن "آثار غالب" کے عنوان سے چھپا ہے) از محمد اکرام۔ "غالب" از غلام رسول مہر اور "ذکرِ غالب" از مالک رام۔ اگر اسے خود ستائی پر محمول نہ کیا جائے، تو کہوں کہ مختلف حیثیتوں سے یہ تینوں اچھی کتابوں میں شمار

کی جاسکتی ہیں ۔

شبلی بڑی جامع شخصیت کے مالک تھے ۔ افسوس کہ ان کی بعض کتابیں ابھی سے کم نگاہی کا شکار ہونے لگی ہیں ۔ انہوں نے سیرت نویسی میں ایک نئے رنگ کی بنیاد رکھی ۔ ان کی سیرۃ النبی نے حضرت رسول کریم صلعم کے حالات کو ایک بالکل اچھوتے انداز میں پیش کیا ۔ اس سے پہلے پیغمبر اسلام کی جتنی سوانح عمریاں لکھی گئی تھیں ان میں جذباتیت اور خوش اعتقادی کے باعث روایات کی چھان بین کڑی نظر سے نہیں کی گئی تھی' اس لئے خالص تحقیقی نقطۂ نظر سے ان میں کمزور پہلو رہ گئے تھے ۔ شبلی نے سیرۃ النبی ایسی عمدگی سے لکھی کہ روایت اور درایت دونوں کا حق ادا کر دیا ۔ سیرت کی دوسری کتابوں میں قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی "رحمۃ العالمین" اور میرزا بشیر احمد کی "خاتم النبیین" بھی بہت اچھی کتابیں ہیں ۔

شبلی نے سیرۃ النبی کے علاوہ بعض اور مشاہیر اسلام کی سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں مثلاً' المامون' الغزالی' سیرۃ النعمان' الفاروق ۔ اگرچہ یہ سبھی نہایت مستند اور محنت سے لکھی گئی ہیں لیکن جو قبولیت الفاروق کے حصے میں آئی وہ اور کسی کو نہ ملی اور اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب اس کی مستحق بھی ہے ۔

شبلی کے تلامذہ نے دارالمصنفین قائم کیا اور ان کی طرف سے اس باب میں بہت کام ہوا ہے ۔ ان کے شاگرد رشید سید سلیمان ندوی نے حیات مالک' سیرۃ عائشہ' خیام اور حیات شبلی لکھی ہیں ۔ ان میں سب سے عمدہ سیرۃ عائشہ ہے ۔ حیات شبلی ان کا جدید ترین ؟ ہے' جس میں انہوں نے اپنے استاد کے حالات بہت والہانہ اور عقیدت مندانہ انداز میں لکھے ہیں ۔ اور اسی لئے ان سے بعض مقامات پر فروگزاشت بھی ہوگئی ہے ۔ حیات شبلی کے ساتھ ساتھ محمد امین زبیری کی کتاب ذکر شبلی اور محمد اکرام کا شبلی نامہ بھی پڑھنا چاہیئے ۔

شبلی کی تقلید میں مولوی عبدالرزاق کانپوری نے سلسلۂ وزرائے اسلام لکھنا شروع کیا تھا ۔ وہ اس سلسلے میں صرف دو کتابیں شائع کر سکے ۔ البرامکہ اور نظام الملک طوسی ۔ البرامکہ بہت مقبول ہوئی ۔ اس کے آخری (ساتویں) ایڈیشن میں سنا ہے کہ انہوں نے بہت اضافے کئے ہیں ۔ اگرچہ لفظ برمک کی تحقیق میں واقعی ان سے غلطی ہوگئی ہے اور جیسا کہ سید سلیمان ندوی نے ثابت کر دیا ہے' یہ لفظ اصل میں پرمکھ ہے' تاہم یہ ہماری اچھی کتابوں میں گنی جاسکتی ہے ۔ مجھے معلوم نہیں کہ نظام الملک طوسی دوبارہ چھپی یا نہیں حالانکہ یہ بھی اچھی کتاب ہے ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "تذکرہ" کا معلوم نہیں کہاں تذکرہ کیا جائے ۔ انہوں نے بعض دوستوں کے اصرار پر یہ اپنی سوانح عمری کے طور پر لکھنا شروع کی تھی ۔ وہ مقصد تو غت ربود ہوگیا ۔ البتہ اپنے بزرگوں کے حالات سے کام شروع کیا اور یوں ایک معرکے کی کتاب وجود میں آگئی ۔

اردو میں خود نوشت سوانح عمری الفادر کالمعدوم کا حکم رکھتی ہے میری نظر سے صرف ایک کتاب اس طرح کی گزری ہے ۔ یہ سر رضا علی مرحوم کا اعمال نامہ ہے ۔ اس کا دوسرا حصہ ابھی وہ شائع نہیں کر سکے تھے کہ ان کی کتاب زندگی کا ورق ہی الٹ دیا گیا ۔ اس کتاب کی صاف گوئی اور راست بازی کی کھنک قابل داد ہے ۔ اسی طرح کی ایک اور کتاب تذکرۂ غوثیہ ہے ۔ یہ دراصل سید غوث علی شاہ (جن کا مزار پانی پت کے باہر مرجع انام ہے) کے حالات پر مشتمل ہے' جو ان کی زبانی لکھے گئے ہیں ۔ اگرچہ اس کے سرورق پر مؤلف کا نام گل حسن شاہ لکھا ہے لیکن دراصل یہ مولوی محمد اسمعیل میرٹھی (بچوں کے مشہور شاعر) کی لکھی ہوئی ہے ۔ اس کتاب کی بے ساختگی' خلوص اور تاثیر کا اندازہ اسے پڑھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے ۔ یہ بھی ہماری بہترین کتابوں میں شمار ہونے کے قابل ہے ۔

سوانح عمری کی ایک اور صنف ہے جس میں صاحب ترجمہ کے پورے حالات بیان کرنے کا التزام نہیں ہوتا ۔ بلکہ مصنف کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کا کردار زیادہ نمایاں ہو ۔ اس لئے وہ اجمالی طور پر حالات بھی وہی بیان کریگا جو اس کے مفید مطلب ہونگے ۔ یہ بہت مشکل کام ہے اور اس کے لئے بڑے سلیقے اور بہت چابک دست لکھنے والے کی ضرورت ہے ۔ ہمارے یہاں اچھی سوانح عمریوں ہی کا کال ہے ۔ اسی طرح کی کردار نویسی کا کیا ذکر ۔ بہرحال دو تین کامیاب چیزیں اس نوع کی بھی لکھی گئی ہیں ۔ ان میں سب سے پہلے مولوی عبدالحق کی دو کتابیں مرحوم دہلی کالج اور چند ہم عصر ہیں ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین میں کردار نویسی کے بعض اچھے نمونے ملتے ہیں بالخصوص

جہاں انہوں نے اپنے استادوں کے حالات لکھے ہیں۔ اس کے بعد پروفیسر رشید احمد صدیقی کی "گنج ہائے گرانمایہ" ہے۔ رشید صاحب نے اسی نہج پر ذاکر صاحب بھی لکھا اور خوب لکھا لیکن بوجوہ وہ اسے کماحقہٗ نہیں لکھ پائے۔ البرامکہ والے مولوی عبدالرزاق نے بھی اپنی موت سے تھوڑے دن پہلے ایک اسی طرح کی کتاب "یادِ ایام" لکھی تھی لیکن، افسوس کہ یہ بہت مایوس کن ہے۔

تذکرے

اسی ضمن میں تذکروں کا بیان بھی بے محل نہیں ہوگا۔ تذکرہ نویسی کا پرانا طریقہ یہ تھا کہ سطر دو سطر میں شاعر کے حالات بلکہ بسا اوقات صرف نام اور تخلص اور اس کے بعد انتخاب ظاہر ہے کہ ایسے تذکرے موجودہ زمانے کے مذاق کے سراسر خلاف ہیں کیونکہ ان میں نہ سوانح مکمل ہیں نہ کلام پر تنقید ہی ہے۔ بہرحال ہمیں شکرگزار ہونا چاہیئے ان مصنفوں کا، ورنہ جو تھوڑے بہت حالات آج دستیاب ہوتے ہیں، یہ بھی ضائع ہو جاتے۔

تنقیدی لحاظ سے سب سے پہلا قابلِ تعریف تذکرہ شیفتہ کا "گلشنِ بےخار" ہے۔ حالات اس میں بھی برائے نام ہیں اور جنبہ داری سے بھی ان کا دامن بالکل پاک نہیں رہا۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی جیسے جچے تلے لفظوں میں انہوں نے مختلف شاعروں کے کلام کے متعلق رائے دی ہے وہ ان کی بالغ نظری کا بین ثبوت ہے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق یہ تذکرہ فارسی میں لکھا گیا ہے۔ اردو میں سب سے پہلا عظیم الشان کارنامہ "آبِ حیات" ہے۔ آزاد کو اس کا مسالہ جمع کرنے میں بہت محنت کرنا پڑی ہوگی اور بقول حالی وہ بہت پہلے سے اس کی فکر میں رہے ہونگے ورنہ ایسے تفصیلی حالات لکھنا محال تھا۔ گزشتہ چند برس میں کتنے مصنفوں نے "آبِ حیات" کی خامیاں منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ بےعیب ذات خدا کی ہے، آزاد بھی بشریت کی کمزوریوں سے بری نہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے اردو کو ایک زندۂ جاوید کتاب عطا کر دی۔ لطیفہ یہ ہے کہ ان کے شدید نکتہ چین بھی ان کی خوشہ چینی اور تقلید کے بغیر نہیں رہ سکے۔ شبلی نے اگرچہ "شعر العجم" میں فارسی کے شاعروں کے حالات اور ان کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ اردو میں لکھا گیا ہے، اس لئے اس کا ذکر بھی اسی جگہ کرنا لازم ہے۔ شبلی کے ایک شاگرد عبدالسلام ندوی نے "شعر الہند" لکھا اور ایک دوست حکیم عبدالحی نے "گلِ رعنا" دونوں اردو کی اچھی کتابوں میں سے ہیں اگرچہ نقائص سے بری نہیں خاص طور پر "شعر الہند" کہ اس میں ترتیب کی بہت خامیاں ہیں۔ اسے از سرِ نو لکھنے کی ضرورت ہے، جس میں اسی مواد کو بہت زیادہ عمدگی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اردو تذکروں میں لالہ سری رام کا "خمخانۂ جاوید" سب سے مفصل اور ضخیم ہے۔ اس کی پہلی چار جلدیں لالہ سری رام خود شائع کر گئے اور پانچویں ابھی پچھلے دنوں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے شائع کی ہے۔ غالباً ابھی تین جلدیں اور چھپیں گی تب کہیں جا کے یہ تذکرہ مکمل ہوگا چشمِ بد دور، آثار بُرے ہیں۔ خدا کرے یہ بھی چھپ جائیں اور یہ تذکرہ جس پر لالہ سری رام نے اپنی زندگی قربان کر دی، پورا ہو جائے۔ ڈاکٹر محمد ابواللیث نے "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند کے حصول کے لئے بطور مقالہ لکھا تھا۔ یہ کتابی صورت میں چھپ گیا ہے۔ انہوں نے لکھنویت اور یہاں کے اساتذہ کے کلام کے حسن و قبح پر جس شرح و بسط سے بحث کی ہے وہ ہر طرح تعریف کے قابل ہے۔ اس موضوع پر یہ بہترین کتاب ہے۔ ضرورت ہے کہ اب اسی طرح "دہلویت" پر بھی ایک کتاب لکھی جائے۔ پارسال محمد یحییٰ تنہا نے "مراۃ الشعرا" شائع کیا ہے۔ ان کی کتاب "سیر المصنفین" ایک زمانے سے چھپ چکی ہے جس میں انہوں نے اردو نثر نگاروں کے حالات، ان کی تحریروں کے نمونے اور ان پر تبصرہ کیا ہے۔ لیکن اس میں ناہمواری بہت تھی۔ اب ربع صدی بعد انہوں نے شاعروں کے حالات اور تنقید میں "مراۃ الشعرا" لکھی ہے۔ یہ پہلی کتاب سے کہیں زیادہ کامیاب ہے۔ اگرچہ اس میں بھی حالات بہت مختصر ہیں اور کہیں کہیں ان سے لغزش بھی ہو گئی ہے لیکن جہاں تک تنقید کا تعلق ہے یہ بہت سیر حاصل ہے۔ ممکن ہے کہ ہم مصنف سے ہر جگہ متفق نہ ہوں لیکن انہوں نے زبان کی جو خدمت سرانجام دی ہے۔ اس کی داد نہ دینا بھی ظلم ہے۔ اردو زبان کی تاریخوں میں رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادبِ اردو" (ترجمہ محمد عسکری) سب سے بہتر ہے

تنقید

تنقید کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جس میں فنِ تنقید اور اس کے اصول سے بحث ہے اور دوسرے وہ جس میں بعض مصنفوں کے کلام، نظم و نثر پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ پہلی قسم میں دو ایک چیزیں قابلِ ذکر ہیں۔ حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" اس رنگ کی پہلی کوشش ہے۔ شبلی کے "شعر العجم" کے آخری دونوں حصے (چوتھا اور

پانچوں) بھی اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ یہ دونوں صاحب ہمارے پُرانے طرز تعلیم کے نمائندے اور انگریزی سے نابلد تھے اگرچہ حالی نے انگریزی خیالات سے بہت استفادہ کیا۔ اس کے بعد مدتوں سنّاٹا چھایا رہا تا آنکہ محی الدین قادری زورؔ نے "روحِ تنقید" لکھی اور اس کے بعد عبدالقادر سروری نے "دنیائے افسانہ" اور "جدید اردو شاعری" دو کتابیں شائع کیں۔

شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن نے کسی زمانے میں دہلی یونیورسٹی میں عربی شاعری پر کچھ لیکچر دئے تھے۔ بعد میں انہوں نے اس میں فارسی اور اردو کی مثالیں بڑھائیں اور اس مجموعے کو "مراۃ الشعرا" کے نام سے شائع کر دیا۔ اس کتاب میں شعر اور اس کے متعلقات پر بڑی پُرمغز بحث ہے اور ہر ایک عنوان کے تحت عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے مستند شعرا کا کلام بطور مثال اور سند پیش کیا گیا ہے۔ خدا معلوم یہ کتاب دوبارہ شائع ہوئی یا نہیں، یہ فنِ شعر و تنقید پر بہت ہی قابل قدر چیز ہے۔

رشید احمد صدیقی نے "طنزیات و مضحکات" لکھ کر اردو کو ایک بالکل اچھوتے موضوع سے روشناس کرایا ہے۔ اس میں انہوں نے طنز کی تاریخ اور اس کی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے اور اس کی مثالیں اردو اور فارسی نظم و نثر سے دی ہیں۔ مصنف خود آج طنز میں منفرد ہیں، اس لئے کوئی ان سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ محتسب را درونِ خانہ چہ کار۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے۔ نہایت واقف کارانہ انداز سے۔ ان سے پہلے طنز کے کچھ نمونے ریاض گورکھپوری مرحوم کے مضامین میں ملتے ہیں۔

جہاں تک تنقیدی مضامین یا کتابوں کا سوال ہے، اس سلسلے میں ہمارے یہاں بعض اچھی کتابیں موجود ہیں۔ سب سے پہلے شبلی کا موازنہ "انیس و دبیر" ہے۔ "دبیریوں" نے رد الموازنہ اور خدا معلوم اور کیا کچھ لکھ کے بہت کوشش کی کہ شبلی کی تردید کریں لیکن بے سود۔ اس مجموعے میں سب سے موقر کتاب انہوں نے "المیزان" لکھی۔ جو اگرچہ سید نظیر الحسن کے نام سے چھپی تھی لیکن عام خیال ہے کہ اس تحریر میں لکھنؤ کے بعض اکابر نے حصہ لیا تھا۔ آج کتنے ہیں، جنہوں نے ان کتابوں کو پڑھنا تو درکنار، ان کے نام بھی سنے ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نے پچھلے دنوں انیسؔ کے کلام پر ایک نئے زاویے سے نظر ڈالی ہے اور ان کے مضمون پر مرزا جعفر علی خاں اثرؔ نے بڑی کڑی تنقید کی ہے۔

نیاز فتحپوری ہمارے بہت بالغ نظر نقّاد ہیں اور ان کی فنی واقفیت بہت وسیع ہے۔ وہ قدیم طرزِ نقد کے علاوہ جدید رجحانات سے بھی ناواقف نہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے "انتقادیات (دو حصے)" اور "مالہ و ماعلیہ" کے عنوانوں سے چھپ چکے ہیں۔ ان میں بصیرت کا بہت سامان ہے۔ انتقادیات کے دوسرے حصے میں انہوں نے غالب کے فارسی کلام پر جو کچھ لکھا ہے اس میں پہلی دفعہ غالب کی فارسی شاعری پر جچی تلی تنقید کی گئی ہے۔

مولوی عبدالحق تنقید کا ایسا سلجھا ہوا مذاق رکھتے ہیں کہ ان کی کڑوی بات بھی میٹھی معلوم ہوتی ہے۔ اردو ادب میں ان کی جگہ اب ایسے بزرگ کی ہے کہ وہ نوجوانوں کی خردہ گیری اور ان کی بے راہ روی پر چشم نمائی کا حق رکھتے ہیں۔ ان کی تنقیدات کے دو حصے چھپ چکے ہیں اور بہت خوب ہیں۔

یادش بخیر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ہماری مٹتی تہذیب کی شمع آخریں ہیں۔ موصوف کی ژرف نگاہی اور وسعتِ نظر مسلمہ ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر۔ ان کے یہاں سطحیت نام کو بھی نہیں۔ ان کی کتاب کیفیہ ہماری زبان کی مایۂ ناز کتابوں میں سے ہے۔

اسی سلسلے میں غالبؔ کے شارحوں اور نقّادوں کا ذکر بھی کر دوں۔ مریض کو گور کس نے پہنچایا، طبیبوں نے۔ ہمارے ڈاکٹر صاحبان نے غالبؔ بیچارے سے جو سلوک کیا ہے، اسے دیکھنے کے بعد اس قول کی صداقت ذہن نشین ہو سکتی ہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اٹھے اور انہوں نے دیوانِ غالبؔ کو الہامی کتابوں سے جا بھڑایا (محاسن کلام غالبؔ) ڈاکٹر عبداللطیف کو جوتا ڈآیا تو انہوں نے بیچارے کو توم کے رکھ دیا اور ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ اسے مہمل ثابت کر دیں۔ (غالب) ڈاکٹر سید محمود آئے تو انہوں نے یہ منوانے کی کوشش کی کہ غالب کا سا محبِ وطن اور بدیشی حکومت کا مخالف کوئی اور تھا ہی نہیں۔ ان کی تحریر پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں دیوانِ غالب کا ہے کو، صدر کانگریس کا خطبہ صدارت ہے (مقدمہ دیوان غالب نظامی ایڈیشن) اور اب ڈاکٹر شوکت سبزواری نے غالب کے کلام سے حیات اور مابعد الحیات کے مسائل کا استنباط کیا ہے (فلسفۂ کلام غالب) جناب جعفر علی خاں اثرؔ

ڈاکٹر تو نہیں لیکن علم و ادب کے پرانے نبض شناس ہیں اور کتنے ڈاکٹروں سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ انہوں نے شوکت صاحب کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف کیا ہے (آج کل ۱۹۴۹ء، ۱۹۵۰ء) لیکن اثر صاحب کے دماغ پر میر چھایا ہوا ہے۔ خدا معلوم وہ موقع بے موقع میر کو کیوں گھسیٹ لاتے ہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ غرض یہ کہ بقول یگانہ یہ سب حضرات غلیا گئے ہیں اور ان کی تحریریں افراط و تفریط سے مملو ہیں۔ ابھی تک غالب کے اردو کلام سے متعلق ایک متوازن اور معتدل کتاب کی جگہ خالی ہے۔

یہی حال شارحین کا ہے۔ غالب کے اردو دیوان کی دو درجن بھر شرحیں لکھی گئی ہونگی۔ ان میں بعض بزرگوں نے غالب کے کلام کے جو معنی بیان کئے ہیں سچ مانئے کہ وہ مرزا غریب تو درکنار اس کے فرشتوں تک کے ذہن میں نہیں ہونگے۔ یہ مبالغہ نہیں۔ مثال کے طور پر بیخود موہانی کی شرح دیکھ لیجئے اور داد دیجئے۔ میرے نزدیک نظم طباطبائی اور آسی الدنی کی لکھی ہوئی شرحیں سب سے اچھی ہیں۔

موجودہ لکھنے والوں میں فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، عبادت بریلوی، سید مسعود حسن رضوی، خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر کلیم الدین احمد وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کلیم الدین احمد کو البتہ مصائب ہی مصائب نظر آتے ہیں اور وہ گاندھی جی کے الفاظ میں اردو شاعری کے "داروغۂ صفائی" کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں۔

خطوط غالب سے پہلے رجب علی بیگ سرور کے اردو خطوط (انشائے سرور) ملتے ہیں۔ اگرچہ ان میں وہ القاب مگر تو نہیں جو اس عہد کا طرۂ امتیاز تھا، لیکن ان میں کوئی خاص بات بھی نہیں۔ سادہ و پرکار خطوط کی جدت کا سہرا غالب کے سر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مرزا کی سی خطوط نویسی پھر کسی سے نہ بن آئی۔ ان کے بعد خدا جھوٹ نہ بلوائے کروڑوں خطوط کے مجموعے شائع ہوتے لیکن الا ماشاءاللہ ان میں سے کسی کا دوسرا ایڈیشن بھی نہ چھپ سکا۔ ان میں سے بعض واقعی خوب ہیں۔ مثلاً سرسید کی سلاست اور خلوص اور مہدی الافادی الاقتصادی کا تیکھا پن اور جدت پسندی قابل داد ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ خطوط جو انہوں نے اپنی آخری قید کے ایام میں نواب صدر یار جنگ مرحوم کے نام لکھے تھے خاصے کی چیز ہیں۔ یہ "غبار خاطر" کے عنوان سے چھپ چکے ہیں۔ نیاز فتحپوری بڑے دلکش طرز تحریر کے مالک ہیں۔ مولانا آزاد کی طرح وہ بھی اپنے خطوں میں شعر اس طرح کھپاتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑا یا جاتے۔ یہی رنگ صلائے عام والے ناصر علی کا تھا۔ نیاز نے خود بھی ان کا ذکر کسی جگہ کیا ہے۔ مکتوبات نیاز کے تین حصے شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے بیشتر کسی شخص خاص کے نام نہیں لکھے گئے۔ لیکن یہ بڑے خیال انگیز اور کام کی چیز ہیں اور ہمارے ادب عالیہ میں ممتاز جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

قاضی عبدالغفار نے کسی زمانے میں "لیلیٰ کے خطوط" لکھے تھے۔ یہ خط بھی فرضی ہیں۔ ایک کسبی لیلیٰ نام اپنے کسی دوست کو اپنے اور اپنے ملنے والوں کے حالات لکھتی ہے، لیکن اس پردے میں انہوں نے ہمارے سماج کی بعض دکھتی رگوں پر جس ماہرانہ انداز میں ہاتھ رکھا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے۔

"مکاتیب شبلی" (۲ جلدیں) خوب ہیں لیکن اس باب میں ان کا اصل کارنامہ خطوط شبلی ہیں جس میں ان کے وہ مکتوب شامل ہیں جو انہوں نے فیضی بیگم (عطیہ بیگم اور زہرا بیگم) کے نام لکھے تھے۔ یہ خطوط تعریف سے مستغنی ہیں۔

تحقیق خالص تحقیقی کتابیں ہمارے یہاں بہت کم ہیں۔ دراصل یہ کام بہت محنت اور وسیع مطالعہ چاہتا ہے اور اس میں پتا مارنا پڑتا ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان ابھی اس سے کتراتے ہیں حالانکہ جب تک کسی زبان میں تخلیقی اور تحقیقی کتابوں کی کمی ہے وہ مکمل نہیں کی جا سکتی۔ یہاں پھر شبلی کا نام آتا ہے۔ ان کے متعدد تحقیقی مضامین مختلف موضوعوں پر موجود ہیں۔ ان کے بعد اس صنف میں سید سلیمان ندوی کی دو تین کتابیں قابل ذکر ہیں۔ ارض القرآن۔ عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی۔ خدا بخشے پروفیسر محمود شیرانی کو، ان میں تحقیق اور جستجو کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اور ان کا طرز بیان بھی شگفتہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ دوسروں کے لئے مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے۔ ان کی "تنقید شعر العجم" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس وسیع مطالعے کے انسان تھے اور کسی چیز کی کھوج میں وہ کتنی محنت کرتے تھے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ بھی بڑی قابل قدر چیز ہے۔ ان کی کتاب "پنجاب میں اردو" جس میں انہوں نے پنجابی اور اردو کا تعلق دکھا کے اردو کی ابتدا پر روشنی ڈالی ہے، ہماری بہترین کتابوں میں سے ہے۔ یہ غالباً نصیرالدین ہاشمی کی "دکن میں اردو" کے بعد چھپی تھی جس میں ہاشمی صاحب نے یہ ثابت

کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کی ابتدا کس سے ہوئی - اردو زبان کی تاریخ اور نشوونما سے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے بعض رسائل بھی بہت خوب ہیں - اس موضوع پر شمس اللہ قادری کے قلم سے بھی بعض اچھی چیزیں شائع ہوئی ہیں -

متفرق دو تین کتابیں ایسی ہیں جو میں کسی خاص عنوان کے تحت شامل نہیں کر پایا - ان میں پہلی انشا کی دریائے لطافت ہے - اصل کتاب فارسی میں تھی لیکن اس کا کیفی صاحب کا ترجمہ چھپ چکا ہے - سلیم پانی پتی کی وضع اصطلاحات ایک اور کتاب ہے - چار پانچ برس ہوئے ڈاکٹر عابد حسین نے تین جلدوں میں "ہندستانی قومیت اور قومی تہذیب" لکھی تھی - یہ سب بہت اچھی کتابیں ہیں -

نظم مضمون پہلے ہی کافی لمبا ہو گیا ہے - لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم اگرچہ ممکن ہے کہ ابھی کچھ کتابیں ذکر سے رہ گئی ہوں - اس لئے میں شاعروں کے صرف ناموں پر اکتفا کروں گا -

غزل - میرؔ، دردؔ، غالبؔ، مومنؔ، حسرتؔ موہانی، یگانہ، جگرؔ، فراق

مرثیہ - انیسؔ، دبیرؔ

مثنوی - سحر البیان (میر حسنؔ)، گلزار نسیم (نسیمؔ)، عالم خیال (شوق قدوائی)، زہر عشق (نواب مرزا شوق)

نظم - نظیر اکبر آبادی، اقبال، جوش ملیح آبادی -

رباعی - انیسؔ، یگانہ، جوش ملیح آبادی، امجد حیدر آبادی

مسدس - مسدس حالی -

اب مختصراً ان کتابوں کی فہرست لکھے دیتا ہوں جو مجھے پسند ہیں اور جو میرے خیال میں اردو کی بہترین کتابوں میں شمار کی جا سکتی ہیں - یاد رہے کہ میں نے تراجم اور مذہبی کتابوں کا دانستہ ذکر نہیں کیا - یار زندہ صحبت باقی -

ناول :-

۱ - قصۂ چہار درویش	میر امن دہلوی
۲ - فسانۂ آزاد	رتن ناتھ سرشار
۳ - مراۃ العروس	نذیر احمد
۴ - بنات النعش	نذیر احمد
۵ - توبۃ النصوح	نذیر احمد
۶ - فلورا فلورنڈا	عبدالحلیم شرر
۷ - منصور موہنا	عبدالحلیم شرر
۸ - چوگان ہستی	پریم چند
۹ - بازار حسن	پریم چند
۱۰ - میدان عمل	پریم چند
۱۱ - امراؤ جان ادا	محمد ہادی رسوا
۱۲ نیلی چھتری	ظفر عمر

مختصر افسانہ :-

۱۳ - پریم پچیسی	پریم چند
۱۴ - پریم بتیسی	پریم چند
۱۵ - واردات	پریم چند
۱۶ - نجات وغیرہ	پریم چند
۱۷ - نگارستان	نیاز فتحپوری
۱۸ - جمالستان	نیاز فتحپوری
۱۹ - نقاب اٹھ جانے کے بعد	نیاز فتحپوری
۲۰ - افسانے	کرشن چندر

مزاح :-

۲۱ - پطرس کے مضامین	احمد شاہ بخاری "پطرس"
۲۲ - چچا چھکن	امتیاز علی تاج
۲۳ - مضامین فرحت	فرحت اللہ بیگ
۲۴ - مضامین رشید	رشید احمد صدیقی

سوانح عمریاں :-

۲۵ - حیات سعدی	حالی
۲۶ - یادگار غالب	حالی
۲۷ - حیات جاوید	حالی
۲۸ - آثار غالب	محمد اکرام
۲۹ - غالب	غلام رسول مہر
۳۰ - ذکر غالب	مالک رام
۳۱ - سیرۃ النبی	شبلی
۳۲ - رحمۃ للعالمین	محمد سلیمان منصور پوری

۳۳ - خاتم النبیین	میرزا بشیر احمد
۳۴ - الفاروق	شبلی
۳۵ - سیرۃ عایشہ	سید سلیمان ندوی
۳۶ - حیاتِ شبلی	سید سلیمان ندوی
۳۷ - البرامکہ	عبدالرزاق کانپوری
۳۸ - نظام الملک طوسی	عبدالرزاق کانپوری
۳۹ - تذکرہ	ابوالکلام آزاد
۴۰ - اعمال نامہ	سید رضا علی
۴۱ - تذکرۂ غوثیہ	اسمٰعیل میرٹھی
۴۲ - مرحوم دہلی کالج	عبدالحق
۴۳ - چند ہم عصر	عبدالحق
۴۴ - گنج ہائے گراں مایہ	رشید احمد صدیقی

تذکرے :-

۴۵ - گلشن بے خار	شیفتہ
۴۶ - آبِ حیات	محمد حسین آزاد
۴۷ - شعرالعجم	شبلی
۴۸ - شعرالہند	عبدالسلام ندوی
۴۹ - گلِ رعنا	عبدالحی
۵۰ - خم خانۂ جاوید	سری رام
۵۱ - لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	محمد ابواللیث
۵۲ - مراۃ الشعراء	محمد یحییٰ تنہا
۵۳ - تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ (محمد عسکری)

تنقید :-

۵۴ - مقدمۂ شعر و شاعری	حالی
۵۵ - مراۃ الشعر	عبدالرحمٰن
۵۶ - روحِ تنقید	محی الدین قادری زور
۵۷ - دنیائے افسانہ	عبدالقادر سروری
۵۸ - جدید اردو شاعری	عبدالقادر سروری
۵۹ - موازنۂ انیس و دبیر	شبلی
۶۰ - طنزیات و مضحکات	رشید احمد صدیقی
۶۱ - انتقادیات	نیاز فتحپوری
۶۲ - مالہ و ماعلیہ	نیاز فتحپوری
۶۳ - تنقیدات عبدالحق	عبدالحق
۶۴ - کیفیہ	برج موہن دتاتریہ کیفی

مکاتیب :-

۶۵ - خطوطِ غالب	غالب
۶۶ - غبارِ خاطر	ابوالکلام آزاد
۶۷ - مکتوباتِ نیاز	نیاز فتحپوری
۶۸ - شبلی کے خطوط	قاضی عبدالغفار
۶۹ - خطوطِ شبلی	شبلی

تحقیق :-

۷۰ - ارض القرآن	سید سلیمان ندوی
۷۱ - عرب و ہند کے تعلقات	سید سلیمان ندوی
۷۲ - عربوں کی جہاز رانی	سید سلیمان ندوی
۷۳ - پنجاب میں اردو	محمود شیرانی
۷۴ - دکن میں اردو	نصیرالدین ہاشمی

متفرق :-

۷۵ - دریائے لطافت	انشاء
۷۶ - وضع اصطلاحات	سلیم پانی پتی
۷۷ - مشرقی تمدن کا آخری نمونہ	شرر
۷۸ - ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب	عابد حسین

نظم :-

(ا) غزل - میر، درد، غالب، مومن، حسرت، یگانہ، جگر، فراق

(ب) مرثیہ - انیس، دبیر

(ج) مثنوی - سحرالبیان - گلزارِ نسیم - عالمِ خیال، زہرِ عشق

(د) نظم - نظیر اکبرآبادی - اقبال - جوش ملیح آبادی

(ہ) رباعی - انیس - یگانہ - جوش ملیح آبادی

(و) مسدس - مسدس حالی

جگن ناتھ آزاد

مدراس کے ساحل پر

طلوعِ صبح کا منظر سمندر کے کنارے پر
سفینہ شوق کا ہے بے خودی کے تیز دھارے پر
نگاہ و دل پہ عالم خود فراموشی کا ہے طاری
طلسماتی مناظر کا فسوں ہے ہر طرف جاری
بیاں میں لاسکوں میں کس طرح یہ منظرِ زیبا
برآمد نیلگوں ابر سے نزوئے نیلگوں دریا
وہ ابھری نیلگوں ماحول سے اک نور کی دنیا
سراپا حسن کی دنیا، سراپا نور کی دنیا

جہاں کا چہرہ فطرت نور کے پانی سے دھوتی ہے
سنبھل اے دل! سمندر کے کنارے صبح ہوتی ہے

یہ سطحِ بحر پر پگھلے ہوئے سونے کا نظارہ
وہ جلوہ ہے کہ دامانِ نظر ہوتا ہے صد پارہ
وہ عالم ہے کہ ضبطِ گفتگو میں آ نہیں سکتا
لباسِ نطق میں آزاد! اسے پہنا نہیں سکتا
یہ وہ دھارا ہے جس پہ نطق میرا بہہ نہیں سکتا
اسے محسوس کر سکتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا
بسا سکتا ہوں میں دل میں زباں پہ لا نہیں سکتا
اسے قرطاس کے دامن پہ میں پھیلا نہیں سکتا
سمندر پر طلوعِ صبح کے اے خوش نما منظر
نظر افروز منظر، روح پرور، دل کشا منظر
اگر تجھ کو بھی کوئی جوشش سا فن کا دل جاتا
تو اونچا مرتبہ تو بھی جہانِ شعر میں پاتا
سمجھتا ہے تجھے اچھی طرح دردِ نہاں میرا
مگر عاجز ہے تیرے سامنے حسنِ بیاں میرا
مرے ذوقِ سخن گوئی نے اے حسن آفریں منظر
دل آرا، دلفریب و دلپذیر و دل نشیں منظر

ترے جلووں کے آگے طاقتِ شرحِ بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی

سُن اے بحرِ رواں کی سطح پر ابھرے ہوئے منظر
سراپا عالمِ تصویرِ حسن و رنگ کے پیکر!
تمنا ہے کہ میں آکر ترے دامن میں سو جاؤں
تری دنیا میں بس جاؤں تری دنیا کا ہو جاؤں
ترا ہی جز و بن کر پھیل جاؤں سطحِ دریا پر
پھر اس کے بعد پھیلوں ہر طرف دامانِ دنیا پر
سما کر تجھ میں بزمِ آب و گِل پر اس طرح چھاؤں
جہاں تو نور برسائے وہیں میں نور برساؤں
تجلی میں زمیں کو ہمسرِ جوابِ آسماں کر دیں
جہاں کے ذرے ذرے کو حریفِ کہکشاں کر دیں

بسا دیں عالمِ ظلمات میں اک نور کی دنیا   بڑی شے ہے اندھیرے میں ضیائے طور کی دنیا
دلوں میں آج اندھیرا ہے دماغوں میں اندھیرا ہے   غضب ہے نور برساتے چراغوں میں اندھیرا ہے
قیامت ہے کہ دنیا کی نگاہوں میں اندھیرا ہے   کسے منزل نظر آئے کہ راہوں میں اندھیرا ہے
بہت ہی بدنما ہے عالمِ تصویرِ دنیا کا   بدل دیں اپنی ضو سے نقشۂ تقدیرِ دنیا کا
مٹا دیں اپنی ہستی سے نشاں دنیا میں ظلمت کا   پھریرا ہر طرف لہرائے رنگ و نور و طلعت کا

ترا تو نام ہی اے دل نشیں منظر سویرا ہے
جہاں میں ہوں وہاں چاروں طرف گہرا اندھیرا ہے

اندھیرا ہی اندھیرا کارفرما ہے جہاں میں ہوں   پرافشاں ظلمتوں ہی کا پھریرا ہے جہاں میں ہوں
نشاں سینوں میں الفت کا نہیں ملتا جہاں میں ہوں   کوئی غنچہ محبت کا نہیں کھلتا جہاں میں ہوں
یہ وہ گلزار ہے جس میں کلی دل کی نہیں کھلتی   یہاں کانٹے ہی کانٹے ہیں یہاں خوشبو نہیں ملتی
یہ وہ صحرا ہے جس میں آدم آدم کا شکاری ہے   یہ وہ دنیا ہے جس میں زندگی انساں پہ بھاری ہے
یہ وہ محفل ہے جس محفل کی ہے بنیاد کینے پر   یہ وہ "الفت" کی دنیا ہے جو ہے آباد کینے پر
تعجب ہے یہاں انسان کو انساں سے نفرت ہے   یہاں بے دردیوں سے ربط ہے درماں سے نفرت ہے
یہاں سینوں میں شعلے بغض و نفرت کے بھڑکتے ہیں   یہاں نفرت ہمکتی ہے یہاں کینے لپکتے ہیں
نہ کہہ میرے جہاں میں نور و نکہت کے فسانے ہیں   یہاں ظلمت کے مرکز آندھیوں کے آشیانے ہیں
کہوں کیا تجھ سے میں اے صبح کے منظر کہاں میں ہوں   سراپا اک تباہی کارفرما ہے جہاں میں ہوں

سمجھ مجھ کو نہ شبنم، صورتِ سیماب رہتا ہوں
کسی نادیدہ منزل کے لئے بےتاب رہتا ہوں

جہاں پر پھیلتا جاتا ہے تو اے صبح کے منظر   ہر اک جانب بڑھا جاتا ہے تو اے صبح کے منظر
تو ہے تنہا تری تنہائی کا احساس ہے مجھ کو   مرے پیارے رفاقت کا تو اتنا پاس ہے مجھ کو
کہ تجھ سے ایک پل کی بھی جدائی ناگوارا ہے   مری یہ کیفیت میری نظر سے آشکارا ہے
جو تیرے عزم کی منزل ہے میری بھی وہ منزل ہے   تری کشتی کا جو ساحل ہے میرا بھی وہ ساحل ہے
تو ضوپاشی کی دنیا میں تمنا لے کے نکلا ہے   مرے دل میں بھی کچھ ایسا ہی جذبہ کارفرما ہے
تمنا ہے کہ ظلمت کے جہاں میں نور برساؤں   نہ ہو قیدِ مکاں کوئی قریب و دور برساؤں
میں اپنی زندگی ہی میں مرادِ زندگی پاؤں   دلِ انساں میں گر انسانیت کو عام فرماؤں
جہانِ آب و گِل کا ہر نظارہ میری منزل ہے   زمیں کا ذرہ گردوں کا ستارہ میری منزل ہے
بس اتنی مجھ کو تو اے صبح کے منظر اجازت دے   بس اتنی ہی فقط اے نور کے پیکر اجازت دے

کہ خوشبو کی طرح تیرے رگ و پے میں سما جاؤں
شمیمِ جانفزا سے بزمِ عالم کو بسا جاؤں

اختر تلہری

مثنوی نان وحلوے

مثنوی نان وحلوے فارسی شاعری کے گنج گراں مایہ کا وہ لعل شب چراغ ہے جس کی ضو سے بصیرت کی آنکھوں میں روشنی پیدا ہوتی ہے اور دل کی دنیا میں اُجالا ہی اُجالا نظر آتا ہے۔ یہ مختصر سی مثنوی جناب علامہ بہاء الدین عاملی کی فکر کا نتیجہ ہے۔

علامہ بہاء الدین عاملی کون تھے۔ نویں اور دسویں صدی ہجری کی ایک مشہور صاحب فکر، نظر علمی و ادبی شخصیت۔ علوم متداولہ کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جس میں آپ کو ماہرانہ دسترس حاصل نہ ہو منطق، فلسفہ، ریاضی، تفسیر، فقہ، اصول فقہ اور کلام میں آپ کا ذوق معتبدانہ تھا۔ ان تمام علوم وفنون میں آپ کے فضل وکمال کے قلمی آثار موجود ہیں۔ جناب بہائی کا ناخن فکر و نظر اگر حکمت وفلسفہ کے دقیق مسائل کی گرہ کشائی میں مصروف رہتا تھا تو ان کی طبع رسا کی خوش سلیقہ مشاطہ لیلائے شاعری کی زلفیں سنوارنے میں۔

جناب بہائی کو عربی وفارسی دونوں زبانوں کی شاعری پر قدرت تھی ان کا فارسی کا کلام جس قدر لطیف و دل پسند ہوتا تھا اس قدر اُن کا عربی کا کلام بھی۔ اُن کی زبان میں شوخی ہے۔ شیرینی ہے رنگینی ہے۔ اُن کے تخیل کا اسلوب متین ہے اور بیان کا پیرایہ نازک۔ اُنہوں نے قریب قریب ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ فارسی میں اُن کی دو مثنویاں ملتی ہیں۔ نان وحلوے اور شیر وشکر اس مقالے میں "نان وحلوے" سے بحث کی جائے گی۔

جناب بہائی نے اس مثنوی میں تصوف کا مذاق ملحوظ رکھتے ہوئے انسانی زندگی کے لئے وہ اخلاقی راستے معین فرمائے ہیں جن سے فلاح و نجات کی منزل مل سکتی ہے۔ ان کے بعض اخلاقی موعظے مثلاً دنیوی مخصوں اور دولت وجاہ کی خواہشوں سے علیحدگی کی تعلیم آج کل کی دنیا میں پسند نہیں کئے جا سکتے۔ لیکن اگر یہ حقیقت پیش نظر رکھی جائے کہ دولت وجاہ کی خواہشوں سے علیحدگی کا مطلب ان ارباب معانی کے نزدیک یہ ہوتا ہے کہ اپنے عیش وآسائش کے حاصل کرنے کے لئے دوسروں کے جائز حقوق پامال نہ کئے جائیں اور اپنی جیبوں کو طلائی سکوں سے بھرنے کے لئے غریبوں کی جیبوں پر لوٹ کھسوٹ کے ہاتھ نہ بڑھائے جائیں تو یہ پند و نصیحت وقت کی چیز معلوم ہوتی ہے ظاہر ہے کہ دوسروں کے جائز حقوق کا روندنا اور غریبوں کے محنت و مشقت سے پیدا کئے ہوئے سرمائے کو اپنے آرام وتعیش کا سامان بنانا انسانیت کا صحیح رجحان نہیں ہے۔

دولت وجاہ کے پیدا کرنے کی یہ خواہشیں خود غرضی کے نقطۂ نظر سے کتنی ہی مفید معلوم ہوں لیکن اگر دنیا میں امن وامان صلح وآشتی کی حکومت کے تصور کو عملی شکل دینا ضروری ہے تو پھر اس خود غرضی کے رجحان کی اصلاح کے لئے پند و موعظت کی یہ تلخ گولیاں بھی انسانی حلقوں کے نیچے اتارنا لازمی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ مانا جا سکتا ہے کہ ان بزرگوں کی موعظت کی زبان میں مشرقی خطابت کا رنگ ذرا گہرا شوخ ہو گیا ہے۔

اس دلپذیر مثنوی کا آغاز اس طرح ہوا ہے[1]

مرحبا اے بُلبُل بستان سے — کامدی از جانب بستان سے
مرحبا اے عندلیبِ خوش نوا — فارغم کردی ز قیدِ ما سوا

---

[1] چونکہ جناب عاملی کے ادبی ذوق پر عربیت کا غلبہ تھا اس لئے فارسی کے اشعار لکھتے لکھتے ان کے قلم سے عربی کے اشعار اور مصرعے برجستہ ٹپک پڑتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار درمیان سے حذف کر دئے گئے ہیں۔ عنہ

اے نواہائے تو نار "موقدہ" — زد بہر بندم ہزار آتش کدہ
مرحبا اے ہدہدِ شہرِ سبا — مرحبا اے پیکِ جاناں مرحبا
باز گو از نجد و از یارانِ نجد — تا در و دیوار را آری بوجد
باز گو از زمزم و خیف و منا — وا رہاں دل از غم و جاں از عنا
باز گو از مسکن و ماوائے ما — باز گو از یار بے پروائے ما
آنکہ از ما بے سبب فشاند دست — عہد را ببرید و پیماں را شکست
از زبانِ آں نگارِ تند خو — از پئے تسکینِ دل حرفے بگو
یاد ایامیکہ با ما داشتی — گاہ خشم از ناز و گاہے آشتی
شب کہ بودم با ہزاراں کوہِ درد — سر بزانوئے ادب بنشستہ فرد
جاں بلب از حسرتِ گفتار او — دل پُر از نومیدی دیدار او
آں قیامت قامتِ پیماں شکن — آفتِ دوراں بلائے مرد و زن
فتنۂ ایام و آشوبِ جہاں — خانہ سوزِ صد چو من بے خانماں
از درم ناگہ برآمد بے حجاب — لب گزاں از رخ برافگندہ نقاب
کاکلِ مشکیں بدوش انداختہ — وز نگاہے کارِ عالم ساختہ
گفت اے شیدا دلِ محزونِ من — وے بلاکش عاشقِ مفتونِ من
کیف حالی انقلب فی نار الفراق — گفتمش واللہ حالی لا یطاق
یک دمک بنشست بر بالینِ من — رفت و با خود برد عقل و دینِ من

"اے قبیلۂ محبوب کے چمن کی بلبل مرحبا اور اس لئے مرحبا کہ تو میرے (نام محبوبہ) کے باغ کی طرف سے آیا - اے خوش آواز بلبل مرحبا - تو نے مجھے ماسوا کی قید و بند سے آزاد کردیا - اے وہ بلبل جس کے نغمے آتشِ مشتعل کی حیثیت رکھتے ہیں جس نے میرے ہر عضو میں ہزاروں آتش کدے روشن کردئے - اے شہرِ سبا کے ہدہد مرحبا اے معشوق کے قاصد مرحبا مرحبا - تو پھر نجد و یارانِ نجد کا تذکرہ چھیڑ تاکہ اس سے در و دیوار میں وجد کی کیفیت پیدا ہوجائے - ہاں "زمزم و خیف و منیٰ" کا پھر ذکر کر اور اس طرح دل کو غم سے اور جان کو تکلیف و پریشانی سے رہائی دے - تو پھر ہمارے اصلی جائے سکونت اور جائے قیام کا قصّہ بیان کر - تو پھر ہمارے تغافل شعار بے پروا محبوب کی داستان ہمیں سُنا - ایسا بے پروا محبوب جس نے بغیر کسی سبب کے ہم سے جدائی اختیار کرلی اور عہد و پیمان توڑ ڈالے - اس محبوب تند خو کی زبان سے دل کی تسلی کے لئے ایک ہی حرف سُنا - اے محبوب مجھے وہ زمانہ یاد آرہا ہے جب تو ناز سے کبھی مجھ پر ناراض ہوتا تھا اور کبھی صلح کی باتیں کرتا تھا - رات جبکہ میں ادب کے ساتھ تنہا سر جھکائے ہوئے درد و الم کے ہزاروں پہاڑوں کے بوجھ کے نیچے دبا بیٹھا ہوا تھا - اُس کے مُنہ سے دو بول سننے کی آرزو میں جان ہونٹوں پر آئی ہوئی تھی - دل میں اس کے دیدار کی طرف سے ناامیدی ہی ناامیدی تھی کہ ناگہاں دروازے سے میرا محبوب میرے سامنے بے حجابانہ آگیا - وہ محبوب جس کا قامتِ پیماں شکن زمانے کے لئے قیامت تھا اور وہ خود اپنے حسن سے ایک آفت تھا - مرد و زن کے لئے مصیبت تھا - زمانے کے لئے بہت بڑی آزمائش کی چیز اور دنیا کے لئے حشر کا سامان مجھ سے ہزاروں بے سر و سامان لوگوں کے گھروں کو پھونک دینے والا - وہ جس وقت آیا ہے تو ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹ رہا تھا اور چہرے سے نقاب بالکل ہٹائے ہوئے تھا - اپنے کاندھے پر کاکلِ مشکیں چھوڑے ہوئے تھا اور اپنی ایک نگاہ سے اُس نے دنیا کا کام بنا دیا تھا - وہ محبوب میری طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا کہ اے میری تکلیفوں کے جھیلنے والے - میرے محزون عاشق - میرے شیدا ہجر کی آگ سے تیرے دل کا کیا حال ہے - میں نے اُسے جواب دیا - قسم خدا کی میری وہ حالت ہے جسے برداشت نہیں کیا جا سکتا - تھوڑی دیر وہ میرے سرہانے بیٹھا رہا اور پھر چلا گیا مگر اپنے ساتھ میرے مذہب دین عقل و ہوش سب کو لے گیا"

ان اشعار سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جناب بہائیؔ کو فارسی شاعری پر کس قدر قدرت تھی - خیالات کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ زبان بھی کس قدر رواں اور شیریں ہے - عشقِ مجازی کے واردات جن لفظوں میں ادا کئے جاتے ہیں اُن کے پردے سے حقیقت کے کیسے کیسے لطیف رموز و اسرار بیان کرتے چلے گئے ہیں -

کاکلِ مشکیں بدوش انداختہ — وز نگاہے کارِ عالم ساختہ

میں جناب بہائیؔ نے اپنے محبوب کی جو قیامت خیز تصویر کھینچی ہے اس کا جواب ملنا مشکل ہے - اس کے تصوّر سے دل میں بے پناہ اثر پیدا ہوتا

ہے۔ دنیائے مجاز کے ان رسمی الفاظ کا جس حقیقت کی طرف اشارہ ہے اُسے جب پیشِ نظر رکھ لیا جائے تو پھر اس کی تاثیر کا عالم ہی کچھ اور ہو جاتا ہے۔ پہلا مصرع جناب محمد کی صوری تصویر ہے اور دوسرا مصرع اُن کے پیام کی "عملی افادیت" کا مکمل نقشہ۔

اگرچہ اس مثنوی کا لہجہ "رومانی" ہے تاہم ایک صوفی صافی کے شستہ جذبات کی پاکیزہ ترجمانی کی حامل ہے اور "حکمت ایمانیاں" کی طرف ذہنِ انسانی کو ملتفت کرنے والی ہے۔ مگر وہ "حکمت ایمانیاں" نہیں جو چند رسموں کے دائرے میں ہمیں محصور کر دے اور ہمارے فکر و نظر کے لئے وسعتیں حرام بنا دے بلکہ وہ "حکمتِ ایمانیاں" جو انسانیت کے دبے ہوئے جذبے ہمارے دلوں میں ابھار دے اور ہمارے اندازِ نظر کو حکیمانہ کر دے۔

جناب بھائی "رسمی علوم" کی حقیقی کلچری اہمیت کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ محض "رسمی علوم" حاصل کر لینے سے نہ انسانیت مکمل ہوتی ہے اور نہ رُوح میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ ان کی نگاہ میں انسانیت کی تکمیل کے لئے "علم عاشقی" میں کمال حاصل کرنا ضروری ہے۔ وہ "رسمی علوم" کو بالکل ہی قیل و قال اور لاف و گزاف سمجھتے ہیں اُن کے خیال میں اس سے نہ تو کوئی کیفیت ہی حاصل ہوتی ہے اور نہ "حال" ہی پیدا ہوتا ہے۔

فرماتے ہیں۔

علم رسمی سر بسر قیل است و قال   نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال
طبع را افسردگی بخشد مدام   مولوی باور نہ دارد ایں کلام
گر کسے گوید کہ از عمرت ہمیں   ہفت روزے ماند آں گردد یقیں
تو دریں یک ہفتہ مشغول کدام   علم خواہی گشت اے مرد تمام
فلسفہ یا نحو یا طب یا نجوم   ہندسہ یا رمل یا اعداد شوم
علم نبود غیر علم عاشقی   مابقی تلبیس ابلیس شقی
زاں نہ گردد بر تو ہرگز کشفِ راز   گر بود شاگرد تو صد فخر راز
ہر کہ نبود مبتلائے ماہ رو   اسم او از لوحِ انسانی بشو
سینۂ خالی ز مہرِ گلرخاں   کہنہ انبانے بود پر استخواں
چند چند از حکمتِ یونانیاں   حکمت ایمانیاں را ہم بخواں
چند زیں فقہ و کلام بے اصول   مغز را خالی کنی اے بوالفضول

رسمی علوم تو بالکل ہی قیل و قال اور لاف و گزاف ہے۔ اس سے نہ تو کوئی کیفیت ہی حاصل ہوتی ہے اور نہ حال (وجد) ہی ہوتا ہے۔ رسمی علوم سے ہمیشہ طبیعت مرجھاتی ہے مگر "مولوی" کو اس بات کا یقین نہیں آسکتا۔ اگر تم سے کوئی یہ کہے کہ تمہاری زندگی کے خزانے میں صرف سات دن باقی رہ گئے ہیں اور اس کا تمہیں یقین بھی آجائے تو پھر تمہیں بتاؤ کہ اس مختصر مدت میں کس علم کی طرف توجہ کروگے۔ فلسفہ، نحو، طب، نجوم، انجینری، رمل یا پُر نحوست اعداد و شمار میں؛ مگر یاد رکھو کہ سوائے علم "عاشقی" اور کوئی علم ہی نہیں ہے۔ اس کے سوا جو علم ہے وہ بدنصیب شیطان کا فریب ہے۔ ان باتوں سے تجھ پر حقیقتوں کے اسرار ظاہر نہیں ہوں گے اگرچہ تیرے شاگرد فخر الدین رازی سے سیکڑوں انسان ہوں۔ جو شخص کسی ماہرو (سچا رہنما) کا والہ و شیدا نہیں ہے اس کا تو نام ہی لوحِ انسانی سے دھو دینا چاہئے۔ گلرخوں کی محبت سے جو سینہ خالی ہے وہ ہڈیوں سے بھری ہوئی چمڑے کی تھیلی ہے۔ حکمائے یونان کی حکمت کے راگ تو کہاں تک گائے گا۔ کبھی تو ایمان والوں کی حکمت کے تذکرے بھی پڑھا کر۔ کم عقل۔ تو کب تک بے اصول فقہ و کلام میں اپنا مغز کھپائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ جناب عالی نے ان اشعار میں علوم رسمی کی جو تنقیص کی ہے وہ بظاہر تلخ ہے لیکن غور کی نگاہ میں حقیقت و واقعیت کی ترجمان ہے۔ اگر ہم نے تمام "علوم رسمی" رٹ ڈالے اور حکمت و فلسفہ وغیرہ کے تمام مسائل نوکِ زبان کر لئے لیکن ہماری فطرت کی لوح پر "انسانیت" کے نقش نہ ابھر سکے اور ہماری سیرت و کردار میں نوعِ بشر سے سچی محبت کے آثار نہ پیدا ہوئے تو ہم "چارپائے بروکتابے چند" سے زیادہ اور کس بات کے مصداق ہو سکتے ہیں۔ "رسمی علوم و فنون" کی درس و تدریس ہمیں کتاب کا کیڑا تو ضرور بنا سکتی ہے لیکن تنہا آگے کی منزلیں طے نہیں کرا سکتی۔

آج کل کی دنیا اس کا زندہ ثبوت ہے۔ فلسفہ و سائنس میں ترقی معراجِ کمال پر پہنچ چکی ہے لیکن اس کے باوجود انسانی تکلیفوں میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے ہر شخص

شمشیر بدست بنا ہوا ہے۔ مختلف جماعتیں مختلف فرقے پڑھے لکھے افراد ہی کی قیادت میں تو وہ سب کچھ کر رہے ہیں جس پر انسانیت نفرین کر رہی ہے۔ یہ صورت حال "رسمی علوم" کی تحصیل ہی کو تعلیم و تربیت کی غایت سمجھ لینے کا نتیجہ ہے۔ اگر مادی ترقی کے ساتھ روحانی ترقی کا بھی خیال رہے۔ اور وہ "حکمت یونانیاں" کے ساتھ "حکمتِ ایمانیاں" میں بھی کچھ وقت صرف کیا جائے تو اس سے پیدا ہونے والا متوازن ارتقا دنیا کا نقشہ بدل دے۔

جناب بہائی کے "مولوی" کے تحت یہ سب بڑے بڑے سائنس داں بڑے بڑے فلسفی بڑے بڑے مقنن آجاتے ہیں جو برابر نئی نئی ایجادیں کرتے رہتے اقتصادیات و معاشرت کے نئے نئے نظام بناتے رہتے اور قانون کے سانچے میں نئے نئے دستور ڈھالتے رہتے ہیں مگر عقل و دانش کے ارتقا کے ساتھ اُن کے قلب و ضمیر کی طاقتوں کو متوازن ارتقا حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

مفتی میر عباس صاحب مرحوم لکھنؤ کے ایک مشہور عالم و ادیب تھے انہوں نے بہائی کی مثنوی "نان و حلوے" کو سامنے رکھ کر اس سے زیادہ طولانی مثنوی "من و سلوے" لکھی ہے۔ اچھی ہے مگر "نان و حلوے" کا سلونا پن اس میں نہیں ہے "بے عمل مولوی" کی خدمت کے سلسلے میں اس کے چند شعر بھی سننے کے قابل ہیں۔

مولوی در بندِ جاہ و حشمت است — در تلاشِ رنگ رنگِ نعمت است
ناہ در عوض است جسمِ اطہرش — گاہ یک حوضِ مدوّر بر سرش
ہست پرستش مے کنند اہلِ غرض — طاعتش نزدِ مریداں مفترض
سر بوقتِ درس بر بالش نہد — چوں امیرے پیشش آید بر جہد
می فرستد رقعہ ہا را در جہات — تا بدست آرد زرِ خمس و زکات
از امیراں سوئے خود درہم کشد — وز فقیراں روے خود درہم کشد
از عبا و جبہ و دستارِ او — گرم چوں بزاز شد بازارِ او
ہر کسے تعظیمِ مولانا نہ کرد — مولوی تکفیرِ بے باکانہ کرد

مفتی صاحب نے دنیا دار مولوی کی تصویر کشی بہت ہی سچی کی ہے۔ فی الحقیقت ایسا مولوی برابر جاہ و حشم کی تلاش میں رہتا ہے۔ ظاہری طور سے ایسا لباس اور ایسا انداز اختیار کرتا ہے کہ دنیا اس سے مرعوب ہو جائے اور وہ اس سے دنیوی فائدے اٹھائے۔

جناب بہائی نے علوم رسمیہ کو قیل و قال بتا کر پھر علم کی تعریف کی ہے اور اس کے ساتھ زہد و ورع کا مفہوم معین کیا ہے۔

حقیقتہً علم وہی ہے جو صحیح راستہ پر ہمیں لگا دے۔ اور اس کی صورت یہی ہے کہ دل و دماغ کی صالح قوتوں کو متوازن ارتقا حاصل کرنے کا سامان فراہم کر دے۔ اس طرح سچا زہد وہ ہے جو منشائے انسانیت پورا کرنے کے راستے میں دنیوی لذتوں کو سنگِ گراں نہ بننے دے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا سے قطع تعلق کر لیا جائے اور اس کی لذتوں کو اور نعمتوں کو بالکل ہی اپنے اوپر حرام کر لیا جائے۔ اس تعلیم کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہمارے جملہ حرکات و سکنات کا منشا خدا کی خوشنودی کا حصول ہونا چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے تمام اقدامات خواہ ان کا تعلق دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز ہونا ہی کیوں نہ ہو "رضائے خالق" سے متاثر ہوں اور ہم جو عمل کریں ہم سے جو فعل صادر ہو اس میں ہم قادرِ مطلق کی مرضی پہلے دیکھ لیں دنیوی مال و متاع سے اپنی حشمتوں اور تمکنتوں میں اضافہ مقصود نہ ہو کہ یہ عجب و پندار کا دوسرا نام ہے اور یہیں سے ان تمام تمدنی و معاشرتی مفاسد کے طوفان پیدا ہوتے ہیں جن سے امنِ عالم زیر و زبر ہوتا ہے۔

علم چہ بود آں کہ رہ بنمائدت — زنگ گمراہی ز دل بزدائدت
زہد چہ بود از ہمہ پرداختن — جملہ را در راہ او دل باختن
ایں ہوسہا از سرت بیروں کند — خوف و وحشت در دلت افزوں کند
خشیۃ اللہ را نشانِ علم داں — "انما یخشی" تو در قرآں بخواں
سینہ را از علمِ حق آباد کن — رو حدیثِ "یو علمہم" یاد کن
علم یابد زیب از فقرائے پسر — نے ز باغ و راغ و اسپ و گاؤ خر
نقصِ علم است اے جنابِ مولوی — حشمتِ مال و متاعِ دنیوی
قاقم و خز چند پوشی چوں شہاں — مرغ و ماہی چند سازی زیبِ خواں

"علم تو وہ ہے جو تیری رہ نمائی کرے اور گمراہی کا زنگ تیرے دل سے دور کر دے۔" "زہد" کیا چیز ہے۔ تمام باتوں سے اپنے کو الگ کر لینا دنیا کی طرف جھکانے والی ساری چیزوں کو پہلے ہی واؤں میں ہار دینا۔ زہد حرص و ہوس کو تیرے دل سے باہر نکال پھینکتا ہے اور دل میں خدا کا خوف اور دنیا کی چیزوں سے وحشت زیادہ کرتا ہے۔ خدا سے ڈرنا علم کا نشان ہے۔ قرآن کریم میں "انما یخشی" اسی کو ظاہر کرتا ہے۔ اپنے سینہ کو "علم حق" سے آباد کر۔ دیکھ حدیث "یو علمہم" میں "علم حق" ہی کی طرف اشارہ ہے۔

علم کی زیبائش فقیری ہی سے ہوتی ہے۔ دنیوی خدم و حشم سے نہیں ہوتی ہے۔ البتہ مولوی کا خیال ہے کہ علم کی زینت دنیوی ساز و سامان سے ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں تو دنیوی مال و منال اور جاہ و حشمت علم کا نقص ہے۔ بادشاہوں کی طرح دیبا و اطلس کی پوشاکیں تو کہاں تک پہنے گا اور مرغ و ماہی کو دستر خواں کی زینت کب تک بنائے گا"۔

جناب بہائی نے دنیوی مال و منال کی جو مذمت کی ہے اور دیبا و اطلس کی پوشاکوں اور "مرغ و ماہی" کی غذاؤں پر جو تیوریاں چڑھائی ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اصولاً ان چیزوں کے خلاف تھے۔ دراصل اس تمام نفرت و مذمت کا رُخ اس نعمت و جاہ کی طرف ہے جو غریبوں کا خون چوس چوس کر حاصل کیا جاتا ہے۔ اس میں شک بھی کیا ہے کہ بے گناہوں کے لہو سے جس عیش و آسائش کے چہرے پر رنگ آئے وہ بیزاری کے قابل ہے۔

حضرت علی کا ایک حکیمانہ ارشاد ہے "واللہ ما عبدتک خوفاً من نارک ولا طمعاً فی جنتک ولکن وجدتک اھلاً للعبادۃ فعبدتک" نہ میں نے تیرے جہنم سے ڈر کر تیری عبادت کی ہے اور نہ جنت کے لالچ سے تیری پرستش میں مصروف ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے تجھے عبادت کا اہل سمجھا ہے اس لئے تیری عبادت کی ہے۔ اس حکیمانہ قول کو جناب بہائی نے مبنا قرار دیتے ہوئے عبادت کے منشا کی تشریح یوں فرمائی ہے

نان و حلوا چیست اے نیکو سرشت این عبادت ہائے تو بہر بہشت
نزد اہل دین بود دین کاستی در عبادت مزد از حق خواستی
رو حدیث "ما عبدتک" اے فقیر از کلام شاہ مرداں یاد گیر
چشم بر اجر عمل از کوری است طاعت از بہر طمع مزدوری است
عابدے کو اُجرت طاعات خواست کے عبادت گر نہی نامش رواست
تا بہ کے بر مزد داری چشم تیز مزد زیں بہتر چہ خواہی اے عزیز
کو ترا با لطف و با فضل مزید از برائے خدمت خود آفرید
با ہمہ آلودگی قدرت نکاست ہر قدرت تشریف خلعت کرد راست

اے نیک طینت نان و حلوا کسے کہتے ہیں۔ کیا اُن سجدوں کو جو بہشت کے واسطے کئے جاتے ہیں۔ عبادتوں کی مزدوری چاہنا دینداروں کے نزدیک دین کا انحطاط ہے۔ شاہ مرداں (حضرت علی) کا قول "ما عبدتک الخ" یاد کر۔ اعمال کے اجر کی خواہش کرنا بینائی ہے۔ کسی لالچ سے عبادت کرنا مزدوری ہی مزدوری ہے۔ جو عبادت کرنے والا اپنی عبادت کی اجرت چاہتا ہے اگر اس کا نام "کج عبادت" رکھ دیا جائے تو بالکل ٹھیک ہے۔ تو مزدوری کو اپنے پیش نظر کب تک رکھے گا۔ اس سے بہتر اجرت تجھے کیا مل سکتی ہے کہ اُس نے تجھے اپنے فراواں لطف و کرم سے اپنی ہی خدمت کے واسطے پیدا کیا۔ مادیت میں اس قدر آلودگی کے باوجود بھی تیرا مرتبہ کم نہ کیا اور اپنی خدمت کا خلعت تیرے جسم پر چست کر دیا۔

سچ پوچھئے تو عبادت کا اعلےٰ مرتبہ یہی ہے کہ اس کا خمیر خلوص سے طیار ہوا ہو۔ اس میں اپنی کوئی غرض شامل نہ ہو حقیقتہً عبادت وہی عبادت ہے جو صرف عبادت کے لئے ہو جنت کے لالچ یا دوزخ کے خوف سے اگر عبادت کی گئی تو پھر وہ بے لوث نہیں رہی۔ اس میں تجارتی حیثیت شامل ہو گئی۔

عبادت کے معاملے میں اگر ہمارا مطمح نظر یہ بن جائے اور اس نظریے کے سانچے میں ہماری ذہنیتیں ڈھلنے لگیں تو پھر ہمارے تمام اعمال کے تیور ہی بدل جائیں۔ اور ہم دوسرے ہی قسم کے انسان ہو جائیں۔

اس مفہوم کو اردو کے مایۂ ناز نکتہ رس شاعر غالب نے اپنے مخصوص رنگ میں یوں ادا کیا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

عبادت کی عالی مرتبتی جب ان آلودگیوں کو بھی پسند نہیں کرتی تو یہ امر کس قدر مقام عبرت ہے کہ عبادت کو تحصیل زر کا آلہ بنایا جائے۔

عبادت کے غلط تصورات ہی نے تو ہمارے سماج کا نقشہ بگاڑ دیا ہے۔ ہماری معاشرت کی دنیا خراب کر رکھی ہے

عبادت کے اس "مقصدی انحطاط" نے ہمارے نماز روزے اور پوجا پاٹ کو بے جان چیز بنا دیا ہے اور اس میں اتنی سکت نہیں رکھی ہے کہ ہماری آگے بڑھتی ہوئی زندگی کے لئے وہ کوئی سہارا بن سکے۔

مثنوی "نان و حلوا" اسی قسم کے ترقی پسندانہ موعظوں سے بھری ہوئی ہے میں جانتا ہوں کہ آج کل کے بہت سے نقاد ادیب جناب بہائی کی ان باتوں کو بڑے بوڑھوں کی بوڑھی باتیں قرار دیں گے اور رضائے خدا خشیۃ اللہ اور عبادت وغیرہ کے تذکرے کو وقت کی چیز نہیں سمجھیں گے لیکن گرتی ہوئی دنیا اگر ان سہاروں ہی سے سنبھل جائے تو بُرا کیا ہے۔ یہ قصۂ پارینہ سہی لیکن یہ وہ "قصۂ پارینہ" ہے جس کے لئے پورے اطمینان سے کہا جا سکتا ہے کہ "باز خواں ایں قصۂ پارینہ را"۔ مہاتما گاندھی کے اپدیشوں کو انہیں سہاروں سے زندگی ملی ہے۔

صالحہ عابد حسین

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

"بدذات، بے حیا ——— سؤر کی بچّی۔۔۔" وغیرہ وغیرہ
"ہو ہو ——— ہائے ——— ہاتھ ٹوٹ جائیں نُوسٹے کے، ائے
اللہ میں مرجاؤں ——— نکھٹّو ——— ہرجائی" وغیرہ وغیرہ
بکے جائے گی ——— چپ نہ ہوگی ——— حرام خور ———"
دھپا دھپ اور چھوا چھو اور تیز ہوگئی۔

"ارے میری مَیّا ——— ارے باپو نہ مارو ——— ہائی ماسی جی ——— باجی جی دوڑنا ——— باپو مارے ڈالے ہیں ماں کو"
رنج میں ڈوبی، غصّے اور خوف سے لرزتی جگّو کی روتی ہوئی ننھی سی آواز گونجی۔

"اے ہے یہ ہے کیا بدتمیزی" اوپر سے پڑوسن نے چلّا کر کہا۔
"توبہ کیا آفت ڈھا رکھی ہے اس چمرو بدذات نے"۔ نیچے سے دوسری پڑوسن نے مصرعہ پر مصرعہ لگایا۔
"اے بہن دوڑنا ——— وہ مارے ڈالے ہے بڑھیا بیچاری کو"!
تیسری نے بھاگتے ہوئے آواز دی اور اُسی کے ساتھ دو ایک اور پڑوسنیں چمرو کی کوٹھری میں گھُسیں۔ شرم نہیں آتی ——— کوئی اپنی گھر والی کی یوں ہڈیاں توڑے ہے بھلا"!
دوسری نے بڑی بی کو چمکارا: "تم ہی چُپ ہو جاؤ بڑی بی ——— مرد سے زبان نہیں چلاتے"!
تیسری نے شہ دی "واہ وا ——— مرد جو چاہے کرے۔ عورت منہ سے بھاپ بھی نہ نکالے!"
"اوئی بٹیا، غارت ہو یہ مرد ——— آگ لگ جائے اس کے منہ کو کھلانے کا نہیں، پہنانے کا نہیں ——— ذرا سکھ نہ چین ——— مارنے کو مُوا مرد بنا ہے"! بڑی بی نے احتجاج کیا۔

"بُری بات ہے چمرو ——— اور کچھ نہیں تو محلّے پڑوس کا تو خیال کرو ——— گھروں میں جوان کنواری لڑکیاں ہیں اور تم یوں گالیاں بکتے رہتے ہو" اوپر والی پڑوسن نے تنبیہہ کی۔
"بجلی ٹوٹے اس کی چھتی پر، آگ لگ جائے اُس گھروے کو، جہاں جا جا منہ کالا کرے ہے موا بڑھو" بڑی بی کی زبان حسبِ دستور تیزی سے چل رہی تھی۔
چمرو کا خشک اور سیاہ چہرہ اور بھی زیادہ سیاہ اور بھیانک ہوگیا۔ اب تک تو اُس کا ہاتھ اور زبان ہی چل رہی تھی مگر سب کے ——— وہ بھی عورتوں کے سامنے، اس کی یہ بے عزتی!! آخر غیرت بھی تو کوئی چیز ہے نا؟ اور وہ بھی مرد کی غیرت ——— یہ عورت اب بہت بڑھتی جا رہی ہے ——— اور ان ساری بلاؤں کو دیکھو کیسی آکر اس کی طرفداری پر تُل گئیں ——— زمین پر جھُک کر اُس نے اپنا موٹا ڈنڈا اُٹھایا جو ایک بار اُس کے پتلے مگر مضبوط ہاتھوں میں زور سے گھوما، اور پھر سُوکھے سہمے ہڈیوں کے ڈھانچ پر جھکا ——— مگر بڑھیا کی پیٹھ توڑنے سے پہلے ہی دو جوان اور مضبوط ہاتھوں نے اُسے ہوا ہی میں پکڑ لیا۔ چمرو نے جھلّا کر دیکھا تو اُس کی نظر بالی کے غصّے سے تمتمائے چہرے پر پڑی۔ ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا، ڈنڈا دُور جا پڑا، اور قبل اس کے کہ بالی کا دوہتڑ چمرو پر پڑے وہ کوٹھری سے فرار ہوگیا۔
بڑھیا بِلک بِلک کر چمرو کی سات پشت اور اُس کی ہستی سستی کو کوس رہی تھی۔ جگّو اپنی توتلی زبان میں ماں کو سمجھاتے سمجھاتے خود بھی رونے لگا۔ اور پڑوسنیں تھوڑی دیر تک اس واقعہ پر رائے زنی کرتی رہیں اور پھر اپنے اپنے دھندوں میں جا لگیں۔ کون ایسی نرالی بات تھی جو کسی کے دل یا ضمیر پر گہری چوٹ لگتی۔ اجی عورت تو ازل سے مرد کے ہاتھوں پٹتی آئی ہے۔ چاہے ہاتھ کہ زبان سے، لاٹھی سے کہ برتاؤں سے۔ قسمت میں یہ نہ ہوتا تو ایشور استری کیوں بناتا؟ خدا نے عورت کو عورت بنایا۔ مگر وہ

بے بس مجبور ـــ خیر ـــ شاید اگلے جنم میں ـــ آخرت میں ـــ عورت بھی اس کا بدلہ چکا سکے۔

پر بالی کا دل یوں آسانی سے اگلے جنم یا آخرت کے انتقام پر نہ بہلتا تھا۔ وہ تو غصّے کی آگ میں جل رہا تھا ـــ اُف یہ طاقت والوں کی دُنیا۔ یہ زبردستوں کی سماج ـــ ہر طاقتور کمزور کو دباتا ہے۔ ہر زبردست زبردست پر ظلم کرتا ہے۔ بادشاہ کے بھیس میں، حاکم کے روپ میں، زمیندار اور لینڈ لارڈ کا چولا پہن کر، سرمایہ دار اور آقا کا جامہ پہن کر، مرد کا ٹھپہ لگا کر، سن اور بزرگی کی آڑ میں ـــ کیسے کیسے روپ دھارن کرتے آتے ہیں، اس پاپی دنیا کو ـــ آخر کب تک ـــ کب تک؟ یہ ظلم اور نا انصافیاں ہوتی رہیں گی؟ کیوں مظلوم ظالم کے ہاتھوں مجبور رہو جاتے ہیں؟ کیوں نہیں اس کے ظلم کے جال کو توڑ کر رکھ دیتے ـــ کب تک یہ فرسودہ، گھُن کھایا نظام .... یوں ہی اندر اندر کھوکھلا کرتا رہے گا ـــ" اب اُسے ظالموں کے ساتھ ساتھ مظلوموں پر بھی غصّہ آ رہا تھا ـــ اس "چھوٹے سے" واقعے سے اس کا تخیل کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔

"اماں جی بیچاری بڑی بی رو رہی ہیں۔ جگو کو بڑا تیز بخار چڑھا ہے۔"

"بی بی اُن سے کہہ رونے کی بات نہیں۔ ملیریا ہے اُتر جائے گا شام تک۔ آج کل تو سبھی بچوں کو آ رہا ہے۔"

"پر اماں جی جگو تو کچھ بولتا ہی نہیں۔ وہ تو بے ہوش پڑا ہے؟" بچّی اپنے کھیل کے ساتھی کی بیماری سے بہت پریشان تھی۔ "اماں چلو ذرا دیکھ لو اُسے چل کر۔"

"اچھا با با اچھا ـــ چل ـــ تو ذرا دیر کام نہیں کرنے دیتی۔" ماں نے ہاتھ سے بچّی کا کرتا جو وہ عید کے لئے سی رہی تھیں تخت پر رکھ دیا، اور بچّی کے ساتھ کوٹھے سے اُتریں کہ جگو کو جا کر دیکھیں۔

بڑی بی کی آٹھ فٹ کی اس کوٹھری کی وسعت اور ہمہ گیری بڑی حیرت خیز تھی۔ یہیں چھ رو جگو اور بڑھیا "آرام" کرتے تھے۔ اس میں چھ رو کے یار دوست اور بڑی بی کی سکھیاں بیٹھ کر اپنے "دُکھ سُکھ پر اور رفتارِ زمانہ" پر بحث مباحثہ کرتے تھے۔ یہی اسٹور روم بھی تھا اور رسوئی گھر بھی، اور مویشی خانہ کا کام بھی اسی سے لیا جاتا تھا۔ بکری تو خیر رات کو ایک کونے میں بیٹھ جاتی تھی۔ مگر اُس کا مُنّا بچہ شُسندر۔ جگو اور بڑی بی مشترک کھٹیا میں حصّہ دار تھا۔ رات کو کبھی بڑی بی اپنے مرے ہوئے پانچوں بچوں کو خواب میں دیکھتے دیکھتے ننھے منے کو کلیجے سے لگا لیتیں اور کبھی جگو کی آنکھ کھلتی تو وہ اپنے کھیل کود کے ساتھی کی گردن میں باہیں ڈال دیتا۔ اس چھوٹی سی جھلنگا کھٹیا میں یہ "تین" آدمی "کیسے سوتے تھے؟ یہ اقلیدس کا بڑا پیچیدہ سوال تھا۔ جسے حل کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔

پڑوسن کوٹھری میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ پلنگ جس پر ہر رنگ اور ہر قسم کا گوڈر جمع ہے، جسے "بستر" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ایک پھٹی گدڑی اوڑھے جس میں جگہ جگہ سے سیاہ روئڑ (پرانی روئی) جھانک رہا ہے۔ جگو آنکھیں بند کئے پڑا ہے۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا ہے۔ ہاتھ پاؤں برف جیسے سرد ہیں۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی ہیں۔ منھ سے جھاگ نکل رہے ہیں۔ اور بدن توے کی طرح تپ رہا ہے۔ بڑی بی پاگلوں کی طرح کبھی بیہوش بچے کو چھاتی سے لگاتی ہیں کبھی چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگتی ہیں۔ پانچ پھول سے بچّے کھو کر مصیبت ماری ماں کا یہ اکیلا اور آخری سہارا ـــ اُف ـــ اگر ـــ اگر ـــ

اور یہ "اگر" ان کے دماغ میں برمے کی طرح سُوراخ کر رہا ہے۔

"ارے بڑی بی، ذرا حواسوں میں آؤ، گھبراؤ نہیں۔ اللہ سے دعا کرو۔ ابھی ہوش آ جائے گا۔" پڑوسن اگرچہ جگو کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی تھی، مگر ماں کی تسلّی کو یہی کہنا پڑا۔

"اے بیوی میرا بچّہ ـــ میرا لال ـــ مجھ بڑھیا کا آسرا ـــ مجھ نصیبوں جلی کا تو اور کوئی نہیں ـــ کوئی بھی نہیں میری بیوی ـــ ہائے ـــ ارے ـــ کیا ہو گیا میرے لال کو۔" اُنھوں نے جھک کر اپنا منھ جگو کے منہ پر رکھ دیا اور پھر بے قرار ہو کر رونے لگیں۔

"میں ابھی ڈاکٹر کو بُلاتی ہوں۔" پڑوسن بےحد گھبرا گئی تھی "سارے آثار گردن توڑ بخار کے لگ رہے ہیں ـــ بیچارا بچّہ ـــ اللہ اس کی ماں کی کوکھ کو ٹھنڈا رکھے ـــ اور پھر ـــ میرا اپنا بچّوں کا گھر ـــ" پڑوسن کتنی ہی دردمند تھی۔ مگر سب سے پہلا خیال دل میں یہی آیا کہ اگر جگو کو کچھ ہو گیا تو اس کے بچّوں کو بھی انفکشن لگنے کا ڈر ہے۔ "اے بڑی بی چھ رو کہاں ہے، میں چٹھی لکھوا دوں اُسے کہو جا کر بلا لائے ڈاکٹر کو۔" وہ گھبراہٹ

میں بھول گئی تھی کہ جگو آج کل کہاں رہتا ہے۔

"مر گیا جگو ——— غارت ہو گیا بدنصیب ——— کیسے ڈھائی گھڑی کی آئے اُسے کمبخت کو میرے بچے کا بھی خیال نہیں ...... اپنی ...... کے سنگ رنگ رلیاں منا رہا ہوگا۔ جھاڑو مارا ——— کل سے میرے بچے کو بُکھار چڑھا ہے۔ میں نے کہا ذرا جا کر دوائی لا دے تو لال پیلی آنکھیں کر کے کچی پکی باتیں منہ سے نکالنے لگا۔ لگے آگ اُسے اور اُس کی ......"

بڑی بی مشین کی سی رفتار سے جگو اور اُس کی "ہوتی سوتی" کو کوسنے اور گالیاں دے کر اپنے دل کا بخار نکال رہی تھیں اور اُس سے بھی تیزی سے اُن کی آنکھیں مینہ برسا رہی تھیں۔

بالی سخت پریشان کوٹھری میں داخل ہوئی اور یہاں کی حالت دیکھ کر ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اُف یہ گندی کوٹھری، یہ میلے چیتھڑے، یہ بدبو ——— گھٹن ——— بچہ نہ مرتا ہو تو مر جائے۔ اُس نے ذرا ڈانٹ کر بڑی بی سے کہا۔ "بھاڑ میں ڈالو جگو کو ——— اور للّٰہ یہ گالیاں کوسنے بند کر دو۔ ہم خود اپنے جگو کا علاج دوا کریں گے ——— تم ذرا اُٹھو اور یہاں سے بکریوں کو نکال کر جھاڑو تو دے ڈالو ———" اُس نے سوچا کام میں لگا کر اُن کی فکر کو ہٹا دے ——— تیس چالیس سال سے اُس نے اپنی زندگی میں اور کیا بھی کیا تھا، سوا کام ——— کام ——— کام ——— کے ——— اچھی ہوتی یا بیمار۔ بچہ پیٹ میں ہوتا یا گود میں۔ فاقے سے ہوتی یا آدھے پیٹ کھائی ہوتی، ہر حال میں، ہر وقت، کام اُس کے لئے اتنا ہی لازمی، ایسا ہی ناگزیر تھا جیسے زندہ رہنے کے لئے سانس لینا۔

بڑی بی نے بے بسی سے بالی کو دیکھا، اس حالت میں بچے کو چھوڑ کر اُٹھنا اُنہیں بڑا کھل رہا تھا۔ پر عمر بھر کی حکم ماننے کی عادت!! وہ اُٹھیں اور کوٹھری میں جھاڑو دینے لگیں۔ بالی نے جگو کے سر پر پانی کا کپڑا رکھنا شروع کر دیا۔ پڑوسن اور اُس کی بڑی لڑکی کوٹھری کی بکھری چیزوں کو حتی الامکان ترتیب سے رکھنے کی کوشش میں لگ گئیں ——— جگو کو تو سارا پڑوس ہی چاہتا تھا۔ وہ تھا بھی تو بڑا محبت کا بچہ، اور باتیں تو تتلا تتلا کر ایسی بھولی اور پیاری کرتا تھا کہ بس گھنٹوں سُنتے جاؤ۔

"ڈاکٹر صاحب آ گئے" یہ سنکر بڑی بی نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب آئے تو تھے تیوری پر بل ڈالے اور ناک بھوں چڑھائے ہوئے، لیکن اس کوٹھری میں کئی معزز لوگوں کو دیکھا تو چہرے پر مسکراہٹ لانی ہی پڑی۔ بالی اُن کے سر پر کھڑی جگو کا باقاعدہ معائنہ کراتی رہی۔

"ڈاکٹر صاحب ذرا سینہ اچھی طرح سے دیکھئے ——— گردن تو دیکھئے۔ کہیں مینجائٹس تو نہیں ہو گیا ——— نبض کی رفتار کتنی ہے ——— سرسام ہے کیا؟ اسپتال لے جانے کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے گا ——— اچھا ذرا دیر اور بیٹھ جائیے، جب اسے ہوش آ لے تب جائیے گا ......"

ڈاکٹر صاحب دل میں خفا ہو رہے تھے کہ عجب بے ڈھب عورت ہے۔ اسے اپنے خیال میں ڈاکٹری میں بھی دخل ہے۔ پر یہ سمجھ گئے کہ سرسری دیکھنے سے کام نہ چلے گا۔ اس لئے جو جو بالی کہتی گئی وہ کرتے گئے۔ البتہ بڑی بی کی گریہ و زاری اور اس مسلسل التجا پر "ڈاکدر جی میرا کوئی نہیں ——— میرے بچے کو بچا لو ——— میرا کوئی نہیں ڈاکدر جی" انھوں نے کچھ جھلا کر کہا "چپ رہو بڑھیا ——— گھبرا نہیں، ابھی ہوش آ جائے گا، تم لوگ پہلے تو بیماری کو پالتے ہو اور پھر ڈاکٹر بیچارے کے سر ہو جاتے ہو" پھر بالی سے بولے، "اس کے سر پر برابر برف رکھئے۔ سارے بدن کا اسپنج کیجئے۔ اور جو دوائیں بھیجوں وہ دو دو گھنٹے بعد دیتی رہئے۔ اور ہاں گلوکوز پانی میں ملا کر پلاتی رہئے۔ کھانے کو کچھ نہ دیجئے گا۔ بخار کم ہو جائے تو انیما دیدیجئے گا ——— ملیریا ہے اور کچھ نہیں ...... شام تک ٹھیک ہو جائے گا۔" ڈاکٹر یہ کہہ کر فیس لے چلتے بنے۔ جگو نے اب آنکھیں کھول دی تھیں اور چہرے پر اس کی مخصوص محبت بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

بالی اور پڑوسن اپنے اپنے ہاں سے کچھ چیزیں لائیں۔ ایک پُرانی دری ایک پھٹی مگر سفید چادر، ایک تولیہ، صابن کا ٹکڑا وغیرہ۔ سب سے پہلے دونوں نے مل کر جگو کا اسفنج کیا اور دوسری چارپائی پر صاف دری بچھا کر اسے لٹا دیا۔ بڑی بی نے جگو کا واحد جوڑا نکالا جو آنے والے تیوہار کے لئے اُنھوں نے پیٹ کاٹ کاٹ کر اور جگو سے چھپا چھپا کر بڑی مشکل سے بنایا اور پڑوسن کے ہاں رکھا تھا۔ پر اب اس سے بڑا تہوار اور کون ہوتا کہ جگو موت کے منہ سے نکل آیا۔ اب جگو اسفنج کے بعد نیا جوڑا پہن کر چپ چاپ لیٹا تھا لیکن اب بیہوشی نہیں تھی۔ بلکہ وہ سکون سے سو رہا تھا اور بخار دھیرے دھیرے کم ہونے لگا تھا۔

شام کو پڑوسن کے بچوں کو اجازت ملی کہ وہ جا کر جگو سے مل آئیں۔

انفکشن کا خطرہ دور ہو گیا تھا، اب اُس کے پاس بھیجنے میں ماں کو کوئی تامل نہ تھا۔ بچے جو دن بھر جگو کے پاس جانے کو بےچین رہے تھے، اُچھلتے کودتے ہنستے ہوئے اُس کی کوٹھری کی طرف دوڑے...... روز تو جگو اُن کے ساتھ کھیلنے کو آیا کرتا تھا۔ وہ بھلا اُس کی ذرا سی گندی کوٹھری میں کیوں جاتے۔ پر آج تو بچارا بیمار تھا، آج تو اُنھیں اس کے پاس جانا ہی چاہیئے۔

جگو نئے کلف دار کپڑے پہنے پڑا ہنس رہا تھا، اور اُس کے سب یار دوست اس کی چارپائی کے آس پاس کھڑے طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے، ایک طرف بکری اپنی خاموش زبان میں بڑی بی کو بدھائی دے رہی تھی۔ دوسری طرف سندر اُچھل اُچھل کر جگو کے پاس جا کر اس سے کھیلنا چاہتا تھا۔ مگر ہر مرتبہ بڑی بی اُسے ہٹا دیتیں اور وہ آنکھوں آنکھوں میں اُن سے پوچھتا "کیوں — آج یہ بندش کیوں" اور بڑی بی بالکل اس انداز میں جیسے وہ جگو سے بات کرتی تھیں کہتی "نہ بھیا اُسے نہ ستا — آج اس کا جی اچھا نہیں —" اور جگو خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ ماں بجائے ڈانٹنے کے چمکار رہی تھی، ماسی جی، اور باجی جی اور سارے ساتھی اس کی مزاج پرسی کو آئے تھے، پینے کو دودھ اور چائے اور پھلوں کا عرق ملا تھا — اتنے لاڈ تو کبھی بھی نہ ہوئے تھے اُس کے۔

اور اگلے دن صبح کو جب جمرو آیا تو قبل اس کے کہ بڑی بی کچھ کہیں ساری پڑوسنیں جمرو کے سر ہو گئیں اور خوب بُرا بھلا کہا۔ جمرو پہلے تو اسے بڑی بی اور پڑوسنوں کی سازش ہی سمجھتا رہا، مگر جب اکلوتے بچے کا زرد اُترا ہوا چہرہ دیکھا تو وہ سمجھا کہ جھوٹ نہیں — سچ مچ جگو بہت بیمار ہو گیا ہوگا — اور خلافِ عادت وہ چپ چاپ بڑی بی کی کڑوی کسیلی باتیں شہد کے گھونٹ کی طرح پیتا اور جگو کو لاڈ کرتا رہا۔

"اجی سنتے ہو — آج پھر جمرو بڑی بی سے لڑ پڑا۔ جب دیکھو مُوا بڑھیا کو مارا کرتا ہے"

"کیسا بہادر مرد ہے جمرو بھی"

کیا کہا — ذرا پھر تو کہنا؟ بہادر ہے — تُف ہے اُس کی بہادری پر — کمبخت — نامرد — عورت پر ہاتھ اُٹھاتا ہے —"

"میرا مطلب ہے کیسا خوش نصیب ہے کہ بیوی سے دبتا نہیں ڈرتا نہیں۔ ورنہ بچارا مرد — ازل سے عورت سے دبتا — اُس کے ظلم سہتا آیا ہے"

"اے ہے بچارا مظلوم، غریب مصیبت مارا مرد —"

"تو کیا جھوٹ ہے — ذرا شاعروں کے دیوان اُٹھا کر دیکھو — یہ عورت معشوق کے بھیس میں کیسے کیسے ظلم توڑتی ہے غریب مرد پر —"

"ہے ہے غریب مظلوم کا کیا حال ہو گیا عورت کے ظلم سہتے سہتے — خدا سمجھے ان جھوٹے لپاٹے شاعروں کو —" بیوی نے کچھ اس طرح منہ چڑا کر کہا کہ میاں کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"اور اوپر سے ہنستے ہو — شرم نہیں آتی؟"

"میں کیوں شرماؤں۔ مجھے کس دن یہ سعادت نصیب ہوئی تھی کہ —"

"کہ مار مار کر بیوی کی پلیاں توڑوں؟ کیا اس کا بھی ارمان ہے دل میں؟ مگر اس بھروسے پر نہ رہنا...... خدا کی قسم اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گی۔ کبھی صورت بھی نہ دیکھوں گی عمر بھر — لو اور سنو۔ مجھے بھی بڑی بی مقرر کیا ہے، جو خصم کی جوتیاں کھاتی رہے اور صدقے قربان رہے —" بیوی نے باقاعدہ گریہ و زاری شروع کر دی۔

"واللہ تم بھی لاجواب عورت ہو۔ یعنی ہنسی ہنسی میں بگڑ گئیں۔ بھلا مجھ ایسے بچارے نیاز مند مرد کو ہاتھ تو ہاتھ تم جیسی ماشاءاللہ دبنگ عورتوں کے سامنے زبان بھی کھولنے کی ہمت نہیں ہوتی — اچھا تو اب یہ خواہ مخواہ کا غصہ تھوک دو۔ بے وجہ کا رونا۔ بے مارے کی توبہ"

"پھر تم نے مارنے کا نام لیا؟"

"نیک بخت یہ تو محاورہ ہے.... اتنا بھی نہیں جانتی؟"

"کتنے دن سے کہہ رہی ہوں کہ ذرا جمرو کو سمجھا دو۔ تمہارا وہ رعب مانتا ہے، کہ بچاری بڑھیا کو نہ مارا کرے۔ تم سے یہ ذرا سا کام نہیں ہوتا۔ ابھی کوئی عورت کسی مرد پر ہاتھ اُٹھاتی تو یہاں سے وہاں تک سارے مرد ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑ جاتے"

"مرد غریب تو بڑا ہی صابر، بڑا ہی جفاکش مخلوق واقع ہوا ہے — ہاتھ کی مار کیا وہ تو نینوں کے تیر تک چپ چاپ سہہ لیتا ہے"

"پھر شروع کی تم نے شاعری"

"تو آخر میں کیا کہوں جمرو سے؟ سال بھر سے وہ یہاں رہ رہا ہے۔

پہلے تو کبھی نہیں مارتا تھا، اب کیوں مارنے لگا آخر؟

"کمبخت کو بری مت لگ گئی ہے، اور کیا۔ کسی عورت سے آنکھ لڑی ہو گی۔"

"ارے کیسی باتیں کرتی ہو، اب اس بڑھاپے میں کیا آنکھ لڑائے گا وہ ——— بیچارے کی نظر بھی تو کمزور ہے۔"

"تمہیں تو مذاق سوجھا ہے اور میرا خون کھولتا ہے، جب وہ بیچاری بڑھیا کو مارتا ہے۔"

"ضرور یہ تمہاری لاڈلی بڑی بی بھی اُس سے زبان چلاتی ہوں گی — ورنہ دیکھنے میں تو خاصا شریف آدمی لگتا ہے وہ۔"

"جی ہاں اور کیا۔ اسکی شرافت کے تو جھنڈے گڑے ہیں — بڑھاپے میں آشنائی وہ کرے —— بیوی کو وہ مارے ———"

"تم بھی جانے کس دنیا میں رہتی ہو   بھلا ہمارے اس دیس میں مرد کی آوارگی کو کون بُرا سمجھا جاتا ہے۔ رہا بیوی کو مارنا پیٹنا، تو یہ بھی لاڈ چونچلے کا ایک طریقہ ہے۔ کبھی دُلار لیا کبھی مار لیا۔"

"آگ لگے ایسے دُلار کو۔"

"بیگم صاحب آپ ٹھہریں تعلیم یافتہ گھرانے کی، جہاں عورت کی بڑی اونچی اور پوری عزت کی جاتی ہے۔ ورنہ مارپیٹ تو اس دیس کا مرد اپنا فطری حق سمجھتا ہے۔"

"جی تو لڑنا اور کوسنا اس دیس کی عورتیں اپنا پیدائشی حق جانتی ہیں — مردوں کا ہاتھ چلے تو کیا حرج عورتوں کی زبان بھی نہ چلے۔"

"ضرور چلے صاحب ضرور چلے ——— کس کی طاقت ہے کہ اس مشین کو چلنے سے روک سکے۔ مگر پھر مرد کا ہاتھ اور زیادہ چلے گا؟"

"مطلب یہ کہ چیرو اچھا کرتا ہے کہ مارتا ہے بیوی کو۔"

"پھر خواہ مخواہ کا جھگڑا۔ میں کب کہتا ہوں کہ اچھا کرتا ہے۔ بہت بُرا کرتا ہے، جھک مارتا ہے ——— اگر اس کہنے سے تمہیں تسلی ہو لاؤ شام تک اُسے تمہاری طرح کوسے جاؤں۔"

"تم آخر اُسے سمجھاتے کیوں نہیں؟"

"اگر وہ کہے کہ صاحب آپ کون ہوتے ہیں میرے معاملے میں دخل دینے والے تو ———"

"تو تم یہ کہو کہ ہم یہ نہیں دیکھ سکتے کہ تم ہمارے محلے میں رہ کر یہ کمینی حرکتیں کرو۔"

"اور اگر وہ کہے کہ پھر آپ تشریف لیجائیے کسی اور شریفوں کے محلے میں تو ———"

"اجی کیا تو تو کرتے ہو، تم اُسے کہہ نہیں سکتے کہ ہم بھی لڑکیوں والے ہیں۔ وہ ہمارے قریب رہ کر بدچلنیاں نہیں کر سکتا۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو، چالیس پچاس روپے تو اس کی تنخواہ ہے۔ آپس تین آدمیوں کا خرچ اُٹھائے گا کہ بدچلنی کرے گا ——— خواہ مخواہ۔"

"واہ خواہ مخواہ کیوں ——— آخر اسی پیسے میں پہلے تینوں خاصی طرح پیٹ بھر کھا لیتے تھے۔ پر اب ——— اب تو بیچاری ———"

"اب تو بیچاری کی بات نہیں۔ سال بھر میں مہنگی کتنی بڑھ گئی ہے۔ یہ بھی سوچا تم نے کبھی۔ اسی لئے اب پوری نہ پڑتی ہو گی۔"

"خیر مہنگائی تو اتنی ہے کہ خدا کی پناہ۔ مگر پھر بھی اُس کی حرکتیں ٹھیک نہیں۔"

"تم کیوں بڑی بی کی کچھ مدد نہیں کرتیں، یا خالی خولی زبانی ہمدردی دکھانا کافی سمجھتی ہو۔"

"جی ہاں خالی خولی ہمدردی۔ کردوں تو اس دوسو روپلی میں یہ اتنا بڑا کنبہ پل چکا۔ پھر بھی اپنے بس بھر کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی ہوں۔ پر تین آدمیوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کہاں سے آئے میرے پاس؟ یہ تو میرا ہی دم ہے کہ ان چند ٹھیکروں میں اتنے بڑے گھر کا خرچ چلا رہی ہوں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے، اس کمبخت مہنگائی اور چور بازاری نے اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیئے ہیں۔ ...... اب ہمیں کو دیکھو، پہلے اسی دوسو میں خاصی اچھی طرح بسر ہوتی تھی، اور اب رو رو کر مہینہ پورا ہوتا ہے۔ چار روز تک گڑ کی چائے پی رہا ہوں۔ دو برس پہلے کسی نے یہ کہا بھی ہوتا تو اُس سے لڑائی ہو جاتی۔"

"تم ہی راگ الاپا کرتے تھے آزادی ——— آزادی ——— سوراج ——— سوراج ——— وہ کمبخت انگریز اچھے تھے کہ بُرے، یہ مصیبت تو نہ تھی اُن کے راج میں۔"

"تم تو ہو جاہل، بات وات سمجھتی نہیں، اعتراض کرنے پر تُل جاتی ہو۔"

"لیکن سرمایہ داروں کو تو کچلنا ہی پڑے گا۔"

"اوہو ..... پڑوسیوں کی صحبت میں تم بھی اشتراکی بنتی جا رہی ہو۔"

"میں بیچاری جاہل عورت، گھر کی بیٹھنے والی ——— نہ اشتراکی جانوں نہ جمہوری، میں تو جو آنکھوں سے دیکھتی ہوں وہ کہہ رہی ہوں۔"

"جیسے دیکھو زبان چلانا جانتا ہے، کام کسی سے نہیں ہوتا۔ اعتراض

کرنے پر سب تلے ہیں۔ اپنا موقع پڑے تو ہر کوئی منافع خوری اور چور بازاری کرنے لگتا ہے۔ ایک طرف حکومت پر اعتراض کرتے ہیں، دوسری طرف جب اپنا کوئی دوست یا عزیز یہ ذلیل حرکتیں کرتا ہے تو اس کی حمایت پر تُل جاتے ہیں۔ ابھی جب تک ملک کی اخلاقی حالت نہیں سنورتی، لوگوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا کچھ نہیں ہو سکتا —— خالی حکومت کیا کر سکتی ہے —— لوگوں کو اعتراض کے سوا آتا کیا ہے ——"

"جہاں کچھ کہا اور تم تُل گئے تیر تفنگ لے کر لڑنے جھگڑنے پر۔"

"تمہاری زبان اب بہت چل گئی ہے۔"

"دیکھو جی میرے منہ نہ لگنا ...... میں بڑی بی نہیں کہ تمہاری جوتیاں کھا لوں گی۔"

"میں بھی چمرو نہیں ہوں کہ تمہاری زبان درازی اور بدتمیزی سہہ لوں گا۔"

اور یہ قصہ جو چمرو اور بڑی بی سے شروع ہوا تھا، سیاست کی حدوں کو چھوتا ہوا گھریلو جھگڑے پر آکر رُکا، اور جانے کتنی دیر چلتا رہا ....

نیچے بیٹھی بڑی بی اور بالی کی خوب گھُٹ گھُٹ کر باتیں ہو رہی تھیں۔

—— "ہاں بٹیا جب ہم پہلی دفا رانڈ ہوئے (اس پہلی پر بالی کو بے اختیار ہنسی آگئی) تو ہمارے سسرالے نے ہمارا سب کچھ لے لیا اور ہمیں کورے مٹکے میں چوہے کی تریوں چھوڑ دیا —— ہم بٹیاں جوان جہان —— اور پھر کیا دھرا ہے —— کبھی ہم پر بھی بڑا جوبن تھا بھینا ..... (اور ان کی بڑی بڑی بے رنگ آنکھوں میں ماضی کی یاد نے ایک نئی چمک پیدا کر دی۔) بہنت مجدوری کرنے جائیں تو کوئی بُری نجر ڈالے، آوازے توازے کسے۔ گھر بیٹھیں تو کھائیں کہاں سے! ہمیں اپنی اجت تھامنی دو بھر ہو گئی —— اللہ بھلا کرے ہماری بوڑھی پڑوسن کا —— اُس نے ہم سے کہا بیٹی تو جوان جہان ہے، دوسرا مرد کر لے —— پر بٹیا یہ تو ہمارے بٹر میں بڑا بُرا سمجھا جاوے تھا —— ہم نے کہا برادری کو کون سا منہ دکھاؤں گی ماں جی —— وہ بولیں یہی برادری نا جس نے تجھے بے سہارا چھوڑ رکھا ہے۔ اُلٹ کر یہ بھی نہ پوچھے ہے کہ تو کہاں سے کھاوے ہے۔ اس کا بس چلے تو تیری آبرو بھی کھاک میں ملا دے —— نگوڑی میرا کہنا مان اور دوسرا بیاہ کر لے —— بس بیوی میرے دل میں بھی دھکڑ پکڑ ہونے لگی۔ کر ہی لوں —— کون میرے کام آیا جوان کی بات مانوں۔ بچاری بڑھیا نے ہی بھلے کی تو کہوے ہے۔ بس بیوی اُن بڑھیا نے خود ہی بر کھوجا اور ایک دن ہمیں کھڑکی سے اس تمہارے چمرو کو دکھایا —— اب کیا دیکھو ہو تم اسے —— بڑا گبرو جوان تھا یہ کمبکھت بھی —— ہمارا دل اس پر آگیا بیٹا —— اس کی جُرو ابھی مر گئی تھی —— بیروا بیران (خانہ برباد) پھر رہا تھا —— بس جی ہم دونوں کی سادی ہو گئی۔ یہ اُس وکھت کارکھانے میں کام کرے تھا۔ سارے دن کی مزدوری کے پیسے لاکر سام کو ہمارے ہاتھ پر رکھ دے تھا —— اُس جانے میں بڑا اچھا ہے تھا یہ مجھ" اور جانے کہاں سے بڑی بی کے چہرے پر سرخی کی ہلکی سی جھلک آگئی۔

"پر بڑی بی تم تو کہا کرتی ہو کہ یہ سدا کا آوارہ ہے، ہمیشہ مجھے مارا اور ستایا اس نے۔ زندگی اس کے ساتھ برباد ہو گئی" بالی نے لقمہ دیا۔

بڑی بی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری "اے بیوی جی جلے ہے تو سچی جھوٹی باتیں سبھی آدمی کہہ جاوے ہے —— اور پھر —— جب مارے تھا تو —— محبت میں مارے تھا —— اب تم سے کیا کہوں —— کنواری بالی ہو —— کیا سمجھو گی —— پر اُس مار میں بھی مٹھاس ہوتی تھی۔ اور اگر کبھی اِدھر اُدھر جھک مار بھی آیا تو پھر مجھے منتی کرکے منا بھی تو لے تھا۔ پر اب —— اب تو بٹیا تم دیکھو ہی ہو، نہ پہننے کو نہ کھانے کو —— نہ میرے لئے نہ میرے بچے کے لئے —— جس کمبکھت کے پانچ بچے مر کر یہ ایک ٹھونسڑا بچا ہو اُسی کا اتنا سا بھی کھیال نہ کرے؟" اور مرے بچوں کی یاد آکر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"تو بڑی بی تم کیوں آخر جلتی ہو۔ تم بھی اُس کی پروا نہ کرو —— آوارگی کرتا ہے تو مارنے دو اُسے جھک —— تم بڈھی ہوئیں اب تو رشک و رقابت چھوڑو۔"

بالی کا خیال تھا کہ محبت اور رقابت کا جذبہ جوانوں ہی میں ہو سکتا ہے۔

بڑی بی کو جیسے ٹھیس سی لگی "بٹیا میں اتنی بڈھی تو نا ہوں جیسی نجر آؤں ہوں —— کوئی پانچ اوپر دو بیسی کی اُمر ہو گی —— یہ تو صدموں نے اور اس نگھٹو کے جلاپے نے میرا یہ حال کر دیا —— اور بیوی اب تو مجھے جلنا اس کے کرتوتوں کا ہے —— جو کچھ کماوے ہے اپنی چہیتی کے کلیجے میں ٹھونس آوے ہے نامراد ——"

"اے بڑی بی اتنی سی تو اُس کی آمدنی ہے ..... پیٹ بھر کا غلہ لاکر اُس کے پاس بچتا ہی کیا ہوگا" بڑی بی تو رشک میں حقیقت سے گریز کر سکتی تھیں، پر بالی تو ماہر سچی حساب کتاب میں۔

"اے بٹیا تم کیا سمجھو —— تم نہیں جانتی ——" اور وہ لاجواب سی ہو کر اپنی کوٹھری میں چلی گئیں اور ذرا دیر بعد پھر بڑی بی کے کوسنے اور چمرو کی گالیاں محلے

پڑوس کے لئے تفریح کا سامان فراہم کر رہی تھیں۔

"ابھی تم نے سنا؟ چھدو اور بڑھیا میں صلح ہو گئی"

"مبارک ہو"

"کئی دن تو معاملہ اینٹھا اینٹھا رہا۔ پر آج تو خوب گھٹ گھٹ کر باتیں ہو رہی تھیں"

"میں تو کہتا تھا کہ چھدو بیچارا شریف آدمی ہے۔ تمہاری بڑھیا بیکار اسے بدنام کرتی ہے"

"ہاں وہ کھانے کو نہ دے، پہننے کو نہ دے، اوپر سے مارے اور گالیاں دے۔ پھر بھی شریف ہے، نیک ہے، مرد ہے نا، اور بڑھیا نامراد عورت ہے۔ اس لئے شکایت بھی کرے تو جھوٹی ہے۔ مکار ہے اور جو اس کا ساتھ دے وہ بھی"

"اللہ رے تمہارا تخیل —— واہ رے تمہاری زبان —— کہاں کی بات کہاں لے جاتی ہو نہیں صاحب عورت بڑی بھولی، نیک اور گؤ ہوتی ہے اور مرد کمینہ، ظالم، آوارہ بس ——"

"یہ تو میں نے نہیں کہا —— مگر زیادہ تر مرد تو ایسے ہی ہوتے ہیں"

"میں بھی ان ہی میں سے ہوں گا"

"اے اللہ نہ کرے —— کیسی باتیں کرتے ہو۔ تمہارا اور چھدو کا کیا مقابلہ۔ تم تو اللہ رکھے" اور بیوی نے شرما کر ناز سے میاں کو دیکھا جو خود بھی ہنس پڑے۔

"میں نے دو تین دن ہوئے چھدو کو سمجھایا تو وہ کہنے لگا کہ صاحب یہ بڑھیا مجھے ناحق بدنام کرے ہے۔ اور جب میں نے کہا کہ تم آخر غائب کہاں رہتے ہو تو وہ مہنگائی اور چور بازاری کا بکھان کرنے لگا کہ اتنے پیسوں میں پوری نہیں پڑتی کسی اور کام کی تلاش میں جاتا ہوں"

"اور یہ گھر سے آٹا، دال اور پیسے لے کے کس اپنی لگتی کو دے ہے جاکر ——"

"یہ میں کیا جانوں —— تم بات سنتی نہیں ہو اور بیچ میں بول پڑتی ہو —— میں نے اس سے کہا کہ خیر یہ سب تو ہے، پر تم بڑھیا کو مارتے کیوں ہو تو ہنسنے لگا —— بولا میاں اس کی فکر نہ کرو —— یہ تو ہم لوگوں کے ہاں حال روٹی ہے —— کبھی مار لیا کبھی لاڈ لیا میں نے کہا مگر بری بات ہے ایسا نہ کیا کرو —— کہنے لگا اجی وہ مجھے بدنام کرے ہے تو غصہ آجائے ہے۔ اور یہ محلے پڑوس والیاں اور اسے اکسا دیں اور چڑھا دے دیویں ہیں"

"جھوٹا۔ بے ایمان۔ بدتمیز۔ ہمیں کیا غرض پڑی ہے اس کے کسی معاملے میں دخل دینے کی"

"بالکل سچ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم لوگ بالکل بے قصور ہو —— نہ ہمیں کے نہ کسی اور کے معاملے میں کبھی دخل نہیں دیتیں —— بھول کر بھی ذکر نہیں کرتیں۔ عورتوں کی تو یہ عادت ہی نہیں"

"اچھا رہنے دو یہ طعن طعنے —— ہر بات میں غیروں کی حمایت ہماری برائی —— واہ وا ——"

"اے خالہ ذرا ادھر آنا —— ایک تماشا دکھاؤں"۔ نیچے سے بالی نے آواز دی اور پڑوسن نیچے اتر آئی اور دونوں چپکے چپکے بڑی بی کی کوٹھری کی طرف چلیں۔

گہرا گلابی دوپٹہ اور اودے رنگ کا پاجامہ پھڑکائے، بڑی بی گائے کی سی بھیکی اور معصوم آنکھوں میں کاجل کی دنبالے دار تحریر دور تک ان کے شوکے چہرے پر چھا گئی تھی اور مسی لگے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"اخوہ بڑی بی آج تو بڑا سنگار ہو رہا ہے" اور وہ نئی دلہن کی طرح ان لوگوں کو دیکھ کر سجا گئیں —— کچھ جواب نہ بن آیا۔

"کیا چھدو نے اپنی چہیتی کو چھوڑ دیا اب؟"

"کیا جانے بہن —— پر اب تو کئی دن سے وہاں گیا نہیں ——"

"اب تو نہیں لڑتیں اس سے؟"

"اے کوئی ہمارا دماغ کھرا ہے بٹیا —— کہ خواہ مخواہ لڑیں ——"

"اچھا وہ تو نہیں لڑتا مارتا"

"نہ بیوی نہ —— اور یوں تو پھر جہاں دو برتن ہوں گے کھڑک ہی جاویں گے" بڑی بی نے اس انداز سے کہا جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسری کو دیکھا مسکرائیں اور بڑی بی کے ادھورے سنگار پر رحم کر کے چلی آئیں۔

ذرا دیر بعد بالی اس طرف پھر گئی تو دیکھا چھدو کوٹھری میں کھاٹ پر پاؤں پھیلائے پڑا ہے، اور بڑی بی پائنتی بیٹھی اس کے پیر دبا رہی اور شرما شرما کر ہنس ہنس کر اس کی باتوں کا جواب دے رہی ہیں —— اور اوپر کھڑکی سے پڑوسن جھک کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی ہیں۔ بڑی بی کی نظر اوپر اٹھی تو وہ شرما کر پیچھے ہٹ گئیں۔ اور بالی فلسفے کی ایک نئی گتھی سلجھانے میں الجھ گئی —— آخر —— آخر یہ بات کیا ہے؟ جہاں مرد نے ذرا پیار سے دیکھا اور عورت ریشہ خطمی ہو گئی —— اس کی ساری برائیاں، ساری بدسلوکیاں، اپنی ساری مصیبتیں بھول جاتی ہے —— یہاں تک کہ زندگی کی اٹل اور تلخ حقیقتیں —— بھوک، بیماری، افلاس، سردی اور گرمی —— ہر چیز کا احساس مٹ جاتا ہے —— کیوں —— آخر کیوں؟

ناتجربہ کار بالی کو اس کیوں کا جواب نہیں مل رہا تھا۔

راج گھاٹ پر

طالع بیدار بن کر سونے والے السلام



مہاراجہ نیپال سمادھی پر عقیدت
کے پھول چڑھا رہے ہیں۔



ڈاکٹر راجندر پرشاد
گاندھی جی کی برسی کے
پرارتھنا کر رہے ہیں۔



تھائی لینڈ کے سفیر
مقیم ہند ہزایکسیلینسی
لنگ قلتیِ اکسون
راج گھاٹ پر۔



ڈاکٹر سوئیکارنو پریزیڈنٹ انڈونیشیا کی طرف سے عقیدت کے پھول



دلائی لاما کے بھائی شری تھاندوپ راج گھاٹ پر

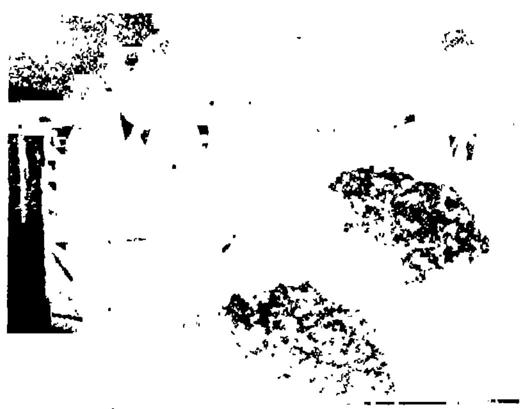
کینیڈا کے وزیر خارجہ آنریبل مسٹر ایل.بی. پیرسن



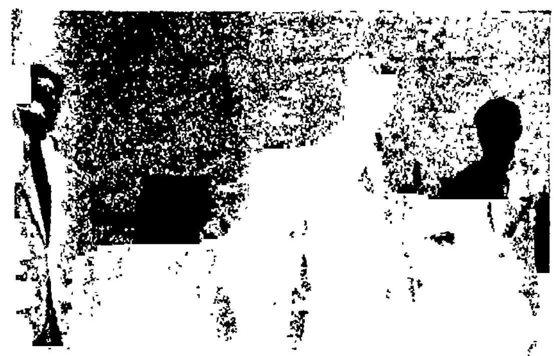
یو.این.او. کے ڈائرکٹر جنرل آف فوڈ اینڈ ایگریکلچر
مسٹر نورس ای. ڈاڈ

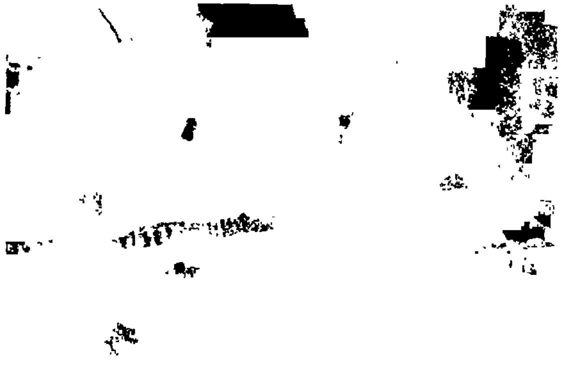
سکم سٹیٹ کانگرس کے نمائندے





یوگوسلاویہ کے سفیر ہزایکسیلینسی ایم. جوزپ گھرگیا







ایرانی اکنامک مشن کے اراکین

آسٹریلیا کے وزیر خارجہ آنریبل مسٹر پی. سی. سپنڈر
شردھا کے پھول چڑھا رہے ہیں

برما کے پریزیڈنٹ کی نمائندہ یتکلی ہزایکسیلینسی تھین کاندا تھاماداکادا

عراق کے سفیر ہزایکسیلینسی مسٹر محمد سلیم الرادی

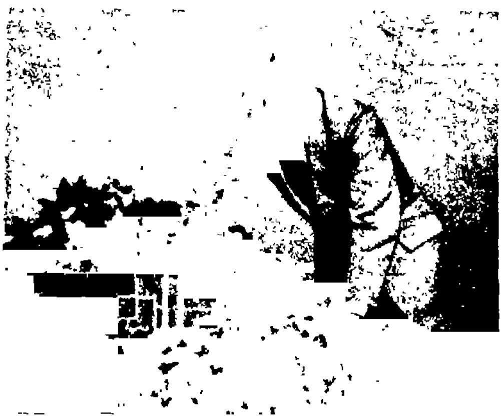




نیوزیلنڈ کے سفیر ہزایکسیلینسی مسٹر ہیوکو ولوانے

ایتھوپیا کے وزیر خارجہ ہزایکسیلینسی ایمونیل ابراھم







آج سے چھیالیس برس پہلے آپ نے پانڈیچری میں اپنے آشرم کی بنیاد رکھی اس آشرم سے آپ نے آخری دم تک بنی نوع انسان کو انسانیت اور حق پرستی کا پیغام دیا اور اسی فرض کو ادا کرتے ہوئے اٹھتر (۷۸) برس کی عمر میں عالم بقا کو روانہ ہوئے۔

شری اربندو گھوش

تاریخ پیدائش ۱۵ اگست ۱۸۷۲ء

تاریخ وفات ۵ دسمبر ۱۹۵۰ء

مہدی عبّاس حسینی

ضدّی

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

کردار	مہاتما گاندھی	عمر ۳۲ سال
	کستوربا	عمر ۳۰ سال
	بڑا لڑکا (بڑا)	عمر ۱۳ سال
	چھوٹا لڑکا (منجھلا)	عمر ۹ سال
	بڑا بچّہ (سنجھلا)	عمر ۴ سال
	چھوٹا بچّہ (مُنّا)	عمر ۲ سال

مقام۔ نیٹال افریقہ — وقت ۱۹۰۱ء — ہندستان واپس آنے کی تیاری ہو رہی ہے

[اسٹیج پر ایک ڈرائنگ روم نظر آتا ہے۔ سامنے ایک آرام کرسی ہے اور اغل بغل دو گدے دار کوچ پڑے ہیں۔ آرام کرسی اور کوچوں کے سرے کے درمیان دو چھوٹی گول میزیں رکھی ہیں۔ کمرے کی دیوار سے لگا ہوا ایک خالی جھولا رکھا ہے اور بائیں طرف ایک سنگار میز ہے جس میں بہت سے خانے لگے ہیں۔

پردہ اُٹھنے پر آرام کرسی پر ایک دو سال کا بچّہ نظر آتا ہے جو تکیوں اور گدّوں کے سہارے بیٹھا ہے اس کے داہنے ہاتھ ایک چار سال کا بچّہ ہے اور بائیں جانب ایک ۹ سال کا لڑکا]

لڑکا (عمر نو سال) گارڈ بابو جھنڈی ہلاؤ

[چھوٹا بچّہ (دو سال کا) ہاتھ ہلاتا ہے]

لڑکا۔ ویو۔ ہوں۔ اوں [انجن کے بھونپو کی نقل کرتا ہے]

بڑا بچّہ (عمر چار سال) ہیں ایں ایں (انجن کی سیٹی کی نقل کرتا ہے)

(لڑکا اُچک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بڑا بچّہ لپک کر اس کا دامن پیچھے سے تھام لیتا ہے۔ دونوں گاڑی کی آواز نکالتے ہوئے کمرے بھر کا چکر لگاتے ہیں اور پھر چھوٹے بچّے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں)

لڑکا۔ ہوں، دھوں اوں (انجن کے بھونپو کی آواز)

بڑا بچّہ (ہیں ای ایں (انجن کی سیٹی کی آواز)

(دونوں ایک دوسرے کو تیکھے ہو کر دیکھتے ہیں)

لڑکا۔ تجھ سے کون سیٹی بجانے کو کہتا ہے چُپ رہتا ہے کہ دوں ایک ہاتھ۔

بڑا بچّہ۔ ہشت کہیں انجن تمہاری طرح بولتے ہیں پُوچھ لو مُنّا سے۔

(مُنّا رونے لگتا ہے)

لڑکا۔ اے لو گارڈ صاحب رونے لگے۔

بڑا بچّہ۔ گارڈ صاحب۔

لڑکا کیوں رو رہے ہو:

بڑا بچّہ۔ کیا کچھ کھاؤ گے؟

لڑکا۔ جاؤ ذرا دودھ لے آؤ۔

(بڑا بچّہ باہر جاتا ہے اور فوراً ہی بائیں ہاتھ میں دودھ کی شیشی اور داہنے ہاتھ میں ایک اُبلی ہوئی گاجر لاتا ہے۔ چھوٹا بچّہ چپ ہو جاتا ہے۔ لڑکا بڑے بچّے کے ہاتھ سے شیشی لے کر چھوٹے بچّے کو پلانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن چھوٹا بچہ ہاتھ مار کر شیشی ہٹا دیتا ہے اور گاجر پر لپکتا ہے۔ تھوڑا سا دودھ چھلک کر دری پر گر پڑتا ہے)

بڑا بچّہ۔ میّا رے میّا اب ضرور مار پڑے گی

(چھوٹا بچّہ غصّے سے چیختا ہے)

بڑا بچّہ۔ لے بھئی لے (گاجر کا ایک ٹکڑا بڑی احتیاط سے توڑ کر دیتا ہے بچّہ اسے پاتے ہی چوسنے اور چبانے لگتا ہے۔ لڑکا بھی ہاتھ بڑھا کر ایک ٹکڑا توڑ لیتا ہے)

لڑکا۔ دیکھو تو جا کر ایک کپڑے کو پانی میں بھگو لا۔ پھر ہم اس دودھ کو

پونچھ دیں گے

بڑا بچہ - اللہ کہیں کے پانی گر گیا - ٹھیک ہے (باقی گاجر کے ٹکڑے کو منہ میں رکھ کر چباتا چلا جاتا ہے)

لڑکا (اپنی گاجر کا ایک ٹکڑا کاٹتے ہوئے) کیوں گارڈ صاحب ٹھیک ہے نا؟

چھوٹا بچہ - نہیں ہم باپو سے کہہ دیں گے مُنّہ دھو گرا ہے۔

لڑکا - جاؤ کہہ دو تم بچے ہو بچے، تمہاری بات کو کوئی کب مانتا ہے۔

چھوٹا بچہ - نہیں ہم ماں سے کہہ دیں گے۔

لڑکا - رام رے رام - ماں سے نہ کہنا مُنّا - لو یہ بھی گاجر لو۔

(چھوٹا بچہ ہاتھ بڑھا کر گاجر لے لیتا ہے - اب اس کے دونوں ہاتھوں میں گاجر ہے)

چھوٹا بچہ (گاجر پر ایک منہ مار کے) نہیں ہم جھوٹ نہیں بولتے۔

لڑکا (بگڑ کر) یہ بے ایمانی - اچھا دیکھو ابھی بتاتا ہوں (چھوٹے بچے کی مٹھی سے گاجر چھیننا چاہتا ہے - بچہ چیختا ہے - بڑا بچہ ہاتھ میں بھیگا ہوا تولیہ لئے داخل ہوتا ہے)

بڑا بچہ کیا کرتے ہو بھیا

لڑکا - (رک کر) یہ ہماری چغلی کھائے گا۔

بڑا بچہ (اطمینان سے جھک کر دری صاف کرتے ہوئے) نہیں لگائے گا چغلی (چھوٹا بچہ جو چیخنے والا ہے رک کر غور سے سننے لگتا ہے) آخر ہمارے مُنّا سے پوچھے گا کون؟ ہے نا مُنّا۔ (مسکرا کر چھوٹے بچے کو دیکھتا ہے) جب کوئی پوچھے تو بتا دینا۔

چھوٹا بچہ - اچھا بتاؤ ماں کہاں گئی ہے

لڑکا - ماں جلسے گئی ہے جلسہ۔

بڑا بچہ - (سمجھا کر) وہ جہاں ہار پہناتے ہیں اور تالیاں بجتی ہیں اور زور زور سے باتیں کرتے ہیں

لڑکا - ارے یہ تو کس کا تولیہ اٹھا لایا - ماں کا تو نہیں!

بڑا بچہ - میں کیا بے وقوف ہوں - یہ باپو کا ہے - باپو کبھی نہیں بگڑتے ہے مُنّا۔

(دروازے پر آواز)

لڑکا پشش شی - لو بھاگو ماں آگئی - (بڑا بچہ تولیے کو پھینکتا ہے۔ کستوربا داخل ہوتی ہیں - عمر تقریباً تیس سال جسم مائل بہ فربہ - ساری پہنے، گردن میں ایک خوبصورت نیکلس پڑا ہے۔

کستوربا - ائے میرا مُنّا کہاں ہے (لپک کر بچے کو گود میں لے کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں) میں آگئی میرے لال - رویا تو نہیں میرے لئے - ہم اپنے مُنّا کو دودھ پلائیں گے، مٹھائی کھلائیں گے - ہلا دھلا کر اچھے اچھے کپڑے پہنائیں گے ارے تیرے ہاتھوں میں یہ کیا ہے - کھول تو مٹھی - گاجر کیوں رے منجھلے۔

(منجھلا (نو برس کا لڑکا) بھی کھسک جاتا ہے - دروازے میں سے ایک اور بڑا لڑکا داخل ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں گیندے اور گلاب کے پھولوں کا ہار ہے - وہ ہار اُچھال رہا ہے - منجھلا اسی کے پیچھے پیچھے داخل ہوتا ہے)

منجھلا - بھیا یہ ہار کہاں سے پایا۔

بڑا - ارے یہ ماتا جی کا ہے - ماتا جی کو جلسے میں نیکلس بھی تو ملی ہے اور باپو کو بہت سا روپیہ زیور تحفہ ملا ہے - سب لوگ رو رہے تھے کہتے تھے نہ جاؤ، پر باپو نے کہا - میں ہمیشہ کے لئے نہیں جا رہا ہوں - جب ضرورت پڑے بلا لینا - آجاؤں گا

منجھلا - ماں کیا ہم لوگ سچ مچ کل گھر جا رہے ہیں؟

سنجھلا - ماں کیا ہم جہاز پر جائیں گے؟

مُنّا - ماں ہم یہ لیں گے (نیکلس پر ہاتھ مارتا ہے - کستوربا بچے کو پیار کر لیتی ہیں اور اسے نیکلس سے کھیلنے دیتی ہیں - ان کے چہرے سے وہ خوشی ٹپکتی ہے - جو ایک سیدھی سادی عورت کو چھانہ زیور پا کر ہوتی ہے)

کستوربا (ایک ناقابل ضبط جذبے سے متاثر ہو کر کمر سے کنجی نکال کر پھینکتی ہیں) بڑے ذرا سنگار میز کا نچلا خانہ کھول - (بڑا لڑکا خانہ کھولتا ہے) اس میں ایک چھوٹا ڈبہ ہے وہ اٹھا لا (بڑا ایک چھوٹے مراد آبادی ڈبے کو لاتا ہے - کستوربا اس کو زانو پر رکھ کے دوسری کنجی سے کھولتی ہیں - منجھلا ایک تپائی گھسیٹ کر ماں کے سامنے رکھ دیتا ہے - کستوربا اس ڈبے میں سے چند زیور چند گنیاں اور کچھ نوٹ نکالتی ہیں - زیوروں کے ساتھ ساتھ ایک پرچہ بھی نکلتا ہے - جس میں کوئی فہرست لکھی ہے - کستوربا زیوروں کو پیار سے چھوتی ہیں مگر

پرچہ دیکھ کر ان کے چہرے پر ذرا سی جھنجھلاہٹ آجاتی ہے۔

باپو: گاندھی جی) داخل ہوتے ہیں عمر تقریباً تیس سال چھوٹے سے دُبلے پتلے سے۔ آنکھ پر عینک، جسم پر انگریزی لباس۔ لبوں پر پتلی پتلی مونچھیں۔ اُن کے ہاتھ میں بھی ایک چاندی کا صندوقچہ ہے وہ بڑے غور سے بیوی کی مشغولیت اور بچّوں کے شوق کو دیکھتے ہیں۔ ان کے چہرے پر ایک تعجب اور تاسف کی جھلک آجاتی ہے)

باپو (آگے بڑھ کر صندوقچہ بھی بیوی کے سامنے میز پر رکھ دیتے ہیں اور آہستگی سے کہتے ہیں) لو یہ بھی لو (باپو کی آواز دھیمی ہے۔ مگر بہت صاف سنائی دیتی ہے)

کستوربا (گھبرا کر کھڑی ہوجاتی ہیں پر فوراً سا گھونگھٹ نکال لیتی ہیں) ارے آپ کب آگئے میں نے تو آہٹ بھی نہیں سنی۔ (کچھ اپنی مشغولیت پر شرمندہ ہو جاتی ہیں)

باپو بیٹھو بیٹھو۔ سبھی چیزوں کا جائزہ لے لو اور ایک پرچے پر حساب لکھ لو۔ بیٹھو نا (خود ایک کوچ پر بیٹھ جاتے ہیں کستوربا بھی کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں)

بڑا - باپو یہ سب چیزیں کیسے ملیں۔

منجھلا - کہاں ملیں۔

سنجھلا - کیا یہ سب ہماری ہیں۔

(کستوربا اتنے عرصے میں نئے صندوقچے کو خالی کر کے زیورات گھڑی بٹن۔ سگریٹ کیس انگوٹھیاں وغیرہ دوسری تپائی پر ڈھیر کر رہی ہیں)

منّا - باپو میں تو یہ لوں گا (پھر ماں کے نیکلس پر ہاتھ مارتا ہے)

کستوربا - (مسکرا کر ڈانٹتے ہوئے) ہوں (پھر زیور نکالنے میں مشغول ہو جاتی ہیں)

باپو - بیٹا یہ سب افریقہ کے ہندوستانیوں کا تحفہ ہے تین سال سے میں ان کی سیوا کر رہا ہوں نا۔ تو وہ میری سیوا سے خوش ہو کر مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میری عزت کرتے ہیں اور یہ چیزیں تحفے دیتے رہتے ہیں۔

(کستوربا ڈبے کی تہ تک پہنچتی ہیں تو اس میں بھی ایک پرچہ برآمد ہوتا ہے۔ جس میں تحفوں کی تفصیل اور دینے والوں کا نام لکھا ہے کستوربا کے چہرے پر پھر وہی جھنجھلاہٹ نمودار ہوتی ہے۔ وہ شوہر کو تیکھی نگاہ سے دیکھ کر سر ہلاتی ہیں۔ باپو کنکھیوں سے ان کے چہرے کے آتار چڑھاؤ کو دیکھ رہے ہیں)

منجھلا - (کچھ سوچتے ہوئے) باپو تمہاری سیوا زیادہ ہے کہ ان کا روپیہ۔

بڑا - بیوقوف باپو ان کا جتنا کام کرتے ہیں وہ ایک فوج بھی نہیں کرسکتی۔

منجھلا - باپو (رُک جاتا ہے)

باپو - کیا ہے بیٹے۔

منجھلا - باپو کیا محبت بغیر روپیوں کے نہیں مانی جاتی۔

بڑا - ارے مانی کیوں نہیں جاتی۔ پر روپیہ دینے سے زیادہ محبت مانی جاتی ہے۔

کستوربا - بیٹا آدمی کو روپے کا لوبھ ہوتا ہے۔ اور دوسرے آدمی سے بھی پریم ہوتا ہے۔ جب کوئی پیار سے کسی کو روپیہ دیتا ہے تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم کو اس آدمی سے زیادہ روپیہ پیارا نہیں۔

منجھلا - ماں میں باپو سے پریم کرتا ہوں۔ اگر میں باپو کو روپیہ نہ دوں تو میرا پیار دیار نہ مانا جائے گا۔

باپو (جو غور سے اس بحث کو سن رہے ہیں کھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں) شاباش بیٹے (بیوی سے مخاطب ہو کر) ہاں اب جواب دو (کستوربا کچھ گھبرا جاتی ہیں۔ باپو ملائمت سے کہتے ہیں) اچھا تم جاؤ کھانے کا انتظام کرو میں اسے سمجھا دوں گا۔

(کستوربا بچے کو گاندھی جی کی گود میں دیتی ہیں اور زیورات سمیٹنا چاہتی ہیں) ان سب چیزوں کو یہیں رہنے دو۔ (کستوربا باہر چلی جاتی ہیں اور باپو بچے کو گودی میں اُٹھا کر کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اب نشست اس طرح ہوجاتی ہے بیچ میں باپو اور چھوٹا بچہ۔ ان کے داہنے ہاتھ چھوٹی گول میز پر زیورات بائیں ہاتھ چھوٹی میز پر تلسی کا ڈبہ اور چاندی کا صندوقچہ۔ بڑا لڑکا کوچ پر بیٹھا رہتا ہے لیکن منجھلا اور چھوٹا آ کر باپو کے قدموں سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں)

منجھلا - ہاں باپو اب بتاؤ۔

باپو - دیکھو بیٹے میں نے افریقہ والوں کی سیوا کیوں کی؟ کیا روپے

کے بدلے۔ کیا میں ان کا نوکر ہوں۔ میں تو صرف رستم جی کا وکیل ہوں۔ افریقہ کے ہندوستانیوں سے پریم کی وجہ سے میں نے ان کے لئے دو ڈھوپ کی۔ اب پریم کا بدلہ کیا ہو سکتا ہے۔ روپیہ؟ نہیں صرف پریم بس جب یہ لوگ میری بات مان لیتے ہیں۔ میرے کہنے پر چلتے ہیں۔ جبھی میرے پریم کا بدلہ ہوتا ہے۔

بڑا۔ تب یہ روپے زیور کیوں۔

باپو۔ اس لئے کہ ہر ایک یہ بات نہیں سمجھتا۔ محبت کے معنی ہیں دینا۔ جس سے پریم کرو اسے اپنی ہر چیز دے دو۔ جتنا دو گے اتنا ہی خوش ہو گے۔ اس لئے یہ بچارے ہندوستانی جو روپیہ کمانے آئے ہیں جن کے لئے روپیہ بہت بڑی چیز ہے سمجھے روپیہ تحفہ دے کر خوش ہوتے ہیں۔

منجھلا۔ تو باپو تم یہ روپیہ خرچ کیوں نہیں کرتے۔

باپو۔ ہاں یہ بھی بڑا ٹیڑھا سوال ہے۔ دیکھو میرا روپیہ الگ ہے۔ قوم کا روپیہ الگ ہے۔ میرا روپیہ میرے اُوپر میرے خاندان پر صرف ہوتا ہے۔ قوم کا روپیہ صرف قوم پر خرچ ہوگا۔

بڑا۔ پر اب تو یہ بھی تمہارا ہے۔

باپو۔ فرض کرو منجھلا اور تم ایک ہی مکان میں رہتے ہو۔ دونوں الگ الگ کھانے کماتے ہو۔ پھر بھی تم منجھلے سے پریم کرتے ہو اس کی خبرگیری کرتے ہو۔ اب منجھلا تم پر بھروسہ کر کے تمہیں سو روپے دے۔ تو تم اسے اپنے اُوپر خرچ کرو گے کہ منجھلا پر۔

بڑا۔ (اکڑ کر) منجھلے کے روپے منجھلے پر خرچ ہوں گے۔ اور میں اپنے روپے بھی اسی پر خرچ کروں گا۔

باپو۔ شاباش یہی ہونا چاہئے۔ بس ٹھیک ہے یہ روپے بھی قوم پر خرچ ہوں گے اور میرے روپے بھی قوم پر خرچ ہوں گے۔

منجھلا۔ باپو میں بھی بڑا ہو کر قوم پر خرچ کروں گا۔

سنجھلا۔ اور میں بھی۔

چھوٹا۔ باپو ہم بھی (سب بچوں میں جوش آجاتا ہے)

باپو۔ اور بیٹا یہ زیور ہوتے ہی کس کام کے ہیں سو دیکھو یہ عورتوں کے زیور ہیں (ایک ڈھیر میز پر الگ کرتے ہیں) اور یہ مردوں کے زیور ہیں (دوسرا ڈھیر بناتے ہیں)

چھوٹا۔ باپو ہم بھی جیور لیں گے۔

سنجھلا۔ باپو کیا مرد بھی زیور پہنتے ہیں۔

باپو۔ (مسکرا کر) ہاں بیٹا۔ بعض مرد۔ عورتوں کی دیکھا دیکھی۔

بڑا۔ باپو یہ تو بڑے شرم کی بات ہے۔

باپو۔ لو یہ سب زیور اور روپے الگ ہو گئے۔ وہ نیکلس کیا میری؟ ارے ہاں وہ تو تمہاری ماتا جی پہنے ہیں۔

منجھلا۔ باپو ماتا جی روز نہ تو زیور پہنتی نہیں۔ آج کیوں؟

(کستوربا داخل ہوتی ہیں)

باپو۔ (شرارت سے مسکرا کر) شاید ہندوستان جانے کی خوشی میں

کستوربا۔ یہ باپ بیٹوں میں کیا سرگوشی ہو رہی ہے۔ چلو کھانا بن گیا۔

باپو۔ (ہنسی مسکراہٹ کے ساتھ) یہ تمہارے بیٹے بڑے ہمدرد ہیں کہتے ہیں ہم یہ سب زیور روپیہ نہ لیں گے

منجھلا۔ ہاں ماں یہ سب قوم کے ہیں۔

کستوربا۔ (تیکھی نگاہوں سے باپو کو دیکھتی ہیں) کیا کوئی نئی سنک سمائی تمہارے سر میں (بچوں کو جھڑک کر) چلو تم لوگ چپ بیٹھو۔

چھوٹا بچہ۔ ماں ہم وہ ہار لیں گے (نیکلس کی طرف اشارہ کرتا ہے) نہیں ماں وہ ہمارا نہیں (رک کر باپ کی طرف دو طلب نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے)

کستوربا۔ لے لو یہ بچہ تک نئی ہانک رہا ہے۔ چلو چلو نہا کے روٹی کھا لو۔

باپو۔ (ملائمت سے) مگر یہ زیور تو رکھ دو۔ اور ایک فہرست بنا لو آئندہ کام آئے گی۔

کستوربا۔ (بگڑ کر) میں کہتی ہوں۔ سر میں کیا سمائی ہے۔ کیا کیا سب واپس تو نہیں کرنے والے ہو۔

سنجھلا۔ ماں یہ ہمارا روپیہ نہیں۔

کستوربا۔ (سر پکڑ کر کوچ پر بیٹھ جاتی ہیں) تم تو روپے پیسے کے مقابلے میں پاگل تھے۔ اب بچوں کا بھی دماغ خراب کر دیا۔

باپو۔ اچھا تم یہ روپیہ کس کے لئے چاہتی ہو؟ میرے لئے؟ بچوں کے لئے؟ اپنے لئے؟ مجھے نہیں چاہئے۔ بچے نہیں مانگتے۔ (پھر رک جاتے ہیں)

کستوربا۔ (بگڑ کر تیزی سے) ہاں اب میں ہی تو ساری بھر کی خود غرض رہ گئی ہوں۔ اچھا جاؤ مجھ کو چاہئے۔

منجھلا۔ مگر ماں تم زیور کب پہنتی ہو۔

(کستوربا ایک کڑوی نگاہ شوہر پر ڈالتی ہیں مگر چپ رہتی ہیں)

باپو۔ (ملامت سے) تمہاری ماں نے سارے زیور بیچ کر مجھے ولایت جانے کا خرچہ دیا۔

کستوربا۔ (تیزی سے) تم غلط کہتے ہو۔ میرے پاس اور بھی زیور موجود ہیں۔ مگر تمہارا بس چلے تو تم وہ بھی بیچ ڈالو۔

باپو۔ جیسی تمہاری مرضی ہو۔ مجھے نہیں چاہئے بچوں کو نہیں چاہئے۔ مگر تمہارے پاس زیور نہیں۔ تم رکھ لو میں تم سے چھین نہیں سکتا۔

کستوربا۔ (بگڑ کر) کہتے ہو چھین نہیں سکتا۔ ابھی غصہ آ جائے تو نہ معلوم کیا کیا گت بنا ڈالو۔ تم نے کیا سکھ دیا ہے مجھے جیون میں۔ شادی ہوئی جب سے ہر وقت کڑوی بات۔ پھر برسوں کے لئے ولایت چلے گئے۔ واپس آتے ہی فوراً افریقہ جب سے یہاں آئی ہوں۔ ہمیشہ غیروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا۔ دیس چھوٹا۔ دھرم چھوٹا۔ انہی ہاتھوں سے جھاڑو نہیں دی کہ میلا نہیں پھینکا۔ اپنا ہی نہیں غیروں کا بھی۔ اب یہ چاہتی ہوں کہ اتنے دنوں کے بعد گھر جا رہے ہیں۔ ذرا حیثیت درست کر کے جائیں۔ بھگوان نے یہ روپے بھیج دیئے ہیں تو انہیں بھی ٹھکرا رہے ہو۔ میرا کیا لوگ یہی کہیں گے جیسے بھیک منگوں کی طرح گئے تھے ویسے ہی خالی ہاتھ آ گئے۔

باپو۔ (ذرا تیزی سے) میں نے کبھی بھیک نہیں مانگی نہ آج تک کسی سے قرضہ لیا۔ یہ تمہیں ہو جو خیرات کے روپیوں سے اپنی حیثیت درست کرنا چاہتی ہو۔

کستوربا۔ تم چپ رہو۔ کون گیا تھا مانگنے یہ پیسے۔ انہوں نے اپنی خوشی سے دیئے ہیں۔ پھر تمہیں گھر کے معاملات میں بولنے کا کیا حق۔ روپیہ کمانا تمہارا کام ہے گھر گرہستی میرا ذمہ ہے۔ ایک دن بھی نگرانی چھوڑ دوں تو یہ روپے تمہارے پاس رہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ دُنیا بھر کے جعلئے فریبی جمع ہو جائیں گے اور ٹوٹ کر جائیں گے کوئی کہے گا میں ترکاری کا ہوٹل چلاؤں گا۔ کوئی کہے گا میں میلا اٹھانے کی مشین بناؤں گا جس میں بھنگیوں کے ہاتھ نہ میلے ہوں۔

باپو۔ (آہستگی سے) یہ دونوں کام کیا بُرے ہیں؟

کستوربا۔ (بے بسی سے گڑگڑا کر) ہے بھگوان میں کیا کروں کیسے آدمی سے پالا پڑا ہے۔ (رنجیدہ ہو کر) کیا تمہاری ساری دُنیا غیروں کے لئے ہے اور سارا ظلم اپنوں کے لئے۔ میں کہتی ہوں چار چار بچے ہیں ان کی تعلیم پڑی ہے۔ شادی بیاہ پڑا ہے۔ بہوئیں آئیں گی۔ انہیں زیور دینا ہوگا۔ میں اپنا جیون تو کسی طرح کاٹ ہی لوں گی مگر ان بے چاریوں نے کیا قصور کیا ہے کہ وہ بہو کی جگہ سادھنی بن جائیں۔

بڑا۔ (کچھ شرما کر کچھ بے چینی سے) ماں (کستوربا احتجاجاً نہیں کرتی ہیں) ہمیں یہ زیور نہیں چاہئے ماں۔

باپو۔ (ملامت سے) دیکھو بچے ابھی بہت کمسن ہیں۔ ابھی سے ان کے دل میں شادی بیاہ کے خیالات نہ پیدا کرو۔

منجھلا۔ ماں تم یہ زیور واپس کر دو۔ میں بڑا ہو کر تمہیں اور بنوا دوں گا۔

سنجھلا۔ ماں تمہیں باپو پیسہ زیور نہیں دیتے تو پروا نہ کرو۔ میں بڑا ہو کر خوب کماؤں گا اور تمہارے لئے بیل گاڑیوں میں لاد لاد کے زیور بھیجوں گا۔

کستوربا۔ (دھیمی ہو کر بچوں پر ایک پیار بھری نظر ڈالتی ہیں پھر چپ رہ کر میاں کو سمجھاتے ہوئے) دیکھو ان لوگوں نے سوچ سمجھ کر یہ تحفے دیئے ہیں۔ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تم دھن کے لوبھی ہو؟ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ تمہاری سیوا کا بدلہ روپیہ سے ہو جائے گا؟ نہیں بلکہ وہ تو صرف اتنا چاہتے تھے کہ تم گھر داری کے جنجال سے آزاد ہو کر قوم کی سیوا کرو۔ جس کو گرہستی کی فکریں ہوں۔ جس کا من اشانت ہو وہ کیسے تن من دھن سے کسی کی سیوا کر سکتا ہے۔

باپو۔ (آنکھوں میں غصے کی چمک آ جاتی ہے مگر زہرخند کرتے ہیں) ٹھیک ہے۔ قوم کے سیوک کو بہترین غذا ملنا چاہئے گوشت اور شراب بہترین مکان ملنا چاہئے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر سمندر کے کنارے شیش محل۔ بہترین ساز و سامان ملنا چاہئے۔ موٹر اور کوچ بجلی کے پنکھے اور ریشمی کپڑے اور بہترین عورتیں ملنا چاہئیں۔ ایک سے ایک حسین (غصے سے) ہونہہ جو اپنے شریک سفر میں اندھا ہوگا وہ دوسروں کا ہاتھ پکڑ کر راستہ دکھائے گا؟

منجھلا- ہاں ماں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

کستوربا۔ (جھنجھلا کر اٹھ کھڑی ہوتی ہیں) میں صرف یہ جانتی ہوں کہ زیور واپس نہیں ہوں گے۔ چلو کھانا کھالو۔

باپو۔ ذرا سا بیٹھ جاؤ۔ یہ معاملہ طے ہو جائے۔

منجھلا۔ ہاں ماں ذرا بیٹھ جاؤ۔

کستوربا۔ (بیٹھ کر) طے کیا کرنا ہے (ٹھنڈی سانس لیتی ہیں) میں جانتی ہوں جو تم چاہتے ہو وہی کرو گے۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا۔ میں کہہ چکی۔

باپو۔ نہیں میں تمہارا دل نہیں دکھانا چاہتا۔

کستوربا۔ (سیدھے ہو کر) لو میں اپنی خوشی سے تو نہ دوں گی۔ اور سب دے دوں گی مگر نیکلس نہیں دوں گی۔ کبھی نہ دوں گی۔

چھوٹا بچہ۔ ماں مجھے بھی وہ اچھی لگتی ہے (باپ کی گود سے ماں کی گود میں لپکتا ہے)

کستوربا۔ (کڑے تیوروں سے) اور سنو میں یہ نہیں پسند کرتی کہ میرے پیٹھ پیچھے بچوں کو بہکا کر انہیں مجھ سے خلاف کر دیتے ہو۔ میں تمہارا یہ ظلم نہیں برداشت کر سکتی (باپو کی گود سے بچہ اٹھا کر گلے سے چمٹا لیتی ہیں) اب ان کے علاوہ میرے پاس کوئی دولت نہیں۔

باپو۔ (کچھ سوچ کر) تمہیں ایک ظلم اور سہنا ہوگا۔

کستوربا۔ میں کہتی ہوں میں یہ نیکلس نہیں دوں گی۔ یہ میری ہے۔ مجھے دی گئی ہے۔

باپو۔ (آواز میں سختی اور زور آجاتا ہے) کیوں۔

کستوربا۔ اس لئے کہ لوگ میرا آدر سنکار کرتے ہیں۔

باپو۔ مگر کیوں۔ آخر کیوں۔

کستوربا۔ اس لئے کہ۔

باپو۔ (بات کاٹ کر تیزی سے) صرف اس لئے کہ تم ایک قوم کے سیوک کی بیوی ہو۔ تم نے آخر کیا کیا کہ وہ تم سے محبت کریں۔

کستوربا۔ (غصے سے) میں ان کے ساتھ جیل بھگت چکی ہوں۔ میں نے تمہارے دوستوں کو کھلایا پلایا ہے۔ ان کے کپڑے دھوئے ہیں۔ ان کی گندی چیزیں صاف کی ہیں مگر تم میری کسی بات کا لحاظ بھی۔

باپو۔ یہ تم نے میری بیوی کی حیثیت سے کیا اور میرے چند دوستوں کے لئے کیا۔ مگر تم نے قوم کے لئے کتنا کام کیا۔ بس اتنا کہ ایک دفعہ جیل گئی ہو اور کیا تم خدمت کی اجرت لینا چاہتی ہو۔ کیا اگر میرے دوست تمہاری سیوا کے بدلے روپے اور زیور دیتے تو تم قبول کر لیتی؟ شاید ایسا ہی ہوتا۔ کیونکہ تمہیں زیوروں سے بہت محبت ہے!۔

کستوربا۔ (غصے میں چیختی ہیں اور نیکلس کو گلے سے اتار کر پھینکتی ہیں کہ اس کی کڑی ٹوٹ جاتی ہے) لو یہ اپنا نیکلس۔ ہر گھڑی کا طعنہ۔ نیکلس نہ ہوئی گلے کا سانپ ہو گئی۔

باپو۔ (نرمی سے) سنو۔

کستوربا۔ (سسک کر) نہیں میں ہی تو گھر بھر میں سب سے ذلیل ہوں۔ سب سے زیادہ خود غرض اور لالچی۔ باپ سادھو ہے۔ قوم کا سیوک ہے بچے تیاگی ہیں۔ بہادروں کی چوٹیوں سے نیچ ماں کو دیکھتے ہیں جو صرف زیور کی لالچ میں کالے کوسوں آئی ہے (پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں۔ بڑا اٹھ کر نیکلس اٹھانا چاہتا ہے۔ باپو آنکھ سے منع کر دیتے ہیں اور ماں کو منانے کا اشارہ کر دیتے ہیں۔ منجھلا اور چھوٹا فوراً ماں کے پیر پکڑ لیتے ہیں۔ بڑا پیچھے سے ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیتا ہے منجھلا اور چھوٹا سسک رہے ہیں۔ بڑے کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں۔ منا ماں کی گود میں بیٹھا سب کو تعجب سے دیکھتا ہے)

بڑا۔ نہ رو ماں۔ (مگر خود رو رہا ہے)

منجھلا۔ ہمیں معاف کر دو ماں (ہچکی لیتا ہے)

باپو۔ (عجیب انداز سے مسکرا کر) دیکھو میں نے تم سے کہا تھا۔ ایک ظلم اور کروں گا۔

(کستوربا تعجب سے آنسوؤں بھرا چہرہ اٹھاتی ہیں۔ مگر انہیں اب رفتہ رفتہ سکون ہو رہا ہے)

باپو۔ اچھا بس رونا بند۔ پھر ماں کے آنسو پونچھو (سارے بچے اپنے ہاتھوں سے ماں کے آنسو پونچھتے ہیں)

کستوربا (ہنس کر) ارے بس بس۔

باپو۔ اور سنو تم بالکل ٹھیک کہتی تھیں یہ زیور سب تمہارے ہیں

منجھلا۔ باپو؟

باپو۔ (مسکرا کر) لیکن تم اپنی خوشی سے یہ سب قوم کو دے دوگی۔

کستوربا۔ میں ان زیوروں کی صورت بھی نہ دیکھوں گی۔

باپو۔ جہالت کی باتیں نہ کرو۔ میں بھگوان کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے تمہیں کبھی بھی دھن کا لوبھی نہیں سمجھا (کستوربا کا چہرہ کچھ خوشی سے چمکنے لگتا ہے) اچھا اب جاؤ نیکلس اٹھا لاؤ۔ میں نے ساری سکیم بنا لی ہے۔ ان سب چیزوں سے ایک وقف بنے گا۔ رستم جی اس کے متولی ہوں گے۔ اور اس کی ساری آمدنی قوم پر خرچ ہوگی۔

کستوربا۔ (نیکلس لانے ہوئے) میں تمہیں خوب پہچانتی ہوں۔ تم بڑے ضدی ہو۔ کہتی تھی "تاکر اپنی بات منوا کر رہوگے۔ مگر تمہیں تو میرے رلانے میں مزا آتا ہے۔

باپو۔ اور تمہیں مجھ سے جھگڑنے میں (مسکرا کر) مگر سچ کہتا ہوں تم سے ایک دفعہ جھگڑا کر کے سارے ہفتہ کی تھکان دور کر لیتا ہوں۔

کستوربا۔ (خوش ہو کر) ہونہہ۔ باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔ چلو کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ (بچے گاندھی جی کو لے کر چلی جاتی ہیں۔ گاندھی جی سب زیور بڑے صندوقچے میں بند کر دیتے ہیں اور بچوں کو خاص بچگانہ انداز میں آنکھ مارتے ہیں۔ سب بچے کھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں)

منجھلا۔ باپو تم بڑے چالاک ہو (تینوں بچے ایک گھیرا بنا کر باپ کے گرد ناچنے لگتے ہیں)

سب بچے (شور مچا کر) باپو۔ باپو۔

بڑا۔ باپو زندہ باد۔

منجھلا۔ ماں زندہ باد۔

چھوٹا۔ ہم زندہ باد۔

(پردہ)

مسیح الزماں

اُردو تنقید میں آزاد کا درجہ

سرسید کے حلقۂ اثر سے الگ جن لوگوں نے انگریزی کا اثر قبول کیا ان میں آزاد کا نمبر پہلا ہے۔ زمانے کے انقلاب نے آزاد کو دہلی سے لاہور پہنچایا اور وہاں قسمت نے انہیں کرنل ہال رائڈ کے زیر سایہ ماسٹر پیارے لال آشوب اور دوسرے انگریزی دانوں کے قریب کردیا۔ ادب و شعر سے لگاؤ ان کی فطرت میں شامل تھا اس لئے انگریزی سے بھی انہوں نے واقفیت حاصل کرلی اور بہت کچھ سن کر اور تھوڑا بہت پڑھ کر انہوں نے شعر و ادب کے متعلق اپنے نظریے وسیع کئے اور انہیں سامنے رکھ کر جب اپنے ادب پر نگاہ ڈالی تو اس کی کم مائیگی نے حسرت و تاسف کے نغمے ان کے کانوں میں گنگنائے۔ اردو کی اس بے بضاعتی کا ذکر ان کے یہاں بار بار اور جگہ جگہ ملتا ہے۔

"اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے، ہار، طرّے ہاتھوں میں لئے حاضر ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے...."

(نظم آزاد صـ۱۵)

"اے اہلِ وطن! آج وہ دن ہے کہ علوم کے ایوان شاہانہ میں دربار لگا ہوا ہے۔ ہر ایک زبان اپنے ملک کی خدمتیں لے کر حاضر اور قدرت اور عظمت کے درجوں پہ قائم ہے۔ تمہیں کچھ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری زبان کس درجہ پہ کھڑی ہے؟ صاف نظر آتا ہے کہ نہایت ادنیٰ درجے پہ ہے۔ وہ آگے بڑھنا چاہتی ہے مگر کوئی بڑھانے والا نہیں...."

(نیرنگ خیال حصہ اول صـ۲)

"بڑی قباحت یہ پیدا کی کہ اربابِ زمانہ نے متفق اللفظ یہ کہہ دیا کہ اردو نظم مضامینِ عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے۔ اسے ہر ایک مضمون ادا کرنے کی طاقت اور لیاقت بالکل نہیں اور یہ ایک بڑا داغ ہے جو ہماری قومی زبان کے دامن پہ لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اسے کون دھوئے اور کیونکہ دھوئے؟ ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے جو کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہوگئے ہیں۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی، دونوں کناروں سے پانی لائے گی اور اس داغ کو نہ فقط دھوئیگی بلکہ قوم کے دامن کو موتیوں سے بھر دے گی...." (آب حیات صـ۸)

آزاد کا یہ احساس محض انگریزی سے مرعوب ہونے کا نتیجہ نہیں بلکہ اس سے ان کے خلوص اور ان کی ہمدردی کا پتہ چلتا ہے۔ جب انہیں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے واقفیت کا موقع ملا تو ان کے مقابلے میں انہیں اپنی زبان کا سرمایہ ہیچ نظر آیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ قدما کے خدمات کا انہیں اعتراف نہیں یا ان کے نزدیک پرانے ادب کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان کی تحریروں سے برابر اس کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے پیشرووں کے کمال اور ان کے خدمات کا اعتراف کرتے ہیں اور اب زمانے کا رنگ بدلتے دیکھ کر لوگوں کو نئی چیزوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

"اے میرے اہلِ وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زورِ مضمون کا جوش و خروش اور لطائف و صنائع کا سامان تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں ہے۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہوگئے ہیں۔ وہ کیا؟ مضامینِ عاشقانہ ہیں جس میں کچھ وصل کا لطف، بہت سے حسرت و ارمان، اس سے زیادہ ہجر کا رونا، شراب، ساقی، بہار، خزاں، فلک کی شکایت اور اقبال مندوں کی خوشامد ہے.... افسوس یہ ہے کہ ان محدود ائروں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اٹھا سکتے، یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزہ ہو

جاتے ہیں .... ان محدود احاطوں میں جو کچھ موجود ہے وہ ڈیڑھ سو برس سے آج تک بڑے بڑے سحر البیان فصیحوں نے شام کو صبح اور صبح کو شام کر کے پیدا کیا ہے ۔ دلوں کے خون اور دماغوں کے روغن پسینے کر کے بہائے ہیں جب یہ دل پسند خیالات، شستہ الفاظ، پاکیزہ ترکیبیں، خوشنما تراشیں مضمون کی گرمیاں، انداز کی شوخیاں پیدا ہوتی ہیں کہ سننے والوں کے کانوں میں رس ڈالتی ہیں ....." (نظم آزاد صہ ۱۸-۱۶)

دہلی اور لکھنؤ والے ماحول سے نکلنا آزاد کے لئے اور بالواسطہ اردو کے لئے بہت سازگار ثابت ہوا ۔ سر رشتہ تعلیم میں رہ کر انگریزی دانوں کی صحبت میں انہوں نے معلومات حاصل کئے اور اس اشارے کے ملتے ہی ان کی ذہانت اور طباعی نے شعر کی اصلیت اور غایت پر بہت کچھ سوچا ۔ چنانچہ شعر اور شاعری کی جہاں جہاں انہوں نے تعریف کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر کو محض کلام موزوں نہیں سمجھتے بلکہ تاثیر کو اس کا اہم جزو مانتے ہیں ۔

"کتابوں میں اکثر شعر کے معنی کلام موزون و مقفیٰ لکھے ہیں لیکن درحقیقت چاہئے کہ وہ کلام موثر بھی ہو، ایسا کہ مضمون اس کا سننے والے کے دل پر اثر کرے ۔ اگر کوئی کلام منظوم تو ہو لیکن اثر سے خالی ہو تو وہ ایک ایسا کھانا ہے کہ جس میں کوئی مزا نہیں ۔ نہ کھٹا نہ میٹھا" (نظم آزاد صہ ۵)

یہی خیال، یہی بات آزاد سے بیس سال بعد حالی نے ملٹن کا نام لے کر اور ایک کم مناسب لفظ "جوش" کا استعمال کر کے پیش کی اور لوگوں کے نزدیک وہ اردو میں پہلی بار تھی ۔ یہاں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ آزاد کے قلم سے یہ الفاظ ایک رو میں نکل گئے ہیں ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فصاحت کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اپنے اس خیال کی مزید توضیح کی ہے ۔

"... فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغہ اور بلند پروازیوں کے بادلوں سے اڑتے قافیوں کے پروں سے فر فر کرتے گئے ۔ لفاظی اور شوکتِ الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے ۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم کسی شئے پر رغبت یا اس سے نفرت، کسی سے خوف یا خطر یا کسی پر قہر یا غضب، غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو اس کے بیان سے وہی اثر، وہی جذبہ، وہی جوش سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے جو اصل کے مشاہدے سے ہوتا ہے ۔ بیشک مبالغے کا زور، تشبیہ و استعارے کا نمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے لیکن نمک اتنا ہی چاہئے کہ جتنا نمک، نہ کہ تمام کھانا نمک ...." (نظم آزاد صہ ۱۵)

ان خیالات میں ہمیں قدیم نظریوں سے ایک ہلکا سا تغیر محسوس ہوتا ہے اسلوب اور الفاظ سے الگ ہو کر فصاحت کے سلسلے میں معنی کو شاید پہلی بار اردو میں یہ درجہ دیا گیا ہے کہ کلام کی خوبی کا دار و مدار قریب قریب اسی پر رکھا ہے ۔ اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ آزاد کے نزدیک شعر کی کامیابی کا انحصار چکنے چپڑے الفاظ اور دلاویز ترکیبوں پر نہیں بلکہ اس تاثیر پر ہے جو ان ترکیبوں سے سننے والوں کے دل پر پیدا ہو ۔ استعارے اور تشبیہ اس مقصد کے حصول میں شاعر کے معین ضرور ہیں لیکن بجائے خود ان کا کوئی درجہ نہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ جب کسی خاص جذبے کے تحت دل و دماغ پر ایک وجدانی کیفیت سی طاری ہوتی ہے ذہن بلندیوں کی طرف پرواز کرتا ہے تو شعر کی تخلیق ہوتی ہے ۔ لکھتے ہیں ۔

"... شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوش و خروشِ خیالات سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے اور اسے قوتِ قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلۂ خاص ہے ۔ خیالاتِ پاک جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں مرتبۂ شاعری کو پہنچتے جاتے ہیں" (نظم آزاد صہ ۱۱)

لیکن شعر آزاد کے نزدیک خلا میں پیدا نہیں ہوتا ۔ یہ اپنے ماحول کا پروردہ ہوتا ہے اور اردگرد کے حالات سے بہت زیادہ متاثر اسی لئے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس کے ماحول کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ۔

"خدا جانے ان باتوں کو سن کر ہمارے شائستہ زمانے کے لوگ کیا کہیں گے کچھ تو پروا بھی نہ کریں گے اور کچھ واہیات کہہ کر کتاب بند کر دیں گے مگر تم ان باتوں کو ہزل نہ سمجھو ۔ ایک پل کی پل آنکھیں بند کر لو اور تصور کی آنکھیں کھول دو ۔ دیکھو وہی محمد شاہی عہد کے کہن سال درباری لباس پہنے بیٹھے ہیں اور باوجود اس متانت و معقولیت کے مسکرا مسکرا کر آپس میں اشعار پڑھتے ہیں .... ایک وقت میں جو بات مطبوع خلائق ہو یہ ضرور نہیں کہ دوسرے وقت میں بھی ہو" (آبِ حیات صہ ۱۰۲)

اس خیال کی تائید اور کئی جگہ بھی ملتی ہے ۔ مثلاً سید انشاء کے بیان میں لکھتے ہیں ۔

"... شہرستان تجارب کے سیر کرنے والے جانتے ہیں کہ جب رواجِ عام کا راجہ ہولی کھیلتا ہے تو بڑے بڑے معقول، وضع دار اشخاص اس کی چھینٹیں

فخر سمجھ کر سر و دستار پر لیتے ہیں پس وہ اور ان کے معاصر ملک چھوڑ کر کہاں نکل جاتے؟ ....." (آب حیات صفحہ ۲۵۵)

آزاد ماحول اور شعر و ادب کے تعلقات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جب تک شاعر کی ذات' اس کے مزاج اور اس کے ارد گرد کے حالات کا اندازہ نہ ہو صحیح طور پر اس کے کلام سے واقف ہونا ممکن نہیں اسی خیال کے پیش نظر انہوں نے شعرا کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں اور ان کے ماحولی اثرات کی نقاشی میں پوری توجہ سے کام لیا ہے۔ اپنے اس خیال کا اظہار انہوں نے آب حیات کے دیباچہ ہی میں کر دیا ہے۔

"..... اور حقیقت میں یہ حالات نہ مٹیں گے بلکہ بزرگانِ موصوف دنیا میں فقط نام کے شاعر رہ جائیں گے جن کے ساتھ کوئی بیان نہ ہوگا.. ہرچند کلام ان کے کمال کی یادگار موجود ہیں مگر فقط دیوان جو بکتے پھرتے ہیں بغیر ان کے تفصیلی حالات کے اس مقصود کا حق پورا پورا نہیں ادا کر سکتے نہ اس زمانے کا عالم اس زمانے میں دکھا سکتے ہیں"۔

اسی بنا پر تنقید لکھتے ہوئے وہ صرف خصوصیات کلام ہی بیان نہیں کرتے بلکہ ان کے اسباب و علل کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔ اردو تنقید میں انہوں نے ایک نیا راستہ نکالا ہے اور تنقید کے صحیح مفہوم پر پورا اترنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے پہلے کے سارے ناقد ادبی تخلیق کو محض ایک انفرادی فعل سمجھتے تھے لیکن آب حیات میں آزاد نے وہ نیا راستہ دکھایا ہے جس سے ادب کی اجتماعی حیثیت سمجھی جا سکے۔ ادب ان کے نزدیک محض ادیب کی من گھڑت نہیں بلکہ اس کی جڑیں معاشرت میں دور تک ڈوبی رہتی ہیں۔ ایک مثال دے دینا نامناسب نہ ہوگا۔

"قاعدہ ہے کہ جب دولت کی بہتات اور عیش و نشاط میں کچھ نیکی پر خیالات آتے ہیں تو صوفیانہ لباس میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت محمد شاہی دور نے در و دیوار کو دولت سے مست کر رکھا تھا جس سے کہ تصوف کے خیالات عام ہو رہے تھے۔ دوسرے ولی خود فقر کے خاندانِ عالی سے تھے اور فقیری ہی کے دیکھنے والے بھی تھے۔ تیسرے زبان اردو کے والدین یعنی بھاشا اور فارسی بھی صوفی ہیں۔ ان جذبوں نے انہیں تصوف شاعرانہ میں ڈالا ...." (آب حیات صفحہ ۹۲)

آزاد نے ان سطروں میں ولی کے کلام میں تصوف کے ہونے کے اسباب بیان کئے ہیں۔ اپنے پیش رو ناقدوں کی طرح وہ بڑی آسانی سے ولی کے خصوصیات کلام کے ساتھ تصوف کا ذکر کر سکتے تھے لیکن اس کے اسباب و علل کی جانب اشارہ اس امر کا صاف پتہ دیتا ہے کہ وہ تنقید کا ایک نیا نظریہ رکھتے ہیں۔

ان کی تنقیدیں پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر شاعر کی روح کو سمجھ لیا ہے۔ وہ ان کے خصوصیات اتنے صاف اور واضح الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ شاعر کا صحیح درجہ ذہن میں آجاتا ہے اور لطف یہ کہ ان کے دلچسپ انداز بیان سے شاعر کی ہو بہو تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ جرأت اور انشا وغیرہ کے بیان کی تمہید میں لکھتے ہیں۔

"قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔ دیکھنا اہل مشاعرہ آن پہنچے۔ یہ کچھ اور لوگ ہیں۔ ع ان کا آنا غضب کا آنا ہے

ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہوں گے کہ جن کی شوخی اور طراریِ طبع بارِ متانت سے ذرا نہ دبے گی۔ اتنا ہنسیں ہنسائیں گے کہ تھک جائیں گے مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے نہ ان عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے۔ انہیں کوٹھوں پر کودتے پھاندتے پھریں گے۔ ایک مکان کو دوسرے مکان سے سجائیں گے اور ہر شے کو رنگ بدل بدل کر دکھائیں گے۔ وہی پھول عطر میں بسائیں گے۔ کبھی ہار بنائیں گے۔ کبھی طرے سجائیں گے۔ کبھی انہیں کو پھولوں کی گیندیں بنا لائیں گے اور وہ گلبازی کریں گے کہ ہولی کے جلسے گرد ہو جائیں گے"۔ (آب حیات صفحہ ۲۳۲)

کتنی دلچسپ اور جامع عبارت، کتنے معنی خیز استعارے، پڑھتے چلے جائیے اور اس زمانے کے سارے معرکے' کل حالات نظر سے گزرتے چلے جاتے ہیں لیکن ایسی ہی عبارتیں دیکھ کر بعض لوگوں کو آزاد سے یہ شکایت ہے کہ ان کی تنقید تنقید نہیں معلوم ہوتی۔ ایسے لوگ آزاد کی سحر بیانی کے تو قائل ہیں لیکن کہتے ہیں کہ اس سے سنجیدگی کی وہ فضا قائم نہیں رہتی جو اعلےٰ تنقید کے لئے ضروری ہے۔ پہلی نظر میں تو ان کا یہ اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس میں حقیقت کم اور تخیل زیادہ ہے۔ مثال کے لئے جرأت کا بیان لے لیجئے۔

"انہوں نے بالکل میر کے طریقے کو لیا مگر اس کی فصاحت و سادگی پر ایک شوخی اور بانکپن کا انداز ایسا بڑھایا جس سے پسند عام نے شہرت

دوام کا فرمان دیا ۔ ۔ ۔ خصوصیت اس میں یہ ہے کہ فصاحت و محاورے کی جان ہے ۔ فقط حسن و عشق کے معاملات ہیں اور عاشق و معشوق کے خیالات گویا اس میں شراب ناب کا سرور پیدا کرتے ہیں" (آب حیات صـ۲۴)

ساتھ ہی ساتھ مصحفی کا بیان بھی دیکھ لیا جائے ۔

"دیوان ان کی استادی کو مسلم الثبوت کرتے ہیں ۔ انواع و اقسام کی صدہا غزلیں ہیں ۔ جو غزلیں نہایت سنگلاخ زمینوں میں لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت مشق سے کلام پر قدرت کامل پائی ہے ۔ الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کر کے اس دروبست کے ساتھ شعر میں کھپایا ہے کہ حق استادی کا ادا ہو گیا ہے ساتھ اس کے اصل محاورے کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ ایسے موقعے پر کچھ کچھ سودا کا سایہ پڑتا ہے جہاں سادگی ہے وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر سوز کے انداز پر چلتے ہیں ۔ اسی کوچے میں اکثر شعر میر صاحب کی بھی جھلک دکھاتے ہیں مگر جو ان کے جوہر ہیں وہ انہیں کے ساتھ ہیں ۔ یہ اس ڈھنگ میں کہتے ہیں تو پھسپھسے ہو جاتے ہیں ۔ بات یہ ہے کہ طبیعت رواں تھی ۔ پُرگوئی کے سبب وہ لطف کلام میں پیدا نہ ہوا ۔ غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے تھے ۔ کسی خاص طرز کی خصوصیت نہیں ۔ بعض تو صفائی اور برجستگی میں لاجواب ہیں ۔ بعض میں یہ معمولی باتیں ہیں جنہیں ڈھیلی ڈھیلی بندشوں میں باندھ کر پھیر پھیر برابر کہتے چلے گئے ہیں اس کا سبب یا تو پُرگوئی یا دلی اور امروہے کا فرق ہے" (آب حیات صـ۳۱۲)

کلام کا تجزیہ اور تفصیلی رائے اس سے زیادہ سنجیدگی سے تو شاید پیش نہیں کی جا سکتی ۔ نہ تشبیہوں کی بھرمار ہے نہ استعاروں کے الجھاوے بلکہ سیدھے سیدھے خصوصیات بیان کئے ہیں ۔ اگر کہیں عبارت میں تشبیہ و استعارے کا استعمال بھی کیا ہے تو اس سے تاثیر میں اضافہ اور تحریر کا حسن ہی بڑھا ہے اس کی بے اعتدالی نے بے لطف نہیں کیا ۔ اب اگر کہیں جوش عقیدت میں کچھ فقرے ایسے نکل گئے ہیں جو کسی کے مناسب حال نہیں تو ان فروگزاشتوں میں شمار کر لینا چاہئے جو انسان سے ہو ہی جاتی ہیں ۔

ناقد کے لئے ایک اہم موقع وہ ہوتا ہے جہاں وہ متقدمین یا معاصرین سے اختلاف کرے ۔ ہر لکھنے والے کو بارہا اس سے سابقہ ہوتا ہے ۔ آزاد سودا کے بیان میں لکھتے ہیں

"مرزا قتیل چار شربت میں فرماتے ہیں ۔ مرزا محمد رفیع سودا در ریختہ پایۂ ملا ظہوری دارد و غیر ازینکہ زبان ہر دو باہم تخالف دارد فرقے نتواں کرد ۔ مرزا قتیل مرحوم صاحب کمال شخص تھے مجھ بے کمال نے ان کی تصنیفات سے بہت سے فائدے حاصل کئے ہیں مگر ظہوری کی کیا غزلیں کیا قصائد دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں سے الجھا ہوا ریشم ہیں ۔ سودا کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے کہ محاورے اور زبان کا حاکم اور قصیدہ اور ہجو کا بادشاہ ہے" ۔

(آب حیات صـ۱۶۳)

تمام ادبی تخلیقات کی طرح تنقید کو بھی اس کے ماحول اور ادبی پس منظر کے اعتبار سے جانچا جاتا ہے ۔ تنقید نگار کا کام محض اچھائیوں اور برائیوں کا گنانا ہی نہیں بلکہ ادب کی تخلیقی قوتوں کو ابھارنا اور حیات بخش نظریوں کی طرف مائل کرنا بھی ہے ۔ آب حیات کے پہلے تک اردو تنقید جس ابہام، رمزیت اور سطحیت کا شکار تھی اسے سامنے رکھنے کے بعد ہی ہمیں آزاد کی عظمت اور ان کے شعور کی تیزی کا اندازہ ہو سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان کی تصانیف کا اس نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اردو تنقید میں ایک مجدد اور پیش رو کا لقب حالی سے زیادہ آزاد پر زیب دیتا ہے ۔

منظر سلیم

جوانی، مفلسی اور شاعری

میں نوجواں ہوں یہ میرے شباب کے دن ہیں
سحر ہوئی ہے شبِ ماضیٔ پریشاں کی
یہ پہلی فصلِ بہاراں ہے باغِ ارماں کی
جنونِ نو، خلشِ کامیاب کے دن ہیں
یہ آرزوئے مہ و آفتاب کے دن ہیں
مزاج دیدۂ بے خواب عاشقانہ ہے
عبادتِ لب و رخسار کا زمانہ ہے
عبادتِ نگہِ نیم خواب کے دن ہیں
یہ رونقِ دلِ خانہ خراب کے دن ہیں
یہ ذوقِ علم کی تکمیل کا زمانہ ہے
تصورات کی تشکیل کا زمانہ ہے
جسارتِ نظرِ انتخاب کے دن ہیں
مری خرد کے لئے وقتِ امتحاں ہے یہی
شعورِ پختہ کی تعمیر کا جہاں ہے یہی

یہی وہ دن ہیں کہ جب ذہنِ ابنِ آدم پر
نظامِ دہر کے اسرار فاش ہوتے ہیں
توہمات کے بت پاش پاش ہوتے ہیں
حقیقت آئینہ ہوتی ہے چشمِ محرم پر
تعیناتِ زر و سیم، فرقِ شاہ و گدا
مفادِ اہلِ ہوس اور محنتِ مزدور
یہیں سے ہوتا ہے محکم بغاوتوں کا شعور

یہیں سے ہوتی ہے دل میں نئی جلن پیدا
یہی وہ دن ہیں جب انسان اتنا سرکش ہو
کہ ہر بگولے کو پانی کا بلبلہ سمجھے
پہاڑ راہ میں آئے تو نقشِ پا سمجھے
الٹ کے رکھ دے صفِ لشکرانِ اعدا کو
جلائے رکھے جواں دل کے خوں کی ارزانی
چراغِ رہگذرِ ارتقائے انسانی

تو پھر مجھے بھی ملے اعتمادِ قلب و نظر
مرے لبوں پہ بھی عہدِ رواں کی بات آئے
حدیثِ پیچ و خمِ گیسوئے حیات آئے
مری نوا سے بھی پھوٹیں بغاوتوں کے شرر
مجھے نصیب ہو طرزِ سخنورانِ عظیم
کلام میں وہ اثر ہو کہ ناقدانِ ادب
وہ راہرو ہوں کہ ہوں میرِ کاروانِ ادب
مری مہارتِ تخلیق کو کریں تسلیم
میں اپنی محنتِ شام و سحر کا پھل پاؤں
مشاہدات کی فرصت ملے نگاہوں کو
دماغ و دل کو ذرا سا سکوں بھی حاصل ہو
سکوں کہ جس کی مدد سے کچھ اور کہہ جاؤں
خیال و خواب کی ویرانیوں میں پھول کھلیں
حیاتِ تازہ کی نوخیز کونپلیں پھوٹیں

محمد حسن

۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ کا اُردو ادب

۱۸۵۷ء کا معرکہ سیاسی اور تمدنی دونوں حیثیتوں سے ایک سنگ میل تھا یہ گویا مشرقی نظام اور ایشیائی جاگیرداری کا آخری مقابلہ تھا اور اس ناکام مقابلے کے بعد ہمارا نظام قطعی طور پر اپنے سے زیادہ طاقتور اور جدید تر مغربی نظام سلطنت کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ بڑی بڑی ریاستیں مٹ گئیں جو باقی رہ گئیں۔ انہوں نے بھی اپنا اقتدار و وقار کمپنی بہادر کے حوالے کر دیا۔ جاگیرداری اپنی بساط تہہ کر رہی تھی اور ہندوستانی ایک نئے راج کا تجربہ کر رہے تھے۔ اس نئے راج کو پہلی مرتبہ انہوں نے پوری سامراجی شکل میں دیکھا تھا اور فاتح و مفتوح کی خلیج پہلی بار اس قدر وسیع اور واضح شکل میں سامنے آئی تھی۔

نوابین اور راجاؤں کے زوال کے ساتھ ساتھ درباروں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کی جگہ جو نیا راج قائم ہوا اس کی وہ نوعیت نہ تھی جو اب تک کے سیاسی انقلابوں کی ہوتی تھی یہاں سرے سے دربار کا وہ مفہوم اور رواج اور بادشاہی کے وہ تصوّرات ہی نہ تھے۔ شاعر اور درباروں سے متعلق دوسرے اہل کمال حضرات نے انگریزوں کی بھی مدح سرائیاں کیں۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ ہوا کا رُخ بدل چکا ہے اور اب قصیدے اور درباداریاں ماضی کی حکایات بن چکی ہیں تو لوگوں کا خیال دوسری طرف جانے لگا۔ یہ دوراہا ہمارے ادب کی ہر شق میں آتا ہے اور یہیں سے ہم جدید و قدیم کی حدبندی قائم کر سکتے ہیں۔ نثر میں یہ دیکھا لمبی لمبی داستانوں اور تفریحی قصّوں کو ختم کر دیتا ہے یہ کوششیں جو محل اور دربار کی عشرتوں تک محدود تھیں اور جنہیں شاہی فرصت اور امیرانہ محفلیں ہی برداشت کر سکتی تھیں ختم ہونے لگیں۔ نئے قصّوں میں افسانے موجود ہیں لیکن افسوں رفتہ رفتہ غائب ہونے لگا۔ اس کے علاوہ یہاں ہیرو اور ہیروئن کے سر سے تاج شاہی کا بوجھ اترنے لگا اور اس کی جگہ متوسط درجے کے امیر طبقے نے لے لی کچھ نے

تاریخ کی طرف رجوع کیا کسی نے اخلاق کو مفید مطلب پایا غرض کہ اس ادب کے عوض جس کا محور دربار اور تاج شاہی تھا۔ ایک نیا ادب فروغ پانے لگا۔

اس نئے ادب کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے محض سیاسی تبدیلی کا سمجھنا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تمدنی اور علمی تبدیلیوں کو سمجھنا ضروری ہے علمی طور پر ۱۸۳۵ء میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کا تجربہ کامیاب ہو چکا تھا جو چیز اس نئی زبان کی آمد سے بھی زیادہ اہم تھی۔ وہ لارڈ میکالے کا فارسی اور سنسکرت کو رد کرنا تھا اس اقدام نے واضح طور پر یہ بات ثابت کر دی کہ جو لوگ نئے نظام میں اپنے لئے زندگی اور روزی چاہتے ہیں۔ انہیں پرانی روایات سے رشتہ توڑنا ہی پڑے گا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ دو قسم کے طبقے پیدا ہوئے ایک تو وہ جو اس نظام سے رشتہ جوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور پرانے جاگیردارانہ نظام میں چند وثیقوں یا وظیفوں کے سہارے وضع داری سے دن گزار رہے تھے انگریزی تعلیم ان کے لئے معاندانہ تھی اور نئے فیشن کو قبول کرنے والا کرسٹان۔ اس کے مقابلے میں دوسرا طبقہ وہ تھا جو روزی اور روٹی کے لئے آگے بڑھا اور اس نے انگریزی تعلیم کو حاصل کیا انگریزی محض ایک زبان ہی نہ تھی وہ ایک نئے کلچر اور ایک نئے تمدن کی علمبردار تھی یہ نیا تمدن اور نئی تہذیب ہمارے نوجوانوں پر اثر انداز ہوئی اور ان کے نظریۂ زندگی اور زاویۂ فکر دونوں میں واضح تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ ان کے سامنے اب مغربی تمدن کے نمونے تھے۔ جو اس وقت میں شاندار کے علاوہ کافی چمکیلے بھی تھے ان کے ذہن میں انگریزی ادب کی تصویریں تھیں اور جب وہ ان معیاروں پر ہماری نظم و نثر کو جانچتے تھے تو نفرت سے اپنا منہ پھیر لیتے تھے۔

تمدنی حیثیت سے یہ نیا طبقہ کافی اہمیت رکھتا ہے عملی طور

پھر یہی طبقہ ہماری سماجی زندگی کی رہنمائی کا تاج اپنے سر پر رکھنا چاہتا ہے، اور پُرانے درباروں اور جاگیردارانہ نظام کی جگہ داستانوں کی سرگرمی اور افسانوں کی مرکزیت اپنے قبضے میں لینا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی پیاس محفلِ گل و بلبل سے نہیں بجھتی، یا اسے یوں کہہ لیجئے کہ وہ ان علامتوں کا پردہ چاک کرکے اپنے دل کا غبار نکالنا چاہتا ہے۔ اس کی فضا زیادہ وسیع اور روشن ہے، اور اس کے مسائل زیادہ متنوع اور اُلجھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اب یہی طبقہ ہمارے قارئین کا طبقہ ہوتا ہے، اور اسی کا مذاق اب ادب کی کسوٹی قرار پاتا ہے۔ دربارداری کے ذوق کی جگہ اب اس نئے طبقے کو ملتی ہے اور اس کی کارفرمائیاں ہم ادب کی ہر صنف میں دیکھ سکتے ہیں۔

سرسید اور مولانا حالی کی آواز اس نئے طبقے کی ترجمان ہے، انہوں نے نثر کی صنعت گری اور آراستگی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اور نثر و نظم کو نئے راستوں کی طرف بُلایا، اس تحریک کا اثر لکھنؤ پر بہت زیادہ نہیں ہوا۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ لکھنؤ میں دربارِ اودھ کی یادیں ماند نہیں پڑی تھیں۔ کچھ لوگ ابھی تک ان بابرکت دنوں کے واپس آنے کے خواب دیکھ رہے تھے، اور ملکہ معظمہ سے انصاف کی اُمید رکھتے تھے۔ دوسرے یہاں جاگیروں اور جائداوں کی ضبطیوں نے ابھی تک وہ حالت پیدا نہیں کی تھی جو بے بسی کا پیش خیمہ ہوتی، اور جس کے نتیجے کے طور پر نئے اور پُرانے نظام کے دوراہے پر پہنچ کر کچھ نہ کچھ طے کرنے پر مجبور ہوتے۔ اس کے علاوہ یہاں انگریزی تعلیم کا رواج بھی بہت دنوں بعد ہوا۔

باوجودیکہ یہ تحریک لکھنؤ میں انتہائی غیر مقبول اور قابلِ ملامت گردانی گئی۔ پھر بھی انگریزی کے اثرات یہاں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ نثر میں تو بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی لٹریچر کی روح کو سمونے کی کوششوں میں سب سے زیادہ کامیاب کوششیں لکھنؤ ہی میں کی گئی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم نئے دور کی ان کوششوں کا تذکرہ کریں یہ ضروری ہے کہ اس بات کا اعادہ کیا جائے کہ ہم انھیں کارناموں کا تذکرہ کریں گے جو اپنی روح کے لحاظ سے منفرد اور مخصوص ہیں اور لکھنؤ کی تمدنی فضا میں سانس لیتے ہیں۔

معرکۂ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی زبان کے رواج اور مغربی تہذیب کے اثرات نے جن چیزوں کی کمی محسوس کرائی تھی ان کا احساس لکھنؤ میں غدر سے پہلے بھی ہو چلا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ نثر و نظم کے مخصوص لکھنوی رنگ نے اس سے نہ کوئی اثر لیا اور نہ تبدیلی کو ضروری جانا۔ ہاں ادبی افسانوں اور شاعری کے علاوہ ذہن اب ٹھوس فلسفیانہ اور سائنٹیفک مسئلوں کی طرف بھی متوجہ ہونے لگا۔ چنانچہ غازی الدین حیدر شاہ کے زمانے میں ایک رصدگاہ سائنٹیفک تحقیقات کے لئے قائم کی گئی، اسی زمانے میں نہایت تکلف اور اہتمام کے ساتھ ایک مطبع کھولا گیا اور تاریخ و مذہب سے متعلق کتابیں اس مطبع میں چھاپی گئیں۔ چنانچہ چنیدہ بخط طغرائی عربی کی مستند فارسی لغت تاج اللغات اور فارسی لغت ہفت قلزم۔ عربی میں مناقب الحیدریہ (۱۸۱۹) اور فارسی میں مجاہد حیدری کے نام سے تاریخ کی دو کتابیں چھاپی گئیں، جن میں غازی الدین حیدر کے زمانے کے حالات قلم بند کئے گئے ہیں۔ اور گلدستۂ محبت کے نام سے غازی الدین حیدر اور ہیسٹنگز کی ملاقات کا حال اس مطبع میں چھپا۔ یہ مطبع ٹائپ کا تھا۔ اور ٹائپ میں آج تک اردو فارسی اور عربی کتابوں کی خاطر خواہ طباعت کے لئے ہند میں کوئی انتظام نہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شعر و شاعری کے میدانوں کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی طرف بھی توجہ مبذول ہونے لگی تھی۔ دربار کی سرپرستی اور مطبع کی آسانی نے اس شوق کو تیز کیا۔

نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ایک انگریز مسٹر آرچر نے اپنا لیتھو کا کارخانہ کانپور سے لکھنؤ منتقل کیا اور بادشاہ نے اُن کی سرپرستی کی۔ دراصل یہ انتقال اُنھیں کے ایما سے عمل میں آیا تھا، اس کے بعد سے مطابع کی تعداد لکھنؤ میں بڑھنے لگی۔ ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ کے حدود میں بارہ چھاپے خانے قائم ہو گئے۔ جن میں میر حسن کا مطبع اور مطبع مصطفائی بہت مشہور ہوئے۔ میر حسن کے مطبع کے اہتمامِ صحت اور حسنِ انتظام کی تعریف سرور نے فسانۂ عجائب میں نہایت تفصیل سے کی ہے۔ اسی زمانے میں شرحوں اور ترجموں کی بھرمار ہو گئی۔ پہلی لیتھو کتاب الفیہ کی شرح میں چھپی، لارڈ بروہم کی کتاب جو سائنس کے فوائد و اعمال پر انگریزی سے ترجمہ کی گئی۔ ۱۸۳۴ء میں کمال الدین حیدر نے شاہ کی خوشنودی کے لئے

خاندان شاہی کے حالات لکھنے شروع کئے لیکن اس کے چھپنے کی نوبت اس وقت نہ آئی۔ ۱۸۵۸ء میں جب منشی نول کشور نے اپنا مطبع کھولا تو علم و ادب کے نئے ذخیرے سامنے آگئے۔

نول کشور پریس ہمارے ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر نول کشور پریس نہ ہوتا تو اردو ادبیات کی روایات نہ ہوتیں اور غالباً ہماری زبان ایک ایسی زبان ہوتی جو اپنا ماضی نہیں رکھتی۔ نول کشور پریس نے اردو ادب کو اس کا ماضی دیا اور اس کی روایات کو زمانے کے دست برد سے محفوظ کر کے ہمیشہ کے لئے اردو ادب کے نئے رجحانات کی پشت پناہی کے لئے استوار کر دیا۔ فارسی اور عربی اثرات اردو نثر و نظم دونوں پر پڑے لیکن ان کا واضح راستہ اور ان کے تدریجی نشو و نما کا اندازہ ہم نول کشور پریس کی چھاپی ہوئی داستانوں اور دیوانوں ہی سے کر سکتے ہیں۔ نول کشور پریس نے زیادہ تر توجہ ترجموں پر صرف کی فارسی اور سنسکرت سے تمام اہم اور مفید مطلب کتابوں کے ترجمے کر دئے گئے۔ رامائن کا ترجمہ ہوا سیر المتاخرین کے ترجمے نے اردو میں تاریخ کے عنوان پر کتابوں میں اضافہ کیا داستانیں ترجمہ ہوئیں جن کا ترجمہ ہونا اور چھاپا جانا تو درکنار آج بھی ان کو پڑھنے کے لئے غیر معمولی استقلال کی ضرورت ہے۔ داستان امیر حمزہ کے مجملہ دفاتر اردو میں ترجمہ ہوئے اور کچھ طبعزاد طور پر لکھے گئے۔ بوستان خیال کی تمام جلدیں ترجمہ ہوئیں۔

اردو داستانوں کا یہ سلسلہ اردو نثر کی دیومالا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس عہد کے تمدن کی پرچھائیوں کے ساتھ ہمیں اس دور کے تخیل اور جمالیاتی تصور کی اڑان کا پورا خاکہ ان میں ملتا ہے یہاں شہزادے اور شہزادیاں بھی ہیں پریاں اور دیو بھی ہیں۔ میدان جنگ اور محفل طرب بھی۔ قتل و خون، عشق و محبت، خطر پسندی اور عشرت کوشی۔ کیا چیز ہے جو یہاں موجود نہیں۔ یہ گویا پوری دنیا ہے جو تخیل کے بل پر قائم کی گئی ہے اور اتفاقات کے سہارے زندہ رہتی ہے۔ یہاں اسباب و علل وغیرہ کے سارے پردے اٹھے ہیں اور انسان گویا مشیت اور حالات سے دست و گریباں نظر آتا ہے۔ یہ ہمارے تمدن کی ابتدائی تصویریں ہیں اور ان ہی کے بل بوتے پر ہم اس دور کے تمدنی حلقے کو مرتب کر سکتے ہیں۔ اس دور کی کوئی تاریخ اور کوئی تذکرہ اس سے زیادہ سچی اور واضح تصویر پیش نہیں کر سکتا۔ عشق و محبت۔ وفا و جفا۔ رقیب و عاشق کے وہ تمام تصورات جو ہماری شاعری کی علامتیں بن گئی ہیں یہاں جیتی جاگتی نظر آتی ہیں۔ پھر بیان اور زبان کا یہ عالم ہے کہ یہ ذخیرہ کہیں ختم ہوتا ہی نظر نہیں آتا گویا الفاظ کا ایک بے پناہ سمندر ہے جو جس طرف چاہتا ہے اپنا رخ موڑ دیتا ہے۔ ان کہانیوں میں کردار نگاری، واقعہ نگاری اور دوسرے فنی اصول کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے کہ یہ وہ ابتدا ہے جو صرف تخیل کے اصول کو مانتی ہے پھر بھی ہمیں یہاں ایسے کردار ملتے ہیں جنہیں ہم اس دنیا میں دیکھتے ہیں ہمیں وہ واقعات ملتے ہیں جنہیں ہم دیکھتے نہیں تو سوچتے ضرور ہیں ہمیں یہاں وہ زبان، وہ رسم و رواج۔ وہ تمدن ملتا ہے جو اجنبی نہیں کہا جا سکتا:۔

"یہ جو ملکہ نے سنا تو اپنا حال تباہ کیا اور جواب دیا کہ مجھ سے یہ قید فرنگ نہ اٹھی ہے نہ اٹھے گی۔ تو صاحب دائی بھر پرگہ درراہ ہوگی میں تو ماں کا دہاؤ سہتی نہیں۔ دائی جو میرے ساتھ رہیں گی اور ہر بات میں پٹ پٹ بولیں گی۔ پھر مجھے کہاں تاب ہوگی۔ میں بھی کچھ کہوں گی۔ تو نگوڑ ماری بدنام ہوں گی۔ اس سے میں درگذری بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ ایسی کیا بے اعتباری ہوں کہ دائی کو لئے لئے پھروں بھاڑ میں جائے سیر چولہے میں جائے تماشا۔ میں اس بڑھیا نگوڑی کو نہ لے جاؤں گی"

(طلسم ہوش ربا: جلد اول)

"طلسم ہوش ربا" کو داستان امیر حمزہ کے پورے سلسلے کی اہم ترین کڑی کہا جاتا ہے۔ منشی میر محمد حسین جاہ اور منشی احمد حسن قمر کی سحر کاری اور سحر نگاری نے ان میں پلاٹ اور طلسم کے علاوہ زبان اور زبان کی وہ غیر معمولی روانی اور قدرت پیدا کر دی ہے جو اپنی آپ نظیر ہے۔

ان مفید مطلب ترجموں اور داستانوں کے علاوہ منشی نول کشور نے ایک اخبار "اودھ اخبار" کے نام سے جاری کیا یہ اخبار کئی حیثیتوں سے اہمیت رکھتا ہے اول تو یہ اردو صحافت کے اس دور میں جاری ہوا تھا جب صحافتی کساد بازاری اپنے عروج پر تھی۔ اخبار نئے نئے نکلنا شروع ہوئے تھے اور اس نئے شوق کو پورا کرنے کے لئے اکثر وہ لوگ میدان میں اتر رہے تھے جن کی گرہ میں دام نہ تھے اور جن کو صحافت سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ لکھنؤ

سے "کارنامہ" اور "اودھ اخبار" نکلنا شروع ہوئے۔ "کارنامہ" جلد ہی ختم ہو گیا لیکن اودھ اخبار نے اردو ادب میں تاریخی اہمیت حاصل کی ہر چند کہ اس کی صحافت کا پایہ نہایت اعلیٰ نہ تھا۔ پھر بھی جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس نے صحافت کی ان ذلیل ترکیبوں اور داؤ پیچ سے اپنا دامن آلودہ نہ کیا جو اس عہد میں عام تھے علاوہ بریں اودھ اخبار نے سرشار اور شرر کو اردو ادب میں روشناس کرایا سرشار کا مایۂ ناز ناول "فسانۂ آزاد" قسط وار اسی اخبار میں شائع ہونا شروع ہوا شرر کے مضامین بھی ان کالموں میں چھپے۔

اودھ اخبار کے اجراء کے بعد ہی اودھ پنچ جاری ہوا اور اودھ پنچ کی ہمعصری نے اودھ اخبار کی اہمیت کو اور بھی زیادہ کر دیا۔

"اودھ پنچ ۱۸۷۷ء اردو میں اپنی قسم کا پہلا اور آخری اخبار تھا۔ صحافت کے لحاظ سے اودھ پنچ پہلا اخبار تھا۔ جس نے محض تجارت کو اپنا مطمح نظر قرار نہیں دیا بلکہ مغربی اصول پر اخبار نویسی کی شان پیدا کی اور ایک خاص سوشل مسلک قائم کیا۔" اب تک کے اخباروں کے برخلاف 'اودھ پنچ' کا ایک سماجی اور کسی حد تک سیاسی مسلک تھا۔ منشی سجاد حسین مرحوم خود کانگرس کے رکن تھے اور نشیب و فراز کے باوجود ان کے قدم کبھی اس راہ سے نہیں ہٹے وہ آخر تک کانگرس کے سیاسی عقیدے کے موئد رہے انہوں نے سر سید اور ان کی اینگلو محمڈن سیاست کے شباب کے زمانے میں بھی ہندو مسلم اتحاد اور انگریزوں کی ذہنی اور سماجی غلامی کے خلاف آواز اٹھائی اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو "اودھ پنچ" نے بہت بڑی خدمت سرانجام دی اور ایک سیاسی نقطۂ نظر یعنی ملک کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کو سامنے رکھ کر ہماری سماجی اور تمدنی زندگی پر طنز اور ظرافت کے پردے میں انتہائی کڑی تنقید کی۔ ہر چند کہ اس کا پیرایۂ تنقید اور نقطۂ نظر دونوں قدامت پسند تھے اور نئی تحریکوں کو عام طور پر اور مغربی اثرات کو خاص طور پر اس کی طنز کا نشانہ بنا پڑا تھا۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ پنچ پر مغربی اثرات صحافت اور ظرافت دونوں حیثیتوں سے طاری رہے۔

اردو ادب ظرافت اور طنز دونوں جوہروں سے تقریباً نا آشنا رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں روایتی سنجیدگی کی جڑیں دور دور تک پھیل سکی ہیں۔ ظرافت ادب عالی کی رگ حیات ہے اور جو ادب اس جوہر سے محروم ہو اسے دنیا کے اعلیٰ ترین ادب میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ظرافت کا فقدان مذاق سلیم کو جدت اور ندرت کے جذبات سے عاری کر کے اسے روایات کی بھاری زنجیروں میں جکڑ تا ہے اور ان بنیادوں کو آنکھ بند کر کے مان لینے پر زور دیتا ہے۔ جو روایات نے ہمارے تمدن اور معاشرت میں قائم کر رکھی ہیں جب تک معاشرت اور تمدن کی ان بنیادی قدروں کا طلسم شکست نہیں ہوتا اس وقت تک ظرافت اور طنز کے چشمے نہیں پھوٹتے اور نئے راستے نہیں کھلتے۔ "اودھ پنچ" ایک ایسے دور کی پیداوار ہے جب تمدن کی یہ مستحکم بنیادیں ہلنے لگی تھیں۔ ہماری تہذیب اور معاشرت نے جن قدروں کو عظیم اور مطلق سمجھ رکھا تھا وہ اب بے بس اور مجبور ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ درباداری اور شہنشاہی کا نظام ختم ہو رہا تھا۔ اور اس کے عوض "سوداگروں کی حکومت" قائم ہو رہی تھی۔ یہ انگریز سوداگر یہاں کی رعایا پر حکومت تو کرتے تھے مگر نہ دربار بناتے تھے اور نہ محفلیں جماتے تھے وہ یہاں کی رعایا میں ملنا نہ چاہتے تھے۔ انہیں ان کے ادب سے دلچسپی تھی نہ تمدن سے۔ وہ ایک نیا تمدن۔ ایک نئی تہذیب اور نئی زبان لائے تھے۔ اور اسے وہ روزی دینے سے قبل شرط کی حیثیت سے ہر ہندوستانی کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ ان دو تمدنوں کی کشاکش نے ہندوستانی ذہن کو ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا۔ پرانی تہذیب کا چراغ جھلملا رہا تھا۔ حرم محفلیں مشاعرے، موسیقی کے جلسے رہس اور اندر سبھائیں رخصت ہو رہی تھیں دربار ختم ہو چکا تھا۔ پرانی قدریں اپنے معنی تبدیل کر رہی تھیں۔ تعلیم نسواں۔ پردہ۔ وضعداری، قوم و مذہب، ذات پات کے قیود سبھی نئے سانچے میں ڈھلنے لگے تھے۔ ایسے وقت میں ایک آزاد اور فکر و ادراک سے کام لینے والے دماغ نے لازمی طور پر اس تماشے کو محض تماشائی کی حیثیت سے دیکھنا چاہا اور راہ چلتے ان نظاروں پر گرد اڑائی۔ قہقہے مارے پگڑیاں اچھالیں

اور حمام میں سب ننگوں کو دیکھ کر خوب ہنسا۔ یہی 'اودھ پنچ' کی ظرافت ہے۔
'اودھ پنچ' کے طنز اور ظرافت کے بارے میں ایک بات قابل غور ہے۔ اودھ پنچ کی ظرافت نئے یا پرانے تصورات سے بغاوت نہیں بلکہ ان کی اصلاح کی ایک مبارک خواہش ہے۔ 'اودھ پنچ' کو مختلف لکھنے والوں کا تعاون حاصل تھا اور ان لکھنے والوں کا رُخ مختلف سمتوں میں تھا کوئی نوابوں اور امرا کی خالصتہً مشرقی عیش پسندی کا خاکہ اڑاتا تو کوئی متوسط طبقے کے نیم مغربی رہن سہن کا لیکن ان سب حضرات کا ہدف تمدن کا یہ ادھ کچرا اختلاط تھا جو اس دور میں فروغ پا رہا تھا۔ ایک طرف انہیں مشرقی تہذیب میں ضرورت سے زیادہ عصبیت اور تنگ نظری دکھائی دیتی تھی وہ علم کے ان محدود دائروں کو دیکھتے تھے۔ جو ہمارے اخلاق اور تمدن نے کھینچے تھے۔ یہاں نہ جدید تحقیقات کی گنجائش نہ نئی معلومات سے استفادہ ممکن تھا۔ وہ اس مختصر زمین آسمان کی طرف نظر کرتے تھے جس کی وسعت 'طلسم ہوشربا' کے تخیلی حلقوں میں محدود تھی۔ وہ زندگی کی ان حد بندیوں کو دیکھتے تھے جن میں صف شکن علی شاہ کی بہدانہ اور عشرت کوٹھیوں سے آگے فکر و عمل کے میدان تنگ تھے دوسری طرف وہ مغرب زدگی کی طرف نظر کرتے تو سے خا بر دایوں کے شکنجوں میں بسیر پاتے کوٹ پتلون کے تکلفات، افسروں اور انگریزوں کی کوٹھیوں کے ایرے پھیرے تلفظ کا بگاڑنا، شراب بے پردگی اور دوسری اخلاقی بے راہرویاں دیکھتے تو اس کا مضحکہ اڑاتے یہاں کے زمین آسمان کو وہ خوشامد اور دفتر تک محدود جانتے اور اس کے علاوہ تہذیبی اور تمدنی حیثیت سے یہ دنیا ان کے لئے اجنبی تھی۔ وہ ان دونوں تمدنوں کے اختلاط کا کوئی واضح نقشہ تو نہیں بنا سکے لیکن یہ معلوم ہوتا ہے جیسے ان کا مطمحِ نظر سادہ پوشاک اور اعلیٰ اور اک کے اصول پر چلنا تھا علم و فضل کے دائروں میں وہ جدید و قدیم، مشرقی و مغربی کے خطوط نہ کھینچتے تھے۔ رہنے سہنے میں وہ دکھاوے اور بناوٹ کے قائل نہ تھے اور اس لئے مشرقی و مغربی دونوں تمدنوں کے خاکے اڑانا ان کے واں جائز تھا۔
'اودھ پنچ' کو مختلف لکھنے والوں کا تعاون حاصل تھا۔ مرزا سجاد حسین مرحوم اس کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے اپنے رفقاء میں ایسے سحربیان اور جادو رقم نامہ نگار ڈھونڈے جو اس زمانے کے لکھنؤ کی سوسائٹی کا جوہر کہے جا سکتے تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے مضامین دو سال تک برابر شائع ہوتے رہے لیکن سرشار نے جب اودھ اخبار کی عنانِ ادارت سنبھالی اور اودھ اخبار اور اودھ پنچ میں چپقلش ہوئی تو یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ سید محمد خاں آزاد۔ احمد علی شوق۔ جوالا پرشاد برق۔ احمد علی کسمنڈوی۔ تربھون ناتھ ہجر۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف۔ اور اکبر الہ آبادی اسی دور میں سامنے آتے ہیں۔ ان کی شوخ و شنگ تحریروں نے اودھ پنچ، صحافت کی بجائے ادبیات کا مخزن بنا دیا۔ ان ادبی شہ پاروں میں زبان و بیان کی وہ چاشنی پورے طور پر ملتی ہے۔ جس کے لئے لکھنؤ مخصوص رہا ہے۔ بیان میں ظرافت، بذلہ سنجی، اور شوخ طبعی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو انشا اور جرأت کے کلام کی جان ہیں۔ ظرافت کے لحاظ سے ان کا مذاق خالصتہً لکھنؤی ہے۔ پھبتیاں فقرے بازیاں اور ضلع جگت خاص لکھنؤ کے مذاق سے متعلق رہی ہیں اور ان کا استعمال 'اودھ پنچ' نے سب سے زیادہ کامیابی سے کیا۔ ظرافت کے اس مذاق کو آج ہم اعلیٰ ترین نہیں کہہ سکتے یا اگر کہہ سکتے ہیں تو اس کے مختصر اور محدود حصے ہی کو۔ لیکن اس دور میں ضلع جگت اور پھبتی کا مذاق عام تھا اور ظاہر ہے کہ ہجو اور رذل گوئی سے یہ مذاق کہیں زیادہ شستہ اور ستھرا ہوا تھا۔ زبان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اودھ پنچ میں تمام تر مزاح الفاظ اور زبان ہی کے ذریعے سے پیدا کیا جاتا تھا واقعات کا عنصر بہت کم ہوتا تھا اور اس کا استعمال محض برائے نام ہی ہوتا۔ زبان محاورے روزمرہ اور خاص ترکیبیں جو اودھ پنچ نے استعمال کیں۔ وہ لکھنؤ کے کلچر کی پیداوار تھیں۔ اور یہیں کے بازاروں، سراؤں اور میلوں ٹھیلوں میں بولی جاتی تھیں۔ زبان کے لحاظ سے 'اودھ پنچ' کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ اس نے ان طبقوں کی زبان کو محفوظ کر دیا اور وہ بھی اس لطف کے ساتھ کہ ظرافت اور خوش طبعی کا رنگ دوبالا ہو گیا۔
'اودھ پنچ' نے اپنی تاریخی زندگی میں چار معرکے سر کئے

فسانۂ آزاد کے سلسلے میں پہلا معرکہ ہُوا کہ یہ فسانہ اودھ اخبار میں چھپا اور اودھ اخبار اور اودھ پنچ میں معاصرانہ چشمکیں ہمیشہ چلتی تھیں اس معرکے ہی پر موقوف نہیں تمام تر معرکوں میں اودھ پنچ نے ادبی تنقید اور نکتہ چینی سے زیادہ ظریفانہ خوش طبعی اور طباعی کا مظاہرہ کیا ہے۔ کچھ اعتراضات صحیح بھی تھے لیکن یہاں مقصد گرمئ بازار قائم رکھنے اور پگڑی اچھالنے سے تھا۔

دوسرا معرکہ مولانا حالی سے ہوا؛ اودھ پنچ نے لکھنؤ والوں کی طرف سے گویا مولانا حالی کی نئی اصلاحوں کے مقابلے میں اعلانِ جنگ کر دیا تھا اور 'مقدمۂ شعر و شاعری' کے اعتراضات اور تجاویز دونوں پر خوب طنز و تشنیع کی اور گویا لکھنؤ کے شعرا کی اس توہین کا بدلہ لے لیا جو اس کی نزدیک مولانا حالی سے سرزد ہوئی تھی۔

تیسرا معرکہ داغ سے ہُوا حیرت کی بات ہے کہ داغ میں لکھنوی اندازِ شاعری کے اتنے اثرات موجود ہوتے ہوئے بھی لکھنؤ نے کبھی ان کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کی وجہ غالباً امیر و داغ کی رقابت اور دہلی و لکھنؤ کے جھگڑے تھے۔" اودھ پنچ کے صفحوں سے اعتراضات کی چنگاریاں مدت تک اڑائیں جن کا رُخ داغ کی شاعری کے علاوہ ان کے حسب نسب اور صورت و سیرت کی طرف بھی تھا اس معرکے سے اور ان اعتراضات سے داغ کی شہرت میں فرق نہ آیا مگر لکھنؤ سے دلانے ہنسنے ہنسانے کا مشغلہ قائم رہا۔"

'اودھ پنچ' کا آخری معرکہ مولانا شرر سے تھا یہ دراصل ان اعتراضات کا شاخسانہ تھا جو مولانا نے 'گلزارِ نسیم' پر کئے تھے۔ 'اودھ پنچ' نے اپنی پرانی وضع کے مطابق ان اعتراضات کا خاکہ اڑایا اور بقول چکبست 'اودھ پنچ' کی بجھتی ہوئی آگ پھر ایسی بھڑک اٹھی کہ اس کی آنچ دور دور تک پہنچی"۔ اس معرکے میں زبان اور محاورے کی تحقیق و تدوین پر بھی خاص توجہ کی گئی لیکن بحث کا لہجہ ہمیشہ طنزیہ ہی رہا۔

ان خاص معرکوں کے بیچ بیچ میں چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں سرسید کو نیچری کہا اور ان کے نیچریہ مذہب کی شان میں کیا کچھ نہیں کہا گیا غرضیکہ ۱۸۷۷ء سے ۱۹۱۲ء تک اودھ پنچ کا دور دورہ کبھی گرم اور کبھی سرد طریقے پر چلتا رہا اور اس نے ہمارے ادب میں ایسے اجزا کی نمائندگی کی جو ابھی تک اس محفل میں موجود نہ تھے لکھنؤ نے اردو نظم میں ندی بانکپن اور خوش طبعی کی جو شمعیں روشن کی تھیں وہ نثر میں اس سے بھی زیادہ آن بان سے روشن رہیں اور اس راہ پر چلنے والوں کے لئے آج بھی ان کی روشنی ماند نہیں پڑی ہے۔

شہاب جعفری

رُباعیات

برہا کے دُکھ ٹٹول، دھیرے دھیرے
ٹانکے دل کے ہیں کھول دھیرے دھیرے
دُکھتی ہوئی رگ اور بھی دُکھ جاتی ہے
او پاپی پپیہے، بول دھیرے دھیرے

اشکوں میں سمو رہا ہوں آنچل کا رنگ
ہاتھوں میں ہے دامن تو نکھرتی ہے اُمنگ
ہونٹوں میں سمٹ رہی ہے دھڑکن دل کی
سینے میں تڑپ رہے ہیں لاکھوں آہنگ

ہم درد، دلوں میں درد کے ہیں ڈیرے
دشمن ہیں زمانے والے میرے تیرے
اک کُنجِ سکوں بنا چکا ہوں آ جا!
تنہائیاں منتظر ہیں پردہ گھیرے

ذکر و فکر

شفقت کاظمی

اندوہِ تمنا کا گِلا ہو نہیں سکتا
کچھ ہم سے علی الرغم وفا ہو نہیں سکتا

شرمائے نہ بے وجہ تری نیم نگاہی
میں اپنے مقدر سے خفا ہو نہیں سکتا

حائل ہے ترا ظلم جو اندازِ کرم کا
مجھ کو بھی سرِ ترکِ وفا ہو نہیں سکتا

پہنچی ہے وہ ایذا ہمیں اپنوں کی بدولت
غیروں کی جفاؤں کا گِلا ہو نہیں سکتا

فریادِ دلِ زار اثر لا نہیں سکتی
وہ شوخ پشیمانِ جفا ہو نہیں سکتا

شفقت کہ تری رنجشِ بیجا کا ہے شاکی
منجملۂ اربابِ وفا ہو نہیں سکتا

راغب مراد آبادی

ہم اُن کی برہمی سے نائل ہیں دل لگی پر
تنقید ہو رہی ہے آئینِ دلبری پر

پُر کیف دیکھتا ہوں مستقبلِ محبت
اللہ رے یہ بھروسہ ہوں کی زندگی پر

محرومیٔ تماشا، ناکامیٔ تمنا
کیا کیا صلے ملے ہیں اِس عجزِ بندگی پر

اہلِ وفا بھی نکلے اپنی غرض کے بندے
پورا نہ کوئی اُترا معیارِ عاشقی پر

اپنوں کو بھی جہاں میں بیگانہ خو ہی پایا
چھینٹے ریا کے دیکھے دامانِ دوستی پر

اخلاص و مہر و الفت دنیا میں گو نہیں ہے
دھوکا ہوا ہے راغب لیکن کسی کسی پر

رباعیات

برج لال رعنا

آلام کا سہنا بھی ریاضت سی ہے
حق بات کا کہنا بھی اسادت سی ہے
ہر سانس ہے اک دعا پشیمانی میں
یہ زیست بھی مختصر عبادت سی ہے

سجدہ در پردہ ہار کا ہے اعلان
تسلیم ہے انکارِ خودی کی پہچان
سمجھا ہے وہ بندگی میں بھی اپنی نجات
محدود خیال کس قدر ہے انسان

ہر رنج مسرت کی خبر لاتا ہے
ہر شعلۂ برق پھول برساتا ہے
آتا ہے محبت میں اک ایسا بھی مقام
ہر چیز کا امتیاز اٹھ جاتا ہے

تلافی

سحر فتحپوری

نئی راہوں پہ مجھے دیکھ کے سرگرمِ سفر
بارہا تو نے تصور میں صدائیں دی ہیں

تیری پائندہ و بیدار تمناؤں نے
اکثر احساس کے شعلوں کو ہوائیں دی ہیں

مجھ سے بیزار ہوئے گرچہ زمانہ گذرا
تیری آگاہی سے یہ بات نہاں ہے ابتک

میں کہ خود اپنے ہی کردار پہ شرمندہ ہوں
اور تو ہے کہ محبت میں تپاں ہے ابتک

تجھ کو اس تلخ حقیقت سے اذیت ہوگی
پھر بھی اس کا کبھی اظہار تو ہوگا آخر

زندگی خواب فقط خواب دلآویز نہیں
تیرا احساس بھی بیدار تو ہوگا آخر

میں نے برسوں تری زلفوں کے گھنے سائے میں
غم و آلام کے پرچم کو نگوں دیکھا ہے

اُن دہکتے جذبات کے گلشن وہ امنگوں کے چمن
تیرے رخسار کے پھولوں کا فسوں دیکھا ہے

لیکن آسودگیٔ شوق کا غم کیا کیجے!
تو مجھے جیت کے مدہوش بنا ہی نہ سکی

مدتوں یاس نے کھینچا مری رگ رگ سے لہو
تیری اُمید امیدوں کو جگا ہی نہ سکی

آخر اس مردہ مزاجی کی تلافی کے لئے
مجھ کو عنوانِ کہانی کا بدلنا ہی پڑا!

آرزوؤں کی نئی شمعیں فروزاں کر کے
تیرہ و تار خلاؤں سے نکلنا ہی پڑا

جی لرزتا ہے یہ کہتے ہوئے تجھ سے لیکن
آج کر لی ہے یہ کہنے کی جسارت میں نے

میری ہمدم! میرے ایامِ گذشتہ کی بہار
اب کسی اور سے کر لی ہے محبت میں نے

دل کے پیمانے میں تجھ بن بھی چھلک جاتی ہے
آج ماضی کے عزائم پہ ہنسی آتی ہے

جنونِ عمل

شہ زور کاشمیری

عقل خریدارِ عیش اور جنوں غم فروش
اُس کو تلاشِ سکوں اور یہ محشر بدوش

تو ہے اسیرِ خرد میں ہوں خرابِ خروش
تو بھی نہیں سخت کوش میں بھی نہیں سخت کوش

عقل بنی دو رہی شعلہ فزا نا رہی
پھر بھی جنوں کو کبھی کر نہ سکی وہ خموش

صرف جنونِ عمل کا ہے نتیجہ جلال
اور شکستِ جلال ہے ثمرِ ناو نوش

ہائے وہ بزمِ شباب حاملِ صد انقلاب
غلغلۂ اضطراب جس میں ہوئی تنظیم کوش

اظہار ملیح آبادی

میر ببر علی انیس

اردو زبان کی تاریخ میں میر ببر علی انیس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انیس میر مستحسن کے فرزند اور میر حسن کے پوتے تھے۔ شاعری کا ذوق ورثے میں پایا تھا۔ ابتدا میں طبیعت غزل کی طرف مائل ہوئی لیکن اپنے والد کے کہنے سے غزل کا میدان چھوڑ کر مرثیے لکھنا شروع کر دیئے، اور اس صنف میں وہ کمال حاصل کیا کہ آج تک اردو زبان دوسرا انیس نہ پیدا کر سکی انیس نے جس چیز پر بھی قلم اٹھایا ہے اُسے اوجِ ثریا پہنچا دیا ہے انیس کا کلام پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا مطالعہ کتنا وسیع اور عمیق تھا انسانی جذبات و کردار کی عکاسی اس طرح کی ہے گویا انسان کو انیس ہی نے تخلیق کیا تھا اور کربلا کی جلتی ہوئی ریگزار میں شاعری کے اتنے میٹھے چشمے بہائے ہیں کہ محبانِ حسین کی روح اُن سے ہمیشہ سیراب ہوتی رہے گی۔ اگرچہ انیس نے تمام تر اسلامی نقطۂ نظر اور خاص کر واقعۂ کربلا کے متعلق لکھا ہے لیکن اس نے اس محدود دائرے کے اندر اتنی بلند عمارتیں تعمیر کی ہیں کہ جن کی وسعتیں تمام دنیا کا احاطہ کئے ہوئے ہیں کیونکہ یہ حق و باطل کا معرکہ ہے، یہ خیر و شر کی جنگ ہے، یہ زشت و خوب کی کشمکش ہے۔ یہ نیکی اور بدی کا تصادم ہے۔ یہ حسین اور یزید کی لڑائی ہے۔ نیکی کو ہر انسان پسند کرتا ہے چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اور نیکی کو پسند کرنے والا یقیناً حسین سے محبت کرے گا کیونکہ حسین سراپا خیر تھے حسین سراپا حق تھے۔ حسین سراپا نیکی تھے۔ حسین نہ صرف انیس کے ہیں، اور نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ وہ ان تمام انسانوں کے لئے مشعلِ ہدایت ہیں جو ہمیشہ حق پر ثابت قدم رہتے ہیں اور طاغوتی قوتوں سے خوف نہیں کھاتے یہاں تک کہ ان سے لڑتے لڑتے جام شہادت پی لیتے ہیں۔ حق و باطل کی اس تاریخی جنگ کو انیس نے جس حسن و خوبی سے نظم کیا ہے اس کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اگرچہ انیس نے اپنے مرثیوں میں تاریخ کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہے لیکن نفسِ مضمون کو ہر جگہ برقرار رکھا ہے اور اس ایک مضمون کو انیس نے جس طرح چاہا نظم کیا اور سننے والوں کو ہر دفعہ نیا پن محسوس ہوا۔ انیس کے وہاں تاثر کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ خود ایک بڑے مذہبی قسم کے انسان تھے اور حبِ اہل بیت کو ذریعۂ نجات سمجھتے تھے اس لئے وہ جو شعر کہتے تھے اس میں ان کے دل کا درد کھنچ آتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور لکھوں مختصراً یہ بھی لکھ دوں کہ انیس سنہ ۱۲۱۶ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے اور تقریباً ۷۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ لکھنؤ میں پرورش پائی اور اپنے والد سے اصلاحِ سخن لیتے رہے۔ انیس کے خاندان میں کئی پشتوں سے شاعری چلی آ رہی تھی جس کے متعلق وہ خود کہہ گئے ہیں

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک دن انیس سر جھکائے کچھ سوچ رہے تھے بڑی دیر ہو گئی یہ حال دیکھ کر ان کی بیوی نے پوچھا "خیر تو ہے" انیس نے چونک کر کہا "ہاں خیر تو ہے لیکن ایک بیت کا مصرعہ ثانی نہیں ہوتا وہی بڑی دیر سے سوچ رہا ہوں" بیوی نے کہا "ذرا مجھے سنائیے وہ کون سا مصرعہ ہے" انیس نے پڑھا "بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے" انیس کی بیوی یہ مصرع سُن کر کچھ دیر خاموش رہیں پھر بولیں "مناسب ہو تو یہ مصرع لکھ لیجئے"

بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

انیس یہ مصرع سُن کر خوشی میں اچھل پڑے اور اس مصرع سے بیت مکمل کر لی غرض کہ جو شخص خود شاعرانہ فطرت لے کر پیدا ہوا ہو اور اس کی شاعرانہ ماحول میں پرورش ہوئی ہو پھر ظاہر ہے وہ کیا کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اب آئیے انیس کے کلام کی چند خصوصیات پیش کی جائیں

دنیا کی بے ثباتی ملاحظہ کیجئے ۔

امید نہیں جینے کی یاں صبح سے تا شام ہستی کو یہ سمجھو کہ ہے خورشید لب بام
یاں کام کرو ایسا کہ آئے وہاں کچھ کام آپہنچے خدا جانئے کب موت کا پیغام

اپنی نہ کوئی ملک نہ املاک سمجھنا
ہونا ہے تمہیں خاک یہ سب خاک سمجھنا

بھائی نہ تو کام آئے گا اس وقت نہ فرزند عرصہ نہیں کھل جائے گا جب آنکھ ہوئی بند
وہ کام کرو جس سے خدا ہووے رضا مند ہشیار کہ ہونا ہے تمہیں خاک کا پیوند

پیری کی بھی مدت ہے جوانی کی بھی حد ہے
آرام گہ شاہ و گدا کنج لحد ہے

دنیا کی بے ثباتی کے بعد اب انیس کے ہمراہ ذرا کربلا کی شدید گرمی کا اندازہ کیجئے ۔

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ گرمیٔ روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

کربلا کی اس شدید گرمی میں فوج یزید کی طیاری دیکھئے ۔

اُمڈی ہوئی تھی فوج یہ فوج اور دل پہ دل تھے برچھیوں کے صورت مقراض پھل پہ پھل
خنجر وہ جن کی آب میں تھی تلخیٔ اجل وہ گرز جن کے ڈر سے گرے پڑتے منہ کے بل

وہ وہ تبر تھے پاس ہر اک خود پسند کے
حلقوں پہ تھے بچھے ہوئے حلقے کمند کے

یہ تو یزیدی فوج کا عالم تھا ادھر صرف ۷۲ آدمی تین دن کے بھوکے پیاسے میدان جنگ میں جام شہادت پی رہے ہیں اور جب رفقا قتل ہو جاتے ہیں تو حسین خود گھوڑے پر چڑھ کر میدان جنگ کا رخ کرتے ہیں اور کفار کے سامنے وعظ فرماتے ہیں لیکن آپ کا وعظ کوئی نہیں سنتا اور چاروں طرف سے تیروں کی بارش شروع ہو جاتی ہے حسین مجبور ہو کر نیام سے تلوار کھینچ لیتے ہیں وہ تلوار جس نے بدر و حنین کے معرکے سر کئے تھے اور آج پھر دین حق کو زندہ رکھنے کے لئے نیام سے باہر آئی تھی وہ تلوار کیسی تھی یہ انیس کی زبان سے سنئے ۔

چمکی گری اٹھی ادھر آئی ادھر گئی خالی کئے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی

اک شور تھا یہ کیا ہے جو قہر صمد نہیں
ایسا تو رود نیل میں بھی جزر و مد نہیں

حسین کا گھوڑا بھی انتہائی چست و چالاک اور وفادار تھا اگر تلوار سے ایک سر اڑتا تو گھوڑا کئی دشمنوں کو روندتا ہوا بجلی کی طرح صفوں سے نکل جاتا ۔

سمٹا، جما، اڑا، ادھر آیا ادھر گیا چمکا، پھرا، جمال دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اڑ کے برچھیوں سے بے خطر گیا برہم کیا صفوں کو پرے سے گزر گیا

گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

غرض کہ حسین کفار کے انبوہ عظیم کو قتل کرتے ہوئے نہر فرات کے پاس پہنچ گئے تین دن کے پیاسے تھے اس لئے پانی کو دیکھ کر روح بے چین ہو گئی لیکن اپنے عزیزوں اور جگر پاروں کی لاشیں دیکھ کر پانی سے منہ موڑ لیا اور گھوڑے کی لگام ڈھیلی کر دی کہ وہ بھی تین دن کا پیاسا ہے لیکن حسین کے گھوڑے نے پانی نہیں پیا وہ کیسے پیتا جب اس کا آقا پیاسا تھا ۔ کفار نے حسین کو خاموش پا کر پھر چاروں طرف سے تیروں کی بارش کر دی اور نیزے اور تلواریں لے کر ٹوٹ پڑے ۔ حسین زخمی ہو کر گھوڑے سے گرے اور خدا کی بارگاہ میں آخری سجدہ ادا کرنے لگے اور اسی اثنا میں شمر نے سینے پر چڑھ کر تن اطہر سے سر مقدس کو جدا کر دیا کفار میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے ۔ انیس چلا اٹھا ۔

شبیر کا سر نیزۂ خونی کی انی پر
تف دہر پر اور خاک ہے دنیائے دنی پر

نئی کتابیں

۱۹۴۹ بہترین ادب

ناشر مکتبۂ اردو لاہور۔ قیمت چھ روپے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ تقطیع ۲۲×۳۶/۱۶ ضخامت ۴۰۵ جلد گوارا، جلد پوش دیدہ زیب۔

ادارۂ ادبِ لطیف (چودھری برکت علی اور مرزا ادیب) نے یہ انتخاب مرتب کیا ہے۔ ۱۹۴۹ کا انتخاب بہترین ادب کے سلسلے کی تیسری کڑی ہے۔ ہندوستان و پاکستان کے بہت سے نئے اور پرانے لکھنے والوں کے شاہکار اس مجموعے میں ملیں گے۔ مقالے، نظمیں، افسانے، ڈرامے، غزلیں، طنز و مزاح، گیت، قطعات اور طویل نظم کے الگ الگ باب ہیں۔ انتخاب میں نہایت اچھے سلیقے سے کام لیا گیا ہے۔ یوں تو ہر انتخاب کے باب میں مختلف آرا ہو سکتی ہیں، اور کوئی انتخاب ہمہ گیر مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا، پھر بھی زیرِ تبصرہ کتاب میں اس کوشش صادق کے پختہ آثار ملتے ہیں کہ ہر ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے۔ اردو میں ایسے انتخابات کا شائع ہونا نہایت ضروری ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ ادارۂ ادبِ لطیف اس طرف تیزی سے گامزن ہے۔ انتخاب میں افادیت اور معیارِ ادب دونوں باتیں پیشِ نظر رکھی گئی ہیں۔ ہم ہر اردو جاننے والے سے اس کتاب کے مطالعے کی سفارش کریں گے۔

پرچھائیں

مصنف سید آصف علی گورنر اڑیسہ۔ ناشر۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ۔ طباعت، بہترین۔ تقطیع ۲۲×۳۶/۱۶ صفحات ۹۲۔ کتاب مجلد ہے اور ٹائپ میں چھپی ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔

مصنف نے نثر میں شاعری کی ہے۔ اندازِ بیان میں انفرادیت ہے۔ یہ فلسفیانہ افسانہ قلعۂ احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں تصنیف ہوا۔ حرفِ اوّل میں ہمزاد کے عنوان سے فاضل مصنف خود ہی فرماتے ہیں: "حقیقت اپنی پرچھائیں کی اور سایہ اپنی حقیقت کی کھوج میں ہے۔ غرض جو ہر اور جوہر عرض کے دام میں فاختائے آگہی کی طرح پر مارتا اور پھڑپھڑاتا ہے۔ اسی کا نام پرچھائیں ہے۔ یہی 'میں' کا ہمزاد ہے۔ یہی 'مایا' ہے۔ جسے قوتِ تخلیق کا سایہ کہئے۔"

آجکل، دہلی

رعنائیاں

مصنف۔ برج لال رعنا۔ ناشر۔ مکتبۂ شانِ ہند۔ دہلی۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۰۸، کتابت و طباعت اوسط۔ جلد اور جلد پوش اوسط۔

قبلہ نیاز فتحپوری صاحب نے پیش لفظ لکھا ہے۔ علامہ کیفی نے دیباچہ اور جناب محروم نے تعارف، شاعرِ انقلاب جناب جوش ملیح آبادی کی رائے بھی کتاب میں شامل ہے۔ منظر لکھنوی اور طالب چکوالی نے بھی آپ کے کلام کو سراہا ہے۔

رعنا صاحب جواں سال اور جواں فکر شاعر ہیں۔ آپ کی طبیعت رسا اور مزاج سہے۔ رباعی جیسی مشکل صنفِ سخن میں بھی آپ نے خوش کلامی کا ثبوت دیا ہے۔ نیاز صاحب کے لفظوں میں "جب وہ بسنت کا ذکر کرتے ہیں تو رنگِ گلال میں ڈوب کر اور جب جنگ کا ذکر کرتے ہیں تو خون میں نہا کر۔ دونوں وقت ان کی ہستیاں الگ الگ ہوتی ہیں، اور کسی شاعر کا اظہارِ بیان سے اپنے آپ کو اس طرح مختلف ہستیوں میں تقسیم کر لینا معمولی بات نہیں۔"

سِکھ

(ناول) مصنف مائل ملیح آبادی۔ ناشر، نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۰۱، کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش اوسط

فسادات نے جس بربریت اور وحشت کے آثار ہماری زندگی پر چھوڑے ہیں، انھیں مٹانے کی کوشش میں مائل صاحب نے ایک جانباز، محبِ وطن سکھ کے کردار کو اس ناول میں اجاگر کیا ہے۔ ناول کا ہیرو مہتاب سنگھ ایک مسلمان لڑکی کو بہن بنا کر اس کی حفاظت کرتا ہے، اور دعالم کو اس بات کا درس دیتا ہے کہ بے گناہوں اور یتیموں کو بچانا ہر انسان کا فرض ہے۔ مقصدی ادب میں تخلیقی قوتیں دب کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ناول دلچسپ ہے۔ پلاٹ میں کہیں کہیں کمزوری ہے۔ قیمت قدرے زیادہ ہے۔

رفتارِ زمانہ

دُنیا میں امن کے قیام کے لئے جو مخلصانہ جدوجہد بھارت کر رہا ہے اُس کا نمایاں ثبوت متحدہ اقوام کی اسمبلی میں شری نرسنگھ راؤ کی انتھک کوششیں ہیں۔ تیرہ ممالک کے نمائندوں نے چین سے جنگ بند کرنے کی جو اپیل کی ہے اور اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی ہے اُس کا سہرا شری راؤ ہی کے سر ہے۔ اُنہوں نے اس سلسلے میں لیک سکیس میں متعدد بار چینی ڈیلیگیشن سے بات چیت بھی کی ہے۔ اب کوریا میں جنگ بند کرانے کے لئے تین نمائندوں کی جو کمیٹی بنائی گئی ہے اُس میں مسٹر نصراللہ انتظام (ایران) مسٹر لسٹر پیرسن (کینیڈا) کے علاوہ تیسرے نمائندے بھارت کے ڈیلیگیٹ شری راؤ ہیں اور فی الواقع تمام دُنیا کی نگاہیں اس وقت بھارت کے نمائندے پر مرکوز ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اگر دونوں گروپوں نے ہٹ دھرمی سے کام نہ لیا۔ تو شری راؤ کی کوششوں کے کامیاب ہونے کی پوری توقع ہے۔ دنیا اس وقت تیسری جنگ کے کنارے پر کھڑی ہے۔ اگر اس نازک سمے میں یہ مصیبت ٹل گئی تو دُنیا کی تمام قومیں اس کا کریڈٹ بھارت کو دیں گی اور وہ ہمیشہ کے لئے اُس کی مرہونِ منت رہیں گی۔

بھارت کی خارجہ پالیسی

بھارت پارلیمنٹ میں حکومت کی خارجہ پالیسی پر اعتماد کا ریزولیوشن پاس کر دیا گیا۔ اس موقعے پر تقریباً تمام ممبروں نے شری جواہرلال نہرو کی امن پسندانہ پالیسی کی تعریف کی اور اس امر کا اظہار کیا کہ بھارت نے بین الاقوامی معاملات میں غیر جانب دار رہ کر اور جنگ کو روکنے کے لئے اپنے تمام وسائل استعمال کر کے دنیا بھر میں اپنے وقار کو اونچا کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ متحدہ اقوام کی اسمبلی میں اس وقت ہندوستان کو ایک ممتاز پوزیشن حاصل ہے اور جس وقت بھی اسمبلی میں کوئی اہم تجویز پیش ہوتی ہے۔ اُس وقت تمام ممالک کے نمائندوں کی نگاہیں بھارت ہی کی طرف اُٹھتی ہیں اور تمام دیشوں کے نمائندے یہ محسوس کرتے ہیں کہ آج کل کے نازک ترین حالات میں اگر کوئی طاقت دُنیا کے دو بڑے گروہوں کو صلح کی طرف راغب کر سکتی ہے تو وہ ہندوستان ہی ہے۔

بھارت اور پاکستان

ہند اور پاکستان دونوں کے صلح پسند لوگوں نے قدرتی طور پر اس امر پر اظہارِ افسوس کیا کہ جنگ نہ کرنے کے متعلق شری نہرو اور مسٹر لیاقت علی خاں کی خط و کتابت کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ لیکن اس خط و کتابت سے ایک بات تو صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں لیڈروں میں سے کوئی بھی جنگ نہیں چاہتا۔ چنانچہ مسٹر لیاقت علی خاں نے اپنے خط میں صاف لکھا ہے کہ "بھارت اور پاکستان کی جنگ ہر دو ممالک کے لئے مہلک ثابت ہوگی اس لئے میں یقین دلاتا ہوں کہ میں امن کے لئے کوشش کرتا رہوں گا۔" شری نہرو نے خان لیاقت علی خان کے اس بیان کا سواگت کیا ہے اور کہا ہے کہ امن قائم رکھنے کے لئے بھارت ہر ممکن کوشش کر رہا ہے اور میں یہ یقین دلاتا ہوں کہ ہم اپنے پڑوسی کے ساتھ دوستی کا رشتہ مضبوط کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ پارلیمنٹ میں بیان جاری رکھتے ہوئے پردھان منتری نے پاکستان جانے کے متعلق مسٹر لیاقت علی خاں کی دعوت کو بھی منظور کر لیا اور کہا کہ فرصت پاتے ہی اس دعوت نامے کے جواب میں پاکستان جاؤں گا۔ دونوں ممالک کے وزرائے اعظم کے یہ بیانات صلح پسند لوگوں کے لئے باعثِ اطمینان ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ نہرو لیاقت خط و کتابت کا کوئی ٹھوس نتیجہ نہ نکلنے پر بھی اس ضمن میں شری نہرو کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔

کشمیر کا مسئلہ

پارلیمنٹ کے اجلاس میں کشمیر کے سلسلے میں بھارت کے زاویۂ نگاہ کی وضاحت کرتے ہوئے پردھان منتری نے بتایا کہ ہم نے کشمیر میں اپنی افواج اُس وقت بھجوائیں جب کہ ریاست کی حکومت نے ہندوستان میں شامل ہونا منظور کر لیا تھا اور اُسے اس کے متعلق ریاست کی سب سے بڑی اور ہر دلعزیز پارٹی کی حمایت حاصل ہو چکی تھی اور پاکستان نے اپنی فوجیں بغیر کسی وجہ کے اُس وقت روانہ کیں۔ جب کہ کشمیر بھارت کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ شری نہرو نے کہا کہ کشمیر کے جھگڑے

کے متعلق ہم متحدہ اقوام کی اسمبلی اور ریاست کے لوگوں کو جو یقین دلا چکے ہیں۔ اُس میں پوری طرح کاربند رہیں گے۔

مُسلمانوں سے سلوک

ہند کے مشہور مسلمان لیڈر خواجہ حسن نظامی نے کراچی میں ایک بیان دیتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار کیا کہ بھارت میں مسلمان پورے امن و سکون کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ آپ نے کہا "میرے بہت سے مُرید یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہندستان میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے۔ اُن سب کے لئے میرا جواب یہ ہے کہ بھارت کے سب مسلمانوں کی ہند سرکار نہ صرف اچھی طرح نگہداشت کر رہی ہے بلکہ اُن کے ساتھ فیاضانہ سلوک روا رکھا جا رہا ہے" خواجہ صاحب نے دہلی کے ایک مقبرے خواجہ قطب صاحب کی مثال دی جس کی مرمّت پر بھارت کے وزیر اعظم نے پینتیس ہزار روپیہ خرچ کیا ہے۔ یہ تو صرف ایک مثال ہے۔ اصلیت تو یہ ہے کہ بھارت سرکار اور عوام دونوں مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔

ہماری مالی حالت

کلکتے میں ایسوسی ایٹڈ چیمبر آف کامرس کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے بھارت کے وزیر مالیات شری چنتامن دیشمکھ نے کہا کہ ہندستان کی موجودہ اقتصادی پوزیشن تسلّی بخش ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ بین الاقوامی پیچیدگیوں اور دُنیا کے ہرلحے بدلتے ہوئے حالات کو دیکھتے ہوئے حکومت اور عوام کے مابین زیادہ سے زیادہ تعاون کی سپرٹ پیدا کریں اور دیش کی مالی حالت کو مضبوط تر بنانے کے لئے پوری کوشش کریں۔

ریڈیو ٹیلیگرافی

بھارت پارلیمنٹ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے محکمہ رسل و رسائل کے نائب وزیر شری خورشید لال نے بتایا کہ حکومت تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور ماسکو سے ریڈیو کے ذریعے سیدھا تعلق قائم کرنے کے سوال پر غور کر رہی ہے۔ اس وقت ہندستان کا برطانیہ، آسٹریلیا، امریکہ، چین، افغانستان اور جاپان کے ساتھ ریڈیو ٹیلیگرافی کے ذریعے براہ راست تعلق ہے۔

جبرالٹر اور سپین

سپین میں "جبرالٹر سپین کے لئے" کی ایجی ٹیشن زور پکڑتی جا رہی ہے چنانچہ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق طالب علموں کے ایک کثیر مجمع نے برطانوی سفارت خانے کے باہر اس سلسلے میں ایک عظیم مظاہرہ کیا اور "جبرالٹر خالی کرو" کے نعرے لگائے لیکن پولیس نے انہیں سفارت خانے سے ایک سو میل پرے دھکیل دیا۔ سپین کے ڈکٹیٹر جنرل فرانکو نے ایک اخباری نمائندے کو بیان دیتے ہوئے جبرالٹر کے باب میں سپین کے ساتھ انصاف کئے جانے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اب اس مسئلے کو مزید التوا میں نہیں ڈالا جانا چاہیئے۔

جرمنی کا مستقبل

پچھلے دنوں روس نے تجویز پیش کی تھی کہ جرمنی کے مسئلے کا حل نکالنے کے لئے چار بڑی طاقتوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس سلسلے میں خبر موصول ہوئی ہے کہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے اس کانفرنس میں شامل ہونے کے لئے آمادگی کا اظہار کر دیا ہے لیکن اُن کی تجویز یہ ہے کہ کانفرنس کے لئے ایجنڈا پہلے سے طے کر لیا جائے۔

پٹھانستان کا مسئلہ

افغانستان اور پاکستان کے تعلقات میں ابھی تک کوئی بہتری کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ آئے دن دونوں ممالک کے اخبار اور ریڈیو ایک دوسرے کے خلاف سخت ترین الفاظ میں پراپیگنڈا کرتے رہتے ہیں۔ اُدھر قبائلی علاقوں میں پختونستان اور پاکستان کی فوجوں میں بھی آئے دن جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اطلاع موصول ہوئی ہے کہ کوٹیوالہ چھاؤنی میں پاکستانی دستوں اور قبائلیوں میں جم کر لڑائی ہوئی جن میں کافی اشخاص ہلاک اور زخمی ہوئے۔ امریکہ نے دونوں ممالک کے معاملات کو سلجھانے کے لئے ایک گول میز کانفرنس کی تجویز کی ہے لیکن حکومت پاکستان نے ابھی تک اس تجویز کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خان نے ایک انٹرویو میں بتایا۔ کہ دیگر تمام معاملات میں تو پاکستان افغانستان کے ساتھ بات چیت کے لئے تیار ہے لیکن سرحدوں کے متعلق کسی قسم کی گفت و شنید نہیں کرنا چاہتا۔

آزاد بھارت کی پہلی مردم شماری

۲۸ نومبر ۱۹۵۰ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے آزاد بھارت کی پہلی مردم شماری کے بارے میں تقریر کرتے ہوئے صوبہ دہلی کے چیف کمشنر شری شنکر پرشاد نے اس مردم شماری کی امتیازی باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اب تک جو مردم شماری ہوئی تھی اس میں ذات پات کے معاملوں پر زیادہ زور دیا جاتا تھا اور خاص تقسیم بھی کی جاتی تھی۔ لیکن اب خاص

تقسیم اقتصادی ڈھنگ کی ہوگی۔ مثلاً یہ معلوم کرلیا جائے گا کہ ایسے آدمیوں کی تعداد کتنی ہے جو دوسروں کو ملازم رکھتے ہیں۔ اُن میں کارخانوں فیکٹریوں یا بڑی کانوں کے مالک شامل ہیں۔ اسی طرح یہ معلوم کرلیا جائے گا کہ دوسروں کے یہاں کتنے ملازم ہیں جیسے کارخانوں یا سرکاری محکموں میں تنخواہ پر کام کرنے والے ملازم۔

آپ نے مزید کہا کہ آزاد بھارت کی پہلی مردم شماری کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ حکومت کی خوراک تعلیم اور سماجی حالت کی ترقی کے بارے میں جو تجاویز حکومت کے زیر غور ہیں وہ آبادی کا صحیح علم ہونے کے بعد ہی عمل میں آ سکتی ہیں۔ اس لئے جنتا کو یہ احساس ہونا چاہیئے کہ مردم شماری کا کام ملک کا ایک بہت بڑا کام ہے۔ اور اگر کسی شخص نے غلط اندراج کرایا تو وہ نہ صرف مردم شماری کرنے والے کو دھوکا دے گا بلکہ اپنے ملک کو بھی نقصان پہنچائے گا۔

بھارت کی زرعی ترقی

متحدہ اقوام کے ادارۂ خوراک وزراعت کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر نورس ڈاڈ نے ناگ پور کے ایک ہندی رسالہ "کرشک" کو اس کے خاص نمبر کے لئے ایک پیغام بھیجا ہے جس میں لکھا ہے کہ بھارت کی جدید زرعی ترقی کے لئے سائنس اور کسان کے مابین ایک مضبوط رشتہ قائم کرنا ازبس ضروری ہے۔ بھارت کے تجرباتی اسٹیشنوں میں جو کام کیا جا رہا ہے وہ نہ صرف بھارت بلکہ ایشیا کی جدید زرعی ترقی کی بنیاد ثابت ہوگا۔ اور اس طرح دنیا بھر کی جدید زراعت کی بنیاد بھی بنے گا۔ بھارت کا کسان اچھا کاشتکار ہے۔ اپنی دھرتی سے پریم کرتا ہے۔ اگر اسے ثابت کر دیا جائے کہ جدید زرعی طریقے قابل عمل اور فائدہ بخش ہیں تو وہ اُن کو اختیار کرے گا اور جب بھارت کا کسان اپنی پیداواری قابلیت کو پوری طرح نشوونما دے لیگا۔ تب ہم ایک ایسے نئے دور کو طلوع ہوتے دیکھ سکیں گے جس میں ہر ایک شخص کو اچھی اور پوری خوراک، اچھی پوشاک اور بہتر مکان میسر ہوں گے۔

ایگمارک گھی کے نئے لیبل

ایگمارک گھی کے نقلی اور جعلی لیبلوں کی روک تھام کرنے کے لئے بھارت سرکار نے نئے ایگمارک لیبل چھپوائے ہیں۔ ان پر زیتونی سبز رنگ کے پیش نظر "گورنمنٹ آف انڈیا" چھپا ہوا ہے۔ عام اور خاص درجے کے گھی کے لئے سبز اور سُرخ رنگ کے حلقے ان پر بنے ہوئے ہیں۔ یہ لیبل یکم نومبر ۱۹۵۰ء سے استعمال ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ اس تاریخ سے پہلے کے بھرے ہوئے گھی کے ڈبوں پر پُرانے لیبل لگے ہوں گے۔

کھانڈ کے کارخانوں کو رعایت

بھارت سرکار نے فیصلہ کیا ہے کہ گنے اور کھانڈ کے سابقہ نرخ بحال رکھے جائیں گے لیکن یو۔ پی اور پوربی پنجاب کے کارخانوں کو ۱۵ دسمبر ۱۹۵۰ء تک اُن کی ایک لاکھ ٹن تک پیداوار پر دو روپیہ چھ آنے فی من زائد قیمت دی جائے گی۔ بشرطیکہ متعلقہ کارخانے ۱۵ نومبر ۱۹۵۰ء سے پہلے ہی گنا بیلنے کا کام شروع کردیں۔ اور ۱۵ دسمبر ۱۹۵۰ء تک وہ پچھلے سال کے اس عرصہ کی پیداوار سے زائد کھانڈ پیدا کریں۔ یہ زاید قیمت مرکزی گورنمنٹ کارخانہ کو امداد کے طور پر ادا کرے گی اور گاہکوں کے لئے فی الحال کھانڈ کے نرخ بدستور جاری رہیں گے۔

ٹریکٹر چلانے والوں کی تربیت

پچھلے ہفتہ بھارت کے وزیر خوراک شری منشی نے بیان کیا۔ کہ مستقبل میں وسیع پیمانے پر مشینوں کے ذریعے کاشتکاری کا انحصار زیادہ تر مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن کی کامیابی پر ہے۔ زمینوں کی ازسرنو آبادکاری کی جس بہت بڑی سکیم پر وزارت زراعت عمل کر رہی ہے اس نے امریکنوں کو بھی حیرت زدہ کر دیا ہے۔ امریکہ کے ماہرین زراعت کا خیال ہے کہ زراعت کی تاریخ میں بھارت کے اس اقدام کی مثال نہیں ملتی ہے۔ بھارت کی مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن نے چھ سے سات سال کے عرصہ میں تیس لاکھ ایکڑ گھاس پات سے اٹی ہوئی زمینوں کو ازسرنو جوتنے کی سکیم پر عمل شروع کر رکھا ہے۔ ایک سال میں ۳۰۷۵ ٹریکٹروں کے پورے دستے کو کام پر لگا کر پانچ لاکھ ایکڑ اراضی کو پھر سے زیر کاشت لایا جائے گا۔ یعنی نو من فی ایکڑ فی سال زائد اناج پیدا کیا جائیگا اس وقت تک ہمیں۔ ۴۴ نئے ٹریکٹر موصول ہو چکے ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ پندرہ ٹریکٹروں کے ایک دستے سے یکم جنوری سے ۳۱ مئی تک کے عرصہ میں بیس ہزار ایکڑ اراضی کو قابل کاشت بنایا جائے گا۔ اس وقت ساٹھ ٹریکٹر چلانے والوں کو مزید تربیت دینے کا انتظام کیا گیا ہے ان میں سے چار بھوپال سے آئے ہیں اور باقی چھپن مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن سے تعلق رکھتے ہیں۔


"میں اپنا کھانا ڈالڈا
میں ہی پکانے پر اصرار کرتا ہوں۔
یہ میری روزانہ قوت کو بحال کرنے
میں مدد دیتا ہے"
DALDA

Regd. No. D.—21

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.



آج کل

مارچ سنہ ۱۹۵۱ء

آٹھ آنے


"میں لکس ٹائلٹ صابن
سے اپنی جلد کی حفاظت کرتی ہوں"
پشپا ھنس کہتی ہے
LUX
LUX TOILET SOAP
یہ سفید اور خالص صابن،
جس کی خوشبو دلکش ہے،
آپ کی جلد کو بھی دلکش
بنا رکھے گا۔
فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن
LTS 277-178 UD


HIMALAY.
BOUQUE
SNOW
HIMALAY
BOUQUE
SNOW


"میں اپنا کھانا ڈالڈا
میں ہی پکانے پر اصرار کرتا ہوں۔
یہ میری روزانہ قوت کو بحال کرنے
میں مدد دیتا ہے"
DALDA

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹرز:- عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۹ ———— نمبر ۸

سالانہ چندہ ———— چھ روپے

فی پرچہ ———— آٹھ آنے

غیر ممالک سے ———— نو شلنگ

مارچ سنہ ۱۹۵۱ء

ترتیب

بچّوں کا آج کل

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

جمیل مظہری

شکریہ

بہشتِ رنگ و بُو کو دل میں مہماں کر دیا تم نے
غمِ امروز کو خوابِ پریشاں کر دیا تم نے

جہانِ کیف و کم کے مرحلوں میں اِک تبسّم سے
خرد کو بے نیازِ سُود و نقصاں کر دیا تم نے

یہی دِل ہے کہ آہوں کے بگولے جس میں اُٹھتے تھے
یہی دِل ہے کہ اُس کو شہرِ ارماں کر دیا تم نے

تخیّل تھا مرا بھیگا ہُوا سہما ہُوا طائر
بیک لُطفِ نظر اُس کو پر افشاں کر دیا تم نے

کنارِ آرزو میں پھُول برسا کر تبسّم کے
مرے ذوقِ سخن کو گُل بداماں کر دیا تم نے

ادب کے لالہ زاروں میں مری شہرت کے جھونکوں کو
ہوادارِ شمیمِ زلفِ پیچاں کر دیا تم نے

نشیلی مدبھری آنکھوں کی وہ چھلکی ہُوئی بُوندیں
مزاجِ آب و گِل میں جن سے طُوفاں کر دیا تم نے

ٹپکتی ہیں قلم سے قطرہ ہائے خُونِ دل بن کر
یہ وہ موتی ہیں جن کو لعل و مرجاں کر دیا تم نے

مری چنگاریوں کو اپنے آنچل کی ہوا دے کر
حریفِ شعلۂ رُخسارِ تاباں کر دیا تم نے

مرے داغوں نے تم سے روشنی کی بھیک مانگی تھی
اُنہیں آخر چراغِ بزمِ امکاں کر دیا تم نے

جوانی کی ہوس کو بیکلی بخشی محبت کی
محبّت کو ترقّی دے کے ایماں کر دیا تم نے

ادا ہو شکریہ کیا اُس نظر کی دل نوازی کا
کہ جس کو مظہری کے دل میں پیکاں کر دیا تم نے

مگر تم سے ہمارے قافلے والوں کو شکوہ ہے
جرس کو اُن کے اک سازِ شبستاں کر دیا تم نے

ربابِ دل میں میرے فاقہ کش دُنیا کے نالے تھے
اسے اپنی محبت میں غزل خواں کر دیا تم نے

عبدالماجد دریابادی

ہندو شاعروں کی کہانی
مسلمان تذکرہ نویسوں کی زبانی

"صاحبِ تصانیفِ بسیار دماغ تفصیل ندارم۔ برہمن رنگین بہار سخن از لفظ لفظش ہزار ہزار رنگ معنی گل می کند۔ با فقیر ہم آشناست"
(صفحہ ۱۲۱)

"بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں تفصیل خیال میں نہیں۔ برہمن رنگین ہیں۔ اُن کے لفظ لفظ سے بہار سخن ہزار ہزار رنگ کے معنی پیدا ہے۔ اس فقیر کے بھی دوست ہیں"

یہ کون کس کے حق میں کہہ رہا ہے؟ کہنے والے اردو کے قدیم اور نامور شاعر میر تقی میر ہیں، اپنی نازک مزاجی کے لئے بدنامی کی حد تک مشہور۔ داد کے یہ الفاظ اُن کے قلم سے نکل رہے ہیں، ایک معاصر ہندو شاعر لالہ ٹیک چند بہار (صاحبِ بہارِ عجم) کے حق میں! ——— کہتے ہیں کہ میر صاحب تو کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور داد دینے میں بخیل تھے۔ پھر یہ کیا کہ ایک ہندو معاصر کے حق میں اس فراخ دلی سے کام لے رہے ہیں!

خیال نہ گزرے کہ یہ لب و لہجہ بطور ایک استثنائی واقعہ کے ذاتی دوستی اور مروت کا کرشمہ تھا۔ اپنے تذکرہ نکات الشعراء کے شروع ہی میں امیر خسرو۔ مرزا بیدل۔ مرزا جان جاناں۔ سراج الدین خاں آرزو جیسے جید مسلم اُستادوں کے بعد ہی اردو شاعروں میں نام رائے آنند رام مخلص کا بھی لا چکے ہیں۔ (صفحہ ۸) ——— میر تقی کا یہ تذکرہ کہا جاتا ہے کہ اُردو شاعروں کا قدیم ترین تذکرہ ہے۔ آج سے کوئی دو سو سال قبل کا لکھا ہوا۔ اُس وقت نہ ہندوؤں کو اُردو شاعری کے اختیار کرنے میں کوئی شرم تھی اور نہ مسلمانوں کو اُن کی داد دینے میں کوئی بخل۔ اردو تنہا مسلمانوں کی ملک نہ تھی۔ ہندو مسلمان دونوں کی مشترک زبان تھی، اور دونوں اس کے استعمال کے یکساں حقدار۔

اور بندرابن راقم کا حال لکھنے پر جب آئے ہیں تو ڈھائی صفحے سے زائد میں اُن کا کلام ہی نقل کرتے چلے گئے ہیں۔ (صفحہ ۱۵۴ تا صفحہ ۱۵۶) اور عشاق کھتری سے گو خوش نہیں تاہم تذکرہ سے انہیں بھی محروم کرنا نہیں چاہا۔ (صفحہ ۱۵۹) ——— زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں کی مغلوبیت کا نہیں اُنکی قوم اور اُن کی تہذیب کے غلبہ کا ہے۔ اُن کی حکومت قائم ہے۔ اُن کے تمدن کا سکہ چل رہا ہے۔ اس پر بھی مسلمان تذکرہ نویس ہندوؤں کے وجود کو بھولے ہوئے اور بھلائے ہوئے نہیں۔

صاحب سحر البیان (بدر منیر) میر غلام حسن حسن کے نام سے کون ناواقف ہے۔ اُن کے تذکرہ شعرائے اردو کا زمانۂ تالیف ۱۱۹۶ھ ہے یعنی کچھ سے پونے دو سو سال قبل، اور زبانِ تصنیف اب تک فارسی ہی ہے۔ ایک ہندو شاعر رائے پریم ناتھ کا ذکر کس پریم کے ساتھ ایک اپنے سے بھی قدیم تر مسلمان شاعر و تذکرہ نویس قائم کے حوالے سے کرتے ہیں۔

"رائے پریم ناتھ خلف رائے کشن ناتھ از قوم کھتری ست۔ قائم در تذکرہ خود نوشتہ کہ ظاہر حالش چوں طبع خویش موزوں و موزونیِ طبعش از خوبیِ ظاہر افزوں۔ خطاط بے نظیر و کمانڈ دلپذیر۔ غزل فارسی بسیار بہ خوبی مے گوید۔ گاہ گاہ فکر ریختہ ہم می کند"

"رائے پریم ناتھ فرزند رائے کشن ناتھ قوم کے کھتری ہیں۔ قائم نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اُن کی صورت ان کی طبیعت ہی کی طرح سجیلی ہے اور اُن کی موزونی طبع اُن کی صورت سے بڑھ چڑھ کر۔ خوش خطی میں بے نظیر اور کمانداری میں دلپذیر ہیں۔ فارسی میں غزل خوب کہتے ہیں اور کبھی کبھی اردو میں بھی

کی تنگ ورزی اور تراکیب کی کرسی نشینی دائرۂ ستائش میں محصور نہیں ہو سکتی۔ یہ چند اشعار اس کے افکار سے ہیں۔" (صفحہ ۲۱۵)

مسلم قلم کی ہندو بیزاری اور ہندو آزاری کے دعوے کی کیا یہی شہادتیں ہیں؟

(۴) مشین تخلص، رائے کانجی سہائے متوطن شہر لطافت نہاد الہ آباد۔

"دیدۂ معتبرانِ روزگار، اُسوۂ اقبال مندانِ کامگار ۔۔۔ قلم تحریر اوصاف میں عاجز اور لفس تقریر محامد میں قاصر ہے۔ نہ عموم اخلاق کے بیان سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے اور نہ وفورِ علم و بردباری کے دفتر سے حرف سرا۔ فنِ سخن سے ازبسکہ مناسبت ذاتی اور ذوق طبعی ہے۔ گاہ گاہ اوقاتِ فرصت میں شعر فارسی کا فکر دامنگیر ہوتا ہے۔ ہر چند اس فن میں کسی سے مشورہ کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن استعداد خداداد سے قدم فکر جادۂ استقامت سے منحرف نہیں ہے۔ یہ چند شعر اس مدعا پر شاہد اور اس دعویٰ پر گواہ ہیں۔ (صفحہ ۴۲)

کوئی ہندو بھی اس سے زیادہ قدر دانی و قدر افزائی کے الفاظ کسی ہندو کے لئے لا سکتا ہے!

(۵) عـــزیز تخلص، مہاراج سنگھ کائستھ۔

"انسانیت مصوّر اور اخلاق مجسّم ہے۔ شاگرد قدیم نصیر مرحوم اور مشقِ سخن میں اکثر سے ممتاز ہے۔ ازبسکہ شاہ مغفور کثرتِ تلامذہ اور افراطِ مشغلہ اصلاح اور مشغولیٔ فکرِ شعر سے اپنے دیوان کی طرف متوجہ نہ ہوئے تھے، اس نیک نہاد نے فرطِ اعتقاد سے کہ خدمتِ استاد میں ہی رہتا تھا اس کلام پریشاں کو جمع کیا، اور اشعار متفرقہ اور غزلیات پراگندہ کو مختلف مقاموں سے فراہم کر کے صورت کتابی بخشی۔ گویا ع

جمع کرد بہ وبال پریشانی را۔ یہ چند شعر اسکے نتائج طبع سے ہیں۔" (صفحہ ۳۹۶)

کیا اس کا نام "فرقہ واریت" ہے؟ اس طرز تحریر پر اطلاق "مسلمانوں کے جوشِ تعصب" کا ہوگا!

عبدالغفور خاں نساخ کے مشہور تذکرہ سخن، "سخن شعرا" کا سالِ تالیف ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) ہے۔ اس ضخیم تذکرہ سے ہندو شاعروں کے نام چھانٹنے کی فرصت افسوس ہے کہ نہ مل سکی۔ لیکن محض سرسری ورق گردانی سے جو نام ہندو شاعروں کے مل گئے، اُن کے تخلص حاضر ہیں۔ آرام۔ ارمان۔ آشفتہ (بشاشت) تجلی۔ چمن۔ رقم۔ شوق۔ طرب۔ طرب۔ طرب (دہلوی)۔ طراز طوبی۔ مشفق۔ نسیم (لکھنوی)، نسیم (دہلوی)۔ وفا۔ وفا (الہ آبادی) مرتب (عظیم آبادی) موزوں (دہلوی) موجی۔ فیض۔ جم۔ عبرت (دہلوی) ہمالچ جوہر۔ نیاز۔ یاس ـــــــــ ۲۸ تو یہی ہو گئے۔ اور یقین ہے کہ اگر ذرا جم کر تلاش کی جاتی تو اُن کی کل تعداد اس سے کہیں زائد نکلتی۔

یہ صرف چند تذکروں کے سرسری جائزہ کا نتیجہ ہے۔ جو بطور ماحضر پیش کر دیا گیا۔ ورنہ اگر کوئی تفصیل کے ساتھ تذکروں کے انبارِ عظیم کو کھنگالے تو اُمید ہی نہیں یقین ہے کہ ہندوؤں کی اردو شاعری کا اعتراف کمیت و کیفیت دونوں کے لحاظ سے اتنا زائد نکلے کہ مسلمانوں کے لئے نظریں جھکانے کی کوئی وجہ ہی نہ رہے۔ بلکہ تمامتر موقع افتخار کے ساتھ نظر اُٹھا کر چلنے کا ہم پہنچ جائے۔

ایک طرف ان واقعات اور حقائق کو رکھئے، اور دوسری طرف اُن نامہربان مہربانوں کی انصاف پسندی اور تحقیق گستری کی داد دیجئے۔ جنھوں نے گل فشانی اس قسم کی شروع فرمائی ہے کہ "مسلمانوں نے ہندو ادیبوں اور شاعروں کو منہ کب لگایا، اور اُن کی شاعری کو قابلِ ذکر ہی کب سمجھے۔ حد یہ کہ تذکرۃ الشعرائے اردو پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں اُن کا نام تک بجز شاذ و نادر صورتوں کے نہیں آنے پایا۔" خدا معلوم یہ کس دور کے تذکرہ نگاروں کے باب میں کسی حد تک بھی صحیح ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی کتاب شعر الہند آج سے ۵۰ سال قبل کی تصنیف ہے۔ اس کی جلد دوم کے آخر میں ایک مستقل باب کا عنوان ہے "ہندوؤں کا تعلق اردو شاعری کے ساتھ"۔ بہتر یہ ہوگا کہ اس مقالہ کے ختم سے قبل چند سطریں اس کی بھی ملاحظہ کر لی جائیں۔

"قدیم تذکروں میں نہایت کثرت سے ان ہندو شعراء کے حالات ملتے ہیں، جنھوں نے نہایت بے تعصبی کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ اس طرح بعض ہندوؤں سے بھی مسلمان شعراء نے اصلاحیں لیں۔۔۔۔۔ بعض ہندو شعراء نے شاعری کی مختلف اصناف میں خاص کمال پیدا کیا تھا اور ہمارے تذکرہ نویسوں نے دل کھول کر ان کے اس کمال کی داد دی ہے۔۔۔۔ غرض گذشتہ زمانے میں زبان کا کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوا تھا، اور دونوں قومیں اردو زبان کی ترقی میں یکساں حصہ لیتی تھیں۔" (جلد ۲۔ صفحہ ۴۳۴،۴۹۰)

صباح الدین عبدالرحمٰن

ہاتھی

(ہندوستان کی گذشتہ تاریخ کی روشنی میں)

سکندر اور پورس کی جنگ میں ہاتھیوں ہی کی وجہ سے پورس کی فوج کو شکست ہوئی۔ میدان جنگ میں ہاتھی باجے کی آواز، بندوق کی گرج سے خوفزدہ ہوتے یا تیروں، تلواروں اور آتشیں اسلحہ کی آتش باری سے زخمی ہوتے تو اپنی فوج کے لئے بہت خطرناک ہوجاتے لیکن ان کی اس مضرت رسانی کے باوجود ہندوستان کے گذشتہ عہد میں وہ جنگ کے لئے بہت ہی مفید اہم اور ضروری جزو سمجھے جاتے تھے۔ محمود غزنوی کی فوج میں تقریباً دو ہزار ہاتھی تھے جن کے لئے اس نے ایک علیحدہ محکمہ قائم کر رکھا تھا، ہر سال ان کا باضابطہ معائنہ کرتا تھا، اور جو ہاتھی لاغر اور کمزور ہوجاتے تھے، وہ ہندوستان منتقل کر دئے جاتے تھے۔ جہاں کی آب و ہوا میں رہ کر وہ اپنی اصلی حالت پر آجاتے تھے، اور پھر غزنیں واپس کر دئے جاتے تھے۔[1]

دہلی کے غلام سلاطین کے عہد میں ہاتھی کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ بلبن کہا کرتا تھا کہ ہندوستان کی آراستگی ہاتھی اور گھوڑے سے ہے، ہندوستان میں ہر ہاتھی پانچ سو سوار کے برابر ہے۔[2] چنانچہ اس نے اپنے دارالسلطنت میں بنگال سے ہاتھی منگوا کر اس کی ایک کثیر تعداد جمع کر رکھی تھی۔[3] علاؤالدین خلجی کی فوج میں ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ جو اس نے مختلف مقامات سے حاصل کئے تھے۔ جنوبی ہند کی تسخیر سے ملک کافور دہلی واپس آیا۔ تو مال غنیمت میں ۶۱۲ ہاتھی ساتھ لایا۔ ضیاءالدین برنی کا بیان ہے۔ کہ دہلی میں ہاتھیوں کی اتنی بڑی تعداد پہلے کبھی نہیں آئی۔[4] لیکن علاؤالدین کے بعد ہر زمانہ میں ہاتھیوں کی تعداد بڑھتی گئی، محمد تغلق کے پاس تین ہزار ہاتھی تھے۔ ابراہیم لودی کے پانی پت کے میدان میں ایک ہزار ہاتھی سے کم نہ تھے۔ شیر شاہ سوری کی فوج میں پانچ ہزار ہاتھی تھے۔ پانی پت کی دوسری لڑائی میں ہیمو کی شکست کے بعد اکبر کو میدان جنگ میں ڈیڑھ ہزار ہاتھی بطور مال غنیمت ہاتھ آئے۔[5]

تیموری عہد میں اکبر نے ہاتھیوں کی نگہداشت کے لئے ایک مستقل محکمہ کا انتظام کر رکھا تھا، ابوالفضل ہاتھیوں سے اس قدر مرعوب تھا کہ آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ یہ عجیب و غریب جانور تنومندی میں پہاڑ، دلیری و جانبازی میں شیر ہے، کشورکشائی میں مالک کے لئے عظیم الشان طاقت اور اضافۂ شان و شوکت کا ذریعہ ہے، سپاہ و ملک کی آبادی کا محافظ اور حفاظت ملک و فوج کی بہترین سند ہے۔[6] آئین اکبری اور اکبرنامہ[7] میں اس نے ہاتھیوں پر مستقل ابواب لکھے ہیں جن سے اس جانور کی مختلف خصوصیات اور جنگ میں اس کے مفید کارناموں کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں، ابوالفضل نے ہاتھیوں کی چار قسمیں بتائی ہیں (۱) بھدر (جس کا جسم متناسب، سر بلند، سینہ کشادہ، دُم لمبی ہو اور جو بڑا دلیر ہو۔) (۲) مند (جس کا رنگ بالکل سیاہ، آنکھیں زرد اور شکم بڑا ہو) (۳) مرگ (جس کا رنگ سفید ہو) (۴) میر (جس کا سر چھوٹا ہو) یہ جانور حسب ذیل مقامات میں پائے جاتے تھے، صوبہ آگرہ میں بیادان اور نرور میں، صوبہ الہ آباد میں پنّہ، گھوساگھاٹ، رتن پور، نندن پور، سرگجہ اور بستر میں، صوبہ مالوہ میں ہنڈیہ، اچھود، چندیری، سنتواس، بیجاگڑھ، رائے سین، ہوشنگ آباد، گڑھہ، اور ہریاگڑھ میں، صوبہ بہار میں رہتاس اور جھارکھنڈ میں، صوبہ بنگال میں اڑیسہ اور ستگاؤں میں بکثرت پائے جاتے تھے۔ پنّہ کے ہاتھی بہترین خیال کئے جاتے تھے۔[8]

---

[1] محمود آف غزنہ از ڈاکٹر محمد ناظم ص ۱۲۹، [2] تاریخ فیروز شاہی از ضیاءالدین برنی ص ۵۳۔ [3] ایضاً ص ۵۳۔ [4] ایضاً ص ۳۳۰۔

[5] اکبرنامہ جلد دوم ص ۱۴۔ [6] آئین اکبری، آئین ۴۱۔ [7] اکبرنامہ جلد دوم ص ۷۳۔ [8] آئین اکبری آئین ۴۸۔

تیموری دور کے ہر منصب دار کو ہاتھیوں کی ہر قسم کی ایک مقررہ تعداد رکھنی پڑتی تھی۔[1]

ہاتھیوں کی نگہبانی کے لئے ایک امیر مقرر ہوتا تھا، جو تیموری عہد سے پہلے شحنۂ پیل اور تیموریوں کے دور میں امیر فیلان کہلاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہاتھیوں کے لئے مندرجہ ذیل خدمت گذار مقرر تھے، (۱) مہاوت یعنی فیلبان۔ (۲) فوجدار، وہ ہاتھیوں کو گھمسان کی لڑائی کے وقت ثابت قدم رہنے کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ (۳) دہائی دار، لڑائی کے موقع پر دو ہاتھیوں کے درمیان کھڑا رہتا تھا۔ (۴) نقیب، ہاتھیوں کی ملالت اور دوسری کیفیات وغیرہ کی روداد لکھا کرتا تھا۔ (۵) بھوئی، میدان جنگ میں ہاتھی کے پچھلے حصے پر بیٹھ کر اس کی مدد کیا کرتا تھا۔[2]

عہد تیموریہ سے پہلے کے مورخین نے ہاتھی کے سامان آرائش کی تفصیل بہت زیادہ نہیں لکھی ہے، ابن بطوطہ کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جنگی ہاتھی زرہ پوش ہوتے تھے۔[3] جن کے ہودج پر سپاہی بیٹھا کرتے تھے، سلطان محمد تغلق عید کی نماز ادا کرنے کے لئے ہاتھیوں کے ایک جلوس میں جایا کرتا تھا، ابن بطوطہ نے اس کی جو تفصیل رکھی ہے۔ اس سے جنگی ہاتھیوں کی آرائش کے ساز و سامان کا بھی اندازہ ہوگا، وہ لکھتا ہے کہ عید کی صبح کو ہاتھی سجائے جاتے ان پر ریشم کی طلائی اور جڑاؤ جھولیں ڈالی جاتیں، ان میں سے سو ہاتھی خاص بادشاہ کی سواری کے ہوتے، ان سب پر ایک ایک چتر ہوتا جو ریشم کا بنا ہوا اور جواہرات سے جڑا ہوتا، ہر ایک چتر کی ڈنڈی خاص سونے کی ہوتی، اور ہر ایک ہاتھی پر ایک جواہر سے مرصع ریشمی گدی رکھی جاتی، ایک ہاتھی پر بادشاہ سوار ہوتا...... ہاتھی کے آگے غلام اور مملوک پیادہ پا چلتے......[4]

تیموریوں کے زمانے میں ہاتھی کے لوازم میں بہت سی چیزیں ہوتی تھیں، مثلاً مختلف قسم کی وزنی اور ہلکی زنجیروں کے نام دھرنہ، آندو، بیڑی، بلند، گدھیری اور لنگر تھے۔ مختلف ڈوریوں کے بعض نام کلاوہ، دلیتھی، ڈور، اور دیجوہ تھے۔ زیب و زینت کے لئے چوراسی قطاس، ٹبیا، گتیلی، پاسے رنجو اور رنگری وغیرہ نامی زیورات پہنائے جاتے، سر اور سونڈ کے لئے برگستوان کی شکل کا ایک خاص قسم کا خوبصورت جامہ ہوتا جس کو پاکھر کہا جاتا، پاکھر کے اوپر ایک مرصع پوسس ڈالی جاتی جس کو گج جھنپ کہتے، ان میں ایک پیشانی بند ہوتا جو زربفت وغیرہ قیمتی کپڑوں کا تیار کیا جاتا، اس کے دامن میں مور چھل لٹکتے رہتے جو ہوا میں ہلنے کی وجہ سے بہت خوشنما نظر آتے، ہودج کے نیچے جھولیں لٹکتی رہتیں جو قیمتی کپڑے کی بنائی جاتیں، ایک شامیانہ ہوتا جو ہاتھی کے اوپر تانا جاتا، یہ میگھ ڈنبر کہلاتا تھا۔[1]

اکبر کے خاصے کی سواری کے لئے ایک سو ایک ہاتھی تھے، اکثر ہاتھیوں کے لئے پانچ سیر شکر، چار سیر روغن زرد اور نصف من چاول فی زنجیر کے حساب سے مقرر تھے، بعض جانوروں کو ڈیڑھ من دودھ بھی دیا جاتا، گنے کی فصل میں ہر ہاتھی کو تین سو یا اس سے کم و زائد نیشکر روزانہ دیئے جاتے۔[2]

تیموری دور سے پہلے میدان جنگ میں بادشاہ یا فوجی سردار گھوڑے پر سوار ہو کر لڑائی کی نگرانی کرتا تھا، لیکن تیموری عہد میں وہ ہاتھی ہی پر سوار رہتا تھا تاکہ فوج کا ہر سپاہی اس کو ہر جگہ سے دیکھ سکے۔ ہیمو پانی پت کی جنگ میں اپنے ہودج ہی پر تیروں سے زخمی ہوا۔[3]

نورجہاں نے مہابت خاں کے خلاف ہاتھی ہی پر سوار ہو کر جنگ کی۔ اس کی عماری میں شہزادہ شہریار کی شیر خوار بچی اور اس کی اَنا بھی تھی، ہاتھی پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ ایک تیر شہریار کی بچی کو بھی آ لگا۔ جس کو نورجہاں نے اپنے ہاتھ سے نکال کر باہر پھینک دیا، عماری خون سے رنگین ہو رہی تھی، لیکن بہادر نورجہاں برابر اپنی فوج کی ہمت بڑھا رہی تھی، غنیم نے قریب پہنچ کر نورجہاں کے ہاتھی کی سونڈ پر تلواروں سے دو کاری زخم لگائے جن سے اس کا منہ پھر گیا۔ وہ زخمی ہو کر دریا میں کود پڑا، غنیم کے سواروں نے بھی اس کے پیچھے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے، لیکن ہاتھی پیرتا ہوا آگے نکل گیا اور سوار ڈوبنے کے خوف سے لوٹ پڑے۔[4] سموگڑھ کی جنگ میں اورنگ زیب اور مراد دونوں ہاتھی ہی پر سوار ہو کر اپنی اپنی فوجوں کو لڑا رہے تھے۔ مراد کی عماری پر دارا کے لشکر کی طرف سے چار ہزار از بک تیر چلا رہے تھے۔ ہاتھی کا ہودج تیروں سے چھلنی ہو کر خار پشت یعنی ساہی بن گیا تھا، مگر اس عالم رستخیز میں بھی مراد ہمت و استقلال کا پہاڑ بنا ہوا دشمنوں کے تیروں کا مسلسل جواب دیتا رہا۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو آئین اکبری آئین ۴۱ - [2] آئین اکبری، آئین ۴۳ - [3] سفر نامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۱۰۰ - [4] سفر نامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۱۰۴ -

[1] مزید تفصیلات کے لئے دیکھو آئین اکبری آئین ۴۴ - [2] آئین اکبری آئین ۴۵ - [3] اکبر نامہ جلد اول ص ۴ - [4] اقبال نامہ جہانگیری ص ۶۲-۲۶۳ -

ں کا فیلبان زخمی ہو کر نیچے گر پڑا تو اس نے فوراً ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈلوا دیئے۔ مراد کے لشکری مراد کی اس ہمت اور پامردی کو دیکھ کر آگے بڑھے، ردیوانہ وار اس کے ہاتھی پر حملہ آور ہوئے ان کے حملے سے مراد کے چہرے پر تین کاری زخم لگے، مگر وہ جانبازی اور سرفروشی کے ساتھ لڑتا گیا۔ اس کے تیروں سے دارا کے اتنے سپاہی زخمی ہوئے کہ ہاتھی کے اردگرد زمین زعفرانی اور زعفرانی ہو گئی۔ مراد کا یہ ہودج دودمان تیموری کی شجاعت اور پامردی کی یادگار میں خزانہ عامرہ میں آخر وقت تک محفوظ رہا۔ فرخ سیر کے زمانہ میں سادات بارہہ نے تیموری خاندان کے افراد پر استیلا اور غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو فرخ سیر کی بہن نے غصہ میں ان سے کہا۔ کہ ہم اس خاندان کے افراد میں جن کی شجاعت کی یادگار میں یہ مشبک ہودج اب تک محفوظ ہے[1]۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب اس کے لڑکوں میں جاجو کے میدان میں جانشینی کی جنگ ہوئی تو شہزادہ اعظم شاہ ہاتھی ہی پر سوار تھا، اس کے ساتھ اس کا نوجوان لڑکا شہزادہ علی تبار بھی تھا، لڑائی شروع ہوئی تو شہزادہ علی تبار کے بازو پر ایک تیر لگا، لیکن اعظم شاہ اپنا ہاتھی لے کر مخالف فوج کی صف میں گھس پڑا، تیروں اور گولیوں سے متواتر چار فیلبان زخمی ہو کر گرے، آخر میں اعظم شاہ خود ہی ہاتھی ہانکنے لگا، اس کا سارا جسم تیروں سے چھلنی ہو رہا تھا، پھر بھی وہ زخموں سے بے پرواہ ہو کر لڑتا گیا، ناگاہ ایک اس کی پیشانی پر ایک گولی آ کر لگی جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا، لڑائی کے دوسرے بازو میں اس کے دو شہزادے بیدار بخت اور والاجاہ ہاتھیوں ہی پر لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ۱۱۳۲ھ میں نظام الملک اور عالم علی خاں برسرپیکار ہوئے تو عالم علی خاں جو ۲۲ سال کا نوجوان تھا میدان جنگ میں ہاتھی ہی پر سوار تھا، لڑائی شروع ہوئی تو وہ اپنے ہاتھی کے ساتھ غنیم کی طرف اتنی تیزی سے بڑھا کہ اس کے سوا پیچھے رہ گئے، عماری پر اس کے ساتھی تیروں سے زخمی ہو کر مارے گئے لیکن اس نے منہ نہیں موڑا، اس کا فیلبان بھی زخمی ہو کر نیچے گر پڑا، ہاتھی بے قابو ہو کر اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا، اور آخر ایک دلدل میں جا کر پھنس گیا، عالم خاں نے اس کو بڑی مشکل سے دلدل سے نکالا، اور پھر دشمنوں کی طرف بڑھا،

ہاتھی تیروں سے زخمی ہو کر بھاگ رہا تھا مگر عالم خاں چلایا "ہاتھی نے منہ موڑا ہے، میں نے پیٹھ نہیں دکھائی" ہاتھی کو موڑ کر پھر دشمن کی طرف بڑھا، اس کے تمام جسم سے خون بہہ رہا تھا، اس کے چہرہ اور جسم پر دشمنوں کے تیر آ آ کر پیوست ہو گئے تھے، اور جب اس کا ترکش خالی ہو گیا تو اپنے چہرے اور جسم سے ان تیروں کو نکال کر دشمنوں پر پھینکنے لگا۔ اس کے ہاتھی نے چار بار میدان جنگ سے منہ موڑا، لیکن وہ ہر بار ہاتھی کو موڑ کر دشمنوں سے سینہ سپر ہوا بالآخر زخموں سے ایسا نڈھال ہو گیا، کہ دشمنوں نے اس کو مغلوب کر لیا[2]۔

ہاتھی پر سوار ہو کر لڑنے کا طریقہ آخر وقت تک رہا، نواب سرفراز خاں ناظم بنگالہ علی وردی خاں مہابت خاں کے خلاف لڑائی لڑنے میدان میں ہاتھی ہی پر اترا، مخالف فوج نے توپ و تفنگ سے ایسی آتش بازی کی کہ اس کی فوج منتشر ہو گئی، اس کے رفقاء اس کو چھوڑ کر فرار ہونے لگے۔ لیکن وہ میدان جنگ میں پورے حوصلہ سے لڑتا رہا، اس کے فیلبان نے خوفزدہ ہو کر عرض کیا کہ حکم ہو تو ہاتھی کو بھگا لے جائیں، سرفراز خاں کی شجاعت اور غیرت جوش میں آئی، اور فیلبان کو ایک طمانچہ مار کر بولا "ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈال دو، میں ان کتوں سے اپنا منہ ہرگز نہیں موڑوں گا" اور بالآخر لڑتا ہوا مارا گیا[3]۔

نادر شاہ ہندوستان آیا تو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ میدان جنگ میں بادشاہ اور سپہ سالار ہاتھی پر سوار رہتے ہیں۔ اس کے نزدیک ہاتھی پر سوار رہنا خواہ مخواہ دشمنوں کا نشانہ بنتا تھا، وہ تو ہاتھی کی سواری کو اس لئے بھی ناپسند کرتا تھا کہ اس کی باگ دوسرے کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ مگر تیموریوں کی رگوں میں شجاعت اور جانبازی کا خون اس طرح موجزن تھا کہ میدان کارزار میں کسی قسم کا خوف اپنے دل میں لانا باعث شرم سمجھتے تھے۔ وہ جنگ کے لئے روانہ ہونے لگتے تو اپنی فوجوں کو اسی طرح آراستہ کرتے تھے جس طرح بارات کا جلوس آراستہ کیا جاتا ہو، اور وہ ان کے ساتھ اس طرح چلتے تھے۔ جیسے کوئی عروس جا رہا ہو۔ وہ معرکہ کارزار میں اپنے مرصع اور مکلل ہاتھی پر اس طرح زرکش رہتے تھے۔ جیسے کوئی ایک جشن منا رہا ہو، اور اسی شان عروسی میں ہر موقع پر اپنی نبرد آزمائی، جانبازی اور پامردی کے اعلیٰ سے اعلیٰ

[1] خافی خاں جلد دوم ص ۳۰۔

[1] خافی خاں ص ۸۹۵ - [2] ریاض السلاطین ص ۳۱۶ -

جوہر دکھلاتے تھے۔

تیر اندازوں کو ہاتھی کی پشت پر بیٹھ کر دشمنوں پر تیر اندازی کرنے میں بڑی سہولت ہوتی تھی۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ایک ہاتھی کے ہودج پر بیس مسلح فوجی بیٹھ سکتے تھے[1] اسی سلطان کے عہد کے میدان جنگ کا نقشہ کھینچتے ہوئے مسالک الابصار کا مصنف لکھتا ہے کہ "ہاتھیوں پر برجوں سے ڈھکے ہوئے آہنی ہودج رکھے جاتے ہیں۔ جن پر تیر انداز سوار رہتے ہیں۔ اور پھر ان ہی برجوں کی ہر سمت میں سوراخ بنے ہوتے ہیں۔ جن سے تاک کر نشانے لگائے جاتے ہیں۔ اور ان ہی ہودجوں میں روغن نفط ہوتا ہے جو شیشہ کی نلکیوں سے دشمنوں پر اچھالا جاتا ہے۔ جس سے شعلے پیدا ہوتے ہیں"۔ سلطان محمود تغلق جب تیمور سے جنگ کرنے کے لئے میدان میں آیا تو ظفر نامہ کے مؤلف کا بیان ہے کہ اس کے پاس ۱۲۰ ہاتھی تھے جو سلاح اور کجیم سے مسلح تھے۔ اور ان کے دانت لکیلے بنا کر زہر آلود کر دیے گئے تھے، ان کی پیٹھ پر ناوک فگن اور چرخ انداز بیٹھے تھے۔ تیمور کے فوجی دشمنوں کے لشکر سے تو نہیں لیکن ان کے ہاتھیوں سے بہت زیادہ خوفزدہ تھے، ان کو خبر ملی تھی کہ ہندوستان کے ہاتھیوں کے سخت جسم پر تیر اور تلوار کا اثر نہیں ہوتا، وہ درختوں کو سونڈ سے اکھاڑ دیتے ہیں، مستحکم عمارتوں کو دھکے دے کر گرا دیتے ہیں، اور میدان جنگ میں اژدہا نما سونڈوں سے گھوڑوں اور سواروں کو ہوا میں پھینک دیتے ہیں، تیمور کی فوج نے محمود تغلق کے لشکر کو مغلوب کیا تو اس کے ہاتھی بھی پسپا ہوئے تیمور نے ان ہاتھیوں کی یورش روکنے کے لئے اپنی فوج کے سامنے خندق کھدوائی، خندق کے سامنے بھینسوں کو ایک دوسرے سے چمڑے میں بندھوا کر کھڑا کیا، اور راستے میں لوہے کی خاردار کیلیں بچھا دیں[2]۔

آئین اکبری میں اکبر کے وزیر ابوالفضل کا بیان ہے کہ ہندی ماہرین میدان جنگ میں بہترین ہاتھی کو پانچ سو سواروں کے برابر خیال کرتے ہیں، اور تیر انداز بہادروں کے ساتھ ایک ہاتھی ہزار سواروں کا کام کرتا ہے[3]۔

ہاتھی کی پشت پر سے توپ اور بندوق بھی چھوڑی جاتی تھی، شاہجہاں نے اپنے بیسویں سال جلوس میں اورنگ زیب کو بلخ کی تسخیر کے لئے بھیجا تو اس جنگ میں ہاتھی کی پیٹھ پر سے بڑی بڑی توپیں اور گجنال چھوڑی گئیں[1] کھجوہ کے میدان میں شہزادہ شجاع اور اورنگ زیب سے جو جنگ ہوئی تو اس موقع پر اورنگ زیب کے تفنگچیوں نے ہاتھی کی پشت پر سے دشمنوں پر گولہ باری کر کے بڑی ہولناکی پیدا کی[2]۔

ہاتھی فوجوں کی صف بندی کے لئے بھی بہت مفید سمجھے جاتے تھے محمود غزنوی جب خراسان میں ایلک خاں کے خلاف معرکہ آرا ہوا تو اس نے اپنی فوج کے آگے پانچ سو کوہ پیکر ہاتھی کھڑے کر دیئے تاکہ صف شکنی نہ کر سکیں۔ سنہ ۹۹۱ھ میں مظفر گجراتی نے احمد آباد میں علم بغاوت بلند کیا تو بیرم خاں کے لڑکے مرزا خاں کو احمد آباد بھیجا گیا، مظفر ایک جرار لشکر لے کر مقابلہ کے لئے آگے بڑھا، مرزا خاں کے پاس نسبتاً فوج کم تھی لیکن اس نے اپنی فوج کو دشمنوں کی زد سے محفوظ رکھنے کے لئے سو ہاتھیوں کی ایک صف آگے کھڑی کر دی، اور جب گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی تو ان ہی ہاتھیوں کو لے کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑا، جس سے ان کے پاؤں بالکل اکھڑ گئے[3]۔

ہاتھی صف شکنی کے لئے بھی بہت ہی مفید سمجھے جاتے تھے محمود غزنوی نے خراسان میں ایلک خاں سے جنگ کی تو وہ ہاتھی ہی پر سوار ہو کر دشمن کی صف کی طرف بڑھا، اس کے پیچھے لشکر کے اور بھی ہاتھی حملہ آور ہوئے، محمود کے ہاتھی نے پہلی ہی یورش میں ایلک خاں کے علم بردار کو سونڈ میں لپیٹ کر دور پھینک دیا۔ پھر یہی ہاتھی لشکریوں کی طرف بڑھا اور اس نے بے شمار سپاہیوں کو ہلاک کیا، محمود کے اور ہاتھیوں نے بھی غنیم کی صف میں بڑی ابتری پھیلائی۔ جس سے وہ بالکل سنبھل نہ سکے[4]۔ سنہ ۸۶۳ھ میں احمد آباد میں سلطان محمود بیگڑہ کے خلاف اس کے امراء نے بغاوت کی تو ان کی فوج پر محمود بیگڑہ نے چھ سو ہاتھی دوڑا دیئے جس سے سارے لشکری ایسے پریشان ہوئے کہ اپنے تمام اسلحہ چھوڑ کر فرار ہو گئے[5]۔ سنہ ۸۶۲ھ میں ہمایوں شاہ بہمنی جب اپنے پھوپھی زاد بھائی

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۲۰۱۔ [2] ظفرنامہ جلد دوم ص ۱۴۱۔
[3] آئین اکبری آئین ۴۱۔

[1] عمل صالح جلد دوم ص ۵۲۵۔ [2] عالمگیر نامہ جلد اول ص ۲۴۹۔ [3] مرآۃ احمدی ص ۱۲۰، اکبرنامہ جلد سوم ص ۴۲۶۔ [4] گردیزی ص ۶۹۔ [5] مرآت احمدی جلد اول ص ۵۹۔

سکندرخاں کی بغاوت فرو کرنے کے لئے لڑنا[1] تو وہ ایک مست ہاتھی لے کر سکندرخاں کے خاصہ کی فوج پر حملہ آور ہوا، سکندرخاں بھی ایک شیر نر کی طرح آگے بڑھا اور نیزے کا ایک وار ہاتھی پر کیا، لیکن ہاتھی نے سکندر کو سونڈ میں لپیٹ لیا، اور غصہ میں زمین پر دے مارا۔[2] محمد شاہ بہمنی نے وجیانگر پر فوج کشی کی تو تنگ بھدرا کے پاس ایک شدید جنگ ہوئی۔ دونوں طرف کی فوجیں جوش و خروش سے لڑ رہی تھیں کہ محمد شاہ بہمنی کے فوجی سردار محمد خاں کا ہاتھی شیر شکار نامی فیلبان کے قبضہ سے نکل گیا، اور غنیم کی فوج پر حملہ آور ہوا، لیکن غنیم کے ہاتھیوں نے اس کو گھیر کر بیکار کر دیا، محمد خاں اپنے ہاتھی کی پسپائی دیکھ کر پانچ سو سواروں کے ساتھ آگے بڑھا اور ہاتھی کو دشمنوں کے نرغے سے چھڑا لیا، اس کے بعد فرشتہ کا بیان ہے کہ ایسا واقعہ پیش آیا جو شاید کبھی نہ آیا ہوگا۔ یعنی شیر شکار نامی ہاتھی نے اپنے لشکر کی پیش روئی اختیار کی اور دشمنوں کی صفوں کو اس طرح درہم برہم کیا کہ ان کو مغلوب ہونا پڑا۔[3] ۹۸۱ھ میں اکبر کی فوج داؤد خاں والئے بنگالہ کو مغلوب کرنے گئی تو میدان جنگ میں داؤد خاں کے ہاتھیوں نے شاہی فوج کی صفوں میں جو انتشار پیدا کیا تھا، اس کا اعتراف ابوالفضل نے بھی اکبر نامہ میں کیا ہے۔[4] اسی طرح ۱۰۲۱ھ میں عثمان خاں افغانی بنگالہ میں علم بغاوت بلند کیا تو جہانگیر کی فوجوں کو عثمان خاں کے ہاتھیوں نے بڑا نقصان پہنچایا جس کی تفصیل خود جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھی ہے۔[5] شاہ جہاں کے زمانے میں بلخ کی مہم میں اوزبکوں کی صف شکنی ہاتھیوں ہی کے ذریعے سے ہوئی تھی۔[6] اورنگ زیب اور شجاع کے درمیان کھجوہ کی جنگ کی ابتدا ہاتھیوں کے حملے ہی سے ہوئی۔ شجاع کے میمنہ کے سردار سید عالم بارہہ نے تین مست ہاتھیوں کے گلے میں دو دو تین تین من کی زنجیریں باندھ کر اورنگ زیب کے جرانغار کی طرف چھوڑ دیئے۔ اورنگ زیب کی فوج اس حملہ کی تاب نہ لا سکی، اور منتشر ہونے لگی، تینوں ہاتھی جس قدر زیادہ زخمی ہوتے اسی قدر زیادہ خطرناک ہوتے جاتے تھے، یہاں تک کہ وہ اورنگ زیب کے ہاتھی کے پاس پہنچ گئے اور قریب تھا کہ اس کے ہاتھی کو زیر کر کے جنگ کا فیصلہ کر دیتے مگر اورنگ زیب نے غیر معمولی

---

[1] فرشتہ جلد اوّل ص ۳۰۴-[2] فرشتہ جلد اوّل ص ۲۹۱-[3] اکبر نامہ جلد دوم ص ۱۲۳-[4] تزک جہانگیری ص ۴۰۲-[5] عمل صالح جلد دوم ص ۵۳۶-

ہمت و استقلال سے کام لیا، اس نے اپنے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی، اور زنجیر اپنے ہاتھوں سے پکڑ لی، اورنگ زیب کے بندوقچی تینوں ہاتھیوں پر گولیاں برسانے لگے۔ اتفاق سے ایک ہاتھی کا مہاوت گولی کھا کر نیچے گر گیا، اس کا گرنا تھا کہ اورنگ زیب کے ہاتھیوں کے فیلبانوں نے اس کے ہاتھی کو گھیر لیا، بعض دلیر اور چالاک مہاوت تیزی سے اس ہاتھی کی پیٹھ پر چڑھ گئے، اور اس کو اپنے قابو میں کر لیا، بقیہ دو ہاتھی فرار ہو گئے۔[1]

صف شکنی کے لئے جو ہاتھی استعمال کئے جاتے تھے، ان کو خاص خاص باتوں کی تربیت دی جاتی تھی، مثلاً وہ گھوڑے سے زیادہ تیز دوڑیں، ابوالفضل پانی پت کی دوسری لڑائی میں ہیمو کے ہاتھیوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ کہ وہ عراقی گھوڑوں سے بھی زیادہ تیز دوڑ سکتے تھے۔[2] ایسے ہاتھیوں کو اس کی بھی تربیت ہوتی کہ وہ سواروں کو ان کے گھوڑوں کے سمیت اپنی سونڈ سے اٹھا کر ہوا میں پھینک دیں، عمارتوں کو ڈھا کر گرا دیں، اور درختوں کو جڑ سے اکھاڑ دیں۔[3] اس قسم کے ہاتھی جنگ کے موقع پر بڑی جانبازی سے لڑا کرتے تھے۔ چتوڑ کے محاصرہ میں اکبر کے ایک ہاتھی کی سونڈ ایک راجپوت کی تلوار سے کٹ گئی، سونڈ کٹ جانے کے بعد ہاتھی کا زندہ رہنا مشکل ہے لیکن اس ہاتھی نے مرنے سے پہلے تیس شمشیر بازوں کو ہلاک اور پندرہ کو زخمی کیا۔ اسی قلعہ چتوڑ کے اندر گھس کر مدھکر اور رسد لیہ نامی ہاتھیوں نے بڑی جوانمردی پیدا کی[4] ہاتھی فوج کو دریا بھی عبور کراتے تھے، فیروز شاہ لکھنوتی کی مہم پر روانہ ہوا تو راستے میں کوسی دریا ملا، شمس سراج عفیف کا بیان ہے کہ دریا میں پانی اس قدر زور پر تھا کہ پانچ سو من کا پتھر ٹھیکرے کی طرح پانی پر بہتا نظر آتا تھا۔ فیروز شاہ نے حکم دیا کہ پایاب مقام پر دریا کے بہاؤ کے بالائی اور زیریں حصے میں ہاتھی کھڑے کئے جائیں تاکہ لشکر آسانی سے دریا عبور کر سکیں، بالائی حصے میں اس لئے ہاتھی کھڑے کئے گئے تاکہ پانی کا زور کم ہو جائے، دونوں طرف ہاتھیوں کے جسم میں مضبوط ڈوریاں باندھ دی گئیں، زیریں حصے میں ہاتھی اس غرض سے کھڑے کئے گئے کہ کوئی لشکری غرقاب ہونے لگے تو ہاتھیوں کی ڈوریاں پکڑ لے۔[5] اکبر تو کئی بار خود فوج لے کر گنگا

---

[1] عالمگیر نامہ ج ا ص ۲۶۱-[2] اکبر نامہ جلد دوم ص ۳۶-[3] ایضاً-[4] اکبر نامہ جلد اوّل ص ۲۲۲-[5] تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف ص ۱۱۱-

اور بیاس پار ہوا[1] ۹۸۵ھ میں پنجاب کے ایک سرکش زمیندار کے خلاف اکبر نے شاہی لشکر بھیجا تو دونوں فوجیں دھارہ دریا کے دونوں ساحلوں پر کھڑی ہوئیں بالآخر شاہی لشکر کے سرداروں نے بے تاب ہوکر دریا میں ہاتھی ڈال دئے، دشمن کی آتشبازی سے دریا موجیں خوں ہونے لگیں۔ لیکن جری اور جانبازہ مغل ہاتھیوں پر دریا پار کرتے چلے گئے، اور ساحل پر پہنچکر دشمنوں کی فوج میں کشتوں کے پشتے لگا دیئے[2]

کبھی دشمنوں کی گذرگاہ کے پل اور کبھی حصار کی دیواریں ہاتھیوں کے ذریعہ سے توڑی جاتی تھیں، ہمایوں جب شیرخاں کے خلاف دوسری بار معرکہ آرا ہوا تو اس نے بھوج پور کے پاس گنگا عبور کرنے کے لئے ایک پل بنوایا افغانوں نے اس پل کو ایک ہاتھی گرد بار نامی کی مدد سے توڑنے کی کوشش کی۔[3] آگرے کے پاس ایک سرکش گروہ کو فرد کرنے کے لئے اکبر جنگ پر روانہ (؟) میں شریک ہوا، تو ایک دیوار کو اس نے خود ایک ہاتھی پر سوار ہو کر توڑی[4] شاہ جہان کے زمانے میں دکنی فتوحات کے سلسلے میں پرینڈہ کے پاس حصار قصبہ کی پانچ گز اونچی اور تین گز چوڑی دیواریں ہاتھیوں ہی سے توڑی گئیں[5]

مذکورہ بالا خدمات کے علاوہ ہاتھی جنگی سامان کے نقل و حمل کے لئے بھی استعمال کئے جاتے تھے، میدان جنگ میں حرم کی عورتیں ساتھ ہوتیں تو ہاتھی ہی پر ان کے محل ہوتے تھے،

موجودہ زمانہ کی لڑائیوں میں ہاتھی بیکار سمجھا جاتا ہے، لیکن کیا عجب کہ ہندوستان کا یہ پرشکوہ جانور ہندوستان کی فوجی اور جنگی شوکت و حشمت بڑھانے میں آئندہ پھر معاون ہو۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو اکبرنامہ جلد دوم ص ۲۹۲، ۳۶۹۔
[2] اکبرنامہ جلد دوم ص ۲۳۰۔
[3] اکبرنامہ جلد اوّل ص ۱۶۳۔
[4] اکبرنامہ جلد دوم ص ۶۴۔
[5] شاہ جہان نامہ جلد اوّل ص ۳۵۷۔

برجموہن دتاتریہ کیفی

دُنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

دیکھ لینا تم کہ دُنیا کیا سے کیا ہوجائے گی
اور ہی کچھ باغِ عالم کی ہوا ہو جائے گی
کفر و دیں کے کل جھمیلے ختم ہوجانے کو ہیں
نیتِ شیخ و برہمن باصفا ہوجائے گی
کافر و دیں دار ہوجائیں گے یک جان دو تن
بانگِ ناقوس و اذاں کی ہمنوا ہو جائے گی
ختم ہوجائے گی محنت اور سرمایہ کی جنگ
اک مساواتِ معاشی رونما ہو جائے گی
اقتصادی کشمکش کو بھول جائے گا جہاں
دولتِ افراد حصّہ قوم کا ہو جائے گی
آمریت، فاشیت اور اشتراکی مسئلے
ہو کے طے اک وطنیت جلوہ نما ہو جائے گی
ہوگی جمہور اور حکومت میں وہ ہمسرنگی کہ پھر
ہستیٔ حزبِ مخالف خواب سا ہو جائے گی
صلح جوئی مات دے گی سرکشی اور غضب کو
حق رسی قلبِ سیاست کی جلا ہو جائے گی
قومیت تہذیب اور کلچر سے ہوگی ہم ردیف
پاک و صاف اکنافِ عالم کی فضا ہو جائے گی
تنگ نظری اور تعصب کا عمل اُٹھ جائے گا
قومیت انسانیت کا آئینہ ہو جائے گی
قضیے سب دیر و حرم کے جلد مٹ جانے کو ہیں
یہ تمیزِ دین و ملت ہی فنا ہو جائے گی
حالِ اہلِ دہر کا جو آپ ہے کیفی اس کو دیکھ
کیا کہے جاتا ہے یہ ہوجائے گا، ہو جائے گی

معین احسن جذبی

کچھ اور بھی ہیں

شریکِ محفلِ دار و رسن کچھ اور بھی ہیں
ستمگرو! ابھی اہلِ کفن کچھ اور بھی ہیں

رواں دواں یونہی اے ننھی بوندیوں کے ابر
کہ اس دیار میں اُجڑے چمن کچھ اور بھی ہیں

خدا کرے نہ تھکیں حشر تک جنوں کے پاؤں
ابھی مناظرِ دشت و دمن کچھ اور بھی ہیں

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

ابھی تو ہیں دلِ شاعر میں سیکڑوں ناسور
ابھی تو معجزہ ہائے سخن کچھ اور بھی ہیں

دلِ گداز نے آنکھوں کو دے دئے آنسو
یہ جانتے ہوئے غم کے چلن کچھ اور بھی ہیں

جاں نثار اختر

رُباعیات

چھیڑے ہیں ہوا نے، نرم کرنوں کے ستار
سورج ہے لئے جامِ صبوحی طیار
پھولوں کی مہک چوم رہی ہیں آنکھیں
بیدار ہوا ہے نیند کے ماتے بیدار

باہوں کا سبک ہار لئے آئی ہو
آغوش کا گلزار لئے آئی ہو
ہنستی ہوئی اِن کیف بھری آنکھوں میں
اِک نشۂ بیدار لئے آئی ہو

یہ پھول سا لہجہ یہ رسیلی آواز
یہ تیرے تکلم کا دلاویز انداز
یہ لوچ، یہ نرمی، یہ گھلاوٹ، یہ کشش
صدقے ترے اِک لفظ پہ سو راز و نیاز

زربفت نہ دیبا نہ حریر و مخمل
گردن میں کوئی ہار نہ کوئی ہیکل
لپٹی ہوئی یہ جسم پہ سادہ ساری
لپٹا ہوا ساری کا گلے میں آنچل

شرمندہ ذرا چمن کو کر لوں آؤ
گلشن سے بھی کچھ بڑھ کے سنور لوں آؤ
شاداب مہکتا ہوا یہ پھول سا جسم
اک بار تو گود تم سے بھر لوں آؤ

سومناتھ گھوش

اُلجھاؤ

اس وقت پٹلا سات سال کا تھا ——— تلاش بسیار کے باوجود جب کہیں نوکری نہ ملی تو ایک روز وہ سنار کی دوکان میں پہنچا۔ یہاں اُسے کام مل گیا۔ کھانا کپڑا اور کھانے کے لئے ایک پیسہ روزانہ، اور پھر کام سیکھ جانے کے بعد ——— اس کا مستقبل درخشاں نظر آتا تھا۔

ایک تنگ قطعہ زمین سے گزرنے کے بعد کوچہ نلدنی دت آتا تھا جس کے ایک سرے پر میونسپلٹی کی لالٹین اپنی پھیکی پھیکی زرد روشنی سے رات کی تاریکی سے نبرد آزما تھی، اور دوسرے کنارے پر ایک وسیع کوڑا گھر۔ گندے کپڑوں کے چیتھڑے مچھلیوں کے سفنے، جانوروں کی ہڈیاں، کنکر پتھر، آم کے چھلکے اور ایسی ہی جانے کیا کیا چیزیں اپنی آغوش میں سمیٹے بیچ راستہ میں مکھیوں کو بھنبھنانے اور کتوں کو چیڑ پھاڑ کرنے کی دعوت دے رہا تھا۔ گلی کے پرلے سرے پر شکستہ مکان کی پانی کی ٹنکی سے رس رس کر گرنے والے پانی نے کافی کیچڑ کر رکھی تھی۔ اس کے بالمقابل ایک پرانا چھپر تھا ——— یہی سنار کی جھونپڑی نما دوکان تھی۔

پٹلا جھاڑو دیتا، دھونکنی چلاتا۔ بڑے لیمپ کو روشن کرتا، استاد کا حقہ بھرتا اور اس کی لڑکی کو گود میں لئے پھرتا۔ اس دنیا میں کوئی ایسا نہ تھا جسے وہ اپنا کہہ سکے۔ اسی لئے تاریک اور سنسان دوکان میں وہ اکیلا سوتا تھا۔

اسی طرح اس کے کاروانِ زندگی نے سات منزلیں طے کر لیں۔

اتنے ہی وقفہ میں دنیا سینکڑوں تبدیلیوں سے دوچار ہو چکی تھی۔ اُس کے اُستاد کی جھونپڑی رفتہ رفتہ ایک منزلہ اور پھر دو منزلہ پکے مکان میں تبدیل ہو گئی تھی۔ لیکن جہاں تک پٹلا کی ترقی کا سوال ہے وہ محض ایک دھوتی اور ایک پیسہ تک ہی محدود رہی۔ پہلے اس سال میں دو دھوتیاں ملا کرتی تھیں اب تین ملنے لگی تھیں، اور ایک پیسہ یومیہ کے بجائے اس کا جیب خرچ دو پیسہ یومیہ ہو گیا تھا ——— حالانکہ اب وہ سونا گلا کر زیورات بھی بنانے لگا تھا۔ لیکن اس کے مستقبل کا درخشاں سورج ہنوز گہن میں تھا۔

تاہم پٹلا اتنی ہی ترقی سے مطمئن تھا۔ اُس کو اپنے آرام و آسائش کی ضرورت ہی کب محسوس ہوتی جبکہ ایسی کوئی عزیز ہستی اس کی خواہشات کو بیدار کرنے والی بھی تو موجود نہ تھی؟ اس طرح اس کی زندگی کا دریا سکون و اطمینان سے ہموار راہ پر گامزن تھا۔

ایک دیہاتی لڑکا ——— نفظ انکار سے ناآشنا ——— کالا کلوٹا، بدصورت دن رات کام میں لگا رہتا شیطان کی طرح حرکت کرتا تھا۔ استاد کا حکم اس کے لئے دیدوں سے کسی طرح کم نہ تھا۔

دوکان کا مالک ڈھاکہ کا ایک مشہور سنار شری رادھا کانت باریک کام کے لئے مشہور تھا۔ اُسے اپنی زندگی کی پچاس بہاریں دیکھے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن اب بھی وہ اپنا کام بغیر چشمہ کی مدد کے کیا کرتا تھا۔ لوگ آسے مخصوص کاموں کے لئے زحمت دیا کرتے تھے۔

اب رادھا کانت خود آرڈر لینے کہیں نہ جاتا تھا بلکہ ہر کام اُس نے اپنے بیٹے کو سونپ دیا تھا۔ یہ ڈھچر ہمیشہ سے یونہی نہیں چلا آتا تھا۔ پہلے مخصوص گاہکوں کے یہاں وہ خود ہی جایا کرتا تھا لیکن اب رادھا کانت اُسے کہیں جانے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اس کا باپ گاہکوں سے بات کرنے کے طور طریقوں سے قطعاً ناآشنا ہے۔ اس کا قدامت پسند رویہ دورِ جدید کے تعلیم یافتہ طبقوں میں قابلِ قبول نہ تھا۔

رادھا کانت ذرا ضدی سی آدمی تھا اور دوکان کا ہر فرد اس سے ڈرتا تھا۔ اپنے مقرر کردہ قواعد میں وہ بڑی سختی برتتا تھا۔ کسی کاریگر کی ڈیوٹی کی کوتاہی کا وہ روادار نہ تھا۔ ایسے لوگ نہ صرف اس کی گالیوں کا محور بنتے بلکہ اکثر اوقات اُن کی تنخواہیں بھی کاٹ لی جایا کرتی تھیں۔ کمسن ہونے کے باوجود دوکان کا حساب اس کی انگلیوں پر رہا کرتا ——— وہ بازار سے سونا خریدتا۔ آرڈر حاصل کرتا اور زیورات کی نوعیت ہر کاریگر کو سمجھاتا تھا۔

رادھاکانت لڑکے کے کاموں میں دخل در معقولات کی کبھی جرأت نہ کرتا بلکہ اس کی ہر بات بے چون و چرا تسلیم کرنے ہی میں اپنی بہتری خیال کرتا تھا۔ علیحدہ سے کچھ پانے کی اُمید البتہ اسے اپنے ہاتھ سے کچھ کام کرنے پر مجبور کردیتی ورنہ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ گھر میں گزارا کرتا تھا۔

پوجا کے دنوں میں اس کے پاس کام کی فراوانی ہوتی تھی۔ ان دنوں زیادہ کاریگر لگانے اور خود باپ بیٹوں کے دن رات جٹے رہنے کے باوجود بھی کام ادھورا ہی رہ جاتا۔

رودراکانت باہر دوڑتا پھرتا اور اس کا پتا دوکان کی نگرانی کرتا رہتا وہ کھانا اور سونا تک بھول جاتے —— کام! کام!! اور کام! بس یہی ایک چیز اُن کی توجہ کا مرکز بنی رہتی۔

تین یوم شبانہ روز کام کرکے رادھاکانت نے سونے اور جواہر ریزوں سے مزین سونے کا ایک نکلس تیار کیا تھا —— لعل و گوہر ادھر اُدھر ترتیب دے کر وہ شکل اپنی طبیعت کے مطابق ڈھال سکا تھا۔ یہ ایک رئیس گھرانے کا آرڈر تھا۔

اس زمانے کا فیشن ایبل طبقہ ایسے زیورات پسند کرتا تھا جن میں سونا کم سے کم استعمال ہو۔ اسی لئے اب اُسے نقش و نگار بنانے کا موقعہ کبھی نہ ملتا تھا۔ حالانکہ اپنے اس کام پر وہ ہمیشہ سے نازاں تھا۔ کچھ لوگ ہاتھ کی چوڑیاں محض تین بھری سونے میں بنانے کی فرمائش کرتے تھے۔ ظاہر ہے ایسی چیزوں پر محض سونے کا ایک چکیلا خول ہوا کرتا تھا، اور کچھ لوگ ڈیڑھ تولہ میں نکلس تیار کرنے کا آرڈر دیتے تھے۔ تعلیم یافتہ طبقہ کا یہ مذاق رادھاکانت کی طبیعت سے مطابقت نہ کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کبھی کوئی بھاری زیور بننے کو آتا تو وہ اس سے اپنے "ذوق" کو تسکین دینے کی کوشش کرتا۔ پھر بھی ہنر دکھانے کی خواہش ہمیشہ تشنہ ہی رہ جاتی۔

رودراکانت کو یہ نکلس خود ہی گاہک کو پہنچانا چاہیے تھا۔ جیسا کہ معمولاً وہ کیا بھی کرتا تھا لیکن اس بار کام کی زیادتی کے پیش نظر اُس نے اپنے پتا کو بھیج دیا۔

راستہ ذرا طویل تھا اس لئے رادھاکانت تنہا جاتا ہوا گھبرایا تو اس نے نپلا کو بھی ساتھ لے لیا۔

خزاں کا موسم تھا —— طلوع ہوتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ گلیاں، ٹرام لائنیں اور سڑکیں طے کرنے کے بعد بالآخر وہ ایک عالی شان عمارت کے سامنے جا ٹھہرے۔ کنڈی کھٹکھٹائی تو دروازہ کھول کر نوکر نے اُنھیں اندر بلا لیا۔

یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں جابجا دیواروں پر روغنی تصاویر آویزاں تھیں۔ مرمریں فرش پر سبز رنگ کے صوفے اور کوچ بچھے تھے۔ سر پر ایک بڑا پنکھا چل رہا تھا، اور دروازوں پر لٹکے ہوئے گہرے نیلگوں پردے اُن کی امارت کا راگ الاپ رہے تھے۔

نپلا آنکھیں پھاڑے ہر شے کو تک رہا تھا۔ اس کے لئے یہاں کی ہر چیز عجیب اور حیران کن تھی۔ اس سے قبل فیشن ایبل رؤسا کے یہاں جانے کا اُسے کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔

گھر کی مالکہ آئی اور رادھاکانت کے ہاتھ سے نکلس لے کر اس کا معائنہ کرنے لگی۔ وہ اپنی برتری جتانے کی خواہاں تھی، اس لئے لاحاصل اور بے کار اعتراضات کی بوچھار کرنے لگی "بہتر ہوتا اگر آپ نے یہ پتھر یہاں کے بجائے یہاں جڑا ہوتا؛ اگر کنیا اس طرح کے بجائے اس طرح بنائی جاتی تو آسانی سے نکل آنے کا خطرہ دور ہو سکتا تھا۔ نکلس کے اس حصے کا سونا ایسا کیوں ہے، ویسا کیوں نہیں؟ اور اسی قسم کے سینکڑوں لایعنی سوالات کا سلسلہ جاری تھا۔

رادھاکانت مخالفت کا ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر مسکرا مسکرا کر اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا، تب مالکہ نے آواز دی۔

"دلّو دیکھو تمہارا نکلس آیا ہے"

دلّو عرف دھالیا کمرے میں آئی اور نیلگوں پردے کے سامنے ٹھہر گئی۔ نپلا کو محسوس ہوا جیسے ایک کنول جھیل کی نیلاہٹوں میں کھِل اُٹھا ہے، خوشگفتہ گل کے سے خمارین نین۔ پشت پر لہراتی ہوئی بھیگی بھیگی زلفیں، متوسط کشادہ پیشانی کا ہلکا سا خم، دو پنکھڑیوں کی مانند نرم و نازک ہونٹ بنس کی مانند لمبی گردن، سینہ کا تیکھا اُبھار —— اور بھرپور جوانی کا گدرایا ہوا جسم —— اس کے کان کی لوئیں جل اُٹھیں اور آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اُڑنے لگیں۔

شاید اُنھیں شرم و حیا نام کو بھی نہ تھی یا پھر اُنھوں نے ایسے لوگوں کے سامنے شرمانا سیکھا ہی نہ تھا، اُنھیں بھی اپنی ہی طرح گوشت پوست کا انسان سمجھنا اور یہ جان لینا کہ ان کی شریانوں میں بھی اسی طرح گرم خون گردش کناں ہے، شاید ان کے بس کی بات نہ تھی —— اسی لئے

ڈھالیا جلدی اپنی ساری کا پلّو اپنے سینے کے ابھار سے ڈھلکا دیا، اور نکلس پہن کر دیکھنے لگی۔

ٹیلا نوجوان تھا اتنا عریاں اُس نے کبھی قریب سے نہ دیکھا تھا۔ اسکی آنکھیں چمک اٹھیں، چہرہ سرخ ہو گیا اور جسم میں خون سرعت کے ساتھ دوڑنے لگا۔ اس کے حواس خمسہ ڈھالیا کے خوبصورت جسم کو جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھائے جا رہے تھے۔

رادھاکانت کے دماغ میں ماضی کی دھندلی تصویریں اُبھرنے لگیں، ڈھالیا کو دیکھکر اُسے اپنے خاندان کی عورتیں یاد آگئیں ——— وہ جوان بھی تھیں ——— اتنی حسین نہ تھیں ——— کالی کلوٹی حسن سے عاری! اور ایسی بھرپور جوانی تو اس نے کہیں بھی نہ دیکھی تھی۔ پہلے اُس نے اپنی بیوی پر غور کیا، پھر دونوں لڑکیوں کے بارے میں سوچا اور پھر بہوؤں کے ایک بیک ہجوم تاثرات سے وہ پریشان ہو اُٹھا۔

نکلس اس کی اُبھری ہوئی چھاتیوں کے درمیان جگمگا رہا تھا، کون زیادہ خوبصورت ہے۔ لاتعداد جواہر ریزوں سے مزین یہ نکلس یا ڈھالیا کا پیارا پیارا مکھڑا ——— رادھاکانت فیصلہ نہ کر سکا، وہ بس انھیں دیکھے جا رہا تھا ——— نکلس ڈھالیا کے گلے میں بہت اچھا لگ رہا ہے اس نے سوچا۔

نکلس اور اس کا بنانے والا دونوں قابل تعریف تھے اور در اصل اسی لمحہ رادھاکانت نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی بھی کچھ قیمت رکھتی ہے۔

ڈھالیا گردن کے پیچھے دونوں ہاتھ لے جا کر رادھاکانت کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی اور ذرا شکایت آمیز لہجے میں بولی۔

"کاریگر صاحب دیکھئے یہ کنٹھا کتنی سخت ہے ———؟"

رادھاکانت فوراً اپنے ہوش میں آگیا، وہ کرسی سے اُٹھا اور اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ ٹیلا ارادتاً اس ہلکی شکن پر غور کر رہا تھا جو اس کی گردن سے ڈھلوان شکل میں قمیص کے اندر چلی گئی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے اپنے مالک کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔

ڈھالیا ہنسی اور کہنے لگی۔

"ٹھیک؟ ارے تم نے تو اسے خود تیار کیا ہے، پھر آخر ٹھیک کرنے میں اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے؟"

ذرا جھینپ کر رادھاکانت نے جواب دیا۔

"لیجئے ٹھیک ہو گیا۔ ذرا سخت ضرور ہے، اس لئے کہ ابھی نیا نیا ہے۔"

پھر وہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

ڈھالیا ہنستے ہوئے تیز تیز قدم اُٹھاتی گھر کے اندر چلی گئی۔

ٹیلا غائب ہوتی ہوئی شبیہہ کو بے خیالی میں دیکھتا رہا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اس کا نقرئی قہقہہ اب بھی فضا میں گونج رہا ہو۔

ڈھالیا اپنے کمرہ میں قدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر دیکھنے لگی کہ ہار اس پر کیسا پھبتا ہے۔ چند منٹ بعد وہ پھر تیز چلتی ہوئی واپس لوٹی اور بولی۔

نہیں سنار صاحب! یاقوت کا یہ جڑاؤ پھول یہاں اچھا نہیں معلوم ہوتا، اسے نکال دیجئے اور نکلس کو ذرا چمکا تے بھی لائیے گا۔ دیکھئے کل ضرور واپس آجائے ——— بس جائیے، کہکر وہ دوسری طرف مڑ گئی۔ پھر سلام کرنے کے بعد دونوں سڑک پر آگئے۔

ٹیلا اور رادھاکانت آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ دونوں خاموش تھے، ایک جوان تھا ——— اپنے استاد کا فرمانبردار۔ دوسرا بوڑھا لیکن ایماندار اور پاک باطن!

کچھ دور جانے کے بعد رادھاکانت نے ٹیلا کو مخاطب کیا۔ ٹیلا ٹھہر گیا رادھاکانت نے نکلس کا بکس اُسے تھماتے ہوئے کہا۔ کہ

"تم اسے لے کر گھر چلے جاؤ، میں ذرا ایک گاہک کے یہاں ہوتا ہوا آؤں گا۔ مگر دیکھو بکس سے خبردار رہنا!"

"بہت اچھا حضور" ٹیلا عقیدت سے بولا۔ اُس نے اپنے مالک کی اس روش پر اظہار پسندیدگی کیا۔ بکس کو اُس نے دل کے قریب کوٹ کی جیب میں دبا لیا، اور آگے بڑھا ——— مسرت و شادمانی اُس کی رگ و پے میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی۔

کچھ دور جا کر ٹیلا ایک سنسان پارک میں ہو لیا، وہ نکلس کو صرف ایک بار اپنے ہاتھ سے چھو لینا چاہتا تھا۔ اسے چوم لینے کی خواہش اس کے دل میں انگڑائی لے رہی تھی۔ ایک درخت کے نیچے سائے میں بیٹھکر اُس نے احتیاط سے بکس کھولا۔ مگر یہ کیا ———؟ نکلس کہاں گیا؟ اُس نے اپنے آس پاس تلاش کرنا شروع کیا، اِدھر اُدھر گھاس پر ٹٹولا۔ کپڑوں کی ایک ایک پرت دیکھ ڈالی، لیکن افسوس اس کا کوئی نشان نہ ملا ——— دنیا اسکی آنکھوں میں تاریک ہو گئی۔ اب کیا کرے؟ اسے کہاں تلاش کرتا پھرے۔

وہ کچھ سوچ نہ سکا۔ چپ چاپ وہیں بیٹھا رہا۔ جیسے اس کی مت ماری گئی ہو۔

ادھر جب رادھا کانت گھر میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ پٹلا اب تک واپس نہیں لوٹا ——— وقت گزرتا گیا۔ ہر شخص بے چین ہو اُٹھا، اور کانت غصے سے بے تاب ہو کر چلا یا۔

"کمینہ بھاگ گیا!"

اور پھر ایک لمحہ انتظار کئے بغیر اس نے تھانے میں رپورٹ لکھوا دی۔

سہ پہر کے قریب پولیس نے پٹلا کو گرفتار کر لیا۔ نکلس کا خالی بکس اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ کچھ کہے بغیر اُسے حوالات بھیج دیا گیا۔

تین دن کے بعد عدالت میں اس کا مقدمہ ہوا۔ رادھا کانت کی گواہی پر پٹلا ایک سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔

پٹلا نے کوئی تاویل پیش نہ کی، اب اُسے ہتھکڑیاں پہنائی جا رہی تھیں تو اس نے نکلس کا خانہ اپنے پاس رکھنے کی التجا کی۔ پھر اُسے دل کے قریب کوٹ کے نیچے رکھ کر وہ لاپرواہی سے پولیس کی لاری میں جیل کی جانب ہو لیا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس بکس میں آخر ہے کیا؟ اس لئے ہر شخص اس کی اس مجنونانہ حرکت پر محض ہنس کر رہ جاتا تھا۔ ہاں "وہ" جو نظرِ مردم سے پوشیدہ انسانی دماغوں کے رازہائے سربستہ سے واقف ہے ——— ہاں شائد صرف وہی اس غریب لڑکے پر خندہ زن نہ تھا۔

دو سال کے بعد رادھا کانت یکایک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گیا۔ تب رودرا کانت کو اپنے پتا کی تجوری کی کنجی سنبھالنا پڑی۔ اس نے اسے اپنے کنجیوں کے گچھے میں ڈال لیا۔

سرادھ کا تہوار آیا اور گزر گیا۔ ایک دوپہر رودرا کانت نے اپنے پتا کی تجوری کھولی تو اُس میں چند روپوں اور گنیوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ تعجب سے رودرا کانت نے میز پر رکھے ہوئے کھاتے ایک طرف لڑھکا دئیے۔ وہ سمجھ نہ سکا، کہ آخر اس تجوری کے بارے میں پتا جی تمام عمر اس پر اعتماد نہ کر سکے تھے۔ اس نے تجوری جھاڑ پونچھ کر صاف کر دینا چاہی۔ سارا کوڑا کٹ نکال دینے کے بعد جب اس نے تجوری میں چھپا ہوا سُرخ کپڑا اٹھایا۔ وایک نکلس اُس میں سے نکل کر فرش پر آ رہا۔ رودرا کانت نے جلدی سے جھک کر اُسے اٹھا لیا، اور وہ بغور دیکھنے لگا کہ یہ بالکل نیا نظر آ رہا تھا۔ اس کے موتی اسی آب و تاب سے درخشاں تھے۔ چمک دمک میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ البتہ دو بالوں کے کلپ اس کے جواہر ریزوں میں اٹکے ہوئے تھے۔ رودرا کانت نے دماغ پر زور دیا کہ آخر یہ کس کا ہے اور یہاں کیسے آیا!

یک بیک اُسے یاد آ گیا کہ یہ نکلس وہی تھا جس کی خاطر پٹلا نے جیل کاٹی لیکن پھر ——— ؟ لیکن آخر یہ اس کے نیک اور پارسا والد کی تجوری میں کہاں سے آیا؟ اُس نے اس گتھی کو سلجھانے کی ہمیشہ کوشش کی لیکن کسی فیصلہ کن نتیجے تک پہنچنے سے قاصر رہا۔

(مترجم:۔ عابد سہیل)

بھارت میں چودہ نئے شہروں کی تعمیر

پانچ لاکھ اشخاص کو آباد کرنے کے لئے وزارت بحالیات کی کوششیں

بھارت سرکار نے پاکستان سے بے گھر ہو کر آنے والے لوگوں کو پھر سے آباد کرنے کے لئے جو کام شروع کر رکھا ہے اس کا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ صاف ستھرے اور صحت افزا قرب و جوار میں بہت سے نئے شہر تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ بھارت یونین کی آٹھ ریاستوں میں اس قسم کے چودہ نئے شہر زیرِ تعمیر ہیں۔ ان شہروں کی تعمیر کے لئے جگہوں کا انتخاب احتیاط سے کیا گیا ہے۔ ان چودہ شہروں میں مجموعی طور پر چار لاکھ ستر ہزار بے گھر لوگوں کو رہنے کی جگہ حاصل ہو گی۔ ۱۔ بیراگڑھ (بھوپال) ۲۔ الہاس نگر (کلیان) ۳۔ کبیر نگر (احمد آباد) بمبئی۔ ۴۔ گاندھی دھام (کانڈلہ) کچھ۔ ۵۔ فریدآباد (گڑگاؤں) ۶ پنیلو کھیڑی (ضلع کرنال) ۷۔ چنڈی گڑھ (ضلع انبالہ (پنجاب) ۸۔ راجپورہ ۹۔ تری پوری (پٹیالہ) پیپسو ۱۰۔ پرتاپ نگر (اودے پور) راجستھان ۱۱۔ گووند پوری (مودی نگر) ۱۲ ہستنا پور (ضلع میرٹھ) ۱۳ تابڑہ ناتی کاچی (نزد کلکتہ) ۱۴۔ فلیا (ضلع ندیا)

آوارہ

کھُدائے میاں

سُنی نہیں دیکھی کہتا ہوں بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے رکھے رکھے ان پر دیمک چڑھ گئی ہو اور چند یا سے لے کر تلووں تک جسم کا سارا اُبرا چاٹ کر جھڑی ہو اور ایک لمب لمبا گھنونا ادھوڑی استر کا ہیولا اندر سے نکلا ہو۔ یا نہیں تو کسی نے گھورے پر سے گدھوں کی جھوٹھن سوکھی ہڈی پسلیاں بین کر آدمی کے سانچے پر ایک کھانکڑ سجائی ہو۔ اور اس پر سُوت بھر موٹی کچے گوشت کی تہ جما کر چکنے سپاٹ تالو کی کھوپری چڑھا دی ہو۔ اس کھوپڑی پر چھوٹی چھوٹی بے ترتیب سفید چتیاں ڈال دیجئے اور خالی گڑھوں کے اندر کیچڑ پانی بھر کے ان میں دو پھوہڑ آنکھیں اس طرح تیرا دیجئے کہ پڑی رستی بہتی رہیں اور بھوکی پیاسی مکھیوں کے لئے بھوجن بھنڈارا کھلا رکھیں۔ اس کے ساتھ ہی کلّوں سمیت ٹھڈی اور ان کا جھوک سنبھالنے کے لئے کن پٹی اور گدی پر چیکٹ چکنی بال بڑھا دیجئے اور نانا رمضانی کا سراپا ختم سمجھئے۔

کہولت اور فرسودگی کے لحاظ سے نانا کو میرا اس رشتے سے پکارنا اس غلط انعام کا نتیجہ تھا جس میں چھوٹے سے بڑے تک میرا سارا کنبہ مبتلا تھا۔ ورنہ یوں کہ روایت در روایت کے بموجب اور خود نانا کے حساب سے گاجلدی[1] حیدر کا جب گدی بھئی ہے تب ہم رہیں پکی دو دی بیگھہ جمین جوتے بربرت چھٹی چلے کے فرق سے ان کا اور میرے پردادا کا سن ایک تھا اور چاہے آج نہ مانوں اُن دنوں میرے لئے آیت حدیث تھا۔

قوم کے شیخ، پیشہ کا شتکاری اور نہ جانے کتنے خیراتی، بغاتی، شبراتی بقریدی نام کے پرپوتوں اور رحیمن، رسولن، حیدن، حیمن، بتولن پرپوتیوں سمیت بچ گھر کے باوا آدم رمضانی نانا کو ابّا مرحوم سے اور ان کے سلسلے میں مجھ سے بڑی محبت تھی اباکو انہوں نے یقیناً دیکھا ہوگا مجھے صرف سُن سکنے تھے۔ یوں تو اپنی اپنی فصل پر "ننھے بھیا" کے لئے رس کے گھڑے گُڑ کی بھیلیاں گنّے کی پھاندیاں، شکر قند، آلو، ہرے بوٹ، مٹر کی چھیمیاں، گھی دودھ، دیہاتی سوغاتیں آتی رہتیں مگر برس کے برس جب خوب اُمس ہوتی، بادل گرماتے گھمنڈ گھمنڈ گھٹائیں چھاتیں، جھولے پڑتے، کڑھائیاں چڑھتیں، اور زمینداری کی پرانی ریت جگانے کے لئے ہمارے چوک میں آلھا کی سبھا جُڑتی بوا جاتا اور دیا بتی ہوتے ہی اُجلی دھوتی، گاڑھے کے کرتے، کاندھوں پہ لٹھ دیہاتیوں کی ٹولیوں پر ٹولیاں آتیں، نرمل چلتے، گھریلو دس سیر کے دھوئیں بکھرتے۔ تب مہمانوں میں سب سے دیدار و خود رمضانی نانا اونچے پالیں کے تخت پر کھاروے کی گدیلی گاؤ تکئے کے سہارے، ابا کے پاس بیٹھے ہوتے، اور جب "زیل" کی کڑکڑ اور "بم" کی دھوں دھوں پر الھیا جھوٹ موٹ باتیں بات میں میان اور سیدھے سے قبضہ پکڑ کے شپ سے تلوار کھینچتا اور پینترا بدل کے تیوری چڑھا کے کڑکتا کہ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ بھالا بولیں سَن سَن سَن سَن چلے تروار۔ تو ایک دفعہ کو نانا کی چپ چپی بے رونق آنکھوں میں جوانی کی جوت اُمنڈ آتی۔ جھُرّیوں پر کانپتا ہات "انٹی" کی طرف جاتا اور الھیا کی آواز پر چھن سے روپیہ گرتا سُنائی دیتا۔ اور رات بھیگے آلھا ختم ہونے تک الھیا کی سَن سَن کے ساتھ نانا کی چھن چھن چلتی رہتی۔

اسی طرح پانچ چھ دن تک دودھ ملیدہ کھلتے، دم پہ دم حقہ گڑگڑاتے رمضانی نانا پورا "آلھ کھنڈ" سُن کر آنے والی برسات تک کے لئے ہم سے بدا ہوتے اور اپنے درجن بھر لٹھ بند خیراتیوں شبراتیوں کے جھرمٹ میں بلی پر لدے ہوئے گاؤں سدھار جاتے۔

خدا صاحب کی بھی ایک ذات ہے! اور اس کو انہوں نے اتنا گنجلک اور پیچیدہ بنا رکھا ہے کہ اچھے اچھے بوجھ گئے اور ان کی پہلی نہ بوجھ سکے لیجئے تو جب کوئی کہ صاحب دکھائی دیں۔ سناٹی پڑیں، سوکھنے کے ہوں

---

[1] اودھ کے پہلے تاجدار بادشاہ "غازی الدین حیدر" ۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء

کر چکھنے میں آئیں یا چھوٹے جائیں ـــــ مگر یہ ہماری آپ کی بات ہے۔ دریا پر کے کاشت کار شیخ رمضان علی "کھدلئے میاں کے ہوآں" گئے تھے ان کو ان آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور عالم سموات کی ملکوتی فضا کی سیر کر کے گانوں کی گبریلی اور سڑے ہوئے بھوسے سے مہکتی ہوئی دنیا میں لوٹ آئے تھے! جھوٹ سچ راوی کی گردن پر!

ساون بھادوں کے اجلی بادلوں سے جھکی ہوئی اندھیاری رات۔ جھینگروں کی سریلی جھنکار سے گونجتا ہوا دیہات کا سناٹا۔ ہوا بند۔ پسینے جاری۔ مردانی بیٹھک کا پیش دالان۔ تختوں کے چوکے پر گاؤ تکیہ لگائے کھجور کا پنکھا ہلاتے ہوئے والد مرحوم ـــ ننگے بدن پاجامہ پہنے آموں کے رس سے جگہ جگہ چپ چپاتا، انھوں نے ہی ہوئی پیٹھ بار بار کھجاتا میں ـــ کھوں کھوں کھانستے کھری کھاٹ پہ اکڑوں بیٹھے ہوئے نانا رمضانی، کڑوے تیل کے چراغ کی میٹھی روشنی میں "باپ بیٹا روح القدس" معلوم ہوتے تھے۔

"میر صاحب کا ننھے بھیا سوئے گئے؟"

ابا ـــ "ہاں شیخ جی سویا ہی سمجھو"

"ونڈا بنانے کے جلدی ہوئے گوا ہے ـــ لے اب تم ہیں بتاؤ کھدلئے میاں کی باتیں بچن سے کہی جات ہیں؟ کوؤ لنترا جائے کے ہوآں لگائے دے تو گجبئے ہوئے جائے۔ کھدلئے میاں سودھے ہیں تبھیں تک سودھے ہیں، آئے گئے انوادی پن پہ پھر کھیر نائیں ہے' پاتا لے ماں گبڑ بنی دھری ہے" ـــ ہاں تمری بات، الگ ہے، تم تے ہم کا اجر نائیں ہے۔

میر صاحب ایسکا بھئے ہوئیہیں برس بیس اک جاڑن کے دن، رات کی بریا اس تسار کٹکٹ رہے، مارے ہاتھن پاین کی کلیجی جمی جائے۔ ہم لہاپھ اوڑھے بُرد ٹھا میں چھپتیا پہ پڑے رہیں۔ سینتی کلوا گو کر کوں کوں کرت، دانت کٹ کٹا دت دم دبائے دبکا رہے۔ اتنے ماں جنجیر کھڑکھڑائے کے کوؤ گرد! رمجانی میاں ہیں کا؟ ہم سمجھن گنگوا ہمری بھریا کا چھڑائے کے لاوا ہے' گجراج سنگھ کی بگیلکے دوئی بردا چاب بہس رہے' تون اٹھائے کے کانجی ہوج ماں سنگوائے دہن رہیں۔ ہم کہا گنگو بھیا، اب تو ہم تے اٹھا ناہیں جات ہے، رتوندھی آئے رہی ہے تم بھینسا کا تو دلؤ باندھ اور بھوربرا ہوئے دیئو ساسر گھر جولکے رہی کھپڑی مار نکھن نہ پھاڑ دے ای تو ہم کا سیکھ رمجانی نہ کہیئو ـــ ہاں! پھر جب داخل ہوئے جائے چہے موڑ کٹ جائے" یہ سن کے لاگے "گنگو بھنگو کا لگائے ہوؤ ددھا کھلو کر کری ہم کو نوں اور تجبیج پھر گلا نہ ہوئے۔ یاک لات ماں تمرے دوؤ نوں پیٹ چت ہوئی جیہیں، جانت ہوکو آئیں ہم؟ اسے ہم آئیں پھرتے! تم بڑبڑ کے جاؤ، ہیاں اڑت اڑت ہمار نکھنا پھاٹے لگے" کا بتائی تہہ تے میر صاحب، اٹھے کا پڑا! ـــــ دروجا کھلتے دوبو پھرنتا ہیڑ بھڑ لئے کے گذ گذ کرے ہمری کھٹیا کے پاس ـــ اور کلوا کو کر جو دیکھیں پوکا؟ چہرہ مہرہ مولبن کا، پنکھنا گودھی کے۔ بس بڑھ کے ٹھوا اور ہمرے دھوت دھوت کے کہے نے گوا پچھے کا گچھا پرن کا نیچ کے۔ تب ہم بولے "کہو پھرتنوا لاگی اکل ٹھکانے؟ اب تو نہ ایتو رمجانی میاں کے گھر؟ آورے کہے لاگے" ہمری کون گنج اگی رہے تم تے۔ ہمکا ہکم دین گوا اے کہ سیکھ رمجان کا ترنت ہاجر کینھ جائے ـــ آئے کا پڑا ـــ ے اب لٹیا لٹیا پانی پلائے دیئو، اور چلو تم کا کھدلئے میاں بلاؤن ہیں ـــ ہم کہا کون ٹھاکر ہو؟ پانی آنی پٹے کا ہوئے، تون سکھر پہ تجرا کی روٹی اڑد کیر دال رسلیا پکائے کے دھر گئی ہے' بٹکی بھر اگھر کا گھیو ہے' کھائے کے پانی پیؤ باہر پکی گیا ہے ہوآں گلا دانوں کے کے چلم تماکھو ہوئے جائے پھیر بیستلے سے کھدلئے میاں کا کسن ہیں، کا ناہیں کہی ہیں سنے کا ہم تیار ہیں۔

یہ سن کے میر صاحب پھرتتے مسکیائے' اور بولے گاج پڑے تم پہ رمجانی میاں' ہم جانت رہیں تم ہوئیہو کوؤ بڑے گیانی' تبھیں تو کھدلئے میاں اتی بریا تمکا بلائے کھاتر ہمکا پٹھئن ہے ـــ تم تو نکسے نرے مورکھ بنیدھے!

یہ بات سنتے میر صاحب۔ دینھ مارے گسا کے بھسم ہوئے گئی اور ہم تھرتھرائے کے بولن" سنو پھرتنو اب تو ہم کھدلئے میاں کے ہوآں نہ جاب! کاہے پوچھو تو، رُکا نہ پرچا' اٹھلئے کے رات کی بریا پہلے دہن دوئی پھرتنا! مانو رمجانی میاں کیر کوئی مرجاوے ناہیں۔ بلاؤن ہیں تو بلا وا کریں

ا دروازہ۔ ۲ لیٹے۔ ۳ چلایا۔

۱ تجویز۔ ۲ گلا۔ ۳ فرشتے۔ ۴ یا آؤ۔ ۵ یہ کیا۔ ۶ گدھوں۔ ۷ چھینکا۔ ۸ بھیجا ہے۔ ۹ ٹھینگا۔

وُہ کھدائے میاں ہیں تو ہم ہُوں رجّان میاں ہیں! جانیو؟ دیبے ہمار سینگ[1]!
رگڑ رگڑ مرگوا سار تعلّنے دار تحصیلدار۔ بلائے نہ پاوا۔ رَپ ٹَپ کرت
تلنگا آئے، صاپھا باندھے ہیٹی لگائے چپراسی چھوٹے۔ ہم ہیو نہ جانا
کَون کو گُر آئیں! تم تو ہو پھرتیمے! اب اپنی کھیر سلّا چاہت ہو تو چُپّ چاپ
چَل دیو، ہم تو نہ جاب — تم ہَجّ کا جَنماہی کھدائے میاں ہمرے نسکھو۔ کاکا
جُلم کمن ہیں۔ ہمری تمھاری اِنہیں کے گھر گئی، ہمری نہردا اِن کے بجر بھئی، کتّا کتّا
منّت چرودری کیہا، ایکے بُڑھوتی بریا ایکا تو نہ مارو! کھدائی میاں کہاں سُنِنیا!
آٹھ بیٹا چھ بٹیاں، ورنہ جانے کتنے ناتی پوتے۔ ہمرا بھرا گھر کھالی ہوے گوا،
اب ہمکا بُلاوت ہیں تو ٹھا گُر ہم تو نہ جاب!! ہتجار بیگما زبّی کھڑی سنائے
رہی ہے، مہوٹیں نائیں بھٹیں ہنچا ہی کرائے کا ہے — اب تُرے کھدائے میاں کے
پا چھے ہاتھ جوڑے جوڑے کو گھوٹے، ہمرے پاس تال تلیا کی کمی ہے کا؟ پھر یہی
مَہنا کی پندرہ کا ہمرے ہیچاتی کی سلمانی ہوے کا ہے گا ٹوں بھرے کی مجبانی کرے
تم اَیّو کا؟ ناہیں بھیا ہمار جانا تو ہوے نا سکت ہے۔ بس تم جائے کے سبکا
دُآ بندگی کہیو اور کھدائے میاں سے کہدیو نہ کہ ابھیں تک ہم تمری نِہدکیر
دیکھ بھار کے لیت رہِن، تو اَچھیرا دِرائے کے ابھیں گبری کرائی ہے۔ اِیبکر یہ
کا مُولبی آئے کے اپنا ماتُول لے جات ہے۔ اب ہم تے ناہیں ہوئے سکت ہے
اپنی مَہجد آپ سنبھارو!

مُنتے میں جان پڑلکے بر ودھا ماں کو ڈالاڈ سلگائے دہِس۔ مار پنّن
کے پسینہ چھوٹے لاگا۔ بتیائے کے لما یَہ جو دیکھت ہیں تو کا ہے! ددمنوں
پھر تیا ہمری چر پتّیا کے بِیچ[2] ٹھا رسے اور دوان کی آنکھیں بھک بھک ماتو
مسا ارِش[3] بیر رہی ہیں۔ دیکھت دیکھت ددنوں ہمری اور اس جَھپٹے جس بسکرا
گرگھیا کا پکڑے جھپٹت ہے۔ بگلن ماں دے کے ہاتھ ہمکا کھڑ نکے دِہِن، اور
کہے لاگے "کے بَل ہتسی سے نہ مَنہہ، اب تم کا ہم جبردی سے جاب، لے دے کا بھو
ہوئے توں تے لٹیو، آگے تم جانو۔

کہے والی بات ناہیں ہے میر ساہیب۔ تم تے کا بتائی چلے کا پڑا۔ ہم کہا
"بھائی کھونٹی پر چادر اہے توَن اور انگوچھا لیئے دیو، گھرجی ماں ستوا، گُرگا،
ٹٹیا ڈَدر، اور ہمرے گھر آؤں ٹارے کا ہے۔ تماکھو کبر ٹپلیا دَھرے کا ہے۔ لیٹھ
ہم ہاتھ ماں رکھب اور مزیل پہیت چلے چلب!
سب تیاری ہوئے گئی، تب یاک پھرتیا جَون تنک گبرو رہے، اُٹھائے
کے ہمکا اپنی گھینچ پہ دھر لیس۔ اور دوسر جَون بُڈّھا رہے گھرجی لادِس۔
اور جَھٹ پھٹائے کے پنکھنا ددنوں اُٹھت ہیں تو سَن سَن کرت اُڑے
لاگے آسمان کی اور۔ رہے اندھریا، پاکّ چندھیا[1] نکسی نائیں رہے،
بہو نہ دکھائی پڑے، کنگھے جات ہیں کنگھے ناہیں جات ہیں۔ مار اُڑے
جائیں اُڑے جائیں۔ تماکھو سُسر چِز کے سپلھا ہوئے گئی۔ نرمل کمر پانی
جسم کے ربڑی بن گوا تب جائے کے پھر تتن کے پنکھنا ڈھیل بھئے اور ہم
کا گُم تے اُتار دہِن۔ ہم کہا "بھیا کون گانوں آوا؟ ہمکا تماکھو پیئے بجوز
جائے کا ہے۔ کہوں چلم بھرے کی آگ ملیہے کا؟" پھر تتے بولے چاہیں ہو بڑھتو
بَک بَک نہ کرو، یہ آسمان ہے، کھدائے میاں نگھیئے[2] گئے ہیں۔ پھاٹک لگی
رہے، اور سَر دپہرے دار کُلپھ[3] ڈارے بھیتر پرے اونگھات[4] رہیں، کھٹکا
ہوتے ہڑبڑائے کے اُٹھے اور لگے سبکا گریاوے[5]، پھر تتے ہمار جَنیہ کرائن
تب کہوں پھاٹک کھلی۔

میر ساہیب کا بتائی تم تے، پھاٹک کھلتے کا دکھائی دیا یہ جو سوچ
نائیں ہیں توَن اور جُنددھیا ددنوں مل کے چھوی چھپلیا کھیلیں اور
لُدھوی لُدھوا، تین گانٹھ کیر پتیا لیے پا چھے پا چھے گھومیں۔ ہم کہا یہ
دیکھو ہمیاں آنے کے پڑے ہیں، تبھیں ہمرے ہمّاں اندھریا چھائے رہی ہے۔
آسمان باگ بگیچا تے پٹا پڑا رہے، آم، امرود، نیبوا، نرنگی، پستہ، بدام
اور بھولن ماں گُلّا بانس، گیندا، دوپہریا کھلی رہے۔ روس پٹی بنی پھوارہ
اُڑت رہیں۔ اور میر ساہیب پیر پیمبر بجرگ جتنے گجرے ہیں نا، سب کے
سب ہوئیں پڑاؤ ڈارے ہیں، آجو کرت ہیں نماج پڑھت ہیں اور جو
منّت مراد مانگو سب کا دیت ہیں، ہم سب کا جھک کے بندگی کیا اور
ہاتھ جوڑ پاپا کھائے کے کہا گیاں سنسار اب رہے والا نائیں رہا، جو نٹھ
کپٹ، جُور جُلم بہت ہوئے لاگ ہے۔ جمیندار، ساہوکار ریت کا کھون
پیئے جات ہیں تحصیلدار تکابی بانٹے آوا رہے، دس دَمڑی کے ددی اپنا
کھَک کاٹت رہے — اور جب سے تو تعلنے دار آوا رہے، اِلا کے بھرماں

---

[1] ٹھینگا۔ [2] نوشا۔ [3] ہنگیے۔ [4] مشتعبیں۔ [5] ٹشکایا۔ [6] گھریلو چڑیا۔

[1] چاند۔ [2] ٹٹی۔ [3] چپ۔ [4] تفل۔ [5] اونگھنا۔ [6] گالیاں دینے

بگ لگائے دیس ہے گھر پاچھے بکرا اور گھیٹو کا رہتا بیت ہے' نہ دیکو پھوجدا کی ماں چلان کئے دیت ہے ۔ اب کو نو اس اُپلے کے دیؤ سب سارن کا تہس نہس ہو جائے"۔

یہ بات ہوئے کے پھرتتے ہمکا لئے کے آگے بڑھے ۔ چلے کا تو ہم چلن' مل جیو دَھک دَھک ہوئے لاگ' کپکپی چھوٹی جائے بل بل پسینہ چھوٹے ۔ اُتے ماں پھرتتے پکر ہمری کھینچ جھکائے دہن' اور بولے' سکھ رمجانی دہ سمجھے کھدائے میاں بیٹھے ہیں"!!

ہمری آنکھ جھپک گئی پھر جو دیکھن تو نکھت بچھی ہے اور آس دمکت ہے مانو سونا کیر بنی ہے' ہیرا موتی جھک جھک کے رہے ہیں۔ بیچ مل کے گلیچہ پہ رُآب سے بُو بڑا ڈاڑھا لگائے کھدائے میاں بیٹھے ہیں۔ صورت اپنا ہوئے رہی ہے۔ مارے جوت کے آنکھ نائیں ٹھہرت ہے' چاریوں اور اس پر بھی رُپئین کے ڈھیر لگے ہیں' ساتوں جات کیر اناج کٹھین ماں بھرا پڑا ہے' سال دُسالا پھیلے ہیں ۔ چُندری کی اُڑھنی' مسرو کا لھنگا' ہاتھن گھڑ دا پاؤں ماں پیجن' گلے ماں چندن ہار لگا رہے سہاگن رہیں ۔ ماتھے پہ بندیا مانگ بیچ سیندر بھرے کھدائن پیڑھا پہ بیٹھی بھو ئیں بھو ئیں چرکھا کات رہیں' ہم کا جو دیکھن گھونگھٹ کاڑھ جھٹ پیٹھ موڑ لہن ۔ اتے ماں کھدائے میاں پوچھن "کیکا لائیو پھرتتو؟" کہن' دریا پر کے سیکھ رمجانی کا لاش ہے ۔ یہ سُن کے کھدائے میاں بتلائے کے گستاں اور کہن کا تم دونوں بوڑاے گئے' ارے ہم اُٹھیلا کسد مجان کھاں کا بلائے ہُکم دیا ہے' نے جاؤ ان کا سنبھار کے گھر پہنچائے دیؤ" ہم تے بولے' ماپھ کیو رمجانی میاں پھرتتی تے چُوک ہوئے گئی ۔ یہ سُن کے ہمار دیہہ میں دم آوا' سلام کہا اور اُلٹے پاٹن لوٹ پڑے' اب ہمکا لاگی رہے حُکاس' پیٹ پھول کے نگارہ ہوئے گوا ۔ پھاٹک پر لاؤ لگائے دس بیس پھرتتا ہاتھ تایت رہیں ہم ہوں جائے کے نریل نکالا' چلم کیر گُٹی کہوں گر گئی رہے' ڈھونڈ ڈھانڈ نئی گُٹی لاٹن' پٹلیا تے کلکتیا تماکھو' گھر کے سیرا ماں کنڈا رہے تون جائے کے کنڈا کیر آگ دھر کے دوئی تین دم لگاوا تب جائے کے بادی اُتری ۔ پھرتتے کھُس کھُس بت کماؤ کیے جائیں ہمکا دیکھ ٹھٹکے ۔ ہم کہا بھیا کا ہم جائے کے تمھارا بھید کو نو تے کہا؟ تب کہے لاگے اَسے کہ رمجانی میاں بات یہ ہے ہیاں کیر احوال بہت جبون ہوئے گا ہے کھدائے میاں بنائے کے جریبھ ہے گئے ہیں' سلار میاں مدر میاں دوگ جنے آ ئے کے ٹکے ہیں' ہمار شُبہہ تم ہوں پر رہے توں تم لوٹے جائے رہے ہو' اب تو جان پڑت ہے ۔ کھدائے میاں کا کچھ بھوا تو سلار میاں کی آسری ابھیں آئی نائیں ہے کھُدائی ندار ئے میاں کا ملیٹے"

بس میر ساہیب' ہمار بھریا اَرلئے رہی رہے' کلوا سار سٹ مارے ہمار لہا پھ اونڈھے پڑا رہے تب پھرتتے ہمکا لائے کے گھر چھانڑن' اور بھور ہوئے گئی!

بھارت کا یوم بحریہ

بحری بیڑے کے کمانڈر انچیف وائس ایڈمرل سر ایڈورڈ پیری کی نشری تقریر

گذشتہ سال "یوم بحریہ" کے موقعہ پر میں نے اپنی تقریر میں اس امر کی وضاحت کی تھی کہ بھارت کے لئے بحری طاقت کس قدر اہم ہے ۔ نیز بحری بیڑے اور تجارتی بیڑے کی تعمیر کتنی لازمی چیز ہے ۔ لیکن یہ چیز اسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے جب کہ زندگی کے ہر شعبہ کے افراد کا عوام تعاون اور عملی امداد حاصل ہو جدید طرز کے جہاز کی ساخت کے لئے صنعتوں کی ضرورت ہے ۔ لیکن یہ چیزیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جن کا سروس سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ ہمیں بنیادی صنعتوں کی ضرورت ہے تاکہ ہم خام سامان یعنی فولاد اور لوہا جیسی چیزیں جہاز کے مختلف حصوں کی تعمیر کے لئے حاصل کر سکیں ۔ لیکن ایک اچھے سے اچھے جہاز کی قدر و قیمت کچھ نہیں رہتی اگر اس کے چلانے والا اور مرمت کرنے والا عملہ بہتر آدمیوں پر مشتمل نہ ہو ۔ اعلیٰ درجے ساز و سامان کے لئے یہ امر بھی ضروری ہے کہ ملاح ایک اچھا تعلیم یافتہ اور ذہین آدمی ہو ۔

بھارت کے بحری بیڑے میں پچھلے دو برسوں میں جو کچھ میں نے دیکھا اس کا مجھ پر بہت اثر ہوا ہے اور مجھے اس بیڑے کا کمانڈر انچیف ہونے پر فخر ہے

اثر رام پوری

زین العابدین منصور

فنِ تاریخ گوئی کا ایک بے بدل لیکن گمنام شاعر

اس شاعر کا اصلی نام سیّد زین العابدین عرف منصور علی ہے۔ والد کا نام سید حسن علی۔ مولد رام پور میاں رفیع الدرجات نزہت تخلص سے تعلیم حاصل کی۔ فارسی اور اردو کی نظم میں پوری قدرت تھی۔ فارسی میں علی تخلص کرتے تھے۔ اردو میں منصور۔ تاریخ گوئی میں اُن کا جواب نہ تھا۔ مادہ تاریخ پر طبیعت اتنی قادر تھی کہ سوال کرنے والے کا سوال ختم نہیں ہوتا تھا کہ مادہ تاریخ بتا دیا جاتا تھا۔ میاں منصور سچے پکے درویش تھے۔ مخلوق سے کسی چیز کے طالب نہ تھے۔ ظاہری زینت سے نفرت تھی۔ نکاح عمر بھر نہیں کیا جب لوگوں نے مجبور کیا تو فرمایا۔

بنا مرادی من سرو کے رسید کہ من بروں ز گلشن وا ز آشیاں ہی مام
دگر ز حالت آزادیم چہ می پرسی کہ در محلۂ آزاد خاں ہی بم

رام پور میں ایک محلہ "بنگلہ آزاد خاں" کے نام سے مشہور ہے چوتھے مصرع میں اسی محلہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد میاں منصور اپنے نانا مولانا سید رستم علی صاحب کے مکان کے متصل اپنے ذاتی مکان واقع محلہ گویا تالاب میں مقیم ہو گئے تھے۔ اب مکان کا ذکر آ گیا ہے تو اس مکان کا ایک واقعہ بھی سن لیجیے۔

ایک دفعہ نواب خلد آشیاں میاں منصور علی صاحب کے مکان پر ہوادار میں سوار ہو کر تشریف لے گئے، تو میاں کو ایک بوسیدہ کھپریل کے کچے مکان میں چٹائی پر بیٹھا پایا نواب صاحب نے فرمایا کہ میاں! مجھے اس خستہ مکان میں آپ کو مقیم دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی۔ میری خواہش ہے کہ آپ کا مکان جلد سے جلد پختہ بنوا دیا جائے۔ تاکہ آپ آرام سے رہ سکیں لیکن مکان کی تعمیر سے پہلے اس کے تخلیہ کی ضرورت ہے۔ لہٰذا آپ یہ مکان کل تک خالی کرا دیں۔ میاں نے کہا میں اس کا تنہا مالک نہیں ہوں اس مکان میں میرے چند شریک بھی ہیں۔ اس لئے جب تک کل شریک آمادہ نہ ہوں میں اجازت کیسے دے سکتا ہوں۔ نواب صاحب نے رخصت ہوتے وقت اصرار کیا کہ آپ اپنے کل شریکوں کو ساتھ لے کر رات کو آ جائیے گا۔ تاکہ شریکوں کو منہ مانگی قیمت دے کر مکان خالی کرا لیا جائے۔

نواب صاحب چلے جاتے ہیں۔ وعدے کی رات آتی ہے تو میاں کو جانا پڑتا ہے۔ نواب صاحب انتظار ہی میں تھے کہ میاں نظر آئے۔ فرمایا کہ میاں اپنے شریکوں کو جلد بلا لو تاکہ معاملہ طے کر دیا جائے۔ میاں چپ ہو گئے۔ جب دوبارہ تقاضا ہوا تو بولے۔ میرے شریک کسی طرح آنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اُنھیں جبرًا لے آتا۔

نواب صاحب۔ اچھا تو سب شریکوں کے نام اور پتے بتائیے تاکہ میں پولیس کے ذریعے طلب کرا سکوں۔

میاں۔ (کچھ دیر چپ رہ کر) پولس کی کیا ضرورت ہے میں نام بتائے دیتا ہوں اس کے بعد آپ جو چاہیں انتظام کریں۔

نواب صاحب۔ فرمائیے فرمائیے۔

میاں سنئے! میرے شریکوں کے نام یہ ہیں۔

گلہریاں۔ چھپکلیاں۔ مکڑیاں۔ چڑیاں۔ چوہے وغیرہ۔

یہ سب میرے شریک ہیں۔ کیونکہ ہر ایک مدعی ہے کہ مکان ہمارا ہے۔

نواب صاحب یہ سن کر سناٹے میں آ گئے اور کچھ جواب نہ دیا۔ میاں نے عرض کیا کہ نواب صاحب! مجھے میرے ہی حال پر رہنے دیجئے۔ میں اپنے آرام کی خاطر اپنے ساتھیوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ جب یہ مکان برسات میں گرنے لگا تو جس طرف کا حصّہ گر جاتا میاں اس کے دوسرے حصّے میں جا کر بیٹھ جاتے۔ یہاں تک کہ کل مکان گر گیا اور لوگ سامان اُٹھا کر لے گئے۔ کسی کو سامان لے جانے سے روکا۔ نہ مکان کی درستی کی کسی سے خواہش کی۔

ایک حاضرباش نے گھر کے آنگن میں چھپر ڈلوا دیا تو اسی میں رہنے لگے اور وہاں سے مر کر اُٹھے۔

میاں کی عادت تھی کہ کبھی ایک ایک برس تک گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ کبھی نکلتے تو رات دن شہر اور جنگل کی گشت کرتے۔

ایک بار میاں اپنے گشت کے زمانے میں میلے کچیلے لباس میں رام پور کے ایک مشاعرے میں پہونچ گئے۔ چونکہ درباری شعراء کے علاوہ کافی تعداد میں بیرونی شعراء بھی بلائے گئے تھے اور مشاعرے کا پنڈال خاص اہتمام سے سجایا گیا تھا۔ میاں کو میلے کپڑوں میں ملبوس دیکھ کر منتظم مشاعرہ نے ڈانٹا کہ ایسی جگہ اور یہ میلے اور بو دار کپڑے۔ تم نے مشاعرے کی شان کا بھی لحاظ نہیں رکھا! میاں کو یہ فقرے ناگوار ہوئے اور بحالتِ ناراضی یہ کہتے ہوئے اُٹھ کر چلے گئے۔

گرد آلود ہے گو پیرہن اپنا لیکن   بو ترابی ہوں نظر میں نہیں کھٹا کہیر
تجھ سے کہتا ہوں کہ تو ہو خود آرائی بچہ   خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

پھر فرمایا۔

ہوس نہیں مجھے اس بزم پُر تکلف میں   گلاب و عنبر و مشک و گل و سمن کی بو
کہ آ رہی ہے مجھے آپ اپنے جامے میں   نبی حسین۔ علی فاطمہ۔ حسن کی بو

بعد کو جب معلوم ہوا کہ یہ میاں منصور تھے تو چاروں طرف تلاش میں آدمی دوڑائے گئے۔ لیکن میاں کا کہیں پتہ نہ چلا۔

بدقسمتی یہ کہ سوائے امیر مینائی کی انتخاب یادگار کے کسی تذکرے میں میاں منصور کا ذکر نہیں، اور ہوتا بھی کیوں کر جبکہ وہ نمود و نمائش کے خلاف تھے۔ اور شعر بھی ہمیشہ ضرورت اور حال کے تحت کہتے تھے۔ کلام کو نہ خود لکھتے نہ لکھنے کی کسی کو ہدایت کرتے سننے والوں کو جو یاد رہا وہ متفرق طور پر لکھ لیا گیا لیکن زمانے کی دست برد سے وہ بھی نہ بچ سکا۔

میاں منصور سجع تضمین بالخصوص فن تاریخ میں یکتائے روزگار تھے۔ منیر شکوہ آبادی بھی اُن کی تاریخ گوئی کے خاص طور پر مداح ہیں۔ فرماتے ہیں۔

فنِ تاریخ میں رسا منصور   جان صاحب کی ریختہ پیاری

کلام کے چند نمونے یہ ہیں۔

تصوّف

طلسم دہر جو دیدم بچشم من ہمہ نیست   بانجمن بجز آں سیر انجمن ہمہ نیست

شمیم پیرہن یار عطر افشاں شد   دگرنہ بوئے گل و نکہت سمن ہمہ نیست
بغیر انجمن آرا بچشم خود دیدیم   سرود و بادہ و ساقی و انجمن ہمہ نیست

رہبری خضر کی معلوم ہے اس کوچے میں   بیری وحشت مجھے لیجائے تو کچھ دور نہیں۔

تضمین ما مقیماں کے چند اشعار

تم نے غنچے سے کیا دکھایا منہ   رُخ بدنیا و دیں نمی آریم
ہائے یہ دن بہار کے اور ہم   اوفتادہ جدا از گلزاریم
جیب سے سونگھی ہے زلف یار کی بو   فارغ از نافہ ہائے تاتاریم

سجع

کسی شخص نے خواہش کی کہ میاں! مولوی محمد گل صاحب کا سجع اس رعایت کے ساتھ کہہ دیجیے جس میں اُن کے پیر میاں سبحان شاہ صاحب کا بھی نام آ جائے۔ فرمایا

بگلزار سبحاں محمد گل است

تاریخ گوئی

رام پور میں جب موتی مسجد بعہد نواب سید محمد سعید خاں ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں تعمیر ہوئی تو نواب صاحب کی فرمائش ہوئی کہ جس شان کی مسجد ہے اس کے لائق ہی تاریخ ہونا چاہیئے۔ اعلان کا ہونا تھا کہ شعراء کی طرف سے تاریخیں اتنی پیش ہوئیں کہ انبار ہو گیا۔ لیکن کوئی تاریخ نواب صاحب کے مذاق کے مطابق نہ نکلی۔ اتفاق سے میاں منصور کے ایک حاضرباش سے نواب یوسف علی خاں صاحب ناظم تخلص نے جو اس وقت ولی عہد تھے فرمائش کی کہ میاں سے کوئی تاریخ کہلوا کر لاؤ۔ چنانچہ کُل واقعہ میاں سے بیان کرنے کے بعد ولی عہد صاحب کی استدعا کی بابت عرض کیا گیا۔ میاں نے فرمایا کہ "بھائی میری طرف سے کہہ دینا کہ منصور کے نزدیک مسجد کے لئے کوئی تاریخ "خانۂ خدا" سے بہتر نہیں ہو سکتی۔" خانۂ خدا کے عدد ۱۲۶۱ھ ہیں۔ جب ولی عہد کی وساطت سے یہ تاریخ نواب سید محمد سعید خاں صاحب

تک پہونچی تو دیکھ کر پھڑک گئے اور وہی تاریخ مسجد پر کندہ کی گئی جو آج تک موجود ہے۔

علی محمد صاحب نے تاریخ لے جانے والے کو انعام دیا اور فوج کا معزز عہدہ عطا فرمایا اور میاں منصور علی صاحب کا دس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر فرما دیا۔ یہ وظیفہ میاں کو آخر وقت تک ملتا رہا اور اسی میں اپنی بسر کرتے رہے۔

ایک شخص نے ۱۲۷۰ھ میں حاضر ہو کر استدعا کی کہ میرے خالو کا انتقال ہو گیا ہے کوئی تاریخ کہہ دیجئے۔ ابھی سوال ختم نہ ہونے پایا تھا کہ فرمایا "خالو خالو" یہی مادۂ تاریخ ہے۔

جب نواب خلد آشیاں کے وزیر مولوی محمد عثمان خاں کا ایک ہنگامے میں قتل ہوا تو ایک حاضر باش نے میاں کے روبرو بھی اس واقعہ کو بیان کیا۔ فرمایا۔ اچھا "رخصت"۔ رخصت ہی مادۂ تاریخ ہے جس کے عدد ۱۲۹۰ ہوتے ہیں۔

اب ایک ایسی مثال پیش کرتا ہوں جس سے اُن کے فن تاریخ گوئی کے کمال کا اور بھی زیادہ معترف ہونا پڑتا ہے۔ جب نواب حیدر علی خاں برادر بزرگ نواب خلد آشیاں کا عالی شان محل نقش و نگار سے مزین ہو کر تیار ہوا تو مکان کی شان کے مطابق ہی تاریخ کی ضرورت ہوئی۔

میاں سے بھی التجا کی گئی کچھ دیر سوچنے کے بعد فرمایا۔ بھائی اس مکان کی تاریخ تو سعدی تقریباً سات سو برس پہلے لکھ چکے ہیں

"نگارخانۂ چینی و نقش ارژنگی"

اور اس تاریخ کے مصرع پر اپنا ایک مصرع اضافہ کیا۔

بحرف عمر سعدی بگفت تاریخش
نگارخانۂ چینی و نقش ارژنگی

پہلے مصرع میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مصرع تاریخ کے نقطہ والے حرفوں کے عدد جمع کئے جائیں تو سال تعمیر ۱۲۹۰ھ نکل آئے گا۔

جب نواب خلد آشیاں کا انتقال ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء میں ہوا تو اہل کمال کی محفل درہم برہم ہو گئی۔ داغؔ یہ کہتے ہوئے حیدرآباد چلے گئے۔

رہے کیا مصطفےٰ آباد میں داغؔ
وہ سارے لطف تھے خلد آشیاں تک

امیر مینائی کچھ دن رہے تو داغ کے حیدرآباد جانے کے بعد انہیں بھی یہ کہنا پڑا۔

کہاں ہم اے امیرؔ اور اب کہاں داغ
وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

معلوم ہوتا ہے کہ اس حادثے کا گہرا اثر میاں منصور پر بھی پڑا جس کا حال مندرجہ ذیل شعروں سے معلوم ہوگا۔ شعر کیا ہیں اس تابناک دور کا مرثیہ ہیں۔

وہ نہ متوالے نہ وہ گل ہائے کیا تھا کیا ہوا
بزم مینا ہے نہ قلقل ہائے کیا تھا کیا ہوا
اس خزاں کا ہو بُرا کیسی بہاریں لٹ گئیں
گل نہ نسریں ہے نہ سنبل ہائے کیا تھا کیا ہوا
شاخ گل پر چہچہے ہیں اور نہ کو کو سرو پر
اب نہ قمری ہے نہ بلبل ہائے کیا تھا کیا ہوا
شور قلقل جن کی محفل میں کہ کل تھا ہم نشیں
آج اُن کا ہو گیا قُل ہائے کیا تھا کیا ہوا
وہ بہاریں تھیں یہاں یا اب فراریں ہو گئیں
ہم اسی غم میں گئے گھل ہائے کیا تھا کیا ہوا
اب غزلخواں ہے نہ محفل ہے نہ ساقی ہے نہ جام
اور نہ مینا ہے نہ قلقل ہائے کیا تھا کیا ہوا
وہ تماشا اور نہ سُولی وہ نہ منصور اور ہجوم
اور اناالحق کا نہ وہ غُل ہائے کیا تھا کیا ہوا

رامپور کی یہ برگزیدہ ہستی ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء کو دنیا سے رخصت ہوئی۔ خسرو باغ دروازے کے باہر مزار ہے۔

مولانا عبدالرزاق خاں صاحب طالبؔ تخلص سابق پروفیسر فارسی مدرسہ عالیہ (احقر کے استاد فارسی) نے یہ تاریخ لکھی ہے۔

سال و ماہ و یوم رحلت منصور
دو یدو یک بیک علی منظور

۲۲	۱۱	۱۳۰۶ھ
تاریخ	ماہ ذیقعدہ	

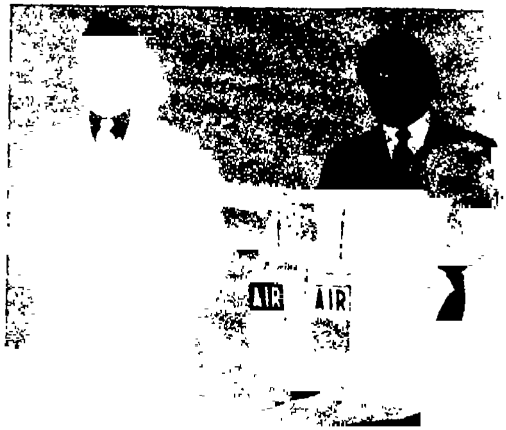


ٹریلیا کے پردھان منتری
نئی دھلی میں

لیا کے پردھان منتری رائٹ آنریبل
آر. جی. مینزیز اپنی دھرم پتنی اور
ی کے ہمراہ ۲۵ دسمبر کو بھارت میں
ے لائے - پالم کے ہوائی اڈے پر ہمارے
ن منتری نے آپ کا استقبال کیا



رائٹ آنریبل مسٹر آر. جی.
مینزیز اے. آئی آر. دھلی سے
ایک تقریر نشر کر رہے ھیں-
آپ کے پیچھے مسٹر آئی. ایس.
چوپڑہ چیف آف پروٹوکول
اور دائیں طرف مسٹر بھٹ
ستھیشن ڈائرکٹر کھڑے ھیں



مسٹر مینزیز اپنی دھرم پتنی
اور سیکٹری کے ہمراہ آگرے میں
تاج محل کا اندرونی منظر دیکھ
رہے ھیں

مسٹر مینزیز تاج محل کے ایک اور
منظر کو دیکھ رہے ھیں

۲ -



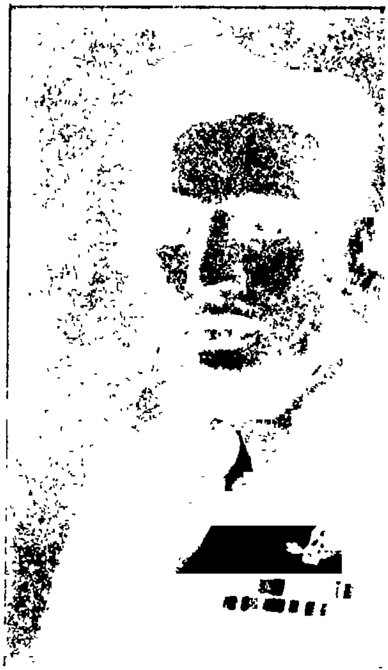
مسٹر مینزیز
شری سی.
راجگوپال
آچاریہ
کے ساتھ



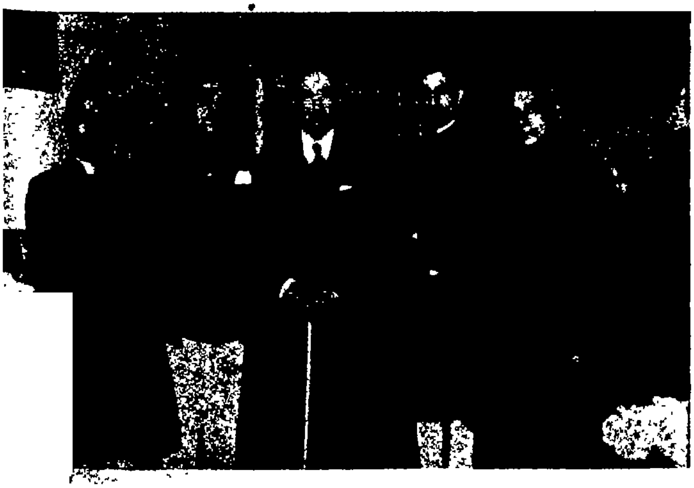
ں ۔ ڈ ۔ ں
تے ہوئے بھارت کے نائب
زیر خارجہ ڈاکٹر بی. وی.
یسکر نے تین روز کے لئے
مصر میں قیام کیا۔ تصویر
ں آپ یمن کے سفیر
مقیم مصر سے ہاتھ ملا رہے
ہیں - یمنی سفیر کے
ائیں طرف بھارتی سفیر
مقیم مصر ہزایکسیلینسی
ے. اے. اے. فیضی کھڑے
ہیں



بریگیڈیئر آگیا سنگھ ایم. بی. ای.
بریگیڈیئر آرمی آرڈیننس سدرن
کمانڈ جو کمبھٹور کے ہوائی
حادثے میں ہلاک ہوئے



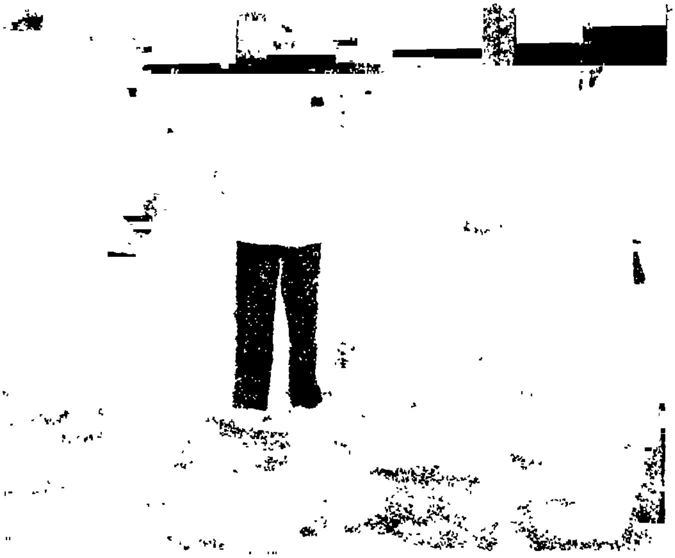
بغداد میں ہندوستانی نقاشی اور مصوری
کی نمائش کے سلسلے میں ہز رائل
ہائی نیس ریجنٹ عراق کی طرف سے
کلکتہ آرٹس سوسائٹی ڈیلیگیشن کے
ممبروں کا استقبال - ہز رائل ہائی نیس
درمیان میں کھڑے ہیں





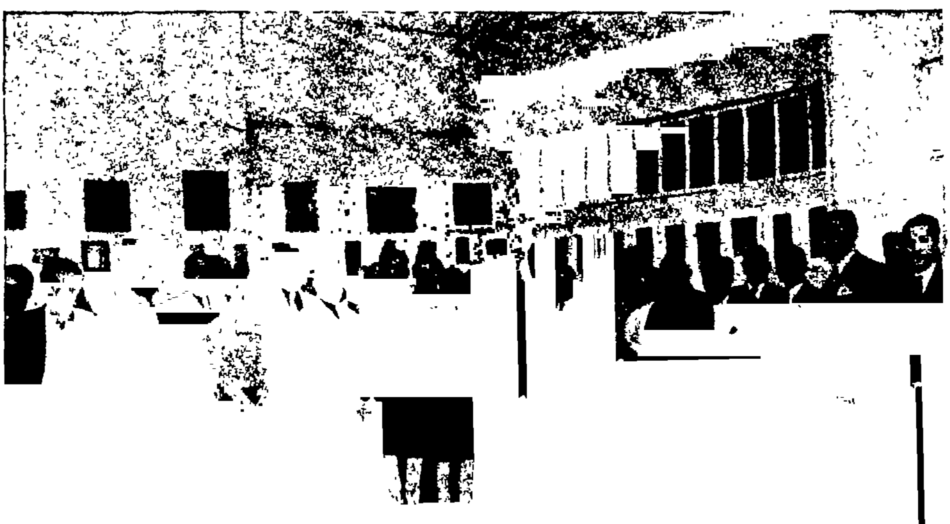
میجر ایس. ڈبلیو. شہانے

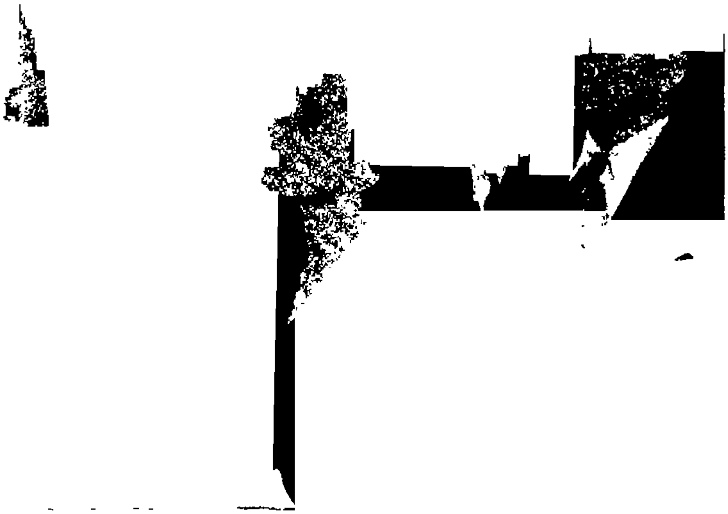
ہیں جموں اور کشمیر کے محاذ جنگ پر
دلیرانہ کارنامے انجام دینے پر ویر چکر کا
ہ عطا ہوا ہے - آپ نے گولیوں کی بوچھاڑ
ں اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر
من کے خفیہ مقامات کا پتہ لگایا اور
م بالا کے الفاظ میں اپنا فرض بجا لانے
ایک مثال قائم کی



اس نمائش کا افتتاح وزیر تعلیم
هزایکسیلینسی سید خلیل کبّہ نے
کیا - تصویر میں بائیں سے دائیں :-
مسٹر پی. ایس. سنہا ممبر آرٹ
ٹیلیگیشن ' ہندوستانی شانتی افیرز
مسٹر محمد یونس (ٹیلیگیشن کے
لیڈر) ' ڈاکٹر کالی داس ناگ ممبر
آرٹ ٹیلیگیشن اور سید عزیز سمیع
ڈین فائن آرٹس انسٹیٹیوٹ بغداد

نمائش کے افتتاح کے موقعے پر شریک ہونے والوں کا ایک گروپ فوٹو -
جس میں ہزایکسیلینسی سید خلیل کبّہ وزیر تعلیم اور ہندوستانی شانتی افیرز مسٹر محمد یونس
کے علاوہ ڈیپلومیٹک کور کے متعدد ممبر اور ہندوستانی اور عراقی افسر شریک ہوئے





ن میں اس نمائش کا افتتاح
شاہ ایران کی بڑی بہن ہز رائل
س پرنسیس شمس پہلوی نے کیا۔
میشن نے مہاتما گاندھی اور
: رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویریں
ورسٹی آف تہران کو پیش کیں۔
تی کے پیچھے ہندوستانی سفیر
، تہران ہزایکسیلینسی سید
ظہیر کھڑے ہیں

ہیں گاندھی جی اور ڈاکٹر ٹیگور کی وہ تصویریں جو تیلیگیشن نے
تہران یونیورسٹی کو پیش کی ہیں - تیلیگیشن کے لیڈر پرنس
یوسف مرزا اس موقع پر تقریر کر رہے ہیں







حال ہی میں نئی دہلی میں حیدرآباد سٹی پولیس ٹیم
اور موہن باگن ٹیم کے درمیان فٹ بال کا میچ ہوا جس میں
حیدرآباد ٹیم جیت گئی اور حیدرآباد ٹیم کے کپتان نے یہ
انعامات حاصل کئے

شفقت رضوی

سنگم

(ہلکی ہلکی موسیقی جس کے تھم جانے کے بعد ستار کی مدہوش کن ہلکی ہلکی چھیڑ آخر تک جاری رہتی ہے)

قمر۔ (گنگناتا ہے)

یہ چرکیف بدمست کالی گھٹائیں ۔۔۔ یہ آوارہ بہکی بہکی سی فضائیں

ابھی میکدے کا ارادہ کیا تھا ۔۔۔ کسی کی اداؤں نے بڑھ کر پکارا

ہاں ــــ کسی کی اداؤں نے ــــ کسی کی اداؤں نے بڑھکر پکارا۔

(ساجد کھنکھارتا ہے، اس کے قدموں کی آواز قریب ہوتی جارہی ہے)

ساجد۔ حضرت قمر کس نے پکارا ہے تمہیں۔ آخر ہمیں بھی تو بتلاؤ کون ہے وہ۔

قمر۔ کون، اوہ تم ساجد تم ہمیشہ میرے شاعرانہ موڈ کو غارت کر دیتے ہو۔ میں اس وقت شعر کہنے کے والہانہ موڈ میں تھا۔

ساجد۔ شعر کہنے کے والہانہ موڈ میں ــــ تو صاحب کہہ ڈالیے شعر ــــ ایک ہی ساتھ ہزار بارہ سو شعر کہہ ڈالیے ــــ پھر بار بار موڈ کہاں سے تو رہا۔ میں بھی موضوع شعر بن کر ساتھ بیٹھ جاتا ہوں ــــ لغویات کے لئے مجھ سے بڑھ کر لغو آدمی نہیں ملے گا۔

قمر۔ تو کیا شعر کہنا لغویت ہے۔ اس طرح تم فطرت کی توہین کر رہے ہو۔

ساجد۔ آہا ہا ہا۔ کتنے اچھے معلوم ہو رہے ہیں یہ الفاظ۔ جیسے شعر نہ ہوئے آسمان کی سیر ہو گئی۔ جنت کے دروازے کھل گئے۔

قمر۔ جی ہاں شاعری کا مرتبہ اس سے بھی بلند و برتر ہے۔

ساجد۔ بھلا وہ کیسے؟

قمر۔ شاعری فطرت کی نباض ہے۔ قدرت کی ہم جلیس ہے۔ جوان دلوں کی اتھاہ گہرائیوں میں پیدا ہونے والے معصوم جذبات کو شاعر اپنے شعور سے محسوس کرتا ہے۔ اس پر بڑے غور سے سوچتا ہے، اور یہ احساس بڑھکر شاعر کے من میں گدگدی سی پیدا کر دیتا ہے۔ تب اس کا ہاتھ چلنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے خالقِ ازلی کا ہاتھ اس دنیا کو تخلیق کرتے سمے چلا تھا۔

ساجد۔ اور اس کے بعد بن جاتی ہے آپ کی نظم ــــ جو شاعروں میں داد بٹورتی ہے۔ جیسے کالج کے لڑکے جوان چھوکریوں کو دیکھکر گنگناتے ہیں، اور غیر معیاری رسائل بلا معاوضہ شائع کرکے آپ کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔

قمر۔ اس طنز کی ضرورت نہیں کہ مجھے شہ پاروں کی تخلیق پر کیا ملتا ہے لیکن سچ مانو ادبی تخلیق کا عوض کوئی نہیں دے سکتا۔

ساجد۔ بات ــــ جب مل ہی نہ سکے تو یہ بہانہ۔

قمر۔ میں سچ کہتا ہوں۔ ساجد میرے من میں کبھی معاوضہ کی خواہش پیدا نہ ہو سکی۔ میں اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لئے شعر کہتا ہوں۔ پھول چمن کی کھلی فضاؤں میں عطر کی لہریں پھیلا کر کسی سے قیمت نہیں مانگتا۔ چندا روشنی نہیں بیچتا۔ یہ تو فطرت کے فیاضانہ عطیے ہیں۔

ساجد۔ لیکن تمہیں شعر کہنے سے کیا ملتا ہے؟

قمر۔ میں شعر کہہ کر اپنے من کو مسرور پاتا ہوں۔ جیسے بہت بڑی نیکی کی ہو میں نے۔

ساجد۔ نیکی ــــ واہ صاحب کیا نیکی ہے یہ۔

قمر۔ سچ مانو دوست میں اسے اپنی سب سے بڑی نیکی سمجھتا ہوں۔

ساجد۔ تمہارے لئے یہ نیکی ہے اور میرے نزدیک لغویت۔

قمر۔ تمہیں شاعری سے کوئی تعلق خاطر نہیں۔ ورنہ تم میرے جذبات کا صحیح اندازہ لگا سکتے۔ لیکن تمہیں سنگیت سے تو دلچسپی ہوگی، مصوّری سے تو

لاؤ ہوگا—— کیا تم نغمہ کی لہریں سن کر جھوم نہیں اُٹھتے —— کیا کسی تصویر کو دیکھ کر تمہارا من شاد نہیں ہو جاتا—— ہوتا ہوگا اور ایسا ہونا بھی چاہیئے —— شعر ان سب سے بلند ہے وہ روح کی آواز ہے، دل کی خلش کا حاصل ہے۔

ساجد۔ اوہ — تو اب تمہارے من میں بھی یہی خلش پیدا ہو چلی رہی ہے کہ کسی دوشیزہ پری پیکر سے تمہاری رسم و راہ بڑھے —— اُس کی محفل میں تم زندگی کی سانسیں لے سکو—— پیو —— پیالے لنڈھاؤ—— صُراحی خالی کرو اور اس کے قرب کی لذّتیں اُٹھاؤ۔

قمر۔ ہاں — میں یہی چاہتا ہوں۔

ساجد۔ بھئی چاہتے ہو تو خوب ہے

قمر۔ میں چاہتا ہوں کوئی جوانی ہو —— جس کی ہر ادا میں مستی ہو جس کے ہر انداز میں مدہوشی ہو۔ نظر دلربا کے بانکپن سے شراب کا نشّہ برستا ہو جس سے پیار کی لہریں اُٹھتی ہوں۔ جس کبھی نس نس میں محبت رچی ہوئی ہو اور میں اس کے آگے اپنے من کے اُمنگ بھرے گیت گاتا رہوں۔

ساجد۔ تمہیں ایسی لڑکی مل بھی گئی ہے یا ابھی صرف دُنیائے تصوّر کی کسی تاریک وادی میں جنم پا رہی ہے۔

قمر۔ مجھے اپنے آئیڈیل لڑکی ابھی تک نہیں ملی ہے میں جس قدر رومانی اور آرٹسٹک لڑکی چاہتا ہوں اُسے میں نہیں پا سکا۔ لیکن میرے دوست انسان کی خوشنودی حاصل کرنے۔ جس نے پھولوں کو نکہت دی ہے۔ ستاروں میں پیاری ضو بھری ہے اور چندا میں مسکراتی کرنیں ڈالی ہیں وہی مجھے ایسی لڑکی ضرور دے گا۔

ساجد۔ اور تم بیٹھے اُس کی شان میں قصیدے پڑھا کرو گے۔

قمر۔ تم چاہو اُسے کچھ ہی کہو لیکن گیتوں کی مالا جسے میں برسوں سے بنا رہا ہوں میرے من کی مقدّس خواہشوں کی آفریدہ ہے جسے کسی دیوی کے چرنوں پر چڑھانا میرے جیون کا سب سے بڑا نیک کام ہوگا۔

ساجد۔ یونہی فلسفیانہ موشگافیاں کرتے رہو—— لیکن یقین رکھو، زندگی اس قدر آسان نہیں جتنی تم سمجھتے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ کسی عورت کا وجود تمہیں دھرتی سے اُٹھا کر آکاش تک پہنچا دے گا۔ لیکن یقین رکھو عورت نے بہت کم لوگوں کو گرایا ہے وہ گرانا خوب چاہتی ہے۔ بڑے بڑے فلسفہ دان اور اس میدان کے سورما اس کے آگے سرِ تسلیم خم کئے بغیر نہ رہ سکے۔

قمر۔ یہی سرِ تسلیم کا خم ہو جانا سب سے بڑی سعادت ہے۔

ساجد۔ اور اس سے شہادت بھی بہت جلد مل جاتی ہے جب عورت ناگن بن کر ڈستی ہے۔ جادو بن کر پکارتی ہے اور دوست بن کر وار کرتی ہے —— اس کا نباہنا بڑا مشکل ہے اسی لئے تو میں گھبرا رہا ہوں۔

قمر۔ تم تو عورت سے دُور ہی ہو پھر کیوں گھبرا رہے ہو۔

ساجد۔ پکڑا پکڑا دار تک لایا گیا ہوں بس دار باقی ہے۔

قمر۔ کیا مطلب ؟

ساجد۔ مطلب کیا سمجھاؤں۔ یہ لو اور تم ہی سمجھ لو۔

قمر۔ اوہ —— ہو — تو یہ تمہاری شادی کا پرچہ ہے چلو بھئی مبارک

ساجد۔ مبارک باد بھی خوب رہی۔ یہاں جان نکلی جا رہی ہے اور تم ہو کہ مبارک باد دے رہے ہو۔

قمر۔ شادی کے نام سے نوجوانوں کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور تمہاری جان نکلی جا رہی ہے۔

ساجد۔ دیکھ قمر۔ میں ذرا عملی ذہنیت رکھتا ہوں—— سوچو تو— میری تنخواہ ڈیڑھ سو روپیہ —— دوسرے سارے کاروبار بند —— اب شادی کروں گا تو بیوی کے لئے پوڈر، لیونڈر، اسنو سے لے کر ساڑی جھمکے اور اُونچی ایڑی کی گرگابی —— یہ سب کہاں سے لاؤں گا۔ آخر میرے ساتھ ذمہ داریوں کا بار بھی تو ہے۔

قمر۔ ذمہ داریاں کس کے ساتھ نہیں ہوتیں۔ پھر بھی تم دیکھتے ہو ہر روز شادیاں ہوتی ہیں اور سب ہی خوش رہتے ہیں۔

ساجد۔ معاف کرنا بھئی —— مجھے تو اس بات پر اعتراض ہے کہ سب ہی خوش رہتے ہیں، ان میں ہزاروں لبوں سے ہی رہتے ہیں۔ اسی لئے میں گھبرا رہا ہوں۔

قمر۔ بزدل کہیں کے — عورت سے گریز و فرار زندگی سے گریز و فرار کے مترادف ہے۔ خوشی خوشی شادی کر لو — زندگی کا لُطف اُٹھاؤ—— حسن، جوانی، زندگی—— (ہلکا قہقہہ) —— میرے نزدیک تو عورت کے بغیر زندگی میں ایک زبردست خلا رہتا ہے اور جب تک وہ پُر نہ ہو زندگی زندگی نہیں ہوتی۔

ساجد۔ تمہاری ان غیر ذمہ دارانہ باتوں سے تو میں گھبراتا ہوں۔ دراصل

مجھے تمہاری شاعری سے دشمنی نہیں۔ میں مانتا ہوں احساس کی بلندی لطیفِ حیات سے روشناس کراتی ہے مگر محبت کو زندگی سمجھ لینا اور عورت کو حاصلِ زندگی ایک نادانی ہے — دُنیا اب ٹھوس سچائیوں کی عادی ہو چکی ہے۔ جینے کے لئے اب ٹھوس سچائیوں کا سہارا لینا ہوگا۔ تمہیں صرف اپنے تصوّر کی محبوب کے لئے شعر نہیں کہنے چاہئیں۔ بلکہ دیس کے کروڑوں انسانوں کے لئے کچھ کرنا ہوگا۔ انفرادی اور اجتماعی مسائل میں گھیرے ہوئے ہیں ہم ان سے بچ نہیں سکتے۔

قمر۔ کیا تم مسائل میں اُلجھ کر شادی سے بچ جاؤ گے۔

ساجد۔ شادی سے بچنا زندگی سے بھاگنا ضرور ہے۔ لیکن میرے معاشی حالات — زمانے کے تقاضے اور —

قمر۔ چھوڑو ان باتوں کو وقت سب کچھ ٹھیک کرے گا۔ یہ تو بتاؤ شادی کہاں ہو رہی ہے۔

ساجد۔ نجمہ کے ساتھ

قمر۔ نجمہ کے ساتھ — اوہ وہ تو معمولی ٹائپ کی لڑکی ہے تمہیں خوش نہ رکھ سکے گی۔

ساجد۔ دیکھتے جاؤ — کیا ہوتا ہے۔

(موسیقی)

(موسیقی کی دھن پر شادیانوں کا شور مچانے لگتا ہے اور جب وہ آہستہ آہستہ دب جاتا ہے رومانی ساز ہلکے ہلکے بجتے رہتے ہیں)

ساجد۔ نجمہ — نجمہ — سنو تو نجمہ —

نجمہ۔ (شرمائی ہوئی آواز میں) جی

ساجد۔ (گھبرایا ہُوا) نجمہ میرا خیال ہے — میں سمجھتا ہوں — اب — ہمیں یہ اجنبیت ختم کر دینی چاہیئے۔

نجمہ۔ جی۔

ساجد۔ دیکھو نجمہ — دو زندگیوں کی دھارا بہتے بہتے ایک جگہ مل گئی ہے۔ اب اس سنگم سے آگے بڑھتے ہوئے اسی طرح ملے ملے بہنا چاہیئے کہیں زندگی کی لغزشیں اُن کا رُخ نہ پھیر دیں۔

نجمہ۔ لیکن — لغزشوں سے تو زیست خالی نہیں۔

ساجد۔ ٹھیک ہے — مگر انسان لغزش کرنے کے بعد اپنے آپ کو معاف کر دیتا ہے۔ اپنی بُرائی کو فراموش کر دیتا ہے بالکل اسی طرح تمہیں بھی چاہیئے کہ میری ہر لغزش پر بگڑ بیٹھنے سے پہلے اسے معاف کرنے کی سبیل تلاش کرو اور میں بھی اس کے لئے ہمیشہ تیار رہوں گا۔

نجمہ۔ جی درست ہے۔

ساجد۔ جب انسان کے تعلقات بندھ جاتے ہیں تو نہیں نباہنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر دیکھو پھول کے دامن میں کانٹا نکلا ہوتا ہے۔ چاند کے گرد ہالہ بنا ہوتا ہے پھر بھی وہ ایک دوسرے سے کس طرح وابستہ رہتے ہیں۔ حالانکہ ہر ایک کی حیثیت جُدا جُدا ہے اور یہی زندگی کی صحیح تصویر ہے۔

نجمہ۔ جی ہاں

ساجد۔ تم بڑی سمجھدار ہو۔ ان باتوں کو سمجھ کر میرا ساتھ دوگی تو یہ زندگی رشکِ فردوس بن جائے گی۔

نجمہ۔ صحیح ہے۔ میں کوشش کروں گی۔

ساجد۔ شاباش — اچھا یہاں تو آؤ — مجھ سے قریب — ہاں اور قریب — (وارفتگی سے) نجمہ — نجمہ

نجمہ۔ جی —

ساجد۔ نجمہ — تمہارا یہ جھمکا — یہ جگ مگ — جگ مگ کرتا جھمکا بڑا پیارا لگ رہا ہے۔ تمہاری گردن کے ہلکے سے ارتعاش سے اس میں جھوم جھوم جانے کی ہلک اُٹھ رہی ہے — میرے ارمانوں کی طرح وہ ہرا ہرا کر جھوم رہا ہے — تمہارے گالوں کو چوم رہا ہے۔

نجمہ۔ جی — (چوڑیوں کی جھنکار سنائی دیتی ہے)

ساجد۔ اور چوڑیوں کی یہ جھنکار — جیسے دل کے رومانی ساز بج اُٹھے ہوں — اس میں ساون کی رم جھم کا طرب ہے — آبشاروں کا ترنم ہے — جلترنگ کی کھنک ہے۔

نجمہ۔ جی —

ساجد۔ نجمہ۔ کیا تمہیں یہ چوڑیاں یہ سارے زیور بہت پسند ہیں۔

نجمہ۔ ہاں —

ساجد۔ (قدرے افسردگی سے) لیکن نجمہ — تمہارے لئے نئے نئے جھمکے۔ نئی نئی چوڑیاں اور نئے نئے زیور روز روز تو کیا برسوں میں

بھی نہ آسکیں گے۔ میں اتنا بڑا آدمی نہیں ــ اس سے تمہیں دُکھ تو بہت ہوگا

نجمہ۔ نہیں ــ اس میں دُکھ کی کیا بات ہے ــ میرے لئے بس اتنے ہی کافی ہیں۔

ساجد۔ اور جو یہ بھی نہ رہیں تو ــ

نجمہ۔ تو بھی کوئی غم نہ ہوگا۔

ساجد۔ کیوں ؟

نجمہ۔ میرے پاس ان سب سے قیمتی اور انمول زیور جو رہے گا۔

ساجد۔ بھلا وہ کیا ہے ؟

نجمہ۔ جی ــ وہ آپ ہیں

ساجد۔ (وارفتگی سے) نجمہ ــ میری نجمہ

نجمہ۔ سرتاج ــ میرے سرتاج

(ہر سوت ساز)

(طویل موسیقی کے بعد شیشوں اور گلاسوں کی آوازوں کے درمیان مغربی موسیقی کی دُھنیں بجتی رہتی ہیں ــ)

قمر۔ (گنگناتا ہے) مفلس پیار کے سپنوں کی سزاوار نہیں

مفلس ــ پیار کے سپنوں کی ــ سزاوار نہیں

(قدموں کی آواز)

ساجد۔ اوہ ــ قمر ــ کہاں رہے بھئی

قمر۔ کون ــ ساجد ــ آؤ ــ آؤ ــ ساجد

ساجد۔ مدت کے بعد آج درشن ہوئے ہیں تمہارے

قمر۔ ہاں ہاں ــ بیٹھ جاؤ ــ بیٹھئے مسٹر ساجد ! بھئی میں ان دنوں باہر گیا ہوا تھا۔ کل ہی آیا ہوں۔

ساجد۔ کہو قمر۔ کیسی گذر رہی ہے۔

قمر۔ گذر کہاں رہی ہے بھائی یوں سمجھو زبردستی گذار رہا ہوں۔ زندگی نیم مردہ ہو چکی ہے جو ایک قدم بھی نہیں چل سکتی صرف رینگ سکتی ہے

ساجد۔ کیوں کیا بات ہے تم اس قدر اداس کیوں ہو

قمر۔ ہر روز روز عید نیست کہ ــ

ساجد۔ قمر ــ تم میں کا وہ انسان کیا ہوا جو بڑا رجائی تھا جس کے پاس زندگی کا مطلب تھا۔ مسکراہٹ ــ رومان ــ اور عورت ،

قمر۔ وہ انسان تو اسی گھڑی مرگیا جس گھڑی میرے ہاتھوں میں کسی کا ہاتھ تھم گیا۔

ساجد۔ معاف کرنا میں سمجھا نہیں۔

قمر۔ میرا اشارہ اپنی شادی کی طرف ہے۔

ساجد۔ تو یوں کہو تمہاری شادی بھی ہوگئی ــ دعوت تک نہ تھی کم بخت ــ خیر ــ ابھی حاضر کردو۔

قمر۔ ہاں ــ ہاں ــ (زور سے) بوائے ــ بوائے

بوائے۔ (دُور سے) لیس سر

قمر۔ دو کولڈ ڈرنک ــ اور کچھ

ساجد۔ نہیں ــ کافی ہے ــ ہاں تو بھابھی کہاں ہیں

قمر۔ وہ بال روم میں ناچ رہی ہیں۔

ساجد۔ اب تو اُن کے چرنوں میں بیٹھے شام سے صبح تک اپنے گیتوں کے پھول نچھاور کرنا تمہارا مشغلہ ہوگا۔

قمر۔ میرے دامن میں اب ایک بھی پھول نہیں ــ من میں صرف کانٹے رہ گئے ہیں

ساجد۔ کیوں وہ پھول کیا ہوئے

قمر۔ اپنے سپنوں کی رانی پر میں نے چڑھا دئے جن کے بارے میں تم نے کہا تھا کہ وہ دنیائے تصوّر کی کسی تاریک وادی میں جنم پا رہی تھی۔

ساجد۔ وہ رانی تمہاری بیوی کا روپ نہ دھار سکی۔

قمر۔ نہیں۔

ساجد۔ پھر بھی کچھ تو بھابھی کے لئے رکھا ہوتا۔

قمر۔ وہ اس لائق کہاں

ساجد۔ کیوں آخر بات کیا ہے۔

قمر۔ میں نے سمجھا تھا کہ ہر عورت کے دل میں صرف پیار اور محبت کے خزانے بھی ہوتے ہیں۔ وہ محبت کرتی ہے اور دوسروں کو محبت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

ساجد۔ یہ تو بالکل سچ ہے ــ دیکھو نو نجمہ کو۔ عورت سے بھاگنے والے ساجد کو اس نے رام کر لیا ہے۔

قمر۔ ٹھیک ہے لیکن اب معلوم ہُوا کہ زندہ رہنے کے لئے محبت کے ساتھ

دوسرے مطالبے بھی ہوتے ہیں۔

ساجد۔ کون سے مطالبے

قمر۔ یہی دن رات کی ضرورتیں۔

بوائے۔ صاحب۔ لیجئے۔ کولڈ ڈرنک۔

قمر۔ پی لو بھئی ساجد — لیجئے مسٹر ساجد

ساجد۔ شکریہ — ہاں تو دن رات کی ضرورتیں تو ہوتی ہی ہیں۔

قمر۔ اور میں اتنا بڑا آدمی نہیں کہ ان مطالبوں کو پورا کر سکوں۔ بنیادی ضرورتیں تو خیر پوری ہوتی ہیں۔ لیکن عورت معشوق بن کر ناز فرما ہو جاتی ہے۔ اس کے ناز سہنے کے لئے جیب سے کھنکھناتے سکوں کی بارش کرنی پڑتی ہے — شاپنگ کروانی پڑتی ہے — سینما دکھلانا پڑتا ہے — کلب پہنچانا ہوتا ہے — اور وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جو ایک وفادار نوکر کر سکتا ہے۔

ساجد۔ (تمہاری بیگم کچھ ماڈرن قسم کی معلوم ہوتی ہیں)

قمر۔ ہاں — بالکل ماڈرن قسم کی

ساجد۔ پھر تو انہیں رومانی اور آرٹسٹک بھی ہونا چاہیئے۔

قمر۔ عورت خواہ کیسی ہو رومانی اور آرٹسٹک ضرور ہوتی ہے لیکن زندگی میں اس کے مطالبے جدا جدا ہوتے ہیں۔

ساجد۔ تم نے پہلے ہی ان مطالبوں کو کیوں نہیں سمجھا۔

قمر۔ میرا خیال تھا محبت کے خزانے بکھیر کر میں ہر عورت کو اپنی بنا سکتا ہوں اور اپنی بساط بھر خاطر کر کے دنیا کو رشک فردوس بنا سکتا ہوں۔ مگر —

ساجد۔ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ صرف رومان اور رومانی شاعری سے انسانی مطالبے پورے نہیں ہو سکتے۔ عورت کو نباہنے کے لئے بڑا ظرف چاہیئے۔

نجمہ۔ عورت کو بدنام کیوں کرتے ہیں آپ، دراصل زندگی نام ہے ضرورت اور آسائش کا۔ کوئی صرف ضرورت کو سامنے رکھ کر زندہ رہ سکتا ہے اور نہ کوئی صرف آسائش کو مدِ نظر رکھ کر ضرورت کو فراموش کر سکتا ہے۔ دل کے کنول اسی وقت مسکراتے ہیں جب ضرورت اور آسائش کی بندھی ہوئی حدیں ہوں۔

قمر۔ واہ بھئی — بنیئے کے گھر کے چولہے بھی سیانے ہو گئے۔

اس تعریف کا شکریہ — مگر بھلا آپ رومان کو اصل حیات کیوں سمجھ بیٹھے تھے۔

یہی تو میری غلطی تھی — شادی کے بعد میں اس غلطی کا کچھ کچھ قائل ہو گیا ہوں۔

ابھی تک کچھ کچھ قائل ہوئے ہیں آپ — پوری طرح قائل ہونے کے لئے دوسری شادی کر ڈالیئے۔

(قہقہہ) (ختم)

صنعتی ترقی اور تربیت یافتہ افراد

شری بی اے نرپل والا آف ٹاٹا انڈسٹریز کی ایک نشری تقریر کا اقتباس

اگر ہمیں اپنے صنعتی پروگرام کی رفتار کو تیز کرنا ہے تو اس کے لئے سب سے پہلے ہمیں ٹیکنیکل ٹریننگ کی اہمیت کو سمجھنا پڑے گا۔ صنعتی ترقی کا انحصار فقط زیادہ تر پیداوار پر نہیں ہے۔ اگر ہماری پیداوار تیزی سے بڑھتی رہی اور ہمیں صنعتوں کے لئے تربیت یافتہ افراد نہ مل سکیں تو صنعتی ترقی کو جاری رکھنا ہمارے لئے مشکل ہو جائے گا۔ غیر تربیت یافتہ افراد کو ہم اپنے کارخانوں میں خواہ کتنی تعداد میں بھرتی کیوں نہ کر لیں وہ ہماری مشکلوں کو حل نہ کر سکیں گے۔

تربیت یافتہ افراد کی ضرورت ایک اور نقطۂ نگاہ سے بھی اہم ہے اور وہ نقطۂ نگاہ ہے ہر قومی اور بین الاقوامی ایمرجنسی کا۔ ان حالات میں جس ملک میں پیداوار زیادہ ہو اور تربیت یافتہ افراد کم ہوں اُس ملک کی پوزیشن بہت مضحکہ خیز بن جائے گی۔ گذشتہ جنگ میں یہ صورت اکثر ملکوں میں نظر آتی تھی۔

جمیل مہدی

نئے ادیب اور بنیادی مسائل

۱۹۳۹ء کی دوسری جنگ عظیم سے پہلے حالانکہ نئے ادب کے چراغ پوری طرح روشن ہو چکے تھے لیکن ہمارے ادیبوں کی کثیر تعداد پر تذبذب تفکر اور دماغی انتشار کا غیر مرئی دھندلکا چھایا ہوا تھا' قدیم ادب کی پیچ در پیچ پگڈنڈیوں اور خارزار رہگذروں سے الگ ہٹ کر جو شاہراہیں پریم چند' آزاد اور حالی نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے نئی قوتوں اور ماحول کے سفاک تقاضوں کے پیش نظر تعمیر کی تھیں وہ اب تک خالی تھیں' زندگی اور ادب کا فطری ارتقا اذہان کو غیر محسوس طور پر اپیل ضرور کرتا لیکن ان وسیع' روشن اور فراخ شاہراہوں پر اکے دکے راہگیروں کے علاوہ اور کسی متنفس کے قدموں کی چاپ سنائی نہ دیتی تھی' زندگی کے نئے تقاضے جاگیردارانہ نظام کی کشتگی' کئی ہزار سال پرانی معاشرت کی بوسیدہ قدریں' عام ذہنی بیداری' غیر ملکی استبداد کے آہنی شکنجے کے درمیان دبتی' پستی اور فریاد کرتی ہوئی مخلوق اور ان سب کے مجموعی اثرات سے پیدا شدہ سماجی انتشار اس زمانہ کے ہر ادیب اور شاعر کے سامنے تھا وہ ان سب کے مشترکہ تاثر کے درمیان چلتا پھرتا اور سانس لیتا تھا' ان تمام خارجی تقاضوں کا مشترکہ دباؤ اس کے دماغ' روح اور قلم پر محیط تھا لیکن وہ اس سے نکلنے' عہدہ برآ ہونے اور اس کو پچھاڑ دینے کی تدابیر میں متشبہ تھا' اس کے باوجود کہ ان تمام خارجی اسباب کو نظر انداز کر دینے یا ان پر غالب آجانے کی تمنا ان کے دل کے ہر گوشے میں پوری آرزومندی کے ساتھ جاگ رہی تھی وہ بے بسی اور پس و پیش اور تذبذب کے درمیان بری طرح گھر گیا تھا' یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کی تمام تخلیقوں پر انتشار' ذہنی کرب' اور غیر صحیح جذبات کی واضح کیفیات چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس وقت کی تمام تخلیقیں خواہ وہ منظوم تھیں یا منثور' براہ راست کانگریس کی تحریک سے متاثر نظر آتی ہیں شاید ۱۹۴۱ء کے ان آخری ایام تک جن میں روس انگریزوں کے ساتھ مل کر محوریوں کے خلاف جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا ہمیں منٹو کے افسانے "نیا قانون" فیض کی نظم "بول" سردار جعفری کی نظم "جنگ اور انقلاب" اور ساحر کی نظم "لمحۂ غنیمت" ایسی دو چار اور تخلیقوں کو چھوڑ کر پورے ادب میں افراتفری' انتشار اور ذہنی کشمکش کے علاوہ اور کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ ان سب فن پاروں کی اہمیت سے انکار کرنا پوری ادبی تاریخ سے منہ پھیر لینا ہے لیکن اس کے باوجود کہ ان تمام تخلیقوں کے اندر ہمیں زندگی کا حقیقی اضطراب اور محکوم سانسوں کی پیہم لرزشوں کا احساس جیتا جاگتا نظر آتا ہے یہ تخلیقیں ہمیں روشنی کی جانب لے جانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوتیں' ماحول کے اضطراب' گھٹن اور کشمکش کے شدید ترین جذبات کی حامل ہوتے ہوئے بھی ان تخلیقوں میں یا تو منہ بسورتا ہوا طنز ہے یا پھر تڑپنے اور فریاد کرنے کی توانا خواہش' رہا اس سے نکلنے' رہائی پانے اور کامیاب ہونے کا راستہ' تو اس کے لئے یہ سب کی سب اتنی تشنہ نظر آتی ہیں کہ اگر ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ ان تمام تخلیقوں کے خارجی ڈانڈے کانگریس کی تحریک سے براہ راست متعلق ہیں تو ہم کسی طرح بھی یہ محسوس نہیں کر سکتے کہ ان کوششوں کا مقصد کیا ہے؟ وجہ وہی ہے جو میں نے شروع ہی میں عرض کر دی ہے کہ ابھی تک کوئی ایسا نقطہ نظر' کوئی آدرش اور کوئی نصب العین سامنے نہیں آیا تھا جو دماغوں کو صاف اور اوہام و اشکالات کی آلائشوں سے پاک کر کے دماغوں کو ایک ہی راستہ' ایک ہی منزل اور ایک ہی طریقۂ فکر پر مرکوز کر دے۔ یہی باعث تھا کہ ہمارے ادیبوں میں جو لوگ زیادہ سنجیدہ' پرجوش اور وسیع النظر تھے وہ غیر محسوس طور پر کانگریس کی سامراج دشمن تحریک سے متاثر ہوئے اور جو اتنے سنجیدہ' اتنے ذہین اور اتنے باحوصلہ نہیں تھے وہ اس زندگی' اس ماحول اور ماحول کے چالیلے تاثر کے سامنے ہتھیار ڈال کر فراریت کے دامن میں سکون اور آسودگی ڈھونڈھنے کی متواتر کوششوں میں مصروف ہو گئے' خارجی محرکات' دماغی خلفشار اور حساس طبیعتوں کا ملا جلا تاثر اتنا شدید تھا کہ نیکیوں

کے بطن سے بدمی اور صداقت کے پیٹ سے گمراہی پیدا ہوگئی اور ہمارے فن کار اتنی تیزی، اتنی حرص، اتنی شدت اور اتنی دلچسپی سے سستی جنسیت اور نفسیاتی پیچیدگیوں پر ٹوٹ پڑے کہ تھوڑے عرصہ کے لئے تو ہمارے ادب کی فضاء تیرہ و تار ہوگئی، اگر احتشام حسین، مسعود حسین، مجنوں، سرور اور حسن عسکری وغیرہ نقاد اس وقت اس بدعت کے خلاف آواز بلند کر کے اس سیلاب کو نہ روک لیتے تو ہمارا آج کا ادب، ایک ترقی یافتہ ادب کے بجائے دبستانِ لکھنؤ کے فحش اور عامیانہ ادب کے مماثل کچھ اور چیز بن جاتا جس میں تسکین کی گمراہ کوششیں اور آسودگی حاصل کرنے کے غلط طریقے زندگی کا منہ چڑاتے ہوئے نظر آتے۔ ۱۹۴۱ء میں روس جنگ میں شامل ہوا۔ اور فوراً ہی ہماری ادبی فضاؤں میں ایک ہلچل سی مچ گئی، ہمہ ہمی، اضطراب اور تشکک کی پیہم ستیزہ کاریاں اتحاد جمہور سے پیدا شدہ امکانی نتائج اور ان سے وابستہ ایک پرامید مستقبل اور جائز دوق کی بلند قدروں سے ٹکرا کر چکنا چور ہوگئیں دنیا کی تین بڑی جمہوریتیں فسطائیت اور آمریت کے خلاف متحدہ طور پر صف آرا ہوگئی تھیں۔ اس لئے دنیا کی بیشتر آبادی کے جذبات ان کے ساتھ ہونے کے علاوہ انسانیت اور دنیا کے لئے ایک سکون مند اور بہتر نظام کے متوقع بھی ہوگئے تھے، دنیا کے محکوم طبقوں میں جو تحریکیں غیر ملکی اقتدار اور سامراج کے خلاف چل رہی تھیں ان میں بھی ایک خوشگوار ٹھیراؤ پیدا ہوگیا اور ان طبقوں میں ایک نئی امید اور زندہ رہنے کی پرجوش مسرتوں کے ساتھ ہی ایک نئے اور مطمئن دور کے استقبال کی خروش مند تمناؤں نے جنم لے لیا، ہمارے وہ ادیب بھی جو اب تک کشاکش اور مایوسی کے درمیان محصور رہتے نت نئی امنگوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے، انہوں نے اس نئے اور پرامید ماحول میں اپنی توجہات کو ہندوستان کے داخلی مسائل سے زیادہ بین الاقوامی اثرات کی جانب مرکوز رکھا اور ان اثرات کے نتیجہ میں انہوں نے جو کچھ ادب کے حوالے کیا اس میں مقامی رنگ صفر سے کچھ ہی زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کم و بیش اس زمانے کی تمام تخلیقوں میں احساس کی شدت اور جذبات کی گہرائیاں اپنی پوری صحت مندی کے ساتھ محسوس ہوتی ہیں، نظموں میں ساحر کی نظم "احساس کامران" اور کیفی اعظمی کی نظم "اعتراف شکست" قابل ذکر ہیں اور افسانوں میں صرف خواجہ احمد عباس کے افسانے "اسٹالین گراڈ" کو آمریت کے خلاف دنیا کے بیشتر حصے پر پھیلی ہوئی محکوم مخلوق کے جذبات کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔ دنیا کی جمہوری طاقتوں کے اتحاد، نازیت اور فسطائیت کی متوقع شکست اور بعد از جنگ ابھرنے اور پھیلنے والے مشکل، پیچیدہ اور نازک مسائل اپنے تمام تر خد و خال کے ساتھ دنیا کے دانش وروں کے سامنے تھے، ان کی موجودگی نے دنیا کی پس ماندہ طاقتوں کے اعصاب میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ ان کے دماغوں میں امید، اطمینان اور منتظر ارادوں کی جھلک صاف طور پر نمایاں ہونے لگی تھی اس لئے ہمیں اس زمانے کی تخلیقوں میں ہندوستان کے داخلی اضطراب، بے چینی اور محکومیت کی زنجیروں کو توڑ ڈالنے کی آرزوؤں کے بجائے ایک ہم آہنگی، ایک ذہنی یکسوئی اور ایک سیاسی اطمینان کے علاوہ مسرت زا کیفیات کسمساتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں (جذبات ان کے علاوہ ہیں) ہمارے ادیبوں نے ہندوستان سے باہر کے جتنے بھی اثرات قبول کئے، ان اثرات کی روشنی میں اپنی استطاعت، ذہانت، انفرادی رائے اور نجی احساس کی بنا پر جو کچھ کہنا تھا کہا، جو کچھ لکھنا تھا لکھا، یہ ہندوستان کے ادب پر احسان نہیں ہے نہ ہی انہوں نے اسے احسان سمجھنے پر اصرار کیا ہے لیکن ہمارے ادب پر اس مختصر سے دور کا جتنا گہرا اثر پڑا وہ اتنا اہم تھا کہ مجموعی طور پر کسی طویل دور کے اثرات بھی اتنی اہمیت حاصل نہیں کر سکے، اسی دور کی بدولت ہمارے ادب میں ایک مرکزی فکر اور ایک نئے نقطۂ نظر نے جنم لیا، تنقید کے ایک نئے مدرسۂ فکر کی بنیاد پڑی، ادب کا ایک نیا محور دریافت ہوا، اس دور نے ہمارے ادبی نقادوں تک کے ذہنوں میں ایک ٹھہراؤ اور ذمہ داری کا ایک خوشگوار سلیقہ پیدا کر دیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ہماری فن کاروں اور نقادوں نے پہلی مرتبہ اجتماعی حیثیت میں ادب کے افادی پہلو، ادب و زندگی کے باہمی ربط اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج پر غور کیا، ادب کو عوام کی ذہنی رہنمائی کرنے کے لئے سب سے موثر آلے کی حیثیت سے استعمال کرنے کا خیال بھی غالباً اسی وقت پیدا ہوا۔ اس نقطۂ نظر اور اس رجحان کی رجعت پسندوں کی جانب سے جتنی شد و مد کے ساتھ مخالفت ہونی چاہئے تھی، حق ہے کہ نہیں ہوئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ بنگال کا قحط تھا۔ بنگال میں قحط شروع ہوا اور اس کے ہولناک اثرات اتنی سرعت کے ساتھ ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے کہ مخالفت کا خیال چھوڑ کر سب کے سب اس کے تاثر اور اس کے نفسیاتی رد عمل کی جانب متوجہ ہوگئے، اعلیٰ اور معیاری ادبی رسائل سے لے کر سستے اور گھٹیا فلمی

رسائل تک قحط بنگال اور اس کے عبرت انگیز اثرات کے ذکر سے بھرپور نظر آنے لگے قحط بنگال کے موضوع کی اتنی ہمہ گیری اور مقبولیت کا سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ قحط کے موضوع میں سے لرزہ خیز عبرت انگیز واقعات کے ساتھ ہی ایک رومانی دلبستگی کا پہلو بھی وابستہ تھا' اس کے برعکس جو کس نے اس پر لکھا۔ بھوک اور اس سے پیدا ہونے والی مجبوری کا تصور اتنا شدید' اتنا گہرا اور اتنا رومان انگیز تھا کہ شاید لاکھوں صفحات کا بے معنی لٹریچر اسی ایک موضوع سے پٹا پڑا ہے لیکن ترقی پسندوں نے جس جوش' جس چاؤ' جس ذہانت اور جس بالغ نظری سے اس پر لکھا' اب تک کسی موضوع پر نہیں لکھا گیا' اس کی بڑی وجہ ان کا فطری میدان تھا جو سرمایہ دارانہ استبداد کے خلاف ان کے ذہنوں میں پرورش پا رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس ایک موضوع میں سے کتنے ہی اور دوسرے موضوع وابستہ تھے غیر ملکی سامراجی لعنت' ترقی دشمن قوتوں کی مہلک سرگرمیاں' معاشی الجھنیں' محنت و سرمایہ کی آویزش' اور ایک نئے اور صحت مند معاشرے کی تعمیر یہ اور کتنے ہی موضوع ایسے تھے جو ترقی پسندوں کے مزاج' نظریات' فطرت اور دعاوی سے نہ صرف لاگ ہی کھاتے تھے بلکہ ان پر تصدیق کی مہر بھی لگا دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ جتنے سلیقے' جتنی قوت اور جتنی سنجیدگی سے اس ایک موضوع کو برتا گیا اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اسی موضوع نے کرشن چندر کو سب سے اچھا افسانہ دیا (ان داتا) ساحر لدھیانوی کو سب سے کامیاب نظم دی (کلکتہ کے بازاروں میں) وامق کو سب سے اچھا گیت دیا (بھوکا بنگال) سردار جعفری کو سب سے اچھوتی ٹکنیک (جمہور) (ماتھی) دی اسی موضوع نے ادب میں نہایت اہم اور ہمت افزا توقعات کو جنم دیا۔ فن کو برتنے' خرچ کرنے اور استعمال میں لانے کا جتنا کامیاب تجربہ اس ایک موضوع کی بدولت ظہور میں آیا اس سے کم اہم اس سے کم مہلک اور اس سے کم ہولناک حادثہ کے رونما ہوئے بغیر ممکن بھی نہیں تھا — نہ کرشن چندر ان داتا سے بہتر افسانہ اب تک لکھ پائے نہ ساحر' جعفری اور وامق اپنے اپنے ادب پاروں سے بہتر۔ لیکن اس موضوع کی کامیابی' مقبولیت' اثر انگیزی اور دل نشینی کے اسباب کو جلد اس کے نفسیاتی پس منظر کو اجاگر کئے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہندوستان میں غیر ملکی سامراج انحطاط پذیر قوت کے ساتھ اپنی آخری ہچکی پوری کر رہا تھا۔ عوام کے شدید تنفر' جذباتی ہیجان اور کچھ کر جانے والی ہیم اور تند خواہشوں کے درمیان اس کی فرسودہ ریشہ دوانیاں اپنی گھڑیاں گن رہی تھیں۔ ہندوستان ہی میں نہیں پوری دنیا میں انگریزی شہنشاہیت نے دم توڑ دیا تھا۔ ہندوستان میں سیاسی جدوجہد اپنے شباب پر تھی مہاتما گاندھی جیسے امن پسند اور اہنسا وادی لیڈر بھی مغلوب الغضب اور پُرجوش نظر آتے تھے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ قحط بنگال کی ترجمانی پر تخلیق میں عوام کے جذبات کی ہم آہنگی تھی' محکومیت کی لعنت سے جلد از جلد مخلصی پا لینے کی انتہائی آرزو مندی کے ساتھ ہی ساتھ اس کے لئے علاج اور مرہم بھی مہیا کیا گیا تھا۔ اس درد کے اظہار کے ساتھ جو ہندوستانیوں کے دلوں میں جگہ بنا چکا تھا۔ طریقۂ علاج بھی تجویز کیا گیا تھا۔ منزل کے تعین اور نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی۔ سرمایہ داری کے خلاف جذبہ اس کے پس منظر میں تھا اور انگریز دشمنی' ہمدردی اور عالمگیر مساوات کا تخیل اس کے منظر میں۔ جذبات کی صداقت اور اپنائیت کی گرمی نے ان تخلیق میں چھا جانے' کھب جانے اور اتر جانے والے تاثر کو اپنی پوری ہمہ گیری اور شدت کے ساتھ سمو دیا تھا ماحول' اسباب' زندگی اور خارجی محرکات کے پیچھے اور صحیح تجزیے کے ساتھ ہی منزل کے تعین' راستہ کی وضاحت اور نجات پا جانے سود مند تدابیر کے علاوہ ان ادب پاروں میں ایک عظیم طاقت تھی' دعوت تھی' للکار تھی' جس نے خواص اور عوام دونوں کے دلوں پر یکساں طور پر اثر ڈالا۔ کچھ تو قحط بنگال کے موضوع کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کے باعث اور کچھ ترقی دشمن قوتوں کی پوشیدہ کوششوں سے لاعلمی کی بدولت ہمارے ادیبوں نے فسادات کے معاملے میں اپنی ذہانت طباعی اور جذباتی شعور کی پختگی کا بہت زیادہ کامیاب ثبوت نہیں دیا۔ انہوں نے فسادات سے پہلے ہواؤں کے رُخ سے عوام کو خبردار نہیں کیا نہ ہی انہوں نے فسادات سے پہلے زوال آمادہ قوتوں کے اس آخری مورچے پر اپنی توجہات مرکوز کیں جو آزادی اور آزادی سے پیدا ہونے والی برکتوں اور سعادتوں کو اپنی آخری اور انتہائی جان توڑ کوششوں سے تارپیڈو کر دینے میں اندر ہی اندر مصروف کار تھیں۔ فسادات ہماری تمدنی تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ ہیں' سب سے ہولناک حادثہ جنہوں نے ہماری تہذیب کو جھلس کر رکھ دیا' معاشرت کی منضبط قدروں کو توڑ مروڑ کر مسخ کر دیا۔ راسخ عقیدوں پر کاری ضربیں لگائیں۔ جنہوں نے ہندوستان کی زمین پر رہنے اور بسنے والے انسانوں کے دماغوں' ذہنوں اور دلوں کو ہلا کر رکھ دیا جنہوں نے ایک برصغیر پر پھیلی ہوئی مشترکہ برادری کے درمیان

ہولناک شگاف پیدا کر دئے۔ جنہوں نے زندگی کی سمیتا کو جھنجھوڑ ڈالا۔ جس وقت انسانی دماغوں سے یہ متعفن اور فاسد مادہ آتشیں لاوے کی شکل میں باہر نکلا تو فضاؤں میں زلزلے آگئے' پوری انسانیت نے ایک شدید جھٹکا محسوس کیا۔ یہی نہیں کہ فسادات نے ہماری داخلی زندگی میں افراتفری' انتشار اور پراگندگی پیدا کر دی بلکہ اس نے ہمارے اس روحانی تفوق کو بھی بری طرح زخمی کر دیا جو ہم مغرب کے مقابلے میں بلا نظریں جھکائے پیش کر دیا کرتے تھے۔ آزادی کے سورج کے طلوع ہونے سے بہت پہلے سفاکی' بربریت اور بہیمیت کا یہ سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ جس دن آزادی کا پہلا سورج ہندوستان کے آسمان پر چمکا تو آزادی کا چہرہ لہولہان ہو چکا تھا! اس کے خوبصورت اور مقدس جسم پر بڑے گہرے' خوفناک اور مکروہ زخم پڑ چکے تھے۔ جوں جوں آزادی کے سورج پر حرارت آتی گئی' دونوں ملکتوں میں یہ فسادات آگ کی طرح پھیلتے گئے۔ ترقی پسند فن کاروں نے بڑی حیرت' ششدری اور دماغی پراگندگی کے درمیان ان کا مشاہدہ کیا۔ اور وہ اسی عالم میں' اسی حالت میں' جیسے اور جس حال میں تھے اٹھ کر وقت کی ان بےرحم اور سنگین حقیقتوں پر ٹوٹ پڑے' جس زور اور جس تیزی کے ساتھ یہ فسادات بڑھتے گئے اتنا ہی ان کے افسانے پھیلتے گئے۔ انہوں نے اس حیرانی اور ششدری میں جو کچھ محسوس کیا وہ جوں کا توں پیش کر دیا۔ بلا کچھ اضافہ کئے۔ جوں جوں فسادات پر وقت گزرتا گیا۔ ان کی سوچنے سمجھنے اور اخذ کرنے کی قوتوں میں توانائی بڑھتی گئی' ایچ پیدا ہوتی گئی' نکھار آتا گیا۔ لیکن جن مفروضوں پر فسادات پر لکھے ہوئے افسانوں یا نقطوں کی بنیاد رکھی ہوئی ہے وہ اصلی اور تحقیقی نہیں ہیں۔ فسادات پر لکھے ہوئے افسانے یقیناً بُرے نہیں۔ ان میں خلوص ہے' درد ہے' ظاہر اور مسطر جذبات کی فراوانی ہے پرخلوص برہمی ہے۔ لیکن سچائی نہیں ہے' علاج نہیں ہے۔ مرہم نہیں' درماں نہیں ہے۔ ہمیں بلا جھجک اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ جو کچھ ماحول نے ہمیں دیا۔ ہم نے بجنسہٖ پڑھنے والوں کے حوالے کر دیا۔ بلا اسباب وشواہد کا تجزیہ کئے' بلا ان کے خارجی اثرات اور داخلی محرکات کا پتہ چلائے' بلا ان کے نفسیاتی پس منظر پر غور کئے' ہم نے یہ طے کر لیا کہ فسادات سامراج کی سازش سے ہوئے' تقسیم اس کا سبب تھی۔ دونوں طرف کے لوگوں کی زیادتیاں برابر ہیں' دونوں برابر گنہگار ہیں' مرنے والوں کی تعداد برابر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ فسادات پر لکھا ہوا لٹریچر

یقیناً بےمعنی اور فضول نہیں ہے۔ یہ اس دور کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ انسانوں کی انسانیت کی۔ پشاور ایکسپریس۔ جڑیں' سورج سنگھ' ترے کہے سے ہم نکلے' گرینڈ ٹرنک ایکسپریس اور منیرس لین' افسانے' افسانے نہیں ہیں محکومیت سے آزادی تک کا فاصلہ پر مشتعل انسانوں کے چلنے کے نمایاں نشانات ہیں' واضح نقوش قدم ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ ان کی عمومیت' ہمہ گیری اور ان کا پھیلاؤ انہیں محض "سازش" کے نام پر مطمئن ہو جانے یا کر دینے کی اجازت نہیں دیتا۔ جن واقعات نے' جن حادثات نے' جن سانحوں نے ہماری تہذیب' ثقافت سماجی اور داخلی روایات اور معاشرتی قدروں سے لے کر عام اور سادہ زندگی کے بعید ترین گوشوں پر اتنے بڑے اور گہرے اثرات چھوڑے ہیں وہ سازش کا نتیجہ نہیں ہو سکتے! انہیں یقیناً تحریک کہنا پڑیگا۔ کوئی ایسی تحریک جس نے دماغ کے ایک ہی چشمہ سے ابل کر دو متوازی دھارے پیدا کئے۔ جن میں آگ ہی آگ تھی۔ خون ہی خون تھا۔ جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی کئی صدیوں پرانی میراث کے ٹکڑے اڑا دئے۔ روداشتوں کی دھجیاں بکھیر دیں جو دنیا کے سامنے ہمارے ماضی کا مسکت افکار بن کر اسے تاریخ کے بطلان پر مجبور کر گئے۔ ایسے کون سے سیاسی نظریات' ایسے کون سے سماجی انتقام اور ایسے کون سے اخلاقی' نفسیاتی داخلی یا خارجی محرکات تھے جنہوں نے دو قدیم ہمسایہ مذاہب کو اس بری طرح ٹکرایا کہ آج دونوں کی شکلیں مسخ ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہ تسلیم ہے کہ بات پرانی ہو چکی ہے لیکن حالیہ فسادات نے ایک بار پھر سر نکال کر پوچھا ہے۔ کیا ہم اب تک سازش ہیں ؟؟؟ آج سے تقریباً تین سال پہلے ہم یقیناً آسانی کے ساتھ کہہ سکتے تھے کہ فسادات سامراج کے اشارۂ چشم و ابرو پر ہوئے لیکن آج نہیں۔ آج اس کا الزام سامراجی سیاست کو دینا بہت بڑے دل گردے کا کام ہے آج جو حکومت برسر اقتدار ہے وہ ابھی تک عوام کی اکثریت کی نمائندہ ہے اور دنیا کی بدقسمت ترین حکومت بھی یہ نہیں چاہ سکتی کہ اس کے داخلی امن میں ذرہ برابر بھی خلل آئے۔ آج جتنے اہم' پیچیدہ اور خطرناک مسائل سے ملک کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے ان کی موجودگی میں تو یہ بات اور بھی دور از قیاس ہو جاتی ہے کہ حکومت کی غفلت سے' یا قصداً چشم پوشی سے یا سرمایہ دوستی کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے امن کا مسئلہ اس وقت وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے اس کا شدید ترین تقاضا ہے کہ ہم اس باہمی نفرت' حقارت' کشمکش اور آویزش کے اصلی اور بنیادی اسباب کا کھوج لگائیں ان کا نفسیاتی

۔ تجزیہ کریں، پھر سب مل کر اس کا علاج سوچیں۔ گو لیاقت اور نہرو معاہدہ نے باہمی نفرت کے اس ابھرتے ہوئے سیلاب میں بندھ لگا دیا ہے۔ اس معاہدے سے جو کچھ نتائج برآمد ہوئے ہیں اس میں شک نہیں کہ دونوں سلطنتیں اس کے خوشگوار اثر کو پوری طرح محسوس کرتی ہیں لیکن حکومتی سطح پر کیا گیا کوئی سمجھوتہ، کوئی معاہدہ جمہور اور عوام کے اصلی جذبات کے سامنے دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ کوئی بھی اسکیم جو حکومتی سطح پر عوام کے سامنے پیش ہوگی بہ اکراہ مسلط تو کی جا سکتی ہے مقبول نہیں بنائی جا سکتی۔ بین المملکتی معاہدہ کا سب سے روشن اور اہم نتیجہ یہی ہے کہ اس نے انصاف کو میزان تک لانے کے لیئے مشکلات پر پُل بنا دیا ہے۔ اب عوام کو احساس دلانے، محبت اور یگانگت کا ماحول پیدا کرنے، دشمنی اور باہمی حقارت کو نیست و نابود کر دینے کے لیئے جتنی فضا آج ہموار ہے اتنی کبھی نہیں تھی۔ لیکن یہ کام سیاسی اور حکومتی اسٹیج سے پائے تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا یہ خالص سماجی مسئلہ ہے اور اسے عوامی سطح سے ہی مکمل طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔ اسے ہمارے ادیب ہی بآسانی انجام دے سکتے ہیں جن کا عوام سے ذہنی اور دماغی تعلق بے واسطہ ہے۔ جنہیں عوام اپنا جانتے اور سمجھتے ہیں اور جنہیں ذہنی تربیت کا یک گونہ تجربہ ہونے کے ساتھ ہی اس کا سلیقہ بھی ہے آج فرض کی آواز جن لوگوں کے لیئے سب سے زیادہ دردمند ہے وہ ہمارے ادیب ہیں۔ جن کی اہمیت آج کے سماج میں، آج کے عوام میں سب سے زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے۔ کوئی بھی ادیب جسے صحافت اور ادب کی قدروں کے درمیان فرق کرنے کی ذرا بھی تمیز ہے وہ اس مسئلہ کو عمرانی نقطہ نظر کے علاوہ فرقہ واریت کی سطح سے تو حل کرنے کی تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ ادیب اگر صحافی نہیں ہے تو یقیناً تنگدل بھی نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی حیثیت میں کسی تکدر یا تاثر کی کوئی لکیر کسی کے لاشعور میں پیوست ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب بھی وہ کسی ارادی تخلیق کو عملی جامہ پہناتا ہے تو اس شاہد کی پرچھائیاں تک دور ہٹ جاتی ہیں۔ ہمارے فن کاروں نے بیدار ہندوستان کے ہر دور کا نہایت خلوص دل سے ساتھ دیا ہے انہوں نے زندگی کے ہر بیمار عضو پر عمل جراحی کر کے اسے صحت مند بنانے کی کوشش کی ہے انہوں نے زندگی کا تصور اس وقت پیش کیا تھا جب ادب میں مقصدیت کو کفر سمجھا جاتا تھا۔ پھر اگر آج سب مل کر بیمار انسانیت کے اس سب سے بڑے عارضہ کی تشخیص اور علاج میں لگ جائیں تو کیا چیز ممکن نہیں ہے۔ کیا یہ مسئلہ توجہ کا محتاج اور رائے کے اظہار کے قابل نہیں ہے ؟؟؟

مضطر گکوڑوی

آمدِ محبوب

مدّتوں میں آج وہ جانِ حیات آ ہی گئی
رقص فرماتی وہ رُوحِ کائنات آ ہی گئی

پھر وہی دلچسپئ نظّارۂ شامِ چمن
پھر بہارِ جلوۂ باغِ حیات آ ہی گئی

گونج اُٹھّے پھر فضا میں نغمہ ہائے زندگی
وجد میں پھر آج رُوحِ کائنات آ ہی گئی

پھر وہی لطفِ جوانی پھر وہی کیفِ شباب
پھر وہی سرشارئ دورِ حیات آ ہی گئی

پھر وہی سرمستیاں ہیں پھر وہی مدہوشیاں
پھر حسیں ساغر میں صہبائے حیات آ ہی گئی

پھر نگاہوں میں سمٹ کر آ گیا حُسنِ تمام
پھر مرے دِل میں سمانے کائنات آ ہی گئی

پھر مہک اُٹھّے شمیمِ زُلف سے کون و مکاں
پھر نفس میں بُوئے گلہائے حیات آ ہی گئی

آ گیا پھر میری باہوں میں چھریرا سا بدن
گود میں پھر رسمساتی کائنات آ ہی گئی

پھر مزا آنے لگا ہر جراُتِ بے باک سے
آرزو تھی جس کی وہ پُر کیف رات آ ہی گئی

عالَمِ مستی میں کھو کر سو گئے پھر حُسن و عشق
پھر وہی کیفیّتِ خوابِ حیات آ ہی گئی

ذکر و فکر

سحر ہونے تک
تنویر علوی

جن سے وابستہ تھی اُمیدِ سحر — وہ اُجالے بھی تھے ظلمت کے نقاب
رات کی آنکھ سے آنسو نہ گرا — خود کشی کرتے رہے گر کے شہاب
کتنے جھوٹے تھے وہ شیریں سپنے — جن میں لہرائے تھے تاروں کے کنول
وُہ تصوّر کی حسیں تر وادی — اور اُبھرتے ہوئے وہ رنگ محل
کیسی تاریک تھی وہ راہِ حیات — کارواں جس میں بھٹکتا ہی رہا
اور کانٹا تھا ہر اک نقشِ قدم — جو نگاہوں میں کھٹکتا ہی رہا
اور وہ سامنے خوشیوں کا سراب — جس کے دامن میں تھی اُمید کی ضو
جیسے بس چند قدم چند نفس — اس دُھندلکے سے پرے وہ جادۂ نو
اور پھر وہ ہی گراں خواب نقوش — ریت کے ذرّوں پہ جیسے اہرام
اور اندھیرے کی مسلسل دیوار — جیسے ماضی کا طلسمِ اوہام
دُور افق پر وہ سنہری سی لکیر — دیکھنے کا جسے یارا بھی نہ تھا
بڑھ گئیں اور بھی ظلمت کی تہیں — اور اب کوئی سہارا بھی نہ تھا
پھر وہی خوف وہی سنّاٹا — بجلیاں تھیں کہ چمکتے تھے سحاب
جن سے وابستہ تھی اُمیدِ سحر — وہ اُجالے بھی تھے ظلمت کے نقاب

عہدِ وفا
انجم اعظمی

شکستِ غم کا تصوّر عجیب ہے لیکن
تری نگاہ پہ کتنا مجھے بھروسہ ہے
مرے جنوں کو نئے آستاں کی حاجت تھی
تری تلاش تھی اے جانِ حسن و برنائی
تجھی کو ڈھونڈھ رہا تھا میں جلوہ گاہوں میں
تجھی کو پا کے محبت نے سر اُٹھایا ہے
جبینِ ناز پہ اب اتنی مسکراہٹ ہے
کہ ڈوب جائیں گے اس روشنی میں وہم و گماں
مَیں سوچتا ہوں کہ کتنا حسیں تعدد ہے
مرے لئے ہی کھِلے ہیں مسرّتوں کے کنول
یہ اعتماد مجھے دے گئی ہو تم آ کر

صنم کدوں میں تو پھیلی ہے تیرگی ہر سو
ہر ایک سمت سے اُٹھتی ہیں سوگوار آنکھیں
کہ جب بھی حوصلۂ دل کو آزمایا ہے
کسی کو عہدِ وفا پھر نہ راس آیا ہے
مگر جو زخمِ جگر کی پکار گونج اُٹھے
مگر جو تشنہ لبی کا کوئی مداوا ہو

تجدید
باقر مہدی

چشمِ اُلفت سے ابھی خون کے آنسو رو تی
شاید اک روز اُمیدوں کا گلستاں ہنستے
ایسا مجبور نہ تھا میرا جنوں بھی لیکن
زخمِ دل دردِ محبت میں مہکتا ہی نہیں
رخصتی لمحوں میں ہونٹوں پہ دعاؤں کا گماں
دھڑکنیں دل کی سُناتی ہوئی بھولے نغمے
تیری آنکھوں میں نہ تھی خونِ تمنّا کی جھلک
پھر بھی پیمانِ وفا کوئی نیا کر نہ سکے
خندہ زن اپنی شکستوں پہ رہا ہوں اکثر
آج اُن خشک سے ہونٹوں پہ یہ آہیں کیسی
ہم نہ طوفانِ الم سے کبھی گھبرائے مگر
تجھ سے چھٹ کر دلِ برباد کہیں ڈوب نہ جائے
آ کہ پھر میری اُمیدوں کو سہارا مل جائے
کتنے جل اُٹھے ہیں دُنیائے تمنّا میں چراغ
اب بھی کھوئی ہوئی راہوں سے یہ آتا ہے پیام
زندگی نام ہے تجدیدِ وفا کا اے دوست
آج تجھ سے چلے ہیں یہ اُمیدوں کے کنول
آ کہ ان خوابوں کا رنگین فسوں ٹوٹ نہ جائے
آرزوؤں کے چراغوں کو جلائے رکھوں
دلِ ناداں کو ابھی اور سنبھالے رکھوں

کے تھال اور پلاؤ کا سامان خرید کر گھر پہنچا۔ اور تین پتیلے بھر کر آگ پر رکھ دئے۔ اتنے میں تمام لڑکے اکٹھے ہو گئے۔ سب نے مل کر مٹھائی کھائی۔ آج لڑکے بڑے خوش تھے۔ گاتے بجاتے اور ہنستے کھیلتے رہے اور بہگو چمار بانسری بجاتا رہا۔

بادشاہ سادھو کا بھیس بدلے آیا۔ بہگو چمار نے آؤ بھگت کی۔ بادشاہ نے پوچھا کہ آج تم بہت خوش نظر آتے ہو۔ اور پھر تین پتیلے پلاؤ کے پکائے جا رہے ہیں۔ کیا وجہ ہے؟ کیا کوئی خزانہ ہاتھ لگا ہے؟



بہگو چمار نے کہا۔ سادھو جی! بات دراصل یہ ہے کہ آج بادشاہ کے ہاں نوکری کی ہے اور انھوں نے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ میں نے انہی کی دی ہوئی چاندی کی تلوار بیچ کر ایک ٹین کی تلوار خرید کر اُسے نیام میں رکھ لیا ہے۔ اور باقی پیسوں سے کھانے پینے کا سامان خرید لایا ہوں۔ اللہ کی قدرت بے نیاز ہے۔

بادشاہ یہ سب کچھ سن کر گھر کو روانہ ہوا اور بہگو چمار کی دل ہی دل میں تعریف کرتا رہا۔

صبح ہوئی۔ بہگو چمار اپنی ڈیوٹی پر تھا اور بادشاہ سلامت دربار میں۔ بادشاہ نے سوچا۔ آج بہگو چمار کی تلوار دیکھی جا اُنھوں نے بہگو چمار کو بلایا۔ اور دو ایسے قیدی جنھیں قتل کے مقدمہ میں گردن سے اُڑا دینے کی سزا ملی تھی۔ دربار میں لائے گئے۔ بادشاہ نے بہگو چمار سے کہا۔ کہ ان دو قاتلوں کی گردنیں اپنی تلوار سے اُڑا دو۔ بہگو یہ حکم سُن کر بہت ڈرا کہ اب کیا کیا جائے۔ چاندی کی تلوار تو بازار میں بیچ آیا ہوں اور ٹین کی تلوار سے گردن تو کیا اُڑائی جا سکتی ہے گھاس بھی نہیں کاٹی جا سکتی اور اگر بادشاہ سلامت کو یہ علم ہو جائے کہ میرے پاس چاندی کی تلوار کے بجائے ٹین کی تلوار ہے تو مجھے ہی گردن زدنی کی سزا دے دیں۔

کچھ دیر کے بعد اُس نے جان کی امان پاتے ہوئے بادشاہ سے گذارش کی کہ بندہ پرور! میرے ہاتھوں کسی کی گردن نہ اڑائی جائیگی کسی کی گردن کاٹنا ایک طرف مجھے ایسے واقعات دیکھ کر ہی ڈر لگتا ہے جب بادشاہ نے سخت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ بہگو چمار نے اِدھر تلوار کو میان سے نکالا اُدھر بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں آیا تو بادشاہ سلامت نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ڈرو مت اس وقت تو تمہارا امتحان لیا جا رہا تھا۔ میں تمہارے سارے حالات جانتا ہوں اور تمہارے کام سے خوش ہوں۔ اب تمہیں کوئی نہیں ستائے گا۔ ہمارے خزانے سے روزانہ پانچ روپے تمہیں ملا کریں گے۔ اور تم مزے سے اپنا جشن مناتے رہو۔

بہگو چمار روزانہ پانچ روپے بادشاہ کے خزانے سے لاتے اور شہر کے تمام لڑکوں کو اکٹھا کرتے۔ مزے سے کھاتے پیتے۔ اور ایک ساتھ بانسری بجاتے ہوئے بادشاہ کی درازیٔ عمر کی دعا کرتے۔

تعجب ہے کہ صاحب اسسٹنٹ بہادر نے مجھے کیوں نہ کہا، بلا کیوں نہ لیا یقین ہے کہ جب آپ یہ خط اپنے نام کا حضرت کی خدمت میں بھجوا دیں گے تو وہ مجھے بے تکلف بلا لیں گے، فقط

عنایت کا طالب

غالب

مذکورۂ بالا خط میں حسب ذیل نکات غور طلب ہیں،

(۱) "نسخہ اعجاز ہنگامہ" کے وصول ہونے کا شکریہ،

(۲) کتاب کا نام "جام جہاں نما" ہے،

(۳) اسسٹنٹ کمشنر بہادر ترقی علوم میں دلچسپی لے رہے ہیں،

(۴) مرزا کو نہیں بلایا جس پر انہیں تعجب ہے،

(۵) غالب مسلسل حاضر نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ ستر برس کی عمر ہے،

(۶) حسب طلب یا ضرورت کے موقع پر حاضر ہو سکتے ہیں۔

ان باتوں کا خیال کرتے ہوئے، شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خط "ماسٹر پیارے لال"[1] کے نام ہو۔ اس لئے کہ ماسٹر صاحب "دہلی سوسائٹی" کے سیکرٹری تھے، اور مرزا کے دوست،

ڈاکٹر عبدالستار صاحب نے اپنے ایک مضمون میں تحریر فرمایا ہے کہ "دہلی سوسائٹی" کے پہلے جلسے میں دہلی کے بڑے بڑے اہل ذوق جمع کئے گئے لیکن غالب کو زحمت نہیں دی گئی"

شاید یہ خط اسی سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہو۔ اور جس کتاب کے ملنے کی اطلاع دی ہے وہ اسی جلسے کی کارروائی ہو، (جس کی تفصیل صدیقی صاحب کے مضمون "دہلی سوسائٹی اور غالب" مطبوعۂ غالب نمبر "علی گڑھ میگزین" میں ملاحظہ ہو) لیکن مرزا صاحب اس کا نام "جام جہاں نما" بتاتے ہیں؟ ؟؟؟

اس کی مزید تائید اسسٹنٹ کمشنر صاحب کے ذکر سے ہوتی ہے جو "دہلی سوسائٹی باعث ترقی علوم رفاہ عام" کے ایک اعلیٰ عہدہ دار تھے، جن کا نام "فنشر چیئرک" یا "ہارکورٹ" صاحب بہادر تھا۔

اس وقت مرزا کی عمر یقیناً ستر یا اس سے زیادہ تھی، پھر یہ کمیٹی کے دوسرے جلسے میں وہ بلائے بھی گئے، اور ممبری بھی قبول کی، اور یہ بھی کہا کہ

"اگر کسی امر[2] میں بذریعۂ خط مجھ سے کچھ پوچھا جائے تو وہ لکھ سکتا ہوں جو میری رائے میں آئے، اگر تحریر نظم و نثر فارسی و اردو کا حکم آ دے تو لکھ کر بھیج سکتا ہوں"۔

اس بنا پر یہ خط جولائی ۱۸۶۵ء کا قرار پاتا ہے۔

یہ بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ خط "منشی سدا سکھ" ایڈیٹر "جام جہاں نما" کے نام ہو لیکن اس میں دقت یہ ہے کہ "جام جہاں نما" کے نام غالب کا صرف ایک خط[3] ملتا ہے۔ اس کے علاوہ دو خطوں میں[4] صرف نام آیا ہے، جس سے خیال ہوتا ہے کہ مرزا سے زیادہ تعلقات اس ادارے کے نہیں تھے، پھر یہ کہ یہ اخبار کلکتہ سے ۲۸ مارچ ۱۸۲۸ء کو نکلا۔ اور ۱۸۵۷ء[5] کے بعد اس کا پتہ نہیں چلتا، تیسری بات یہ کہ غالب اس خط کے ذریعے سے اپنی طلبی اور خدمت گذاری کا موقع حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ اسسٹنٹ کمشنر صاحب خوش ہوں؟ جہاں تک میرا علم ہے دہلی کے کسی افسر کا تعلق اس پرچے سے نہیں معلوم ہوتا۔

اس خط کے بعد دس خط "میر مہدی مجروح" کے نام ہیں یہ خط "اردوئے معلی و عود ہندی" میں کسی قدر کمی زیادتی کے ساتھ ہیں، دو خط ان دونوں مجموعوں میں نہیں لیکن "خطوط غالب" مرتبہ مہیش پرشاد صاحب میں ہیں،

ایک خط جو "اردوئے معلی" طبع اول ص ۱۸۵ مطبع نامی ص ۱۱۲ مجتبائی ص ۱۶۹ فاروقی ص ۱۶۹ میں بغور تاریخ کے، اور "غالب کے خطوط" شایع کردہ انوار بکڈپو خط نمبر ۲ ص ۱۰۹ میں "انتخاب" سے نقل کیا گیا ہے، اور آخر میں تاریخ ۹ جون ۱۸۶۶ء ہے۔ ہمارے مجموعے میں اس خط کی تاریخ ۹ جون ۱۸۶۱ء ہے

(۲)

مفتی میر محمد عباس صاحب مرحوم[6] ہندوستان کے ان مایۂ ناز علماء میں تھے جن پر عراق، عرب، ایران کو رشک ہے۔ جن کے تصانیف بڑی قدر و منزلت کے مالک ہیں۔ مرزا غالب سے ان کے تعلقات تو بہت پہلے سے قائم تھے۔ لیکن براہِ راست خط و کتابت یوں شروع ہوئی کہ انہوں نے اپنی کتاب "قاطع برہان" مرزا کو بھیجی، جس کے لفافے پر یہ عبارت تھی:۔

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے ص ۳ پر دونوں کو اسسٹنٹ کمشنر لکھا ہے لیکن ص ۵ پر میکاہن صاحب کو اسی عہدے سے یاد کیا ہے، حالانکہ اس سے پہلے "کمشنر" بتایا ہے۔

[2] غالب نمبر ص ۵۰ [3] متفرقات ص ۹۶ [4] ص ۵۳ [5] "آجکل" ہار دسمبر ۱۹۳۶ء ص ۹۵ [6] متوفی ۱۳۰۶ھ

" مکانپور بمکان نواب باقر علی خان صاحب موصول و بخدمت خدام مخدومی جنات مفتی میر عباس صاحب زاد مجدہ مقبول و دربارۂ بخشیدن اطلاع رسیدن ارمغان عنایت مبذول باد"

مرسلہ چہارم اگست ۱۸۶۳ء

کتاب کے وصول ہونے کی اطلاع مفتی صاحب یوں لکھی،

اسٹامپ پیڈ

اسد اللہ
غالب

یا اسد اللہ الغالب و مظہر العجائب

پس از اقدام برائے اتحاف تحفہ سلام کہ نثار اقدام خدام تواند چہ سلامیکہ چون در نجف در صدف شرف پرورده، و در تلألؤ انوار از تکمۂ زرتار افتاب نصف النہار گوئے سبقت بردہ، ملتمس انکہ تحریر شکریۂ ہدیۂ بہیہ مشتمل مدح و ثنائے آن عطیہ از حیز بیان و بنان بیرون است، سبحان اللہ فکریم (؟) کراستایم و یکے گرامیم بستائش "قاطع برہان" کہ در انقلاب زبان نام و نشان "برہان قاطع" را بر ہم زدہ و زیر و زبر کردہ، یا بسپاس گزاری آن خسرو خاور شیرین بیانی و ناظم قلمرو سخندانی کہ امروز در شعر و شاعری نظیرے ندارد و کسے در برابرش نامورے نیاید و ہرگاہ صدا انجمن اہل سخن ذکرش بر آید یاد فردوسی فراموش است واگر در شہرستان نظم و نثر کوس لمن الملک زند زمانہ سراپا گوش،

در فن معانی ید بیضا دارد	در سحر بیانی لب عیسیٰ دارد
گر شیوہ منشیان دیگر جادوست	او از قلمش عصائے موسیٰ دارد

نواب مستطاب معین الدولہ انتظام الملک سید باقر علی خان بہادر ظفر جنگ کہ نکتہ رسے است یکتا و مسیحا نفسے است۔ بے ہمتا برین شعر

از من بمن سلام و از من بمن پیام	رنج دلی مباد پیام و سلام ما

وجد کردند و مکرر خواندند و فقیر از تاریخ ختم کہ "مہر غالب" یافتہ محو شدم کہ چہ قدر بے تکلف و پر تکلف است و تاریخ این ہدیہ از ہمیں مادہ باین صورت بر آوردم

غالب آن مہر سپہر نظم و نثر	ہمصفیر صائب و طالبا
تحفہ اش از مہر ش رسید	شد رقم تاریخ "مہر غالبا"

۱۲۷۹ھ

حررہ اضعف الناس السید محمد عباس....

....

اس خط کے جواب میں مرزا نے جو خط لکھا، وہ "اردوئے معلی" طبع اول ص ۲۱۲ پر شائع ہو چکا، اس خط میں حسب ذیل اختلافات ہیں۔

" فقیر امیدوار ہے کہ یہ دفتر بے معنی سراسر دیکھا جائے نہ پیش نظر دُہرار ہے بلکہ اکثر دیکھا جائے" سطر ۳ اردوئے معلی "اصل خط لیکن فقیر نہ سرسری بلکہ سراسر دیکھنا چاہیئے، پیش نظر دہرا رہے۔ وقت فرصت اکثر دیکھا جائے"

سطر ۴ "دیباچہ و خاتمہ میں........" "اصل خط" دیباچہ و خاتمہ و متن میں......" سطر ۵ "گزارش لطافت سے خالی......" اصل "گزارش ظرافت ....." سطر ۸ "مطابق اہل پارس کی منطق کا بھی مزہ ابھی لایا ہوں" اصل خط "مطابق اہل پارس کی منطق کے یہی فقرہ ایزدی لایا ہوں" سطر ۱۴ "برہان جب تک غیر کے کسی برہان کو قطع نہ کرے کیوں کر برہان قاطع نام پائے گی؟" اصل خط "برہان......کو قطع نہ کرے گی۔ کیوں کر برہان قاطع نام ہوگا" سطر ۱۹ "میرے شعر کی تعریف......" اصل "میرے شعر کی ستائش......"

مطبوعہ نسخوں میں غالب کے اس خط کی کوئی تاریخ درج نہیں، لیکن خط میں یہ جملہ مع تاریخ موجود ہے،

انصاف کا طالب غالب

شنبہ ۱۰ صفر ۱۲۷۹ھ

غالب

اس کا جواب "تجلیات" میں شائع ہو چکا ہے، جو باوجود مفید ہونے کے یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا؛ کیونکہ مضمون بہت طولانی ہو گیا ہے۔

مرزا کے خط میں ایک جملہ ہے "قطعہ تاریخ کا کہنا ہے الخ" اس سے مراد وہی قطعہ ہے جو مفتی صاحب کے خط میں موجود ہے"۔

(۳)

"تیسرا خط جو غالب کے کسی مجموعۂ مکاتیب میں نہیں وہ خط مولانا سید محمد صاحب قبلہ مرحوم[1] کے نام کا ہے۔ مولانا ہند کے مشہور علما میں سے تھے۔ حضرت غفرانمآب مولانا دلدار علی صاحب قبلہ کے صاحبزادے تھے، شاہان اودھ ان کے حکم سے معاملات حکومت طے کرتے تھے۔ غالب کے دد

[1] سلطان العلما، اور بڑے قبلہ و کعبہ کے نام سے مشہور تھے۔ ۱۲۸۴ھ میں انتقال کیا۔

خط ممدوح کے نام "پنج آہنگ" میں ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ممدوح ہی کے واسطے سے غالب کو شاہی عطایا پہونچتے تھے، غالب چونکہ ان کے ارادت مند * اور منہ بولا ان کے پیرو تھے لہٰذا ان کا بہت احترام کرتے تھے، ان کے بھائی کے انتقال پر ایک پردرد مرثیہ بھی کہا اور تاریخ بھی جو ان کے کلیات میں موجود ہے (قطعہ سید حسین اور ان دو خطوط میں)

" خداوند نعمت، آیۂ رحمت سلامت۔ تسلیم و کورنش و فدلیہ نیازی کہ پیش ازیں بپاسخ ہمایوں توقیع مدان داشتہ ام لغز قبول قرین باد درین ہنگام در شہر دو دانشمند باہم درآویختہ اندیکے می سراید کہ آفریدگار ہمتائے حضرت خاتم الانبیا علیہ و آلہ السلام می تواند آفرید و این یکے میفرماید کہ ممتنع ذاتی و محال ذاتی است بندہ چون ہمین عقیدت دارد نظمے در گیرندہ بدینمد عا سرانجام دادہ است بر آئینہ چشم دارد کہ سواد بہ نور نظر اصلاح روشن شود۔

زیادہ حد آداب   از غالب نگاشتہ بست و یکم جمادی الاولیٰ ۱۲۶۲ھ (فروری ۱۸۵۱ء)

اس کے بعد آخر کے بیس شعر" کلیات کی چھٹی مثنوی" سے نقل کئے ہیں، مثنوی کے اشعار لکھ کر تاریخ تحریر ۴ جمادی الثانی ۱۲۶۳ھ لکھا ہے (میرا خیال ہے کہ "اولیٰ" کو "ثانی" سہواً لکھ گئے ہیں)

حالی نے "امتناع نظیر خاتم المرسلین" والے مسئلے پر نزاع کا ذکر کیا ہے لیکن زمانہ معیّن نہیں کیا۔ اکرام صاحب بھی سرسری ذکر کر کے رہ گئے، مہر صاحب نے ص ۳۶۲ پر تحریر فرمایا ہے۔

مولانا فضل حق ...... نے ...... بہ اصرار ایک مثنوی شاہ اسمٰعیل کے رد میں لکھوائی جو فارسی کلیات میں موجود ہے ..... غالب کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ چھبیس ستائیس برس کی ہوگی۔ اس لئے کہ ۱۷۹۷ء میں وہ پیدا ہوئے اور ۱۸۲۶ء میں شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد جہاد کے لئے دہلی سے روانہ ہو چکے تھے۔ یہ بحث بہرحال ۱۸۲۴ء سے پیشتر ہوئی ہوگی۔" (غالب از مہر)

لیکن خط میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ۱۸۲۴ء سے ۲۶۔۲۷ برس بعد کا ہے اور ۱۸۵۱ء سے * کچھ پہلے کا۔

(۴)

سید محمد زکریا خاں رضوی ذکی ڈپٹی انسپکٹر مدارس یو پی متوفی ۱۹۳۳ء کے دیوان مطبوعہ جون ۱۹۲۵ء میں غالب کی ایک سند شاگردی شائع ہوئی ہے، جو نقل کی جاتی ہے

" سبحان اللہ سارٹیفکیٹ لکھنے کا کس وقت میں اتفاق ہوا ہے کہ میں نیم جان چند روز کا مہمان ہوں۔ بینا مجھ سے غذا بالکل مفقود صرف گوشت کے پانی پر مدار ہے اگر اٹھوں تو دوران سر سے گر پڑوں، سید محمد زکریا خاں نسب میں سید امیر زادۂ عالی دودمان ان کے بزرگ وزارت کا منصب پا چکے ہیں۔ جاگیر اب تک تھی، پھر بعوض جاگیر پنشن مقرر ہوئی معہذا یہ شخص نہایت خود نیک ذات اور صاحب علم اور متواضع اور دانشمند اور نیک طینت اور رنگین طبع معنی نے طبیعت کو عطا کیا ہے اچھے شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ اس فن میں میرے شاگرد رشید ہیں"

اسد اللہ خان غالب

۱۲۳۸
محمد اسد اللہ خاں

یہ چار تحریریں غالباً ارباب تحقیق کے لئے بالکل نیا مواد فراہم کریں گی۔ مرزا کی زندگی کے دو واقعوں کے بارے میں بہت کچھ روشنی ملے گی، آخری تحریر سے یہ معلوم ہوگا کہ مرزا آخر میں تقریظ کو سارٹیفکیٹ سے کیوں کر بدلتے ہیں اور سارٹیفکیٹ میں بھی فنی طور پر کوئی خاص بات نہیں لکھتے، ہاں سواد خط بڑھانے کو بہت کچھ لکھ دیا۔ اسی بنا پر ذکی مرحوم اس خط کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

منور لکھنوی

جان ٹنڈل

(آئرلینڈ کا مشہور سائنس داں)

جان ٹنڈل آئرلینڈ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے ۱۸۲۰ء میں ان کے سلسلہ حسب و نسب کے متعلق دو روائے ہیں۔ ایک طبقے کا خیال ہے کہ وہ ان ولیم ٹنڈل کی نسل سے تھے جنھوں نے سولھویں صدی کے آغاز میں انجیل مقدس کا ترجمہ پہلے پہل انگریزی زبان میں کیا تھا۔ لیکن انھیں اس خدمت کا صلہ یہ ملا کہ تنگ نظر مذہبی دیوانوں نے ان سے زندگی کا حق چھین لیا محض اس لئے کہ انجیل کا ترجمہ انگریزی زبان میں کرنا گناہ ہے۔

دوسرے بیان کے مطابق جان ٹنڈل متھیو ٹنڈل کی نسل سے ہے۔ متھیو ٹنڈل ایک ممتاز مصنف اور قابل انشا پرداز تھے۔ سترھویں صدی میں انھوں نے مذہبی آزادی کی زبردست حفاظت کی۔

دونوں میں سے کون سا بیان صحیح ہے، اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں لیکن یہ صحیح ہے کہ جان ٹنڈل ایک ایسے بزرگ خاندان کے چشم و چراغ تھے جو وسعت خیال اور کشادگی نظر کے لحاظ سے ایک خاص منزلت کا مالک تھا۔ اس کے کیرکٹر میں شجاعت اور بے باکی کو نمایاں دخل حاصل تھا۔ جان ٹنڈل کو بھی انھیں بزرگ کے اوصاف ورثے میں حاصل ہوئے تھے۔

جان ٹنڈل کے باپ کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ نہائت آزاد خیال تھے طبیعت میں نیکی اور ایمانداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ حالانکہ جس ماحول میں وہ رہتے تھے اس میں قدامت پرست عیسائیوں یعنی کیتھولک فرقے کے افراد زیادہ حاوی تھے۔ لیکن جان ٹنڈل کے باپ اپنے پروٹسٹنٹ عقیدے پر استحکام کے ساتھ قائم رہے۔

جان ٹنڈل کی ابتدائی تعلیم بالکل محدود تھی۔ شروع شروع میں ان کی فطری ذہانت و ذکاوت کا اظہار مذہبی مباحثوں کی شکل میں ہوا۔ اپنے باپ کی طرح پکے پروٹسٹنٹ تھے۔ انھوں نے چیلنگ ورتھ ٹلٹسن جیرمی ٹیلر اور دوسرے انحرافی مبلغان مسیحیت کی کتابوں کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ انجیل بھی انھوں نے پڑھی اور سیر ہو کر پڑھی انجیل کے اکثر حصے انھیں زبانی یاد تھے۔ گویا ان کی ذہنی نشوونما کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی تھی۔ ۱۹ سال کی عمر تک جان ٹنڈل نے ریاضی کا بھی علم حاصل کر لیا۔ اس میں جیومیٹری یعنی پیمائش الارض کا بھی علم شامل تھا۔ علم ریاضی میں اپنی مہارت کی بدولت وہ محکمہ پیمائش میں ملازم ہو گئے۔ محنتی آدمی تھے۔ رفتہ رفتہ ڈرافٹ مین ہو گئے۔ کیلکولیٹری، سروے اور ٹرگنامیٹری کے حساب کرنے کی خدمت بھی ان کے سپرد کر دی گئی۔

۲۱ سال کی عمر میں ایک معمولی سے واقعے نے ان کی زندگی کا رُخ ہمیشہ کے لئے پلٹ دیا۔ ابھی تک جان ٹنڈل کی زندگی کا کوئی مقررہ نصب العین نہیں تھا لیکن ایک روز کی بات ہے محکمے کے ایک اور نہائت ذہین اور شریف ملازم نے جس کے ساتھ جان ٹنڈل نے بمقام کارک کام کیا تھا۔ موصوف کے معاملات سے خود بخود دلچسپی لینا شروع کر دیا۔ بہت جلد اس بندۂ خدا نے جان ٹنڈل کے خصائل و اطوار۔ طرز وقت گذاری اور ان کے آئندہ لائحۂ عمل کے متعلق تمام باتیں دریافت کر لیں اور ایک روز نہائت شفقت کے ساتھ ٹنڈل سے کہا۔

میرے بھائی۔ تمہارے لئے ترقی کے بہت وسیع امکانات ہیں اور تمہیں اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ تم کو پورے پانچ گھنٹے خالی ملتے ہیں مگر میرا خیال یہ ہے کہ اس خالی وقت کو بے عملی میں گذارنے کے عوض اس میں باقاعدہ درس و مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جس وقت میں تمہاری عمر کا تھا اگر اس وقت کوئی مجھے اسی طرح مشورہ دیتا جس طرح میں تمہیں اس وقت مشورہ دے رہا ہوں تو اس محکمے میں ماتحتی کرنے کے بدلے میں اس کا ڈائرکٹر بن گیا ہوتا۔

اپنے اس محسن کے مشورے سے جان ٹنڈل نے فوراً فائدہ اٹھایا دوسرے روز صبح ہی وہ پانچ بجے اٹھ بیٹھے اور مطالعہ شروع کر دیا۔ بارہ سال تک برابر وہ اسی طرح کام کرتے رہے۔ آرڈننس سروے کی ملازمت کا سلسلہ

پانچ سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد انھوں نے ریلوے انجنیرنگ کی طرف توجہ کی اور اسی سلسلے میں انھیں تین مرتبہ انگلستان جانا پڑا۔ اس کام میں تین سال لگ گئے انگلستان میں اس وقت ریلوے لائینوں کا جال بچھایا جا رہا تھا۔ ریلوے کمپنیوں کے حصّوں کی تجارت زوروں پر تھی۔ لوگ بڑی سٹہ بازی کرتے تھے بشامت اعمال سے جان ٹنڈل کو بھی اس کا چسکا پڑ گیا، مگر یہ سودا انھیں گراں پڑا۔ دلالوں کی چپقلش سے وہ گھبرا گئے۔ اور آخر کار اس کاروبار سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اپنی اس حماقت سے جو سبق ملا وہ انھیں زندگی بھر یاد رہا۔

تین سال تک ریلوے انجنیرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جان ٹنڈل ہیمپ شائر کے ایک کالج میں معلّم کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ یہ کالج ابھی نیا نیا قائم ہوا تھا۔ کالج میں ان کی توجہ بیشتر فن زراعت اور انجنیرنگ کی ابتدائی ٹکنیکل تعلیم کی طرف مبذول رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے ان کو خاص کر اسی کام کے لئے پیدا کیا تھا۔ حتیٰ کہ جو لڑکے دوسرے معلّموں کے سامنے سرتابی کر کے فرض منصبی کے انجام دینے میں ٹال مٹول کرتے۔ جان ٹنڈل نے ان پر بھی ایسا جادو ڈالا کہ وہ اپنی حرکتوں سے خود بخود باز آنے لگے۔ انھوں نے بھی تحصیل علم کی طرف نہائت تن دہی کے ساتھ توجہ کرنا شروع کردیا۔

مگر جان ٹنڈل کی علمی پیاس ابھی بجھی نہیں تھی۔ ان کے ایک ہم پیشہ ڈاکٹر فرینک لینڈ تھے جنھوں نے ایک ماہر کیمیا کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی تھی۔ جان ٹنڈل انھیں کے ساتھ جرمنی چلے گئے اور ایک یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ جرمنی کے شہرۂ آفاق ماہر کیمیا طبعیات بنسن کے کمالات کا چرچا ان دنوں شہر شہر تھا۔ یہ دونوں طالب علم کشاں کشاں اس عظیم المرتبت شخصیت کے قریب پہنچ گئے۔ ماربرگ میں دونوں کا نہائت گرمجوشی کے ساتھ استقبال ہوا۔ بنسن نے حصول تعلیم کے لئے انھیں ہر قسم کی سہولت مہیا کردی۔ لیکچروں اور تجربہ گاہوں کا دروازہ دونوں کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ جان ٹنڈل کی عمر اس وقت ۲۸ سال تھی۔

ٹنڈل اپنے وطن سے باہر چار سال تک رہے۔ زیادہ زمانہ ماربرگ میں گذرا۔ آخر کار وہ برلن چلے گئے تھے ٹنڈل نے اپنے زمانۂ قیام جرمنی ہی میں ذاتی تحقیقات کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ یہاں انھوں نے دو مقالے سپرد قلم کئے۔ ایک ریاضیات سے متعلق تھا جس میں اسکریو سرفیسز Screw Surfaces کے بارے میں بحث تھی۔ دوسرے مقالے میں کرسٹل کی مقناطیسی نیز تعبداتی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

اپنے اس دوسرے مقالے کی بدولت جان ٹنڈل کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ سائنس دانوں نے ان کے اس مقالے کو غور و خوض کے ساتھ پڑھا انگلستان واپس جا کر جان ٹنڈل نے اپنی سرگرمیاں وہاں شروع کرنی چاہیں لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ اسی لئے انھوں نے امریکہ جانے کا قصد کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جان ٹنڈل کی ملاقات پہلے پہل مشہور سائنسدان ہکسلے سے ہوئی تھی۔ ان دونوں نے مل کر کناڈا کی ٹورنٹو یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کی درخواست دی۔ مگر دونوں کو کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر اس سے امریکہ ہی گھاٹے میں رہا اور انگلستان کی قسمت جاگ اٹھی۔

جرمنی میں جان ٹنڈل کو جو کمالات حاصل ہوئے ان کا ذکر انگلستان کے سائنسی حلقوں تک پہنچ چکا تھا۔ اسی وجہ سے انگلستان میں بہت جلد ٹنڈل کا رسوخ ان حلقوں میں ہو گیا حتیٰ کہ مشہور سائنسدان فیراڈے تک ان کی رسائی ہو گئی۔ بہت جلد جان ٹنڈل رائل سوسائٹی کے رکن منتخب کر لئے گئے۔ یہ ۱۸۵۲ء کی بات ہے۔ جان ٹنڈل اس وقت صرف ۳۲ سال کے تھے۔

جان ٹنڈل کو سوسائٹی کی ایک میٹنگ میں اپنا مقالہ پڑھنے کے واسطے دعوت دی گئی ہے یہ نشست ہر جمعے کو ہوا کرتی تھی۔ جان ٹنڈل کے لئے یہ لمحہ بڑی آزمائش کا لمحہ تھا۔ مگر یہ موقعہ ان کے حق میں نہائت زرّیں ثابت ہوا۔ جس سائنسدان کے تجربات اور مشاہدات کو اس سوسائٹی کے باکمال افراد کے ہاتھوں سے مہر قبول ثبت ہو جاتی تھی پھر اس کا شمار مستند اہل کمال میں ہونے لگتا تھا۔

جن لوگوں کے اثر و رسوخ سے جان ٹنڈل کی رسائی رائل سوسائٹی تک ہوئی تھی۔ اس نشست میں ان کو قدرتی طور پر اپنے وقار کا خیال ستا رہا تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہ اگر جان ٹنڈل اس آزمائش میں پورے نہ اترے تو سخت بدنامی ہوگی۔ لیکن اب کرتے تو کیا کرتے۔ ٹنڈل کو اس نشست میں ابھی صرف پانچ ہی منٹ تقریر کرتے ہوئے گذرے تھے کہ ان لوگوں کی گھبراہٹ دور ہو گئی۔ جان ٹنڈل اپنے موضوع کی گہرائی میں درآنہ اترتے چلے گئے۔ ان کے ایک ایک لفظ سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اپنے موضوع پر پورا عبور حاصل ہے ان کے خیالات نہائت واضح تھے۔ ان میں بلوریں شیشے کی طرح صفائی تھی۔ جتنے نظریے یا مثالیں انھوں نے اپنے دعوؤں کے ثبوت میں پیش کیں وہ

بالکل نئی اور اچھوتی تھیں۔

تقریر میں روانی تھی۔ سلاست تھی اپنے موضوع کے سلسلے میں ان کے دل میں جو ولولہ اور جوش تھا اس میں نام کو بھی بناوٹ نہ تھی نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ تقریر کر چکے تو ہر طرف سے تحسین و مرحبا کے نعرے بلند ہوئے۔ مبارک بادوں کی بارش ہونے لگی۔ دوسرے روز جتنے بھی اخبار شائع ہوئے ان میں جان ٹنڈل کی اس معرکہ آرا تقریر کا خاص طور پر ذکر تھا جس سے ان کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی۔

اب جان ٹنڈل کو اپنے مستقبل کے لیے کسی قسم کا اندیشہ نہ رہا۔ چار مہینے کے اندر اندر ہی وہ رائل انسٹی ٹیوشن میں نیچرل فلاسفی کے پروفیسر منتخب کر لئے گئے یہ وہ عہدہ تھا جو اب تک صرف سر ہمفری ڈیوی یا پروفیسر فاراڈے کے حصے میں آیا تھا۔ جان ٹنڈل کو اس عہدے پر متواتر تین سال تک کام کرنا پڑا۔ اس دوران میں ان کی شہرت اور بھی زیادہ ہو گئی

رائل انسٹی ٹیوشن میں جان ٹنڈل کو آزادانہ تحقیقات اور تجربات کے جاری کرنے کا اور بھی زیادہ موقعہ مل گیا چونکہ رائل سوسائٹی کا دائرہ اثر بہت وسیع تھا اس لئے اس کے ذریعے سے تجربات و مشاہدات کے نشر و اشاعت کے لئے انھیں اچھا پلیٹ فارم مل گیا۔ انجام کار چند ہی سال میں وہ برطانیہ کے مشہور ترین اور ہر دلعزیز سائنس دان قرار دیئے جانے لگے۔

۱۸۸۷ء میں جان ٹنڈل اس عہدے سے کنارہ کش ہو گئے۔ ان کی طبیعت لندن کی تیرہ اور کہر آلود فضا نیز وہاں کے شور و شغب سے اکتا گئی تھی۔ درحقیقت انھیں اس قسم کے ماحول سے فطری طور پر مناسبت نہیں تھی اسی لئے وہ مقام سرے چلے گئے۔ وہاں دیہاتی وضع کا ایک مکان بنوا لیا۔ یہ جگہ بہت پرسکون تھی۔

اب وہیں رہنے لگے۔ اس دوران میں وہ کبھی کبھی سوئٹزرلینڈ بھی چلے جاتے گرمیاں سرے میں گذرتی تھیں اور جاڑا ہیل آلیا میں۔ یہ دونوں مقامات فطرت کے خارجی مظاہروں کا وسیع مشاہدہ کرنے میں نہایت درجہ ممد و معاون ثابت ہوئے۔

۱۸۷۲ء کے زمانے میں جان ٹنڈل کو لیکچروں کے سلسلے میں امریکہ جانا پڑا۔ امریکہ میں جہاں جہاں بھی ان کے لیکچر ہوتے اس زمانے کے تمام اعلیٰ درجے کے سائینسدان ان کے لیکچروں سے فائدہ اٹھانے کے لئے آیا کرتے تھے۔ امریکہ والوں کو جان ٹنڈل کی عظمت کا اعتراف اس وجہ سے بھی کرنا پڑا کہ انھوں نے اپنی تمام امریکی کمائی کا سرمایہ وہیں کی یونیورسٹیوں کو سائنس کی تعلیم کے لئے نذر کر دیا۔

جان ٹنڈل کی جن تصانیف کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ان میں سے حسب ذیل تصانیف خاص طور پر قابل ذکر ہیں:۔

HEAT as a MEDIUM OF MOTION.

(حرارت وسیلہ حرکت کی حیثیت سے) ۱۸۶۳ء۔ **Radiation.**

ریڈی ایشن ۱۸۶۵ء۔ **Sound** آواز ۱۸۶۷ء۔ **Light**

روشنی ۱۸۷۰ء۔ پانی کی مختلف شکلیں ۱۸۷۲ء

آب و ہوا کے ذریعے سے آواز کی ایک سرے سے دوسرے سرے تک مواصلت ۱۸۷۴ء۔ عمل تخمیر ۱۸۷۶ء۔ حرارت محرک، کے میدان میں علم الذرات کے متعلق کچھ تحقیقاتی مقالے ۱۸۷۶ء۔ ہوا کے علاوہ سیال کے بارے میں مختلف اسباق ۱۸۸۱ء۔ برقیات ۱۸۷۶ء

جان ٹنڈل کی ایک اور چھوٹی سی کتاب جس میں قوت قیاس کے سائنٹیفک استعمال پر بحث کی گئی تھی بہت مقبول ہوئی

اپنے زمانے کے سائنسدانوں کے مقابلہ میں جان ٹنڈل اپنے تجربات میں سب سے زیادہ محتاط تھے اور ان کے مقابلہ کا مدلل اور منطقی بحث کرنے والا سائنسدان شاذ و نادر اس وقت تک ناپید تھا۔

جان ٹنڈل نے اپنی ایک دوسری تصنیف میں مشہور سائنسدان پروفیسر فاراڈے کی سائنسی تحقیقات پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس تصنیف کی بھی بڑی قدر و منزلت ہوئی حق تو یہ ہے کہ فاراڈے اور جان ٹنڈل کے درمیان باپ بیٹے کا سا رشتہ پیدا ہو گیا تھا۔ مگر کہتے ہیں کہ جان ٹنڈل کی تمام تصانیف میں **Fragmentation of Science** تفوق حاصل ہے

"سائنس کے تجزیہ کو"۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ جہاں اس میں ایک طرف مختلف مقالے، خطبات، تبصرے اور تنقیدیں شامل ہیں وہاں دوسری طرف بعض ایسے عجیب و غریب مقالے یا خطبات بھی شامل ہیں جن کے موضوع نیم مذہبی اور نیم سائنسی ہیں۔ مثلاً (۱) دعا اور قانون قدرت (۲) کرامات و مکاشفات۔ لیکن جان ٹنڈل کی آخرالذکر تصانیف نے یعنی جس میں مذہب اور سائنس کا مقابلہ و موازنہ کر کے دونوں کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی تھی مخالفت کا ایک طوفان عظیم کھڑا کر دیا تھا۔ مذہب پرستوں نے ان تصانیف پر شدت

کے ساتھ تخریبی تنقید کی اور عالمِ دیوانگی میں انھیں حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔

مذکورۂ بالا تصانیف کے علاوہ جان ٹنڈل کی بعض دوسری تصانیف قابلِ ذکر ہیں مثلاً الپس کے گلیشیر، پانچ پارے، گلیشیر کی ساخت اور حرکت۔

اپنی صدی کے سائنسدانوں میں جان ٹنڈل کا کیا مرتبہ ہے۔ اس کا سوال جواب دینا کسی قدر مشکل ہے۔ لیکن جو لوگ بھی فیصلہ کن رائے دینے کا حق رکھتے ہیں ان کا بھی یہ کہنا ہے کہ ایک اوریجنل محقق کی حیثیت سے جان ٹنڈل نے دنیائے سائنس میں بڑا کام کیا ہے۔ عوام تک سائنس کا پیغام پہنچانے میں جان ٹنڈل سے زیادہ شاید ہی کوئی اور شخص کامیاب ہوا ہو۔

جان ٹنڈل اخلاقی لحاظ سے نہایت بلند مرتبت انسان تھے۔ سچائی ایمانداری اور ذاتی وقار کو جان ٹنڈل نے کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

جان ٹنڈل امرسن کے بہت مداح تھے۔ انھوں نے محض امرسن کی تصانیف کا مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کی اکثر نظمیں انھیں زبانی یاد ہو گئیں۔ امرسن کی تصانیف بیشتر ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ جان ٹنڈل کارلائل کے بھی گہرے دوستوں میں تھے۔ ٹنڈل سائنس دان تھے اور کارلائل ہمیشہ سائنس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی عظمت کے قائل تھے۔

سائنسدان ہونے پر بھی ٹنڈل کو مذہب سے فطری لگاؤ تھا۔ ان کا یہ رجحان بسا اوقات تلخیوں کا باعث بھی بنا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ مذہب کے متعلق ایک آزادانہ اور جداگانہ نظریہ رکھتے تھے۔ ان پر الزام یہ تھا کہ وہ انجیل کا قرار واقعی احترام نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے بائبل کو کبھی مافوق الطبع یا آسمانی صحیفہ نہیں سمجھا۔ اور نہ ان کے خیال کے مطابق بائبل ہر قسم کے نقص سے پاک تھی۔ بائبل کی اکثر دعاوی سائنس کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ بائبل میں محض سائنٹفک غلطیاں ہی نہیں ہیں اس کی بعض باتیں تاریخی نقطۂ خیال سے بھی بے سروپا ہیں۔ اور ان میں اکثر مقامات پر تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ بائبل کی پرانی وصیت کو ابتدائی اور قدیم مہذب زمانے کی پست اخلاقی کا مرقع خیال کرتے تھے۔

راسخ الاعتقاد عیسائیوں نے جان ٹنڈل پر یہ بھی الزام لگایا کہ وہ معجزوں اور کرامتوں پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ اس میں شک نہیں الزام درست تھا مگر جان ٹنڈل کی نیت میں خرابی نہیں تھی۔ اگرچہ ان کے مخالف ان کی نیک نیتی پر بھی شبہ کرتے تھے سائنس نے معجزوں اور کرامتوں کی کبھی تائید نہیں کی۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب کی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے معجزوں کا حوالہ دینے سے کوئی فائدہ نہیں معجزوں پر اعتقاد رکھنے سے مذہب میں بھی ایک توہماتی عنصر داخل ہو جاتے ہیں۔ اور یہی ایک رکاوٹ ہے جس کی وجہ سے مذہب ابھی تک اصلی بلندی اور پاکیزگی نہیں حاصل کر سکا۔

۱۸۷۴ء میں جان ٹنڈل نے بلفاسٹ میں ایک تقریر کی۔ اس میں انھوں نے تخلیقِ عالم کا صرف مادی پہلو دکھایا تھا۔ روحانی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مادے ہی میں ہر شکل کی زندگی اختیار کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ مادے کو اس قدر زیادہ اہمیت دے کر خدا کی ہستی ہی سے منکر ہو گئے تھے۔ وہ مادے کے متعلق رائج الوقت نظریوں کو وسعت دینا چاہتے تھے اور اسے جامد و غیر متحرک نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں اسی کے اندر حرکت۔ زندگی اور مقصد تینوں چیزیں موجود نظر آتی تھیں

بلفاسٹ کے واقعے کے علاوہ ایک مرتبہ اور جان ٹنڈل کے خلاف مذہبی دیوانوں نے شور و حشر مچایا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک شخص نے جس سے جان ٹنڈل بالکل ناواقف تھے۔ ان کے نام ایک خط بھیجا اور درخواست کی کہ اس خط کو وہ عوام کے سامنے پیش کر کے اس پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اس خط میں یہ تجویز تھی کہ سائنٹفک طور پر اس دعا کی افادیت کا جائزہ لیا جائے جو ایک بیمار کی شفایابی کے لئے کی جایا کرتی ہے۔ لکھنے والے کا منشا یہ تھا۔ کہ اگر واقعی یہ سچ ہے کہ دعا میں تاثیر ہوتی ہے۔ یعنی دعا کے الفاظ کی تہہ میں کوئی خاص طاقت کام کرتی ہے تو اس کی سائنٹفک طور پر آزمائش کی جائے۔ مگر اس آزمائش کے لئے کوئی طیار نہیں ہوا۔ تمام مسیحی دنیا نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ جان ٹنڈل نے نہ جانے کیا گناہ کیا تھا کہ وہ دوسرے حقائق کی طرح عمل دعا کو بھی سائنس کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے تھے لیکن لوگوں نے اس تجویز کی منظوری نہیں دی۔

جان ٹنڈل دعا کو خلوص دل کا عکس سمجھتے تھے مگر وہ چاہتے تھے کہ لوگ اس بات کا خود سائنٹفک طور پر جائزہ لیں کہ دعا کا دائرۂ عمل اخلاقی اور روحانی ہے جسمانی یا مادی نہیں ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جسمانی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جسمانی کوشش ہی صحیح دعا ہے اور اسی طرح روحانی اور اخلاقی مقصد حاصل کرنا ہو تو اس کے لئے مناسب ہے۔ کہ روحانی یا اخلاقی مساعی سے کام لیا جائے۔

وقار خلیل شاہ پوری

تذکارِ غوثیہ اور غالب

تذکارِ غوثیہ، حضرت سید غوث علی شاہ قلندر پانی پتی قدس سرہ کے ارشادات کا مجموعہ ہے۔ جسے حضرت کے مرید و خلیفہ شاہ گل حسن قادری نے جمع و شائع کیا تھا۔ جو مرشد کی ولادت و وصال تک مشتمل ہے۔ یہ تذکرہ نہایت دلچسپ ہے۔

سنہ ولادت ۱۸۰۴ء/۱۲۱۹ھ اور سن وصال ۱۸۸۰ء/۱۲۹۷ھ ہے۔ آج سے ۹۸ سال پہلے بقیدِ حیات تھے۔ ۱۸۵۷ء کا زمانہ دیکھا تھا۔ اور اس زمانے کے مشاہیر سے ملے تھے۔ منجملہ ان کے ایک مرزا غالب تھے۔ ان کی نسبت یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

"ایک روز ہم مرزا نوشہ کے ہاں گئے، نہایت حسنِ اخلاق سے ملے لب فرش تک آ کر لے گئے اور ہمارا حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت پسند ہے علی الخصوص یہ شعر ؎

تو نہ قاتل ہو . . . . . سہی   تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا۔ صاحب یہ شعر میرا تو نہیں کسی استاد کا ہے۔ فی الحقیقت نہایت اچھا ہے۔" اس ذیل میں مرزا غالب کی غزل ہے۔ مطلع ؎

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی

میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

اس دن سے مرزا نوشہ نے یہ دستور کر لیا کہ ہر تیسرے دن "زینت المساجد" میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلف نہ کیجئے تو کہنے لگے میں اس کا قائل نہیں ہوں شرابخوار، روسیاہ، گنہگار، مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ البتہ اوش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ مزاج میں بکمال انکسار و فروتنی تھی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ جب مرزا رجب علی سرور لکھنوی مصنف "فسانۂ عجائب" آئے تو مرزا نوشہ سے ملے اور آشنائے گفتگو میں پوچھا کہ "مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے؟" کہا۔ "چہار درویش کی" میاں رجب علی بولے "اور فسانۂ عجائب کیسی ہے؟" مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے "لاحول ولا قوۃ اس میں لطفِ زبان کہاں! ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔" اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی "میاں سرور" ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا۔ بہت افسوس کیا اور کہا، ظالمو پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے۔ اور یہ قصہ سنایا اور کہا کہ یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا ہے آئیے آج ان کے مکان پہ چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں ہم ان کے ہمراہ ہوئے اور میاں سرور کی "فردوس گاہ" پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور میاں صاحب کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔ "جناب مولوی صاحب! رات میں نے فسانۂ عجائب کو بغور دیکھا تو اس کی خوبیٔ عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں۔ نہایت فصیح اور بلیغ عبارت، میرے قیاس میں ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہوگی۔ اور کیوں نہ ہو اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔"

غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں اور میاں سرور کو مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت توصیف کی۔ مرزا صاحب کا کہنا تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے۔ اور حقیقتاً بجا ہے۔ المومن من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ ؎

مباش در پے آزار ہر چہ خواہی کن

کہ در طریقتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ "تم کو کسی سے محبت بھی ہے؟" کہا کہ "ہاں حضرت علی مرتضیٰ سے۔" پھر ہم سے پوچھا کہ "آپ کو؟" ہم نے کہا "واہ صاحب! آپ مغل بچہ ہو کر حضرت علی مرتضیٰ کی محبت کا دم بھریں اور ہم اُن کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں، کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے؟"

خبر وفات کے ضمن میں مؤلف کتاب راوی ہیں کہ "ایک روز راقم حاضر خدمت تھا کہ کسی شخص نے مرزا نوشہ کے انتقال کی خبر سنائی، آپ نے فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن۔

سدا نہ پھولیں توریاں اور سدا نہ ساون ہوئے
سدا نہ جوبن تھر رہے اور سدا نہ جیوے کوئے

ہندی پر اس قدر عبور تھا کہ دوہے نوک زبان تھے۔ ارشاد یہ تھا کہ نہایت خوب آدمی تھے۔ عجز و انکسار بہت تھا۔ خلیق از حد تھے۔ ایک روز جو ہم گئے تو انھوں نے اپنے دو قطعے پڑھے (قطعے دونوں فارسی اور زیب کلیات ہیں) رند مشرب تھے۔ اور صاحب دل، اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ افسوس ہے ہمارے محب بھی چل دیئے ہے

ندی ناؤ کا پیٹنا پلک ایک کی بیت
پل کا بچھڑے جات ہیں یہی جگت کی ریت
ہم دیکھیں جگت جات ہے جگت دیکھے ہم جائیں
ہم تو بیٹھے راہ پر کس کس کو پچھتائیں

رفتارِ زمانہ

نیپال میں اصلاحات

جمہوریت اور امن پسندی بھارت کے ماضی ہی کا طرۂ امتیاز نہیں ہے بلکہ وہ آج بھی اُس کا علمبردار ہے اور اس کش مکش اور نفسا نفسی کے زمانے میں بھی امن کی صدا بلند کرنے والوں میں پیش پیش ہے۔ اس لئے یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کے ایک ہمسائے ملک نیپال میں جمہور کے جذبات کا احترام نہ ہو۔ بھارت سرکار نے نیپال کے حکمرانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے ملک میں آہستہ آہستہ جمہوری نظام قائم کریں۔ شروع شروع میں حکومت نیپال کو بھارت سرکار کے اس مشورے کو ماننے میں کچھ پس و پیش تھی لیکن بالآخر وقت کے تقاضوں کا احساس کر کے ۸ جنوری کو نیپال کے وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ ۱۹۵۲ء تک ایک آئین ساز اسمبلی بلائی جائے گی۔ اس میں سات وزیر عوام کے نمائندے ہوں گے۔ پردھان منتری نے اس کے ساتھ تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کا بھی اعلان کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ ہر میجسٹی شری تربھون شاہ ہی نیپال کے بادشاہ رہیں گے اور اگر وہ فی الحال کھٹمنڈو نہ جانا چاہیں تو انہیں حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی غیر حاضری میں ایک ریجنٹ مقرر کر دیں۔

نیپال میں ان اصلاحات کا اعلان ہونے پر بھارت اور نیپال کے سیاسی حلقوں میں مسرت و اطمینان کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ شاہ نیپال نے ایک اعلان میں نیپال کے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ جمہوریت کے اس پہلے قدم کو عمل میں لانے کے لئے حکومت سے پورا تعاون کریں اور ہر حالت میں امن قائم رکھیں۔ بھارت کے پردھان منتری شری نہرو نے لنڈن میں اصلاحات کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی ہے کہ یہ اصلاحات بعد ازاں مکمل جمہوری حکومت کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوں گی۔ آپ نے امید ظاہر کی کہ نیپال میں نئی تبدیلیوں کا پورا فائدہ اٹھایا جائے گا اور جن دیش بھگتوں نے اب تک نیپال کی آزادی کے لئے جد و جہد کی اور مصائب برداشت کئے وہ ایک صدی کی پرانی آمریت کو ایک جمہوری نظام میں تبدیل کرنے کے پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ چنانچہ نیپال کانگرس کے لیڈروں نے عوام سے باغیانہ سرگرمیوں کو بند کرنے کی اپیل کی ہے۔ امید ہے نیپال میں جلد پورے طور پر امن قائم ہو جائے گا اور ملک صلح و آشتی کے راستے پر گامزن ہو کر ترقی کی منزلیں طے کرے گا۔

کشمیر کا مسئلہ

لنڈن میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس کے موقع پر مسئلہ کشمیر بھی زیر بحث آیا اور کافی دیر تک دوستانہ فضا میں گفت و شنید ہوتی رہی۔ لیکن یہ ساری بات چیت پرائیویٹ نوعیت کی تھی۔ پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خان نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ بھارت کے پردھان منتری نے کامن ویلتھ کے وزرائے اعظم کی اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ استصواب رائے کے موقع پر کشمیر میں کامن ویلتھ کے ممالک کی افواج رکھی جائیں۔ شری نہرو نے مسٹر لیاقت علی کے اس بیان کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مسئلہ کشمیر پر ہماری جو بھی بات چیت ہوئی وہ پرائیویٹ تھی اور اس قسم کی باتوں کو ظاہر کرنا اصول کی خلاف ورزی ہے۔ شری نہرو نے کہا کہ بھارت کشمیر کے مسئلے کو امن کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے اور وہ اس بات کے لئے تیار ہے کہ کشمیر کے عوام ہی اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں۔ بھارت نے اپنی کچھ فوجوں کو کشمیر سے واپس بلا لیا ہے اور وہ بتدریج اپنی ساری فوجیں وہاں سے ہٹانے کو تیار ہے اگر پاکستان بھی اپنی باقاعدہ اور بے قاعدہ افواج ہتھیائے ہوئے علاقے سے واپس بلا لے۔ لیکن بھارت اس پوزیشن کو بھی منظور نہیں کر سکتا کہ حملہ آور پاکستان کو بھی ریاست کے نظم و نسق میں وہی اختیارات دے دئے جائیں جو کہ بھارت کو حاصل ہیں۔

پختونستان

وسطی پختونستان کی قومی آئین ساز اسمبلی کے صدر خان ظہیر الدین خان رمضانی نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں یہ امید ظاہر کی کہ بہت جلد

پختونستان کی ایک مرکزی حکومت کا قیام عمل میں آ جائے گا جو تین آئین ساز اسمبلیوں پر مشتمل پچاس لاکھ پٹھانوں پر حکومت کرے گی ۔ اُنہوں نے کہا کہ اس وقت پختونستان میں تین مختلف آئین ساز اسمبلیاں کام کر رہی ہیں۔ شمالی وسطی اور جنوبی ۔ شمالی اسمبلی مہمند باجوڑ اور دوسرے قبائل کی نمائندگی کرتی ہے اور اس کا صدر مقام زیارت باغ ہے ۔ وسطی اسمبلی وزیری قبیلے کی نمائندہ ہے جس کا دار السلطنت فقیر اپی کا ہیڈ کوارٹر گرویک ہے ۔ اسی طرح جنوبی پختونستان کا صدر مقام توباہ ہے جو پاکستان کی سرحد سے صرف تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ اپنے دہلی آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے خان رمضانی نے کہا کہ میں یہاں باہر کے لوگوں پر یہ امر ذہن نشین کرانے کے لئے آیا ہوں کہ اگر حکومت پاکستان نے پٹھانوں پر حکومت کرنے کے خواب کو ترک نہ کیا اور پختونستان کی آزادی کو تسلیم نہ کیا تو اس علاقے میں ایک ایسی آگ بھڑک اُٹھے گی جس سے ساری دنیا کا امن خطرے میں پڑ جائے گا اور اس کی تمام تر ذمے داری حکومت پاکستان پر عائد ہوگی ۔

شیرِ کشمیر کا بیان

بمبئی کی ایک پریس کانفرنس میں شیخ محمد عبد اللہ پردھان منتری ریاست جمّوں و کشمیر نے ریاست میں استصواب کرانے کے لئے چار شرائط رکھیں یعنی (۱) پاکستان نام نہاد آزاد کشمیر علاقے سے اپنی افواج ہٹا لے ۔ (۲) سارا کشمیر (جس میں نام نہاد آزاد کشمیر بھی شامل ہو) ریاست کی باقاعدہ حکومت کے تحت آ جائے ۔ (۳) نام نہاد آزاد کشمیر کی حکومت ختم کر دی جائے اور (۴) ریاست کی باقاعدہ حکومت کا انتظام قائم کرنے اور نو آبادی کے لئے وقت دیا جائے ۔ جب تک یہ ساری شرائط پوری نہیں ہو جاتیں استصواب رائے کسی حالت میں عمل میں نہیں لایا جا سکتا ۔ انہوں نے اس امر کو بھی واضح کیا کہ ریاست سے ہندوستانی فوجیں ہٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اتنی ہندوستانی فوجیں تو ہر حالت میں رہنی چاہئیں جتنی کشمیر میں کسی باہر کے حملے کی مدافعت کے لئے ضروری ہیں ۔ آئین ساز اسمبلی کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے شیخ عبد اللہ نے کہا کہ کشمیر کے عوام ریاست کی غیر معین پالیسی کو ختم کرنا چاہتے ہیں ۔ یہ اسمبلی نہ صرف ریاست کے ہندوستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کرے گی بلکہ یہ کشمیر کے آئین ۔ زمینداروں کو معاوضہ دینے اور مہاراجہ کی پوزیشن کے متعلق بھی فیصلہ کرے گی ۔

مصر اور ہندوستان

مصر میں بھارت کے سفیر شری علی اصغر فیضی نے قاہرہ میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ مجھے بہت جلد حکومت مصر کی طرف سے یہ گارنٹی ملنے والی ہے کہ مصر کشمیر کے متعلق بھارت اور پاکستان کے جھگڑے میں قطعاً غیر جانبدار رہے گا ۔ انہوں نے اس سلسلے میں مصر کی وزارت خارجیہ کے سیکرٹری سے استفسار کیا تھا جس کے جواب میں اُنہوں نے بذریعہ تار انہیں اطلاع دی کہ کراچی کے اخباروں نے اس سلسلے میں ان کے نام پر جو خبریں چھاپی ہیں وہ غلط ہیں ۔ ان کے تار میں کہا گیا ہے کہ "حکومت مصر کی ہدایات کے مطابق میرا رویہ بالکل غیر جانبدار ہے ۔

اناج کی درآمد

امریکہ میں بھارت کی سفیر شریمتی وجے لکشمی پنڈت نے لنڈن میں نمائندہ اخبار کو بتایا کہ فروری ۱۹۵۱ء سے ساٹھ لاکھ ٹن اناج بھارت میں غیر ممالک سے آنا شروع ہو جائے گا ۔ آپ نے امید ظاہر کی تھوڑی مدت کے اندر ہی بھارت کو امریکہ سے بیس لاکھ ٹن اناج مل جائے گا ۔ لیکن اس کام میں سب سے بڑی مشکل رسل و رسائل کی ہے اس کام کے لئے ۲۲۰ بڑے جہازوں کی ضرورت ہے جس کے لئے کوشش کی جا رہی ہے ۔

جرمنی

مغربی اقوام اور پچھمی جرمنی کے مابین یورپ کی ایک مشترکہ فوج میں جرمنی کے مسلح دستوں کے قیام کی سکیم پر جو گفت و شنید چل رہی ہے اس کے سلسلے میں جرمنوں کا زاویہ نگاہ مسلح نہ ہونے کے اس نعرے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ "اہنے پگ" (میرے بنا یعنی مجھے بخشو) حال ہی میں جرمنی میں جن مت کے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ جرمنوں کی اندرونی کیفیت کا صحیح طور پر اظہار کرتے ہیں ۔ ان نتائج سے یہ امر صاف ہو جاتا ہے کہ ہتھیار اُٹھانے کے لئے تیار جرمنوں کی تعداد جو پہلے ہی کم تھی اب مزید گھٹ رہی ہے ۔ جون ۱۹۴۹ء میں ۲ء ۶۰ فیصدی جرمنوں نے یہ رائے دی تھی کہ وہ ہتھیار اٹھانے سے انکار کر دیں گے لیکن یکم نومبر ۱۹۵۰ء کو یہ تعداد بڑھ کر ۷۳ فیصدی تک پہنچ گئی ہے ۔

پنجاب اسمبلی کے ضمنی انتخاب میں کانگریس کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ کانگریسی امیدوار ڈاکٹر بکرم چند کو ۹۰۳۸ ووٹ ملے ہرچی چند آزاد امیدوار کو ۵۷۵۳ اور کامریڈ رام کشن کیمونسٹ کو ۱۸۵۴ ـ ۱۱۲ ووٹ ناجائز قرار دئے گئے کیمونسٹ امیدوار کی تو ضمانت ہی ضبط ہو گئی۔ کانگریس کی اس کامیابی پر صوبے میں خوشی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن کی تقریر

رُوس میں بھارت کے سفیر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے مدراس میں ایک تقریر کرتے ہوئے دُنیا بھر کے سیاست دانوں سے اپیل کی کہ وہ ایک ایسی اسکیم طیار کریں جس سے دُنیا امن کی طرف راغب ہو اور جنگ کا خطرہ دور ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جنگ ایک امر ناگزیر نہیں ہے۔ اگر ہم سچے معنوں میں جمہوریت پسند ہیں تو ہم میں برداشت کرنے کی طاقت ہونی چاہئے اور ہمیں اپنے اختلافات باہمی بات چیت اور تبادلۂ خیالات سے دور کرنے چاہئیں۔ خوف ایک اچھا مشیر نہیں ہے۔ جب تک وہ ہم پر چھایا رہے گا ہم میں غلط فہمی رہے گی۔ آپ نے مزید کہا کہ پچھلی دو بڑی جنگوں سے دُنیا پر جو تباہی نازل ہوئی وہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اس لئے ہمیں ٹھنڈے دماغ سے ایک دوسرے کو سمجھنا چاہئے اور نفرت کے جذبات کو بالائے طاق رکھ کر پریم اور محبت کی عالم گیر اشاعت کرنا چاہئے۔

ویٹ نام سے چاول

ویٹ نام گورنمنٹ نے بھارت سرکار کو سینتیس ہزار ٹن چاول دینے کی پیشکش کی تھی جسے بھارت سرکار نے شکریے کے ساتھ منظور کر لیا ہے اس سلسلے میں تفصیلات طے ہونا ابھی باقی ہیں لیکن توقع ہے کہ ۱۹۵۱ء کی پہلی سہ ماہی میں یہ چاول بھارت پہنچ جائے گا اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۱۹۵۰۰ ٹن سن کی اشیاء کے بدلے پچاس ہزار ٹن چاول حاصل کرنے کا ایک معاہدہ بھارت سرکار نے چین سے بھی کیا ہے۔

سکم اور بھارت

سکم کے مہاراج کمار نے اعلان کیا ہے کہ خواہ تبت میں حالات کچھ بھی رُخ اختیار کریں سکم ہر حالت میں بھارت کے ساتھ رہے گا اور کوئی طاقت اُسے بھارت سے جُدا نہیں کر سکتی۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے کہا کہ بھارت کے ساتھ ہمارا حال ہی میں جو معاہدہ ہے ہم اُس پر پُوری طرح کاربند رہیں گے۔ نازک صورت حالات کے وکسی قسم کی سودا بازی کرنا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ معاہدے کے مطابق جس پر ۵ دسمبر ۱۹۵۰ء کو دستخط ہوئے بھارت سکم کی حفاظت کے لئے پابند اور اس کے تمام خارجی امور کے لئے ذمہ دار رہے گا۔ اس کے علاوہ بھارت سکم کو تین لاکھ روپے کی مالی امداد بھی دے گا۔

پولینڈ کے ساتھ تجارتی معاہدہ

بھارت اور پولینڈ کے مابین تجارت کو فروغ دینے کے لئے ایک معاہدہ ہوا ہے جس کے ذریعے بھارت پولینڈ کو خام لوہا، لاکھ، ابرق، کالی مرچ اور تمباکو وغیرہ سپلائی کرے گا اور اس کے عوض پولینڈ بھارت کو خام جست، آنکھوں کے متعلق اوزار، کپڑے اور ان سے متعلقہ سامان خوردبین، زرعی مشینیں اور اوزار وغیرہ دے گا۔

دہلی پیکٹ کی کامیابی

گوناگوں دشواریوں کے باوجود نہرو لیاقت سمجھوتہ کامیابی کے مراحل نہایت خوش اسلوبی سے طے کر رہا ہے مسلمانوں کی اکثریت مشرقی بنگال سے مغربی بنگال پہنچ چکی ہے اور اُن کو اپنے مکانات واپس دلوا دئے گئے ہیں۔ آسام میں ۹۰ فیصدی سے زاید مہاجرین واپس آ گئے ہیں اور حکومت مشرقی بنگال کا ایک پریس نوٹ مظہر ہے کہ وہاں بھی دس لاکھ سے زاید ہندو واپس آ گئے ہیں۔ اور اُن کو پھر بسانے کے لئے حکومت ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچا رہی ہے۔ ان تمام اعداد و شمار سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دن دُور نہیں جب مشرقی و مغربی بنگال اور آسام کے تمام مہاجرین بہت جلد اپنے آبائی گھروں میں واپس آ جائیں گے۔

وزیر اعظم افغانستان

افغانستان کے وزیر اعظم مارشل شاہ محمد خاں امریکہ میں آنکھوں کے علاج کے لئے جاتے ہوئے راستے میں دہلی اُترے۔ ہوائی اڈے پر شری راج گوپال آچاریہ، شری ابوالکلام آزاد اور بھارت سرکار کے بڑے بڑے افسروں نے ان کا سواگت کیا اس کے بعد بری، بحری اور ہوائی فوجی دستوں نے ان کو سلامی دی۔ پریس کے نمایندوں کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے وزیر اعظم افغانستان نے فرمایا مجھے اپنے ایک دوست ملک میں آ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔

تاثیر کی یاد میں

ہمارے انگریزی داں حضرات خواندہ تو ضرور ہیں مگر عالم نہیں، انھوں نے فذائی مشکلات کو اپنے خیال میں سہل کرنے کی خاطر، امتحانات میں کامیابی حاصل کر کے سندیں تو لے لی ہیں، مگر علمی و ادبی نقطۂ نظر سے ان کی ذاتیں مستند نہیں بن سکی ہیں۔

دَورِ غلامی میں ہم اس سے زیادہ امید ہی کیا کر سکتے ہیں۔ خام اساتذہ سے سرکاری زبان کا سیکھنا، درسی کتابوں کی سستی شرحوں اور اساتذہ کے نوٹوں کو رٹ کر امتحان میں کامیاب ہو جانا اور اس کے نتیجے میں، اگر سفارشیں پُشت پناہی کریں تو کسی دفتر میں ملازم ہو جانا، ورنہ بے روزگاری کا شکوہ کرتے ہوئے سڑکوں پر رضی بہ جیب مارے مارے پھرنا، جب یہ دستورِ عام ہو تو کیسا علم، اور کیسی علم کی پختگی۔

چنانچہ میرے محبوب و مرحوم دوست ڈاکٹر تاثیر بھی اسی قسم کے انگریزی داں خانوادے کے ایک فرد تھے، لیکن اس کے باوجود ان سب حضرات سے اس طرح مختلف و متضاد واقع ہوئے تھے جس طرح سفیدی، سیاہی سے مختلف و متضاد ہوتی ہے۔

آج کل کے تعلیم یافتہ نہ تو جدید علوم ہی سے واقف ہیں، نہ قدیم سے، اور اس گروہ میں اکثر و بیشتر ایسے افراد بھی ہیں جو قدیم علم و ادب سے ناواقفیت و جہل پر فخر کرتے رہتے ہیں۔

لیکن ڈاکٹر تاثیر، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، اس گروہ کے ایک فرد ہوتے ہوئے، اس گروہ سے بالکل علیحدہ تھے۔

جدید علوم پر انہیں ایسی دستگاہ حاصل تھی کہ وہ ہزاروں ہی میں نہیں لاکھوں میں فرد تھے اور اسی کے دوش بدوش قدیم علم و ادب پر انھیں وہ قابلِ رشک عبور حاصل تھا جو آج کل تقریباً نادر و نایاب ہے۔

تاثیر صاحب کی ادبی تخلیق میں مغربی و مشرقی رنگ اس تناسب کے ساتھ سمویا ہوا تھا کہ دل سے بے ساختہ داد نکلتی تھی۔

اُن کی فطانت، دقیقہ سنجی، ثروت نگاہی، بالغ النظری، نُدرت رسی اور نکتہ یابی کا منارہ اس قدر بلند تھا کہ اُس کی طرف دیکھنے سے بہت سے لوگوں کی ٹوپیاں گر جاتی تھیں اس قدر ٹھوس علمی لیاقت کے ساتھ ساتھ، جیسا کہ بڑے بڑے آدمی ذہین ہوتے ہیں، اُن کی طبیعت ایسی چنچل اور شوخ اور اُن کی ظرافت و بذلہ سنجی میں اس بلا کی شگفتگی و تازگی تھی کہ اُن سے مل کر دل باغ باغ ہو جاتا تھا اور ہنسی ہنسی میں بعض اوقات وہ ایسے نکتے بیان کر جاتے تھے جو دل کو فرحت اور دماغ کو آگاہی کی روشنی عطا کرتے تھے۔

تاثیر کی موت ایک فرد کی نہیں ایک زبردست ادارے کی موت ہے۔ ایک پورے کاروانِ علم و ادب کی موت ہے اور یہ وہ موت ہے جس پر جتنے آنسو بھی بہائے جائیں وہ کم ہے۔

اُن کی موت نے پاکستان ہی میں نہیں، ہندوستان کے دائرہ ادبیات میں بھی ایسا خلا پیدا کر دیا ہے جو نہایت عظیم و عبرت ناک ہے۔

اب ہم تاثیر کو واپس نہیں لا سکتے، اور قبل اس کے کہ ہم خود وہاں جائیں جہاں وہ چلے گئے ہیں، ہمارا فرض ہے کہ اُردو ادب پر اُن کے جو احسانات ہیں اُن کے اعتراف کے طور پر ہم کسی صورت سے، اُن کی ایک ایسی یادگار قائم کریں جو ہمیشہ قائم و باقی رہے۔

جوش

تاثیر کا لمبا قد، بھرا بھرا جسم، موٹی موٹی آنکھیں، کشادہ پیشانی اور ہنستا ہوا چہرہ اب بھی آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ علم و ادب کی دنیا میں ایک خلا پیدا

ہوگیا۔ دوستی کی دنیا ایک بہت اچھے دوست سے خالی ہوگئی۔ حفیظ، اختر، تاثیر اور تبسم محبت اور دوستی کے چار ستون تھے۔ میں جب کبھی لاہور جاتا اختر کے مکان پر ان چار یاروں کی ایک تصویر کو مسلسل دیکھتا رہتا۔ یہ تصویر اس زمانے کی تھی جب تاثیر انگلستان گئے تھے۔ دوستی کے اس گروہ میں سالک، بطرس، مجید ملک، حسرت اور فیض بھی شامل تھے۔ یہ ایک ایسا ادبی گروہ تھا جس نے ایک طویل مدت تک پنجاب کیا ہندوستان کی علمی فضاؤں پر اپنا تسلط جمائے رکھا۔ تقسیم ملک اور زمانے کی نامساعدت نے کسی کو غریب الدیار بنایا کسی کو بے یار و مددگار۔ محفل کی محفل برہم ہوگئی۔ اب موت کے بے رحم ہاتھوں نے اس بساط کے مہروں کو اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے تاثیر پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ تاثیر اس شطرنج کے فرزیں تھے۔ فرزیں پٹ جائے تو بازی مات سمجھو۔

ایسا محبوب اور پیارا دوست کم دیکھنے میں آیا ہے۔ کسی سے چپقلش تو کجا چشمک کا روادار بھی نہیں تھا۔ اپنے زمانے میں ترقی پسندوں کی اس نے رہنمائی کی۔ انوں کا عظمت شناس تھا، اس لئے ان کا نازبردار بھی رہا۔ اقبال سے والہانہ محبت تھی۔ اُس کی ہم نشینی سے خوش وقت ہوا۔ فارسی، اردو، انگریزی میں پوری دستگاہ تھی۔ شعر میں جدت کا علمبردار تھا۔ تنقید میں توازنِ مزاج کا قائل۔ اچھے اور پاکیزہ ذوقِ ادب کا ثبوت دیکھنا ہو تو کاروان کے خاص نمبر دیکھئے۔ یہ شمارے اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جمالیاتی اعتبار سے بھی اور ادب کی جلالی حیثیت سے بھی۔

یہاں ایک واقعے کا ذکر کرنا ضروری ہوگیا۔ پنڈت ہری چند اختر دہلی میں بیمار تھے۔ اپنے مختصر سے مکان پر۔ میں اُن کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ رات کو نو بجے کے قریب بطرس، حفیظ، مجید ملک، فیض اور تاثیر دفعتہً آدھمکے۔ میرے پاس اُن کو بٹھانے کے لئے نہ جگہ تھی نہ سامان، مگر اُن کے اخلاص کے صدقے مجھے ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔ کوئی چارپائی پر بیٹھ گیا کوئی کرسی پر، کسی کو اسٹول ہی میسر ہوا۔ تاثیر ٹرنک ہی پر بیٹھ گئے۔ آدھ گھنٹے تک یہ محفلِ عیادت گرم رہی۔ لطفِ سخن بھی رہا۔ بذلہ سنجیاں بھی۔ حفیظ اور بطرس میں خوب نوک جھونک ہوئی۔ قہقہے پر قہقہے کا عالم تھا۔ تاثیر نے کہا پنڈت! (اختر صاحب کو یہ سب احباب اسی طرح خطاب کرتے ہیں) کیوں اتنا کم ہمت بن رہا ہے۔ تجھے ہوا ہی کچھ نہیں۔ پنڈت جی اپنی صحت سے غیر مطمئن تھے مایوسانہ انداز میں کہنے لگے "آپ کی دعا سے جلد اچھا ہو جاؤں گا" تاثیر نے کہا "ہم تمھیں مرنے نہیں دیں گے۔ اگر ایسی صورت پیش آئی تو پہلے خود مریں گے" آج اس فقرے کو یاد کرتا ہوں تو طبیعت سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ آج وہ خود موجود نہیں۔ ہزاروں دوست ان کا ماتم کر رہے ہیں۔ وہ سب سے زیادہ خوبیوں والے دوست تھے۔ وہ سب سے زیادہ محبوب تھے۔ موت نے بہترین آدمی کا انتخاب کیا اور اُسے لے گئی۔

میں کچھ مدت ایک ایسے دفتر میں ملازم رہا جس میں تاثیر میرے افسرِ اعلیٰ تھے۔ ایک لمحے کے لئے بھی تاثیر نے مجھے یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ افسر ہیں۔ بسا اوقات دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے خود مجھے کمرے سے اُٹھا کر لے جاتے اور پنجابی میں اپنے مخصوص انداز میں کہتے "عرش چل چلیے" (عرش چلو بھاگیں یہاں سے) ہم لوگ دفتر کو خیرباد کہتے۔ تاثیر کے مکان پر صحبت گرم ہوتی۔ شعر و سخن، علم و ادب، مذہب و فلسفہ، مزاح و متانت، نہ جانے کس کس موضوع پر گفتگو ہوتی۔ یہ بذلہ سنج سب پر چھا جاتا۔ ہر وقت قہقہے مارتا۔ اور اپنی موٹی موٹی آنکھوں اور اُن کے سُرخ ڈوروں کا جادو احباب پر کرتا۔ اس کی موت کے تیر کا نشتر دل میں کچھ ایسا چبھا ہے کہ زندگی اور ادب کے دوراہے پر سوائے فریاد کے کوئی چارہ ہی نہیں۔ اس مغتنم ہستی کے لئے اس کے سوا اور کیا کہوں ؎

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

حرماں نصیب عرش

Regd. No, E. P—689



آدمی اور شیر

حامد حسن قادری

شیر اور آدمی میں بحث ہوئی ‏ ‏ ‏ کہ ہے دونوں میں کون طاقت ور
یہی اک دوسرے سے کہتا تھا ‏ ‏ ‏ کہ میں طاقت میں تجھ سے ہوں بڑھ کر
شیر بولا کہ دو ثبوت اِس کا ‏ ‏ ‏ زور میں مجھ سے تم سِوا ہو اگر
ایک تصویر آدمی لایا ‏ ‏ ‏ اور دکھائی وہ شیر کو لا کر
ایسی تصویر جس میں ایک انساں ‏ ‏ ‏ تھا سوار ایک شیر کے اُوپر
اور کہنے لگا کہ دیکھ اسے شیر ‏ ‏ ‏ تو ہے زیر اور آدمی ہے زبر
شیر نے ہنس کے یہ جواب دیا ‏ ‏ ‏ کوئی انساں ہے اِس کا کاریگر
یہ ہے تصویر اس لئے ایسی ‏ ‏ ‏ ایک رُخ اس میں آرہا ہے نظر
دوسرا رُخ بھی میں دکھا دیتا ‏ ‏ ‏ شیر بھی جانتا اگر یہ ہُنر
ایسی تصویر بھی ہے کیا مشکل ‏ ‏ ‏ شیر ہو آدمی کی گردن پر

معشوق علی علوی

صوبائی گورنر

آج جن بڑی ہستیوں کا ذکر کیا جا رہا ہے - ان کے متعلق اگر آپ کو پوری نہیں تو کچھ نہ کچھ معلومات ضرور ہوں گی - یہ ضروری ہے کہ ہم ان ہستیوں کا مطالعہ کرتے رہیں - تاکہ ان کے متعلق ہماری یاد تازہ رہے اور ہم بھی انہیں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں
اس مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ جس حد تک حالات مختصر سے مختصر ہو سکیں لکھے جائیں ورنہ ہمارے ان بزرگوں پر اگر قلم اٹھایا جائے تو دفتر کے دفتر لکھے جا سکیں گے -

۱ - اُتر پردیش -

سر ہرماس سپرو شا مودی - سنہ ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے آپ نے بمبئی سے ایم - اے ' ایل - ایل بی کیا سنہ ۱۹۱۳ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک بمبئی میونسپل کارپوریشن کے ممبر رہے - سنہ ۱۹۳۵ء میں سر کا اعلےٰ خطاب ملا - آپ کل ہند ملازمین فیڈریشن اور ہند مرچنٹ چیمبر کے صدر رہ چکے ہیں - ٹاٹا کمپنی کے ڈائرکٹر رہے ہیں سنہ ۱۹۳۷ء میں لیبر کانفرنس کے نمائندہ کی حیثیت سے جنیوا گئے - سر مودی سنٹرل بنک آف انڈیا اور کرکٹ کلب آف انڈیا کے چیئرمین ہیں - آپ نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں - محترمہ سروجنی نائیڈو کی وفات کے بعد سنہ ۱۹۴۹ء میں آپ اس صوبہ کے گورنر مقرر ہوئے -

۲ - اڑیسہ -

آصف علی - آپ کی ولادت سنہ ۱۸۸۸ء میں ہوئی - دہلی اور لنڈن میں تعلیم حاصل کی - بیرسٹر ہیں - بحیثیت ایک کانگریسی کے آپ کئی بار جیل گئے ہیں - آپ نے یورپ کا سفر کیا ہے اور وہاں کے حالات سے واقفیت حاصل کی ہے - سنہ ۱۹۳۴ء میں میونسپل کمشنر اور کانگریس پارلیمانی بورڈ کے ممبر رہے - عارضی حکومت کے وزیر محکمہ ریلوے اور ٹرانسپورٹ رہ چکے ہیں - سنہ ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۴۸ء تک واشنگٹن میں پہلے ہندوستانی سفیر رہے ہیں -

۳ - آسام -

جے رام داس دولت رام - سنہ ۱۸۹۲ء میں بمقام حیدرآباد (سندھ) پیدا ہوئے - سنہ ۱۹۱۵ء میں حیدرآباد کراچی میں وکالت شروع کی - سنہ ۱۹۱۹ء میں ہند کانگریس کے ممبر ہوئے - آپ کراچی سے نکلنے والے اخبار "ہندو" کے ایڈیٹر تھے - اس کے علاوہ سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء میں ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر رہے آپ بہت بڑے صحافی و سیاسی کارکن ہیں - سنہ ۱۹۳۴ء میں کل ہند کانگریس کے جنرل سیکرٹری ہوئے - سنہ ۱۹۴۷ء میں صوبہ بہار کے گورنر رہ چکے ہیں - اور حکومت ہند میں محکمہ غذا کے وزیر بھی رہے ہیں - آج کل آسام کے گورنر ہیں -

۴ - بمبئی -

راجہ سر مہاراج سنگھ - آپ ایم - اے (آکسن) اور بیرسٹر ہیں - آکسفورڈ میں بھی آپ نے تعلیم حاصل کی ہے - سنہ ۱۹۰۲ء میں علم سے فراغت حاصل کر کے سنہ ۱۹۰۴ء میں یو - پی میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے - سنہ ۱۹۱۱ء میں حکومت ہند کے اسسٹنٹ

سیکرٹری محکمۂ تعلیم ہوئے اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں ہمیرپور (یو۔پی) کے کلکٹر ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں حکومت یو۔پی کے سیکرٹری ہوئے پھر محکمۂ تعلیم کے ڈپٹی سیکرٹری ہو کر مرکزی حکومت میں چلے گئے۔ اسی طرح ۱۹۲۷ء میں الہ آباد کے کمشنر مقرر ہوئے۔ اور ۱۹۲۸ء میں بنارس کے کمشنر ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں جودھپور کے وزیر اعظم اور ۱۹۳۲ء میں جنوبی افریقہ میں ایجنٹ جنرل مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ ۱۹۴۳ء میں کشمیر کے وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں کل ہند کرسچین ایسوسی ایشن کے چیرمین مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۶-۴۷ء میں اقوام متحدہ میں ہندوستان کی نمایندگی کر چکے ہیں۔

۵۔ بہار

مادھو بہاری اینے۔ آپ نے ۱۸۸۰ء میں جنم لیا۔ ناگپور سے بی۔اے، بی۔ایل کیا۔ اور ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء تک امراوتی کے ایک پرائیویٹ اسکول کے مدرس رہے۔ ۱۹۰۸ء میں وکالت شروع کی۔ ۱۹۲۱-۳۰ء تک برار کانگریس کے صدر اور ۱۹۴۱-۴۳ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر رہے۔ ۱۹۴۷ء میں کونسل سے استعفیٰ دے دیا اور لنکا میں ہندوستان کے ایجنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۸ء سے صوبۂ بہار کے گورنر ہیں۔

۶۔ پنجاب

چندولال مادھولال ترویدی ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ آکسفورڈ سے بی۔اے پاس کیا اور ۱۹۱۷ء میں انڈین سول سروس میں داخل ہوئے اور ۱۹۲۱ء تک سی۔پی میں اسسٹنٹ کمشنر رہے۔ ۱۹۳۲-۳۵ء میں حکومت ہند میں محکمۂ پولیس کے ڈپٹی سیکرٹری اور ۱۹۳۷ء میں برار کے کمشنر ہوئے۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۲ء تک سی۔پی و برار کے چیف سیکرٹری رہے۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۶ء تک مرکزی حکومت میں محکمۂ جنگ کے سیکرٹری رہے۔ آپ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک اڑیسہ کے گورنر بھی رہ چکے ہیں۔ اب ۱۹۴۷ء سے پنجاب کے گورنر ہیں۔

۷۔ مدراس

کرشن کمار مہاراجہ بھاؤنگر۔ آپ ریاست بھاؤنگر میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۹ء میں آپ کو گدی ملی یعنی مہاراجہ ہو گئے۔ آپ ۱۹۲۸ء میں "ہیرو" انگلینڈ سے تعلیم حاصل کر کے ہندوستان آئے۔ ۱۹۴۸ء سے صوبۂ مدراس کے گورنر ہیں۔ ہندوستان کے سب سے کمسن گورنر آپ ہی ہیں۔

۸۔ مدھیہ پردیش و برار

منگل داس منچارام پکواسہ۔ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ الفنسٹن کالج بمبئی سے انٹرمیڈیٹ پاس کر کے دھیرج لال متھرا داس کا وظیفہ حاصل کیا جس سے بی۔اے اور ایل۔ایل۔بی کی تعلیم حاصل کی۔ ۳۰ سال تک سولیسٹر رہے۔ کئی بار جیل جا چکے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے سی۔پی و برار کے گورنر ہیں۔

۹۔ مغربی بنگال

ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو۔ ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ لاہور اور الہ آباد میں تعلیم حاصل کی۔ آپ ایم۔اے۔ ایل۔ایل۔بی۔ ڈی ہیں۔ کانپور میں وکالت کی اس کے بعد الہ آباد منتقل ہو گئے۔ اور ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ ۱۹۱۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی۔ آپ الہ آباد میونسپل بورڈ کے چیرمین رہ چکے ہیں۔ اور پریاگ مہلا ودیا پیٹھ کے چانسلر بھی رہے ہیں۔ الہ آباد سے نکلنے والے ایک قانونی رسالہ "لا جرنل" کے مدیر بھی تھے۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۶ء کی وزارتوں میں آپ یو۔پی کے وزیر صنعت و ترقیات رہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک اڑیسہ کے گورنر رہے اور اب ۱۹۴۸ء سے مغربی بنگال کے گورنر ہیں۔

جگت سنگھ

علم کی برکت

مکھن وال میں رحیمو ایک غریب زمیندار رہتا تھا اس کے ایک ہی بچہ تھا۔ جس کا نام طفیل تھا لیکن طفیل غریب ہونے کے باوجود بہت ذہین تھا۔ بچپن ہی میں ایسی ہوش کی باتیں کرتا کہ گاؤں کے بڑے بوڑھے بھی سُن کر حیران ہوتے۔

مکھن وال کے چند لڑکے پاس کے گاؤں میں جہاں پرائمری تک تعلیم تھی پڑھنے کے لئے جایا کرتے تھے دوسرے بچوں کی دیکھا دیکھی طفیل کی ماں نے اُسے پڑھنے کے لئے سکول بھیج دیا۔ باپ نے بہتیرا کہا کہ ہمارے مویشی آوارہ پھرتے رہتے ہیں بچہ اب رکھوالی کے قابل ہوا تو تم نے منشی کے حوالے کر دیا لیکن رحیمو کی بیوی نے ایک نہ سنی اور اپنی ضد پر اڑی رہی۔ اور طفیل برابر مدرسے جاتا رہا۔ گاؤں کے اکثر لڑکے تو ماں باپ کی لاپرواہی اور غربت کے باعث آہستہ آہستہ سکول چھوڑ گئے لیکن طفیل نے جوں توں کر کے مڈل پاس کر لیا۔ رحیمو میں گو اب تعلیم دلانے کی ہمت نہ تھی لیکن طفیل کے شوق نے اُسے بے کار نہ بیٹھنے دیا اور وہ اپنی تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے جموں چلا گیا یہاں اس کی تعلیمی قابلیت کی قدر کرتے ہوئے سرکار نے بھی نے اس کی بہت مدد کی اور اس نے آخر بی۔ اے کر لیا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد طفیل گاؤں چلا آیا۔ رحیمو کا خیال تھا کہ میرا بیٹا اب تھانے دار یا تحصیل دار بنے گا۔ اور نوکری کر کے بہت سا روپیہ کمائے گا چنانچہ باپ کی رائے کے مطابق طفیل نے دو چار محکموں میں ملازمت کے لئے عرضیاں بھیجیں۔ اور خود بھی افسروں سے ملا۔ لیکن خاطر خواہ کام یا[بی] نہ ہوئی آخر کار اس نے ملازمت کا خیال ہی دل سے نکال دی[ا] گاؤں والے اُسے بے کار پھرتا دیکھ کر پیٹھ پیچھے اس کا مذاق اُڑاتے اور کہتے چودہ جماعتیں پاس کر کے باپ کے ٹکڑوں پر آپڑا ہے۔ ایسی تعلیم جو انسان کو کسی کام کا نہ رکھے۔ اس سے تو اَن پڑھ اچھا۔ لیکن طفیل پر اُن فضول باتوں کا ذرا بھ[ی] اثر نہ ہوا۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ گاؤں والوں کو بتا دو[ں] کہ پڑھا ہوا انسان ہر کام کے لئے موزوں ہوتا ہے۔

کھیتی باڑی کا کام کامیابی سے شروع کرنے کے لئے اول اول طفیل نے اپنے ایک دوست سے کچھ رقم قرض لی اور محکمہ زراعت کے نئے آلات اور بیج منگائے۔ ا[ور] باپ کے ساتھ مل کر کاشت کاری کا کام بڑی محنت سے شروع کر دیا۔ پہلے سال ہی اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ اگر زمی[ن] کو عمدہ طریق سے تیار کر کے اُس میں بیج ڈالا جائے۔ اور ا[چھے] بیجوں کا استعمال کیا جائے۔ تو ناممکن ہے کہ زمین سو[نا] نہ اگلنے لگے۔

پہلے پہل تو یار لوگوں نے طفیل کی اس تجویز اور محن[ت] کا مذاق اُڑایا لیکن جلد ہی اُنہیں معلوم ہو گیا کہ کاشت کے نئے اصول پر چل کر طفیل نے اپنی زمین سے سونا پ[یدا]

کیا ہے ۔

طفیل کی دیکھا دیکھی اب تو دوسرے لوگ بھی زراعت کے عمدہ آلات منگانے لگے اور اچھے بیجوں کا استعمال کرنے لگے کھاد سب نے گڑھوں میں دبانا اور عمدہ طور پر اس کا استعمال شروع کر دیا۔ ان سب باتوں سے گاؤں کی فصلوں پر بہت اچھا اثر ہوا اور چند ہی سالوں میں لکھن وال گاؤں کی حالت عام دیہات سے بہتر ہو گئی ۔

لوگوں کو مالی طور پر اطمینان ہوا تو طفیل نے محسوس کیا کہ جب تک زمینداروں میں تعلیم عام نہ کی جائے اس وقت تک یہ بُری عادات اور بے جا رسموں سے نہیں بچ سکتے اس لئے اس نے اپنے گاؤں میں تعلیم بالغاں کی مہم شروع کر دی۔ اول اول تو گاؤں والوں میں سے کوئی بھی اس کا حامی نہ ہوا اور سب نے اس کی کوشش کو دیوانہ پن قرار دیا لیکن جب اس نے دو ہی مہینے میں اپنے بڈھے باپ اور چھوٹے بھائی کو لکھا پڑھا دیا اور وہ بڑی آسانی سے اخبار دیکھنے اور خطوط رسیدیں لکھنے پڑھنے لگے تو طفیل کے چند پڑوسیوں نے بھی وقت نکال کر پڑھنا شروع کر دیا ۔ اسی طرح آہستہ آہستہ لکھن وال میں تعلیم کا چرچا ہونے لگا ۔ طفیل نے بھی اس نیک کام میں تن۔ من۔ دھن کا زور لگایا اور اپنے باپ بھائی اور دو ایک طالب علموں کی مدد سے ایک سال کے اندر اندر گاؤں کے ہر بالغ کو خواندہ بنا دیا۔ اور اپنے آپ کو بڈھا طوطا کہنے والے بخوبی پڑھنا لکھنا سیکھ گئے ۔

بالغ تعلیم یافتہ ہوئے تو وہ اپنی اولاد کو کس طرح ان پڑھ دیکھ سکتے تھے ۔ سب کو بچوں کی تعلیم کی فکر ہوئی ۔ گاؤں میں ساٹھ سے زیادہ بچے تعلیم کے قابل تھے طفیل اس سلسلہ میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب مدارس سے جا ملا اور اپنے گاؤں کے لئے بچوں کا سکول منظور کرا لیا ۔

اب گاؤں میں تعلیم کا چرچا عام ہو گیا۔ اور لوگ بچوں کی طرف سے مطمئن ہوئے تو انہیں اخلاق سدھار اور متعدی بیماریوں کی روک تھام کی بھی فکر ہوئی چنانچہ گاؤں کی صفائی اور بُری رسموں کو دور کرنے کے لئے گاؤں میں ایک اصلاحی انجمن بنائی گئی ۔ لوگوں نے اس کے بنائے قاعدوں پر پابندی سے عمل کیا ۔ ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کی لوٹ سے بچنے کے لئے زمیندارہ بنک کھولا گیا ۔

اب لکھن وال ہر حیثیت سے دوسرے دیہات کے لئے نمونہ تھا۔ اور طفیل کی کوششیں پورے طور پر کامیاب ہو چکی تھیں ۔ وہ طفیل جو کبھی دیہاتیوں کے لئے بے کار تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اب اس کی پوجا ہوتی تھی۔ اور گاؤں والے ہر معاملے میں اس کے مشوروں کو اہمیت دیتے تھے۔ اس نے بتا دیا کہ ایک شخص کی تعلیم دوسرے بھائیوں کے لئے کس قدر اور کس طرح مفید اور کارآمد ہو سکتی ہے ۔

مویشی خانے کے منشی صاحب سے کسی نے ٹیلیفون پر پوچھا "کون صاحب بول رہے ہیں" ؟
وہ گھبرا گئے اور بدحواسی میں بولے "منشی خانے کا مویشی"

ماں ۔ سینا پرونا تو درکنار آج کل کی لڑکیوں کو تو اتنا بھی معلوم نہیں کہ سوئی کس کام آتی ہے ؟
لڑکی ۔ اس سے گراموفون بجاتے ہیں امی جان ۔

وکیل انصاری

دلچسپ باتیں

پیارے بچو!

بھئی تم کو معلوم ہے کہ "پیٹ" ہی دنیا میں ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے اتنا ہنگامہ ہوتا ہے۔ دنیا کی یہ رونق، یہ شور و شر اور یہ چہل پہل سب اسی ایک لفظ "پیٹ" کے گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہیں، ظالم پیٹ ایسی چیز ہے جس کے لئے انسان کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ لاکھوں تدبیروں کے باوجود ابھی تک انسان کے پیٹ کا مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ بہرحال حضرت انسان کے پیٹ بھرنے کے جو طریقے ہیں ان سے تم واقف ہی ہو، آؤ آج پودوں کے پیٹ بھرنے اور کھانا تیار کرنے کی داستان سنائیں۔

یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ پودے آج کی تحقیق سے 'جاندار' ثابت کئے جا چکے ہیں۔ ہماری تمہاری طرح وہ سانس لیتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں، تیار کرتے ہیں اور ہضم کرتے ہیں۔ تمہیں یہ سن کر شاید تعجب ہو کہ پودوں کی دنیا بھی "پیٹ" بھرنے کے معاملے میں بڑی دلچسپ واقع ہوئی ہے۔ یہاں بھی اس کی اتنی اہمیت ہے جتنی ہمارے یہاں۔ ! فرق یہ ہے کہ وہ "بے زبان" ہیں اس لئے ان کی اس سلسلے کی سرگرمیوں کا چرچا نہیں ہوتا اور ہم لوگ "بازبان" ہیں اس لئے ہمارے پیٹ بھرنے کی داستانیں عام ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ چیز یہ ہے کہ پودوں کے غذا حاصل کرنے کے طریقے انسان سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ کمانے اور دولت پیدا کرنے کے لحاظ سے دنیا کے سارے آدمیوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ جو اپنے ہاتھ پیر سے کام لے کر پیٹ بھرتے ہیں اور دوسرے وہ جو اپنے ہاتھ پیر کو حرکت نہیں دیتے۔ خود نہیں کماتے بلکہ دوسروں کی کمائی پر ڈاکہ ڈال کر اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں۔

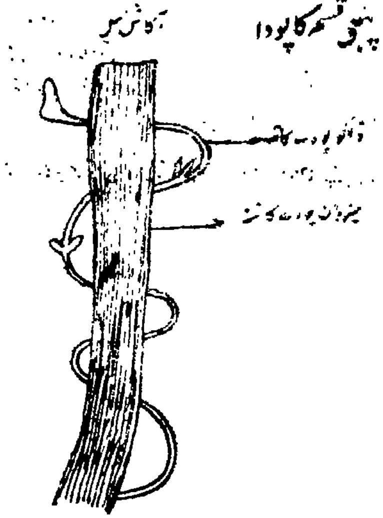
ہو بہو یہی حال پودوں کا ہے۔ غذا تیار کرنے کے لحاظ سے پودوں کو انسان کی طرح ہم دو بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنا کھانا خود بناتے ہیں اور دوسرے جو دوسروں کے تیار کئے ہوئے کھانے پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ پہلی قسم کے پودوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے وہ جو ذرا سی محنت کرتے ہیں تو کافی کھانا تیار کر لیتے ہیں اور دوسرے وہ جن کو پیٹ بھر کھانے کے لئے اتنی محنت کرنی پڑتی ہے کہ چوٹی کا پسینہ ایڑی تک پہنچ جاتا ہے۔ اب ہم مثال دے کر الگ الگ پودوں کا حال بیان کریں گے۔

(۱) پہلی قسم جیسا کہ ابھی بتایا گیا وہ ہے جس میں پودے اپنے ہرے رنگ کے ذریعے سورج کی روشنی میں اپنا کھانا تیار کرتے ہیں۔ یہ عمل (Chlorophyll) سے ہوتا ہے جو ان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اس قسم کے تمام پودے ہرے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی مثال دینے کی ضرورت نہیں۔

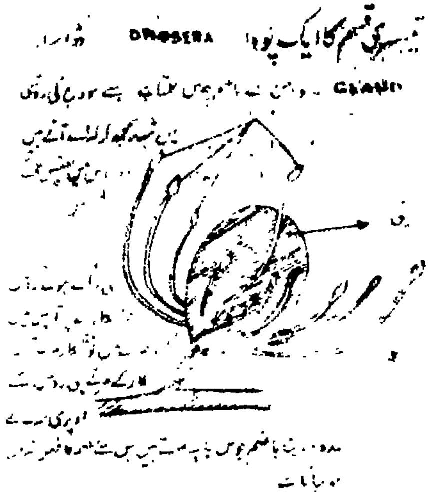
(۲) دوسری قسم کے پودے ایسے ہوتے ہیں جن کو ہم "ڈاکو" کہہ سکتے ہیں - یہ اپنا کھانا خود تیار کرنے کی زحمت نہیں گوارا کرتے بلکہ دوسرے پودوں کے تیار کئے ہوئے کھانے پر جیتے ہیں - یہ اُسی دوسرے پودے سے لپٹ کر بڑھتے ہیں جس کو "میزبان" کہتے ہیں اور خاص قسم کی "چوسنے والی جڑ" (Sucking Root) کے ذریعہ اس پودے کا تیار کیا ہوا کھانا چوس لیتے ہیں - ان کو ہم کھانا چوسنے کی ڈگری کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں - ایک "مکمل ڈاکو" جو دوسرے پودے کے سارے کھانے کو چوس لیتے ہیں اور خود ذرا سی بھی محنت نہیں کرتے - ان کا رنگ ہرا نہیں ہوتا - مثال کے طور پر "آکاش بیل" کو لیجئے جس کو انگریزی میں (Cascuta) کہتے ہیں - یہ "میزبان" پودے کی ساری کمائی چوس لیتے ہیں - دیکھئے تصویر نمبر ۱

دوسری قسم وہ ہوتی ہے جس کا رنگ ہرا ہوتا ہے - جو تھوڑا کھانا خود تیار کرتے ہیں اور تھوڑا چوستے ہیں - ان کو "نصف ڈاکو" کہہ سکتے ہیں - مثال "باندا" ہے جس کو انگریزی میں (Viscum) کہتے ہیں - چوسنے کا عمل کبھی کبھی میزبان پودے کے خاص "تنے" سے لپٹ کر ہوتا ہے اور کبھی کبھی اس کی "جڑ" کے ذریعہ بھی -

(۳) پودوں کی یہ تیسری قسم سب سے زیادہ دلچسپ ہے - یہ ہرے رنگ کی ہوتی ہے - اپنے اندر کے "کلوروفل" کی مدد سے سورج کی روشنی میں یہ اپنا کھانا بنانے کے اہل ہوتے ہیں مگر اس کے علاوہ انہیں "پروٹین" کی ضرورت ہوتی ہے جس کو یہ چھوٹے کیڑوں مکوڑوں اور پتنگوں کا شکار کرکے حاصل کرتے ہیں -



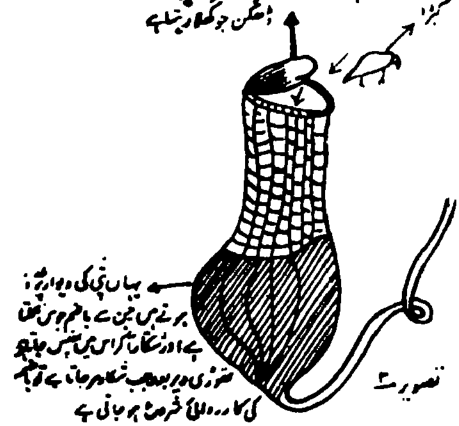
تصویر ۱



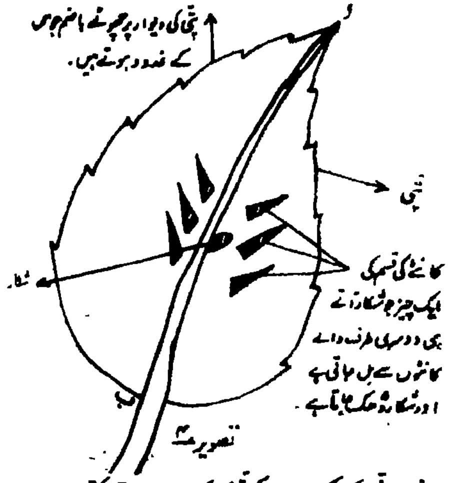
تصویر ۲

اس کے لئے ان کے پاس خاص حصے ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ شکار پکڑتے ہیں۔ جب شکار پھنس جاتا ہے تو اس پودے کی پتیوں میں چھوٹے چھوٹے غدود (Gland.) ایک قسم کا ہاضم رقیق (Digestive Fluid) نکالتے ہیں جس کو پیپسن ہائڈروکلورک (Pepsin Hydrochloric) کہتے ہیں۔ یہ کیڑے (شکار) کے مشکل سے حل ہونے والے پروٹین کو (Peptone) میں بدل دیتی ہے جو آسانی سے ہضم ہو سکتا ہے۔ اس طرح بعض بعض پودے گوشت کے چھوٹے ٹکڑے تک ہضم کر جاتے ہیں۔ دیکھئے تصویر ۲ ۳ اور ۴ ۔

تیسری قسم کے ایک اور پودے کی پتی۔ جو کیڑوں کا شکار کرتا ہے



اس پودے کا نام NEPENTHES ہے۔



تیسری قسم کے ایک پودے کی پتی جس کو DIONEA کہتے ہیں۔

ان کیڑوں کو کھانے سے ان پودوں کی نشو و نما پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے

لطیفہ ۔

بچہ ۔ ابا جان! یہ بکری کیوں چلا رہی ہے ؟
باپ ۔ قصاب اسے ذبح کرنے قصاب خانے لے جا رہا ہے ۔
بچہ ۔ تو بس اتنی سی بات کے لئے چلا رہی ہے ۔ میں تو سمجھا تھا کہ وہ اسے مدرسے لئے جا رہا ہے ۔

حسن ۔ قمر بھائی! میں بڑی مشکل میں پھنسا ہوں ۔
قمر ۔ کیوں کیا ہوا ؟
حسن ۔ میری عینک کھو گئی ہے ۔ اور جب تک مجھے عینک نہ ملے گی میں اسے تلاش نہیں کر سکوں گا ۔

عالمِ پیئرس کے خوبصورت بچّے



ایک خوبصورت خاتون بننے کی تیاری میں

کملا کی بے داغ جلد دیکھنے سے دل خوش ہوتا ہے۔ سمجھدار ماں اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ کسی بھی طرح اسکی بچّی کی جلد خراب نہ ہونے پائے۔ مثلاً وہ جانتی ہے کہ صاف وشفاف پیئرس صابن کا عملِ تقویت بچّے کی جلد کو آنے والے برسوں میں نرم ونازک رکھے گا، اور یہ بھی کہ پیئرس صابن کے رازِ حُسن کو دُنیا بھر کے خاندانوں میں ماں اپنی بیٹی کو سونپتی آئی ہے۔



پیئرس
صابن

پُشتوں سے حسین عورتوں کا سِنگار

TO 61-172-56 UD

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D.—21




"میں لکس ٹائلٹ صابن
سے اپنی جِلد دِلکش رکھتی ہوں"
مینا کہتی ہے
LUX
LUX TOILET SOAP
یہ سفید اور خالِص صابن جس کی
خوشبو دِلکش ہے، آپ کی جِلد کو
بھی دِلکش بنا رکھے گا
لمی ستاروں کا حسن بخش صابن
LTS. 270-172 UD

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۹ ———— نمبر ۹

سالانہ چندہ ———— چھ روپے
غیر ممالک سے ———— نو شلنگ یعنی ایک ڈالر
فی پرچہ ———— آٹھ آنے

اپریل سنہ ۱۹۵۱ء

ترتیب

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

دینا ناتھ مست کشمیری

فردوسِ کاشمیر

• صنعت گرِ ازل کا تو یہ شاہکار دیکھ
فطرت کا حُسنِ رُوح فزا جلوہ بار دیکھ
یہ گل زمیں ہے منتخبِ روزگار دیکھ
ہر سمت شانِ قدرتِ پروردگار دیکھ
ہر گام پر مُرقعِ تصویرِ یار دیکھ
فردوسِ کاشمیر کا رنگِ بہار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اِسے بار بار دیکھ

• کیا کیا نظر نواز ہیں میدان و سبزہ زار
کنولوں بھری یہ جھیلیں یہ دریا یہ آبشار
مانندِ جُوئے شیر ہے ہر جُوئبار دیکھ
ہر کشت و باغ و راغ کی ہے دیدنی بہار
آبِ بقا کے چشمے سے بہتر یہ چشمہ سار
فردوسِ کاشمیر کا رنگِ بہار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اِسے بار بار دیکھ

• یہ برف پوش کوہ یہ جنگل ہرے بھرے
حُوروں کے جمگھٹے کہیں پریوں کے ہیں پرے
پُر لطف و خوشگوار ہیں لیل و نہار دیکھ
اِک مستقل بہار اُفق سے بھی ہے پرے
منظر قدم قدم پہ ہیں رومانیت بھرے
فردوسِ کاشمیر کا رنگِ بہار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اِسے بار بار دیکھ

• چشمے ہیں میٹھے میٹھے تو نہریں ہیں مَے بھری
ہر غنچہ حُور ہے تو ہر اِک پھول ہے پری
عشاقِ دلِ گرفتہ کو بھی نغمہ بار دیکھ
سرسبزی و تری سے دلِ تشنہ کو تری
کشتِ اُمید و شوق ہے رہتی یہاں ہری
فردوسِ کاشمیر کا رنگِ بہار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اِسے بار بار دیکھ

• یہ زعفراں کے ہنستے ہوئے سُرخ کشت زار
شب ہائے[2] ماہتاب میں عاشق ہیں کامگار
دامانِ صبر مثلِ کتاں تار تار دیکھ
دَورِ خزاں[1] میں بھی ہیں دکھلاتے نئی بہار
ہاتھوں میں جامِ سُرخ تو پہلو میں ہیں نگار
فردوسِ کاشمیر کا رنگِ بہار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اِسے بار بار دیکھ

• یہ سُرخ سُرخ پھول یہ گلزار سُرخ سُرخ
یہ لالہ و گلاب یہ اشجار سُرخ سُرخ
یہ سُرخ رو جوان یہ مردانِ کار دیکھ
یہ لال لال سیب یہ اثمار سُرخ سُرخ
یہ آتشیں بہار یہ کہسار سُرخ سُرخ
فردوسِ کاشمیر کا رنگِ بہار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اِسے بار بار دیکھ

---

[1] زعفران پت جھڑ کے موسم میں اپنی بہار دکھاتا ہے۔
[2] چاندنی راتوں کو لوگ زعفران زاروں کی بہار سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ظفر حسین خاں

مولانا عبدالماجد دریابادی

مولانا عبدالماجد دریابادی کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔ ادارے کی طرف سے بارہا یہ کوشش کی گئی کہ آجکل کے لئے آپ کے نگارشات حاصل کئے جائیں ۔ لیکن کامیابی خان بہادر ظفر حسین صاحب کی وساطت سے ہوئی ۔ چنانچہ مولانا کے دو مضمون پچھلے شماروں میں شائع ہو چکے ہیں ۔ ذیل کا مضمون خان بہادر ظفر حسین صاحب سے بہ اصرار لکھوایا گیا ، کیونکہ وہ مولانا کے ہم مکتب بھی ہیں اور ہمدم دیرینہ بھی ۔ تصویر نہ وہ حاصل کر سکے اور نہ ہم ۔ فرمائش تصویر کے جواب میں راقم کو ذیل کا جواب ملا ۔

" فرمائش تصویر کے جواب میں :-

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب ۔۔۔۔۔ ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

صورت بھی بڑی حسین پائی ہے جو تصویریں کھنچوا کر مزید رسوائی کا سامان بہم پہنچاؤں !

اُن کو اصرار ہوا بھیج دو تصویر اپنی ۔۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ رسوائی ہے تشہیر اپنی "

(عرش ملسیانی)

افسوس کہ یہ مضمون تصویر کے بغیر تشنہ رہ گیا ۔

جس طرح عالمِ صوری میں فطرت اپنی جلوہ نمائیوں کے لئے کہیں گل و بو اور کہیں بلبل کی نغمہ سرائیوں کا آئینہ اختیار کر لیتی ہے ، اسی طرح عالمِ معنوی میں مشیت بھی اپنے ظہور کے مختلف اسلوب چن لیتی ہے ۔ پیغمبر کا پیغام ، شاعر کا شعر ، حکیم کی حکمت ، یہ سب مظاہرِ مشیت ہی ہیں ، اور قبولِ عام اُن کی سند ، مولانا عبدالماجد دریابادی اُن مخصوص شخصیتوں میں سے ہیں جو نہ آئے دن پیدا ہوتی ہیں ، اور نہ جن کا نقش جریدۂ عالم پر ایک مرتبہ ثبت ہو جانے کے بعد پھر کسی کے مٹائے مٹ سکتا ہے ۔ زمانہ اُن کی قدر اُن کے بعد کرے گا ۔ اس لئے کہ عالمِ معنوی میں بھی بصریات کا قانون نافذ ہے یعنی یہ کہ کسی شے کے صاف صاف نظر آنے کے لئے ضرور ہے کہ وہ کچھ فاصلے پر ہو ۔ حد سے زیادہ نزدیکی اور حد سے زیادہ دوری دونوں مانعِ مرئیت ہیں ۔

راقم الحروف کو مولانا کی خدمت میں ۱۹۰۹ء سے نیاز حاصل ہے ۔ وہ ۱۹۰۸ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہو چکے تھے ، اور میں ۱۹۰۹ء میں آیا ، اور بحمد اللہ کہ یہ پس و پیش روی کی نسبت میرے اور اُن کے درمیان بدستور قائم ہے ۔ کیننگ کالج میں ہم چند ہم مذاق طلبا کی ایک مختصر سی جماعت تھی جس میں ڈاکٹر حفیظ سید اور مرحوم متین الدین ایڈوکیٹ لکھنؤ بھی تھے ۔ وہی زمانہ ندوہ میں بھی ایک اسی مذاق کے طلبا کا گروہ پیدا کر رہا تھا ، ڈاکٹر سید سلیمان تو فارغ التحصیل ہو چکے تھے ، مولوی عبدالسلام فضیلت کے قریب تھے ۔ لیکن مولوی عبدالباری صاحب جو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے ریٹائر ہو کر اب لکھنؤ میں مقیم ہیں معقولات سے خاص ذوق رکھتے تھے ۔ چنانچہ ہم لوگوں نے جو انجمن فلسفہ قائم کی تھی جس کے صدر مولانا عبدالماجد صاحب اور میں سکریٹری کے فرائض انجام دیتا تھا ، مولوی عبدالباری صاحب بھی اس کے ایک سرگرم ممبر تھے ۔ علامہ شبلی مرحوم کی ادبی شخصیت سے ہم سب متاثر تھے ، اور اُن کی تحریرات کو سنجیدہ ادب کا بہترین نمونہ سمجھتے تھے ۔ شام کے وقت اکثر امین آباد پارک کے فلیٹ پر جہاں علامہ شبلی نے سیرت نبوی کا دفتر قائم کیا تھا ، ہم سب جمع ہوتے تھے اور اُن کے فیضانِ صحبت سے مستفیض ہوتے تھے ۔ علامہ شبلی کی نظرِ انتخاب مولانا عبدالماجد پر اس وقت پڑی ، جب مولانا نے علامہ کے " الکلام " پر الناظر لکھنؤ میں " ایک تنقیدی نظر " ڈالی ، اور حقیقت میں مولانا عبدالماجد کا یہ مضمون ان کی ایوانِ شہرت کی پہلی اینٹ تھی ۔ لطف یہ کہ سارا مضمون علامہ شبلی کے

اشاعت کا نہایت کامیاب تجربہ تھا۔

مولانا عبدالماجد کی سوانح عمری دراصل ایک تاریخی فلسفہ ہے۔ اس لئے کہ ان کی اس مختصر سی حیات میں وہ سب دور گزر چکے ہیں، جو ہزاروں سالوں پر پھیلی ہوئی تاریخِ فلسفہ کا موضوع ہوتے ہیں، مذہب پرستی، مذہب سے بیزاری، تشکیک، الحاد، اور پھر ایمان و ایقان کی جانب بازگشت، مولانا کی تنہا ذات ان تمام مد و جزر افکار کا مرکز رہی ہے۔

آئندہ سوانح نگار کی سہولت کے لئے مولانا کی حیات کے خاص خاص واقعات یہاں سپردِ قلم کئے جاتے ہیں، تاکہ اس کو وہ راہیں معلوم ہو جائیں جو مزید تحقیقات و اجتماع مواد کے لئے اختیار کرنا ہیں۔

خانگی حالات اور ابتدائی تعلیم

مولانا عبدالماجد مارچ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ تین بھائی بہن میں سب سے چھوٹے ہیں۔ بسم اللہ بجائے پانچویں سال، چوتھے سال ہی کرا دی گئی۔ گھرانا دنیوی خوش حالی کے ساتھ اچھا خاصا مذہبی بھی ملا۔ والد ماجد نہایت دیندار بزرگ تھے۔ عین دورانِ حج میں مکہ معظمہ میں انتقال کیا۔ ماں اور بہن دونوں بڑے عبادت گذار، تہجد گذار۔ ابتدائی تعلیم اسی انداز پر ہوئی جو عام مسلمان شرفا کے ہاں رائج ہے۔ یعنی پہلے قرآن مجید، اس کے بعد مولوی اسمٰعیل کی اردو ریڈریں، فارسی میں گلستاں، بوستاں، یوسف زلیخا، سکندر نامہ، کیمیائے سعادت وغیرہ۔ نویں سال برانچ اسکول میں داخلہ ہوا۔ تھرڈ اور فورتھ دو کلاسوں کا ڈبل امتحان دیا۔ سولھویں سال سیتاپور ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اور سب مضمونوں میں برق لیکن حساب میں کسی قدر کچے تھے، اس لئے سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوئے۔ عربی کی ابتدائی تحصیل حکیم مرزا محمد ذکی صاحب اور اُس کے بعد مولوی عظمت اللہ صاحب فرنگی محل سے کی۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانیں خوب جی لگا کر پڑھیں۔ مولانا پڑھنے کے شروع سے بڑے شوقین ہیں۔ اُس زمانہ میں اخبار، اشتہار، رسالہ، کتاب جو چیز ہاتھ آ گئی اُسے بے پڑھے نہ چھوڑتے تھے۔ اسکول سے چار بجے آتے، خوب بھوکے ہوتے، ناشتہ پر گرتے لیکن اُس وقت بھی کوئی کتاب، اخبار، رسالہ سامنے رہتا۔

الحاد کا آغاز

مضمون نگاری کا سلسلہ بارہویں ہی سال سے شروع ہو گیا تھا۔ مولانا نے اپنے مضامین میں کسی سے کبھی اصلاح نہیں لی۔ یہ مضامین فرضی ناموں سے لکھے گئے۔ عنوانات زیادہ تر مذہبی ہوتے تھے۔ ایک پورا رسالہ اسی سن میں عیسائیوں کے جواب میں لکھ ڈالا۔ جون ۱۹۰۸ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ اب کالج کی لائبریری، اور رفاہ عام کلب کی لائبریری تھی اور مولانا۔ بے تحاشا انگریزی کتابوں پر گرے۔ رفتہ رفتہ عقائد میں تزلزل واقع ہوا، اور سال چھ ماہ کے اندر ساری دینداری کی عمارت زمین کے برابر ہو گئی۔ ریشنلسٹ پریس ایسوسیشن کے سستے اڈیشن اس وقت بازار میں کثرت سے تھے۔ ان کتابوں نے آگ پر تیل کا کام دیا، اور اب مولانا بجائے مسلمان کے اپنے ریشنلسٹ، اگناسٹک لاادری، کہلانے پر فخر کرنے لگا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں جب ایف۔ اے کے امتحان کا فارم بھرنے کا وقت آیا تو مجھ سے پوچھا کیا کرنا چاہیئے، بالآخر طے پایا کہ دیانتداری اس کی مقتضی ہے کہ فارم میں مذہب کا خانہ خالی چھوڑ دیا جائے۔

اعلیٰ تعلیم

عربی بطور سیکنڈ لینگویج کورس میں برابر رہی۔ ۱۹۱۲ء میں بی اے کیا۔ منطق اور سائیکالوجی سے خاص ذوق تھا۔ چنانچہ جب دیگر طلبا کے ہاتھ میں جیمس کی ٹکسٹ بک آف سائیکالوجی کی مختصر جلد تھی جو بی۔ اے کے کورس میں مقرر تھی۔ مولانا کے پاس جیمس کی پرنسپلز آف سائیکالوجی کی دو ضخیم جلدیں تھیں۔ جو اس وقت ایم۔ اے کے کورس میں داخل تھی۔ اُسی کو پڑھ کر امتحان دیا، چھوٹی کتاب مولانا نے خریدی ہی نہ تھی۔ اسی زمانے میں انگریزی میں مضمون نگاری شروع ہو چکی تھی۔ رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ بمبئی میں اور ولایتی پرچوں مثلاً نیچر، سیٹرڈے ریویو وغیرہ میں مضمون لکھتے تھے۔ اردو رسالوں میں الناظر، ادیب الندوہ وغیرہ مولانا کے رشحاتِ قلم سے سیراب ہوتے رہتے تھے۔ کالج میں پروفیسر اور پھر پرنسپل کیمرن کی خاص توجہ رہی۔ فلسفہ میں ایم۔ اے کرنے علیگڈھ گئے لیکن کچھ حالات ایسے پیش آئے کہ تکمیل نہ کر سکے۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ

۱۹۰۹-۱۰ء وکیل ایجنسی امرتسر متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے مثلاً "غذائے انسانی"، "محمود غزنوی" وغیرہ شائع کر چکی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں سب سے پہلی مستقل کتاب "فلسفۂ جذبات" انجمن ترقی اردو کی طرف سے نکلی۔ اس کے سال دو سال بعد انجمن مذکور ہی نے "فلسفۂ اجتماع" شائع کی۔ نومبر یا دسمبر ۱۹۱۵ء میں انگریزی کتاب "سائیکالوجی آف لیڈرشپ" لندن کے نامور پبلشر فشر اَنوِن کی ایجنسی نے شائع کی۔ اور اس پر ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ

سے لے کر چھوٹے بڑے متعدد ولایتی جریدوں نے تبصرے کئے۔

اس کے بعد اردو تصنیف وتالیف کا کام مسلسل اور باقاعدہ طور پر شروع ہوگیا۔ اور ۲۲، ۲۳ سال کی عمر میں مولانا مستقل اور نامور مصنفوں کی صف میں آگئے۔

روحانی دور

اگر سیرت انسانی کو دل اور دماغ، کی دو مستقل سرخیوں میں تقسیم کر دیا جائے تو بعض شخصیتیں ایسی نکلیں گی جن پر دماغ کا غلبہ ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پہلو میں "دل" ہے ہی نہیں۔ اس کی مثال جرمنی کا مشہور عالم فلسفی کانٹ ہے، جو ایک کافر ادا کے خنجر ابرو سے بری طرح گھائل ہو کر بھی بچ گیا، اور ساری عمر تجرد ہی میں کاٹ دی۔ اس کے خلاف بعض ایسے "دل" چلے ہوتے ہیں کہ گویا "دماغ" رکھتے ہی نہیں۔ مولانا کی سیرت میں فطرت نے "دل و دماغ" کا ایک لطیف توازن ودیعت کیا ہے، اور کیرکٹر کے ان دو اسپرنگوں میں تعاون ہونے سے فکر و عمل اور کردار کے ہر شعبہ میں ایک ایسا دلآویز توازن پیدا ہوگیا ہے جو بلند مرتبہ شخصیتوں کا مخصوص جوہر ہوتا ہے۔ جب مولانا پر یہ روحانی دَور گزر رہا تھا میں لکھنؤ ہی میں تھا، اور اُن کے ساتھ شب و روز کی نشست برخاست تھی۔ رازدانی اپنے ساتھ رازداری کے فرائض بھی عائد کرتی ہے، بہرطور ایک ناول نگار کی زبان سے نہیں ایک مورخ کی سیدھی سادھی بے کیف اور معاملہ فہم زبان اختیار کرتے ہوئے اس قدر لکھنے پر کفایت کروں گا کہ جون ۱۹۱۲ء میں مولانا کی وہیں شادی ہوگئی جہاں وہ چاہتے تھے، اور بحمد اللہ محبت و شیفتگی کا جو رشتہ قائم ہوا تھا، وہ آج تک برقرار ہے۔ بلکہ ایک بار ایک اور آزمائش میں پڑ جانے کے باوجود اس میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔

ادبی نقطۂ خیال سے ہماری دلچسپی کی چیز اس روحانی دور کا وہ سایہ ہے جو مولانا کے قلم پر پڑا۔ یوں نظم و غزل سننے اور پڑھنے کا شوق شروع سے تھا، لیکن اس زمانہ میں باقاعدہ غزل گوئی بھی شروع ہوگئی۔ غزلیں عموماً حسرت موہانی، شیفتہ، جوہر (مولانا محمد علی مرحوم) کی زمینوں میں ہوتی تھیں، اور کلام کبھی کبھی حضرت اکبر الٰہ آبادی کے پاس اصلاح کے لئے بھیجتے رہتے تھے۔ ایک مجموعہ "زود پشیماں" کے نام سے گمنام اسی دور کی یادگار ہے، جو غالباً غالب کے اس شعر پر ختم ہوتا ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیدرآباد کی ملازمت

اس ساری مدت میں خیالات ملحدانہ اور مادہ پرستانہ رہے۔ اور فرائڈ، اسپنسر، ہیکل وغیرہ کی ترجمانی پر رہا۔ ۱۹۱۷ء میں سر راس مسعود (جو حیدرآباد میں اس وقت ڈائرکٹر تعلیمات تھے) اور مولوی عبدالحق صاحب کے اصرار سے حیدرآباد گئے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے سررشتۂ ترجمہ و تالیف میں چار سو کے مشاہرہ پر ملازمت منظور کرلی۔ اس سے قبل کا واقعہ یعنی ۱۹۱۲ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں بطور لٹریری اسسٹنٹ کے ملازمت کرنے اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی دلدہی اور عنایتوں کے باوجود چند ہفتوں کے بعد چھوڑ دینے کا ہم سب کے علم میں تھا۔ چنانچہ مولانا جب حیدرآباد جانے کے لئے پا برکاب تھے تو میں نے پوچھا تھا کہ "استعفا بھی جیب میں ہے یا نہیں؟"

الحاصل بشتم پشتم ایک سال حیدرآباد میں کاٹا، اور اگست ۱۹۱۹ء میں رخصت لے کر لکھنؤ واپس آئے، تو پھر حیدرآباد استعفا ہی گیا۔

مولانا کی تصانیف میں "فلسفۂ اجتماع" واقعی مذہبی نقطۂ نظر سے کہیں کہیں فی الجملہ قابل اعتراض ہے۔ حیدرآباد میں "غیر ملکیوں" کے خلاف ایک محاذ ہمیشہ سے قائم ہے۔ چنانچہ اس کتاب کو آڑ بنا کر بڑی سختی سے لے دے مچائی گئی۔ بیسیوں فتوے کفر کے نکل گئے، اور جوش وغضب کا طوفان مہینوں برپا رہا۔

زمانۂ قیام حیدرآباد میں بعض بڑے لوگوں سے تعلقات قائم ہوگئے تھے، جن میں خاص طور پر قابل ذکر عماد الملک سید حسین بلگرامی، نواب سالار جنگ، مہاراجہ یمین السلطنت سرکشن پرشاد، نواب ہوش یار جنگ ہوش بلگرامی کے نام ہیں۔

عبوری دور

حیدرآباد سے لکھنؤ آکر ہندو فلسفہ کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ انگریزی میں جو ملا بغیر پڑھے نہ چھوڑا۔ مسز بسنٹ، ڈاکٹر بھگوان داس، آربٹ، وگمور، ٹیگور کی تصنیفات میں سے کوئی کتاب مطالعہ سے نہ بچی۔ سب سے زیادہ مؤثر مسز بسنٹ اور ڈاکٹر بھگوان داس کی تحریریں ثابت ہوئیں۔ اس مطالعہ نے بالکل نیا منظر آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا، اور یہ بات پہلی بار ذہن میں آئی کہ فرنگیت اور مادیت ہی دنیا میں فلسفہ کے آخری نقطے نہیں ہیں بلکہ روحانیت، خدا پرستی اور الٰہیاتی مباحث بھی کچھ معنی رکھتے ہیں۔

یہ دور ۱۹۱۸ء کے آخری سہ ماہی حصے کے دو برس تک رہا، اور کہنا چاہیئے کہ یہ مولانا کے الحاد اور اسلام کے درمیان کا عبوری دور تھا۔ رفتہ رفتہ طبیعت مذہب کی طرف کھنچنے لگی اور پیمبروں اور بزرگانِ دین سے بیزاری باقی نہ رہی۔

ہندو تصوّف سے اسلامی تصوّف کی جانب منتقل ہو جانے میں کچھ دیر نہ لگی۔ اور گیتا کے پُرشوق مطالعہ نے گویا مثنوی مولانا روم کے لئے دروازہ کھول دیا۔ مثنوی کا ہاتھ لگنا تھا کہ مولانا اس کے عاشق ہو گئے، اور اس کی چھ ضخیم جلدیں مع شرح و حاشیہ ستائیس ہزار اشعار لفظاً لفظاً پڑھے اور ایک ایک شعر پر وجد کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ علامہ شبلی کی سیرۃ النبی اور محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمۃ القرآن بھی اس درمیان میں اپنا کام کرتے رہے اور نفس مذہب کے فلسفیانہ مطالعہ میں خصوصی جگہ اسلام کے لئے پیدا کرتے رہے۔ مذہب کی تحقیق میں شغف کا یہ عالم تھا کہ پبلک لائبریریوں کی کتابوں کے مطالعہ ہی پر قناعت نہ کی بلکہ احباب کے پاس جو اس موضوع پر پڑھنے کے قابل کتابیں تھیں وہ بھی مانگ مانگ پڑھیں۔ مجھے یاد ہے کہ مجھ سے بھی مولانا نے فلسفۂ مذہب کے موضوع پر کتابیں منگائی تھیں اور میں نے ڈاکٹر منزلیس کی ہسٹری آف ریلیجن، ٹولس کی سائیکالوجی آف ریلیجن اور وارڈ کی انٹروڈکشن ٹو دی فلاسفی آف ریلیجن مولانا کو بھیجی تھیں۔ آخرالذکر تو مولانا نے جلد واپس کر دی تھی۔ اس لئے کہ شاید اُن کی پڑھی ہوئی یا اُن کے پاس تھی۔ باقی دو سے استفادہ کیا بالخصوص منزلیس بہت عرصہ تک اپنے پاس رکھی۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی کی زندہ شخصیت بھی اس عبوری منزل کو طے کرنے میں حکیمانہ مدد دیتی رہی۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی جب لکھنؤ تشریف لاتے تھے امین آباد میں ایک فلیٹ پر قیام کرتے تھے۔ مولانا عبدالماجد اُن سے ملنے ضرور جاتے تھے۔ کھل کر حضرت اکبر مرحوم نے ایک بار بھی تبلیغ نہیں فرمائی۔ لیکن نہایت لطیف اشاروں سے اسلام کی جانب مولانا کی طبیعت کو مائل کرتے رہے۔ مولانا محمد علی کی صحبت و رفاقت بھی منزل اسلامیت کی جانب لانے میں معین رہی۔ آخر میں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم سے روحانی عقیدت سونے پر سہاگے کا کام کر گئی۔

اس زمانے میں انگریزی مضامین ماڈرن ریویو کلکتہ میں زیادہ تر نکلتے رہے۔ کبھی نام سے، کبھی گمنام، کبھی A.M. سے۔ معارف کی ایڈیٹری بھی مدت تک کی۔ لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار "حقیقت" نکلوایا۔ مدتوں اس میں لکھتے رہے۔ لیکن زیادہ تر گمنام طور پر۔ بالخصوص الناظر لکھنؤ میں بہت کچھ لکھا۔

نظام کی قدردانی

۱۹۱۹ء میں سر امین جنگ سکریٹری اعلیٰ حضرت نظام حیدر آباد کا تار مولانا کی طلبی میں آیا۔ تار پا کر حیدر آباد گئے۔ چار دن مہمان رہے۔ باریابی ہوئی اور ایک سو پچیس روپیہ کا تصنیفی وظیفہ مقرر ہو گیا، کہ خواہ کہیں رہیں، ہر سال جس موضوع پر چاہیں کوئی کتاب کسی ضخامت کی ہو تیار کریں۔ ۱۹۲۶ء میں وظیفہ کی تعداد دو سو روپیہ ماہوار ہو گئی۔ افسوس کہ اب یہ وظیفہ بند ہو گیا ہے۔ ہمیں حکومت ہند کی قدردانی سے اُمید ہے کہ موجودہ اقتصادی حالات کے پیشِ نظر اسے صرف دوبارہ جاری ہی نہیں کر دیا جائیگا بلکہ اس میں اضافہ بھی کر دیا جائے گا۔

تجدید اسلام

۱۹۲۰ء سے کہنا چاہیئے کہ مولانا از سرِ نو مسلمان ہوئے، اور اسی وقت سے لکھنؤ کی مستقل سکونت ترک کر کے دریاباد چلے گئے۔ لکھنؤ میں عزیزوں دوستوں کی کثرت ہے، لکھنے پڑھنے کا وقت کم ملتا تھا۔ دریاباد میں مولانا کا مہمان ہونے کا مجھے اتفاق ہوا ہے۔ وہاں وہ اپنی زندگی نہایت منضبط پروگرام کے تحت بسر کر رہے ہیں۔ آبائی گھر کو ضروری ترمیم کر کے اپنے حسبِ ضرورت بنا لیا ہے۔ لائبریری کے لئے ایک لمبی گیلری نکال لی ہے، جو میرے پہونچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی اُنھوں نے مجھے بڑے شوق و مہربانی کے ساتھ دکھائی۔ گھر پر پڑھی ہوئی فارسی اور کالج میں پڑھی ہوئی عربی اب کام آئی۔ تصوّف کا بڑا لٹریچر فارسی میں ہے، پہلے اُسے پڑھا، پھر رفتہ رفتہ کلام، حدیث اور تفسیر کا مطالعہ کیا۔ اور ۱۹۲۹ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔

صحافت

۱۹۲۳ء میں محبت و عقیدت کے تعلقات مولانا محمد علی کے ساتھ اور گہرے ہو گئے جو اُن کے سنِ وفات ۱۹۳۱ء تک بڑھتے ہی گئے۔ دہلی اُن کے پاس بار بار جانا ہوتا رہتا تھا، اور اُن کا روزنامہ ہمدرد، عملاً تو شروع نومبر ۱۹۲۴ء ہی سے مولانا کے اختیار میں تھا باقی ۱۹۲۵ء میں تقریباً آٹھ ماہ تک باضابطہ مولانا ہی کے ہاتھ میں رہا۔ مولانا محمد علی، بہ غرض علاج یورپ گئے تھے۔ اور پرچہ مولانا کے ہاتھ میں چھوڑ گئے تھے۔ ہر پرچہ پر مولانا کا نام بطور نگراں نکلتا رہتا تھا۔

شروع ۱۹۲۵ء میں مولانا ظفر الملک اور ایک اور صاحب کی شرکت میں "سچ" ہفتہ وار لکھنؤ سے جاری کیا۔ جولائی ۱۹۲۵ء سے اخبار

کی ادارت تمامتر مولانا ہی کے ہاتھ میں آگئی۔ وہ عارضی وقفوں کو چھوڑ کر اٹھا نو سال یعنی آخر ۱۹۳۳ء تک مسلسل جاری رہا۔

آخری ایام ۱۹۳۳ء میں تحریک قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ و تفسیر کی پیدا ہوئی۔ یہ کام چوبیس گھنٹے کی مشغولی کا تھا۔ پرچہ مجبوراً بند کرنا پڑا۔ سنہ ۱۹۳۵ء سے جدید انتظام کے ساتھ یہ پرچہ "صدق" کے نام سے پھر نکلنا شروع ہوا۔ کبھی دو روزہ، کبھی سہ روزہ، مگر عموماً ہفتہ وار۔ جو لوگ مولانا کی طرز تحریر اور بلندی خیال کے شیدائی ہیں اخبار کو ہاتھوں ہاتھ خریدتے اور بے چینی سے ہر نمبر کا انتظار کرتے ہیں۔ مگر اس وقت "صدق" بند ہے اور کچھ روز بعد نئے انتظام کے ساتھ نکلنے والا ہے۔

سیاسیات

عملی سیاسیات سے مولانا کو کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ البتہ اسلام اور مذہب کے ماتحت اس سے برابر تعلق قائم رہا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء سے تحریک خلافت میں عملی حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۹۲۹ء میں اودھ کے صوبہ خلافت کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے اور تین سال متفقہ طور پر اس عہدہ پر انتخاب ہوتا رہا۔ آخر جب کمیٹی کے اندر اختلافات کے آثار دیکھے تو استعفیٰ دے دیا۔ آل انڈیا مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی کے بھی کئی سال ممبر رہے، اور اس کی مختصر مجلس ورکنگ کمیٹی کی ممبری پر دو سال تک انتخاب ہوتا رہا۔ فروری ۱۹۲۲ء میں سالانہ جلسہ خلافت لکھنؤ کے صدر مجلس استقبالیہ کی حیثیت سے خطبہ پڑھا۔

ادبی اور تعلیمی اداروں سے تعلق

مذہب کے بعد مولانا کے ذوق کی چیز اردو ہے۔ چنانچہ لکھنؤ کی انجمن اردو کے مجانب ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۱ء تک صدر رہے۔ ہندوستانی اکیڈمی یوپی کی کونسل کے ممبر شروع ۱۹۲۷ء سے اب تک ہیں۔ شاید درمیان میں کچھ تھوڑے عرصہ تک نہیں رہے تھے۔ علیٰ ہذا آل انڈیا ریڈیو دہلی کی اردو ایڈوائزری کمیٹی کے بھی ممبر ہیں۔ پہلے نشری تقریروں کے لئے دہلی اکثر جایا کرتے تھے، اب مصروفیت کم ہو گئے ہیں اور نشریات بھی لکھنؤ سٹیشن تک محدود ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر شروع ۱۹۲۱ء سے ہیں، اور اس کی مجلس انتظامی کے ممبر بھی کئی سال سے ہیں۔ کچھ عرصہ عثمانیہ یونیورسٹی کے سینیٹ کے بھی ممبر رہے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں کئی سال تک ایم اے میں اردو ادب کے ممتحن رہے ہیں۔ لکھنؤ اور علی گڈھ یونیورسٹیوں میں اب بھی ممتحن ہوتے ہیں، ایک سال الہ آباد یونیورسٹی میں بھی ممتحن رہے ہیں۔

مسطورہ بالا نقوش مولانا عبدالماجد کی حیات کے مختصر سے خاکہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک عظیم الشان شخصیت کے سوانح نگار کے لئے شرط اول یہ ہے کہ وہ خود بھی ایسا صاحب شخصیت ہو کہ موضوع بحث شخصیت کو احاطہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ورنہ بڑی شخصیت پر جب نظر ڈالے گا کچھ نہ کچھ حصہ اس کے حد نظر سے باہر رہ جائے گا۔ چنانچہ اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے میں نے چاہا تھا کہ مولانا اپنے کچھ حالات قلم بند کر کے دیدیں۔ اول تو از راہ انکسار، جو استقامت و استقلال کے بعد ان کی سیرت کا ایک نمایاں جوہر ہے، انکار کرتے رہے۔ لیکن جب میرا اصرار بڑھا تو کچھ مختصر سا حال مجھے لکھ کر بھیجا۔ لیکن اس میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو مجھے پہلے سے معلوم نہ ہو۔ ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ ایک بات سے دس باتیں یاد آگئیں۔ مولانا کی جیسی شخصیت در اصل پبلک ملکیت ہوتی ہے۔ اور ملک و قوم کا یہ مطالبہ بالکل بجا ہوگا کہ وہ اپنے سوانح حیات خود قلم بند کریں۔ بعض مشاہیر عالم نے اپنے اس فرض کو پہچانا ہے۔ چنانچہ روسو، جان اسٹوارٹ اور ہربرٹ اسپنسر نے اپنے سوانح حیات خود قلم بند کر کے دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں۔ مولانا یاد کریں کہ مل اور اسپنسر کی آٹو بیاگرفیاں انھوں نے کس شوق سے پڑھی تھیں، پھر دنیا ان کی سبق آموز زندگی سے کیوں محروم رہے۔

تصنیفات

مولانا نے اردو میں سنجیدہ ادب کا معتدبہ اضافہ کیا ہے پھر انداز تحریر اس قدر دل آویز و شگفتہ کہ جن کو موضوع بحث سے دلچسپی نہیں ہے۔ وہ لطف ادب ہی حاصل کرنے کے لئے مولانا کی تصنیفات پڑھتے ہیں۔ ان کی خاص خاص تصنیفات کی فہرست یہ ہے۔

(۱) تفسیر قرآن مجید انگریزی میں۔ دو پاروں کی تفسیر شائع ہو چکی ہے (تاج کمپنی لاہور و کراچی) یہ تقسیم ہند سے بہت پہلے مولانا تاج کمپنی کو اشاعت کیلئے دے چکے ہیں۔ ۲۸ پارے پبلشر کے پاس ہیں۔ (۲) سائیکالوجی آف لیڈرشپ (فشر انون لندن) (۳) اردو ترجمہ تفسیر القرآن (تاج کمپنی) مقالات ماجد ادبی مضامین کا مجموعہ (تاج آفس بمبئی) (۵) مقالات حصہ دوم (مسودہ تیار ہے) (۶) مبادی فلسفہ حصہ اول و دوم (دار المصنفین اعظم گڈھ) (۷) سفر حجاز (دار المصنفین) (۸) فی مافیہ ملفوظات مولانا روم (دار المصنفین) (۹) تصوف اسلام (دار المصنفین) اس کتاب کے تیس ایڈیشن نکل چکے ہیں (۱۰)

فلسفۂ جذبات (انجمن ترقی اردو) (۱۱) فلسفۂ اجتماع (انجمن ترقی اردو) (۱۲) تاریخ اخلاق یورپ دو جلد لیکی کا ترجمہ (انجمن ترقی اردو) (۱۳) تاریخ تمدن بکل کا ترجمہ تین جلد جس کی ایک جلد شائع ہو چکی ہے (انجمن ترقی اردو) (۱۴) مکالمات برکلے (دار المصنفین) (۱۵) ہم آپ، پاپولر سائیکالوجی — (ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد) (۱۶) منطق قیاسی و استقرائی (سررشتۂ تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) (۱۷) قصص و مسائل (رضا اکیڈمی رامپور) (۱۸) اسلامیہ کالج کے سامنے دو لیکچروں کا مجموعہ (غیر مطبوعہ) (۱۹) محمد علی مرحوم کی ڈائری کے ورق، پہلا ایڈیشن (غیر مطبوعہ) (۲۰) حکیم الامت، نقوش و تاثرات (دوسرا مکمل ایڈیشن تیار) (۲۱) تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام (۲۲) تمدن اسلام کی کہانی، اس کی زبانی (مجلس اسلامیات یونیورسٹی علی گڑھ) اور بہت سی چھوٹی کتابیں اور رسالے اس کے علاوہ ہیں۔ جو طوالت کے خیال سے قلم انداز کئے جاتے ہیں۔ معارف، الناظر، اردو، ہندوستانی وغیرہم رسائل میں اردو مضامین اور تقریباً سو فرسٹ، ماڈرن ریویو، اسلامک ریویو (ووکنگ) میں انگریزی مضامین صدہا صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

بھارت اور ایران

تہران میں ۱۲۔ فروری کو ہز امپیریل میجسٹی محمد رضا شاہ پہلوی شاہ ایران کی شادی مس ثریا اسفندیاری بختیاری سے ہوئی۔

بھارت کے راشٹرپتی نے ایران میں بھارت کے شارج ڈی افیئرز کی وساطت سے شاہ موصوف کو بطور تحفۂ شادی بنارسی زربفت کے دوپٹنگ پوش اور اس پُرمسرت موقع پر بھارت کے لوگوں اور حکومت کی طرف سے مبارکباد کا پیغام بھیجا ہے۔

بھارت اور ایران میں جو اپنی شاعری، تصوف اور تیل کے چشموں کے لئے بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے، صدہا سال سے تعلقات قائم ہیں۔ چنانچہ شری جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" میں لکھا ہے "جن لوگوں اور قوموں سے بھارت کا واسطہ پڑا اور جو اس ملک کے لوگوں کی زندگی اور تہذیب و تمدن پر اثر انداز ہوئی ہیں، اُن میں ایرانی قوم سب سے زیادہ پُرانی ہے۔ بھارت میں ایرانی اثرات مسلسل رہے ہیں، اور افغانوں اور مغلوں کے دورِ حکومت میں ملک کی درباری زبان فارسی تھی۔ ماضی میں بھارت نے فارسی زبان کے بڑے بڑے مشہور شاعر پیدا کئے اور آجکل بھی بھارت میں فارسی کے بڑے بڑے ہندو اور مسلمان عالم موجود ہیں۔ بھارت اور ایران کے لوگوں میں جو حقیقی تعلق چلا آرہا ہے اس کے مقابلہ پر چند ہی قومیں ایسی ہوں گی جنہیں ایسا تعلق میسر آیا ہوگا۔

مشرقِ وسطیٰ اور قریب میں ایران کو ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ ایران باب الایشیائے وسطیٰ ہے۔ جنوب میں یہ اس خلیج فارس پر چھایا ہوا ہے جو بحیرۂ ہند کا ایک بازو ہے۔ بھارت کی طرح ایران بھی اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے بھارت کی طرح زمانے کے انقلابات کی آماجگاہ رہا ہے۔

ایران کی سب سے اہم پیداوار تیل ہے۔ ایران میں تیل کی دریافت اس صدی کے آغاز میں ہوئی ہے اور اس دریافت کی اہمیت اور نتائج کا موازنہ انیسویں صدی میں امریکہ میں سونے کی دریافت سے کیا جا سکتا ہے۔ بھارت میں تیل کی رسد رسانی کا بڑا ذریعہ ایران ہی ہے۔ چنانچہ بھارت میں تیل کی درآمد کا ۵۰ فی صدی حصہ ایران سے آتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم نے ان دونوں ملکوں کو بہت زیادہ قریب کر دیا ہے۔ اور آج وہ اقتصادیات کے میدان میں اتنے زیادہ قریب ہو گئے ہیں کہ تاریخ میں اس سے قبل کبھی نہ ہوئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں بھارت نے ایک اقتصادی مشن ایران بھیجا اور ایران نے بھی ایک ایرانی اقتصادی وفد ۱۹۴۹ء میں بھارت بھیجا تھا۔ مارچ ۱۹۵۰ء میں دونوں کے درمیان دوستی کا ایک معاہدہ بھی طے پایا۔

زمانۂ ماضی میں تاریخی قوتوں نے ایران اور بھارت کو ایک دوسرے سے پیوستہ کیا تھا اور آج بھارت یہ پُرانے بندھن اور بھی زیادہ مضبوط کرنے کا متمنی ہے۔ ایران کے سابقہ وزیر تعلیم اے حکمت کی قیادت میں ایران کا ایک مشن ۱۹۵۰ء میں بھارت آیا جس کا اس ملک میں نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا گیا تھا۔ اور اسی سال نئی دہلی میں انڈو ایرانین ایسوسی ایشن بھی قائم ہوئی۔

آرزو لکھنوی

غزل

محبت میں چونکی ہے یوں زندگانی
کہ انگڑائیاں لے رہی ہے جوانی
اُمنگوں نے آنکھوں میں کیا بھر دیا ہے
کہ ہر شے نظر آ رہی ہے سہانی
پپیہے کی پیو پیو ہے ایسی کہ جیسے
کسی کو سُنا دیں اسی کی کہانی
نہ چپ رہتے ہی سے نکلتا ہے مطلب
نہ کہتے ہی بنتی ہے دل کی کہانی
پسینا بنیں گی یہی ٹھنڈی سانسیں
ڈبو دے گی بہتی ہوا بن کے پانی
کلی پھول بننے میں اس طرح چٹکی
کہ جس طرح بچپن پہ ہنس دے جوانی
چھپے راز کیوں کر کہ چپ رہنے پر بھی
نظر کہنے لگتی ہے دل کی کہانی
نگاہوں میں پھرنے لگے بے بلائے
بڑی مہربانی بڑی مہربانی
اُمنگ اور اُبھری جہاں تک دبایا
یہ ہے آرزو کوئی دبتی کہانی

اثر لکھنوی

کاروانِ حیات

طلسم ساز ہے کوئی کلی کے پردے میں — چمن ہے ایک دلِ بیقرار کیا کہئے
سکوت پچھلے پہر کا حیات سے لبریز — تمام محویتِ انتظار کیا کہئے
ہوا میں ایک سبک زمزمۂ طرب انگیز — کہ جیسے دور پہ ہو آبشار کیا کہئے
ستارے چونک پڑے جب ذرا پلک جھپکی
فضا میں پھیل گیا انتشار کیا کہئے
ہر ایک شے کو ہے منزل سے اپنی آگاہی — بجز بشر کہ ہے گم کردہ کار کیا کہئے
گزارتا ہے یہ لیل و نہار غفلت میں — خود اپنی بے خبری کا شکار کیا کہئے
یہ بے حسی ہے کہ سو بار کھا چکا ہے فریب — مگر فریب نہیں آشکار کیا کہئے
غریب؟ جیسے ہو میت لحد کی اُگلی ہوئی! — امیر؟ عیش کا ماتم گُسار کیا کہئے
یہ پستیاں ہیں کہ پستی کو شرم آتی ہے — غیورِ طبع نہ عزم استوار کیا کہئے
نگاہ بودھ کی، سینے میں دل مگر مردہ — بجائے نشۂ عرفاں خمار کیا کہئے
شکست موت سے کھاتا ہے ٹھوکریں کھا کر — کہ زندگی کا نہیں رازدار کیا کہئے
اسی کی حرص و ہوا نے یہ گل کھلائے ہیں — کہ ہے لہو سے زمیں لالہ زار کیا کہئے
خدا ہی ہے جو کبھی راہِ راست پر آئے — "بہیمیت کا یہ پروردگار" کیا کہئے
نظر نظر سے ملی پھر بھی دل سے دل نہ ملا — اور ایک بار نہیں لاکھ بار! کیا کہئے
اثر یہ حال ہے اپنا مٹیں نہ ہم کیونکر
غبار وہ بھی سرِ رہگزار کیا کہئے

خواجہ احمد عباس

دیا جلے ساری رات

جہاں تک نظر جاتی تھی ساحل کے کنارے کنارے ناریل کے پیڑوں کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے۔ سورج دُور سمندر میں ڈوب رہا تھا اور آکاش پر رنگا رنگ کے بادل تیر رہے تھے۔ بادلوں میں آگ کے شعلوں جیسی چمک تھی اور موت کی سیاہی، سونے کی پیلاہٹ اور خون کی سُرخی!

ٹراونکور کا ساحل اپنے قدرتی حُسن کے لئے ساری دُنیا میں مشہور ہے میلوں تک سمندر کا پانی زمین کو کاٹتا، کبھی تپلی نہروں کے ذریعے بناتا کبھی چوڑی چکلی جھیلوں کی شکل میں پھیلتا ہوا چلا گیا ہے۔ اُس گھڑی مجھ پر بھی اس حسین منظر کا جادو دھیرے دھیرے اثر کرتا جا رہا تھا۔ سمندر شیشے کی طرح ساکن تھا مگر کبھی ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور سمندر کی سطح پر ہلکی ہلکی لہریں ایسے کھیل گئیں جیسے کسی بچے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہے۔ دور — بہت دُور — کوئی مچھیرا بانسری بجا رہا تھا۔ اتنی دُور کہ بانسری کی تپلی دھیمی تان پھیلے ہوئے سناٹے کو اور گہرا بنا رہی تھی۔

میرا ناؤ والا بھی اُس سحر آفریں ماحول سے متاثر معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہی ہماری لمبی پتلی کشتی ناریل کے جھنڈوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی کھلے سمندر میں آئی۔ اُس نے چپوؤں پر سے ہاتھ ہٹا لئے۔ سمندر کی طرح وہ بھی خاموش تھا۔ کشتی ڈگمگے جا رہی تھی نہ پیچھے لہروں کی گود میں دھیرے دھیرے ڈول رہی تھی۔ فضا اتنی حسین اتنی شانت، اتنی خواب آور تھی کہ ذرا سی حرکت یا دھیمی سی آواز بھی اُس وقت کے طلسم کو توڑ دینے کے لئے کافی تھی۔ کشتی ڈول رہی تھی۔ کشتی والا چپ چاپ ٹکٹکی باندھے سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میں خاموش تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہوا بھی سانس روکے ہوئے ہے۔ سمندر گہری سوچ میں ہے اور دنیا بھی گھومتے گھومتے رک گئی ہے۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کوئی دن کے قصبے کو ہم بہت دُور چھوڑ آئے تھے اب تو ساحل کے کنارے والے ناریل کے جھنڈ بھی نظر نہ آتے تھے اور دُور سے آتی ہوئی ٹرین کی سیٹی کی آواز ایسی سنائی دیتی تھی جیسے کسی دوسری دُنیا سے آ رہی ہو۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس چھوٹی سی کشتی میں بہتے بہتے ہم کسی دوسرے ہی سنسار میں جا نکلے ہوں۔ یا بیسویں صدی کی دُنیا، اُس کے تمدن اور ترقی کو بہت دُور چھوڑ آئے ہوں اور کسی پچھلے یُگ میں واپس پہنچ گئے ہوں جب انسان کمزور تھا اور قدرت کے ہر منظر کے سامنے ماتھا ٹیکنے پر مجبور تھا۔ یہاں سمندر گہرا تھا — بہت گہرا — اور آکاش اونچا تھا بہت اُونچا — اور سمندر اور آکاش کے درمیان ایک ننھی سی، کمزور سی، حقیر سی کشتی ڈول رہی تھی۔ اور چھوٹا سا، کالا سا، ادھ ننگا کشتی والا ایسا لگتا تھا جیسے کسی پُرانے زمانے سے بھٹک کر ادھر آ نکلا ہو جب انسان نے ناؤ بنانا اور چپو چلانا سیکھا ہی تھا۔

سورج کی آتشیں گیند سمندر کی سطح پر ایک پل کے لئے ٹھٹکی اور پھر دھیرے دھیرے پانی میں ڈوب گئی۔ پھر اُس کی آخری کرنیں بھی مغربی آسمان پر گلابی غازہ ملتے ہوئے رخصت ہو گئیں اور تھوڑی دیر بعد ہی موت کی پرچھائیں کی طرح گہرا اندھیرا آسمان اور سمندر دونوں پر چھا گیا۔ اتنا گہرا اندھیرا کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں کشتی والے سے کہنے والا ہی تھا کہ کوئی لوٹ چلو۔ کہ کچھ دیکھ کر میں ٹھٹک گیا اور حیرت سے میرا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ منظر تھا ہی اتنا عجیب۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دُور سمندر میں ایک چراغ بہتا ہوا چلا جا رہا ہے۔

"وہ کیا ہے؟" آخر کار میں نے کشتی والے سے پوچھا۔

پیچھے مڑ کر اس ننھے چراغ کو دیکھے بغیر ہی وہ بولا۔ "ابھی آپ خود ہی دیکھ لیں گے، صاحب"۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ یہ کہتے وقت اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

وہ کشتی والا تھا بھی عجیب ہی آدمی۔ مشکل سے نوجوان لگتا تھا نہ بڈھا۔ ٹراونکور میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی تو تقریباً ہر ایک ہی بول سکتا ہے

مگر وہ اچھی خاصی ہندوستانی بھی بول لیتا تھا۔ اصل میں میں نے اسی لئے اس کی کشتی کرائے پر لی تھی۔ ایک اور وجہ بھی تھی۔ میں مسافروں سے بھری ہوئی دوسری بڑی بڑی کشتیوں میں سیر کرنا نہ چاہتا تھا۔ میں سکون اور خاموشی چاہتا تھا چیخ پکار اور ہنگامہ نہیں۔ کوئی باتونی کشتی والا مل جاتا تو بیکار بک بک سے سارا مزہ کرکرا کر دیتا۔ "صاحب، یہ دیکھو، صاحب وہ دیکھو، یہ لائٹ ہاؤس دیکھو۔ وہ ٹاپو دیکھو۔ صاحب کتنے دن ٹھیرو گے۔ صاحب یہاں سے کہاں جاؤ گے؟ صاحب تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ صاحب بیوی بچوں کو ساتھ نہیں لائے؟......" مگر میرا کشتی والا میری طرح خاموشی پسند تھا گھنٹہ بھر میں اس نے مشکل سے دو چار باتیں کی ہوں گی۔ چپ چاپ بیٹھا چپو چلاتا رہا اور اس تمام عرصے میں اُس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اتنا بڈھا تو نہ تھا پھر اُس کے چہرے پر یہ جھریاں کیسے پڑیں، اُس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں یہ دُکھ کی پرچھائیں کیوں تھی؟ وہ اتنا خاموش کیوں تھا — جیسے زندگی سے بالکل تھکا ہوا اور ہارا ہو۔ جیسے دنیا کے سارے دُکھ سکھ اس پر گزر چکے ہوں اور اب وہ وہاں پہنچ گیا ہو جہاں نہ دُکھ ہے نہ سکھ ہے صرف ایک گہری، اتھاہ مایوسی ہے اور اُکتاہٹ ہے۔ ہاں تو میں نے اُس سے پوچھا "وہ کیا ہے"؟ اور اس نے پیچھے مڑے بغیر جواب دیا "ابھی آپ خود ہی دیکھیں گے صاحب....." جیسے اُسے پہلے ہی سے معلوم ہو کہ میں کس انوکھے نظارے کی طرف اشارہ کر رہا ہوں اور پھر اُس نے ہماری کشتی کو دھیرے دھیرے اُسی طرف کھینا شروع کر دیا جدھر اندھیرے سمندر میں وہ روشنی بہتی ہوئی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک اور کشتی چلی جا رہی ہے جسے ایک اکیلی عورت کھے رہی ہے اور اس کشتی میں ایک لالٹین رکھی ہے جس کی روشنی دور سے میں نے دیکھی تھی اتنی رات گئے اندھیرے سمندر میں وہ کہاں جا رہی تھی اور کیوں؟ کیا وہ سچ مچ کی کشتی تھی یا صرف میرے تخیل کا ہیولا جو اس طلسمی اندھیرے ماحول میں اُبھر آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے مانجھی نے اپنی کشتی کو عورت کی کشتی سے کافی فاصلے پر رکھا تاکہ ہم اندھیرے میں چھپے رہیں اور ہمیں وہ دیکھ سکے۔ مگر لالٹین کی روشنی کے دائرے میں وہ اچھی طرح نظر آ رہی تھی۔ ایک میلی سی ساڑھی میں لپٹی ہوئی دُبلی پتلی عورت تھی مگر اُس وقت چہرہ ساڑھی کے آنچل میں چھپا ہوا تھا۔ اُس کی کشتی بیچ سمندر میں ایک جگہ جا کر رُک گئی جہاں ایک ڈوبے ہوئے درخت کا ٹھنٹھ پانی سے باہر نکلا ہوا تھا سمندر میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایسے کتنے ہی ٹھنٹھ آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھائے کھڑے تھے۔ مگر اس درخت پر ایک لالٹین بندھی ہوئی تھی جس میں اب اس عورت نے تیل ڈالا اور پھر دیا سلائی جلا کر اُسے روشن کیا۔ جیسے ہی وہ لالٹین جلی اُس کی روشنی میں نے اُس عورت کا چہرہ دیکھا جس پر سے آنچل اب ڈھلک گیا تھا۔ وہ چہرہ مجھے آج تک اچھی طرح یاد ہے۔ میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ پیلا، بیمار چہرہ پچکے ہوئے گال۔ دھنسی ہوئی آنکھیں۔ بال پریشان اور دھول سے اٹے ہوئے۔ ہاتھ جس سے وہ لالٹین کی بتی کو اونچا کر رہی تھی کمزوری سے کانپ رہا تھا۔ مگر اُسی لالٹین کی طرح وہ چہرہ بھی ایک اندرونی روشنی سے منوّر تھا نیلے سوکھے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ایک عجیب چمک، انتظار کی چمک، اُمید کی چمک، اعتقاد کی چمک، ایسی چمک جو کبھی کبھی کرتے وقت کسی جوگن کی آنکھوں میں ہو سکتی ہے، کسی شہید کی آنکھوں میں یا کسی محبت کرنے والی کی آنکھوں میں جو اپنے عاشق سے بہت جلد ملنے کا انتظار کر رہی ہو!

ضرور وہ بھی اپنے محبوب کی منتظر تھی۔ کم سے کم مجھے اس کا یقین ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے اپنی کشتی گھمائی اور جس خاموشی سے آئی تھی اسی طرح دھیرے دھیرے چپو چلاتی ہوئی ایک ٹاپو کی طرف چل گئی۔ جہاں ستاروں کی روشنی میں ماہی گیروں کے جھونپڑے دُھندلے دُھندلے نظر آ رہے تھے۔ اب وہ گا رہی تھی۔ ملیالی زبان کا کوئی لوک گیت۔ اتنا تو مگر پھر بھی جانا بوجھا جس کے الفاظ کو میں نہ سمجھ سکتا تھا مگر ایسا لگتا تھا۔ جیسے یہ گیت میں نے پہلے بھی کسی اور زبان میں سنا ہو۔

"وہ کیا گا رہی ہے"؟ میں نے پوچھا۔

اور مانجھی نے جواب دیا۔ "یہ ہم لوگوں کا پرانا گیت ہے صاحب۔ عورتیں اپنے پریمیوں کے انتظار میں گاتی ہیں۔ میں ساری رات دیا جلائے تیری باٹ دیکھتی رہی ہوں، تو کب آئے گا ساجن؟"

اور مجھے اپنے ہاں کا لوک گیت 'دیا جلے ساری رات' یاد آ گیا جو ہمارے ہاں کی عورتیں بھی ایسے موقع پر ہی گاتی ہیں۔ "کیا ساری دُنیا کی عورتوں کے من میں سے ایک ہی آواز اُٹھتی ہے"؟ میں نے سوچا اور پھر مانجھی سے کہا۔ "تو اسی لئے وہ یہاں لالٹین جلانے آئی تھی؟ تاکہ اُس کا پتی یا پریمی رات کو لوٹے تو اندھیرے سمندر میں راستہ نہ کھو بیٹھے؟"

مانجھی نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے پھر سوال کیا۔ "کیا اس کا پریمی آج کی رات آنے والا ہے؟"
اندھیرے میں مانجھی کی آواز ایسی آئی جیسے وہ کسی بڑے دکھ کے احساس سے بوجھل ہو۔ "نہیں وہ نہیں آئے گا۔ نہ آج رات نہ کل رات۔ وہ مرچکا ہے۔ کئی برس ہوئے مرچکا ہے۔"

میں کچھ نہ سمجھ سکا اور تعجب سے پوچھا۔ "کیا مطلب؟ کیا اس عورت کو نہیں معلوم کہ اس کا پریمی مرچکا ہے اور اب کبھی نہ لوٹے گا؟"

"وہ جانتی ہے — شاید۔ مگر وہ مانتی نہیں۔ وہ اب تک انتظار میں ہے..... اُس نے اُمید نہیں چھوڑی...."

"اور کئی برس سے وہ ہر رات یہاں آتی ہے اور یہ لالٹین جلاتی ہے تاکہ اس کے پریمی کی کشتی اندھیرے میں راستہ پا سکے؟" میں نے کہا۔ مانجھی سے نہیں اپنے آپ سے۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ آج میں نے اپنی آنکھوں سے امر پریم کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ ایسا پریم جو قصے کہانیوں میں پڑھنے میں آتا ہے۔ زندگی میں کبھی کبھار ہی ملتا ہے۔ میری افسانہ نگاری کی حس دفعتاً بیدار ہو گئی تھی۔ اور ایک سوال کے بعد دوسرا سوال کر کے میں نے مانجھی کی زبانی پوری کہانی سُن لی۔

یہ کہانی پریم کہانی بھی تھی اور ہندوستان کی جنگِ آزادی کی ایک روح پرور داستان بھی۔ سن ۱۹۴۲ میں جب سارے ملک میں انقلابی طوفان آیا تو ٹراونکور کے عوام۔ طالب علم۔ مزدور کسان — یہاں تک کہ مانجھی اور ماہی گیر بھی — اپنے جمہوری حقوق کے لئے راجہ شاہی کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کوئی لون کے کئی ہزار مانجھیوں نے ہڑتال کی اور اعلان کر دیا کہ ہم کام پر نہیں جائیں گے چاہے اس سمندر کا رنگ ہمارے خون سے لال ہی کیوں نہ ہو جائے۔

اَن پڑھ مانجھی کی زبانی یہ جوشیلے الفاظ سُن کر میں نے پوچھا۔ "مانجھیوں کی طرف سے یہ اعلان کس نے کیا تھا؟"

"اُس نے، صاحب، اُس نے!"

"اُس نے؟ کس نے؟"

"کرشنا نے، صاحب، ہم مانجھیوں کا لیڈر وہی تو تھا — تھا تو ذات کا مانجھی اور ہماری طرح کشتی ہی چلاتا تھا۔ مگر سکول میں پڑھا ہوا تھا اور کئی سال ترِیوَنڈرم شہر میں رہا تھا جہاں اُس نے بڑے بڑے لیڈروں کی تقریریں سنی تھیں۔ وہ خود بھی لیڈروں کی طرح بھاشن دے لیتا تھا صاحب۔ بڑا خوبصورت اور تگڑا جوان تھا۔ کوئی لون سے اس ٹاپو تک تیس میل تیر کر اپنی رادھا سے ملنے آیا کرتا تھا...."

"کرشنا اور رادھا! رادھا اور کرشنا! یہ تو بالکل کہانی ہی بن گئی"۔ میں نے تعجب سے کہا۔

"اصل میں اُس کا نام رادھا نہیں ہے صاحب، مگر کرشنا اُسے رادھا رادھا کہہ کر ہی پکارتا تھا۔ سو اور بھی سب اُسے رادھا ہی کہنے لگے۔ رادھا اور کرشنا۔ سب مانجھی کہتے تھے ایسا سندر جوڑا دُور دُور ڈھونڈے سے نہ ملیگا جب اُن دونوں کی منگنی ہوئی تو سب ہی بہت خوش ہوئے سوائے...."

اور اتنا کہہ کر وہ رُک گیا۔ اور کچھ دیر پھیلی ہوئی خاموشی میں صرف اس کے چپّو چلنے کی آواز آتی رہی۔

"سوائے؟" میں نے لقمہ دیا۔

"سوائے اُن کے جو خود رادھا کو بیاہنا چاہتے تھے۔" اور یہ کہہ کر ایک بار پھر وہ خاموش ہو گیا۔

"یہ رادھا...." میں نے گفتگو کا سلسلہ پھر چلانے کے لئے کہا۔ "یہ رادھا۔ آٹھ برس پہلے کافی خوبصورت رہی ہوگی؟"

ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ بولا۔ "خوبصورت؟ بہت خوبصورت، صاحب آس پاس کے گاؤں میں کیا کوئی لون میں بھی کوئی لڑکی اتنی سندر نہیں تھی۔ ناریل کے پیڑ کی طرح لمبی اور دُبلی۔ مچھلی جیسا سڈول اور چمکدار جسم تھا اُس کا۔ اور اُس کی آنکھیں — ؟ اُس کی آنکھیں۔ اس سمندر کی ساری گہرائی اور ساری خوبصورتی تھی اُن میں...."

میں نے سوچا۔ کہانی سے ہٹ کر ہم شاعرانہ مبالغوں میں پھنستے جا رہے ہیں۔ مجھے رادھا کی خوبصورتی کے بیان میں اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی کرشنا کے انجام میں۔ اس لئے میں نے "اور پھر کیا ہوا؟" کہہ کر گفتگو کا رُخ پھر واقعات کی طرف پھیرنا چاہا۔

پھر کیا ہونا تھا، صاحب۔ کرشنا کی اس جوشیلی تقریر کے بعد تو پولیس اُس کے پیچھے ہی پڑ گئی۔ اس کے لئے بڑے بڑے جال بچھائے انہوں نے۔ مگر وہ ان کے ہاتھ نہ آیا۔ چھپ کر کام کرتا رہا۔ پولیس والے دن بھر اُس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے مگر اُنہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ہر رات کو اسی اندھیرے سمندر میں تیرتا ہوا وہ رادھا سے ملنے اُس کے ٹاپو تک جاتا اور سویرا ہونے سے پہلے پھر تیرتا ہوا واپس آجاتا۔ اور سب پولیس کا

ٹھٹھا اُڑاتے اور کہتے ہیں کہ کرشنا کبھی ان پولیس والوں کے ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔"

"تو سارے مانجھی کرشنا کے طرفدار تھے؟"

"ہاں صاحب — سب ہی اُس کے ساتھی تھے، سوائے اُن کے . . . .؟"

اور ایک بار پھر اُس کی زبان رُک گئی۔

"سوائے کن کے؟"

"جو رادھا کی وجہ سے اُس سے جلتے تھے صاحب۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"چاند ڈھلتا گیا صاحب، اور جب اندھیری راتیں آئیں تو ہر رات کو اپنے کرشنا کو راستہ دکھانے کے لئے سمندر کے بیچ میں رادھا یہ لالٹین جلانے لگی۔ ہر شام کو وہ اسی طرح سے جیسے وہ آج آئی تھی۔ کشتی میں اس جگہ آتی اور لالٹین جلا کر واپس ہو جاتی —"

میں نے جب پیچھے مڑ کر اندھیرے سمندر میں اس ننھی روشنی کو ٹمٹماتے ہوئے تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک بار پھر بہادر کرشنا اپنے مضبوط بازوؤں سے پانی کو چیرتا ہوا اپنی رادھا سے ملنے جا رہا ہے۔

"اور پھر کیا ہوا؟"

"ایک رات رادھا نے لالٹین جلائی مگر وہ بجھ گئی اور جب کرشنا رات کو تیرتا ہوا آیا تو اس کو راستہ دکھانے کے لئے کوئی روشنی نہ تھی۔"

"کیوں کیا ہوا؟ کیا کوئی طوفان آیا تھا؟"

"ہاں یہی سمجھئے کہ ایک طوفان آیا — مگر یہ طوفان سمندر میں نہیں ایک بے ایمان آدمی کے من میں اٹھا تھا۔ اُس نے اپنی قوم کو دغا دی اور لالٹین بجھا کر اپنے دوست کی موت کا باعث ہوا۔"

"مگر کیوں؟ کوئی انسان ایسی کمینی اور بے کار حرکت کیسے کر سکتا ہے؟"

محبت کی خاطر — کم سے کم وہ یہی سمجھتا تھا صاحب — پر اُس کی محبت اندھی تھی۔ محبت کیا ایک بیماری تھی۔ پریم نہیں ایک پاگل پن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رادھا کرشنا کے سوا کسی دوسرے کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ سو اُسی نے کرشنا کو — اپنے دوست کو — قتل کر دیا . . ."

"تو کرشنا ڈوبا نہیں قتل کیا گیا تھا؟"

"اُس رات کو وہ لالٹین بجھا کر کرشنا کو قتل کرنے کے برابر ہی تھا صاحب۔ پر قاتل کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کرشنا کی موت سے اُس کا کام بھلا نہ ہوگا۔ بلکہ اُس کا بھیانک جرم بھوت بن کر اُس کے من میں ہمیشہ منڈلاتا رہے گا۔ اُس کا دن کا چین اور رات کی نیند اڑا دے گا۔"

اب ہماری کشتی کوٹی لون کی بندرگاہ کے پاس پہنچ گئی تھی۔ میں کہانی اور اس کے سب کرداروں کا انجام جاننا چاہتا تھا۔

"سو اُس رات کو کرشنا ڈوب کر مر گیا۔ پھر کیا ہوا؟"

"کرشنا کے بغیر مانجھیوں کا ایکا نہ رہا۔ پولیس کے ڈر سے انہوں نے ہڑتال ختم کر دی۔"

"اور رادھا؟ جب اُس نے کرشنا کی موت کی خبر سُنی تو اُس نے کیا کیا؟"

"آج تک اُسے کرشنا کی موت کا یقین ہی نہیں آیا۔ بات یہ ہے کہ کرشنا کی لاش آج تک سمندر سے نہیں نکلی۔ سو آج تک ہر شام کو وہ ویسے ہی کشتی میں آتی ہے، لالٹین جلاتی ہے اور واپس جا کر رات بھر اپنے جھونپڑے کے سامنے بیٹھی کرشنا کا انتظار کرتی رہتی ہے۔"

"اور اُس غدار کا کیا ہوا؟ وہ پاپی جس نے کرشنا کو موت کے گھاٹ اتار اور اپنے لوگوں اور اُن کی جنگ آزادی کے ساتھ غداری کی۔ اس کا کیا حشر ہوا وہ اب کیا کرتا ہے؟"

مانجھی نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ پیٹھ موڑے اکنڈے اور سر جھکائے وہ چپ چاپ بیٹھا چپو چلاتا رہا۔ مگر اس کی خاموشی میں اس کے مجرم ضمیر کی دھڑکن تھی۔ اُس وقت ساری کائنات پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ موت کی طرح گہرا سناٹا۔ مگر ریل کی سیٹی نے مجھے چونکا دیا۔ میں اُسی رات کو کوٹی لون کو خیرباد کہنے والا تھا۔

کشتی سے اُترنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر سمندر کی طرف نگاہ کی آسمان پر اب ہزاروں ستارے جگمگا رہے تھے۔ مگر ایک ستارہ اندھیرے سمندر کے بیچ میں چمک رہا تھا۔ یہ رادھا کی لالٹین تھی جو اُس کے کرشنا کا انتظار کرتی رہے گی۔ آج کی رات — اور کل کی رات . . . . . اور پھر پرسوں کی رات . . . . . رادھا کی محبت کی طرح ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ اس لئے کہ یہ اُمید کا ستارہ ہے ۔

سیّد احتشام حسین

یوروپی مُصوّری[1]

دنیا کا کوئی خطہ اور پُرانی یا نئی کوئی تہذیب ایسی نہیں جس کے پاس نقش و نگار یا مصوّری کی کوئی روایت نہ پائی جاتی ہو۔ انسانی دنیا کے اُن ابتدائی سماجی حالات میں مصوّری نے دوہری تہذیبی فرائض انجام دیئے ہیں۔ جب اظہارِ خیال کے لئے کوئی زبان یا کم سے کم کوئی ترقی یافتہ زبان موجود نہیں تھی۔ ایک طرف تو تصویر یا نقش کی حیثیت اگر اظہارِ خیال کی تھی اور دوسری طرف اظہارِ جذبات کی۔ اظہار کی یہ دونوں صورتیں غیر متمدن لوگوں کو بھی پیش آتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مصوّری کی کوئی نہ کوئی شکل ہر ملک، ہر قوم اور ہر دور کی تہذیب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان میں جو فرق ہوا ہے اس کا تعلق تاریخی اور مادّی حالات سے، ملکی اور قومی روایات سے، معاشی حالت اور سماج کی منزلِ ارتقا سے ہوتا ہے۔ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح مصوّری بھی ایک تاریخ رکھتی ہے جس میں اس کی ابتدا، ارتقا، عروج اور زوال کے نقوش دیکھے اور معاشی حالات کی روشنی میں سمجھے جا سکتے ہیں۔ ابتدائی فنونِ لطیفہ میں استعجاب، عقیدہ، جادو، اظہارِ جذبات تمام چیزیں ایک دوسرے میں اس طرح گھتی ہوئی ہیں کہ اُن کا پوری طرح تجزیہ کرنا آسان نہیں۔ تاہم ملکوں کی مادّی رفتارِ ترقی اور مختلف اقوام کے آپس کے تہذیبی روابط کے مطالعہ سے بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔

عام طور سے اسے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مصوّری وغیرہ کی ابتدا قدیم حجری دور ہی سے ہو گئی تھی لیکن جدید عہدِ حجر تک بھی اس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاریخِ مصوّری کا نقاد تحقیق اور خیال آرائی کے درمیان غوطے کھاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مصر اور عراق میں مطالعہ کے لئے اتنا مواد مل جاتا ہے جس پر دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔ بابل، نینوا اور مصر کی مذہبی اور شاہی زندگی کے نقش وہاں کے فنونِ لطیفہ پر اس قدر زیادہ ملتے ہیں کہ اُن میں ایک طرح کی بے روح رسمیت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن یہ مصر ہی تھا جس نے یورپ کو اُس کے پہلے نقش و نگار دیئے۔

جب یوروپی تہذیب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو بحیرۂ ایجین کے چند جزائر، جن میں کریٹ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس تہذیب کا پہلا گہوارہ قرار دیئے جاتے ہیں۔ یہیں سے ایک نیا تمدن ساحلِ ایجین پر پھیلتا چلا گیا اور حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کئی سو سال پہلے تاریخِ عالم میں ایک زرّیں باب کا اضافہ ہو گیا۔ گو اس میں شک نہیں کہ دریائے نیل کی تہذیب بحیرۂ روم کو پار کر کے اس علاقہ پر اثر انداز ہوئی تھی۔ لیکن اس کی حیثیت بالکل جداگانہ تھی۔ اسی زمانے کی تصویر کشی ہومر کی لافانی نظموں الیڈ اور اوڈیسی میں پائی جاتی ہے۔ زمانے کے انقلابات نے کریٹ کی مصوّری اور مجسمہ سازی کی بہت کم یادگاریں باقی رکھی ہیں لیکن یورپ کے ابتدائی تہذیبی کارناموں میں انھیں اتنی اہمیت حاصل ہے کہ کوئی مورخ انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہی آغاز تھا جو بڑھ کر یونان اور روما کے عہد آفریں کارناموں میں صورت پذیر ہوا، اور ہر دور میں یورپ کے فن کار اور دانشور ان سے فیض حاصل کرتے رہے۔ کریٹ کی مصوّری میں آزادی، جدّت اور شگفتگی ہے اور یہ تمام باتیں اُسے مصری آرٹ سے الگ کرتی ہیں۔ جہاں بندش کی یکسانی کے ساتھ ساتھ ممیوں کا سا جمود اور مقبروں کا سا سکوت نظر آتا ہے۔ کریٹ ہی میں اُس جسمانی حُسن اور تناسب کی داغ بیل پڑ گئی تھی جسے یونانی مجسمہ سازوں اور مصوّروں نے تکمیل حد تک پہنچانے کی کوشش کی۔ یونان نے انسانی جسم کے حسن میں دیوتاؤں کا جلال تخلیق کیا اور دیوتاؤں کے مجسموں میں انسانی جمال کی تصویر دکھائی۔ یہی اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ ورنہ حقیقتاً یہ ہے کہ اُن کے فلسفہ اور خیال میں جو گہرائی

---

[1] یہ مضمون محض ایک تعارف کی حیثیت رکھتا ہے تنقیدی نہیں ہے۔ احتشام

اور وسعت ہے وہ ان کی مجسمہ سازی یا مصوری میں نہیں پائی جاتی۔ بدقسمتی سے اس عہد کے مصوری کے نمونے باقی نہیں رہ گئے ہیں۔ اس لئے ان کا مطالعہ ان اثرات ہی کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے بعد کی نسلوں پر چھوڑے ہیں۔

یونان کی مختلف شہری ریاستوں میں مختلف قسم کے جمہوری تجربے ہو رہے تھے اور پہلی دفعہ انسان شعوری طور پر زندگی کو زندگی کی طرح بسر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یونانیوں کے طریقۂ حیات میں دین اور دنیا، ذاتی خواہشات اور سماجی ذمہ داریاں سب ایک دوسرے میں ملی ہوئی تھیں اور فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔ کئی سو سال تک یونان میں مختلف فلسفۂ خیال کی تلقین کرنے والے اُٹھے، لیکن اُن میں جو چیز مشترک تھی وہ زندگی کو سمجھنے اور اُسے حسین بنانے کی پیاس تھی۔ انسانی تمدن کے اس تقریباً ابتدائی دور میں یونان کے تہذیبی کارنامے اور اُن کے اثرات مابعد غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

سکندرِ اعظم کے بعد یونان کی شہری ریاستیں اور جمہوریت کے تجربے معرضِ زوال میں آگئے اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد سلطنتِ روما وجود میں آئی۔ ایتھنز کی جگہ فلورنس اور روفیس نے لی۔ اور پیریکلیز کی جگہ سیزر اور آگسٹس پیدا ہوئے۔ یہ فرق یونان اور روم کی مصوری اور فنونِ لطیفہ میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ عام خیال ہے کہ جہاں تک فنونِ لطیفہ کا تعلق ہے روم نے یونان کے مقابلے میں کوئی نئی اور بہتر چیز پیش نہیں۔ بلکہ انھیں روایتوں کو برقرار رکھا۔ شہنشاہی نظام قائم ہو جانے کی وجہ سے البتہ اندازِ فکر میں تغیر ہوا اور خاص طرح کے مذہبی خیالات اور دیومالا نے یونانی فکر میں جو دلکشی پیدا کی تھی وہ باقی نہ رہی۔

سلطنتِ روما کا خیال آتے ہی نگاہ اس کی وسعت اور عظمت کے ساتھ ساتھ مشرقِ وسطیٰ میں جا پہونچتی ہے۔ جہاں ایک نئے مذہب نے جنم لیا اور تھوڑے ہی دنوں کے اندر جس نے یورپ کے ایک بڑے حصّے کو گھیر لیا۔ دینِ مسیحی کئی حیثیتوں سے یونانی تصوّرِ مذہب سے مختلف تھا۔ اس کا اثر فنونِ لطیفہ پر بھی گہرا پڑا۔ کیونکہ عیسائیت نے شاہی کی جڑیں مضبوط کر کے یونانیوں کے مادّی تصوّرات اور نظامِ زندگی کو بالکل کمزور بنا دیا۔ وہ تاریک دور جس میں دینِ مسیحی کی آگ دبی دبی سی تھی اور یونانی اثرات مٹ رہے تھے۔ فنونِ لطیفہ کے لئے سب سے نازک دور تھا، کیونکہ فن کی ترقی کے لئے جس گہرے اور دیرپا جذبے کی ضرورت تھی وہ موجود نہ تھا۔ کچھ وقت لگا، جب عیسائیت زندگی کے ہر شعبے کا مرکز بن گئی اور اُس نے اپنے نئی روایتیں پیدا کیں۔ شہنشاہ قسطنطین نے چوتھی صدی عیسوی میں مشرق کی طرف قدم بڑھائے اور عیسوی مذہب کو ترقی کا زبردست سہارا ملا۔ مصوری، نقاشی اور مجسمہ سازی کو پھر ایک مرکز مل گیا۔ مصر میں یہ فنون مقبروں سے وابستہ تھے۔ یونان میں معبدوں سے اور اب گرجا گھر کی دیواروں نے انھیں جگہ دی۔ رومی انداز میں مشرقی اثرات پیدا کرنا کا کام بھی لیا جانے لگا۔ گرجا گھروں کی یہ مصوری حقیقتاً مذہبی تبلیغ کا ایک اہم ذریعہ تھی۔ گرجاؤں کی خوبصورت تعمیر اور اُن کے اندر کی مرصّع کاری کا یہ سلسلہ صدیوں تک قائم رہا، اور اس میں شک نہیں کہ تعمیر، مصوری اور نقاشی ہر ایک میں نئی راہیں نکلیں۔ یہ البتہ حیرت کی بات ہے کہ ہزارہا فن کاروں میں سے کسی ایک کا نام بھی تاریخِ مصوری میں کوئی اہمیت حاصل نہ کر سکا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کی ترویج میں اس قدر محو تھے کہ انھیں اپنی ذات کے اظہار کا خیال ہی نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ بازنطینی آرٹ کی تاریخ لکھنا بھی آسان نہیں ہے۔ وہاں شخصیتیں نہیں ہیں نہ طرزِ اظہار میں شخصیتوں کا اظہار ہی نظر آتا ہے۔ جب قسطنطنیہ مسلمانوں کے ہاتھ میں پہنچ گیا تو بازنطینی آرٹ کے وارث روسی بن گئے لیکن وہ بھی مذہب کی مقرر کردہ حدوں کے اندر ہی گل بوٹے کھلا سکے۔

اگر نگاہ مشرق سے مغرب کی طرف ہٹا لی جائے تو معلوم ہوگا کہ تقریباً ایک ہزار عیسوی تک کوئی قابلِ ذکر پہلو فنونِ لطیفہ کے ارتقاء میں نظر نہیں آتا لیکن "مقدّس رومن سلطنت" قائم ہو جانے کے بعد سے مذہبی سرگرمیوں نے فنِ تعمیر کو ترقی کا موقع ضرور دیا تھا، اور تھوڑے ہی دنوں کے اندر گاتھک طرزِ تعمیر وجود میں آیا جو اپنی عظمت، پائداری اور اَن گھڑ حُسن کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں یورپ اُس نشاۃ الثانیہ اور احیائے علوم کے قریب آ رہا تھا جس نے یورپ پر ترقی کے ہزارہا دروازے کھول دئے۔ چنانچہ ابھی تیرھویں صدی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ یورپ میں مصوّری کے اُس دور کا آغاز ہوا جس کا سلسلہ اب تک قائم ہے۔

جب سینٹ فرانسس کے اثر سے عیسائی مذہب کے تصوّر میں وسعت

پیدا ہوئی تو قدیم رہبیت کے بندھن ٹوٹ گئے اور مصوّری میں ایک نئی طرح کی جذباتیت اور انسانیت رونما ہوئی۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلا اور سب سے اہم نام گیوٹو کا ہے جس نے فلورنس میں نشو و نما پائی اور اپنے فن میں اُس توازن، لطافت، ڈرامائی تاثر، انداز اور دلکشی کو اِس طرح سمو دیا کہ اس کے بعد آنے والوں کے لئے آگے کی راہ روشن ہوگئی۔ پندرھویں صدی تک فلورنس نے کئی اعلیٰ پائے کے فنکار پیدا کئے جن پر گیوٹو کا اثر گہرا تھا۔ اٹلی کے مختلف شہر تجارتی ترقی کی وجہ سے نئی تہذیبی زندگی کا مرکز بن رہے تھے۔ چنانچہ فلورنس کے علاوہ وینس اور سینا میں بھی اُس زندگی کا ظہور ہوا جو نشاۃ الثانیہ میں تبدیل ہونے والا تھا۔ فلورنس اور سینا کی مصوّری میں جو فرق ہے اُسے بعض نقادوں نے بہت تفصیل سے پیش کیا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ فنونِ لطیفہ کے اندر حُسن اور حقیقت کی جو کشمکش جاری رہتی ہے اُس میں حُسن پر سینا نے زور دیا۔ اور حقیقت کو فلورنس نے اپنایا۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلورنس کی نگاہ جدید کی طرف تھی اور سینا اپنے دل میں عہدِ وسطیٰ کی روایتیں چھپائے ہوئے تھا۔ سینا کی مرقّع کاری اور آرائش میں زیادہ نزاکت اور امارت کا ظہور ہوتا ہے۔ فلورنس میں طاقت زیادہ ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یورپی مصوّری کا اصل دور نشاۃ الثانیہ سے شروع ہوتا ہے۔ جب یورپ نے اپنے آپ کو پالیا، جب یونانی علوم اور فنون ایک گمشدہ خزانہ کی طرح عربوں کے وسیلہ سے پھر یورپ کے ہاتھ آ گئے، جب وہ فخر سے اپنا تعلق ایک قدیم، اعلیٰ اور وسیع تہذیب سے قائم کرسکے۔ حالانکہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ قدیم کی پرستش یا اُس پر قانع ہو جانے کا جذبہ نہیں تھا، بلکہ خوب سے خوب تر کی اور اعلیٰ سے اعلیٰ تر کی جستجو میں نکل کھڑے ہونے کا جذبہ تھا جس نے زندگی کے ہر گوشے کو روشن اور ہر شعبے کو متحرک بنا دیا۔ علم کے شوق اور نئے تجربوں کے ذوق کا وہ شاندار دور شروع ہوا جس نے آہستہ آہستہ ساری دنیا کے علوم کو اپنے انداز میں متاثر کیا۔ اس دور میں فلورنس اور وینس نے وہ بڑے بڑے فنکار پیدا کئے جن کے نام ساحرانہ کشش اور جن کے کارنامے کمالِ فن کی پائندگی رکھتے ہیں۔ اگر صرف دو ہی نام ——— لیونارڈو ڈاونچی اور مائیکل انجلو ——— یاد رکھے جائیں تو بھی اس دور کی عظمت کسی دوسرے دور سے کم نہیں۔ چہ جائیکہ ایک بڑی تعداد میں فنونِ لطیفہ کے ہر شعبے کے ماہر جیتا دو فنی نجوم ہیں۔ فلورنس کے تقریباً ہر اہم مصوّر کا اپنا تصویر خانہ تھا۔ جس میں اُس کے ساتھ بہت سے زیرِ مصوّر کام سیکھتے تھے اور سرپرستوں کا ذوق اتنا بلند تھا کہ وہ ہر اچھے کارنامے کی قیمت لگا سکتے تھے۔ پندرھویں صدی میں اُچیلو، فرینکسا اور بوٹی چیلی نے فلورنس کو رنگ و آہنگ میں فوق کر دیا، خاص کر بوٹی چیلی کی شعریت، نزاکت اور آرائش نے اُن حسین مرقعوں کو جنم دیا جو اس وقت تک بے مثال ہیں۔

لیونارڈو (۱۴۵۲ء سے ۱۵۱۹ء تک) نشاۃ الثانیہ کی کامل پیداوار ہے۔ وہ مصوّر ہونے کے ساتھ ساتھ سائنس داں اور عالم بھی ہے۔ اُس کی بے پناہ تخلیقی قوت، اُس کے مشاہدے کی صحت، اُس کے تجربوں کی بیباکی، سب مل کر اُسے حیرت خیز جامعیت کا انسان بناتے ہیں۔ سائنس کی تجرباتی صداقت کے ساتھ ساتھ ایک روحانی تخلیق کا جذبہ اُس میں ملتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی مشہور تصویر، شہرۂ آفاق مونا لیزا اور مسیح کی آخری دعوت اُس کے موقلم کے معجزے ہیں اور مصوّری کی مختصر سے مختصر تاریخ میں طرزِ اظہار کے ان سحر آفریں کارناموں کے قصیدے ملیں گے۔ حضرت عیسیٰ کا مقدس، پُروقار اور سادہ چہرہ، مونا لیزا کا معصوم تبسّم، اور آخری دعوت کا ڈرامائی اثر تقریباً چھ سو سال گزرنے پر بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ رفائیل (۱۴۸۳ء سے ۱۵۲۰ء تک) گو قدیم اساتذۂ فن کی حدوں کو توڑنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مجموعی حیثیت سے خود ایک عظیم الشان فن کار رکھے جانے کا مستحق ہے۔ کیونکہ اس میں وہی توازن، ڈرامائی کیفیت، ترتیب کا حُسن اور لطافت ملتی ہیں جو بڑے مصوّروں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ بعض ناقدوں کے نزدیک مائیکل انجلو (۱۴۷۵ء سے ۱۵۶۴ء تک) اس دور کا سب سے بڑا مصوّر اور مجسمہ ساز ہے جس کی شدّتِ احساس اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ رنگ، موقلم اور پتھر اس کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ وہ قدیم یونانی تصوّرِ فن سے بہت قریب تھا۔ اور موضوع کے اختلاف کے باوجود بھی مردانہ انسانی جسم کی مصوّری اور تراش میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ اُس کے مجسّمے اور تصویریں اپنے گرد و پیش سے بے نیاز اپنا ذاتی حُسن اور فنی کمال رکھتی تھیں۔ اُس کی تصویریں ہوں یا مجسّمے، وہ انہیں قوت، عظمت اور پاکیزگی کا مظہر بنا دیتا تھا۔ آدم اور یرمیاہ نبی کی تصویریں غیر معمولی قوت اور اثر رکھتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی مصوّر یا مجسمہ ساز

علم الاعضا اور تشریح الابدان کی اتنی گہری واقفیت نہیں رکھتا تھا۔

فلورنس کا یہ حال تھا، لیکن تقریباً اسی زمانے میں وینس بھی اپنے لئے نئی راہیں نکال رہا تھا۔ فلورنس نے رنگ کو تصویر کے حُسن میں اضافہ کے لئے گویا رنگ سے استعمال کیا، وینس کے لئے رنگ تصویر کا جزو تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وینس نے اچھے مجسمہ ساز نہیں پیدا کئے۔ جن کی ساری توجہ خاکہ پر ہوتی ہے۔ وینس کے بلینی، گیورگیون، ٹیشین وہاں کے نمائندہ مصوّر ہیں۔ جنہوں نے رنگ و نُور کی آمیزش سے ساحرانہ کیفیت پیدا کی۔ گو پس منظر کو اُس وقت تک زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن وینس کے مصوّروں نے اس کا استعمال فنی دلآویزی کے ساتھ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پس منظر کو اپنی تصویر کا جزو بنانا چاہتے تھے۔ لیکن فلورنس کے لئے پس منظر اتنا اہم نہ تھا۔ فلورنس اور وینس کے ان دیوزاد مصوّروں کے بعد مصوّری کا مرکز اٹلی کے باہر چلا گیا۔

اسپین، جرمنی، ہالینڈ اور فلینڈرس کی قومی زندگی یوروپین نشاۃ الثانیہ اور مذہبی اصلاحات کی وجہ سے مدوجزر سے گزرنے لگی اور گو روایتاً اٹلی اور یونان ہی سے اثر قبول کیا جاتا رہا لیکن ان ملکوں میں بھی بڑے بڑے مصوّروں نے جنم لیا جنہوں نے مذہبی اور غیر مذہبی مسائل کی تصویر کشی میں نئے راستے پیدا کئے۔ یوں تو ان ملکوں میں مصوّری کا رواج پہلے بھی تھا لیکن سولہویں صدی نے انھیں تاریخ کے صفحات پر اتنا اُبھار دیا کہ کوئی مورّخ انھیں نظر انداز نہیں کرسکتا۔ شہرت اور کارناموں کی عظمت دونوں کے لحاظ سے روبنس، ال گریکو، وان ڈایک، ویلاسکے، ریمبران وغیرہ تاریخ مصوّری کے درخشاں ستارے ہیں۔ اِن میں سے ہر ایک کے فن کا تفصیلی مطالعہ کیا جاچکا ہے۔ اور اُن کے نتائجِ فکر سے یورپ کے مشہور تصویر خانے اور میوزیم آراستہ ہیں۔ ریوبنس کا ذہن غیر معمولی تخلیقی قوت اور تنوع رکھتا تھا۔ وہ مذہبی موضوعات سے لے کر خالص رومانی موضوعات تک ہر ایک پر یکساں قدرت رکھتا تھا۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ گوشت اور پوست کا پجاری تھا اور اُس کے بہترین کارنامے وہی ہیں جو مادّی حُسن سے تعلق رکھتے ہیں۔ مادّی حُسن کی مصوّری اور حرکت، ان دو فقروں میں ریوبنس کے کمالِ فن پر تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔ فلینڈرس کے مصوّروں کی حقیقت پسندی اور قوتِ مشاہدہ ریوبنس میں بدرجۂ اتم آئی تھی۔ اسپین کا ال گریکو بھی جسے بیسویں صدی میں زبردست ہردل عزیزی حاصل ہوئی، اپنے فن میں لاثانی ہے۔ اس کی تصویروں کا آہنگ، رنگوں کی آمیزش، شعلہ کی طرح لہراتے ہوئے جسم اور مجموعی اثر، ساری باتیں اُسے صفِ اوّل کا مصوّر بناتی ہیں۔ ایک نقّادِ فن نے اُس کا اور ریوبنس کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر ریوبنس زمین سے اوپر نہیں اُٹھ پاتا تو ال گریکو کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے قدم کبھی زمین کو چھوتے ہی نہیں۔ اس جملہ میں ریوبنس کی دنیا داری اور ال گریکو کے تصوّف کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئیے کہ دونوں کے عروج کا زمانہ سترھویں صدی کا ابتدائی عہد ہے۔

ویلاسکے (۱۵۹۹ء سے ۱۶۶۰ء تک) مصوّروں کا مصوّر کہا جاتا ہے، اُس کی جامعیت اور کمال، اُس کی فنی مہارت آج تک عزّت اور توصیف کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔ بہت سے نقّادوں کی نظر میں وہ زبردست فطرت پرست ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئیے کہ وہ فوٹوگرافی کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ زندگی سے قریب تر ہونے میں اُس کی حقیقت پرستی کا کمال ہے۔ اسپین ایک زبردست سامراجی ملک تھا، اس لئے وہاں کی مصوّری بھی ربار سے وابستہ ہے۔ لیکن ہالینڈ اور فلینڈرس کی مصوّری متوسط طبقہ سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ گو وہاں مصوّری کے عروج کا زمانہ مختصر رہا لیکن گھریلو زندگی کی سادگی اور سچائی کے پیش کرنے میں وہ سب سے آگے ہے۔ ولندیزی مصوّری میں سب سے اہم نام ریمبران کا ہے۔ اُس نے عام زندگی کی سچائی اور حقیقت کی مصوّری کرکے انسان کے اندر سوئی ہوئی دردمندی کو ظاہر کیا۔ اُس کے موضوعات میں بہت زیادہ تنوّع نہیں۔ لیکن فنی تکمیل بدرجۂ اتم ہے، کسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔ اُس کا شمار یورپ کے مشہور ترین مصوّروں میں کیا جائے گا۔ اتنا ہی کہنا اُس کی عظمت کے لئے کافی ہے۔

جب ان ممالک کا ذکر کیا جا رہا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یورپ کے اور خطے بالکل ویران اور مصوّروں سے خالی تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ فرانس جو اٹھارھویں صدی سے اس وقت تک فنونِ لطیفہ کی مختلف تحریکات کا مخزن بنا ہوا ہے اور انگلستان جس نے کئی اہم مصوّر پیدا کئے۔ یا سکس جو بیسویں صدی میں نئی زندگی اور نئے تصوّرات فن کا علمبردار ہے۔ یہ تمام اہم ممالک اپنا ذاتی فنی ورثہ نہیں رکھتے تھے بلکہ کسی نہ کسی حیثیت سے اطالوی، یونانی یا بازنطینی فنونِ لطیفہ سے متاثر تھے۔ لیکن اٹھارھویں صدی شروع ہوتے ہوتے فرانس نے واتو، بوشے، فریگونار اور شاردین

سے سے مصوّر پیدا کر دیئے تھے۔ جو فرانسیسی جاگیردارانہ تصورات کی ترجمانی کر رہے تھے۔ مصوّری کے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اٹھارھویں صدی کا فرانس مصوّری کے نقطۂ نظر سے کوئی اہم تخلیقی مصوّر نہیں پیدا کر سکا۔ فرانسیسی مصوّری کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہاں کوئی نظریاتی تحریک وجود میں آلیتی ہے۔ اُس کے بعد مصوّر اُس کے کارنامے سامنے آتے ہیں، چنانچہ فنونِ لطیفہ کے جتنے مکاتبِ خیال فرانس میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوئے اتنے مشکل سے کہیں اور نظر آئیں گے۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے بعد سے فرانسیسی مصوّری مختلف نظریات کی بنیاد پر آگے بڑھی۔ فرانسیسی مصوّر ہمیشہ اس بات کا قائل رہا کہ تصویر دیکھے جانے کی چیز ہے، اور آنکھوں ہی کی مدد سے اُس کے حُسن کا احساس ہونا چاہیئے۔ (حالانکہ یہ بات بحث طلب بھی ہے اور خود فرانس میں اس کی خلاف ورزی کی جاتی رہی ہے) شروع انیسویں صدی میں کلاسیکی اندازِ نظر کا زور رہا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں مصوّری کی رہنمائی رومانی مصوّروں کے ہاتھ میں آگئی جس کی سرکردگی ولکرائے (۱۷۹۸ء سے ۱۸۶۳ء تک) نے کی۔ اس مکتبِ خیال نے ریوبنس کے فن سے فیض اٹھایا۔ اِس دور کے فرانسیسی مصوّروں کا مطالعہ کرتے وقت یورپ کی رومانی تحریکِ ادب کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ تاکہ فنونِ لطیفہ کے سماجی پس منظر کا پتہ چل سکے۔

انگلستان کی تاریخ مصوّری اس کے ادب کی طرح زرخیز نہیں ہے۔ اس کا پہلا اہم مصوّر ہوگارتھ (۱۶۹۷ء سے ۱۷۶۴ء تک) قرار دیا جا سکتا ہے، جس نے اٹلی سے آنکھیں پھیر کر خود انگلستان کی زندگی کو اپنے فن میں جگہ دی۔ اُس کی خامی یہ تھی کہ وہ اپنی مصوّری سے اخلاقی وعظ کا کام لینا چاہتا تھا۔ ولیم بلیک جو کئی حیثیتوں سے بہت اہمیت رکھتا ہے، مصوّر کی حیثیت سے اتنا اہم نہیں تاہم انگریزی تاریخ مصوّری میں اس کی جگہ ہے۔ رینالڈس (۱۷۲۳ء سے ۱۷۹۲ء تک) انگلستان کا مشہور مصوّر ہے، جس نے مصوّری کو علمی حیثیت بخشی۔ گو اس میں تخلیقی صلاحیت کی کمی تھی، لیکن وہ قدیم اساتذہ کی پیروی میں ماہر تھا۔

لیکن قبل اس کے یورپ کی مصوّری کی تاریخ آگے بیان کی جائے "تاثریت" کا ذکر ضروری ہے جس نے ۱۸۷۴ء میں فرانس میں جنم لیا، اور یورپ کے اکثر مصوّروں کو متاثر کیا۔ ویسے تو اس کے ابتدائی نقوش پہلے سے ملنے لگتے ہیں، لیکن بعد میں اس نے ایک نظریہ اور تحریک کی حیثیت اختیار کر لی۔ تاثریت کے نقادوں نے کہا ہے کہ تاثریت حقیقت پسندی کی ایک شکل ہے جس میں مصوّر ایک لمحہ میں حقیقت کو جس طرح دیکھتا ہے پیش کر دیتا ہے۔ یہ لوگ فطرت کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی حالت کی خارجی مصوّری کو اصل مصوّری سمجھتے تھے۔ غور و فکر کے بغیر وقتی تاثر کی ترجمانی ان مصوّروں کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس کے بڑے حمایتی مونے اور پزارو تھے۔ یہ تحریک ابھی زیادہ دنوں چلنے نہیں پائی تھی کہ اس سے نجات کرنے والے بھی پیدا ہو گئے۔ گو ان کی بغاوت محض تاثریت کی خارجیت سے تھی۔ سیزان۔ فان گاگ اور پکاسو وغیرہ نے محض تصویر کشی کو حقیقت نہیں سمجھا۔ بلکہ تخیل کو جگہ دی اور تخلیق سے کام لیا۔ خود رینوائے جو تاثریت ہی کی تحریک سے تعلق رکھتا تھا، اُس کی حدبندیوں سے آگے جاتا تھا۔ بیسویں صدی شروع ہوتے ہوتے فن اور حقیقت کے متعلق بہت سے نظریات پیدا ہو گئے۔ اور مصوّری کبھی قدیم یونانی تصورات کے قریب آئی اور کبھی بالکل معمہ بن گئی۔

انگلستان میں ٹرنر اور کانسٹیبل کے بعد جن مصوّروں کا ظہور ہوا، اُن میں مصوّری سے زیادہ ادبیت تھی۔ چنانچہ راوزیٹی۔ برن جونس ہینٹ اور براؤن میں تخلیق سے زیادہ تخئیلیت اور آورد تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرح کی روایت پرستی پیدا ہو گئی جس سے معمولی بغاوتیں ہوتی رہیں لیکن انگلستان نے دورِ جدید میں بھی مصوّری کے رہنما نہیں پیدا کئے۔ اس کے برعکس فرانس میں جو چراغ سیزان نے جلایا تھا اُسے پکاسو نے ایک خاص انداز میں تیز تر کر دیا۔ اشاریت اور حقیقت کے درمیان فنونِ لطیفہ میں جو آویزش برابر رہی ہے اس کی نمود پکاسو کے یہاں ایک جدید اشاریت میں ہوئی ہے۔ اسی دوران میں اشاریت اور تاثریت کی مختلف شکلیں مکعبیت، مستقبلیت اور ماورائے حقیقت پسندی کی شکلوں میں رونما ہوئی ہیں۔ جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ چیزیں خود اُن کے بانیوں کے ذہن میں واضح نہیں تھیں۔ حقیقت سے بچنے اور اُسے دھندھلا کر کے پیش کرنے کی یہ مختلف ہیئتی کوششیں تھیں۔ جو آہستہ آہستہ اپنی موت آپ مر رہی ہیں۔ زندگی سے دور ہو کر کوئی فن محض جمالیاتی تصورات کے سہارے نہیں چل سکتا۔ چنانچہ خود بعض مصوّروں کو اپنی راہ بدلنی پڑی۔ پکاسو نے جب فرانس کا زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا اور زندگی کے مادی حقائق اُسی کے سامنے بے نقاب ہوئے تو اُس کے فن نے اشاریت کے باہر قدم نکالے اور

آج وہ یورپ کا سب سے بڑا مصوّر ہے۔ کیونکہ وہ اپنی مصوّری سے زندگی کی بڑھتی ہوئی رو کا ساتھ دے رہا ہے۔

روس کی مصوّری انقلاب سے پہلے برابر مختلف یوروپی اثرات قبول کرتی رہی۔ یہاں تک کہ زمانہ انقلاب میں وہاں بھی اشاریت مستقبلیت اور مکعبیت کا دور دورہ تھا۔ لینن نے ان تمام رجحانات کا مذاق اُڑایا۔ کیونکہ وہ زندگی کے ترجمان نہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید سویت مصوّری وہاں کے ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح اشتراکی حقیقت نگاری پر مبنی ہے اور قوتِ حیات سے بھرپور۔ وہاں ہیئت کے تجربے محض ہیئت کے لئے نہیں ہوتے، بلکہ طرزِ اظہار کو اور زیادہ پُراثر بنانے اور زندگی کے امکانات کو نمایاں کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ بیرونی اثرات سے بچ کر روس میں خود سویت مصوّری پھل پھول رہی ہے۔

یوروپین مصوّری کا یہ مختصر سا خاکہ بہت سے اہم ناموں سے بھی خالی ہے لیکن اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہی مصوّر ہر دور میں پسند کئے گئے ہیں اور اس وقت تک زندہ ہیں جنھوں نے اپنا مواد زندگی سے لیا تھا اور زندگی کے کسی پہلو کی ترجمانی اپنے فن کے ذریعہ کی تھی۔

سانحۂ عظیم

کس کس کو روئیں، یہ آنکھیں شاید اب صرف رونے ہی کے لئے وقف ہو کر رہ گئی ہیں۔ اکابرِ ادب اس قدر جلد جلد رخصت ہو رہے ہیں کہ ایک بساطِ ماتم اُٹھاتے ہی دوسری بساطِ ماتم بچھانا پڑتی ہے۔

حیف صد حیف کہ سیاب صاحب بھی ہم سے بچھڑ گئے۔ ہم سے رُوٹھ کر چلے گئے۔ سیاب صاحب کو میں ایک قابلِ قدر شاعر کی حیثیت سے مانتا اور ایک پُرانے دوست کی حیثیت سے چاہتا تھا۔ اُن کی موت نے میرے دماغ پر بھی ضرب لگائی اور دل کو بھی زخمی کر دیا۔

صرف ایک دردِ دل ہو تو آ جائے صبر جوش　　　جب ہوں دماغ میں بھی خراشیں تو کیا کریں

ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ میری اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ کس محبت سے ہم دونوں ملے اور کس دلچسپی سے ہم نے ماضی کی داستانیں چھیڑی تھیں۔ وہ آخری صحبت اب تک میری آنکھوں کے نیچے پھر رہی ہے، اور وہ باتیں اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔

محفل میں اب تین چار ہی پُرانی صورتیں نظر آ رہی ہیں۔ سوچتا ہوں کہ کیا طوالتِ عمر میرے ساتھ یہ خطرناک کھیل کھیلے گی کہ محفل کی محفل خالی ہو جائے اور میں باقی رہ جاؤں۔ اگر قضا و قدر نے میرے ساتھ خدانخواستہ یہ کھیل کھیلا تو میں زندہ درگور ہو کر رہ جاؤں گا۔ کروروں دوزخوں کا عذاب قبول ہے مجھے، لیکن یہ نہیں چاہتا کہ اب کسی دوست کی موت سے دوچار ہوں ۔۔

سرگھوم رہا ہے ناؤ کھیتے کھیتے　　　اپنے کو فریبِ عیش دیتے دیتے
اُف جہدِ حیات، تھک چکا ہوں معبود　　　دم ٹوٹ چکا ہے سانس لیتے لیتے

جوش

$\frac{2}{51}$ ۱۶

ڈاکٹر اعجاز حسین

صفی کی نظم نگاری

صفی صاحب کی جس شاعری سے ہم یہاں بحث کریں گے اس کی عمر ادبی لحاظ سے زیادہ نہیں - خود اس کی پیدائش صفی صاحب کی پیدائش کے سنہ سے ۵ سال بعد کی ہے صفی صاحب ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے اور جدید نظم ۱۸۶۷ء میں باقاعدہ عالم وجود میں آئی - میرا مطلب اس نظم سے ہے جو کسی خاص مقصد و تحریک کے زیر اثر کہی جانے لگی جس کی بنیاد محمد حسین آزاد نے لاہور میں ڈالی تھی - ابتدا میں کسی ادبی تحریک کو تنی لطافت و معنویت مشکل ہی سے حاصل ہوتی ہے جو بعد کے فن کار اسے عطا کرتے ہیں - چنانچہ اس نظم کو بھی شروع میں آزاد نے بڑی سادگی سے اردو ادب میں متعارف کیا - حالی - اسمٰعیل - درگا سہائے سرور وغیرہ نے بڑی صناعی و سرکاری سے اس کو آگے بڑھایا - زیادہ تر سامنے کی باتیں اور زندگی کے روزمرہ کے حالات صفائی و تاثیر کے ساتھ پیش کرتے رہے - ان لوگوں کے بعد زمانہ بھی بڑی تیزی سے بدلا اور مذاق شاعری بھی سیاسی محسوسات کو کانگریس نے بھی پر پرداز عطا کرنا شروع کر دیا تھا - اکبر - اقبال - چکبست وغیرہ کی ذہنی نشو و نما کو ایک طرح سے بالکل نیا ماحول ملا - ان کی بے بدل گئی نظم کو بھی جوان ہونا پڑا - زور بیان معنویت 'جوش' بے باکی' سب کچھ حالی وغیرہ کے دور سے زیادہ نظر آنے لگے - مگر یہ بعد کی بات ہے صفی صاحب ی ذہنی نشو و نما جدید نظم کے ابتدائی دور سے زیادہ لگاؤ ہے - ان ے شباب میں آزاد و حالی کے وقت رجحان کا اثر زیادہ تھا اور پھر س وقت کی غزل بھی زبان و بیان کے لحاظ سے اسی اسلوب کی حامی ی - چنانچہ صفی صاحب نے اس فضا کو اپنانا مناسب سمجھا اور رے نزدیک بڑی دور اندیشی تھی - اس رویے کو اختیار کرنے میں اعر کے ذہنی نشو و نما اس کی فطرت اس کی ادبی فضا کے لئے سازگار بنتی ہیں - اس کی ذہنی کاوشوں کے لئے وہ اسی ماحول میں اپنے فن کی تکمیل زیادہ خوبی سے کر لیتا ہے - اور آنے والے دور کے لئے اپنے کلام کو پس منظر بنا دیتا ہے -

صفی صاحب کی نظم گوئی کی ابتدا میں سادگی و صفائی کے علاوہ نرم و درد انگیز لہجے میں شعر کہنا ضروری سا تھا - حالی وغیرہ نے جو کچھ کہا اور جس طرح کہا وہ اس زمانے کا تقاضا تھا - اسی طریقے پر گفتگو کرنا داخل اخلاق تھا - اقبال اور جوش نے جو انداز بیان اختیار کیا وہ حالی کے زمانے میں مناسب کیا شاید ممکن بھی نہ تھا - کیونکہ طرز گفتار کی طرح طرز تخییل کا بھی دائرہ محدود تھا - سیاست کا فولادی پنجہ مشکل سے زبان کھولنے دیتا تھا ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم صفی صاحب کے سیدھے سادے بیان و طرز تخاطب کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جو انداز بیان صفی صاحب نے اختیار کیا تھا وہ ماحول و رجحان دونوں لحاظ سے مناسب تھا اس لئے کہ اول تو شاعر کی طبیعت اسی سانچے میں ڈھل گئی تھی اور دوسرے اتنی سیاسی بیداری بھی نہ تھی جو اقبال و جوش کے زمانے میں ہو گئی تھی - جو سیاسی اور سماجی مسائل و مطالبات صفی صاحب کے زمانے میں تھے اس کے لحاظ سے ان کا طرز تخییل بالکل موزوں تھا - اب یہ ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے ان باتوں کو زمانے کے ساتھ ساتھ تبدیل کیوں نہیں کیا - اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی نظم گوئی ایک ایسے نقطے پر پہنچ چکی تھی اور اس میں اتنی پختگی آ چکی تھی کہ بدلتے ہوئے زمانے کو اس کے بدلنے کے لئے کافی دیر ہو چکی تھی - ان کا لب و لہجہ ان کا طرز تخییل اور ان کا اخلاق بیسویں صدی کی پیداوار نہ تھا بیسویں صدی کے آتے آتے ان کی یہ خصوصیات مکمل ہو چکے تھے - ان کا معیار قائم ہو چکا تھا اور اب ان کا بدلنا آسان نہیں تھا مگر یہ نہ سمجھئے گا کہ

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تبدیلی نہ ہونا ہی اچھا تھا۔ میں خود بھی یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کاش ان کی شاعری و طرز تخیل زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے۔

ہمارے سامنے بدقسمتی سے صفی صاحب کا پورا کلام نہیں۔ جو نظمیں ہیں وہ بھی ایک مخصوص وقت اور مخصوص جماعت سے متعلق ہیں۔ میرا اشارہ ان کے مجموعہ 'لخت جگر' کی طرف ہے۔ اس میں تمام نظمیں شیعہ فرقے سے متعلق ہیں۔ کاش صفی صاحب کی اور متفرق نظموں کو بھی کوئی مجموعی شکل مل جاتی تو پورا نظم گو صفی ہمارے سامنے ہوتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ میرا مضمون یوں بھی ناقص ہے اور تمام نظموں کی موجودگی میں ناقص تر ہے۔ بہرحال اس وقت جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ لخت جگر کی روشنی میں۔ قبل اس کے کہ اس پر کچھ رائے زنی کی جائے یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صفی نے شیعہ فرقے کو ہمیشہ قوم سمجھا۔ لیکن اس غلط فہمی کے شکار وہ اکیلے نہیں۔ ہندوستان کے اکثر حضرات قومیت کے دوسرے اجزا کو نظرانداز کرکے صرف ایک جزو یعنی مذہب کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ جزو کل ہو جاتا ہے باقی اجزا ریا در ہوا ہوتے ہیں۔ اور مذہب کی عینک سے فرقہ قوم نظر آنے لگتا ہے۔ بہرحال صفی صاحب نے شیعہ فرقے کو قوم سمجھا' غلط سمجھا یا صحیح۔ یہاں یہ بحث بیکار ہے۔ میں نے یہ بات تھے ہاتوں اس لئے کہہ دی کہ صفی صاحب کی شاعری اور ان کے ذہنی تجزیے میں ہم کو کچھ مدد مل سکے۔ یہ ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ صفی صاحب سے پہلے اور بعد تک وہ دور تھا جب انگریزی حکومت کی پرستش ہوتی تھی اور سونے میں سہاگہ یہ تھا کہ وہ سرکاری ملازم بھی تھے۔ ان کی شاعری کو ذہنی آزادی اور قومی تخیل اس معنی میں نصیب نہیں تھے جو اقبال و جوش کو ملے لہٰذا انہوں نے کسی سیاسی جماعت سے اپنی شاعری کو وابستہ نہیں کیا صرف آل انڈیا شیعہ کانفرنس ان کے تخیل کی جولانگاہ بنی رہی۔ اس کانفرنس کی اصلاح اور شیعوں کی ضرورتوں کو پیش کرنا وہ اپنی نظم کی معراج سمجھتے رہے۔ اس لئے کسی بڑے سیاسی مسئلے کا حل ان کی نظموں میں تلاش کرنا بے سود ہوگا۔ پورے ہندوستان کے احساسات کی عکاسی بھی ان کے یہاں نہیں ملتی۔ لیکن یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہیں جو قابل عفو نہ ہو۔ اول تو ہم اس نتیجے پر اس لئے بھی مطمئن نہیں کہ ہمارے سامنے ان کی تمام نظمیں نہیں اور دوسرے یہ کہ اگر اقبال پر اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صرف مسلمانوں کے متعلق خامہ فرسائی کی اور دوسرے لوگوں کو زیادہ تر نظرانداز کیا تو بے شک صفی پر بھی یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری میں بھی عوامی تحریک مفقود ہے لیکن اس نتیجے سے پہلے یہ بھی سوچنا ہے کہ اگر کسی قوم کے کسی کمزور عضو کو درست کرنا بھی قومی خدمت ہے تو پھر صفی کی مخصوص و محدود خدمت کو سراہنا ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ ان کے یہاں سیاسی تحریکات و خیالات کی کمی ہے لیکن پھر بھی انہوں نے اپنا ایک راستہ سب سے الگ کر لیا ہے جو اردو ادب میں صرف صفی کے لئے مخصوص ہے دوسرا کوئی ان کا اس خصوصیت میں شریک و حریف نہیں۔ میرا مطلب ان کی شاعری کے اس پہلو سے ہے جو تاریخی و جغرافیائی حالات پر روشنی ڈالتی ہے۔ مختلف شہروں کی نمایاں خصوصیات' تاریخی اہمیت' مشہور چیزیں اور جغرافیائی بیانات ان کی اس شاعری میں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ جگہ پاتے ہیں۔ تاریخی و جغرافیائی خاکے میں شاعری کا رنگ بھرنا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ ایسے خشک موضوعات ہیں جو شعر کے سانچے میں ڈھلنے کے لئے کسی بڑے صناع کا ہاتھ چاہتے ہیں اور پھر جب کوئی الٹا سیدھا نمونہ سامنے ہو تو تخلیقی قوت کا بھی سہارا ڈھونڈھتے ہیں۔ اتفاق سے صفی صاحب کے سامنے کوئی نمونہ بھی نہیں تھا اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ انہوں نے کیا کمال کیا وہ اس خصوصیات کے پہلے صناع ہیں لیکن صنعت کو اتنا مکمل کر گئے ہیں کہ غالباً اب ان کے بعد اس پر ترقی مشکل ہے گو اول کا آخر ہو جانا اردو ادب کے لئے نئی بات نہیں ہے۔ سودا قصیدے کے ابتدائی دور میں قصیدے کو اتنا بلند کر گئے کہ بعد والے اس میں کوئی قابل قدر اضافہ نہ کر سکے۔ میر تقی میر غزل کے ابتدائی دور میں نہ سہی ذرا بعد میں آئے مگر غزل کو وہ معراج عطا کر گئے کہ پھر ان سے آگے کوئی قدم اس میدان میں نہ بڑھا سکا دور کیوں جائیے اکبر کی مثال لے لیجئے اپنے رنگ میں اپنی شاعری کی ابتدا بھی کی اور انتہا بھی۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی کہنا تو یہ تھا کہ صفی نے اتنے دن ادب کی خدمت کرنے کے بعد اپنا ایک اچھوتا مقام پیدا ہی کر لیا۔ اس کا ان کو اعتراف بھی تھا اور احساس بھی خود ہی کہتے ہیں ؎

نظم میں تاریخی و جغرافیائی کڑیاں اس چمن بندی کا موجد ہیں ہلا واقف ہے جہاں

تاریخی و جغرافیائی بیان میں صفی صاحب بڑی چابکدستی و صناعی سے کام لیتے ہیں۔ ان کو احساس ہے کہ وہ مورخ و جغرافیہ دان کا نہیں بلکہ شاعر کا فرض

انجام دے رہے ہیں۔ وہ واقعات کی تفصیل میں نہیں پڑتے۔ اس لئے کہ وہ ایک جنگل ہے جس کا سنوارنا باغبان کا فرض نہیں شاعر صرف چمن بندی کر سکتا ہے تفصیلات میں پڑنے سے شاعرانہ لطافت اور مقصد خطرے میں پڑ جائیں گے۔ شاعری اشارے کنائے کی چیز ہے۔ لہذا شہر زیر بحث کے مخصوص بیانات و مشہور ہیئت کو لطافت کے ساتھ نظم کرکے دل و دماغ کو اس کی عظمت کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں بات بات میں بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ احساس کو لطف سے ہم کنار کرکے اپنا راستہ لیتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ نہ شاعری تفصیلات سے بوجھل ہوتی ہے اور نہ سننے والے پراگندہ ہوتے ہیں بلکہ سمجھنے والے ان کے طرزِ کلام سے ایک ایسی لذت بھی پاتے ہیں جو اور کہیں نہیں ملتی۔ ایک اور خاص بات ان بیانات میں نمایاں ملتی ہے۔ تاریخی و جغرافیائی میدان میں شفقی صرف شاعر کی طرح نظر آتے ہیں نہ وہ کسی ایک مذہب کے پابند ہونے والے کی طرح اپنے سے غیر مذہب والوں کے کارنامے کو برا کہنا گوارا کرتے ہیں اور نہ کسی تاریخی تحریک یا شخص کو بری نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو جس احترام کا مستحق ہے اس کا ذکر اسی لہجے میں کرتے ہیں گویا شاعر اس وقت صرف انسان ہے نہ وہ کسی مذہب کی خاطر دوسرے مذہب کی توہین کرنا چاہتا ہے نہ کسی غیر ہندوستانی کے کارناموں پر پانی پھیرنا چاہتا ہے۔ وہ تنگ نظری سے کام لینا ادبی گناہ سمجھتا ہے۔ وہ صرف ایک فن کار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے اور فضا میں وجدان بکھیر کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اب سے بیس بائیس سال یعنی ۲۸ء میں "سکھر" کی تعریف کرتے کرتے ایک مقام وہ بھی آ گیا ہے جہاں ہندو مستورات نے اپنی عزت بچانے کے لئے خدا سے دعا کی تھی کہ عصمت دری سے پہلے یہ پہاڑ شق ہو اور ہم اس میں سما جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ دعا قبول ہوئی زمین پھٹی اور عورتیں اس میں سما گئیں۔ اس موقع کا جس خلوص و احترام سے ذکر کرتے ہیں اسے اس وقت بھی دیکھتے چلئے۔

اک پہاڑی پل کے پہلو ہی میں کاٹے ہے قدم   جس سے ٹکراتا ہے آکر آبِ دریا دم بدم
ہے یہی استھان ستیوں کا مقامِ محترم   آج تک جو ہے نظر گاہِ غزالانِ حرم

حفظِ عصمت کی دعا مانگی جو ہنگامِ شکست
شق ہوا پربت سمائیں کل زنانِ حق پرست

۱۹۲۹ء میں الہ آباد کی تعریف میں ایک جگہ یہاں کے لیڈروں کا جس محبت و عظمت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں وہ بھی سن لیجئے

ہے شل راجہ کے گھر میں موتیوں کی کیا کمی   زیبِ معدن ہیں جواہر لال، موتی لال جی
فرد ہیں فردیں یہ دونوں آن سے زینت شہر کی   ڈاکٹر سپرو کا انصافاً نہیں ہے شل ہی

بے تعصب خوش دماغ آئینہ دل منصف مزاج
فخرِ ملت، فخرِ ملک اردو ادب کے سر کا تاج

اس طرح بدھ مذہب، راجہ اشوک۔ سکندر وغیرہ کا ذکر خیر اسی احترام سے کرتے ہیں جس کے وہ مستحق ہیں۔ اشخاص و تحریکات کے تذکرے کے بعد بعض اور شہروں کے بھی حالات اسی ضمن میں سن لیجئے تو پھر آگے بڑھا جائے۔ الہ آباد میں شیعہ کانفرنس جب پہلی بار ۱۹۱۵ء میں خسرو باغ میں ہوئی تو اپنی اس نظم کی ابتدا ہی الہ آباد سے کرتے ہیں جس مزے اور اجمال کے ساتھ تفصیل پر نظر ڈالتے ہیں وہ آپ بھی دیکھ لیں۔ ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کے سلسلے میں الہ آباد نے سیاسیات میں جو حصہ لیا ہے ان اشعار کو پڑھتے وقت اس کو بھی پیش نظر رکھئے گا۔ دیکھئے کس مزے کے ساتھ اشارے کنایے میں بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔

اے الہ آباد اے جولانگہِ گنگ و جمن   تیرا دامن تین تربینی کی ہے اک انجمن
سیکھتے ہیں تجھ سے فرقے میل ملت کیسے چلی   اتحادِ باہمی سنگم سے تیرے موجزن

گنتے گنتے خسرو باغ کے متعلق فرماتے ہیں۔

باغ یہ واقع ہے اسٹیشن سے تھوڑی دور پر   دید کے قابل ہیں اس کے خوش نما دیوار و در
چار دیواری اگر دیکھیں تو آتے ہیں نظر   مختلف پتھر کے ٹکڑے وصلیاں باہم دگر

جس طرح دلقِ گدائے تارکِ دنیائے زشت
اپنے گھوپے میں چھپائے ساز و سامانِ بہشت

سبز بیلوں کے گھنے پتوں سے پھاٹک سبز پوش   جس طرح آنچل عروسانِ حسین کے زیبِ دوش
کیاریاں پھولوں کی کثرت سے دکانِ گلفروش   رنگ بن کر پھوٹ نکلا ناہیے دل کا جوش

اہلِ دل کے حوصلے کی طرح اتنا بڑھ گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے پھاٹک پہ بیلیں چڑھ گئیں

جانبِ مشرق بھی چل کر دیکھ لیجے اک نگاہ   کچھ نظر آئیں گے واٹر ورکس تالاب چاہ
ایک انجن ہے یہاں گرم فغاں شام و پگاہ   ہو گئیں ہیں جس کے دودِ دل سے دیواریں سیاہ

کیا ترقی کی گئی ہے عالمِ اسباب میں

لائیں ہیں جمنا سے پانی کاٹ کر تالاب میں

دوسری بار جب ۱۹۲۹ء میں پھر اس الٰہ آباد پر نظم لکھتے ہیں تو قلعے کا بھی ذکر خاص طور سے کرتے ہیں۔ اس کے اندر کیا کیا چیزیں ہیں سب گناتے ہیں۔ پھر اشوک کی لاٹ دیکھ کر کہتے ہیں ۔

قربِ مسجد ہے اشوکِ نامور کی یادگار   یہ ستوں یہ سنگِ خارا ہے بہت ہی پائدار
کندہ اس پر واقعاتِ انقلابِ روزگار   گزرے ہیں کیں سو انسٹھ برس کر لو شمار
جتنی تحریریں ہیں گویا ہیں وہ پتھر کی لکیر
سنگ یہ آئینۂ تاریخ ہے اک بے نظیر

صفی کی اس شاعری پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر مثالوں کی زیادتی کے باعث ڈر لگتا ہے کہ کہیں پڑھنے والے گھبرا نہ جائیں۔ اس لئے کم سے کم اقتباسات پیش کرتا ہوں بمبئی کے لئے ۱۹۳۵ء میں لکھا ہے ۔

ہر دو جانب کوہساروں کا تسلسل تا بہ دور   اور ان کے بیچ میں تو صورتِ بینُ السطور
اپنے سنگیں بازوؤں پر تجھ کو زیبا ہے غرور   روک دیتے ہیں جو طوفانی تموج کا عبور
دل ہے لبریزِ محبت آ گیا جب جوش میں
لے لیا بحرِ عرب کو حلقۂ آغوش میں

دامنِ ساحل پہ صدہا رنگ کے نقش و نگار   کوٹھیاں کچھ کچھ تلے اوپر منازل خاردار
جن کی پستی اور بلندی یوں دکھاتی ہے بہار   جیسے زینوں پر لگا دیں سج کے گملوں کی قطار
خیر مقدم کو مسرت بڑھتی ہے دل کی طرف
اک نظر ڈالو سمندر سے جو ساحل کی طرف

خاص نمبر ہر مکاں ہر راہ کے ہر بات کے   خضرِ راہ ساحل مقصود زینے گھاٹ کے
پاٹ دی کس نے یہ کھاڑی ڈال کیسر کاٹ کے   ہٹ گیا میلوں سمندر خاک آخر چاٹ کے
تاج ہوٹل کے جلو میں خوش نما وہ گھاٹ ہے
جس سے کوسوں تک خلیج بمبئی کا پاٹ ہے
کیا بتائیں اس سے پہلے حدِ ساحل تھی کہاں   پاؤں دھونی کا لقب تو دے رہا ہے خود نشاں
اللہ اللہ عقلِ انسانی کی کار ستانیاں   نوک دُم بھاگا سمندر ہٹ گیا کوہِ گراں
خوش نما گھاٹ آج ہے کل تھی کوئی گھاٹی جہاں
کوہ کی چوٹی دہیں تھی اب ہے چوپاٹی جہاں

ان مثالوں کے پیش کرنے کا مدعا یہ تھا کہ آپ صفی کی محاکاتی شاعری کا کچھ اندازہ کر سکیں ان کی قوتِ بیان اور تسلسل کا پورا مظاہرہ تو جب ہو سکتا ہے جب ان کی نظمیں پوری پوری سامنے ہوں اس وقت اندازہ ہوتا ہے کہ بیانیہ نظموں میں ان کی فن کاری کتنی ابھر آتی ہے ۔ ان خشک موضوعات کو بھی وہ صرف تشبیہ اور استعارے کی چاشنی دے کر دل کش بنانے کے قائل ہیں۔ حقیقت و منظر نگاری کو کم سے کم الفاظ میں ایک تسلسل کے ساتھ پیش کر کے پڑھنے والوں کے دل و دماغ کو موضوع سے ہم آہنگ کر دینا ان کا خاص کارنامہ ہے جس کی مثال دورِ حاضر میں کم ملتی ہے ۔

شہروں کے بیان ہی کے ضمن میں یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تاریخی معلومات عام شعرا سے کہیں زیادہ تھی ۔ یہ تو میں نہیں کہنا چاہتا کہ وہ فنِ تاریخ کے ماہر تھے اور اچھا ہی ہوا کہ وہ ماہر نہ تھے اس لئے کہ اس صورت میں تاریخ کی تفصیلات اور تنقید میں الجھ کر شعر سے بے پروا ہو جاتے نتیجہ یہ ہوتا کہ چاہے اس شہر کی تاریخ اچھی خاصی تیار ہو جاتی مگر ہماری شاعری تاریخی عنصر سے بیگانہ ہی رہتی یا کم از کم اتنے حسن سے یہ چیز ادب میں نہ آتی ۔ جن تاریخی اشاروں سے صفی نے کام لیا ۔ وہ عموماً تاریخ کے اہم نقطے ہیں جن میں اکثر اپنے زمانے میں زندگی کا موڑ بن گئے ہیں یا ایسی اہمیت اختیار کر چکے ہیں کہ ان سے چشم پوشی کرنا کسی طرح مناسب نہیں ۔ صفی کا کمال یہ ہے کہ ان کڑیوں کے ملانے میں پوری صناعی اور احتیاط سے کام لیتے ہیں ان کو پورا احساس ہے کہ ادبی لحاظ سے یہ موضوع بہت ہی خشک ہے ۔ شعر سننے والے ان باتوں سے جلد ہی اکتا جائیں گے اس لئے کہ وہ نہایت اختصار سے کام لیتے ہیں بے کار الفاظ یا بے محل اور غیر ضروری اجزا مشکل سے نظم کرتے ہیں ۔ متانت اور شعریت سے سامعین کو اس کے معرکے میں بھی اپنی طرف متوجہ رکھتے ہیں ۔ ایک مصرعہ دوسرے مصرعے سے وابستہ ہوتا ہے اور اتنا کہ ذہن کو ہر وقت توجہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تشبیہ و استعارات کے ساتھ واقعات کا امتزاج دل و دماغ دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور اس خصوصیت کی ایک نمایاں مثال صفی کی اس نظم میں بھی ملتی ہے جو ۱۹۳۳ء میں دہلی کے متعلق کہی گئی

ہیں - چند بند ملاحظہ ہوں۔ شروع میں بتاتے ہیں کہ دلی کا نام ہستنا پور اور اندرپرست تھا پانڈوؤں کی عملداری تھی کوروں کو جا بھارت میں شکست ہوئی لیکن

عہد نا معلوم کے لیکن ہیں یہ سب واقعات　　درج ہیں تاریخ میں جو سنئے وہ اب واقعات
تین صدیاں قبل میلادِ مسیح خوش سیر　　تابع قنوج تھا یہ خطۂ نزہت اثر
دہلو اک راجہ وہاں گزرا ہے باصد کروفر　　نام رکھا اس نے اس بستی کا اپنے نام پہ

تھا جو اندرپت وہ دہلو ہو گیا مشہور عام
بن گیا دہلو سے پھر دہلی تغیر پا کے نام

اس کے بعد چوہان خاندان اور قطب الدین وغیرہ کا تذکرہ کر کے سلسلہ بہ سلسلہ عہد مغلیہ تک ان حکمرانوں کا تذکرہ کیا ہے جو قابل ذکر تھے اس کے بعد دہلی کی خاص خاص عمارتیں ان کی صفت - ان کی اہمیت کا بیان نہایت ہی دلفریب انداز میں پیش کیا ہے۔ غالباً شہروں کے بیان اور تفصیل میں یہ نظم سب سے زیادہ طولانی ہے - اور شاید اس سے بہتر کوئی نظم "لخت جگر" میں نہ ہو -

صفی نے زیادہ تر اپنی نظمیں مسدس کی شکل میں پیش کیں "لخت جگر" میں تو کوئی اور شکل نہیں ملتی ممکن ہے کہیں اور ہو تو ہو۔ شاید کہنے کے لئے کوئی کہدے کہ ہمیشہ اسی طرز میں کہتے رہنا جدت کی کمی کا پتہ دیتا ہے - انہوں نے کسی اور شکل میں نظمیں کیوں نہ کہیں۔ ممکن ہے یکسانی کا احساس ان کی نظموں کی شکل سے پیدا ہو جائے لیکن کسی صورت سے یہ نکتہ چینی الزام کی صورت نہیں اختیار کر سکتی۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے مسدس کو اپنے کمال سے اتنا ہر دل عزیز و کارآمد ثابت بنا دیا تھا کہ طولانی نظموں کے لئے اس سے بہتر کوئی اور شکل نہ تھی۔ صفیؔ ہی پر کیا موقوف ہے حالیؔ، اقبالؔ، چکبستؔ سب ہی نے ابتدا میں بلکہ زیادہ تر اپنے خیالات کا اظہار اسی مسدس ہی میں کیا اور اسی سے ہر وہ کام لیا جو آج جوشؔ، مجازؔ وغیرہ کسی اور شکل سے لیتے ہیں۔ اظہار مطالب و جذبات نہایت کامیابی اور آسانی سے وہ اس شکل میں کر لیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں آپ کو ہر جذبے اور ہر خیال کا عکس مل جائے گا اور کبھی یہ نہ محسوس ہو گا کہ نظم کی شکل کی وجہ سے وہ ناکامیاب ہو گئے۔ وہ مسدس کے تمام لوازم سے واقف تھے - اس کی ٹکنیک، کا پورا پورا نباہ کرتے تھے - اور اس میں اپنا انفرادی رنگ بھی پیدا کرتے تھے اور سچ پوچھئے تو ان کے بیان اور زبان کے لئے اس سے بہتر کوئی شکل ان کی نظموں کی ہو بھی نہ سکتی تھی۔ شعر کہتے وقت وہ دریا کی طرح بہتے چلے جاتے تھے - ان کے خیالات الفاظ میں آنے کے لئے بے چین رہتے تھے - ان کے یہاں آپ کو ان طولانی نظموں میں بھی خیال کی تکرار نہ ملے گی - ان کا مقصد سمجھا بوجھا ہوتا' کیا کہنا ہے اور کیا سوچنا ہے اس کا سوال ہی نہ تھا شیعوں کی ضروریات' مکان و شہر کے حالات و بیانات ہر وقت ان کے زیر مطالعہ رہتے۔ خیالات کی کمی نہ تھی - اگر دقت تھی تو اس کی کہ کیا کہا جائے اور کیا چھوڑا جائے - ایسی صورت میں شاعرانہ صلاحیتوں کے لئے مسدس سے زیادہ کون سی صنف شاعری بہتر ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس شکل میں تسلسل بیان کو ایک ہی طرح کے چار مصرعے ملتے ہیں اور پھر انجام پر پہنچنے کے لئے دو مصرعے بیت کے یعنی ایک ہی بند میں چھ مصرعے ایک خیال کو قلم بند کرنے کے لئے بہت کافی اور مناسب تھے -

شاعری میں زبان و بیان کے لئے موضوع کا دیکھنا ضروری ہوتا ہے بحر' الفاظ' انداز بیان سب کچھ اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ اگر مضمون یا موضوع فلسفیانہ ہے تو اس کے لئے الفاظ و لہجہ بھی بلند تر ہونا چاہیئے لیکن اگر محاکاتی' تاریخی یا رومانی ہے تو زیادہ تر نرم الفاظ اور سیدھی سادی زبان زیادہ کارگر ہے۔ صفی صاحب کے پیش نظر کچھ تاریخی باتیں تھیں کچھ درد دل سنانا تھا اور کبھی کبھی نصیحت یا اپنی قوم کی نکتہ چینی کرنا تھا - اس لئے انہوں نے نہایت سوچ سمجھ کر زبان و بیان اپنی نظموں میں اختیار کیا ان کا لب و لہجہ' الفاظ و طرز بیان سے اتنا ہم آہنگ ہے کہ مقصد پوری طرح سے دل کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے - اور زبان کی پاکیزگی استعارے میں ایسی روانی پیدا کر دیتی ہے - کہ معلوم ہوتا ہے دریا پہاڑ سے اتر کر میدان میں آ رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ تمام شاعرانہ لطافتوں کو بھی لا رہا ہے۔

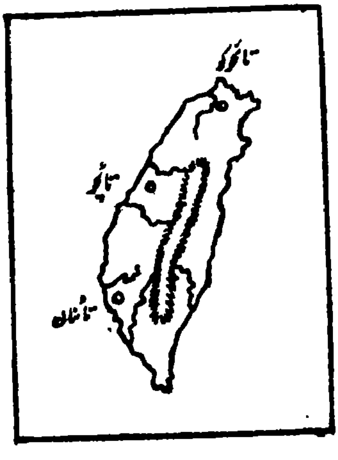
"لخت جگر" میں آپ کو نکتہ چینیوں اور نصیحتوں کا انبار نظر آئے گا اپنی قوم کو راہ راست پر لانے کے لئے انہوں نے نصیحت فضیحت دونوں حربے استعمال کئے' سمجھایا بھی ہے اور ڈانٹا بھی' طنز بھی کیا ہے اور ماتم بھی۔ لیکن ہر عنصر اپنی جگہ پر ان کے مقصد و تجویز کو دل نشین کرتا رہتا ہے۔

اسرار احمد آزاد

فارموسا

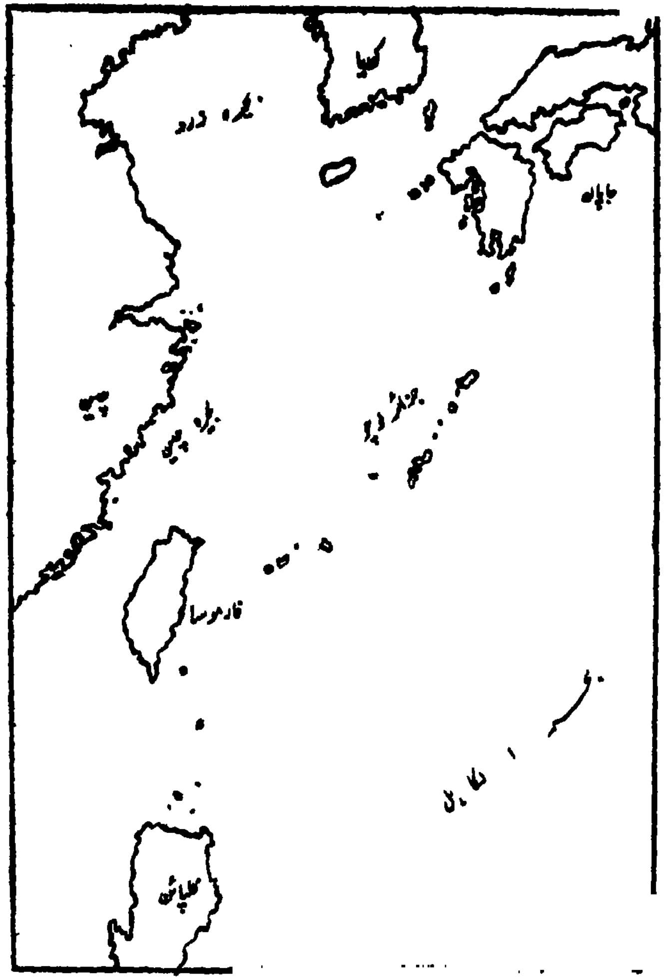
آج مشرقِ بعید کے جن مسائل پر مشرق اور مغرب کے مابین شدید ترین اختلافات موجود ہیں یا رونما ہوتے جا رہے ہیں ان میں فارموسا کا معاملہ بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ بحرالکاہل کا یہ جزیرہ بین الاقوامی امن کے جسم پر الگ ناسور بن گیا ہے اور فارموسا سے متعلق رونما ہونے والے تازہ ترین حالات کے پیش نظر یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں یہی معاملہ تیسری عالم گیر جنگ کا موجب نہ بن جائے

فارموسا جسے "تائیوان" کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے بحرالکاہل کا ایک جزیرہ ہے اس کے شمال میں جاپان اور جنوب میں فلپائن واقع ہے اور ایک سو میلس کیلومیٹر سے تین سو کیلومیٹر تک عریض ایک آبنائے اسے چین کے جنوبی ساحل سے علٰحدہ کرتی ہے۔ فارموسا کے ساتھ اس کے مغرب میں واقع چند چھوٹے چھوٹے جزائر کا مجموعہ بھی جنہیں جزائر پیسکا ڈورکز کہا جاتا ہے شامل ہے۔ فارموسا کا رقبہ ۱۳۸۴۰ مربع میل ہے اور ان جزائر کا مجموعی رقبہ صرف ۵۰ مربع میل۔ اور فارموسا میں ۶۵ لاکھ افراد آباد ہیں۔ فارموسا مدت دراز تک کافور کا جزیرہ بھی کہلاتا رہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کو جس قدر کافور مہیا کیا جاتا ہے اس کی بیشتر مقدار فارموسا ہی سے حاصل کی جاتی ہے اور اس کی زرخیزی کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے اس پر جاپان کا تسلط قائم ہونے سے پیشتر اسے چین کے غلہ کا گودام بھی کہا جاتا تھا۔ فارموسا معدنی دولت کے اعتبار سے بھی مشرق اور مغرب کی استعماری قوموں کے لئے تحریص اور ترغیب کا مرکز بنا رہا ہے۔ وہاں کوئلہ، تیل سونے اور گرافائٹ



ایسی مفید اور قیمتی دھاتیں موجود ہیں۔ فارموسا میں زرعی اعتبار سے چاول، شکرقندی، جائے، تمباکو، مونگ پھلی، نارنگی اور کیلہ بکثرت پیدا ہوتا ہے زراعت کے علاوہ وہاں کے باشندے مویشی بھی پالتے ہیں لیکن مصنوعی ریشم بنانے کا پیشہ عام ہے۔ جاپان کے قبضہ کے دوران میں فارموسا میں شکرسازی اور پھلوں کو محفوظ کرنے کی صنعتوں نے بھی ترقی کی تھی۔ لیکن دوسری عالم گیر جنگ کے بعد اس جزیرے کی اقتصادی حالت خراب ہو گئی ہے اس کے زرخیز میدان فوجی چھاونیاں بن کر رہ گئے ہیں

اس جزیرے کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تاریخی، اقتصادی اور تہذیبی اعتبار سے چین کا ایک حصہ ہے اور مذہبی اعتبار سے بھی وہاں کے باشندوں کی زبردست اکثریت چین ہی کی طرح شنٹو مذہب بودھ مذہب اور مسیحیت کی پیرو ہے۔ چینی پہلی دفعہ پندرھویں صدی عیسوی میں فارموسا جا کر آباد ہونے شروع ہوئے تھے اور آج بھی وہاں کی بیشتر آبادی چین کے صوبہ جات فوکیان اور کوانگ تنگ کے باشندوں پر مشتمل ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک فارموسا چینی سلطنت کا ایک جزو بنا رہا لیکن چین اور جاپان کے درمیان ۹۵-۱۸۹۴ء میں برپا ہونے والی جنگ میں چین کی شکست کے بعد ایک معاہدہ کی رو سے یہ جزیرہ اور اس کے ساتھ جزائر پیسکا ڈورز جاپان کے قبضہ میں چلے گئے اور دوسری عالم گیر جنگ کے خاتمہ تک جاپان ہی ان پر قابض رہا مگر وہاں کے باشندے جاپان کی مستعمرانہ دست درازیوں کے باعث ہمیشہ غیر مطمئن ہی رہے اور اس



نصف صدی کی مدّت میں انہوں نے متعدد بار حصولِ حریت کی مسلح جد و جہد بھی شروع کی۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۵ء تک اور اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں فارموسا کے باشندوں نے جاپانیوں سے اپنے ملک کو آزاد کرانے کی جو جد و جہد کی تھی اگرچہ وہ کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس سے یہ بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ فارموسا کے باشندے ابتدا ہی سے اپنے وطن پر جاپان کے تسلط اور اقتدار کے مخالف تھے۔ آج مارشل چیانگ کائی شیک اور نیشنلسٹ چین کے رہنما اس جزیرہ پر حکمراں ہیں لیکن فروری ۱۹۴۷ء میں فارموسا کے باشندوں نے ان کی حکومت کے خلاف بھی زبردست بغاوت برپا کی تھی اور اسے فرو کرنے کے لئے موصوف کو فوج کے علاوہ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے بھی کام لینا پڑا تھا اور اس ہنگامہ میں دس ہزار سے زیادہ شہری ہلاک ہوئے تھے۔

دنیا کے کسی ملک یا مقام کی سیاسی اور عسکری اہمیت اس کے معدنی اور اقتصادی وسائل نیز اس کے محل وقوع پر منحصر ہوا کرتی ہے اور حسن اتفاق سے فارموسا اپنے اقتصادی وسائل کی وسعت کے علاوہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک جزیرہ ہونے کے باعث ایک طرف تو کوئی مضبوط بحری بیڑہ نہایت آسانی کے ساتھ اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اور دوسری طرف یہاں سے چین، جاپان، سوویٹ روس کے مشرقی اور جنوبی مشرقی علاقوں کوریا، ہند چینی اور ملایا پر ہوائی حملے بھی کئے جا سکتے ہیں اور اس کی یہی خصوصیات آج اسے کمیونسٹ چین اور امریکہ کے مابین اختلاف اور نزاع کا مرکزی نقطہ بنائے ہوئے ہے۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ دوسری عالم گیر جنگ اور اس کے بعد خانہ جنگی کے دوران میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے نہایت کشادہ دلی کے ساتھ کومن ٹانگ کی حکومت کی امداد کی تھی اور خانہ جنگی میں نیشنلسٹ حکومت کی شکست کے بعد بعض بے باک اخبارات اور مدبرین نے اس نے اس شکست کو چین میں امریکی ڈپلومیسی کی شکست سے تعبیر کیا تھا لیکن اس کے باوجود امریکہ آج بھی ارض چین میں شکست خوردہ

نیشنلسٹ حکومت کا حامی اور معاون ہے اور اس کی وجہ صرف فارموسا کی فوجی اور سیاسی اہمیت ہے۔ کیونکہ اگر آج امریکہ چین کی کمیونسٹ حکومت کو وہاں کی جائز اور قانونی حکومت تسلیم کرلے تو پھر وہ فارموسا پر کمیونسٹ چین کے اقتدار کو تسلیم کرنے پر بھی مجبور ہے اور اس کے بعد ایک طرف تو وہ اس جزیرہ کے قدرتی اور معدنی وسائل سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکے گا اور دوسری طرف مشرق بعید میں اس کے تمام مقبوضات اور مفادات بھی خطرہ میں پڑ جائیں گے۔

کوریا کی جنگ شروع ہونے کے بعد فارموسا پر کمیونسٹ چین کے حملے کے اندیشہ سے امریکہ نے اپنا ساتواں بحری بیڑہ فارموسا کی حفاظت کے لئے متعین کر دیا تھا اور کمیونسٹ چین اس کے اس اقدام کو چین کے خلاف جارحانہ اقدام قرار دے رہا ہے اور یہ معاملہ مجلس تحفظ میں بھی پہنچ چکا ہے لیکن ابھی اس پر غور نہیں کیا جا سکا۔

حقیقت یہ ہے کہ کوریا کی جنگ میں چین کی شرکت نے فارموسا کے مسئلہ کو الجھا دیا ہے اور اب کوریا کی جنگ سے دست کشی کے لئے چین نے یہ شرط بھی رکھی ہے کہ فارموسا کی حفاظت پر متمکن امریکی بیڑہ کو واپس بلا لیا جائے لیکن اگر مجلس تحفظ ابتدا ہی میں ہندوستان کے مشورہ کے مطابق اپنی افواج کو اڑتیسویں خط متوازی کو عبور کرنے کی اجازت نہ دیتی تو فارموسا کے مسئلہ کو علیحدہ حل کیا جا سکتا تھا۔

بہرحال فارموسا کی موجودہ صورت حالات یہ ہے کہ ایک طرف تو امریکہ اسے اپنے دفاعی استحکامات کا مرکزی نقطہ تصور کرتا ہے اور دوسری طرف چین کی کمیونسٹ حکومت اسے چین کا جزو سمجھ کر اسے چین کے ساتھ وابستہ کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی فریق بھی اپنی جگہ سے جنبش کرنے کے لئے تیار نہیں اور یہی وہ اختلاف ہے جس نے مشرق بعید کے اس چھوٹے سے گمنام جزیرہ کے مستقبل کو عالمی سیاست کا ایک پیچیدہ ترین مسئلہ بنا دیا ہے۔

زرعی کھوج کی درسگاہ

راشٹرپتی کی تقریر کا اقتباس

زرعی کھوج کی بھارتی کونسل کی مجلس انتظامیہ اور زرعی تحقیق کی درسگاہ کے کانووکیشن کے مشترکہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کہا کہ اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت ملک کی زرعی ترقی ہے۔ انہوں نے کہا یہ بات باعث شرم ہے کہ ایک زرعی ملک ہوتے ہوئے آجکل ہم اپنی خوراک کے لئے دوسروں کے محتاج ہیں۔ بھارت میں اس وقت صرف اناج کی ہی کمی نہیں بلکہ دودھ، پھل اور ضروریات باغبانی کے ضمن میں بھی ہماری حالت کچھ تسلی بخش نہیں ہے۔ اس لئے یہ عین ضروری ہے کہ زرعی تحقیق کی درسگاہ میں ایسی تحقیقات کی جائے جس سے بھارتی کسان کی حیثیت اور پسند کے مطابق اصلاح زراعت کی تدبیریں معلوم کی جائیں۔ یہ تدبیریں بھارتی حالات کے مطابق ہونی چاہئیں۔ اور ضلع وار نمائشی کھیتوں کے ذریعہ فوراً کسان تک پہنچائی جانی چاہئیں۔ ان تدبیروں اور طریقوں سے کسان کو روشناس کرنے سے پیشتر سائنسدانوں اور محققوں کو یہ امر ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ ہمارے زرعی ملک میں بیشتر تعداد ایسے زراعت پیشہ لوگوں کی ہے جن کے پاس تھوڑے سے رقبہ کی اراضی ہے۔ ان کے لئے تو آسان اور کم خرچ طریقے ہی موزوں ہوں گے۔ نئے طریقے پیش کرنے سے پیشتر ملک کے مختلف زرعی حالات کو بھی پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ کھیتی باڑی کے طریقوں کے علاوہ ہمارے ملک کے مختلف حصوں میں مختلف موسمی حالات کی وجہ سے مویشی بھی طرح طرح کے ہیں۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کہا کہ بھارت کا کسان اپنی عادتیں اور طریقے بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اسے نئے طریقوں کے فائدوں کا اطمینان دلا دیا جائے اور یہ کام علاقہ وار نمائشی کھیتوں کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔

کنیا مہا ودیالہ جالندھر

(تصاویر ۳۰۔۳۱ صفحوں پر ملاحظہ فرمائیے)

سماجی اصلاح اور تعلیم نسواں کے سلسلے میں شمالی ہندوستان کی درسگاہوں میں کنیا مہا ودیالیہ جالندھر کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ ۱۸۸۶ء میں ناگری اسکول کے نام سے یہ درس گاہ قائم ہوئی۔ دنیا میں جتنے بھی بڑے کام انجام دئے جاتے ہیں اُن کا آغاز نہایت معمولی اور سادہ ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ شروع میں اس اسکول میں صرف تین طالبات تھیں۔ ایک روپیہ ماہوار اس کے اخراجات کے لئے آریہ سماج جالندھر نے منظور کیا تھا۔ ۱۸۹۱ء میں اس اسکول کا نام کنیا مہا ودیالہ ہو گیا۔ ۱۹۰۲ء میں ۵۵ طالبات زیرِ تعلیم تھیں۔ آج یہ درسگاہ پنجاب میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے اپنے ڈھنگ کی ایک ہی درس گاہ ہے۔

اس کی عمارت شہر سے باہر کھلی ہوا میں ۱۳۵ ایکڑ زمین میں پھیلی ہوئی ہے۔ طالبات کے کھیلنے اور گھومنے کے لئے چار دیواری کے اندر ہی کھلے میدان اور لمبی سڑکیں ہیں۔

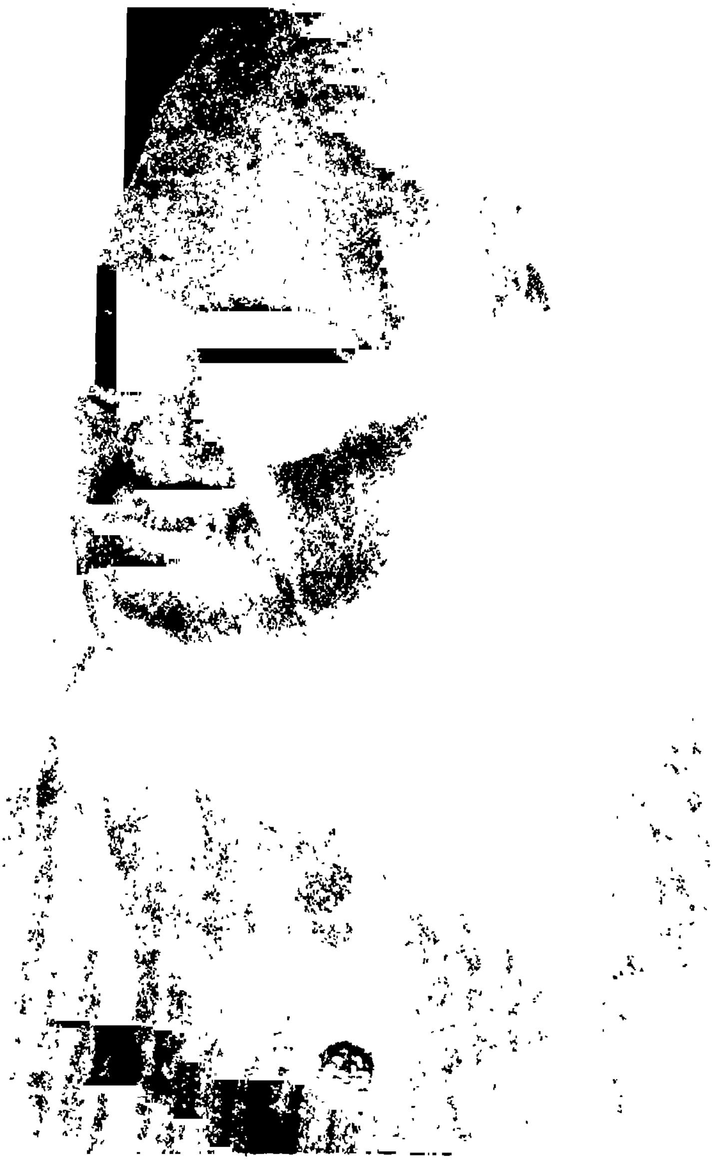
صحیح قوم پرستی اور حب الوطنی کی تعلیم دینے میں یہ درسگاہ پیش پیش رہی ہے۔ ۱۹۴۹ء کی رپورٹ کے مطابق آٹھویں جماعت سے لے کر بی اے تک کل ۷۰۵ طالبات زیرِ تعلیم تھیں جن میں زیادہ تر آشرم ہی میں قیام کرتی تھیں۔ ہندوستان کے ہر صوبے سے طالبات حصولِ تعلیم کی غرض سے اس درسگاہ میں داخل ہوتی رہی ہیں۔ بلکہ فجی، افریقہ اور ترکستان کے علاقوں سے آکر بھی طالبات نے یہاں تعلیم حاصل کی ہے

ماہ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں پنجاب کے تعلیمات کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ڈیکسی کھنہ نے کانووکیشن ایڈریس پڑھا۔ اس کا مختصر اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"کنیا مہا ودیالہ جالندھر اپنی تاریخ اور تعلیم نسواں کے میدان میں اپنی کامیابی پر بجا طور سے فخر کر سکتا ہے۔ اس عظیم درسگاہ کی بنیاد رکھنے والوں کی دُور بینی کا ہمیں شکر گزار ہونا چاہیئے۔ یہاں کی فارغ التحصیل طالبات کی زندگیاں ان اونچے اصول کی آئینہ دار ہیں جو اس درس گاہ کے قائم کرنے والوں کے پیشِ نظر تھے اور جنہیں اس کے اراکین نے ہمیشہ اپنایا ہے۔ ان طالبات نے قوم و ملک کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ اس درسگاہ میں ہم نے قدیم و جدید کا ایک حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ جہاں ہم نے پُرانی تہذیب و تمدن کو اس ودیالیہ میں بڑی خوش اسلوبی سے تازہ رکھنے کی کوشش کی ہے وہاں ہم نے زندگی کو مکمل اور متمدن بنانے کی غرض سے جدید عصری نوازشات کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا۔ اس طریق سے ہم نے ترقی یافتہ زندگی کا سا دیا لیا ہے۔

مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ اس ودیالہ سے تعلیم حاصل کرنے والی تمام طالبات نے بالعموم اور حال ہی میں فارغ التحصیل ہونے والی طالبات نے بالخصوص یہاں کی تعلیم و تربیت سے پورا فائدہ اُٹھایا ہے اور جب وہ آئندہ زندگی میں اپنے فرائض کو سنبھالیں گی تو انہیں اس بات کا احساس ہوگا کہ جو کچھ انہوں نے یہاں سیکھا ہے اُس کی کیا قدر و قیمت ہے۔ اگر واقعی انہوں نے حق و راستی پر قائم رہنا سیکھ لیا ہے تو یقیناً وہ سماج کی رہبری میں مددگار ثابت ہوں گی زندگی ایک مسلسل جد و جہد اور کشمکش کا نام ہے۔ بہت سی باتوں میں ہمارا دوسروں اور دوسروں کا ہم سے اختلاف رہتا ہے لیکن جسے حق و راستی کی سچی تمنا ہے وہ کبھی اپنے خیالوں کو قطعی اور آخری حقیقت کا درجہ نہیں دیتا بلکہ جہاں سے بھی مل سکے روشنی لینے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھنے سے اس قوتِ برداشت کے جوہر حاصل ہوتے ہیں جن کی اس ہنگامہ خیز دنیا میں سخت ضرورت ہے۔ قدیم تاریخ ہند کے ایک عام طالب علم کی حیثیت سے میرا یہ یقین ہے کہ کچھ معمولی خامیوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہمارے بزرگوں نے تلاشِ حق کی کوشش میں قوتِ برداشت کے راز کو پا لیا تھا اور اس راز کی حقیقت کو دنیا بھر سے زیادہ واضح طور پر جاننے کے لئے وہ ایک دوسرے سے پورا تعاون کرتے تھے

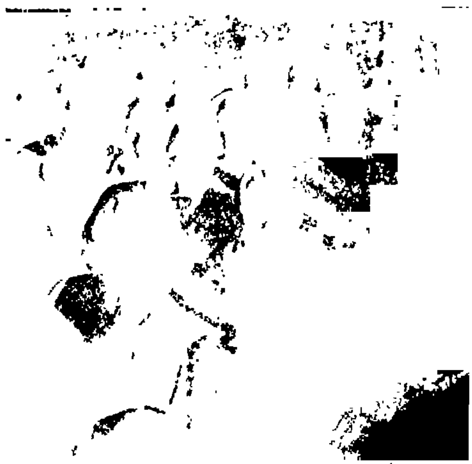
مجھے یہ جاننے میں تامل ہے کہ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے بھی ہم سچائی اور قوتِ برداشت کو ایک ساتھ قائم رکھنے کی طاقت اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں اس درس گاہ کی خدمات بیش بہا ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ جو طالبات فارغ التحصیل ہو کر جا رہی ہیں وہ نہ یہ کہ خود ہی سچائی اور نرم مزاجی کو اپنائیں گی بلکہ ان لوگوں کو بھی اس راز سے آگاہ کریں گی جن کو اس درس گاہ کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔"



سہاب اکبرآبادی

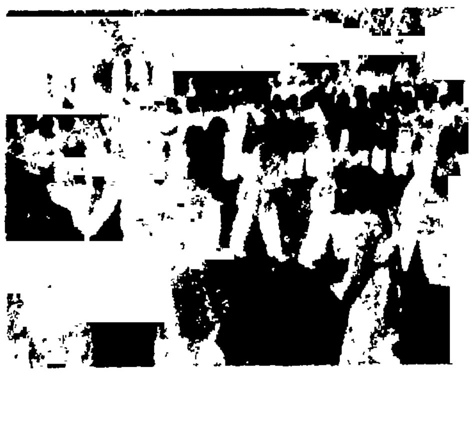


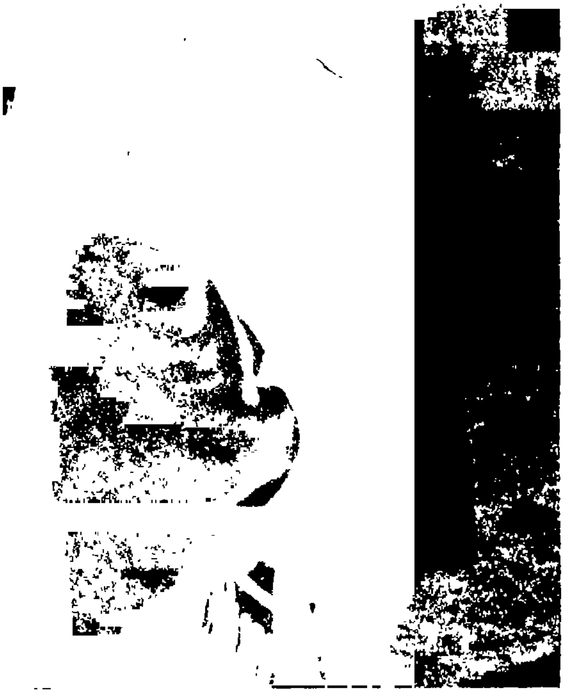
سی. کهنه ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب کنیا مہاودیالیہ
جالندھر کی فارغ التحصیل طالبات کے ساتھ



لیڈی تریودی نائش کی طالبات کے ساتھ

طالبات کھیل کے میدان میں





آنریبل ڈاکٹر گوپی چند بھارگو چیف منسٹر پنجاب
کنیا مہاودیالیہ جالندھر کی پرنسپل کماری لجاوتی کے ساتھ

کھیل کے میدان کا ایک اور رخ - طالبات گولہ پھینک رہی ہیں





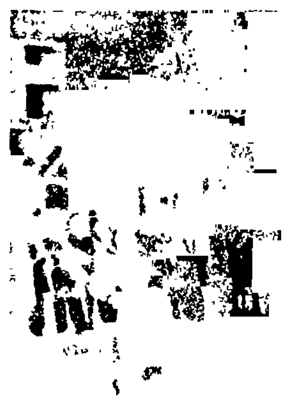
اودیالیہ کے کھیل کے میدان
کے چار مختلف پہلو

رس گاہ میں جہاں طالبات کو کتابی
کے زیور سے آراستہ کیا جاتا ہے وہاں
جسمانی صحت کا بھی پورا خیال
اتا ہے - کھیل کے میدان کی ان
ب تصاویر سے یہ ظاہر ہے کہ کھیل کو
رس گاہ میں کس قدر اہمیت دی
ہے



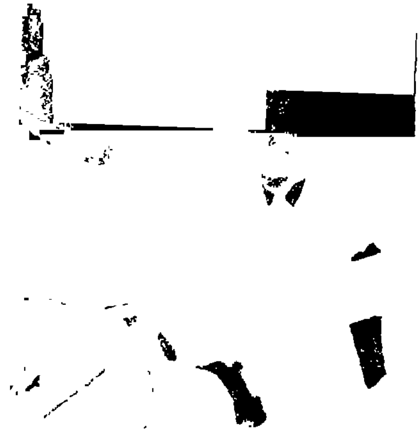






پیرس میں شري جواهر لال نهرو روسي سفیر مقیم فرانس کے ساتھ





پیرس میں شري جواهر لال نهرو هزایکسیلینسي
ایم. اینگ جوزف رون کالي ڈین آف ڈپلومیٹک کور
کے ساتھ گفتگو کر رہے ہوں

نیروبي میں حال هي میں مسلم نرسري کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس
تقریب میں بھارتي هائي کمشنر شري اے. بي. پنت نے بھي شرکت
کي۔ اس تصویر میں شري پنت پرنسیس علي خان سے بات چیت
کر رہے ہیں





عدن میں هندوستاني ري پبلک کي پهلي سالگرہ

دائیں سے بائیں – مسٹر بھٹ وائس پریزیڈنٹ
انڈین ایسوسي ایشن، مسٹر اے.بي. تھڈاني عدن
میں هندوستاني کمشنر اور مسز تھڈاني قومي
ترانہ گائے جانے کے دوران میں خاموشي سے کھڑے ہیں

فراق گورکھپوری

بادۂ کہن

دل کی جانب دیکھ کر کل دیر تک للچائیاں
میں نے جب دیکھا تو وہ آنکھیں بہت شرمائیاں

کہہ رہا تھا عشق کی رودادِ غم ہنس ہنس کے میں
نام جب آیا ترا آنکھیں مری بھر آئیاں

آپ اپنے سے اُلجھ کر رہ گیا میں ہم نفس
گتھیاں جذبِ نہاں کی جب بہت سلجھائیاں

لہلہا اٹھے طلوعِ مہر سے جیسے فضا
دل میں تو آیا کہ گلشن میں بہاریں آئیاں

چند کلیوں پر چمن میں آ چلا تھا رنگ سا
آج تیری شوخیاں اکثر مجھے یاد آئیاں

کچھ نہ کچھ تو جی میں ٹھانی ہے مگر یہ سوچ ہے
وہ نگاہیں بھی اگر سُن گُن کہیں کچھ پائیاں

پردے پردے میں ہزاروں وارداتیں ہو گئیں
آہ کیا کیا تیرہ بختوں نے بھی راتیں پائیاں

بجلیاں کوندیں گھٹائیں چھا گئیں ہوش اُڑ گئے
وہ شرابیں نرگسِ سرشار نے چھلکائیاں

درد نے بھی کروٹیں بدلیں دلِ ناکام میں
ہجر میں جب رات کی زلفیں ذرا لہرائیاں

نیم خوابی کچھ فضلئے غم کی گہری ہو گئی
چرخ پر تاروں نے جب پلکیں ذرا جھپکائیاں

وجہِ آغازِ محبت جو ہوئی تھیں ایک دن
آج تیری وہ ادائیں دیر تک یاد آئیاں

یوں تو تقدیرِ محبت میں تھی مرگِ بیکسی
آج سنتے ہیں وہ آنکھیں دیر تک پچھتائیاں

دیکھنا ہے ہم کو اس ترکِ محبت کا مآل
آئیں ہیں خبریں کہ اہلِ غم نے قسمیں کھائیاں

اس جہانِ اجنبی کا کچھ نہ کچھ اندازہ ملا
وحشتیں دل کی جب ان آنکھوں نے کچھ پرچائیاں[1]

عشق سَو سَو طرح سوگندِ وفا کھاتا رہا
مشکلوں سے آج وہ آنکھیں مگر پتیائیاں[2]

داستانِ عشق بھی بے ربط سی ہونے لگی
حسن کو انگڑائیوں پر آئیں جب انگڑائیاں

ہم سمجھتے تھے اب اس کا یاد آنا ہے محال
آج پلکوں کو مگر نم اور ملائم پائیاں

اے نسیمِ صبح تو نم دیدہ گزری باغ سے
ہاں وہ کلیاں یاد ہیں جو بن کھلے مرجھائیاں

رونے والو احترامِ غم بہت دشوار ہے
یوں تو آنکھیں ہیں تعجب کیا اگر بھر آئیاں

لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کا بدلنا ہے محال
عشق کہتا ہے کہ اس جینے سے تو مرجائیاں

دیکھیاں گر کچھ یہاں تو آنکھ والوں نے فراق
پائیاں گر کچھ یہاں تو اہلِ دل نے پائیاں

---

[1] پرچانا یعنی مانوس کرنا ہلا بلا لینا۔

[2] پتیانا یعنی یقین کرنا

کانووکیشن ایڈریس

جو سر مرزا اسمٰعیل نے ۴ فروری ۱۹۵۱ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا

مسٹر وائس چانسلر، یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ

معزز خواتین اور حضرات

آج اس عظیم یونیورسٹی میں آکر میں اپنی ایک دیرینہ تمنا پوری کر رہا ہوں۔ میں وائس چانسلر کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے آپ حضرات سے مخاطب ہونے کی دعوت دی ہے۔ اس یونیورسٹی کے مقاصد بہت بلند ہیں اس قدر بلند کہ جب تک متعدد نسلیں مسلسل کوشش میں مصروف نہ رہیں وہ مقاصد حاصل ہی نہیں کئے جا سکتے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس یونیورسٹی کا مطلب ایک ایسی فرقہ وارانہ یونیورسٹی نہیں ہے جو نوجوانوں کی حدِ نگاہ کو محدود کر دے اور اس طرح نظر کو جسے زندگی کے کشادہ جادے پر چلنا ہو فرقہ داری کے تنگ و تاریک راستوں پر لے جائے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آنے والے دور میں "مسلم یونیورسٹی" کس اعتبار سے مسلم اور کس اعتبار سے یونیورسٹی ہوگی۔ کیا لفظ "مسلم" اور یونیورسٹی ایک دوسرے کے متضاد الفاظ ہیں؟ اس سوال کا صحیح حل جاننے کے لئے ہمیں ایک نئی گرامر وضع کرنا ہوگی جس میں اسم صفت پوری طرح اسم کے تابع ہو۔ میری رائے میں کسی یونیورسٹی کی فرقہ وارانہ بنیادوں پر ماحول سے علیحدگی اور تنہائی یونیورسٹی کے بنیادی تصوّر کے منافی ہے۔

جہاں تک علی گڑھ یونیورسٹی کا تعلق ہے اس کے سامنے مقصد یہ ہونا چاہئے کہ یہ سچائی کا مرکز ہو، نیکیوں کا گھر ہو، اور علم اور ایمان کو ہر اعتبار سے ترقی دے۔ اس یونیورسٹی کے پیش نظر صرف یہی معیار نہ ہو کہ اسے عالم پیدا کرنے ہیں بلکہ یہ معیار بھی ہو کہ اُسے بلند کردار کے نوجوان پیدا کرنے ہیں ایسے نوجوان جنہیں صحیح معنوں میں شریف کہا جا سکے۔ اگر ایک شخص ذہین ہو اور قابل اعتماد نہ ہو، ہوشیار ہو اور اس کے قول، فعل اور حال میں دیانت داری نہ ہو تو ایسا شخص کسی کام کا نہیں۔ انسان کی یہ دو خاصیتیں۔ اس کا با اعتماد اور دیانتدار ہونا — ہر دور میں اچھے شہری کی خاصیتیں رہی ہیں۔ ہمارے ملک کے بدلے ہوئے حالات میں فرد کے کردار کی اہمیت پہلے سے کہیں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

. . . .

تقسیم ہند کا مسلمانوں پر براہِ راست یہ اثر پڑا ہے کہ ان کی پوزیشن ہندوستان میں بہت حد تک تبدیل ہو گئی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اپنے ملک میں اجنبی محسوس کرنے لگے ہیں۔ ان کے لئے ہندوستان کا ماحول بہت حد تک خوشگوار نہیں رہا۔ یہی بات ہمارے نائب وزیر اعظم نے پچھلے دنوں پارلیمنٹ میں کہی تھی۔ اور یہ بات صحیح ہے۔ مستقبل کے متعلق مسلمانوں کی کیفیت غیر یقینی سی ہو گئی ہے۔ جب یہ حالت ہو تو کیا یہ ملک کے مفاد میں نہیں ہے کہ آبادی کے اتنے بڑے اور اہم حصے کے لئے ماحول کو سازگار بنایا جائے۔ مسلمان خود اپنے قول و فعل سے سازگار فضا پیدا کر سکتے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ اکثریت اور حکومت کے دل میں یہ یقین پیدا کر دیں کہ وہ ہر حال میں ملک کے وفادار رہیں گے انہیں اپنی مشکلات کو بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کرنا چاہئے۔ بردباری آج ان کے لئے ایک ضروری فرض کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ حالات میں بہتری رونما ہوگی۔ اس بہتری کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے ہیں اور وہ آثار ایک ایسے مستقبل کے آثار ہیں جو اتنا ہی تابناک ہے جو ہندوستان میں رہنے والی کسی بھی قوم کا ہو سکتا ہے۔ اکثریت کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اقلیت کو اس امر کا احساس دلائے کہ اس کے افراد کو برابر کا شہری سمجھا جاتا ہے اور اکثریت کو اقلیت کی مسرّت اور بہبود سے دلچسپی ہے۔ فراخ دلی اور بلند حوصلگی سیاست کی بہت بڑی خوبیاں ہیں۔

سب سے بڑی دانشمندی یہ ہے کہ ان دو خوبیوں کو عمل میں لایا جائے لیکن ہم ہندوستان میں ان کی اہمیت کو نظر انداز کر رہے ہیں ۔

ملک کے روشن خیال طبقے کے لئے یہ سوچنا بھی مشکل ہے کہ کل کا ہندوستان ایک خالص ہندو ہندوستان ہوگا ۔ آج جن لوگوں کے ہاتھ میں عنانِ اختیار ہے انھوں نے بھی اس بات کی تمنّا نہیں کی ۔ ہمارا عظیم اور نیک وزیر اعظم اپنی پوری کوششوں سے ایک ایسے نئے ہندوستان کی تعمیر میں مصروف ہے جس پر فرقہ داری اور مذہبی تعصب کی پرچھائیں بھی نہ پڑی ہو اسے ہر صحیح الخیال انسان کی طرح فرقہ داری اور مذہبی تعصب سے نفرت ہے ۔ آج اس سے بہتر شخصیت ہندوستان بھر میں موجود نہیں اور ہم مسلمان بجا طور پر اُسے اپنا لیڈر تسلیم کر سکتے ہیں وہ سب کا دوست اور خیر خواہ ہے ۔ ہندوستان کو اس وقت زاویۂ نگاہ میں وسعت اور اس قوت کی ضرورت ہے جو مختلف نسلوں مذاہب، صوبوں اور ریاستوں کے لوگوں کی متحدہ کوششوں سے پیدا ہو سکتی ہے ۔

مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے قابل مسلمان طلبہ کے سامنے ایک روشن مستقبل ہے اور یہ مقصد محض تحمل اور بردباری ہی سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے ایک دوسرے سے قریب تر رہنا بھی بہت لازمی ہے ۔ اس مقصد کے حصول کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ یہاں اور اس کے علاوہ ہر مقام پر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کریں اور باہمی تعاون سے زندگی کی شاہراہ پر چلیں ۔ یہ صحیح ہے کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں پر اس بات کا بہت حد تک دار و مدار ہے لیکن اس حصول مقصد کے لئے انفرادی طور پر بھی کسی کی کوششیں کم اہمیت نہیں رکھتیں ۔

. . . .

اعلےٰ تعلیم کے متعلق ہندوستان میں ایک مسلّمہ خیال یہ ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم میں روز بروز تنزّل واقع ہوتا جا رہا ہے ۔ اس کے کئی وجوہ ہیں ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسکولوں کا معیارِ تعلیم گر گیا ہے ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ طلبہ کی روز افزوں تعداد کے ساتھ ساتھ اسی تناسب سے کالجوں، یونیورسٹیوں اور اساتذہ کی تعداد میں اضافہ نہیں ہو رہا اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ طلبہ انفرادی توجہ سے محروم ہو گئے ہیں ۔ جہاں کہیں کالجوں کی تعداد میں اضافہ ہوا بھی ہے وہ ایسے کالج ہیں کہ ان میں تعلیم کا انتظام مکمل طور پر موجود نہیں۔

اس وقت یونیورسٹیوں کی توجہ گریجویٹوں کی تعداد بڑھانے پر صرف ہو رہی ہے اس بات پر نہیں کہ وہ ایک بلند معیار کے گریجویٹ ہوں ۔ اگر یہ صورت حال جاری رہی تو اس کا نتیجہ طلبہ کے لئے بھی خراب ہوگا اور ملک کے لئے بھی ۔ ملک کو اس وقت رہنماؤں کی ضرورت ہے یونیورسٹی کا ایک بڑا مقصد رہنما پیدا کرنا بھی ہے مگر ہماری یونیورسٹیاں اس مقصد میں کامیاب ثابت نہیں ہو رہیں ۔

اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مختلف کمیشن کام کرتے ہیں اور اپنی رپورٹیں پیش کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود مرض کا صحیح حل نہیں مل رہا ۔

. . . .

اس سلسلے میں یونیورسٹی سوسائٹیوں پر ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ اس طرح کہ یونیورسٹی سوسائٹیوں کے زیر اہتمام بحث مباحثوں کے ذریعے سے مختلف الخیال گروہ ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں ۔ ان مباحثوں میں صرف چند ایک باشوق طلبہ ہی کو نہیں بلکہ ہر طالب علم کو حصہ لینا چاہئے ۔ ہر طالب علم کو باشوق ہونا چاہئے ۔ مصمّم ارادہ اور مضبوط کردار ایسی خوبیاں ہیں جو انسان کو کامیابی کی طرف لے جاتی ہیں ۔ اگر یونیورسٹی کے بعد کی زندگی کو ایک کامیاب زندگی بنانا ہے تو تعلیم میں جسمانی مضبوطی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ اور آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کی یونیورسٹی طلبہ کی جسمانی صحت کو اس قدر اہمیت دے رہی ہے ۔

اس یونیورسٹی میں سب سے قابل تعریف بات جو رونما ہوئی ہے وہ ہے ڈاکٹر ذاکر حسین کا وائس چانسلر کے طور پر تقرر ۔ تعلیم کے مسئلے پر جس قدر گہری نگاہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہے شاید ہی کسی اور کی ہو ۔ آپ سے ہر طالب علم تمدن کی اہمیت اور ذہنی اور روحانی ضبط کا سبق سیکھ سکتا ہے اگر آپ ڈاکٹر ذاکر حسین کی مثال اپنے سامنے رکھیں اور ان کے نقشِ قدم پر چلیں تو یہ آپ کے لئے زندگی میں کامیابی کی پہلی منزل

ہے ۔ اس بات کو آپ کبھی فراموش نہ کریں کہ آپ کے وائس چانسلر ایسے اشخاص ہیں جو بنیادی طور پر ہر اعتبار سے ہندوستانی ہیں مغرب کے تمدن اور اس کی سماجی اور سیاسی اہمیت سے بھی پوری طرح آشنا ہیں۔ اور یہ اس لئے ہے کہ وہ انگریزی زبان سے پوری طرح واقف ہیں آپ کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ آپ انگریزی زبان سے کما حقہٗ واقفیت حاصل کریں۔ اگر یونیورسٹی کا کوئی طالب علم انگریزی میں مہارت حاصل کرے تو وہ نہ صرف اپنے مطالعے کو وسیع کر سکے گا بلکہ بین الاقوامی سیاسیات کو بھی وہ پورے طور پر سمجھ سکے گا اس حقیقت کو فراموش کرنا ایک بہت بڑی غلطی ہوگی کہ انگریزی ایک بین الاقوامی زبان کا درجہ حاصل کر چکی ہے اور آنے والے دور میں اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھتی چلی جائے گی ۔

آئین ساز اسمبلی کے اس فیصلے سے کہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی ہندی کو ہندوستان کی زبان تسلیم کیا جائے ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ ہندوستان کے ایک محب وطن شہری کی حیثیت سے میں بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ فیصلہ کسی قدر مختلف ہوتا تو اچھا تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ فیصلہ قوم کے معمار کی رائے کے مطابق ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ خدا نے اسے ایک ایسی گہری نظر بخشی تھی کہ اس نے بغیر کسی غلط اندازے کے مستقبل کو دیکھ لیا تھا۔ وہ عظیم معمار اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ دونوں رسم الخط میں لکھی ہوئی ہندوستانی ہی اس ملک کے لئے موزوں ترین زبان ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستانی ایک سنسکرت کا اور ہندی خالص فارسی زبان کا لفظ ہے لیکن اب جب کہ آئین ساز اسمبلی نے ایک فیصلہ کر دیا ہے تو ہمیں وفادار شہریوں کی طرح اس فیصلے کو قبول کرنا چاہئے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بعض موقعوں پر حالات انسان کے قابو سے باہر ہو جاتے ہیں اور قدرت خود ہی فیصلے کر دیتی ہے۔ ہمیں اب بھی اس امر کا یقین ہے کہ ہندوستانی ترقی کرتی رہے گی۔ یہ ایک مفید اور خوبصورت زبان ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ تمدن سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ زبان کبھی ختم نہ ہوگی اور نہ ہی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ کوئی شخص اسے ختم کرنا چاہتا ہے ۔

آپ سب حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیا اس وقت ایک نازک دور میں سے گزر رہی ہے کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ آئندہ چند مہینوں میں ہمارے ملک میں یا کسی اور ملک میں کیا صورت رونما ہونے والی ہے۔ اس وقت دنیا کو معاہدے اور عہد نامے تباہی سے نہیں بچا سکتے بلکہ باہمی اعتماد کی فضا ہی ایک پائیدار امن قائم کر سکتی ہے ۔

دنیا کی موجودہ غیر یقینی صورت حال کے پیش نظر یہ ہمارا فرض ہے کہ ہمارے سیاسی خیالات خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں ہمیں اپنے ذاتی مفاد اور فرقہ وارانہ رنجشوں کو بالائے طاق رکھ دینا چاہئے۔ زبان کے جھگڑوں کو بھول جانا چاہئے اور اپنے دل میں ایک ہی ارادہ پختہ کر لینا چاہئے۔ اور وہ ارادہ ہو مادرِ وطن کی خدمت کا۔

ایک اور سانحہ

شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی پرانے وقتوں کے لوگوں میں سے تھے۔ افسوس کہ حال ہی میں آپ کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔ اردو ادب اور صحافت کی مولانا نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ نجیب آباد آپ کا وطن تھا لیکن آپ مدت دراز سے لاہور میں مقیم تھے۔ اب تو یہ عالم تھا کہ پنجابی زبان بھی سیکھ گئے تھے۔ مولانا بڑے بذلہ سنج، خوش خلق اور مرنجاں مرنج قسم کے انسان تھے۔ وہ بجائے خود ایک ادارہ تھے۔ دوستوں کے ساتھ محبت اور دشمنوں کے ساتھ مروت آپ کا شعار خاص تھا۔ چار سال کے قریب ہوئے کہ مولانا سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی۔ بڑی محبت سے پیش آئے۔ فرمانے لگے کہ میں پنجابی بن گیا ہوں تم دہلوی ہوتے جا رہے ہو۔ دیر تک اردو اور اس کی بہبود کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ افسوس اردو کا یہ جواں ہمت بزرگ خادم بھی نہ رہا۔

عرش ملسیانی ۔ ۱۶ر فروری ۱۹۵۱ء

غلام احمد فرقت

لکھنؤ اور دِلّی کے بانکے

نوابینِ اودھ اور آخری شاہانِ مغلیہ کے دور میں دلّی اور لکھنؤ میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا تھا جو بانکوں کے نام سے موسوم تھا۔ اگرچہ مورخین اس باب میں خاموش ہیں، تاہم پُرانی داستانوں اور تاریخی افسانوں میں کہیں کہیں اُن کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ یورپ کی قدیم تاریخ میں بانکوں کی قسم کا ایک گروہ وہاں کے جاگیردارانہ نظام میں بھی نظر آتا ہے۔ جن کے طور طریقے اور عادات و اطوار بالکل ہی بانکوں جیسے تھے، ان کو نائٹ کہتے تھے۔ نائٹ ایک خطاب تھا جو وہاں کے امرا و مصاحبین کو عطا کرتے تھے۔ جو نبرد آزما وقت میں اُن کے دستِ راست ثابت ہوتے۔ چنانچہ انگلستان میں اب تک ان خطابات کا سلسلہ جاری ہے۔ فسانۂ آزاد میں پنڈت رتن ناتھ سرشار جو لکھنوی تمدن کی گوناگوں صحبتیں اُٹھائے ہوئے تھے ان لوگوں کی سج دھج اور وضع قطع کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ترچھا تیکھا چنت دار انگرکھا پہنے، ٹِکّے دار کٹی ہوئی ٹوپیا سر پر جمائے۔ ڈھانٹے باندھے چلے جاتے ہیں۔ تنچے کی جوڑی کمر سے لگی۔ دو دو ولائتیاں پڑی ہوئی۔ قرابینچہ، پیش قبض، کٹار، سروہی، شیر بچہ سب سے لیس خاصے اوچھے بنے ہوئے"

اسی طرح "مشرقی تمدن کی آخری جھلک" کے عنوان سے جو مضامین حکیم عبدالحلیم شرر مرحوم نے لکھے ہیں، اُن میں ایک جگہ انھوں نے دلّی کے بانکوں کے بارے میں بھی ذکر کیا ہے جس سے دلّی کے باشندوں کی وضع قطع اور ان کی اصل کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"دربار دہلی میں بکثرت قندھاری آ آکر فوج میں نوکر تھے وہ لوگ چونکہ بہت بہادر سمجھے جاتے، اس لئے یہاں کے عام سپہ گروں میں اُن کی وضع و لباس اور عادات پھیلنے لگیں رواج پانے لگے۔ اور یہ انھیں کی برکت اور صحبت کا اثر تھا کہ دہلی میں بانکے بڑے بڑے کلیوں دار پائنچوں کے پیجامے پہنتے تھے۔ دلّی کے آخر عہد میں بانکوں کی وضعداری اور شجاعت اس قدر پسندیدہ ہوگئی کہ صدہا شریف زادوں نے بانکوں میں داخل ہوکے ان کی وضع اختیار کرلی، اور شرفا جن میں اکثر اپنی اعلیٰ وضع پر تھے سب بانکے بنے ہوئے تھے لکھنؤ میں اُن کا لباس کلیوں دار پیجامے ہوتے"

اب بھی لکھنؤ میں بڑے بوڑھے جب لکھنؤ کے قدیم تمدن کا تذکرہ کرتے ہیں تو اکثر وہ روایات ان کی زبانوں پر آجاتی ہیں جو سینہ بسینہ اُن کے آبا و اجداد سے اُن تک پہنچی ہیں، اور وہ ان لوگوں کے قصّے بیان کرتے ہیں جو وضع قطع سے وہی لوگ تھے جن کو ہم بانکے کہتے ہیں۔ ان بانکوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی کہ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، ہمہ وقت جنگی اسلحہ سے آراستہ رہتے۔ یک رنگی اور یک وضعی ان کا شعار تھا۔ جو سج دھج شروع سے اختیار کرلیتے اُسے مرتے دم تک نبھاتے۔ محمد شاہ رنگیلے کے دور میں ان بانکوں کا بڑا زور تھا۔ بلکہ یہاں تک مشہور ہے کہ وہ زنانوں اور بانکوں کی باقاعدہ فوج رکھتے تھے۔ زنانوں کے بارے میں مشہور ہے کہ اگرچہ یہ بہادر تھے، تاہم تلوار کی ہر ضرب مار کر عورتوں کی طرح "وئی" کہتے۔ لیکن جہاں تک بانکوں کا تعلق ہے اُن کے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ ایک ہی سج دھج میں رہتے ہوں۔ بلکہ ہر بانکا اپنی نئی وضع اور نئی شان میں نظر آتا بعض آدھا سر منڈا کر دوسری طرف کا پٹّا اس قدر بڑھا لیتے کہ وہ کاندھے تک پہنچ جاتا، اُن کو لکھنؤ میں ایک پٹے کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ بعض اس ایک پٹے کو چوٹی کی طرح گوندھ کر سینہ پر ڈال لیتے۔ کچھ ایسے تھے جو ایک مونچھ اس قدر بڑھا لیتے تھے کہ چوٹی معلوم ہونے لگتی۔ کوئی دو دھارا تیغہ ہاتھوں میں لئے

پھرتا۔ کوئی بھاری گرز لئے اپنی قوت کا مظاہرہ کرتا نظر آتا تھا۔ جہاں کوئی بات خلافِ مزاج گذرتی یہ لوگ مرنے اور مارنے کو تیار ہو جاتے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اُن کی اِس مضحکہ خیز سج دھج پر کوئی مسکرا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ اس کے معنے جان سے ہاتھ دھونے کے تھے بعض بانکے تو بڑے بڑے امراء اور بادشاہِ وقت تک کو نظر میں نہ لاتے۔ چنانچہ نوّاب سعادت علی خاں کے زمانے میں ایک بانکے جہانگیر بیگ[1] نامی تھے۔ ان کے باپ نواب صاحب کے مصاحبِ خاص تھے۔ نواب صاحب نے ایک دن جہانگیر بیگ کی کسی بات سے بیحد برافروختہ ہو کر ان کے باپ سے شکایت کی اور کہا اپنے بیٹے سے کہہ دیجئے گا کہ "اپنے بانکے پن پر نہ جائیں۔ میں نے ان کی ناک نہ کٹوائی ہو تو سعادت علی خاں میرا نام نہیں۔" اس پر جہانگیر مرزا کے باپ نے گھر آکر بی بی سے کل واقعہ بیان کیا، اور صاحبزادے پر بیحد ناراضگی ظاہر کی۔ جہانگیر بیگ کے گھر آنے پر ماں نے کہا کہ نواب صاحب ایسا ایسا کہتے تھے اس پر اُن کو طیش آگیا۔ اور جب شام کو باپ گھر آئے تو انھوں نے اپنی تلوار سے ناک کاٹ کر باپ کی طرف پھینک دی۔ اور کہا "بس اسی ناک کاٹنے کی نواب صاحب دھمکی دیتے تھے۔ لیجئے یہ ناک حاضر ہے اُن کو دیدیجئے۔" جب باپ نے نواب صاحب کے سامنے ناک پیش کی تو انھوں نے کہا کہ میں نے تو محض دھمکانے کی غرض سے ایسا کہا تھا۔ اِس کے بعد جہانگیر بیگ شہر میں نکٹے مشہور ہوگئے، اور بڑے بڑے بانکے اُن کے شاگرد ہوگئے۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی مشہور ہے کہ ایک بھانڈ سعادت علی خاں کا بہت منہ چڑھا تھا۔ اس نے ایک دن نواب صاحب سے کوئی مذاق کیا جو نواب صاحب کو شاق گزرا۔ اِس پر انھوں نے بھانڈ سے کہا کہ جب جانیں جب تم مرزا جہانگیر بیگ سے کوئی ایسا فقرہ کہو جس پر وہ جھینپ جائے۔ بھانڈ نے کہا بہتر ہے۔ چنانچہ ایک دن جہانگیر مرزا دریا کے کنارے اپنے شاگردوں کے ہمراہ بیٹھے تھے کہ یہ بھانڈ دریا سے نہا کر نکلا اور سلام کرکے سامنے بیٹھ گیا۔ جہانگیر بیگ نے کہا "کہو اچھے تو ہو" اس پر اس نے کہا کہ "خداوند اچھا ہوں۔" اس کے بعد ان کے چہرے کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ "خداوند اتنی کٹ گئی ہے، یہ بھی کٹ جائے گی۔" اس پر جہانگیر مرزا اس کی طرف بڑھے اور وہ بھاگ گیا۔ عرصہ تک وہ اور ان کے شاگرد اس کی تلاش میں رہے۔

آخر میں نواب صاحب نے بھانڈ کو بلا کر اپنے سامنے اُن کے قدموں پر سر رکھوا کر اور یہ کہہ کر کہ یہ تو بھانڈ ہیں یہی ان کی روزی ہے اُس بھانڈ کو معاف کرایا۔

یہ لوگ وعدے کے پکے ہوتے جس بات کا وعدہ کرلیتے اُسے پورا کرکے چھوڑتے جس کسی کو زبان دیدیتے اس کے ہو رہتے۔ عوام کو اُن پر بھروسہ اور اعتماد ہوتا۔ یہ لوگ بروقتِ ضرورت ہزاروں روپے زیورات یا نقدی کی صورت میں صرف اپنی مونچھ کا ایک بال بطور ضمانت دے کر لے جاتے، اور مہاجن خوشی خوشی دے دیا کرتے۔ کیونکہ اُن کو یقین ہوتا کہ جس وقت کا وعدہ کرکے لئے جا رہے ہیں اس وقت واپس بھی کر دیں گے۔ چنانچہ اس باب میں ایک روایت مشہور ہے کہ ایک بانکے اپنی مونچھ کا بال رہن رکھ کر کسی مہاجن سے لین دین کر رہے تھے کہ ان کو ایسا کرتے ایک بدمعاش نے جو قریب ہی کھڑا تھا دیکھ لیا۔ دوسرے دن وہ بدمعاش بانکے کا سوانگ بھر کر اُس مہاجن کے پاس پہنچا اور اپنی مونچھ کا ایک بال توڑ کر مہاجن کو دیا۔ اور اس سے بطور ضمانت کچھ قیمتی زیورات طلب کئے۔ مہاجن کو اُس کے طرزِ تخاطب سے کچھ شبہ پیدا ہوگیا اور اُس نے یہ کہہ کر کہ بال ٹھیک نہیں ہے دوسرا بال طلب کیا۔ اس پر بدمعاش نے اپنی مُونچھ کے کئی بال توڑ کر مہاجن کو حوالے کرتے ہوئے کہا کہ اِن میں سے جو پسند ہو اُس کو رکھ لو۔ اس پر مہاجن نے اُسے بہت شرمندہ کیا اور کہا جعل کسی اور سے کرنا۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر تم اصلی بانکے ہوتے تو جس وقت میں نے دوسرے بال کا مطالبہ کیا تھا اس وقت میرا سر نالی میں تڑپتا ہوتا۔

اسی طرح بعض بانکے ایک کان میں بڑا سا بالا ڈال لیتے تھے اور اُن کا لباس وہی ہوتا تھا جس کا تذکرہ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد میں کیا ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار چونکہ لکھنؤ کی ہر قسم کی صحبتیں اُٹھائے ہوئے ہوتے تھے۔ اور ہر طبقے کے لوگوں میں اُٹھتے بیٹھتے تھے لہٰذا فسانۂ آزاد میں انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اُن کے ذاتی تجربات تھے۔ جن کا انداز اگر ایک طرف افسانوی ہے تو دوسری طرف لکھنؤ کلچر کی ایک مستند تاریخ بھی ہے۔

اس کے ماسوا حکیم عبدالحلیم شرر مرحوم نے دلّی کے بانکوں کا جو تذکرہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کے علاوہ آخری دورِ مغلیہ میں دلّی میں بھی اس گروہ کے لوگ موجود تھے۔ جب دلّی میں سلطنتِ مغلیہ کی شمع گل ہوگئی تو یہ لوگ اودھ چلے آئے اور یہاں لکھنؤ اور فیض آباد میں رہنے لگے۔

---

[1] مرزا جہانگیر کی تصویر دہلی کے لال قلعہ میں موجود ہے۔ یہ نکٹوں کے سردار کہلاتے تھے۔

بانکوں سے پہلے شاہانِ مغلیہ کے دور میں احدی ہوا کرتے تھے۔ لغت میں احدی ایران میں وہ لوگ ہوتے تھے جو تنہا منصب ذات رکھتے تھے۔ یہ لوگ اگرچہ وضع قطع میں اُن کے سے نہ تھے تاہم فنِ سپہ گری اور بالخصوص تیراندازی میں یہ لوگ ماہر ہوتے تھے۔ چنانچہ اکبر کے زمانے میں اس قسم کے منصب دار اسی لقب سے مشہور تھے۔ یہ منصبدار تیر انداز ہوتے اور ان کے ہمراہ سوار اور پیادے نہ ہوتے تھے۔ بیش قرار تنخواہیں پاتے اور بادشاہ کی خدمت میں ہر وقت موجود رہتے۔ لہٰذا خیال ہوتا ہے کہ یہ وہی احدی ہوں گے جو بعد میں سلطنت پر زوال آنے اور حالات ناسازگار ہونے پر بانکوں میں تبدیل ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنی ایک خاص وضع بنالی۔ چونکہ احدی خون اُن کی رگوں میں موجزن تھا اس لئے یہ لوگ باعتبار کردار وہی رہے جو کہ احدی تھے۔

مغل دربار میں احدی ایک ادنیٰ ترین منصب ہوتا تھا، مگر ان احدیوں پر بادشاہ پورا بھروسہ کرتا۔ ان کا ایک علیحدہ دستہ تھا جس کو جنگ میں اُس وقت استعمال کیا جاتا تھا جب کہ جنگ فیصلہ کُن دور سے گزر رہی ہو۔ یہ لوگ قول کے دھنی۔ بات کے پکّے اور فنِ سپہ گری کے ماہر ہوتے تھے۔ چنانچہ دلّی میں محمد شاہ رنگیلے کے دَور میں ایک بانکے تھے جن کو بیگم بیگم کہتے تھے بیگم کا لقب اختیار کرنے کا بھی ایک دلچسپ سبب تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ محمد شاہ رنگیلے کے دور میں سلطنتِ مغلیہ کی حالت بہت ابتر ہو گئی۔ بادشاہ اپنا تمام وقت رنگ رلیوں میں صرف کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے گوشے گوشے میں بدنظمی اور ابتری پھیل گئی۔ چوری رہزنی ڈکیتی کی وارداتیں عام ہو گئیں۔ شرفا کو اپنی عزت بچانا دشوار ہو گیا۔ شریف زادیوں کے عزت و ناموس خطرے میں پڑ گئے۔ چنانچہ خود پایۂ تخت کے اندر اس قسم کی وارداتیں ہونے لگیں جس سے اہالیانِ شہر پریشان رہتے۔ اسی زمانے میں دلّی کے ایک محلہ میں چند بدمعاشوں نے یہ حرکت شروع کر دی کہ اُن کے محلے سے کہار ڈولی میں اگر کسی جوان شریف زادی کو لے کر نکلتے، تو کہاروں پر حملہ کر کے شریف زادی کو ڈولی سے غائب کر دیا جاتا تھا۔ اتفاق سے اس قسم کی وارداتوں کے سرغنہ ایک ہی خاندان کے تین بھائی تھے، جو ہر وقت اپنے مکان کے آگے اسی انتظار میں بیٹھتے کہ کوئی نوجوان عورت اُدھر سے ڈولی میں بیٹھ کر نکلے اور وہ حملہ کر دیں۔ چنانچہ اس کی اطلاع دلّی کے ایک بانکے کو ہوئی۔ چونکہ بانکوں کی زندگی کا مقصد ہی غریبوں۔ لاچاروں اور بیکسوں کی مدد کرنا تھا، اور وہ اگر کسی کو مصیبت میں دیکھتے تو اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اُس کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ظلم و تشدد سے نجات دلانا اُن کا شیوہ تھا۔ چنانچہ جب اِن بانکے کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ایک روز زنانہ لباس پہنا۔ قیمتی زیورات سے اپنے کو آراستہ کیا۔ ہاتھوں اور پیروں میں مہندی لگائی اور تمام اسلحہ زیب تن کر کے کہاروں سے کہا کہ ڈولی اس راستے سے لے چلو جہاں اس قسم کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ پہلے تو کہاروں نے اُدھر جانے سے انکار کیا لیکن جب بانکے نے بہت زیادہ انعام اکرام کا لالچ دیا اور اُن کی جان کی حفاظت کا وعدہ کیا تو وہ اُس راستہ سے ڈولی لیکر چلے۔ ڈولی میں بیٹھنے کے بعد بانکے نے جو بیگم کا بھیس بدلے ہوئے تھے جگہ جگہ ڈولی سے تانکنا جھانکنا شروع کیا اور زیورات کی نمائش کرنے لگے تاکہ دیکھنے والوں کو شبہ ہو کہ کوئی جوان عورت کی سواری ہے۔ اس صورت سے جونہی ڈولی ان بدمعاشوں کے مکان کے قریب پہنچی، انھوں نے حسبِ معمول اُس پر حملہ کر دیا۔ حملہ کرنا تھا کہ بانکے ڈولی سے نکل پڑے اور تلوار چلانا شروع کر دی۔ چونکہ یہ فنِ سپہ گری میں ماہر تھے اس لئے انھوں نے ان تینوں بدمعاشوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ اِس واقعے کی اطلاع محمد شاہ رنگیلے کو ہوئی تو انھوں نے ان کو طلب کیا۔ بانکے بادشاہ کی خدمت میں اسی زنانے لباس میں پہنچے جو لباس پہن کر یہ بدمعاشوں کو زیر کرنے گئے تھے۔ کُل واقعہ سننے کے بعد بادشاہ نے ان کی بڑی تعریف کی، اور انعام و اکرام اور خلعت دے کر اُن کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور چلتے وقت کہا کہ اب وہ اس زنانے لباس کو اُتار دیں۔ اِس پر بانکے نے دست بستہ عرض کی کہ چونکہ اسی لباس کے سبب شریف زادیوں کو عذاب سے نجات دلائی ہے۔ لہٰذا اُن کو اُسی لباس میں رہنے دیا جائے۔ چنانچہ اُس دن سے یہ بانکے شہر میں بیگم کے نام سے مشہور ہو گئے۔

جب نادر شاہ نے پنجاب فتح کرنے کے بعد دلّی کی طرف رُخ کیا اور اُس کی فوجیں پائے تخت سے سو میل کے فاصلے پر رہ گئیں تو محمد شاہ رنگیلے خوابِ غفلت سے بیدار ہوئے اور انھوں نے مقابلے کے لئے شاہی فوج روانہ کی جس وقت شاہی لشکر کے سپاہی قلعہ کے سامنے سے گزر رہے تھے اُس وقت بادشاہ ہر ہر سپاہی کو بغور دیکھتا جاتا تھا۔ دیر تک جب یہ سلسلہ جاری رہا تو مشیرانِ خاص میں سے ایک نے دریافت کیا کہ ظل اللہ کو کون سی فکر دامن گیر ہے، جو ہر ہر سپاہی کو بغور دیکھتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ میں بیگم کو دیکھ رہا ہوں

کہ وہ کہاں ہیں، وہ جبکہ سلطنت خطرہ میں ہے ضرور فوج میں ہوں گے۔ لیکن تمام فوج گزر گئی اور کہیں بیگم نظر نہ آئے۔ آخر جب محمد شاہ رنگیلے کی فوج کو نادر شاہ کے لشکر کے مقابلے میں شکست ہوگئی تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ فوج کا پہلا دستہ جس نے نادر شاہ کی فوج کا زبردست مقابلہ کیا تھا اُس میں بیگم بھی تھے اور لڑائی میں کام آگئے تھے۔ بادشاہ کو بیگم کے مرنے کا از حد قلق ہوا۔ یہ تھے وہ لوگ جو دلّی کے بانکے کہلاتے تھے۔ اسی دور کا ایک دوسرا واقعہ جس کا ذکر حکیم عبدالحلیم شرر لکھنوی نے اپنی کتاب گزشتہ لکھنؤ میں کیا ہے، جو حسب ذیل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں لکھنؤ کا صوبیدار گردھا نانگا نام کا ایک بہادر ہندو رسالدار تھا۔ اُس کا چچا چھبیلے رام دربار دہلی کی طرف سے الہ آباد کی حکومت پر مامور تھا چھبیلے رام کے مرنے پر گردھا نانگا نے سرکشی اختیار کی اور ارادہ کیا کہ چچا کی جگہ زبردستی الہ آباد کا حاکم ہو جائے، مگر پھر خود ہی رُک کر اُس نے اظہار اطاعت و فرمانبرداری کیا، اور دربار سے اُسے صوبیداری کا خلعت عطا کیا گیا۔ اُس نے یہاں سکونت اختیار کی۔ مگر یہاں کا حاکم یا صوبیدار رہا ہے جو ہو شیخزادوں کا اس قدر زور تھا کہ کسی والی کو چاہے کیسا ہی زبردست ہو اور کیسی ہی سند حکمرانی لے آیا ہو یہ جرأت نہ ہو سکتی تھی کہ اُن کے حلقے میں قدم رکھے۔ جو لوگ شیخزادوں کی عمارات شیخن دروازے یا پنج محلا میں جانا چاہتے اس پھاٹک سے ہو کر گزرتے، اُس پھاٹک کی محراب میں بانکے شیخزادوں نے ایک ننگی تلوار لٹکا رکھی تھی اور حکم تھا کہ جو کوئی یہاں آنا چاہے، کوئی ہو، کتنا بڑا شخص ہو، پہلے اس تلوار کو جھک کر سلام کرے، پھر آگے قدم بڑھائے۔ کس کی مجال تھی کہ اس حکم کی تعمیل میں عذر کرے، یہاں تک کہ دہلی سے جو والی اور حاکم مقرر ہو کے آتے تھے اور شیخوں سے ملنے جاتے تھے تو انھیں بھی اس تلوار کے آگے ضرور سر جھکا دینا پڑتا تھا۔"

اسی نوعیت کی ایک روایت سعادت علی خاں کے دور سے منسوب ہے اُسمیں اسی واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے دور میں ایک بانکے تھے جنھوں نے اپنی ڈیوڑھی کے دروازے پر ایک ننگی تلوار لٹکا رکھی تھی اور اعلان کر رکھا تھا کہ ہر وہ شخص جو ادھر سے گزرے اس کو بغیر سلام کئے نہ جائے ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھوئے۔ اس سے بڑے بڑے شرفا اور عمائدینِ سلطنت جن کا وہی راستہ تھا بے حد مضطرب ہوئے۔ رفتہ رفتہ یہ بات سعادت علی خان کے کان تک پہنچی اور بعض امراء اور رؤسا نے بھی اس واقعہ کی شکایت کی۔ اس پر بادشاہ نے حکم دیا کہ ہمارا جلوس اس راستہ سے لے کر چلو۔ چنانچہ جلوس اس سمت روانہ ہوا۔ مگر جب یہ جلوس اُس سڑک کے نکڑ پر پہنچا جہاں سے بانکے کے مکان کو سڑک مڑتی تھی تو چوراہے کے موڑ پر وہی بانکے صاحب بادشاہ کے ہاتھی کے سامنے آکر سر برہنہ کھڑے ہوگئے۔ بادشاہ نے سواری رُکوا کر دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے۔ درباریوں نے بتایا کہ یہ وہی بانکے ہیں جنھوں نے اپنے دروازے پر تلوار لٹکا رکھی ہے۔ یہ سنکر نواب نے بانکے کو طلب کیا۔ انھوں نے شاہانہ آداب بجا لاتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ حضور جلوس کا رُخ دوسری جانب موڑ دیں۔ ورنہ اگر جلوس اِدھر سے گزرا تو یہ غلام زادہ جہاں پناہ پر سے قربان ہو جائے گا، اور گھر بار مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ بادشاہ فوراً ہی اُن کا مطلب سمجھ گیا اور حکم دیا کہ جلوس کا رُخ دوسری جانب موڑ دیا جائے۔ اس کے بعد ان بانکے صاحب کو دوسرے دن دربار میں بُلا کر بہت سا انعام و اکرام دیا۔

ایک خاص خصوصیت ان بانکوں کی یہ تھی کہ ادنیٰ درجے کے سپاہیوں سے لڑنا یہ اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے صرف اپنے ہم پلّہ سے مقابلہ کرتے، اور اگر مقابلے میں حریف کمزور پڑتا تو فوراً ہاتھ روک لیتے اور اس کے زخمی ہو جانے پر اگر گھر جانے میں اُسے تکلیف ہوتی تو اُسے سہارا دے کر اس کے گھر پہنچا آتے۔ بعض بانکے ایسے وضعدار تھے کہ کڑکڑاتے جاڑوں میں باریک تنزیب کا یا ریشم کا لباس پہنتے اور دوسروں پر اپنا رعب ڈالنے کے لئے مزید ٹھنڈا پانی اُس لباس پر چھڑک لیتے۔ اور جتنی جتنی سردی لگتی اتنے اتنے اکڑتے جاتے۔ مگر زبان سے اُف نہ کرتے۔ اسی طرح لڑائی میں زرہ بکتر یا ڈھال لیکر تلوار کی لڑائی لڑنا معیوب سمجھتے۔ بلکہ ننگے سینے پر چرکے کھاتے مگر اُف نہ کرتے۔ اسی طرح بعض بانکے پائجامے کا ایک پائنچا اس قدر نیچا کر لیتے کہ زمین کو مس ہو جاتا اور دوسرا اس قدر اونچا کرتے کہ آدھی پنڈلی کھلی رہتی۔ غرض عجیب وضعدار لوگ تھے۔

حضرت آرزو لکھنوی جن کی عمر اس وقت اسّی سال کی ہے اور جنہوں نے لکھنؤ کی بزمِ نشاط کے اس دور کو بچشمِ خود دیکھا ہے جب کہ دلّی اور لکھنؤ کی تہذیب دم توڑ رہی تھی اور پرانے وضعداروں میں دلّی کے کچھ ایسے لوگ زندہ تھے جن میں قدیم لکھنؤ کی اصل تہذیب و تمدّن کی جھلک نظر آتی تھی۔ انھوں نے لکھنؤ کے بانکوں کو اگر نہیں دیکھا تھا تو ان کے کردار کی جھلک کچھ لوگوں میں ضرور ایسی پائی ہوگی۔ جس سے متاثر ہو کر اُنھوں نے اپنی مثنوی عدلِ محمود میں ایک بانکے کے کردار کی عکاسی کی ہے جس سے قدیم لکھنؤ کے بانکوں کی وضع قطع، بات چیت، اخلاص و محبت، ایثار و قربانی اور مظلوم نوازی پر روشنی پڑتی ہے۔ مثنوی میں تو صرف اس قدر دکھایا گیا ہے کہ ایک شریف سوداگر ہے جس کے اکلوتا لڑکا ہے۔ اس لڑکے کا ایک دن شب کو وزیر کے محل کی طرف سے گزر ہوتا ہے۔ اچانک محل کے بالاخانے سے ایک آواز تلاوتِ کلامِ پاک کی سنائی پڑتی ہے۔ سوداگر زادہ اس آواز پر عاشق ہو جاتا ہے، اور کمند ڈال کر بالاخانے پر پہنچتا ہے۔ یہاں اس کو وزیرزادی یک و تنہا کلامِ پاک پڑھتی ملتی ہے۔ یہ اتنی دیر وہاں بیٹھا رہتا ہے جتنی دیر وہ کلامِ پاک پڑھتی ہے۔ درمیان میں اگر تلفظ میں غلطی ہوتی ہے تو لقمہ بھی دیدیتا ہے۔ اس کے بعد کمند سے اُتر کر گھر واپس آتا ہے اور یہ اُس کا روز کا معمول ہے۔ اسی دوران میں بادشاہ وقت رات کو چوکیدار کا بھیس بدل کر رعایا کے دُکھ درد کا پتہ لگانے نکلتا ہے۔ اتفاق سے اس کا گزر وزیر کے محل کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور وہاں کمند لٹکی دیکھ کر اُسے کچھ شبہ ہوتا ہے اور وہ راز معلوم کرنے کی غرض سے، اس کمند کے ذریعہ اوپر چڑھ جاتا ہے۔ اور وہاں چھپ کر دونوں کو دیکھتا ہے۔ سبق ختم ہو جاتا ہے اور قبل اس کے کہ سوداگر زادہ نیچے آئے بادشاہ چپکے سے نیچے اُتر کر ٹہلنے لگتا ہے۔ اتنے میں سوداگر زادہ نیچے آتا ہے۔ بادشاہ اسے پکڑ لیتا ہے۔ سوداگر زادہ گھبرا جاتا ہے اور وزیر زادی کی عزّت بچانے کے خیال سے اپنے کو چور ظاہر کرتا ہے۔ چوکیدار کوتوالی لے جانے لگتا ہے۔ سوداگر زادہ اس صبح تک کی مہلت طلب کرتا ہے۔ وہ پہلے چوکیدار کو اپنے باپ کے پاس لے جاتا ہے۔ باپ لڑکے سے دریافت کرتا ہے، اور جب وہ اس سے بھی راز چھپاتا ہے، اور اپنے جانے کی غرض و غائت چوری بتاتا ہے تو وہ ضمانت کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس کے بعد سوداگر زادہ اپنے ایک دوست کا حوالہ دیتا ہے۔ وہ دوست شہر کے ایک مشہور بانکے ہیں، جو بات کے دھنی اور قول کے پکے ہیں۔ مظلوموں کی مدد اور بیکسوں کی داد رسی اُن کا شیوہ ہے۔ وہ صبح تک کے لئے اُس کی ضمانت کر لیتے ہیں۔ چوری کی سزا اس زمانے میں یہ ہے کہ اسے توپ کے منہ پر باندھ کر اُڑا دیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی اس کی ضمانت کرتا ہے تو اگر وقت معینہ پر اگر ملزم حاضر نہیں ہوتا تو ضامن کو وہی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ غرض مرزا ضمانت کرتے ہیں۔ صبح کو سوداگر زادہ کوتوالی میں حاضر ہونے سے قبل مرزا کا شکریہ ادا کرنے اور اُن سے آخری بار رخصت ہونے جاتا ہے۔ اسی درمیان میں کوتوالِ شہر کا آدمی بھی سوداگر زادے کی طلبی کے لئے مرزا کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ سوداگر زادہ اپنے کو حوالے کرنے لگتا ہے تو بانکے مرزا حقِ دوستی ادا کرنے کی غرض سے اپنے کو چور بتا کر گرفتار کرانے لگتے ہیں۔ مگر بعد کو بادشاہ اصل ملزم کی شناخت کر لیتا ہے۔ اور سوداگر زادہ توپ کے منہ پر باندھ دیا جاتا ہے۔ بانکے مرزا دوست کی رفاقت میں بادشاہ کو بُرا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ اور توپ کے قریب دوسری طرف تلوار کھینچ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ادھر توپ دغے اور یہ خودکشی کر کے راہِ عدم میں دوست کی رفاقت کریں۔

آخر میں بادشاہ راز کا انکشاف کرتا ہے اور سوداگر زادہ اور وزیرزادی معصوم قرار پاتے ہیں اور بادشاہ سوداگر زادے کو اپنی فرزندی میں لے کر اس کی شادی بڑے تزک و احتشام سے وزیرزادی سے کرتا ہے، اور بانکے مرزا کو شاہی فوج میں اعلیٰ منصب عطا کیا جاتا ہے۔

غرض یہ تھا کردار اُن بانکوں کا جن پر ہندوستان بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔

نوٹ ۱۔ گوالیار میں راجپوت بانکے بھی گزرے ہیں۔ مگر ابھی تک کسی تاریخ میں اُن کا ذکر راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس لئے اگر کسی صاحب کو اُن کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو از راہِ عنایت وہ مجھے بھیج دیں۔ اُن کی بعض سنی سنائی داستانیں ضرور ہیں مگر کسی تاریخ کے حوالے نہیں ہیں۔

نوٹ۔ ماہ فروری کے شمارے میں منظر سلیم صاحب کی نظم "جوانی عقلمی اور شاعری" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ دراصل مطبوعہ تین بند ان کی ایک طویل نظم کا ابتدائی حصہ ہیں۔ ان تین بندوں کے علاوہ ایک بند جگہ کی قلت کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکا جس کا ہمیں افسوس ہے۔ (ادارہ)

ذکر و فکر

فضا ابن فیضی

جگر میں یا دلِ بیمار میں کہاں تم ہو
نظر میں خوبیٔ افکار میں کہاں تم ہو
کنارِ جو ہو کہ کہسار میں کہاں تم ہو
بہار آئی ہے گلزار میں، کہاں تم ہو!

شرابِ کہنہ ہے موجود تم بھی آجاؤ
بساطِ سبزہ ہے موجود تم بھی آجاؤ
بہارِ نغمہ ہے موجود تم بھی آجاؤ
بہار آئی ہے گلزار میں، کہاں تم ہو!

تم آؤ اب کہ وہ یارائے ضبط ہی نہ رہا
جو اتصال سے مجھے تھا وہ ربط ہی نہ رہا
خدا کا شکر کہ توبہ کا خبط ہی نہ رہا
بہار آئی ہے گلزار میں، کہاں تم ہو!

عجیب رنگ میں کوہسار ہے آؤ
عروسِ نغمہ لبِ جوئبار ہے آؤ
سرور بخش ہوائے بہار ہے آؤ
بہار آئی ہے گلزار میں، کہاں تم ہو!

خزاں کا دور نہیں اب کہ پھر کریں آہیں
گلے میں ڈال دیں اک دوسرے کے ہم باہیں
بہار میں تو کریں عیش جس قدر چاہیں
بہار آئی ہے گلزار میں، کہاں تم ہو!

کرشن موہن

خود سے اہرمن کی عظمتیں "سنبھالتے" رہے
کہ مدتوں دلوں میں ہم اندھیرے پالتے رہے

ہمارے غم پہ دوستوں کے طعنہ ہائے پے بہ پے
ہمیشہ زندگی کے رس میں زہر ڈالتے رہے

امید کے سنہری سانپ ڈستے ہی رہے ہمیں
ہم آرزوؤں کے جنازے ہی نکالتے رہے

ہمارا اور عیش کا بس آشنا رابطہ رہا
وہ ہم کو ٹالتا رہا ہم اس کو ٹالتے رہے

ڈبو کے اندھی پیروی میں اپنے اقتدار کو
ہم اپنے جھوٹے رہبروں کے نام اچھالتے رہے

جے کرشن چودھری

خیالِ صبحِ شبِ انتظار ہے اب بھی
امیدِ لذتِ دیدارِ یار ہے اب بھی

خزاں کا دور ہے جھونکے ہیں باد صرصر کے
امیدِ آمدِ فصلِ بہار ہے اب بھی

فسردہ گل ہیں فضائیں گھٹی گھٹی ہیں مگر
امیدِ خندۂ صد لالہ زار ہے اب بھی

جہانِ پیر ہے ردگوں سے سوگوار مگر
امیدِ عالمِ نو برگ و بار ہے اب بھی

ہر ایک سرو ہے گویا بہ گِل گلستاں میں
امیدِ لطفِ خرامِ نگار ہے اب بھی

بھنور میں ناؤ ہے اور خیمہ زن ہے تاریکی
امیدِ ساحلِ ناآشکار ہے اب بھی

ہے قحطِ اُنس کا بے دردیوں کی ارزانی
امیدِ مہرِ دلِ غم گسار ہے اب بھی

ہر ایک سمت ہے گو کارزار کا عالم
امیدِ عالمِ بے کارزار ہے اب بھی

بلا سے بجلیاں ٹوٹیں کہ زلزلے آئیں
امیدِ رحمتِ پروردگار ہے اب بھی

سحر رام پوری

اللہ یہ سلوک دلِ ناتواں کے ساتھ
اپنا بھی غم دیا ہے غمِ دو جہاں کے ساتھ

یوں ہی رہی بہار اگر گلستاں کے ساتھ
وابستہ ہو نہ جائیں امیدیں خزاں کے ساتھ

کیا کیا ستم چھپانے کی ہوتی ہیں کوششیں
چلتا ہے ایک نغمہ سا میری فغاں کے ساتھ

ہیں صاف رنگِ رُخ سے عیاں دل کی دھڑکنیں
ان کا بھی امتحاں ہے مرے امتحاں کے ساتھ

جلنا تھا جن کو چند ہی تنکے تھے وہ، مگر
کیا کچھ نہ بجلیوں نے کیا گلستاں کے ساتھ

تنہا روی کے عزمِ تنک ظرف کو سلام
اب چل کے دیکھنا ہے کسی کارواں کے ساتھ

لایا ہے انقلاب وہ چیزیں کہ اے سحر
جنت کا کیا مقابلہ ہندوستاں کے ساتھ

ہوش عظیم آبادی

کس پہ ظاہر تپشِ دل اثر انداز نہیں
ہم تو ہم آپ میں وہ ولولۂ ناز نہیں

میری افسردگیٔ دل کو اسی سے سمجھو
ساز باقی ہے مگر کیفیتِ ساز نہیں

ہم تو خاموش ہیں آدابِ قفس سے لیکن
کون ایسا ہے جسے حسرتِ پرواز نہیں

آپ کیوں اس نگہِ شوق سے شرماتے ہیں
اپنی غماز ہے یہ آپ کی غماز نہیں

اب بھی کانوں میں جو کچھ رات گئے آتی ہے
کہیں اپنی ہی تو بھٹکی ہوئی آواز نہیں

حسن اور حسن کی معصوم طلب کیا کہئے
راز ہے اور کوئی پردہ دَرِ راز نہیں

خیر اتنا تو ہوا آج کہ خود کہتے ہیں
کچھ نہیں ہوش سا گر شیفتۂ ناز نہیں

شمیم کرہانی

زہر

بُھوکے ہی چلے گئے ——— اُونھ چلے جائیں ——— آخر تھا ہی کیا گھر میں جو پکا رکھی اور کہتی، گھر سے بُھوکے نہیں نکلتے، روٹی کھالو تو جاؤ —— اب دن بھر مارے مارے پھریں گے بابو جی ——— میں کہتی ہوں آخر مل والے صاحب جب روز دھتکارتے ہیں تو پھر کیوں جاتے ہو؟ تمھیں لجا بھی نہیں آتی؟ پر کچھ بولتے ہی نہیں، چپ سادھے بیٹھے رہتے ہیں۔ لاکھ غصہ کرو، پھٹکارو، سر جھکائے کچھ سوچا کرتے ہیں۔ آدمی اتنا نیک بھی نہ ہو، اتنا نیک آدمی تو بُدّھو کہلاتا ہوگا۔ اصل میں ان کے بُدّھو پن ہی کی وجہ سے کوئی انھیں کام کاج نہیں دیتا۔ دیکھتے ہی کہتا ہوگا۔ ایسے بدھو سے کل پُرزوں کے مہین کام کیسے چلیں گے۔ آخر میکو بھی تو ہے۔ کیسا چالاک پھرتیلا آدمی ہے۔ اُسی مل سے روز کما لاتا ہے اور اپنی گھروالی کو آرام سے رکھتا ہے۔ پر وہ اپنی گھروالی کو مارتا بہت ہے۔ بس یہی ذرا خرابی ہے اُس میں۔ پر یہ خرابی تو جی کا جنجال ہے۔ روز روز لاتیں اور ڈنڈے کون کھائے ——— اتنی اچھائی ہے اِن میں۔ چاہیں تو ہڈی پسلی توڑ کے رکھ دیں، مگر غصے کی بات پر مسکرا کر کہیں گے "پگلی۔ تجھے اتنی عقل بھی نہیں"۔

کھٹ کی آواز ہوئی اور وہ چونک پڑی۔ اُس نے کھاٹ پر بیٹھے ہوئے کوٹھری کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک بلی بھاگی جا رہی تھی، وہ پھر لیٹ گئی اور دل میں بولی —— بھوکی تھی بیچاری، پر اسے بھی چبیانہ ملی۔ پھر اُس نے کروٹ لیتے ہوئے دل میں کہا۔ کتنا کٹھن ہے یہ جیون۔ کل صبح کو ذرا ذرا سی دال ہم دونوں نے چاٹی تھی۔ پھر جب سے ایک دانہ بھی اُڑکر منھ میں نہ پڑا۔ اُس نے سُوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھراتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ اگر آج بھی وہ خالی ہاتھ آئے تو کیسے کام چلے گا۔ محلّے میں جان پہچان کا ایسا کوئی نہیں جس سے کچھ نہ کچھ مانگ نہ چکی ہوں۔ اب کس کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں۔ پھر روز روز مانگتے ہوئے اچھا بھی تو نہیں لگتا اور مانگا بھی جائے تو کس آشا پر۔ بابو جی تو ہر شام کو سیر سپاٹے کر کے ——— سیر سپاٹے؟ گرمیوں کی اس چلچلاتی دھوپ میں وہ روز سیر سپاٹے کرنے جاتے ہیں؟ میں بھی اُن کے لئے کیسی بُری بُری باتیں سوچتی ہوں۔ وہ اپنے خیالات پر نادم ہوگئی اور اس کے دل میں مادرانہ خبرگیری کے جذبات اُبھر آئے اور اُس کا جی چاہا کہ وہ اِسی لُو دھوپ میں سر و پا برہنہ دوڑتی ہوئی جائے اور اپنے سرتاج کے سر پر اپنی میلی پھٹی ساری کا آنچل ڈال کر کہے۔ اس پگھلا دینے والی دھوپ میں کہاں مارے مارے پھر رہے ہو، آؤ میرے ساتھ میری کوٹھری میں چلو۔ میں تمہارے پاؤں کی دھول اپنی پلکوں سے جھاڑ کے من مندر میں بٹھاؤں۔

——— وہ جلدی سے کھاٹ پر بیٹھ گئی اور دونوں پاؤں نیچے لٹکا کے چونک پڑی۔ یہ کیا؟ میں کہاں جا رہی ہوں؟ جانے کہاں ہوں گے وہ ——— ہوا کے تیز جھونکے نے دھڑ سے دروازہ کھولا اور اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ چپکے سے کھاٹ پر لیٹ گئی اور سوچنے لگی۔ آج بڑی لُو ہے، کیا حال ہوگا اُن کا۔ سر پر صافہ پگڑی تو دور چارگرہ کی ٹوپی بھی نہیں۔ پگڑی کا نام آتے ہی اُسے پیلی پیلی وہ پگیا یاد آگئی جسے پہن کر دو سال ہوئے وہ گونا کرانے گیا تھا۔ چوڑے چکلے ہاتھ پاؤں اور بھولے بھالے چہرے پر وہ پیلی پیلی پگیا کیسی بھلی لگتی تھی۔ اُس نے جلدی سے آنکھیں بند کرلیں اور سوچنے لگی۔ کیسی سُہانی تھی وہ شام جب اپنے موہن کے درشن ہوئے تھے۔ درشن ہوتے ہی وہ میرے من میں کھُب گئے تھے۔ کیسے پاجی تھے وہ، مجھے دیکھتے ہی بولے، کتنا پیاسا تھا میں تیرے درشن کا۔ میں لجا کے رہ گئی۔ کیا کہتی کہ میں بھی تمہارے درشن کی پیاسی ——— پیاسی ——— پیاسی ——— اُس نے زیرِ لب کئی بار کہا اور اُس نے محسوس کیا کہ پیاس سے اُس کا بُرا حال ہے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور کھاٹ سے اُتر کر کوٹھری کے کونے کی طرف لپکی اور لڑکھڑاتی ہوئی گھڑے کے پاس پہنچی۔ اُس نے پیالہ اُٹھا کر گھڑے سے پانی لیا اور جلدی سے ہونٹوں سے لگالیا۔ پر دو چار گھونٹ کے بعد ہی اُسے اپنے موہن کا خیال آگیا، لُو دھوپ

میں بنّو کے پیاسے دو... کی ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے۔ اُس نے جلدی سے پیالہ ہونٹوں سے الگ کیا اور سوچنے لگی۔ میری سی دل کی کمھور اداری سنسا رہیں نہ ہوگی بنّو کی پیاسی ہی پر گھر میں تو بیٹھی ہوں، پھر کاہے کی بیکلی۔ اُس کا جی متلانے لگا اور اُس نے چاہا جتنا پانی اُس نے پیا ہے وہ قے کرکے باہر نکال دے۔ وہ سر تھامے تھوڑی دیر بیٹھی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے اُٹھی۔ کوٹھری کے اناج والے گوشے پر اُس نے نگاہ ڈالی۔ شاید تھوڑا غلّہ نظر آ جائے جیسے رکھ کر وہ بھول گئی ہو۔ اُس نے لپک کر ہانڈیوں میں ہاتھ ڈالے، مگر تمام ہانڈیوں کی تہوں کو اُس کے ناخن کھُرچ کھُرچ کر واپس آ گئے اور ایک دانہ بھی ہاتھ نہ لگا۔ وہ آٹے کے گھڑے پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگی کس سے تھوڑا سا آٹا مانگا جائے کہ شام کو جب وہ بنّو کے پیاسے گھر آئیں تو گرم گرم روٹیاں اُن کے سامنے رکھ دی جائیں۔ اُسے میکو کی گھر والی کا خیال آیا، پر اُس سے تو وہ دو مرتبہ کل کے وقت پر آٹا دال لا چکی تھی، اب تیسری مرتبہ کس منہ سے مانگنے جائے ——— تو پھر تو پھر وہ کیا کرے؟ اس کے پاس کوئی ایسی چیز بھی تو نہیں رہی جسے بیچ کر وہ تھوڑا سا غلّہ لائے اور آج شام کو اپنے موہن کے سامنے گرم گرم روٹیاں اور سوندھی سوندھی دال پکا کر رکھے۔ سوچتے سوچتے اُسے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ اور وہ آٹے کے گھڑے پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔

دروازہ بھڑ سے کھُلا اور وہ چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے دیکھا اب کی ہوا نے نہیں بلکہ میکو نے دروازہ کھولا تھا۔ اُس نے سر پر آنچل کھینچتے ہوئے کہا۔

میکو بھیّا!

ہاں بھوجی میں ہوں کہو کیا کر رہی ہو!

کچھ نہیں۔

آخر کچھ تو، یہ اندھیری کوٹھری میں اکیلی پڑی کیا کیا کرتی ہو؟

کچھ نہیں، تم کہاں سے آ رہے ہو؟

مِل سے۔ ارے یہ تمہاری حالت کیا ہو رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کئی دن کے فاقے سے ہو۔ اُس کا سر جھُک گیا اور وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ میکو نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ تم لوگ مجھے بالکل پرایا سمجھتے ہو۔ موہن بھیّا تو خیر کبھی کچھ حال چال بتلاتے ہی نہیں، پر تمہیں تو کبھی کبھار مجھے اپنا سمجھ کر کچھ کہہ دینا چاہیئے۔ وہ اس کا جواب بھی نہ دے سکی اور چپ چاپ سر جھکائے کھڑی ٹپ ٹپ آنسو گرانے لگی جیسے بیمان کی کڑی دھوپ میں بادل کی گزرتی ہوئی چھاؤں بھی مل جائے تو آنکھیں موند لینے کو جی چاہتا ہے۔ میکو کے ہمدردانہ جملوں نے اُسے بڑی ڈھارس دی اور وہ آنچل سے آنکھیں پونچھتی ہوئی بولی۔

تم کیا جانو بھیّا، تمہاری گھر والی سے میں کئی دفعہ

بس بس، چپ رہو۔ میں ایسی باتیں نہیں سننا چاہتا۔ یہ کہہ کے وہ آگے بڑھا اور جیب سے دو روپے نکال کے بولا ——— "لو اس سے آج کا کام چلاؤ، کل پھر دیکھوں گا"۔ وہ پیچھے قدم ہٹاتی ہوئی بولی: "نہیں بھیّا، اس کی کیا ضرورت؟" مگر میکو نہیں مانا۔ ہاتھ میں روپے لئے آگے بڑھتا گیا، اور وہ انکار کرتی ہوئی اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی دونوں پنڈلیاں کھاٹ کی پٹّی سے ٹکرا گئیں اور وہ کھاٹ پر دھم سے گر پڑی۔ میکو نے جھُک کر اُس کے شانے تھام لئے اور دھیرے دھیرے باہوں کو سہلا کر کہا، چوٹ تو نہیں آئی بھوجی۔ دراصل تم ہو بھی ایسی دھان پان کہ ذرا ہوا لگی اور لہرا گئیں۔ یہ کہہ کے اُس نے آہستہ سے گدگدایا۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی، مگر ایسی جیسے کسی نے کلی کو ناخنوں سے کھرچ کر کھول دیا ہو۔ میکو کی آنکھیں نشیلی ہو گئیں اور وہ پٹّی پر بیٹھ گیا اور گدگدانے لگا۔ وہ دھیرے سے بولی۔ کیا کرتے ہو بھیّا لیکن دفعتہ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی رگوں میں بجلی کی لہریں دوڑ رہی ہیں اور اس کا سر چکرا رہا ہے۔ میکو نے کھاٹ پر آرام سے بیٹھتے ہوئے اُس کا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ وہ سسکیاں لے لے کر کانپنے لگی اور اس کی نگاہوں کے سامنے پیلی پیلی سی پگیا کی تہیں کھُلنے لگیں۔ یہاں تک کہ ساری فضا میں پیلی پیلی سی پگیا چھا گئی۔ اور وہ اس دلکش بسنتی چھاؤں میں سرسوں کے پھول کی طرح کھِل اُٹھی، پر اچانک اُسے کسی مِل کی چمنی سے دھوئیں کا بادل نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ جو دیو کی طرح آگے بڑھ کر پیلی پگیا کے اُس بسنتی شامیانے کو نگل گیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی اس لئے کہ وہ کالا خونی دیو اب اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے نگل لینے کے لئے اس کی گردن دبوچ کر اس کے خون کا آخری قطرہ تک پی جانے کے لئے۔ اس نے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد جب میکو اُن دو روپوں کا غلّہ اور لکڑی لینے چلا گیا تو وہ دھیرے دھیرے کھاٹ سے اُٹھی۔ وہ تھکن کے چُور ہو گئی تھی۔ لیکن ہمّت کر کے اُس نے جھاڑو اٹھائی اور دھیرے دھیرے ساری کوٹھری بہار کر صاف کر ڈالی۔ اتنے میں میکو سودے رکھ کر مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اُس نے

جلدی جلدی چولہے میں آگ جلائی۔ دھویں اور آنچ کی چمک سے محسوس ہوا کہ گھر میں زندگی نے قدم رکھے اور در و دیوار میں جان آ گئی۔ وہ دال کی ہانڈی اُتار رہی تھی کہ پھر کھٹ کی آواز ہوئی اور اُس نے مُڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہی بلی تھی۔ بیتاب کی اس کے دانتوں میں چوہیا دبی ہوئی تھی۔ وہ زیرِ لب ایک لمحے کے لئے مسکرائی اور بولی۔ مل گیا اسے بھی کھانا۔ بہت بھوکی تھی بے چاری۔

جب وہ کھانا پکا کے اُٹھی تو اچھی طرح شام ہو چکی تھی۔ وہ چولھے پر کھانا رکھ کر کوٹھری کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ آج اُسے اپنے بھوکے پیاسے موہن کا بڑا انتظار تھا۔ یارے کسی طرح وہ گھڑی آ ئی۔ دُور ہی سے وہ اپنے موہن کو دیکھ کر بے چین ہو گئی۔ جلدی سے کواڑ کھولے اور دوڑ کے لوٹے میں پانی لے آئی۔ جب تک اُس کے موہن نے ہاتھ منہ دھویا، اُس نے گرما گرم بھوجن پروس دیا۔ موہن تین وقتوں کا ایسا بھوکا تھا کہ جلدی جلدی کئی لقمے کھا کر آدھا لوٹا پانی پی چکا تب بولا۔ ارے میں تجھے بُلانا تو بھول ہی گیا۔ آ۔ بیٹھ جا۔

نہیں تم کھالو میں بعد میں کھالوں گی۔

نہیں تجھے میری جان کی قسم۔

وہ جلدی سے بیٹھ گئی اور لقمہ بنا کر چاہا تھا کہ منہ میں رکھے کہ موہن نے پوچھا۔

تو ٹھیک ٹیم پر پہنچ گیا تھا میکو؟

معاً اس کا ہاتھ ہل گیا اور منہ کا لقمہ گال سے ٹکرا گیا۔ موہن نے کہا بیچارہ راستے میں مل گیا۔ میں نے تین بجے تک ٹھیلہ کھینچا تھا۔ دو روپئے ملے تھے۔ سوچا میکو کے ہاتھ جلدی سے بھجوا دوں کہ تو راہ تک رہی ہوگی!! اچانک وہ سارے جسم سے کانپ اُٹھی اور اُس کی آنکھوں کے دیدے مرُدے کے دیدوں کی طرح باہر نکل آئے۔ موہن گھبرا گیا اور اُس نے لقمہ موس کے مُنہ میں رکھتے ہوئے کہا لے کھالے۔ پچھلی تین وقت کے فاقے میں تیرا یہ حال ہو گیا۔ تو بھلا کیا ساتھ دے گی میرا۔

اُس نے لقمہ منہ میں گھماتے ہوئے محسوس کیا جیسے زہر کھا رہی ہے۔

بے گھر لوگوں کی آبادکاری

اس وقت تک مغربی پاکستان سے آئے ہوئے بے گھر لوگوں کے ایک ہزار دیہاتی خاندانوں میں سے ۹۹۰ خاندانوں کو انڈین یونین میں منظور شدہ معیار کے مطابق مالی امداد اور زمینیں دیدی گئی ہیں اور اب صرف ہزاروں میں سے دس باقی رہ گئے ہیں جنھیں زمینیں الاٹ کی جائیں گی۔

مغربی پاکستان سے آئے ہوئے چھ لاکھ ۲۶ ہزار خاندانوں کو زمینیں دی جا چکی ہیں اور صرف تقریباً پانچ ہزار خاندان زمینوں کی الاٹمنٹ کے منتظر ہیں۔

آجکل مؤخرالذکر خاندانوں کے روزی کمانے والے افراد کو عارضی طور پر زراعت کے مختلف پیشوں اور غیر زرعی کام کاج میں کھپا دیا گیا ہے۔

بے گھر لوگوں کو انفرادی حیثیت سے شمار کرنے سے (اور اگر اس شمار میں زمین پانے والے خاندانوں کے افراد بھی شامل کئے جائیں) اور پوربی بنگال سے آئے ہوئے ایک لاکھ پچاسی ہزار ان بے گھر لوگوں لوگوں کو جنھیں زمینیں الاٹ کر دی گئی ہیں اس تعداد میں شامل کر لیا جائے تو پاکستان سے آئے ہوئے ایسے بے گھر لوگوں کی مجموعی تعداد جو زمینوں کی کاشت میں مشغول ہیں یا ان کی پیداوار گزر بسر کر سکتے ہیں چالیس لاکھ ہو جاتی ہے۔ پوربی بنگال کے بے گھر لوگوں کی آبادکاری ابھی اپنے ابتدائی دور میں ہے اور ابھی متعلقہ امداد و شمار میں کچھ عرصہ تک اضافہ کی طرف رجحان رہے گا۔

کاشت کی زمینوں پر آباد ہونے والے خاندانوں کو زمین کی قسم۔ آبپاشی کی آسانیاں اور ہر خاندان کی وسعت کے لحاظ سے ۱۰ ایکڑ سے ۲۰ ایکڑ تک زمین دی گئی ہے۔ زمینوں کی الاٹمنٹ کے ساتھ ہی ہر ایک خاندان کو ۲ ہزار روپے تک کے قرضے دئے جاتے ہیں۔ جن کی رقم بھی مقامی حالات میں فرق کے باعث مختلف ہوتی ہے۔ ملک بھر میں اس وقت تک جو قرضے تقسیم کئے گئے ہیں ان کی مجموعی رقم ۲ کروڑ ۶۰ لاکھ روپیہ سے بھی زیادہ ہے۔

یدھشٹر کمار

نفسیاتی تجزیہ اور ہارمک نفسیات

دنیائے نفسیات کو حال ہی میں اس کے بہت سے مقتدر لیڈروں کے انتقال کر جانے کی وجہ سے نقصان عظیم اٹھانا پڑا ہے - ان لیڈروں میں فرائڈ (Freud) اور میک ڈگل (Mc Dougall) کو آسانی سے صف اوّل میں جگہ دی جاسکتی ہے - کیونکہ انہوں نے بیش قیمت اور لازوال ورثہ چھوڑا ہے - انہوں نے عوام کو نفسیات کی دو نئی قسموں سے روشناس کرایا - ان دونوں قسموں میں بہت سی چیزیں ایک دوسرے سے مشترکہ ہیں - لیکن ان میں انتہا درجہ کا بنیادی اختلاف بھی ہے - یہ دو تو سسٹم دیگر تمام طریقوں سے اس لحاظ سے سبقت لے گئے ہیں کہ وہ جماعتی طرز عمل کی دنیا میں پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لئے لاثانی استعداد رکھتے ہیں -

فرائڈ اور میک ڈگل نے بالکل ہی مختلف ابتدائی نقاط سے کام شروع کیا - جن طریقوں سے انہوں نے انسانی طرز عمل کے بڑے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی - وہ بھی مختلف تھے - لیکن آخرکار وہ ایک ہی نتیجہ ظاہر کرتے معلوم ہوتے ہیں - کیا اس پر بھی ان ہر دو نفسیاتی نظاموں کو ایک دوسرے کے مخالف جیسا کہ اس وقت ہیں رہنے دیا جائے؟ کیا ان دونوں کی مصالحت سے ایک توانا اور عملی نفسیات کا قیام عمل میں لایا جائے جوان دونوں نظاموں کے قابل زیست عناصر کی ایک ہم آہنگ آمیزش ہو - "نفسیاتی تجزیہ اور سماجی نفسیات" کے دیباچے میں ہم یہ مطالعہ کرتے ہیں - صاف بات یہ ہے کہ یہ لیکچر اس امید پر شائع ہو رہے ہیں - کہ ان دو قریبی تعلق رکھنے والوں اور امدادی طریقوں کے سمونے کے کام کو تیز تر کر دیا جائے - اور یہ سمونے کا کام ایسا ہوگا - کہ اس سے ان دونوں نظاموں کے نقائص سے بچتے ہوئے دونو کے بہترین خواص یکجا کئے جائیں گے - اوپر جو دو سوال اٹھائے گئے ہیں - ان کا مختصر اور اجمالی جواب اس مضمون میں دیا جائیگا - اور اس امر کی کوشش کی جائیگی کہ ایسے ذرائع بیان کئے جائیں جن سے ہارمک نفسیات (Hormic Psychology) کا امتزاج فرائڈ کے نفسیاتی تجزیہ سے کیا جائے کیونکہ یہ میرا پختہ یقین ہے - کہ میک ڈوگل کے طریقہ کار کو فرائڈ کے طریقہ کار سے ملانے سے بڑا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے -

علم نفسیات کے بہت سے نظام جو آج کل رائج ہیں - ان میں سے صحیح معنوں میں صرف محرک نفسیاتی تجزیہ اور ہارمک (Hormic) نفسیات ہی ہیں وڈورد ین Wood Worthian نظام جس کے ساتھ دکھلاوے کے طور پر محرک ہونے کا دُم چھلا لگ گیا ہے - اس امر کا سب سے کم مستحق ہے - کیونکہ باقی تمام نظاموں سے وہ طرز عمل (Behaviourism) کے سب سے زیادہ قریب ہے - نفسیاتی تجزیہ اور ہارم ازم (Hormism) میں ایک اور بھی مشترکہ خصوصیت ہے جو ان دونوں کو دوسرے نظاموں سے بالکل الگ کرتی ہے - یہ اُن کی لامکانیت ہے - یعنی ان کے نزدیک دماغ کی جگہ اعصابی نظام میں نہیں ہے - یہ تصور کرنا عین ممکن ہے - کہ دونو نظاموں کا مکمل ڈھانچہ ایسی بنیادوں پر کھڑا کیا جائے - جس سے تمام جسمانی عناصر کے نشانات نکال دئے گئے ہوں -

میک ڈگل نے غیر معمولی نفسیات میں ان خاص نقاط پر بحث کی ہے - جو کہ اس کے طریقے اور نفسیاتی تجزیے میں مشترکہ ہیں - دونو قاعدے مقصد کے ساتھ منزل مقصود کی طرف بڑھنے کو انسانی طرزِ عمل کا بنیادی نقطہ تسلیم کرتے ہیں - اور یہ با مقصد کوشش ایک خاص جنس کے افراد میں منزل مقصود کے بارے میں اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے ذرائع کے بارے میں ایک خاص قسم کی عوامیت کا اظہار کرتی ہے -

نفسیاتی تجزیہ کے چیدہ چیدہ خواص میں سے جو کہ ہارمک نفسیات سے اختلاف ظاہر کرتے ہیں - مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں - اول نفسیاتی تجزیہ کچھ تو اس اصول پر مبنی ہے کہ عیش و عشرت کرنا ہی سب سے

اچھی چیز ہے۔ اور انسانی محرکات کے تصور میں یہ ہر معاملے میں جنسی اور ایک ہی وجود کی تھیوری کو ماننے والی ہے۔ حالت غیر شعوری کو بڑا اہم خیال کرتی ہے۔ دوسرا فرائڈ نے محرکات (Instinct) اور جذبات میں فرق کو واضح نہیں کیا۔ آخری یہ کہ دباؤ کی مشینری جو نیم شعوری اور غیر شعوری طبقوں میں کام کرتی ہے ایسے حیران کن الفاظ میں بیان کی گئی ہے کہ فرائڈ کے نظریے کے مطابق دماغی نقشے کی ایک واضح تصویر کھینچنا نہایت دشوار ہے۔ اختلافات کے ان نقاط کے علاوہ ایک نقطے کا مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ نفسیاتی تجزیہ بعض جگہوں پر مشینری کی طرح جبریہ ہے۔

اختلافات کے نقائص پر بحث کرتے ہوئے میک ڈوگل نفسیاتی تجزیے میں نقائص تصور کرتا ہے اور اسے یوں پیش کرتا ہے۔ گویا فرائڈ کے پیروین کو ہارمک (Hormic) نفسیات کے ماہر کے ساتھ ملنے سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ حالانکہ آخر الذکر کو نفسیاتی تجزیہ سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا وہ اپنے نفسیاتی تجزیہ اور "اجتماعی نفسیات" میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کس طرح فرائڈ باقاعدہ طور پر میک ڈوگل کے نظریے کے قریب ہوتا رہا۔ حالانکہ فرائڈ محرکات کے بارے میں ہمہ گیر جنسی ماہیت سے اپنے نظریے کی ابتدا کرتا ہے۔ تاہم وہ غیر شہوتی محرکات کے ایک مجموعے کی ہستی کو تسلیم کرتا ہے۔ اور بعد میں اُس نے موت کی حس اور جارحانہ حس کو بھی اپنی فہرست میں ایزاد کر لیا۔ فرائڈ کے نئے لیکچروں میں میک ڈوگل کو ایک اور حس یعنی خوف کی حس کا ثبوت ملتا ہے۔ اور میک ڈوگل اپنی تصدیق کی مہر ثبت کر کے فرائڈ کی حسب ذیل سطور کا حوالہ دیتا ہے۔ ابھی تک میرے دل میں ایک قسم کا یقین ہے۔ جس کے لئے میرے پاس کوئی وجہ جواز نہیں۔ کہ تمام حسیں ایک ہی قسم کی نہیں ہو سکتیں۔ یہ بات میری سمجھ میں آتی کہ ہم نے غیر شہوتی جارحانہ اور تباہ کن کارروائی کی ہمہ گیری کو کیسے نظر انداز کر دیا ہے۔ اور زندگی کی تشریح کرتے ہوئے اس کو مناسب اہمیت دینا کیوں بھول گئے کسی کے حقوق غصب کرنے کی خواہش فطرتی۔ ایک علیحدہ اور انسانی حس رجوع ہے۔ فرائڈ اگر صرف نفرت آور خود نمائی کی نازک تحریک کے علیحدہ وجود کو تسلیم کر لیتا۔ تو ہارم ازم (Hormism) کی طرف اس کی تبلیغ مکمل ہو جاتی۔

میک ڈوگل کی فرائڈ کے بارے میں نکتہ چینی یہاں تک محدود ہے۔ کہ نفسیاتی تجزیہ کا مشہور لیڈر جو کہ انسانی فطرت کا کافی تجربہ رکھتا تھا۔ اور جس کا نادیہ نگاہ نہایت وسیع تھا۔ نئی حقیقتوں کا جوں ہی کہ وہ اس کے سامنے آتی تھیں۔ اعتراف کر لیتا تھا۔ اور اُن کا چیلنج قبول کر لیتا تھا۔ ایک کم اہلیت والا انسان کشمکش و پیچ میں پڑ جاتا اور نتیجے کے طور پر اپنے اولین نظریہ پر بڑی سختی کے ساتھ قائم رہتا۔ فرائڈ نے اُس چیز کو پا لیا۔ جس کا احساس میک ڈوگل کر سکا یا کیا تو بہت دھندلا۔ وہ یہ کہ انسانی دماغ کی محرکیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے۔ کہ حسوں کی ابتدا اور ان کی ترقی کی ارتقائی تشریح کی جائے۔ مختلف حسوں میں اختلاف ایک منبع سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح بہت طاقتور جسمی توانائی کی ضرورت اس واسطے ہوتی ہے کہ منبع کو اکٹھا رکھا جائے۔ اور جیسا کہ قدرت میں ہم دوسری جگہوں پہ دیکھتے ہیں۔ قوت کا ایک اور ذریعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو کہ حسوں کو الگ الگ اطراف میں کھینچتا ہے۔ فرائڈ نے ان دو ذرائع کو حیات اور موت تصور کیا۔ وہ کہتا ہے۔ کہ میں نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ علاوہ جاندار مادہ کے قائم رکھنے اور اس کو بتدریج بڑے سے بڑے حصوں میں جوڑنے والی حس کے برعکس ایک اور مخالف حس ضرور ہو گی۔ جو کہ ان اجزا کو علیحدہ کر کے پھر انہیں غیر جاندار حالت میں پہنچا دے۔ یا دوسرے لفظوں میں موت کی حس اور حیات کی حس۔ اسی طرح زندگی کے کرشمے کی تشریح ان دونوں حسوں کے کام اور باہمی مخالف اثروں سے کی جا سکتی ہے۔ ان حسوں کے باہمی عمل اور ردِ عمل سے وہ تمام تیرہ حسیں پیدا ہوئیں۔ جس کا کہ اُس نے "خاکۂ نفسیات" (نقشۂ نفسیات) میں ذکر کیا ہے۔ حاصل کرنے کی حس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی ایک حس ہو۔ جو کہ بھوک کی حس سے اختلاف حاصل کرنے کے دوران میں ہے۔ اور ایسی حسیں اختلافی مدارج کی تشریح ہیں"۔ فرائڈ ساری عمر دماغی بیماری کے شدید مریضوں کا علاج کرتا رہا۔ اس لئے اس کے پاس ایسے مواقع آئے۔ جو کہ میک ڈوگل کو حاصل نہیں ہوئے۔ کہ وہ دماغی بناوٹ کی ارتقائی اور اولین حالت کا مطالعہ کر سکے۔

حسوں کی فہرست کو لمبا کرنے سے یہ کیونکر سمجھ لیا جائے۔ کہ یہ ابتدائی نظریے کو رد کرنے کے مترادف ہے کیا میک ڈوگل نے خود اپنی پہلی فہرست میں ایزادی نہیں کی۔ اس مرحلے پر ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے ہر ایک حس کی ابتدا اور اس کے نشو و نما کا واضح بیان۔ اور

اس ضرورت کو کچھ حد تک فرائڈ کے نفسیات نے پورا کر دیا ہے۔ آؤ ہم دونو پہلوؤں کو سامنے رکھیں۔ جیسوں کے ہارمک تجزیہ اور فرائڈ کی ارتقائی تصویر اور اوّل الذکر کو مؤخر الذکر سے مکمل کرنے کی کوشش کریں۔ تب شاید ہم انسانی فطرت کو سمجھنے کے مقصد کی جانب قدم بڑھائیں گے۔

وہ حالات جس میں میک ڈگل کا دعوےٰ ہے۔ کہ فرائڈ اس کی نفسیات کے قریب تو پہنچ گیا ہے حالتِ غیر شعوری ہے۔ لیکن یہاں ہمارے پاس اس امر کو ماننے کے لئے کافی ثبوت ہے۔ کہ ہارمک نفسیات کو نفسیاتی تجزیہ کی مدد سے درست اور مکمل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مسئلے کے بارے میں میک ڈگل کے دلائل اس طریقے پر مختصر بیان کئے جا سکتے ہیں۔ فرائڈ کی "حالت غیر شعوری" ایک مبہم ترکیب ہے۔ نفسیاتی تجزیے کی تھیوری کے ابتدائی دَور میں فرائڈ نے اس ترکیب کو دماغی گہری تہوں کی بناوٹ اور تفاعل (کام) کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا۔ نفسیات میں دماغی بناوٹ اور دماغی تفاعل میں تمیز ایک بنیادی چیز ہے اور جب تک اس تمیز کو واضح طور پر نہ سمجھا جائے۔ تھیوری میں ترقی ممکن نہیں۔ فرائڈ نے خود اس تمیز کی ضرورت کو مبہم طور پر تسلیم کیا۔ اور ایک نیا لفظ (Id) بناوٹ کو ظاہر کرنے کے لئے ایجاد کیا۔ جو کہ تفاعل سے علٰحدہ ہے۔ نئے لیکچر میں ہم پڑھتے ہیں "اب ہم لفظ غیر شعوری کو سسٹم یعنی نظام کے معنوں میں استعمال نہیں کریں گے۔ اور جس چیز کو ہم اس وقت تک اس نام سے یاد کرتے رہے ہیں اسے ہم اب ایک بہتر نام سے پکاریں گے اور آئندہ اسے (Id) کہیں گے۔

بناوٹ اور تفاعل میں تمیز درحقیقت بہت اہم ہے۔ لیکن اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے میک ڈگل حد سے بڑھ گیا ہے اور اس کے دل میں ایک زبردست کشمکش پائی جاتی ہے کہ دماغی بناوٹ اور تفاعل میں ایک سیدھے سادے تعلق پر زور دیا جائے۔ بناوٹ کے بارے میں اس کا یقین ہے کہ تفاعل کے ذریعے وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ تفاعل کے تجزیے سے ہم اُس کی متعلقہ بناوٹ کو نتیجے کے طور پر بغیر کسی دقت کے اخذ کر سکتے ہیں۔

ہمارا یقین ہے کہ میک ڈگل کی ہارمک نفسیات میں بھی جذبات کے بارے میں اس بات کا اشارہ ہے۔ کہ ایسا نتیجہ جذبات کے بارے میں اخذ کیا جانا ممکن ہے۔ یہ وہی نقطہ ہے جہاں ہارمک نفسیات نے غلطی کی ہے۔ اور یہاں اسے نفسیاتی تجزیے کی مدد سے درست کرنے کی ضرورت ہے۔ سیدھے سادے قسم کا نتیجہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ صرف ان دماغی بنیادوں کے ساتھ ممکن ہو سکتا ہے۔ جو کہ ارتقا کی ابتدائی سطحوں پر کام کر رہے ہیں۔ لیکن مہذب انسان کے تعلق میں جس پر بہت سی قسم کے دباؤ۔ ڈر اور اعصابی بیماریوں کا بوجھ ہے۔ یہ تعلق اتنا دور کا پیچیدہ اور غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ کہ اکثر دیتے ہوئے تفاعل سے ایک غلط بناوٹ حاصل ہو جاتی ہے نفسیاتی تجزیہ نے تفاعل سے بناوٹ کے متعلق جلد بازی سے نتیجہ نکالنے میں تنبیہہ کر کے ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ لیکن میک ڈگل اس نقطہ کو ماننے پر رضامند نہیں۔ اپنی تصانیف میں ایک جگہ اُس نے اپنے ایک خواب کا تجزیہ کرتے ہوئے نشانات کی تشریح غیر علمی اور بھگانہ طریقہ پر کی ہے۔ کہ ہم حیران ہوتے ہیں۔ (جس نے مگنیٹزم کے (Inductive) طریقوں کی سخت مشق کی ہو۔ بھلا اس قسم کی تشریح کس طرح کر سکتا ہے) کہ ایک مہذب انسان کی دماغی بناوٹ جو کہ پیچیدہ اور ناقابل تشریح راستے سے ہوتی ہوئی تغافل کی طرف رجوع کرتی ہے۔ کا خاکہ صرف نفسیاتی تجزیے کے طریقے سے بنایا جا سکتا ہے۔

تیسرا اہم میدان جس میں فرائڈ کو میک ڈگل کے قریب پہنچتا ہوا خیال کیا جاتا ہے۔ احساسات کا ہے۔ نفسیاتی تجزیے کی ابتدائی منزلوں میں ابتدائی عیش و عشرت کا اصول پیش پیش رہا۔ اگرچہ اس وقت بھی فرائڈ کے خیال میں دماغی محرکاتی ڈھانچہ کی ہارمک نوعیت تھی۔ لیکن جنگ کے بعد اس بڑے رہنما نے نفسیاتی عیش و عشرت کے اصول کی پرزور وکالت چھوڑ دی۔ اور اپنی کتاب "عیش و عشرت سے پار" میں اس نے بنیادی تھیوری میں احساسی تبدیلیاں کر دیں۔ اصلیت کے اصول کو زیادہ گہرا اور بہ نسبت عیش و عشرت کے بہت بنیادی اصول کے تسلیم کیا گیا۔ جہاں تعریف مناسب ہو۔ وہاں ضرور کرنی چاہیئے۔

اس کے علاوہ ایک اور طبقہ ایسا بھی ہے۔ جہاں کہ نفسیاتی تجزیہ کار اور ہارمک نفسیات کا ماہر مل سکتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ خیالات کر کے مستفید ہو سکتے ہیں۔ وہ طبقہ "تجویز" (Suggestion) کا ہے۔ جس میں ہپناٹزم (ہپناٹیسی) تجویز بھی شامل ہے "تجویز" کا نظریہ ہارمک نفسیات کی رو سے حیران کن ہے اور کئی مقامات پر جس میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ سماجی نفسیات میں میک ڈگل "تجویز" کی تشریح شدید جذبات کو

ہمدردانہ طریقہ سے ابھارنے کے اصول کی بنا پر کرتا ہے۔ اس اصول کی بنا پر تجویز دماغ کی محرکاتی بناوٹ کے جاننے والے پہلو سے ماخذ کئے ہوئے نتائج سے تعلق رکھتی ہے۔ اور یہ تشریح ایسی ہے۔ جو کہ حقائق کے لئے بہت کافی ہے۔ لیکن بعد ازاں میک ڈگل تشریح کی وجہ جواز بدل کر "تجویز" کی بنیاد رضامندی یا (Submission) مان جانے پر رکھتا ہے۔ جب اسے ہپناٹزم رہپناٹیسلا تجویز کے بیان میں دقت پیش آئی۔ تو اسے رضامندی کی حس کی امداد مجبوراً لینی پڑی۔ میرا خیال ہے۔ کہ اس نئی تجویز کی بنیادیں ناپائیدار ہیں۔

میرے ایک طالب علم نے رضامندی کی حس پر وار کیا ہے۔ اپنے ایک سنجیدہ مضمون میں وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہ مان جانے یا رضامندی کی حس صرف خوف کی تبدیل شدہ حالت ہے۔ اگر اس کے دلائل کو صحیح مان لیا جائے۔ تو فرائڈ کی غیر معمولی نفسیات سے "تجویز" کی زیادہ صحیح تصویر پیش کرتی ہے۔ ضمنی طور پر یہاں یہ بیان کر دینا اچھا ہوگا۔ کہ میک ڈگل نے بھی اپنے خیالات اتنی ہی دفعہ تبدیل کئے ہیں۔ جتنی دفعہ فرائڈ نے ہارمک تھیوری کی نشوونما کی تین واضح منزلیں ہیں جو کہ سماجی نفسیات ایک خاکہ اور "قوتیں" کے زیر عنوان ہیں۔ جبلتوں کی ہارمک فہرست جو کہ پہلے مرحلہ پر اکائی سے شروع ہوئی۔ (جو کہ دس سے کم تھیں) دوسرے مرحلے پر تیرہ تک جا پہنچی۔ اور آخری مرحلے پر بیس پر جا کر ختم ہوئی۔ شدید جذبات کے تصور میں بہت سی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ احساسات کی نوعیت میں بھی کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ (Hormic) ہارمک نفسیات کی عام اسکیم میں بہت سے پیچیدگئے ہیں۔ جو کہ تشریح طلب ہیں۔ ادراک کا درجہ۔ خاکہ کا مطالعہ کرنے والے ایک عام طالب علم کو آسانی سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اخلاقی جذبات کی تھیوری اور یقین اور شک کی تھیوری بہت سی تفاصیل سے پُر ہیں۔ ہارمک نفسیات میں بھی اتنے ہی زیادہ اور سنجیدہ نقائص ہیں۔ جتنے کہ میک ڈگل کے خیالات کے مطابق نفسیاتی تجزیہ میں ہیں۔

آخیر میں میں اس بات پر زور دوں گا۔ کہ ان دونو لازم و ملزوم اور متعلقہ طریقوں کو ایک دوسرے میں سمونے کا کام سرعت سے کیا جائے۔ رانڈ اس بارے میں ایک اہم قدم پہلے ہی اٹھا چکا ہے۔ اب ہارمک نفسیات کے ماہر کی باری ہے۔ کہ وہ نفسیاتی تجزیہ کار کے پیش کئے ہوئے سمجھوتے لبیک کہتا ہوا اس کا خیر مقدم کرے۔ باہمی قربت کا قدم خود بخود اٹھ جانا ہے۔ بہ شرطیکہ اول الذکر یہ دو باتیں تسلیم کر لے۔ کہ اول اس کے محرکات کی سکیم محدود ہے۔ اور کہ اس کی تھیوری کو ایک ارتقائی رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ جس ڈھنگ پر کہ فرائڈ نے پیش کیا۔ دوم کہ فرائڈ کے غیر شعوریہ کو یک قلم رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں بڑے قیمتی اجزاء ہیں۔ جو کہ دماغی بناوٹ کا صحیح نقشہ پیش کرنے کے کام آ سکتے ہیں۔ آخری یہ کہ نفسیاتی تجزیہ کا طریقہ انسانی مزاج کے پوشیدہ مقاصد کو ظاہر کرنے کے لئے ایک بڑا طاقتور ہتھیار ہے۔

خوراک کا خبرنامہ

۵ر فروری ۱۹۵۱ء

بہار۔

حصول غلہ کے لئے حکومت بہار کی کوششوں سے تین لاکھ من سے زیادہ اناج حاصل کیا گیا ہے۔ جعلی راشن کارڈوں کے خلاف کارروائی کرنے سے بارہ ہزار من کی بچت ہوئی ہے۔ پٹنہ میں ۸۵ ہزار من اناج ماہانہ لگتا ہے۔

بمبئی۔

ضمنی خوراک کی پیداوار بڑھانے کے سلسلہ میں حکومت بمبئی کی کوششوں سے سال رواں میں چودہ ہزار ٹن زائد آلو اور ۲۸ ہزار ٹن زائد سبزیاں ہونے کی توقع ہے۔

اتر پردیش۔

ماہی پروری کی تحقیق کے لئے عنقریب مرزا پور میں ایک مرکز کھولا جا رہا ہے اس مرکز پر پہلے سال میں ۵۸ ہزار روپیہ خرچ ہوگا۔ ماہی پروری کے لئے ٹانڈہ کی آبشاروں کے نزدیک بھی چھ تالاب تعمیر کئے جا رہے ہیں خوراک میں اضافہ کرنے کے لئے راشن کی دکانوں پر خشک دودھ اور عراقی کھجوریں دینے کا انتظام کیا گیا ہے خشک دودھ مفت بانٹا جائے گا اور چھ مہینے تک ایک ایک بچہ کو چالیس گرین روزانہ کے حساب سے ملے گا۔ یہ دودھ بچوں کے عالمی امدادی فنڈ سے ملا ہے کھجور ایک روپے کی دو سیر بارہ چھٹانک کے بھاؤ سے بیچی جائے گی۔ یہ کھجور سیلاب زدہ علاقوں میں بھی بانٹی جائے گی۔

سید مشکور عظیم

ناصح اور اُردو شاعری

اُردو شاعری میں ناصح، زاہد، واعظ اور شیخ وغیرہ پر جو لعنتیں بھیجی گئی ہیں ان سے کون واقف نہیں؟ مگر یہ وجہ آج تک سمجھ میں نہ آسکی کہ آخر ان غریبوں پر یہ سب دشنام کی عنایت کیوں؟ ۔ رقیب تو بے چارہ خیر روسیاہ ہے ہی —! معاف کیجئے گا رقیب کے لئے میں نے لفظ "بے چارہ" خود استعمال کیا ہے۔ مجھے نسبت عاشق کے رقیب سے زیادہ ہمدردی ہے۔ کیوں؟ گو اس کا جواب ہے تو مشکل تاہم مجھے اس کی عالی ظرفی بہت پسند ہے۔ کیا کوئی عاشق عالی ظرفی کی ایسی کوئی دوسری مثال پیش کر سکتا ہے۔ وہی کیا جو غالب نے کہا ہے؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

آپ چاہے اسے محبوب کے شیریں لبوں کا اعجاز کہہ لیجئے مگر میں تو رقیب کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ذکر تھا کچھ ناصح کا۔ حیاں ایک رقیب کو کچھ کا تعلق ہمارے عاشق کے رشک و حسد کے جذبے پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ناصح اور واعظ وغیرہ وغیرہ تو بزرگ ہیں۔ بجنسہٖ ایسے ہی بزرگ جیسے آپ کے اور ہمارے۔ بھلا کوئی بزرگوں پر بھی نکتہ چینی کرتا ہے۔ غالباً آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ع

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

غالب نے حقیقتاً انتہائی دیانت داری و کمال معصومیت کے ساتھ غالباً ایک جگہ اقرار بھی کیا ہے؎

ماں پیچ سے شیخ جو دھوئی کرے
اک بزرگ ہیں کہ ہم جھٹلا گیا

ناصح اور عاشق کے تعلقات کی کب ابتدا ہوئی اور نا خوشگواری کیسے پیدا ہوئی بظاہر تو اس کا جواب بہت مشکل ہے اور تاریخ ادب اردو اس کا جواب دینے سے قاصر بھی۔ تاہم بہت چھان بین کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ناصح عاشق کا دوست تھا اور اکثر و بیشتر ملتا یا از راہ ترحم عاشق کو نصیحتیں کیا کرتا تھا۔ مگر عاشق پند و نصائح کے اس دفتر بے معنی کو ایک داستان سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا؎

سودا کبھی نہ ناصح و واعظ کی گفتگو
آزردہ دل ہے حرفِ شنیدہ دور کا

جب شب فراق میں تنہائی مارے ڈالتی تھی اور نیند عاشق کی آنکھوں سے کوسوں دور ہوتی تھی تو اس وقت کسی قصہ گو کی ضرورت محسوس کیا کرتا تھا اور افسانہ خواں کے نہ ملتے پر وہ ناصح کو آنے کی اجازت دے دیا کرتا تھا؎

لگ جائے آنکھ میری کوئی دم شبِ فراق
ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

لیکن عاشق اس دوستی سے ذرا گھبرا سا گیا تھا۔ اکثر اس کے دوست و احباب برسبیل تذکرہ اس دوستی پر طنز کر دیا کرتے تھے؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب کو یہ دوستی پسند نہ تھی۔ اس نے ایک روز عاشق سے استفسار کیا تو اس نے کہا؎

نہ ملوں گا نصیحت پہ نہ سنتا ہی تو کیا کرتا
کہ ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

اور یہ محبوب کا ہر ہر بات میں نام لینا عاشق کے لئے اچھا ہی ثابت ہوا، ورنہ تو ایک دن وہ عاشقی سے ہاتھ دھو بیٹھتا؎

آج ناصح نے کہیں کا بھی نہ رکھا تھا مجھے
وہ تو یہ کہیے کہ تیری یاد آڑے آگئی

القصہ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عاشق نے ناصح سے ملنا جلنا ختم کر دیا مگر ناصح کو اپنا وتیرہ نہ بدلنا تھا اس نے نہ بدلا۔ عاشق نے اس سے صاف صاف کہہ دیا؎

ترکِ الفت بجا سہی ناصح
لیکن اس تک اگر یہ بات گئی

لیکن صاحب توبہ کیجئے ناصح پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوا اور ایک دن برسبیل تذکرہ عاشق نے اس سے طنزاً پھر کہا؎

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھا اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہیں کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

ناصح پر اس طنز کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ زور و شور کے ساتھ اپنے وعظ کو جاری رکھتا۔ بے چارہ عاشق اس دفتر بے معنی کو سنتا سنتا عاجز آجاتا۔ مگر ناصح کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ آخر ایک دن عاشق نے صاف

صاف کہہ دیا کہ ؎

ناصح امت کر نصیحت جی مرا گھبرائے ہے
میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

شاید بطینت ناصح دشمن ہو لی ہی لینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی روش نہ بدلی تو عاشق حقیقتاً تعلقات ختم کرنے میں حق بجانب تھا۔ پہلے تو ناصح محض دوزخ و جنت۔ کفر و ایمان۔ نیکی و گناہ اور عذاب و ثواب ہی کا ذکر کیا کرتا تھا۔ مگر جب اس نے محبوب سے نہ ملنے کے متعلق گفتگو شروع کی تو عاشق نے بھی جل کر کہہ دیا ؎

یہ کیا تو نے کہا ناصح نہ جانا کوئے جاناں میں
ہمیں تو رہروؤں کی ٹھوکریں کھانا مگر جانا

یہ عاشق نے تنہائی میں نہیں بلکہ برملا کہا اور اسی وقت سے ان کے تعلقات منقطع ہو گئے۔ اور یہ حالت ہو گئی ؎

بات ناصح سے کرتا ڈرتا ہوں
کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

اس سے قبل جب کبھی ناصح آتا تو عاشق فرائض میزبانی ادا کرتا مگر اب جب بھی کبھی اس کے آنے کی خبر ملی تو بستر سے "مے و ساغر" اور کھانے کی دیگر اشیاء اٹھوا دیا کرتا ؎

اٹھوا لو منبر سے مے و ساغر ریاض جلد
آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے

عاشق نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ اب اکثر و بیشتر ناصح پر فقرے بازی کرنے لگا مثلاً ؎

عمامے کو اتار کے پڑھیو نماز شیخ
سجدے سے ورنہ سر کو اٹھایا نہ جائے گا

واہ رے دستار و اعظ بے ریا
بڑھ گیا طرۂ دم رو باہ سے

داڑھی کے ساتھ ہے سر اقدس گھٹا ہوا
اب تو کسی درماں سے ہے اک پشت خار کی

سر گھٹا نظر آتا ہے جب شیخ کا ناصر
اٹھ جاتا ہے خود ہاتھ اٹھایا نہیں جاتا

اور حد ہی ہو گئی کہ جوتوں کی چوری کا الزام بھی بے چارے ناصح کے سر تھوپ دیا ؎

اپنے جوتوں کو رکھیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

اب عاشق اس کو انتہائی بد مذاق سمجھنے لگا تھا۔ جب سے اس نے رعنائی خیال کو گناہ ٹھیرا دیا تھا ؎

رعنائی خیال کو ٹھیرا دیا گناہ
ناصح بھی کس قدر ہے مذاق سخن سے دور

ناصح بھی آخر انسان تھا فرشتہ تو تھا نہیں کب تک صبر کرتا یعنی خود اپنے متعلق تو حضرت عاشق کے یہ خیالات کہ ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اور بے چارے ناصح پر یہ بے بنیاد الزام ؎

ہم نے دیکھا طرف میکدہ جاتے تھے ریاض
اک عصا ہاتھ میں، عبا پہنے، عمامہ باندھے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

یاد آئی ہے خلد کی شاید
شیخ جی میکدے سے نکلے ہیں

حلقۂ رنداں میں شیخ تشنہ کام آ ہی گیا
آج اک صید میدہ زیر دام آ ہی گیا

یہ سن کر ناصح کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ اور شاید جھنک بھی پڑا یعنی بہ الفاظ دیگر اس نے (دیکھئے راز کی بات ہے) بے چارے عاشق کے پیچھے چند غنڈے لگا دیئے۔ ایک روز جب کہ عاشق غمگین و اداس مگر بیاں چاک، منہ جھلسا سر پہ دو رقیب سے پٹ کر محبوب کے گھر سے واپس آ رہا تھا غنڈوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بے چارے مجبور و لاچار کو گرفتار کر کے ایک تاریک قید خانے میں مقید کر دیا۔ ناصح نے پھر اپنی پرانی عادت کی مشق شروع کی جو سعی رائیگاں ثابت ہوئی عاشق نے قطعی طور پر کہہ دیا کہ چاہے جو ہو جائے۔ مگر زبان سے حق کی ہی صدا بلند ہو گی ؎

کر دیا ناصح نے مجھ کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

عشق آفت سہی مگر ناصح
کم نہیں کچھ تری نصیحت بھی

ناصح ناشناس غم ہو چکا اب بہت کرم
عشق عذاب جاں سہی آپ بھی کوئی کم نہیں

ناصح نے حضرت کو پھر سمجھانا شروع کیا۔ گھر دوسرے کر کر سمجھایا۔ زنداں کے عذاب سے ڈرایا مگر انھوں نے کہا ؎

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

انھوں نے ناصح سے یہ بھی کہہ دیا کہ ع

ہم میں باقی ہے طاقت پرواز

ہم جب چاہیں یہاں سے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ اور وہ بدستور ناصح کی گرفت میں رہا۔ جب ناصح نے مظالم کی شدت کی تو عاشق نے سپر ڈال دی اور خود کو سمجھایا ؎

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

عاشق کا ہاتھ گریبان تک ضرور پہنچا مگر اپنے ہی گریباں تک —! بہت جز بز ہوا۔ اور اس پر ستم بالائے ستم ناصح کی نصیحت ؎

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

مگر ناصح اس مزے کو بھلا کیوں بتلانے لگا تھا۔ عاجز آ کے عاشق سے بھلا کے

کی ٹھانی۔ اور ایک دن جب کہ ناصح شاید کہیں باہر گیا ہوا تھا انھوں نے باہر جھانکا تو ایک نیا ہی دربان نظر آیا۔ انھوں نے بغور دیکھا تو ع

بارے آشنا نکلا اس کا پاسباں اپنا

یہ نہایت خوش ہوئے اور پرانے آشنا نے بھی چشم پوشی کی حضرت صاف نکل گئے۔ مگر ۔۔۔ صدر دروازہ پر پہنچے تو ؎

اک مصیبت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
دوسری پڑ گئی ہے یہ مرے اللہ کیسی

صدر دروازہ پر ایک نہایت ہی خونخوار قسم کا ہٹا کٹا دربان پہرہ دے رہا تھا آخر بے چارے ع

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا

یہ اس شش و پنج میں تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں؟ معاً ان کے ذہن میں ایک ترکیب اجاگر ہوئی ع

اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بس کچھ پوچھئے نہ، پاسباں کے قدم لینا ستم ہی ہوگیا۔ اسے کچھ شک ہوا اور آپ ع

پھر وہی ہم وہی صیاد کا گھر

کا مصداق بنے۔

ناصح کو جب کل رپورٹ سنائی گئی تو اس نے نگرانی اور کڑی کر دی اور سزا ان کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ دو پہر رات کو اس کے پیر دبایا کریں ؎

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

آپ "راہزن" پر چونکئے مت، ایسے ثقیل الفاظ ہماری شاعری میں بکثرت موجود ہیں۔ معاف فرمایئے گا۔ یہ آپ کی سمجھ سے بالاتر چیز ہے، اس کو چھوڑ ہی دینا انسب ہوگا۔ اس کے علاوہ اگر آپ میری قابلیت پر کسی قسم کا شک نہ کریں تو اصلیت تو یہ ہے کہ خود میری سمجھ سے بھی یہ چیز بہت بالاتر ہے۔ خیر چھوڑیئے اس کو۔ اس کا ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ ویسے آپ ماشاءاللہ خود سمجھدار ہیں۔ سمجھ جائیں گے ہی۔ ہاں تو جب حضرت عاشق کے اوپر نگرانی کڑی ہو گئی تو یہ بہت ہی بگڑے۔ انھوں نے کہا ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

حشر کی دھمکیاں نہ دے واعظ
حشر برپا ابھی نہ ہو جائے

تو قیامت سے ڈراتا ہے ہمیں اے واعظ
آتی رہتی ہے شب و روز یہ میخانے میں

کونسی جنت کا واعظ کر رہا ہے ذکر تو
ایسی اک جنت تو ہم رندوں کے گھر میں بھی ہیں

میکشوں کی دوزخ و جنت ہے اے واعظ یہیں
ایک میخانے کے باہر ایک میخانے میں ہے

وہ اور ہیں جو طلب گار خلد ہیں واعظ
نگاہِ یار سلامت مجھے کمی کیا ہے

اسی پر بس نہیں کی بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ ع

دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

نتیجۃً ناصح نے مظالم میں اور شدت کر دی۔ اب تو یہ گھبرا گئے۔ انھوں نے زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ واعظ کی باتوں پر غور کیا تو دل و دماغ دونوں اس نتیجہ پر پہنچے ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کیونکہ گھبرا زیادہ گئے تھے۔ اس لئے طبیعت کا کسی نہ کسی طرح لانا ضروری تھا انھیں اپنی خیر اسی میں نظر آئی کہ ناصح کو دھوکا دے کر عارضی طور پر مصالحت کر لی جائے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ اب کے انھوں نے دل کے بجائے دماغ سے کام لیا اور اس نتیجے پر پہنچے ع

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ

الغرض یہ مصالحت پر راضی ہو گئے تو ناصح نے مطمئن ہو کر مشروط طور پر ان کو آزاد کر دیا۔ صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آجائے تو اس کو بھولا نہیں کہا جاتا۔ اس "بھولا" اُس "بھولا" سے کوئی مطلب نہیں جس کو سادہ لوح یا بیوقوف کہا جاتا ہے۔ فرض کیجئے آپ دوسرا ہی مطلب اخذ کرنا چاہیں تو وہ بھی ٹھیک ہے اور اس طرح عاشق کی عقلمندی کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنی عقل کا مظاہرہ انھوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کیا اور ناصح کی باتوں پر برا ماننا چھوڑ دیا۔ جب کبھی اس کی باتیں حد سے تجاوز کر جاتیں تو دل ہی دل میں یہ شعر پڑھ کر خود کو تسکین دے لیتے تھے کہ ؎

غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

وہ دن ہے اور آج کا دن پھر کبھی ان میں اور ناصح میں لڑائی نہیں ہوئی۔ انھوں نے ہمیشہ پند پیرانہ کو جوانانِ سعادت مند کی طرح جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھا۔ اگر حسنِ اتفاق سے کبھی کوئی بات ناگوارِ خاطر بھی ہوئی تو یہ نہایت عالی ظرفی کے ساتھ یہ شعر پڑھ کر ٹال دیتے ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

یہ تو خیر سب اپنی جگہ پر رہا۔ اس میں شک نہیں کہ شکست عاشق ہی کو اٹھانی پڑی اور شکست بھی غیر معمولی؛ اس لئے ہم کو بھی کہنا پڑتا ہے کہ ؎

آنچہ دانا کند، کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

ع-م

نئی کتابیں اور رسالے

انیس اینڈ شیکسپیر

مصنف سید غلام امام بی اے، ایل ایل بی ایڈوکیٹ لکھنؤ
پبلشر: ظہور حسین، مسلم پریس ۲۳ اکینگ اسٹریٹ لکھنؤ
ملنے کا پتہ۔ (سول ایجنٹ) الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

قیمت۔ چھ روپے۔ کاغذ، طباعت، جلد، جلد پوش عمدہ۔ ضخامت ۲۸۴ صفحات تقطیع ۲۲×۱۷/۸۔ کتاب انیس و شیکسپیر کی متعدد متعلقہ تصویروں سے مزین ہے۔

کتاب انگریزی میں ہے۔ فاضل مصنف نے یہ معرکۃ الآرا موازنہ بڑے غور وخوض اور مطالعے کے بعد پیش کیا ہے۔ شروع کے دو باب انیس اور شیکسپیر کے سوانح پر مشتمل ہیں تاکہ پڑھنے والوں کو دونوں عدیم المثال شاعروں کے تفکرات کا پس منظر سمجھنے میں کچھ آسانی ہو۔ ہندوستانی ادب میں انیس کا درجہ بہت بلند ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے حال ہی میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا تھا کہ اردو ادب میں غالب اور انیس کے ارشادات اس قابل ہیں کہ وہ دنیا کے بہترین ادب میں ایک خاص مقام حاصل کرسکتے ہیں۔ بلکہ اُن کا ایک خاص مقام ہے۔ اس موازنے میں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان میں بعض تو ایسی ہیں کہ ان کی مماثلت پر حیرت ہوتی ہے۔ فی الحقیقت زبان، نسل، رنگ بلکہ زمان ومکان کے بُعد کے باوجود دو عظیم شاعروں کی مفکرانہ ہم آہنگی، انسانی احساسات کی یکسانیت پر دلالت کرتی ہے۔

موازنے کی صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

Shakespeure :-

What a piece of work is Man !

How noble in reason ! how infinite in faculties !

In form and moving, how express and admirable

In action, how like an angel ! in apprehension,

how like a god ! The beauty of the world

Paragon of animals ! and yet to me,

What is this quintessence of dust.

انیس

آدم کو عجب خدا نے رتبہ بخشا ادنیٰ کے لیے مقام اعلےٰ بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایماں اس ایک کفِ خاک کو کیا کیا بخشا

یہ کتاب اردو ادب پر ایک بڑا احسان ہے۔ انگریزی جاننے والے ادب پسند حضرات اس کے مطالعے سے واقعی لطف اندوز ہوں گے۔ ہم فاضل مصنف کے ژرفِ مطالعہ اور خوش ذوقی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

سُہیل

مصنف آغا حمید مرزا۔ ناشران، ایوان الادب کراچی۔ قیمت ایک روپیہ ۱۲ آنے
ملنے کا پتہ، کتب خانہ تاج آفس مقابل میونسپل آفس بندر روڈ۔ کراچی
تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶ صفحات ۱۴۴۔ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش عمدہ

یہ کتاب آغا حمید مرزا کے سات نثری مضامین کا مجموعہ ہے۔ آغا صاحب کی زبان دلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ لیکن اس کتاب میں آپ ایک حساس شاعر کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں۔ شدتِ احساس کا ایک سیلاب ہے کہ اُمنڈا چلا جاتا ہے۔ دیباچہ صرف ایک سطر پر مشتمل ہے: "یہ اوراق اُن ذہنی عوارض کے معالج ہیں جن کا مداوا ہی نہیں" سیماب مرحوم نے اس کتاب کے باب میں فرمایا تھا: "آغا حمید مرزا نے نثر میں شعر کہے ہیں۔ محبت کی نفسیات پر آپ کو پورا عبور حاصل ہے"

شکستِ ساز کی آواز، محبت کی دلگدازی اور جذب و تاثیر سے مملو یہ کتاب ایک جوان دل کی دھڑکن ہے۔ مضامین کے عنوانات۔ نگاہِ اولیں، سہیل، آہِ نیم شب، رقیب سے خطاب، تیرے بغیر، ایک بار، شاد و ناشاد، گہر بار، کتاب کی افسانویت کو بخوبی ظاہر کر رہے ہیں۔

ثریا

(ناول) مصنفہ فاطمہ بن۔ پبلشرز۔ یونائیٹڈ۔ لاہور۔ قیمت تین روپے تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶ ضخامت ۲۰۴ صفحے۔ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش عمدہ۔

ایسے ناولوں کی اردو زبان میں کمی ہے۔ مقام مسرت ہے کہ اب اس طرف نئے لکھنے والوں کی توجہ ہو رہی ہے۔ زیرِ تبصرہ ناول ہر لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے۔ کردار نگاری قابلِ تعریف ہے اور اندازِ بیان میں صفائی ہے۔

مشامِ روح ۔ مصنف تاباں جمالی القادری قیمت ڈھائی روپے ۔ ملنے کا پتہ ۔ مکتبۂ قادریہ نمبر ۲۴ خانقاہ شریف لین ۔ کلکتہ نمبر ۱۴ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۰۱ صفحے ۔ طباعت و کتابت اور کاغذ گوارا ۔ جلد جلد پوش اوسط ۔

تاباں جمالی القادری کلکتے کے ایک جواں سال شاعر ہیں ۔ یہ کتاب ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے شروع میں مولانا عبدالماجد دریابادی، احتشام حسین اور دیگر اہلِ قلم کی رائیں بھی شامل ہیں ۔ کچھ اچھے شعر ملاحظہ فرمائیے ۔

تھک چکے ہیں جستجوئے خضرِ منزل میں قدم
آ تجھے اے شوقِ منزل رہبرِ منزل کریں

دُہرا رہی تھی خونِ شہیداں کی داستاں
وہ سُرخیٔ شفق کہ جو روپوش ہو گئی

بڑھ گئی پریشانی اور بھی مرے دل کی
حال پر اُسے اپنے جب بھی مہرباں پایا

بہار آ آ کے گلشن سے ہوئی ہے بارہا رخصت
نہیں جاتی گلوں کی چاک دامانی نہیں جاتی

اس مجموعے میں کچھ نظمیں بھی شامل ہیں لیکن زیادہ کلام غزلوں ہی پر مشتمل ہے ۔

سوز و سرور ۔ مصنف نصرت قریشی ۔ انڈین پرنٹنگ ورکس لاہور سے شائع ہوئی ہے ۔ قیمت فی جلد دو روپیہ ۔ کتاب پاکستان میں چھپی ہے ہندوستان میں دفتر ہفتہ وار بے باک' بازار خانی باغ سہارنپور کے پتے سے مل سکتی ہے ۔ کاغذ، کتابت، طباعت گزارا' جلد اچھی' جلد پوش یاما ۔ ضخامت ۱۱۲ صفحے ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶

مجموعۂ نظم نصرت قریشی کی غزلوں پر مشتمل ہے ۔ چند اچھے شعر ملاحظہ فرمائیے

مت پوچھ کہ ان کی محفل میں دیوانوں کا کیا حال ہوا
یہ دیکھ کہ ان کی محفل میں فرزانوں پر کیا بیت گئی

ذرا اک بار دل کا نشیمن بنا لوں
ان آنکھوں میں کچھ بجلیاں اور بھی ہیں

غزل گوئی میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ صدیوں کے اگلے ہوئے نوالے بار بار اگلے جاتے ہیں ۔ ایسی مثالیں اس مجموعے میں بھی ملتی ہیں ۔ دوسروں کے مشہور اشعار کے چربے شائع کرنے سے خود اپنی طبیعت کی رسائی پر حرف آتا ہے اور اس سے بچنا ہر نئے ادیب اور شاعر کے لئے ضروری ہے ۔ نصرت صاحب کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ۔

گلچیں کا ڈر نہ خوف ہے صیاد کا مجھے
تیرِ قفس میں آ کے سکوں مل گیا مجھے

اس کے ساتھ ہی اس مشہور شعر کو ملاحظہ فرمائیے ۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

بیرنگ نامے ۔ مصنف رند ھیر ایم اے' پبلشرز رہنمائے تعلیم بکڈپو دہلی قیمت ۸؍ ۔ کاغذ' کتابت' طباعت اوسط' جلد گوارا ۔ جلد پوش عمدہ تقطیع ۲۲×۲۹/۱۶ ضخامت ۹۶ صفحے ۔

یہ سترہ بے رنگ نامے واقعی ایک حساس دل سے نکلے ہوئے جذبات کے چھینٹے ہیں ۔ خود فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ "میں نے یہ نامے لکھنے کی خاطر نہیں لکھے ۔ میں نے انہیں فقط اس حالت میں لکھا جب کہ میں لکھے بغیر نہ رہ سکا ۔ یعنی زمانے کی ٹھوکروں نے میرے دل کو ایسا ہلایا کہ اس میں سے پُر درد آوازیں آنے لگیں ۔"

علامہ کیفی نے پیش لفظ میں فرمایا ہے "بیرنگ نامے سماج کی دکھتی رگوں کی عکس ریز تصویریں ہیں"۔ کتاب دلچسپ ہے اور مطالعے کے قابل ۔

رسالے ۔

سال نامۂ الحسن (رامپور) ملنے کا پتہ ۔ دفتر الحسن رام پور (یو۔پی) انڈیا چندہ سالانہ پانچ روپے ۔ ۱۵۲ صفحوں پر یہ سال نامہ اردو ادب کا ایک اچھا مجموعہ ہے ۔ اس کی ترتیب اور اشاعت میں سلیقے سے کام لیا گیا ہے ۔ مقالہ نگاروں میں محوی لکھنوی' جوش ملسیانی' رشید حسن کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ تمام مقالے معیاری نہیں سلکِ انجم کے عنوان کے تحت تیس شعراء کی نظمیں ہیں جن میں اس رسالے کے فاضل مدیر محمد تقی ابر احسینی صاحب گنوری' منور لکھنوی اور گوپال متل کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ دس افسانے اور متعدد غزلیں شریکِ اشاعت ہیں ۔ اس دور میں زرام پور ایسے رسالے کا باقاعدہ جاری رہنا ابر صاحب کی ہمت اور اردو کی ہمہ گیر مقبولیت پر دال ہے

رفتارِ زمانہ

فرقہ پرستی کی مخالفت

احمد آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں شری جواہر لال نہرو نے فرقہ پرستی کے خلاف تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ میرا سب سے اہم اور ضروری کام فرقہ پرستی کے خلاف لڑنا ہے۔ فرقہ دارانہ اتحاد کو میں کانگریس کے آدرشوں کی بنیاد سمجھتا ہوں اور اگر کسی وقت میں نے یہ محسوس کیا کہ کانگریسیوں میں اس بنیادی اصول کے خلاف معمولی رجحان بھی پیدا ہو گیا ہے تو اس رجحان کے خلاف جدوجہد کرنا میرا سب سے پہلا کام ہوگا۔ آج اگر کوئی کانگریسی یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ اس بنیادی اصول کو الوداع کہی جا سکتی ہے تو میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اس کا مقابلہ کروں گا۔

کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کا انتخاب

کانگریس پارلیمنٹری پارٹی نے اتفاق رائے سے سورگیہ سردار پٹیل کی جگہ مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم کو پارٹی کا نائب صدر چن لیا ہے۔ مولانا آزاد کا نام شری چکرورتی راج گوپال آچاریہ نے پیش کیا۔ مولانا آزاد کو کانگریس میں جو مقام حاصل ہے۔ یہ انتخاب اس کا ایک خاص ثبوت ہے۔ شری جواہر لال نہرو اور شری ستیہ نارائن سنہا کو بالترتیب پارٹی کا صدر اور چیف وہپ چن لیا گیا۔

کشمیر

ریاست جموں و کشمیر کے نائب وزیر اعظم آنریبل غلام محمد بخشی نے کلکتہ میں مقامی مسلمانوں کی طرف سے دی گئی ایک دعوت میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر کے عوام یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ وہ ہندوستان کے ساتھ ہی مل کر رہیں گے اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں اس فیصلے سے ہٹا نہیں سکتی۔ ریاست میں غیر ملکی فوج رکھنے کی مخالفت کرتے ہوئے بخشی صاحب نے کہا کہ ہم اپنی سرزمین پر غیر ملکی فوج ایک منٹ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ استصواب رائے کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ جب تک پاکستان اپنی افواج ریاست سے نہیں ہٹا لیتا اور تمام کشمیری مہاجرین اپنی ریاست میں واپس نہیں آ جاتے تب تک استصواب رائے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

امریکہ سے اناج کی آمد

بھارت سرکار کی اطلاع کے مطابق امریکہ سے ۱۵ اپریل تک اناج آنا شروع ہو جائے گا۔ وزیر خوراک شری کے۔ ایم۔ منشی نے اس سلسلے میں نامہ نگاروں کو بتایا کہ امریکہ کی وزارت خارجہ نے ہمیں لکھا ہے کہ اناج کا پہلا جہاز اپریل میں پہنچ جائے گا۔ راشن میں کمی کا ذکر کرتے ہوئے شری منشی نے کہا کہ امریکہ سے اناج آنے پر مقدار بحال کر دی جائے گی۔

شاہ نیپال

پورے ۱۰۱ دن ہندوستان میں رہنے کے بعد شاہ نیپال ۱۵ فروری کو نیپال کی راجدھانی کھٹمنڈو میں بذریعہ ہوائی جہاز پہنچے۔ ایک لاکھ آدمیوں نے آپ کا سواگت کیا نیپال کے وزیر اعظم مہاراجہ جنرل موہن شمشیر، فوجی افسر اور لیڈر ہوائی اڈے پر موجود تھے ہوائی اڈے سے آپ کا جلوس نکالا گیا جو چار میل کے راستے سے ہوتا ہوا راج بھون پہنچا سیاسی حلقوں میں شاہ نیپال کی اپنی راجدھانی میں دوبارہ آمد کو بھارت کی سیاسی فتح قرار دیا جا رہا ہے

پختون جرگے کا میمورنڈم

پختون جرگۂ ہند کے صدر مولانا محمد اکبر خاں نے متحدہ اقوام کی اسمبلی کے سیکرٹری جنرل مسٹر ٹریگوی لی کو ایک میمورنڈم بھیجا ہے۔ جس میں اُن سے درخواست کی گئی ہے کہ پختونستان کے نمائندوں کو اپنا زاویۂ نگاہ متحدہ اقوام کی اسمبلی کے سامنے پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی درخواست کی ہے کہ پاکستان کو پختون دیہات میں بے گناہ عورتوں اور بچوں پر بم گرانے اور اُن کو ظالمانہ طور پر موت کے گھاٹ اُتارنے سے روکا جائے۔ اس کے علاوہ مولانا محمد اکبر نے سیکرٹری جنرل کی توجہ خان عبدالغفار خاں اور ہزاروں خدائی خدمتگاروں کی نظربندی کی طرف بھی دلائی ہے۔ میمورنڈم کی ایک ایک نقل پریذیڈنٹ ٹرومین، شری ہی۔ این راؤ شری وی۔ کے۔ کرشنا مینن، شری جیکب ملک، سر ظفر اللہ خاں، جیب اور افغان سفیر سردار عبدالحسین خاں کو بھی بھیجی گئی ہیں۔

بیربل شکھشا کیندر بلاتی

بالاتی میں بیربل شکھشا کیندر کی رسم افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر راجندر پرشاد نے طلبا کو مشورہ دیا

رہ ۔ سب وقت اپنے حقوں کے لئے مطالبات پیش کرنے پر زور نہ دیں ۔ بلکہ اپنے فرائض کو سمجھنے کی کوشش کریں ۔ اُنہیں یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ وہ تمام سکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آتے ہیں ۔ اس لئے اُن کے دلوں میں اپنے معلموں کے لئے عزت اور شردھا کا جذبہ ہی نہ ہونا چاہیئے بلکہ انہیں اُن کا شکرگزار بھی ہونا چاہیئے ۔ آئے دن یہ سننے میں آتا ہے کہ جس طرح بڑے بڑے کارخانوں میں مزدوروں کی ہڑتال ہوا کرتی ہے ، اسی طرح تعلیمی اداروں میں طلبا بھی ہڑتال کر دیتے ہیں ۔ ہم کو اس صورتِ حال پر اچھی طرح غور کرنا چاہیئے ۔ اور سوچنا چاہیئے کہ کیا اس طرح کی باتیں مشرق کی شان کے شایاں ہیں ۔ تعلیم کا اصلی مقصد تو یہ ہونا چاہیئے کہ ہمارا اخلاق اور خیالات اونچے ہوں ۔ اور ہم میں اپنے فرائض کے ادا کرنے کا جذبہ پیدا ہو ۔ یہ کام جب ہی ہو سکتا ہے کہ طلبا اور معلموں میں باہمی تعاون ہو اور وہ ایک دوسرے کے جذبات کی قدر کریں ۔

مہیلا پولیس

مہیلا پولیس ویلفیئر مرکز کے ایک خاص جلسے میں تقریر کرتے ہوئے شریمتی اندرا گاندھی نے اس امر پر زور دیا کہ عورتیں بھی دنیا کی بدلتی ہوئی رفتار کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے مطابق بنانے کی کوشش کریں ۔ جن ممالک کی عورتوں نے اس باب میں ترقی کی ہے اُن کی تاریخ بیان کرتے ہوئے آپ نے بھارت کی عورتوں کو بھی آگے بڑھنے کا مشورہ دیا تاکہ وہ دیش کی حفاظت میں حصہ لے سکیں ۔

لکھنؤ میں شری نہرو کی تقریر

امین الدولہ پارک لکھنؤ میں تقریر کرتے ہوئے پردھان منتری شری نہرو نے فرقہ پرستوں کو تنبیہہ کی کہ وہ ایسی شرارتوں سے باز رہیں ۔ ورنہ اُن کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی ۔ جب تک ہماری حکومت قائم ہے تب تک ہم کسی حالت میں بھی تشدد وادی سرگرمیوں کی اجازت نہیں دے سکتے ۔ نہرو جی نے کہا کہ آج کل عام طور پر گئوکشی کے نام پر لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا جا رہا ہے ۔ اور ہندو مہاسبھا والے اس طریق سے فرقہ وارانہ فساد کروانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اصلیت تو یہ ہے کہ دیہاتی حلقوں میں ایک مسلمان کو گئوکشی کرنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی ۔ وہ کوئی ایسا کام ہرگز نہیں کرے گا جس سے اُس کی قوم خطرے میں پڑ جائے ۔ اس لئے اگر اس قسم کی کوئی افواہ آئے تو آپ لوگوں کو اس پر ہرگز یقین نہیں کرنا چاہیئے ۔

محکمہ فنانس میں راجیہ منتری کا تقرر

یو۔پی سے بھارت پارلیمنٹ کے ایک سرکردہ ممبر شری مہابیر تیاگی کو بھارت سرکار کے فنانس ڈیپارٹمنٹ کا راجیہ منتری مقرر کیا گیا ہے ۔ ۱۶ ؍ فروری کو راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد کے سامنے اُنھوں نے اپنے عہدے کا حلف وفاداری اُٹھایا ۔ اس موقع پر پردھان منتری شری جواہر لال نہرو ، وزیر بحالیات شری سی ۔ ڈی ۔ دیش مکھ اور دیگر عہدہ دار بھی موجود تھے ۔

کشمیر اور معاملات خارجہ پر شری نہرو کا بیان

نئی بھارت پارلیمنٹ میں پردھان منتری شری جواہر لال نہرو نے خارجہ معاملات کے بارے میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں لندن میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شامل ہوا ۔ اس کانفرنس میں ہمارا بہت سا وقت بین الاقوامی صورتِ حالات اور خاص طور پر دور پورپ کی نازک صورتِ حالات پر غور کرنے میں صرف ہوا ۔ کیونکہ یہ ناگزیر تھا اس بات چیت میں قدرتی طور پر مختلف ملکوں کے نظریئے ایک سے نہیں ہو سکتے تھے ۔ کسی حد تک ہر ایک ملک کے نمائندہ نے ان مسائل کو اپنے انفرادی زاویۂ نظر سے دیکھا اور شاید کسی ایک خاص پہلو پر نسبتاً زیادہ زور دیا ۔ لیکن یہاں میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس بات چیت کے دوران میں مقصد اور طرزِ عمل کے لحاظ سے بہت حد تک اشتراک موجود تھا ۔

یہ صورت بلاشبہ اطمینان بخش تھی ۔ جیسا کہ کانفرنس کے خاتمہ پر جاری کئے ہوئے اعلان سے ظاہر ہے ۔ ہم سب کا ایک ہی اوّلین مقصد تھا کہ ہماری مصیبت زدہ دنیا میں امن برقرار رہے ۔ ہم سب نے محسوس کیا کہ جنگ کا دور دور تک پھیل جانا سب سے بڑی خوفناک تباہی ہوگی ۔ اور ہمیں اس کو روکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے ۔

یورپ میں نہایت مشکل قسم کی صورتِ حالات موجود ہے ۔ جرمنی کو پھر سے مسلح کرنے کا فوری مسئلہ بہت تشویش کا باعث بن رہا ہے ۔ ایک طرف تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تحفظ ایسی اسلحہ بندی کا متقاضی ہے ۔ دوسری طرف یہ کہا جا رہا ہے کہ ایسا کرنا معاہدوں اور تعلقات کی خلاف ورزی ہوگا اور اس سے دوسرے ملکوں کا تحفظ خطرہ میں پڑ جائیگا ۔ اس لئے جرمنی کو از سرِ نو مسلح کرنا یورپ میں نہایت اہم مسئلہ بن گیا ہے ، اور اس کے فیصلے پر بہت سی باتوں کا دارومدار ہے ۔

لیکن کانفرنس کے سامنے کوریا اور اس سے متعلقہ دور پورپ کے دیگر امور کا مسئلہ تھا ۔ اگر دور پورپ میں کسی طرح کا کوئی تصفیہ کیا جا سکتا تو بلاشبہ اس کا یورپ

کی صورت حالات اور بہت سے دیگر بین الاقوامی مسائل پر بہت مفید اثر پڑتا۔ اس لیے کانفرنس نے دور پذیر اور اس کے بہت سے مسائل پر بہت زیادہ وقت صرف کیا۔ اسکے علاوہ فیصلہ طلب امور میں ایک بڑا مسئلہ فارموسا کا مستقبل تھا۔ چین کا مطالبہ ہے کہ یہ اُسے واپس کر دیا جائے اور یہ مطالبہ اعلان قاہرہ پر مبنی ہے۔ اس اعلان کی تصدیق پاٹسڈم میں ہوئی اور شروع جنوری ۱۹۵۰ء میں حکومت امریکہ نے پر زور طور پر اس کی تصدیق کی۔ حصول فارموسا کے علاوہ چین نے انجمن اقوام متحدہ میں داخلہ کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ ایک سال سے زیادہ عرصہ سے ہم جمہوریہ چین کو اقوام متحدہ میں شامل کرنے کی حمایت کر رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ چین کو اقوام متحدہ میں شامل کرنا ایک مرئی حقیقت کو تسلیم کرنا ہی نہیں بلکہ یہ انجمن اقوام متحدہ کی پوری اسکیم کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ بلاشبہ یہ کہا جاتا ہے کہ اگر نئے چین کو اقوام متحدہ سے الگ رکھنے کی افسوسناک غلطی نہ کی جاتی تو بعد کی بہت سی مصیبتیں پیدا ہی نہ ہوتیں۔

مسئلہ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے شری نہرو نے کہا، جب میں لندن میں تھا تو کشمیر کے متعلق کچھ بات چیت ہوئی تھی۔ لیکن یہ بات واضح طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ وزرائے اعظم کی کانفرنس کا ان مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس قسم کے معاملات پر غور و خوض کرنا اس کانفرنس کی غرض و غایت نہ تھی اور یہ امر اسی وقت واضح کر دیا گیا تھا۔ صرف ایک غیر رسمی گفت و شنید ہوئی تھی جس میں دولت مشترکہ کے بعض وزرائے اعظم نے شرکت کی تھی۔ میں یہ بات تسلیم کروں گا کہ جن وزرائے مذکور نے اس غیر رسمی گفت و شنید میں حصہ لیا تھا وہ کشمیر کے مسئلہ کو تسلی بخش طور پر حل کرنے کے لیے امداد بہم پہنچانے کے متمنی تھے۔ ان کا رویہ دوستانہ تھا اور وہ اس مسئلہ میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کا اپنا کوئی مفاد اس سے وابستہ نہ تھا۔ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ اس مسئلہ کو جو امن کے راستہ میں ایک رکاوٹ ثابت ہو رہا ہے حل کیا جائے۔ بدقسمتی سے ان مذاکرات سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ غیر رسمی بات چیت کے دوران میں میں نے اس بات کو واضح کرنے کی جرأت کی کہ ہم جو قدم بھی اٹھائیں وہ نہایت سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ان سے نت نئے مصائب اور حالات پیدا ہو جائیں جو تمام ہندوستان اور پاکستان پر اثر انداز ہوں۔ بالآخر پاکستان اور ہندوستان کے مابین دوستانہ تعلقات اور اتحاد کا ہونا لازمی امر ہے۔ چنانچہ ہم پاکستان سے دوستانہ تعلقات اور امن برقرار رکھنے کے متلاشی رہے ہیں۔ اگر ہم نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو ایسے نتائج پیدا ہو جائیں گے جو ہمیں بہت مدت تک غلط راستہ پر ڈال دیں گے۔

دوسری بات جس پر میں نے زور دیا یہ تھی کہ کشمیر کوئی ایسا علاقہ نہیں جس کے متعلق سودا بازی کی جائے۔ وہاں لاکھوں انسان بستے ہیں اور ان سے مویشیوں جیسا سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی درخواست پر ہم ان کی حفاظت کے لئے وہاں گئے تھے۔ اور جب تک وہ ہمیں اپنی حفاظت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں ہم پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ ہم اپنے وعدے سے سرخروئی سے سبکدوش ہوں۔ لیکن ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ ان کی خواہشات کے خلاف ہم کوئی چیز ان پر ٹھونس دیں۔

اب سوال تو یہ ہے کہ پچھلے بیس برسوں میں جب کشمیر کے لوگ مطلق العنانی کے خلاف آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے، اُس وقت کہاں تھے وہ لوگ جو آج سرحد پار سے کشمیر کی آزادی کے بارے میں بڑے زور سے چلاتے ہیں۔ ان میں اکثر یا تو رجعت پسندی کے حامی تھے یا خاموش تھے۔ وہ لوگ اگرچہ مختلف پیرایے میں باتیں کرتے ہیں اور مسئلہ کو الجھانے کے لئے مذہب کا نام استعمال کرتے ہیں۔

ہم نے یہ سیدھی سادھی پیش کش کی تھی کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ خود کشمیر کے لوگ رائے شماری یا کسی اور طریقہ سے کریں گے۔ بہت مہینوں تک پاکستان نے اس پیش کش کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ ان دنوں پاکستان سے کشمیر میں رائے شماری کرنے کے بارے میں کوئی آواز نہ سنی گئی۔ پاکستان کو امید تھی کہ وہ طاقت کے ذریعے اپنا مقصد پورا کرے گا۔ لیکن جب اس کی سینہ زوری اس کے کوئی کام نہ آئی تو پاکستان نے رائے شماری کے متعلق سوچنا شروع کیا۔

اس ضمن میں پاکستان نے جو کچھ کہا یا کیا ہے اس سے ہمیں غرض نہیں۔ ہم نے کشمیر کے لوگوں سے ایک عہد کیا تھا اور پھر بعد میں یہ عہد اقوام متحدہ سے بھی کیا۔ اس عہد پر ہم قائم رہے، اور آج بھی قائم ہیں۔ اس بارے میں خود کشمیر کے لوگوں کو فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اس لئے پچھلے کچھ مہینوں میں پاکستان میں حیرت انگیز اور متواتر ہنگامہ آرائی رہی ہے۔ فرقہ وارانہ جوش اور مذہبی تعصب کو جنون کی حد تک پہنچا دیا گیا ہے، اور لوگ برابر جہاد اور جنگ کی باتیں کر رہے ہیں اور کوئی بھی شخص پاکستان کے ان حالات کا بھارت یا بھارت کے پریس کے حالات سے موازنہ کر سکتا ہے۔ پاکستان کے جنگی نعروں کے جواب میں ہم نے کچھ بھی نہیں کہا۔ ہم نے تو اپنی کچھ فوج بھی کشمیر سے واپس بلا لی ہے لیکن پاکستان نے ایسا نہیں کیا۔ ہم اپنی فوج کشمیر سے واپس بلا لینے کا سلسلہ جاری رکھنے کو تیار ہیں۔ لیکن اس کیلئے یہ ضروری ہے کہ پاکستان اپنی ساری فوجیں وہاں سے واپس بلا لے۔

نئے سال کا بجٹ

پارلیمنٹ میں بھارت کے وزیر مالیات آنریبل شری سی۔ڈی دیش مکھ نے اپنا پہلا بجٹ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ نظر ثانی کے بعد ۵۱-۱۹۵۰ء کے بجٹ میں سات کروڑ ۳۹ لاکھ روپے کی بچت نکلتی ہے۔ اس سے قبل ابتدا میں جو اندازہ لگایا گیا تھا اس کے مطابق بچت کی رقم ۱۷ لاکھ روپیہ تھی۔

مالی سال ۵۲-۱۹۵۱ء

وزیر خزانہ نے بتایا کہ ٹیکسوں کے موجودہ معیار کے مطابق آئندہ سال کے دوران میں کل آمدنی کا اندازہ تین ارب ۹۶ کروڑ ۹۸ لاکھ روپیہ کیا گیا ہے۔ اور کل خرچ کا اندازہ تین ارب ۵۷ کروڑ ۳۴ لاکھ روپے ہے۔ جس سے پانچ کروڑ ۴۵ لاکھ روپے کا گھاٹا رہتا ہے۔ محصولات کی آمدنی کا اندازہ ایک ارب اکتالیس کروڑ ۹۲ لاکھ روپے انکم ٹیکس کی آمدنی ایک ارب ۵۷ کروڑ پانچ لاکھ روپے۔ ریلوں کی آمدنی سے مرکز کا حصہ سات کروڑ ۴۶ لاکھ روپے۔ ڈاک اور تار کی آمدنی کا حصہ دو کروڑ روپے ہے۔

دفاعی اخراجات

کل اخراجات میں سے دفاعی اخراجات کا اندازہ ایک ارب ۸۰ کروڑ دو لاکھ روپے اور شہری اخراجات کا اندازہ ایک ارب ۹۵ کروڑ ۴۱ لاکھ روپے ہے۔

سول اخراجات

۵۲-۱۹۵۱ء میں سول اخراجات کا اندازہ ایک ارب ۹۵ کروڑ ۴۱ لاکھ روپیہ کا لگایا گیا ہے جبکہ سال رواں میں یہ اندازہ ایک ارب ۹۹ کروڑ ۱۸ لاکھ روپیہ تھا یعنی اس طرح سول اخراجات میں ۴ کروڑ ۴۰ لاکھ روپیہ کی بچت ہوگی حقیقی بچت اس سے بھی کم ہوگی، کیونکہ مختلف ریاستوں کے لئے زیادہ خوراک پیدا کرنے کی اسکیموں اور دوسرے ترقی کے منصوبوں کے لئے ۸ کروڑ ۳۱ لاکھ روپیہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ یعنی اس طرح سال رواں کے مقابلہ میں آئندہ سال ۱۲ کروڑ ۱۷ لاکھ روپیہ کی بچت ہوگی۔






HIMALAYA
BOUQUET
SNOW
HIMALAYA
BOUQUET
SNOW

Regd. N . L. I. 003



"بچّوں کا آج کل"



تابش سلطانپوری

میرے وطن میں

سروسمن ہیں میرے وطن میں　　پھولوں کے بن ہیں میرے وطن میں
ہوتا ہے جن پر جنّت کا دھوکا　　ایسے چمن ہیں میرے وطن میں
خطرہ نہیں ہے سوکھے کا مجھ کو　　گنگ و جمن ہیں میرے وطن میں
ہر سیپ میں ہے موتی یہاں کے　　لاکھوں عدن ہیں میرے وطن میں
حق کی حمایت شیوہ ہے جن کا　　وہ مرد و زن ہیں میرے وطن میں
جن کو فلاطون اُستاد مانے
وہ اہلِ فن ہیں میرے وطن میں

صابر مالیگانوی

بچّوں کا ترانہ

دیکھو بھول نہ جاؤ بچّو　　اپنا سبق دہراؤ بچّو
باغِ وطن میں پھول کی صورت　　مہکو اور مہکاؤ بچّو
گلشنِ علم کے بلبل بن کر　　گیت وطن کے گاؤ بچّو
اپنے ملک و وطن کا پرچم　　تم مل کر لہراؤ بچّو
دل سے بڑوں کی باتیں سُن کر　　ان کو عمل میں لاؤ بچّو
صابر کا دل کش یہ ترانہ
مل جل کر سب گاؤ بچّو

وجے بھٹناگر

چوہا، بلّی اور کتّا

بہت مدّت کی بات ہے ایک چھوٹے سے گاؤں میں امجد نام کا ایک سیدھا سادہ کسان رہتا تھا۔ اُس کے کھیت سرسبز اور شاداب تھے۔ امجد نے ایک چوہا، بلّی اور ایک کتّا بھی پال رکھا تھا۔ وہ ان تینوں سے بڑی محبّت کرتا تھا۔

اس سال فصل بڑی اچھی ہوئی۔ امجد نے کچھ دھان تو اپنے گھر میں رکھ لئے اور باقی دھان بازار میں بیچنے کی ٹھانی۔

شہر میں ایک سوداگر نے اُس کا دھان خرید لیا اور اُس کے ہاتھوں میں چاندی کے چمکتے ہوئے سکّے رکھ دئے۔ روپوں کو ہاتھ میں لیتے ہی اُس کی نظر اپنے بائیں ہاتھ میں پڑ گئی۔ اُسے اپنی چاندی کی انگوٹھی سے نفرت سی ہونے لگی۔ وہ جھٹ ایک سُنار کی دُکان پر گیا اور ایک سونے کی انگوٹھی خرید لی۔

گاؤں کے نزدیک جب آیا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے گھر سے اُونچے اُونچے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے گھر کی طرف تیزی سے بھاگا۔ گاؤں کے لوگ آگ بجھانے کی پوری کوشش کرنے لگے۔ مگر



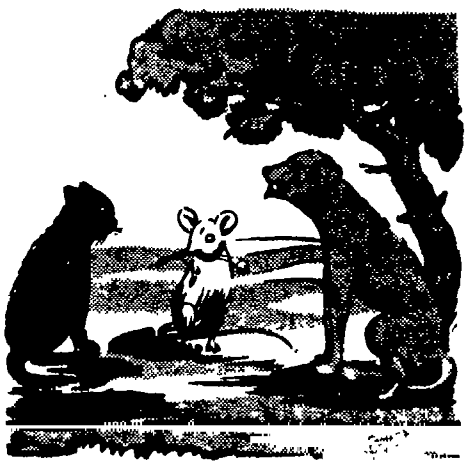
دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا گھر جل کر راکھ ہو گیا۔ امجد کی بیوی سر جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔ امجد خاموشی سے اپنی بیوی کے پاس بیٹھ گیا۔ امجد کو دیکھ کر کتّا، بلّی اور چوہا بھی اُس کے پاس آ گئے۔ "گھبراؤ مت، میرے پاس بہت سے روپے ہیں، ہم ایک اور اچھا سا گھر لیں گے اور پھر خوشی سے رہیں گے" امجد نے کہا۔

امجد نے ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا اور ایک بیلوں کی جوڑی بھی خرید لی۔ اُس نے اور اُس کی بیوی نے مل جل کر ہل چلایا۔ جھوم جھوم کر بادل اُٹھتے لیکن امجد کے کھیتوں کے پاس آتے آتے آسمان پھر صاف ہو جاتا اور سورج چمکنے لگتا۔

دولت تو پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اب پچھلے سال کا اناج بھی ختم ہو گیا۔ پہلے تو اُس نے اپنے گھر کی قیمتی چیزیں بھی فروخت کر دیں۔ پھر آہستہ آہستہ اُدھار لینا شروع کر دیا۔ مگر آخرکار بنیے نے اُدھار دینے سے بھی انکار کر دیا۔

آج تین دن سے امجد کے گھر روٹی نہیں بنی تھی۔ اُس کی

ی، بلی، چوہا اور کتا سب بھوکے پڑے تھے۔ موت کو سامنے دیکھ
کتے نے بلی اور چوہے سے کہا۔ "اس بھوک سے نجات حاصل
نے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے"۔
بلی بولی۔ "جب سے مالک نے چاندی کی انگوٹھی بیچی ہے گھر میں
ت آگئی ہے اور بدقسمتی نے آگھیرا ہے۔ میرا خیال ہے اگر مالک کے
ں پھر سے وہی انگوٹھی آجائے تو ممکن ہے ہم پھر امیر ہو جائیں اور
کے ذمرین"۔



چوہا جھٹ بول اٹھا: "راستے میں ندی پڑتی ہے اور سنار کے گھر کی
اریں اتنی چکنی ہیں کہ میرے پاؤں پھسل جائیں گے ورنہ میں اس کے
ندوق میں سوراخ کرکے انگوٹھی نکال لاتا"۔
کتا کہنے لگا "بھائی چوہے تو تم میری پیٹھ پر بیٹھ کر پار کر لینا"۔
"اور میں تمہیں اپنی پیٹھ پر بٹھا کر چکنی اور اونچی دیواروں پر چڑھ
کتی ہوں"۔ بلی یکدم بولی
رات کو تینوں انگوٹھی لانے کی غرض سے شہر کی طرف چلے۔ کتے
پیٹھ پر بلی اور بلی کی پیٹھ پر چوہے نے بیٹھ کر ندی پار کی۔ ندی پار کر
کے تینوں سنار کے گھر گئے۔ بلی چوہے کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر دیوار پر چڑھ گئی
چوہا چپکے سے دیوار سے نیچے سرک آیا اور دبے پاؤں سنار کے کمرے میں
گھس گیا اور اپنے تیز دانتوں کے ساتھ سوراخ کرکے صندوق سے
انگوٹھی نکال کر منہ میں ڈال لی۔
انگوٹھی لے کر تینوں واپس چلے۔ چوہا راستے بھر سوچتا رہا۔ کہ انگوٹھی
میری وجہ سے ہی حاصل ہوئی ہے اس لئے مالک کو انگوٹھی دینے کا حق
مجھ ہی کو ہے۔ اسے رہ رہ کر بلی اور کتے پر غصہ آ رہا تھا جو چوکیداروں
کی طرح اس کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ جب گاؤں نزدیک آگیا اور
گاؤں کی تنگ گلیاں شروع ہو گئیں تو چوہا آنکھ بچا کر بھاگ نکلا۔ کتا اور
بلی جھٹ سمجھ گئے کہ چوہے کے دل میں بے ایمانی آگئی ہے۔ وہ دونو چوہے
کے پیچھے دوڑے۔ بلی دیواریں اور چھت پھاندتی اور کتا گلیوں کو پار کرتا
ہوا گھر کی طرف دوڑا۔ جیسے ہی چوہا گھر میں گھسنے لگا۔ بلی نے جھپٹ کر اس
کی گردن پکڑ لی۔ چوہے کو مرے ہوئے دیکھ کر پہلے تو بلی گھبرا گئی۔ لیکن
دوسرے لمحہ ہی اس نے چوہے کو منہ میں ڈالا اور نگل گئی۔
اتنے میں بلی نے پاس کی گلی سے کتے کے بھونکنے کی آواز سنی۔ اس
نے جھٹ انگوٹھی اٹھائی اور گھر میں گھس گئی۔ بلی نے لپک کر انگوٹھی امجد کے
سامنے رکھ دی۔ امجد نے جیسے ہی انگوٹھی انگلی میں ڈالی۔ بادل گھر آئے اور
موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے بلی
کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔ اتنے میں کتا بھی آ پہنچا۔ مالک کے ہاتھ میں انگوٹھی
دیکھ کر کتے کو بھی بلی کی نااعتباری، خود غرضی اور دھوکے پر غصہ آیا اور وہ
غراتا ہوا بلی پر جھپٹا۔ امجد سمجھا شاید کتا پاگل ہو گیا ہے اور کتے کو مار مار
کر گھر سے باہر نکال دیا۔
اس واقعہ کے بعد پہلے جیسا اتفاق نہیں رہا اور ہمیشہ کے
لئے کتے بلی میں دشمنی ہو گئی۔
آج بھی بلی چوہے کو ہضم کر جاتی ہے اور جہاں کتا بلی کو دیکھ
لیتا ہے۔ کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔

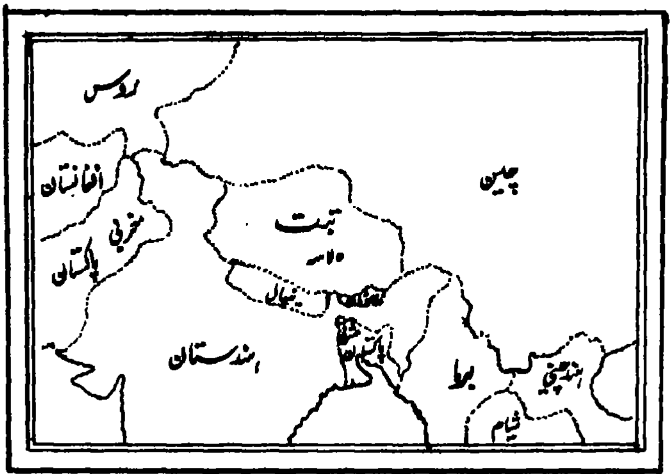
محمد امین

تبت

تبت ہمارا پڑوسی ملک ہے۔ یہ اُتر میں ہمالیہ پہاڑ کے اُس پار واقع ہے یہ دُنیا کی سب سے اُونچی پہاڑی ریاست ہے۔ سمندر کی سطح سے اس کی اونچائی ۴ہزار اور ۱۰ہزار فٹ کے درمیان ہے۔ اس کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں جن کی بلندی لگ بھگ ۵ میل ہے ان پہاڑوں پر ہر سال برف کی موٹی تہہ جمی رہتی ہے اور تبت کی سرزمین کو باہر کی دُنیا سے بالکل علیحدہ رکھتی ہے۔ شاید اسی لئے یہاں باہر کی دنیا کے انسانوں کا گذر بڑی مشکل سے ہوتا ہے بلکہ صدیاں گذر جاتی ہیں اور کوئی سیاح وہاں نہیں جا پاتا۔ پچھلے زمانے میں جو دو بڑی بڑی لڑائیاں ہوئی ہیں اس کا بھی اثر تبت میں بالکل نظر نہیں آتا۔ آج بھی تبت پُرانے طرز کی ایک ایسی ریاست ہے جہاں عجیب و غریب قسم کی چیزیں، رسم و رواج اور طور طریقے ملتے ہیں جن کو دیکھ کر ہم آپ بہت حیران ہوتے ہیں وہاں رہنے سہنے اور لباس کا طریقہ اب بھی ساتویں صدی پُرانا ہے۔

تبت کے باشندوں کا خاص مذہب بدھ ہے جن کے بڑے بڑے سادھو اور مہنت اپنے باشندوں کی مدد سے حکومت کرتے ہیں۔ بدھ مذہب کے ماننے والوں کی ۲ لاکھ ہے۔ وہاں کے بادشاہ کا نام دلائی لاما ہے جن کی عمر ابھی پندرہ سولہ سال کے قریب ہے۔ اس لئے ان کا قائم مقام ایک ایجنٹ ہے اور حکومت کا کام ان کی طرف سے وہی کرتا ہے۔ جب دلائی لاما کی عمر اٹھارہ سال کی ہو جائے گی تو وہ اپنی گدی پر بیٹھ کر حکومت سنبھال لیں گے۔ بادشاہ کو اپنی ریاست سے بہت گہرا لگاؤ ہے لیکن اپنے ملک میں بیرونی رسوخ اور اثر کو بڑھانا وہ ہرگز پسند نہیں کرتے۔ تبت ایک ایسی ریاست ہے جہاں نہ تو ریڈیو ہے، نہ اسپتال نہ موٹر نہ ٹرین، نہ اخبار نہ رسالہ نہ میگزین اور نہ گرمی حاصل کرنے کے لئے جدید طریقے اور بجلی حیرت یہ ہے کہ یہاں معمولی قسم کی دو پہیوں والی گاڑی بھی دکھائی نہیں دیتی شاید اس لئے کہ وہاں کی زمین پہاڑی اور اُونچی نیچی ہے۔

تبت کا رقبہ لگ بھگ ۱۲ لاکھ مربع میل ہے۔ اس کی کل آبادی ۴۰ لاکھ ہے۔ وہاں کے باشندوں کا خیال ہے کہ دُنیا میں صرف انہیں



تبت اور اس کے پڑوسی ملک

کا ملک ایک ایسا ملک ہے جو بیسویں اور صنعتی دور کی ساری برائیوں سے پاک ہے۔ رقبے کے لحاظ سے تبت کافی بڑا ہے لیکن اس کی ساری زمین پہاڑی ہے اس لئے پیداوار کم ہوتی ہے۔ دریاؤں کی وادیوں میں یہاں کے کسان چاول پیدا کرتے ہیں۔ اونچائی پر بھیڑ بکریاں اور یاک پالتے ہیں۔ ان سے اون، اسمور حاصل کرتے ہیں اور یہ چیزیں ہمارے دیش کے ذریعے باہر کے ملکوں میں بھیجتے ہیں۔ امریکہ سے ان کی سالانہ تجارت دو یا تین ملین ڈالر کے قریب ہے۔ یاک کی دم بھی امریکہ بھیجی جاتی ہے۔

یہاں کے باشندے منگول نسل سے ہیں۔ امیر، غریب سبھی طرح کے لوگ وہاں ہوتے ہیں۔ دولت مند لوگ اونچی اونچی کئی منزلہ عمارتوں میں رہتے ہیں اور گلی، کسان اور مزدوروں سے میل جول نہیں رکھتے۔ عام طور پر وہاں کے لوگ بہت مہمان نواز ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں پارٹیاں، دعوتیں اور جلسے بہت ہوتے ہیں جن سے کہ وہ اپنا دل بہلاتے ہیں۔ چونکہ یہاں کوئی سنیما، تھیٹر، براڈ کاسٹنگ ہاؤس اور باقاعدہ منظم کئے ہوئے کھیل وغیرہ کا انتظام نہیں ہے اس لئے پارٹیاں، ناچ گانے کی محفلیں کئی کئی دنوں تک گرم رہتی ہیں اور انہیں سے وہاں کے شرفا دل بہلا کر خوشی حاصل کرتے ہیں۔

لاسہ تبت کا سب سے مشہور اور بڑا شہر ہے۔ یہ اس کی راجدھانی بھی ہے۔ اس کی آبادی ۲۵ ہزار کے قریب ہے۔ لیکن اگر ہم خانقاہوں کے سادھوؤں یعنی لاماؤں کو بھی شامل کرلیں تو ۵۰ ہزار ہے۔ لاسہ سطح سمندر سے ۱۲ ہزار فٹ اونچا ہے اور اس کے چاروں طرف ۱۸ ہزار فٹ اونچے اونچے پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ پہاڑ اور ان کی چوٹیوں پر ادھر ادھر بے شمار خانقاہیں ہیں۔ لاسہ میں سب سے زیادہ شاندار عمارت وہاں کے بادشاہ دلائی لاما کا محل ہے۔ اس کی چھت سونے کی ہے۔ آج سے ۲۰۰ برس پہلے یہ محل بنایا گیا تھا۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس میں کہیں بھی لوہا استعمال نہیں ہوا ہے۔

لاسہ کے قریب سے ایک دریا گزرتا ہے جس کا نام کوئی چو ہے۔ اس دریا پر جدید قسم کا لوہے کا پل بنا ہوا ہے جسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اتنا شاندار پل یہاں کب اور کس طرح بنایا گیا۔

تبت میں بدھ مذہب کے ماننے والوں کے لئے لاسہ سب سے زیادہ متبرک مقام ہے۔ ہر بدھ مذہب کا پیرو سال میں ایک بار لاسہ پہنچنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ وہ لوگ جو یاترا کے لئے آتے ہیں۔ ان میں بعض بہت ہی کٹر قسم کے مذہبی ہوتے ہیں جو دور دراز مقامات سے گھٹنوں کے بل چل کر آتے ہیں اور بعض لوگ لیٹ لیٹ کر اپنے جسم کی لمبائی سے میلوں کا فاصلہ طے کرکے آتے ہیں۔

تبت کا بادشاہ عورتوں سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ قانوناً شادی کرنا اس کے لئے منع ہے۔

تبت کی عورتیں ریشم کے بھڑکیلے کپڑے پہنتی ہیں۔ ان پر جواہرات ہیرے اور سونے کا کام ہوتا ہے۔ ہر عورت کے پاس کم از کم ایک ایسا عمدہ کپڑا ضرور ہوتا ہے جسے وہ تیوہار یا کسی جشن کے موقع پر پہن سکے۔ یہ کپڑا بہت قیمتی ہوتا ہے۔ امیر عورتوں کے پاس کئی ایک نفیس کپڑے ہوتے ہیں۔ دلائی لاما کی ماں کا ایک جوڑا نگین اور خاص ریشمی کپڑا ۲۵ ہزار ڈالر یعنی ۴ لاکھ روپے کی لاگت کا ہے۔

موہن۔ میں ڈوب مرنا چاہتا ہوں لیکن ....
سوہن۔ لیکن کیا ....؟
موہن۔ میں تیر نہیں سکتا۔

(وجے بھٹناگر انبالہ)

دیول سدن ماح

وقت کی قیمت

پیارے بچو! تم میں سے ہر ایک کی یہی خواہش ہوگی کہ بڑے ہو کر دنیا میں نام پیدا کریں۔ تم میں سے کوئی ڈاکٹر بننا چاہتا ہے تو کوئی انجینئر۔ کسی کی خواہش ہے کہ ٹیگور اور اقبال کی طرح علم و ادب کے میدان میں شہرت پائے تو کوئی مارکونی اور جگدیش چندر بوس کی مانند دنیا کے لئے مفید ایجادیں اور حیرت انگیز مشینیں تیار کرنا چاہتا ہے۔ دراصل ہر انسان کا فرض ہے کہ دنیا کے لوگوں کی بھلائی کے لئے جو کچھ بھی کر سکے ضرور کرے۔ ترقی کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان وقت کی قدر کرتا اور اُسے صحیح طور پر استعمال کرتا ہو۔ ایک دفعہ کسی نے ہنری فورڈ سے پوچھا کہ آپ کے لئے ایک منٹ کی کیا قیمت ہے۔ تو انہوں نے مسکرا کر جواب دیا "ایک ہزار ڈالر" اور سچ پوچھو تو وقت سے بھی قیمتی چیز۔ ایک دفعہ جو وقت ہاتھ سے نکل جائے پھر اُس کا واپس آنا ناممکن ہے۔



کچھ بچے کہیں گے "ہم تو ابھی چھوٹے ہیں، وقت تو صرف بڑے آدمیوں کا ہی قیمتی ہوتا ہے"۔ نہیں یہ بات غلط ہے بچپن میں جیسی عادتیں پڑ جاتی ہیں۔ بڑے ہو کر ان سے چھٹکارا پانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ جو بچے اپنا سارا قیمتی وقت لٹو چلانے، پتنگ اڑانے، شرارت کرنے اور اسی قسم کے دوسرے بیکار کاموں میں گنوا دیتے ہیں وہ تعلیم کی دولت حاصل نہیں کر پاتے اور زندگی بھر پچھتاتے ہیں۔

میرا اس سے یہ مطلب نہیں کہ تم ہر وقت کتابی کیڑے بنے رہو لیکن فالتو وقت کو بے کار کاموں میں ضائع کرنے کی بجائے اگر مفید اور دلچسپ کاموں میں صرف کیا جائے تو اس سے جی بھی بہلتا ہے اور زندگی بھی سنورتی ہے۔ جاپانی بچے کھلونے وغیرہ بنانے کے بہت شوقین ہوتے ہیں جب وہ سکول کے کام سے فرصت پاتے ہیں تو کاغذ، لکڑی اور ٹین کے خوش نما کھلونے اور تصویریں بناتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ کھلونے جاپانی بچوں نے تمہارے لئے شری جواہر لال جی کو بھیجے تھے۔ وقت کو ٹھیک طرح سے استعمال کرنے کے لئے تمہیں کچھ مفید کام سیکھنے چاہئیں۔ ودیش ودیش کے ٹکٹ جمع کرنا ایک نہایت دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس سے نہ صرف تمہاری جغرافیے کی معلومات ہی بڑھتی ہیں بلکہ تمہیں اس بات کا بھی خیال رہتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں رہنے والے بچے تمہارے دوست ہیں۔ کچھ بچے تصویریں، پرندوں کے پر، کھلونے، مختلف قسموں کے پھول وغیرہ بھی جمع کرتے ہیں اور انہیں اپنے البم میں سجاتے ہیں

یہ عادتیں صرف دل بہلا دے کا سامان ہی مہیا نہیں کرتیں بلکہ زندگی بھر خوشی اور دلچسپی کا ذریعہ بنی رہتی ہیں۔ جو بچے پھول یا پرندوں کے پر جمع کرتے ہیں انہیں جنگلوں اور کھیتوں وغیرہ میں گھومنے پھرنے کا کافی موقعہ ملتا ہے۔ اس سے ان کی صحت بھی اچھی رہتی ہے اور معلومات میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کچھ شریر لڑکے غلیل سے معصوم پرندوں کو مار کر خوش ہوتے ہیں، یہ عادت اچھی نہیں۔ جہاں تک ہو سکے پرندوں، درختوں اور پھولوں کو اپنے بے زبان دوست سمجھو جو تمہاری مسرّتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔

فالتو وقت میں اچھی اچھی کتابیں پڑھنا ایک ایسی عادت ہے جو ہر بچے کی زندگی سنوار سکتی ہے۔ کتابیں تمہارے سچّے دوست ہیں گھر بیٹھے تمہیں دُور دُور کے ملکوں کے دلچسپ حالات، نئی نئی ایجادوں کی باتیں اور بڑے بڑے لیڈروں کی کہانیاں سناتی ہیں۔ ہر بچے کے پاس تصویروں سے سجی ہوئی دلچسپ کتابیں ضرور ہونی چاہئیں۔

کبھی کبھی دیہات کی سیر ضرور کرو اس سے تمہیں پتہ چلے گا کہ ہمارا دیش کتنا خوبصورت ہے، تمہیں کسانوں کی زندگی کے بارے میں بھی کئی باتیں معلوم ہوں گی، بھورے بھورے مویشی، ہرے بھرے کھیت، ٹیڑھے ٹیڑھے مکان، برگد اور پیپل کے درخت، ننھے ننھے تالاب اور جوہڑ اور سب سے بڑھ کر گاؤں کی کھلی ہوا اور سادہ زندگی ایسی چیزیں ہیں جن کا تجربہ ہر ہندوستانی بچے کو ہونا چاہیئے۔

پیارے بچو! وقت بہت قیمتی چیز ہے اور وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ جہاں تک ہو سکے اسے صحیح طرح سے استعمال کرو۔ وقت کا صحیح استعمال جبھی ہو سکتا ہے جب ہر منٹ اپنی اور دوسروں کی بہتری کا سامان پیدا کرنے میں گزرے۔ اچھے بچے ہمیشہ اپنا وقت ٹھیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔

لطیفے

بچہ:- دادا جان۔ کیا آپ کے منہ میں کوئی دانت نہیں ہے؟
دادا جان:- (منہ دکھا کر) میرے منہ میں ایک بھی دانت نہیں۔
بچہ:- تو پھر میرے اخروٹ اپنے پاس رکھیئے۔

نوکر۔ حضور! دھوبی آپ کے کوٹ کی دھلائی مانگتا ہے
آقا۔ اسے کہہ دو کہ ابھی تمہاری باری نہیں آئی پہلے اس کوٹ کی سلائی درزی کو دے دوں تو پھر دھلائی کا بل ادا کروں گا

(جمیلہ عزیز دہلی)

دو پاگل سڑک کے کنارے لڑ رہے تھے۔ پولیس نے انہیں پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا۔ ان میں سے ایک نے حوالات میں پھر لڑنا شروع کیا۔ جس پر دوسرا بولا:-
ابے اب تو نہ لڑ کیا یہاں سے بھی نکلوائے گا؟

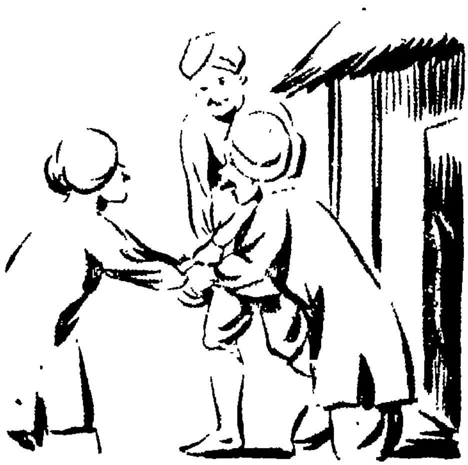
(پینده ہاشمہ بھوپال)

ایک آدمی (جج سے) صاحب اس نے میری توہین کی ہے
جج:- کس طرح؟
آدمی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تیرا ایک بال بھی بیکا نہیں ہونے دوں گا۔
جج۔ تو اس میں توہین کی کیا بات ہے؟
آدمی۔ جناب! میں گنجا ہوں۔ (دیبی مینا گیا نگالہ)

مہ دیوبوں

قاضی کا اِنصاف

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو بھائی ایک گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ اُن کی تیل کی دُکان تھی۔ یہ دُکان ان کے گاؤں سے بہت فاصلے پر تھی۔ اُن کی ماں نے اُن کو ایک تھیلی دے دی تھی اور یہ کہہ دیا تھا کہ لو بیٹا! یہ تھیلی اپنے ساتھ لیتے جاؤ اور جو پیسے تمہارے پاس جمع ہوتے جائیں اُن کو اس تھیلی میں ڈال لیا کرو۔ اُنہوں نے وہ تھیلی لے لی اور چل دئے۔



رفتہ رفتہ اُن کے پاس ایک ہزار روپیہ جمع ہوگیا۔ اس دوران میں اُن کے پاس ایک چٹھی آئی جس میں اُن کی ماں نے لکھا تھا کہ میں سخت بیمار ہوں تم فوراً چلے آؤ۔ دونوں بھائیوں نے صلاح کی کہ آج شام کو ہی چل دینا چاہیئے۔ انہوں نے تھیلی کو سنبھالا اور دُکان بند کر کے روانہ ہوئے۔

سفر کے دوران میں اُن کا حلق مارے گرمی کے خشک ہوگیا اور پیاس لگنے لگی۔ چلتے چلتے انہیں ایک جھونپڑی نظر آئی۔ وہ اس جھونپڑی کے پاس گئے اور آواز دی کہ اس جھونپڑی میں کوئی ہے۔ اندر سے ایک اندھا بولا کہ کون ہے۔ دونوں نے جواب دیا کہ ہم بہت پیاسے ہیں۔ ہمیں ٹھنڈا پانی چاہیئے۔

یہ سُن کر اندھے نے اُن دونوں کو اندر بلا لیا اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ دونوں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اُس نے پوچھا کہ بھائی کہاں جا رہے ہو۔

اُنہوں نے جواب دیا کہ ہم اپنے گاؤں جا رہے ہیں کیونکہ ہماری ماں بیمار ہے۔ ہمارے پاس ایک ہزار روپیہ ہے۔ یہ سُن کر اندھے کو لالچ آگیا اور کہا کہ دکھانا بھائی میں بھی دیکھوں ایک ہزار روپیہ کیسا ہے۔ یہ سُن کر چھوٹے بھائی نے اندھے کے ہاتھ میں وہ تھیلی دے دی۔ اندھے نے اُس تھیلی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر چلّانا شروع کیا کہ

بھائیو! یہ لوگ میرا ایک ہزار روپیہ چھین رہے ہیں۔ یہ سُن کر آس پاس کے لوگ بھی آگئے اور تھوڑی دیر میں پولیس بھی آگئی۔ پولیس اُن دونوں بھائیوں اور اندھے کو پکڑ کر قاضی کے پاس لے گئی۔ قاضی نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ایک کڑاہی میں پانی گرم کرو۔ جب پانی گرم ہوگیا تو قاضی نے اُن روپوں کو اس کڑاہی میں ڈال دیا اور تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ پانی کی سطح پر چکنائی آگئی۔

قاضی نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ یہ تھیلی اُن دونوں بھائیوں کی ہے کیونکہ روپوں پر چکنائی لگی ہوئی ہے اور یہ چکنائی تیل کی ہے ساتھ ہی اُنہوں نے حکم دیا کہ اندھے کے ہاتھ کاٹ دئے جائیں۔ چنانچہ قاضی کے کہنے کے مطابق وہ تھیلی اُن دونوں بھائیوں کو دے دی گئی اور اندھے کے ہاتھ کاٹ دئے گئے۔



HVM. 145-172 UD

عالمِ پیئرس کے خوبصورت بچے



ایک خوبصورت خاتون بننے کی تیاری میں



پیئرس

صابن

پشتوں سے حسین عورتوں کا سنگار

[illegible]

١٩٩١

[illegible]

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر — جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر — عرش ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

جلد ۹ — نمبر ۱

سالانہ چندہ — چھ روپے

غیر ممالک سے — نوشلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ — آٹھ آنے

مئی ۱۹۵۱ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

خلیق احمد نظامی

خواجہ احمد فاروقی

پال بری کوف، ٹالسٹائی کا مشہور سوانح نگار لکھتا ہے کہ مجھے لیو ٹالسٹائی کے دوست بننے کی سعادت حاصل تھی اور میری زندگی اُس کی زندگی کے ساتھ کچھ ایسی ہم آہنگ ہو گئی تھی کہ من و تو کا فرق مٹ گیا تھا۔ یا یوں سمجھئے کہ ہم دونوں کو کیمیاوی طریقے سے اس طرح مشترک و متحد کر دیا گیا تھا کہ اگر میں چاہتا بھی کہ اپنے آپ کو الگ کر لوں تو یہ ناممکن تھا۔

بلا تشبیہ میرا اور خواجہ صاحب کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے میں اُن کی تحریریں اس وقت سے دیکھ رہا ہوں جب وہ پھول اور غنچہ میں لکھتے تھے، اس کے بعد اُن کی طالب علمی کا وہ زمانہ بھی دیکھا جب وہ رات کے دو دو بجے تک خارج از کورس کتابیں پوری قرأت کے ساتھ پڑھتے رہتے — اور دادا جان مرحوم یعنی مولوی فرید احمد صاحب نظامی سرسید کے حاشیہ نشین اور نواب وقار الملک کے ساتھی، گھنٹوں اُن سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں وہ میرٹھ کالج میں بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ اس وقت وہ قامت میں کم تھے لیکن قیمت میں کم نہ تھے۔ اُن کا وسیع مطالعہ۔ اُن کی شگفتہ طبیعت اور غیر معمولی ذہانت نے اُن کو اُستادوں اور طالب علموں کے حلقے میں بہت مقبول بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کالج میں سوشل سکریٹری بھی منتخب ہوئے، میگزین کے اڈیٹر بھی اور بزم ادب کے سکریٹری بھی۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں اُن کے مضامین نگار، ہمایوں، عالمگیر اور جامعہ میں شائع ہو چکے تھے۔ اور علمی حلقوں میں اُن کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

خواجہ صاحب انگریزی کی اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی بے چین طبیعت کی وجہ سے انگریزی کے ایم۔ اے کی تکمیل نہ کر سکے۔ اردو اور فارسی میں ایم۔ اے کر کے البتہ انھوں نے دامن کے چاک اور گریبان کے چاک کو ملا دیا۔ شاید اسی وجہ سے اُن کے اسلوب میں قدیم و جدید کی آمیزش ہے۔ انھیں دونوں زبانوں کی حیثیت اور معنوی لہروں کے اختلاط سے اُن کا قلم گلکاریاں کرتا ہے۔ اُن کے یہاں فارسی کی رنگینی، انگریزی کی پُرکاری، اور اردو کی سادگی اور گھلاوٹ موجود ہے۔ جو دل پر اثر کرتی ہے۔

خواجہ احمد فاروقی کا وطن بچھراؤں ضلع مراد آباد ہے۔ یہ چھوٹی سی جگہ ہے۔ یہاں کی پرانی حویلیاں، پرانی کتابیں اور پرانے لوگوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شریفوں کی قدیم بستی ہے۔ جہاں ابتدا سے علم و فضل کا چرچا رہا ہے۔ خواجہ صاحب کے جدِ امجد مفتی محمد ولی اللہ صاحب ناظر جنگ، جو اکبر شاہ ثانی کے ہم عصر تھے ایک صاحبِ تصنیف بزرگ تھے۔ اس طرح ادبی ذوق گویا اُن کو ورثہ میں ملا ہے۔ لیکن اُن کا ماحول بھی ادبی چرچوں سے خالی نہیں تھا۔ جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو اُن کے ہم وطنوں میں قاضی عبدالغفار اور عزیزوں میں پروفیسر حامد حسن قادری (صاحب داستانِ تاریخ اردو) کی شہرت کا دامن دراز ہو چکا تھا۔

خواجہ صاحب نے تین کتابیں لکھی ہیں۔

(۱) "ادبی تنقیدیں"۔ یہ اُن تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ تھا جو رسالہ اردو اور نگار میں شائع ہو چکے تھے، اور جنھیں انجمن ترقی اردو کتابی صورت میں شائع کر رہی تھی۔ (۲) میر تقی میر۔ (۳) تاریخ مکاتیب اردو۔

ان تینوں کتابوں کے مسودے ۴۷ء کے ہنگامہ و آشوب میں تلف ہو گئے۔ انھوں نے ایک خط میں لکھا تھا۔

"بھائی! میں کیا اور میری کتابیں کیا۔ لیکن مکڑی کو اپنا جالا بھی ریشم سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ مال و زر تو

رکھتا ہی نہیں تھا بس یہ نقد سخن ہی تھا۔ خیر ناگفتہ بہ ست۔ یہ اوراق پھر جمع ہو جائیں گے۔ انسانیت اور اخلاقی اقدار کا جو نقصان دونوں مملکتوں میں ہوا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔"

اب اُن کی ادبی کائنات "چند تصویر بتاں" اور "چند حسینوں کے خطوط" پر مشتمل ہے یعنی متفرق تنقیدی اور علمی مضامین جو رسالہ اردو۔ نگار، جامعہ۔ ہمایوں، ادبی دنیا، عالمگیر۔ نقوش۔ برہان۔ معارف۔ شاعر آجکل اور نئی روشنی کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ یا اُن کے وہ دلچسپ خطوط جو بعض دوستوں کے لئے "حرزِ ادب" ہیں۔

خواجہ صاحب کا سب سے پہلا مضمون جس نے مجھے اُن کے اسلوب طرز نگارش کا گرویدہ بنا دیا وہ "آرائشِ جمال۔ تاریخ اور نفسیات" کی روشنی میں ہے۔ جو جون ۱۹۳۹ء کے نگار میں شائع ہوا تھا۔ جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم کے طرز سے کتنے متاثر ہیں۔ لیکن یہ اُن کا اس رنگ میں پہلا اور آخری مضمون ہے۔ اس کے بعد وہ بہت جلد اس ریشمی خول سے باہر آگئے، اور تاریخ و تنقید کی طرف متوجہ ہو گئے، جو اُس وقت سے اب تک اُن کی سرگرمیوں کا اصل میدان رہا ہے۔

اُن کا پہلا اہتمام بالشان تنقیدی مضمون "مثنوی زہرِ عشق"[۱] ہے۔ جو نومبر ۱۹۳۹ء کے نگار میں شائع ہوا، اسی سلسلے کی دوسری کڑی "بہارِ عشق"[۱] کے عنوان سے ایک مقالہ ہے جو رسالہ نقوش کے جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ نیاز فتحپوری نے ان دونوں مضامین کو دیکھ کر لکھا تھا

"تبصرے کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا، کہ وہ تبصرے سے زیادہ تنقید ہو کر رہ گیا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر آپ کے اختیار میں ہوتا تو آپ اپنے آپ کو اسی زمانے میں پہونچا دیتے اور ممکن ہوتا تو شاید زہرِ عشق اور بہارِ عشق کے ہیرو بننے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ پھر اگر یہ صحیح ہے کہ ایک نقاد اپنے فرض کو اسی وقت صحیح طور پر انجام دے سکتا ہے جب وہ تصنیف کے ماحول کو اپنے اندر پوری طرح جذب کرلے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں مثنویوں پر تبصرہ کرنے کا حق آپ سے زیادہ اور کسی کو نہیں پہونچتا۔"

خواجہ صاحب اپنی تنقید میں داخلی لذت اندوزی کے خوبصورت محل نہیں بناتے۔ جہاں بیٹھ کر وہ غمِ روزگار کو بھول جائیں۔ بلکہ وہ تاریخ، نفسیات، اجتماعیات اور دوسرے علوم کی مدد سے ایک ایسی وسیع شاہراہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس پر وہ خود بھی چلیں، اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ واجد علی شاہی لٹریچر کی منفی نگینیوں میں گم ہو جانا کس قدر آسان ہے۔ لیکن اُنھوں نے تاریخ اور سماج کی ہمہ گیر قوتوں کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ مضمون "بہارِ عشق" میں لکھتے ہیں:-

"یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بربادی کے بعد وہ لڑکی اُس سے ملنے کا اقرار کیوں کرتی ہے؟ اس کے لئے بے چین کیوں ہوتی ہے؟ ماما کو کیوں بھیجتی ہے۔ کیا محبت اس نقطے سے بھی شروع ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب اس لڑکی کو نہیں ہماری معاشرت کو دینا چاہیئے۔ یہاں یہ اکثر ہوا ہے کہ جس سانپ نے ڈسا ہے اسی کی پوجا کی گئی ہے۔ ۔۔۔۔۔ مہ لقا کے یہ الفاظ صرف اس کے دُکھے ہوئے دل کی پکار نہیں۔ بلکہ ہماری عجیب و غریب معاشرت کا مرثیہ بھی ہیں۔ اب تک ہماری نگاہیں واجد علی شاہی لٹریچر کی صرف منفی رنگینیوں میں اُلجھی رہی ہیں، لیکن اس کا یہ مثبت پہلو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

نہیں واللہ دسترس اپنا قیدی بندی ہے کیا ہے بس اپنا

دن بھر ایک ایک منہ کو تکتا ہے بات کرنے میں عیب لگتا ہے

ناک میں دم ہے اشکباری ہے زندگی تنگ ہے جان عاری ہے

شادی کے بعد نہ تردامنی کی گرانی باقی رہتی ہے اور نہ خشک دامنی کی سبک سری کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ شباب یا روزگار خراب کی اس مستانہ لغزش پر روح کی اندرونی عدالت نے ان دونوں کو تو بری کر دیا ہے، لیکن قاری کیلئے

[۱] یہ دونوں مقالے مرزا شوق لکھنوی کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں (ادارہ)

ایک خلش سی پیدا کر دی ہے۔ مرداشوق کا یہ کمال معمولی نہیں ہے، کہ اگر وہ ان مسائل کا حل تلاش نہیں کر سکے تو کم از کم ان مسائل کو پوری صفائی اور دیانت داری سے پیش تو کر سکے "

تنقید تاریخ سے مختلف ہے لیکن اس میں توانائی اسی کی بدولت آتی ہے۔ خواجہ صاحب کی تنقید میں تاریخ کی جھلکیاں قدم قدم پر نظر آتی ہیں۔ انھوں نے خالص تاریخی موضوعات پر بھی مضامین لکھے ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر یہ ہیں۔

(۱) علم تاریخ کی اہمیت (جامعہ نومبر ۱۹[illegible]ء)
(۲) تاریخی نظریے کا ارتقاء (جامعہ دسمبر [illegible]ء)
(۳) جنگِ پلاسی اور انگلستان کا صنعتی انقلاب
(ہمایوں۔ جنوری [illegible]ء خاص نمبر)
اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انگلستان کا صنعتی انقلاب کبھی کامیاب نہ ہوتا اگر بنگال اور کرناٹک کے خزانے انگلستان نہ پہنچتے۔
(۴) ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات (برہان ستمبر [illegible]ء)
اور (۵) ہندوستان کی تاریخ میں اتحاد پسندی کا رجحان۔
(نئی روشنی ستمبر [illegible]ء)

ان دونوں مضمونوں کا خلاصہ خواجہ صاحب کی زبان سے سنئے۔

"اتحاد و اختلاط کا یہ سرچشمہ جو موہنجو داڑو سے بھی پہلے پھوٹا تھا، عہدِ قدیم اور عہدِ وسطیٰ کے میدانوں سے گزرتا ہوا آج بھی اسی طرح جاری ہے، اور ہماری مقدس سرزمین کو سیراب کر رہا ہے ....

اس اختلاطِ باہمی کی گواہ، ہماری مصوری، ہماری موسیقی ہماری شاعری، ہماری عمارتیں اور ہماری مذہبی تحریکیں، ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کو بادشاہوں کی رزم آرائیوں میں ڈھونڈا گیا۔ منصور و منوہر کی رنگ کاری خسرو اور تان سین کی موسیقی، جائسی اور فیضی کی شاعری لال قلعے۔ اور تاج محل کی صنعت۔ اور بھاگت کبیر او حضرت محبوب الٰہی کی صلح پسندی میں ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حالانکہ ان تخلیقی کوششوں نے جو یقیناً زمان و مکان کے قومی موثرات کا نتیجہ تھیں، ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ ابن حوقل اور مسعودی جو دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی سرزمین پر آئے۔ وہ دونوں قوموں کی ہم رنگ وضع و معاشرت کو دیکھکر حیران رہ گئے، اور بابر تو اس ہندوستانی طرزِ زندگی" سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ۱۵۲۶ء میں اپنی حکومت کی اساس ہی اس اتحاد اور ارتباط کے اصول پر قائم کی۔

کچھ لوگ ہیں جو ہندوستان کی تاریخ کو محمد بن قاسم سے شروع کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو اسے ہرش پر لاکر ختم کر دیتے ہیں ...... اس عصبیت نے نہ صرف تاریخ کے تسلسل کو نقصان پہونچایا ہے بلکہ اشتراکِ خیال اور اتحادِ ذوق کے اُن عظیم الشان تخلیقی کارناموں کو بھی نظر سے پوشیدہ کر دیا ہے جن کے ساتھ ہماری پوری تاریخ وابستہ ہے۔ فرقہ وارانہ منافرت کو دور کرنے کے لئے سب سے پہلے صحیح تاریخی نظریہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جو ہندوستانیوں کے صفحاتِ زندگی پر مختلف نقوش دیکھ سکے اور اُن کی مجموعی قدر و قیمت پہچان سکے "

یہ تو خیر ایک سخن گسترانہ بات تھی۔ ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ خواجہ صاحب تاریخ کا بہت اچھا مذاق رکھتے ہیں، اور اسی ذوق نے اُن کی تنقید کو مضبوط اور موثر بنا دیا ہے۔ اُن کی تنقید عینی یا جمالیاتی نہیں ہے۔ اُن کے یہاں صرف اُن احساسات کی بازگشت نہیں ہے جن سے ادیب یا شاعر دوچار ہوا ہے۔ انھوں نے بلند و پست میں تمیز کی ہے۔ نور کو ظلمت سے الگ کیا ہے اور ادب کے پائیدار حصوں کی قدر و قیمت متعین کی ہے۔ یہ بات میرے نزدیک اس وقت تک ممکن نہیں ہے۔ جب تک تاریخی نگاہ اور سماجی شعور صحیح نہ ہو۔ خواجہ صاحب اس سے بہرہ مند ہیں۔

خواجہ صاحب ادب کو ایک نامیاتی حقیقت سمجھتے ہیں، اور وہ اس میں ہر اچھی اور نئی تبدیلی کے لئے طیار ہیں۔ وہ نئی نظموں کی اہمیت اور اُن کے خدمات کے دل سے معترف ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ "اردو میں

اب بلند پایہ نظموں کی کمی نہیں ہے۔ اس کا دامن گلہائے رنگ رنگ سے بھرا ہوا ہے۔ مضامین کا تنوع، وسعت، جدت، معنویت، نیا شعور، احساس ـــ یہ سب باتیں کافی نظر فریب ہیں، اور نظم کے درخشاں مستقبل کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ لیکن ابھی اُسے حسن کاری اور آرٹ کی بلند منزلیں طے کرنا ہیں۔ بہت سی خرابیاں تو اُن کے بقول اس وجہ سے ہیں کہ ہمارا معاشرتی نظام کشمکش اور انتشار کے عالم میں ہے، اور ہماری شاعری بھی ایک درمیانی زمانے کو عبور کر رہی ہے۔

خواجہ صاحب ماضی کے سرمائے کے قدردان اور حال کے صحت مند رجحانات کے ہمدرد ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں حال کا عزم اور مستقبل کا نور ہے۔ جو لوگ ماضی سے خفا اور حال سے بیزار ہیں اُن کے لئے خواجہ صاحب کی تنقید صبح عید کی نوید ہے۔ یونان کے دیوتا جانس کی طرح اُن کا ایک رُخ ماضی کی طرف ہے، اور ایک مستقبل کی طرف۔ اسی وجہ سے اُن کی رائے میں سنجیدگی، توازن، اصابت اور اعتدال ہے۔ آپ اُن سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ لیکن اُن کے خلوصِ نیت پر شبہ نہیں کر سکتے۔ اُن کے تنقیدی مضامین کی فہرست طویل ہے۔ میں صرف چند کا ذکر کروں گا۔ ان پر علیحدہ علیحدہ تبصرے کی گنجائش نہیں ہے ورنہ یہ "شوق کا دفتر" بڑھتا ہی جائے گا۔

۱۔ ریاض کی شگفتہ نگاری (ریاض نمبر۔ نگار جنوری ۱۹۳۴ء)
۲۔ اصغر کی شاعری (نگار اپریل ۱۹۴۲ء)
۳۔ مومن کی شاعری (رسالہ اردو۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء)
۴۔ فانی کی شاعری کا ایک روشن پہلو (فانی سے متعلق مجموعۂ مضامین مطبوعہ کتابی دنیا۔ دہلی)
۵۔ غزل کے جدید رجحانات پر ایک نظر۔ (ہمایوں۔ اپریل ۱۹۴۱ء)

اصغر کے متعلق اُن کا خیال ہے۔

"اُن کے صوفیانہ کلام کا تعلق دماغ سے زیادہ ہے، اور دل سے کم۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی قلب ماہیت نگاہ سے زیادہ کتاب سے ہوئی ہے۔ درد کی سی طہارت تو اُن کے یہاں ہے لیکن اُس کا سا سوز نہیں ہے۔ وادیٔ ایمن کی جن شرر باریوں کا ذکر اُن کے تقریظ نگاروں نے کیا ہے اس کی گرمی اُن کے کلام میں محسوس نہیں ہوتی۔"

خواجہ صاحب ادب کو سماجی عمل سمجھتے ہیں۔ اور وہ اس کے معنوی اور افادی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے۔ مومن کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس وقت رندی اور مذہبیت میں وہ تضاد نہیں تھا جو آج ہے۔

"مومن شاہ عبدالقادرؒ کا شاگرد ہے اور شاہ عبدالعزیزؒ کے مجالسِ وعظ کا حاشیہ نشین۔ وہ مولوی سید احمدؒ کا مُرید ہے اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا ہم سبق لیکن کوچۂ رقیب میں سر کے بل جانے کے لئے تُلا رہتا ہے، اور شبِ وصل غیر کاٹنے کے لئے آمادہ۔ اس کی مذہبیت جب بلند سطح پر پہنچ جاتی ہے تو وہ انگریزی حکومت سے نفرت کا سبب بن جاتی ہے، اور وہ یہ کہہ اُٹھتا ہے۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں — مری جاں فدا ہو تری راہ میں

اسی طرح جب اس کی وقوعہ گوئی یا معاملہ بندی، جرأت و انشاؔ کی سطح سے بلند ہو جاتی ہے تو اس کا انداز یہ ہوتا ہے۔

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں — سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
گلہ ہرزہ گردی کا بیجا نہ تھا کچھ — وہ کیوں مسکرائے بجا کہتے کہتے

فانی کے متعلق اُن کی رائے ملاحظہ ہو۔ اس تنقید کو بجا طور پر تخلیقی اور تعمیری کہا جا سکتا ہے۔

"فانی کے کلام میں رنگا رنگی، مضامین اور متنوع خیالات زیادہ نہیں ہے۔ اس نے اپنی دنیا غم سے بنائی ہے۔ لیکن اس کا غم قطرۂ وسعت طلب ہے جس سے کیفیات و جذبات کے ہزار طوفان برپا ہو سکتے ہیں۔ اس کی درد آشنائی، اعجم اور بہت اہم ہے لیکن اس کی رنگینی اور مسرت زائی بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ یہ نوحہ و نغمہ کی کیفیات بلیک کی طرح اُسکی اپنی ہیں۔ وہ وہی دیکھتا ہے جو وہ دیکھتا ہے، اور وہ وہی کہتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے۔ یہ صداقت اور خلوص شاعری کی دنیا میں ایسی نعمت اور سعادت ہے جو دیر یا زود سے حاصل نہیں ہوتی۔ فانی خالص شاعری کا علمبردار ہے۔ اس کے کلام

میں غیر شعر کی آمیزش نہیں ہے۔ اسی وجہ سے بعض وقت زیخا کی طرح ان اشعار کے آبگینوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر بھی اس کا یہ کمال کیا کم ہے کہ اس نے رضا کو تسلیم کی نظر سے دیکھا ہے۔ اور اس طرح بارِ حیات کو ہلکا کر دیا ہے۔ اس نے تیرگیٔ شام کو نورِ سحر قرار دیا ہے۔ اور اس طرح ہمیں ظلمت کے برداشت کرنے کا اہل بنا دیا ہے۔"

خواجہ صاحب نے مکتوبات پر بھی کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے تین مضمون بڑے معرکے کے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک سرسید کے متعلق جو رسالہ اردو میں بالاقساط شائع ہوا۔ (اکتوبر ۱۹۴۴ء اور جنوری ۱۹۴۵ء) دوسرا مرزا رجب علی بیگ سرور کے متعلق جو نومبر ۱۹۴۳ء کے نگار میں شائع ہوا جس میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ سرور نے بے خبر اور غالب سے بھی پہلے اردو میں خطوط لکھے۔ اور تیسرا مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق ہے جو "آج کل" کے سالنامہ ۱۹۴۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ سب مضامین بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھے گئے ہیں۔ اور اُن میں تبصرہ و نقد کا بھی حق ادا کر دیا ہے۔

اُن کے تحقیقی مضامین میں ابھی تین مقالات کا ذکر ضروری ہے۔ انھوں نے "میر اور خان آرزو کے تعلقات" اور "میر کی خود نوشت" میں میر کی سیرت پر حریفانہ لیکن منصفانہ نظر ڈالی ہے۔ اور اُن کے کمالات کا شناسانہ لیکن غیر ستائشی اعتراف کیا ہے۔ وہ میر کو خدائے سخن مانتے ہیں لیکن اس کا بُت نہیں بناتے۔

ایک اور مضمون جو توجہ کا مستحق ہے وہ "معرکۂ قتیل و غالب" ہے۔ جو اپریل ۱۹۴۲ء کے رسالہ اردو میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ قتیل اور غالب کے جھگڑے کو اس ایرانی ہندی نزاع کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ جو سیاست اور ادب دونوں میدانوں میں جاری تھی۔ اور جس کے اہم مظاہر ایرانی اور تورانی جماعتوں کی باہمی آویزش، شیخ علی حزیں اور خان آرزو کے معرکے ہیں۔ لیکن جن کا سلسلہ عبید اور خسرو اور عرفی و فیضی تک پہنچتا ہے۔

خواجہ صاحب نے چند سوانحی مضامین بھی لکھے ہیں۔ جن میں شوخیٔ اشارت کے ساتھ مرقع کاری کا کمال ہے۔ یہ جملے ملاحظہ ہوں۔ سرتیج بہادر سپرو کے متعلق لکھتے ہیں۔

"سرتیج بہادر کی موت، ایک فرد کی موت نہیں۔ پورے ایک دَور، ایک عہد کا خاتمہ ہے۔ وہ دراصل اُس قدیم تہذیب کا بے مثل نمونہ اور عہدِ دہلی کی، اُس کلچر کا بہترین مظہر تھے، جو منوہر کی رنگ کاری، تان سین کی موسیقی، غالب کی شاعری اور تاج محل کی صناعی میں موجود ہے .... یہ موت کا وہ معمولی واقعہ نہیں ہے جو اس دُنیا میں روز پیش آتا رہتا ہے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماضی کو حال سے ملانے والی ایک زنجیر تھی جو ٹوٹ گئی۔ ہندوستانی تہذیب کا ایک ستون تھا جو گر گیا۔ افسوس۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔"

(آج کل اپریل ۱۹۴۹ء)

خواجہ صاحب کے اسلوب میں سادگی و پُرکاری ہے، اور اسی کے ساتھ ایک خاص قسم کی آب داری اور نازک کاری، لیکن اگر اُن کی بے خودی میں کچھ اور ہوشیاری، اور اُن کی چشمِ باطن میں کچھ اور بصیرت شامل ہو گئی تو اُن کی یہ شراب شمشیر بن جائے گی۔ اسی طرح اگر اُن کی تنقید میں فلسفے اور سائنس کی کچھ اور گہرائی اور گیرائی بھی پیدا ہو گئی تو اُن کا مستقبل حال سے زیادہ تابناک ہوگا۔ ابھی اُن کی تنقید منزل و محمل سے بے نیاز ہے۔ اسی لئے اُن پر کوئی لیبل چپکانا آسان نہیں ہے۔ اور یہ اُن کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔

بسمل سعیدی

غزل

کیا زمانہ تھا وہ جب اُس کا مرا یارا نہ تھا
آپ سے بیگانہ وہ تھا، خود سے مَیں بیگانہ تھا

ربط و ضبطِ باہمی کے ہائے وہ راز و نیاز
عاشقانہ حسن تھا اور عشق معشوقانہ تھا

اُس کو تھا دیدار حاصل مجھ کو نظّارہ نصیب
میرے اُس کے درمیاں اک جلوۂ جانانہ تھا

میرے کفرِ عشق میں تھی ایک ایمانی ادا
اُس کے کافرِ حُسن میں اک عشوۂ تُرکانہ تھا

میرے اشکِ شوقِ پیہم میں تھی اُس کی داستاں
اُس کے اندازِ تبسّم میں مرا افسانہ تھا

ہائے وہ شبہائے زلف و کاکل و گیسو کہ جب
آفتابِ صبح بھی اک شمعِ عشرت خانہ تھا

شاملِ انفاس تھے نغماتِ عیش و انبساط
زندگی کے ساز کا ہر زیر و بم شاہانہ تھا

آنکھ سے دل میں سما جاتے تھے، دل سے روح میں
زندگیٔ شوق کا ہر حال بے تابانہ تھا

ہائے وہ میخوارئ باہم کا عالم، آہ جب
اہتمامِ مے بغیرِ شیشہ و پیمانہ تھا

جب ملیں آنکھوں سے آنکھیں، جب ملے ہونٹوں سے ہونٹ
ہر نظر پیمانہ تھی اور ہر نفس مے خانہ تھا

اُف وہ ربط و ضبطِ شرم و شوق جب باہمدگر
ایک جذبہ مشترک تھا اور بے باکانہ تھا

وہ تقدّم شرم کا ہو یا تجاوز شوق کا
داخلِ مستثنیاتِ لغزشِ مستانہ تھا

اُف وہ فرطِ شوق جس کا نام تھا رنجیدگی
عالمِ رنجیدگی کس درجہ محبوبانہ تھا

برہمی پر ہائے وہ جرمانہائے جرمِ شوق
وجہِ افزونئ شوقِ جرم ہر جرمانہ تھا

بے تعلق زندگی ہونے کا تھا امکاں ہی کیا
زندگی زُلفِ تعلّق تھی مقدّر شانہ تھا

رُونما لیکن مقدّر سے ہُوا وہ عشق کے
جو تلوّن حُسن کی فطرت میں محبوبانہ تھا

حسن تو ہے اک تجلّی، شمعِ ہر محفل صفت
وہ تو کہہ دے گا، یہ اک اندازِ معشوقانہ تھا

ہاں مگر، کل عشق کو دیکھا کہ وہ شوریدہ بخت
بڑھ چکا تھا زندگی میں موت سے، دیوانہ تھا

جا رہا تھا بے ارادہ، بے خیالِ سمت و راہ
اور زباں پر نالۂ موزوں یہ مظلومانہ تھا

چشم ہے محرومِ صورت، گوش مایوسِ صدا
"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا"

پرکاش پنڈت

سگائی کی چائے

افراد

۱ - ساوتری   ۲ - جگل کشور
۳ - اوشا   ۴ - موہن

(دروازہ کھلنے اور چلنے کی آواز)

جگل کشور - اُف ف، ف، بلا کی گرمی ہے توبہ!

ساوتری - آپ آ گئے جگل بھیا - میں کب سے بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی تھی - اس چلچلاتی دھوپ میں آپ کہاں چلے گئے تھے - آئیے ادھر پنکھے تلے آ جائیے -

جگل - ہوں! آج پھر ہمارا انتظار ہو رہا ہے - خدا خیر کرے -

ساوتری - اوفو! آپ تو پسینے سے بھیگ رہے ہیں - نگوڑی گرمی سی گرمی ہے -

جگل - تالو تڑخ گیا ہے — میں کہتا ہوں ایسی گرمی دوزخ میں بھی نہ ہوگی — کناٹ سرکس سے پیدل چلا آ رہا ہوں - ذرا پرتاپ کے یہاں گیا تھا آنے میں سائیکل پنکچر ہو گیا -

ساوتری - کیوں گئے تھے آپ خواہ مخواہ -

جگل - یہ ذرا میری پیٹھ دیکھو - معلوم ہوتا ہے پسینہ نہیں سینکڑوں کنکھجوڑے پیٹھ پر رینگ رہے ہیں - میں کہتا ہوں یہ پرتاپ بھی عجیب گھن چکر ہے - بھلا کوئی پوچھے کہ صاحب زادے سگائی تو ہوئی میری اور پارٹی دے رہے ہو تم — یہ کس عقلمندی کی علامت ہے - یہ کوئی پیرس یا نیویارک نہیں کہ پارٹی دینے والا دلہن لے اڑے - (ہنستا ہے)

ساوتری - ایسا تو کبھی نہیں سُنا -

جگل - اور سنو - کچھ ایسی ویسی بھی نہیں خوب ٹھاٹھ کی دعوت تھی - ڈیڑھ دو سو سے کیا کم اُٹھا ہوگا -

ساوتری - عجب تماشہ ہے — اچھا یہ سب تو ہوا آپ یہ بتائیے کہ موہن کو آپ نے کہیں باہر بھیجا ہے - صبح سے کہیں دکھائی نہیں دیا میں کہتی ہوں آپ نے اسے خواہ مخواہ سر پر چڑھا رکھا ہے - کیا مجال جو پاؤں پر پانی پڑنے دے - جب بھی پوچھو کہ اے موہن بتا کہاں جا کر مر گیا تھا تو یا تو سنی ان سنی کر دے یا پھر تنک کر کہے گا — چھوٹے صاحب نے بھیجا تھا - آپ اسے کہیں بھیجیں یا وہ کسی پنواڑی کی دوکان پر بیٹھا مزے سے بیڑیاں پھونکتا رہا ہے یہ بہانہ اسے خوب ہاتھ لگا ہے - دیکھئے آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ گھر والے تو گھنٹوں اس کی راہ میں آنکھیں لگائے بیٹھے رہیں کہ حضور کب تشریف لائیں اور کب — مرجلا آج آئے پتا جی سے کہہ کر سڑک پر نہ ڈلوا دیا تو میرا نام بھی ...... یہ تو وہ بات ہوئی، ہونہہ!

جگل - اے، ہے کیوں خواہ مخواہ انگارہ ہو رہی ہو اُسے تو صبح ماتا جی نے میرے سامنے ٹوکری دے کر چاچا جی کے یہاں بھیجا تھا - آتا ہی ہوگا - چار میل سے کم کا راستہ نہیں - اس پر اس قدر گرمی، اُبل جائیگا بے چارا -

ساوتری - ہاں ہاں جی بھرتہ ہی تو ہو جائے گا — آپ ہی نے اُسے منہ لگا رکھا ہے - یہی دیکھئے آپ اس برستی آگ میں ہو ہو کرتے آئے ہیں نہ برف نہ شربت - ٹھنڈے پانی تک کا تو ٹھکانا نہیں — بھلا ایسے میں کوئی مہمان آ جائے تو -

جگل - ایسے میں کوئی سمجھ بوجھ رکھنے والا مہمان تو آنے سے رہا یہ وقت میزبان اور مہمان نوازی کا ہے -

ساوتری - دیکھئے، بدقسمتی سے آج میں اپنی ایک سہیلی کو چائے پر بلا بیٹھی ہوں - گھر میں ڈبل روٹی تک نہیں — ذرا پاس کے ہوٹل سے چند ٹکڑے پیسٹری کے تو لا دیجئے - بڑا احسان ہوگا، موا موہن یہاں ہوتا تو

آپ کو تکلیف نہ دیتی -

جگل - ہوں! نکلی نہ وہی بات - میں تو آتے ہی سمجھ گیا تھا کہ میرے لئے تمہارا انتظار ..... نہ بھئی یہ مجھ سے نہ ہوگا تمہاری سہیلیوں کی خاطر میں اپنے آپ کو آگ میں نہیں جھونک سکتا - کمال ہے تمہاری سہیلیاں تو میرے لئے وبالِ جان ہوگئیں - اس دن جانے کون گھسیارن آپڑی جو حکم صادر ہوا — جگل بھیا! آج تو گول گپے کھانے کو جی چاہتا ہے - کہیں سے گول گپے والے کو ڈھونڈ لائیے — تمہارا کیا بگڑتا ہے - تمہاری تو صرف زبان ہلتی ہے — میں پوچھتا ہوں یہ کنواری بالیاں کیا گھر گھر کو کرتے لگاتی پھرتی ہیں - اس پر لطف یہ کہ فلاں رائے صاحب کی نواسی ہے - فلاں رانا صاحب آپ کے دادا ہیں — ہونہہ! آخر میرے بھی تو دوست آتے ہیں کبھی کسی نے بھولے منہ سے پانی تک نہیں مانگا - پھر دیکھتا ہوں کہ تمہاری سہیلیوں کی دلی خواہش بھی کچھ یہیں آکر زور پکڑتی ہے - پکوڑے کھٹے چنے "آم پاپڑ" گول گپے — ہونہہ! کیا الا بلا کھاتی ہیں -

ساوتری - جگل بھیا وعدہ لے لو کہ پھر کبھی آپ کو تکلیف نہ دونگی بس آج — بات اصل میں یوں ہوئی کہ کل نہ جانے مجھے کیا سوجھا کہ میں نے اوشا کو آج شام کی چائے یہیں پینے کے لئے کہہ دیا - وہ تو پوچھتی ہی رہی کہ بے موسمی دعوت کس سلسلے میں کی جا رہی ہے لیکن میں نے نہیں بتایا میں اسے آج بتانا چاہتی تھی کہ پرسوں جگل بھیا کی سگائی ہوئی ہے کچھ اسی لئے — ذرا مزا آئے گا اسے سگائی کا ابھی کچھ علم نہیں -

جگل - اوشا! اوشا آرہی ہے؟ ایں - ہشت - یونہی بک رہی ہو سچ پوچھو تو بہن ساوتری مجھے تمہاری تمام سہیلیوں میں ایک اوشا ہی کچھ سمجھ بوجھ والی دکھائی دیتی ہے - بات چیت کا ڈھنگ، بناؤ کا سلیقہ بھی تو آخر کوئی چیز ہے لیکن تم نے اسے چائے پر — اچھا تو تم اسے بیوقوف بنانا چاہتی ہو لیکن جناب وہ تو بس ایک ہے -

ساوتری - ایک! یعنی کیا — ہونہہ — یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا بیچاری نے تو کبھی آپ کے سامنے نظر تک نہیں اٹھائی - بڑی شرمیلی ہے - بالکل آپ کی دلہن کی طرح — بھیا اس دن جب میں اور ماتا جی دلہن دیکھنے گئیں تو شروع سے آخر تک چینی کی گڑیا سی وہ گم سم ہی بیٹھی رہی - میں نے تو کئی بار چھیڑا، جھنجھوڑا لیکن کیا مجال کہ — بڑی پیاری ہے — آپ دیکھیں گے تو — میں کہتی ہوں ذرا اس گھر میں اس کا قدم پڑنے کی دیر ہے میری تو کوئی بات آپ مانتے ہی نہیں - آنکھ کے ایک اشارے سے اس نے یوں تیر نہ کر دیا تو .....

جگل - اچھا بھئی تیر کرے چاہے کمان، جو ہوگا دیکھا جائے گا لیکن دیکھو میں تمہیں ایک بات بتاؤں - یہ سگائی کی بات تم آج بھی اوشا کو نہ بتاؤ پھر دیکھنا کیا لطف آتا ہے - میں نے خود کئی بار ایسی ہی باتوں سے بڑے بڑے حضرتوں کے چھکے چھڑا دئے ہیں -

ساوتری - میں کچھ سمجھی نہیں — بھلا اس سے کیا ہوگا -

جگل - یہی تو، یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ تم نہ سمجھو گی - ہر بات دراصل مناسب موقعہ کی محتاج ہوتی ہے - یہ تو کچھ نہ ہوا کہ چائے کی ایک پیالی کے ساتھ وہی بات پھٹاک سے کہہ دی جائے جو بعد میں مناسب موقع پر کہنے سے دوسرے کو اچنبھے میں ڈال دے حیران کردے سننے والا سکتے میں آجائے -

ساوتری - نہ جی مجھ سے تو یہ نہ ہوگا - بیچاری نے میرا کیا بگاڑا ہے کہ خواہ مخواہ اسے پریشان کرتی پھروں - پھر بھلا آپ کو اس سے کون سی لگاوٹ ہے - وہ بیچاری تو ہمیشہ آپ کی تعریفیں ہی کرتی رہتی ہے - خیر چھوڑیئے، آپ کو بھلا اس سے کیا .....

جگل - نہ بھئی، آخر معلوم تو ہو کہ وہ میری کیا تعریفیں کرتی ہے - میں تو سمجھتا ہوں جلتی ہے مجھ سے -

ساوتری - ارے! یہ آپ سے کس نے کہا - اس نے تو کبھی بھولے سے بھی آپ کے خلاف ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا — وہ کچھ ایسی چھچھوری نہیں — خیر ہٹائیے — آپ ذرا پاس کے ہوٹل سے ....

جگل - نہیں ساوتری بہن — میری بات تو تمہیں ماننا ہی ہوگی — اور کچھ نہیں ذرا دلچسپی ہی رہے گی — زندگی میں دراصل معمولی معمولی باتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں - یہ بھی سائیکالوجی کا ایک اصول ہے - ذرا غور تو کرو کہ ابھی جو وہ آکر تم سے پوچھے کہ بتاؤ آخر ماجرا کیا ہے اور تم اسے یونہی باتوں باتوں میں ٹال دو کہ آہا! تم سمجھیں میں کوئی بہت بری خبر تمہیں سنانے جا رہی ہوں - یہ تو یونہی میرے جی میں آئی میں نے چائے پینے کے لئے کہہ دیا اب وہ تمہارے چہرے سے یہ تو پڑھ لے گی کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے

[illegible] - پھر وہ ... باتیں کرتی رہے گی کہ ہو نہ ہو کسی طرح وہ بات
تمہارے منہ سے نکلوا لے - باتوں باتوں میں وہ تمہارے منہ سے اگلوانے کی کوشش
کرے گی - تمہاری منتیں کرے گی لیکن ادھر تم بھی کچھ کچی گولیاں نہیں کھیلیں -
اسی طرح ٹال مٹول کرتی رہو گی — کئی طرح کے خیالات اسے پریشان کریں گے
کبھی اپنے بارے میں کبھی اپنے گھر والوں کے بارے میں وہ کئی طرح کی
قیاس آرائیاں کرے گی - اس ذہنی کشمکش میں جو جذبات اُبھر کر اس کے
چہرے پر ظاہر ہوں گے بس وہی . . . .

ساوتری - مجھے بھی کئی بار وہ اس طرح الجھا چکی ہے - مجھ سے
کوئی بات چھپائیے مجھے تو چین نہیں پڑتا - سوتے جاگتے بس یہی خیال
دماغ پر سوار رہتا ہے کہ آخر بات کیا ہے جو چھپائی جا رہی ہے لیکن
جب کئی دنوں کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس سے میری پنسل گم ہو گئی تھی یا
وہ بغیر مجھے ساتھ لئے سینما دیکھ آئی تھی تو سچ مچ بڑی جھلاہٹ ہوتی ہے
واقعی اب خوب مزا آئے گا میں تو ہرگز اسے نہیں بتاؤں گی کہ — لیکن
آپ پاس کے ہوٹل سے . . . .

جگل - تو گویا بات تمہاری سمجھ میں آ گئی — لیکن میں نے کہا
ساوتری بہن! بھئی یہ کیا کمال ہے کہ تمہاری سہیلیاں آئیں ان کی فرمائشوں
پر ہم شہر کا کونہ کونہ چھانتے پھریں لیکن اگر کبھی اپنی کتاب وغیرہ ڈھونڈنے
آپ لوگوں کے کمرے میں چلا جاؤں تو بس آفت! یوں ٹکر ٹکر تاکنے لگتی ہیں
جیسے چڑیا گھر سے بھاگا ہوا لنگور ہو - ہوّا ہوں کہ نہیں کھا جاؤں گا۔
تم نے بھی تو کبھی بھولے منہ سے اتنا نہیں کہا کہ آئیے بھیا ذرا ان رسگلوں
ہی کا مزہ چکھئے — یہ تھوڑا فالودہ ہی پی لیجئے - یوں تو میری عادت
بھی نہیں . . . .

ساوتری - عادت! دیکھئے یہ آپ جھوٹ کہہ رہے ہیں - بھلا
باہر دیوار سے کان لگائے آپ کیا سنا کرتے ہیں - میں نے تو دسوں بار آپ
کو دیکھا ہے - اس دن اوشا بھی کہہ رہی تھی -

جگل - کیا کہہ رہی تھی اوشا؟

ساوتری - کہہ رہی تھی اپنے بھیا کو اندر بلا لو - کھڑے کھڑے
تھک جائیں گے (ہنستی ہے)

جگل - ہونہہ! واہ — بڑی آئی ہے نا! خیر کچھ مضائقہ نہیں -

دیکھو آج تم خود ہی مجھے اپنے کمرے میں بلا لینا — میں تمہارا پارٹ اور اس
چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ کر ہی بتا دوں گا کہ نشانہ ٹھکانے پر لگا ہے یا
اب اسے بھی . . . . واہ! بھئی تم نے ٹھیک کہا ہے کہ بڑی بھولی ہے -
یہ باتیں کہنے کی ہوتی ہیں — کمال ہے —

ساوتری - لیکن میں کہتی ہوں اگر وہ آ گئی تو . . . .

جگل - تو کیا تم یہ چاہتی ہو کہ وہ نہ آئے -

ساوتری - نہیں نہیں میرا مطلب ہے - گھر میں تو کچھ ہے نہیں
باورچی خانے میں چائے کی کیتلی تو میں نے آدھ گھنٹے سے لگا رکھی ہے - اُبل
اُبل کر وہ بھی ختم ہو گئی ہو گی -

جگل - دیکھو بھئی پھر کہو گی — ہاں - اب تم یہ چاہتی ہو کہ میں ہر
موڑ والے اٹھائی گیرے سے پیسٹری لے آؤں - آدمی دعوت کرے تو ذرا جی جان
سے - یہ کیا کہ بلایا تو بڑی شان سے اور رکھ دیئے سامنے پیسٹری کے چند
باسی بدبودار ٹکڑے لوٹ کا رو - سو مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ کھانے پینے کی
چیزیں اس لٹیرے سے مت منگوایا کرو - جب شہر میں عمدہ سے عمدہ چیز
مل سکتی ہے اور پیسے ہر جگہ نقد دیتے ہیں تو کیوں خواہ مخواہ — چار قدم
اور چلنے سے کیا پاؤں گھلتے ہیں -

ساوتری - میں نے تو آپ ہی کے لئے کہا تھا - اس دھوپ میں
بھلا آپ کہاں جائیں گے - پھر آپ کا سائیکل بھی تو پنکچر ہو گیا ہے -

جگل - پنکچر تو میں لگوا لایا تھا - نہیں جی کم از کم میں تو وہاں سے
کچھ لانے سے رہا - جب کرنا ہی ہے تو دو قدم اور نہ جایا جائے گا اور دیکھو
پیسٹری ہو گی کیک ہو گا سینڈوچز آئس کریم . . . .

ساوتری - لیکن میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں ہیں -

جگل - اگر یہ سب کہا ہے تو آج پیسے بھی اپنی گرہ سے دوں گا —
میرا جی بھی آج سینڈوچز کھانے کو چاہ رہا ہے — اچھا میں چلا -
(پاؤں کی چاپ - پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز)

وقفہ

(دروازہ کھلنے کی آواز اور پاؤں کی چاپ)

ساوتری - چہ! تم آ گئیں واہ بڑی عمر ہے تمہاری - ابھی ابھی
تمہاری ہی باتیں ہو رہی تھیں - آؤ ادھر بیٹھو - اس کرسی پر — (کرسی

گھسیٹنے کی آواز)

اوشا - میری باتیں! دل ہی دل میں ہو رہی ہونگی (ہنستی ہے)
اف - ف - گرمی کے مارے تو — لیکن جناب کچھ یاد بھی ہے - آج چائے پلانے کا وعدہ تھا - لیکن یہاں تو چائے کے پانی تک کی بو نہیں اور ہاں آج میں کوری چائے پینے کی نہیں بھئی!

ساوتری - اے ہے کیوں خواہ مخواہ مری جا رہی ہو - سب کچھ ہوگا - ذرا دم تو لو -

اوشا - دم تو آ رہا ہے لیکن چائے آتی دکھائی نہیں دیتی - (ہنستی ہے)

ساوتری - چائے بھی آجاتی ہے ذرا جگل بھیا آ لیں — ذرا بازار تک گئے ہیں — تمہارے ہی لئے بڑی مشکل سے بھیجا ہے -

اوشا - میرے لئے، کیا مطلب! نہیں میں کچھ سمجھی نہیں -

ساوتری - ابھی سمجھ جاؤگی جب وہ طرح طرح کی چیزوں سے لدے پھندے آئیں گے -

اوشا - تو کیا تم نے انہیں کھانے کی چیزیں لانے کو بھیجا ہے - موہن نہیں تھا -

ساوتری - موہن چاچا جی کے ہاں مٹھائی کی ٹوکری لے کر گیا ہوا ہے - ہک - ہا - تمہارے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا - کسی طرح مانتے ہی نہ تھے لیکن سچ پوچھو تو تمہارے نام میں جادو ہے شاید جونہی یہ کہا کہ تم آ رہی ہو - فوراً جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے -

اوشا - اے لعنت! کم بخت کیوں تم نے انہیں بھیجا - اس دھوپ میں تو کوئی اپنے دشمن کو بھی باہر نہیں نکلنے دیتا - بڑی ظالم ہو - پیدل ہی گئے ہوں گے -

ساوتری - نہیں ہوائی جہاز پر — شاید سائیکل پر گئے ہوں - کہہ رہے تھے سائیکل پنکچر ہو گیا ہے پھر بولے کہ پنکچر لگوا لایا ہوں - ان کی بھی کچھ سمجھ نہیں آتی -

اوشا - کچھ بھی ہو — میرے لئے ناحق انہیں تکلیف اٹھانا پڑی - ہیں بھی بیچارے بالکل سیدھے سادے - جس وقت اور جدھر بھی کہتی ہوگی اٹھ بھاگتے ہوں گے -

ساوتری - جی ہائے بالکل سرمہ ہیں آنکھ میں ڈالے جا سکتے ہیں ابھی ابھی جو پٹی مجھے پڑھا رہے تھے، سن پاتیں تو دانتوں تلے انگلیاں داب لیتیں -

اوشا - تم کہہ رہی تھیں، میرے متعلق کہہ رہے تھے -

ساوتری - ہاں ہاں کہہ رہے تھے ایک تم ہی میری تمام سہیلیوں میں ....

(دروازہ کھلنے کی آواز - پاؤں کی چاپ)

اے موئے موہن! باہر جا کر گھر باہر سب بھول جاتا ہے — ٹوکری نہیں لایا؟

موہن - بی بی جی، وہ کہہ رہے تھے خود ہی بھجوا دینگے -

ساوتری - اچھا پہلے جا رسوئی میں دیکھ کہیں اسٹوپ تو نہیں بجھ گیا اور دیکھ — بجھ گیا ہو تو جا کر چائے کے لئے پانی رکھ دے -

موہن - اچھا بی بی جی -

(پاؤں کی چاپ، دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر ذیل کا پہلا جملہ سپرامپوز)

اوشا - یہ ٹوکری والا کیا معاملہ ہے - پہلے بھی تم کہہ رہی تھیں مٹھائی کی ٹوکری ....

ساوتری - یہی تو، یہی تو میں تمہیں بتانا چاہتی تھی لیکن ذرا جگل بھیا آ لیں -

اوشا - وہ آ لیں - کیا کوئی عجوبہ ہے - بھئی بتاؤ وہ تو نہ جانے کب آ چکیں گے -

ساوتری - لیکن پہلے وعدہ کرو کہ ان کے سامنے اس بارے میں کچھ نہ کہوگی - وہ مجھ سے وعدہ لے چکے ہیں -

اوشا - کیا وعدہ لے چکے ہیں - بھئی تم تو پہیلیاں بجھواتی ہو — بتاؤ نا کیا کہا تھا انہوں نے"

ساوتری - یہی کہ یہ بات میں تمہیں نہ بتاؤں -

اوشا - کونسی بات، عجیب بات ہے ہونہہ!

ساوتری - پرسوں ان کی سگائی تھی - اسی کی مٹھائی چاچا جی کے یہاں ٹوکری میں بھیجی گئی تھی اور اس کی خوشی میں میں نے تمہیں آج چائے پر بلایا ہے - سمجھی! بھئی اوشا، جگل بھیا تو جو ہیں سو ہیں بھابی ہماری بس لاکھوں میں ایک ہے - کسی دن تمہیں بھی دکھانے لے چلوں گی -

اوشا - سگائی! تمہارا مطلب ہے پرسوں ان کی سگائی ہو چکی - ہشت بنا رہی ہو -

ساوتری - نہیں جناب، اب تو نہیں بنا رہی وہ کہتے تھے نہ بتاؤں اس طرح کہ آج تمہیں یہ بات نہ بتائی جائے - کہنے لگے یہ بھی سائیکالوجی کا ایک اصول ہے جسے میں نہ سمجھوں گی - آج یہ بات نہ بتانے سے وہ کئی دن پریشان رہے گی - رہ رہ کر وہ اپنے بارے میں، اپنے گھر والوں کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرے گی - اس ذہنی کشمکش میں ....

اوشا - (جیسے اپنے آپ سے) تو واقعی ان کی سگائی ہو گئی -

ساوتری - واقعی مزا تو بڑا آتا اگر میں تمہیں یہ سب نہ بتاتی - لیکن تمہیں یہ ایکدم کیا ہو گیا ہے — تمہارا چہرہ ....

اوشا - (سُنی ان سُنی کرتے ہوئے) سگائی — کیا وقت ہو گا -

ساوتری - یہ پونے پانچ ہیں — کیوں ؟

اوشا - اب میں چلوں گی .

ساوتری - کہاں، کیوں، کہاں ہے، نہیں نہیں -

اوشا - نہیں اب میں جاؤں گی - پتا جی انتظار کر رہے ہونگے سینما جانے کو کہہ رہے تھے - ناراض ہوں گے (کرسی سے اٹھنے کی آواز)

ساوتری - لیکن سینما شروع ہونے میں تو ابھی بہت دیر ہے -

اوشا - (روکھی ہنسی ہنستے ہوئے) اپنے بھیا سے کہنا - اپنی سگائی کی مٹھائی ہمیں نہیں کھلائی -

ساوتری - لیکن وہ تو آتے ہی ہوں گے خود ہی کہہ دینا ان سے -

اوشا - نہیں تم ہی کہہ دینا — اور یہ بھی کہ اب میرے لئے انہیں کبھی تکلیف نہ اٹھانا پڑے گی -

ساوتری - لیکن .....

(قدموں کی چاپ، دروازہ کھلنے پھر بند ہونے کی آواز)

وقفہ

(دروازہ کھلنے کی آواز - پاؤں کی چاپ)

جگل - اف، ف، ف توبہ! بلا کی گرمی ہے - (جیسے سنبھالو کاغذوں کی سرسراہٹ) یہ رہا کیک، پیسٹری، بالکل تازہ ہے - یہ سینڈوچز - چکنا یہ سبھی کچھ آ گیا - صرف نہیں آئی تو تمہاری سہیلی - میں تو ڈر رہا تھا کہ کہیں آ نہ چکی ہو -

ساوتری - سگائی کی بات اپنے اندر اتنی بڑی اہمیت رکھتی تھی یہ مجھ بعد میں معلوم ہوا - آپ کو بھی کیا دور کی سوجھی -

جگل - سو تو میں کہہ ہی رہا تھا - تم بھلا اس دماغ کو کیا سمجھتی ہو - اور پھر یہ تو اتنی بڑی بات بھی نہیں - میں نے اس سے بھی معمولی معمولی باتوں پر ان لوگوں کو ناکوں چنے چبوا دئے جو کبھی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے - اور لڑکیوں کی سائیکالوجی تو ....

ساوتری - آپ کا دل بھی آج سینڈوچز کھانے کو چاہ رہا تھا -

جگل - ہاں میں بھی ایک آدھ پیس لے لوں گا -

ساوتری - ایک آدھ پیس کیوں — یہ سب آپ ہی کھائیے -

جگل - کیوں کیا مطلب ہے، اوشا نہیں آ رہی -

ساوتری - وہ تو آ کر چلی بھی گئی -

جگل - چلی گئی! کہاں، کیوں چلی گئی - تم نے کیوں جانے دیا - تم نے یہ نہیں کہا کہ ....

ساوتری - میں نے تو بہت کہا کہ آپ کھانے کی چیزیں لینے گئے ہیں آتے ہی ہوں گے لیکن وہ تو ایک دم مجھ پر برس پڑی - کہنے لگی کہ میری خاطر دوسروں کو تکلیف دیتی ہو - میں چائے نہ پیوں گی -

جگل - دوسروں کو — کیا میں — کچھ اور بھی تو کہتی ہو گی -

ساوتری - کہنے لگی اپنے بھیا سے کہنا اب میرے لئے انہیں کبھی تکلیف نہ اٹھانا پڑے گی -

جگل - تکلیف! کبھی! کیسی تکلیف - نہیں نہیں اس میں تو تکلیف کی کوئی بات ....

ساوتری - اور یہ بھی کہا تھا کہ سگائی کی اس چائے کا شکریہ -

جگل - سگائی کی چائے — تو کیا تم نے — تم نے اُسے (مرتی ہوئی آواز میں) ساوتری! یہ تم نے کیا کیا — اب کبھی تکلیف نہ اٹھانا پڑے گی سگائی کی چائے — اوشا! آہ!!

فیڈ آؤٹ

(پنجابی زبان میں یہ فیچر جالندھر ریڈیو سے کھیلا جا چکا ہے)

شمیم کرہانی

غزل

جنوں اِک دورِ مدہوشی خرد اک عہدِ خمیازہ
بقیدِ ہوش، اُمیدِ سکوں، طفلانہ اندازہ

زمین و آسماں ہیں تنگ میخواروں پہ اے ساقی
خدارا تو نہ کرنا بند میخانے کا دروازہ

برابر سب کو مے ملتی تو پھر شورش ہی کیوں ہوتی
مرے ساقی غلط بےحد غلط ہے تیرا اندازہ

ہواؤں میں بکھر جائیں گی پنکھڑیاں شگوفوں کی
کسی دن منتشر ہو جائے گا ہستی کا شیرازہ

کہاں آنسو بہانا اور کہاں پیہم لہو رونا
غمِ دوراں سے ہوتا ہے غمِ جاناں کا اندازہ

ترے ہاتھوں وہ بیزاری کا عالم ہے غمِ دُنیا
محبت بن گئی ہے طنز، حرفِ دست آوازہ

چراغ افسردہ، شیشے سرنگوں، میخوار فریادی
یہ شامِ سرخوشی ہے دوستو یا صبحِ خمیازہ

درائے کارواں بے جان و اہلِ کارواں بیدل
بساز و سوزِ مستانہ شمیم اک نغمۂ تازہ

ثاقب کانپوری

غزل

جب سے ترا، اشارۂ پنہاں نہیں رہا
دل بستگی کا کوئی بھی ساماں نہیں رہا

ویرانیوں سے گھر کی ہوں آسودۂ خیال
یعنی مجھے جنونِ بیاباں نہیں رہا

دیتی رہی نگاہ تری ضبط کا پیام
میں بوئے گل کی طرح پریشاں نہیں رہا

تھیں جس میں جذبِ حُسن کی ساری تجلیاں
میں کیا کروں وہ دیدۂ حیراں نہیں رہا

اے ضعف تونے کھو دیا لطفِ جنونِ شوق
ہاتھوں میں میرے، میرا گریباں نہیں رہا

بربادیوں نے کر دیا محرومِ التفات
خوش ہوں کہ اب میں لائقِ احساں نہیں رہا

تھے داغہائے دل ترے سرمایۂ حیات
غربت میں بھی میں بے سروساماں نہیں رہا

بے کیف ہو گئی ہے مری کائناتِ دل
جب سے خلش فزا ترا پیکاں نہیں رہا

مایوسیٔ فراق کی اللہ ری تیرگی
میرا خیال سلسلۂ جُنباں نہیں رہا

کب دینے والے نے دیا پیغامِ زندگی
جب دل میں میرے کوئی بھی ارماں نہیں رہا

رکھ لی مرے جنوں نے مری آرزو کی شرم
سر زیرِ بارِ منتِ درباں نہیں رہا

ثاقب کی آہ کا ہُوا شاید کہ کچھ اثر
وہ رنگِ بزم و حُسنِ گلستاں نہیں رہا

اسلام حسین

سُریلے بول

زبانوں کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی سلاست اور شیرینی ہوتی ہے، اور عوام کی زبان بھی وہی ہو سکتی ہے جو سلیس ہو۔ زبان میں حلاوت اور سلاست کے شامل ہو جانے کے بعد دل پر اثر انداز ہونے کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے — ہندوستان میں جہاں متعدد قومیں آئیں وہیں متعدد زبانیں بھی وجود میں آ گئیں۔ سنسکرت کو ہند کی سب سے قدیم زبان ہونے کا دعویٰ ہے۔ پھر بھی وہ عوام کی زبان نہ بن سکی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ عام فہم نہ تھی۔ فارسی نے مسلم قوم کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں قدم رکھا۔ حلاوت اور شیرینی سے لبریز ہونے کے باوجود عوامی زبان نہ بن سکی۔ کیونکہ وہ بھی ایک مخصوص طبقہ کی فہم تک محدود تھی جو اہلِ علم و ادب تھے۔ یہی حال عربی، انگریزی اور ان دیگر زبانوں کا ہوا جو ہند اور دوسرے ممالک کے اتصال سے وجود میں آئیں۔ اردو بھی ایسے دَور سے گزر چکی ہے جب اس میں فارسیت کے بہت زیادہ عناصر موجود تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ تبدیل ہو کر ایک ایسی صورت میں آگئی جو اس کی کامیابی کا سب سے بڑا باعث ہے۔ فارسیت کا جامہ اُتارنے کے بعد اردو کے عوام کی زبان بننے سے ہم منکر نہیں ہو سکتے۔ اس کی سب بڑی شناخت سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کسی ایک قوم نے نہیں بلکہ مسلمانوں کے ساتھ ہندو، سکھ اور حتّٰی کہ عیسائیوں نے بھی اس کو سنوارنے میں برابر کا حصّہ لیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر دور اور ہر زبان سے متاثر ہوئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُس نے ہمیشہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ قدم اُٹھایا ہے۔ اردو نے دوسری زبانوں کے وہ تمام الفاظ جو عام فہم اور حلاوت اور سلاست سے لبریز تھے اپنے میں جذب کر لئے ہیں یا دوسرے الفاظ میں دوسری زبانوں کی تمام حلاوت، سلاست اور لطافت جمع کرنے کے بعد اردو کا خمیر تیار ہوا ہے۔ اردو کی کامیابی کی ایک وجہ یہ ہے ہند کے عوامی طبقہ میں وہی زبان کامیاب ہو سکتی ہے جو عام فہم ہو، اس سلئے کہ عوامی طبقہ بہت مدت تک غیر تعلیم یافتہ ہے۔

لیکن یہ تمام اوصاف صرف زبان ہی تک محدود نہیں جو کسی زبان کو عوام میں مقبولِ عام بنا سکتے ہیں۔ بلکہ ہر ادیب اور شاعر بھی یہی اوصاف اپنا کر عوام کے دلوں کو اپنا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کے وہ شعراء بھی جن کے کلام میں فارسیت زیادہ غالب ہے عوام میں اتنے مقبول نہیں جتنے کہ وہ شعراء ہیں جنھوں نے زبان کو فارسی کے الفاظ اور خارجی تصوّرات سے نکال کر ہندستانی جامہ پہنایا۔ ہند کی اپنی زبان اور طرز کو جس نے سب سے زیادہ اپنایا وہ نظیر اکبر آبادی تھے۔ ان کی شاعری میں ہم کو اپنے تصوّرات اپنی طرز اور اپنی زبان ملتی ہے۔ ایک انگریزی نقّاد کا خیال ہے کہ "شاعری صرف مادری زبان ہے۔ جو مادری زبان پر مکمل قادر ہوگا وہ بہترین شاعر ہوگا" لیکن ہماری مادری زبان نہ صرف اردو ہے نہ صرف ہندی، بلکہ ان دونوں کے امتزاج سے جو لطیف اور سلیس زبان پیدا ہو وہی ہندوستان کی مادری زبان کہے جانے کی مستحق ہوگی۔

عظمت اللہ خاں کے یہاں ہم کو اردو ہندی کا بہت ہی دلکش امتزاج ملتا ہے۔ عظمت اللہ خاں ہند کے ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ نظیر کے بعد انہوں نے اسی طرز کو اپنایا ہے۔ لیکن اُن کی شاعری قلم اور باہری تصوّرات سے بالکل خالی ہے۔ ہند اور یہاں کی پست حالت سے اُن کے ذہن کو شدید تکلیف پہنچتی تھی۔ انھیں اپنے اس وطن سے محبت تھی لیکن جب وہ اس کی پست حالت، سماج کی سوقیانہ بندشیں، اور ان میں تڑپتے ہوئے ہزارہا معصوم دلوں کو دیکھتے تو خود بھی تڑپ جاتے۔ اور یہی تڑپ آپ کو ان کی شاعری میں ہر جگہ ملے گی۔ اور یہی تڑپ تھی، یہی احساس تھا جس نے اُن کو ایک نئے موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا۔ اور یہ موڑ صرف

عظمت سے ملے نہیں بلکہ اُن کی شاعری کے لئے بھی ایک نیا موڑ تھا۔ انھوں نے کسی بھی تصور اور اسلوب کو نہیں اپنایا بلکہ اپنے اسی احساس کو شاعری کا جامہ پہنایا جو حقیقت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ حقیقت سے بہت جلد متأثر ہوتا ہے، اور حقیقت کی شناخت یہ ہے کہ وہ ہمارے دلوں کو گرویدہ کرلیتی ہے۔ ایک ہندوستانی کے لئے جتنی لطافت ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال کے واقعہ میں نظر آئے گی رومیو جولیٹ کا قصۂ عشق اس کو اتنا متأثر نہ کر پائے گا۔ بالکل یہی حال ہماری شاعری کا ہے۔ جو کسک ہم ہند کے حسن و عشق۔ رعنائی اور بہاروں میں محسوس کریں گے وہ مصر و یونان کی بہاروں اور حسن میں نہیں۔ کیونکہ ایک دیدہ اور دوسرا شنیدہ ہے۔

عظمت ہندوستان کے پہلے شاعر تھے جنھوں نے صرف اس کا احساس ہی نہیں کیا بلکہ ہند کے ہر دُکھ کو اپنی شاعری کے ذریعے اپنانے میں وہ آگے آگے رہے۔ لیکن وہ سب سے زیادہ متأثر ہند کی عورت کی بے بسی سے ہوئے غالباً وہ پہلے شاعر تھے جس نے عورت کے دھڑکتے دل پر ہمدردی کا ہاتھ رکھا۔ ان کی شاعری میں ہندوستان کی عورت، اس کی فطرت، اس کی بے بسی اور اس کے دل کی دھڑکنیں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ اُنھوں نے نہ صرف عورت کی فطرت کا مطالعہ کیا ہے بلکہ اُس سماج کے ہر پہلو کو واضح کیا ہے، جس میں عورت کی زندگی گھٹ گھٹ کر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ہند کی عورت کی فطرت کے بہت بڑے نباض تھے اُن کے کلام کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ اُنھوں نے حسن و عشق کے فرسودہ تصورات سے اپنے ذہن کو پاک رکھا ہے اور اپنے کلام میں ایک ناقابلِ انکار حقیقت پیش کر کے سماج کے فرسودہ تصورات اور مظالم کا پردہ چاک کر دیا ہے۔

"عورت اور محبت" کا موضوع ہماری شاعری کا سب سے زیادہ عام موضوع رہا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ محبت کا جذبہ نہ صرف زندگی میں بلکہ شاعری میں بھی ایک ایسا درد اور سوز و گداز پیدا کر دیتا ہے جو ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔ لیکن اب تک ہمارے شعرا نے عورت کو حقیقی روپ میں نہیں دیکھا یا سوچا ہے۔ میر۔ غالب اور مومن نے بھی جس عورت کو اُجاگر کیا وہ ہندوستانی عورت نظر نہیں آتی۔ ناسخ و آتش نے جس عورت کو پیش کیا وہ عورت نہیں اس کا فحاشانہ روپ تھا۔ اکبر نے عورت کی محبت اور محبوب کے ظلم و ستم سے الگ رہ کر ایک نئے نظریہ سے عورت کو دیکھا لیکن طنز پر اکتفا کیا۔ حالی نے البتہ "اے ماؤں، بہنو، بیٹیو" کہہ کر عورت کو ایک حد تک احساس دلایا کہ اب بھی عورت کی پاک فطرت کو تسلیم کرنے والے موجود ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عورت کی فطرت کا صحیح اندازہ اب تک کسی کو بھی نہ ہو سکا تھا۔ میر کی محبت، غالب کا فلسفہ۔ مومن کی حساس نظریں اکبر اور حتیٰ کہ اکبر کی ناقدانہ فطرت اور حالی کی دردمند طبیعت بھی اُس کی فطرت کی نباضی نہ کر سکی۔ ناسخ و آتش نے اپنے ماحول کے مطابق جس عورت کو پیش کیا وہ ہند کی بگڑی ہوئی عورت کا فحاشانہ روپ تھا۔ اس میں بھی وہ حد سے تجاوز کر گئے۔ اکبر کے طنز نے عورت کو اور جھنجھلا دیا۔ حالی کی خالی خولی نصیحت بھی اس کے کردار پر کوئی خاص اثر نہ ڈال سکی، اور اقبال جیسے مفکر شاعر کا یہ خیال کہ ؎

ہیں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

لیکن ان تمام لوگوں سے الگ وہ ایسی نکتہ رس نگاہیں بھی تھیں جو عورت کی فطرت کا مطالعہ اپنی نہیں خود عورت کی نظروں سے کر رہی تھیں اور یہ نگاہیں عظمت کے علاوہ اور کسی کی نہیں تھیں، جس نے نہ صرف عورت کو محبوب کی نظروں سے، نہ تسکین نفس کی نگاہوں سے دیکھا بلکہ وہ اس کی فطرت کے سمجھنے کے لئے اس کے دل میں اُتر گئے، وہاں انھوں نے عورت کا جو روپ دیکھا وہ اب سب سے جدا تھا، جو اب تک ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اس نے دیکھا یہ معتوبہ نہیں، نہ مکر و ریا کا مجسمہ، نہ ہی بیوفائی کی تصویر ہے بلکہ یہ دنیا کی معصوم ترین ہستی ہے خصوصاً ہند کی عورت۔ عظمت نے اس کے دل کے وہ تمام زخم دیکھے ہیں جو اب تک ہم سے پوشیدہ رکھے گئے۔ تاکہ مرد کی فطرت معلوم ہو جائے۔ اور یہ سب دیکھکر عظمت کا دل عورت کے درد سے لبریز ہو گیا۔ وہ اپنے کلام میں عورت کو خود اس کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ خود کچھ نہیں کہتا۔ اس کی پیش کردہ عورت خود اُن زخموں کو کھول کر آپ کے سامنے رکھ دیتی ہے جو اب تک رس رہے تھے۔ اور رستے رستے ناسور بن چکے تھے اور تب یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کی فطرت کا اندازہ نہ لگنے کا صرف ایک سبب تھا کہ سماج کے

مظالم پر پردہ پڑا رہے۔ وہ حقیقت اس لئے تھی کہ اس کا حل ڈھونڈھنے کے بعد یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ اسے سوتن بنایا کس نے؟ —— وہ ظالم صرف اس لئے تھی کہ اب تک ہم نے اس کے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھنے کے بجائے اس کے ہونٹوں پہ چھلکتی ہوئی شراب کو لبوں سے چوس لینے پر ہی اکتفا کی۔ لیکن جب عظمت نے عورت کا دوسرا روپ پیش کیا تو عورت مجسّم محبت، مجسّم مظلومیت اور تقدس کی معصوم دیوی کے روپ میں ہمارے سامنے نمودار ہوئی۔ اور میرے خیال میں ہند کی عورت عظمت کے اس احسان کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

عظمت کے یہاں جس عورت کا تصور ہے وہ ہند کی عورت ہے۔ وہ شعراء کی خیالی محبوبہ نہیں۔ وہ محلوں کی رہنے والی وہ کافرہ بھی نہیں جو ستم کرنا اپنا شعار سمجھتی ہے اور نہ ہی کلبوں اور بال روم میں اپنے لوجدار جسم کے اتصال سے جذبات میں ہیجان پیدا کر دینے والی سوسائٹی گرل ہے ——

نہ ہی وہ عورت ایسی ہے جس کا نمونہ کردار ہمارے شعراء نے پیش کیا، اور جسے دیکھکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیتا جیسی مقدس، دروپدی جیسی باعصمت، رضیہ جیسی بہادر اور جھانسی کی رانی جیسی جاں باز وطن پرست جیسی عورتیں ہند میں پیدا ہی نہیں ہوئیں —— بلکہ عظمت جس عورت کا کردار پیش کرتے ہیں وہ عورت "وہ" ہے جو آپ کو مجازی خدا تک سمجھتی ہے۔ جو آپ کے دکھ کو اپنا دکھ اور آپ کے سکھ کو اپنا سکھ سمجھتی ہے۔ اور یہ ہے ہند کی عورت جس میں اب بھی سیتا کے تقدس کا جلال، دروپدی کے مظلوم حسن کی جھلک، رضیہ کی بہادر فطرت کا عزم اور جھانسی کی رانی کی جاں نثاری موجود ہے۔ لیکن سماج نے اس عورت کو ایک حسین کھلونا بنا کر آپ کو دے دیا۔ جسے کبھی ہم نے سمجھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔

یہی جذبہ تھا جسے عظمت نے اشعار کا جامہ پہنایا۔ لیکن اس میں جو درد ہے، جو مٹھاس وحلاوت ہے وہ کتنی لطیف ہے۔ اس کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب ہم ان کے کلام کا غائر مطالعہ کریں۔ ایک مغربی ناقد کا خیال ہے کہ

"تخیل کو متاثر کرنے کی قابلیت ہی شاعری کی جان اور روح ہے"

اور جب ہم عظمت کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو نہ صرف ہمارا تخیل متاثر ہوتا بلکہ ایک لافانی تاثر ہمارے دلوں پہ چھوڑ جاتا ہے۔ یہ اُن کے کلام کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ عورت کے متعلق مشہور ہے کہ وہ "زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے" اور اس کی یہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ اس محبت کرنے کے لئے وہ ہمارے قدیم شعراء کی محبوبہ کی طرح سرگرداں نظر نہیں آتی بلکہ یہ محبت ہمارے اپنے گھروں ہی میں پرورش پاتی ہے۔ عورت نے اپنی پاک محبت کی بدولت بہت دھوکے کھائے ہیں۔ مرد نے اس کو فریبی کہہ کہہ کر خوب دھوکا دیا ہے اور سماج نے اس کے محبت بھرے دل پر بہت ستم ڈھائے ہیں۔ لیکن وہ سب کچھ برداشت کرتی رہی ہے۔ اس کی ایک ایسے سمندر کی طرح ہے جو ہزاروں طوفان کے بعد بھی ساکت رہتا ہے —— لیکن پھر بھی ہماری نظریں اس راز کو نہ پا سکیں۔ ہمارے اپنے ہی گھرانوں میں نہ ہم نے کتنے محبت بھرے دلوں کو توڑ ڈالا ہے یہ ہم نے کبھی محسوس نہیں کیا لیکن عورت کا حساس شعور اس وقت سب سے زیادہ زخمی ہوتا ہے۔ جب اس کی محبت اور پاکیزگی کو صرف نفس پرستی کے اوپر قربان کر دیا جائے۔ جب محبت کے دھوکے اور امارت کے زعم میں اس کو سبز باغ دکھا کر ایک جوانی کا کھیل سمجھ کر اس کا سب کچھ حاصل کر لینے کے بعد یک دم ٹھکرا دیا جائے۔ لیکن وہ سب کچھ نثار کرنے کے بعد بھی محبت سے باز نہیں آتی۔ اس لئے کہ وہ محبت کرتی ہے، ہوس نہیں۔ لیکن ایک ایسی ٹھکرائی ہوئی عورت کے جذبات کی ترجمانی عظمت سے سنئے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ اس کی ہر نظم ایک چھوٹی موٹی کہانی ہوتی ہے، اور یہ بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے ایک عورت کی — لیکن اس میں جو صداقت، جو سوز، جو جذبہ پنہاں ہے وہ ایسا نہیں جسے آپ نظر انداز کر سکیں ؎

نہ بھلے کی تھی نہ بُرے کی تھی، مجھے کچھ جہاں کی خبر نہ تھی
تمھیں عیش کا ہی جو دھیان تھا تمھیں چاہ میری اگر نہ تھی
مرے حُسن کے لئے کیوں مرے، نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے
بہت اپنی چاہ جتا جتا مرے دل کو موہ کے لے لیا
مرے واسطے یہ بہشت تھی، تمھیں دل لگی تھی یہ کھیل تھا
مرے حُسن کے لئے کیوں مرے، نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے
مری چاہ تھی بڑی قیمتی میں غریب تھی پہ امیر تھی
تے امیر تم پہ نہ چاہ تھی، میں امیر تھی پہ فقیر تھی
مرے حُسن کے لئے کیوں مرے، نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

نہ تھا اس جہان میں آسرا مری جان بھی یہ جہان تھا
مرے شکوہ تمہیں ہتھیں چین تھے، تمہیں چاہ ہے یہ گمان تھا
مرے حُسن کے لئے کیوں مَرے نہیں لینے تھے تمہیں یوں مَرے

مری چاہ لی، مرا دل لیا، جو طلب کیا وہ تمہیں دیا
جوں ہی حُسن سے مرے دل بھرا وہ پھری نگاہ وہ دل پھِرا
مرے حُسن کے لئے کیوں مَرے نہیں لینے تھے تمہیں یوں مَرے

ہرا باش پاش یہ دل ہوا مری چاہ کا وہ دیا بُجھا
مرے دل کو تم نے یہ کیا کیا نہیں اب بھی وہ کسی اور کا
مرے حُسن کے لئے کیوں مَرے نہیں لینے تھے تمہیں یوں مَرے

مرے دل سے بھگایا کب بھلا تمہیں دے سکوں کوئی بددُعا
وہ ہوا جو ملتے پہ تھا لکھا مرے دل سے آ نکلی یہ صدا
مرے حُسن کے لئے کیوں مَرے نہیں لینے تھے تمہیں یوں مَرے

("مرے حُسن کے لئے کیوں مَرے" کا انتخاب)

اردو شاعری میں واقعہ نگاری کی سب سے نادر مثال ہم کو عظمت کے یہاں ملتی ہے۔ مرثیہ اور مثنوی سے ہٹ کر اُنھوں نے ایک نئی راہ نکالی، اور ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو جن کو ہم نظر انداز کر جاتے ہیں لیکن جو ہماری زندگی میں سب سے زیادہ اہم ہیں، عظمت نے اشعار میں ڈھال لیا۔ لیکن اس کی ندرت کی سب سے بڑی خو اس کا انداز بیان ہے جس میں ندرت سے زیادہ ایک قسم کا اپنا پن ہے۔ اُن کی شاعری کو پڑھ کر ہمیں اپنی روزمرہ زندگی کے ان واقعات کا احساس ہوتا ہے۔ جس سے ہم اب تک بے بہرہ تھے۔ ان کے یہاں زبان بھی سادہ ہے اور خیالات بھی پاکیزہ و بلند، اور خوبی تو یہ ہے کہ وہ اپنی اس زبان میں بھی حسنِ شعریت زائل نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ برعکس اس کے اشعار میں ایک ایسی شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے جو اب تک شاعری میں بہت کم ملتی تھی۔ اُن کا اندازِ کلام بہت بے تکلفانہ ہے۔ انھوں نے پیچیدہ خیالات، اُلجھے ہوئے الفاظ اور مقیم تراکیب سے اجتناب کیا ہے۔ ان کے کلام میں ایک ایسی مٹھاس ہے جو ہمارے دلوں کو موہ لیتی ہے، ایک ایسا درد ہے جو وہ اپنے دل سے ہمارے دلوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ یہ ان کے مقصد کی کامیابی اور شاعرانہ کمال کی بے نظیر مثال ہے۔ وہ اپنے جذبِ دل کو ایسے ہی پیارے انداز میں ہمارے میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اور مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے کلام میں ایک ایسا جذبہ آفریں سرور ہے کہ جب تک ہم پڑھتے رہتے ہیں ہمارا دل مٹھاس اور درد سے جھومتا رہتا ہے اور اس کا اندازہ ہم کو اس وقت ہوتا ہے جب کلام پڑھ چکنے کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں کہ ایک رنگین طلسم تھا جو ٹوٹ گیا، لیکن ہمارے ذہن میں ایک ایسا جذبہ بیدار کر گیا جو حقیقی ہے، جس سے ہم واقف تھے، لیکن گریز کرتے تھے۔ اور اسے اگر ہم شاعرانہ فن کی سب سے بڑی کامیابی نہ کہیں تو یقیناً زیادتی ہوگی۔

عظمت کا تخیل ہمارے دیسی گھریلو زندگی میں ہی اُلجھا ہوا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ سماج کے مظالم کا درد اور اس کے خلاف غصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے پیش کردہ کرداروں میں زیادہ تر کردار ہم کو ایسے نظر آئیں گے جو عورت کی مظلومیت سے متاثر ہوں اور جن میں اس کی فطرت کو صحیح طرح پرکھنے اور برتنے کا پورا پورا احساس ہے۔ ایسے کردار چونکہ ہمارے سماج میں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ کچھ لوگ یہ بھی سوچ لیں کہ انھوں نے حقیقت سے گریز کیا اور پردہ پوشی کی۔

عظمت کا تخیل ہمارے دیسی گھریلو زندگی میں ہی اُلجھا ہوا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ سماج کے مظالم کا درد اور اس کے خلاف غصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پیش کردہ کرداروں میں زیادہ تر کردار ہم کو ایسے نظر آئیں گے جو عورت کی مظلومیت سے متاثر ہوں اور جن میں اس کی فطرت کو صحیح طرح پرکھنے اور برتنے کا پورا پورا احساس ہے۔ ایسے کردار چونکہ ہمارے سماج میں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں، اس لئے ممکن ہے کچھ لوگ یہ بھی سوچ لیں کہ اُنھوں نے حقیقت سے گریز کیا اور پردہ پوشی کی۔ لیکن عظمت نے جہاں ایسے بے حس اور ہوس پرست کردار دکھائے ہیں جو عورت کو صرف نفس کی تسکین کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں وہیں ایسے کردار پیش کرنے کا مقصد جو حساس ہیں فقر یہ ہے کہ ہم دونوں کرداروں کو پرکھنے کے بعد اُس کو برتیں۔ جو انسانیت کے اصولوں پر اور پیار و محبت کی بندشوں سے تعمیر ہوا ہو۔

کچھ بھی ہو عظمت کی صرف چند نظمیں ہی ان کو غیر فانی بنانے کے لئے کافی تھیں۔ ان کے صحت مند خیالات اور جدید طرزِ بیان نے یقیناً اردو شاعری میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ ان کی شاعری اور شاعری کا وہ دوسرا پہلو ہے جس سے ہم ایک حد تک ناواقف تھے۔

ان کی شاعری کا زیادہ تر حصہ چھوٹی چھوٹی بحروں پر منحصر ہے۔ لیکن مناسب الفاظ، موزوں تراکیب اور جدید طرزِ بیان نے ان کی شاعری میں ایک گہرا تاثر پیدا کر دیا ہے جو فوراً ہم کو متاثر کرتا ہے۔ گھریلو زندگی کی عکاسی میں ان کو مکمل قدرت تھی۔ ذیل میں ایسی ہی چند نظموں کا انتخاب پیشِ نظر ہے۔ ایک شوہر کی نظروں میں بیوی کی حقیقت دیکھئے ؎

وہ بہار پر جوانی　　وہ بھرا بھرا سا جوبن
وہ بھرا ہوا سا پانی　　وہ مہکتا رنگ و روغن
مری ماہتاب تم تھیں مرا آفتاب تم تھیں
یونہی گزرا کچھ زمانہ　　نہ رہا وہ جوش باقی
گیا عیش کا فسانہ　　نہ رہا خروش باقی
پہ تھیں سکھ کی رین تم ہی مرے گھر کا چین تم ہی

(بیوی کے اصرار پر دوسری شادی ہوتی ہے، کیونکہ اولاد نہیں ہوئی تھی، دوسری بیوی سے اولاد ہوتی ہے۔ لیکن شوہر بیوی کے اس جذبۂ ایثار کو کن نظروں سے دیکھتا ہے) ؎

ہوئے مجھ کو بال بچے　　مرا دل رہا تمھارا
بنے ہم وہ دوست سچے　　کہ جہاں ہے ہیچ سارا
مری آتما تمہاری مری آتما کی پیاری
یہ کھلا نکاح اپنا　　کہیں اب ہوا ہے پیاری
یہ نہیں بدن کا تپنا　　کہیں اب ہوا ہے پیاری
مرا دن بھی رین تم ہو، مرا اصلی چین تم ہو

غلمت نے ان تمام موضوعات کو اپنایا، جن میں حسنِ شعریت کو قائم رکھنا بہت دشوار تھا۔ لیکن ان کا موزوں انتخاب الفاظ اور شیریں طرزِ بیان میں ایک ایسی کیفیت ہے جو فوراً ہمارے احساسات کو چھو لیتی ہے۔ دراصل گھریلو زندگی کی منظر کشی میں ہمارے لئے یقیناً اب تک کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نہ ہی کسی اور شاعر نے اس موضوع پر قلم اُٹھانے کی ضرورت محسوس کی۔ لیکن عظمت نے محسوس کر لیا کہ اس موضوع میں دلکشی اس لئے نہیں کہ ہماری زندگی بھی یکسر دلچسپی سے خالی ہے۔ ہمارا گھریلو ماحول بھی اس مسرت سے خالی ہے۔ جو زندگی کا ماحصل ہے۔ لیکن وہ اس ماحول کے سدھارنے اور ہم کو اس مسرت کا جواز تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ ذیل میں ایسے ہی چند گھریلو ماحول کی عکاسی عظمت نے کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے گھر اور گھر والوں سے کتنی دلچسپی تھی اور کیونکر وہ ان کو اپنانے اور ایسا ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے تھے ؎

ہونے لگیں پھر گھر کی باتیں　　بچوں کی دن بھر کی باتیں
اور کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں　　اک آدھ کوئی ضروری بات

گھر میں بالک آبادی ہو　　چاہنے والی گھر والی ہو
ہنسی خوشی گزرے جاتی ہو　　یونہی برسیں برساتیں

(برسات کی رات دکن میں)

یا

وہ چین کہاں وہ بات کہاں اپنے گھر کی
پیارا پیارا گھر اپنا
وہ راج کہاں اپنے گھر کا وہ رات کہاں اپنے گھر کی
آنکھوں کا تارا گھر اپنا
وہ گھر والی چتر اگھر کی سیوا کرنے والی
آرام ہمیں دینے والی آپ مصیبت جھیلنے والی
پیارا پیارا گھر اپنا

ورڈز ورتھ نے کہا ہے کہ "شاعری انسان اور اس کی فطرت کا عکس ہے۔" یہ حقیقت ہے کہ شاعر اپنی فطرت کے مطابق ہی خارجی اثرات کو قبول کرتا ہے۔ میر اپنی فطرت کی وجہ سے ہی تعیش پسند دھارے میں نہ بہہ سکے۔ جو اس دور کا ایک عام تحفہ تھا۔ ناسخ و آتش اور یہاں تک کہ جرأت بھی اپنے آپ کو اس دھارے سے بچا نہ سکے جو ایک شاعر کو جوہر سے محروم کر دیتا ہے۔ چنانچہ جہاں میر جیسے شاعروں نے در بدر کی ٹھوکریں کھا کھا کے شاعری کو روح بخشی وہیں ایسے بھی شعرا موجود تھے جنھوں نے شاعری کا پاک جوہر زر و جواہر کی لالچ میں بیچ دیا۔ لیکن یہ دور قدیم شعرا کا تھا اس کے بعد جو دور آیا وہ اور بھی زیادہ نازک تھا۔

ہندوستان میں حُب الوطنی بیداری اور ایک نئی تحریکِ آزادی کا آغاز ہو رہا تھا۔ اب تک غزل گوئی کو تمام اصنافِ سخن پر فروغ حاصل تھا۔ لیکن غزل گوئی سے بغاوت کر کے جس نے نظم کو سب سے زیادہ فروغ

پہنچایا وہ اقبال تھے۔ ان کی اثر میں ڈوبی ہوئی نظمیں وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ تمام ملک میں گونج اٹھیں۔ سیاست نے شاعری پر اثر انداز ہونا شروع کیا اور ہجر و فراق حسن و عشق کی جگہ ملکی سیاست اور "ادب برائے زندگی" نے لے لی۔ شاعری جب وقت اور ملک کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوئی، تو حقیقت آمیز رجحانات وجود میں آئے۔ یہاں تک کہ غزل گو شعرا نے بھی غزل کا رنگ بدل دیا۔ لیکن ایک طرف تخیل پرست، قدامت پرستوں کا زور۔ دوسری طرف نئی نئی تحریک۔ پھر بھی حقیقت سب پر غالب آئی اور اردو شاعری نے ایک نیا موڑ اختیار کیا۔

عظمت نے جب دنیائے شاعری میں آنکھیں کھولیں تو شاعری ان تمام مراحل کو طے کرکے حقیقت کی راہ پر گامزن ہو چکی تھی۔ حقیقت پسندانہ عناصر رجعت پسند عناصر پر بہت حد تک غالب آچکے تھے اور لوگوں کا رجحان زیادہ تر ملکی سیاست یا سماجی حالت پر تھا۔ ہر چیز اور ہر ادب وقت اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق قبول کی جاتی ہے۔ اور ہر ادیب یا شاعر عوام کی توجہ اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب وہ وقت کے دھارے کے ساتھ چلے۔ عظمت کی زمانہ شناس نظریں اور نباض فطرت، وقت کے ابھرتے تقاضوں کو محسوس کر رہی تھی۔

یہ سب کچھ تھا، اقبال نے گو شاعری کو نئی روح نیا جامہ پہنایا، پھر بھی ایران و عجم کے تصورات ان کے یہاں بدستور موجود ہیں۔ زبان بھی ایک حد تک وہی تھی، اردو اور فارسی کا امتزاج بدستور قائم تھا، لیکن ہند کو ایسی زبان اور ایسی شاعری کی ضرورت تھی جو عام فہم ہو۔ جسے ہندوستان کا ہر طبقہ سمجھ سکے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اقبال آج عوام میں اپنی اُن نظموں کی وجہ سے اتنے مقبول ہیں جو سلیس تھیں جن میں زبان عام فہم تھی۔ اور جو ان کے اس جذبۂ دل کا نتیجہ تھیں جو ہندوستان کی زبوں حالت دیکھکر پیدا ہوا تھا۔ اقبال نے جہاں عوام سے منہ موڑ کر مذہب کی طرف توجہ دی اور فارسی اسلوب کو اپنایا وہیں لوگوں کے دلوں میں ان کے متعلق شک و شبہ کی گنجائش پیدا ہو گئی، اور یہاں تک کہ اب اکثر لوگ ان کو فرقہ پرست تک کہتے نہیں جھجکتے۔

لیکن ہندوستانی زبان کو شاعری کے اسالیب میں اس طرح نبھانے کی مہم کہ حسنِ شعریت قائم رہے نظیر اکبرآبادی نے لے لی۔ اور اس کو وہ بہت حد تک پورا کر گئے۔ ان کے میٹھے بولوں کے گیت، پیار بھری نظمیں ابتک عوام کے لبوں پر موجود ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی نظموں کی سلاست، ان کا جانا پہچانا انداز، پیار بھرا طرزِ تخاطب اور زبان کی دلکشی ان کی شاعری کو عوام میں زندۂ جاوید بنا گئی۔ نظیر کے بعد اس ضرورت کو جس نے محسوس کیا وہ عظمت تھے۔ اس مہم میں وہ نظیر کے ساتھ ہیں، اور طرزِ بیان اور زبان کی انھیں خصوصیات کو اپنا کر وہ اردو شاعری میں ایک بلند مقام پیدا کر گئے ہیں۔

عظمت کی شاعری میں حسن و عشق کے کیف آگیں تصورات بھی ہیں۔ زبان کی حلاوت بھی، اشعار میں لطافت و شگفتگی ہے لیکن سب سے زیادہ مؤثر ان کی سادہ لوحی ہے۔ ان کا تصور اپنے ماحول اور وقت کے دھارے سے کبھی باہر نہیں گیا۔ انھوں نے ہر موضوع کو اپنی شاعری میں نبھایا ہے۔ سب سے بڑی دلکشی ان کے یہاں اردو ہندی امتزاج نے پیدا کر دی ہے۔ کسی بھی دو زبانوں کو ملا کر اظہارِ خیال کرنا آسان بات نہیں۔ اگر شاعر دونوں زبانوں پر مکمل حاوی نہ ہو اور امتزاج میں انتخاب الفاظ اور موزونیت کا مکمل لحاظ نہ رکھا جائے تو شاعری اپنی حلاوت کھو بیٹھتی ہے۔ لیکن عظمت کے یہاں دونوں زبانوں کے امتزاج نے بھی اپنے پیارے اندازِ بیان، عمدہ انتخاب الفاظ اور حسنِ موزونیت کی وجہ سے شاعری کے تمام اوصاف بخوبی نبھائے ہیں۔

اُن کی متعدد نظموں میں پُراز لطافت تشبیہات اور جدید تراکیب موجود ہیں۔ نزاکت احساس۔ طرزِ بیان کے اچھوتے پن اور اکثر و بیشتر شوخی نے ان کی شاعری میں ایک دلکشی پیدا کر دی ہے۔ مثال کے طور پر "من موہنی صورت والی" میں وہ "چال" کا نقشہ کتنے دلکش پیرائے میں کھینچتے ہیں، دیکھئے ؎

چال نشیلی جھومتا بادل یا کوئی ندی لہراتی
بھر جوانی میں اٹھلاتی رکتی رکتی شرماتی
دل کو مسلتی تڑپاتی

الفاظ کی برجستگی، تشبیہ کی ندرت اور اندازِ بیان کی روانی دیکھئے۔ چند اشعار اور دیکھئے۔ برسات کے منظر کی عکاسی اور شاعر کے حسین تخیل کو ملاحظہ کیجئے ؎

بجلی چمکی انگارا سی۔ آگ کی ناگن لہرائی
بھریا کاڑھا بیل بنائی

بھاپ کے دریا میں قدرت نے نُور کی مچھلی تیرائی

ادھر اُدھر تڑپائی

عظمت ایک انسان پہلے تھے شاعر بعد میں۔ اُن کے پاس ایک حساس دل تھا جس میں محبت نے متعدد دگمی ڈگلئے تھے۔ ان کا تخیل بھی حسن وعشق کی وادیوں میں بھٹکتا رہتا تھا۔ لیکن یہ دردبھرا دل محبت کی ناکامی پر آنسو نہیں بہاتا تھا۔ بلکہ جب محبوب کی بیوفائی اور ہوس پرستی سے دُکھ پہنچا، وہ صرف یہی کہہ کر خاموش ہو گئے کہ ؎

اس کا علاج کچھ نہیں دل میں اگر وفا نہ ہو

پھول میں جیسے رنگ ہو باس کا کچھ پتہ نہ ہو

(دام میں یاں نہ گیئے)

اور یہی چیز ہے جس سے شاعر کی اعلیٰ فطرت کا ہم کو اندازہ ہوتا ہے۔

اُن کے یہاں جو محبت کا تصور ہے وہ حد درجہ پاک وبلند ہے۔ اس میں ہوس پرستی کی بو نہیں۔ ایک پاکیزگی ہے جو ہم کو اقبال کے عشقِ صادق کے تصور میں نظر آتی ہے۔ متعدد شعراء نے محبت کی تعریف کی ہے اور مختلف انداز بیان دہرایہ ہے۔ لیکن عظمت کا معصومانہ انداز اور دردمندانہ طرزِ بیان بھی دیکھئے ؎

کیوں مجھے تیری چاہ ہے　　　اس کو کیوں تُو جیئے

جس کی تُو جیہ کچھ نہیں　　　اس کو کیوں تُو جیئے

تجھ میں انوکھی خوبیاں　　　کیوں کر کوئی گِنائے

مرتے ہیں کس بات پر　　　کیوں کر کوئی بتائے

عظمت زندگی کے سربستہ رازوں سے انجان نہ تھے۔ اپنے وطن کی بہاریں اُنھیں بہت عزیز تھیں۔ لیکن اس عزیز وطن کی زندگی ــــ اُس کو وہ بھی ایک پہیلی سمجھتے تھے۔ فانی کہتے تھے ع

اک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

اور عظمت بھی یہی محسوس کرتے تھے کہ ؎

ایک پہیلی اپنا جینا ایک معمّہ مرجانا

اک رازِ نہاں کا آنا جانا

لیکن اس معمّہ کا تصور کر کے ہی وہ ہمت ہار نہیں جاتے بلکہ اس گتھی کو سلجھاتے ہیں۔ اس کا حل ڈھونڈتے ہیں اور جو حل اُنھوں نے پیش کیا وہ ہم کو عمل وصداقت کے تصورات سے ہمکنار کرتا ہے ؎

سُکھ اک سکھشا ہے، جان کو دکھ بن آرام نہیں

سُکھ خواب ہے دُکھ بیداری

ہر کام میں دکھ، دکھ میں سکھ ہے گر کام نہیں چین نہیں

ہے کام کی جگ میں برکت ری

لیکن موت کے ظالم پنجے نے عمل وبیداری کے اس پیغامبر کو زیادہ دن زندہ نہ رہنے دیا۔ وہ آج ہم میں نہیں ہے۔ پھر بھی اس کا پیغام اس کا کلام ہے۔ جو یقیناً اردو شاعری میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

کلیم غازی پوری

غزل

تری تلخیوں میں بھی ساقیا، یہ عجب طرح کا سرور ہے

کوئی جور سمجھے تو نار ہے، کوئی لطف سمجھے تو نور ہے

سرِ بزم تیری عنایتیں جو مجھی سے آنکھ چُرا گئیں

یہ تری عطا کی خطا نہیں، یہ مری طلب کا قصور ہے

یہ سبب ہے کیا کہ سُرور میں کبھی ہوش کی بھی ہے کیفیت

مری بیخودی میں بھی کچھ نہ کچھ ترا التفات ضرور ہے

یہ تری نگاہ جُھکی جُھکی یہ مری نگاہ دبی دبی

یہ حجابِ عشق سہی مگر کوئی بھید اِس میں ضرور ہے

یہ عجب زمانے کی ریت ہے یہ عجیب رسم ہے اے کلیم

کوئی دُور رہ کے بھی پاس ہے کوئی پاس رہ کے بھی دُور ہے

فرید الوحیدی

آثارِ ابوالکلام آزاد

اردو ادب میں سوانح نگاری کا ایک مخصوص اسلوب رائج ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صحیح نہیں ہے لیکن یہ واقعہ ہے یہ اسلوب ایک قدیم اور روایاتی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس میں کوئی جاذبیت نہیں پائی جاتی۔ اس قسم کی سیریں ایک دوسرے سے اس قدر ملتی جلتی ہوئی ہیں کہ قطع نظر اُن حالات کے جو دو شخصیتوں کے درمیان لازمی طور پر مختلف ہوتے ہیں اُن کی ترتیب اور الفاظ میں زیادہ فرق نہیں محسوس ہوتا۔ خاندانی حالات۔ پیدائش تعلیم و تربیت کچھ ذاتی خصوصیات اور قومی یا ادبی و علمی خدمات بصیرت۔ یہ چند متعین عنوانات ہیں جن کے تحت ہر بڑی سے بڑی اور بہتر سوانح مرتب کی جاتی ہے۔ اگر آپ کچھ رعایت سے کام لینا چاہیں تو بعض ایسی کتابیں مستثنیٰ کر سکتے ہیں جن کی تصنیف میں سوانح نگاری کے علاوہ کچھ ادبی مقاصد مصنف کے پیش نظر رہے ہوں۔ مگر ایسی مثالیں آپ کو بہت کم ملیں گی۔ سوانح کا یہ مخصوص طرزِ نگارش کچھ ایسا منطقی راستہ اختیار کر چکا ہے کہ اگر کوئی ہمیں بتلائے کہ اس منزل تک پہونچنے کی کچھ اور دلکش اور روشن راہیں بھی ہیں تو شاید ہم یقین نہ کریں۔

میں نے قاضی عبدالغفار صاحب کی کتاب "آثارِ ابوالکلام آزاد" کا مقدمہ پڑھا جس میں وہ کتاب کے موضوع کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس کتاب سے ہندوستانی زبان میں سوانح نگاری کے ایک نئے اسلوب کا آغاز ضرور ہوتا ہوتا ہے۔ گو کہ وہ کتنا ہی ناقص اور نامکمل سمجھا جائے۔" اس اچھوتے اسلوب کی جانب قاضی صاحب کا یہ اشارہ پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ یہ نیا اسلوب کیا ہو سکتا ہے۔ مقدمہ پڑھتا رہا مگر مضطرب تھا کہ اصل موضوع شروع کر دوں۔ یہ خیال بھی ہوا کہ ہو سکتا ہے قاضی صاحب نے اندازِ بیان کی ندرت اور جملوں کی اچھوتی ترکیبوں کو نئے اسلوب سے تعبیر کیا ہو۔ لیکن کتاب کے چند ابتدائی صفحات پڑھ کر اندازہ ہوا کہ اردو سیرت نگاری میں یہ بالکل انوکھا اور نیا طرز ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ "آثارِ ابوالکلام" کا یہ اسلوب محض سوانح نگاری ہی میں نہیں فنِ تنقید میں ایک جادۂ نو کی نشان دہی کر رہا ہے۔

پوری کتاب دو حصّوں میں ہے۔ پہلے حصّہ نقشِ اوّل میں قاضی صاحب نے اپنے ارادے اور خیال کے مطابق مولانا کی سوانح لکھی ہے لیکن درحقیقت یہ نقشِ اوّل سوانح نہیں ہے۔ شروع میں مولانا کی خاندانی خصوصیتیں اور پیدائش کے کچھ حالات لکھ کر قاضی صاحب نے اُسے سوانح سے تعبیر کر لیا ہے۔ چند ابتدائی اوراق کے علاوہ پورے باب میں مولانا کی سیاسی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ جس طرح دوسرے حصّہ نقشِ ثانی میں مولانا کے علمی و ادبی نقوش پیش کئے گئے ہیں۔ اسی طرح یہ پہلا حصّہ مولانا کی زندگی کے سیاسی مطالعہ کی حیثیت سے بہت کامیاب ہے۔ اور یہی صورت کتاب کے مقصد کو صحیح طور پر پورا کر رہی ہے۔ کیونکہ نقشِ اوّل میں مولانا ایک سیاسی مفکّر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں اور نقشِ ثانی میں اُن کی علمی و ادبی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس طرح یہ نفسیاتی مطالعہ مکمل ہو جاتا ہے۔ مگر قاضی صاحب نے مقدمے میں اپنی کوششوں کا محور نقشِ ثانی کو قرار دے کر نقشِ اوّل کو محض سوانح اور ضمنی باب بتلایا ہے۔ حالانکہ واقعی طور پر نہ وہ سوانح ہے اور نہ بلحاظ اہمیت نقشِ ثانی سے کمتر ہے۔ قاضی صاحب اس لئے بھی بابِ اوّل کو غیر اہم بتلا رہے ہیں کہ اُن کا خیال ہے کہ مولانا کی قومی خدمات سے قاضی صاحب کے خیال کے مطابق وہی شخص ناواقف ہو سکتا ہے جسے فیضانِ قدرت سے فہم عامّہ کا ذرا سا حصّہ بھی نصیب نہ ہوا ہو۔ لیکن میرا خیال ہے مولانا کی سیاسی زندگی کی بعض اہم خصوصیات عوام کے علاوہ خواص کی نگاہوں سے بھی ابھی تک مستور ہیں۔ مثلاً ایک بنیادی نکتہ جس کے متعلق "آثارِ ابوالکلام" کی تحقیق سے پہلے کوئی صحیح رائے نہیں قائم کی جا سکتی تھی خود قاضی صاحب نے حل کر دیا ہے۔ اور وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں میں اس جذبہ کا محرک کون تھا، اور کن زبانوں

یہ ہموار اور رسیدہ آواز ان کے کانوں تک پہونچا ئے۔ مگر ہم نہیں جانتے کہ مسلمانوں میں ایسی تجویز کا سب سے پہلا داعی کون تھا اور کس نے مرض الموت کے اس مریض کے لئے یہ علاج تجویز کیا۔ بہت سے رہبرانِ قوم تھے جو ہندو مسلم اتحاد کی جانب راستہ دکھلا رہے تھے۔ مگر وہ راہنما ہمیں معلوم نہ تھا جس نے بھٹکے ہوئے بے راہ رو قافلہ کا رُخ سب سے پہلے اس منزل کی طرف موڑا۔ مولینا ابوالکلام کی زندگی کا بہت کچھ مطالعہ کیا جائے گا۔ اور وہ بہت غور سے پڑھے جائیں گے۔ مگر قاضی صاحب اپنی خصوصیات کے اعتبار سے منفرد رہیں گے۔

وہ "آثار ابوالکلام" میں پہلی مرتبہ بڑی جرأت کے ساتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد کا صور مسلمانوں کے اس شہر خموشاں میں سب سے پہلے ابوالکلام نے پھونکا۔ کوئی دوسرا سوانح نگار اگر یہ جسارت کرتا تو مسلم پردۂ قیادت کے بے شمار غیر فرقہ پرست ادا کار شاید یہ کاری ضرب برداشت نہ کرسکتے۔ مگر قاضی صاحب نے ان لا تعداد زبانوں اور ذہنوں کے لئے اعتراض اور تنقیص کی کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی۔ وہ مولینا کے ابتدائی دور کی ملکی اور مسلم سیاسیات کا تذکرہ کرتے ہوئے "الہلال" سے مولانا کا ایک اداریہ نقل کرتے ہیں: "الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کے مذہبی لہو سیاسی جمود میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کردی ہے۔ پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ اس کی مخالفت کے لئے بیوروکریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انھیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان آزاد ہوگیا تو ملک میں ہندو گورنمنٹ ہوجائے گی۔ مگر الہلال نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی جس کا نتیجہ آج متحدہ تحریک خلافت اور سوراج ہے۔" اس باب میں مولانا کی سیاسی زندگی کامیاب طور پر پیش کرتے ہوئے ہندوستان گذشتہ تیس سالہ سیاست پر قاضی صاحب نے ایک گہرا اور ٹھوس مطالعہ پیش کیا ہے جس سے بیک وقت مولانا کی سیاسی شخصیت اور ہندوستان کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے حالات اپنے صحیح خد و خال کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ لیکن سوانح نگاری کا یہ انوکھا اور بالکل نیا اسلوب دیکھکر ہم اس بات کے متوقع تھے کہ مولانا کی زندگی کے تمام تاریک اور روشن دونوں پہلو اپنی اصلی صورت میں ہمارے سامنے آجائیں گے۔ مگر اوّل تو غالباً

قاضی صاحب نے بہت عجلت سے کام لیا۔ دوسرے اپنی تحقیقات اور مطالعہ کا مرکز صرف مولینا کی تحریروں تک محدود رکھا۔ اگر قاضی صاحب کی باریک بیں اور تجسس نظریں مولینا کی شخصیت پر بھی پڑتیں تو یہ کچھ مشکل کام نہ تھا۔ اور وہی اس کام کے لئے کما حقہٗ اہل بھی تھے۔ وہ اس کوتاہی اور بے پروائی کے اپنے مقدمہ میں معترف بھی ہیں۔ بہر حال قطع نظر اس کے کہ یہ باب سوانح کے نقادوں کو پورا کرسکا ہے یا نہیں! محض مولانا کی سیاسی زندگی کے مطالعہ کی حیثیت سے نہایت کامیاب اور نافع ہے۔ دوسرے باب میں مولانا کی بعض فطری خصوصیات پر تبصرہ ہے۔ بادی النظر میں ایسا لگتا ہے جیسے کتاب کا یہ حصہ مولانا کی اردو اور اسلوب نگارش پر تبصرہ ہو۔ مگر درحقیقت ان اوراق میں مولینا کی سیرت کے بعض اہم پہلوؤں کا تجزیہ ہے۔ اور خود مولینا کی تحریروں سے استدلال ہے۔ مولانا کی انانیت اور احساسِ برتری کا قاضی صاحب نے بہت صحیح اور منصفانہ تجزیہ کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا کی زندگی کا یہ پہلو بہت تکلیف دہ ہے کہ وہ عوام سے کبھی قریب نہیں ہوئے۔ اور نہ کبھی اُن کے دکھ درد کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے دوسرے سیاسی اسباب بھی ہوں۔ مگر قاضی صاحب نے عوام سے اس احتراز کو مولانا کی انانیت اور مغرورانہ خود داری کا نتیجہ بتلایا ہے۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ "مولانا ایک بہت مشکل انسان ہیں۔ مشکل اس لئے کہ ان کی شخصیت اپنی ایک مخصوص مرکزیت میں خلوت نشین رہتی ہے۔ اور عوام کی نظر کا مرکز بننا گوارا نہیں کرتی۔ مولانا کی انانیت اور احساس برتری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "مولانا کی یہی نفسیاتی کیفیت اُن کے اور عوام کے درمیان ایک اونچی دیوار بن گئی ہے۔"

مولانا کی بعض خصوصیات پڑھے لکھے عوام اور مولانا کے نادان دوستوں اور معتقدین کے لئے ما فوق الفطرت حد تک حسین اور عظیم ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ تمام عادتیں اور کیفیتیں ایک رفارمر اور راہ نما کے لئے جو ایک بڑی قوم کی سیاست کا ذمہ دار ہے۔ علم و فضل میں بھی جسے اجتہادانہ ذوق حاصل ہو شعر و ادب میں جس کا ایک انفرادی مقام ہو غیر پسندیدہ بلکہ مضر ہیں۔ قاضی صاحب ان خصوصیات پر بڑے لطیف انداز میں طنز کر رہے ہیں۔ کہیں وہ اُس ذہنی ساخت کو مغرورانہ خودداری کہتے ہیں۔ کہیں احساس برتری سے تعبیر کرتے ہیں۔ کہیں علم و فضل کی اجارہ داری لکھتے ہیں۔ کتاب کو ایک سرسری نظر سے دیکھ جائیے۔ آپ کو قاضی کے لطیف طنزیہ اشاروں کا احساس

بھی نہ ہو سکے گا۔ مگر غور کیجئے تو صحت مند اور بشاش مریض کے دُکھے ہوئے دل کی یہ کراہ آپ صاف سُن سکیں گے۔ قاضی صاحب ایک جگہ ذہنی کرب کی شدت سے بےچین ہو جاتے ہیں اور ان کا قلم لکھتا ہے "مجھے تو اردو میں کوئی دوسرا ادیب اب نظر نہیں آتا جس نے اس شدت کے ساتھ اپنی انفرادیت کے تازیانے عوام کی ذہنیت پر مارے ہوں۔ یا جس کے افکار کے پیمانہ میں عوام کا جمود اس قدر مایوس کُن ثابت ہوا ہو۔ یا جس کا احساس عوام کے جمود سے اس قدر مجروح ہوا ہو۔ جذبۂ صادق کے ان مظاہروں کی قوت سے انکار نہیں۔ لیکن مولانا کی مایوسیوں کا ایک سبب اور بھی ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ امام کا منبر مقتدیوں کی سطح سے بہت اونچا ہے۔ ادیب و خطیب نے جس اونچے مینار پر کھڑے ہو کر نیچے میدان کے اس ہجوم پر نظر کی ہے اُس کے افراد بلندی کی وجہ سے بہت چھوٹے نظر آئے" اس تبصرہ میں قاضی صاحب اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ وہ مولینا کے صحیح مقام کا تعارف اُن کی شخصیت اور اُن کی انفرادیت کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی باسلیقہ اور حسین انداز میں اُن کی مغرور اور تکلیف دہ حد تک بڑھی ہوئی خودداری کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قاضی صاحب کی انفرادیت ہے۔ مولینا نے بھی اپنی مختلف تحریروں میں اپنی کچھ اسی قسم کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مگر اُن کے پیش نظر اپنی مخصوص انفرادیت اور انانیت کے اظہار کا جذبہ زیادہ کارفرما ہے اور مغرورانہ خودداری اور کمزوریوں کے اعتراف کا جذبہ کم بلکہ شاید بالکل نہیں۔ مگر قاضی صاحب نے غالبًا خوش فہمی کی بنا پر مولینا کی ان تحریروں کو کمزوریوں کا اعتراف سمجھا ہے۔ جس کا وہ بار بار تذکرہ کر رہے ہیں۔

مولینا کی مذہبی انفرادیت اور عام طبقۂ علمار کی روش سے بیزاری ظاہر ہے۔ مگر جرأت نہیں ہوتی کہ کوئی اس پر بحث کر سکتا۔ انفرادی طور پر کہیں کہیں یہ صدا سُنی گئی۔ مگر ایسی جیسے نقار خانہ میں طوطی کی آواز۔ کوئی نوجوان طالب علم اگر کبھی اس بارے میں بول اُٹھا تو ماحول نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اور مولینا کے کور مقلدین اور جماعت علمار سے متعلق مولینا کے نادان دوستوں نے اسے دہریت سے تعبیر کیا، اور سب سے بڑا حربہ یہ سمجھا کہ بغیر سوچے سمجھے اسے مسلم لیگی ذہنیت کا اثر بتلایا، حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ اس انفرادیت میں مولینا کا تبحر علمی اور اجتہادانہ قوت کارفرما ہے۔

غور و فکر اور بحث و نظر کی وہ راہیں جو علمار کا یہ طبقہ مسدود کر چکا ہے مولینا پھر اُن شاہراہوں کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ تاہم اگر یہ لوگ مُلائیت اور رسمی تصوف کے اس گنبد میں رخنہ اندازی منظور نہیں کرتے تو انہیں مان لینا چاہیئے کہ مولینا ہمیشہ اس رسم کہن کے مخالف رہے ہیں۔

قاضی عبدالغفار صاحب نے مولینا کی مذہبی انفرادیت پر بہت کامیاب اور مفید بحث کی ہے۔ خود مولینا کی تحریروں میں بھی اندھی تقلید سے بیزاری نظر آتی ہے۔ مگر "آثار ابوالکلام آزاد" نے ان تحریروں کو بہت نمایاں کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود قاضی صاحب اس انفرادیت اور اسلامی جدت کے قائل ہیں۔ اگرچہ قاضی صاحب کی افتاد طبع اس باب میں مولینا سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے، مگر اپنے تبصرہ میں قاضی صاحب نے طعن و تشنیع کے تمام راستے نظر انداز کر دئے ہیں، اور باوجود اپنی طبعی موافقت کے صرف مولینا کی تحریروں پر اکتفا کی ہے۔

کتاب کے آخری صفحات میں مولینا کے طرز و مزاج پر بحث کرتے ہوئے قاضی صاحب بجائے مولینا کی نفسیاتی کیفیت کے اُن کے اسلوب نگارش پر تبصرہ کر گزرے ہیں۔ حالانکہ یہ موضوع بالکل خارج از بحث ہے۔ کیونکہ "آثار ابوالکلام آزاد" مولینا کی فطری اور نفسیاتی کیفیات پر بحث ہے۔ اس کے لئے اگر مولینا کے ادب سے کچھ مواد مل جاتا ہے تو قاضی صاحب اُس سے مدد لے لیتے ہیں۔ بحث نہیں کرتے۔ اگرچہ مولینا کے اسالیب کا یہ پہلو بھی بہت اہم اور قابلِ تذکرہ ہے۔ نیز زیرِ نظر تبصرہ بھی کامیاب اور مفید ہے۔ مگر کتاب کے اصل موضوع سے بالکل خارج ہے۔

بحیثیت مجموعی کتاب اس حقیقت کی جانب اشارہ کناں ہے کہ یہ مطالعہ مولینا کی شخصیت سے بالکل بےنیاز اور صرف اُن کی تصانیف اور تحریروں کا مرہونِ منت ہے۔ "قاضی صاحب کی دوسری کتابوں کی طرح "آثار ابوالکلام" کا بھی اردو ادب میں ایک منفرد مقام ہے۔ اس کی وجہ ایک تو سیرت نگاری کا یہ نیا طرز ہے دوسرے قاضی صاحب کا شاندار اسلوب بیان اور مخصوص زبان ہے"۔

کاش! قاضی صاحب کو اس ضرورت کا احساس ہو کہ اردو زبان میں اس راستے کے اور بہت سے گوشے باقی رہ گئے ہیں۔ جن پر ابھی روشنی ڈالنا ہے اور یہ کام صحیح طور پر قاضی صاحب ہی کی توجہ سے ہو سکتا ہے۔

عرش ملسیانی

تین یادگار ادبی صحبتیں

راؤنڈ ٹیبل ادبی مباحثہ

دہلی کالج بزم ادب کی تاریخ میں ۷ فروری ۱۹۵۱ء ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس روز اردو کے چند مشہور ادیب دہلی کالج ہال میں جمع ہوئے اور انھوں نے ایک راؤنڈ ٹیبل کے گرد بیٹھ کر اس مسئلے پر غور کیا کہ نئے ہندوستان کی تعمیر میں اردو کے ادیبوں کا کیا حصہ رہا۔ آج اُن کا کیا حصہ ہے، اور آئندہ کیا ہونا چاہیئے۔ ہماری تقدیر، ماضی کی تفسیر، حال کی تعبیر اور مستقبل کی صحیح تنویر ہی پر منحصر ہے۔ اس لئے اردو کے ادیبوں کا یہ اقدام ہر طرح لائقِ ستائش ہے۔ نئے ہندوستان کے بنانے اور سنوارنے میں نئی مشینوں اور نئے آدمیوں کے ساتھ نئے ادب کی بھی ضرورت ہے جو ہماری رگوں میں زندگی کا خون دوڑا دے اور ہمارے اندر تعمیر اور عمل کا بے لوث جذبہ پیدا کر دے۔

اس راؤنڈ ٹیبل ادبی مباحثے کی صدارت خواجہ غلام السیدین صاحب ایم اے ایڈ لیڈ اسسٹنٹ مشیر تعلیم حکومت ہند نے کی جو خود ایک بلند پایہ ادیب اور دیدہ ور مفکر ہیں۔

اس مباحثے میں مندرجۂ ذیل حضرات نے شرکت کی۔

(۱) پروفیسر آل احمد سرور لکھنؤ یونی ورسٹی

(۲) پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، دہلی کالج

(۳) پروفیسر احتشام حسین لکھنؤ یونی ورسٹی

(۴) جناب جگن ناتھ آزاد، دہلی

(۵) ڈاکٹر عبد العلیم، علی گڑھ یونیورسٹی

(۶) حضرت امن لکھنوی۔ دہلی

(۷) پروفیسر مس سیدہ ثریا سلطانہ علی گڑھ

(۸) پروفیسر خورشید الاسلام علی گڑھ

(۹) جناب علی سردار جعفری۔ بمبئی

راؤنڈ ٹیبل ادبی مباحثے میں خواجہ احمد فاروقی صاحب نے بحث کا آغاز کیا۔ اُنھوں نے اردو ادب کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر کو پیش کیا۔ اور ابتدائی ادیبوں اور شاعروں نے آزادی حاصل کرنے اور متحدہ قومیت کے بنانے میں جو حصہ لیا تھا، اس کو واضح کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اردو، ہند آریائی زبان ہے۔ جس نے ہمیشہ کھڑی بولی کی خصوصیات اور عوام کی ضروریات کا لحاظ رکھا ہے۔ اپنے عوامی کلچر (ثقافت) اور عالمی قدروں کو فروغ بخشا ہے۔ اُس نے شیخ و برہمن اور دیر و حرم کے امتیازات مٹائے ہیں اور ہندوستان میں اتحاد پسندی کے اس تاریخی رجحان کو قوت بخشی ہے جس کا سلسلہ عہد قدیم سے ملتا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب نے شاہ ولی اللہ اور ان کے ساتھیوں کی تحریک کا ذکر کرنے کے بعد مولانا فضل حق خیر آبادی، مولوی امام بخش صہبائی، مفتی صدر الدین آزردہ، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، مومن دہلوی، نیاز علی پریشان، منیر شکوہ آبادی وغیرہ کے اُن مساعی کا ذکر کیا، جو اُنھوں نے آزادی کے لیے کی تھیں۔ انھوں نے اردو کی عوامی دلکشی، اس کی بھارتیتا اور اس کی تہذیبی روایات کی بنا پر وثوق کے ساتھ کہا کہ نئے ہندوستان کی تعمیر میں بھی اردو کا، جس کی تزئین و آرائش میں ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ سب ہی نے کوشش کی ہے، بہت بڑا حصہ ہوگا۔ نئے ہندوستان کی خصوصیت، جمہوریت اور غیر مذہبی حکومت کے تصورات ہیں۔ اردو میں یہ دونوں خصوصیتیں موجود ہیں۔ اس لیئے وہ نئے ہندوستان کے اِن بنیادی تصورات کو فروغ بخشے گی۔ البتہ اُس کے لیئے ضرورت ہے کہ اردو اور ہندی کو قریب لایا جائے اور ادب شہر کی فضا سے نکل کر دیہات کی کھُلی فضا میں ترقی کرے۔ اُنھوں نے تقریر کو ختم کرتے ہوئے کہا کہ اُردو کا پودا جب کبھی کھڑی بولی کے علاقے سے، دوسری ادبی روایات کے علاقے میں لگایا گیا ہے، اس کی اصلی شادابی باقی نہیں رہی ہے، سب رس اور فسانۂ عجائب، میر اور میر امّن

کے تخلیقات کے مقابلے میں کتنے غیر حقیقی ہیں! اسی لئے آج بھی اردو کے لئے اگر کوئی میدان ہے تو وہ پاکستان نہیں بلکہ ہندوستان ہے۔ یہاں کا کوئی علاقہ ایسا نہیں جہاں کی مائیں اپنے بچوں کو اردو میں لوریاں دیتی ہوں۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہم اُردو کے مُستقبل سے مایوس ہوں۔

اس کے بعد حضرت جگن ناتھ آزاد نے ماضی کے ادیبوں کے خدمات کا جائزہ لیا۔ اور گفتگو کا سلسلہ اُس جگہ سے شروع کیا جہاں سے پچھلے مقرر نے ختم کیا تھا۔ انھوں نے حالی کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اور کہا کہ حالی نے جو راہ دکھائی تھی اردو کا قافلہ آج اسی راستے پر چل رہا ہے۔ اور یہی راستہ نئے ہندوستان کا راستہ ہے ......

پروفیسر مس ثریا سلطانہ نے زبان سازی کے سلسلے میں عورتوں کی خدمات کا ذکر کیا۔ اور اس بات پر زور دیا کہ اردو نے ایک مشترک تہذیب کے بنانے میں بڑا حصّہ لیا ہے جو نئے ہندوستان کے لئے بہت بڑی دولت ہے۔

پروفیسر خورشید الاسلام نے کہا کہ پُرانے تہذیبی ورثے کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے انتقادی احساس اور صحیح توازن درکار ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے فرمایا کہ ہمیں ماضی کے بارے میں آسان پسندی نہیں اختیار کرنا چاہیئے۔ اس میں ہمیں جاندار حصّے کی تلاش اور تعمیر و تخریب میں امتیاز کرنا ہے۔ اس کے بعد ہمیں طبقاتی زندگی کے مسائل کی تنقید کرنا چاہیئے، تب ہی ہم نئے ہندوستان کے سنوارنے میں کوئی حصّہ لے سکیں گے۔

ڈاکٹر عبد العلیم نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمیں دستور زبان بندی کی مخالفت کرنا چاہیئے۔ اردو ہندی نزاع ختم اور اپنے حیات پرور ادب کے ذریعے سے سماجی مساوات کے قیام میں مدد کرنا چاہیئے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اس بات پر زور دیا کہ نئے ہندوستان کو واقعیٔ نیا بنانا چاہیئے۔ اُردو کے ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ سائنسی طرزِ فکر پسید اور ادب کی اقتصادی بنیادوں کو اُستوار کریں۔

حضرت احسن لکھنوی نے فرمایا کہ اردو میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔ ہمیں عوامی الفاظ کا تحفظ کرنا چاہیئے اور اِس مُشترکہ تہذیب کا بھی جس کی نمائندہ اُردو زبان ہے۔

اس صاحب کے بعد سردار جعفری صاحب نے تقریر کی اور فرمایا کہ ہمیں نئے ہندوستان کا ایک صحیح تصوّر سامنے رکھنا چاہیئے اور اس کے بنانے اور سنوارنے میں مل جل کر کوشش کرنا چاہیئے۔

آخر میں خواجہ غلام السیدین صاحب صدر مجلس نے سارے مباحث کا مختصر لیکن جامع خلاصہ بیان کیا اور جابجا بڑے فاضلانہ اور شگفتہ انداز میں مُقرّروں کے خیالات پر تنقید بھی کی۔ گروپ فوٹو کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

نظریاتی مشاعرہ

۱۸۔ فروری ۱۹۵۱ء کو دہلی کالج بزمِ ادب کی جانب سے ایک نظریاتی مشاعرہ ہوا جس کی صدارت جوش ملیح آبادی نے فرمائی۔

شرکائے مشاعرہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

جوش ملیح آبادی، تلوک چند محروم۔ پنڈت زار زتشی۔ بسمل سعید۔ عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد۔ سردار جعفری۔ احسن لکھنوی۔ غلام ربانی تاباں۔ کمال احمد صدّیقی۔ شمیم کرہانی۔ غلام احمد فرقت۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ جاوید وششٹ۔ احتشام حُسین۔ آلِ احمد سُرور۔

ہر شاعر نے پہلے اپنا نظریۂ فن بیان کیا اور اس کے بعد اپنی نمائندہ نظم یا غزل پڑھی۔

شروع میں پروفیسر احتشام حسین نے نظریاتی مشاعرہ کا تعارف کرایا اور آخر میں پورے مشاعرے پر پروفیسر آل احمد سرور نے تنقید کی۔

یہ مشاعرہ اپنی نوعیت اور افادیت کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ مخصوص شاعر تھے اور مخصوص سننے والے۔ دہلی کالج کا وسیع ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور لوگ ایک پہلو سے بیٹھے سُن رہے تھے۔

جوش صاحب کی نظم "تیجا بگی"۔ آزاد کی نظم "میرا موضوعِ سخن" اور جعفری کی نظم "پتھر کی دیوار" بہت مقبول ہوئیں۔ راقم کا نظریۂ شعر اور اس کی نمائندہ نظم ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

میرا نظریۂ شاعری

اپنے گرد وپیش کے ماحول سے تأثر قبول کرنے شاعر کو عام مخلوقِ انسانی سے ایک خاص

حاصل ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہی امتیاز اُسے شاعر بناتا ہے۔ انھیں تاثرات کا نظم اور شگفتگی کے ساتھ اظہار شاعری ہے۔

اُردو شاعری ایک مدّت تک ایک خاص قید و بند کی اسیر رہی۔ جب میں اس دنیا میں داخل ہوا تو اسی پنجرے میں بند آیا۔ شعور میں اتنی روشنی نہیں تھی کہ فرسودگی اور قدامت کی تاریکیوں کو دور کر سکتا۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ عمرِ عزیز کے چالیس بیالیس سال گزارنے کے بعد آج جب اپنے کلام کی ورق گردانی اس نیت سے کرتا ہوں کہ اپنے نظریۂ شاعری کی تلاش کروں تو خود کو ایک مصیبت میں گرفتار پاتا ہوں۔ تذبذب حتیٰ کہ مایوسی کا احساس ہوتا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ اگر صاف طور پر اس بات کا اقرار کروں کہ میرا کوئی نظریۂ شاعری نہیں تو صفِ شعرا سے نکال دیا جاؤں گا۔ اس لئے ذہنی دیانت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے تھوڑی سی فریب کاری سے کام لوں گا۔ شاعر زبان و اسلوبِ بیان کے عیوب سے بچنے کے لئے ضرورتِ شعری کا سہارا لیا کرتے ہیں۔ اپنے غیر نظریاتی کلام کے لئے مجھے کہیں ضرورتِ شعری کا سہارا نہ لینا پڑے۔ اس خوف سے کوئی نہ کوئی نظریہ گڑھ لینا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ گرد و پیش کے ماحول سے تاثر قبول کرنے اور اُسے ایک خاص نظم اور شگفتگی سے بیان کرنے کا نام شاعری ہے۔ اسی کو میں اپنے نظریۂ شاعری کی بنیاد سمجھتا ہوں۔ غزل میں درد و کرب کے عالم کی تصویر ہو۔ سماج کے دُکھ درد کا رونا ہو۔ حسینوں سے اٹکھیلیوں کا ذکر ہو۔ یا معاشی اور اقتصادی نشیب و فراز کا بیان۔ یہ سب کچھ اپنے گرد و پیش کی باتیں ہیں۔ انھیں کا ذکر ناگزیر ہے۔ مفروضات کی گنجائش سچی شاعری میں نہیں۔ یہاں نہ فرضی معشوق سے نباہ ممکن ہے نہ فرضی عاشق ہی کی چلتی ہے۔ انسان خود نسلِ انسانی کی بہبود کے لئے جو کچھ کر رہا ہے اُس کی توصیف اور جو کچھ اس کی ہلاکت اور بربادی کے لئے کر رہا ہے اُس کے خلاف احتجاج سچی شاعری ہے۔ شاعری کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کی آئینہ دار ہو۔ اولادِ آدم کے کسی حصے کو اجارہ داری کی اجازت نہ دے۔ عام بندوں کی لٹتی اور مٹتی ہوئی راحت و آسائش کے احیا کا اظہار کرے۔ گونگی جنتا کی آواز سُنے اور دنیا کو سنائے۔ مظلوم کی حمایت، امنِ عالم کی بقا اور ارتقائے ذہن کے اصول کو اپنائے۔ مذہب کی چیرہ دستیاں اور سیاست کی جنگ آفرینیوں کی جگہ اب دنیا میں باقی نہیں رہی ہے۔ آواز اُٹھانا اور ان کی تضحیک اچھی اور سچی شاعری کا مطمحِ نظر ہونا۔ لیکن ان تمام باتوں میں ایک وقار آمیز متانت کا میں قائل ہوں۔ وہ شاعری پسند نہیں جس میں مار دھاڑ اور پکڑ دھکڑ کی تلقین یا لوٹ اور غارت گری کے نعرے ہوں۔ اظہارِ مطالب کے باب میں عجزِ طبیعت زبان اور غلط ترکیبوں کی جدّت آفرینیوں سے چھپانا میرے نزدیک نہیں۔ وہ شاعری جو شعریت سے خالی ہے جس میں رس اور نوع نہیں جو موسیقی اور مصوّری سے مبرّا ہے محض تضیعِ اوقات ہے۔

یہ تو مشکل ہے کہ کسی شاعر کی کوئی ایک نظم اُس کے نظریے کی کُلّی طور پر حامل ہو۔ پھر بھی جو نظم میں آپ کی خدمت میں اس وقت پیش کروں گا وہ قریب قریب میرے ان خیالات کی نمائندگی کرے گی۔ اس میں قنوطیت کی جھلک موجود ہے۔ لیکن اس میں ایک مخفی رجائیت بھی۔ اس لحاظ سے کہ فرسودگی اور قدامت کے جو عناصر نظامِ عالم میں موجود ہیں یا ذہنِ انسانی کے ارتقا کی راہ میں جو مشکلیں ابھی حائل ہیں اُن سب پر استعجاب اور حیرت کا اظہار اس نظم میں ملے گا۔ ایک مایوسی ہے اُمید کی متمنّی ہے۔ ایک بیزاری ہے جو لطیف طنز یا زہرخندے تعبیر کی جا

جہل کی رات

عقل کی صبح کہاں جہل کی ہے رات ابھی
ذہنِ انساں میں ہیں فرسودہ خیالات ابھی
پائے آدم میں ہے زنجیرِ قدامت اب تک
گردنِ دہر میں ہے طوقِ روایات ابھی
طاقتِ جست و عمل سے ہیں ابھی دل محروم
زینۂ عقدہ کشائی ہے مناجات ابھی
دل میں انسان کے ہے دہشتِ افراط ہنوز
ثبت اذہان پہ ہے مُہرِ کرامات ابھی
رُوحِ احساس پہ ہے گردِ تنک مایہ ہنوز
دوشِ افکار پہ ہے زلفِ خرابات ابھی
جنتِ خوب میں ہے شیخ کا ہر قول ہنوز
دوزخِ زشت میں ہے رند کی ہر بات ابھی

منعم بیٹھا ہوا ہے مرکزِ انعام اب تک
مفلسِ غمزدہ ہے موردِ آفات ابھی

خونِ مزدور ہے ارزاں ابھی پانی کی طرح
بہرِ سرمایہ ہے یہ مُفت کی سوغات ابھی

عیب سازوں سے ہیں افسردہ ہنرمند ابھی
نقص بازوں سے ہیں آزردہ کمالات ابھی

دہر میں جوہرِ قابل کی نہیں قدر کہیں
پُجتے ہیں جاہ و حشم کے ہُبل ولات ابھی

رہبرِ راہِ تعقل کا خدا حافظ ہے
راہ میں وہم کے لاکھوں ہیں مقامات ابھی

خاکۂ حسن ابھی ذہنِ تصور میں نہیں
خامِ تخئیل ہے محرومِ محاکات ابھی

ابھی آئینۂ افکار نہیں پیشِ نظر
دل ہے نظّارگیِ جلوۂ آیات ابھی

ابھی ممنوع ہے دارائی شرح و تفسیر
نازفرما ہیں اشارات و کنایات ابھی

خندۂ دلکش و گلدستۂ رنگیں کے عوض
خنجر و تیغ سے ہوتی ہے مدارات ابھی

آستاں امن کا اب تک نہیں مسجودِ بشر
آستاں جنگ کا ہے قبلۂ حاجات ابھی

گرہِ زیست کے ہیں عقدہ کشا ناخنِ مرگ
خدمتِ امن میں داخل ہیں فسادات ابھی

عرشؔ کیوں خواب سے بیدار ہوا جاتا ہے
بند کر آنکھ کہ باقی ہے یہاں رات ابھی

عرش ملسیانی

یومِ غالب

۱۸۔ فروری ۱۹۵۱ء کو دن کے دو بجے درگاہ خواجہ نظام الدین کے ن
چونسٹھ کھمبا میں یومِ غالب منایا گیا۔ اسی مہینے کی پندرھویں تاریخ کو ۱۸
میں مرزا غالب کا انتقال ہوا تھا۔

اس نشست کی صدارت کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے نام کا ا
ہوا تھا لیکن وہ کسی خاص وجہ سے تشریف نہ لاسکے۔ جلسے کی صدارت
مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمائی۔ مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیا
حکومتِ ہند بھی تشریف لائے تھے۔

جناب شنکر پرشاد صاحب چیف کمشنر دہلی استقبالیہ کمیٹی کے صدر
آپ نے نہایت سلیس اور شستہ اردو میں خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ آپ نے ا
بات پر زور دیا کہ مرزا غالب کے کلام اور ان کی شخصیت کے مختلف پہ
پر ریسرچ کرنا صحیح ادب کی خدمت کرنا ہے۔ اس معاملے میں اب تک ج
رفتار سے کام ہوا ہے وہ تسلی بخش نہیں۔ مغربی ممالک میں ایسی شخصیتو
کے متعلق تحقیق کے سلسلے میں ادارے قائم ہو جاتے ہیں۔ آپ نے مز
غالب کی طرف بھی ملک کی توجہ مبذول کی، اور فرمایا کہ یہ یادگارِ غالب
شایانِ شان نہیں۔

مولانا آزاد نے ایک نہایت فصیح و بلیغ تقریر میں مرزا غالب کے
اردو کے محاسن مختصر طور پر بیان کئے۔ مولانا نے فرمایا کہ فارسی میں مرزا
حیثیت ایک مقلد کی سی ہے مجتہد کی نہیں لیکن اُردو میں وہ ایک مجتہد کا در
ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہندوستانی زبانوں میں اردو اور بنگالی ہی ایسی ز
ہیں جن کا ادب دنیا کے بہترین ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے، او
میں غالب اور ٹیگور ہی دو ایسے شاعر ہیں جن کی تخلیقات ادبِ عالی کا در
ہیں۔ اس کے بعد چند تقریروں اور مقالوں کے بعد یہ نشست برخ
ہوئی۔ شب کو اسی مقام سے ایک طرحی مشاعرہ براڈکاسٹ ہوا۔

ماہ اگست ۱۹۵۱ء کا شمارہ سالنامہ ہوگا

(ادارہ)

ذکر و فکر

پنگھٹ
شررؔ فتحپوری

ایک الھڑ حسین، مہ پیکر کس ادا سے کھڑی ہے پنگھٹ پر
ہر نظر میں کنوارپن کی حیا شوخ بے باک کم سنی کی ادا
زلف برہم، شگفتہ پیشانی رُخ پہ مہرِ مبیں کی تابانی
اُبھا اُبھا نفس کا زیر و بم نرم سینے میں پھولتا سا دم
انکھڑیوں میں فروغ کاجل سے بجلیوں کی نمود بادل سے
مسکراہٹ لبوں کی محوِ ستیز دل میں اک آرزوئے فتنہ خیز
فرقِ تاباں پہ چاندسی بیندی جگمگاتے نصیب کی بیندی
کفِ نازک پہ وہ حنا کے نقوش اُف رے اس برگِ دلربا کے نقوش
بازوؤں میں کھنچاؤ کا عالم ابروؤں میں تناؤ کا عالم
چوڑیوں کی لطیف سی آواز چھیڑتی ہے دلوں کا تارِ ساز
بوجھ سا بوجھ کچھ کمر پر ہے گاگرِ اک اور پھر بھی سر پر ہے
لے رہی ہے عجیب انگڑائی اُف رے ہاتھوں کی عرش پیمائی
ہائے گاگر کا وہ چھلک جانا دلِ معصوم کا دھڑک جانا
زلفِ برہم جہاں بکھرتی ہے انکھڑیوں میں حیا سنورتی ہے
رنگِ روئے حسین نکھرتا ہے جذبۂ نازنیں اُبھرتا ہے
تیز ہوتی ہے سانس کی رفتار فتنے ہوتے ہیں خواب سے بیدار
دیدنی ہے شباب کا انداز دلربائی ہے حسن کا اعجاز

آئینۂ حیرت
عبدالمجید حیرت

دل جس کی رفاقت کا طلبگار بہت ہے وہ عشق و محبت ہی سے بیزار بہت ہے
مشکل ہے کہ ناصح کی نصیحت کا اثر ہو دل اُن کی اداؤں میں گرفتار بہت ہے
اس شوخ بلا کے غم پنہاں ہیں، کہ ہم کو تھوڑی سی بھی تسکینِ دلِ زار بہت ہے
بیدادِ محبت کے لئے یاد تو رکھا اتنا بھی کرم آپ کا، سرکار بہت ہے
برسوں نہیں پڑتی تو نہیں پر نہیں پڑتی گو محوِ تماشا نگہِ یار بہت ہے
کس منہ سے ہو اُن سے کرم و عفو کا طالب یہ بندۂ عاجز، کہ گنہگار بہت ہے
یہ محو جگر اور اضافہ سے ہے، دگرنہ حیرتؔ کے لئے دل کا ہی آزار بہت ہے

کجا.... می روی
جلال ملیح آبادی

یہ اُفق پر چاند - یہ پچھلا پہر فرشِ گل پر یہ سہانی چاندنی
یہ کھنکھتے آبشاروں کی صدا بُوئے گل سے یہ ہوا مہکی ہوئی
جگمگاتی، مسکراتی، کہکشاں رات کی ہے مانگ تاروں سے بھری
چاندنی میں جھیل کی شفافیاں ہے عروسِ شب کی گویا آرسی
یہ ہواؤں کی سُبک رفتاریاں یہ ستاروں کی خنک تابندگی
پنکھڑی پر ضوفشاں شبنم کی بُوند جیسے ہیرے کی کنی ترشی ہوئی
یہ زمیں پر ارغوانی نُور سا یہ فلک پر چمپئی سی روشنی
گنگناتی فرش پر تازہ حیات عرش پر انگڑائی لیتی زندگی
از زمیں تا آسماں رنگینیاں زندگی، تابندگی، رخشندگی
ان ستاروں کی ملائم چھاؤں میں کس نے چھیڑی ہے چمن میں بانسری
درد سا، دل میں بدلتا کروٹیں شمع سی دل میں جلاتی، نغمگی

(۲)

آج وہ جانِ چمن وقتِ سحر گلستاں میں اتفاقاً مل گئی
عارضِ گلنار پر گُل کا بیاں تا کمر، زلفِ رسا جھومی ہوئی
پیکرِ رنگیں سراپا نُور سا رس میں ڈوبی سی شگفتہ چاندنی
میں نے از راہِ تمنّا، یہ کہا "اے سراپا حُسن و جانِ دلبری
"اے زیارت گاہِ عالم رُوئے تُو تو کجا بہرِ تماشا می روی"

پورن سنگھ ہنرؔ

رکھا جو دل کو مجمعۂ این و آں سے دور رہ کر جہاں میں بھی ہیں ہم جہاں سے دور
میدانِ فکر ہے مرا حدِ جہاں سے دور اُس آسماں پہ ہوں جو ہے اس آسماں سے دور
آہ و فغاں میں ربطِ عبادت نہ ڈھونڈیئے شرحِ نیازِ عشق ہے لفظ و بیاں سے دور
دن رات ہم نوا تھے چمن میں جو ہم صفیر اب اُن کا آشیاں ہے مرے آشیاں سے دور
لایا ہے شوقِ دید تری جلوہ گاہ میں ورنہ مقام تھا مرا ہفت آسماں سے دور
درماندگی ہے قابلِ رحم اُس غریب کی پائے نظر بھی جس کا ہے آبِ رواں سے دور
کیا کیجئے خرابیٔ تقدیر کا گلہ اب کی بہار میں بھی رہے آشیاں سے دور

سلام مچھلی شہری

الف لیلیٰ کی ایک رات

(پس منظر میں ایک نغمہ) ایک رات ۔ ایک رات
الف لیلیٰ کی ایک رات
پریوں کی ۔ جنّوں کی ۔ دیوں کی بات ۔ الف لیلیٰ کی رات !! (وقفہ)

راوی :— اور ہر رات کہانی ختم کرتے ہوئے وزیر زادی یہی کہتی، یہ تو اس کہانی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو میں کل آپ کو سنانے والی ہوں اور بادشاہ ہمہ تن اشتیاق آنے والی رات کا انتظار کرتا، کسی اور بھی زیادہ حسین افسانے کا ۔ (وقفہ)

راوی :— آج شہرزاد الٰہ دین اور اُس کے طلسمی چراغ کی کہانی چھیڑے ہوئے ہے ۔ سلطانِ وقت نے الٰہ دین کی ماں کی درخواست رد کر دی ہے اور شہزادی بدرالبدر کی شادی وزیر زادے سے ہو گئی ہے ۔ الٰہ دین کا جذبۂ انتقام بھڑک اُٹھا ہے اور وہ طلسمی چراغ کی مدد سے میاں بیوی دونوں ہی کو محل کے خلوتِ عروسی سے اُٹھوا منگاتا ہے اور صبح ہوتے ہی پھر دونوں کو محل میں واپس بھجوا دیتا ہے ۔ (وقفہ)

راوی :— یہ وہ گھڑی ہے جب سلطان نے اپنی بیٹی کی افسردگی اور پریشانیوں کو ایک وہم اور بھیانک خواب کا اثر سمجھتے ہوئے اُسے خوش کرنے اور اُس کا خیال بٹانے کے لئے ایک محفلِ طرب منعقد کرنے کا حکم دیا ہے ۔ رنگ برنگی شمعیں فانوس میں جگمگا رہی ہیں ۔ رباب و چنگ کی لہریں انگڑائیاں لے رہی ہیں ساقی گلفام ہے، دورِ جام ہے ۔ سلطانِ وقت کی جانب سے خاص و عام کے لئے ہی انعام ہے ۔ شہزادی کی خوشنودی کے لئے ساقی کا نغمہ زندگی کا پیام ہے ۔

(کورس)

آئی، آئی، آئی
فصلِ بہاراں آئی

موسمِ گل کی شہزادی لیتی ہے انگڑائی
فصلِ بہاراں آئی
کہہ دو، کہہ دو، بامِ فلک سے ٹوٹ پڑے مہتاب
باغ کے پھولوں سے کہہ دو ہو جائیں شاداب
دیکھا ہے شہزادیٔ عالم نے افسردہ خواب
آنکھ جھکی
رخسار بھی دمکے
ہونٹوں پہ اک موجِ تبسّم وہ دیکھو لہرائی !
آئی، آئی، آئی، فصلِ بہاراں آئی —!!
موسمِ گل کی اک شہزادی لیتی ہے انگڑائی
ناچ رہی ہے، جھوم رہی ہے دنیا کی رعنائی
آئی، آئی، آئی
فصلِ بہاراں آئی ۔

(ساز ختم)

ملکہ ۔ مَیں تو سمجھتی ہوں کہ یہ محض ایک خوفناک خواب کا ردِّ عمل تھا ۔

بادشاہ ۔ میرا بھی یہی خیال ہے تم نے دیکھا نہیں ملکہ، ایک ہی نغمے نے شمعِ مملکت کی پہلی جگمگاہٹ واپس کر دی ۔

ملکہ ۔ خدا کرے اب میری بیٹی ایسا کوئی خواب نہ دیکھے ۔

بادشاہ ۔ بدرالبدر کو افسردہ دیکھ کر میری نظر میں پوری دنیا تاریک ہو جاتی ۔ خدا خیر کرے اب وہ کبھی افسردہ نہ ہو ۔ اچھا شب بخیر ملکہ ۔

ملکہ ۔ شب بخیر جہاں پناہ (وقفہ)

راوی :— لیکن الٰہ دین کا جذبۂ انتقام ہنوز باقی ہے وہ آج کی شب بھی اپنے طلسمی چراغ کی مدد سے اس آتشِ انتقام کو سرد کرنا چاہتا ہے ۔

دیکھئے وہ اس طلسمی چراغ کو رگڑ رہا ہے۔ (آندھی، طوفان)

دیو۔ طلسمی چراغ کا مالک بتا کیا چاہتا ہے؟

الہ دین۔ میں چاہتا ہوں کہ آج کی رات بھی اُن دونوں کو خلوتِ عروس سے اُٹھا لایا جائے۔ مجھے ٹھکرانے کے بعد شہزادی کبھی آرام کی نیند نہ سونے پائے گی۔ جاؤ فوراً ان دونوں کو میرے پاس لے کر آؤ۔

دیو۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ ابھی لیجئے (آندھی اور طوفان)

راوی:— ابھی شہرزاد یہ کہانی مکمل بھی نہ کر پائی تھی کہ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگی۔

بادشاہ۔ اور پھر اس کے بعد کیا ہوا؟

شہرزاد۔ عالم پناہ۔ اب تو صبح ہو رہی ہے۔

بادشاہ۔ اچھی بات ہے ہم بقیہ کہانی آنے والی رات کو سنیں گے (ساز)

راوی:— دن گزرا، شام ڈھلی اور پھر رات آگئی — بادشاہ بڑے اشتیاق کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ شہرزاد بھی کہانی مکمل کرنے کے لئے تیار تھی اور پھر——

ایک آواز— اور پھر ایک جادوگر کے شریر دماغ کے کارنامے۔ الہ دین کا چراغ اور اُس کی کراماتیں — آہا ہا۔ زندہ باد تخیل پرستو! پائندہ باد "الف لیلیٰ" کی خواب آگیں کہانیو! پائندہ باد۔ آج — ہاں آج بھی جبکہ دُنیا کافی حقیقت آشنا کافی سمجھ دار ہوگئی ہے۔ الہ دین کا طلسمی چراغ اپنا کام کر رہا ہے۔ نہ یقین ہو تو ایک نائٹ کلب میں "الف لیلیٰ" کی یہ رات دیکھئے —

(ناہید کا گانا) (رقص کے ساتھ)

بات ذرا مان لینا ساقیِ گلفام کی
ہاں ہاں بات مان بھی لو ساقیِ گلفام کی — ساقیِ گلفام کی
مجھ سے نویدِ فصلِ بہار لو
چار دن کی زندگی کو خوشی میں گزار لو
سرخی سمجھ بھی لو چھلکتے ہوئے جام کی
تم کو قسم ہے روحِ حافظ و خیام کی
ہاں ہاں بات مان بھی لو ساقیِ گلفام کی

منظر۔ کیا بات شاعر! بہت ڈوبے ہوئے نظر آ رہے ہو؟

اختر۔ تم ٹھیک کہتے ہو منظر! میں واقعی ڈوبا ہوا ہوں۔ یوں سمجھو کہ ناہید کے اس نغمے نے مجھے "الف لیلیٰ" کی وادیوں میں چھوڑ دیا ہے۔ کیا قسم دلائی ہے ظالم نے، تم کو قسم ہے روحِ حافظ و خیام کی —

منظر۔ تو پھر لو، ناہید کے نام پر ایک جام اور سہی۔

اختر۔ اب جام سے تو کام نہ چلے گا۔

منظر۔ پھر کیا ارادے ہیں

اختر۔ سوچتا ہوں کوئی ایسا کروڑ پتی آدمی مل جائے جس کے کوئی اولاد نہ ہو۔

منظر۔ بس۔ بس۔ بس۔ میں سمجھ گیا۔ میرے خیال میں تم کہیں سے "الہ دین کا طلسمی چراغ" تلاش کرو۔ پھر متوجہ ہونا تو کیا ناہید تمہاری داسی بن جائے گی۔ داسی! سمجھے۔

اختر۔ اُڑا لیجئے مذاق تعلقدار منظر صاحب۔ ایک غریب شاعر بھلا کوئی جواب بھی کیا دے سکتا ہے

منظر۔ بُرا مان گئے۔ دوستی امیری اور غریبی کی کسوٹی پہ نہیں پرکھی جاتی۔ اختر بچپن کے ساتھی ہو اور ابھی تک مجھے سمجھ بھی نہیں پائے۔

اختر۔ کیا کروں منظر! جانتے تو ہو، جب دل مجروح ہوتا ہے تو —

(ٹھنڈی سانس بھر کر) ایک شاعر نے غریبی میں محبت کی ہے
اور اک بات بھی سوچوں تو میری زیست حرام

منظر۔ پردے اُٹھ گئے ہیں، ناہید کا نغمہ پھر شروع ہونے والا ہے میرے خیال میں تم ایک پیک اور لو۔ تب تمہارا موڈ ٹھیک ہوگا

اختر۔ اب تو موڈ اسی وقت ٹھیک ہوگا جب میں —

منظر۔ جب میں

اختر۔ جب میں عشرت نگر اسٹیٹ کا منیجر ہو جاؤں گا۔ ہاں۔ ہاں راجہ صاحب مجھ پر بہت مہربان ہیں اور اُنھوں نے وعدہ بھی کیا ہے۔

منظر۔ سچ؟

اختر۔ اور نہیں تو کیا جھوٹ؟

منظر۔ جیو میرے منیجر۔ پھر ایک ناہید کیا ہزاروں ناہید تمہارے قدموں پہ ہوں گی۔ اچھا اب اسٹیج کی طرف دیکھو۔ ایک لمحے میں پکار اُٹھوگے

" شعلہ سا بھڑک جائے ہے آواز تو دیکھو"۔

(رقص)

دل کی واردات ہے
پریوں کی بات ہے
کتنی حسین آج الف لیلیٰ کی رات ہے
کتنی حسین آج الف لیلیٰ کی رات ہے
دل کی خوشی ہنس کر گلابی میں ڈھل گئی
آتے ہی محفل میں طبیعت بہل گئی
پیا سے بول سے ملے
تازہ شگوفے کھلے
آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے ملاقات ہے
دل کی واردات ہے
پریوں کی بات ہے
کتنی حسین آج الف لیلیٰ کی رات ہے
کتنی حسین آج الف لیلیٰ کی رات ہے

اختر۔ اچھا منظر میں تو چلتا ہوں

منظر۔ ابھی ایک Item تو باقی ہے۔ "علی بابا اور چالیس چور کا ڈرامہ" کیا اسے نہ دیکھوگے

اختر۔ جھوٹی ہی سہی۔ مگر میں الف لیلیٰ کی یہ فضا نہ برداشت کرسکوں گا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس محفل میں میرا اور میری غربت کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔

منظر۔ جب شاعر ہو کر بھی تم افسانوں کی دنیا میں نہیں رہ سکتے تو پھر بھلا زندگی کے حقائق سے کیسے ٹکر لوگے؟

اختر۔ یہ میں پھر سوچوں گا منظر۔ مجھے جانے دو۔ یہ پھر سوچوں گا۔

ایک آواز:۔ دیکھی آپ نے شہر کے مشہور نائٹ کلب میں الف لیلیٰ کی یہ رات۔ کیا آپ اس پریشان حال شاعر اختر کے جذبات کو چھو سکتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا وہ "عشرت نگر" کا ہیرو ہو سکے گا۔ اور ـــــ اور کیا وہ ناہید کو اپنا بنا سکے گا۔ ناہید۔ جگمگاتی محفلوں کی ہیروئن بھلا اختر کی ہو سکیگی۔ یہ ایک سوال ہے اور اس سوال کے آگے الہ دین کے طلسمی چراغ کی بات ایک دیوانے کے حسین خواب سے زیادہ کچھ نہیں۔ (وقفہ)

راوی:۔ آج کی شب شہرزاد کی کہانی اس منزل پر ہے جب طلسمی چراغ کی مدد سے الہ دین کسی نہ کسی طرح شہزادی بدرالبدر سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ الہ دین نے جادو کا ایک محل تعمیر کر لیا ہے جو سلطانِ وقت کے محل سے ہزار گنا زیادہ حسین و جمیل ہے۔ دونوں دن عید اور رات شب برات کی منا رہے ہیں۔

راوی:۔ لیکن افریقی جادوگر نے اپنے جادو کے زور سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ الہ دین ابھی زندہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے سلطانِ وقت کی بیٹی سے شادی بھی کر لی ہے اور چراغ کی مدد سے ایک عالی شان محل بھی تیار کر لیا ہے جس میں ہر روز جشن منائے جا رہے ہیں

راوی:۔ افریقی جادوگر کا جذبۂ انتقام بھڑک اٹھتا ہے۔ وہ پھر چین آتا ہے اور اپنے فریب سے طلسمی چراغ حاصل کر لیتا ہے۔ آن کی آن میں الہ دین کی دنیا ویران ہو جاتی ہے۔ طلسمی محل مسمار ہو جاتا ہے اور جادوگر شہزادی بدرالبدر کو بھی اپنے ساتھ افریقہ لے کر چلا جاتا ہے۔ اور جب سلطان عالم کو یہ خبر ہوتی ہے ـــــ

سلطان:۔ وزیر سلطنت یہ میں کیا سن رہا ہوں۔

وزیر:۔ مجھے تو پہلے سے اندیشہ تھا جہاں پناہ

سلطان:۔ پھر اب کیا کیا جائے۔

وزیر:۔ سب سے پہلے تو الہ دین کو گرفتار کیا جائے۔ پھر شہزادی عالم کی تلاش شروع کی جائے۔

سلطان۔ لیکن الہ دین کو گرفتار کرنا ـــــ ہمارا یہ مطلب ہے کہ شہزادی کو تلاش کرنے کا کام الہ دین ہی پر کیوں نہ چھوڑا جائے پھر اس کی ساحری اور فریب کی سزا بعد میں دی جائے گی۔

وزیر۔ میرا تو خیال ہے کہ ایسے خطرناک آدمی کو جلد از جلد زیر حراست ہو جانا چاہیئے۔

سلطان۔ اچھا تو باید دولت تمہاری بات مانتے ہیں۔ ہماری جانب سے اس کی گرفتاری کا حکم دے دو۔ (وقفہ)

راوی:۔ اور پھر سلطان کے حکم سے الہ دین کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر وہ تمام مظالم کئے گئے جو کسی بھی بڑے مجرم کے لئے روا رکھے جاتے ہیں۔

راوی:۔ دن بیتے، ہفتے گزرے اور پھر کئی مہینے گزر گئے۔ ایک دن

الہ دین کسی نہ کسی طرح زنداں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور پھر تلاشِ گم شدہ کے لئے نکل پڑا۔

راوی:— طلسمی انگوٹھی اب بھی الہ دین کی ایک انگلی میں رہ گئی تھی۔ اور اس نے پہلے کی طرح اس بار بھی اس کی مدد کی۔ آخر کار الہ دین افریقی جادوگر کی طلسمی دنیا میں آ ہی گیا۔

ایک آواز:— اور ہماری حقیقی دنیا کا شاعر خلیل ہے۔ ہیرو اختر جب نائٹ کلب کی الف لیلیٰ کی رات اور اس کی یاد نہ بھلا سکا اور عشرت نگر کا طلسم بھی نہ ہو سکا تو اس نے پہلے تو خودکشی کی ٹھان لی۔ مگر پھر کچھ سوچ بچار کر اس ارادے سے باز رہا۔ گلابی جاڑوں کی حسین شام تھی۔ اس کا تخیل افق کی رنگ برنگی وادیوں میں کھو گیا اور ذرا دیر بعد اس نے آخری طور پر یہ فیصلہ کر لیا کہ آج وہ خود ناہید سے ملے گا خواہ اس کا انجام جو بھی ہو۔ قوتِ ارادی سے مسرور، تخیلات سے مسحور وہ ناہید کی کوٹھی پر آ ہی گیا۔ (وقفہ)

اختر۔ میں اندر آ سکتا ہوں؟

ناہید۔ ضرور تشریف لائیے۔

اختر۔ شکریہ

ناہید۔ تشریف رکھئے۔ یہاں آ جائیے۔ اس کوچ پر۔ فرمائیے۔ کیسے یاد کیا آپ نے کنیز کو۔

اختر۔ جی اس روز نائٹ کلب میں جب الف لیلیٰ کی رات منائی جا رہی تھی۔ میں نے آپ کے نغمے سنے تھے۔

ناہید۔ میرے نغمے آپ کو بہت پسند آئے۔ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ کی پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ۔ اور فرمائیے کوئی خاص بات۔

اختر۔ آپ کی آواز میں ایک جادو تھا۔ ایک جادو۔ جو ویرانے میں حسین ترین محلات تعمیر کر سکتا ہو۔ ایک روح تھا مانو صبح کی ٹھنڈی ہوا ڈول رہی ہو۔ اور——

ناہید۔ اور یہ کہ آپ کافی پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ بال بکھرے ہوئے ہیں اور ان پر گرد جمی ہوئی ہے۔ دیکھئے۔ وہ ہے آئینہ ذرا خود کو درست کر لیجئے۔ ہاں اس طرح آئیے۔ اب باتیں کریں — تو آپ کہہ رہے تھے کہ میرا نغمہ سن کر آپ کو ایسا معلوم ہوا گویا۔

اختر۔ جی میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں میرا مطلب یہ ہے کہ میں — جی ہاں میں آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں۔

ناہید۔ سگریٹ پیتے ہیں آپ؟

اختر۔ جی، سگریٹ، ہاں، ہاں کیوں نہیں۔

ناہید۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میری گھڑی اب آٹھ بجانے والی ہے اور اس وقت میرا کلب میں جانا بہت ضروری ہوتا ہے۔

اختر۔ جی ہاں، جی ہاں۔ اچھا تو پھر کس روز حاضر ہوں۔

ناہید۔ (موٹر پر بیٹھتے ہوئے) آنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے آپ ہی کا گھر ہے۔ مگر سنئے ذرا انسان بن کر آئیے گا۔ آپ تو سرے سے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

(کار پر چلی جاتی ہے)

ایک آواز:— یہ تھی آج کی دنیا۔ اسی دنیا میں جو کافی ترقی یافتہ ہو چکی ہے۔ جی ہاں، آج کی دنیا میں جو مساوات کی دنیا کہلاتی ہے۔ یہ تھی امیری اور غریبی کی جھلک۔ غریب شاعر کے تصور کے طلسمی چراغ کا ایک پرتو، یہ تھی مادی دنیا میں بھی تخیل پرستی اور الف لیلیٰ کی راتوں کے خیال میں ڈوب جانے کی سچی تصویر اور اس کا ردِ عمل۔ (وقفہ)

راوی:— اور انجام کار الہ دین ایک بار پھر وہ طلسمی چراغ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وزیر زادی نے ابھی قدر کہہ کر پہلے بادشاہ کے چہرے کا جائزہ لیا اور اس کی نیم غنودہ آنکھوں میں بھی اشتیاق کی جھلک پا کر جلدی کہانی کی اس منزل میں آ گئی جب الہ دین افریقی جادوگر کو قتل کر چکا ہوتا ہے۔ اور اس کا حسین طلسمی محل پھر سے تعمیر ہو جاتا ہے۔

بادشاہ۔ پھر کیا ہوا؟

شہرزاد۔ الہ دین نے شہزادی بدرالبدر کو گلے سے لگایا۔ اس ملاقات کی خوشی میں سارا محل جگمگایا گیا۔ شہنائیاں بجیں۔ نشاط کی محفلیں آراستہ کی گئیں۔

بادشاہ۔ پھر؟

شہرزاد۔ پھر خود شہزادی بدرالبدر نے الہ دین کو ایک نغمہ سنایا۔

بادشاہ۔ نغمہ؟ کیسا تھا وہ نغمہ۔

شہرزاد۔ یہ کیسے بتایا جا سکتا ہے کچھ اس طرح کا رہا ہوگا۔

(نغمہ)

فصلِ بہار ہے - ہوا خوش گوار ہے
تیرا انتظار تھا - تیرا انتظار ہے
آسماں پر ماہتاب اور زمیں پہ گلاب
دو نوں ہی ہیں محوِ خواب
تیرے لئے منتظر دل کا خواب زار ہے
فصلِ بہار ہے، ہوا خوش گوار ہے
تیرا انتظار تھا - تیرا انتظار ہے

بادشاہ۔ اگر یہ نغمہ رہا ہوگا تو الہ دین کے دل پر کیا بیتی ہوگی
شہرزاد۔ یہ تو سوچنے کی بات ہے کہ ایسے پُر خلوص مگر نشاط آگیں پیغام کے بعد خوش نصیب الہ دین پر کیا بیتی ہوگی۔
بادشاہ۔ اور جب شہزادی بدرالبدر نے اپنا نغمہ ختم کیا تو پھر کیا ہوا
شہرزاد۔ میرے خیال میں پھر ڈھلتی ہوئی رات کی خاموشی نے ایک نامعلوم سا فردوسی نغمہ چھیڑا ہوگا اور یہ نغمہ۔
بادشاہ۔ اور یہ نغمہ —
شہرزاد۔ عالم پناہ۔ اب تو سحر ہو رہی ہے
بادشاہ۔ بڑی ظالم ہو، اس خوش گوار بات کو پھر کل پہ ٹال رہی ہو۔
شہرزاد۔ خوش گوار بات کو جلد نہ ختم ہونا چاہیئے عالیجاہ۔
بادشاہ۔ اچھی بات ہے۔ میں کل رات پھر ہمہ تن اشتیاق رہوں گا۔ (وقفہ)
راوی :— اور ہر رات کی طرح شہرزاد نے اس مرتبہ بھی اپنی کہانی ادھوری ہی رکھی۔

(وقفہ)

ایک آواز۔ بے شک ایک ہزار ایک کہانیاں بھی ختم ہو سکتی ہیں اور پھر وہ کہانیاں جن میں صرف تخیل کی پرواز سے کام لیا گیا ہو۔
راوی :— الف لیلیٰ کی راتیں۔ ایک ہزار ایک کہانیوں کی رُومانی راتیں۔ جی ہاں جب زمین پہ آنسو ہی آنسو اور کانٹے ہی کانٹے بکھرے ہوں تو کون سی بُری بات ہے۔ اگر ذرا سے سکون کیلئے۔ ذرا سی مسرت کیلئے آسمان کے چاند اور ستاروں میں پناہ ڈھونڈ لی جائے۔

(کورس)

ایک رات - ایک رات
الف لیلیٰ کی رات - پریوں کی جھنڈ کی، دیووں کی بات۔
الف لیلیٰ کی رات —— !!
(ایک نشاطیہ ساز)

ناصر علی خاں

جین پال سارترے

جین پال سارترے Jean Paul Sartre اپنے ہم عصر فرانسیسی ادیبوں میں سب سے زیادہ متنازعہ اور اہم شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا نام اس آخری جنگ عظیم کے بعد سے کسی تعارف یا تعریف کا محتاج نہیں۔ ان کے نئے فلسفۂ وجودیت کا تذکرہ پیرس اور لندن کے ادبی حلقوں اور تنقیدی محفلوں میں بڑی سرگرمی سے ہو رہا ہے۔ تنقیدی دنیا میں ان کے فلسفہ کی اہمیت ابھی مشکوک اور بحث طلب سمجھی جاتی ہے اور اس امر پر ابھی تک کوئی رائے قرار نہیں پائی ہے کہ اُن کے خیالات کا رویہ اور ان کا فلسفیانہ نظریہ انسانی فطرت پر صحیح روشنی ڈالتا ہے یا نہیں اور اس میں کسی شخص کے کردار کو متاثر کرنے اور بدل دینے کی صلاحیت کہاں تک موجود ہے۔ مگر فلسفیانہ پہلو سے قطع نظر سارترے کی تصانیف فنی نقطۂ نظر سے بے حد مقبول اور مشہور ہوئی ہیں۔ وہ اپنی ہنرمندی کاوش سے ادبی دُنیا کو حیران کرتے ہیں۔ ان کا ادبی فن، جسے سارترے نے اپنے فلسفۂ وجودیت کی اشاعت کا آلۂ کار بنایا ہے، ان کے فلسفہ کی طرح اشتعال انگیز اور قوت رفتار حاصل کر کے روز بروز اہم تر ہوتا جا رہا ہے اور اُن کی ادبی کوششوں میں وہ تمام امتیازی خصوصیات موجود ہیں جو اُن کی شہرت کو برقرار رکھیں گی۔

جنگ کے پہلے جین پال پیرس کے ایک اسکول میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ وہ سپاہی کی حیثیت سے فرانسیسی فوج میں بھرتی ہوئے اور سنہ ۱۹۴۰ء میں فرانس کی شکست کے بعد گرفتار ہو کر نو ماہ تک ایک جرمن کیمپ میں رہے۔ اسی قید کے زمانے میں انھوں نے اپنے خیالات کو فلسفہ کی شکل میں منقلب کیا۔ اور فلسفہ کے نئے اصول "وجودیت" کا آغاز کیا۔ ان کی خاص فلسفیانہ تصنیف "وجود اور نیستی" تین برس بعد شائع ہوئی۔ جو تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد اُنھوں نے 'فرنٹ نیشنل' کی قومی تحریک میں حصّہ لیا اور کئی موقعوں پر اپنی جان کھونے سے بال بال بچے۔ اُن کی ایک ناول Nausea اور مختصر افسانوں کا ایک مجموعہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکا تھا مگر اس وقت مقبول نہ ہوا اور ان کی شخصیت گمنام رہی۔ سارترے کی وہ تصنیف جس نے دفعتاً ان کی شہرت کو عروج پر پہونچا دیا۔ Huis Clos تھی جو تمام مغربی دنیا میں بے حد مقبول ہوئی۔ لندن میں Vicious Circle (بدکار حلقہ) کے نام سے بی۔بی۔سی نے یہ کھیل براڈکاسٹ کیا اور اس ڈرامہ نے سارترے کو گمنامی سے نکال کر دفعتاً ساری مغربی دنیا میں مشہور کر دیا۔ جب سے یہ ڈرامہ یورپ کے ملکوں میں شاندار کامیابی سے کھیلا جا چکا ہے۔

منظر: دوزخ کا ایک کمرہ، جہاں نہ دہکتی ہوئی آگ ہے نہ گندھک کی بُو۔ یہ ایک فرانسیسی ہوٹل کا کمرہ ہے۔ ہر طرف گندگی، نحوست اور لعنت برس رہی ہے۔

کردار: ایک بزدل اور مکّار جرنلسٹ جو فوج میں بھرتی ہونے سے جان بچا کر بھاگا ہے۔ جس نے اپنی نیک اور وفاشعار بیوی کی زندگی حرام کر رکھی ہے۔
ایک خوبصورت عورت جو خود اپنی خواہشات کا شکار ہے، اس نے اپنے عاشق کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ایک اور کردار: یہ اپنے ایک رشتہ کے بھائی کو ذہنی اذیت دیتی رہتی ہے اور وہ اس کی سودائی حرکتوں کا شکار ہو کر مر چکا ہے (چوتھا کردار — ایک نوکر — بہت کم سامنے آتا ہے)

اس کھیل میں دکھایا گیا ہے کہ یہ تین بدبخت کس طرح ایک دوسرے کو عذابِ جہنم میں مبتلا کر دیتے ہیں اور آخر ان سنگدلوں پر آشکارا ہوتا ہے کہ دراصل دوزخ — دوسروں کے سوا اور کچھ نہیں اور لعنتِ دوامی، ان کی ابدی صحبت ہے جس سے ان کو کبھی پناہ نہیں مل سکتی۔

. . "دوشیزے گور" اور "فرمانبردار جسیوا" ان کے دو اور مشہور ڈرامے ہیں۔

اگر آپ کسی صبح کو پیرس کے سینٹ جرمین اِسکوائر میں جا کر کیفے دی فلورے نامی ایک میلے کچیلے اور اُجڑے ہوئے ہوٹل میں داخل ہوں تو آپ ایک صاحب سے ملیں گے جو ادھیڑ عمر کے ہیں۔ عینک لگاتے ہیں۔ گندمی رنگ ہے۔ چہرے سے حزن و ملال کے ساتھ سنجیدگی، انکسار اور ہمدردی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اکثر آپ کو مطالعہ یا مباحثہ میں مشغول نظر آئیں گے۔ وہ ادیب اور فلاسفر ہیں اور ان کے زیادہ تر مضامین اور ڈرامے اپنی ریستورانوں میں لکھے جاتے ہیں۔ یہیں وہ اپنے شاگردوں سے مل کر اپنے فلسفہ پر تبادلۂ خیالات کرتے ہیں —— یہ جین پال سارترے ہیں۔ وجودیت کے بانی، فرانس کے سب سے بڑے مفکر —— موجودہ دور کی جمہوریت اور شخصی آزادی، سوشلزم اور عدم مداخلت Laissez Faire مادیت اور نفسیاتی اُلجھنوں کے جامع الاضداد میں سارترے کی وجودیت ایک عملی تصفیہ کا امکان رکھتی ہے۔

سارترے کے فلسفۂ وجودیت کا سلسلہ بعض جرمن فلسفیوں سے ملتا ہے۔ انھوں نے مثالیت کے فلسفی نٹشے (Nietzsche) کے علاوہ دوسرے جرمن مثالیت پسندوں سے اپنے خیالات مستعار کرنے کے بعد انھیں اپنی انفرادی فکر و تخیل سے ان کے منطقی ماحصل میں بدل دیا ہے۔ ان کی "وجودیت" کا کچھ حصہ انیسویں صدی کے صوفی سورن کیرکیگارڈ کے خیالات میں ملتا ہے۔ ہم عصر جرمن فلاسفر مارٹن ہائیڈیگر کا اثر سارترے کے فلسفہ پر بہت گہرا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ارنسٹ رنیان کے منطقی و معقولی طرز تحریر اور نٹشے کی اخلاقیات نے بھی سارترے کو کم متاثر نہیں کیا۔ لیکن سارترے نہ مثالیت پسند ہیں نہ صوفی۔ اُن کا فلسفہ انفرادی آزادی، عمل اور جد و جہد کی حمایت کرتا ہے، وہ اپنے فلسفہ کو 'وجودیت' کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن وجودیت کے اصلی معنی اور اس کی پوری اہمیت خود سارترے کے ذہن میں محفوظ ہے۔ اپنی تصنیف "وجودیت اور نیستی" میں انھوں نے اپنے فلسفہ کی تعریف و تصریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ کتاب اس قدر مشکل اور دقیق ہے کہ صرف ان کے خاص شاگرد ہی اس کو سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ سارترے کے فلسفہ کا بہترین ترجمان ان کا افسانوی فن ہے جس میں وہ اپنے خیالات کو زندگی کے مسائل کے ساتھ اُلجھا کر اپنے جیتے جاگتے کرداروں کی معرفت پیش کرتے ہیں۔

اصطلاحی زیبائش اور فلسفیانہ پیچیدگیوں سے قطع نظر، ان کے فلسفہ کا مرکزی خیال یہ ہے۔

انسان کا وجود ہے۔ لیکن یہ وجود صرف انسانی عمل سے ممکن ہے۔ ڈیکارٹ نے اپنے فلسفہ کی بنا اس اصول پر ڈالی تھی "میں سوچتا ہوں، اس لئے میں ہوں" یعنی فکر و تخیل انسان کا جوہر ہے جو اس کے وجود سے پہلے ہے۔ میرا وجود میری قوت تخیل پر منحصر ہے، کیونکہ اگر میں فرض کر دوں کہ کائنات کی ہر شے محض سراب ہے اور میرے احساسات ناقابلِ اعتبار ہیں کیونکہ وہ اکثر مجھے دھوکا دیتے ہیں، تو بھی میں اس حقیقت سے منکر نہیں ہو سکتا کہ —— میں سوچ رہا ہوں یہی فکر میرا جوہر ہے اور میرے وجود کو ثابت کرتی ہے۔ لیکن سارترے کہتے ہیں "میں عمل کرتا ہوں، اس لئے میں ہوں" سارترے نے اپنا استعدادی فلسفہ "قوت" کی اہمیت پر تجویز کیا ہے۔ انسان عمل کے لئے آزاد ہے۔ لیکن اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لئے اُسے عمل کی ضرورت ہے۔ انسان اپنے کردار کو اپنی خواہش اور قوتِ عمل و ارادی کے مطابق جو چاہے بنا سکتا ہے۔ اور یہ اُس کا ناقابلِ تنسیخ حق ہے۔ تقدیریں کردار کے ساتھ بنتی اور بگڑتی ہیں۔ دراصل انسانی کردار توت کے بعد ہی عیاں ہوتا ہے یعنی فلسفیانہ اصطلاح میں، وجود مقدم ہے اور اصلیت یا جوہر ہستی کے بعد ہی ظاہر ہو سکتا ہے۔ اس لئے کلیسائی تعلیم کے برخلاف، اس نسلی کشمکش میں فتح انہیں کی ہے جو اپنے عمل سے توانا و تیز رفتار ہیں۔ زندگی کے لئے وجود ایک دوہری کشمکش ہے۔ اوّل حیات اور بقا کے لئے۔ اس کے علاوہ جب عمل اور آزادی کی جد و جہد انسانی جوہر ہے، تو انسان اپنی ماہیت کے مطابق عمل نہ کرنے سے نیست و نابود ہو جائے گا۔

سارترے کا یہ فلسفہ اقدام اور فساد کی طرف راغب کرتا ہے، مگر دوسرے نقطۂ نظر سے "وجودیت" ایک للکار ہے جو انفرادیت اور جمہوریت کو اپنی اپنی آزادی کے لئے، پیش دستی کرنے والوں کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کی ترغیب دیتی ہے۔

"بچہ! —— ایک اور شعور، نور کا ایک ننھا سا مرکز جو بند کمرے میں بھٹکتا پھرے گا۔ دیواروں سے ٹکرائے گا اور کبھی ان بندشوں سے آزاد نہ ہو سکے گا۔" نہ زندگی برباد کرتے وقت، نہ زندگی پیدا کرتے وقت، ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ زندگی کا آغاز ایک جسمانی فعل ہے۔ ایک جنسی بھوک اور نفسانی خلش۔ پیدائش خود ایک دھکا ہے۔ بقول آٹو رنیک

Trauma Of Birth ایک جھٹکا سا ہے جس کی شدت کے اثر سے انسانی ساخت جنون اور خبط کی حامل ہو جاتی ہے۔ لیکن آدمی اپنے عمل سے آزاد ہو سکتا ہے "میں اپنے سوا اور کسی کی وفاداری تسلیم نہیں کرتا. ...... اگر میں اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق نہ گزار سکوں تو میرے خیال میں میری زندگی حماقت آمیز ہوگی" اور مختار رہنے کے لیے عمل کی ضرورت ہے۔ لیکن سارترے جس آزادی کا ذکر کرتے ہیں وہ ایک سمجھدار اور صحتمند آدمی کی آزادی ہے۔

سارترے دو تو داعظ ہیں نہ مجتہد۔ نہ وہ رجعت پسند ہیں نہ انقلاب پسند۔ وہ زندگی کی فرسودہ قدروں کی حمایت نہیں کرتے اور نہ وہ سوسائٹی میں کسی اصلاح کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ سارترے ایک زبردست حقیقت نگار اور عملی فلاسفر ہیں۔ وہ حیاتِ انسانی کے ہو بہو نقشے ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ وہ ماہر نفسیات ہیں اور ان کا ہر کردار ایک جداگانہ شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ انھوں نے وقتی مسائل کی اہمیت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ فطرت اور جذباتِ انسانی کے گہرے مطالعہ اور نفسیاتی تحلیل کے اوپر سے مسلح ہو کر حقیقت کو اپنے فسانوی ادب میں تمام فنی خوبیوں اور نزاکتوں کے ساتھ پیش کر دیا۔ عملی زندگی کی تلخ حقیقتوں اور اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کو جس خوبی سے عیاں کیا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ وہ بدی سے اجتناب نہیں کرتے۔ ان کا ادب گناہ، معصیت اور جرم کے کثیف مناظر سے پُر ہونے کے باوجود نفسیاتی خیالات کو مشتعل نہیں کرتا۔ انھوں نے جسمانی اور ذہنی اتصال کی جو غلیظ تصویریں پیش کی ہیں وہ نفسانی جذبات کو متحرک کرنے کے بجائے سوچنے اور شرمندہ ہونے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

یوں تو ہر ادیب اپنے اپنے دور کی زندگی اور تہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لیکن سارترے نے جتنی ہمت اور راست بازی سے ہماری تہذیب کے پردوں کو چاک کر کے ہمارے لاشعور میں گھس کر ہماری دماغی الجھنوں، تحریکوں اور فکروں کو بے نقاب کیا ہے اس کی مثال شائد ہی کہیں ملے۔ وہ آپ کے سامنے موجودہ دورِ شعور کے تمثیلی انسان کی جو برہنہ تصویر پیش کرتے ہیں اسے دیکھ کر آپ لرز جاتے ہیں، سہم کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ لیکن آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ آپ کی اپنی تصویر، آپ کی اصلی شخصیت ہے۔ ہماری بیسویں صدی کی شخصیت، عریاں، بدمست، لالچی، شہوانی جذبات سے مغلوب۔ نشے میں چور۔ اگر ہم کو اپنا بگڑا ہوا چہرہ پہچاننے میں دقت ہوتی ہے تو یہ آئینہ کا قصور نہیں۔ یہ خود فریبی ہے۔ ہم نے جھوٹے اخلاق کی آڑ میں تصنع اور تکلف کو پشت پناہ بنا کر اپنی فرسودہ قدروں کو موجودہ تہذیب کے شوخ مگر کچے رنگوں میں رنگ کر اپنا نصب العین بنا لیا ہے۔ مگر ہماری زندگی ایک بذرِ عدم موجودگی ہے۔ ہم اپنی اوقات کے باہر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمارا مستقبل ——— ؟

سارترے کے فسانوی ادب کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنی کہانی کے مرکزی خیال اور پلاٹ سے ہٹ کر پڑھنے والے کو ذہنی چولوں سے شل کر دیتے ہیں۔ اور اپنے مخصوص معتدانہ بیان اور پُر زور نثر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دردناک بلکہ گھناؤنے، رکیک اور برہنہ مناظر بیان کرنے لگتے ہیں۔ ایک رسالے نے سارترے کی تصانیف میں عیب جوئی کرتے ہوئے انھیں غلاظت کا مرقع قرار دیا اور کہا "سارترے کی کتابیں رذیلوں کی ذہنی زندگی کی نقل اُتارتی ہیں۔ بناوٹی فلسفہ، ذہنی خرابیوں، روگیلے ذوق اور رستا ہوا شہوانیت کا بیمار کُن مرکب ہیں' اور خود بینی کا ایسا عمل جسے کچل کر خوش ہونا چاہیئے" وجودیت کے ثنا خواں ان گالیوں کا جواب یوں دیتے ہیں کہ سارترے صرف ایک ناخوشگوار دُنیا کو آئینہ دکھاتے ہیں جس میں اچھی شکلیں بھی ہیں، بُری بھی، جو جیسی ہو۔ خیر اس بحث میں پڑے بغیر ہم آپ سے صرف اتنا کہتے ہیں۔

جس طرح غلیظ اور بیہودہ باتیں لکھنا آج کل کا فیشن ہے، ایسی باتیں جن کا کوئی نیک مصرف نہیں ہوتا۔ جو صرف حیوانی جذبات کو برانگیختہ کر کے پڑھنے والے کو دماغی عیاشی اور نفسانی خفا کی خطرناک حدوں تک پہونچا دیتی ہیں۔ اسی طرح عریاں ادب کو بیہودہ اور بے مصرف کہنا بھی ایک فیشن ہے "ادب برائے ادب" یا "فن برائے فن" کا اصول تو بحث طلب اور غالباً مبالغہ آمیز ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ جو عریانی آپ کے سامنے کسی مقصد سے پیش کی جاتی ہے اس کی آپ کیوں مذمت کرتے ہیں۔ کسی بک اسٹال پر چلے جایئے اور اُردو کے دس بارہ رسالے جن کی اشاعت سب سے زیادہ ہوتی ہو، اُٹھایئے۔ آپ دیکھیں گے کہ کم از کم پچاس فیصدی رسالے ایسے ہیں جن کے نصف سے زائد حصے جنسی اور بیہودہ اشتہارات سے پُر ہیں۔ جو سراسر مکاری اور دغا بازی کا نمونہ ہیں۔

کیا یہ اشتہارات ہمارے جنسی مسئلوں کو حل کر دیتے ہیں؟ کیا یہ ہماری جسمانی اور دماغی صحت کے لئے مفید ہیں۔ اُن کے اوپر جو غلاظت اور برہنگی اُچھالتے ہیں اپنا احتساب ناول کرنے کے بجائے آپ اُس مصنف کو بُرا کہتے ہیں جو کسی مقصد سے یا اپنی حقیقت نگاری کی دھن میں کوئی عُریاں بات لکھ جاتا ہے۔ ہماری نگاہ میں تو اچھی تصنیف اور اچھے ادب کا معیار یہ ہے کہ اس کو پڑھکر آپ سوچیں۔ آپ کے خیالات ایک منطقی رَو میں بہنے لگیں۔ آپ کے سامنے کسی مسئلہ کے دونوں پہلو پیش کر دئے جائیں اور آپ اپنے دماغ سے اسکا اخلاقی حل نکال سکیں۔

سارترے کے ناول کے بعض حصّے جنھیں اخلاقی نقطۂ نظر سے معیوب سمجھا جائے گا، درحقیقت آپ کو ان ذہنی گلیوں میں لیجاکر نہیں چھوڑ دیتے۔ جہاں آپ بھٹکتے پھریں۔ وہ آپ کو سوچنے اور سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ اپنی اُلجھنوں کا حل آپ اپنے کردار کے مطابق نکال سکیں۔ اس بھول بھلیاں سے نکلنے کی صرف ایک راہ ہے۔ عمل۔ اپنے جوہر کے مطابق عمل، ایسا عمل جو آپ کی استعداد سے واقعی ہم آہنگ ہو۔ سارترے کے کردار خود سوچتے ہیں اور دوسروں کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کی عریانی ایک آئینہ ہے، جس میں وہ سُرابی عکس نہیں دکھائی دیتا، جو اب تک ہمیں دھوکا دیتا رہا ہے۔ بلکہ اصلیت، مصنوعی اخلاق کے پردوں میں چھپی ہوئی تہذیب کی سچی تصویر۔ ہم خود اپنی ایشیائی تہذیب کا ڈھونگ رچاتے رہے ہیں بغز کو تو بھول جایئے۔ ہماری شخصیت وہ بھی جو ان فسادات میں نمایاں ہوئی۔ ہم نے غصّہ کرنے کے جو بہیمانہ طریقے استعمال کئے وہ سوائے اس کے اور کیا تھے کہ ایک لاوا تھا جو پھٹ پڑا، ایک مواد تھا جو ذرا سے نشتر سے بہہ نکلا۔ کیا ہمارے لاشعور کی یہ تحریکیں کسی تخلیقی اور معنی خیز کردار کی طرف اشارہ کرتی ہیں؟ کوئی اس پھوڑے کو دبانا چاہتا ہے۔ کیونکہ اُسے غلاظت سے گھن آتی ہے۔ عریاں ادب اس میں نشتر دینا چاہتا ہے۔ تاکہ اس کا زہریلا فاسد مادہ پھیل کر دوسرے عضو کو بھی نہ سڑا دے۔

آج انسانیت کو جس آزادی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ اُن چار مشہور آزادیوں Four Freedoms کے علاوہ ایک پانچویں اور اہم ترین آزادی ہے "جنونی اضطراب" سے آزادی Neurotic Anxiety، فکر، اندیشے اور تردد سے آزادی' انسانی فضیلت کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسانی بقا کے لئے۔ سارترے نے اپنی ناول "آزادی کی راہیں" میں یہ دکھایا ہے کہ ذہنی ارتقا کے ساتھ، بیسویں صدی کا انسان کس طرح فکروں اور اندیشوں میں مبتلا ہو کر کبھی خبط کی حدوں تک پہونچ جاتا ہے، اور کبھی عمل اور قوت کردار کے سہارے میں شعور کو پہنچ جاتا ہے۔ اور جس طرح سارترے کے کردار بتدریج ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے شعور یا وقوف کی سرحد تک پہونچ جاتے ہیں، اسی طرح خود سارترے کی تصانیف بیسویں صدی کے دورِ شعور کی نمائندگی کرتی ہیں۔ گلبرٹ کانن نے رومین رولینڈ کی شہرۂ آفاق ناول "جین کرسٹوفے" کے متعلق لکھا ہے: "یہ بیسویں صدی کی پہلی اہم کتاب ہے۔ ایک طرح سے یہ بیسویں صدی کا آغاز کرتی ہے۔ یہ دو صدیوں کو ملاکر ماضی اور حال کو آشکارا کرتی ہے، اور مستقبل کو ہمارے لئے کھلا چھوڑ دیتی ہے"۔ سارترے کا ادبی فن اس صدی کا دورِ شباب ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کو سن تمیز تک پہونچا دیا ہے، جہاں وہ اچھا برا سوچ کر اپنے کردار کو بنا یا بگاڑ سکتی ہے۔

Age Of Reason "دورِ شعور" سارترے کی پہلی ناول ہے، جو ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ ان کے سلسلہ وار ناول "آزادی کی راہیں" Roads To Freedom (جو تین حصّوں پر مشتمل ہے) کا پہلا حصّہ ہے۔ لیکن یہ خود ایک مکمل ناول ہے۔ اس پورے ناول کے کردار میونک کے معرکہ سے پہلے، ان دنوں سے لئے گئے ہیں۔ جب اسپین کی لڑائی کی گونجیں ستمبر ۱۹۳۸ء میں پیش آنے والے ہنگامے کی پیشین گوئی کر رہی تھیں۔ دوسری عالمگیر جنگ کے آغاز کو پس منظر بنا کر سارترے نے بین الاقوامی واقعات کو اپنے کرداروں کی ذاتی زندگیوں سے منسلک کیا ہے اور آزادی کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ فرد اپنی زندگی بنانے یا بدلنے کے لئے کس حد تک آزاد ہے۔ جہاں کہیں یہ کردار اُنھیں لے گئے سارترے نے حقیقت کی تلاش میں بلا تعصب اور بے رحم ہو کر ان کے سلوک اور روش کی تفتیش کی ہے۔

پیرس ۱۹۳۸ء کا موسم گرما، نائٹ کلب، طالب علموں کی زندگی، پکچر گیلری اور کیفے ——— سارترے نے اُن تمام مناظر کو اُن کی پوری رونق اور ہماہمی کے ساتھ اپنے دلچسپ طرز بیان سے الفاظ میں اس طرح منعکس کیا ہے۔

لہٰذا اس عصاب ہو بہو تصویر کھنچ جاتی ہے، اور ان ذاتی رشتوں اور تعلقات کے ماحول پر بنیادی واقعات کے اثرات، دھوپ میں کھڑکی کی سلاخوں کے سائے کی طرح، بڑھتے گھٹتے ہیں۔ اس ناول کا عمل صرف دو دنوں کے قلیل زمانے میں مرکوز ہے، لیکن اسی زمانہ میں مصنف نے جس تحقیق اور باریک بینی سے اپنے کرداروں کا تجزیہ کیا ہے وہ ان کی تکنیکی فضیلت اور علمی استعداد کی شاہد ہے۔ ان ۴۸ گھنٹوں میں جو اس ناول کا زمانِ عمل ہیں، کرداروں کی زندگیاں ایک نازک دور سے گزر رہی ہیں۔ وہ زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہیں صحیح راہِ عمل معلوم کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ وقت کی نزاکت ہیرو کو اپنی الجھنوں کا حل تلاش کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی حل کی تلاش میں (جسے وہ چاہتا بھی ہے اور گریز بھی کرتا ہے) وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنی اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے دوچار ہو، بڑھے اور ——— سنِ شعور کو پہونچ جائے۔

ناول کو عموماً دو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے، عرضی اور طولی یعنی Latitudinal اور Longitudinal یا آپ ان کو Biographical اور Cross Sectional بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ جن میں کسی ایک کردار کے عرصۂ حیات کو زمانِ عمل مان کر ناول نگار اپنے دوسرے کرداروں اور کہانی کو اس طرح ہیرو کی ذات سے وابستہ کرتا ہے کہ وہ مرکزی خیال کے تحت میں رہ کر اتحادِ اثر پیدا کریں، اور وہ جن میں وقت کے ایک مختصر قطعے میں پلاٹ کو اس طرح مرکوز کرتے ہیں کہ زمان کی کمی شدّتِ کردار نگاری اور وسعتِ بیان سے پوری ہو جاتی ہے۔ سوانحی ناول کی بہترین مثال رومین رولینڈ کی "جین کرسٹوفے" ہے۔ لیکن سارترے کے مذکورہ بالا ناول دوسری قسم میں آتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ سارترے نے فن اور حقیقت کو اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ ان کی اجمالی عکاسی کا یہ شاہکار زندگی کا آئینہ بن گیا ہے، اور کمال یہ ہے کہ اُن کی ناول میں فنی اتحادِ اثر اس درجہ تک موجود ہے کہ خیالات کی رَو اپنے مرکز سے فلسفیانہ گریز کرنے کے باوجود پڑھنے والے کے ذہن پر ایک مسلسل نقش کھینچتی چلی جاتی ہے۔ تخئیل کے اونچے اور نیچے سُر ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر ایک پیہم گونج کا بن جاتے ہیں جو شروع سے آخر تک دماغ کے گوشوں میں بازگشت کرتی ہے۔

سارترے ایک ادبی جرّاح ہیں، وہ اپنے کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کا ہر کردار ایک تمثیلی اہمیت رکھتا ہے میتھیو ایک فلسفہ کا پروفیسر ہے، جو مالی اور جنسی الجھنوں میں پھنس کر اپنی اور زندگی کی حقیقتوں پر فلسفیانہ غور کرتا ہوا اپنی آزادی کی تلاش میں سنِ شعور حاصل کر لیتا ہے۔ دانئیل کے اعصاب پر تصابی ذوق کا ذوق کا بھوت سوار ہے، وہ اپنے ضمیر کی ملامت سے تنگ آ کر اس مابعد الطبیعاتی نظریہ پر پہونچتا ہے کہ انسان کا جوہر اور وجود صرف ایک فرضی محتسب کی نگرانی پر منحصر ہے۔ مارسل حاملہ ہے۔ وہ اپنے مادرانہ جذبات کو مطمئن کرنا چاہتی ہے، اس لئے کہ اس کا عاشق اس بچہ کا قانونی باپ بننا نہیں چاہتا۔ لولا اپنے شہوی جذبات کا شکار ہے اور بورس کو اپنی محبت میں گرفتار رکھنا چاہتی ہے۔ بورس ابھی کمسن ہے، وہ جنسی تعلقات میں کوئی نفسیاتی حظ نہیں پاتا ہے ان باتوں سے گھن آتی ہے .... اس سلسلہ کی دوسری ناول "التواء" Reprieve میں جنگ کے بادل مذکر کرداروں کی زندگیوں کو اپنے سایہ میں لے لیتے ہیں، اس خاص اور نازک ماحول میں ان کا انفرادی طرزِ عمل ان کے ذاتی کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔ سارترے کی یہ ناول بیانیہ تحریر کا بہترین نمونہ ہے۔

سارترے کے سخت ترین عیب جو بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ مصنف کی حیثیت سے ان میں بے پناہ زورِ بیان اور ناخوشگوار مسائل کو بآسانی پیش کرنے کی جرأت اور صلاحیت موجود ہے۔ انہوں نے حقیقت نگاری اور تحلیلِ نفسی کو تفکر اور تخئیل کے ساتھ سمو کر ایک اچھوتا طرزِ تحریر اختیار کر لیا ہے۔ ان کے کرداروں کے دلوں کی دھڑکن میں آپ اپنے جذبات محسوس کر سکتے ہیں، ان کی الجھنوں میں اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ بس ایک گزارش ہے، ان کی ناول کو ذرا غور سے پڑھئے۔ سارترے کی یہ تصنیف، سارترے کی کوئی تصنیف ایسی نہیں ہے جس کی عریانی اور وحشیانہ بے تکلفی کا مذاق اڑایا جائے، جسے آپ تضیعِ اوقات کے لئے پڑھیں اور دوستوں کی صحبت میں اس پر حرف گیری کریں۔

پریم ناتھ پردیسی

شنکر داس

سورج کی کرنوں کا تانا بانا ڈھیلا ہوتا جا رہا تھا۔ پولو گراؤنڈ کے وسیع میدان میں چناروں کے لمبے لمبے سائے آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے پھیل رہے تھے۔ آسمان پر گلابی نیم گلابی اور قرمزی رنگ کے بادل چھوٹی بڑی ٹولیوں میں یوں پریشان تھے جیسے آنے والی رات سے انہیں ڈر لگ رہا ہو۔ لائیڈز بنک کے سامنے تین ٹانگے کھڑے تھے اور اُن کے کوچوان فٹ پاتھ پر ایک بدصورت خوانچہ فروش سے مخول کر رہے تھے۔ فضا نہ زیادہ خوشگوار تھی نہ زیادہ اداس۔ بس یونہی سی تھی ان دو کے درمیان۔ بینک کی پختہ سیڑھی سے کانوینٹ میں پڑھنے والی لڑکیاں اور سیاہ پوش بہنیں جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی اُتر رہی تھیں اور چوک میں پہنچ کر بڑی احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد گرجے کی طرف جاتی تھیں۔ ساتھ ہی ایک ریڈیو کی دکان کشمیری چھکری سننے کے لئے بے شمار مزدور انتظار کر رہے تھے۔ چھکری اُن کی روح کی غذا تھی۔ جو تھوڑے وقت کے لئے اُن کا احساس افلاس کم کرتی تھی۔ مگر شنکر داس کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چھکری اس کے اجداد کی بھی وراثت تھی۔ لیکن ایسی وراثت جو اُس نے گویا اپنے ہاتھ سے اٹھا کر دوسرے کو بخش دی ہو۔ وہ دکان کے سامنے سرمئی سڑک پہ بے مطلب ٹہل رہا تھا۔ اس کے مدھم سایوں میں اُسے اپنے رنگین ماضی کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس ماضی کی جب اس کی اپنی ایجنسی تھی۔ اپنا کاروبار تھا اور اپنی شہنشاہی تھی۔ جب ہندوستان دو حصوں میں تقسیم نہیں ہوا تھا۔ اور کشمیر بلکہ سیاحوں کی آماجگاہ ہوا کرتا تھا۔ اُن دنوں کتنی چہل پہل ہوا کرتی تھی شہر کے اس حصے میں۔ ہر طرف لال لال انگریز اور مرمریں میمیں۔ بوڑھی اور بدصورت آیائیں۔ دھلے دھلائے کتے اُجلے اُجلے خانساماں اور لوگوں کا ایک ہجوم۔ ہر دکان جنت ہر سڑک فردوس لیکن اب کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں فردوسی سڑکیں صبح سے شام تک فوجی گاڑیوں کی دوڑ دھوپ سے چیخ رہی تھیں۔ کہیں کتے مرتے تھے۔ کہیں ٹانگوں سے ٹکر ہوتی تھی۔ کہیں سائیکل سوار سہمے سہمے سے گزر جاتے تھے۔ غرض تانا بانا لگا رہتا ہے چاروں پہر۔ اب تانگے والے بھی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اور دوکاندار بھی۔ حتیٰ کہ شنکر داس سے ان دنوں دوپہر کا کھانا بھی دوبھر ہو جاتا تھا۔ اب یا تو کبھی کبھی سڑک پر ٹہلا کرتا تھا یا پاس کی دوکان پر جا کر کڑوے تمباکو کا ایک آدھ کش لگا لیتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ دوکان کے مالک سے زمانے کے انقلاب پر چار آنسو بہاتا تھا۔ اسے سیاسی جماعتیں ایک آنکھ بھی نہ بھاتی تھیں۔ جنہوں نے مل ملا کر سارے ہندوستان سے انگریزوں کو نکال دیا تھا۔ اور اب خود حکومت کرتی تھیں۔ پالیسی بناتی تھیں۔ چوراہوں میں قومی جھنڈے گڑھاتی تھیں۔ دفتروں سے فالتو ملازموں کو برطرف کرتی تھیں۔ یا زیادہ سے زیادہ سکیمیں تیار کرواتی تھیں۔ یہ بھی کوئی انقلاب ہوتا ہے۔ جن کی جیبوں سے پیسہ نکلتا تھا۔ انہیں کان پکڑ کر نکال دیا۔ اور جو کنگال تھے۔ انہیں حکومت کی کرسیوں پہ بٹھا لیا۔ وہ بھی اس وقت جب آر پار کے لاکھوں آدمی کٹ گئے۔ شنکر داس بدستور ٹہل رہا تھا۔ اور دور شام ہر لحظہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ریڈیو کی دکان پر میلے اور غلیظ انسانوں کا ہجوم جھوم رہا تھا۔ کبھی کبھی فوجی گاڑی سرمئی سڑک کو چھیلتی ہوئی نکل جاتی تھی۔ تانگے والے پرانی عادت کے مطابق تجسس آمیز نگاہوں سے پھیلتی ہوئی تاریکیوں میں رومان پسند چڑیوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ مگر آج کی تاریکیوں میں رومان کہاں تھا۔ ان میں انقلاب کی سرخی تھی۔ قومی جھنڈوں کا لہراؤ اور آزادی کے دبے دبے ترانے تھے۔ شنکر داس یہ سب کچھ جانتا تھا مگر کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ کہنے کی ممانعت تھی بلکہ اس لئے کہ شنکر داس کے خیال کے مطابق یہ بات کہنے کے لائق نہ تھی۔ لوگوں کی بیشتر تعداد اس انقلاب کو اچھا سمجھتی تھی۔ اور شنکر داس بھی ایسے لوگوں کے

سامنے ہاں میں ہاں ملاتا تھا - مگر یہ ہاں اُس کی روح سے نہیں نکلتی تھی - دانتوں سے چھوٹتی تھی - آج سے کئی سال پیشتر جب وہ انقلاب اور آزادی کی باتیں اپنے انگریز خریداروں سے کرتا تھا - تو وہ تمسخر میں ہنستے ہوئے کہتے تھے یہ گاندھی کا خواب ہے - انگریز اتنے کچے نہیں جو ہندوستان چھوڑ دیں -

شنکرداس دل ہی دل خوش ہو جاتا - انگریز خریدار اس سے مذاق کرتے - تم بہت موٹے ہو - تمہاری توند شراب کے بیرل کی طرح پھولی ہوئی ہے - شنکرداس کو اس پر مطلق ملال نہ ہوتا - بلکہ وہ یہ سُن کر اور خوش ہوتا - کہ خریدار اس سے بے تکلف ہو رہے ہیں - اور دکانداری کے اصول کے مطابق بے تکلف خریداروں سے منہ مانگی قیمتیں ملتی ہیں - وہ ظاہرداری کے لئے اپنا چھوٹا سا ہاتھ توند پر پھیلا کر کہتا - یہ گوشت نہیں ہے صاحب ایک بیماری ہے جسے ہم لوگ ماس کہتے ہیں (Flesh Fat) اس پر کوئی اعتبار نہیں - اور اسی لئے میں ہر صبح پانچ میل کا چکر لگا آتا ہوں -

انگریز خریدار اس کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے - گردن پر پھیرتے - سینے پر پھیرتے - اور لٹکتے ہوئے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے ہاتھوں میں لے کر ہنسنے لگتے - یہ (Flesh Fat) نہیں اصل چربی ہے - وہی چربی جو سؤر میں ہوتی ہے - شنکرداس اس پر قہقہہ لگاتا - انگریز بڑے ظریف ہوتے ہیں - اس کے قہقہے کے بیچ میں الفاظ خود بخود نکل جاتے -

کچھ خریدار ایسے بھی تھے جو اس کی تصویریں لیتے تھے - تاکہ ولایت میں اپنے دوستوں کو تحفے کے طور پر بھیج سکیں - اور کچھ ایسے تھے جو اس سے مذاق کرنے کے لئے ہی اُس کے خریدار بن چکے تھے - اور شنکرداس دونوں سے مطمئن تھا - لیکن اب اس ماضی کا ورق ہی الٹ گیا تھا - اب نہ وہ خریدار رہے تھے نہ وہ بے تکلفیاں تھیں - اب شنکرداس سارا سارا دن دکان میں پڑا رہتا - جس سے اس کی مذاق پسند روح مرچکی تھی - اور اس کی جگہ بے پناہ سنجیدگی نے لے لی تھی -

سامنے پھیلے ہوئے میدان میں اندھیرا چھا گیا - سڑک کی بتیاں یکایک جگمگا اٹھیں - سرمئی سڑکوں پر پھیلی ہوئی تاریکیاں ایسے بھاگ گئیں جیسے راہ چلتی جوان لڑکیاں کالج کے چھوکروں کو دیکھ کر جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی بھاگ جاتی ہیں - شنکرداس ماضی کے بھنور سے نکل کر حال کے گرداب میں آگیا - اُس کی کھلی دُکان میں اندھیرا تھا - جس کے نیچے اس کے تمام شوکیس دب گئے تھے - حتےٰ کہ دکان کا سائن بورڈ پڑھا نہیں جاتا تھا - وہ آہستہ آہستہ دکان کی سیڑھیاں چڑھا - اُسے دکان میں داخل ہوتے ہوئے نامحسوس قسم کا خوف سا آنے لگا - اتنا اندھیرا آج تک کبھی اس کی دکان میں نہ تھا - سرشام ہی وہ آدھ درجن بتیاں جلا لیتا تھا - اور ساری دکان چمک اٹھتی تھی - مگر آج اُسے اس اندھیرے کا بھی افسوس نہ تھا - دکان کی آرائش ہوتی ہے - خریدار کی توجہ اپنی طرف پھیرنے کے لئے جب خریدار ہی نہ ہوں تو آرائش کس لئے؟ پھر بھی اس کا بھرا بھرا ہاتھ بے اختیاری کے عالم میں سُوئچ کی طرف اُٹھا - دکان کے وسط کی ایک بتی جل اٹھی - شوکیسوں میں رکھی ہوئی چیزیں نظر آنے لگیں - لیکن اس پر بھی مایوسیاں تھیں ان کی رُوح بھی شنکرداس کی طرح مرچکی تھی -

تقسیم ہند سے دنیا نے لاکھوں انسانوں کا بہتا خون دیکھ لیا تھا لیکن ان چیزوں کا خون شنکرداس کے سوا اور کوئی نہ دیکھ سکا تھا - یہ خون اب بھی اس دکان میں بکھرا پڑا تھا - منجمد ہو چکا تھا - دکان کی دیواروں پر اس کے نقوش تھے - خود شنکرداس کے بدن پر - گوشت پر - آنکھوں میں اس کی چھینٹیں تھیں - مگر دیکھنے اور سمجھنے والا صرف ایک تھا شنکرداس! اور جب بھی اسے اس کا احساس ہوتا تھا - اس کے محدود ذہن میں ایک عظیم دنیا بس جاتی تھی - اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کرکے خریدار گھومنے لگتے تھے - مسز پارکر - کیپٹن چارلس - تیل کی کمپنی کا جنرل منیجر رینالڈ - مس بہاؤن جو ہمیشہ اسے موٹا آدمی کہہ کر پکارتی تھی - اور اسے دیکھ کر قہقہے لگاتی تھی اور یہی بہت سے - جو سب کے سب اس کا موٹاپن دیکھ کر ہنستے تھے اس کی چھاتی کا گوشت ٹٹولتے تھے - اس کی تصویریں اتارتے تھے - اور اس کی بے پناہ چربی پر عش عش کر اٹھتے تھے - مگر شنکرداس کو ان کا مذاق کبھی برا نہیں لگا اس مذاق کے پیچھے سکے ہوتے تھے - بنک کے نام چیکیں ہوتی تھیں - بخششیں اور انعامات ہوتے تھے - تانگے والے گھوڑوں اور مالکوں کو گالیاں دیتے ہوئے چلے گئے - سڑک کی خاموشی میں اضافہ ہوا - سامنے کے کھمبے کی بتی کئی دنوں سے فیوز ہو گئی تھی - اور کوئی اس کی طرف توجہ نہ دیتا تھا - اگلا سا زمانہ ہوتا - تو انگریز سیاحوں کی سہولیت کے لئے اُسی دن نئی بتی لگائی ہوتی - مگر یہ آزادی کا زمانہ تھا - اور انگریز جا چکے تھے - شنکرداس نے کئی بار دکان بڑھانے کا ارادہ کیا - لیکن ہر بار ایک موہوم سی امید

اس کے آگے کھڑی ہو گئی۔ آنے والا کوئی نہ تھا۔ پھر بھی شنکر داس کو انتظار تھا۔ وہ بار بار سڑک کی طرف دیکھتا تھا۔ اور بار بار اس کی نظریں پلٹ کر ہونٹوں میں شرمندگی کا احساس لئے چھپ جاتی تھیں۔ اُسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ کون آئے گا۔ لیکن دکان کی بے جان اور بے روح چیزیں جیسے اسے کہتی تھیں۔ تھوڑی دیر اور انتظار کرو شاید کوئی خریدار آجائے اور ہم سب کو ان شوکیسوں کی قید سے چھڑا کر لے جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد دو فوجی سپاہی دکان کے آگے کھڑے ہو گئے۔ شاید وہ کسی کا انتظار کر رہے تھے جو اُن سے پیچھے رہ گیا تھا۔ معاً ان میں سے ایک کی نظر شنکر داس پر پڑی۔ اُس نے چپکے سے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور دونوں بے اختیار ہو کر ہنسنے لگے۔

شنکر داس انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کیا بات ہے۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر اُن سے پوچھا۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک نے ہنستے ہنستے ہی جواب دیا۔

آیئے اوپر آیئے۔ دکان ابھی کھلی ہے۔

دونوں دکان پر چڑھے اور ہنسنے ہی کے انداز میں شوکیسوں کی طرف دیکھنے لگے۔

یہ بڑی پرانی دکان ہے۔ آج سے ۴۰ سال پہلے کی۔ جب سول لائنز میں کوئی دکان ہی نہ تھی۔ شنکر داس نے اپنے ماضی کے ورق الٹتے ہوئے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔

آپ اس کے مالک ہیں؟ ایک نے پوچھا اور دوسرے نے ہنسنا شروع کیا۔

ہاں ہاں۔ آپ فرمایئے کیا چیز چاہئے آپ کو۔ مجھے معلوم ہے فوجی ہمیشہ اچھا تیل خریدتے ہیں۔ عطر خریدتے ہیں۔ صابن خریدتے ہیں۔ یہ دیکھئے گلاب کا عطر ہے اور یہ .....

ایک جوان ہنسی کو ضبط کرنے کے لئے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور دوسرے نے پوچھا۔ آپ یہیں کے رہنے والے ہیں۔

شنکر داس نے فوراً جواب دیا۔ ہاں یہیں کا ہوں۔ میرا گھر یہاں سے صرف دو میل دُور ہے۔ اتنے میں ان کے دو ساتھی اور آگئے۔ اور دکان پر چڑھے ہوئے جوان ہنستے ہنستے سڑک پر آگئے ان میں سے ایک نے آنے والے دو ساتھیوں کو شنکر داس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ انگریزی میں کہا دیکھتے ہو کتنا موٹا ہے۔ جیسا جنگلی سؤر۔

چاروں کھلکھلا کر ہنس پڑے اور چلے گئے۔

شنکر داس کا چہرہ غصے سے تلملا اٹھا۔ جیسے اس کی گردن میں پھندا ڈالا گیا ہو۔ اُسے محسوس ہوا جیسے شوکیس کی تمام چیزیں غصے میں کانپ رہی ہوں۔ اس نے جلد جلد سوئچ دبا کر بجلی بجھا دی۔ اور چھپے ہوئے اندھیرے میں اپنے ہونٹ چبانے لگا۔

پوربی بنگال سے آئے ہوئے بے گھر لوگوں کی آبادکاری

پارلیمنٹ میں مولوی واجد علی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے وزارت امور خارجہ کے ڈپٹی منسٹر ڈاکٹر بی۔ وی کیسکر نے کہا کہ بھارت سرکار کو جو تازہ ترین اطلاع ملی ہے اس کے مطابق تقسیم کی تاریخ سے لے کر ۱۹۵۰ء کے اختتام تک پوربی بنگال سے آئے ہوئے بے گھر لوگوں پر پچھمی بنگال اور آسام میں آباد کرنے کے لئے ۱۴ کروڑ ۶۶ لاکھ ۳۹ ہزار روپیہ خرچ کیا جا چکا ہے۔

مذکورہ رقم کے علاوہ واپس ہونے والے بے گھر مسلمانوں کی امداد اور آبادکاری کے سلسلے میں مغربی بنگال میں آخر نومبر ۱۹۵۰ء تک ۶ لاکھ روپیہ اور آخر جنوری ۱۹۵۱ء تک آسام میں ۲۵ لاکھ ۱۰ ہزار روپیہ صرف کیا جا چکا ہے۔

اعجاز حمید اعظمی

مختصر افسانہ

مختصر افسانے کی مختلف تعریفیں قرار دی گئی ہیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی کوئی جامع تعریف جس پر اکثریت متفق ہو اب تک وجود میں نہیں آئی۔ ایک نقاد کی یہ رائے ہے کہ "افسانہ وہ ہے جو آدھ گھنٹہ سے لیکر ایک گھنٹہ تک پڑھا جائے"۔ دوسرے کا خیال ہے کہ "افسانہ وہ ہے جو تم اسے بنانا چاہو"۔ اور بقول مجنوں "افسانہ نام ہے واقعہ کو تخیل کے رنگ میں رنگ کر حسب مراد بنانے کا"۔ ان تمام مثالوں سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان نقادوں کے نظریوں میں نہ تو کہیں اتحاد ہے اور نہ یہ کسی نقطہ پر متفق ہیں۔ لیکن افسانہ کی ایک خصوصیت پر اکثر نقاد متفق ہیں کہ "افسانے کا میدان نہایت وسیع اور اس کے موضوع محدود نہیں ہیں۔"

مجنوں گورکھپوری کا یہ دعویٰ کہ اگر یہ سوال کہ افسانہ کیا ہے شہرزاد سے کیا جاتا تو وہ ایک بار تو آپ کا منہ دیکھتی اور پھر شاید یہ کہتی "مجھے موت کی گھڑی کو ٹالتے رہنا ہے، اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتی کہ افسانہ کیا ہے اور کس واسطے ہے" افسانے کی ایک نہایت اچھوتی اور مکمل تعریف ہے۔ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ شہرزاد کے حزن و یاس سے لبریز دل کی یہ آواز خود ایک المیہ افسانہ ہے۔ اور اس قسم کے دیگر وہ تمام واقعات اور سارے موضوع جن کے اسلوب میں ذرا سی بھی شیرینی و دلکشی ہو ایک جیتے جاگتے افسانے ہیں۔ اس سلسلہ میں مثال کے طور پر اتنا کہہ دینا اور بھی کافی ہوگا کہ روزمرہ زندگی کے معمولی حالات اور واقعات جب فداموزوں و دلکش لب و لہجہ اور زبان میں بیان کئے جاتے ہیں تو اکثر ہماری زبان سے خود بخود یہ مصرع نکل جاتا ہے۔ ع

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

اب اس سے زیادہ افسانے کی تعریف بھلا کیا کی جا سکتی ہے اور یہاں وہ مثال کہ "افسانہ وہ ہے جو تم اسے بنانا چاہو" کافی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔ افسانویت اور رنگینی کے بغیر احساسات، جذبات یا واقعات ایک ٹھوس اور تلخ حقیقت ہیں۔

لیکن اس ایک خصوصیت کی بنا پر جس پر کہ اکثر نقاد متفق بھی ہیں کہ افسانے کا میدان نہایت وسیع اور اس کے موضوع محدود ہیں اور یہ حیات انسانی کے ہر پہلو کا جیسا مطالعہ اور انکشاف کرتا ہے وہ نہ شاعری میں ممکن ہے، نہ تمثیل میں اور نہ کسی اور صنف ادب میں، ماہرین فن نے افسانے کو ادبِ عالیہ کا درجہ دیا ہے۔ اور یہ بھی عام طور سے مان لیا گیا ہے کہ جہاں مختصر افسانے سے جی بہلتا ہے اور تکان دور ہوتی ہے وہاں یہ ایک کارآمد مشغلہ بھی ہے۔ مختصر افسانے کے ذریعے سے سماج کی جس قدر خدمت اور اصلاح ممکن ہے کوئی دوسری صنف ادب مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ اس مشغلے کو اختیار کر کے خود افسانہ نگار بہت سے ادبی نکتوں پر عبور حاصل کر سکتا ہے اور صرف اسی ایک صنف ادب کے ذریعے وہ انسانوں کی بہت بڑی تعداد تک پہنچ سکتا ہے۔ پھر چونکہ افسانہ اچھا ہو یا برا دیگر اصناف ادب سے زیادہ پڑھا بھی جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پڑھنے والے کی پوری توجہ جذب کر لینے میں بھی فوقیت رکھتا ہے اس لئے اس کی یہ خصوصیت بھی اسے مکمل فن کے درجے تک پہنچا دینے کی ذمہ دار ہے۔ اور اسی لئے افسانہ نگار کو اوروں پر برتری بھی حاصل ہے مگر اہل الرائے کا یہ بھی کہنا ہے کہ افسانے کی یہ عام مقبولیت سماج کا اخلاق و مذاق بگاڑنے کا سبب بھی بن سکتی ہے تو اس سلسلہ میں میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ یہ خطرہ سبھی اصناف ادب سے ہے اور اس کا علاج صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ادنیٰ ادب خواہ وہ افسانہ ہو خواہ نظم و غزل اشاعت نہ پا سکے۔ صرف افسانہ ہی کو مطعون کرنا ٹھیک نہیں۔

افسانہ اولاً لکھنے والوں کی انفرادیت کا اظہار ہے۔ افسانہ نگار

غیر محسوس اور لاشعوری طور پر زندگی کے متعلق ایک نقطۂ نظر بناتا ہے اور پھر اپنے تجربہ و احساس کے مطابق انسانوں اور سماج کے ساتھ سلوک اور عمل کا ایک جدا انداز ایک نیا طرز قائم کرتا ہے اور اسی نقطۂ نظر کے تحت اپنے احساس و تجربہ کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ اور اس طرح افسانہ نگار جو چیز تخلیق کرتا ہے وہ اس کی انفرادیت کی حامل بھی ہوتی ہے اور سماج اور دوسرے عام انسانوں پر بھی لاگو ہوتی ہے ا کا تخیل صحیح معنوں میں اخلاق ہوتا ہے۔ وہ عمومی زندگی کو خود اپنی انفرادیت میں چلا دے کر دیکھتا ہے۔ اور جب موضوع اور واقعات کے انتخاب میں عوام کے لئے کوئی اجنبیت نہیں ہوتی' افسانہ زمانہ ماحول اور معاشرت کے مطابق ہوتا ہے پھر افسانہ نگار ایک سچے صناع کی طرح اپنے تخیل کی تمام وسعتوں اور شدتوں کے ساتھ وقت و مقام کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے دلچسپ اور پُر زور انداز سے الفاظ میں ڈھال دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اکثر و بیشتر پڑھنے والے اسے اس کی سرگزشت یا اپنی روداد سمجھنے لگتے ہیں اور یہاں اس کا فن اپنی انتہائی بلندیوں پر جلوہ نما ہوتا ہے۔ اور یہ سب اس کے تخیل کی وسعت اور شدت کی برکتیں ہیں۔ اس لئے کہ اس کا تخیل دوسروں سے کہیں زیادہ ہمہ گیر' ذکی اور دُور رس ہوتا ہے۔ اس کے فن میں خارجیت (Objectivity) اور واقفیت شاعر یا مصور سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور پھر اس کی ذمہ داری اس کی انکشافی قوت (Renealing Power) قوت پر بھی بہت کچھ ہوتی ہے جو دوسروں کے یہاں بہت کم ہوتی ہے اور یہی چیزیں اُسے دوسروں پر برتری دیتی ہیں۔

جدید افسانہ گوناگوں خیالات' نظریات' جذبات اور احساسات کا ایک مرقع ہے۔ اور چونکہ آجکل خاص طور پر افسانے کا میدان عمل زیادہ تر نفسیات قرار دیا گیا ہے جس کی ابتدا انگریزی ادب میں جارج ایلیٹ اور میریڈتھ سے ہو چکی ہے لہذا انسانی نفسیات کی ہر ذرا سی بات معمولی سانحہ اور اس کا ہر پہلو افسانہ بن سکتا ہے۔ افسانے میں متعدد کردار بھی ہو سکتے ہیں اور صرف ایک ہی کردار بھی۔ پھر اس ایک کردار کے کسی ایک احساس یا جذبے کی شرح و تجزیہ بھی افسانہ بن سکتا ہے کسی احساس کی تاویل و تحلیل بھی افسانہ ہو جاتی ہے۔ افسانہ میں ماجرا اور کہانی بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی۔ اس لئے کردار کشی اور نفسیاتی تجزیہ ہی افسانے کے نمایاں خد و خال ہیں۔

اردو زبان میں قصہ و حکایات تو ایک زمانہ سے موجود ہیں جو اُسے عربی' فارسی اور ہندی سے جوں کے توں مل گئے تھے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جو "فورٹ ولیم کالج" یا "ڈاکٹر گلکرائسٹ" کا دور کہا جاتا ہے اور اسی وقت سے انگریزی زبان کے اثر کی وجہ سے اردو میں بھی مغرب کے ترقی یافتہ ناولوں کی نقل ہونی شروع ہوئی۔ لیکن اس نقل و ترجمے پر ابھی اچھی طرح سے پوری ایک نسل بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ ناول نویسی غائب اور مختصر افسانہ متعارف ہو گیا۔ ان مرحلوں میں کہاں تک ربط و تسلسل ہے؟ اور یہ ارتقا کی کڑیاں کہاں تک ایک دوسرے سے منسلک ہیں؟ ماہرینِ فن کے لئے یہ ایک غور طلب امر ہے۔

یورپ کے نقاد طویل ناول اور مختصر افسانے کو جُدا اور بالکل آزاد و بے تعلق مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دونوں کے فن و تکنیک ایک دوسرے سے قطعی علیحدہ اور بے پروا ہیں۔ اور ناول نویسی کے مقابلے میں مختصر افسانہ لکھنا زیادہ مشکل اور کٹھن بھی ہے۔ لیکن خلاف اس کے اردو کے لکھنے والے ناول نویسی کو ترک کر کے افسانہ نویسی کی طرف اس طرح دوڑ پڑے جیسے افسانہ نویسی سہل ترین ادبی مشغلہ ہو۔ اور میرا خیال تو یہ ہے کہ شاید افسانہ کو انہوں نے مختصر ناول سمجھا۔ اس کی وجہ سے جو خرابیاں اور خامیاں پیدا ہوئیں وہ ہمیں پریم چند سے پیشتر کے سبھی لکھنے والوں میں کچھ نہ کچھ نظر آتی ہیں۔

اردو افسانہ نویسی کی موجودہ شکل بہت حد تک اردو کی قدیم داستان گوئی' ناول نویسی اور دوسرے قسم کے قصوں کی مرہون منت ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے بنانے' سنوارنے اور ترقی دینے میں مغربی افسانوں اور خاص طور پر رُوسی' ترکی' انگریزی اور فرانسیسی افسانوں کا شاندار حصہ ہے۔ اور اب تک ان میں زبانوں کی افسانہ نگاری کی مدد سے نئے نئے فنی اور تکنیکی تجربات کئے گئے ہیں اور کئے جا رہے ہیں اور خاصی کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے گو کہ ابھی اردو افسانہ میں (Originality) پیدا ہونے میں بہت دیر ہے پھر بھی اس بات سے انکار کرنا گناہ کے مترادف ہوگا کہ ان چند سالوں میں اردو افسانہ نگاری نے بڑی ترقی کر لی ہے اور

زبان میں بھی بعض ایسے افسانے لکھے گئے ہیں جو غیر ممالک کے افسانوں کے مقابلہ میں بہت آسانی سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں دلکشی، رعنائی اور موسیقیت کے ساتھ ساتھ تحلیل نفسی، فضائی کیفیت، بے جھجک واقفیت، تلوار کے مانند تیز اور چبھتی ہوئی حقیقت نگاری، رمزیت اور اشاریت سبھی کچھ ملتا ہے۔ اور اس کے باوجود ہمیں جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں مغربی افسانوں کا بہت کچھ احسان مند ہونا چاہیئے۔

پریم چند، دسنیاز فتح پوری سے لے کر کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی تک دیکھ جائیے آپ کو افسانہ نگاروں کا ایک جم غفیر نظر آئے گا۔ لیکن ان میں سے چند ہی ایسے ہیں جنہیں بڑا افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے جنہوں نے زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع اور گہری نظر سے کیا اور اپنے شاہکاروں کو خلوص کی آنچ اور فنی ریاض کے ساتھ پیش کیا وہ تو واقعی بڑے افسانہ نگاروں کی صف میں آئے اور صرف انہیں کی جگہ ادب میں متعین ہو سکی لیکن جن سے یہ ریاضت و مشقت اور جانفشانی برداشت نہ ہو سکی وہ پیچھے چھوٹ گئے۔ ان فنکاروں نے سیاسی، معاشی، اخلاقی معاشرتی، نفسیاتی، جنسی، فلسفیانہ ہر قسم کے افسانے لکھے ہیں جن میں سماجی مسائل کی عکاسی، صحت مند اور تندرست جنسیت، اور فنکارانہ انداز کا حسین اور متوازن امتزاج نظر آتا ہے۔ اور اس میں کافی حد تک چیخوف کی کیفیات و احساسات، موپاساں کی بے رحم اور بے لاگ حقیقت نگاری، کارل مارکس کی اشتراکیت اور اقتصادیات، لارنس سومرسٹ مام اور جیمس جوائس کے فنی انداز اور فرائڈ کے جنسی نظریے کا بھی اثر ہے۔ میں اسے برا نہیں سمجھتا بلکہ اس طرح اپنے فنکاروں کے مطالعہ کی وسعت، گہرائی اور صحت مند اثر کو قبول کرنے کی صلاحیت کی قدر کرتا ہوں لیکن فن کی حد تک اور جہاں تک یہاں کے مقامی رنگ اور حقیقی روح اور مزاج کو ٹھیس نہ پہنچے۔ افسانوں میں جنسی چھینٹوں سے کام لینا بھی برا نہیں۔ عریانی ایک فن ہے اور صرف فن کی حد تک جائز ہے۔ لیکن جب یہی فن کی حدود سے آگے نکل کر لذتیت اور جنسی تشنگی کا احساس پیدا کر دیتی ہے تو ناقابل برداشت ہے۔

اس تمام بحث سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہمارے افسانوی ادب میں کوتاہیاں اور خامیاں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ ضرور ہیں اور بہت ہیں۔ اور بالکل اسی طرح ہیں جس طرح ادب کے دوسرے اصناف میں نظر آتی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح اردو میں حشرات الارض کی طرح شاعر پیدا ہوئے بالکل اسی طرح افسانہ نگار بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اس فن کو سہل ترین ادبی مشغلہ سمجھا اور شہرت و ناموری کی دھن میں اپنی زبان و محاورے سے بے خبری اور لاعلمی کے باعث جاندار، توانا اور صحت مند ادب پیش کرنے کے بجائے جذباتی دلدل اور سستی ونشہ آور رومانیت میں الجھ کر رہ گئے اور انہوں نے نہ صرف اس فن کو بلکہ زبان اور انشا تک کو دانستہ پامال کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اور اس تباہی کی ذمہ داری بہت کچھ فلمی اور بازاری رسائل پر بھی ہے جو ادب نوازی کا بے جا ڈھونگ رچا کر صرف تجارتی مقاصد کے پیش نظر ایسے ادنیٰ افسانوں کو بڑی دھوم دھام سے شائع کرتے ہیں اس لئے کہ ان کی (Market Value) زیادہ ہے۔ پھر بھی ہمیں اتنا اطمینان ضرور ہے کہ ایسے افسانوں اور ان کے لکھنے والوں کی ادب کی پچھلی صف تک میں نہ تو اس وقت کوئی جگہ ہے اور نہ آیندہ ہو سکتی ہے اور یہ بہت جلد تھک اور ہار کر اپنی موت خود ہی مر جائیں گے۔

ان باتوں کے باوجود اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو افسانہ نگاری کا فن ابھی نوجوانی کی منزل میں ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس زبان میں جدید قسم کی افسانہ نگاری اس وقت شروع ہوئی جبکہ مغربی ممالک میں وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ اس لئے اس کے اندر ابھی اپج کی کافی گنجائش ہے۔ اس زبان میں یورپ کی تمام فنی تکنیک کو اپنا لینے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کروں گا۔ وہ یہ کہ اب وطن آزاد ہو چکا ہے اب قومی اور ملکی تعمیر کا مسئلہ درپیش ہے جس میں یہاں کے فنکاروں کا زیادہ حصہ ہونا چاہیئے۔ ان کا پہلا فرض قومی اخلاق کی قدروں کو پھر سے قائم کرنا ہے۔ اوہام پرستی کے طلسم کو توڑنا، سماج کو اخلاقی پستی کی لعنت سے چھٹکارا دلانا بھی بڑا اہم کام ہے۔ انہیں صحیح معنوں میں ہندوستان کا معمار بننا ہے۔ اور اس کے لئے لازمی ہے کہ ہمارے افسانوں میں یہاں کا مقامی رنگ اور حقیقی روح اور مزاج کا تصور اور ہندوستانی عوام کی زندگی کا ہر باریک پہلو سچائی و خلوص اور تخیلی و نفسیاتی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ اجاگر ہو۔

اولاد احمد صدیقی

برٹرنڈرسل

سنہ ۱۹۵۰ء کا ادبیات کا نوبل پرائز برٹرنڈرسل کو دیا گیا ہے۔ یہ اُن کی اُن خدمات کے صلے میں ہے جو اُنہوں نے انسانیت کے بقا کے لئے انجام دیں۔ رسل موجودہ مصنفین میں سب سے زیادہ موجودہ تہذیب سے غیر مطمئن ہیں۔ وہ بعض اصول اور نظریات کے تحت سماجی و معاشی نظام کو پرکھنے کے خلاف ہیں۔ اور ایک آزاد نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ وہ فرد کی ہر حال میں آزادی کو سراہتے ہیں اور اس سماج کے خلاف ہیں جو اسے اپنے موافق بنانا چاہتی ہے۔ وہ سائنس اور صنعتیت پر ایمان رکھتے ہیں اور یہی ان کے خیال میں موجودہ دَور کو دَورِ وسطیٰ اور دَورِ قدیم سے ممتاز کرتے ہیں لیکن اس تہذیب میں ان عالمگیر انسانی قدروں سے بھی انحراف کیا گیا ہے جن کے بغیر ایک صحت مند اور ترقی یافتہ سماج کی تشکیل ممکن نہیں۔

رسل سنہ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ گیارہ برس کی عمر سے ریاضی سے دلچسپی پیدا ہوئی اور مدت تک یہ سمجھتے رہے کہ ریاضی اور سائنس کے ذریعہ انسانیت کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ پھر فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہوئی اور "فلسفیانہ نقطۂ نظر" زندگی کے لئے ضروری معلوم ہوا۔ رفتہ رفتہ اس کا انکشاف ہوا کہ کسی ایک علم کے ذریعے سے انسانیت کی خدمت نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ سیاسیات، معاشیات، سائیکالوجی اور تعلیم یکجا طور پر کوئی قابلِ قبول نظریۂ حیات مہیا کر سکتے ہیں۔ سیاسیات سے دلچسپی پیدا ہوئی تو عملی زندگی میں اسے برتنے کا احساس ہوا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں عورتوں کی رائے دہندگی کی جد و جہد میں عملی طور پر حصہ لیا۔ پھر جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ مختلف ملکوں نے جو پالیسی اختیار کی تھی، اس سے رسل نے آنے والے خطرہ کا اندازہ کر لیا تھا۔ جنگ کے دوران میں انہوں نے اپنے آپ کو بھرتی کرا لیا اور لڑائی میں حصہ لیا۔ جنگ کے ختم پر پھر لکھنے کی طرف واپس لوٹے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں روس گئے اور وہاں دور دراز حصوں کی سیر کی۔ لینن سے بھی ملے، مگر اس نظام سے متاثر نہ ہو سکے جس کی بنیاد اس کے ہاتھوں پڑ رہی تھی۔ اس کے بعد مشرقی تہذیب کو دیکھنے کے لئے چین گئے۔ روس میں انہیں مغربی صنعتیت کے مقابلے میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوا۔ اور وہاں بھی انہی اصول کی کارفرمائی دیکھی جو مغربی صنعتیت کی مخصوص صفات تھیں۔ چین نے اس کے خلاف اپنی قدیم تہذیب کو برقرار رکھا تھا۔ وہ چینی طرزِ زندگی سے بہت متاثر ہوئے اور اس میں ان انسانی قدروں کی نشو و نما دیکھی جو صنعت زدہ مغربی ممالک سے غائب ہو چکی تھیں۔ چینیوں کا صلح کل مزاج، ان کے اطوار اور خوش خلقی ایک اخلاقی مجموعۂ قوانین، ان کی انفرادیت پسندی، شاعرانہ مزاج اور شریفانہ فطرت، ان سب کا ان پر بہت گہرا اثر پڑا۔ انسانی شخصیت کو جو درجہ چینیوں نے دیا ہے اس میں انہیں ساری انسانیت کی نجات نظر آئی۔ وہ چین سے انسانی قدروں پر ایمان اور انسانیت پر یقین کامل لے کر آئے۔

رسل دراصل کسی مدرسۂ فکر کے پابند نہیں۔ انہیں خاص مسلک (Isms) سے چڑ ہے۔ وہ انفرادیت پسند ہیں اور اس نظام کے خلاف ہیں جو انفرادیت کا خاتمہ کر دے۔ وہ فرد کو مکمل آزادی دینا چاہتے ہیں تاکہ انسانی شخصیت کی ترقی نہ رک جائے وہ ہر شخص کے لئے زندگی گزارنے کے لئے ایک رقم مقرر کرنا چاہتے ہیں تاکہ کسی دباؤ سے آدمی کام کرنے پر مجبور نہ ہو۔ اس طرح سے لوگ کام کرنے میں فخر محسوس کریں گے۔ ظاہر ہے کوئی نظام کامیاب نہیں کہا جا سکتا جو افراد کو مطمئن اور بامراد نہ دیکھے آزادی کی حالت سے سماج کی حالت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مگر فرد کو اس کی حالت پر چھوڑ دینا کوئی مستحسن کام نہیں۔ اچھے افراد اچھے سماج میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے اچھے سماج کی تشکیل کی کوشش نامبارک نہیں کی جا سکتی۔

رسل موجودہ تہذیب سے بیزار ہیں - وہ اشتراکیت اور سرمایہ داری میں کوئی فرق نہیں پاتے - اس لئے دونوں میں سے انتخاب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - وہ سرمایہ داری کو اشتراکیت پر ترجیح دیتے ہیں - اس لئے کہ ان کے خیال میں سرمایہ داری فرد کی آزادی کا احترام کرتی ہے، اور اشتراکیت اس کو سماج کا تابع بناتی ہے - ان کی رائے ہے کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری میں باہم مشابہت ہے - ابتدائی زمانہ میں دونوں بلحاظ طویل کام کے اوقات کم مزدوری - اسٹرائیک کو ممنوع قرار دینا - اور مزدوروں کا مالک کی اطاعت یکساں ہیں - اور بعد کو بھی دونوں میں یکسانیت ملتی ہے یا پیدا کی جا سکتی ہے - مثلاً اشتراکیت میں مزدور خود اپنی صنعتوں کے انتظام کے ذمہ دار ہوتے ہیں - یہی اصول سرمایہ داری بھی اپنے یہاں رائج کر سکتی ہے، کیونکہ مزدوروں کی کام کرنے کی عادت اور ضبط و نظم اتنا راسخ ہو چکا ہوتا ہے کہ اس تبدیلی سے کوئی خاص دقت نہیں ہوگی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسل اشتراکیت اور سرمایہ داری کے بنیادی اصولوں سے چشم پوشی کر رہے ہیں - سرمایہ داری کی بنیاد (Laissez Faire) پر ہے اور اشتراکیت تمام ذرائع پیداوار کے اجتماعی ہونے پر دیتی ہے - ایک نفع کو برقرار رکھنا چاہتی ہے اور دوسری اسے بالکل ختم کر دینا ضروری خیال کرتی ہے - وو ضدوں میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا - اشتراکیت کے اصول سرمایہ داری میں ناقابل عمل ہیں - بعض اداروں کی یکسانیت محض ظاہری ہوتی ہے - اس کو سب کچھ سمجھ لینا عقلمندی نہیں معلوم ہوتی -

رسل سائینس اور صنعتیت کے معتقد ہیں - ان کے خیال میں سائینس اور صنعتیت موجودہ دور کو دور وسطیٰ اور دور قدیم سے ممتاز کرتے ہیں - سائینس نے انسان کی فطرت پر تسخیر کے عمل کو مکمل کر دیا ہے - صنعتیت نے بڑی بڑی مشینوں کو اور انسان کا انسانوں سے غیر شخصی (Impersonal) تعلق قائم کر دیا ہے - اس کے خیال میں موجودہ تہذیب کی بھی سب سے بڑی خامی ہے - وہ صنعتیت کے مخالف نہیں مگر اس طریقہ کار کے مخالف ہیں جس کی رو سے موجودہ تہذیب نفع خوری، ذاتی مفاد - دوسروں پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کا ذریعہ بن گئی ہے - اُن کے خیال میں سائینس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ مشینوں کے ذریعے سے انسان کی معاشی، سماجی اور اخلاقی حالت بہتر بنائی جا سکتی ہے - وہ کسی نئے نظام کا خواب نہیں دیکھتے کیونکہ اس میں وہ سب خامیاں ہو سکتی ہیں جو موجودہ نظام میں - وہ موجودہ نظام میں اصلاح چاہتے ہیں - تجربہ سے نتائج اخذ کرنا اور ان کو بروئے کار لانا وہ انسانیت کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے ہیں -

رسل کے نزدیک تعلیم بہت بڑی خدمت انجام دے سکتی ہے - موجودہ دور نے تعلیم کو ایک خاص مقصد کے حاصل کرنے کا آلہ بنا دیا ہے - یہ روپیہ کمانے، اقتدار حاصل کرنے، اور آپس میں مقابلہ کرنے کو فوقیت دیتی ہے - یہ مقابلہ کو تعاون پر ترجیح دیتی ہے - یہ علم کو علم کی خاطر حاصل کرنے میں توہین سمجھتی ہے - یہ طاقت اور اقتدار میں ایمان رکھتی ہے - آج کل کے دور میں ایک مستغرق دماغ، شاعرانہ مزاج، ایک فلسفیانہ نقطۂ نظر دوسرے دور کی چیز ہو گئے ہیں - رسل کا خیال ہے کہ تعلیم کا صحیح مقصد یہ ہے کہ وہ انسانی شخصیت کو مکمل کرنے میں مدد دے - وہ تعلیم کو اس کے محدود معنی سے نکال کر ایک بڑے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں - ان کے خیال میں یہ فضول لڑائیاں جو محض "بازاروں" پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے لڑی جاتی ہیں ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روکاوٹ ہیں - وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ صنعتی نظام کو صرف تعلیم ہی کے ذریعے سے بدلا جا سکتا ہے -

غالباً ان کا سب سے بڑا کارنامہ "مغربی فلسفہ کی تاریخ" ہے - معلومات اور مضمون پر قدرت کے لحاظ سے وہ ویلز کی "دنیا کی تاریخ" کی یاد دلاتی ہے - یہ مغربی فلسفہ کی مکمل تاریخ ہے جو سقراط سے پہلے شروع ہوتی ہے اور جان ڈیوی پر ختم ہوتی ہے - اس میں مختلف مدرسۂ فکر نمودار ہوتے ہیں جو آپس میں مختلف اور متضاد ہونے پر بھی ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں -

رسل کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے - وہ اس دور کے بڑے مفکرین فلسفہ، سیاسیات، معاشیات اور تعلیم پر اُن کے خیالات علیحدہ علیحدہ کر دیجئے، تو بعض اوقات وہ قابل قبول نہیں معلوم ہوتے - ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بیک وقت ان تمام علوم کے ذریعے سے مسائل پر سوچنے کی کوشش کی ہے - انہیں معاشی نقطۂ نظر سے چڑ ہے محض اس لئے کہ وہ معاشی نقطۂ نظر ہے لیکن وہ ہر مسئلے کو سائیکالوجیکل مسئلہ بنا دیتے ہیں - ان کے خیال میں سائیکالوجی انسانی عقدوں کو کھولنے میں سب سے زیادہ مفید ہے - ان کے مضامین معلومات کے لحاظ سے زیادہ اہم نہیں ہوتے اور نہ کوئی منفرد نقطۂ نظر ملتا ہے - بعض وقت دونوں پہلوؤں کو دیکھنے کی کوشش ہی اُن کا سب سے اہم مقصد بن جاتی ہے، اور کوئی واضح نتیجہ سامنے نہیں آتا -

شوکمار

آبادی اور خوراک

آبادی اور خوراک کے مسئلے کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جن ممالک کی آبادی بڑھ جاتی ہے لیکن خوراک کی پیداوار نہیں بڑھتی اُن کا خوراک کی کمی اور تشویشناک حالات سے دوچار ہونا لازمی ہے۔ ان حالات کے مطابق مسئلۂ آبادی و خوراک کے ماہرین دنیا کی آبادی اور خوراک میں کمی بیشی سے آنے والی جنگوں کا اندازہ بھی لگا لیتے ہیں، کیونکہ جن ممالک کی آبادی بڑھ جاتی ہے اُن کا حملہ آور بن جانا ممکنات میں سے ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ صنعتی ترقی میں بھی پیش پیش ہوں۔ چنانچہ مسٹر ہیرلڈ کاکس نے ۱۹۲۳ء میں اور مسٹر ڈیلون نے ۱۹۲۶ء میں منچوریا کی جنگ سے کئی سال پہلے جاپان کے حملے کی پیش گوئی کی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں مسٹر تھامپسن نے اٹلی میں جاپان کی سی حالت پیدا ہونے کی پیش گوئی کی تھی۔ اس طرح کے ماہرین آبادی، خوراک اور صنعتی ترقی کے اعداد و شمار کو اکٹھا کر کے یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ فلاں ملک کس وقت حملہ آور کی پوزیشن میں آ سکتا ہے۔

سترھویں صدی کے وسط تک دنیا کی آبادی پچاس کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ اس کے بعد اس میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ اس اضافے کے وجوہ صنعتی انقلاب اور آمدنی کا بڑھ جانا ہے۔ چنانچہ اس وقت دنیا کی آبادی دو ارب سے زائد ہے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مغربی دنیا کی آبادی کے اضافے کی رفتار میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اس لئے وہاں آبادی کو بڑھانے کے لئے قانون استعمال کیا جاتا ہے۔ اور مختلف مذہبی و سماجی ادارے بھی آبادی کو بڑھانے کیلئے حکومت کے ہم نوا ہو کر اس طرح کے پرچار کے لئے مختلف وسائل کام میں لاتے ہیں۔

مغربی ممالک میں سے اکثر میں حمل گرانے پر قانونی بندش ہے۔ برتھ کنٹرول کی مخالفت ہے۔ بڑے کنبوں پر ٹیکس کم اور کنواروں پر زیادہ عائد کیا جاتا ہے۔ زیادہ بچوں کے والدین کو انعامات دیے جاتے ہیں شادیوں کے لئے قرضے دیے جاتے ہیں۔ بچوں کے لئے اسکولوں میں ہر طرح کی سہولتیں دی جاتی ہیں، اور کھیتی باڑی کے جدید طریقوں سے زیادہ خوراک پیدا کرنے کے ذرائع عمل میں لائے جاتے ہیں۔ لیکن اس قدر سہولتوں کے باوجود مغربی ممالک میں آبادی کے اضافے کا مستقبل اتنا روشن نہیں جتنا کہ مشرقی ممالک میں ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف آبادی کی زیادتی پر ہی کسی ملک کی ترقی اور تنزل کا انحصار نہیں ہوا کرتا۔ آبادی میں اضافے کے متعلق جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں اُن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آبادی کے اضافے اور صنعتی ترقی سے کئی ممالک تو حملہ آور اور کئی غربت و افلاس اور گوناگوں تکالیف کا شکار بن جاتے ہیں۔ بھارت کی آبادی کے قریباً ایک تہائی حصے کے برابر یعنی ساڑھے دس کروڑ انسان بھوک کی وجہ سے موت کے منہ میں جا چکے ہیں۔ پچھلے پچاس برس میں دنیا کی آبادی ۱۶۰ کروڑ سے بڑھ کر ۲۲۴ کروڑ تک پہنچ گئی ہے اور اس کے چھٹے حصے سے کچھ زیادہ حصہ موت کا نوالہ بن چکا ہے۔ بیسویں صدی میں ۱۹۲۵ء تک مختلف ممالک میں بھوک سے مرنے والوں کی تعداد ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوتی ہے۔

ملک	قحط زدگان کی تعداد کروڑ میں	بھوک سے مرنے والوں کی تعداد لاکھ میں
چین	۲۹۶۷	۴۰۷۶۵
بھارت	۲۶۹	۳۰۰۶۵
روس	۱۳۶۴	۱۹۱۶۰
یونان *	۰۲۴	۲۰۶۰
پولینڈ	۳۶۵	۱۵۶۰
فرانس	۱۶۰	۱۰۶۰
جرمنی	۱۶۰	۷۶۵
آسٹریا	۶۴۲	۱۶۵
دوسرے ممالک	-	۱۲۶۴
	۹۳۶۳	۱۰۹۳۶۴

یہ صورت حال دنیا میں ہونے والی جنگوں سے بھی زیادہ دردناک ہے کیونکہ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ میں ایک کروڑ کے قریب اشخاص موت کے منہ میں گئے تھے ۔

	فوجوں کی تعداد	مرنے والوں کی تعداد
اتحادی ممالک	۴۲۲۰۰۰۰۰	۵۱۵۰۰۰۰
جرمنی کے ساتھی دیش	۲۲۹۰۰۰۰۰	۳۳۹۰۰۰۰

پہلی بڑی جنگ کے وقت دنیا کی آبادی میں ۸ء۴ کروڑ کا اضافہ ہوا تھا ۔ اس کا چھٹا حصہ لڑائی میں کام آیا ۔ بے رحمانہ قتل و غارت کی جنگ میں آبادی کے اضافے کا جتنا حصہ موت کے منہ میں جاتا ہے کم و بیش اتنا ہی حصہ بھوک سے نڈھال ہو کر ملک الموت کا شکار بنتا ہے اس لئے اس امر کو ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ بھوک کا غائبانہ حملہ جنگ سے کم نقصان رساں نہیں ہوتا ۔ اگر دنیا کے مختلف ممالک جنگ کو روکنے کے لئے مختلف تجاویز طیار کرتے ہیں تو اس غائبانہ جنگ کی روک تھام کے لئے بھی پوری کوشش اور اسکیمیں مرتب کی جانی چاہئیں ۔ جنگ کے باعث ہر سال اکیس لاکھ جانیں تلف ہوئیں لیکن بھوک کے مارے ہر سال ۲۵ لاکھ انسان لقمۂ اجل بن جاتے ہیں اس لئے موت کی اس بڑی وجہ کا جنگ کے مقابلے میں زیادہ تیز اور موثر علاج سوچا جانا چاہیئے ۔ اس کا سب سے بڑا علاج جو سمجھ میں آسکتا ہے وہ ہے خوراک کی پیداوار کو بڑھانا ۔ خوراک کی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھا کر ہی ہم قحط سے انسان کو نجات دلا سکتے ہیں

خوراک کے متعلق مختلف ممالک کی پیداوار کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کینیڈا، امریکہ، ارجنٹائن، پاکستان، پولینڈ، روس، فرانس اور جرمنی میں خوراک کی پیداوار زیادہ ہے اور اس کے مقابلے میں بھارت اور چین کی حالت خراب ہے ۔ اس لحاظ سے امریکہ اور روس سے خوراک کی درآمد ہونی چاہیئے اور خوراک یورپی ممالک کو نہیں بلکہ بھارت کو بھیجی جانی چاہیئے جو اس سلسلے میں بدقسمت واقع ہوا ہے اور تقسیم نے تو اس کی غذائی صورت حال کو بہت ہی زیادہ خراب بنا دیا ہے

اس میں شک نہیں کہ غیر ممالک سے خوراک کی درآمد بڑھ رہی ہے لیکن اس خوراک کا بڑا حصہ یورپی ممالک کو بھجوا دیا جاتا ہے ۔ ایشیا کے ممالک کو جو درآمد ہوتی ہے وہ یورپ کے دیشوں سے ایک چوتھائی ہے ۔ ایشیائی ممالک میں سے زیادہ خوراک جاپان کو بھجوائی جاتی ہے ۔ روس سے غیر ممالک کو خوراک دیئے جانے کے متعلق کوئی اعداد و شمار موصول نہیں ہوئے ممکن ہے کہ اس کا میلان چین کی طرف ہو کیونکہ چین میں اس کے قدم جم گئے ہیں اور جہاں تک امریکی ممالک کا تعلق ہے وہ قدرتی طور پر چین کو خوراک نہیں دیں گے ۔

سوشلسٹ زاویۂ نگاہ سے ایک وقت ایسا خیال کیا جاتا تھا کہ صنعتی ترقی کرنے والے ممالک میں انقلاب پہلے آئے گا لیکن انقلاب انگلینڈ اور امریکہ کو چھوڑ کر روس اور اب چین میں ہوا ہے ۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انگلینڈ اور امریکہ میں وقت کے مطابق برسر اقتدار طبقے کی پالیسی بدلتی رہی اس لئے وہاں افلاس انتہا تک نہیں پہنچا لیکن روس اور چین میں یہ حالت نہیں تھی ۔ وہاں کے حکمرانوں نے عوام پر انتہائی سختی کی اور جنتا اس حد تک افلاس اور تنگدستی کا شکار بنی کہ انہوں نے شہنشاہی کا جوا ایک دم اپنے کندھوں سے اتار پھینکا ۔

جنوبی ایشیائی ممالک خاص کر بھارت میں برسر اقتدار پارٹی ترقی پسند دکھائی دیتی ہے اور اس کے دل میں حقیقی طور پر خواہش ہے کہ دیش میں خوشحالی کا دور دورہ ہو اور بھارت اتنی ترقی کرے کہ افلاس اور تنگدستی کا نشان تک باقی نہ رہے لیکن خوراک کی کمی نے اس کے ہاتھ باندھ رکھے ہیں ۔ اگر خوراک کی کمی دور ہو جائے تو یہ چند سال میں اول درجے کے ترقی پسند ممالک کی صف میں آجائے ۔ اس لئے ان ممالک کا جہاں خوراک ضرورت سے زیادہ ہے یہ فرض ہے کہ خوراک کی کمی کو دور کرنے میں بھارت کی زیادہ سے زیادہ مدد کریں ۔ یہ خوشی کا مقام ہے کہ بہت سے غیر ملکی مدبر بھی اس امر کو محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہندوستان کے عوام کا معیار بلند ہو جانے سے جمہوریت کے نشو و نما میں بہت ترقی ہوگی اس لئے وہ اپنے ملکوں سے گندم اور دیگر اناج ہندوستان بھجوانے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں ۔ امید کی جاتی ہے کہ بہت جلد بھارت میں خوراک کی تکلیف رفع ہو جائے گی اور اس طرح ملک کی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی ۔

یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ دوسرے ملکوں کا دست نگر ہونا مشکل کشائی نہیں کیا کرتا ۔ ہمیں خود کفیل ہونے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا ہے ۔

کتابیں اور رسالے

ہم آپ

مصنفہ:۔ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ پبلشرز۔ ہندستانی اکیڈیمی یوپی الہ آباد۔ قیمت دو روپے چار آنے۔ کاغذ معمولی۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔

انگلستان بلکہ سارے یورپ اور امریکہ کے مسلم و مشہور ناقد ٹی، ایس، ایلیٹ نے چارلس وہیلی پر اپنی تنقید کا آغاز اِن لفظوں میں کیا ہے:۔

"ایک ایسے مصنف کے ادبی کارناموں کی تنقید کرتے وقت، جس کے ساتھ ناقد کو دیرینہ واقفیت کا شرف حاصل رہ چکا ہو، ایک خاص دشواری محسوس ہوتی ہے۔ تعریف کی راہ میں قلم کے رُک رُک کر چلنے کا باعث یہ نہیں ہوتا کہ اعتدال پسندی یا غیر ناقدانہ روش کا خوف عناں گیر ہو بلکہ یہ کہ ناقد کا نظریہ ناگزیر طور پر تصنیف اور مصنف کے اثرات کا ایک مرکب ہوتا ہے"

علیٰ ہٰذالقیاس میرے لئے بھی مولانا عبدالماجد کی شخصیت کو حذف کر کے اُن کی کسی تصنیف پر ریویو کرنا محال ہے۔ چنانچہ اُن کی اس کتاب پر ریویو کرتے وقت مجھے یاد آرہا ہے کہ اپنی طلبیانہ زندگی کے ابتدا میں اُن کو نفسیات سے کیا کچھ شغف تھا اور اُن کا مطالعہ اپنے ہم سبقوں سے کس قدر آگے بڑھا ہوا تھا جب کہ بی اے کے دیگر طلباء کے ہاتھ میں جیمس کی ٹکسٹ بک آف سائیکالوجی کا مختصر نسخہ تھا تو اُن کے بغل میں جیمس کے پرنسپلز آف سائیکالوجی کی دو ضخیم جلدیں تھیں جو اُس وقت ایم اے کے کورس میں داخل تھی۔ مولانا نے "ٹکسٹ بک" خریدی ہی نہ تھی اور "پرنسپلز" پڑھ کر ہی امتحان دیا۔

"ہم آپ" پاپولر سائیکالوجی یعنی روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والے نفسیات پر ایک عام فہم کتاب ہے جو مولانا نے ہندستانی اکیڈیمی، یوپی کے لئے ۱۹۴۶ء میں لکھی تھی اور اکیڈمی نے ۱۹۴۹ء میں شائع کی۔ یہ کتاب چھوٹی تقطیع (پاکٹ اڈیشن) میں اُردو ٹائپ میں چھپی ہے اور دو سو اُنیس صفحوں کے وسعت میں قابل مصنف نے موضوع کے جملہ مہمات مسائل پر نہایت سہل، شگفتہ اور دل نشیں الفاظ میں بحث کی ہے۔

فہرستِ ابواب کے چند بولتے ہوئے عنوانوں کی جانب اشارہ اس امر کے ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ نفسیات کے نہایت خشک اور مشکل مسائل پر کس قدر دلچسپ طریقے سے بحث کی گئی ہے۔ "اپنا چہرا اپنے آئنہ میں"، "بھول چوک"، "خود بینی و خود نمائی"، "شرم و حیا"، "کمسن مجرم" اسی طرح چودہ باب باندھے ہیں، جن میں نفسیات کے متعلق سب ہی کچھ آگیا ہے۔

"جذبات" اور "عادت" کے باب میں جیمس کی طرح مولانا نے زیادہ وضاحت سے لکھی ہیں اور کم و بیش جیمس ہی کے نظریہ کی پیروی کی ہے۔ یوں جذبات پر مولانا کی ایک مستقل تفصیلی کتاب "فلسفۂ جذبات" ہے جو انجمن ترقی اُردو نے شائع کی ہے اور میری خواہش تھی کہ وہ "عادت" پر بھی ایک مستقل رسالہ لکھتے۔ لیکن اُن کا قلم اور امور کی بحث میں مشغول ہو گیا جو اُن کے لئے باعث دلچسپی تھے۔

فی زمانہ جیمس کے نظریہ "عادت" کے مقابل ایک اور گروہ بھی کھڑا ہو گیا ہے جس کا علم بردار ایف میتھیاس الگزنڈر ہے اور جس کے حلقۂ شاگردی میں ایسے ایسے لوگ شامل ہیں جیسے امریکہ کا مشہور فلسفی جان ڈیوئی (جس نے الگزنڈر کی کئی کتابوں پر مقدمہ لکھا ہے)، ایلڈس ہکسلے، جارج برنارڈ شا، سر اسٹیفرڈ کرپس اور ایک لحاظ سے ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو جو ڈیوئی کے معتقد اور اس لئے الگزنڈر کے معتقد ہوئے جیمس بھی الگزنڈر کے اسکول کو جا کر دیکھنا چاہتا تھا مگر الگزنڈر نے اپنی کسی کتاب میں افسوس ظاہر کیا ہے کہ اسے جیمس کو اپنا شاگرد بنالے کا شرف حاصل نہ ہوا۔ لاشعوریت یا نیم شعوریت، عادت اور جبلت کی بنیاد اور مایۂ امتیاز ہے۔ الگزنڈر کے فلسفے کا مایۂ خمیر "شعوریت" اور اسی کو وہ ارتقا و صحت نفسانی و جسمانی کا راز سمجھتا ہے اور اسی کے ذریعہ ساری جسمانی و نفسی امراض کا علاج کرتا ہے۔

مجھے سررشتۂ تعلیم کو خیرباد کہے مدت ہوگئی۔ معلوم نہیں یو۔پی اور دیگر ریاستوں کے تعلیمی محکموں کے ارباب حل و عقد کے نظر سے "ہم آپ" گذری ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ وہ ٹریننگ اسکولوں اور بیسک نارمل اسکولوں کے ہیڈ پٹیچروں کے لئے بہترین کتاب ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ٹریننگ اسکولوں اور کالجوں کے کورس میں سائیکالوجی سب سے زیادہ سنگلاخ ثابت ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عرصہ تک فلسفہ کا جزو رہ چکی ہے اور اس کا سائنٹفک اور عملی پہلو اجاگر کرکے دکھانے والی کتابیں جن کی مبتدی کو ضرورت ہے، کم ہیں، اگر مولانا کی "ہم آپ" ان لوگوں کے ہاتھ میں آجائے تو ساری مشکلیں حل ہو جائیں، بالخصوص جبکہ قابل مصنف نے جا بجا تعلیمی مقالوں سے اس مباحث کی توضیح کی ہے۔ طلباء کے علاوہ عام پڑھنے والوں، سیاسیات کے دلدادہ اور قیادت کے شیدائیوں کے لئے بھی "ہم آپ" ایک نہایت مفید کتاب ہے۔ نفس ادبی اعتبار سے یہ کتاب ایسی ہے کہ انسان بار بار پڑھے اور زبان کا لطف حاصل کرے۔ (ظفر حسین خاں)

ذکرِ غالب

مصنف:۔ مالک رام ایم اے۔ پبلشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی۔ قیمت ۴ روپیہ۔ کاغذ، کتابت طباعت اوسط۔ تقطیع و ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶، ۲۳۲ صفحات

یہ قابل قدر کتاب غالبیات کے ضمن میں ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن پوری نظرثانی اور اضافے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مصنف غالب کے خاص شیدائیوں میں سے ہیں۔ کتاب کا ہر ورق اس بات کا ثبوت ہے کہ اس پریشان داستان کو یکجا کرنے اور اس کی کڑیوں کو ملانے کے لئے آپ نے کس قدر محنت سے کام لیا ہے۔ غالب کے سوانح حیات، کلام اور کلام کا پس منظر، تصنیفات وغیرہ کے باب میں دلچسپ معلومات اس کتاب میں ملتی ہیں۔ بہت سی معلومات ایسی بھی ہیں جو خود مصنف کی تحقیق کا نتیجہ ہیں اور اس سے قبل انہیں کسی نے دریافت نہیں کیا تھا جگہ جگہ حواشی پر نوٹ اور حوالہ جات سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ابتدا میں غالب کی تصویر اور ایک دلچسپ قطعہ فارسی غالب کی تصنیف سے درج ہے۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم لاجرم در نسب فرہ مندیم

صرف یہی نہیں کہ غالب کا مطالعہ اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ آباواجداد، چچا کی سرپرستی، پنشن، انور کا وظیفہ، تعلیم، نظیر اور غالب شادی، قیام دہلی، مالی پریشانیاں، سفر کلکتہ، ورود کلکتہ، مقدمہ، دہلی کالج کی مدرسی، حادثۂ اسیری، قلعے کی ملازمت، سنہ۱۸۵۷ء کا حادثہ، امرائے رام پور، باقر علی خاں، حسین علی خاں وغیرہ عنوانات کے تحت سوانح حیات پوری تحقیق سے بیان کئے ہیں۔ کتاب کا دوسرا باب تصنیفات کے باب میں تفصیل و تنقید پر مشتمل ہے۔ مالک رام صاحب اس کتاب کی تصنیف اور دوسرے ایڈیشن میں ترمیم و اضافے کے لئے مستحق مبارکباد ہیں۔ (ع۔م)

سفینہ و ساحل

پبلشرز مکتبۂ شانِ ہند دہلی، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ کاغذ، کتابت، طباعت گوارا۔

کتاب مجلد ہے اور جلد پوش سے آراستہ۔

عزیز وارثی بچھرایونی کے کلام کا یہ مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ عزیز صاحب ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی سے تلمذ رکھتے ہیں۔ صفائی زبان اور سلاست آپ کے کلام کا جوہر ہے۔ غزل میں اچھے اچھے شعر نکالے ہیں۔

یہ انکشاف چمن میں ہوا بہار کے بعد اک اور دَور بھی ہے دَورِ خوشگوار کے بعد

(ع۔م)

موصولات

کیوپڈ و سائیکی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مترجمہ۔ ضیاالدین احمد برنی کیوپڈ اور سائیکی کے بیاہ سے متعلق آٹھ سہ رنگی تصویریں بھی شامل کتاب ہیں

لطائفِ ملا نصرالدین۔ قیمت ۱۲؍ ۔ آقا محمد رمضانی کی کتاب کا یہ ترجمہ بھی ضیاالدین احمد صاحب برنی نے کیا ہے۔ کتاب دلچسپ ہے۔

اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں۔ قیمت ۴؍ ڈاکٹر مسز اینی بسنٹ کے ایک لکچر کا ترجمہ از ضیاالدین احمد برنی۔

یہ تینوں کتابیں تعلیمی مرکز ۱۰۵ گیرو مل لیکھراج روڈ کراچی (پاکستان) سے مل سکتی ہیں۔

(ع۔م)

رسالے

نورنگ۔ یہ ماہ نامہ کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ آغا سرخوش دہلوی اس کے ایڈیٹر ہیں۔ ماہ نامہ نورنگ، الفنسٹن اسٹریٹ کراچی کے پتے سے مل سکتا ہے مضامین اور نظمیں معیاری ہیں۔

(ع۔م)

رفتارِ زمانہ

کچھ مدت سے بھارت اور پاکستان کے درمیان تجارتی تعطل کے باعث دونوں ممالک کے اقتصادی حالات پر کافی اثر پڑ رہا تھا۔ اب دونوں ملکوں نے آپس میں ایک تجارتی معاہدہ کر لیا ہے۔ جس کی رُو سے جون ۱۹۵۱ء تک پاکستان پٹ سن کی ۲۵ لاکھ گانٹھیں مہیا کرے گا اور روئی، چاول اور گندم بھی کافی مقدار میں دے گا۔ جس کے بدلے میں بھارت کی طرف سے پاکستان کو کوئلہ، کپڑا اور لوہے کا سامان دیا جائے گا۔ بھارت نے اس کے ساتھ پاکستانی روپے کی قیمت کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ تجارتی حلقوں میں اس تجارتی عہدنامے کا سواگت کیا گیا ہے اور امید ظاہر کی جا رہی ہے کہ اس تجارتی ڈیڈلاک کے ختم ہو جانے سے جہاں دونوں ملکوں کی تجارت میں ترقی ہو گی وہاں اس سے ان کے باہمی سیاسی اختلافات کے دور ہونے میں کافی مدد ملے گی۔

خالص گھی کا مسئلہ

بھارت پارلیمنٹ میں شری ٹھاکر داس بھارگو کے ایک بل پر تقریر کرتے ہوئے وزیر خوراک شری کے۔ ایم منشی نے کہا کہ بھارت سرکار نے گھی میں ملاوٹ کو روکنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے اور اب امید کی جا سکتی ہے کہ تین ماہ کی مدت تک اس ضروری مسئلے کا حل نکل آئے گا۔ شری منشی نے یہ بھی اعلان کیا کہ حکومت دودھ دینے والے جانوروں کی نسل کو ترقی دینے کے لئے بھی جلد ہی پارلیمنٹ میں بل پیش کرے گی۔

دنیا میں اخبار پڑھنے کا شوق

دنیا میں اخبار پڑھنے کے متعلق حال ہی میں جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اخبار پڑھنے کا سب سے زیادہ شوق برطانیہ میں ہے۔ اخباری کاغذ کی انتہائی کمی کے باوجود برطانیہ کے لوگوں نے سب سے زیادہ اخبار خریدے۔ ۱۰۰۰ اشخاص میں سے برطانیہ میں ۶۰۰ لیکسمبرگ میں ۴۴۵، ناروے میں ۴۲۱، سویڈن میں ۴۱۶، سوئٹزرلینڈ میں ۳۵۵ اور امریکہ میں ۴۴۵ اشخاص اخبار پڑھتے ہیں۔ اس کے مقابلے پر بھارت اور برما میں ۱۰۰۰ کے پیچھے کل چھ، پاکستان میں ۲ اور افغانستان میں صرف ایک آدمی اخبار پڑھتا ہے۔

بھارت اور مصر میں تجارتی معاہدہ

بھارت اور مصر کے درمیان ایک نیا تجارتی عہدنامہ قرار پایا ہے یہ عہدنامہ یکم مارچ ۱۹۵۱ء سے ۲۹ فروری ۱۹۵۲ء تک جاری رہے گا سمجھوتے پر بھارت سرکار کی طرف سے محکمہ تجارت کے سیکرٹری شری ایس اے وینکٹارمن اور مصر کی طرف سے بھارت میں مصر کے سفیر شری اسمٰعیل نے دستخط کئے اور اس کے مطابق مصر بھارت کو روئی، سوت اور کچھ دوسری اشیاء بھیجے گا جس کے بدلے میں بھارت کی طرف سے چائے، تمباکو اور کپڑا وغیرہ دیا جائے گا۔

نیپال اور ہندوستان

نیپال میں مقیم بھارت کے سفیر شری سی پی این سنگھ نے وبرگنج میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ بھارت اپنے پڑوسی دیشوں کی آزادی کی حفاظت کے لئے ہر وقت کربستہ رہے گا۔ انہوں نے نیپال میں رہنے والے ہندوستانیوں کو مشورہ دیا کہ وہ ایک نئے نیپال کے بنانے میں نیپالیوں کے ساتھ پورا تعاون کریں۔ انہوں نے مزید کہا کہ نئی وزارت حکومت کے نظام کو جمہوری بنانے کے لئے پوری کوشش کر رہی ہے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کا ہاتھ بٹائیں

اینگلو امریکی قرارداد اور کشمیر

سری نگر اور ریاست جموں و کشمیر کے دوسرے شہروں اور قصبوں میں کشمیر کے متعلق اینگلو امریکی قرارداد کے خلاف پرزور اور شدید مظاہرے کئے جا رہے ہیں۔ سری نگر میں اس سلسلے میں ۵۰ سے زیادہ جلوس نکالے جا چکے ہیں۔ عوام کے ہاتھوں میں مختلف ماٹو تھے جن پر لکھا تھا "یہاں غیر ملکی فوجیں نہیں آنی چاہئیں"۔ "ہمارے مستقبل کے فیصلے میں شہنشاہیت پسندوں کو دخل نہیں دینا چاہیئے" وغیرہ۔ ان جلوسوں کا اہتمام کشمیر نیشنل کانفرنس

ہو دونوں ملکوں نے حل کر لیا۔ کشمیر کے نائب وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر کشمیر کے مسلمان پاکستان میں شامل ہونا چاہتے تو وہ سنہ ۱۹۴۷ء کی لوٹ مار میں پاکستانیوں کے ساتھ شامل ہو جاتے اور چونکہ وہ اس میں شامل نہیں ہوئے اس لئے صاف ظاہر ہے کہ وہ پاکستان میں شامل ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ جلسے میں ریونیو منسٹر مرزا افضل بیگ نے بھی تقریر کی۔ ریاست کے مسئلے کے حل کرنے کے لئے پنچ مقرر کرنے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہم لاکھوں انسانوں کی قسمت کسی ایک کے ہاتھوں میں دینے کے لئے تیار نہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر ہم بھارت کے ساتھ شامل ہوئے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے جمہوری اصول صرف بھارت کے ساتھ شامل ہونے سے ہی پورے ہوتے ہیں

غذائی صورت حال

سنہ ۱۹۵۰ء میں ملک میں غذائی صورت کے متعلق وزارت خوراک نے ایک رپورٹ پارلیمنٹ کے ممبروں میں تقسیم کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس سال ملک کو ایک کے بعد ایک قدرتی آفت کا سامنا رہا۔ اس سال کے شروع میں غذائی صورت حال امید افزا تھی۔ ریاستوں کے پاس اناج کے جو ذخیرے تھے وہ پچھلے تین چار سال کے ہر سال کے ذخیرہ سے زیادہ تھے۔ لیکن پھر فصلوں کو وسیع پیمانے پر نقصان ہوا اور قدرتی آفتوں کے ایک پورے سلسلے نے حالات کو اور بھی ابتر کر دیا۔ چنانچہ سال کے شروع میں یہ اندازہ تھا کہ صرف پندرہ لاکھ ٹن غیر ملکی اناج درآمد کرنے سے کام چل جائے گا وہ غلط ثابت ہو گیا اور سنہ ۱۹۵۰ء میں حقیقتاً بیس لاکھ ٹن غیر ملکی اناج درآمد کیا گیا۔ سال کے آخر میں ذخیرہ اناج پندرہ لاکھ اسی ہزار ٹن سے سات لاکھ ۴۶ ہزار ٹن رہ گیا۔ جون کے بعد قدرتی آفتوں کی وجہ سے قریباً ۵۵ لاکھ ٹن اناج یا تو ضائع ہو گیا یا بیکار ہو گیا۔ اس دشواری کو دور کرنے کے لئے باربرداری کی مشکلات کے باوجود غیر ملکی اناج منگوانے کے کام کو تیز کیا گیا اور ملکی ذخیروں اور برطانیہ سے ادھار اناج لیا گیا۔

وسط دسمبر سنہ ۱۹۵۰ء میں بمبئی میں خوراک کے وزیروں کی جو کانفرنس ہوئی اس میں غذائی قلت کے پیش نظر سال آئندہ کے لئے ایک منظم پالیسی اختیار کرنے کے لئے زور دیا گیا اس میں ملک کو اپنی خوراک خود پیدا کرنے کے قابل بنانے کا عہد دہرایا گیا۔ اور یہ تسلیم کیا گیا کہ مارچ سنہ ۱۹۵۲ء کے بعد غیر ملکوں سے اناج نہیں منگوایا جائے گا یہ صرف ذخیرے جمع کرنے کے قومی مفاد کے لئے تبدیلی کاشت اور قدرتی آفتوں کے سبب پیدا ہونے والی قلت کے پیش نظر ہی منگوایا جائے گا۔ کانفرنس نے غذائی اقتصاد کے کنٹرول کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور سنہ ۱۹۵۱ء کے لئے کل ۳۰ لاکھ ٹن غیر ملکی اناج منگوانا مخصوص کیا گیا۔

ڈاکٹر کومارآپا کی امریکہ میں تقریریں

ڈاکٹر بھارتن کومارآپا نے امریکہ میں جو تقریریں کیں۔ ان کی اطلاعات کے متعلق بھارت سرکار کو توجہ دلائی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر کمارآپا نے بیان کیا ہے کہ مذکورہ اطلاعات غلط ہیں اور کسی حد تک توڑ مروڑ کر پیش کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر کومارآپا اقوام متحدہ کے سوشل کمیشن میں بھارت کے نمائندے ہیں اس کمیشن کی سرگرمیاں سماجی فلاح سے متعلق ہوتی ہیں۔ موصوف نے بھارتی نمائندے کی حیثیت سے ہی کمیشن کے گزشتہ اجلاسوں میں شرکت کی تھی۔ کمیشن کا آئندہ اجلاس اس مہینے جینوا میں ہو رہا ہے۔ تاہم امریکہ میں ڈاکٹر کمارآپا کا موجودہ دورہ بالکل نجی حیثیت کا ہے۔ وہ وہاں اپنے طور پر لیکچر دینے گئے ہیں۔ بھارت سرکار اور اقوام متحدہ کے سوشل کمیشن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ڈاکٹر موصوف کو بھارت سرکار کی طرف سے صرف سوشل کمیشن میں ہی کمیشن میں پیش ہونے والے معاملات پر بولنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ ایسے بیان بھی وہ حکومت کی ہدایات کے مطابق دے سکتے ہیں ان موضوعوں پر جو کمیشن کے دائرہ عمل سے باہر ہیں یا کمیشن کے زیر غور نہ ہوں ڈاکٹر کمارآپا کا اظہار خیالات ان کا ذاتی نقطۂ نظر ہوگا اور بھارت سرکار اس کی ذمہ دار نہ ہوگی۔

بھارت اور کشمیر

نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران میں پردھان منتری شری نہرو نے اعلان کیا کہ اگر جہاد کے نعروں کے نتیجے کے طور پر پاکستان نے کشمیر پر کوئی نیا حملہ کیا تو اسے بھارت پر حملہ سمجھا جائے گا۔ آپ نے کہا کہ بھارت نہ تو کشمیر میں کسی غیر ملکی فوج کو داخل ہونے کی اجازت دے گا اور نہ کشمیر کی موجودہ ہر دل عزیز حکومت کو ختم ہونے دے گا۔

تعلیم کی اہمیت

بھارت پارلیمنٹ کے مسٹر شری ماؤلنکر نے دہلی ٹیچرز کلب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ خوراک کے بعد ملک میں سب سے زیادہ اہمیت تعلیم کے مسئلے کو دی جانی چاہیئے۔ آپ نے کہا کہ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے تعلیمی سسٹم میں کچھ بنیادی نقائص ہیں۔ عام طور پر تعلیم سے لوگ یہ معنی لیتے ہیں کہ ملک میں کتنے اسکول اور کالج ہیں لیکن میرے خیال میں تعلیم سے مراد اسکولوں اور کالجوں کی تعداد نہیں ہے بلکہ اس کا حقیقی ادیش بنی نوع انسان کی بے غرضی سے خدمت کرنا ہے۔

ایرانی تیل

ایران کی ساری سیاست تیل کے محور کے گرد گھومتی ہے۔ ایک مدت تک اس سیاست پر برطانیہ کا عمل دخل رہا کیونکہ تیل کے سارے کارخانے ان کے قبضے میں تھے لیکن اب ایران کے لوگوں کا نادیہ نگاہ بدل رہا ہے اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ کسی غیر ملکی طاقت کا ان کے ملک پر اقتدار رہے اس لئے وہاں یہ ایجی ٹیشن زور پکڑ رہا ہے کہ تیل کے تمام کارخانے ایرانیوں کی ملکیت ہیں اور غیر ملکیوں کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ ایران کے قدرتی ذرائع کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کریں چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ملک میں باقاعدہ طور پر جدوجہد کی جا رہی ہے۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانی

جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی کے ساتھی مسٹر ہنری پولک نے کراچی میں بیان دیتے ہوئے یونین گورنمنٹ کے اس بیان پر سخت نکتہ چینی کی کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کا معاملہ ان کا گھریلو معاملہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانی (جن میں ۹۰ فیصدی وہاں ہی پیدا ہوئے) حقوق شہریت سے محروم ہیں اور محض ہندوستانی ہونے کی وجہ سے ان کو یورپینوں سے کمتر سمجھا جاتا ہے اس لئے یہ مسئلہ ایسا ہے جس کو حل کرنے کے لئے متحدہ اقوام کی اسمبلی کو جلد از جلد قدم اٹھانا چاہیئے۔

ایشیائی کھیلیں

ماہ مارچ میں نئی دہلی میں ایشیائی کھیلوں کی خوب دھوم رہی۔ ان کھیلوں میں حصہ لینے کے لئے جاپان، سنگاپور، فلپائن، ایران، برما اور بھارت کے کھلاڑیوں نے حصہ لیا جن میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی شامل ہوئیں۔ راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ان کھیلوں کی رسم افتتاح ادا کی اور پردھان منتری شری نہرو نے انعامات تقسیم کئے۔ ان کھیلوں میں جاپان، ایران اور بھارت کے کھلاڑیوں نے اپنی جسمانی قابلیت اور بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ زیادہ وزن اٹھانے میں ایران کا کھلاڑی اول نمبر پر آیا۔ جمناسٹک کی کھیلوں میں جاپان کے کھلاڑیوں نے نام پیدا کیا اور دوڑوں، تیراکی اور فٹ بال میں میدان ہندوستان کے ہاتھ رہا۔ سب سے زیادہ سونے کے میڈل جاپان اور بھارت نے حاصل کئے۔

پاکستان کا بجٹ

پاکستان پارلیمنٹ میں سنہ ۱۹۵۱-۵۲ء کا بجٹ پیش کرتے ہوئے وزیر مالیات مسٹر غلام محمد نے ۱۵۱٫۸۵ کروڑ کی آمدنی اور ۱۳۹٫۱۱ کروڑ کے اخراجات کا تخمینہ بتاتے ہوئے ۱۲٫۷۴ کروڑ کی بچت دکھائی بجٹ میں کوئی نیا ٹیکس عائد نہیں کیا گیا۔ اخراجات میں سب سے زیادہ خرچ ڈیفنس پر کیا جائے گا یعنی ۷۹٫۳۹ کروڑ روپیہ۔ اس کے علاوہ مہاجرین پر بھی پانچ کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔

کمیونسٹ پارٹی اور ہندو مہاسبھا

بھارت سرکار کے ہوم منسٹر شری راجگوپال آچاریہ نے پارلیمنٹ میں ایک سوال کے جواب میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ بھارت سرکار کمیونسٹوں کی تشدد اور توڑ پھوڑ کی پالیسی میں تبدیلی کے متعلق کسی بیان کو اس وقت تک منظور نہیں کر سکتی جب تک کہ کمیونسٹوں کے افعال بھی اس بیان کے مطابق نہ ہوں اور اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ تلنگانہ مدراس، آسام اور دوسری جگہوں پر جرائم کی تعداد میں کافی کمی ہو۔

ہندو مہاسبھا کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ سبھا کی فرقہ وارانہ پالیسی میں تشدد کو جگہ نہیں دی گئی۔ لیکن سبھا کے ضمن میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ اس کا پروگرام اپنی خاصیت کے لحاظ سے فرقوں میں جوشیلے جذبات ابھارنے اور تشدد کو تحریک دینے کا باعث بنتا ہے۔

بھارت میں سائنسی تحقیقات

تپ محرقہ، نمونیا، پیچش، تپ دق وغیرہ بیماریاں پیدا کرنے والے جراثیم کو مارنے کے لئے بنگلور کی انڈین سائنس انسٹی ٹیوٹ نے ایک عام درخت کی جڑ سے ایسا مادہ کشید کیا ہے۔ جو تاثیر کے لحاظ سے پینسلین سے ملتا جلتا ہے۔

عالمِ پیئرس کے خوبصورت بچے



ایک خوبصورت خاتون بننے کی تیاری میں

"ہر ایک کوئی ننھی منی کی جلد کی تعریف کرتا ہے، لیکن سب یہ نہیں جانتے کہ یہ اسکے لیے پیئرس صابن کے سوا دوسرا کوئی صابن استعمال نہیں کرنے دیتی: اسکی ماں کہتی ہے صاف و شفاف پیئرس صابن کا گہرا تقویت اسکی ماں کی طرح ننھی منی کی جلد کو بھی آنیوالے برسوں میں صاف، ملائم اور خوبصورت بنا سکے گا۔ کیونکہ دنیا بھر کے دیگر خاندانوں کی طرح اس خاندان میں بھی پیئرس صابن پشتوں سے ایکسا ہر دلعزیز رہا ہے۔



پیئرس صابن

پشتوں سے حسین عورتوں کا سنگار

Regd. No. E. P. 689



"بچوں کا آج کل"



حامد حسن قادری

اکبر بادشاہ کی رحم دلی

جس زمانے میں لڑائی ہوئی پانی پت کی   عہد کا اکبرِ اعظم کے وہ تھا پہلا سال
فتح شاہنشہِ اکبر کو لڑائی میں ہوئی   اور حاضر ہوا دربار میں ہیمو بقّال
عرض بیرم نے یہ کی، قتل کریں اس کو حضور   ہاتھ سے اپنے، کہ قائم رہے رُعب اور جلال
رحم و انصاف و مروّت کا تھا پُتلا اکبر   سُن کے یہ مشورہ بیرم کا ہُوا اس کو ملال

کہا، مغلوب پہ ہرگز نہ اُٹھاؤں گا ہاتھ
قتل کرنا ہے گرفتار کا بھی کوئی کمال

شریا دجوشی

چلنے والا ٹکٹ

مورس نام کا اسکول جانے والا ایک دس بارہ سال کا لڑکا تھا۔ اُسے خط لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اپنے خط رنگ برنگے لفافوں میں بند کرکے اُن پر طرح طرح کی تصویروں والے ٹکٹ لگاتا اور انہیں ڈاک خانے کے ڈبے میں ڈال آتا۔ چچا، ماموں، دوست وغیرہ سب کو وہ خط لکھتا۔ اُس کے لکھے سارے خطوں کے جواب آتے ہی ہوں یہ ضروری نہیں۔ کبھی کبھی تو اُس کے دروازے پر ٹنگے ہوئے چھوٹے لیٹر بکس میں بھی چٹھی نہ دکھائی دیتی۔ ایسے موقع پر وہ خود اپنے ہی پتے سے خط لکھ کر ڈاک خانے میں ڈال آتا۔

ایک روز وہ ایک نیلے رنگ کے لفافے میں ایک خط بند کرکے ٹکٹ لانے کے لئے ڈاک خانے میں گیا۔ لفافہ کھڑکی میں رکھ کر اُس نے دو فرینک کا ایک ٹکٹ مانگا۔ ٹکٹ بابو نے اُسے کئی قسم کے باتصویر ٹکٹ دکھائے۔ اُن میں سے اُس نے ایک ٹکٹ پسند کیا جس پر نوتردام نامی مشہور گرجا گھر کی تصویر تھی۔ پاس کے برتن میں سے تھوڑا سا پانی ٹکٹ پر لگا کر اُس نے اسے سُکھانے کے لئے کھڑکی کے پاس رکھا۔ اتنے میں ہوا کا ایک جھونکا آیا اور ٹکٹ نیچے گر گیا۔ اُسے اُٹھانے کے لئے مورس نیچے جھکا تو دیکھتا کیا ہے کہ ٹکٹ چلنے لگا ہے مورس حیران ہو گیا اور وہ بھی ٹکٹ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اُس نے سوچا۔ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ ٹکٹ ایک بے جان چیز ہے۔ وہ کیسے چل سکتی ہے؟ چنانچہ اُس نے اپنے ہی ہاتھ سے اپنے جسم میں چٹکی کاٹ لی۔ لیکن اُس کے درد کے مارے وہ زور سے چلّا اُٹھا۔ تب کہیں اُسے یقین آیا کہ وہ خواب میں نہیں بلکہ حقیقت ہی دیکھ رہا تھا۔

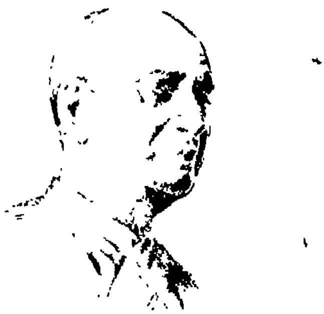
خیر، ٹکٹ چلتا ہی رہا۔ سامنے والی دیوار کی طرف وہ بڑھا جا رہا تھا۔ دیوار تک پہنچ کر ٹکٹ تھوڑی دیر تک وہاں رُک گیا اور پھر دیوار پر چڑھنے لگا۔ اس وقت میں ڈاک خانے میں آئے ہوئے دوسرے لوگوں کا دھیان بھی اس عجیب و غریب معجزے کی طرف گیا۔ سب لوگ حیران ہو کر ٹکٹ کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن اُن میں سے کوئی بھی اس معمّے کو حل نہ کر سکا۔ وہاں جمع ہوئے لوگوں میں سے ایک لمبے آدمی نے دیوار پر چلنے والے ٹکٹ کو پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن ٹکٹ اُس کی پہنچ سے باہر نکل گیا تھا۔ چنانچہ سب لوگ ٹکٹکی باندھے اُس کی طرف دیکھتے ہی رہے۔

اتنے میں ٹکٹ نیچے گر گیا۔ اُس کا پچھلا (گوند والا) حصہ اُوپر کو ہو گیا تھا۔ گویا اتنی لمبی مسافری سے وہ تھک گیا ہو۔ سب لوگوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ بس پھر کیا تھا۔ سارا معمّہ حل ہو گیا۔

ایک بڑی مکھی کی پیٹھ سے وہ ٹکٹ چپک گیا تھا۔ اُس کے پیروں میں گوند لگ جانے سے وہ اُڑ بھی نہیں سکتی تھی اور پیٹھ میں لگے ہوئے بوجھ کو بھی کسی طرح دُور کرنا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ اسی لئے ٹکٹ کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے وہ اس سے چھٹکارا پانے کی ترکیب ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ شاید کسی دوست کی مدد سے اُسے اس سے نجات پانے کی اُمید ہو!

اختر جمال

سردار پٹیل



سردار پٹیل ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو بمبئی کے ایک گاؤں کرم سد میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اہم حصہ لینے کی وجہ سے پہلے ہی مشہور ہوچکے تھے۔ اسی طرح غیر ملکی حکومت کے خلاف بغاوت کا جذبہ تو اُن کو وراثت میں ہی ملا تھا۔

ہندوستانی قوم کا معمار اپنے بچپن کے دنوں میں بے حد شوخ و شریر تھا اور اُن کے ماسٹروں کے لئے یہ ایک مسئلہ تھا کہ کس طرح سردار کو شرارت سے باز رکھا جائے۔ دسواں درجہ پاس کرنے کے بعد اُنہوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور گودھرا میں وکالت شروع کی۔

اس زمانے کے دستور کے مطابق بچپن میں ہی اُن کی شادی کردی گئی اور چند ہی سالوں کے بعد اُن کی رفیقۂ حیات چل بسیں۔

اس دوران میں سردار نے کافی رقم پس انداز کرلی تھی اور اب وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان روانہ ہوئے جہاں قانون کے امتحان میں پوری یونیورسٹی میں اوّل رہے۔ اس کے بعد احمدآباد میں وکالت شروع کی اور کامیاب ترین بیرسٹروں کی صف میں شامل ہوگئے۔

۱۹۱۶ء سے اُنھوں نے قومی تحریک میں دلچسپی لینا شروع کردی اور جلد ہی ہندوستان کے محبوب ترین رہنما ہوگئے۔ اسی تحریک آزادی کی بدولت اُنھوں نے سیکڑوں مصائب کو لبیک کہا۔ بارہا جیل کی آہنی سلاخوں اور موٹی موٹی دیواروں کے پیچھے برسوں رہنا پڑا۔ ہندوستان کو آزاد کرانے میں اُن کا اہم مقام ہے اور ہندوستان کے عوام اُن کی لازوال قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے ——— آزادی ملنے کے بعد ہندوستان کے نائب وزیر اعظم اور وزیر داخلہ مقرر ہوئے —— شب و روز کی محنت اور بے انتہا کام کے بار نے اُن کی تندرستی خراب کردی اور ایک ایسے موقعے پر جب تاریکی کے بادل ہر طرف امڈے ہوئے ہیں۔ ہمارے سردار چل بسے۔

سچ بات کہنے سے ہمارے سردار کبھی نہ چوکے۔ دشمن کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرنا اور اپنے دوست کی بُرائی کو اس کے سامنے ٹوک دینا اُن کی خاص خصوصیت تھی۔

بچو! تم نے سردار کے بچپن کے حالات سُنے۔ تمہاری بھی یہی کوشش ہونی چاہیئے کہ تم بھی اپنے میں سردار ایسی خوبیاں پیدا کرو۔ اور سردار ہی کی طرح شہرت اور عزت حاصل کرو۔

موتی لال دتہ

کام اور اُس کا انجام

بِلا سوچے سمجھے کام کرنے کا نتیجہ اکثر اوقات نقصان دہ ہوتا ہے۔ کافی سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد اگر کام شروع کیا جائے تو آدمی فائدے میں ہی رہتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک بادشاہ اپنے وزیر کے ساتھ سَیر کو نکلا۔ چلتے چلتے وہ شہر سے بہت دُور نکل گئے۔ یہاں تک کہ وہ ایک گھنے جنگل میں آ گئے۔ اس جنگل میں اُنھوں نے ایک تناور درخت کے سائے میں ایک آدمی کو بیٹھا ہُوا دیکھا جس کی چال ڈھال، رنگ روپ اور قد و قامت سے دکھائی دیتا تھا کہ یہ شخص تارک الدنیا ہے۔ دُنیا کی ناپائیداری اور انسانوں کی گنہ گاری سے تنگ آکر شہر کو چھوڑ دیا تھا۔ اور جنگل میں خاموشی کے ساتھ بغیر کسی پریشانی کے اپنی عمر کے باقی دن گذار رہا تھا۔ بادشاہ یہ نظارہ دیکھ کر خوش ہو گیا اور وزیر سمیت فقیر کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد فقیر سے بات چیت کرنے میں مشغول ہو گیا۔



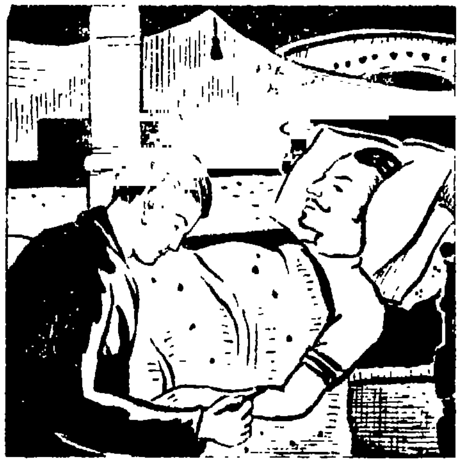
باتوں باتوں میں فقیر نے بادشاہ سے کہا۔ کہ بادشاہ سلامت میں آپ کو ایک قیمتی بات بتلائے دیتا ہوں جس کی قیمت ایک ہزار روپے سے کم نہیں ہے۔ اگر آپ اتنی قیمت دینے کے لئے تیّار ہیں تو میں بتا دوں گا۔ بادشاہ کچھ وقفے سوچتا رہا۔ اور آخر میں ایک ہزار روپیہ دینا منظور کر لیا۔

بادشاہ کے وزیر سے نہ رہا گیا۔ اور فقیر کے خلاف بہت کچھ کہنے لگا۔ وزیر نے بادشاہ کو بہت سمجھایا مگر بادشاہ نے اُس کی ایک نہ مانی۔ چناں چہ شاہی خزانے میں سے فقیر کو ایک ہزار روپیہ دینے کا حکم دے دیا گیا چُوں کہ فقیر لالچی نہ تھا اور نہ ہی اُسے رُوپوں کی ضرورت تھی۔ اس لئے اُس نے یہ سارا روپیہ غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ بادشاہ یہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔

کچھ دنوں کے بعد فقیر نے بادشاہ کو وہ بات بتا دی۔ فقیر نے نہایت ہی نرم آواز میں کہا: "پہلے انجام سوچنا چاہیئے پھر کام کرنا چاہیئے۔"

اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بادشاہ وزیر کے ساتھ شاہی محل

میں واپس آ گیا۔ وزیر حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔ اُس نے دل میں سوچا کہ یہ بادشاہ کتنا بے وقوف ہے۔ بے وجہ اور بے سبب ایک ہزار روپیہ برباد کر ڈالا۔ اگر بادشاہ کا طریقۂ کار ایسا ہی رہا تو شاہی خزانہ جلد ہی خالی ہو جائے گا۔ دوسرے دن وزیر پھر فقیر کو دیکھنے کے لئے جنگل میں گیا۔ لیکن یہاں تو مہاتما جی نے دوسرے دن صبح ہی بوریا بستر گول کر دیا گیا۔ وزیر کے شک میں مزید پختگی ہو گئی۔ ادھر یہ حال دیکھا اور اُدھر سے بادشاہ نے یہ حکم جاری کیا کہ تمام سرکاری عمارتوں پر یہ فقرہ کندہ کرایا جائے کہ "کام کرنے سے پہلے اس کا انجام سوچو"۔



ایک دن بادشاہ کی طبیعت کچھ علیل سی ہو گئی۔ بیماری بڑھتی ہی گئی حتےٰ کہ بادشاہ کا زندہ رہنا ایک امرِ محال ہو گیا۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا جو اُس کی موت کے بعد تخت کا وارث ہوتا۔ اس لئے بادشاہ کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر میں مرجاؤں تو میرا راج برباد ہو جائے گا۔ اس لئے جلد ہی مفید ترین علاج کرنا چاہیئے۔

ادھر سے وزیر نابنجار کے دل میں بے ایمانی پیدا ہوئی۔ اُس نے یہ خیال کیا کہ اگر بادشاہ کو عالمِ بقا کو روانہ کیا جائے تو اس کے بعد میرا بادشاہ بننا کوئی مشکل بات نہیں ہے کیونکہ اُس کا کوئی بیٹا یا وارث نہیں ہے جو مجھ سے تخت چھیننے کے لئے لڑے۔

بادشاہ کے علاج کے لئے دُور دُور سے حاذق الحکماء بلائے گئے۔ ہر چند کوشش کی گئی کہ بادشاہ صحت یاب ہو جائے مگر وہ تندرست نہ ہو سکا۔

اب وزیر بادشاہ کو مارنے اور خود تخت پر بیٹھنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ جب بادشاہ کو جینے کی کوئی آس نظر نہ آئی تو اُس نے انگلستان سے ایک ڈاکٹر منگوایا۔ جو اپنے فن میں چابکدست اور مسلّم الثبوت تھا۔ ڈاکٹر آ گیا اور اُس نے بادشاہ کا علاج شروع کر دیا۔ ڈاکٹر کی ہوشیاری اور عقلمندی سے بادشاہ صحت یاب ہونے لگا۔ وزیر نے دل میں سوچا۔ اگر بادشاہ تندرست ہو گیا تو میرے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ کسی نہ کسی طریقے سے ڈاکٹر کو اپنے ساتھ ملایا جائے۔ یہ سوچ کر وہ ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اور اُسے چار ہزار اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلی دکھا کر کہنے لگا۔ "اگر تم بادشاہ کو کسی دوائی کے ذریعے سے مار ڈالو تو میں تمہیں یہ تھیلی دے دوں گا۔" اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلی دیکھ کر ڈاکٹر کے مُنھ میں پانی بھر آیا اور وہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ میں بادشاہ کے بازو میں دوائی کے بدلے زہر کا انجکشن دے دوں گا اور وہ مر جائے گا۔

دوسرے دن ڈاکٹر بادشاہ کے علاج کے لئے محل میں گیا۔ اُس نے اپنی جیب میں دوائی بھرنے کے دو اوزار رکھے۔ ایک میں زہر رکھا اور دوسرے میں دوائی۔

محل میں پہنچ کر ڈاکٹر نے بادشاہ کے بازو میں انجکشن کرنے

کے لیئے دہی اوزار جیب سے نکالا جس میں زہر بھرا ہوا تھا۔ انجکشن کرنے سے پہلے اُس نے بادشاہ کا بازو دھویا تو خدام باادب میں سے ایک طشت لایا تاکہ بادشاہ کے بازو سے گدلا پانی اس میں گرے اب جونہیں ڈاکٹر نے چاہا کہ بادشاہ کے بازو میں زہر بھر دے کہ اچانک اُسکی نظر طشت پر پڑی جس پر لکھا ہوا تھا" کام کرنے سے پہلے اُس



کا انجام سوچو"۔ یہ فقرہ پڑھ کر اُس کے دل میں یہ خیالات پیدا ہوئے ' اگر میں بادشاہ کے بازو میں زہر بھر دوں تو انجام کیا ہوگا۔ اس نے سوچا۔ کہ" اگر وزیر کے علاوہ کسی اور شخص کو اس بات کا پتہ لگ گیا تو مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا جائے گا۔ میرا نام اور میرا وطن بدنام ہوجائے گا۔ یہ سوچ کر وہ کانپ اُٹھا۔

اب وہ سوچنے لگا کہ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ وزیر کی اشرفیوں کے لالچ میں اتنا بڑا خطرہ مول نہ لیا جائے۔ اگر بادشاہ تندرست ہوگیا تو وہ بھی مجھے مالا مال کر دے گا۔ اتنا سوچ کر اس نے جیب سے دوسرا آلہ نکالا جس میں اصلی دوائی تھی۔ اور اُسے بازو میں بھرنا شروع کیا۔

بادشاہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بازو فوراً پیچھے کی طرف ہٹایا اور ڈاکٹر سے پوچھنے لگا۔ بتاؤ یہ ماجرا کیا ہے۔ پہلے تم نے ایک دوائی بھرنا شروع کی اور اب دوسری بھرنا چاہتے ہو۔ مجھے فوراً اس کی وجہ بتاؤ۔ ڈاکٹر نے تھر تھراتے ہوئے کہا۔ "وہ پہلی دوائی چونکہ اچھی نہ تھی۔ اس لئے دوسری بھر رہا ہوں۔"

" نہیں نہیں" بادشاہ نے غصے میں آکر کہا۔ سچ سچ بتلائیے کہ ماجرا کیا ہے۔ ڈاکٹر نے کانپتے ہوئے سارا حال کہہ سنایا۔ بادشاہ یہ سن کر نہایت ہی برافروختہ ہوا اور اُسی وقت وزیر کو بلوا کر تلوار کے ایک ہی وار سے اُس کا سر دھڑ سے الگ کر دیا اور ڈاکٹر کو معافی دیتے ہوئے اُسے واپس انگلستان بھیج دیا۔



بچو۔ دیکھا۔ اگر بادشاہ" کام کرنے سے پہلے اس کا انجام سوچو" سارے محل میں نہ کھدواتا۔ اور ڈاکٹر یہ فقرہ نہ پڑھتے ہوئے اس کے بازو میں زہر بھر دیتا۔ اور اُس کے انجام پر غور و خوض نہ کرتا تو نا معلوم اُس کی کیا درگت ہوتی۔ بادشاہ کی بھی جان بچ گئی اور ڈاکٹر کا بھی کچھ نہ بگڑا۔ اس لئے جب بھی تم کوئی کام شروع کرو۔ تو پہلے اس کے انجام پر غور کرو۔ اگر انجام برا ہو تو اُس کو نہ کرو۔ اگر انجام مفید ثابت ہو تو کرنے میں ذرا دیر نہ کرو۔

شیلا شرما

سگریٹ

سات بہنوں میں ایک بھائی تھا اور آج اُس کی شادی تھی۔
۔سوں بعد آج وہ دن آیا تھا کہ ساتوں بہنیں اکٹھی ہوں۔ کُنتی تو
م کرتے تھکتی ہی نہ تھی۔ نہ کوئی کام ہی تھا جو کُنتی کے دیکھے بغیر
را ہو جاتا۔ ماں کئی سال کی مریضہ تھی۔ اس لئے کُنتی کو پہلے سے
الکھ دیا تھا کہ اپنے بھائی کی شادی سنبھالنا ہو تو پہلے سے آ جانا۔
نیں تو اور بھی تھیں لیکن کُنتی سب
ے بڑی تھی اس لئے ان کاموں
ں ماہر بھی تھی۔ سب بہنوں
شادیاں اُسی کے سامنے
ئی تھیں۔ تین بچوں کے بعد
ہی تھا جو پانچ سال کا اس
گودی میں کھیل رہا تھا سنتے
یا، دوسرے بچوں میں سے
ئی ایک برس بھی نہ جی
سکا۔



مُنّا سے پیار کرتے ہوئے
تی بولی۔ "راجا بیٹا، اماں بُلاوا دینے چلی جائے۔ گھر کھیلے گا؟"
مُنّا نے حامی بھر لی
"اور سُن مُنّا۔ یہ نئی نئی شیروانی۔ یہ نیا نیا چوڑی دار پاجامہ گندا
رنا۔ ہاں آج تو میرے مُنّا کی مامی آئے گی"
مُنّا نے سر ہلا دیا۔ جیسے اُس کو کھیل میں کپڑوں کا دھیان ہی

تو رہے گا۔
"جگّو، او جگّو۔ کہاں بیٹھا رہتا ہے، سُن۔ میں ابھی آؤں گی۔
خبردار جو مُنّا کو چھوڑا۔ ساتھ ساتھ کھیلنا۔ باہر نہ جانے دینا۔ موٹر
گاڑی آتی رہتی ہے۔ اور دیکھ۔ مجھے دیر ہو جائے تو اس میں سے
کچھ کھانے کو دے دینا۔ سمجھا؟"
"تم جاؤ بہو جی، میں دیکھ لوں
گا۔"
جگّو نے جواب دیا۔
کُنتی بولی:۔ "جا تو رہی
ہوں پر کہیں اپنی چلم پر وہ
بکُنی نہ چھڑک لینا"۔
چادر اوڑھ کر کُنتی چل دی۔
"مجھے تو آتے دیر ہو گئی مہیش
بیٹا! مُنّا نہیں دیکھا نہ جگّو
ہی۔"
کُنتی نے اپنی چھوٹی بہن
وِمّو کے بچے سے پوچھا۔
مہیش اور مُنّا دونوں ساتھ ساتھ کھیلتے تھے۔ دونوں میں
کچھ مہینوں کا فرق تھا
"موسی ماسے گی تو نہیں" مہیش نے کچھ تتلا کر جواب
دیا۔

"کنتی نے سوچا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ پہلے کی طرح آج بھی یہ کٹور دان کی مٹھائی کھا گیا ہے اور مُنّا بھوکا رہ گیا ہے۔ بولی "ماروں گی کیوں! موسی کبھی مارتی ہے؟ ہاں کہاں ہے مُنّا؟ جلدی سے بُلا لا' مٹھائی دوں گی تجھے"۔

مہیش کا چہرہ اُترتا جا رہا تھا جیسے کوئی بھیانک شکل اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی ہو۔ بڑی مشکل سے کچھ لفظ مُنہ سے نکلے۔

"موسی اوپر سگریٹ پینے گئے تھے۔ منّا اور ہم موسی"۔ یہ مہیش کی پُرانی عادت تھی اور اس پر کئی بار پٹ بھی چکا تھا۔

"تجھے پتہ نہیں سگریٹ کہاں سے مل جاتا ہے۔ تو مُنّا کو بھی سکھائیگا اب مت پینا۔ جا مُنّا کو بُلا"۔ کنتی نے جھنجھلا کر کہا۔

"دادا کی جیب میں تھی موسی۔ سگریٹ اور سلائی بھی۔ مُنّا نے سلائی جلائی موسی"۔ مہیش رُک رُک کر کہنے لگا "تو اُنگلی جل گئی۔ تو پھر جلائی چیلائی تو کوٹ موسی آگی ہونے لگا۔ گھم گھم لال لال۔ میں پنکھا لایا موسی آگ بجھانے کو۔ تو اور لال لال۔"

"ارے جلدی بتا مہیش! اب کہاں ہے منّا؟ جگو۔ او جگو! ارے سانپ سونگھ گیا کیا؟" پاگلوں کی طرح گھبرائے ہوئے کنتی بولی۔

"موسی۔ دوڑ کے مُنّا ٹب میں بیٹھ گیا۔ نیند آ گئی موسی تب۔" مہیش نے اپنی سمجھ میں بڑی جلدی سے جواب دیا۔

"موسی۔ اوپر ہے' اوپر ہے۔ مُنّا ٹب میں"

کنتی اوپر بھاگی۔ بہت تیز۔ جگو۔ او جگو! پر جگو تو کنبھ کرن سے شرط لگا کر سو رہا تھا۔ اس کے فوراً بعد کنتی ٹب میں پڑے منّا کے مُردہ جسم کے سامنے ماتھا پکڑے بیٹھی تھی۔

نیچے بینڈ بج رہا تھا۔ شاید بہو کی پالکی دروازے پر آ رہی تھی۔

تاجور نجیب آبادی

مولانا تاجور نجیب آبادی کا تقریباً دو مہینے پہلے انتقال ہو گیا۔ آپ دیال سنگھ کالج لاہور میں اُردو کے پروفیسر تھے۔ آپ نے اُردو کی بہت خدمت کی ہے۔ ادبی دنیا، شاہکار اور ہمایوں ایڈیٹر بھی رہے۔ بچوں کا اخبار پریم بھی آپ نے جاری کیا آپ نے لاہور میں ادبی مرکز قائم کیا تھا۔ جس میں بچوں کے بہت سی اُردو کی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ چنانچہ ان خدمات صلے میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب بھی ملا تھا۔



افسوس کہ آپ ہم سے جلد جُدا ہو گئے۔ اردو ادب پر خاص سے اور بچوں کے ادب پر عام طور سے آپ کے احسانات ایسے کہ اُن کو بھولا نہیں جا سکتا۔


"لکس
ٹائلیٹ صابن سے جِلد کو
دِلکش بنانا آسان ہے"
کانن دیوی کہتی ہے
LUX
یہ سفید اور خالص صابن،
جس کی خوشبو دِلکش
ہے، آپ کی جِلد کو بھی
دِلکش بنا دے گا۔
فِلمی سِتاروں کا حُسن بخش صابن

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D.—81



۹(۱۱)

جون سنہ ۱۹۵۱ء

عالمِ پیئرس کے خوبصورت بچے



ایک خوبصورت خاتون بننے کی تیاری میں

کملا کی بے داغ جلد دیکھنے سے دل خوش ہوتا ہے۔ سمجھدار ماں اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ کسی بھی طرح اسکی بچی کی جلد خراب نہ ہونے پائے۔ مثلاً وہ جانتی ہے کہ صاف وشفاف پیئرس صابن کا عملِ تقویت بچے کی جلد کو آنے والے برسوں میں نرم ونازک رکھے گا، اور یہ بھی کہ پیئرس صابن کے رازِ حسن کو دنیا بھر کے خاندانوں میں ماں اپنی بیٹی کو سونپتی آئی ہے۔



پیئرس
صابن

پشتوں سے حسین عورتوں کا سنگار

TO 61-172-86 UR


میں یہ اطمینان کر لیتا ہوں
کہ میرا کھانا ہمیشہ
ڈالڈا ہی سے بنے۔
یہ میری روزانہ
قوت کو بحال کرنے
میں مدد دیتا ہے"
موزوں غذا میں آپ کیلئے ضروری چکنائی

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل
دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۹ ——— نمبر ۱۱
سالانہ چندہ ——— چھ رُوپے
غیر ممالک سے ——— نو شلنگ یعنی ایک ڈالر
فی پرچہ ——— آٹھ آنے

جون ۱۹۵۱ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ایک اور صاحبِ کمال اُٹھ گیا

انتہا ہو چکی خستہ حالیوں اور زار نالیوں کی — محفلِ ادب تیزی کے ساتھ خالی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تند ہواؤں کے جھونکے بار بار آ رہے ہیں اور شمعیں، ایک ایک کرکے، جلد بجھ رہی ہیں۔ ایک کی بساطِ ماتم ابھی مشکل سے اُٹھنے پاتی ہے کہ دوسرے کی بساطِ عزا فوراً بچھا دی جاتی ہے۔ اور ایک کی موت پر ابھی آنسو تھمنے بھی نہیں پاتے کہ دوسرے کی میّت پر دوبارہ اُبلنے لگتے ہیں۔

ابھی سیماب صاحب کی جُدائی کا زخم ہرا ہی تھا کہ آرزو صاحب کی مفارقت نے دل میں ایک تازہ گھاؤ ڈال دیا۔

آرزو صاحب کو میں بچپن سے جانتا تھا، وہ میرے والدِ مرحوم کے روز آنے جانے والے بے تکلف دوست اور حضرت جلال لکھنوی کے شاگردِ رشید تھے۔ الفاظ کی تحقیق، لغات کی پرکھ، فنِ شعر کے نکات، زبان کا اُتار چڑھاؤ، اصوات کا زیر و بم، اور عروض کی دقیقہ سنجیوں میں وہ ایک زبردست مجتہد اور قدیم ادب سے وابستگی کے باوجود، فن اور زبان کے مسائل میں وہ ترقی پسندانہ خیالات کے حامل تھے۔

زندگی کے اس دورِ آخر میں اُن کا خیال تھا کہ وہ اُردو قواعد و لغت کو ایک نئے اُسلوب اور سائنٹیفک طرز سے مدوّن کر دیں، لیکن افسوس کہ زندگی نے وفا نہیں کی، اور یہ عظیم الشان کارنامہ ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" بن کر رہ گیا۔

اب یہ آرزو شاید کبھی نہیں نکل سکے گی۔ اس لئے کہ ہماری نئی پَود میں نہ وہ علم ہے، نہ وہ بصیرت، اور پُرانی نسل میں اب ہے کون؟

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

ابھی ایک ہفتہ ہُوا لکھنؤ میں یہ خوش خبری سُنی تھی کہ آرزو صاحب کا کراچی ریڈیو میں تقرّر ہو گیا ہے۔ کسے معلوم تھا کہ یہ خوش خبری ع "خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود" ہو کر رہ جائے گی اور اس خوش خبری کو حضرتِ آرزو کی خبرِ مرگ بہت جلد ماتمی لباس پہنا دے گی۔

کراچی کی خاک کو کیا معلوم کہ اس کے آغوش میں وہ گنجِ گراں مایہ دفن ہُوا ہے جسے حریمِ لکھنؤ کی آسماں بدوش زمین نے پیدا کیا اور فضائے ادب پر آفتاب کی طرح دمکایا تھا۔

جہاں تک آرزو صاحب کی آخری دردناک زندگی کا تعلق ہے، موت اُن کے حق میں آیۂ رحمت ثابت ہوئی، اس لئے کہ:-

مارا دیارِ غیر میں مجھکو وطن سے دُور رکھ لی مرے خدا نے مری بےکسی کی شرم

لیکن اُن کے قدرداں اور مرتبہ شناس ہم عصروں کے ساتھ اُن کی موت نے کیا سلوک کیا، اس کی شرح ناممکن ہے کہ ان باتوں کو:-

آدمی محسوس کر سکتا ہے، کہ سکتا نہیں

بہرحال اس سیاسی بُحران کے دورِ ناقدری میں صاحبِ کمال کا مرجانا ہی اُس کی زندگی ہے، اور جو لوگ ابھی زندہ ہیں وہ ہر میّت کو دیکھ کر کہتے ہیں۔ ع کیا قافلہ جاتا ہے، اُٹھ تو بھی چلا جاتا۔

اے خاکِ پاکِ لکھنؤ، یہ تیری کتنی عبرت ناک بدبختی ہے کہ تیرے صاحبانِ کمال، معاش سے تنگ آکر، زندگی میں بھی تجھ سے دُور بہت دُور رہتے ہیں اور مر کر تجھ میں دفن بھی نہیں ہونے پاتے۔

عمی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

جوش

نواب علی خاں — (دہلی)

سروش عسکری — ایک غزل گو کی حیثیت سے

سروش بحیثیت ایک شاعر کے ایک "ہمہ گیر ہستی" کے مالک ہیں۔ غزل، نظم، قطعہ، رُباعی، قصیدہ، مسدس، ترکیب، بند وغیرہ سب ہی کچھ کہتے اور خوب کہتے ہیں۔ لیکن اس ہمہ گیر شاعر کے سب سے زیادہ ہمہ گیر اصنافِ سخن دو ہیں، غزل اور نظم۔ نظموں کے متعلق پھر کبھی اظہارِ خیال کیا جائے گا۔ سردست سروش بحیثیت ایک غزل گو کے اس مختصر مقالے کا موضوع ہوگا۔

عہدِ حاضر کے جدید رجحانات کی نمایندگی میں سروش پیش پیش ہے۔ وہ صرف نظم کی ہئیت و صورت میں انقلابی تجربوں کا قائل نہیں بلکہ خیالات کی ترتیب و تشکیل میں انقلاب کا حامی اور مسائلِ زندگی کے حل تلاش کرنے میں منہمک ہے۔ اس کی غزلوں میں اکثر اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جو "ادب برائے زندگی" کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ان اشعار میں دعوتِ عمل ہے، پیام ہے، تلقینِ عزم و حوصلہ ہے۔ درسِ ثبات و خود اعتمادی ہے، اور سب سے بڑھ کے یہ بات ہے کہ ہر مقام پر لہجے میں وہ اعتماد اور تیقّن پایا جاتا ہے جو "ادب برائے زندگی" کی جان ہے۔ جو ہر پست ہمّت کو بلند ارادہ و بلند حوصلہ بنا دے۔ ہر پیام میں زندگی ہے، زندگی میں بالیدگی اور بالیدگی میں جوش، رعنائی اور شگفتگی، ملاحظہ ہو ؎

موجِ بیباک مجھے تہہ کی خبر لاتا ہے
دامِ ساحل سے نکل، حلقۂ گرداب میں آ

ہو سکے اپنے پیام آؤ تازہ گلستاں کریں
خزاں کو رنگ دے دے کر بہارِ جاوداں کرلیں

ذرّوں کا بھی خیال رہے مشغل نہ ہوں
تاروں سے بھی نگاہ لڑاتے چلے چلو

چھٹنے نہ پائے ایک بھی عنوانِ زندگی
ہر جزوِ کائنات پہ چھاتے چلے چلو

ناکامیاں ہمّت پست نہیں کر سکتیں بلکہ اس اولوالعزم شاعر کی ہمّت افزائی کرتی ہیں ؎

یہ تلخ تجربے ناکامئ محبت کے
کچھ اور بھی مری ہمت بڑھائے جاتے ہیں

مجھ پہ عزیز ہے ناکامئ مدام اپنی
کہ ننگ ہے مرے دامن کو گوہرِ مقصود

عزم و حوصلہ مندی ؎

غرق ہے عشرتِ بیکار نہ ہونا چاہا
میں نے طوفاں کو کشتی میں ڈبونا چاہا

ہم نے دکھلائے ہیں ثابت قدمی کے جوہر
ایسی منزل میں فرشتوں کے جہاں ہوش اُڑے

غرور و خودداری ؎

حکومتوں سے، خزانوں سے، بادشاہوں سے
ترے فقیر کی نیچی نظر نہیں ہوتی

شاید یہ اشارہ کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ شعر کے بانیاد تیور تعریف کے مستغنی ہیں
عزّتِ نفس ؎

اگرچہ موت ہے ہر ہر نفس میں بال فشاں
میں جی رہا ہوں کہ لازم ہے احترامِ وجود

یہی عزم و عمل اور کشمکشِ اُمید و بیم زندگی کو ایک مستقل عذاب دینے کے باوجود اصلِ حیات ہے ؎

نہ مٹے کشمکشِ ترک و طلب
زیست جولانگہِ طوفاں ہی سہی

دنیا نئے نظام، نئے تمدّن اور نئے رسم و رواج کے لئے بے چین ہے۔ حکومتیں بدل رہی ہیں، سماج میں تغیّر ہو رہے ہیں۔ سروش بھی اس انقلاب کو محسوس کرتا ہے اور اس شدّت کے ساتھ ؎

سنائی دیتی ہے راتوں کو پاؤں کی آہٹ
یہ اور کیا ہے جو آوازِ انقلاب نہیں

ظاہر ہے کہ یہ اندرونی انقلاب وہ سیلِ تند و سرکش ہوگا جو ہر خارجی مخالفت و مزاحمت کو خس و خاشاک کی طرح بہائے جائے گا ؎

دشت و صحرا کو ہے طوفاں کی تمنا کب سے
جوئے خاموش و بیباک بنے، ہاں سیلاب بن کر آ

یہ انقلاب ہر شے کو اپنے دامن میں سمیٹ لے گا اور اس طرح گویا خود فطرت کی وہ اُمید بر آئے گی جو ایک مدت سے نبضِ کائنات میں ارتعاش پیدا کئے ہوئے تھی۔ اس وقت سوچنا جائز نہ ہوگا اور جھجکنا ایک ناقابلِ معافی غداری ہے

محبت بحرِ بے ساحل ہے اے دل سوچتا کیا ہے
ڈبو دے اپنی کشتی کو تو بیڑا پار ہو جائے

غرض یہ کہ عملی انقلاب سے پہلے کھلے الفاظ میں وہ ذہنی انقلاب کا پرچار کر رہا ہے

عمل کو طرزِ بغاوت سکھانا پھر پہلے
خیالِ فکر کو توفیقِ انقلاب تو دے

موجودہ سرمایہ داری کے استبدادی نظام کے متعلق کس شاعرانہ اور مؤثر پیرایہ میں اظہارِ خیال کیا ہے

کسی کے خون کا گارا کسی کی دیواریں
لکھے گئے ہیں بہت اس طرح بھی افسانے

اس نظام کی حقیقت اور خود غرضانہ انداز یہ ہے

غریبوں کا لہو ہو آب جس کی
حذر ہے، صد حذر اُس آبرو سے

کیا جنوں خیز پیام آئے ہیں دیوانوں کے
سُرخ تحریر ہے پُرزوں پہ گریبانوں کے

ساتھ ہی سرمایہ داروں اور سرمایہ داری کے حامیوں کو اس طرح تنبیہ کی جاتی ہے

نہ سمجھو سوزِ دل کو برقِ ایمن
سلگ اُٹھیں دو عالم ایک ہُو سے

"برقِ ایمن" کی معنی خیز ترکیب مستحقِ ستائش ہے۔ اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظالم سرمایہ دار اپنے وہمِ ناقص میں اس برق سے مطمئن اور بے خوف ہیں کہ یہ ان کو کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتی!؟

اسی طرح سروش کی شاعری میں سیاستِ حاضرہ کے متعلق بھی نہایت بلیغ اور لطیف اشارے پائے جاتے ہیں۔ جہدِ آزادی کی تبلیغ بھی ہے، ترقی کرنے کی تعلیم بھی ہے اور سیاسی لیڈروں کی حالت کی نقاب کشائی بھی۔ انھیں میں کچھ مکار، خود غرض، اور ڈھیٹ ایسے بھی ہیں جن کا

بیاں ہے دل کے منافی، عمل بیاں کے خلاف
اور اس پہ یہ ہے کہ لکنت ذرا زباں میں نہیں

یہی وہ بے حیا ملت فروش ہیں جو اپنے آقاؤں کی بارگاہوں اور دوسرے اہم سیاسی جلسوں سے بارہا نکالے گئے اور پھر اُن میں گھسے

نکالے جا چکے ہیں جس سے سو بار
پھر اُس محفل میں بُلوائے گئے ہیں

انھیں کی خود غرضیوں اور سیاسی غلطیوں سے ناقابلِ تلافی نقصانات ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر تو ہندوستان کی فضا انتہائی تاریک ہو گئی تھی اور اہلِ نظر مایوس۔ سروش اُس وقت پکار اُٹھا

اک سیاہی بڑھ کے ہستی کے اُفق پر چھا گئی
اب یہ نہیں بیٹھے ہوئے شمعِ فروزاں کے

اسی طرح سروجنی نائیڈو کی موت کی خبر پڑھ کر سروش نے نعرہ لگایا

جو بات پہ سر دیتا تھا وہ شخص کہاں اب
کہنے کو تو ہیں شہر میں کتنے ہی جواں اور

اور آج مہاتما گاندھی ایسے ژرف نگاہ، روحانی اور بلند خیال رہبر کی نعش اپنے قاتلوں اور اُن کے ہم خیالوں کے بارے میں بزبانِ حال سروش کے الفاظ میں پکار پکار کر کہہ رہی ہے

"قدر جانی نہ مری دیدہ وری کی تا زیست
اپنے سے جھک گئی آپ اُن کی نظر میرے بعد"

حصولِ آزادی کے بعد ایسے ایسے انسانیت سوز واقعات رُو نما ہوئے کہ آخر فرقہ پرستی سے اظہارِ نفرت کرنا ہی پڑا۔ انسانیت، ہمدردی اور محبت کی تعلیم اس مؤثر اور دل کش پیرایہ میں دیتے ہیں

پلائے جا پلائے جا شرابِ احمریں ساقی
بنامِ حُبِّ انسانی، بَرَغمِ کفر و دیں ساقی

بہا دے آبِ آتش رنگ میں یہ ہو کہ وہ دونوں
کہ اک مدت سے ہے آویزشِ مینا و دیں ساقی

مے بے غش سے یہ تاریخ کا خونیں ورق دھو دے
ہو سے مسلم و ہندو کے رنگیں ہے زمیں ساقی

جدت پسندی

سروش فطرتاً جدت پسند واقع ہوئے ہیں۔ ابھی تک تمام شعراء نے بغیر کسی استثناء کے محبوب کو نگاہوں سے پوشیدہ نظم کیا یا پیشِ نظر، ان دو حالتوں کے علاوہ کوئی تیسری صورت کسی کی سمجھ ہی میں نہ آئی۔ سروش نے یہ جدت کی کہ پردہ و جلوہ کے درمیان ایک اور مبہم مقام ایجاد کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے جنت و دوزخ کے درمیان میں خلقتِ اعراف ہے

گزر گیا وہ زمانہ بھی اہلِ بینش پر
کہ وہ نگاہ سے اوجھل رہے نہ پیشِ نظر

محبوب یا ساقی کی مخمور آنکھوں کی مستی کا عالم ہر شاعر نے بیان کیا ہے۔ کسی نے ان کو جامِ شراب سے تعبیر کیا، کسی نے نرگسِ مست کہا، کسی نے کچھ کسی نے کچھ، سروش کہتا ہے ؎

مست انکھڑیوں کے گیت کی تجھ کو بھی خبر ہے؟
اے ساقیٔ مے خانۂ خودسے و جمشید

"خودسے و جمشید" کا فقرہ وہ جدت وہ معجزہ ہے جو بالکل غیر متوقع طور پر ذہنِ سامع کو حیرت کے ساتھ ساتھ مسرت سے لبریز کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح اس شعر میں ؎

برس پڑ، ہاں برس پڑ جھوم کے ابرِ آتشیں ساقی
سنہری بال بکھرا دے، اُلٹ دے آستیں ساقی

پہلا و دوسرا مصرع جدتِ ادا اور اندازِ بیان کی ندرت و بداعت کی بہترین مثال ہے ؎

جو پلکوں کے گھنے سائے سے بھی آگے نہیں بڑھتی
وہی نیچی نظر اک روز عالمگیر ہوتی ہے

چشمِ معشوق کی حیا پروری اور فتنہ سامانی کو کس قدر انوکھے انداز سے بیان کیا ہے۔ اسی طرح یہ اشعار جدتِ ادا میں اپنی مثال آپ ہیں ؎

اُف ترنم کسی کے لہجے کا — جیسے پھولوں پہ اوس لرزہ طراز
اس آشفتہ بیانی پہ تمہاری آنکھ بھر آئی
اجازت دو تو یہ ٹکڑا بھی زیبِ داستاں کر لیں
نگہِ ناز کے بس میں دلِ آشفتہ مزاج — پھول کے ہاتھ میں شعلے کا رباب اچھا ہے
اُس جلوہ گاہِ ناز میں جب سے چلا ہے دل — سو سو قدم نگاہ بھی آگے خیال کے

معیارِ نشاط و الم

سروش کے کلام میں قنوطیت کم ہے اور رجائیت زیادہ۔ لیکن جہاں کہیں قنوطیت ہے وہ تصنع سے بری، آورد سے مبرا اور تکلف سے پاک صاف، اس کا غم ایک بلند روحانی جذبہ ہے جو مایوسی یا پست حوصلگی نہیں پیدا کرتا بلکہ روح کو جلا دیتا ہے اور فطرت کو بلند و ارجمند بناتا ہے۔ اس طرح اس کے جذبۂ غم کا حاصل ایک روحانی اور بلند پایہ مسرت ہوتی ہے جسے اہلِ طرب اور عالمِ انبساط کہنا درست ہوگا۔ روح کو جو مستقل سکون اور پائندہ تابش و طمانیت اس نکھرے ہوئے خالص روحانی غم سے حاصل ہوتی ہے عیش پرستی و ہوس کوشی کے ہزار وقتی و عارضی ہنگامے اس کو پیدا نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر جانسن کہتا ہے:-

"بندگانِ عیش و ہوس کی کمی نہیں، لیکن رازدانِ نشاط شاذ ہیں"

؎ مگر اسے کوئی سمجھے گا کیا زمانے میں
جہاں کو غم نے، ہمیں تو نشاط نے مارا

ایسے دردانگیز اشعار کانوں کے راستے دل تک پہنچتے ہیں اور دل میں سرتیز نشتر بن کر پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ روح کی گہرائیوں میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں صدائے بازگشت کی طرح گونجا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ؎

کبھی یوں بھی گزرتی ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ ہونٹوں پر ہنسی ہوتی ہے دل سینے میں روتا ہے

تمام درد ہو دل اور نظر گلا نہ کرے — کسی غریب پہ یوں آ بنے، خدا نہ کرے
لاکھ کاموں میں ترے غم کی پرستش کے لئے — زندگی سے ذرا کچھ لمحے چرا رکھتا ہوں میں
خدا کرے کہ یہ لمحے ابد سے مل جائیں — وہ اشک پونچھتے جاتے ہیں رو رہا ہوں میں

حُسن و عشق

اُردو، فارسی اور عربی نظم میں حسن و عشق کا تصور یا تو انتہائی بلند و ارفع ملتا ہے یا حد درجہ پست۔ سروش بیسویں صدی کے جدت پسند اور بالغ نظر شاعر ہیں۔ وہ بازاری حسن و عشق کی پست اخلاقی تک اپنے ادبی معیار کو گرا کے اس کی توہین نہیں کر سکتے۔ اسی طرح تمام تر معیاری حسن و عشق کی افلاطونی دنیا بھی اُن کی حقیقت نگاری و صداقت اندیشی کے دائرے سے قطعاً خارج ہے۔ ان کا حسن و عشق ان کا ذاتی اور تجرباتی حسن و عشق ہے یعنی یہ حسن و عشق معیاری اور بازاری کے بین بین یعنی نیچرل، واقعاتی اور تجرباتی ہے۔ نہ اس قدر معیاری کہ حسن، فہم و ادراک سے بالاتر ہو اور عشق تمام تر نیاز و فتادگی اور بے غرض پرستش ہو کر رہ جائے۔ نہ اس قدر بازاری کہ حسن تمام آرائش و زیبائش و ناز و غمزہ کے باوجود خودداری سے معرا اور تصنع سے لبریز ہو اور عشق ہوس پرستی اور جسمانی آلودگی تک محدود ہو۔

ناز جس کے خود اٹھاتے ہیں حسینانِ جہاں
دل ہی پہلو میں وہ کافر ادا رکھتا ہوں میں

یہی سبب ہے کہ اس کا محبوب بھی اپنے عاشق کی پذیرائی کرنے پر مجبور ہے اور عاشق کو بھی بغیر کسی جھجک یا ہچکچاہٹ کے اپنی تمنا کے اظہار کی جرأت ہوتی ہے۔

اب ضبطِ غمِ عشق کی ہے لاج ترے ہاتھ
اے دوستِ نہاں، اے دلِ درد رسیدہ

صرف آشنا ہی نہیں بلکہ اس کا محبوب عملی طور سے بھی اس کی دلجوئی اور دلداری کرنے میں انہماک ظاہر کرتا ہے لیکن اس کا عشق بھی ایک جذبۂ بلند و ارجمند ہے ؎

وہ سمجھائیں، دلاسا دیں، منائیں | مگر دل پھر بھی گھبرائے تو کیا ہو؟

یہ محبت کی خلش ہے، اس سے تم واقف نہیں
جب تسلی دو گے ایذا کچھ سوا ہو جائے گی

یہی وجہ ہے کہ سروش باوجود اس پذیرائی کے بے حجابانہ ملاقات کو اچھا نہیں سمجھتے ؎

شمع و پروانہ کو رکھتا ہے حدوں میں فانوس
حسن اور عشق میں ہلکا سا حجاب اچھا ہے

یہی وہ مقامات ہیں جہاں سروش نے مادیت و روحانیت کو نہایت لطیف اور وجد آفریں انداز سے سمو دیا ہے اور اس پر مزید لطف یہ ہے کہ تمام ایسے اشعار پڑھتے چلے جائیے۔ صرف روحانی لذت حاصل ہوگی کوئی پست جذبہ نہ ابھرے گا ؎

ہم بھی طوفاں بہ دل، وہ بھی تلاطم بہ کنار | ابتدا دیکھئے ہوتی ہے کدھر سے پہلے
پھر لگا حسن تعاقب میں ترے سرگرداں | سمندِ شوق کو مہمیزِ اجتناب تو دے

تری آغوش میں دل کا دھڑکنا یاد آتا ہے
جو گل پر قطرۂ شبنم کو لرزاں دیکھ لیتا ہوں

نظروں کو حسن، حسن کو نظریں پسند ہیں
بیٹھے رہیں وہ سامنے دیکھا کرے کوئی

ہائے پہلی چھیڑ مضرابِ نگاہِ ناز کی
اس طرح اب زندگی کے تار تھرّائیں گے کیا

بالغ نظری اور ژرف نگاہی

شعر سمجھنے کے لئے ذوقِ سلیم کے ساتھ وسیع مطالعہ بھی بہت ضروری ہے۔ جو بھی اشیاء کی ظاہری نمائش اور صورتوں میں محو ہو کر رہ گیا۔ اور ان میں پوشیدہ حقائق تک اپنی نگاہیں پہنچانے کی صلاحیت پیدا نہ کر سکا۔ وہ دیدہ ور اور صاحبِ نظر نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے صاحبِ نظر بن جانا ہر اعلیٰ و ادنیٰ کے بس کی بات نہیں،

دیدہ ور مختلف اشیاء کی ظاہری صورتوں اور حالتوں سے فریب نہیں کھاتے بلکہ جو حقائق ان کے پردے میں پوشیدہ ہیں ان تک اپنی بالغ نظری سے پہونچ جاتے ہیں۔ چند اشعار ایسے سن لیجئے جن میں دیدہ وری و ژرف نگاہی کا اعلیٰ معیار پایا جاتا ہے ؎

بارِ احسانِ سماعت بھی نہ اٹھا جس سے
حشر اٹھا اسی ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ

گمانِ اہلِ دل میں بھی عجب تاثیر ہوتی ہے
نظر جس خاک پر ڈالیں وہ خاک اکسیر ہوتی ہے

مجھے پھندے میں شیخ و برہمن کیا خاک لائیں گے
کہ میں سازِ دروں کفر و ایماں دیکھ لیتا ہوں

نظر مضراب بن کر دوڑ جاتی ہے رگِ گل پر
کلی کو چھیڑ کر سازِ بہاراں دیکھ لیتا ہوں

کمیں میں ہے کیا کوئی اشکوں کا طوفاں | یہ کیوں مسکرانے کو جی چاہتا ہے
آنکھ کھلتے ہی اسیرِ حسرتِ پرواز تھا | دام کے حلقے تھے جن کو بال و پر سمجھا تھا

سمجھ میں گو نہیں آتا مگر اتنا سمجھتا ہوں
کہ تجھ پر غور کرنے سے نظر باریک ہوتی ہے

ایک فرنگستانی ادیب و عالم کہتا ہے :-

تاملِ اظہار

Restraint in the essence of Literature تاملِ اظہار ادب کی جان ہے۔ تاملِ اظہار کا یہ مطلب نہیں کہ ما فی الضمیر کو مبہم رکھا جائے یا اپنے مطلب کا کچھ حصہ بیان کیا جائے اور کچھ بیان نہ کیا جائے اور جو کچھ بیان کیا جائے وہ بھی اشاروں میں۔ یا اس قدر ضبط و صبر سے کام لیا جائے کہ دل کی بات زبان تک نہ آنے پائے۔ اصل میں تاملِ اظہار سے یہ مطلب ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ دبے الفاظ میں انتہائی متانت کے ساتھ ہو، نہ بالکل کھلے الفاظ میں نہ بالکل مجمل اور مبہم طریقے سے۔ ملاحظہ ہو ؎

ہائے ان چاندنی راتوں کی جنوں انگیزی | دل کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ تم دور نہیں

شعر کے تیور بتاتے ہیں کہ صبر کا دامن چھوٹ چکا ہے تاب ضبط باقی نہیں، پھر بھی خودداری اور ضبطِ نفس کا یہ عالم ہے کہ دردِ دل کا اظہار صرف ان الفاظ میں کیا جاتا ہے کہ

"دل کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ تم دور نہیں"

ظاہر ہے کہ تاملِ اظہار کے صحیح استعمال کے لئے نکھرے ہوئے ذوق اور پختہ شعور و قابلیتِ اظہار کی ضرورت ہے۔ سرورش کے اکثر اشعار میں اس کا نہایت عمدہ استعمال پایا جاتا ہے ؎

مجھے تو سیرِ چمن سے معاف رکھ صیاد — مری نظر ابھی شائستۂ بہار نہیں

یہ بات بات میں لکنت سی آج کیسی ہے
کسی کے دل کی تو دھڑکن مری زباں میں نہیں

اس کمی پر ہے یہ عالم کہ ابھی تو یہ — ہائے کیا چیز تھے تم ترکِ وفا سے پہلے

گھٹ کے رہ جائے کلیجہ میں تو بہتر ہے سرورش
وہ فغاں جو متمنیٔ اثر ہوتی ہے

مکمل سکون اور کامل طمانیت کیونکر حاصل ہو سکتی ہے یہ ایک خشک حقیقت تھی جسے سرورش نے اس طرح شعر کا لباس پہنا کے رنگین و دلکش بنا دیا ؎

سکوں جہاں میں نہیں آزما کے دیکھ لیا — تمہیں بھی وجہِ تسلی بنا کے دیکھ لیا

اسی طرح یہ اشعار بھی صداقتِ خیال و صداقتِ بیان میں اپنی نظیر آپ ہیں ؎

شوق کرتا ہے سفر، بانگِ درا سے پہلے
کان بجتے ہیں محبت میں صدا سے پہلے

آپ اور تم کی ہے تخصیص، نہ تو پر موقوف
جس میں اخلاص کی بُو ہو وہ خطاب اچھا ہے

موت ہے ساحلِ مقصود طلب کے حق میں
دل میں ہمت ہو تو دریا سے سراب اچھا ہے

کوئی مٹتا ہُوا خاکہ کہ ابھرتا ہُوا نقش
جو نگاہوں کو لبھا لے وہ شباب اچھا ہے

ایک حشرِ شور افزا، ایک طوفانِ ابد — زندگی کو داستانِ مختصر سمجھا تھا میں

بحرِ غم کی شورشِ پنہاں کا عالم کچھ نہ پوچھ
سطح پر جتنا سکوں ہے تہہ میں اتنا جوش ہے

تھی ضامنِ حفاظت موجوں کی سربلندی — ڈوبی وہیں پہ کشتی طوفاں گھٹا جہاں ہے

ذوقِ محرومی بھی دھوکا، نازِ حاصل بھی فریب
کچھ نہیں ہے جب تو پھر کھوئیں گے کیا پائیں گے کیا

اُن کی پُر معنی خموشی ہی نے سب کچھ کہہ دیا
اب وہ فرمانے پہ آئیں گے تو فرمائیں گے کیا

نکھرتا جاتا ہے جتنا شعورِ ذہنِ انسانی — حقیقت اور مبہم اور مبہم ہوتی جاتی ہے

ماورائیت

شاعر کا انتہائی کمال یہ ہے کہ اس کے اشعار آفاقی صداقتوں کا رنگین گلدستہ ہوں، حقیقتوں کا روشن آئینہ ہوں۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی سچی ترجمانی کریں اور ہر شخص کے حسبِ حال ہو سکیں۔ لیکن اس سے بھی بلند وہ منزل ہے جہاں شاعر کائنات و عالم کی وسعتوں کو بھی اپنی بلند پروازی کے مقابل میں تنگ اور محدود محسوس کرنے لگتا ہے اور ایسے بلند مقام کو اپنی جولانگاہ بناتا ہے جس کے مقابلے میں افلاک بہت پست ہو جاتے ہیں اور ستارے بہت پیچھے چھوٹ جاتے ہیں۔ ایسے مقام پر شاعر آفاق و کائنات سے ہم آہنگ رہنے کی پروا نہیں کرتا بلکہ خود کائنات کوشش کرتی ہے کہ کسی طرح اس کی ہم آہنگ ہو جائے یہی وجہ ہے کہ اس کی ماورائیت قطعی ماورائیت اور کسی دوسری دنیا کی چیز نہیں ہونے پاتی بلکہ اس میں آفاقی اجزا شامل رہتے ہیں۔ سرورش کا یہ انداز بھی کتنا شاندار اور دلکش ہے، اس کا اندازہ شاید مندرجہ ذیل اشعار سے ہو سکے ؎

شوق کی صبر آزما وادی میں تھک کر رہ گئے
انجم و پروین کو اپنا ہم سفر سمجھا تھا میں

یہ کس حریمِ تجلی میں شوق لے آیا — جہاں نظر کے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

ہزار برقِ تجلی، ہزار شعلۂ طور — ہنوز اے مرے اللہ روشنی کم ہے

جنونِ اُلفت کا بول بالا کہ ایسی منزل پہ کھینچ لایا
جہاں بشر کا تو ذکر ہی کیا خیال کا بھی گذر نہیں ہے

میں شوق کی حشر خیز وادی میں وقت کی طرح گامزن ہوں
ستارہ و ماہ و مشتری میں کوئی مرا ہمسفر نہیں ہے

کلاسکل انداز

قدیم کلاسکل شاعری جس قدر عمدہ اور لطیف ہے اسی قدر اسی کا تتبع دشوار، کیونکہ اس میں صداقتِ جذبات کے ساتھ سادگیٔ ادا، سلاست و روانی، درد و اثر اور معیاری رکھ رکھاؤ کا عجیب دل پذیر امتزاج پایا جاتا ہے۔ معشوق ہزار بے وفا سہی، عاشق اس کو موردِ الزام نہیں ٹھیراتا بلکہ اپنی تباہی، شکستہ حالی اور پریشانیوں کی کوئی نہ کوئی قابلِ قبول توجیہہ کر دی جاتی ہے جس سے بےوفائی اور ظلم کا الزام بجائے

محبوب کے کسی دوسرے کے سر تھوپا جاتا ہے اور اس طرح ذمہ داری تقدیر، فلک یا کسی دوسری چیز پر عاید ہو جاتی ہے۔ میر علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں

اُس کے ایفائے عہد تک نہ جیئے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

اور یہ شعر اُن کی بات کمال میں سے ہے جن پر ترقی کرنا عالم دل و دماغ کی طاقت سے بالا تھا۔ لیکن ذہین و فطین سرورش کہتے ہیں۔

کسی کے وعدۂ فردا کی شرم رہ جائے
خدا کرے کہ مری زندگی وفا کرے

شعر کے دعائیہ انداز نے جذبۂ ایثار کو جس طرح نمایاں کر دیا ہے۔ وہ سرورش کا حصّہ ہے!

افسانۂ خوابی یک عمر وفا کا یہ مآل
سو گیا میں ترے دامن کی ہوا سے پہلے

حکیم مومن خان فرماتے ہیں ؎

وصل کی شب شام سے میں سو گیا
جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا

مضمون دونوں اشعار کا ایک ہی ہے مگر انداز بیاں کے فرق نے ایک کو دوسرے سے بڑھا دیا ہے۔ اہلِ نظر خود فیصلہ کر لیں!

سادگی و پُرکاری

اکثر اشعار ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے مطالب میں کوئی خاص ندرت، رفعت، عمق، دقت نہیں پائی جاتی۔ جو بات بیان کی جاتی ہے وُہ اس قدر صاف، آسان اور واضح طور سے بیان کی جاتی ہے کہ اکثر و بیشتر ان کا مطلب نثر میں بیان کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ سرورش کے دو ایک ناقابلِ تشریح اشعار بھی سن لیجئے

اک پیکرِ شباب کا الھڑ سے خوابِ مست
تکیہ کہیں ہے، زلف کسی جا ہے، سر کہیں
زلف برہم ہے، مژہ نم ہے، خدا خیر کرے
حُسن پر عشق کا عالم ہے خدا خیر کرے
بہار دیکھی ہے میں نے، بہار کی سوگند
ترے شباب کی پرچھائیں ہے بہار نہیں
وہ خوابِ ناز سے انگڑائی لے کے اُٹھے ہیں
کہ آفتاب کی پہلی کرن مجسّم ہے
محبت جس قدر شائستۂ غم ہوتی جاتی ہے
وہ کاکل اور برہم اور برہم ہوتی جاتی ہے
جیسے ہو کوئی اوس میں ڈوبا ہوا گلاب
یوں تھے عرق عرق وہ مری التجا کے بعد

و کہ ارمان اس انکار کی شوخی پہ نثار
پھر اُسی ناز سے کہہ دو ہمیں منظور نہیں
چاند سورج بھی ہم نے دیکھے ہیں
کوئی تیسرا جواب ہے پیارے
زیر و بم راگ میں جس طرح سے ہو ساز کے ساتھ
دل دھڑکتا ہے ترے پاؤں کی آواز کے ساتھ
درحقیقت ہے شباب اُس لرزشِ رنگیں کا نام
دل میں جب اک ولولہ ہو چوٹ کھانے کیلئے
وہ اپنی نگاہوں سے واقف نہیں ہیں
کلیجہ دکھانے کو جی چاہتا ہے!

اگر سرورش کو بھی قسمت سے کوئی چھاپنے والا مل گیا تو عجب نہیں کہ ایسے ہی جواہر پاروں کا ایک نایاب مستند مجموعہ بھی کبھی شائع ہو جائے کیونکہ سرورش کی شاعری تمام صداقت ہے اور صداقت تمام رنگینی۔ آرٹ کی تشریح آرٹ ہی کے ذریعے ہو تو کیا کہنا۔ سچ ہے ؎

ہے وہ بالیدۂ و شاداب چمن، اے سرورش
پھول کھلتے ہیں جہاں بادِ صبا سے پہلے

زکی انور

تماشا

شہر سے پرے اُتر جانب ایک بڑے سے میدان میں میلہ لگا ہوا تھا۔

میدان میں چاروں طرف چھوٹی بڑی چیزوں اور مٹھائیوں کی سجی سجائی دکانیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اِن دکانوں کے علاوہ ہوٹل تھے اور اُن رضاکاروں کے دفاتر تھے جو دُور سے آئے ہوئے جاتریوں کی خدمت اور میلے کے انتظام کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

میدان کے بیچ میں دکانیں نہیں تھیں۔ وہاں موت کا کنواں تھا۔ ناٹک کمپنی تھی۔ چھ پیروں والی گائے تھی۔ دو سر والا لڑکا تھا اور جادوگر تھا۔ اِن سبھوں نے چاروں طرف سے چٹائیاں گھیر اور اوپر شامیانے تان کے اپنا اپنا شو ہال بنا رکھا تھا —— اِن کے علاوہ مٹی سے سونا بنانے والے کیمیاگر، چڑیا کے غلام سے دس روپے کا نوٹ بنانے والے جادوگر، اپنے بچے کا کلیجہ کاٹ کر نکال دینے والے مداری۔ آپ کی زندگی کے اگلے پچھلے واقعات بتانے والے غیب داں۔ پچاس برس کے بڈھے کو بائیس برس کا نوجوان بنانے والے طبیب اور شیشے چبا جانے کے قابل دانت بنا دینے والے دندان ساز اپنی اپنی ٹولیاں جمائے اپنے اپنے کرامات دکھا رہے تھے۔

ایک ٹم ٹم میدان میں آکر رُکی جس پر ایک خوش پوش ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا تھا۔ اُس کے بال لمبے لمبے تھے۔ آنکھوں پر ایک خوبصورت سی عینک تھی۔ مونچھیں رُعب دار تھیں۔ ڈاڑھی خوبصورتی سے چھٹی ہوئی تھی اور اُس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا وقار تھا۔ اور آنکھوں میں عینک کی وجہ ہی سے سہی مگر غیر معمولی چمک تھی۔ اُس کے ساتھ چمڑے کا ایک بکس بھی تھا۔ جو نہ تو بہت بڑا تھا نہ بہت چھوٹا، اور بکس کی وجہ سے ایسا لگتا تھا، جیسے وہ کہیں دُور سے میلہ دیکھنے آیا ہو۔ اور ٹم ٹم رُکتے ہی جب اُس نے ٹم ٹم والے سے مسافر خانے کا پتہ پوچھا تو یہ بات صاف ظاہر ہوگئی کہ وہ دُور کا کوئی جاتری ہی ہے۔ ٹم ٹم والے نے جب اُسے بتایا کہ مسافر خانہ تو پیچھے ہی چھوٹ گیا تو وہ پچھتایا پچھتایا سا نظر آیا۔ چند لمحوں کے لئے وہ ٹم ٹم ہی پر کھڑا رہا، اور پھر اُسی پر قدرے اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"میں آپ کو مسافر خانے تک پہنچا دوں؟" ایک نوجوان رضاکار نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"جی نہیں شکریہ ——" اُس آدمی نے جواب دیا۔ "میں خود ہی چلا جاؤں گا۔"

پھر وہ اِدھر اُدھر گرد و پیش میں بھری ہوئی ٹولیوں، دکانوں اور بھیڑ بھاڑ کی طرف دیکھنے لگا۔ اور وہ اُس وقت تک اُدھر دیکھتا رہا جب تک ٹم ٹم والے نے اُس سے اُترنے اور ٹم ٹم کا کرایہ دینے کو نہ کہا۔

اُس آدمی نے جلدی سے اپنی جیب سے کچھ پیسے نکال کر ٹم ٹم والے کی طرف بڑھائے اور خود ٹم ٹم سے اُتر کر بکس اُتارنے ہی کو تھا کہ اتنے ٹم ٹم والے نے پیسے گن لئے اور اُس کا بکس تھام لیا۔

"کیا تماشہ کرتے ہیں صاحب!" ٹم ٹم والا ناک بھوں چڑھا کر بولا —— "ایک روپیہ طے کر کے سات آنے پیسے دیتے ہیں آپ؟"

"کس نے ایک روپیہ طے کیا تھا" وہ آدمی ذرا شرمایا شرمایا سا بولا۔

"آپ نے اور کس نے" ٹم ٹم والا زور سے بولا۔ "اسی لئے تو میں پہلے ہی طے کر لیا کرتا ہوں۔"

"طے تو ہوا نہیں تھا" وہ آدمی دھیمی آواز میں بولا۔

"واہ صاحب!" ٹم ٹم والا گرجا۔ "مرد بچے کی زبان ایک۔"

"میں کب کہتا ہوں، مرد کے بچے کی زبان دو۔" وہ آدمی ذرا کھسیانی۔

"تو پھر اگر آپ کی زبان ایک ہے تو آپ پورا کرایہ کیوں نہیں دیتے؟!"

ٹم ٹم والا اتنی زور سے بولنے لگا تھا کہ کچھ آدمی وہاں ٹھہر کر تماشہ دیکھنے لگے۔

"دیکھو دوست میں کسی جنگل میں نہیں رہتا ہوں۔" وہ آدمی سنجیدگی سے کہنے لگا۔ "مگر اتنی دور کا کرایہ تم دس روپے کہہ دیتے تو کیا کوئی دے دیتا؟"

ٹھیکا — ریٹ کھلا ہوا ہے۔" ٹم ٹم والا غصے ہو گیا اور اور بھی زور سے بولنے لگا — "کوئی بھی اسٹیشن سے یہاں میلے تک ایک روپے سے کم میں نہیں لا سکتا۔ جس سے جی چاہے پوچھ لیجئے۔"

"جانے بھی دو یار، کسی اور بُدّھو کو پھنسانا۔ میرا بکس چھوڑ دو۔" اُس آدمی نے بکس کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مگر ٹم ٹم والا بکس کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں کھسک سکا۔

"پھنسانے کی بات نہیں ہے بابوجی،" ٹم ٹم والا تن کر بولا: "آپ روپیہ دیں گے یا نہیں؟"

"فرض کرو کہ نہیں دوں گا، تو تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو؟" اب وہ آدمی بھی تن گیا۔

اور اس تناتنی کی آواز سن کر جو آدمی بھی اُدھر سے گزرتا تماشہ دیکھنے کے لئے ٹھہر جاتا۔ کوئی تو مارپیٹ ہو جانے کے ڈر سے فوراً ہی کھسک جاتا اور کوئی مزا لینے لگتا۔

ٹم ٹم والا چند لمحوں تک اُس آدمی کو گھورتا رہا۔ پھر بولا۔

"کیا کر لوں گا؟" وہ ذرا اکڑ کا "فضول بات بڑھاتے ہیں بابو صاحب، شریفوں کا یہ دستور نہیں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو، میرا بکس چھوڑ دو۔" اُس آدمی نے بڑے زور سے کہا اور پھر بکس کھینچنے کی کوشش کی۔

"ابھی رہنے دیجئے۔ بابوجی تکلیف نہ کیجئے۔ ہاتھ میں موچ آ جائے گی۔" ٹم ٹم والے نے بکس اور بھی قریب کھینچ کر کہا — "ایسے ایسے کتنے پہلوان آئے سرکار، جو ماں کا دودھ پی کر روتے بسورتے رخصت ہو گئے۔"

"زبان سنبھالو جی —" وہ آدمی بہت غصے میں بڑبڑایا۔ "میں شرافت سے پیش آ رہا ہوں۔ اُسی کا نتیجہ ہے کہ تم آگے بڑھے جا رہے ہو۔"

"میں کہاں آگے بڑھ رہا ہوں بابوجی،" ٹم ٹم والے نے کہا: "شرافت تو آپ کی جیب سے نکلی بھاگی جا رہی ہے۔ یہ کہاں کی شرافت ہے کہ ایک روپیہ طے کر کے سات آنے پیسے دے رہے ہیں آپ۔"

"بے کار طے طے کی رٹ لگا رہے ہو۔" وہ آدمی ذرا سنجیدہ ہو کر بولا: "طے وے کچھ نہیں ہوا ہے۔ سیدھی طرح سے جو کچھ دیتا ہوں لے لو۔ اور میرا بکس چھوڑ دو ورنہ ......" وہ ابھی کچھ اور کہنے والا ہی تھا کہ ٹم ٹم والے نے بیچ میں ٹوکا۔

"ورنہ؟ — ورنہ کیا ہوگا بابوجی؟"

"وہ کیا ہوگا بتا دوں؟" وہ آدمی اپنی مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔

"اجی چلو جی —" ٹم ٹم والا منہ بچکا کر بولا — "ایسی ایسی کتنی مونچھیں ہمارے شہر میں چوراہے پر گڑ کی جلیبی بیچا کرتی ہیں بابوجی۔"

وہاں جتنے آدمی کھڑے تھے ہنسنے لگے۔ اور ایک آدمی نے جو ابھی آ کر کھڑا ہوا تھا دوسرے سے پوچھا —

"کیا بات ہے بھائی؟" دوسرے آدمی نے ابھی کچھ جواب بھی نہیں دیا تھا کہ ادھیڑ عمر والے خوش پوش آدمی نے کہا

"دیکھئے نا صاحب آپ کے شہر کا یہ کوچوان بدتمیزی کر رہا ہے۔"

"زبان سنبھال کر بولئے صاحب،" ٹم ٹم والے نے کہا، اور اب وہ بہت زیادہ غصے نظر آنے لگا۔ وہ تماشائیوں کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا — "ایک روپیہ طے کر کے سات آنے پیسے دیتے ہیں اور اوپر سے لڑائی کرنے پر آمادہ ہیں۔ آپ ہی لوگ انصاف کیجئے بدتمیز کون ہے!"

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سارے لوگ ٹم ٹم والے کی طرفداری کر رہے ہوں۔ کسی نے بھی کچھ کہا تو نہیں، لیکن اُن کے چہروں کے اتار چڑھاؤ سے کم سے کم یہی ظاہر ہو رہا تھا، اُس آدمی کی طرف دیکھتے وقت اُن کے چہرے پر حقارت کے نشان صاف نمایاں تھے۔ اور جب وہ ٹم ٹم والے کی طرف دیکھتے تو یہ بات صاف جھلک جاتی۔ جیسے اُن کے دلوں میں اُس کے لئے ہمدردی ہے۔

اور ایک نوجوان نے ذرا آگے بڑھ کر کہہ ہی دیا۔

"صاحب! آپ شریف آدمی ہو کر معمولی سی بات کے لئے جھنجھٹ کر رہے ہیں۔"

"یہ معمولی سی بات ہے جناب؟" وہ آدمی بولا "آپ نو آنے کو معمولی سی رقم سمجھتے ہیں کیا!"

"اجی صاحب،" وہی نوجوان بولا: "نو آنے ہوں چاہے نو لاکھ، بات تو یہ ہے کہ جب کرایہ طے ہو چکا ہے تو پھر جھگڑا کیسا؟"

"واہ صاحب —" وہ آدمی نوجوان کے قریب آ کر بولا — "جب آپ کو پوری بات معلوم نہیں تو آپ بے فیس کی وکالت کیوں کر رہے ہیں؟ کس نے کرایہ طے کیا ہے؟"

"ٹلے! —— ٹم ٹم والا بولا —— ٹلے کس نے نہیں کیا ہے صاحب! فضول آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"کیا ٹلے ٹلے بک رہے ہو جی۔" وہ آدمی بولا "جھوٹ! جھوٹ بولے گا تمہارا خاندان، تمہاری سات پشت۔ مفت میں مجھے غصہ دلاتے ہو۔ میں اپنی زبان پر جان دینے والا آدمی ہوں۔"

"چھوڑیئے صاحب غصہ کسے دکھاتے ہیں۔" ٹم ٹم والا بہت طیش میں آکر بولا۔ "ایسے کتنے غصّوں کا مقابلہ میرے چھوٹے بچّے نے کر لیا ہے۔ رہے آپ، رہی زبان پر جان دینے کی بات، وہ تو یہ بھائی لوگ دیکھ ہی رہے ہیں۔" ٹم ٹم والے نے تماشہ دیکھنے والے لوگوں کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اُن سے اپنی طرف داری میں بولنے کی سفارش کر رہا ہو۔

"زبان سنبھال کر بات کرو جی۔" اس آدمی نے تن کر کہا: "ذرا زبان میں لگام نہیں دیتے۔ بیہودہ۔"

اُس آدمی نے پھر اپنا بکس پوری طاقت سے کھینچنا شروع کیا۔ مگر ٹم ٹم والے نے ایک جھٹکے سے بکس اپنی طرف کھینچ کر اوپر، ٹم ٹم پر رکھ لیا۔ اور وہ آدمی بھی بڑی تیزی سے ٹم ٹم پر چڑھ گیا، ایسا معلوم ہوا جیسے اب ان دونوں میں مار پیٹ شروع ہو جائے گی، اور یہ دیکھ کر کچھ اور آدمی اُدھر آکر جمع ہو گئے۔

"ہونہہ اپنی زبان تو بے لگام ہے اور میری زبان کو بے لگام بتاتے ہیں۔" ٹم ٹم والا طنزیہ ہنسی ہنس کر کہنے لگا —— "بڑے آئے شریف کہیں کے۔"

"تم سیدھے طریقے سے میرا بکس مجھے دیتے ہو یا میں پولس کو بلاؤں؟"

اُس آدمی نے پھر بکس چھیننا شروع کیا۔

ٹم ٹم والا بکس ہی پر بیٹھ گیا اور زور زور سے بولنے لگا۔

"شوق سے پولس کو بلایئے، میرا قصور ہو جب تو میں کچھ ڈروں۔"

"دیکھو جی —— وہ آدمی دانت پیسنے لگا اور کچ کچا کر بولا —— "دیکھو میرا بکس چھوڑ دو ورنہ میں آدمیوں کو بلاتا ہوں۔"

"اجی صاحب ——" ٹم ٹم والا بہت اطمینان سے بولا —— "ویسے ہی ڈھائی تین سو آدمی تو جمع ہی ہیں۔ میرا خیال ہے یہ سب میری مرمت کے لئے بہت کافی ہیں۔"

"تم اپنے حق میں بہت بُرا کر رہے ہو سمجھے تم؟" وہ آدمی تن کر بولا —— "کہے دیتا ہوں نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔"

"اجی چلیئے صاحب بس، اور کو گیدڑ بھبکی دکھانا۔" ٹم ٹم والا اطمینان سے بکس پر بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر تک وہ آدمی کچھ عجیب انداز میں کھڑا رہا، جیسے اب وہ تھک سا گیا ہو۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنے گرد اتنے سارے آدمیوں کو دیکھ کر وہ کچھ سوچ رہا ہو۔ بظاہر یہ بات تھی بھی سوچنے کی۔ اتنے خوش پوش آدمی کا اتنی دیر تک ایک ٹم ٹم والے سے لڑتے رہ جانا بھی خوش پوش آدمی کے لئے بے شک گری ہوئی بات تھی۔ اور سوچ کر وہ آدمی ٹم ٹم پر سے اُتر گیا۔

"چھوڑ دو میرا بکس ——" وہ آدمی بولا۔ جیسے اُس کے پاس بولنے کے لئے کوئی دوسرا جملہ ہی نہیں تھا۔

"آپ میری ٹم ٹم کا کرایہ ادا کر دیجئے۔" ٹم ٹم والے نے اپنا مطالبہ پھر پیش کیا۔

"تو میں کیا تمہیں کرایہ نہیں دے رہا ہوں۔" اُس آدمی نے کہا —— "یہ لو اپنے پیسے۔" اور اُس نے پھر وہی سات آنے جنھیں اب سے چند لمحے پیشتر اُس نے جیب سے نکال کر مٹھی میں رکھ لیا تھا، ٹم ٹم والے کی طرف بڑھا دیئے۔ اور مجمع کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ جیسے وہ یہ چاہ رہا ہو کہ اب یہ مجمع والے اس کی طرف داری میں بولنا شروع کر دیں۔

ٹم ٹم والے نے اُس کے ہاتھ سے پیسے نہیں لئے۔ بلکہ اُس کی ہتھیلی پر رکھے ہوئے پیسوں کو ایک نظر دیکھ کر اُس نے بھانپ لیا۔ کہ یہ وہی سات آنے ہیں۔ اور جھلا بھنا سا ہو کر کہنے لگا۔

"اجی یہ سات آنے پیسے بھی مفت میں کیوں برباد کرتے ہیں۔ جایئے اسی پیسے سے میلہ گھوم لیجئے۔ پانی پوڑی کھا لینا اور ناٹک دیکھ لینا۔"

مجمع کے سارے لوگ ہنسنے لگے۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔

"عجیب چِڈی (ضدی) قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

اور ایک اور آدمی نے مڑ کر دور جاتے ہوئے اپنے چند ساتھیوں کو بھی تماشہ دیکھنے کے لئے پکارنا شروع کیا۔ چند عورتیں بھی غول میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگیں، مبادا کوئی جادو کا تماشہ کرنے والا، تماشہ کر رہا ہو۔

ایک رضاکار بہت غصّے ہو کر بولا۔

"عجیب قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ایک غریب ٹم ٹم والے کے نو آنے ہضم کرکے پتا نہیں اسے کون سی دولت مل جائے گی؟"

"واہ صاحب ـــ" وہ آدمی رضاکار کی طرف مخاطب ہوا: "کیا اسے ساری دنیا کی دولت دے ڈالوں؟"

"ابھی نہیں صاحب" ٹم ٹم والے نے ہی جواب دے دیا" وہ تو اپنے بال بچوں کے لئے چھوڑ جانا۔ مجھ غریب کو تو صرف ایک روپیہ چاہیئے"

تماشائی پھر ہنسنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُنھیں اب نہ تو ٹم ٹم والے سے کچھ مطلب تھا اور نہ اُس آدمی سے، بلکہ اُنھیں دلچسپی کا ایک اچھا خاصہ سامان مل گیا تھا جس سے وہ دل بہلا رہے تھے بعضوں نے تو اپنے آگے کھڑے لوگوں کو باضابطہ طور پر بٹھا دیا تھا۔ جیسے وہ دیر تک یہ تماشہ دیکھتے رہنے کا تہیّہ کر چکے ہوں، اور آگے بیٹھے ہوئے لوگوں نے پورے اطمینان کے ساتھ بیڑی سلگا کر لمبے لمبے کش لگانا شروع کر دیا تھا۔ جیسے اُنھیں ابھی دیر تک بیٹھنا ہو۔ پیچھے سے چند کم عمر لڑکے اندر آنے کی کوشش میں لمبے لمبے آدمیوں کی ٹانگوں کے بیچ سے گھسنے کی جدوجہد شروع کر رکھی تھی۔ بس، ٹم ٹم والے اور اُس آدمی کی بحث اچھا خاصہ تماشہ بن گئی تھی۔

"بابو جی! آپ مفت میں میرا وقت برباد کر رہے ہیں" ٹم ٹم والے نے ذرا لجی انداز میں کہا: "دیکھئے یہی تو کمانے کا وقت ہے۔ اب تک میں ایک سواری اور لا چکا ہوتا"

"تمہارا وقت کون برباد کر رہا ہے" وہ آدمی بولا" اپنے پیسے لو۔ میرا بکس مجھے دو اور دفع ہو جاؤ، تم تو ناحق جھگڑ رہے ہو"

"کتنے پیسے؟" اب کے اُس آدمی کی بات سے ٹم ٹم والے کو یہ خوش فہمی ہوئی کہ شاید وہ آدمی پورا کرایہ دے رہا ہو۔ اُس نے اپنا ہاتھ بڑھا یا۔ لیکن اُس آدمی نے جب پھر اس کے آگے وہی سات آنے پیسے بڑھائے تو وہ بپھر کر بولا ـــ

"سرکار اگر آپ ظلم ہی پر اُتر گئے ہیں تو مجبوراً میں اسی بات کو بہتر سمجھوں گا کہ ایک پیسہ بھی نہ لوں، مگر یہ سات آنے تو ہرگز نہیں لوں گا"

"تو پھر گھر کا راستہ لو، جاؤ یہ سات آنے پیسے بھی نہیں ملیں گے"! اُس آدمی نے اب اپنی جیب سے سگرٹ کیس اور دیا سلائی نکالی۔ اور سگرٹ سلگا کر اطمینان سے کھڑا کھڑا پینے لگا۔

مجمع کا ایک آدمی واقعی غصّے ہو گیا۔ وہ اپنے آگے کے آدمیوں کو ہٹا کر آگے آیا اور بڑے غصّے کے ساتھ کہنے لگا۔

"تو پھر ٹم ٹم والے تم واقعی چلے جاؤ۔ مگر بابو صاحب کا بکس بھی ساتھ لیتے جاؤ"

"اب تو یہی کرنا ہوگا ـــ" ٹم ٹم والے نے اپنی آستین چڑھالی۔ مگر وہ آدمی چپ چاپ کھڑا سگریٹ پیتا رہا۔ تماشائیوں میں سے ایک نے کہا۔

"ارے ـــ لگتا ہے بابو صاحب کے پاس سات آنے سے زیادہ پیسے ہی نہیں ہیں"

"تو پھر سیدھی طرح بات کریں تو میں سچ کہتا ہوں معاف ہی کر دوں" ٹم ٹم والے نے اس آدمی کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھا، اور جب چند لمحوں تک اُس آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا تو تماشائیوں میں سے ایک نے کہا۔

"کیا صاحب، آپ کے پاس سات آنے سے زیادہ پیسے نہیں ہیں"!

"ہیں کیوں نہیں" وہ آدمی جلدی سے بولا: "مگر پیسے لٹانے کے لئے تو ہرگز نہیں ہوتے، کیا آپ دیدہ و دانستہ سات آنے کی چیز ایک روپے میں خریدنا پسند کریں گے"؟

"دیکھا نا حضور!" ٹم ٹم والا مجمع کی طرف مخاطب ہوا ـــ "یہ آدمی محض بدمعاشی کر رہا ہے"

سارے تماشائی آپس میں کچھ کانا پھوسی کرنے لگے اور اب کے ایک نیا رضاکار آگے بڑھا۔ آگے بڑھ کر اُس نے دو سے اپنی لاٹھی زمین پر پٹکی۔ پھر اپنی قمیص کا کالر درست کیا اور، ذرا تن کر ٹم ٹم والے سے کہنے لگا۔

"اے تو بھی عجیب بدھو ہے۔ بابو صاحب کا بکس لے کر چلتا بن۔ بس کل ٹیڑھ نکل جائے گی"

ایک دوسرے رضاکار نے بھی آگے بڑھ کر کہا۔

"واقعی نرا بدھو ہے۔ نہیں جانتا کہ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلا کرتا"

اور ان رضاکاروں کی دیکھا دیکھی تماشائیوں میں سے بھی کچھ لوگوں نے ٹم ٹم والے کو یہی رائے دے ڈالی۔

ٹم ٹم والے نے سچ مچ گھوڑے کی باگ موڑ لی۔ اور کہنے لگا:

"اچھا بابو جی ــــ اب میں بھی گھر کا راستہ لیتا ہوں۔ مجھے تو اس بکس کی ضرورت نہیں۔ پر ایک روپیہ میں تو یہ بکس ٹھاٹھ سے بک جائے گا۔"

ٹم ٹم والے نے باگ ذرا ڈھیل چھوڑی اور گھوڑا ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ اُس آدمی نے گھوڑے کی باگ تھام لی اور جلدی جلدی کہنے لگا۔

"ارے ارے ــــ میرا بکس اتار دو، اُتار دو میرا بکس ــــ چور ہو تم ــــ ڈاکو، ڈاکو......"

اور گھوڑا رُکا ہی تھا کہ وہ آدمی جلدی سے ٹم ٹم پر سوار ہو گیا، اور ٹم ٹم والے کی کلائی تھام لی۔ ٹم ٹم والے نے سمجھا کہ اب وہ اُس سے ہاتھا پائی کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ بھی اپنی مدافعت کے طور پر کھڑا ہو گیا اور تماشائیوں نے سمجھا کہ اب دونوں اُلجھ پڑیں گے۔ اس لئے وہ شور و غل مچاتے ہوئے ٹم ٹم کے پاس سمٹ آئے۔ اور شور و غل سن کر اِدھر اُدھر سے بھی بہت کافی لوگ دوڑ دوڑ کر آئے اور بھیڑ میں شامل ہو گئے۔

ٹھیک اُسی وقت، اُس آدمی نے ٹم ٹم والے کی کلائی چھوڑ دی اور مسکرا کر بہت زور سے بولا۔

"ٹھہرو ــــ"

یک بیک سارا شور تھم گیا۔

اُس آدمی نے اپنی جیب سے دو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور ٹم ٹم والے کی طرف مڑ کر کہا۔

"لو میرے دوست اب تک تو ایک سواری اور لا چکے ہوتے تم، لیکن ایک روپے کے بدلے دو روپے لو ــــ اور سنو! ابھی مجھے تمہاری ٹم ٹم پر کچھ دیر اور کھڑا رہنا ہے۔ جس کے لئے یہ ایک روپیہ اور لے لو۔"

اُس نے ایک روپے کا ایک نوٹ بھی اُس کی ہتھیلی پر اور رکھ دیا۔

ٹم ٹم والا اور سارے تماشائی بڑی حیرانی سے اُس پُر اسرار آدمی کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ جھک کر اپنے بکس سے کچھ نکال رہا تھا۔ پھر وہ آدمی اپنے دونوں ہاتھوں میں چھوٹی بڑی دس پندرہ شیشیاں لئے ٹم ٹم پر کھڑا ہو گیا، اور کہنے لگا۔

"بھائیو! ہندوستان میں ہزاروں دوا بیچنے والے ہیں۔ پر اُن کا مجمع لگانے کا طریقہ وہی پُرانا ہے۔ کوئی ڈگڈگی بجا کر مجمع لگاتا ہے۔ کوئی میجک دکھا کر، تو کوئی کہانی سنا کر۔ لیکن آپ نے دیکھا مہربان! میرا طریقہ کتنا نیا اور مفید ہے۔ اسی طرح میرے بھائیو، دنیا میں بوڑھے کو جوان اور جوان کو نوجوان بنانے کی ویسے تو ہزاروں دوائیاں نکلیں لیکن بس سب کی سب چار سو بیس ثابت ہوئیں۔ لیکن میرا یہ روغنِ جوانی مہربان! میں اس کی کہاں تک تعریف کروں۔ ساٹھ برس کا بوڑھا استعمال کرے تو بیس برس کا جوان ہو جائے، اور بیس برس کا جوان استعمال کرے تو اٹھارہ برس کا پٹھا نوجوان بن جائے۔ میرے بھائیو ــــ بڑی بڑی کتابوں میں لکھا ہے۔

سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے

اور ــــ خوشبو آ نہیں سکتی ہے اُن کاغذ کے پھولوں سے

سو مہربان میری دوا وہ کاغذ کا پھول نہیں، اور اسی لئے تو بھگت کبیر نے لکھا تھا میرے بھائیو کہ ــــ

دانا خاک میں مل کر گُل گلزار ہوتا ہے

لاکھ تدبیر کرو، کہنے سے کیا ہوتا ہے ــــ"

اور سارا مجمع اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جوش ملیح آبادی

اعترافِ عجز

لوگ کہتے ہیں کہ میں ہوں شاعرِ جادو بیاں
صدرِ معنی، داورِ الفاظ، امیرِ شاعراں

اور خود میرا بھی کل تک، خیر سے، تھا یہ خیال
شاعری کے فن میں ہوں من جملۂ اہلِ کمال

لیکن اب آئی ہے جب اِک گونہ مجھ میں پختگی
ذہن کے آئینے پر کانپا ہے عکسِ آگہی

آسماں جاگا ہے سر میں، اور سینے میں زمیں
اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں

جہل کی منزل میں تھا مجھ کو غرورِ آگہی
اِتنی لامحدود دُنیا، اور میری شاعری!

اَلاماں آفاق کا دِل اور یہ طغیانِ سوز!
اب کھلا مجھ پر کہ اِک طفلِ دبستاں ہوں ہنوز

زُلفِ ہستی، اور اتنے بے نہایت پیچ و خم!
اُڑ گیا رنگِ تعلّی، کھُل گیا اپنا بھرم

میرے شعروں میں فقط اک طائرانہ رنگ ہے،
کچھ سیاسی رنگ ہے، کچھ عاشقانہ رنگ ہے

کچھ مناظر، کچھ مباحث، کچھ مسائل، کچھ خیال
اک اُچٹتا سا جمال، اِک سرسری زانو سا جلال

میرے کاخِ شاعری کی نیو میں سنگِ فتور
ایک طفلانہ بلوغ، اِک کھوکھلا سا حسنِ شعور

میرے قصرِ شعر میں غوغائے فکرِ ناتمام
ایک دردانگیز درماں، اِک شکست آمادہ جام

گاہ سوزِ چشم و ابرو، گاہ سازِ نادِ نوش
گاہ خلوت کی خموشی، گاہ جلوت کا خروش

چہ چہے کچھ موسموں کے، زمزمے کچھ جام کے
دیرِ دل میں چند ٹکڑے مرمریں اصنام کے

چند زلفوں کی سیاہی، چند رُخساروں کی آب
گاہ حرفِ بے نوائی، گاہ شورِ انقلاب

وہ بھی کچھ جاگیردارانہ یہ قولِ ناقداں
بے سواد و بستۂ رسم و رہِ رومانیات*

وصل کے دو چار نغمے، ہجر کی ایک آدھ آہ
قعر سے ناواقفیت، سطحِ دریا پر نگاہ

گاہ مرنے کے عزائم، گاہ جینے کی اُمنگ
بس یہی سطحی سی باتیں، بس یہی اوچھے سے رنگ

اِتنی اوچھی رنگ سازی سے کھلا جاتا تھا میں
اِتنی عبرت ناک سطحیت پہ اِترا تا تھا میں

بے خبر تھا میں کہ دُنیا رازِ اندر راز ہے
وہ بھی گہری خامشی ہے جس کا نام آواز ہے

جو یہاں اظہر من الشمس و چراغِ طور ہے
وہ درخشاں چیز بھی اک حلقۂ بے نور ہے

یہ سہانا بوستاں سرو و گل و شمشاد کا
ایک پل بھر کا کھلنڈراپن ہے ابرو باد کا

* Roman سے یہ لفظ بنایا گیا ہے۔

ہر ترنّم ہے دلِ خوں بستہ کی اک موجِ زہر
شرم، شوخی کی تھکاوٹ، عشوہ، عجزِ دلبری
بوسے محل کیا، ایک عیلواد شوخی گرد کی
برق، بینائی پر اک ضربِ سحابِ تیرگی
اس مسلسل آب و گل میں یہ حیاتِ آدمی
ابتدا و انتہا کا علم نظروں سے نہاں
جہل کا اک تہ بہ تہ ہر ادعائے آگہی
روشنی بن کر اکڑتا پھر رہا ہے برملا
انجمن میں تخلیئے ہیں، تخلیوں میں انجمن
عام معلوماتِ دنیا، واقعاتِ صبح و شام
ہر گماں میں اک یقیں سا، ہر یقیں میں سو گماں
روشنی امیدوں کی پیشانی میں غلطاں ابرِ بیم
ایک اک گوشے سے پیدا وسعتِ کون و مکاں
جنگ میں پیغامِ رحمت، سنگ میں پیکِ بہار
لیلیٰ سنجیدگی کے لب پہ سرمستی کا حرف
تخم کے سینے میں غلطاں گلستانوں کے نکات
ہر کرن، ایک ابر، ہر تعبیر اک ژولیدہ خواب
ہر نمایاں نقش، اک پنہاں فریبِ ابصار کا
ہر خزف، الماس — ہر زنجیر، تارِ عنکبوت
پیکرِ ہستی پہ ڈھیلا ہے مظاہر کا لباس
برق کی لہروں کی وسعت، الحفیظ و الاماں
نارسا کیا، مدح خواں، اور مدح خواں بھی کم سوا
خارج از وہم و گماں ہے عمرِ لیلائے زمیں
کیوں نہ پھر سمجھوں سبک اپنے سخن کے رنگ کو
لیلیِ آفاق ملتی ہی رہی بے نقاب
دائمی قدروں کی ہر ساعت تجرباتی رہی

ہر تبسم ہے خراشِ سینہ کی ہلکی سی لہر
تازہ اک رنگیں سہارا، نازکی اک لاغری
زمزمے کیا، ایک خوش فعلی ہے آزردگی
شعلۂ جوالہ، قرطاسِ کتابِ تیرگی
گریہ کی صرف ایک پل بھر موش ہے بانگی
ٹم ٹماتا سا دیا، دو ظلمتوں کے درمیاں
موت کا اک مسخرا پن ہے بقائے زندگی
تہ بہ تہ تاریکیوں کا خندۂ دنداں نما
ہر شکن میں اک کھچاوٹ، ہر کھچاوٹ میں شکن
فکرِ انسانی کے محبس، عقلِ انسانی کے دام
ناخنِ تدبیر بھی خود ایک گتھی بے اماں
ہم سوادِ گیسوئے پرخم صراطِ مستقیم
ایک اک خوشے میں پنہاں صد بہار بجا و دل
پرنیاں میں تیغ کی باڑھ، آب میں آہن کی دھار
برف میں شعلے تپاں، شعلوں کی طراری میں برف
خاک کی خشکی میں پرافشاں قوائے کائنات
ہر سحر، ایک دیوِ شب، ہر جلوہ اک گہرا حجاب
ہر گلِ شاداب، اک بہروپیا پن خار کا
ہر کلید، اک قفل، ہر جھنکار اک جولاں سکوت
اور میں اس کی ذرا سی اک شکن سے روشناس
اور میں صرف ایک کوندے کی لپک کا رازداں
نابلد، نادان، ناواقف نہ دیدہ، نامراد
اور اک لمحے کی پیمائش پہ میں قادر نہیں
خلق نے الماس کے بدلے تراشا سنگ کو
اور یہاں عورت، مناظر، عشق، صہبا، انقلاب
اور یہاں وقتی مسائل ہی کی عیاشی رہی

خُردہ ہائے لعل و گوہر آسماں کھولا گیا
اور مَیں رندِ سیہ رُو کو ٹکے تولا گیا

پا رہا ہوں شاید اب اس تیرہ حلقے سے نجات
کیوں کہ اب پیشِ نظر ہیں عقدہ ہائے کائنات

کائنات اِک کارگاہِ سطوت و کارِ جلال
جلوہ گر جس کے نقائص میں بھی رنگِ صد کمال

یہ بھنچی اُلجھی زمیں، یہ پیچ در پیچ آسماں
اَلاماں و اَلاماں و اَلاماں و اَلاماں

ایک مُنّا سا ستارہ، ایک ننھا سا شرار
یہ تزلزل، یہ تلاطم، یہ تموّج، یہ فشار!

اِک نفس کا تار اور یہ شورِ عمرِ جاوداں!
اِک کڑی اور اُس میں زنجیروں کے اتنے کارواں!

اِک تبسّم اور اتنے خونِ مصالح کے نجوم!
ایک مبہم نقش اور اتنی شعاعوں کا ہجوم!

ایک اِک لمحے میں اِتنے کاروانِ انقلاب
ایک اِک ذرّے میں اتنے ماہتاب و آفتاب!

یہ گرج، یہ برق، یہ طوفاں، یہ صرصر، یہ سموم
بندگانِ چند اور اِتنے خداؤں کا ہجوم

نے کی جنبش اور اِتنے حلقہ ہائے بے شمار
نے کی کروٹ اور یہ ہنگامۂ رقصِ شرار

ایک حرف اور اُس میں یہ لاکھوں ہوائی دائرے
جن کی آوازیں اگر سن لے تو دنیا گونج اُٹھے

ایک پَر تو اور فضائے بے کراں پر ہیبت خیز
اِک دیا اور آندھیوں کی فوج سے گرمِ ستیز

ایک بوند اور ہفت قلزم کے ہلا دینے کا جوش
ایک گونگا خواب، اور تعبیر کا اتنا خروش

کوہ کی رفعت میں اتنی پستیوں کے خط و خال
کاہ اور اِتنے عناصر کے مساعی کا مآل

اِک ہیولیٰ اور یہ اَشکال و اَسماء کا ہجوم
جہلِ مطلق کے سیہ خانے میں یہ رقصِ علوم

بہر یک ساعت، برائے تابشِ یک بامداد
اِتنی سعیِ آب و آتش، اتنی جہدِ برق و باد

ایک شبنم، اور اِتنے تند شعلوں کی ترنگ!
اِک صدا اور اِتنے شبہے، اِک نظر اور اِتنے رنگ

اِک کلی اور اُس میں صدیوں کی متاعِ رنگ و بو
صرف اِک لمحے کی رگ میں اور قرنوں کا لہو

ہر قدم پر نصب اور اَسرار کے اتنے خیام!
اور اِس منزل میں میری شاعری، میرا کلام!!

جس میں علمِ آسماں ہے، اور نہ اسرارِ زمیں
ایک خس، اِک دانہ، اِک جَو، ایک ذرّہ بھی نہیں

نوعِ انسانی کو جب مِل جائے گی رفتارِ نور
شاعرِ اعظم کا تب ہوگا کہیں جا کر ظہور

خاک سے پھوٹے گی جب عمرِ ابد کی روشنی
جھاڑ دے گا موت کی دامن سے جب گرد آدمی

جب تُولائے بحر و بر پہ آدمی ہوگا سوار
جب بنے گا بندۂ مجبور الٰہِ روزگار

جب بشر کی جوتیوں کی گرد ہوگی کہکشاں
تب جنے گی نسلِ آدم شاعرِ جادو بیاں

فکر میں کامل، نہ فنِ شعر میں یکتا ہوں مَیں
کچھ اگر ہوں تو نقیبِ شاعرِ فردا ہوں مَیں

جوشؔ ملسیانی

اُردو نظم میں فارسیت

فارسیت سے نہ تو عطف و اضافت مُراد ہے اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ فارسی کے مانوس الفاظ اور مقبول ترکیبوں کو گردن زدنی قرار دیا جائے۔ ایسے الفاظ اور ایسی ترکیبیں تو اُردو نظم کی زینت ہوتی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ وہ ایک خاص حد تک ناگزیر بھی ہیں۔ ان کی کثیر تعداد عوام کی بول چال میں بھی شامل ہے۔ بعض عطف و اضافت بھی ایسے ہیں جو بے تکلف مستعمل ہوتے اور جزوِ زبان سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً آب و ہوا، رنگ و بو، نمک و روغن۔ آب و دانہ۔ خواب و خیال۔ جان و مال۔ گرد و غبار۔ اہلِ وطن۔ اہلِ ہند۔ شامتِ اعمال سرزمینِ پنجاب۔ دریائے جہلم وغیرہ۔ بعض ایسے ہیں کہ کثرتِ استعمال نے اُن کی اضافتیں اُڑا دی ہیں مگر دراصل وہ مرکب اضافی ہیں۔ اور ان پر فکِ اضافت کا عمل بالکل بے ارادہ حاوی ہو گیا ہے مثلاً صاحب خانہ۔ پُل صراط۔ شاہ جہان وغیرہ۔ بعض فارسی ترکیبیں بھی ایسی ہیں جو محاورہ کی صورت میں مانوس و مقبول ہو چکی ہیں اور فارسیت کی زد سے بالاتر ہیں۔ مثلاً:۔

تا وقتے کہ۔ بہ شرطے کہ۔ حال آں کہ۔ با ایں ہمہ

۱۔ حسابِ اصلا نہ پوچھ مجھ سے میرے دل کے زخموں کا
حسابِ دوستاں در دل اگر وہ دل ربا سمجھے

۲۔ ذاتِ خود رفتہ ہوں جس کو خود ہی نے ... خدائی میں اگر ڈھونڈا نہ پایا

۳۔ قہرِ درویش بہ جانِ درویش

۴۔ سوال از آسماں کب تک جواب از ایساں کب تک

۵۔ براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو اس کو کہتے ہیں

اس لئے اس قسم کے مقبول و مروج فارسی الفاظ اور مرکبات کو فارسیت کہنا ہرگز ہرگز درست نہیں۔ ہاں جو الفاظ اور مرکبات عوام تو عوام خواص کی زبان اور بول چال میں بھی شامل نہیں اور محض ضرورتِ شعری کی آڑ میں مستعمل ہوتے ہیں یا مستعمل ہوتے ہیں۔ وہی فارسیت ہیں۔ اور فصحائے اُردو اور ناقدانِ سخن انھیں کو محلِ نظر سمجھتے ہیں اور ان کے ترک میں حق بجانب ہیں۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ اس لفظ میں فارسیت ہے تو یہی نکتہ ان کا موضوعِ بحث ہوتا ہے کہ یہ عوام و خواص دونوں کی بول چال اور روزمرہ کے خلاف ہے۔

چوں کہ اُردو نظم کے ابتدائی دَور میں یہ فارسیت اُردو نظم پر بےطرح چھائی ہوئی تھی اس لئے اسے روزمرہ کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ فصحائے اُردو کا نا قدانہ شعور ان اجنبی اور نامانوس الفاظ کو خارج کرنے کی طرف توجہ مبذول کرتا۔ چناں چہ ان کی یہ کوشش اُردو نظم کے تیسرے دَور سے شروع ہو گئی اور آخری دَور تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اگر فارسی درباری زبان اور حکام تک رسائی پانے کا ذریعہ نہ ہوتی اور خواص اس زبان کے اتنے دل دادہ و وارفتہ نہ ہوتے کہ اُردو میں خط لکھنا بھی اپنی تحقیر خیال کرتے تو یہ کوشش اُردو نظم کے آخری دَور تک ضرور اپنا کام کر چکتی۔ مگر خواص کا مذاقِ سخن فارسی آشنا ہونے کی وجہ سے آخری دَور تک بھی ہماری اُردو نظم پورے طور پر فارسیت سے مبرا نہ ہو سکی اور بعد میں آنے والے فصحا کو اس کوشش کی تکمیل میں معروف ہونا پڑا۔ ان بزرگوں نے جہاں تک ہو سکا۔ خدمتِ زبان کے خیال سے اپنا فرض ادا کیا اور بہت کچھ کامیابی حاصل کی مگر ان کے بعد ملک کے سیاسی حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ اُردو نظم پر بھی انقلابی تحریکوں کے اثرات غالب آ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب بھی اُردو نظم میں کچھ الفاظ اور مرکبات ایسے نظر آتے ہیں جن میں فارسیت پائی جاتی ہے اور شاداں ادیب جو تھوڑا سا کام ضروری شعری یا انقلابی تحریکوں کی وجہ سے پورا نہ کر سکے تھے۔ وہ اب تک شرمندۂ تکمیل نظر آتا ہے۔ ضرورت ہے کہ فصاحتِ زبان کے حامی ان الفاظ اور مرکبات پر بھی غور فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ عطف و اضافت۔ ان کا مسلسل استعمال فصحائے متاخرین نے تین سے زیادہ تعداد میں معیوب قرار دیا ہے۔ اُردو ہندی کے اس مخالفانہ دور میں ضرورت ہے کہ جہاں ہندی شعراء سنسکرت کے بھاری بھرکم اور نامانوس الفاظ کو آخری حد تک کم کر دیں وہاں اُردو شعراء کو بھی لازم ہے کہ دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب لانے اور مخالفت کی وجوہ کو کم اور دور کرنے کے لئے عطف و اضافت کی تعداد بھی ایک یا دو تک محدود کر دیں۔ قادر الکلام اصحاب کو اس میں کوئی خاص دشواری یا دقت بھی محسوس نہیں ہوگی۔ باقی رہے وہ اصحاب جو اپنے لاابالیانہ طرزِ عمل سے ہر ایک زنجیر کو توڑ رہے بلکہ توڑ چکے ہیں۔ ان سے نہ تو یہ امید ہے کہ وہ صحتِ زبان کی کچھ پروا کریں اور نہ یہ ضرورت ہے کہ ایسی باتیں اُن کی خدمت میں گزارش کی جائیں۔ اس مضمون میں وہی ادیب اور شعراء میرے مخاطب ہیں جو صحتِ زبان کے شیدائی اور فصاحت کے علم بردار ہیں۔ یہ برگزیدہ اصحاب اپنے عزیزوں کے کلام میں اصلاح دیتے وقت بھی اگر اس اصول کو زیرِ نظر رکھیں اور وجہ اصلاح ظاہر کرنے میں اس کی وضاحت فرماتے رہیں تو اوسط درجہ کی مشق رکھنے والے بھی اپنے تازہ افکار میں محتاط ہو جائیں گے۔ اس طرح کوالیٔ عطف و اضافت کا سسٹم معقول حد تک کم ہو جائے گا اور اس قسم کے مرکبات کا صرف ناگزیر استعمال ہی باقی رہ جائے گا۔

۲۔ فارسی حروفِ جار کا استعمال بھی فارسیت ہی میں شمار ہونا چاہیئے بہ شرطیکہ یہ استعمال روزمرہ سے خارج ہو۔ مثلاً:۔

از — پس از فنا۔ پس از مرگ۔ بعد از فنا۔ بعد از مرگ۔

ان کی جگہ پسِ فنا۔ پسِ مرگ۔ بعدِ فنا۔ بعدِ مرگ آسانی سے کہا جا سکتا ہے ع

غیر از خیالِ یار مرے دل میں کچھ نہیں

یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ قبل از مرگ واویلا چوں کہ محاورہ ہے اور اُردو کی بول چال میں سب کی زبان پر ہے اس لئے یہ ناروا نہیں ہو سکتا۔

ب — بہ معنی در اور بہ معنی بر وغیرہ حرف جار ہے۔ اس کا استعمال بھی فارسیت ہے۔ مثلاً ع

۱۔ صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

۲۔ ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں

اس کی بھی بعض صورتیں فصیح ہیں۔ مثلاً دربدر۔ جا بہ جا۔ پے بہ پے وغیرہ

تا — تک کے معنی میں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں ع

۱۔ تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

۲۔ پانی ترے خنجر کا اگر تا کمر آئے

۳۔ چاندنی کی سیرِ خوباں تا سحر دیکھا کئے

۳۔ فارسی مصدر کا استعمال۔ مثلاً ع

ا۔ سنگِ دنیا پس از مردن بھی دامن گیر تھا ہو

ب۔ تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن

ج۔ تو اور ایک وہ ناشنیدن کہ کیا کہوں

د۔ نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری

ہ۔ شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

و۔ کہ انداز بہ خوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

ز۔ جیسے مستسقی کا دم ہو وقتِ رفتن آب میں

۴۔ تا بہ معنی جب تک۔ مثلاً اس دعائیہ شعر میں ؎

رہے دارا کو تا نام آوری تاجِ کیانی سے
سکندر تا ہو نامی سکۂ کشورستانی سے

تری شمشیر جوہر دار میں نصرت کا جوہر ہو
ترا حامی ابوبکر و عمر عثمان و حیدر ہو

۵۔ تا بہ معنی تاکہ ؎

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جائے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

۶۔ کاش کی جگہ کاشکے ع

کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا

۷۔ آخرش بجائے آخر۔ یہ استعمال بھی فارسی ہی سے مخصوص ہے۔

۸۔ بس کہ۔ از بس کہ ؎

ا۔ بس کہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے

ب۔ بس کہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا

ج۔ بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا

د۔ ہو گیا ہوں بعجب میں از بس کہ میں زار و نحیف

۹۔ گویا کی جگہ گویا کہ ؎

کیا تجلی ریز جلوہ آج مے خانے میں تھا   آفتاب اُترا ہوا گویا کہ پیمانے میں تھا

ما مکاتِ علت۔ تعجب ہے کہ اس کاف کی فارسیت پر ابھی تک کسی بزرگ نے توجہ مبذول نہیں فرمائی۔ اور محتاط شعراء بھی ابھی تک اس کو استعمال فرما رہے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اُردو کی بول چال سے خارج ہے۔ جلد بازی نہ کرو کہ عجلت بُری ہوتی ہے —— میں آج وہاں نہیں جا سکتا کہ بیمار ہوں —— مجھے معاف رکھو کہ میری طبیعت ناساز ہے —— جب اس طرح کوئی نہیں بولتا تو نظم میں اسے استعمال کئے جانا کیوں بول چال کے خلاف نہ سمجھا جائے۔ یہ کاف بھی فارسی ہی سے اُردو نظم میں آگیا تھا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

ا۔ محبت کے رود گر استخوانم توتیا گردد
کہ از سائیدنِ صندل کجا نقصان شود بو را

ب۔ پئے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

ج۔ خریدارش مشو اے تاجرِ دل
کہ ایں سودا سراسر پُر زیان است

د۔ زکوٰۃِ مال بدر کن کہ فضلۂ رز را
چو باغباں ببرد بیش تر دہد انگور

ہ۔ منشیں ترش تو از گردشِ ایام کہ صبر
گرچہ تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد

و۔ دراز دستی من چاکے اگر فگند چہ عیب
کہ پیشِ دلقِ ورع با ہزار پیوند است

اب اس کی تقلید میں اُردو کی مثالیں بھی ملاحظہ ہوں۔ سب سے پہلے اپنا ہی ایک شعر عرض کرتا ہوں۔ تاکہ یہ ظاہر ہو کہ میں خود بھی مدت تک اس غلطی میں گرفتار رہا ہوں ؎

کہاں تک دھوئیں اشکوں سے ہم اپنے دامنِ دل کو
کہ ہر روز اک نہ اک داغِ تمنا دیکھ لیتے ہیں

اب اور مثالیں سنیئے

ا۔ کہے ایک جیب سی لے انسان دو
کہ حق نے زباں ایک ہی کان دو

ب۔ بہے بحرِ فنا میں جلد یا رب لاشِ بسمل کی
کہ بھوکی مچھلیاں ہیں جوہرِ شمشیرِ قاتل کی

ج۔ ہزار شکر نہ ضائع ہوئی مری کھیتی
کہ برق و سیل میں تقسیم دانہ دانہ ہوا

د۔ ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

ہ۔ بدبختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

آخری شعر کے مصرعِ ثانی میں یہ کاف بہت آسانی سے خارج کیا جا سکتا ہے اور اسے اس طرح کہا جا سکتا ہے ع

اندھیرے میں تو سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

۱۱۔ اے کہ۔ اُردو کی بول چال سے یہ بھی خارج ہے۔ مگر نظم میں اس کا استعمال شد و مد سے ہو رہا ہے۔ مثلاً ؎

اے کہ تیرے فیض سے پُر نور ہے بزمِ سخن
اے کہ تیری یاد سے مسرور ہے بزمِ سخن

شروع کے دس بارہ اشعار میں ممدوح کو اسی طرح مخاطب کیا گیا ہے اس کے بعد جوابِ ندا ہے۔ نئی شاعری میں اس فارسیت کی کثیر مثالیں آئے دن نظر آتی رہتی ہیں۔ حرفِ ندا کے بعد کاف کو چھوڑ دیا جائے تو فارسیت بھی نہیں رہتی اور اسلوبِ بیان میں بھی اس کاف کا اخراج سدِّ راہ نہیں ہوتا۔ مثلاً حالی مرحوم کے یہ اشعار ؎

اے سپہرِ بریں کے سیارو　　اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دل فریب فضا　　اے لبِ جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری　　اے شبِ ماہتاب تاروں بھری
اے نسیمِ بہار کے جھونکو　　دہرِ ناپائدار کے دھوکو

۱۲۔ جا بمعنی جگہ۔ ذوق کا یہ مصرع دیکھئے۔

کہ شمسِ بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدرِ منیر

یہ مصرع بھی اسی قبیل سے ہے ع

نہیں تو زینتِ محفل تو جا میری بھی خالی ہے

اِس جا۔ اُس جا۔ کس جا وغیرہ بھی آں جا۔ ایں جا۔ کجا کا عجیب و غریب اُردو ترجمہ ہیں۔

۱۳۔ تماشا کرنا۔ اُردو کی بول چال میں اس کا مفہوم شرح کا محتاج نہیں مگر سیر کرنے اور دیکھنے کے معنی میں فارسی محاورہ کا یہ لفظی ترجمہ بلاشبہ

محلِ نظر ہے۔

فارسی کی مثال ۔ غنچی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کُن

اُردو کی مثال ۔ تماشا کرائے محوِ آئینہ داری

تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

زندگی کردن کی جگہ زندگی کرنا اور بُو کردن کی جگہ بُو کرنا یعنی سونگھنا بھی اسی قبیل سے ہیں۔

۱۴۔ رہ بمعنی راہ ۔ ع

۱۵۔ نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

نشہ (فعلن کے وزن پر) جب خواص وعوام کی زبان پہ یہ لفظ فعل کے وزن پر یعنی ادا ۔ دُعا وغیرہ کا ہم وزن ہے۔ مثلاً ذوق کے اس شعر میں ؎

رات مے خانے میں ساقی جو نشے میں بہکا

خُم کے شیشے کو لگا کہنے خمِ جامِ شراب

تو پھر اس کو ترکیبی صورت کے بغیر فعلن کے وزن پر استعمال کرنا فارسیت ہی کہا جائے گا۔ مثلاً ذوق کا یہ مطلع ؎

نشہ دولت کا بد اطوار کو جب آن چڑھا

سر پہ شیطاں کے اک اور بھی شیطان چڑھا

متروکاتِ زباں کی بحث میں یہ نکتہ بہت قابلِ لحاظ ہے۔ کہ جو الفاظ مردہ ہو چکے اور عوام یا کم سے کم شرفا و فصحا کی زبان پر نہیں رہے ہیں۔ صرف انھیں کا ترک و اخراج جائز ہوتا ہے اور انھیں کو متروکات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جو الفاظ ابھی شرفا و فصحا کی زبان میں شامل ہیں۔ انھیں متروک قرار دینا محض زبردستی ہے۔ فارسیت کی مثالوں میں جو الفاظ نذکور ہوئے ہیں وہ اسی اصول کے ماتحت اس مضمون میں شامل کئے گئے ہیں۔ اسی قبیل کے کچھ الفاظ اور بھی ہیں۔ اُنھیں بھی فارسیت ہی کہنا پڑتا ہے۔

گر بجائے اگر ۔ یہ لفظ بول چال میں تو در کنار۔ کتابی نثر میں بھی کوئی نہیں لکھتا۔ یہ فارسی کی نثر میں بھی نہیں ہے۔ مگر اُردو نظم میں ابھی تک اس کا استعمال (چند ثقات شعراء کو چھوڑ کر) جاری ہے۔ اس کی وجہ اگر دریافت کی جائے تو ضرورتِ شعری ہی کا عذرِ لنگ پیش کیا جاتا ہے۔ مگر یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ جو ثقات شعراء اسے متروک قرار دے چکے ہیں کیا وہ اس کی جگہ لفظ اگر کو استعمال کرنے سے شعر نہیں کہہ سکتے۔

۱۷۔ وگرنہ بجائے ورنہ ۔ اُردو کے روزمرہ میں سب ورنہ بولتے ہیں اس لئے وگرنہ قابلِ ترک ہے ؎

موت نے کر دیا لاچار وگرنہ انساں

ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

۱۸ ۔ گرچہ بجائے اگرچہ ۔ جب گر قابلِ ترک ہے تو گرچہ کا ترک شک وشبہ سے بالاتر ہے ؎

ا ۔ عاشقوں سے گرچہ مطلب کچھ نہیں

آپ پھر پیدا ہوئے کس کے لئے

ب ۔ گرچہ ہے کس کس برائی سے مگر با ایں ہمہ

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

ج ۔ گرچہ ہے ترکِ تعلق پردہ دارِ رازِ عشق

پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

۱۹ ۔ مگر بمعنی شاید ۔ یہ بھی فارسی ہی سے مخصوص ہے ؎

سنگِ اسود تھا مگر سنگِ فسانِ تیغِ عشق

زخم میرے کیا ہیں دروازے ہیں بیت اللہ کے

۲۰ ۔ صورت بمعنی مانند ع

ا ۔ میری آنکھوں میں وہ پھرتے ہیں نظر کی صورت

ب ۔ آنکھ دن رات کھلی رہتی ہے در کی صورت

اس لفظ کا صحیح استعمال فارسی ہی کی ترکیب میں بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً

ا ۔ صورتِ اشک گرا دیں گے نظر سے اک دن

ہے اُن آنکھوں سے یہی مجھ کو دکھائی دیتا

ب ۔ صورتِ غنچہ کہاں تاب تکلم مجھ کو

منہ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسم مجھ کو

۲۱ ۔ نے بمعنی نہیں ۔ دیر سے متروک ہونے کے باوجود اب بھی لاابالی شعراء اس کا استعمال فرما رہے ہیں۔

۲۲ ۔ ساں ۔ بہ ساں ۔ آسا بمعنی مانند ۔ یہ الفاظ اگرچہ ترکیبی صورت میں مستعمل ہوتے ہیں۔ مگر نامانوس اور فارسیت کہے جانے کے مستحق ہیں۔ مثلاً ؎

د- شبِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم
اور آتے تھے پسینوں پہ پسینے

ب- شمع آسا کبھی روتے کبھی ہنستے گزری

ج- بساطِ نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

وے اور ولیکن بمعنی مگر یا لیکن ؎

د- دیکھی مسافر کسی شہر کا
کہ تھا ذات و مذہب میں اس سے جدا

ب- گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

۲۴- لوبیا بجائے لوبیا۔ ؎
گویا صحرا غبارِ خاطرِ دیوانہ تھا۔

ممکن ہے کہ ان بیس تیس الفاظ اور مرکبات میں سے بعض کے متعلق کچھ اختلاف ہو۔ مگر جن اصول کے تحت یہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔ اگر وہ درست ہے تو ان سب کا ترک بھی صحتِ زبان کے لحاظ سے نادرست نہیں کہا جا سکتا۔ خاص کر اس وجہ سے کہ ان سب کے نعم البدل موجود اور وہ اردو کی بول چال یا اہلِ زبان کے روزمرہ میں شامل ہیں۔ برخلاف ان الفاظ و مرکبات کے کہ ان میں کوئی بھی عوام کی زبان میں شامل نہیں ہے۔

مرکزی وزارتِ زراعت کی سالانہ کارگزاری

سال ۱۹۵۰ء میں مرکزی وزارتِ زراعت کی سالانہ کارگزاری کی ایک رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش کی گئی جس میں سے مندرجہ ذیل کام قابلِ ذکر ہیں۔ ملک کی خوراکی اجناس اور بڑی بڑی تجارتی فصلوں کی قلت کو دور کرنے کے لئے منظم کوششیں بھارت میں کھیتی باڑی کو مختلف پہلوؤں سے ترقی دینا۔ زرعی تحقیقات اور زرعی توسیع کے کاموں کو فروغ دینا۔ ٹیوب ویل یعنی نلدار کنویں لگانے پر خاص توجہ دی گئی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ نئے نلدار کنوؤں سے تقریباً دو لاکھ [illegible] ایکڑ اراضی میں آبپاشی ہو رہی ہے۔

روئی اور پٹ سن کی پیداوار بڑھانے کے لئے خاص اسکیمیں جاری کی گئی ہیں۔ جن کے نتیجے کے طور پر پچھلے سال کے مقابلے میں اس برس روئی کا زیرِ کاشت رقبہ دس فی صدی بڑھ گیا ہے۔ اور پیداوار بھی پانچ سے چھ لاکھ گانٹھ تک بڑھ گئی ہے۔ پٹ سن کے زیرِ کاشت رقبہ میں بھی تقریباً تین لاکھ ایکڑ کا اضافہ کیا ہے، اور پیداوار میں اضافہ کا اندازہ ایک سے دو لاکھ گانٹھ تک ہے۔

۱۹۵۰ء میں خوراک کی صورتِ حالات پر تبصرہ: جہاں تک خوراک کی صورتِ حالات کا تعلق ہے ۱۹۵۰ء کا آغاز بڑے اُمید افزا حالات میں ہوا۔ اس وقت ریاستوں کے پاس اناج کے جو بقایا بدست ذخیرے تھے وہ پچھلے تین چار برسوں کے بقایا بدست ذخیروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ تھے لیکن سال کے دوران میں فصلوں کو وسیع پیمانے پر نقصان پہنچا اور قدرتی آفتوں کے باعث صورتِ حالات بالکل اُلٹ گئی۔ جہاں یہ توقع تھی کہ صرف پندرہ لاکھ ٹن اناج درآمد کرکے ملک کی خوراک کا انتظام کر لیا جائیگا وہاں ۱۹۵۰ء میں بیس لاکھ ٹن سے زائد اناج درآمد کیا گیا۔ پھر بھی سال کے آخر میں بقایا بدست اناج پندرہ لاکھ اسی ہزار ٹن سے کم ہو کر سات لاکھ چھیالیس ہزار ٹن رہ گئی۔ جون ۱۹۵۰ء سے جو قدرتی حادثے ہوئے اُن کی وجہ سے ۵۵ لاکھ ٹن اناج برباد ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۵۰ء میں بمبئی میں ملک بھر کی ریاستوں کے وزرائے خوراک کی جو کانفرنس ہوئی تھی، اس نے تسلیم کیا کہ صورتِ حالات بہت تشویشناک ہو چکی ہے۔ کانفرنس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ ۱۹۵۱ء میں ۳۷ لاکھ ٹن اناج درآمد کیا جائے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ذخیروں سے ۱۹۵۱ء کے دوران میں اناج کا کل نکاس [illegible] ہوگا، اور کل ملکی فراہمی تیس سے چالیس لاکھ ٹن تک ہوگی۔ اس لئے اس نو لاکھ ٹن کی کمی کے علاوہ جو ۱۹۵۰ء کے آخر میں پائی گئی ۱۹۵۱ء کے دوران پچاس لاکھ ٹن اناج کی کمی باقی رہ جائے گی۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے تدبیریں کی جا رہی ہیں۔

منظور احسن برکاتی

اسد لکھنوی اور ٹونک

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں بستے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

۱۸۵۶ء کی دستبرد سے جب دہلی اور لکھنؤ کی ادبی محفلیں اجڑیں، واجد علی شاہ کو معزول کرکے کلکتہ اور بہادر شاہ کو قید کرکے رنگون روانہ کیا گیا تو جن شعراء نے اپنے وطن کو خیرباد کہا، اور ٹونک کی ادب دوستی، علم پروری اور شعراء نوازی کا غلغلہ سن کر اس طرف کا رخ کیا اُن میں فرماں روائے روہیل کھنڈ حافظ الملک نواب رحمت خاں بہادر کے پوتے نواب سلیمان خاں اسد بھی تھے۔

اسد ۱۲۴۹ھ میں لکھنؤ کی مردم خیز سرزمین میں پیدا ہوئے۔ مولوی فضل علی لکھنوی سے جو اس زمانے میں فارسی عربی کے اچھے عالم خیال کئے جاتے تھے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت پائی تو شعرگوئی کے ذوق نے انگڑائی لی۔ جو بچپن ہی سے دامنگیر اور ورثے میں ملا تھا۔ آپ کے دادا نواب محبت علی خاں شہباز جنگ اردو کے صاحب دیوان شاعر اور مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔

ابتداءً اسد نے چند غزلیں نواب عاشور علی خاں نبیرۂ شجاع الدولہ کو دکھائیں، اور ان کے انتقال کے بعد "میر مظفر علی اسیر لکھنوی شاگرد مصحفی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

اسیر لکھنؤ کے رہنے والے اور اردو کے قادر الکلام شاعر تھے۔ اُن کا شمار فنِ عروض کے مُسلّم الثبوت اَساتذہ میں ہوتا تھا۔ چھ دیوان ان سے یادگار ہیں۔ حضرت نواب واجد علی شاہ اسیر کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ تدبیر الدولہ اور مُدبّر الملک کے معزز ترین خطاب، اسیر کو واجد علی شاہ ہی نے عطا کئے تھے۔

اسد نے واجد علی شاہ کے عہدِ عشرت کی رنگینیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ انہیں کے سامنے اودھ کی سلطنت پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تھا، اور واجد علی شاہ معزول ہو کر کلکتے سدھارے تھے۔

حلیہ و لباس

اسد کا رنگ گندمی، نازک خدوخال، اونچا قد اور ورزشی جسم تھا۔ اُن کی آنکھیں بڑی بڑی۔ ڈاڑھی چھوٹی، لمبی لمبی مونچھیں اور زلفیں کانوں تک لٹکی ہوئی تھیں۔ آواز ایسی اچھی تھی کہ جب غزل پڑھتے تھے تو سننے والوں پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

اسد اکثر بند گلے کی اچکن اور اس پر سادہ دوہری صدری پہنا کرتے تھے۔ جاڑوں میں کاندھے پر کارچوبی کام کی اونی شال ڈالے رہتے تھے۔ سر پر کارچوبی دوپلی ٹوپی پہنتے تھے۔ انگلی میں جڑاؤ انگوٹھی۔ ہاتھ میں چاندی کی شام کا عصا رکھتے تھے۔

ٹونک سے تعلق

۱۸۶۶ء / ۱۲۸۳ھ میں صاحبزادہ محمد خاں جرنیل ریاست ٹونک، نبیرۂ نواب وزیر الدولہ بہادر سیر و تفریح کی غرض سے لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہاں تقریباً ایک ماہ قیام پذیر رہے۔ اسد کے بھائی محمد مختار علی خاں، جو ٹونک میں نائب جرنیلی کے عہدے پر فائز تھے، اُن کے ہمراہ تھے۔ اسد بھائی کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ اس طرح اسد کی ملاقات صاحبزادہ محمد خاں سے ہو گئی اور پھر یہ ملاقات دوستی کی صورت اختیار کر گئی۔

لکھنؤ سے چلتے وقت صاحبزادے صاحب نے اسد کو ٹونک آنے کی دعوت دی، اور جلد ہی آنے کا وعدہ لے لیا۔ ایفائے وعدہ کے لئے کچھ مہینوں کے بعد اسد ٹونک آئے، اور ایک ماہ سے زیادہ سکونت پذیر رہ کر لکھنؤ واپس چلے گئے۔

اس مدت میں ٹونک کے ممتاز اہلِ خاندان اور صاحبزادۂ

عبید اللہ خاں سے آپ کے دوستانہ مراسم ہوگئے تھے۔

ٹونک میں اُس وقت امین الدولہ وزیر الملک نواب محمد علی خان بہادر سوم فرمانروائے ریاست مسندِ ریاست پر متمکن تھے۔

نواب محمد علی خاں بہادر، بڑے حاتم دل، پابندِ شرع، با مروّت اور با اخلاق رئیس تھے۔ خود صاحبِ علم تھے اور اہلِ علم کی قدر کیا کرتے تھے۔ معقولی و منقولی علوم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ علوم منقولی میں خصوصیت کے ساتھ اُن کو کامل دستگاہ تھی۔ نواب صاحب کو تالیف و تصنیف کا بھی شوق تھا۔ نواب صاحب نے ایک کتاب "قرۃ العیون" تصنیف فرمائی ہے۔ جو تقریباً پانچ ہزار صفحات پر ختم ہوئی ہے۔ اس کتاب میں علوم عربیہ، تاریخ اسلامیہ کے دقیق مسائل پر بڑی صحت و نقادی سے خامہ فرسائی فرمائی ہے۔

صاحبزادہ محمد خاں کے توسّط سے اسد کو نواب صاحب کے دربار میں باریابی ہوئی۔ نواب صاحب نے نذر قبول کی، اور بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ فرمایا اگر ٹونک میں قیام کا خیال ہو تو ریاست سے وظیفہ مقرر کر دیا جائے گا۔

لیکن اس وقت اسد کا دل ٹونک میں نہیں لگا۔ وطن کی یاد نے ستایا اور یہ لکھنؤ واپس چلے گئے۔

دوبارہ آمدِ ٹونک ۱۸۸۰ء میں امین الدولہ نواب ابراہیم علی خاں بہادر کے عہد میں نائب الریاست صاحبزادہ عبید اللہ خاں فیروز جنگ نے اپنی دوسری شادی کے موقع پر اسد کو ٹونک آنے کی دعوت دی اور اسد دوبارہ ٹونک آئے۔

اس مرتبہ ایک سال کے قریب نائب صاحب کے مکان پر آپ کا قیام رہا۔ اور اس مدّت میں نائب صاحب اور ٹونک کے دوسرے شعر و سخن سے ذوق رکھنے والے عمائد و صاحبزادگان آپ سے مشورۂ سخن کرنے لگے، اور آپ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔

وظیفے کا تقرر ۱۸۸۱ء میں نائب صاحب کی سفارش سے نواب صاحب نے پر ورشنا پچیس روپیہ ماہانہ ریاست سے آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا جو ۱۸۸۶ء تک جاری رہا۔

خلعت وقائع ابراہیمی میں مذکور ہے کہ "۱۸۹۱ء میں اسد صاحب کو نواب صاحب کی جانب سے خلعتِ فاخرہ عطا ہوا"

مشیرِ سخن تاریخ ٹونک مؤلفہ سید اصغر علی آبرو میں لکھا ہے کہ "۱۸۹۱ء میں نواب ابراہیم علی خاں نے آپ کو اپنا مشیرِ سخن مقرر فرمایا اور خلعتِ ہفت پارچہ مرحمت فرمایا"

"مطلع خورشید" کے آخر میں اسد نے اپنے حالات کے ذیل میں لکھا ہے:

"جناب نواب صاحب بہادر دام اقبالہ نے از خود اس فقیر کو یاد فرمایا۔ و بکمال مراحم خسروانہ پیش آئے۔ کچھ کلام میرا سنا۔ از راہِ قدردانی و غریب نوازی کمال پسند فرمایا اور اپنی زبانِ فیض ترجمان سے نہایت تعریف کی۔ و نیز اپنا کلام بلاغت نظام سنوایا۔ و از راہِ عزّت افزائی یہ بھی حکم دیا کہ تجھ کو ہم نے اپنا مشیرِ سخن گردانا"

(مطلع خورشید صفحہ ۲۴۹)

ملازمت ۱۸۹۶ء میں ریاست ٹونک کی جانب سے اسد ایجنسی بھوپال کی وکالت پر مامور ہوئے اور ایک سال تک وکالت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۸۹۸ء میں اسد نے ملازمت سے برداشتہ خاطر ہو کر استعفیٰ دے دیا۔ لیکن نواب صاحب نے آپ کو لکھنؤ نہیں جانے دیا، اور ٹونک ہی میں روک لیا۔

کلام کا رنگ اسد کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ کلام کا رنگ کا منوی ہے۔ لیکن انھوں نے صنعت ایہام وغیرہ کو زمانے کی روش سے متاثر ہو کر نظر انداز کر دیا اور ادائے مطلب کا پسندیدہ طریقہ اختیار کیا۔

نمونۂ کلام

ناز تھا رحمت پہ تیری مجھکو اے نکتہ نواز، اس لئے اپنے گناہوں کو چھپایا میں نے تھا

ہجر میں گریہ، فریاد و فغاں کیونکر کروں؟، آنکھیں میری ہیں، کلیجہ ہے مرا، دل میرا

اسد کا یہ شعر فارسی کے مشہور شعر

نمی دانم زمینِ گریہ مطلب چیست تا صبح زا

دل از من، دیدہ از من آستیں از من کنار از من

کا ترجمہ ہے۔

یاد رکھئے کہ میرے قتل کے بعد ـــ بھول جائیں گے سب جفائیں آپ

میں گنہگار تھا اسی قابل ـــ قتل کرکے نہ سر جھکائیں آپ

حال میرا متوجہ ہوکر ـــ تم نے اک آن نہ سنا کیا باعث؟

ہم کشاکش سے جیتے بے سر و ساماں ہوکر ـــ فکرِ دامن نہ رہی چاک گریباں ہوکر

ایک مدت سے گلوگیر ہے، اے دستِ جنوں

ہو سکا تجھ سے گریباں نہ مرا چاک ہنوز

حرم ہو، دیر ہو، مسجد ہو، میکدہ کوئی ـــ کہیں کسی کو پتہ آپ کا چلا ہی نہیں

عالم میں وہ سرا کوئی آیا نہیں نظر ـــ ایسی سمائی ہے تری صورت نگاہ میں

لئے ہے تیغ پئے قتل ہاتھ میں وہ ترک ـــ جسے ہو شوقِ شہادت شہید ہو جائے

کبھی کبھی فلسفیانہ شعر بھی کہتے تھے۔

نقش برآب ہے طلسمِ جہاں ـــ عیش کیا چیز ہے یہاں غم کیا

تلامذہ

بہت سے شعراء آپ کے تلمذ سے مستفید ہوئے ہیں۔ ٹونک میں جن شعراء نے آپ سے اصلاح لی ہے۔ اُستاد آبرو کے قول کے مطابق اُن کی تعداد ۱۸ ہوتی ہے جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) نواب سلطان احمد خاں جری (۲) صاحبزادہ عبید اللہ خاں فیروز (۳) حکیم فدا احمد خاں اثر (۴) محمد رضا حسن خاں محزون (۵) صاحبزادہ مجید اللہ خاں نادر (۶) صاحبزادہ صابر علی خاں صابر (۷) محمد حبیب اللہ خاں ضبط۔ (۸) صاحبزادہ عبد اللطیف خاں رنگین (۹) صاحبزادہ صفی اللہ خاں صفی (۱۰) صاحبزادہ عبد الرؤف خاں والی۔ (۱۱) صاحبزادہ عبد الرحمٰن خاں رسا (۱۲) منشی علی حسین خاں حسن (۱۳) سید نیاز احمد خرد (۱۴) محمد ابراہیم خاں رمز (۱۵) محمد سیف الدین سیف۔ (۱۶) منشی یحییٰ سہاسے (۱۷) مولوی عنایت حسین خاں عنایت (۱۸) حافظ عالمگیر کیف۔ ان تلامذہ میں سے اکثر نامور تلامذہ کا انتقال ہو چکا ہے۔

سنٹرل پولیس ٹریننگ کالج

یہ ادارہ بھارت سرکار نے انڈین پولیس سروس میں بھرتی ہونے والے افسروں کی ٹریننگ کے لئے ۱۹۴۸ء میں قائم کیا تھا۔ اس سے پہلے انڈین پولیس کے افسروں کی تربیت کا کام صوبائی حکومتوں کے سپرد تھا۔

سنٹرل پولیس ٹریننگ کالج کا مقصد فقط پہلے سے بہتر پولیس افسر ہی پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ ایسے افراد پیدا کرنا ہے جن کے دلوں میں وطن کی خدمت کا صحیح جذبہ کارفرما ہو۔

یہ کالج ماؤنٹ آبو پر چار ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں کی آب و ہوا انسانی صحت کے لئے ہر اعتبار سے مفید ہے۔ اور چند مہینوں کے قیام سے اس کا خوشگوار اثر انسان کے جسم اور دل و دماغ پر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ ایمرجنسی افسروں کے لئے چار سے چھ مہینے تک کا کورس ہے اور ایمرجنسی افسروں کی ضرورت اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ ۱۹۴۷ء میں برطانوی افسروں کی ایک بھاری تعداد کو ہندوستان چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔

بھرتی اور ملازمت کی شرائط

انڈین پولیس سروس میں ملازمتیں اُس مقابلے کے امتحان کے نتیجے کو دیکھکر دی جاتی ہیں۔ جو ہر سال یونین پبلک سروس کمیشن لیتی ہے۔ ابتدا میں افسروں کو ایک سال کے لئے مقرر کیا جاتا ہے اس ایک سال کی مدت میں تسلی بخش کام کرنے پر اُن کی ملازمت مستقل کر دی جاتی ہے۔

فرائض۔ بالعموم یہ افسر مخصوص صوبوں میں متعین کر دئے جاتے ہیں۔ لیکن حکومت کو اس امر کا اختیار حاصل ہے کہ ہندوستان بھر میں جہاں چاہے اُن کا تقرر کر دے۔

تنخواہ کا اسکیل۔ انڈین پولیس سروس میں تنخواہ کے دو اسکیل ہیں، ایک جونیئر اسکیل اور دوسرا سینیئر اسکیل۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

جونیئر اسکیل۔ ۳۵۰ روپے۔ ۳۵۰ ——— ۳۸۰ — ۳۸۰ — ۳۰ — ۵۹۰ — ای۔بی — ۷۷۰ — ۴۰ — ۸۵۰ (۱۹ سال)

سینیئر اسکیل۔ ۶۰۰ روپے (چھٹا سال یا اُس سے قبل) — ۴۰ — ۱۰۰۰ — ۱۰۰۰ — ۱۰۵۰ — ۱۱۰۰ — ۱۱۰۰ — ۱۱۵۰ (بائیسویں برس میں)

ملازمت کا تقرر اسی دن سے شروع ہو جاتا ہے جس دن افسر ٹریننگ کے لئے سنٹرل پولیس ٹریننگ کالج آبو میں داخل ہوتے ہیں۔ یعنی اُنھیں گورنمنٹ سرونٹ تصور کیا جاتا ہے، اور ٹریننگ کے دوران میں اُنھیں پوری تنخواہ اور الاؤنس وغیرہ دئے جاتے ہیں۔ شروع شروع میں جونیئر اسکیل کی ابتدائی تنخواہ دی جاتی ہے جن افسروں کا تقرر اسپیشل ریکروٹمنٹ بورڈ انڈین پولیس سروس میں ایمرجنسی ریکروٹ کے طور پر کرتا ہے، اُنھیں ابتدا میں ایک اور طے شدہ فارمولا کے مطابق تنخواہ دی جاتی ہے۔ اس فارمولے میں افسروں کی پہلی آمدنی کو خواہ وہ سرکاری نوکری سے ہو یا پرائیویٹ ملازمت سے، اور ساتھ ہی اُن کی عمر کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

وردی کی گرانٹ۔ ملازمت ملنے پر پانچ سو روپے کی ایک ابتدائی وردی گرانٹ بھی دی جاتی ہے۔

چھٹی۔ ان افسروں کو بھارت سرکار کے کلاس ایک (I) افسروں کی طرح ۱۹۳۳ء کے ترمیم شدہ چھٹی کے قوانین کے مطابق

چھٹی دی جاتی ہے۔ کیثرول چھٹی بھی انہیں قوانین کے مطابق ملتی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے موقع پر۔ یہ شرائط ابھی حکومت کے زیر غور ہیں۔

قیام وطعام

بھارت سرکار نے راجپوتانہ ہوٹل اسٹیٹ کی عمارت اس مقصد کے لئے حاصل کرلی ہے۔ یہ ایک خوبصورت عمارت ہے جس میں دیگر کمروں کے علاوہ ایک اچھا لاؤنج، ایک بڑا کھانے کا کمرہ اور ایک کھلا صحن موجود ہے۔ یہ عمارت پہاڑی فضا میں ایک خوبصورت منظر پیش کرتی ہے۔ ایک وقت میں اس میں ۸۵ افسر قیام کرسکتے ہیں۔ ہر افسر کو ایک فرنیچر سے آراستہ کمرہ ملتا ہے جس کے ساتھ ایک برآمدہ اور ایک غسل خانہ ملحق ہوتا ہے۔ بعض افسر چند کمرے لے کر ان میں اکٹھا رہنا شروع کردیتے ہیں۔ یہ تمام انتظامات اس مقصد کے پیش نظر کئے گئے ہیں کہ افسروں میں باہمی میل جول اور تعاون کا جذبہ پیدا ہو۔

ہر افسر کے لئے کالج میں داخل ہوتے ہی آفیسرز میس کا ممبر بننا لازمی ہوتا ہے۔ ہر افسر کو اپنے اپنے مذاق کے مطابق ویجی ٹیرین یا نان ویجیٹیرین کھانا ملتا ہے۔ لیکن توہم پرستی کو اس میس میں کوئی جگہ نہیں دی جاسکتی۔ کھانے کے اوقات مقرر ہیں۔ سارے میس کا انتظام میس کے قوانین کے تحت ہوتا ہے۔ اور ان قوانین پر سختی سے عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ افسروں میں نظم وضبط قائم رکھنے کا ایک جذبہ پیدا ہو۔

سیروتفریح، گانا بجانا یہ سب چیزیں اس کالج کی تعلیم کا جزو ہیں۔ میس کے لاؤنج میں پنگ پانگ اور دیگر متعدد کھیلوں کا سامان موجود ہے۔

ٹریننگ

تھیوریٹیکل تربیت کے لئے ایک خاص اسٹاف مقرر کیا گیا ہے۔

محکمانہ تعلیم کے علاوہ افسروں کو یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ عوام کی خدمت کس طرح کی جاتی ہے۔

جرائم کا پتہ چلانے کے لئے افسروں کو سائنٹیفک طریقے بھی سکھائے جاتے ہیں۔ آج کے نئے زمانے میں جرائم کا کھوج لگانے کے لئے یہ سائنٹیفک طریقے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں انگلیوں کے نشانات، پیروں کے نشانات اور دوسرے نشانات۔ بالوں کی پہچان، اور جعلی نوٹوں وغیرہ کی پہچان وغیرہ پر خاص طور پر زور دیا جاتا ہے۔ اس سائنٹیفک تعلیم کے سلسلے میں افسروں کو قسم قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جس میں موٹروں، ریڈیو اور وائرلیس تک کی تعلیم شامل ہے۔

کھیل کود

ڈسپلن، اچھے مذاق اور جماعتی تنظیم کو اس کالج میں بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ہر افسر سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ایک یا ایک سے زیادہ کھیلوں میں حصہ لے۔ اس کالج کے مقبول ترین کھیل کرکٹ، ٹینس اور ہاکی ہیں۔ ان کے بعد باسکٹ بال، والی بال اور بیڈمنٹن کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ان ڈور کھیل ان کے علاوہ ہیں۔ کھیل کے لئے اس کالج میں ایک باقاعدہ فنڈ کا انتظام کیا گیا ہے۔ اور بھارت سرکار اس فنڈ میں پانچ سو روپیہ سالانہ گرانٹ دیتی ہے۔

امتحانات

ہر تھوڑے وقفے کے بعد کالج کی طرف سے افسروں کا ہر مضمون میں امتحان لیا جاتا ہے۔ سال کے خاتمے پر اور پورے سیشن کے خاتمے پر یونین پبلک سروس کمیشن کی طرف سے امتحان لیا جاتا ہے۔

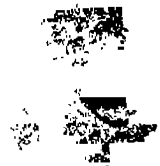
لائبریری

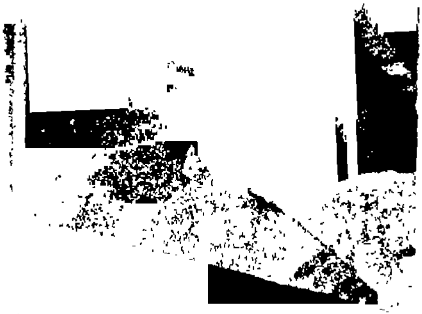
اس کالج کی لائبریری آہستہ آہستہ تعمیر ہو رہی ہے۔ ہر مہینے اس لائبریری میں متعدد رسائل آتے ہیں۔ کالج کی طرف سے بھی ایک رسالہ جاری کیا گیا ہے جو سال میں ایک بار چھپتا ہے۔



حضرت آرزو لکھنوی
جو ماہ اپریل کو
کراچی میں انتقال
فرما گئے

سروش عسکری طبا طبائی (مضمون صفحہ ۵ تا ۱۰)





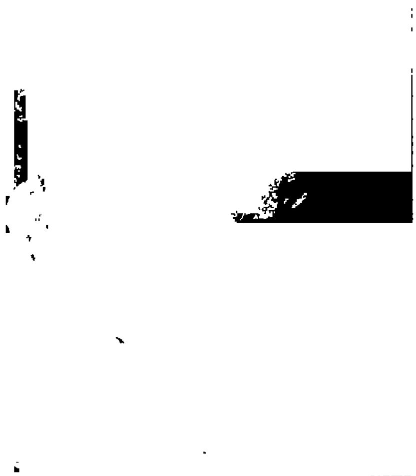


مہا دیوی ورما — ہندی کی مشہور شاعرہ
آپ کی شاعری پر ستیہ دیو شرما کا مضمون
۴۴-۴۷ صفحے پر ملاحظہ فرمائیے

اسد لکھنوی
آپ سے متعلق منظور الحسن برکاتی کا
مضمون ۲۴-۲۶ صفحے پر ملاحظہ فرمائیے







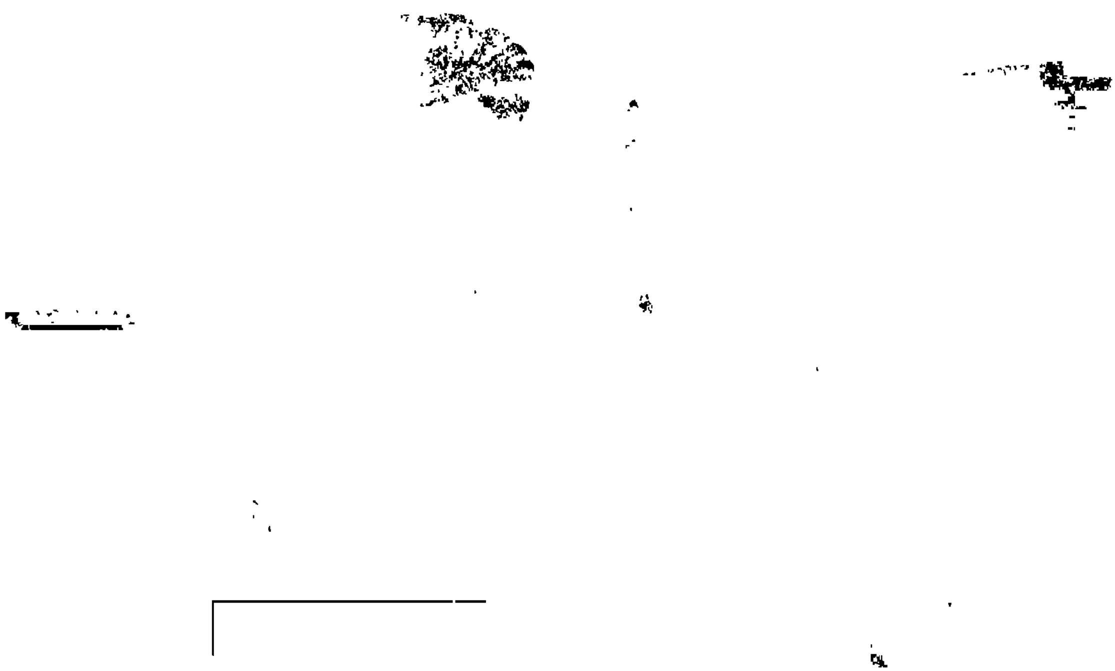
لکڑی میں کھدائی کا کام



بید کی ٹوکریاں

کشمیر کی صنعت

چاندی کے برتن



غزل

(نواب محمد اسماعیل علی خاں والیٔ ٹونک)

آسماں بر دوش ہر پہلو تری بیداد کا
آسماں نادیدہ ہر عنواں مری فریاد کا

زِندگی اُن کے کرم سے ایک عنوان بن گئی
داستاں در داستاں روداد در روداد کا

آنسوؤں کی چند بوندیں دل کے کچھ دھندلے نقوش
ہے یہی سامانِ ہستی خانماں برباد کا

اس کے سایہ میں پلی ہیں دل کی ساری عظمتیں
چھُوٹ سکتا ہے کہیں دامن کسی کی یاد کا

اب کوئی طوفاں نہیں ہمّت شکن میرے لئے
کیوں نہ ممنونِ کرم ہوں اس ستم ایجاد کا

تھی مری شاخِ نشیمن ہی سے تزئینِ چمن
دل بھر آیا میری بربادی سے ہر صیّاد کا

کیوں نہ سینے سے لگاؤں کیوں نہ آنکھوں پر بٹھاؤں
دل کی بیتابی عطیّہ ہے کسی کی یاد کا

کِس بلندی پر مجھے خود دارِ فطرت لے گئی
عرش کے لب پر بھی نغمہ ہے مبارکباد کا

دل سے سب کچھ مٹ گیا باقی ہے اک نقشہ ہنوز
کچھ مری رودادِ غم کا کچھ تمہاری یاد کا

خود فراموشی کا یہ عالم ہے اب میں کیا کہوں
آپ آئے تو خیال آیا دلِ ناشاد کا

آنکھوں آنکھوں میں وہ کل تیور بدل کر کہہ گئے
یہ خموشی بھی تو اک انداز ہے فریاد کا

اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ پی لی ہو شراب
تھا کبھی اک حادثہ آنا تمہاری یاد کا

آستاں ہی پر رہے یادشت پیمائی کرے
تاجؔ کب سے منتظر ہے آپ کے ارشاد کا

کمال احمد صدیقی

اُردو ناول کا ارتقاء

چند روز ہوئے میرے ایک دوست نے دورِ حاضر کے ایک ایسے ناول نگار کی بابت میری رائے پوچھی جس کے ایک درجن سے زیادہ ناول شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے اپنے دوست کو جواب دیا "اُس نے صرف ایک ناول لکھا ہے"۔

"صرف ایک ناول؟ — کیا نام ہے اس ناول کا؟" میرے دوست نے حیرت سے پوچھا۔

"کوئی بھی ایک ناول جو اُس نے لکھا ہے" میرا بظاہر بہت سیدھا سا جواب تھا۔

ایک لمحے کی مزید حیرت کے بعد میرے دوست نے میری بات سمجھ لی اور قہقہے لگانے لگا۔ جب اُس نے ہنسی پر قابو پا لیا تو بولا:

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اُس کے ہر ناول کے کردار بالکل یکساں ہوتے ہیں۔ ہر کتاب کے نام کے ساتھ ساتھ کرداروں اور مقامات کے نام بدلتے رہتے ہیں۔ واقعات اور حادثات کا تانا بانا ذرا سے ردو بدل کے علاوہ ایک ہی ہوتا ہے"۔

یہی میرا مقصد تھا۔

افسانے کے مقابلے میں ناول کے لئے زیادہ وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ افسانے کے لئے تو سکون اور اطمینان کی کچھ ساعتیں مل بھی جاتی ہیں ناول کے لئے جس مسلسل سکون اور اطمینان کی ضرورت ہوتی ہے، وہ زیادہ تر لکھنے والوں کو میسّر نہیں۔ منتشر ذہنوں سے ہمیں عظیم ناولوں کی توقع رکھنا بھی نہیں چاہئے۔

ناول نگار کے لئے زندگی کے مطالعے کے ساتھ ساتھ نفسیات پر کامل عبور بھی ضروری ہے۔ تاکہ وہ کردار تراشتے وقت اُن کی حرکات کو اس طرح متعین کرے کہ وہ جیتے جاگتے کردار معلوم ہوں۔ اِس کے لئے ضروری ہے کہ کرداروں کا ناول میں تعارف کرانے سے پہلے خود ناول نگار اُن سے تعارف حاصل کرے۔ اور یہ ذہن نشین کرے کہ جس ماحول اور جس طبقے سے وہ تعلق رکھتے ہیں اُن کی کیا کیا خصوصیات ہیں، اور ان کرداروں سے کن حالات میں کن اطوار کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ ناول نگار کو ایسے کردار منتخب کرنا چاہئیں جو اپنے ماحول سے نہ صرف مطابقت رکھتے ہوں بلکہ اپنے ماحول کے نمائندے بھی ہوں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ جاندار ہوں اور سب سے پہلے یہ کہ اُن کی حرکت زندگی کی حرکت ہو — کٹھ پتلی یا ربڑ کے ان بونوں کی حرکت ہو جو کوک اور کمانی سے قلابازیاں لگاتے ہوں۔

یہ کس قدر افسوسناک حقیقت ہے کہ عہدِ حاضر کے جن ادیبوں نے ناول نگاری کے لئے قلم اُٹھایا ہے اُن میں اکثریت ایسے ادیبوں کی ہے جو واقعات کی ترتیب اور کرداروں کے انتخاب پر محنت نہیں کرتے۔ اپنی اقتصادی مشکلات کے حل کے لئے وہ فن پر نہ صرف کاروبار کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ کاروبار پر فن کو قربان بھی کر دیتے ہیں جیسا کہ کاروبار کا اصول ہے۔ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ صفحات سیاہ کرنے کی کارگذاری پر زور دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے زیادہ تر ناول تخلیقی کارناموں کے بجائے "فارمولا ناول" ہیں۔ یہ ناول کسی نئے کردار کا تعارف نہیں کراتے، بلکہ صرف ایسے کردار پیش کرتے ہیں جنھیں دنیا میں سوائے محبت اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ اگر وہ کبھی غمِ زمانہ سے دوچار ہوتے بھی ہیں تو محبت کے مقابلے میں اُس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ غمِ زمانہ محبت میں نئی اُلجھنیں پیدا کرنے، محبت کے لئے نئی راہیں نکالنے یا سین بدلنے کے لئے لایا جاتا ہے۔ ان کرداروں کی زندگی محبت کے گورکھ دھندے سے باہر نہیں نکلتی، اور اُن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اُن کا وجود صرف ناول کے صفحات تک محدود ہوتا ہے۔ اور عملی زندگی میں اُن سے مماثلت رکھنے والے کردار نہیں پائے جاتے۔ ان ناولوں میں واقعات زندگی کی رَو کے عوض حادثات سے رُونما ہوتے ہیں۔ اس طرح جو تذبذب حادثات سے عبارت ہوتا ہے وہ رومان کو تو ایک حد تک ضرور نمایاں کر دیتا ہے، لیکن چاروں طرف پھیلی ہوئی وسیع زندگی پر اتنا دبیز پردہ ڈال دیتا ہے

. قاری کی نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتی ہے۔ یہ ناول قاری میں سماجی شعور بیدار
، کے عوض اسے مریض رومان کی افیون کھلا کر تھپکیاں دیتے ہیں۔ ایک
ین قاری جو دنیا کو خواب کے بجائے حقیقت سمجھتا ہے ایسے ناولوں سے
مت اندوز ہونے کے عوض اُکتا جاتا ہے، کیونکہ اسے ناول کی دنیا میں
بنی دنیا کے عکس کا شائبہ تک نہیں ملتا۔

یہاں میں مختصر طور سے اس بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ناول میں کرداروں کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟ کردار ناول کا مقصد نہیں ہوتے بلکہ وسیلہ ہوتے ہیں۔ جن کا کام ایک خاص دور کی زندگی کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر ناول نگار واقعات مرتب کرتا ہے جنھیں وہ مناسب کرداروں کی مدد سے پیش کرتا ہے۔ ناول نگار کی ہنر مندی اس بات میں ہے کہ واقعات اور کردار لازم و ملزوم ہوں۔ قاری کو یہ احساس نہ ہونا چاہیئے کہ ایک خاص واقعہ محض ایک خاص کردار کو اُبھارنے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ کامیاب ناول کے کرداروں کا رویّہ مصنّف کا مافی الضمیر اپنی حرکات و سکنات و گفتگو سے ادا کرنے کے باوجود بالکل فطری ہوتا ہے، برخلاف اس کے ایک ناکام ناول میں مصنّف کرداروں پر وہ زندگی مسلّط کر دیتا ہے جو اُن کی اپنی زندگی نہیں ہوتی۔

آئندہ صفحات میں میں اُن خاص خاص کرداروں پر مختصراً اپنے خیالات پیش کروں گا، جو ڈپٹی نذیر احمد سے لیکر قرۃ العین حیدر تک مختلف ناول نگاروں نے اردو ادب کو دیئے ہیں۔

اردو ناول کے ارتقا میں مندرجہ ذیل ادیبوں کا ہاتھ رہا ہے اور اس مضمون کے مطالعے کو میں اُنھیں تک محدود رکھوں گا۔

۱۔ ڈپٹی نذیر احمد
۲۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار
۳۔ عبدالحلیم شرر
۴۔ مرزا ہادی رسوا
۵۔ راشد الخیری
۶۔ منشی پریم چند
۷۔ قیاض علی
۸۔ عظیم بیگ چغتائی
۹۔ کرشن چندر
۱۰۔ عزیز احمد
۱۱۔ عصمت چغتائی
۱۲۔ محمد احسن فاروقی
۱۳۔ قرۃ العین حیدر

ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد کو اگر اردو ناول نگاری کا باوا آدم کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اگرچہ داستانیں اور مثنویاں اُن سے پہلے بھی کافی مقدار میں لکھی گئی تھیں۔ لیکن ناول کی تشکیل ایک صنف کی حیثیت سے انھیں کے ہاتھوں ہوئی۔

ادب ہمیشہ سے مقصدی اور تبلیغی رہا ہے۔ پند و نصائح اور تصوّف کی شاعری اس کی مثالیں ہیں۔ خاص طور سے تصوّف کو ہمارے ادب میں ایک فکری تحریک کی حیثیت سے مرکزیت حاصل رہی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ڈھکے چھپے طرز اظہار کی وجہ سے ادب کا مقصدی کردار معدوم ہوتا گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں نے اس رجحان کو پھر ایک بار شدّت کے ساتھ اُبھارا۔ یہ ایک بہت بڑی خدمت ہے جو اُنھوں نے سرانجام دی۔

اُن کے ناول فن کے اعتبار سے بھی کافی منزلت رکھتے ہیں۔ خاص طور سے پلاٹ کا تسلسل اور غیر اہم کرداروں کی سیرت نگاری۔ اب ہم اُن کے مختلف ناولوں کے مختلف کرداروں کا جائزہ لیں گے۔

مرآۃ العروس:۔ اصغری کے روپ میں نذیر احمد نے ایک مثالی عورت کو مجسّم کیا ہے، اور اُس کے مثالی ہونے ہی نے اُسے ایک زندہ کردار کے بجائے فرضی کردار بنا دیا ہے۔ تیرہ سال کی عمر سے وہ عقل و فراست کی پتلی ہے۔ اس میں لڑکیوں کی سی کوئی بات نہیں ہے، ہر انسان میں خوبیاں و خامیاں دونوں ہوتی ہیں۔ حالات اور تربیت ایک کو اُبھار دیتے ہیں، اور ایک کو دبا دیتے ہیں۔ اس کے باوجود دونوں کا وجود اور دونوں کا امتزاج باقی رہتا ہے۔ لیکن نذیر احمد نے ایک ایسا کردار تراشا ہے جس کے پہلو میں نہ دل ہے اور نہ دل میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کی تمنا — اور نہ نسائیت، جس کے بغیر ایک عورت کم سے کم عورت نہیں ہو سکتی — کش مکش کو انسانی زندگی میں ضرور دخل ہوتا ہے۔ خواہ اس کی نوعیت

کوئی ہو۔ کش مکش کے فقدان نے اصغری کو غیر فطری کردار بنا دیا ہے۔ مثلاً جب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے خاوند نے اُسے فراموش کر کے کسی دوسری عورت کے ساتھ عیش کرنا شروع کر دیا ہے تو نہ وہ مشتعل ہوتی ہے اور نہ اُسے قلق ہوتا ہے۔ عورت اور خاص طور سے ہندوستانی عورت کی سیرت اپنی ازلی فرمانبرداری بے زبانی اور اطاعت گزاری کے باوجود یہ نہیں ہوتی۔

اصغری کے مقابلے میں اکبری کا کردار زیادہ قابلِ توجہ ہے۔ کیونکہ وہ جذبات سے عاری نہیں ہے۔

توبتہ النصوح :۔ نصوح بھی اصغری کی طرح روکھا پھیکا کردار ہے۔ وہ اس طرح کا مسلمان ہے جس طرح پیوریٹن عیسائی ہوتے تھے۔ وہ زندگی کی ہر لطافت سے خار کھاتا ہے۔ دراصل نصوح خود نذیر احمد کی ذہنی تصویر ہے۔ جو اسلام اور شریعت میں انسان کی فلاح دیکھتے ہیں۔ نصوح ایک سخت اور کٹر مُلا کی کامیاب تصویر ہے۔ لیکن نذیر احمد کا جو مقصد اس کردار کو پیش کرنے سے تھا وہ پورا نہیں ہوتا۔ قاری نصوح کی سخت گیری اور سپاٹ رویے سے کوئی خوش گوار اثر قبول نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے بد دل ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا دل محبت اور شائستگی سے خالی ہے۔ یہی نہیں کہ وہ آتش اور نظیر اکبرآبادی کے دیوان جلا دیتا ہے، بلکہ جب بیوی جوان اور شادی شدہ بیٹی کو پیٹتی ہے تو وہ اس فعل کو سراہتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب جوان بیٹا دم توڑتا ہوتا ہے تو اُس وقت بھی اس کا رویہ ایک دم توڑتے بیٹے کے باپ کے عوض ایک مُلا کا ہوتا ہے۔

ابن الوقت ۔ ابن الوقت واقعی ایک زندہ کردار ہے۔ کیونکہ یہ جامد اور ڈھلا ڈھلایا نہیں ہے۔ اس کردار میں ارتقا اور کش مکش ہے۔ اس کردار میں انگریزی اور ہندوستانی تہذیب اور طرزِ معاشرت کے تضاد بھی نمایاں ہیں، اور اس حیثیت سے یہ اپنے ماحول کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ اس کو بجائے مصنف کے حالات نے تراشا ہے۔ اسی وجہ سے یہ جیتا جاگتا کردار ہے۔ اس کی حرکات اور اس کے خیالات کی رَو اسے خود تک محدود رکھنے کے عوض ایک ذہنیت کا نشان بنا دیتی ہیں، اور یہ نشان ہماری تہذیبی زندگی میں ایک سنگ میل ہے۔

شروع میں جیسا میں نے کہا تھا، ڈپٹی نذیر احمد کے غیر اہم کردار سیرت نگاری کے لحاظ سے زیادہ اہم ہیں۔ انھوں نے جہاں بھی زندگی "اندرونِ خانہ" کا نقشہ پیش کیا ہے۔ ہندوستانی عورت کا پورا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ماما عظمت، اکبری۔ نعیمہ۔ نعیمہ کی ماں، نعیمہ کی خالہ اور خاص طور سے ابن الوقت کی پھوپھی مختلف ٹائپ ہیں، اور اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار

"پنڈت رتن ناتھ سرشار کا "فسانۂ آزاد" اردو کے ادبِ عالیہ کا غیر فانی سرمایہ ہے۔ ہئیت کے اعتبار سے یہ ناول کے عوض افسانوں کی زنجیر ہے، کیونکہ اس میں مربوط پلاٹ نہیں ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ سرشار نے دم توڑتی ہوئی جاگیردارانہ شرافت کی آخری جھلکیاں فنکارانہ چابکدستی سے پیش کی ہیں۔ "فسانۂ آزاد" ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور اُس کے غیر فانی کردار میاں آزاد اور خوجی اردو کے زندہ و پائندہ کردار ہیں۔ جو ہر زمانے میں زندہ اور لوگوں کو ہنساتے رہیں گے۔

"فسانۂ آزاد" کے علاوہ "سیر کہسار" اور "جام سرشار" بھی اُن کی تصنیفیں ہیں جنھوں نے اپنے زمانے میں شہرت تو حاصل کی، لیکن اس دوام سے محروم ہیں جو ایک شہکار کو ملتا ہے۔ ہئیت کے اعتبار سے "جام سرشار" نسبتاً بہتر ہے، اور اس پر ناول کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ ناول اخبار والوں کے لیے لکھے گئے تھے۔ پلاٹ کے مقابلے میں سرشار کے پیشِ نظر دلچسپی برقرار رکھنا اور کالم پورے کرنا رہتا تھا۔ باقاعدہ پلاٹ بنا کر اور باضابطہ تصنیف کے طور پر اُنھوں نے نہیں لکھا، اور "جام سرشار" کے علاوہ اُنھوں نے کسی اور پر نظر ثانی بھی نہیں کی۔ آج اس کی ضرورت ہے کہ "فسانۂ آزاد" کو ایڈٹ کر کے شائع کیا جائے۔

سرشار کی فن کاری اس نکتے میں ہے کہ انھوں نے مثالی کردار تراشنے کے عوض ایسے کردار چُنے جو اپنے زمانے کی زندگی پیش کر سکیں۔ ان کے کرداروں میں اخلاقی خوبیاں بھی ہیں، اور کمزوریاں بھی۔ اسی وجہ سے اُن کے کرداروں میں زندگی کی لہر ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں، سرشار نے جاگیردارانہ شرافت کے ہنگامِ نزع کا خاکہ اُڑایا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے خود کو محدود نہیں کیا ہے۔ بلکہ ہمیں اُن کے یہاں نیک و بد، امیر او فقیر، مُلا، مجتہد اور آوارہ شرابی، حلوائی، بنئے اور نائی وغیرہ سبھی طرح کے کردار ملتے ہیں۔ سبھی سجائی اعلیٰ محفلوں کے ساتھ ساتھ میلوں کا ذکر بھی ملیگا۔

مانیونیوں کا سراپا بھی۔ یہ تنوع اُن کے وسیع سماجی مطالعہ اور نفسیات پر عبور کا ثبوت ہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اُن کے ناولوں کے پلاٹ غیر مربوط ہیں۔ اس کے باوجود اُن کے کردار حقیقی زندگی کے نمائندے ہیں اور اپنے ماحول کے مختلف حالات کا جو ردِ عمل ہوتا ہے وہ اپنے زمانے کی تہذیب کے خدوخال اُجاگر کرتا ہے۔ مزاح، سرشار کا طرّۂ امتیاز ہے۔ لیکن ان کا مزاح وہ ہے جو فطری ماحول میں انسانوں کی فطری حرکات سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ مزاح کی چاشنی تیز کرنے کے لئے کبھی کبھی اُنھوں نے کرداروں سے غیر فطری حرکتیں بھی کرائی ہیں۔

میاں آزاد اگرچہ ایک کردار کا نام ہے۔ لیکن وہ اپنے زمانے کے سماج کے کئی قسم کے لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کا کردار غیر فطری ہو گیا ہے۔ لیکن غیر فطری ہونے کے باوجود دلچسپ بھی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں کئی ایسے کردار سموئے ہوئے ہیں جو الگ الگ ہوتے تو بالکل فطری ہوتے۔ اُن میں نوابوں اور شریف زادوں کی خُو بُو ہے، اور مصاحبوں کی عیاریاں بھی ہیں۔ وہ عاشق بھی ہیں، اور پہلوان بھی۔ درویش ولی اللہ بھی ہیں اور آوارہ شرابی بھی۔ وہ شاعر، نثار اور مقرر ہیں اور ساتھ ہی ساتھ فنِ حکمت کے اُستاد بھی۔ غرضکہ وہ شائستہ بھی ہیں اور ناشائستہ بھی۔ ایک عشق کی تکمیل کے لئے دنیا جہان کی خاک چھانتے ہیں، اور اسی مدت میں کئی اور معاشقے بھی کر ڈالتے ہیں۔

ہر کردار میں متضاد رجحانات ہوتے ہیں اور ان پر ماحول اور حالات اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر کردار میں تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک ارتقا بھی ملتا ہے۔ آزاد کے کردار میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں اُن کو ہم مافوق الفطرت تو نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اُن میں کافی حد تک مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، اور اسی مبالغہ سے کردار کا ارتقا پسپا ہو گیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ خود سرشار نے آزاد کی تخلیق اسی لئے کی ہوگی کہ وہ اپنے زمانے کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی دلچسپ پیرایے میں پیش کریں اور مزاح کی چاشنی تیز کرنے کے لئے اُنھوں نے کئی کرداروں کو آزاد میں (Condense) کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس زاویۂ نظر سے آزاد کو دیکھا جائے تو ہم سرشار کے فن کے ساتھ انصاف کر سکیں گے۔ — پولینڈ کی شہزادی سے معاشقہ، روس کی جنگ اور چند ایسے ہی واقعات کو اگر ہم نظر انداز کر دیں تو ہم دیکھیں گے کہ سرشار نے ہمیں مزاح کے علاوہ بھی اور بہت کچھ دیا ہے جو زیادہ اہم ہے —— اور وہ ہے ہمارے جاگیری تہذیب کا خاکہ:

خوجی کو سرشار کی شاہکار تخلیق بتایا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں میاں آزاد کا کردار سماجی لحاظ سے زیادہ اہم بھی ہے اور عظیم بھی اور اُس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ خوجی کے کردار میں کوئی ارتقا نہیں ہے اور وہ آزاد کا پابند ہے۔

خوجی میں سرشار نے ایک افیون کو مجسم کر دیا ہے، اور اگلے وقتوں میں ہم ایک ایسے کردار میں نے بھی دیکھے ہیں۔ افیونی اب بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ لیکن خوجی ٹائپ معدوم ہو گیا ہے۔ اور اس کی وجہ معاشرت کی تبدیلی ہے۔ جو بھی زندگی میں خوجی ٹائپ سے دوچار ہوا ہے وہ جانتا ہے کہ سرشار نے فن کار کی حیثیت سے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ سرشار نے خوجی کو تخلیق نہیں کیا ہے۔ بلکہ اپنے ماحول سے ایک کردار کو چُنا ہے۔ یہ اُن کی فنی پختگی اور نظر کی گہرائی ہے کہ اُنھوں نے ہو بہو نقشہ کھینچ دیا۔ خوجی ٹائپ سے مضحکہ خیز حرکتیں سرزد نہیں ہوتیں، بلکہ اُن کے سنجیدہ افعال بھی نہایت مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ سرشار نے خود بھی خوجی کے کردار میں رنگ آمیزی کی ہے لیکن جہاں بھی اُنھوں نے زیادہ گہرا رنگ چڑھانے کی کوشش کی ہے وہیں کردار مصنوعی ہو گیا ہے۔ مزاح کی تندی ہمیں سرشار کی تحریر کے ساتھ بہا تو ضرور لے جاتی ہے۔ لیکن جب ہم ہنس چکنے کے بعد سوچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے خوجی کی بے ساختگی کا خون ہو گیا۔ مثلاً روس میں گرفتاری کے عالم میں اُن کا مسخرا پن —— لیکن شاید اس طرح خوجی کے کردار کو پرکھنا سرشار کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ جب فسانۂ "آزاد" لکھا گیا تھا اُس زمانے کے پڑھنے والوں کی ذہنی تربیت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس وقت ادب کا کوئی واضح یا مبہم ایسا نظریہ رائج نہیں تھا، جو ادب کی سماجی اہمیت کا حامی ہوتا۔ اس وقت ادب محض تفریح کا ایک ذریعہ تھا، اگر اس تفریحی صنف میں سرشار ہمیں خارجی زندگی کی جھلکیاں دکھاتے ہیں تو اُسے کارنامے سے کم نہ سمجھنا چاہیے (حقیقت کی

جھلکیاں تو کم و بیش ہر زمانے کے ادب میں ملتی ہیں۔ یہاں میری مراد خاص طور سے سماجی حقیقت نگاری سے ہے، داخلی حقیقت نگاری سے نہیں۔

میرا یہ بھی خیال ہے کہ سرشار نے محض "تفریح طبع" کی خاطر نہیں لکھا، اور اُن کا مقصد مزاح سے زیادہ بے مصرف تہذیب پر طنز بھی تھا۔ جب سرشار، روم اور ڈکنس کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کا رویّہ "فینٹسی" کا ہوتا ہے۔ "فسانۂ آزاد" حقیقت اور "فینٹسی" کا امتزاج ہے جس میں حقیقت غالب ہے۔ "فینٹسی" کا جزو دال میں نمک کے برابر ہے۔

عبدالحلیم شرر

عبدالحلیم شرر پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے ہیئت کے اعتبار سے اردو ناول کو سنوارا۔ شرر کے پیشِ نظر مسلمانوں کا زوال تھا۔ غدر کے مسلمان حکمراں قوم کی خود اعتمادی اور غرور کو کھو چکے تھے۔ احساسِ شکست نے اُن کی سماجی پستی کو شدید تر کر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں کو ایک باوقار قوم دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ خود کو بھی اور اپنے ہم مذہبوں کو بھی عظمتِ رفتہ کے نشہ میں سرشار رکھنا چاہتے تھے۔ قوم کو بامِ عروج پر لے جانے کے لئے سماجی حالات کو سمجھنے اور خارجی حقائق کی روشنی میں مسائل کو حل کرنے کی ضرورت تھی۔ شرر سماجی بصیرت سے بے بہرہ تھے۔ اور مذہبی تعصّب سے بھی ایک حد تک اُن کی ذہنیت کو لگاؤ تھا۔ (مثنوی گلزارِ نسیم کے سلسلے میں اُن کے مضامین اس پر روشنی ڈالتے ہیں) ماضی کی روایات انسان کا سب سے بیش قیمت ورثہ ہوتی ہیں۔ لیکن انسان کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ اپنے اجداد کے تجربوں کی روشنی میں حال اور مستقبل کو بہتر بنائے۔ جب انسان حال اور مستقبل سے مایوس ہو کر ماضی کی طرف مراجعت کرتا ہے تو اُس کا یہ رویّہ صحت مند ہونے کے بجائے مریضانہ ہوتا ہے۔ شرر نے وقتی تسکین کے لئے فرار اور رجعت کا راستہ اختیار کیا۔ اور ایسے ناول لکھے جن میں مسلمانوں کی بہادری کے راگ الاپے گئے تھے۔ بعض لوگ ان ناولوں کو تاریخی ناول سمجھتے ہیں، ایسا نہیں ہے۔ یہ تخیّلی ہیں، اور جن داستانوں اور ڈراموں پر اُن کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ تاریخی صداقت سے محروم ہیں۔ اور شرر نے موضوع کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے وہ بجائے حقیقت نگاری، "فینٹسی" کا ہے۔ شرر نے اُن حالات کی ترجمانی سے اپنا دامن بچایا ہے، جو اُن کے زمانے کی تہذیب پر اثر انداز ہو رہے تھے۔

منصور موہنا، فتح اندلس، ملک العزیز، ایّامِ عرب وغیرہ ایسے ہی ناول ہیں جو بے حد مقبول ہوئے۔ اُن کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ شرر نے انحطاط قوم کی دُکھتی ہوئی رگ، یعنی عظمتِ رفتہ حاصل کرنے کے جذبہ کو پہچان لیا تھا۔ لیکن نبض شناسی کے باوجود وہ علاج نہ کر سکے۔ بلکہ جو انھوں نے کیا وہ غلط تھا۔ اُن کے "تاریخی ناولوں" نے نہ تو سماجی حیثیت کوئی تعمیری خدمت انجام دی اور نہ کوئی نیا کردار اردو ادب کو دیا۔ کردار نگاری کے لحاظ سے شرر کے ناول ناکام ہیں۔ اُن کا ہیرو مسلمان نوجوان ہے۔ شرر اس میں کُوٹ کُوٹ کر خوبیاں بھر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ سیرت کے لحاظ سے فرشتہ ہو جاتا ہے۔ ہیروئن غیر مسلم ہوتی ہے۔ لیکن شرر شاید مسلم طرزِ معاشرت کے علاوہ کسی اور تہذیب سے واقف نہیں تھے۔ اس وجہ سے اس بیچاری غیر مسلم خاتون کا کردار ٹھونس دیتے ہیں۔ کردار نگاری کے سلسلے میں شرر کا مذہبی تعصّب صاف نمایاں ہے۔ اُن کے یہاں مسلمان رحمان اور غیر مسلم شیطان ہوتا ہے۔

پھر بھی شرر نے "فردوسِ بریں" کے روپ میں اردو کو ایک اچھا ناول دیا ہے۔ اگرچہ غیر فطری حرکتوں نے کرداروں کو مصنوعی بنا دیا ہے۔ اس کے باوجود فیشن بیجا کی تباہ کاریوں کو بے نقاب کرنے کی جرأت کیلئے یہ ناول قابلِ قدر ہے، اور اس لحاظ سے اردو ادب میں ایک تاریخی مقام رکھتا ہے۔

مرزا ہادی رُسوا

مرزا ہادی رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" اردو ادب میں ایک روایت کی حیثیت رکھتا ہے، اور آج بھی پختگیِ فن کے لحاظ سے اردو ادب میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مرزا رسوا کے دوسرے مشاغل ہمیشہ اُن کی ادبی دلچسپیوں پر حاوی رہے۔ اگرچہ انھوں نے "امراؤ جان ادا" کے علاوہ بھی اور کئی ناول لکھے۔ لیکن توجہ کے ساتھ اُنھوں نے صرف یہی ایک ناول لکھا، جو انھیں کی تصنیفات میں نہیں۔ بلکہ اردو ادب میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ "اختری بیگم" اور "افشائے راز" تکمیل کی منزل تک نہ پہونچ سکے۔ "ذاتِ شریف" اگرچہ انھیں کی تصنیف ہے لیکن اس توجہ سے محروم رہا جو ایک فن پارہ چاہتا ہے۔ مختلف حصّے مختلف نشستوں میں محض اجرت کے لئے لکھے گئے، اور ان پر نظرِ ثانی بھی نہیں کی گئی۔ البتہ "شریف زادہ" کو کسی حد تک قابلِ توجہ سمجھا

جا سکتا ہے۔ اگرچہ مثالی کرداروں نے اس ناول کو خشک کر دیا ہے۔ پھر بھی اس میں طرزِ معاشرت اور سماجی حقیقتوں کی جھلک ملتی ہے۔

"امراؤ جان ادا" کے کردار ماحول سے چُنے گئے ہیں۔ اسی لئے وہ زندہ جاوید ہیں۔ امراؤ جان ادا ایک طوائف ہے اور یہ ناول اس کی زندگی ہے۔ باقی کردار وہ ہیں جو اس کی زندگی میں آتے ہیں۔ اگرچہ اس ناول کو ایک دور کا ترجمان نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ یہ صرف ایک مخصوص حلقے تک محدود ہے۔ لیکن اس ایک حلقے کی زندگی پیش کرنے میں رسوا نے بہ گیر فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ اس ناول کے کردار منہ بولتی تصویریں ہیں۔ اور قاری کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ کوئی کردار بے مصرف ہے۔ جو کردار جس جگہ ہے اپنا اہم مقام رکھتا ہے۔ کہانی بہت سیدھی سادی ہے۔ اس کے باوجود شدید ڈرامائی کیفیت کی حامل ہے۔ یہ مرزا رسوا کی فنی گرفت کا کمال ہے۔ ایک طوائف کی زندگی پیش کرنے میں مصنف عام طور سے لذتیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ مرزا رسوا کے فن کا دامن اس عیب سے داغدار نہیں ہے۔ جو بہت بڑی خوبی ہے۔

طوائف کو زوال آمادہ نوابی تہذیب میں جو مرکزیت حاصل تھی اُسے مرزا رسوا نے بخوبی سمجھ لیا تھا، اور اس تہذیب کو پیش کرنے میں طوائف کو آلۂ کار بنا کر اُنھوں نے اپنی حقیقت بینی کا ثبوت دیا ہے۔ اگرچہ اُنھوں نے ایک محدود حلقے کی تصویر کشی کی ہے۔ لیکن اُن کی نظریں پوری سوسائٹی پر تھیں۔ اسی لئے اس ناول کا پس منظر بہت وسیع ہے۔ عیش باغ کے میلے کا ذکر۔ شادی بیاہ کی رسوم اور رہن سہن کا ذکر اور ایسی ہی دوسری باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مرزا صاحب کا مقصد صرف چکلے کی زندگی کی عکاسی نہ تھا۔ لباسوں اور حلیوں کا تفصیلی ذکر اور امراؤ جان کی زبان سے ناقدانہ کردار نگاری اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مرزا صاحب کا اصل مقصد "غدر" سے پہلے اور "غدر" کے فوراً بعد کی طرزِ معاشرت پیش کرنا تھا۔ اس بات کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ تمام کردار خوبیوں اور خامیوں کا ایک ایسا امتزاج ہیں جو عام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے کسی کردار کو آدرش بنا کے پیش نہیں کیا۔ اور نہ اسے حالات کے اثرات سے بے نیاز رکھا۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کو غیر قدرتی نہیں بنایا۔ انہیں ایسا جامہ نہیں پہنایا جو مصنوعی معلوم ہو۔ بلکہ اُن کے کردار حالات سے اسی طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح اُن کی طرح کے دوسرے آدمی۔ یہ بات مرزا صاحب کے نفسیاتی مطالعہ کی گہرائی اور سُوجھ بُوجھ کا پتہ دیتی ہے۔ مرزا صاحب نے صرف کرداروں کی حرکات ہی پیش نہیں کیں، بلکہ حالات اور ماحول کے بیان میں بھی ضروری تفصیل ملحوظ رکھی ہے۔ اس سے جہاں کردار کا ارتقا واضح ہوتا ہے وہیں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کرداروں کو نمایاں کرنا مرزا صاحب کا مقصد نہیں تھا بلکہ اُن کے ذریعے سے زندگی کی ترجمانی مقصود تھی۔

امراؤ جان ادا کی کردار نگاری بے مثل اور مکمل ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی زندگی کے تمام رُخ، تمام شعبے خارجی حالات کے پس منظر میں پیش کئے گئے ہیں۔ پچھلے دس بارہ برسوں سے طوائف اردو افسانہ نگاروں کا محبوب موضوع رہی ہے۔ لیکن ایک بھی کردار اتنے بڑے پیمانے پر تخلیق نہیں کیا گیا کہ وہ دوام حاصل کرلے۔ جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا رسوا کے علاوہ کسی اور نے طوائف کی زندگی کا مطالعہ نہیں کیا۔ اور اگر کسی نے ہمت کی تو اس کی پسند کے چند مظاہر نے اس کی نظروں کو اسیر کرلیا اور وہ گہرائی میں نہ جا سکا۔ بعض جو نفسیات کے دلدادہ تھے اُنھوں نے نظریات پہلے قائم کرلئے، اور طوائف پر اس کو چسپاں کرنے کی کوشش کی، اور اُن حالات اور ماحول کو یکسر نظر انداز کر دیا جو اُن کے کردار کی زندگی کا رُخ بدلتے رہتے ہیں۔

امراؤ جان ادا کے علاوہ ہمیں اردو ادب میں پیش کی جانے والی کسی اور طوائف کے کردار میں ارتقا نہیں ملتا۔ امراؤ جان ادا کا کردار اس ناقابلِ تردید حقیقت کو کتنی بلاغت کے ساتھ نمایاں کرتا ہے کہ ماحول اور حالات کی مجبوریاں انسان کی زندگی اور نفسیات کو سانچوں میں ڈھال دیتی ہیں۔ اس کے باوجود انسان کے دل کی دھڑکن نہیں مٹتی۔ بہتر زندگی بسر کرنے کی لگن فنا نہیں ہوتی۔ ترقی کرنے کی تمنا نہیں مرتی۔

محمد رضا انصاری

ہفتہ وار "طلسم" لکھنؤ

ایک صدی پرانا اخبار

اودھ کے انتزاعِ سلطنت اور ۱۸۵۷ء کی شورش کی درمیانی مدت سوا سال سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن یہی زمانہ اودھ کی تاریخ کا سب سے زیادہ ہیجانی زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس غیر معمولی اور ہیجانی زمانے میں لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار اخبار "طلسم" کے نام سے جاری ہوا تھا۔

۱۸۵۷ء کے اخبارات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا احسن مارہروی نے "خورشید عالم" (سیالکوٹ) اور "طلسم" (لکھنؤ) کا حوالہ ان الفاظ میں دیا ہے۔

"یہ دونوں اخبار ۱۸۵۷ء میں جاری ہو سکتے۔ اس میں طلسم لکھنؤ اس لئے اہم ہے کہ اس سے ۱۸۵۷ء کی شورش کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے۔"

جہاں تک ۱۸۵۷ء کی شورش کا تعلق ہے "طلسم" اخبار اس سلسلے میں بالکل خاموش ہے جیسا آگے لکھا گیا ہے ۱۸۵۷ء کی شورش سے دو دن قبل اس اخبار کی آخری اشاعت ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ اخبار چھپ نہ سکا۔ غالباً مولانا مارہروی کی نظر سے "طلسم لکھنؤ" کا فائل نہیں گزر سکا۔ اور انھوں نے صرف اندازے سے مذکورۂ بالا رائے ظاہر کر دی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اودھ کے انتزاعِ سلطنت کے بعد قدرتی طور پر اٹھ کھڑے ہونے والے سیکڑوں سیاسی اور سماجی مسائل کے لحاظ سے یہ اخبار بنیادی حیثیت کا مالک ٹھہرتا ہے۔

تاریخِ اشاعت

"طلسم" کا پہلا پرچہ ۲۵ جولائی ۱۸۵۶ء مطابق ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۷۲ھ کو شائع ہوا تھا۔ یہ تاریخ انتزاعِ سلطنت کے پورے پانچ مہینے بعد کی تاریخ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ زمانہ ہے جبکہ باشندگانِ اودھ ایک غیر ملکی اقتدار کا تجربہ شروع کر چکے تھے۔ لیکن شاہانِ اودھ کو سلطنت کی واپسی کی اُمید پوری طرح منقطع نہیں ہوئی تھی۔

یہ اخبار جاری کب تک رہا؟ اس بارے میں کوئی حتمی بات کہہ آسان نہیں ہے۔ دستیاب شدہ شماروں کی مدد اور قیاس کی رہنمائی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اخبار کی عمر بہت مختصر تھی۔ اور ۱۸۵۷ء کی شورش میں یہ تاریخی غنچہ بن کھلے مرجھا گیا۔ اخبار کا آخری شمارہ جو دستیاب ہوا اُس پر ۸ مئی ۱۸۵۷ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے جس کے تیسرے دن (۱۰ مئی ۱۸۵۷ء) وسیع پیمانے پر وہ شورش پھوٹ پڑی تھی جس کو غدر ۱۸۵۷ء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور جس کا مرکز اصلی شمالی ہندوستان ہی تھا۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس انقلابی ہلچل میں کارکنانِ اخبار کو اس اخبار کی اشاعت ملتوی کر دینا پڑی ہوگی۔ اس خیال کی تائید مرزا رجب علی بیگ سرور کی ایک تحریر سے بھی ہوتی ہے جس میں انھوں نے "طلسم" اخبار کے مالک اور مہتمم کا وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور جس کا اقتباس آنے والی سطور میں اپنی جگہ پر آئے گا۔

فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی اور مارہروی نے اپنی تصنیفات میں "طلسم" کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان دونوں بزرگوں نے نہ اخبار کے محلِ اشاعت کا کوئی حوالہ دیا ہے نہ اس کے مالک اور مدیر کا نام بتایا ہے اور نہ اخبار کے فائل ہی کا کہیں پتہ چلتا تھا جو اس سے تفصیلات معلوم کی جاتیں۔

ایک تاریخی حوالہ کی جستجو میں فرنگی محل سے شائع ہونے والے ایک اخبار "ہفتہ وار کارنامہ" کی فائلیں جو مولانا عبد الباری صاحب مرحوم (فرنگی محل) کے کتب خانے میں محفوظ ہیں دیکھنے اور ان کی ورق گردانی کے دوران میں "طلسم لکھنؤ" کے ایک پرچے پر اچانک نظر پڑی۔ پھر انہیں فائلوں کے اندر "طلسم" کے پہلے شمارے سے لے کر ۲۳ تک دستیاب ہو گئے۔ شمارہ

پر ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کی تاریخ پڑی ہے جس کے تیسرے دن شمالی ہندوستان غدر کی ہلچل سے دوچار ہو گیا تھا۔

ہر شمارے کے آخر میں ان نئے خریداروں کے نام پابندی کے ساتھ درج ہوتے تھے جو اس ایک ہفتہ کے اندر خریدار بنتے تھے۔ خریداروں کی اس فہرست میں بہت سے ان علم دوست حضرات کے نام بھی شامل ہیں جن کے یہاں مخطوطات اور مطبوعات کی حفاظت اور نگرانی کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔ مثلاً نواب رام پور نواب کلب علی خاں۔ والی محمود آباد۔ راجہ امیر حسن خاں۔ سالار جنگ اوّل ریاست حیدر آباد وغیرہ۔ لیکن رام پور کے مشہور کتب خانہ میں اور نہ ریاست محمود آباد کی لائبریری میں طلسم لکھنؤ کا پتہ چل سکا، خیال ہوتا ہے کہ مولانا عبدالباری (فرنگی محلی) کے کتب خانہ کے علاوہ اب طلسم کی فائل اور کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے طلسم لکھنؤ کے اندر مدفون تاریخی سرمایہ کا منظرِ عام پر لانا ایک تاریخی تقاضا ہے۔

دستیاب شدہ شماروں کی روشنی میں اخبار طلسم کے حسب ذیل پہلو سامنے آتے ہیں۔

محلِ اشاعت "طلسم (لکھنؤ) کا محلِ اشاعت مشہور علمی مرکز فرنگی محل تھا۔ اور اس کے مالک و مہتمم فرنگی محل کے ایک بزرگ مولوی محمد یعقوب انصاری تھے جنھوں نے احاطۂ فرنگی محل میں مطبع محمدی کے نام سے ایک پریس قائم کیا تھا۔

اس حقیقت کا سراغ لگانا کہ اخبار کے اجرا سے مولوی یعقوب انصاری کی خاص غرض کیا تھی یا عام طور پر اس زمانے میں اخبار نکالنے والوں کی غرض و غائت کیا ہوا کرتی تھی، دشوار ہے۔ اخبار کی پہلی اشاعت جس میں عموماً پالیسی اور اغراض و مقاصد کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔ اس موضوع پر کسی قسم کی روشنی نہیں ڈالتی۔ اگر اخبار کی لوح پر پابندی کے ساتھ چھپنے والے حسب ذیل قطعہ کو ؎

شکرِ حق کز نامۂ اخبارِ نو — یافت جانِ تازہ جسمِ لکھنؤ
گنج گوہر ہائے معنی اندروست — چشم بکشا بر طلسمِ لکھنؤ

اخبار کی غرض و غائت کا ترجمان سمجھ لیا جائے تو کسی حد تک یہ عقدہ کھل سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خواہ طلسم لکھنؤ کے ہم قافیہ ہونے کی بنا پر جسم لکھنؤ لایا گیا ہو۔ یا یہی صحیح ہو کہ لکھنوی مذاق کے مطابق طلسم کی مناسبت سے گنج و گوہر کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اس زمانے میں ایک اخبار کی غرض و غایت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ جن ہاتھوں تک اس کی رسائی ہو ان کو ایک طرح کی تازگی یا "حیاتِ تازہ" نصیب ہو سکے۔

جہاں تک "جسم لکھنؤ" کا تعلق ہے اس وقت نمایاں تاریخی اسباب کی بدولت نحیف و نزار ہو کر تپ سبرگ تک پہنچ چکا تھا۔ اودھ کی سلطنت جو ایک طویل مدت تک سربلندی اور توانائی کے ساتھ قائم رہ چکی تھی، ان زخموں سے جو غیر ملکی ماہرینِ امراضِ عمل جراحی کے نام پر اُسے پہنچا رہے تھے بتدریج ناتواں ہو کر بے جان بلکہ معدوم ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت "جانِ تازہ" کی ضرورت "جسمِ لکھنؤ" سے زیادہ اور کس کو ہو گی۔

مالک و مدیر مولوی محمد یعقوب انصاری جو اس اخبار کے مالک اور مدیر (مہتمم) تھے فرنگی محل کے علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کا انتقال ۳ جنوری ۱۹۰۶ء مطابق ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ میں ہوا۔ اس حساب سے طلسم اخبار جاری کرتے وقت وہ جوان سال ہوں گے۔ اور ایک حساس نوجوان کی طرح لکھنؤ کے متوقع مگر افسوسناک انقلاب نے ان کے احساسات کو نہ صرف جھنجھوڑ دیا ہو گا بلکہ عام شہریوں کے گھٹے جذبات اور احساسات کی ترجمانی اور اظہار پر بھی اُنھیں مجبور کر دیا ہو گا۔

مولوی یعقوب صاحب کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ کوئی سیاسی رہنما یا مدبر آدمی تھے دعویٰ بلا دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ لکھنؤ کی سماجی زندگی میں کسی نمایاں جگہ کے ضرور مالک تھے "فسانۂ عجائب" اور "فسانۂ عبرت" کے نامور مصنف مرزا رجب علی بیگ سرور نے جن سے مولوی صاحب کے تعلقات بہت گہرے معلوم ہوتے ہیں اپنی اکثر تصنیفوں میں اُن کا تذکرہ کیا ہے جس سے مولوی یعقوب کی سرگرمیوں کا سرسری اندازہ ہو جاتا ہے۔

مرزا سرور کی تمام تصانیف ان کی زندگی میں مولوی صاحب کے مطبع محمدی میں طبع ہوتی تھیں، جہاں سے طلسم اخبار شائع ہوتا تھا۔ مرزا صاحب نے اپنے ترجمۂ الف لیلہ کے آخر میں جو شبستانِ سرور کے نام سے مشہور ہے، اور پہلے پہل مولوی صاحب ہی کے زیرِ اہتمام مطبع محمدی میں طبع ہوا تھا مولوی یعقوب کے ساتھ گہرے تعلقات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

"عاجز ہیچ مداں، مدرسۂ جہل و نادانی کا ابجد خواں۔ بلکہ پڑھا نہ لکھا نام محمد فاضل مشہور کفش بردار اہلِ فضل و کمال مرزا

رجب علی بیگ سرور نے الف لیلہ کا زبانِ عربی سے اردو میں ترجمہ کیا اور بفرمائش و پاس خاطر فضیلت انتساب محبوب قلوب جناب مولوی محمد یعقوب انصاری بعبارت مقفّیٰ و مسجع لکھا۔ حق تصنیف و تالیف اس مجموعۂ دلفریب کا جناب مولوی کو بعوض نقد محبت و امداد و اعانت ہبہ و بخل کیا اور چھاپنے و اشاعت کرنے کا کامل اختیار دیا۔"

اس ترجمہ کے شروع میں مرزا صاحب نے یہ بتلاتے ہوئے کہ "مولوی (یعقوب) انصاری کہ شہر میں ان کا چھاپہ خانہ ہے بخدا یہ شخص بہ صفت موصوف روزمانہ ہے" لکھا ہے۔

"جو جو بزرگوار کتاب الف لیلہ کی تحریر کے سلسلہ جنباں ہوسکے۔ ان کا نام لکھنا ضرور ہے، اس واسطے کہ جب تک یہ کلام رہے اُن کا نام رہے۔ بہر کیف منظور ہے۔

سب سے پہلے تو سرخیل رہروانِ کوچۂ صادق الاقراری جناب مولوی محمد یعقوب انصاری۔۔۔۔۔۔ حق تالیف مولوی صاحب کو بخل کیا۔ مولوی نے اس کو چھاپ کر مذاق دی سخن فہموں نے پڑھ کر قدر کی۔ اب یہ کتاب الف لیلہ بلکہ اس کی ملکیت بھی مولوی صاحب کو دی۔"

مرزا سرور نے اپنی مشہور کتاب "فسانۂ عجائب" کے مقدمہ میں جو اسی مطبع ہی میں طبع ہوئی تھی، مولوی یعقوب انصاری کے پیشۂ صحافت کا بھی حوالہ ہے، اور اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اُن کا اخبار انقلاب زمانہ سے (مطلب غدر ۱۸۵۷ء سے ہے) بند ہو گیا تھا۔ لکھتے ہیں۔

"مطبعے اس شہر میں (لکھنؤ میں) اکثر سنگ کے ہیں۔ نمونے نیرنگ کے ہیں۔ مگر ہمارے شفیق و مہربان یک رنگ حاضر و غائب یکساں جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدظلہ عزیز دلہا بہ صفت موصوف ہیں، منور فرد مشہور و معروف ہیں۔ سابق ازیں فرنگی محل میں چھاپہ خانہ تھا۔ رشکِ ابنائے زمانہ تھا، اخبار کا پرچہ چھپتا تھا، ان کا پتہ نہ چھپتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کارخانے میں جو کتاب چھپی وہ مرقعِ مانی کی تصویر تھی۔ شہروں میں اس چھاپے کی دھوم تھی۔ گردشِ تقدیر کے

معلوم تھی، دفعتہً فلک نے یہ چکر کھایا۔ حرفِ غلط کی طرح رگڑ کے شہر کو مٹایا۔ پروین سے بنات النعش کی صورت نظر آئی۔ ایسا تفرقہ پڑا کہ پھر کسی کی خبر پائی۔"

اس تفرقہ اور انقلاب کے ہاتھوں مرزا سرور کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ وہ تو مہاراجہ بنارس ایسری پرشاد نارائن سنگھ بہادر کے ملازم ہو کر بنارس چلے گئے۔ لیکن مولوی یعقوب انصاری کو مرزا رجب علی بیگ سرور کے الفاظ میں :۔

"دوستوں کی تحریک سے مولوی صاحب کو شغل پارینہ منظور ہوا۔ پہلے عزم فسانۂ سرور ہوا۔ اس کی صحت کی خاطر بندہ کو لکھا۔ بجز اقرار چارہ نہ ہوا۔ انکار گوارا نہ ہوا۔ جب تو یہ فسانہ بطور زمانہ ہر ایک چھاپے خانے میں نیا نیا رنگ لایا جس نے چاہا جس فقرے پر پانی پھیرا۔ فقیر نے اس کے دیکھنے (نظر ثانی) میں عرق ریزی از حد کی۔ حضرت (مولوی یعقوب انصاری) کے خوف سے انتہائی کد کی۔ جس جگہ محل اور موقعہ پایا ہے کیا کیا جملہ بڑھایا ہے۔ طبیعت نے بڑھاپے میں کیا کیا دور دکھایا ہے۔"

گویا جب حالات کسی حد تک یکسو ہو گئے اور انقلاب کی ہمہمی ختم ہو گئی تو مولوی صاحب کو "شغلِ پارینہ" منظور ہوا۔

"شغلِ پارینہ" کی تفصیل یہ ہے کہ انھوں نے فرنگی محل ہی میں دوسرا پریس "نجم العلوم" کے نام سے جاری کیا۔ جس میں کتابوں کی طباعت ہوتی تھی۔ اور ایک ہفتہ وار اخبار "کارنامہ" کے نام سے نکالا۔ جو کم و بیش چالیس سال تک مسلسل جاری رہا، اور مولوی صاحب کی وفات تک نکلتا رہا۔

اخبار کارنامہ ۳۱ جولائی ۱۸۵۶ء مطابق ۲۷ ربیع الاول ۱۲۷۲ھ سے جاری ہوا تھا۔ گارسان دتاسی نے اپنے خطبات میں اور دوسرے مصنفوں نے اپنی تصانیف میں کارنامہ کا ذکر کیا ہے۔

کارنامہ اخبار کی تاریخی اہمیت سے قطع نظر مولوی یعقوب کا یہ کیا کم کارنامہ ہے کہ انھوں نے تقریباً ۴۰ سال تک ایک اخبار جاری رکھا۔ آخری عمر میں مولوی یعقوب کو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اُن کا پریس اور اخبار بتدریج زمانہ کی ناقدری کا شکار ہوتا گیا۔ اور ایک زمانہ

اُن پر ایسا گزرا کہ وہی کتابت کرتے، وہی اصلاح شکل کرتے اور وہی اخبار کو ڈسپیچ بھی کرتے تھے اور عجب نہیں کہ کبھی کبھی پریس چلانے میں ایک مزدور کی طرح مصروف بھی نظر آتے ہوں۔

تاریخی موقف بہرحال طلسم لکھنؤ انتہائی نازک حالات میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ سلطنت ختم ہو چکی تھی۔ لیکن مزاجوں کی نزاکت میں کوئی فرق نہیں ہوا تھا، اور یہ اُمید کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ناجائز طور پر جو سلطنت چھینی ہے وہ انگلستان کے انصاف سے مل کر رہے گی، طبیعتوں کو غلامی کے لئے تیار بھی نہیں ہونے دیتی تھی۔

بادشاہ جم جاہ (نواب واجد علی شاہ) واپسی اودھ کا مقدمہ انگلستان لے جانے کے ارادہ سے لکھنؤ چھوڑ کر جا چکے تھے اور کلکتہ میں قیام پذیر تھے، اور شاہی خاندان کے ذمہ دار افراد کا ایک وفد انگلستان کی پارلیمنٹ سے دادخواہی کے لئے روانہ کر دیا گیا تھا۔

لکھنؤ سے بادشاہ جم جاہ صرف مع ضروری سامان اور ہمراہیوں کے گئے تھے۔ افسران اور اعیانِ سلطنت کے علاوہ خود بادشاہ کا تقریباً پورا خاندان یہیں مقیم تھا۔ لوازم سلطنت اور خزانۂ شاہی میں سے کوئی خاص چیز بھی یہاں سے منتقل نہیں ہوئی تھی، اور نئی حکومت کے ارکان، خزانہ اور اثاثہ کی جستجو میں ہر اُس معزز شہری کی جس پر واقفیت کا ذرا بھی گمان ہوتا تھا سخت گرفت کر رہے تھے۔ بادشاہ کا تعلق لکھنؤ سے پوری طرح منقطع نہیں ہوا تھا۔ سلطنتِ اودھ کے جو ذمہ دار افسر لکھنؤ میں مقیم تھے اُن کے نام شاہی احکام کلکتہ سے آتے رہتے تھے۔ جو افسران ان احکام کی تعمیل کرتے اور انگریزی حکومت کے احکام کو واجب التعمیل نہ سمجھتے اُن کو باشندگانِ لکھنؤ کی طرف سے وفادار اور خیرخواہِ سلطنت کے خطابوں سے یاد کیا جاتا تھا۔ لیکن کچھ افسران ایسے بھی تھے جو وفاداری پر مصلحتِ وقت کو ترجیح دے کر نئی حکومت سے تعاون کرنے لگے تھے۔ ایسے افسران کے بارے میں نیز انگریزوں اور اعیانِ سلطنت کے لئے جو عام خیال کے پیش نظر انتزاعِ سلطنت کے ذمہ دار تھے، باشندگانِ اودھ کے جذبات انتہائی منافرانہ تھے۔

غرض قدیم سلطنت کے خاتمہ اور نئی حکومت کے جمنے کے عبوری زمانہ میں جذبات اور فرائض کی جو کشمکش لازمی ہوا کرتی ہے اُس کا نقشہ طلسم اخبار میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

سَتیہ دیو شرما

مہادیوی ورما

ہندی کے عہدِ حاضر کے اُن شعرا میں جن کا نام اور کلام ہندی ادب میں زندہ رہے گا مہادیوی ورما ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔

اپنے جذبات کی عکاسی کے لئے وہ صرف شاعری کی محتاج نہیں بلکہ فن مصوّری سے بھی مدد لیتی ہیں یعنی شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اچھی خاصی مصوّرہ بھی ہیں۔ اپنے بہت سے گیتوں کو خود انہوں نے تصویروں کی زبانی بھی بیان کیا ہے۔ قلم اور موقلم دونوں میں ان کو بہت اچھی دسترس ہے لیکن موقلم پر قلم نے یقیناً فوقیت حاصل کی ہے۔

مہادیوی جی نے سنسکرت میں ایم۔اے پاس کیا ہے اور وہ الہ آباد کے مہلا ودیا پیٹھ کی پرنسپل ہیں۔ شروع ہی سے ذہین اور طباع تھیں اور شاعری کی طرف میلان بھی بچپن سے ہی تھا۔ زندگی میں سادگی اور بلند خیالی کے سنہرے اصول کو ہی اپنایا ہے۔ شادی ان کی بچپن ہی میں ہو گئی تھی پھر بھی انہوں نے تعلیم کو جاری رکھا۔ مہادیوی جی کے دل میں اہل فن کا بڑا احترام ہے۔ چنانچہ کچھ سال ہوئے انہیں کے ایما سے الہ آباد میں بلند پایہ ادیبوں کی سرپرستی اور ان کی مدد کے لئے ایک ادارہ بھی قائم کیا گیا تھا

ہندی کے گیت لکھنے والوں میں پرساد، پنت، نرالا، مہادیوی، بچن، رام کمار ورما، بھگوتی چرن ورما، نریندر شرما وغیرہ ہیں پرساد کے بعد مہادیوی اور بچن سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ بچن اپنی سادہ زبان اور مہادیوی جذبات کی گہرائی کی وجہ سے۔

گو مہادیوی نے اپنے گیتوں میں بہت سے سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے ہیں پھر بھی ان کی دل کشی میں فرق نہیں آیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گیت اُن کے دل کی گہرائیوں کو چیر کر کاغذ پر اترتے ہیں۔ اُن کا قلم اُن کے آنسوؤں کو ہی پرو کر کاغذ پر بکھیرتا جاتا ہے۔ اُن کی کوِتا دماغی کاوشوں کا نتیجہ کم اور دل کی آواز زیادہ ہے۔ ان کے دماغ پر ان کا دل حاوی ہے۔ وہ جنم سے شاعر ہیں۔ چشمے کی طرح ان کی کوِتا خود بخود ابھرتی اور اپنی راہیں خود ہی بناتی ہوئی چلتی ہے۔ ان کی نکالی ہوئی راہوں پہ دوسروں نے بھی چلنے کی کوشش کی ہے۔ مہادیوی کی کوِتا نے بہت سے نوجوان شعرا کو ان کے تتبع پر مجبور کر دیا ہے۔ ان کے راستے کو بہتوں نے اپنایا ہے۔ کیونکہ ان کا راستہ سیدھا اور صاف ہے۔ اس میدان میں مہادیوی نرالا سے بھی کچھ بڑھ گئی ہیں۔ نرالا میں ایک عجیب مستی اور پختگی ہے جو ہندی کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں لیکن انہوں نے اپنے لئے جو شاہراہ منتخب کی ہے اس پر دوسرا کوئی نہیں چل سکتا۔

پرانی ہندی کوِتا میں جس طرح میرا بائی نے اپنے گردھر گوپال کے پریم میں مست ہو کر اپنے جذبات کو لفظوں کے پیرہن میں پیش کیا ہے اسی طرح موجودہ دَور میں مہادیوی اپنے روحانی محبوب (پریتم) کے لئے روتی رہتی اور اپنے دل کو گیتوں میں بہاتی ہیں۔ مہادیوی کے آنسو ایسے نہیں جو تھم جائیں۔ یہ ایک ایسا سیلاب ہے جو ہمیشہ اُمڈتا رہتا ہے۔ پھر بھی ان آنسوؤں میں نور کی جھلک ضرور موجود رہتی ہے۔ مہادیوی کے دل میں نور کا ایک ساگر سا لہراتا رہتا ہے۔ لیکن اس نور کے ساگر میں اندھیارا بھی اپنا آسن جمائے ہوئے ہے۔

ان کے آنسوؤں نے چمکتے ہوئے ستاروں کو دھندلا کر دیا ہے۔ ایک جگہ وہ کہتی ہیں۔

بنھ کے دھندلے کر ڈالے کتنے اپلک چمکیلے تارے
ان آہوں پر تیرا کر رجنی کر پار اُتارے

ترجمہ۔ رات نے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والے آسمان کے کتنے ہی چمکدار ستاروں کو دھندلا کر دیا ہے۔ اور انہیں آہوں پر تیرا کر اس پار اُتار دیا ہے۔

میراں کا پریم فقط اپنے گردھر ناگر کے لئے ہوتے ہوئے بھی لامحدود
ا۔ اور مہادیوی کا پریم کسی لامحدود، لا متناہی، روحانی محبوب کے لئے
ر بھی خود تک محدود ہے۔ اپنے پریتم کی جھلک پاتے ہی وہ اس میں
ل مل سی جاتی اور اسی کا روپ بن جاتی ہیں۔ ایک دوسرے کی پہچان
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"تم مجھ میں پریہ پھر پریچے کیا"

مہ۔ من تو شدم، تو من شدی

مہادیوی کے گیتوں میں تصوّف کا رنگ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان
شاعری میں محبّت ایک فلسفیانہ رنگ لئے ہوئے ہے۔ اپنی ذات
انہوں نے اپنے حقیقی محبوب میں مدغم کر دیا ہے۔ کہیں ایک جگہ بھی
، کی محبت میں ان کے درد اور غم نے محبت کا مجازی پہلو نہیں دیکھا
رتی مناظر کو اپنے نرالے انداز میں بیان کرتے ہوئے بھی ان میں اپنے
یتم کی جھلک کو دیکھا ہے۔ اس کے لئے وہ پاگل ہو گئی ہیں۔ اسی کے
دھن کو مانا ہے۔ اسی لامحدود کو اپنے میں مقیّد یا پھر اپنی محدودیت
ں اپنے کو مدغم کرنے کی کوشش کی ہے۔ دونوں حالتوں میں پریم کا بندھن
وٹ ہے۔ کبھی خود کو لامحدود میں گم پاتی ہیں تو کبھی اس کو اپنے دل
ں بند۔ اسی جذبے کا مرقّع ان کا ایک گیت ہے۔ پپیہے کو مخاطب کرتے
وئی مہادیوی جی لکھتی ہیں۔

"پران پک پریہ نام رے کہہ
میں مٹی نسیم پریہ میں
وہ گیا بندھ مجھو ہردے میں
اب ورہ کی رات کو تو، چر ملن کی پربھات رے کہہ
پران پک . . . . . .

ترجمہ۔ اے پرانوں سے پیارے پپیہے۔ پیارے کے نام کی رٹ لگاؤ
میں تو اپنے لامحدود پریتم پر مٹ چکی ہوں
اور وہ میرے چھوٹے سے دل میں مقیّد ہو گیا ہے
اس لئے میری جدائی کی رات کو تو ملن کی مستقل منزل یعنی
وصل کی نہ مٹنے والی صبح کہہ دے۔

اس پر بھی مہادیوی کے گیتوں میں وصل کی شکر کم ہے ہجر کا
نمک زیادہ ہے۔ ان کی جدائی کا غم اتنا گہرا ہے کہ کبھی کبھی جدائی ہی ملن کا روپ
بھر لیتی ہے۔ بلکہ ملن کی منزل کو چھوڑ کر بھی وہ اپنے راستے پر چلی جاتی ہیں۔
جیسے چلے جانے والے مسافر کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ منزل کہاں تھی اور کب نکل
گئی۔ وہ جیسے راستے کو ہی منزل مان کر چلا جا رہا ہو۔ ایسا ہی ہے مہادیوی
کا ہجر۔ ان کا جیون جیسے ورہ کا ہی کنول ہو جو دل کے درد میں ہی پیدا ہوا.
اور دن رات آنسو پینا ہی اس کا کام ہو۔ ایک گیت میں اس کا تذکرہ یوں
ہوا ہے

ورہ کا جل جات جیون
ورہ کا جل جات
ویدنا میں جنم کرونا میں ملا آواس
اشرو چنتا دوس اس کا۔ اشرو چنتی رات
جیون ورہ کا جل جات

ترجمہ۔ یہ زندگی ہجر کے پھولوں کی مانند ہے۔ درد میں اس کا جنم ہوا
اور غم والم میں یہ پروان چڑھی۔
اس زندگی کا دن آنسو چننا ہے اور رات بھی۔
یہ زندگی آخر ہجر کا پھول ہی تو ہے۔

مہادیوی کی یہ حقیقی محبّت ان کے گیتوں میں رہ رہ کر بولتی ہے۔ محبت
کی مٹھاس، پیار کی مدھرتا کو انہوں نے اپنے قلم کی نوک سے جس طرح کاغذ
پر اتارا ہے یہ انہیں کا حصہ ہے۔ کوی میں چتر کار بولتا ہے اور چتر کار میں
کوی کی وانی جادو جگاتی دکھائی دیتی ہے۔ اس سے اچھی اور اچھوتی پیار
کی تصویر کہاں ملے گی۔

کمل دل پر کرن انکت
چتر ہوں میں کیا چتیرے
بادلوں کی پیالیاں بھر چاندنی کے سار سے
تو لکا کر اندر دھنو تم نے رنگا ار پیار سے
کال کے مجھو اشرو سے. گھل جائیں گے کیا رنگ میرے
کمل دل پر . . . . .

ترجمہ۔ کمل کی پنکھڑیوں پر کرنیں بچھی سی جا رہی ہیں۔ میرے چتر کار
کیا میں تمہاری تصویر ہوں؟ چاندنی کے رس سے بادلوں کی پیالیاں بھر کر

قوس وقزح کو برش بنا کر تم نے میرے دل کو پیار سے رنگ دیا - کیا ذقت کے چھوٹے چھوٹے آنسوؤں سے یہ رنگ پھیکے پڑ جائیں گے ؟

اور کہیں کہیں انہوں نے اپنے پیار کے رنگوں میں اپنے کو کسی دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے -

میں نیر بھری دُکھ کی بدلی
وستترت نبھ کا کوئی کونا
میرا نہ کبھی اپنا ہونا
پریچے اِتنا، اِتہاس یہی
امڑی کل تھی بہ آج چلی

ترجمہ - میں جل کی بھری ہوئی ایک بدلی ہوں - آسمان کی وسعتوں میں ایک ادنیٰ سا ٹکڑا - میں کبھی بھی اپنی نہ ہو سکی - اور میری زندگی اور اس کی کہانی بس اتنی ہے کہ کل اٹھی تھی اور آج بہہ چلی ہوں -

حقیقت کو نمایاں کر کے دل میں ایک ٹیس سی پیدا کر دینے والے یہ چند مصرعے زندگی کی اصلیت کو کس کھلے رنگ میں پیش کر رہے ہیں اور کتنے ضبط کے ساتھ -

مہادیوی کا تخیل بلند ہے اور دل کے حقیقی جذبوں سے ناتا نہیں توڑتا - یعنی سنتیہ، کلپنا اور بھاؤ (حقیقت، تخیل اور جذبہ) تین الگ الگ دھارے ایک ہو کر بہتے ہیں - ایک کو دوسرے سے الگ کرنا آسان نہیں - اور اس تند دھارے نے ان کی کویتا میں صرف سوز و گداز ہی نہیں پران بھی ڈال دئے ہیں - اور یہ سب کچھ لے کر انہوں نے اپنے آپ کو پریتم کے چرنوں میں نچھاور کر دیا ہے - رات سے کہتی ہیں لیکن خود ہی رات بنی جاتی ہیں -

او رِ بھاوری
چاندنی کا رنگ راگ، مانگ میں سجا پراگ
رشمی تار گونتھ گونتھ چکر بھار ری
انل گھوم گھوم دیش
لایا پریہ کا سندیش
موتیوں کے سمن کوش
دہل وار ری ....

ترجمہ - او رات - تیرا جسم چاندنی سے سجا ہے - تیری مانگ زر گل سے مزین ہے - اپنے بالوں میں چاندنی کے تار پرو لئے ہیں - صبا گھوم گھوم تیرے محبوب کا سندیسہ لائی ہے - روی اس پر سے موتیوں کے خزانے وار دے -

اپنے پریتم کے لئے بیقرار مہادیوی کی روح ازل سے پیار کی بھوکی ہے - یہ پیار اور اس کی پیاس امِٹ ہے - پیاسا ہوتے ہوئے بھی دل آنکھوں کی راہ سمندر کے سمندر بہا دیتا ہے - دل میں سمائے ہوئے پیارے محبوب کے ہجر میں زندگی لاکھوں دورِ خزاں اپنے میں بسائے بیٹھی ہے پرانوں میں پت جھڑ اور آنکھوں میں برسات بسائے مہادیوی کی روح اپنے دور بسنے والے پریتم کی تلاش میں ایسے راستوں پر بھٹکتی ہے جو کبھی دیکھے نہیں جا سکتے - یاد بھی جہاں سہارا نہیں دیتی - لیجئے ایسی ہی جستجو کا ایک منظر ملاحظہ فرمایئے -

پران رما پت جھار سجنی
اور نین بسی برسات ری
وہ پریہ دور پنتھ ان دیکھا
شواس مٹاتے سمرتی ریکھا
پنتھ بن انت - پتھک چھایا ئے
ساتھ لہلوتی رات ری
سنکیتوں میں پلّو بولے - مرد کلیوں نے آنسو تولے
اس میں جس میں ڈوب گیا
ہنستا آیا جو پرات ری ..... -

ترجمہ - پرانوں میں پت جھڑ رم گیا ہے - اور نینوں میں برسات بس گئی ہے - پیارا دُور ہے - راستہ دیکھا بھالا نہیں - ہر سانس یاد کی لکیر دل کو مٹائے جاتی ہے - اس راستے کی کوئی منزل نہیں - مسافر خود سایہ سا بن رہا ہے اور اس پر سائیں سائیں کرتی ہوئی رات -

درختوں کے پتے اشاروں سے باتیں کر رہے ہیں - کلیاں آنسو گرا رہی ہیں - مسکراتی ہوئی صبح بھی انگشت بدنداں ہو کر رہ گئی -

اپنے دلی جذبوں کو پیش کرنے کے لئے پھول، پتی، بادل، بارش، شبنم، آسمان، قوس قزح الغرض کائنات کے انفرادی اور مجموعی حسن سے

مہادیوی نے بہت کام لیا ہے - ایسا دکھائی دیتا ہے قدرت کی ہر چیز خود اُن کے گیتوں میں کھِنچ کر چلی آئی ہے - جیسے وہ ان کے گیت کی کڑی بننے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہو -

میرے ہنستے ادھر نین
جگ کی آنسو لڑیاں دیکھو
میرے گیلے پلک چھوؤ مت
مرجھائی کلیاں دیکھو

اپنے غم سے ساری کائنات کو رنگ دینے کی یہ ہوس یا پھر دنیا کے دکھ میں اپنے دکھ کو مٹا دینے کی خواہش -

ہنس دیتا نو اندر دھنش کی سمت میں گھن مٹتا مٹتا
رنگ جاتا ہے ویشو راگ سے نشپھل دن ڈھلتا ڈھلتا
کر جاتا سنسار سُرَبھی سے ایک سمن جھرتا جھرتا
بھر جاتا آلوک تمر میں لگھو دیپک بجھتا بجھتا
مٹنے والوں کی ہے نشٹھر
بے سُدھ رنگ رلیاں دیکھو
مٹنے والے مٹتے مٹتے بھی کیا رنگ دکھا جاتے ہیں

ترجمہ - بادل مٹتا مٹتا اپنی مسکراہٹ کو قوس قزح میں چھوڑ جاتا ہے دن ڈھلتا ڈھلتا اپنی لالی سے جہان کو رنگ جاتا ہے - ایک پھول مرجھاتا ہوا بھی دنیا والوں کو معطّر کر جاتا ہے - چھوٹا سا دیا بجھتے بجھتے بھی اندھیرے میں روشنی بھر جاتا ہے - مٹنے والوں کی یہ رنگ رلیاں اے میرے سنگ دل محبوب - تم بھی دیکھتے جاؤ .....

اپنے پریتم کے راستے کو روشن کرنے کے لئے دیپک سے کہتی ہیں -

مدھر مدھر میرے دیپک جل
پریتم کا پتھ آلوکت کر

میرے دیپک تو دھیرے دھیرے جل اور میرے محبوب کے راستے کو روشن کرتا جا -

اسی طرح مہادیوی نے اپنے دیپ گیتوں سے یا گیت کے دیپوں سے اپنے پریتم کے راستے کو ہی نہیں بلکہ ہندی ادب کی شاہراہ کو بھی ایک انوکھے نور سے روشن کر دیا ہے - ان کے کچھ گیتوں میں رومان اور تصوف کا رنگ وشو کوی رویندر ناتھ ٹھاکر کے گیتوں سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے لیکن مہادیوی کا اپنا رنگ نمایاں ہے -

ہندی ادب میں مہادیوی کا یہ دان امِٹ ہے - امر ہے - پڑھتے جائیے - سوچتے جائیے - سر دھنتے رہیے - کہیں بھی آپ کو پھیکا پن دکھائی نہیں دے گا - لیکن مٹھاس اتنی زیادہ بھی نہیں کہ آپ ایک دو گیت پڑھ کر بھر جائیں - مٹھاس کے ساتھ سلونا پن بھی پایا جاتا ہے -

مہادیوی کے گیتوں میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ تصوف کے ساتھ ساتھ ان میں ترنّم اور موسیقی بھی جلوہ فرما ہے - الفاظ مشکل ہوتے ہوئے بھی ان میں ایک خاص بات ہے جو گفتگو نہیں - ایسے ترشے ہوئے لفظ جو سنگیت میں بھی ٹھیک بیٹھتے ہیں - چپنے تلے اور ان کی چمک دمک بھی ویسی ہی رہتی ہے - ہندی کے دوسرے شعرا میں یہ بات کم پائی جاتی ہے -

مہادیوی کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں - الگ الگ بھی اور ایک بڑی کتاب 'مایا' میں بھی - نیہار' رشمی' نیرجا - ساندھ گیت وغیرہ - اور اب بھی مہادیوی جی برابر لکھتی رہتی ہیں - نظم کے علاوہ نثر میں بھی انہوں نے خوب لکھا ہے لیکن نثر پر بھی نظم کا انداز غالب ہے - مہادیوی کی سی شخصیت پر ہند کے ادب کو جتنا بھی ناز ہو کم ہے -

ہنسراج رہبر

ممتا

روپا کی آنکھ کھل گئی اور وہ چارپائی پر اٹھ بیٹھی - اس کا دل مسرت سے بھرا ہوا تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی - ابھی ابھی وہ پوتے کو کھلا رہی تھی کہ بہو آگئی - اس نے بچے کو لینا چاہا - لیکن وہ جانے کو تیار نہیں ہوا :

"آ آ آ سیانا بیٹا ! چیزی دوں گی" ماں نے لالچ دیا -

"نا - میں نہیں بنتا تمہارا بیٹا -"

"اور کس کے بیٹے ہو ؟"

"میں دادی کا بیٹا ہوں" اس نے دادی کے گلے میں باہیں ڈال دیں - دادی نے پیار سے اس کا منہ چوم لیا -

یہی حسین منظر آنکھوں میں لئے وہ اٹھ بیٹھی تھی - اس پر کتنی ہی دیر خود فراموشی کا عالم طاری رہا - وہ خواب کے تاثر میں ڈوبی جانے کیا کچھ سوچتی رہی - اسے اپنے گلے میں اب بھی ننھے ننھے بازوؤں کا لمس محسوس ہو رہا تھا - کتنا پیارا تھا یہ لمس ! اس کی روح میں جنت آباد ہو گئی - پوتے کو گود میں کھلانے اور دادی کہلانے کی حسرت میں تو وہ اب تک جی رہی تھی - سر کے بال روئی کے گالوں کی طرح سفید ہو گئے تھے اور ہاتھوں میں رعشہ آگیا تھا - لیکن وہ جی رہی تھی - زندگی کم ہو رہی تھی - تمنا بڑھ رہی تھی -

روپا جب بیوہ ہوئی تو اس کے اکلوتے بیٹے للو کی عمر صرف دو سال تھی - اس کے تین بچے ایک چھ ماہ کا اور دو جنم لینے سے پہلے ہی مکمل ہوئے بغیر ضائع ہو چکے تھے - بڑی حسرتوں کے بعد للو کو پایا تھا - اس نے ابھی اپنی ننھی ٹانگوں پر چلنا ہی سیکھا تھا تو تلی زبان سے "ماں، ماں" کہنا ہی شروع کیا تھا کہ باپ مر گیا - بیٹے کو لاڈ لڈانے کا ارمان دل ہی میں لے کر چلا گیا -

بیٹے کی پرورش کا سارا بار روپا پر آپڑا - گھر میں اثاثہ تو زیادہ نہیں تھا - لیکن تھوڑی سی زمین تھی - اس کی بٹائی آ جاتی تھی - روٹی کا گزارہ چل رہا تھا - روپا ابھی جوان تھی - لیکن کیا کرتی ! بیٹے کا منہ دیکھ کر خاوند کی موت کا غم بھول جاتی تھی - وہی ایک اس کی حسرتوں اور ارمانوں کا مرکز تھا - وہ کسی چیز کے لئے مچلتا فوراً منگوا کر دیتی - وہ اس کے لئے چڑیا کا دودھ تک مہیا کرنے کو تیار رہتی - اس کے ساتھ جو دوسرے بچے کھیلنے آتے تھے روپا انہیں بھی پیار کرتی تھی - انہیں بھی بیٹے کی طرح کھلونے اور چیزیں دیتی تھی تاکہ وہ ہمیشہ اسی طرح آتے اور کھیلتے اور للو کا دل بہلاتے رہیں -

اور پھر جب ذرا بڑا ہوا - گلی میں جا کر محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا - کھیل میں کئی بار جھگڑا ہو جاتا - للو ماں کے پاس فریاد لے کر آتا "ماں مجھے دیو مارتا ہے" "ماں چندی میری گولیاں نہیں دیتا - تو وہ جھٹ بیٹے کی حمایت کو دوڑی جاتی - گھر والوں سے کہتی "تم اپنے بچوں کو کیوں نہیں سمجھاتے - وہ میرے للو کو دق کرتے ہیں" - پڑوسنیں جانتی تھیں کہ روپا دل کی بری نہیں - اس شکایت میں وہ خود نہیں - اس کے دل کا پیار بول رہا ہے - وہ ہنس کر جواب دیتیں "بچوں کو کوئی کیا سمجھائے - بچے جو ہوئے -"

للو کو بھی ماں سے اتنی ہی محبت تھی - اگر کبھی دو چار گھنٹے گھر سے باہر رہتا - ساتھیوں سے مل کر کھیتوں وغیرہ میں گھومنے چلا جاتا - تو لوٹ کر یوں ماں کی گود میں جا بیٹھتا جیسے اور کہیں بھی اسے تسکین نہ ملی ہو -

دس گیارہ سال کا ہو کر بھی وہ دو تین سال کا معصوم ننھا بنا ہوا تھا - اور ماں کی گود میں بیٹھ کر دودھ پیتے بچوں کی طرح مسکرایا کرتا تھا اور ماں اسے دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی -

رفتہ رفتہ ماں کے لاڈلے للو نے لڑکپن کو پار کر کے جوانی کی حدود میں قدم رکھا - اس کی بھیگتی مسیں دیکھ کر ماں کے دل میں ایک آرزو نے جنم لیا - اسے اپنے خواب کی تعبیر نظر آئی - میرا بیٹا دولہا بنے گا - دولھن بیاہ کر گھر لائے گا -

اس وقت کا احساس کرتے ہوئے روپا نے ایک دن للو سے کہا - بیٹا للو ! اب تمہارا بیاہ کر دیں ؟" بیاہ" ! للو نے معصومیت سے دوہرایا - "ہاں بیاہ" - ماں نے پیار سے بیٹے کا منہ چوم لیا - اور

اس کی ٹھوڑی ہلاتے ہوئے کہا۔ اب میرا للّو بیاہ کرے گا۔ دلہن لائے گا۔

" ناماں۔ میں بیاہ نہیں کروں گا"۔ للّو روٹھ گیا۔" میرا چاندسا بیٹا' روٹھا نہیں کرتے"۔ ماں نے منانا شروع کیا۔" اچھا نہ سہی" ماں نے اس کا سر پیار کے ساتھ گھٹنوں سے اٹھایا۔" تو آپ ہی بتا پھر کب بیاہ کرے گا۔

"جب تم مر جاؤگی" للّو ہنس دیا

مرنے کی بات سُن کر ماں کے دل پہ گھونسا سا لگا لیکن بیٹے کی ہنسی نے چوٹ ابھرنے نہیں دی۔ وہ پھر بولی۔" تو کیا دلھن کو سُونے گھر میں لاؤگے میرے سامنے آئے گی۔ تو ساس کا منہ تو دیکھے گی"۔

روپا کو مرحوم خاوند کی یاد آئی اور اس پہ رقت طاری ہو گئی۔

" دیکھنے سے کیا ہوتا ہے"؟ للّو نے معصوم انداز میں پوچھا" ہوتا کیا۔ کہہ دیا کرے گی۔ میری ساس بڑی اچھی تھی"۔ اور یہ نہ کہے گی کہ میری ماں بہت بُری تھی"۔

" یہ کیوں کہنے لگی"۔ ماں نے تردید کی۔" آدمی برا ہو' تبھی دوسرا بُرا کہتا ہے۔ پھر روپا نے بیٹے کو گود میں کھینچ کر اور دل کا تمام پیار آنکھوں میں بھر کر کہا۔ تو ہی بتا۔ کیا مَیں بری ہوں"؟

للّو نے ماں کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کا دل مسرت سے بھر گیا۔ لیکن کہنے کو کہا۔" ہاں میں تو کہتا ہوں بُری۔ لاکھ بُری۔ چل جھوٹا کہیں کا"۔ ماں نے اس کا مُنہ چُوم لیا۔

روپا جتنی جلدی بیٹے کا بیاہ کرنا چاہتی تھی اتنی جلدی نہ کر سکی۔ نَنَد' نہ دیور اور نہ جیٹھ جیٹھانیاں۔ سونے گھر میں لڑکی کون دے۔ اکیلی بڑھیا کا کیا ٹھکانا۔ جانے کب آنکھیں بند کرلے۔ الھڑ لڑکی رو رو کر ہلکان ہو جائے گی۔

گاؤں میں عام طور پر سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں لڑکوں کی شادیاں ہو جاتی ہیں لیکن للّو بیس سال کا ہو کر بھی کنوارہ ہی رہا۔ روپا کو اب بیوگی کا احساس ستانے لگا۔ اگر اس کا خاوند زندہ ہوتا تو للّو اب تک کبھی کنوارہ نہ رہتا۔ جب دو سال اس طرح اور گزر گئے تو روپا کے دکھ کی انتہا نہ رہی۔ دو ہی سال میں اس کے سیاہ بال سفید ہو گئے۔ اس کے دل کا حوصلہ جو اس کی جسمانی قوت کا راز تھا۔ جاتا رہا۔ وہ ہر ایک کی خوشامد کرتی اور اپنے رشتے داروں کو بیٹے کے بیاہ کی سفارش کرنے کو کہتی۔

آخر اس کے جیٹھ نے کہہ سُن کر اپنے سالے کی لڑکی کا رشتہ کرا دیا۔ للّو کا بیاہ ہو گیا۔

ایک سال بیت گیا۔ للّو جو پہلے تھا۔ اب نہیں رہا۔ وہ جو پہلے ماں کے بغیر دم نہیں لیتا تھا۔ اب صرف بیوی کا ہو کر رہ گیا۔ وہ اس سے دو باتیں کرنے کو ترس جاتی۔ سارا دن ڈیوڑھی میں بیٹھی رہتی۔ للّو چپ چاپ پاس سے گزر جاتا۔ ماں کی بات تک نہ پوچھتا۔ روپا کبھی خود کہتی۔

"بیٹا بیٹھ جاؤ"۔

" نہیں ماں مجھے کام ہے"۔ وہ جلدی سے گزر جاتا۔

ماں بیٹے کی اس بے اعتنائی پر کڑھتی اور سوچنے لگتی کہ کیا بیاہ ہو جانے کے بعد بیٹے ماں کی خدمات کو اس طرح بھول جاتے ہیں؟ لیکن للّو تو ایسا نہیں تھا۔ بیوی ضرور اس کے کان بھرتی ہوگی۔ اسے ماں کے خلاف سکھاتی پڑھاتی ہوگی۔

ایک شام للّو اور اس کی بہو چھت پر بیٹھے تھے۔ خوب گھُل مِل کر باتیں ہو رہی تھیں۔ ماں بھی دبے پاؤں سیڑھی چڑھ گئی۔ اور ان کے قریب جا پہنچی۔ للّو چارپائی پہ ادھر لیٹا پڑا تھا۔ وہ بیوی کے زانو پر سر رکھے تھا۔ اس کی بیوی دُلاری اسے اپنی کسی سہیلی کی بات سُنا رہی اور بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی۔ للّو نے ماں کو دیکھا تو جھٹ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

" کیا کرنے آئی ہو ماں"؟ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ نیچے جی نہیں لگتا تھا۔ سوچا کہ چلوں میں بھی تمہاری باتیں سُنوں"۔

" تم کیا سنوگی ہماری باتیں۔ جاؤ ماں نیچے ہی بیٹھو۔

اور ماں جب الٹے پاؤں لوٹی تو اس کا دل رو رہا تھا۔ اور وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھی۔ للّو کو ماں کا یوں یکایک آنا بُرا لگا۔ اور اس بڑبڑانے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ چلّا کر کرخت آواز میں بولا:۔

" سچ ہے بڑھاپے میں عقل نہیں رہتی"۔

" ہے ہے تم کتنے بے رحم ہو"۔ بہو نے کہا۔ بیٹھ جانے دیتے بے چاری کو موہ سے آئی تھی۔

بیٹھنے میں تو کچھ ہرج نہیں۔ پر کیسے چپ چاپ آئی تھی۔ شرم نہیں

آئے گی اسے ہماری باتیں سننے"۔ اس کے سلنے کی باتیں بھی تو ہو سکتی تھیں۔

اُدھر رودپا غصّے کے مارے اُبل رہی تھی۔ اسے ہرگز اس سلوک کی توقع نہیں تھی۔ للو پہلے بھی اسے بسا اوقات جھڑک دیتا تھا لیکن وہ ماں بیٹے کی آپس کی بات تھی۔ اس سے لڑائی جھگڑا یا بے عزّتی مقصود نہیں تھی۔ آج تو اس نے ماں کی بے عزّتی کی تھی اور بہو کے سامنے۔ للو کے یہ الفاظ "بڑھاپے میں عقل ماری جاتی ہے"۔ اسے رہ رہ کر کچوکے دے رہے تھے۔ بنا عقل کے پال پوس کر اتنا بڑا کر دیا اور بڑا کیا ہے یہ بے عزّتی برداشت کرنے کے لئے۔

بہو جب نیچے آئی تو ہمدردی سے کہا:۔

"ماں جی بُرا نہ ماننا۔ ان کے من میں کچھ نہیں سبھاؤ ذرا تلخ ہے"۔

"اب تو آئی ہے سبھاؤ بتلانے والی"! رودپا نے تنک کر کہا میں کیا نہیں جانتی اپنے بیٹے کو۔ یہ سب تیرے کرتوت ہیں"۔ "ماں جی! بنا بات کیوں دوش لگاتی ہو۔ میں انہیں کچھ سکھاتی تھوڑا ہوں"۔ "سکھایا نہ ہوتا تو للو میری بے عزّتی کرتا۔ سارا محلہ جانتا ہے وہ مجھ سے کتنا پیار کرتا تھا۔ ماں بیٹے میں ایک دن بھی تکرار نہیں ہوئی"۔

"نہیں ہوئی ہوگی۔ اچھی بات ہے۔ میں تو کہتی ہوں اب بھی نہ ہو۔ ماں بیٹے کی بات میں میرا کوئی دخل نہیں"۔

"دخل کیوں نہیں۔ تو لڑاتی ہے۔ تو سکھاتی ہے۔ تو چاہتی ہے کہ ماں کی بات نہ سنے اور بس تیرا بنا رہے۔"

بہو نے دیکھا کہ بڑھیا اپنے آپ میں نہیں اسے بیٹے کی بات سے صدمہ پہنچا ہے۔ آدمی جھلایا ہوا ہو تو اس کو بھلی بات بھی بُری معلوم ہوتی ہے۔ اس سے کچھ کہنا سننا بے کار ہے۔ یہ سوچ کر بہو چپ چاپ اندر چلی گئی۔

لیکن یہ ایک دن کی بات نہیں بیٹے کا بدلا ہوا رویہ دیکھ کر رودپا بہو سے بگڑتی اور معمولی معمولی بات پر اس سے اُلجھ پڑتی۔ بہو کبھی ہنس کر اور کبھی کڑھ کر اس کے کھوٹے بول چپ چاپ سہہ لیتی۔ لیکن ایک دن بات زیادہ بڑھ گئی۔ رودپا کی قمیص کندھے پر سے پھٹ گئی تھی۔ بہو نے ٹانکا لگا کر دیا۔ تو اسے پسند نہ آیا اور وہ برس پڑی۔

"ماں رانڈ نے تمہیں کچھ سکھایا بھی ہے یا نہیں؟"

بہو اور کچھ سہہ لیتی لیکن اپنے ماں باپ کو گالی نہ سن سکتی تھی بولی:۔

"مجھے جو کچھ کہنا ہے کہہ لو۔ میری ماں کو کچھ کہا تو زبان کھینچ لوں گی"۔

"آج تک تو میری زبان کھینچی نہیں۔ تو کہاں سے آ گئی میری زبان کھینچنے والی"

رودپا کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ کوسنوں کی بھرمار کرتی ہوئی بہو پر جھپٹ پڑی۔ بہو سبزی چڑھا رہی تھی۔ اس نے کدو چھیل کر چھلکے نزدیک ہی گرا دئے اور ان پر کچھ پانی پڑنے سے کیچڑ ہو گئی تھی۔ بڑھیا کا پاؤں پھسل گیا۔ گری تو سر دہلیز سے جا ٹکرایا۔ اسے سخت چوٹ آئی اور پیشانی سے خون نکل آیا۔

بہو اس کی امداد کے لئے لپکی تو رودپا نے اسے یوں دھتکار دیا جیسے اس کے چھونے سے چھوت لگ جائیگا۔ اس کا کہنا تھا کہ بہو نے جان بوجھ کر اسے گرانے کے لئے چھلکے وہاں پھینکے تھے۔

رودپا سارا دن بہو کو اور اس کے گھر والوں کو کوستی رہی اور روٹی نہیں کھائی۔ منہ سر لپیٹ کر چارپائی پر جا لیٹی۔ اس کا خیال تھا کہ للو گھر آئے گا۔ بہو کو اس کی زیادتی پر بُرا بھلا کہے گا۔ ماں کی منت سماجت کرے گا۔ تب وہ اٹھ کر کھانا کھائے گی۔

لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ للو اس روز کھیت میں بٹائی کا اناج لینے گیا تھا۔ رات گئے گھر لوٹا۔ اس نے ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ آتے ہی بولا۔

"ماں تم نے روٹی کیوں نہیں کھائی"؟

"مجھے بھوک نہیں"۔ رودپا نے جواب دیا۔

"بھوک کیوں نہیں۔ میں سب جانتا ہوں۔ پہلے لڑتی ہو۔ پھر ٹسوے بہاتی ہو"۔

رودپا نے دیکھا کہ بیٹا منانے کی جگہ ماں سے لڑنے پر آمادہ ہے۔ گرج کر بولی۔

"میں ٹسوے بہاتی ہوں۔ تجھے شرم نہیں آتی۔ وہ کل کی چھوکری میری زبان کھینچتی ہے اور تو اس کی حمایت کرتا ہے۔"

"اچھا۔ میں نہ اس کی حمایت کروں نہ تمہاری۔ جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔ تم کل سے دوسرے گھر میں رہا کرنا"۔

ماں پر بجلی سی گر پڑی۔ وہ بیٹے سے ایسی بات سن رہی تھی جس کی اسے ہرگز توقع نہیں تھی۔

بیٹا اگر یہاں تک جا سکتا ہے تو اس سے ہمدردی اور دلجوئی کی

امید بے کار تھی۔ اس پر خفا ہونے سے بھی کیا فائدہ؟ روپا نے

"کیا کہا۔ میں دوسرے گھر میں رہا کروں۔ لوگ باگ کیا کہیں گے۔ بوڑھی ماں کو گھر سے نکال دیا۔ تمہاری ناک نہ کٹ جائے گی۔"

"لوگ کچھ بھی کہیں۔ مجھ سے یہ ہر روز کا جھگڑا نہیں دیکھا جاتا۔"

"بیٹا تم تو دنیا سے نرالی بات کر رہے ہو۔ بستے گھروں میں لڑائی جھگڑے بھی ہوتے ہیں اور من منائی بھی۔ جہاں دو برتن ہوں گے وہ کھڑکیں گے ضرور"

ماں کی یہ اپیل بھی بے اثر ثابت ہوئی۔ تلو جو فیصلہ کر چکا تھا اس پر اٹل رہا۔ بڑھیا دوسرے گھر میں الگ رہنے لگی۔ گھر دوسرے محلے میں واقع تھا۔ دو ٹوٹے پھوٹے کمرے تھے۔ آنگن میں بیری کا پیڑ تھا اس لئے وہ بیری والا گھر کہلاتا تھا۔ جب روپا کا خاوند زندہ تھا تو اس میں مویشی باندھے جاتے تھے۔ اب مویشی رکھنے کی توفیق نہیں تھی اس لئے مدت سے سونا پڑا تھا۔ روپا کو کیا معلوم تھا کہ کبھی خود اسے اس گھر میں رہنا پڑے گا۔

وہ چار ماہ سے اس گھر میں تنہا رہتی تھی۔ بہو دونو وقت کا کھانا بھیج دیتی تھی۔ بارہا خود بھی ملنے آجاتی تھی۔ وہ روپا سے کئی مرتبہ لوٹ چلنے کو بھی کہہ چکی تھی۔ لیکن روپا بہو کے کہنے سے جانے کو تیار نہیں تھی۔ البتہ تلو کہتا تو اور بات تھی۔ لیکن تلو تو اس دن کے بعد ماں سے ملنے بھی نہیں آیا۔ ایسا بے مروت بیٹا ماں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ روپا کے دل کا دکھ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔

کچھ دنوں سے یہ دکھ اتنا بڑھ گیا تھا کہ روپا سے سہا نہیں جاتا تھا آج کل میں بہو کو بچہ ہونے والا تھا۔ اس وقت وہ زچہ کے پاس رہنا چاہتی تھی۔ بہو سے اس کا موہ بڑھ گیا تھا۔ وہ دن رات پوتا ہونے کے خواب دیکھتی تھی۔ اور اسے گود میں کھلانے کی بات سوچا کرتی تھی۔ آج اس نے پوتے کو خواب میں کھلایا تھا اسے گلے میں باہیں ڈال کر "میں دادی کا پوتا ہوں" کہتے سنا تھا۔ اس کی روح تازگی اور شگفتگی سے بھر گئی تھی اس پر دیر تک خود رفتگی کا عالم طاری رہا۔

رات ابھی کافی تھی۔ خواب کا اثر دیرپا تو ہو نہیں سکتا۔ حقیقت خواب سے زبردست ہے اس سے فرار کی صورت نہیں۔ آخر روپا نے آہ سرد بھری اور اپنے آپ سے کہا۔ کاش! میں اس وقت بہو کے پاس ہوتی۔

اس نے حسرت بھری نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ مکان کے سونے پن سے اس کا دل دہل گیا۔

وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ رہی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات اٹھ رہے تھے۔ کبھی تلو پر کڑھتی تھی اور کبھی اپنے آپ پر کڑھتی تھی۔ اور کبھی مرحوم خاوند کی یاد آتی تھی۔ آہ! وہ کتنی بدقسمت ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتے۔ تلو اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر الگ نہ پھینک دیتا اس کا یہ رویہ کبھی نہ ہوتا۔ وہ اس سونے گھر میں اکیلی نہ رہتی۔ بیوگی کا دکھ جو وہ پہلے بیٹے کا ستہ دیکھ کر بھول جاتی تھی۔ اب ایک ناسور بن گیا۔ اسے اب بہو سے ذرا بھی شکایت نہ تھی سارا قصور تلو کا تھا۔ تلو کی بے مہری اور اپنی بے بسی پر اس کا دل بھر آیا اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

لیکن اس وقت جبکہ بہو کے بچہ ہونے والا ہے۔ اس وقت جبکہ اس نے اتنا اچھا خواب دیکھا ہے۔ جی کو میلا کرنا مناسب نہیں ہے۔ روپا نے آنسو پونچھ ڈالے غم کی اس شدت میں بھی ایک سندر سپنا اس کی روح کو گدگدا رہا تھا۔

ایک نگاہ باہر ڈالی۔ پو پھٹ رہی تھی۔ صبح کی سپیدی پھیل رہی تھی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ صحن میں ٹپ ٹپ ہونے لگی۔ پیڑ کی ٹہنیاں ہل رہی تھیں۔ اور بیر۔ پکے ہوئے بیر۔ ٹہنیوں سے ٹوٹ کر زمین پر گر رہے تھے۔

وہ چارپائی سے اٹھی اور آہستہ آہستہ باہر نکلی۔ آنگن کی دیوار چھوٹی تھی۔ محلے کے شریر بچے صبح سویرے ہی دیوار پھاند کر اندر آجاتے تھے اور بیر چن لیتے تھے۔ وہ اب بھی بیری کے نیچے بیر چن رہے تھے۔ جب نیچے کے بیر ختم ہو گئے تو وہ جھکی ہوئی ٹہنیاں پکڑ کر ہلانے لگے۔ بڑھیا اکثر انہیں دتکار بھی دیتی تھی لیکن اب پیار سے بولی۔ "بیٹا کچے پکے تو ڑو۔ کچے رہنے دو۔ کل پک جائیں گے"۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی ایک بچے نے دوڑ کر کواڑ کھول دئے۔ نوری دائی اندر داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ مسرت سے کھلا ہوا تھا۔ بولی:۔

"روپا مائی۔ بدھائی ہو بدھائی!!"

"بڈھ سہاگن ہو نوری۔ سنا کیا خبر لائی؟"

"پوتا ہوا ہے۔ لا مٹھائی کھلا"۔

"پوتا"! روپا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہاں پوتا۔ گول گول چہرہ، چپٹی ناک۔ بالکل تجھ پر پڑا ہے۔

"اچھا۔ حیرت اور مسرت کے مارے الفاظ نہیں نکلتے تھے "چل دکھاؤں"۔

روپا نوری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسی حالت میں چل پڑی۔ پوتے کو دیکھنے کی حسرت آنکھوں میں رقصاں تھی۔ چاہتی تھی کہ پر لگا کر اڑ جائے اس کی کمزور ٹانگوں میں کہاں سے قوت آگئی۔ نوری کو آگے ٹھیل کر کہا۔ "جلدی چل"!

سلطانہ آصف فیضی

عروس النیل

۲۳ راگست کو دریائے نیل کا آہستہ آہستہ چڑھتا ہوا پانی پورے حد تک چڑھ چکا تھا۔ اس میں ہر سال آنے والا پور اس سال بھی پوری بہار پر تھا۔ اور سارا مصر آج اس خوشی میں سرشار اور شادکام ہو کے جشن منانے والا تھا۔ یہ وہ جشن تھا جو چار ہزار برس سے وادیٔ نیل میں منایا جاتا رہا ہے۔ کہتے ہیں دریائے نیل ہی مصر ہے جو چار ہزار میل سے بہتا ہوا چلا آتا ہے اور مصر کے خشک صحرائی دشت کو سرسبز و شاداب کرتا ہوا بحیرۂ روم میں مل جاتا ہے۔ وہ دریائے نیل جس کی لمبائی اور روانی دیکھ کر عرب اس کو بحر نیل کہتے ہیں۔ جس کی روانی ہزاروں برس سے یونہی جاری ہے۔ جو مصر کے حق میں ایسا ہے جیسے سوکھے دھانوں میں پانی یا ایک بچہ کے لئے شیر مادر۔ جس کو قدیم مصر کے فرعون خدائے نیل کہہ کے اس کی پوجا کرتے تھے۔ خدائے نیل کے نام کے مجسمے بنا بنا کے اس کی پرستش کی جاتی تھی۔ اُن کے ہر مندر و بُت خانہ میں اس کے بُت تراش کر رکھے جاتے تھے۔ یا مُوقلم سے اس بُت کو نقش بدیوار بنا کے اپنی عقیدت کا ثبوت دیتے تھے۔ آج کی طرح سے ہزاروں برس پہلے بھی دریائے نیل میں اسی طرح پور آتا تھا۔ حبش کے اونچے اونچے پہاڑوں پر جب برف پگھلنے لگتی تو اس میں پور آ جاتا۔ اس کے کنارے پانی سے لبریز ہو کے چھلکنے لگتے اس کی چھوٹی چھوٹی نہریں پانی سے بھر جاتیں اور جوش و روانی کے ساتھ وہ منوں زرخیز مٹی ساتھ لے کے بہتا ہوا چلا آتا اور مصر کے سوکھے صحرا اور نیم تشنہ کھیتوں کو اس مٹی سے مالامال اور زرخیز کر دیتا۔ اس مٹی سے مصریوں کے کھیتوں میں قدرتی کھت آ جاتا جس میں ان کی ترکاریاں پھل اور اناج اُگنے لگتا۔ بحر نیل کا پاٹ چوڑا اور رنگ ملگجا ہو جاتا۔ اونچی اونچی لہریں اٹھنے لگتیں۔ جب وہ اس حالت پر پہنچ جاتا تھا تو قدیم مصریوں کا دستور تھا کہ اس دن بے حد خوشیاں مناتے تھے اور اپنی عقیدت اور امتنان کے ثبوت میں خدائے نیل کے سامنے اپنی عزیز ترین اور بہت پیاری چیز بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔ اُن کے لئے اس زمانہ میں محبوب ترین اور سب سے قیمتی چیز ایک کنواری خوبصورت نازنین ہوتی تھی اور قدیم مصری خدائے نیل کے حضور میں اسی کی قربانی پیش کرتے تھے کیوں کہ ان کے عقیدے میں خدائے نیل کی مہربانی سے اُن کے اناج کے کوٹھے بھر جاتے تھے ان کی پیداوار میں ترقی ہو جاتی تھی وہ غریبوں کسانوں کا پالنے والا اور ان کی نظروں میں مقدس تھا۔

مشہور ہے کہ قدیم مصریوں میں یہ رسم جاری تھی کہ ہر سال آج کے دن بلادِ مصر کی جو حسین ترین کنواری لڑکی ہوتی اس کو پکڑ لاتے پھر اس کو دلہن کی طرح سجایا جاتا اور لے جا کے خدائے نیل کی بھینٹ اس طرح چڑھا دیتے کہ اس کو اس بحر ذخار میں دھکیل دیا جاتا۔ اس کے بعد ایک جلوس نکلتا جس میں اس کا بوڑھا کاہن آگے آگے چلتا اور اس کے پیچھے لوگوں کے مجمع میں رقص و سرود ہوتا۔ کئی آدمی ہارپ ترنج اور باجے بجاتے ہوئے ساتھ ہوتے۔ یہ لوگ بیل پرندے اور ہرنوں کو نذر کے لئے ساتھ لے لیتے اور اس انداز سے گاتے ہوئے مندر میں داخل ہوتے۔ کہ

اے خدائے نیل تیری حمد و ثنا ہو تو زمین سے نکل کر مصر کی سرزمین کو شاداب کرتا ہے۔ تو ہمارے لئے ایک چھپی ہوئی رحمت ہے۔ کہ ہمارے کھیت تیری وجہ سے سیراب ہوتے ہیں ہمارے جانوروں کی پیاس بجھتی ہے اور ہمارا اناج پیدا ہوتا ہے۔

اس رسم کو بعد میں آنے والے یونانی' رومی اور عیسائی مصریوں نے بھی جاری رکھا تھا۔ مگر آج سے ہزار برس پہلے جب فاطمیہ خلفاء کی یہاں حکومت قائم ہوئی تو اُن کے حکم سے کنواری زندہ لڑکی کی قربانی روک دی گئی اور اس کی جگہ ایک کپڑے کی گڑیا نذرِ بحر نیل کی جانے لگی۔ خلفائے فاطمیہ بذاتِ خود اس جشن میں شرکت کرتے تھے اور اُن کے جلوس میں

میں ہزارہا سوار جوان سونے چاندی سے مزین زرہ بکتر پہنے جلوس کے ساتھ ہوتے تھے۔ اُن کے پیچھے خچروں کی قطار ہوتی تھی جن پر سنہری جھولیں پڑی ہوتی تھیں۔ یہ جلوس قدیم قاہرہ سے اس شان سے نکلتا تھا کہ شہر کے علماء و فضلاء اور امیر و شہزادے سب ہمراہ ہوتے تھے۔ اور خلیفہ سب سے اخیر ایک معمولی سے خچر پر سوار ساتھ ساتھ ہوتا۔ اس کے گرد اس کے خاص سوار رہتے اور خواجہ سرا اس کے سامنے بخور جلاتے ہوئے چلتے تھے۔ اس طرح یہ جلوس قدیم قاہرہ کے کنارے پر پہنچتا جہاں خلیج کا منہ ہے۔ یہاں جلوس کے سوار اپنے نیزے سے اس مٹی کی دیوار کو توڑ دیتے جن سے پانی رکا ہوا تھا اور بحرنیل کا پانی بے تحاشا چاروں طرف کی نہروں میں دوڑنے لگتا تھا۔ اسی جگہ المتوکل باللہ نے ۸۶۱ھ میں ایک نیلومیٹر تعمیر کیا تھا جس سے نیل کے پانی کے پور کو ناپا جاتا تھا۔ جس سے سالانہ پیداوار کا حساب لگا کر آئندہ سال کے لئے ٹیکس مقرر کیا جاتا تھا۔ اب تو خیر ٹیکس لگانے کے وجوہ نئے نئے پیدا ہو چکے ہیں۔

بارھویں اور تیرھویں صدی میں ایوبی سلطان کے دورِ حکومت میں سلطان جلوس کو لے کر اسی نیلومیٹر تک جاتا تھا۔ وہاں نیلومیٹر کے معائنے کے بعد سلطان کی طرف سے ایک شاندار دعوت دی جاتی تھی اور بندوقیں سر کی جاتی تھیں۔ اس طرح سے نیل مبارک کے چڑھتے ہوئے پانی کا خیر مقدم کیا جاتا تھا۔

مگر آج ان سب رسوم کی جدید شکل یہ بن گئی ہے کہ بجرے کے بجائے ایک بڑی سی لانچ اس طرح سجائی گئی ہے گویا اس دن کو دلہن سسرال کو رخصت ہونے والی ہے۔ اوپر شامیانہ جس کے چو طرف سبز حریر کے پردے شامیانہ میں داخل ہونے کی جگہ اوپر قدیم مصری نشان یعنی عقاب کے دو پھیلے ہوئے پر رنگین و سنہری بنے ہوئے ہیں۔ لانچ میں باجہ بج رہا تھا اور چو طرف فوجی سپاہی بندوقوں سے لیس کھڑے تھے۔ مگر امر دلچسپی ختم کر دیا۔ اس لانچ کو کھینچنے کے لئے ایک بڑی سی دوسری لانچ جس کو چھوٹی سی بوٹ کہنا چاہیئے اس سے بندھی کھڑی تھی جس میں ہم بھی سوار تھے اور ہمارے ساتھ بہت سے شائقین کا ہجوم بھرا ہوا تھا جو شاید اجازت کے کارڈ سے داخل ہوئے تھے۔ قاہرہ کے مشہور عالیشان ہوٹل "سیمی راس" کے سامنے سے یہ جلوس اس طرح سے روانہ ہوا کہ آگے آگے ایک پولیس لانچ زور زور سے گولے چھوڑ رہی تھی اس کے پیچھے دوسری پولیس لانچ وردی والے افسروں سے بھری ہوئی ساتھ تھی اور پھر ہماری بوٹ "عروس النیل" کو بحرنیل کی روانی کے ساتھ کھینچے لئے جا رہی تھی۔ بحرنیل کے پانی میں جس میں پور کی وجہ سے لہریں اٹھ رہی تھیں ان دخانی کشتیوں کی وجہ سے لہریں اور بھی اونچی اٹھنے لگیں۔ دریا کے دونوں کناروں پر تماشائی کھڑے تھے اور ہماری بوٹ پر موٹے موٹے مصری فوجی افسر معہ خاندان کے آگے آرام سے کرسیوں پر اس طرح سے بیٹھے تھے جیسے ہوٹل میں بیٹھے ہوں۔ اُن کی موٹی موٹی بی بیاں سر پر رومال باندھے یا کھلے سر کھڑی دریا کا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ بعضوں کی ضعیف مائیں بھی سیاہ لمبا فراک پہنے اور سر پر سیاہ رومال باندھے بیٹھی ہوئی بجائے دریا کے اپنے پوتے پوتی کو دیکھ دیکھ کے خوش ہو رہی تھیں۔ بہت سے مصری مرد اپنی وضع قطع سے متوسط درجے کے آفس کلرک معلوم ہو رہے تھے۔ آج کی تعطیل کا فائدہ اٹھا کر وہ بھی جہاز پر معہ خادمہ و خاندان آ گئے تھے۔ ایک شور برپا تھا۔ پکنک منائی جا رہی تھی۔ "کوکاکولا" جو یہاں کا سب سے عام ڈرنک ہے جہاز پر بھی بک رہا تھا۔ اور لوگ کثرت سے بوتل پر بوتل چڑھا رہے تھے۔ دریا کی ہوا دھوپ کی وجہ سے گرم ہو رہی تھی مگر اس گرمی کے باوجود لوگ کنارے پر کھڑے تالیاں بجا رہے اور رومال ہلا رہے تھے۔ اور اس بجرے کو ہر ایک "عروسہ عروسہ" کہہ کے دکھلا رہا تھا جس میں اب کوئی عروسہ موجود نہ تھی۔ ایک گھنٹے تک یہ برات اسی شان سے آہستہ آہستہ بحرنیل پر چلی گئی کہ نیلومیٹر نظر آ گیا۔ جس کی شکل اور مینارہ دور سے کنیسہ کی طرح لگتا ہے۔ جس کے اندر ایک غار کے ذریعے سے دریا ایک طرف سے گھس کر دوسری طرف سے باہر بہہ جاتا ہے۔ نیلومیٹر کے قریب لوگوں کا ہجوم سب سے زیادہ تھا۔ کالا کالا ملابہ پہنے ہوئے عورتیں وہاں بیٹھی ہوئی ایک اونچی آواز سے کلیلی کلیلی کی آواز نکال رہی تھیں جیسے ایرانیوں میں شادی کے وقت عورتیں کرتی ہیں۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ بہت سے تیراک لنگوٹیاں باندھے ایک کشتی کے بادبان کی لکڑی پر چڑھے بیٹھے تھے۔ برات خلیج کے منہ تک پہنچ چکی تھی جہاں بحرنیل کا پانی دو شاخوں میں کٹ جاتا ہے اور اس کے بہاؤ کی رفتار زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ یہاں پانی بہت اونچا ہو چکا تھا۔ تاریخ کے ورق الٹئے تو شاید اسی جگہ آ کے اس بحر کے شوریدہ بھنور میں قدیم فراعین کے زمانے میں ایک کانپتی لرزتی ہوئی نوجوان کنواری حسینہ "عروسہ" کو دریا کے بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا۔ میرے بازو میں بیٹھی ہوئی ایک موٹی سی مصرن نے میرا ہاتھ دبا کے کہا "یہاں

لئے "عزوسہ" کو کہتے تھے کہ جا تجھے خدائے نیل اپنے محل میں لے جانے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ جن کے زرنگار محل میں تو ہمیشہ آرام و آسائش کے جھولے جھولیگی۔ جنت کا لالچ یہاں بھی موجود تھا۔ عربوں کے زمانے میں ایک لکڑی اور کپڑوں کی گڑیا اس بھنور میں ڈال دی جاتی تھی مگر آج باوجود نظریں جمانے کے بھی کوئی چیز بحر کی نذر نہ کی گئی۔ اور لانچ وہاں پہنچ کے پلٹ گئی۔ اس کے پردے ہوا میں ہلتے رہے اس کے شامیانے کا نیلا عقاب دھوپ میں چمکتا رہا۔ اس پر سے توپیں چھوٹتی رہیں۔ تالیاں بجیں شور ہوا اور "عزوسہ" نے واپسی کا رخ شروع کر دیا میں نے دل میں کہا "کاش خدائے نیل کے نذرانے کے لئے ایک پھولوں کی ٹوکری یا کچھ شیرینی ہی دریا میں بہاتے جاتے"۔

میں نے یہ بھی تعجب کی نظروں سے دیکھا کہ گو نام لینے کے لئے یہ "جشن نیل" سرکاری تھا مگر صحیح معنوں اس جشن کے منانے والے یہاں کے فلاحین تھے جن کے لئے یہ دن باعث برکت و خوش حالی تھا۔ آج ان کو اطمینان کی نیند آئے گی کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی ان کے کھیتوں میں بحر نیل کی مہربانی سے کھت آکے جمع ہو گا۔ ان کے کھیت سیراب ہوں گے۔ گیہوں اور چاول کی پیداوار ہوگی اور ان کو غلہ ملے گا۔ گو ان کے ٹوٹے ہوئے بوسیدہ مکانوں میں کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر ان کو پیٹ بھرنے کو اناج اور ترکاری تو مل ہی جائے گی۔

گوہاٹی یونیورسٹی میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کا کانووکیشن ایڈریس

گوہاٹی یونیورسٹی میں ہندوستان کے مشہور فلاسفر اور روس میں بھارت کے سفیر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کانووکیشن ایڈریس پڑھتے ہوئے ڈگری یافتہ طالب علموں کو مشورہ دیا کہ وہ انسانیت کے تئیں بے غرض اور بے لوث خدمت کے لئے اپنی پرانی روایات کو برقرار رکھیں۔ ایک یونیورسٹی کی بڑائی اور اونچی پوزیشن اس امر سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے ممبر تکلیف اور مصیبت کے دنوں میں کس طرح بنی نوع انسان کی سیوا کرتے ہیں۔ آپ نے کہا، آسام نے حال ہی میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کیا ہے اور بھارت کا یہ سرحدی صوبہ ہے۔ اس لئے آپ کو خاص ذمے داریوں کا سامنا کرنا ہے۔ آپ کو ہر وقت سچائی کا ساتھ دینا چاہیئے۔ خواہ اس میں آپ کو کتنی ہی مشکل کیوں نہ پیش آئے۔ ہم نے اگست ۱۹۴۷ء میں سیاسی آزادی حاصل کی لیکن یہ صحیح معنوں میں آزادی نہیں ہے۔ بلکہ آزادی کی جانب ایک قدم ہے۔ جذبۂ بیداری پیدا ہونے کے وقت انسان کو ایک خاص قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح کی خوشی کا جذبہ فرانس اور امریکہ کے انقلاب کے وقت وہاں کے عوام کے دلوں میں پیدا ہوا تھا، اور حال میں چین کے انقلابات میں بھی یہی بات دیکھی گئی اسی طرح ہمارے دیش میں بھی بیداری کا جذبہ پھر سے پیدا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اس وقت ہمارے سامنے بڑا مسئلہ انفرادی اور مجلسی دونوں طرح کے خیالات کو صحیح طور پر ایک نظام میں لانے کا ہے، یہ دونوں ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک سی اہمیت رکھتے ہیں جس طرح ایک فرد کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ اپنے مفاد کے لئے سوسائٹی کو استعمال کرے۔ اسی طرح سوسائٹی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی ترقی و بہبود کے لئے شخصی آزادی کو سلب کرے۔ دراصل ہم اصول کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ رجعت پسند مذہب ہمارے مجلسی نظام میں داخل ہوگیا ہے اور ترقی پسند عناصر اکثر اوقات بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اگر ہمیں دنیا میں انسانیت کو بنیادی طور پر ترقی یافتہ بنانا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اُسے اُن غیر انسانی حرکتوں سے بچائیں جو آج کل عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں اور اس طرح ایک غلط جذبے کی روک تھام کریں۔ مجلسی طور پر آجکل دو باتیں کام کر رہی ہیں: ایک سماجی انقلاب اور دوسرا دنیا کی بڑھتی ہوئی وحدانیت۔ سماجی ترقی کے ان دونوں عناصر کو ہمیں استعمال میں لانا ہے ہمیں اُن تحریکوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ جو ان دنوں وقوع پذیر ہو رہی ہیں بلکہ سچی انسانی سپرٹ کے زیر تحت ہمیں نفرت کے جذبے کو ختم کرنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔ اس اہم کام میں یونیورسٹیاں بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ وہ ہمیں نئی دنیا کے لئے دماغ اور نوجوان مہیا کر سکتی ہیں۔ ہمیں صرف مختلف شعبوں کے لئے ماہرین ہی مہیا نہیں کرنے چاہئیں بلکہ ہمیں تو ان نوجوانوں کی ضرورت ہے جو انسانی نظریہ اور سماجی جذبے کو پیش نظر رکھیں۔ اور مجھے خوشی ہے کہ اس یونیورسٹی میں فاضل وائس چانسلر کی زیر نگرانی صحیح نقطۂ نظر کو اپنایا اور برقرار رکھا جا رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ گوہاٹی یونیورسٹی زیادہ سے زیادہ ترقی کرے۔ اور پرارتھنا کرتا ہوں کہ یہ یونیورسٹی ملک و قوم کے لئے مفید ثابت ہو۔

ع۔م

نئی کتابیں اور رسالے

پُرانے خُدا

مصنف کرشن چندر۔ ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی۔ قیمت ڈھائی روپے۔

کتابت، طباعت، کاغذ، جلد، جلد پوش بہتر۔

کرشن چندر کے دس افسانوں کا یہ مجموعہ دوسری بار زیورِ طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ مقدمہ عزیز احمد نے لکھا تھا وہی اس اشاعت میں بھی شامل ہے۔ کتاب [illegible] صفحات پر مشتمل ہے۔ اُردو زبان کے نئے ادب میں کرشن چندر بہت ممتاز ہیں۔ اس ادب کے محرکات سے ان کی ہمدردی انتہا پسندی کی حدوں کو چھو رہی ہے۔ ان افسانوں میں کرشن چندر کی تخلیقی قوتیں خوب اُجاگر ہیں۔ وہ قدامت پسندی کی رجعتوں کے مخالف ہیں۔ طنز کے ذریعے اشاروں میں مطلب کی بات کہہ جاتے ہیں۔ نفسِ مضمون اور بیان کے اظہار میں اُن کی بے تعصبی انہیں دوسرے فن کاروں سے ممتاز بناتی ہے۔

گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں

ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی۔ قیمت تین روپے۔ کتابت۔ طباعت وغیرہ بہتر۔

کتاب کے اصل مصنف مہاتما جی کے پرائیویٹ سیکرٹری شری پیارے لال جی ہیں۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے اسے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ کتاب اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ صوبہ سرحد کا نقشہ بھی شامل ہے۔ چند سطور ابتدا میں تقریب کے عنوان سے ڈاکٹر ذاکر حسین نے رقم فرمائی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"سرحد میں گاندھی جی کی کامیابی کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ وہاں انھیں ستیہ گرہ کی لڑائی میں ایک ایسا سپہ سالار مل گیا جس کی کھری سچائی میں کھوٹ کا نام تک نہ تھا۔ خان عبدالغفار خاں جو سرحدی گاندھی کے نام سے مشہور ہیں، چند گنتی کے آدمیوں میں سے ہیں جنہوں نے عدم تشدد کو وقتی غرض کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے قلب اور روح کے تقاضے سے اختیار کیا تھا۔ اس لئے اُنھوں نے اس کی آب و تاب کو سیاسی مصلحت کا زنگ نہیں لگنے دیا۔"

اس کتاب میں گاندھی جی کے سفرِ سرحد کے حالات دلچسپ پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ دراصل یہ کتاب پٹھانوں کی گاندھی جی اور اُن کے اصول سے عقیدت مندی کی ایک مختصر تاریخ ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے اسے اُردو کا جامہ پہنا کر اُردو ادب میں ایک بہت اچھی کتاب کا اضافہ کیا ہے۔

اسلام کے معاشی نظریے

مصنف ڈاکٹر محمد یوسف الدین ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی استاد مذہب و ثقافت جامعہ عثمانیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مہتمم دفتر الہدیٰ دہفتہ وار مشاہ بجر دگاہ۔ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن۔ قیمت دونوں جلدوں کی مجلد دس روپے آٹھ آنے، غیر مجلد نو روپے۔

دونوں جلدیں بڑی تقطیع کے [illegible] صفحوں پر مشتمل ہیں۔ آخر میں [illegible] صفحوں میں انڈکس یا اشاریہ ہے اور سات صفحوں میں عنوانات کی طولانی فہرست۔

یہ اس کتاب کی دوسری اشاعت ہے۔ فاضل مصنف کی محنت قابلِ داد ہے۔ اسلامی نظامِ معیشت پر یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے اور مصنف کی دس سال کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ عرب کا قدیم معاشی نظام، ایامِ جاہلیت میں طائف مکہ اور مدینہ کی سیاسی، مذہبی معاشرتی اور معاشی حالت۔ اسلام اور دیگر مذاہب کے معاشی اصول کا تقابلی مطالعہ، پیدائشِ دولت، حیوانات، نباتات اور جمادات سے استفادہ، صنعت و حرفت، حمل و نقل، تجارت، تقسیمِ دولت، مسئلہ اراضی، مسئلہ لگان اور معدنی دولت وغیرہ عنوانات کے تحت پہلی جلد میں بڑی شرح و بسط سے اسلامی نظمِ معیشت کی تفاصیل درج ہیں۔ دوسری جلد میں مسئلہ اُجرت، مسئلہ سُود، اُجرت تنظیم یا منافع، حکومت کی آمدنی میں تقسیم دولت کا اصول، مبادلہ دولت اور

ن کے انتظامات، کاغذی زر، صرفِ دولت، مالیات عامہ وغیرہ موضوعات پر نہایت مفید اور دلچسپ واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے۔ اسلام کی رواداری کا ثبوت دیکھنا ہو تو غیر مسلموں سے معاملت صفحہ ۱۴۴، غیر مسلموں کے لئے بیت صفحہ ۲۵۱، مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کو مساوی حقوق صفحہ ۲۵۶، غیر مسلموں کے لئے عطائیں صفحہ ۲۵۹، اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو ملازمتیں۔ ذمی رعایا مذہبی اور قانونی آزادی صفحہ ۲۳۱-۲۳۳، غیر مسلموں کے لاوارث بچے صفحہ ۲۴۷، غیر مسلموں کا سماجی تحفظ صفحہ ۲۵۲، کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر صاحب ذوق کی تشنگی کو مٹائے گا۔ محنت کی عزت اور مزدور کا وقار، معاملات اور سرمایہ دار کی اجارہ داری کے خلاف اسلامی تعلیمات و عمل اور اس سلسلے میں مفصل معلومات اس کتاب میں ملیں گی۔ مقام مسرت ہے کہ اچھی کتابوں کی کم یابی کے دور میں یہ کتاب دوبارہ چھپ گئی ہے۔ اردو کی ہر لائبریری میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔

راسخ

مؤلف حضرت حمید عظیم آبادی۔ ملنے کا پتہ۔ سید احسان الحق نظر فریادی معتمد انجمن نو بہار ادب پٹنہ سٹی۔ بہار

قیمت [illegible]۔ کاغذ، کتابت، طباعت گوارا۔ کتاب مجلد ہے۔

شاد عظیم آبادی آخری دور میں اردو کے نہایت مسلم الثبوت اور برگزیدہ شاعر تھے۔ انہیں کے شاگرد رشید جناب حمید عظیم آبادی نے راسخ عظیم آبادی پر ایک مبسوط مقالہ انتخاب کلام راسخ کے ساتھ شامل کر کے شائع کیا ہے۔ یہ سعی مشکور ہر لحاظ سے قابل داد ہے۔ عظیم آباد ہر دور میں اردو ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ راسخ نے اس زمانے میں دادِ سخن دی ہے جب میر، سودا، سوز اور درد کی سخن سنجی دلی کی فضاؤں میں گونج رہی تھی۔ پروفیسر اختر اورینوی نے کتاب کے شروع میں چند صفحات حرفِ آغاز کے عنوان سے تحریر فرمائے ہیں۔ حرفِ آغاز کتاب کا ایک نہایت برمحل اور مختصر تعارف ہے۔

سلاح الاصلاح

ناشر تابش بن ابر احسنی رضا ٹیکسٹائل رام پور (یو۔پی) قیمت دو روپے آٹھ آنے

صفحات ۱۴۴ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶۔ کتابت، طباعت جلد وغیرہ گوارا۔

علامہ سیماب مرحوم اصلاحاتِ اساتذہ پر گاہ گاہ رسالہ شاعر آگرہ میں لکھتے رہے۔ ابر صاحب گنوری نے انہیں اصلاحات پر سیماب صاحب کے اعتراضات کا جواب مسلسل مضامین کی صورت میں رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور میں شائع کیا۔ اب وہ مضامین کتابی صورت میں شائع ہوگئے ہیں۔ ابر صاحب شدت سے استاد پرست اور بزرگانِ ادب کے عقیدت مند ہیں۔ غالباً اسی عقیدت مندی کے زیر اثر آپ نے یہ فرض سعادت مندی ادا کرنے کا تہیہ کیا۔ کتاب طالبانِ فن کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ یوں بھی شعر و سخن اور اس کے ظاہری و باطنی محاسن پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ خالی از لطف نہیں ہوگا۔ یوں تو ابر صاحب بجائے خود ایک کہنہ مشق اور ماہر فن شاعر ہیں پھر بھی کتاب کے شروع میں لوحِ نادری، ناطق گلاؤٹھوی، جوش ملسیانی، اطہر ہاپوڑی اور رضا علی وحشت کی آرا بھی شامل ہیں۔

سیماب صاحب کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے کتاب میں کہیں کہیں لہجے کی تلخی ناپسندیدہ سی محسوس ہوتی ہے۔ مگر چونکہ یہ مضامین سیماب صاحب کی زندگی میں شائع ہوئے تھے۔ اس لئے ابر صاحب بھی قابل معافی ہیں۔

ہمارا راج

مصنف مدن موہن گپت۔ ناشر مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی۔ قیمت دس آنے۔ کتابت طباعت وغیرہ عمدہ۔

۴۴ صفحوں پر مشتمل یہ کتاب بچوں کے لئے بہت مفید ہے۔ اس میں آسان زبان میں ہمارے ملک کے لئے دستور یا سمودھان کی خاص خاص باتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کچھ تصویریں اور ہندوستانی زبانوں کے علاقوں کو ظاہر کرنے کے لئے ایک نقشہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ بچوں کے لئے ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے اور یہ کتاب یقیناً ایک بڑی ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرے گی۔

موصولات

اصولِ دعوت اسلام

مصنف علامہ محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ ناشر ادارہ دعوت الحق۔ غریب خانہ گوشہ محل روڈ۔ حیدرآباد دکن۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶ کتابت، طباعت، جلد وغیرہ گوارا۔ قیمت مجلد عہ

سالنامہ رسالہ شاہراہ دہلی۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ شاہراہ اردو بازار دہلی۔

سالنامہ رسالہ شعلہ و شبنم دہلی۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر رسالہ شعلہ و شبنم دریبہ کلاں دہلی

سالنامہ کارواں الٰہ آباد۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر رسالہ کارواں نشیمن منشور روڈ الٰہ آباد

رفتارِ زمانہ

کشمیر کے متعلق اینگلو امریکی قرار داد کے خلاف ریاست جموں و کشمیر کے کونے کونے میں صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہے اور ہر کشمیری اینگلو امریکی پرستاد کے خلاف نعرے لگاتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ جب پردھان منتری نہرو سرینگر پہنچے تو سرینگر کے ہوائی اڈے سے چشمہ شاہی تک آٹھ میل لمبے راستے پر لوگوں کا بڑا ہجوم اسی قسم کے احتجاجی نعرے لگا رہا تھا، اور کہہ رہا تھا کہ کشمیر میں غیر ملکی فوجوں کو نہیں داخل ہونے دینگے' وغیرہ وغیرہ۔ نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کو مخاطب کرتے ہوئے شری نہرو نے کہا کہ بھارت نے اینگلو امریکی پرستاد کو رد کر دیا ہے اور ہم اس کے پاس ہونے سے پیدا شدہ تمام نتائج کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ وزیر اعظم نے کہا کہ مجھے پورا یقین ہے کہ ہم اس چیلنج کا معقول طریقے سے جواب دیں گے۔ انھوں نے نیشنل کانفرنس کے کارکنوں سے کہا کہ وہ اس ریزولیوشن سے بالکل خوف زدہ نہ ہوں اور اپنے کام کو جاری رکھیں۔ یہ قرارداد ریاست میں ہونے والے انتخابات میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ڈال سکتی۔

شیخ محمد عبداللہ وزیر اعظم ریاست جموں و کشمیر نے امریکہ اور برطانیہ پر یہ الزام لگایا کہ وہ پاکستان کی اس لئے حمایت کر رہے ہیں کہ اگلی بڑی جنگ میں پاکستان اپنے فوجی اڈے اُن کے حوالے کر دے گا۔ اینگلو امریکی قرارداد کے متعلق تقریر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے کہا۔ شری نہرو ہمارے درمیان موجود ہیں کوئی باہر کی طاقت کشمیر کی عزت کو نہیں کچل سکتی۔ ہم انسان ہیں کوئی بھیڑ بکریاں نہیں کہ ایک پنچ آ کر ہم پر کوئی فیصلہ ٹھونس دے۔ کچھ مدت پیشتر ناروے اور برطانیہ میں مچھلیاں مارنے کے متعلق جب کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو یہ تجویز پیش کی گئی کہ یہ معاملہ کسی پنچ کے سپرد کر دیا جائے لیکن برطانیہ نے پنچ کے ماننے سے صاف انکار کر دیا جب برطانیہ اتنے چھوٹے سے معاملے میں پنچ قبول کرنے کو تیار نہ ہوا تو پھر کس منہ سے اتنے بھاری مسئلے پر ہمیں ثالث ماننے کے لئے کہا جا رہا ہے۔

۱۱۳۸۸۱۴ مربع میل میں پھیلے ہوئے دیش بھارت کی ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق کل آبادی ۳۵،۶۸،۹۱،۳۲۴ ہے —— جن میں ۱۸،۳۳،۸۴،۸۰۶ مرد اور ۱۷،۳۵،۰۶،۸۱۷ عورتیں ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر اور آسام کے قبائلی علاقوں کی مردم شماری نہیں کی جا سکی ان کی آبادی کا اندازہ لگا کر بھارت کی کل آبادی ۳۶ کروڑ ۱۸ لاکھ ہے۔ یہ آبادی ۱۹۴۱ء کی آبادی سے ۱۳٫۴ فیصدی زیادہ ہے۔ صوبوں کے لحاظ سے آبادی میں سب سے زیادہ اضافہ دہلی میں ہوا یعنی ۹۰ فیصدی اور سب سے کم اضافہ پنجاب میں یعنی ۵٫۴۔ مدراس اور اڑیسہ میں عورتیں مردوں سے زیادہ اور باقی تمام صوبوں میں مردوں سے کم ہیں۔ شرنارتھیوں کی کل آبادی ۷۵ لاکھ کے قریب ہے۔ جن میں سے ۲۵ لاکھ پنجاب میں اور ۲۱ لاکھ بنگال میں ہیں۔ دہلی کی ۱۷ لاکھ آبادی میں سے ۵ لاکھ شرنارتھی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۱۹۰۱ء میں بھارت کی آبادی ۲۳ کروڑ ۵۵ لاکھ تھی یعنی ۵۰ برس میں ۱۲ کروڑ ۳۸ لاکھ آبادی بڑھ گئی۔

بحرالکاہل کے تحفظ کے سلسلے میں امریکہ، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے مابین معاہدے کی غرض سے گفتگو ہو رہی ہے۔ مسٹر ٹرومین صدر جمہوریۂ امریکہ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ جاپان سے صلح کے معرض عمل میں آنے کے بعد ہی تحفظ بحرالکاہل کے خیال عارضی طور پر جاپان میں امریکی فوجیں رکھنے کے سلسلے میں بات چیت ہو رہی ہے۔

کچھ مدت سے بڑودہ کے مہاراجہ پرتاپ سنگھ گائیکواڑ کچھ ایسی سرگرمیوں میں مصروف تھے جو دیش کے آئین کے خلاف ہونے کے ساتھ ہی بحیثیت مجموعی ملک و قوم کے مفاد کے لئے بھی نقصان دہ تھیں۔ بھارت سرکار نے کئی دفعہ اُن کو تنبیہ کی لیکن اس تنبیہ کا بھی ان پر کوئی اثر نہ پڑا آخر مجبور ہو کر بھارت سرکار نے آئین کی دفعہ ۲۹۶ کے مطابق

اُن کو گدی سے اُتار کر ان کے بڑے لڑکے راج کمار فتح سنگھ کو مہاراجہ بنا دیا ہے - اس حکم کے خلاف مہاراجہ بڑودہ ایک ماہ تک راشٹرپتی کے پاس اپیل کر سکتے ہیں -

قاہرہ کے اخبار "الاہرام" کے مطابق مصر اور برطانیہ کے مابین بات چیت میں نازک صورت پیدا ہو گئی ہے اور اس کے کامیاب ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی - مصر اس امر پر بضد ہے کہ ۱۹۳۶ء کے عہد نامے کو رد کر کے مصر سے انگریزی فوجیں ایک دم ہٹا لی جائیں وہ اپنے اس مطالبے سے ایک اِنچ بھی پیچھے ہٹنے کو طیار نہیں -

احمد آباد میں کپڑے کی ملوں کی ایسوسی ایشن کے صدر شری چندولال نے ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کپڑے کی کمی کے باعث مدّت سے میں جو نازک صورت حال پیدا ہو گئی تھی اس کا نازک ترین دَور اب گزر گیا ہے اور مجھے امید ہے کہ تمام ملیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں کپڑا طیّار کرنے میں مصروف ہو جائیں گی - اگر سرکار، کارخانہ دار اور مزدور مل کر باہمی تعاون سے کام کریں تو مستقبل قریب میں کپڑے کی پوزیشن بہت اچھی ہو جائے گی -

بھارت کے لیبر منسٹر شری جگ جیون رام نے ریڈیو سے ایک تقریر براڈ کاسٹ کرتے ہوئے کہا کہ جو بھی حکومت ملک کو طاقتور بنانا چاہتی ہے اس کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ مزدوروں کے لئے خوراک، آرام، تندرستی اور ترقی کے لئے فوری قدم اٹھائے لیکن یہ سارا کام گورنمنٹ پر ہی نہیں چھوڑ دینا چاہئے - بلکہ صحیح اور عملی طور پر اپنی مجموعی طاقت کو بڑھا کر مزدور اپنے مفاد کی حفاظت زیادہ مؤثر طور پر کر سکتے ہیں - اگر ان کا اپنا سنگھٹن ہو تو جب بھی ان کے مفاد پر کوئی چوٹ کرے وہ آئینی طور پر اس کی مخالفت کر سکتے ہیں - کارخانے دار بھی اس حالت میں ان کے حق کو نہیں چھین سکیں گے کیونکہ انہیں اس امر کا احساس ہوگا کہ مزدور کے دلی تعاون کے بغیر انڈسٹری ترقی نہیں کر سکتی - ایسے حالات میں کارخانے داروں کو چاہئے کہ وہ خود اپنے مفاد کو مدِ نظر رکھ کر مزدوروں کے ساتھ جائز برتاؤ کریں - شری جگ جیون رام نے کہا کہ سرکار اپنی پوری توجہ مزدوروں کے مسئلے کی طرف دے رہی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ مزدوروں کے بنیادی حقوق کو کسی حالت میں بھی نقصان نہ پہنچے اور فیکٹری ایکٹ کے بنانے کا صحیح مقصد ہی یہ ہے کہ کوئی بھی شخص مزدوروں کو اُن کی صحت، تندرستی اور حفاظت کی ذمہ داری لئے بنا ان کو کام پر نہیں لگا سکتا - آخر میں لیبر منسٹر نے مزدوروں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی تنظیم کریں تاکہ کوئی بھی ان کے حقوق کو کچلنے کی جرأت نہ کر سکے - انہیں اپنی یونین بنانے کی پوری آزادی ہونی چاہئے تاکہ وہ آئینی طریقوں سے جد و جہد کر کے اپنے حقوق کو منوا سکیں

کچھ مدّت سے ایران میں یہ تحریک چل رہی ہے کہ غیر ملکی کمپنیوں سے ایران سے تیل حاصل کرنے کی مراعات چھین لی جائیں اور تیل نکالنے کے تمام کارخانوں کو قومی ملکیت قرار دیا جائے - اس سلسلے میں اب صورت حال نازک صورت اختیار کر رہی ہے اور متشددانہ سرگرمیاں زور پکڑتی جا رہی ہیں یہاں تک کہ گولی چلنے سے کئی اشخاص ہلاک اور زخمی بھی ہو چکے ہیں - چنانچہ ان حالات کے پیش نظر اینگلو ایرانی آئل کمپنی کا کارخانہ بند کر دیا گیا ہے اور کہا نہیں جا سکتا کہ یہ حالت کتنی مدّت تک قائم رہے گی - حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ تیل کے کارخانوں کے علاقہ جات میں مارشل لا نافذ کر دیا جائے -

برطانیہ کے سابق وزیر خارجہ مسٹر بیون جو پچھلے دنوں خرابیٔ صحت کی بنا پر اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے تھے انتقال کر گئے ہیں - وہ برطانیہ کے مشہور سیاست دان تھے اور لیبر پارٹی کے ایک بڑے ستون تھے - بھارت کے پردھان منتری شری نہرو نے ان کی موت پر ہمدردی کا پیغام بھجوایا ہے -

راجندر نگر نئی دہلی میں سر گنگا رام ہسپتال کا افتتاح کرتے ہوئے بھارت کے پردھان منتری شری نہرو نے پبلک سے اپیل کی کہ وہ خودداری اور اپنے آپ پر بھروسہ رکھنے کی ذہنیت کو ترقی دیں - قوموں کی ترقی و زوال کا مدار عوام کے جذبۂ خودداری میں پنہاں ہوتا ہے

اگر لوگوں کی ذہنیت کمزور ہو جائے اور وہ دوسروں پر بھروسہ رکھنے کا خیال کرنے لگیں تو اس کے نتیجے کے طور پر قوم میں بھی کمزوری کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں اور اس طرح اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ نہرو جی نے عوام کو غیر ملکوں پر بھروسہ رکھنے کے خلاف چیتاونی دیتے ہوئے کہا کہ اُن ممالک سے جو ہمیں امداد دینا چاہتے ہیں امداد لینا اور بات ہے لیکن اُن پر ہی انحصار کر لینا بالکل دوسری بات ہے۔ آج کل کے پُرخطر زمانے میں دوسرے ممالک پر انحصار کرنا ایک نہایت ہی خطرناک بات ہے۔

تقسیم سے پیدا شدہ تکلیفوں اور مشکلوں کا ذکر کرتے ہوئے شری نہرو نے بے گھر لوگوں کی جد وجہد اور سخت مصائب کا سامنا کرنے کے لئے ان کے حوصلے اور پختہ عزائم کی تعریف کی اور کہا کہ اُن کے پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جانے اور ان کی بلند حوصلگی سے مجھے اپنے دیش کا مستقبل بہت شاندار نظر آتا ہے۔ پردھان منتری نے کہا کہ اس نسل کے لوگوں کے لئے تقسیم سے پیدا شدہ اثرات کو مکمل طور پر سمجھنا مشکل ہوگا۔ اس سے ایک عجیب صورتِ حال پیدا ہوئی ہے۔ ان گنت پریوار اُجڑے۔ انفرادی طور پر بھی مصیبتیں آئیں۔ کروڑوں اشخاص کے دل و دماغ پر اس کا اثر پڑا ہے لیکن اب وہ وقت گزر گیا ہے اور وہ تاریخ کا ایک باب بن چکا ہے لیکن جب بھی کوئی شخص اُن واقعات پر نظر ڈالتا ہے تو دُکھ اور غُصّے کا خیال اس کے دماغ میں بھر جاتا ہے اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ لوگ تکالیف کے باوجود اپنی زندگی کی ابتدا نئے سرے سے کر رہے ہیں۔ اس خیال سے ہمارا سر فخر اور خوشی سے بلند ہو جاتا ہے۔

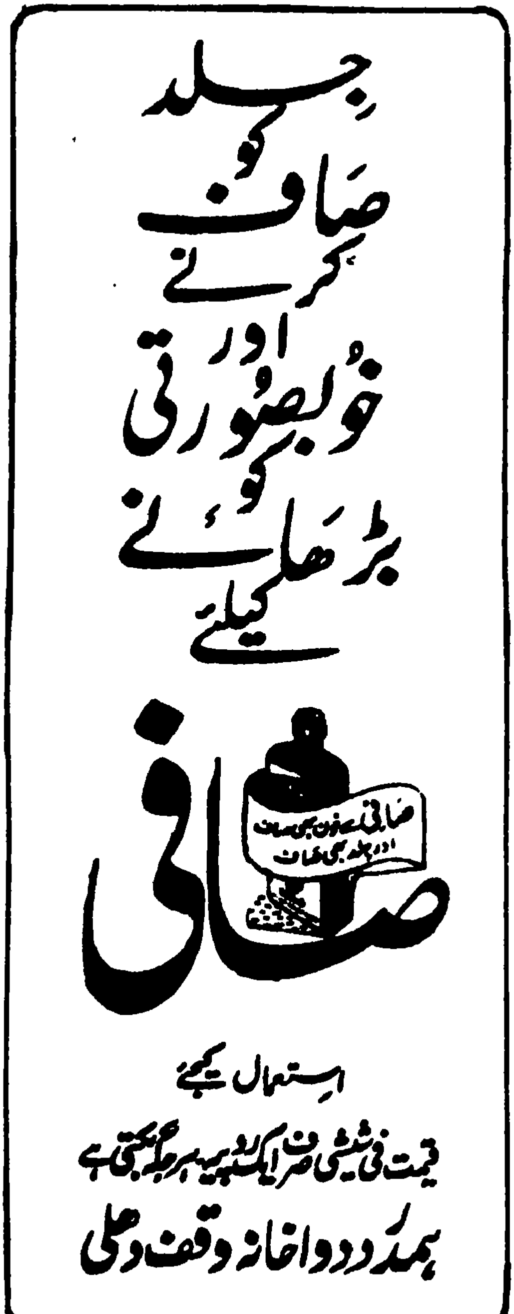
پریذیڈنٹ ٹرومین نے جنرل میکا رتھر کو اُن کے عہدے سے برخاست کر دیا ہے۔ وائٹ ہاؤس میں پریس کے نمایندگان کے سامنے یہ اعلان کیا گیا کہ جنرل میکا رتھر کی جگہ پر جنرل ... جو کوریا میں متحدہ اقوام کی افواج کے کمانڈر انچیف ہوں گے۔ اس سلسلے میں پریذیڈنٹ ٹرومین نے قوم کے نام ایک پیغام نشر کرتے ہوئے کہا کہ مشرق بعید میں امریکہ کی پالیسی کا مقصد تیسری بڑی جنگ کو روکنا ہے اور اب تک ہم اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ کے لئے یہ ایک مہلک غلطی ہوگی کہ وہ کوریا کی جنگ کو زیادہ پھیلانے میں پہل کرے۔ پریذیڈنٹ ٹرومین نے جنرل میکارتھر کو برخاست کرنے کے چوبیس گھنٹے بعد اپنا یہ پیغام براڈکاسٹ کیا اور اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جنرل میکارتھر کو برخاست کرنے کا صحیح مقصد تیسری جنگ کے امکانات کو روکنا ہے۔

فرانس، پچھمی جرمنی، اٹلی، ہالینڈ اور لکسمبرگ کے وزرائے خارجہ نے شومان اسکیم پر اپنے دستخط ثبت کر دئے ہیں۔ اس سکیم کے مطابق کوئلے اور فولاد کو اکٹھا کرنے کے لئے ایک یورپین گروپ بنا لیا گیا ہے۔ ان تمام ممالک میں کوئلے اور فولاد کی قیمتوں کا معیار ایک جیسا رہے گا

مرکزی دفتر روزگار کی تازہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس دفتر کی مدد سے اب تک سات لاکھ سے زیادہ بے گھر لوگوں کے مسئلہ روزی کو حل کیا جا چکا ہے۔ اس دفتر کی وساطت سے آٹھ ہزار لوگوں کو انڈین ریلویز میں ملازمت ملی ہے۔ یہ لوگ تیسری اور چہارم کلاس کی ان پندرہ ہزار اسامیوں کا حصہ تھے جو ٹالسٹ کے ایوارڈ کے ماتحت بے گھر لوگوں کے لئے مخصوص کی گئی تھیں قریباً سات ہزار ایسے لوگوں کو مرکزی حکومت کے دفتروں میں جگہ ملی ہے جو غیر منقسم پنجاب میں حکومت پنجاب کے ملازم تھے۔

واضح رہے کہ تقسیم ملک کے بعد بے گھر شہری لوگوں کی امداد روزگار کے لئے ذیل کے چار نکات کی ایک اسکیم مرتب کی گئی تھی۔ (۱) سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں ملازمتیں ڈھونڈنا۔ (۲) تجارت یا صنعت کے لئے قرضے دینا (۳) دکان یا کارخانہ الاٹ کرنا اور (۴) طرح طرح کے پیشوں اور ہنروں کی پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل تربیت دینا۔ ان چاروں نکات پر کافی کام ہوا اور ہو رہا ہے

بھارت پارلیمنٹ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر خوراک شری کے۔ ایم منشی نے کہا کہ ۱۹۵۱ء میں مرکزی ٹریکٹر آرگنائزیشن کے ذریعہ بھوپال مدھیہ بھارت اور مدھیہ پردیش میں ۲۳۹۵۰۰ ایکڑ غیر کاشت زمین پر کاشت لانے کی تجویز ہے۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں جو رقبہ زمین پٹ سن کے زیر کاشت تھا اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ آسام ۲۹۲۰۰۰ ایکڑ۔ بہار ۳۵۷۵۳۲ ایکڑ۔ اڑیسہ ۱۱۰۱۶۲ ایکڑ۔ مغربی بنگال ۶۵۰۹۰۰ ایکڑ۔ اتر دیش ۲۳۸۵۰ ایکڑ اور تریپورہ ۱۴۵۰۰ ایکڑ۔


جلد
کو
صاف
کرنے
اور
خوبصورتی
کو
بڑھانے
کیلئے
صافی سے خون بھی صاف
اور جلد بھی صاف
صافی
استعمال کیجئے
قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ ہر جگہ بکتی ہے
ہمدرد دواخانہ وقف دہلی


خوبصورتی
ایک برکت ہے
پرفیکٹ ٹائیلٹ سوپ
کا اس میں بڑا ہاتھ ہے
مودی سوپ ورکس
مودی نگر (یو، پی)
بچت کی اسکیم:- اب پرفیکٹ ٹائیلٹ سوپ پہلے سے کم نرخ ایک ٹکیہ کے پیکنگ میں بھی ملتا ہے

Regd No. E P 689



بچّوں کا آج کل

بسمل سعیدی

گرمی

گرمی کا جو آگیا ہے موسم — بدلا ہُوا ہے تمام عالم
سردی کی فضا نہیں رہی ہے — اب سرد ہوا نہیں رہی ہے
ہر چیز ہے گرم، کُل جہاں گرم — ہے گرم زمین، آسمان گرم
کیا گرم ہوائیں چل رہی ہیں — گرمی سے فضائیں جل رہی ہیں
جو لُو کی لپیٹ میں آگیا ہے — آفت کی جھپیٹ میں آگیا ہے
جنگل میں چرند ہیں بد اوساں — گلشن میں پرند ہیں پریشاں
گرمی سے جو تپ رہا ہے پانی — پانی میں تڑپ رہے ہیں آبی
ہے وقت عذاب دوپہر کا — قدموں کے ہے نیچے سایہ سر کا
گاہک ہے نہ ہے کوئی خریدار — گرمی سے ہُوا ہے سرد بازار
افسردگی برگ و بار پر ہے — باغوں میں خزاں بہار پر ہے
کُملا کے ہُوئے ہیں پھول پتّی — مُرجھائی ہوئی ہے پتّی پتّی
ہر چیز سے آگ اُبل رہی ہے — پنکھے سے بھی لُو نکل رہی ہے

کیا قہر ہے جُون کا مہینہ
ہے جسم میں خون بھی پسینہ

نسیم کوثر

وفادار پینا

" نانی، نانی اماں۔ کہانی سنائیے نا، آج کتنی دیر کردی۔" حامد نے اپنی نانی سے لپٹتے ہوئے کہا۔

" چھوڑ دو بھی، ہر وقت کہانی کہانی۔ کم بخت کوئی کام بھی تو نہیں کرنے دیتے۔ چلو ہٹو مجھے سکینہ کے یہاں جانا ہے۔" نانی اماں نے اپنی پرانی عینک کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا جو آنکھوں پر سے اُترنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔

نانی اماں۔ حامد، رضیہ، اکبر کی نانی اماں تھیں۔ وہ یا تو دن بھر تسبیح پڑھتیں یا پھر کبھی اِس کو ڈانٹ، کبھی اُس کو ڈانٹ اور بس اسی طرح دن گزر جاتا۔ روزانہ رات کو تینوں بھائی بہن اُن کی چارپائی پر دھاوا بول دیتے اور ضد کر کے کہانیاں سنتے۔ مگر انہیں تاریخی، اصلاحی اور مذہبی کہانیاں بالکل پسند نہیں تھیں کیونکہ وہ زیادہ تر خشک ہوتی تھیں، انہیں پریوں، جادوگروں اور بادشاہوں کی کہانیاں اچھی لگتی تھیں۔ ان تینوں کو سال بھر سے کہانیوں کی چاٹ پڑ گئی تھی اور روزانہ رات کو کہانیاں سننا اُن کا معمول تھا۔ نانی اماں کو پریوں، جادوگروں، بادشاہوں کی جتنی کہانیاں یاد تھیں سب سنا ڈالیں۔ اب کیا سنائیں۔ ہاں تاریخی، اصلاحی، مذہبی کہانیاں انہیں اب بھی بہت سی یاد تھیں۔ اس لئے آج اُنھوں نے سوچ لیا کہ یا تو ان بچوں سے کوئی بہانہ کر کے اپنا پیچھا چھڑاؤں گی یا پھر تاریخی یا اصلاحی کہانی سناؤں گی۔ اب میں پریاں، بادشاہوں اور جادوگروں کی کہانیاں کہاں سے لاؤں۔



" نانی اماں۔ کانی سنائیے ولدی سے۔" رضیہ نے اپنی توتلی آواز میں کہا۔

نانی اماں مسکرا دیں، رضیہ کو گود میں اُٹھا لیا اور پیار کر کے بولیں " ٹھہر جا بیٹی، آج ایسی اچھی کہانی سناؤں گی کہ تو بھی یاد کرے گی۔ اب تک تو تو نے صرف وہ کہانیاں سُنی ہیں جس میں صرف مردوں کا تذکرہ تھا۔ لیکن آج بیٹی تجھے ایسی کہانی سناؤں گی کہ . . . .

تو نانی اماں، ولدی سے، نہیں تو پھر امیں نیند آ جائیگی۔ رضیہ نے نانی اماں کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

" اچھا تو سنو" نانی اماں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا:۔

کسی زمانے میں ایک ملک پر ایک راجا حکومت کرتا تھا۔ اس کا نام تھا رانا سانگا اور ملک کا نام تھا میواڑ۔

۴۔ ٹکر سے حرارت کا پیدا ہونا۔ ہتھوڑے کا آہرن پہ مارنے سے گرم ہو جانا، گھوڑے کے سموں سے چنگاریاں نکلنا ہڈیوں کی فاسفورس کا ہوا سے ٹکرا کر آگ لگنا۔ تیز آندھی کے وقت درختوں کی خشک شاخوں کے ٹکرانے سے آگ کا پیدا ہونا، گرچیار سے آگ کا پھونک مار کر یا پنکھے سے ہلا کر جلانا (آکسی جن گیس کے ذرات لکڑی کی کاربن سے متواتر ٹکرا کر حرارت پیدا کرتے اور آگ پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں) رئی سے دہی کا بلونا اور مکھن نکالنا۔ دہی بلونے سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور وہی گرم ہو کر مکھن نکلتا ہے۔ جو سرد پانی ڈالنے سے منجمد ہو جاتا ہے۔ مائعات کو ایک برتن سے دوسرے میں بار بار اُلٹائیں تو گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی شے کو پانی میں حل کرنے کیلئے ہلاتے ہیں آبشاروں میں اوپر سے پانی گر کر صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ رات کے وقت مصری کی ڈلی توڑنے سے چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ طوفان کے وقت سمندر کا پانی ٹکرا ٹکرا کر گرم ہو جاتا ہے وغیرہ۔

۵۔ دباؤ کے ذریعے سے حرارت کا پیدا ہونا۔

کولہو کے مشاہدے سے یہ امر ثابت ہے۔ تل یا سرسوں پیلتے وقت لاٹھ کے دباؤ سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ تیل اور کھلی دونوں گرم ہو جاتے ہیں۔ آدمیوں کے بہت نزدیک نزدیک کھڑے ہونے یا سر پہ بوجھ اُٹھا کر چلنے سے عام حالات کی نسبت زیادہ گرمی محسوس ہوتی ہے۔

۶۔ عمل کیمیائی کے ذریعے سے حرارت کا پیدا ہونا۔

اگر سرد پانی میں گندھک کا تیزاب ڈالیں تو پانی گرم ہو جاتا ہے۔ تمام اشیاء جو کہ کیمیائی طور پر بنتی ہیں۔ ان کے بننے سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔

۷۔ قوت برقی سے بھی حرارت پیدا ہوتی ہے۔

اگر کسی برقی مورچے کے دونوں تاروں کو آپس میں ملا دیا جائے تو گرمی محسوس ہوتی ہے۔ یا اُن تاروں کے درمیان پلاٹینم کا تار رکھا جائے تو وہ روشن ہو جاتا ہے۔ یا بارود پر تار ملا کر رکھ دئے جائیں تو وہ بھڑک اُٹھتا ہے۔ غرضکہ دنیا میں آج کل بہت سے کام بجلی کی حرارت کے ذریعے ہی انجام دئے جاتے ہیں۔

کیا آپ کو معلوم ہے

(۱) ہندوستان میں ۱۴۷ زبانیں بولی جاتی ہیں۔

(۲) گرین لینڈ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ نیز اس جگہ میں دُنیا میں سب سے زیادہ مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔

(۳) ہندوستان میں سونے کی سب سے بڑی کان ریاست میسور میں ہے جس کا نام "کولر" ہے۔

(۴) میکسیکو میں سب سے زیادہ چاندی پائی جاتی ہے

(۵) ہندوستان کی ہاکی کی ٹیم دنیا کی بہترین ٹیم ہے۔

(۶) دنیا کا سب سے بڑا صحرا شمالی افریقہ کا صحرا ہے جس کا اندازاً تیس لاکھ مربع میل ہے۔

(۷) دنیا میں لندن کے بعد ہیمبرگ (جرمنی) سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔

(۸) ریڈیم کو سب سے پہلے میڈم کیوری نے معلوم کیا تھا۔

(۹) وینس (جو اٹلی میں واقع ہے) ایک سو میں جزائر کا ہے

(۱۰) دنیا کا سب سے بڑا سمندر بحر الکاہل ہے۔ اس کا رقبہ چھ کروڑ چالیس لاکھ مربع میل ہے۔

(وید پرکاش گوئل)

تم یہ تاج اپنے سر پر رکھ لو اور سمجھو کہ تم شہزادے ہو اور سو جاؤ۔
جب پنّا نے اُس کے سر پر تاج رکھا تو اس نے کہا "ماں، پیاری ماں، کیا میں خواب سے جاگنے کے بعد بھی شہزادہ ہی رہوں گا۔" تو پنّا نے غم زدہ ہو کر کہا۔ پیارے بیٹے جب تم جاگو گے تو ایک وفادار بہادر راجپوت ہو گے۔"

پھر پنّا نے اودے سنگھ کو گود میں اُٹھا لیا اور اُس کو بتایا کہ وہ ایک سفر کو جا رہے ہیں تو شہزادے نے پنّا کے بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا میرا پیارا ساتھی نہیں چلے گا۔"

نہیں پیارے شہزادے وہ یہیں رہے گا اور تمہارے حقوق کی حفاظت کرے گا۔ جب پنّا کے بیٹے نے سُنا کہ وہ سفر پر جا رہے ہیں تو وہ چیخ پڑا اور کہا کہ ماں مجھے مت چھوڑو مجھے ساتھ لے چلو۔ ماں نے اُسے سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ تم ایک وفادار راجپوت بیٹے ہو۔ خاموش لیٹے رہو جب تک میں واپس آؤں۔ بچہ سہم گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ پنّا شہزادے کو لئے محل کے ایک حصّے میں پہنچی جہاں اُس نے شہزادے کو ایک پھولوں کی ٹوکری میں لٹا کر اُوپر سے پھولوں اور پتوں سے ڈھک دیا اور ملازم سے کہا کہ وہ ہوشیاری کے ساتھ قلعے کے باہر چلا جائے اور میرا انتظار کرے۔ اتنا کہہ کر وہ پھر کمرے میں لوٹ آئی اُس کا بیٹا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ چند منٹ بعد کمرے کا دروازہ بہت زور سے کھلا اور بن بیر ہاتھ میں خنجر لئے اندر داخل ہوا اور شہزادے کا پتہ پوچھا۔ وفادار پنّا نے غم زدہ ہو کر اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کر دیا۔ چونکہ اُس کا مُنہ ڈھکا ہوا تھا اس لئے وہ اس کو پہچان نہ سکا اور جلدی خنجر اُس کے سینے میں گھونپ دیا۔

"ایں نانی اماں آپ رو کیوں رہی ہیں"۔ اکبر بولا۔

نانی اماں نے اشارے سے اسے چپ رہنے کو کہا اور کہانی برابر جاری رکھی۔ آج بچوں کی بھی نیند اُڑ گئی تھی اور وہ بڑی دلچسپی سے کہانی سن رہے تھے۔

جُوں ہی بن بیر اُسے مار کر کمرے سے باہر نکلا۔ بدقسمت ماں مگر وفادار اور بہادر پنّا اپنے بیٹے کی لاش کی طرف لپکی اور اُس سے لپٹ گئی اور زار زار رونے لگی محل کی عورتیں بھی اُس کی آواز سن کر آ گئیں اور ماتم میں شریک ہو گئیں۔ اب سب کو معلوم ہو گیا کہ شہزادہ مار ڈالا گیا۔ پنّا قلعے کے باہر آ گئی۔ کیونکہ اسے اپنی شاہی، پاک امانت کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ اسے اپنے بیٹے کے قتل کا سخت افسوس تھا۔ مگر وہ مطمئن تھی کیونکہ اُس کا وہ عہد پورا ہو رہا تھا جو اُس نے



رانی سے کیا تھا اور اس طرح سے وہ اپنے شہزادے کی جان بچا سکی تھی کیونکہ انسان کو وعدہ پورا کرنے کے لئے جو بھی قربانی کرنا پڑے ہنسی خوشی کرنا چاہیئے۔

قلعہ کے باہر ملازم بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دونوں طرح طرح کی مصیبتیں جھیل جھیل کر دیولیہ کے راجا سنگ راؤ کے پاس پہنچے اور اُس سے درخواست کی کہ وہ شہزادے کو لے کر اُس کی حفاظت کریں

اور اس کو تخت پر بٹھانے کی کوشش کریں۔ مگر مٹنگ ماؤ بن بیر سے ڈرتا تھا۔ اس لئے اُس نے اُن کی درخواست کو نا منظور کر دیا۔ آخرکار دونوں بمشکل کھمب ہالر پہنچے اور وہاں کے گورنر سے شہزادے کے متعلق کہا۔ وہاں کا گورنر بہت رحم دل اور رانا سانگا کا وفادار تھا اُس نے شہزادے کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور مشہور کر دیا کہ وہ اس کا بھتیجا ہے اور پھر اس کو تخت پر بٹھانے کی کوشش کرتا رہا۔ پنّا وہاں سے واپس میواڑ آگئی اور انتظار کرنے لگی کہ کب اُس کا شہزادہ تخت پر بیٹھتا ہے جس کے لئے اُس نے اتنی قربانیاں کیں۔



کچھ مدت بعد میواڑ کے امیر بن بیر سے بگڑ بیٹھے اور اُسے تخت سے اُتار کر کھمب ہالر کے گورنر کی مدد سے شہزادے اودے سنگھ کو تخت پر بٹھا دیا جو تخت کا اصلی وارث تھا ——— بس اب کہانی ختم۔ نانی اماں نے ٹھنڈی آہ کھینچ کر کہا۔ دیکھا بیٹی رضیہ۔ مرد ہی بہادر نہیں ہوتے۔ عورتیں بھی بہادر ہوتی ہیں اور سب کے سب اُٹھ کر اپنے اپنے بستر پر چلے گئے۔ مگر بہت دیر تک انھیں بھی نیند نہیں آئی۔

دیکھا بچو! وفاداری اور وعدہ پورا کرنے کے لئے اگر جان کی بھی بازی لگانا پڑے تو اس سے گریز نہ کرو۔

شیام سندر آزاد

بگ بین

بگ بین دنیا کا مشہور کلاک مانا جاتا ہے۔ دراصل بگ بین کلاک کا نام نہیں بلکہ اُس بھاری گھڑیال کا نام ہے جس کا وزن ۱۳½ ٹن ہے۔ یہ کلاک لندن شہر میں پارلیمنٹ ہاؤس پر نصب ہے۔ گھنٹہ گھر ۳۱۶ فٹ اونچا ہے اور اُس پر چڑھنے کے لئے ۳۷۴ چکردار سیڑھیاں ہیں۔ گھڑیال کے ہندسے دو دو فٹ لمبے ہیں اور ایک منٹ کا وقفہ ڈائل پر ایک فٹ کے برابر ہے۔ سوئیاں تانبے کی ہیں اُن کا وزن پونے تین من کے قریب ہے۔ اس کلاک کو ۱۸۵۴ء میں تیار کیا گیا اور گھنٹہ گھر ۱۸۵۹ء میں۔ یعنی اب اس کی عمر ایک کم نوّے سال ہے اور اب تک صرف ایک بار مشینی خرابی کے باعث بند ہوا ہے۔ اصل میں ہوا یوں کہ ایک موٹے سے چوہے نے اس میں گھر بنا لیا اور اس طرح مشینری ٹھہر گئی۔

بگ بین کی تاریخی لحاظ سے بھی بڑی قدر ہے۔ ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو اس کی گیارہ ٹن ٹن کی بھاری آواز نے دنیا والوں کو یہ خوشخبری سنائی کہ پہلی جنگ عظیم ختم ہو گئی ہے لیکن بدقسمتی سے اکیس سال بعد پھر ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو اسی آواز نے دنیا کو بتلایا کہ دوسری جنگ عظیم ایک بار پھر چھڑ گئی ہے۔ گھڑیال کے ہر ڈائل کے نیچے لکھا ہے "خدا ملکہ وکٹوریہ کو محفوظ رکھے"۔ اگر گھنٹہ گھر میں روشنی ہو رہی ہو تو یہ ظاہر ہے کہ برٹش پارلیمنٹ کا اجلاس جاری ہے۔

انیسویں صدی تک گھڑیال کو ہاتھ سے چابی دی جاتی تھی اور ہفتے میں تین دن پانچ گھنٹے روزانہ صرف کیا کرتے تھے، اب بجلی کی مشین لگا دی گئی ہے جو یہی کام چالیس منٹ میں کر دیتی ہے۔ کبھی کبھار جب یہ ٹھیک ٹائم نہیں دیتی تو اس کے لنگر پر بھاری وزن رکھ یا اُٹھا کر وقت ٹھیک کر لیا جاتا ہے۔

۱۹۴۱ء میں جرمنی کے ہوائی جہازوں نے اس کی بلڈنگ کو بھی نقصان پہنچایا تھا لیکن بعد میں اس کی مرمت کر دی گئی۔

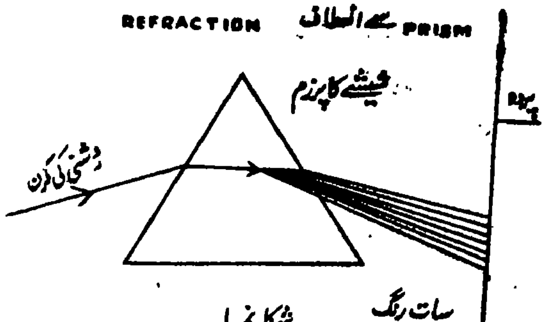
وکیل انصاری

کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ دھنش کیوں بنتی ہے؟

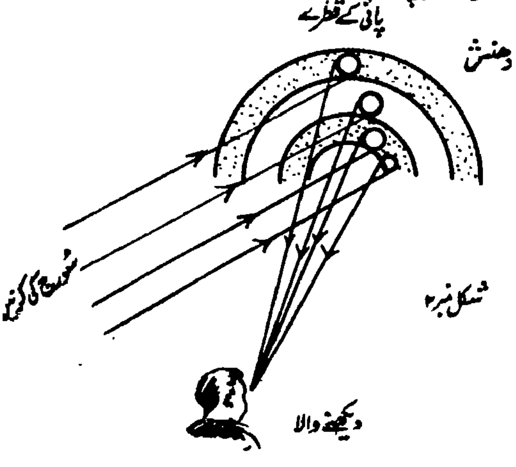
آپ نے بارہا بارش کے بعد آکاش پر مختلف شندہ رنگوں کا بنا ہوا نصف دائرہ دیکھا ہوگا جس میں نیلے، پیلے، ہرے، لال اور دوسرے رنگ کتنی خوب صورتی کے ساتھ سموئے ہوتے ہیں۔ آپ اس کو دھنش کہتے ہیں۔ آپ نے اس خوبصورت چیز کے بارے میں بہت سی دلچسپ کہانیاں سنی ہوں گی۔ آیئے، آج ہم اس کی حقیقت بتائیں۔

ہلکی یا تیز بارش کے بعد سورج کے نکلنے پر دھنش فوراً دکھائی پڑتی ہے۔ زمین پر کھڑے ہو کر ہم لوگ اسے آدھی دیکھتے ہیں لیکن ہوائی جہاز پر بیٹھ کر دیکھنے پر اس کا پورا دائرہ نظر آتا ہے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یہ سب روشنی کا کھیل ہے۔



شکل نمبر۱

بارش ہونے کے بعد بھی پانی کے چھوٹے چھوٹے قطرے ہوا میں لٹکتے رہتے ہیں۔ جب بارش ختم ہو جاتی ہے اور سورج نکلنا شروع ہوتا ہے۔ تو اس کی زریں کرنیں ہوا میں لٹکے ہوئے ان پانی کے قطروں سے گزرتی ہیں۔ سورج کی کرنوں کا ان قطروں سے گزرنا چند خاص قوانین کے تحت ہوتا ہے اور جب یہ کرنیں انعطاف کے بعد باہر نکلتی ہیں تو اپنے سات مختلف رنگوں میں منقسم ہو جاتی ہیں اور ان کا رنگین عکس سورج کے مخالف سمت آکاش پر نظر آتا ہے جس کو ہم دھنش کہتے ہیں۔ چونکہ یہ قطرے اور کرنیں بڑی تعداد میں ہوتی ہیں۔ اس لئے ہمیں ایک متوازن اور صاف رنگین عکس دکھائی پڑتا ہے (دیکھئے تصویر ۲)



شکل نمبر۲

اس کو بخوبی سمجھنے کے لئے آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ روشنی کی سفید کرنیں جن کو ہم روزانہ دیکھتے ہیں، دراصل سفید نہیں ہیں بلکہ یہ سات مختلف رنگوں سے مل کر بنی ہوتی ہیں۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے

،نماشیشے کا ٹکڑا لیجئے اور اس میں سے ایک طرف سے روشنی کی بانے دیجئے، دوسری طرف پردے پر آپ کو سات رنگ ملیں گے ں لال سب سے نمایاں اور بنفشی دھندلا دکھائی پڑے گا۔ دو یکھئے
ملا)

آپ کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے۔ شیشے نے ان رنگوں کے پیدا ہونے بر مداخلت کی ہو۔ اور سفید روشنی کی کرن سفید ہی ہوتی ہے لیکن سے لال روشنی پاس کرنے پر پردے پر لال ہی روشنی نظر آتی ہے سے پتہ چلتا ہے کہ انعطاف کے دوران میں مثلث نماشیشہ کچھ نہیں کرتا بلکہ واقعی سفید روشنی کی کرن سات رنگوں سے بنی ہے۔

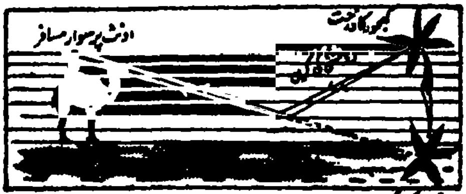
ریگستان میں سراب

کیا آپ سراب کے صحیح لفظی معنی جانتے ہیں؟ ریگستان میں مسافروں نظر تک چمکتی ہوئی ریت سورج کی روشنی میں پانی کی جھیل معلوم ہوتی ہں کو دیکھ کر ان کی پیاس اور بڑھ جاتی ہے مگر قریب پہنچ کر انہیں ہوتا ہے کہ وہاں ریت ہی ریت ہے اور پانی کا نام و نشان نہیں و "سراب" کہتے ہیں۔ اہلِ عرب اس سے قدیم زمانے سے واقف

یہ بھی دراصل روشنی کا کھیل ہے۔ اس کا سبب سمجھنے کے لئے کچھ بدی باتیں سمجھنی ضروری ہیں۔ روشنی کی کرن جب ایک واسطے Medi سے دوسرے واسطے میں جاتی ہے تو اس عمل کو ف" کہتے ہیں۔ ایسا چند خاص قوانین کے تحت ہوتا ہے جن میں ہ یہ ہے کہ روشنی کی کرن دوسرے واسطے میں داخل ہوتے ہی اصلی راستے سے کچھ ہٹ جاتی ہے۔ یہ "ہٹنا" دراصل واسطوں Me کی فطرت پر منحصر ہے۔

ریگستان میں زمین کی سطح چونکہ بہت گرم رہتی ہے۔ اس لئے وہاں زمین سے اوپر تک بہت سی مختلف تعلق والی تہہ میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے تصویر عسٓا ملاحظہ فرمائیے۔

سراب



شکل نمبر ۳

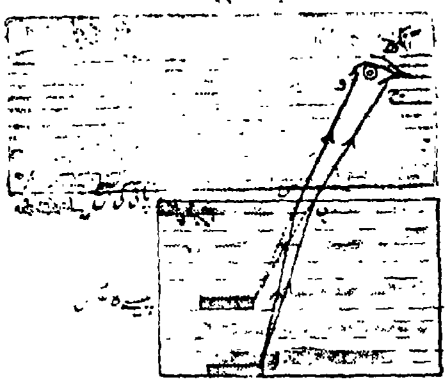
کھجور کے درخت سے آنے والی روشنی کی کرن ہوا کی مختلف تہوں سے گزرنے کے بعد منعکس ہو جاتی ہے اور جب یہ کرن کی لکیر پیچھے کی طرف بڑھائی جاتی ہے تو کھجور کا اُلٹا عکس اونٹ والے آدمی کو نظر آتا ہے۔ اس عکس کو دیکھ کر وہ سمجھتا ہے کہ وہاں کوئی لہریں لیتی ہوئی جھیل ہے لیکن وہاں پہنچ کر اسے اپنی غلط فہمی کا احساس ہوتا ہے۔

۳۔ مچھلی یا مچھلی عکس؟

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مچھلی مارنے والے، دریا میں مچھلی کو تاک کر نشانہ لگاتے ہیں مگر ان کا نشانہ غلط ہو جاتا ہے۔ پانی میں رکھی ہوئی تمام چیزوں کا یہی حال ہے۔ دراصل جس کو مچھلی مارنے والے دیکھ کر نشانہ لگاتے ہیں۔ وہ مچھلی کا عکس ہوتا ہے جو اوپر بن جاتا ہے۔ مگر مچھلی بہت نیچے رہتی ہے۔ اس طرح مچھلی کے شکاری دھوکا کھا جاتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ دریا اتنا کم گہرا نہیں ہوتا جتنا کہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ ہم پانی کے نیچے کی زمین کو نہیں بلکہ اُس کے عکس کو دیکھتے ہیں۔ اس کا سبب سمجھنے کے لئے ایک دلچسپ تجربہ کیجئے۔ ایک گلاس میں پیسہ رکھئے اور اپنی آنکھ ایسی جگہ پر کیجئے جہاں سے پیسہ نظر نہ آئے۔ اب گلاس میں

پانی ڈال دیجئے تو پیسہ آپ کو نظر آنے لگے گا۔ دراصل اس میں پیسہ نہیں بلکہ اُس کا اُبھرا ہوا عکس دکھائی پڑتا ہے۔ اس پیسے کی جگہ مچھلی تصور کر لیجئے تو مچھلی والی بات سمجھ میں آ جائے گی۔ ملاحظہ ہو تصویر ۴



شکل نمبر ۴

اس میں روشنی کی کرن پیسے سے ا ب ج اور س د کے راستے سے جا کر آنکھ سے ٹکراتی ہے۔ جب ج اور س د کو پیچھے کی طرف ملانے سے پیسے کا اُبھرا ہوا عکس دکھائی پڑتا ہے۔

۴۔ روشنی کیا ہے؟

روشنی کیا ہے؟ یہ سوال جتنا آسان ہے اُتنا ہی مشکل بھی۔ ہم اس کی جتنی تحقیق کرتے ہیں یہ مسئلہ اور اُلجھتا جاتا ہے لیکن طبیعات کی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ بھی ایک قسم کی طاقت ہے کیونکہ یہ دوسری قسم کی مختلف طاقتوں میں بدلی جا سکتی ہے اور ان کے ذریعے سے پیدا کی جا سکتی ہے۔

ہم کم سے کم اتنا تو جانتے ہی ہیں کہ آنکھوں کے ذریعے سے ہمیں چیزیں نظر آتی ہیں۔ لیکن جب ہم کمرے اور کھڑکیاں بند کر لیتے ہیں تو ہمیں چیزیں نظر نہیں آتیں۔ یعنی اب وہ چیز نہیں رہی جس کی موجودگی کے سبب ہم دوسری چیزوں کو دیکھ سکتے تھے۔ اس چیز کو ہم "روشنی" کہتے ہیں۔ اس لئے اب یہ ظاہر ہے کہ روشنی وہ طبعی ذریعہ ہے جس سے چیزیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ چیزیں دیکھی کیسے جاتی ہیں۔ عیسیٰ مسیح سے قبل کے بہت سے فلسفیوں نے اس مسئلے پر غور کیا تھا، ان کا خیال تھا کہ جس طرح "جھینگر" اپنی مونچھوں کے ذریعے سے چیزوں کو پہچانتا ہے اسی طرح ہماری آنکھ سے چھوٹے چھوٹے ذرّے نکلتے ہیں جو چیزوں سے ٹکرا کر اپنی موجودگی کا احساس ہم کو دیتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد افلاطون نے اس خیال کو رد کر دیا کیونکہ تاریک کمرے میں وہ ذرّے بھی رہتے ہیں اور وہ آنکھیں بھی۔ لیکن پھر بھی چیزیں نظر نہیں آتیں۔ اس نے بتایا۔ کہ

۱۔ نظر آنے والی چیز سے روشنی کی کرن چلتی ہے۔

۲۔ آنکھ سے بھی روشنی کی کرن چلتی ہے۔

۳۔ جب اوپر والی دونوں روشنی کی کرنیں آنکھ سے نکلنے والی روشنی سے ٹکراتی ہیں تو ہمیں وہ چیز نظر آتی ہے۔

لیکن موجودہ نظریہ اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہماری آنکھ ایک کیمرے کے مانند ہے جس میں اشیاء کا عکس آنکھ کے پردے پر بنتا ہے اور مختلف Nerves کے ذریعے سے دماغ کو اس کی خبر ہو جاتی ہے جو چیز کی نوعیت کے بارے میں فیصلہ دیتا ہے۔

سوال تھا کہ بلی کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟

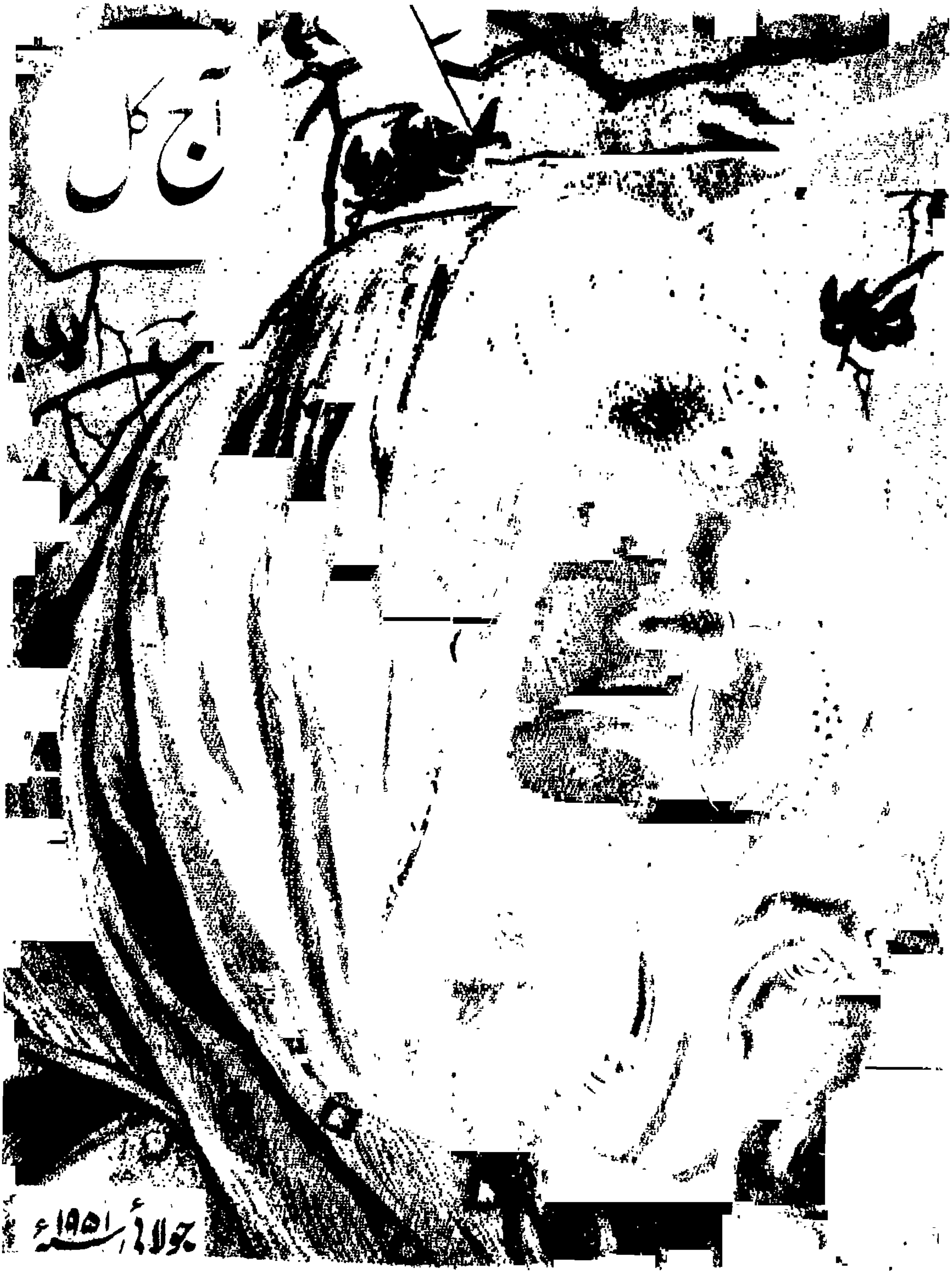
سب لڑکوں نے کہا "دو" اور ایک لڑکا کہنے لگا۔ جناب "تین"۔

ماسٹر صاحب بولے۔ "ہاں یہ جواب قدرے درست ہے"


HIMALAYA BOUQUET SNOW
HIMALAYA BOUQUET SNOW



Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting.
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

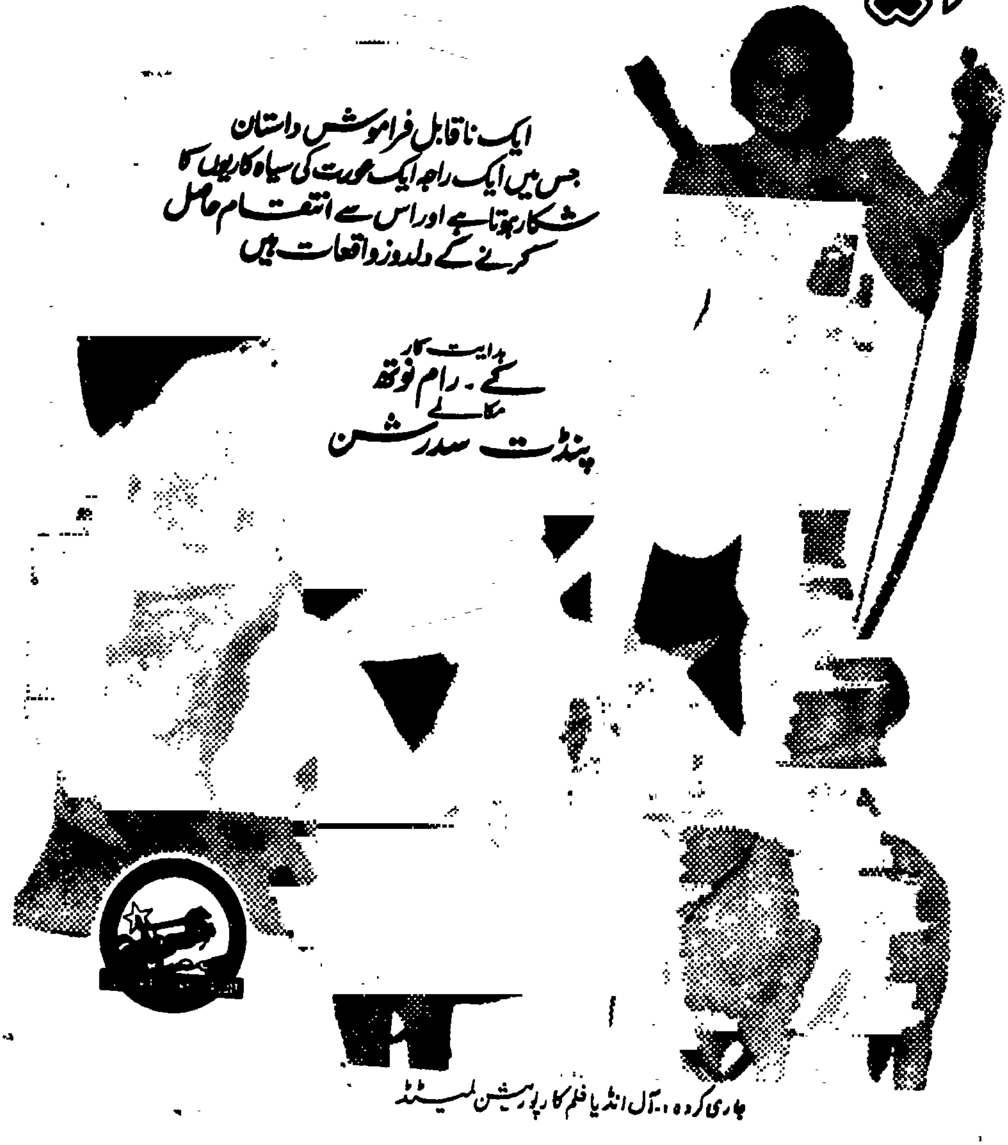

آج کل
جولائی ۱۹۵۱ء



"میں لکس ٹائلیٹ صابن
کی
بہت ممنون ہوں"
ثریا کہتی ہے
یہ سفید اور خالص صابن، جس
کی خوشبو دلکش ہے۔ آپ کی جلد
کو بھی دلکش بنادے گا!
LUX

جیوپیٹر کا

ایک تھا راجہ



ایک ناقابل فراموش داستان
جس میں ایک راجہ ایک عورت کی سیاہ کاریوں کا
شکار ہوتا ہے اور اس سے انتقام حاصل
کرنے کے دلدوز واقعات ہیں

ہدایت کار
کے۔ رام نوتھ
مکالمے
پنڈت سدرشن

جاری کردہ: آل انڈیا فلم کارپوریشن لمیٹڈ

جولائی ۱۹۵۱ء

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹرز:- عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۹ ——— نمبر ۱۲

سالانہ چندہ ——— چھ روپے

غیر ممالک سے ——— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ ——— آٹھ آنے

جولائی سنہ ۱۹۵۱ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

واحسرتا

چودھویں مئی کے "ہندوستان ٹائمز" میں یہ سُرخی MAULANA HASRAT DEAD پڑھتے ہی دل سے خون کی بوندیں ٹپک پڑیں آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا، سر چکرانے لگا اور دل پر، اُس نامراد دل پر جس میں اب جان باقی نہیں رہی ہے، کچھ ایسی ناقابلِ شرح قسم کی چوٹ لگی کہ اس منحوس خبر کی تفصیل پڑھے بغیر میں نے اخبار میز پر رکھ دیا اور دونوں ہاتوں سے کلیجہ پکڑ کے بیٹھ گیا۔

اُردو، بے یار و ناصر اُردو کا ستارہ گردش میں آچکا ہے ——— موت نے اُسے اپنے شکار کی خاطر منتخب کر لیا ہے ——— نہیں، اب مشاہیرِ اردو میں سے کوئی نہیں بچے گا ——— اب کوئی نہیں بچے گا ——— ایک متنفس بھی نہیں بچے گا ———

اچھا، اگر قضا و قدر کا یہی منشاء اور لیل و نہار کا یہی فرمان ہے تو کوئی پروا نہیں۔ سرِ تسلیم خم ہے۔ بہت اچھا، اُتار دیا جائے تمام بدنصیبوں کو موت کے گھاٹ، اس لئے کہ مرجانا کہیں بہتر ہے، اس جینے سے۔

اس مرگِ طویل النزع کے ہولناک دَور میں، جب کہ ہر شاعر و ادیب اپنا جنازہ خود اپنے دوش پر اُٹھائے پھر رہا ہے، موت، اور صرف موت ہی وہ تنہا چیز ہے جس سے جمعیتِ خاطر اور قدر افزائی کی اُمید وابستہ کی جا سکتی ہے۔

بے شک ہماری تمام بہترین اُمیدیں اب موت ہی پر منحصر ہو کر رہ گئی ہیں ——— اور یہ منزل "منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید" وہ اُمید کش منزل ہے جہاں لغزِ حیات کی بالیدگی کا تو کیا ذکر، نوحۂ ممات بھی بھرپور نہیں ہو سکتا ——— اور جی بھر کے ہنسنا تو درکنار، دل کھول کر رویا بھی نہیں جا سکتا ——— کیونکہ اس منزل میں مرنے والے کی میّت پر جب ماتم کیا جاتا ہے، تو ابھی ماتم کی ابتدا ہی ہوتی ہے کہ یکایک اُس مرنے والے کی زندگی کی دردناکیاں ذہن میں اُجاگر ہو جاتی ہیں اور اُن کے اُجاگر ہوتے ہی دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ہمارا یہ ماتم سفّاکانہ خودکامی کے سوا کچھ اور نہیں، کیونکہ ہم مرنے والے کے بلائے زندگانی سے نجات پا جانے پر آنسو بہا رہے ہیں اور اس خیال کے ساتھ ہی ہمارے نالہ و شیون کی نبضیں ساقط ہو کر رہ جاتی ہیں۔

بار بار دل کہتا ہے میاں کونی سے لڈو بٹ رہے ہیں اس نامراد زندگی میں کہ کسی کی موت پر ماتم کیا اور کسی کی درازیٔ عمر کی دُعا کی جائے کس قدر جواں بخت ہیں مرجانے والے، باقساط مرنے والے، کہ اپنی آخری قسط ادا کر کے رُوپوش ہو گئے ہیں اور کس حد کے بدبخت ہیں وہ لوگ جن کی قسطیں ابھی ادا نہیں ہوئی ہیں اور آج بھی رُسوائی و بے چارگی کے راستوں پر بیٹھے نظر آ رہے ہیں۔

حسرت موہانی اپنی آخری قسط ادا کر کے شاہ راہِ ناقدری و انگشت نمائی سے اُٹھ کر وہاں چلے گئے ہیں، جہاں خدا کے فضل و کرم سے ہم سب کو جانا ہے ——— اگر مجھ پر عقل کی فرماں روائی ہوتی تو حسرت کی قیدِ حیات و بندِ غم سے رہائی پا جانے پر ایک جشن کا اہتمام کرتا، اور شادیانے بجاتا ——— لیکن ایک مدتِ دراز کی مشقِ عقل کے باوجود میں ابھی تک جذبات کا غلام اور مردِ خام ہوں، اس لئے حسرت کے پائے وجود کی وہ زنجیر جو اب زمین پر اُتری ہوئی پڑی ہے، میری رگ رگ میں شیون کی ایک گونج اور فریاد کی ایک جھنکار پیدا کئے ہوئے ہے ———

حسرت کی شخصیت و شاعری کے باب میں کیا لکھوں — کون نہیں جانتا کہ میرا یہ مرحوم پڑوسی، اگر سیاست کے میدان میں ایک سرفروش مجاہد تھا تو ادبیات کے گلستاں کا بلبلِ ہزار داستاں تھا۔

حسرت صاحب دُھن کے پکّے، بات کے دھنی، وضع کے پابند، قناعت کے مرکز اور اصول پرستی کے پیغامبر تھے اور اُن کی شاعری میں ماضی و حال کچھ اس طرح سمویا ہوا تھا کہ قدامت پرست اور جدّت پسند دونوں اُن کے مدّاح تھے۔

سیاست، شریف آدمیوں کا پیشہ نہیں۔ لیکن یہ حسرت ہی تھے کہ اس کوئلے کی دلّالی میں عمرِ عزیز گنوا دی اور مرتے دم تک بے داغ رہے۔ اور تمام زندگی تمام طاغوتی دیوتاؤں کو للکار للکار کر کہتے رہے۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے، کرے شکار مجھے

شاید لوگ ابھی بھولے نہ ہوں گے کہ یہ حسرت ہی تھے جنہوں نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے سب سے پہلی بار آزادیٔ کامل کا آوازہ بلند کیا تھا —— اور یہ وہ وقت تھا کہ آزادیٔ کامل کے تصوّر سے بھی، عوام تو عوام، خواص تک کانپ اُٹھتے تھے۔

قیدِ فرنگ کے مسلسل شدائد میں بھی اُنھوں نے "مشقِ سخن" کو جاری رکھا اور چکّی کی آواز سے تال کا کام لیا — اس لئے کہ وہ ایک طرفہ طبیعت کے آدمی تھے۔

انسان کی تمام زندگی اور اُس کی زندگی کے ہر ایک دقیقے کو نگل کر ڈکار تک نہ لینے اور مزید وقت کا تقاضا کرتی رہنے والی سیاسی معروفیتوں کے لانہایت اور کاربلاں در کارواں ہجوم میں جب کہ سر کھجانے کی فرصت بھی میسّر نہیں ہوتی۔ حسرت کے ذوقِ سخن کا جاری رہنا کچھ ایسی بات معلوم ہوتی ہے، جسے خرقِ عادت یا کرامت نہیں، بلکہ معجزہ کہا جا سکتا ہے۔

ہر کفے جامِ شریعت، ہر کفے سندانِ عشق   ہر ہوسناکے ندانَد جام و سنداں باختن

اور ان تمام غیر معمولی خصوصیات کے دوش بدوش سب سے بڑی بات یہ تھی کہ حسرتؔ موہانی حقیقی معنیٰ میں ایک انسان بھی تھے۔ وہ راست فکاری، راست گفتاری، راست کرداری، حلم و بُردباری، اصول پرستی، جواں مردی، قناعت دوستی، محبّت نوازی، خودداری اور خلوص کی ایک ایسے اوتار تھے کہ اگر فرشتوں کا وجود ہوتا اور اُن میں وہ تمام اوصاف ہوتے جو اُن سے منسوب کئے جاتے ہیں، تو حسرت کی چوکھٹ پر سجدہ کرنے سے اُن کی پیشانیاں شمس و قمر بن کر دمک اُٹھتیں۔

کس قدر ترس آتا ہے مجھے اپنی بے چارگی پر کہ محفل دھڑا دھڑ خالی ہوتی چلی جا رہی ہے، اور قافلوں پہ قافلے گُزرتے چلے جا رہے ہیں لیکن میں فرشِ حیات پر پاؤں پھیلائے بیٹھا ہوا ہوں، حالانکہ خیمۂ احباب سونا ہو چکا ہے، بجھی ہوئی شمعوں کا دُھواں فضا میں گونجا ہوا ہے۔ پسماندوں کی خاک تک اُڑ چکی ہے، مگر میں اب تک اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔ یہ مجبوری ہے، بے حسی ہے، یا بے کسی، کیا معلوم۔ میرے سر پر کتنے محبوب دوستوں کی خاکِ گور جمی ہوئی ہے اور میرے بالوں میں کتنے یارانِ رفتہ کے کفن کی سفیدی جھلک رہی ہے، لیکن میں اُٹھنے کا نام نہیں لیتا۔

قدرت کی سفّاکی شاید یہ چاہ رہی ہے کہ مجھے "اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو" کی اُس منزل میں ہلاک کرے جب کہ میری دماغی برادری والوں میں سے ایک بھی مجھ پر رونے کے واسطے باقی نہ رہے۔

قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

۱۴ مئی ۱۹۵۱ء

جوشؔ

حامد حسن قادری

تواریخِ وفاتِ مولانا حسرت موہانی

حسرت شیدائے ملک، ہر دل کو حبیب	اک شاعر و نکتہ سنج و نقّاد و ادیب
۱۳۷۰ھ	۱۳۷۰ھ
یا رب گلزارِ خلد حسرت کو نصیب	ہو اوجِ شرف شفیعِ محشر کے قریب
۱۹۵۱ء	۱۹۵۱ء

(۲)

اللہ باقی باقی فانی — مَوت حقیقت، زیست کہانی
جیسی دولت، ویسی ہستی — دھوپ اور چھاؤں، آنی جانی
نقش بر آب اس کو بھی سمجھو — آخر زیرِ زمیں ہے پانی
لیکن جس کی یاد ہے باقی — اس کی ہستی جاویدانی
ایسے ہی تھے مولانا حسرت — فخرِ بنی نوعِ انسانی
عزم میں پتھر، عجز میں مٹی — جوش میں آگ، اخلاق میں پانی
شاعر ایسے، نقّاد ایسے — بس ختم اُن پر سحر بیانی
لُطف، مزہ، تاثیر اور جادو — نشہ فزائی، بادہ چکانی
لوچ، لچک، نرمی، شیرینی — شبنم ریزی، گُل افشانی
اس کے آگے نام اللہ کا — اُن کا تغزّل وہ لاثانی
بات یہی ہے، سب نے سُن لی — اپنی کہانی، اُن کی زبانی
بات میں وہ لذّت تھی کہ سب نے — اپنے دل کی بات ہی جانی
ملک کے شیدا، قوم کے خادم — پیری اُن کی رشکِ جوانی
ایسے صفا آئیں، روشن دل — دن سے بڑھ کر شب نورانی
قادری ان کی مدح ہے مشکل — ان پر ہو فضلِ یزدانی
پورے شعر میں نکلے تاریخ — رہ جائے تیری یہ نشانی

سچے لیڈر، ناقد شاعر = ۱۰۴۳
مولانا حسرت موہانی = ۹۰۸
۱۹۵۱ء

سید محمد فاروق

تجلّی کی مثنوی لیلےٰ مجنوں

بزرگوں کی متروکہ کتابوں میں ایک قلمی نسخہ میر تجلّی دہلوی کی مثنوی "لیلےٰ مجنوں" کا دستیاب ہوا ہے۔ حیرت بالائے حیرت ہے کہ اس بے بہا گوہر پر اس سے پہلے نظر نہ پڑی۔ یہ مثنوی ایک یادگار چیز ہے جس کا ذکر تذکروں میں نگاہ سے گزرا تھا لیکن اچانک اس کا وجود غیر یقینی اور مبہم رہا۔ خیال گزرا کہ شاید اس سے پہلے یہ کہیں چھپ چکی ہو لیکن جس قدر بھی تفتیش کی گئی نتیجہ یہی نکلا کہ اس کا وجود ناپید ہے۔ اس لحاظ سے اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے درحقیقت ادبی اور تاریخی اعتبار سے یہ چیز آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے۔

میر تجلّی جو اس مثنوی کے مصنّف ہیں معروف شخصیت کے حامل تھے۔ دہلی میں بیگم کے باغ واقعہ چاندنی چوک میں گھر تھا اور غالب کی طرح پیشہ سپاہ گری رکھتے تھے۔ ان کے والد میر محمد حسین کلیم شاہجہان آبادی مشہور شاعر گزرے ہیں۔ یہ میر تقی میرؔ کے بہنوئی تھے۔ اس طرح تجلّی میر صاحب کے بھانجے ہوئے۔ مصحفی اپنے "تذکرۂ ہندی" میں کلیم کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

محمد حسین کلیم والد میاں حاجی صاحب تصنیف بسیار است
چنانچہ ترجمہ خصوص الحکم در مجلس ہندی بہ سلک نظم کشیدہ

کہتے ہیں کہ قائمؔ نے اپنے کشیدہ تذکرے میں ان کی مبالغہ آمیز تعریف کی ہے۔

تجلّی کی عرفیت "میاں حاجی" تھی[۱] لیکن نام کے اوپر تذکرہ نویسوں کا اختلاف ہے۔ بعض محمد حسن ولد محمد حسین اور بعض محمد حسین ولد محمد حسن کہتے ہیں میرزا علی لطف نے انھیں بجائے میر شیخ لکھا ہے۔ مصحفی سے ان کی ذاتی ملاقات تھی لیکن وہ صرف عرفیت (میاں حاجی) سے کام لیتے ہیں۔ میر قدرت اللہ قاسم نے اپنے "مجموعۂ نغز" میں تین جگہ تجلّی کا نام لیا ہے اور تینوں جگہ ان کو "میر محمد حسن" لکھا ہے۔ متاخرین میں صاحب خم خانۂ جاوید (لالہ سری رام دہلوی) نے جن کو دہلی میں تحقیق کے نادر مواقع حاصل تھے، ان کا ذکر میر حسین عرف میر حاجی پسر میر حسن کلیم کے نام سے کیا ہے۔ یہ زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے، جس کا ثبوت خود تجلّی کے قلم سے بھی ملتا ہے۔ ان کا شعر ہے

زبان عرب میں وہ آشفتہ حال   پکارا مجھے یا حُسینی تعال

یہ شعر اس مقام کا ہے جہاں وہ لیلےٰ اور مجنوں کو خواب میں دیکھتے ہیں اور مجنوں انھیں بُلا کر اپنی سرگزشت زبان ہندی میں قلمبند کرنے کی فرمائش کرتا ہے۔ حسینی، میر حسین یا محمد حسین کا مخفف تو ہو سکتا ہے لیکن حسن سے اس کو کوئی نسبت نہیں۔ بہرحال یہ اختلافات معمولی ہیں۔ محمد حسین، محمد حسن، محمد محسن، یہ سب نام ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ پڑھنے لکھنے میں غلط فہمی ہو سکتی ہے۔

تجلّی کا شمار اپنے وقت کے بہترین شعراء میں سے تھا۔ شاعروں کے تذکرے ان کے ذکر سے خالی نہیں اور تمام تذکروں میں ان کی شاعری کو سراہا گیا ہے۔ مصحفی لکھتے ہیں۔

میاں حاجی ولد میر محمد حسین کلیم جوانے است در فنِ ریختہ بے نظیر

ان کے کلام کے متعلق لکھتے ہیں "کہ بر زبان شائقانِ زمان در شاہجہان آباد جاری است"۔ مصحفی اور لالہ سری رام نے ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں۔

کئی دن سے روٹھ گئے ہیں وہ نہ پیام ہے نہ سلام ہے
جو یہی طرح رہی ہم نشیں تو ہمارا کام تمام ہے

مری وفا پہ تجھے بعد نشک نقالے ظالم   بہ سر یہ تیغ ہے لے اب تو اعتبار آیا
یہ شوق دیکھ پس مرگ بھی تجلّی نے   کفن میں کھول دیں آنکھیں صبا جو یار آیا

یہ تار دم ہے صورت بار کا رشتہ کہ ہر صورت
چلے جاتے ہیں پردے میں اسے ناچار جب کھینچا

---

[۱] تجلّی کے نام وغیرہ کی تحقیق کے سلسلے میں جو قیمتی معلومات ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے حاصل ہوئی اس کا اعتراف دلی شکریہ کے ساتھ کیا جاتا ہے (ف)

عشق میں کرتے ہیں بدنام تجلی کو عبث
وہ بچارا کبھی اس کوچے میں آیا نہ گیا

لالہ سری رام ان کو میر کا شاگرد بتاتے ہیں جس کو خدائے سخن میر سے وہ دو نسبتیں حاصل ہوں۔ اس کی قدر و منزلت کا کیا کہنا۔ مصحفی فرماتے ہیں "دیوان ضخیم ترتیب دادہ" لیکن وہ دیوان آج کہاں ہے کہ اہل ذوق عقیدت کے ہاتھوں اسے سر پر رکھیں۔ اللہ اللہ کیا کیا گراں بہا خزانے زمانے کی دستبرد سے تلف ہو گئے۔ بزرگوں کی علم دوستی کا صدقہ کہ مثنوی ضائع ہونے سے محفوظ ہے۔ اگر انجمن ترقی اردو یا کوئی اور ادارہ متوجہ ہو تو اس گراں پایہ ادبی شاہکار کو زندگیٔ دوام حاصل ہو سکتی ہے۔

مثنوی "لیلےٰ مجنوں" تجلی کی مستقل یادگار اور ان کا بیش قیمت سرمایۂ حیات ہے۔ میرے قلمی نسخے میں اس کا نام "منظومہ لیلےٰ مجنوں" اور "حکایت لیلےٰ مجنوں تصنیف میر تجلی" لکھا ہے۔ اس جگہ ایک ضمنی بحث آ جاتی ہے کہ اس کے مصنف میر حسین تجلی، خواہر زادۂ میر تقی میر ہیں یا کوئی اور تجلی بہر صورت مثنوی "لیلےٰ مجنوں" کو ہر تذکرہ نگار نے ان کی تصنیف بتایا ہے قطب الدین باطن اکبر آبادی کو اس سے ضرور اختلاف ہے اور وہ "لیلےٰ مجنوں" کو غلام علی تجلی سے منسوب کرتا ہے۔ اور اُن کے یہ دو شعر بھی نقل کئے ہیں

تجھے بھیج مکتب میں پچھتائے ہم ۔۔۔ ترے لکھنے پڑھنے سے باز آئے ہم
تجلی دل آزاریٔ عشق دیکھ ۔۔۔ بہار جفا کاریٔ عشق دیکھ

یہ دونوں شعر بعض تبدیلیوں کے ساتھ اس قلمی نسخے میں موجود ہیں۔ لیکن باطن کی تحقیقات اہل نظر کے سامنے زیادہ مستند نہیں۔ اس کا تذکرہ "گلستان بے خزاں" نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے "گلشن بے خار" کے جواب میں لکھا گیا تھا جس میں شیفتہ اور دوسرے نامور شعراء کو بہت کچھ بُرا بھلا کہا گیا ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی دائرہ امکان سے خارج نہیں کہ کوئی غلام علی تجلی گزرا ہو لیکن یہ نام باطن کے تذکرے کے سوا اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ اس کی غیر معروف شخصیت کے خلاف تمام تذکرہ نویس جہاں میر حسین تجلی کا نام لیتے ہیں وہاں ان کی مثنوی "لیلےٰ مجنوں" کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ اس جگہ اس کم سواد کی رائے میں خود مثنوی کا ایک شعر

و زباں پہ رہے وردِ نام علی ۔۔۔ لقب میرا ٹھہرے غلام علی

اس گتھی کو سلجھا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ باطن کو بظاہر پوری مثنوی دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اِدھر اُدھر سے سُن کر اوپر کے دو شعر نقل کر دئے۔ یہ تیسرا شعر بھی گوش گزار ہوا ہوگا اور اس نے نتیجہ نکالا ہوگا کہ شاعر کا نام یا لقب "غلام علی" ہے۔ یہ چیز بعید از قیاس نہیں۔ بہرکیف اس لحاظ سے کہ اس مثنوی کے علاوہ کسی اور مثنوی "لیلےٰ مجنوں" کا جو تجلی نام شاعر کی تصنیف ہو اردو لٹریچر میں پتہ نہیں چلتا اور یہ مسلّمہ امر ہے کہ میر حسین تجلی نے اس نام سے ایک مثنوی لکھی تھی یہ ماننا پڑیگا کہ یہی اس مثنوی کے مصنف ہیں۔

یہ مثنوی "لیلےٰ مجنوں" ایک ضخیم تصنیف ہے جو پندرہ سطری مسطر کے ۱۸۹ سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے درمیان اور آخر کے دو ایک صفحے ضائع ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب اپنی جگہ پر مکمل ہے اور ضائع شدہ صفحات کے نہ ہونے سے کوئی خاص کمی نہیں محسوس ہوتی۔ پرانے قسم کے دبیز کاغذ پر نہایت صاف اور پاکیزہ خط میں لکھی گئی ہے۔ مطالب کے لحاظ سے یہ منظومہ مصنف کی پرگوئی، سخن کی مشاقی اور پختہ کلامی کا ایک واضح ثبوت ہے۔ لیلےٰ مجنوں کا افسانہ اور اس کے متعلقات اس درجہ مشہور اور زبان زدِ عام ہیں کہ یہ داستان ایک فرسودہ کہانی ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن اسی جگہ شاعر کا کمال نظر آتا ہے کہ وہ واقعات پر رنگ و روغن چڑھا کر انہیں جاذب نظر بنا دیتا ہے۔ اس کوشش میں تجلی پورے طور پر کامیاب نظر آتے ہیں اور انہوں نے یہ مثنوی لکھ کر اپنی قادر الکلامی کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔

مثنوی کا خلاصہ یہ ہے۔ حمد، نعت، منقبت اور تمہید کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ عرب کا ایک بادشاہ تھا جس کے اولاد نہ ہوتی تھی کعبہ شریف میں دعا کرنے کے بعد اس کے یہاں ایک لڑکا قیس پیدا ہوتا ہے۔ اپنے وقت پر اس کو مکتب میں بٹھایا جاتا ہے۔ جہاں لیلےٰ بھی پڑھنے جاتی تھی، دونوں میں محبت کی بنیاد پڑتی ہے، جس کا چرچا ہوتا ہے۔ لیلےٰ مکتب سے اُٹھالی جاتی ہے، اس کے فراق میں قیس کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔ یہ فقیر کے بھیس میں جا جا کر لیلےٰ سے ملتا ہے، یہ راز بھی کھل جاتا ہے اور ملاقات کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں، باپ پند و نصائح سے کام لیتا ہے لیکن سب بے اثر، فرطِ دیوانگی میں وہ جنگل کی راہ لیتا ہے اور قیس سے مجنوں بن جاتا ہے، مجنوں کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کے قوم کے سربرآوردہ لوگ لیلےٰ کے باپ کے پاس وفد لے کر جاتے ہیں اور اس سے

درخواست کرتے ہیں کہ وہ مجنوں کو اپنی فرزندی میں قبول کرے لیکن یہ التجا منظور نہیں ہوتی۔ لیلےٰ کا عقد ابن السلام کے لڑکے سے ہو جاتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتی اور آخرکار علیحدگی ہو جاتی ہے۔ مجنوں شادی کی خبر سن کر لیلےٰ کو شکایت آمیز خط لکھتا ہے، لیلےٰ جواب میں اپنی حقیقی محبت کا اطمینان دلاتی ہے۔ مجنوں کے لئے فقیر فقرا سے دُعا کرائی جاتی ہے، اطبا کا علاج ہوتا ہے، مجنوں کو نشتر دیا جاتا ہے تو اس طرف لیلےٰ کے ہاتھوں سے خون جاری ہو جاتا ہے، بادشاہ نوفل کا گزر ہوتا ہے وہ مجنوں کو جنگل سے اپنے ساتھ لاتا ہے اور لیلےٰ کے باپ کو مجنوں کی طرف سے پیام دیتا ہے لیکن اس کی درخواست بھی مسترد ہوتی ہے، نوفل فوج کشی کر کے اسے شکست دیتا ہے لیکن لیلےٰ کے حُسن و جمال پر وہ خود فریفتہ ہو جاتا ہے، اس کے اشارہ سے مجنوں کے لئے ایک جام زہر آلود طیار کیا جاتا ہے کہ اس کو ختم کر کے لیلےٰ پر قبضہ کیا جائے لیکن غلطی سے زہر کا پیالہ خود نوفل کو پلا دیا جاتا ہے اور وہ تمام ہو جاتا ہے، لیلےٰ اپنے باپ کے پاس جا پہنچتی ہے اور حضرت مجنوں بدستور جنگل باسی ہو جاتے ہیں، اتفاقاً لیلےٰ کا ناقہ راستہ گم کر کے ادہر آ نکلتا ہے اور اس طرح دونوں فراق زدہ آپس میں مل لیتے ہیں، مجنوں ایک شتر سوار کی وساطت سے لیلےٰ کے شہر میں جا پہنچتا ہے، لیلےٰ کو لب بام پاتا ہے اور گفتگو ہوتی ہے لیلےٰ کا بھائی اس پر حملہ آور ہوتا ہے لیکن اس کے ہاتھ شل ہو جاتے ہیں۔ لیلےٰ خواب میں مجنوں کا جنازہ دیکھتی ہے، صدمے سے بیمار ہو کر بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔ وصیت کے مطابق دایہ مجنوں کو خبر پہنچاتی ہے۔ وہ لیلےٰ کے مزار پر آتا ہے۔ مزار شق ہو جاتا ہے اور مجنوں اس میں سما جاتا ہے۔

یہ ہے مرقع نجد کے قبیلۂ بنی عامر کے ایک سردار مُلوح بن مزاحم کے صاحبزادے قیس مجنوں کا، جس کو تجلّی کے موشگاف قلم نے شاعرانہ رنگینیوں کے ساتھ طیار کیا ہے۔ اس پلاٹ کے قائم کرنے میں بعض تغیرات سے قطع نظر مولینا نظامی اور حضرت امیر خسرو کا تتبع کیا گیا ہے۔ ان تمام و کمال واقعات کا ثبوت پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے لیکن وہ ان دونوں کے وجود سے قطعی طور پر منکر بھی نہیں ہے[1]۔ پھر یہ حالات فرضی ہی سہی لیکن "لیلےٰ مجنوں" کی داستان کے مقبول عام ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ عربی لٹریچر ان کے ذکر سے مملو ہے۔ فارسی میں مولینا نظامی گنجوی، ملا ہاتفی ہروی، ملا مکتبی شیرازی اور حضرت امیر خسرو دہلوی نے اس کے منظومے تیار کئے اور ان کے اندر معرفت و اخلاق کے وہ دُرِ بے بہا اکٹھا کئے جنہیں اہلِ دل نے آویزۂ گوش بنایا۔ اسی کی بدولت اسالیب بیان، محاورات، تماثیل اور تلمیحات کے نئے نئے راستے کھلے، جن سے علم ادب مالا مال ہوا۔ غور کیجئے کہ ایک طرف مولینائے روم خدا شناسی کی تعلیم دیتے ہیں تو "عکس رخسار من" کی جلوہ ریزیاں حسن لیلےٰ سے پیدا کی جاتی ہیں کہ

عشق لیلےٰ نیست ایں کار من ست   حُسن لیلےٰ عکس رخسار من است

تو دوسری طرف اس صدی کے نباض شاعر اکبر کو اپنے مخصوص ظریفانہ پیرائے میں تعلیم جدید کی تلقین کی ضرورت ہوتی ہے تو "مادر لیلےٰ" کی زبان سے کام لیا جاتا ہے اور برداشتہ خاطر نوجوانوں کی پست ہمتی دکھانے میں مجنوں کو مثالی شکل میں پیش کیا جاتا ہے ؎

کہا مجنوں سے یہ لیلےٰ کی ماں نے   کہ بیٹا تو اگر کر لے مڈل پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلےٰ کو تجھ سے   بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سُنائی   مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
کہاں یہ فطرتی جوشِ طبیعت   کہاں ٹھوسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے   ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
اگر ٹھہری یہ شرط وصلِ لیلےٰ
تو استعفےٰ مرا با حسرت و یاس

مجنوں بجائے خود کم حوصلہ نہ تھا۔ وہ اپنے میدان کا مرد تھا لیلےٰ کی محبت میں اس نے اپنی جانِ عزیز کی بازی لگا دی اور اسی دھن میں دنیا سے نامراد گیا۔

تجلّی کی یہ مثنوی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے سودا و میر کے

---

[1] لیلےٰ اور مجنوں دونوں بنی عامر کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے عشق و محبت کا فسانہ (بقیہ کالم ۲ کے نیچے) بھی صحیح ہے اور مجنوں کی دشت نوردی بھی مسلم ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا انتقال [illegible] میں ہوا۔ اس کا ایک دیوان بھی چھپ گیا ہے جو مبصرین کے نزدیک والہانہ جذبات کا مجموعہ ہے لیلےٰ کا انتقال پہلے ہوا۔ اس کی شادی ہو گئی تھی لیکن مجنوں کے ساتھ اس کی محبت صادق تھی، اسی غم میں گھل گھل کر ختم ہوئی۔

عہد کا نمونہ ہے ۔ متروک الفاظ اور ترکیبیں جو اس زمانے میں مستعمل تھیں اس میں ضرور موجود ہیں مثلاً تئیں، نپٹ، نت، ٹک وغیرہ، اسی طرح بعض مقامات پر فارسیت کا رنگ غالب آگیا ہے جو موجودہ مذاق کے لئے غیر مطبوع ہوگا، لیکن مجموعی حیثیت سے طرزِ بیان سُلجھا ہوا ہے اور زبان صاف اور رواں ہے ۔ مستثنیات کو چھوڑ کر خود فارسی ترکیبیں بھی اپنی جگہ پہ کچھ کم دل آویز اور معنی خیز نہیں ہیں ۔ نمونہ ملاحظہ ہو ۔

پیرِ آزمودہ کار کی تعریف میں ۔

نگا کہنے اے رہبرِ راہِ عشق　　　برآرندۂ غرقۂ چاہِ عشق

طبیب کی تعریف میں ۔

طبیبِ شفا بخشِ آزارِ عشق　　　کشایندۂ مشکلِ کارِ عشق

مجنوں کے احباب کی کیفیت ۔

دلے سب سے ناواقف کارِ عشق　　　ستمگارِ دل، ناخبر دارِ عشق

لیلےٰ کی تعریف میں ۔

کہ وہ سروِ نوخیزِ بُستانِ حُسن　　　گُلِ رنگ بخشِ گلستانِ حسن

مجنوں کی تجویز کردہ "معجونِ دیدار" کے خصوصی اثرات ۔

شفا بخشِ بیماریٔ جاں ہے یہ　　　دلِ دردِ منزل کا درماں ہے یہ

"دردِ منزل" کی ترکیب کتنی اچھوتی اور کس قدر بھلی ہے ۔ ایک جگہ رات کو "سویدائے دل ہائے اہلِ حضور" کیا خوب کہا ہے ۔

نہ شب بلکہ تھی مردمِ چشمِ نور　　　سویدائے دل ہائے اہلِ حضور

قلم کی صفت میں کتنا صحیح کہا ہے ۔

صفت جس کی کہتے ہیں دل تفتگاں　　　دریدہ دہان و بُریدہ زبان

ایک دوسری جگہ قلم کو "زبان کا گدا" کہا ہے جو معنی خیز ہے ۔

شاعر کو اپنے قلم پر پورا پورا قابو حاصل تھا ۔ تمامی مناظر غیر معمولی صراحت اور وضاحت سے سامنے لائے گئے ہیں، جس واقع کو قلمبند کیا ہے اس پہ ہر پہلو سے نظر ڈالی ہے اور بے تکان کہتے چلے گئے ہیں ۔ یہ شاعر کی قدرتِ کلام کی دلیل ہے ۔ ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں ۔

اللہ تعالےٰ سے دعا ۔

تری رہ کا پامال ہوں اس قدر　　　کہ سرمہ کریں جس سے اہلِ بصر
غمِ عشق کی تیری کاہش رہے　　　سوا تیری خواہش، نہ خواہش رہے

گزارندۂ جُرمِ آدم ہے تو　　　برآرندۂ کارِ عالم ہے تو

نعت ۔

شفیعِ قیامت بلاغ المبین　　　رسولِ خدا رحمت العالمین
شہِ دوجہاں مخزنِ التفات　　　وقیع المکان، اشرفِ کائنات
طبیبِ شفا بخشِ آزارِ جُرم　　　رہانندۂ ہر گرفتارِ جُرم

بیت محمد شریف میں مجنوں کا باپ دُعا مانگتا ہے ۔ اس کی قبولیت کا اعلان ہاتفِ غیب سے سنئے ۔

کہ اتنے دنوں تو ہی بھٹکا پھرا　　　نہ آیا اِدھر، اور ہر جا پھرا
وگرنہ یہ وہ در نہیں جس سے یار　　　کوئی پھر گیا ہووے امیدوار
جو کچھ تو نے چاہا وہ ہم نے دیا　　　پسر یعنی تجھ کو عنایت کیا

مجنوں عشق بازی کا چسکا اپنی پیدائش کے ساتھ لایا تھا ۔ رات دن گریہ وزاری کرتا اور کسی تدبیر سے نہ بہلتا لیکن جہاں کوئی اچھی صورت سامنے آجاتی تو اس کے اندر خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی ۔ عمر کے ساتھ یہ جذبہ بھی ترقی کرتا گیا ۔ اُس وقت کی کیفیت ان الفاظ میں ظاہر کی گئی ہے ۔

حکایاتِ عشق اس کو اچھی لگے　　　محبت ہی کی بات میں جی لگے
دل آرزومند، ماوائے شوق　　　سرِ شورش افزائے سودائے شوق

مکتب میں لیلےٰ سے سابقہ پڑتا ہے ۔ اس جگہ لیلےٰ کا سراپا دیا گیا ہے "منقیاس الشباب" کی تشبیہ سرو کے پھل سے جدت نہ سہی لیکن نارنگیوں کو ہم چشمی کے دعوے پر جو سزا دی گئی ہے وہ لطف سے خالی نہیں ۔ کہتے ہیں ۔

کہا ہو کے نارنگیوں نے بہم　　　ہم اچھے ہیں کیا رنگ روغن میں کم
وہ دعوے سے انھیں عاقبت کھا گیا　　　گئیں جس جگہ پوست کھینچا گیا

اس کے حسن کی مجموعی طور پر جو تعریف کی ہے وہ نہایت بلیغ ہے ۔

نگا ناخنِ پا سے تا موئے سر　　　پڑے حسن پر جس جگہ پر نظر
نظر وہ دہن کی رہے ہو کے محو　　　تماشا کرے اور جا گہ کا سہو

رازِ و نیازِ عشق کا واقعہ جب لیلےٰ کی ماں تک پہنچتا ہے تو وہ قدرتی طور پر بہت برہم ہوتی ہے اور لیلےٰ کو آڑے ہاتھوں لیتی ہے ۔

جب اس زن نے اس ماجرے کو سنا　　　رکھ انگشت دانتوں تلے سر دُھنا
غضب سے لگی ڈالنے سر پہ خاک　　　دیا پھینک مقنع[1]، کیا جیب چاک

[1] دوپٹہ، اوڑھنی ۔

بلایا اُسے غصّہ و قہر سے   کہا دیکھ چشمانِ پُر زہر سے

سُنا ہے کہ مکتب میں اک نوجواں   طرحدار، خوش خلق و صاحب زباں

ترے دام زلفوں کا نخچیر ہے   گرفتار ہے پا بہ زنجیر ہے

بھلی کیا ہے اے دشمنِ جاں یہ بات   کسی سے ہوئی تھی تجھے ہاں یہ بات

ترے پڑھنے لکھنے سے باز آئے ہم   بہت بھیج مکتب میں پچتائے ہم

اس کے بعد ایک طرف لیلےٰ

ہوئی وہ ستم کش جُدا یار سے   پڑا کام اندوہِ بسیار سے

کئی دن میں تن ہو گیا زار سا   فسردہ سا، پژمردہ، بیمار سا

دوسری طرف -

فراموش کئے قیس نے سب نشاط   کسی سے نہ اس کو رہا ارتباط

یہ رو رو کے کہتا تھا اے رشکِ حُور   محبت میں کیا ایسا دیکھا قصور

مجھے کچھ بن آتا نہیں، کیا کروں   جیوں تیرے ہجروں میں یا اب مروں

یہ کہتا تھا اور مارتا ہو کے تنگ   کبھو سر پہ سنگ اور کبھو سر بہ سنگ

مجنوں کی حالتِ زار کا نقشہ (پہلا شعر سہل ممتنع کی ایک اچھی مثال ہے)

تنِ زار میں غیرِ جاں کچھ نہ تھا   سوا پوست اور استخواں کچھ نہ تھا

رگیں خشک گردن کی تھیں آشکا   نحافت میں جیسے گریباں کے تار

تن اس کا جو وہ ناز پرورد تھا   تپِ غم سے پژمردہ تھا، زرد تھا

باپ کی فہمائش -

گئی عمر سب آرزو میں تری   ہوا پیر میں جستجو میں تری

یہ جانا تھا میں نے کہ جب ہونگا پیر   تو فرزند ہوگا جواں دستگیر

سو اب تجھ کو لیلےٰ نے مجنوں کیا   زِ خود رفتہ، رسوا، مفتوں کیا

ابھی ہے مری جان تو خورد سال   نہیں ماہرُولیں کی دیکھی ہے چال

عجب طرح کے دشمنِ جاں ہیں   کہ لیتے ہیں جان اور انجان ہیں

عشق بازوں کی قسم، مجنوں کی زبان سے (آخری شعر کا دوسرا مصرعہ کس قدر بدیع ہے)

قسم اس عذارِ دل افروز کی   اور اُن کے غمِ عشق کے سوز کی

قسم اس کے محرابِ مسجد کی ہے   کہ مریم ہیں جس کے تلے مست مَے

قسم ناز کی، آنکھوں میں جو کھُپے   قسم اس ادا کی جو دل میں چھُپے

قسم چشمِ گریاں کی اپنی کہ جو   رکھے ہیں مری عشق میں آبرو

قسم اشک کی، جس کو چشمانِ تر   جو چھوڑیں تو شرمگاں کریں تاج سر

فراقِ لیلےٰ میں مجنوں کا خدا سے بے تابانہ خطاب

کہے یوں کہ اللہ کیا جور ہے   عجب طرح ہے اور عجب طور ہے

خدائی میں کیا تیرے آتا قصور   یہ مجنوں جو لیلےٰ سے ہوتا نہ دور

"درویش مجیب الدعوات" کی خدمت میں پہنچ کر مجنوں کیا دعا بیان کرتا ہے

لگا کہنے مجنوں کہ مجنوں ہوں میں   جنونِ محبت کا مفتوں ہوں میں

دلِ زار وابستۂ عشق ہے   یہ تفتہ جگر خستۂ عشق ہے

تو سر لائے اپنا سوئے سجدہ گاہ   خدا سے دعا میرے حق میں یہ چاہ

الم یار کا ایک دم کم نہ ہو   یہ جس دم نہ ہووے تو اُس دم نہ ہو

پسر ابن السلام کے ساتھ لیلےٰ اپنی مرضی کے خلاف بیاہ دی جاتی ہے - یہ سُن کر مجنوں لیلےٰ کو شکایت آمیز خط لکھتا ہے -

ترے عشق نے مجھ پہ کیا کیا کیا   گرفتار و بدنام و رُسوا کیا

زبانِ خلائق کا مطعوں ہوا   کہ تھا نام قیس، آہ مجنوں ہوا

یہ برعکس کیا ہے ستم جو ہوا   تیرا آئینہ غیر کا رو ہوا

وہ وعدے مری جان کیا ہو گئے   تیرے عہد و پیمان کیا ہو گئے

وہی تو ہے لیلےٰ وہی قیس میں   بھلا کیا ہوا پھر گئی اب جو تیں

لیکن آخر میں کہتا ہے -

مری جاں شکایت کا پایاں نہیں   ولیکن محبت میں شایاں نہیں

لیلےٰ کا جواب -

یہ باتیں کہیں جس نے تجھ سے وہاں   یہ سب کذب ہیں جان اے میری جاں

امانت ہے تیری امانت ہنوز   نہیں کی کسو نے خیانت ہنوز

رطب ہے سلامت ترے باغ کی   نہیں پہنچی منقار واں زاغ کی

مرے لب دہن تجھ کو تشکر رہیں   لبِ غیر کے حق میں اخگر رہیں

اپنی بے بسی اور بے کسی کا حال بھی کہتی ہے -

تو جنگل میں، میں گھر میں اے یار ہوں   تو آزاد ہے میں گرفتار ہوں

میں تنہا بھی رہتی ہوں غم سے خموش   کہ کہتے ہیں دیوار کے بھی ہیں گوش

پر اے عاشقِ پاک، پاکیزہ خُو   خدا نے رکھی عشق کی آبرو

خسِ طعن آتش پہ میری نہ ڈال   خدا رحم کر اور سمجھ میرا حال

لیلےٰ و مجنوں کی خط و کتابت کا ایک ٹکڑا اور اس واقعے سے متعلق ہے کہ مجنوں کی فصد لی جاتی ہے اور لیلےٰ کی انگلیوں سے خون کے فوارے جاری ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ لیلےٰ کو بدگمانی ہوتی ہے کہ صحت یاب ہو کر مجنوں کی نگاہیں اس سے پھر گئیں تو وہ کسی طرف کی نہ رہے گی۔ کتنا اچھوتا خیال ہے۔ وہ مجنوں کے نام نامۂ محبت لکھ کر کبوتر کے حوالے کرتی ہے اور دیکھئے وہ اپنے نامہ رسان کو کس طرح پرچاتی ہے اور مجنوں کی نشان دہی کرتی ہے۔

کہ سنتا ہے اے پیکِ اہلِ وفا　　تو ہُدہُد سے بلقیس کے ہے سوا
نہیں گو کہ ہدہد نمط تجھ کو تاج　　ترے سر کو میں تاجِ زر دوں گی آج
کہ میرا جو ہے وہ سلیماں شکوہ　　ہے اب تخت گہ جس کی صحرا و کوہ
غبارِ دل آیاتِ لشکر جیسے　　حزیں نالہ رایاتِ لشکر جیسے
مرا نامہ جا کر اُسے دیجیو　　جواب اس کا جو کچھ کہ دے لیجیو

حرف مطلب یوں ادا ہوتا ہے (یہ چوتھا شعر "من تو شدم تو من شدی" کی کھلی ہوئی تفسیر ہے)

یہ صحت مبارک ہو، تو نے بھلا　　کیا فصد سے خونِ فاسد جُدا
پر اس فصد سے یہ ارادہ نہ ہو　　جنونِ محبت کو دے دل سے دھو
مجھے اپنے دل سے بھلانا نہیں　　کہ اب کوئی میرا ٹھکانا نہیں
نہیں آب و گوہر کے مانند فرق　　تو ہے مجھ میں غرق اور میں تجھ میں غرق
الٰہی وہ گُل ہے جو رشکِ بہار　　اگرچہ بظاہر خزاں سے ہے خوار
رہوں گلشنِ دہر میں جب تلک　　اُسی گل کی بلبل رہوں تب تلک

مجنوں کی طرف سے جو جواب ہونا چاہئے اس کا اندازہ دشوار نہیں۔

بزم کی رنگینیاں دیکھ چکے، اب رزم کا نقشہ ملاحظہ ہو۔ نوفل مجنوں کی طرف سے لیلےٰ کے یہاں پیام بھیجتا ہے جس کو رد کر دیا جاتا ہے نوفل کی فوج کشی اور جنگ کی حالت بیان کرتے ہیں۔

دلیرانِ پیکار و مردانِ چست　　سلاح اپنے کرنے لگے سب درست
کٹی رات اس اندیشہ و فکر میں　　اسی و غدغے اور اسی ذکر میں
کہ کل دیکھئے کیا پڑے طرح جنگ　　کرے کس کے اوپر فلک عرصہ تنگ

سحر گہ کہ خورشیدِ تابانِ تیغ　　دھری سان پر چرخ کی بے دریغ
نقیبوں نے فریاد کی ایک بار　　کہ تیار ہو اے جوانانِ کار
دلیرانِ جنگ آزمایانِ چست　　صفیں باندھ ہوئے ایستادہ درست
نقیبانِ میدان پکارے دو سُو　　کہ اے شیر مردانِ پیکار جو
یہی وقت ہے ترکتازی کرو　　سرِ خونِ دشمن سے بازی کرو

اب گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔

ہوا دمبدم عرصۂ حرب تنگ　　پکڑنے لگا رنگ میدان جنگ
گئے اس طرح دونوں انبوہ مل　　کہے تو گیا کوہ سے کوہ مل
یہ آفت جو دیکھی تو خورشید کانپ　　چلا چادرِ گرد میں منہ کو ڈھانپ
ہوئے گرم کیں گرز و تیغ و کمند　　بگیر و بزن کی صدا تھی بلند
زبس تیغ پر تیغ پڑتی تھی واں　　سناں سے رگڑ کھاتی تھی سینہ سناں

مجنوں کی آخری ملاقات لیلےٰ سے وہ تھی جب وہ ایک ناقہ سوار کے ساتھ لیلےٰ کے شہر میں پہنچتا ہے اور اسے دیکھ کر لیلےٰ ارمان کرتی ہے۔

کہ گھر تک مرے تجھ سا مہمان آئے　　اور آ بیٹھنے کو بھی جاگہ نہ پائے
مجھے ننگ اس زندگانی سے ہے　　کہ خجلت تری میہمانی سے ہے

مجنوں کے لئے لیلےٰ کی ملاقات ہی ہزار مہمانی کے برابر تھی

ترے دل میں مجھ کو جگہ ہے اگر　　تو در کار کب ہے یہ ظاہر کا گھر
میں سب چیز سے سیر اے یار تھا　　مگر گرسنہ ایک دیدار تھا
سو شکرِ خدا وہ میسّر ہوا　　زیادہ ہے مہمانی اب اس سے کیا

ان حسرت نصیبوں کے حسرت ناک انجام پر کہانی ختم ہوتی ہے جس طرح عاشقوں کی فہرست میں مجنوں اور لیلےٰ کا نام اُجاگر ہے۔ اسی طرح اُن کے سیرت نگار کا یہ کارنامہ بھی حیاتِ جاوید پانے کا مستحق ہے۔ تجلّی کا یہ کمالِ فن تھا کہ ایک افسانہ آپ کی نظروں کے سامنے واقعہ بن کر آتا ہے اور لیلےٰ مجنوں اپنے حقیقی رنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔

خموش اے تجلّی آتش بہ جاں　　زمانہ ہے آتش کا تیری زباں
تجھے گلشنِ دہر میں اے حبیب　　بلا ہیچ بتا کون سا عندلیب
کہ تو بے نوا خوش نوا ہو گیا　　ہزاروں کا دستاں سرا ہو گیا

محمد اویس بزمی

چتر کار

وہ اپنے پہاڑی بنگلے کے ایک بڑے دریچے کے آگے کھڑی افق کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی اور اس کی اُداس آنکھیں ڈوبتے ہوئے سورج میں کچھ تلاش کر رہی تھیں ——— ایک ایسی دُنیا تلاش کر رہی تھیں جہاں نسیت کا بدلہ عقیدت ہو۔ مگر فضا کی پھیلتی ہوئی سیاہی میں سے شاید اس کی اُمیدوں کو کوئی روشنی دکھائی نہیں دی۔ اور اسی لئے اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے سورج کا رنگ دکھائی دینے لگا۔ کچھ دیر بعد ان رنگوں جیسے پانی کے دو بے رنگ قطرے نکل کے زمین میں جذب ہو گئے۔ وہ اس وقت چونکی جب جنگلی کبوتروں کا ایک جھنڈ پھڑپھڑاتا ہوا نکل گیا اور سامنے کی خاردار جھاڑیوں سے ٹھنڈی ہوا سرسراتی ہوئی نکلنے لگی۔ یہی ہوا جب اس کے جسم سے بھی کھیلنے لگی تو اس کی رگ رگ میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔ خون میں حرارت بڑھ گئی اور اس کا جی چاہا کہ سامنے کی دیوار سے اتنے زور سے ٹکرا جائے کہ اس کا جسم پاش پاش ہو جائے۔

- - - - - - - یہ شیلا تھی! اس کا شوہر ملک کا ایک بہت بڑا چتر کار تھا۔ بہت دھنی اور بہت خوش قسمت۔ اس کی کلا میں لوگوں کو زندگی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی جیتی جاگتی تصویروں میں لوگ اپنا دل تلاش کرتے تھے۔ اس کی مصوری میں ہر زندگی کی نبض چلتی نظر آتی تھی۔ وہ قرطاس کی بےجان تصویروں میں روح پھونکنے کی قدرت رکھتا تھا۔ سب کچھ تھا۔ مگر تصویر دیکھ اندھا دھند عشق نے اس سے آنکھیں چھین لی تھیں۔ وہ حسین سبزہ زاروں میں کھڑے ہوئے خوبصورت درختوں کو دیکھ سکتا۔ آبشاروں، پہاڑوں اور پھولوں میں سے فطری مناظر ڈھونڈ ڈھونڈ کے تصویر کے سانچوں میں ڈھال سکتا۔ لیکن اس کی آنکھیں اگر بند تھیں تو اپنی بیوی کے لئے۔ وہ قدرتی نظارے جنگلوں میں تلاش کرتا۔ مگر اس کی بیوی جو خوبصورتی اور رعنائی میں خود قدرت کا ایک کمال تھی اُسے کبھی جی بھر کے دیکھ نہ سکا ——— یا تصویروں کے باعث دیکھنے کا موقع نہ ملا ——— یہی آرزو تھی شیلا کی، کہ وہ کم از کم ایک دفعہ اُسے قریب سے دیکھ تو لے۔ پھر اس کی آنکھوں میں کون سے نیلے آبشار نظر نہیں آئیں گے۔ اُس کی زلفوں میں کون سے سیاہ بادل نظر نہیں آئیں گے۔ اس کی چال ڈھال میں کون سے آہو کا بہلے پروا خرام دکھائی نہ دے گا۔ مگر کون سمجھائے کرشن کو! اُس نے شادی کی تھی صرف اس لئے کہ لوگ شادی کیا ہی کرتے ہیں۔ بیوی ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی اُسے اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھلاتی، اور شاید اس کے سامنے بیوی کا یہی سب سے بڑا مصرف تھا۔ اس لئے کہ صبح ناشتہ کے بعد تصویروں کا سامان لے کے جھونے کے پاس بیٹھ جانا تخیلات کے دریا میں ڈوبتے اور اُبھرتے رہنا اور پھر سارا دن اِدھر اُدھر تھا کے رات کی تاریکی میں گھر واپس آنا اور پھر کھانا کھا کے سو جانا۔ آج کل یہ اس کی زندگی ہو کے رہ گئی تھی۔ صرف اس لئے کہ وہ شہرت کی معراج حاصل کرنا چاہتا تھا۔

جب سے کرشن اپنی نئی تصویر بنانے کے لئے پہاڑوں پر آیا تھا، شیلا کرشن کے برابر کے کمرے میں سوتی تھی۔ دونوں کمروں کو ایک بڑا دروازہ جدا کرتا تھا۔ شیلا ایک طرف پہاڑوں کی پُرکیف راتیں آنکھوں میں کاٹتی تھی اور دوسری طرف چتر کار کرشن یا تو خواب میں ساتویں آسمان پر ہوتا یا پھر تصویروں میں رنگ بھرتا - - - - - -

ہاں تو شیلا بڑے دریچے کے آگے کھڑی تھی۔

فضا کافی تاریک ہو گئی، جب وہ اندر جانے کے لئے مڑی، نیچے جنگل سے کسی کی بہت سریلی اور دردبھری آواز اس کے کانوں میں آنے لگی۔

"ٹوٹ گئی وہ مالا سجنی، ٹوٹ گئی وہ مالا"

شیلا کو یاد تھا کسی اچھے شاعر کا گیت ہے۔ مگر اس تاریک جنگل میں یہ راگ کس نے الاپا؟ وہ یہ جاننے کے لئے مڑی۔ اس کی نگاہیں نیچے ایک شعلے پر پڑیں۔ وہ کافی متعجب ہوئی۔ جب اُس نے دیکھا کہ اندازاً آٹھ سال کا ایک جنگلی لڑکا مشعل سے راستہ دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ کچھ دُور چل کر رُکا۔ مٹی کے ایک ڈھیر پر کوئی پھول رکھا اور اسی طرح گاتا ہوا لوٹنے لگا۔ شیلا اس بچے سے ملنے کے لئے بے چین ہو گئی۔ اس کی حرکتوں کے پیچھے ایک درد بھری کہانی تھی۔ وہ چلّا اٹھی۔

"لڑکے، لڑکے"

وہ ٹھہر گیا۔ گردن اٹھا کے اوپر دیکھنے لگا۔ شیلا پھر کہنے لگی۔

"بچے یہاں آؤ، میری بات سنو"

وہ بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر میں اوپر پہونچا۔ بجز ایک لنگوٹی کے اس جسم پر اور کچھ نہیں تھا۔ اُس کے معصوم چہرے پر دردوکرب کے آثار تھے۔ اس کے گھنے بال اُس کی گردن تک پہونچے ہوئے۔ وہ شیلا کے سامنے آکے کھڑا ہو گیا۔ شیلا کو غور سے دیکھنے لگا۔ شیلا نے دیکھا بچے کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ شیلا کچھ بھی نہ کہہ پائی تھی کہ وہ ایک چیخ کے ساتھ دوڑا اور اس سے لپٹ گیا۔

"انجلی...... انجلی" اور شیلا سے لپٹ کر رونے لگا۔

شیلا اس بچے کا مطلب کچھ بھی نہ سمجھ پائی۔ وہ اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی۔

"کیا نام ہے تمہارا بچے۔ انجلی کون ہے؟"

وہ سسکیاں لیتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"تم انجلی بہن ہو؟...... پھر تمہاری صورت انجلی سے کیوں ملتی ہے! نہیں تم ضرور انجلی ہو۔ بتاؤ تم نے پہلے جنم میں میرا ساتھ کیوں چھوڑ دیا تھا؟"

شیلا سخت حیران تھی: "میں انجلی نہیں ہوں بچے۔ میرا نام شیلا ہے تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام موتی ہے۔ انجلی میری تھی۔ وہ میرے ساتھ کھیلتی تھی۔ سوتی تھی۔ کھاتی تھی، اور کہتی تھی ہم دونوں ساتھ ہی مریں گے۔ پھر وہ پہلے کیوں مر گئی؟"

"انجلی تم سے چھوٹی تھی؟"

"ہاں"

"کیا ہوا اس کو؟"

"اس کو؟" اور وہ پھر رونے لگا۔ "مر گئی، اُسے جنگل میں سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ اُس دن سے میں کوئی سانپ زندہ نہیں چھوڑتا" شیلا کا دل درد سے بھر آیا۔ اُس نے بچے کو پہلو میں بٹھا لیا۔

"تم انجلی سے پریم کرتے تھے موتی؟"

"پریم...... میں پریم نہیں جانتا، مگر انجلی کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی تھی ——— اب مجھے کوئی خوشی نہیں ہوتی"

"تم جنگل میں اس وقت کہاں گئے تھے؟"

"جہاں انجلی کو سب نے زمین میں دبا دیا ہے۔ میں اس جگہ روز ایک لال گلاب رکھنے جاتا ہوں۔ وہ لال گلاب بہت چاہتی تھی۔ اپنے چمکیلے بالوں میں لگاتی تھی۔ اور جب میں وہاں جاتا ہوں تو اُس کا سکھایا ہوا گانا بھی گاتا ہوں۔ مگر انجلی نہیں بولتی ---- کچھ نہیں بولتی۔ وہ مر کے کہاں چلی گئی ہے دیوی جی؟ کیا میں بھی وہاں جا سکتا ہوں؟"

"نہیں موتی۔ تمہاری انجلی بہت دور چلی گئی ہے۔ تم وہاں نہیں جا سکتے"

"تو میں اب کسی کے ساتھ نہیں کھیلوں گا دیوی؟"

"کیوں نہیں؟ تم میرے ساتھ کھیل سکتے ہو۔ میرے پاس بیٹھا کرو۔ تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"وہ ایک جھونپڑی میں رہتے ہیں۔ دن بھر لکڑیاں کاٹتے ہیں اور جب میں ہر جگہ انجلی کو ڈھونڈتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ اس پہ انجلی کی پرچھائیں پڑ گئی ہے"

شیلا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے موتی کو گلے سے لگا لیا۔ پھر کہنے لگی۔

"گھبراؤ مت موتی، تمہاری انجلی تمہیں مل گئی ہے۔ میں سچ مچ انجلی ہوں۔ انجلی کا روپ میں نے بھر لیا ہے۔ تم میرے پاس برابر آتے رہنا" وہ بچے کو ڈھارس بندھا رہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"خیر تو ہے...... یہ کیسا ڈرامہ ہو رہا ہے شیلا؟ کون ہے یہ ننگ دھڑنگ بچہ؟" کرشن تصویروں کا پلندہ لئے کھڑا تھا۔ وہ گھبرا گئی۔

"یہ ایک بیکس جنگلی لڑکا ہے۔ میں نے آواز دی تھی۔ اوپر آگیا"

"نہیں شیلا، اس قسم کے جنگلی لڑکے اصل میں ننھے ڈاکو ہوتے ہیں۔ اُسے چلتا کر دو یہاں سے۔ ممکن ہے کبھی گھر کی کوئی چیز غائب ہو جائے۔"

بچہ اپنے آپ گود سے اُتر گیا۔ خاموشی سے سیڑھیوں سے اُترنے لگا۔ اور پھر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

دوسری شام معمول کے مطابق کرشن گھر سے غائب تھا اور شیلا اُداس بیٹھی ہوئی تھی کہ سامنے سے موتی آتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں سُرخ گلاب کا ایک پھول تھا۔ شیلا کی اُداس طبیعت کچھ بشاش ہوئی۔ موتی آ کے اُس کی گود میں بیٹھ گیا۔ اُس نے خاموشی سے گلاب شیلا کے بالوں میں لگا دیا اور پھر غور سے اس کی صورت تکنے لگا۔

"موتی آج تم انجلی کے مزار پر نہیں گئے؟"

"انجلی؟ —— تم نے کہا تھا انجلی کا روپ میں نے دھار لیا ہے۔"

"ہاں موتی میں بھول گئی تھی۔"

"تم بہت بڑی ہو گئی ہو انجلی — مگر تمہاری آنکھیں وہی ہیں۔ میں پہلے ہی پہچان گیا تھا۔" وہ بھولے پن سے کہنے لگا۔

"ہاں موتی"

"تمہیں یاد ہے انجلی تم نے کہا تھا کہ میں تم سے بیاہ کروں گی۔"

"یاد ہے موتی۔"

"پھر کر لو نا انجلی۔ تم چلی جاؤ گی تو میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں گا۔"

"بیاہ .... مگر میرا بیاہ تو ہو چکا ہے موتی۔ نہیں نہیں میرا بیاہ نہیں ہوا۔ کرشن مجھے اپنی بیوی نہیں سمجھتا۔" موتی یہاں چونکا۔

"وہ صاحب کون ہیں انجلی؟"

"وہ ...... وہ میرا دوست ہے موتی۔"

"تم اداس اداس رہتی ہو .... تمہیں کھانے کو نہیں دیتا کیا؟"

"دیتا ہے، سب کچھ دیتا ہے۔ کھانے کو۔ رہنے کو۔ خرچ کرنے کو، .... مگر ....."

"میں جان گیا انجلی وہ تمہیں مارتا ہے کیوں؟"

"نہیں موتی"

"ہاں انجلی۔ تم چھپاتی ہو۔ مجھے صاحب پر بہت غصہ آتا ہے۔ کسی دن میں اُسے مار ڈالوں گا۔ میں نے بہت سارے سانپ مارے ہیں۔ دیکھو میرے پاس یہ چھوٹا چاقو ہے۔"

شیلا نے دیکھا وہ چھوٹا تھا، بہت نوکیلا اور بہت تیز۔

وہ بولا "بتاؤ کہاں نشانہ ماروں؟"

شیلا ہنسی "وہ دیکھو سامنے میز پر ایک سیب رکھا ہے۔"

جملہ ختم ہونے سے پہلے اُس نے چاقو پھینکا اور آناً فاناً سیب میں پیوست ہو گیا۔ شیلا ایک نامعلوم خوف سے تلملا اُٹھی۔ اس نے کہا۔

"نہیں موتی صاحب کو نہ مارنا۔"

"اچھا انجلی" اور پھر چاقو اپنی لنگوٹی میں رکھتے ہوئے بولا "اب میں جاتا ہوں" اور لنگور کی طرح سیڑھیاں پھاندنے لگا۔ کرشن کے آنے سے پہلے وہ مکان سے صاف نکل چکا تھا۔

کرشن پہاڑوں پر صرف اس وجہ سے آیا تھا کہ وہ یہاں چند دن رہ کے ایک ایسی تصویر بنائے جس میں کشش، زندگی، روح اور تڑپ ہو۔ اس دفعہ اس کی تصویر اس وجہ سے اول نہ آئے کہ وہ فن کا بہترین نمونہ ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اُس نے تصویروں کو زبان دے دی ہے۔ وہ بولتی ہیں۔ زندگی کی داستانیں سناتی ہیں۔

مگر اس کا یہ خواب اب تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔ اس کے تخیل کی اُڑان اب تک کسی ایسے ولیش میں نہیں پہونچی تھی جہاں اُسے اپنے مطلب کا خیال مل جائے۔ یہ مہا کلاکار کچھ اور دن صبح سے شام تک میدانوں اور جنگلوں میں پھرتا رہا۔ پہاڑوں اور وادیوں میں وقت گذارا کیا۔ مگر قدرت کے بڑے عجائب گھر میں کوئی منظر اُسے نہیں جچا۔

پہاڑی لڑکیاں چاندنی رات میں آنکھ مچولی کھیلا کیں۔ ہرنوں کے جھنڈ بے پروائی سے پھرتے رہے۔ ایک گلاب دوسرے گلاب کا منہ چومتا رہا۔ مگر فن کار کی آنکھیں کچھ اور ڈھونڈتی تھیں —— کچھ اور

ہفتوں بیت گئے رنگ خشک ہونے لگے اور نمائش میں صرف دو دن رہ گئے۔ شہر میں بہت چہ میگوئیاں ہوئیں۔ لوگ سخت حیران تھے کہ اس دفعہ کرشن کی تصویر مقابلے کے لئے کیوں نہیں آئی۔ مگر جو زندگی

وہ کاغذ پر کھینچنا چاہتا تھا وہ اب تک بلندیوں میں اوجھل تھی۔

ایسی ہی پریشانی میں ایک دن وہ باہر نکلا اور معمول کے مطابق شام تک گھر نہیں لوٹا۔ شیلا کو اب کرشن سے زیادہ موتی کا انتظار رہتا تھا۔ چنانچہ وہ پھر بڑے دریچے کے آگے کھڑی تھی۔ اُس کی نگاہیں نیچے جنگل کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جہاں جھاڑیوں میں سے موتی برآمد ہوتا تھا۔ وہ بہت دیر کھڑی رہی۔ سورج غروب ہوگیا۔ اُفق پر سیاہی چھانے لگی۔ مگر موتی کا پتہ نہ تھا۔ کئی بار ہلتی ہوئی جھاڑیوں پر اُسے موتی نکلتا ہوا معلوم ہوا۔ مگر یہ اس کا وہم تھا۔ وہ اپنی انجلی کو آج کیسے بھول گیا۔ شیلا بہت دیر تک سوچتی رہی اور کمرے کے دوسری طرف جب کسی کے چلنے کی آواز آئی تو وہ چلّا اٹھی۔

"موتی تم آگئے!"

"موتی — کون موتی" کرشن نے اونگھے انداز سے پوچھا۔

"کوئی نہیں" وہ گھبرا سی گئی۔

"آخر کوئی تو ہے یہ موتی؟" کرشن مسکرا کے پوچھنے لگا۔

شیلا نے کچھ حاضر دماغی سے کام لیا "کچھ نہیں، آج کل میں نے آپ کا نام موتی رکھ چھوڑا ہے"

"اچھا تو ہم ہیں موتی" وہ کھلا جاتا تھا۔ شیلا کرشن کو غیر معمولی طور پر خوش دیکھ کے بولی۔

"آج شاید آپ کوئی حسین منظر دیکھ آئے ہیں"

"ہاں وہ منظر جو میری تصویر کی جان ہوگا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے آج میں رات رات تصویر بناؤں گا۔ کل صبح ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے"

کرشن نے اتنا کہا تھا کہ باہر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ شیلا کا دم نکلنے لگا۔ آج موتی بُرے وقت آیا۔ وہ جلدی سے یہ کہتی ہوئی آگے بڑھی "میں ابھی دیکھتی ہوں کون ہے۔ آپ اتنی دیر میں منہ ہاتھ دھو ڈالیے"

"کون ہے؟ تم دروازہ تو کھولو"

شیلا نے لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ اس کی جان میں جان آگئی۔ یہ اُس کا نوکر منجو تھا۔ جو بازار بسکٹ لینے گیا ہوا تھا۔ منجو کو گھستا دیکھ کے وہ غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے شیلا کے ساتھ جلدی جلدی چائے پی، اور یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں گھس گیا "میں اس وقت سے صبح تک تصویر بناتا رہوں گا۔ مجھے کھانے پر نہ بلانا" اور کمرہ اندر سے بند ہوگیا۔

شیلا نے خود بھی کھانا نہیں کھایا۔ وہ سخت پریشان تھی۔ موتی آج کہاں رہ گیا! اسے کیا ہوگیا ہے! کیا وہ اس سے ملے بغیر چلی جائے۔ نہیں وہ نہیں جائے گی۔ وہ موتی کی عقیدت اور محبت کی پجارن ہو چکی تھی۔ وہ بچہ کتنی محبت سے اس کے بالوں میں پھول لگایا کرتا تھا۔ کس پیار سے شیلا کو وہ "اپنی انجلی" کہا کرتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ موتی کو اس طرح چھوڑ کے چلے جانا خود غرضی اور بے وفائی ہے۔ اس کا ننھا دل پاش پاش ہو جائے ۔۔۔۔ یہی سوچتے سوچتے کچھ دیر کے لئے اس کی آنکھ لگ گئی —— اُس نے دیکھا موتی جھاڑیوں میں سے نکلا۔ آہستہ آہستہ شیلا کے پاس پہونچا۔ سُرخ گلاب کا پھول اس کے بالوں میں سے لگاتا ہوا بولا۔

"تم ہمیشہ یہیں رہو گی نا انجلی"

"نہیں موتی۔ میں کل جا رہی ہوں"

"جا رہی ہو؟" وہ گھبرا کے بولا "پھر جا رہی ہو!"

"ہاں موتی۔ مگر میں جلدی لوٹوں گی"

"جلدی آنا انجلی۔ میری بکری بہت موٹی ہوگئی ہے۔ جب تم لوٹ کے آؤ گی تو اپنے حصہ کا دودھ تمہیں پلا دوں گا" شیلا نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ معصوم مکان سے جھاڑیوں کی طرف چلا، اور جب کنجوں میں کھو گیا تو شیلا خواب میں چلّا پڑی "موتی"

"کیا بات ہے شیلا، کیوں پکارتی ہو مجھے؟" کرشن کی آواز برابر کے کمرے سے آئی۔

"کچھ نہیں" وہ گھبرا کے اُٹھ بیٹھی۔ کرشن پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ شیلا کچھ دیر بیٹھی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ خاموشی سے بڑے دریچے پر آ کے کھڑی ہوگئی۔ نیچے تاریک جنگل میں ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ جیسے کوئی مریض دم توڑ رہا ہو۔ اسی فضا میں دُور کہیں ایک بھیڑیے کی پکار دیر تک ہلکی ہلکی پہاڑوں میں گونجتی رہی، اور خوف سے پیچھے ہٹ آئی۔ پھر بستر پر گر پڑی اور تکئے میں منہ دیکے بہت دیر تک سسکیاں لیتی رہی۔

سفیدی سیاہی پر مسلّط ہوتی گئی اور آخر سورج کی خفیف کرنیں مشرق میں اُبھرنے لگیں اور شیلا کے لئے ایک کش مکش کی صبح نے ہر جگہ اُٹھے

ڈال دیے۔ وہ گھبرا کے اُٹھ بیٹھی جنگل میں پرندے صبح کا نغمہ الاپ رہے تھے، اور اندر نوکر ہدایت کے مطابق سامان باندھ رہا تھا۔ وہ کرشن کے کمرے کی طرف بڑھی دروازہ کھٹکھٹایا۔ کرشن تصویر ختم کر چکا تھا۔ اس نے تصویر پر پردہ کھینچا اور آگے بڑھ کے دروازہ کھولا۔

"بن گئی آپ کی تصویر" وہ پوچھنے لگی۔

"ہاں بالکل ویسی جیسی میں چاہتا تھا"

"دیکھ سکتی ہوں"

"نہیں"

"کیوں؟"

"نظر نہ لگ جائے" وہ کچھ رنجیدہ سی ہوئی۔ پھر پوچھنے لگی۔

"تو کیا آج ضرور چلنے کا ارادہ ہے؟"

"بالکل"

"ایک آدھ دن رُک جائیں تو کیا حرج ہے!"

"اس کے معنی یہ ہوئے کہ آج میری تصویر مقابلے پر نہ پہونچے"

شیلا سمجھ گئی، آج کا جانا ٹل نہیں سکتا۔ وہ واپس ہوئی۔ ہاتھ منھ دھو کے اُس نے کرشن کے ساتھ چائے پی اور کچھ ہی دیر میں معلوم ہوا کہ ٹیکسی آگئی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ بنگلے سے انھیں خاردار جھاڑیوں میں کود پڑے، جہاں سے موتی نکلا کرتا تھا، مگر وہ کچھ بھی نہ کر پائی۔

کچھ دیر بعد وہ کرشن کے ساتھ ٹیکسی میں تھی۔ گاڑی پہاڑی پیچ دار راستہ پر اُڑی چلی جا رہی تھی اور شیلا آنسو پیتے ہوئے موٹر کے شیشوں میں دیکھ رہی تھی کہ رات کی تاریکی میں موتی مشعل لئے انجلی کے مزار کی طرف جا رہا ہے، اور اس کے لبوں پر

"ٹوٹ گئی ــــ وہ مالا سجنی"

رقصاں ہے۔

شیلا کرشن کے ساتھ نمائش گاہ میں گئی ــــ

جب کرشن کی بنائی ہوئی تصویر سے پردہ اٹھایا گیا تو اس کی چیخ نکل آئی۔ موتی خاردار جھاڑیوں کے بیچ میں مردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی بھچی ہوئی انگلیوں میں سرخ گلاب کی ایک ٹہنی تھی اور اس کی پنڈلیوں سے ایک سیاہ ناگ لپٹا ہوا تھا۔ کاش وہ جانتی کہ کل شام کرشن کونسا منظر دیکھ کر آیا تھا۔

روش صدیقی

خواب و خیال

جمالِ دیر و حرم میں وہ دلکشی نہ رہی
اب آبروئے فریبِ نگاہ بھی نہ رہی

دلِ حزیں کو تلاشِ خلوص ہے بے سُود
اب اس دیار میں شاید یہ رسم ہی نہ رہی

ہے ایک حادثۂ غم یہ دَورِ بیداری
ہمیں تو فرصتِ خواب و خیال بھی نہ رہی

ہزار میکدۂ پرخروش، بے حاصل
نَفَس نَفَس میں اگر روحِ تشنگی نہ رہی

کہاں پہونچ کے لُٹا کاروانِ مہر و وفا
کہ دوستی سے بہت دُور دُشمنی نہ رہی

نگار خانۂ تہذیبِ نَو کے معمارو
رہے گا کیا جو محبّت کی سادگی نہ رہی

فروغِ حسنِ گماں ہی بہت ہے مجھ کو روش
چراغِ دانشِ حاضر میں روشنی نہ رہی

راجیندر ناتھ شیدا

جائسی کی پدماوت پر ایک نظر

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت مستحکم ہونے کے بعد ہندی شاعری میں بھگتی کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس جدید تحریک کے رونما ہونے کے اسباب کچھ بھی کیوں نہ ہوں، اس میں شک نہیں کہ اس کی رو میں ہندؤں اور مسلمانوں کی تہذیبوں کے دھارے ساتھ ساتھ بہتے نظر آتے ہیں۔ پرانوں کے زمانے میں اوتار واد کا جو تصور پیدا ہوا تھا اُس نے ہندؤوں کی فکری اور عملی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ ادھر تصوف نے درجہ بدرجہ ترقی کرکے مسلمانوں کی زندگی میں اپنے لئے ایک مخصوص جگہ پیدا کرلی تھی۔ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد و اختلاط نے ایک بڑا تہذیبی سنگم بنایا جس کی شہادت کے طور پر بھگتی کال کے سنت کویوں کی تخلیقات پیش کی جاسکتی ہیں۔

بھگتی تصوف اور اس قسم کی دوسری تحریکوں نے اور حیثیتوں سے قوموں کی زندگیوں پر خواہ کچھ بھی اثرات ڈالے ہوں۔ اور ان کی بنیادیں کیسے ہی شدید مغالطات پر کیوں نہ قائم ہوں۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ ایک بڑی حد تک عوام میں انسانیت کے آفاقی تصور اور رواداری کے جذبات پیدا کرنے کا ذریعہ رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں بھگتی کال کے اکثر ہندو اور مسلمان اپنے مذہبی، سیاسی، تہذیبی اور لسانی اختلافات کو پس پشت ڈال کر ایک ہی راستے پر گامزن نظر آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس دور کے شاعروں کے مابعد الطبیعیاتی نظریات میں تنوع موجود ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو اس تنوع کی تہ میں ایک یکسانیت بھی موجود ہے۔ دراصل یہ سب لوگ اپنے اپنے طریقے پر بغیر اختلاف مذہب و ملت انسانوں کی ایک ہی مقصد کی طرف رہنمائی کرتے تھے اور وہ مقصد تھا دنیا کی ہوس رانیوں اور فریبکاریوں سے بچا کر انسان کو خدا تک پہنچنے میں مدد دینا۔ طریقوں کا یہ تنوع اس بڑی تحریک کو چار حصوں (۱) عرفان (۲) عشق (۳) رام بھگتی (۴) کرشن بھگتی) میں منقسم کردیتا ہے۔ جن کے نمائندہ شاعر بالترتیب کبیر، جائسی، تلسی اور سور ہیں) ان میں ملک محمد جائسی عشق یا تصوف کے شاعر ہیں۔

جائسی کی شاعری پر نظر ڈالتے وقت اُس عہد کے اس بین تضاد کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے جس زمانے میں سلاطین اپنی سلطنتوں کی توسیع میں مصروف تھے اور اپنی ہوس کی تسکین کے لئے لوگوں کے مذہبی جذبات سے کھیل کر فتنہ و فساد کی آگ روشن کرتے تھے۔ درباروں کے متوسلین اپنے چھوٹے چھوٹے مقاصد اور ذاتی اغراض کے لئے جوڑ توڑ میں لگے رہتے تھے۔ اسی زمانے میں کچھ فقر دوست شاعر عوام کو عشق کی عظمت کا احساس کرا رہے تھے۔ اس کوشش کو آپ چاہیں تو جہد حیات سے فرار کہہ لیں۔ قوم اور فرقوں پر اس کے مجموعی اثرات کے متعلق آپ کی رائے کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کی آفاقیت سے انکار کسی طرح ممکن نہیں۔

جائسی کی تین تصنیفات "پدماوت"، "اکھراوٹ" اور "آخری کلام" میں پدماوت ہی سب سے اہم ہے۔ سچ پوچھئے تو وہ اس نظم کی وجہ سے ہندی شاعری کی تاریخ میں زندۂ جاوید ہو گئے ہیں۔ نظم ایک عشقیہ قصے پر مشتمل ہے۔ اس عشق میں مجاز اور حقیقت دونوں پہلو موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ تصوف میں مجاز اور حقیقت ایک ہی مقصد کے ذرائع بن کر لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جائسی کی نظم میں بھی دونوں کا خوشگوار امتزاج موجود ہے۔ ہندی میں ایسی نظمیں جائسی سے پہلے کی بھی ملی ہیں۔ جیسے قطبن کی "مرگاوتی" اور منجھن کی "مدھومالتی" اور بعد کی بھی مثلاً عثمان کی "چتراوتی" اور نور محمد کی "اندراوتی" وغیرہ۔ مگر فنی اعتبار سے جو مرتبہ پدماوت کو حاصل ہے وہ کسی دوسری نظم کو حاصل نہ ہوسکا۔

یہ نظم مشرقی ہندی کی شاخ "اودھی" میں لکھی گئی ہے۔ برہندیں

سات چوپائیوں کے بعد ایک دوہا آتا ہے۔ شاعر، جیسا کہ مثنوی کا دستور تھا، حمد و نعت اور خلفائے راشدین کی منقبت کے بعد شیر شاہ کی مدح کرتا ہے اور پھر اپنے مرشدوں کا سلسلہ بیان کرکے سالِ تصنیف کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

سن نو سو سنتالیس اہا   کتھا آرمبھ بین کو ہی کہا

اس چوپائی کا سیدھا مطلب یہ ہوگا کہ تصنیف کا آغاز ۹۴۷ھ میں ہوا لیکن شیر شاہ کی تخت نشینی ۹۴۷ھ ہجری مطابق ۱۵۴۰ء میں عمل میں آئی۔ اس سے ہندی کے مشہور محقق اور نقاد پنڈت رام چندر شکل نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ممکن ہے جائسی نے یہ نظم شیر شاہ کے عہد میں مکمل کرکے تبھی مدح کے شعر کہے ہوں۔ بہر حال یہ سولہویں صدی عیسوی کے نصف اوّل کی تصنیف یقیناً ہے۔ یہاں تک پدماوت پر اسلامی تہذیب اور شعری روایات کی مہریں ثبت ہیں۔ لیکن آئندہ نظم کی پوری فضا پر ہندویت مسلّط ہے۔ علاء الدین کو چھوڑ کر جسے خود جائسی نے مایا کہا ہے، باقی سب کردار ہندو ہیں۔ ناتھ پنتھ اور ہٹ یوگ سے افسانے کے ارتقا میں براہِ راست مدد لی گئی ہے اور یوں بھی ہندوؤں کے صحائف اور تاریخی روایات سے متعدد تلمیحیں آئی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جائسی کو ہندوؤں کی مذہبی روایات اور عام تہذیبی امور کا اچھا علم حاصل تھا۔ پھر بحور، صنائع اور اسالیب بھی ہندی ہی کے قواعد اور روایات پر ہیں۔

نظم کا تقریباً پہلا دو تہائی حصہ تخیلی ہے، اور باقی کی بنیاد تاریخِ ہند کے ایک مشہور واقعہ پر۔ قصّے کا خلاصہ یہ ہے کہ فسانۂ عجائب کے جانِ عالم کی طرح چتوڑ کے راجہ رتن سین کے دل میں (جو نظم کا ہیرو ہے) ایک طوطا سنگل دیپ کی شہزادی پدماوتی کا حسن بیان کرکے محبت کی تخم کاری کرتا ہے۔ راجہ اپنی پہلی رانی ناگ متی کو چھوڑ کر فقیرانہ لباس میں سنگل دیپ کا راستہ لیتا ہے اور وہاں پہنچ کر شیو مندر میں ریاضت میں مصروف ہو جاتا ہے۔ طوطا جا کر پدماوتی کو رتن سین کے عاشق ہو کر آنے کی خبر دیتا ہے۔ وہ بسنت کے روز شیو مندر میں آتی ہے لیکن پدماوتی کے دیدار سے رتن سین کو غش آ جاتا ہے۔ آخر وہ شیو جی کی مدد سے پدماوتی سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اور اسے لے کر چتوڑ واپس آتا ہے۔ اتنا قصّہ تو تخیلی ہے، اس کے بعد کا تاریخی۔ اگرچہ اس میں بھی شاعر کے تخیل کو جا بجا دخل ہے۔

ایک دن رتن سین اپنے دربار کے راگھو چیتن نامی ایک برہمن سے ناخوش ہو کر جلا وطنی کا حکم صادر کرتا ہے۔ یہ برہمن انتقام اور طمع کے جوش میں دلّی کے سلطان علاء الدین خلجی کو پدماوتی کے حصول کی تحریص دلاتا ہے۔ اس پر علاء الدین اور رتن سین کے درمیان جنگ ہوتی ہے مگر فیصلہ کچھ نہیں ہوتا۔ آخر علاء الدین صلح کی پیش کش کرتا ہے اور دھوکے سے رتن سین کو گرفتار کر کے دلّی لے جاتا ہے۔ اس پر راجپوت بھی چالاکی سے رتن سین کو رہا کرا لاتے ہیں۔ چتوڑ پہنچ کر رتن سین کو اپنے ایک قدیم دشمن کبھلنیر کے راجہ دیو پال سے جس نے پدماوتی پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی لڑنا پڑتا ہے۔ اس لڑائی میں رتن سین اور دیو پال دونوں کام آ جاتے ہیں۔ رتن سین کی رانیاں ناگ متی اور پدماوتی جوہر کر کے ستی ہو جاتی ہیں۔ اُدھر علاء الدین چتوڑ فتح کر لیتا ہے۔ مگر اسے پدماوتی کی جگہ ملتی ہے محض اس کی خاکستر!

چھار اٹھائی لینہہ اک موٹھی   دینہہ اڑائی پرتھوی جھوٹی

(اس نے ایک مشت خاکستر اٹھائی اور اس بے مایہ (خاکستر) کو ہوا میں اڑا دیا)

اس فتح میں شکست کا کتنا شدید احساس موجود ہے۔

اگرچہ پدماوت، بظاہر عشقِ مجازی کے ایک نیم تاریخی قصّے پر مشتمل ہے۔ لیکن شاعر کی نظروں سے عشقِ حقیقی کا پہلو بھی اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ وقتاً فوقتاً اس کی طرف اشارہ کرتا چلتا ہے، اور آخری میں تو ایک قلم کی جنبش دے کر پورے افسانے کو تمثیلی رنگ میں ڈبونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی چوپائیاں ہیں۔

تن چتور، من راجا کینہا   ہیہا سنگھل، بدھی پدمنی چینہا
گرو سوا جیہی پنتھہ دکھاوا   بن گرو جگت کو نرگن پاوا
ناگ متی یہ دنیا دھندھا   بانچا سوئی نہ ایسی چت بندھا
راگھو دوت، سوئی سیطانو   مایا علاؤ دین سلطانو

(جسم چتوڑ ہے، من راجہ رتن سین۔ دل سنگل دیپ اور پدماوتی عرفان۔ توتا مرشد ہے۔ کیونکہ بغیر مرشد کے کون خدا کو پا سکتا ہے۔ ناگ متی دنیا اور اس کے کاروبار ہیں۔ جس نے اس سے دل لگایا وہ بچ نہ سکا۔ راگھو چیتن شیطان ہے۔ اور سلطان علاء الدین ماسوا اللہ)

ان اشارات کی روشنی میں مطالعہ کرنے سے نظم کی پوری فضا ماورائی اور فوق الفطری بن جاتی ہے اور پڑھنے والے کو اس کے اکثر مقامات کا غیر فطری ہونا نہیں کھٹکتا۔ کیونکہ روح اور روحانی تجربات کا ہر معتقد عالم فطرت سے بلند ہوتا ہے۔ اور اس کی نظر میں ہر وہ بات ممکن ہو جاتی ہے جو دوسروں کے لئے غیر ممکن ہو۔

پلاٹ بہت کچھ مثنویوں کے انداز کا ہے۔ اور حسب دستور ہیرو کی پیدائش سے موت تک کے سارے واقعات نظم کئے گئے ہیں۔ مگر ان واقعات کا انتخاب سلیقے سے ہوا ہے۔ سارے واقعات کا مرکزی افسانے سے براہ راست تعلق ہے۔ اور راگھو چیتن اور دیوپال وغیرہ کے ضمنی قصے پلاٹ کے ارتقا میں مدد دیتے ہیں۔ اگر انھیں حذف کر دیا جائے تو نظم کی دلچسپی میں بھی کمی ہو جانے کا اندیشہ ہے اور اس میں فنی اسقام پیدا ہونے کا بھی۔ جائسی کو پلاٹ بنانے کا فن خوب آتا ہے۔ پدماوت کا سارا پلاٹ گٹھا ہوا اور غیر ضروری تفصیلات سے بالکل پاک ہے۔ ہاں کہیں کہیں وہ پھولوں، چڑیوں اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے نام ضرور گنانے لگتے ہیں۔ لیکن یہ پدماوت ہی کی خصوصیت نہیں ہے۔ اُس زمانے کے نظم و نثر کے تقریباً سارے افسانوں میں اس قسم کی تفصیلات موجود ہیں۔ کیونکہ اس سے اُن چیزوں کے وسیع علم کا اظہار مقصود ہوتا تھا۔

جائسی افسانے کے ایسے موقعوں سے بخوبی واقف تھے جہاں تفصیلات مخصوص تاثرات پیدا کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ مثلاً شادی کے بعد رتن سین اور پدماوتی نے ایک سال سنگلدیپ ہی میں گزارا۔ اس سے جائسی نے بڑا فائدہ اُٹھایا۔ ایک طرف تو وہ ہندوستانی روایات کے مطابق چھ موسموں کے بیان (شٹ رتو ورنن) میں شادی کے پہلے سال کی گوناگوں دلچسپیاں بیان کر گئے اور دوسری طرف بارہ ماسہ میں ناگ متی کے عالم فراق کی عکاسی کر سکے۔ یہ بارہ ماسہ تاثیر اور ہندوستانی جذبات کی ترجمانی کے لئے پورے ہندی ادب میں آپ اپنی نظیر ہے۔ اس کے علاوہ جائسی نے منظر نگاری کے لئے بھی کہانی سے عموماً اچھے مواقع انتخاب کئے ہیں۔ مثلاً سنگلدیپ میں پنگھٹ، تالاب کے کنارے دوشیزاؤں کی چہل اور پھر دولہا سے چھیڑ چھاڑ۔ یہ چیزیں ہندوستانی زندگی کے دلکش نقوش کو بڑی خوبصورتی سے اُبھارتی ہیں۔

قدیم افسانوں میں کردار نگاری سے زیادہ توجہ پلاٹ پر صرف کی جاتی تھی۔ اُن قصوں کے اکثر کردار قدرت کے ہاتھوں میں کھلونے محسوس ہوتے ہیں۔ جائسی کے کرداروں کو بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ پھر بھی شاعر کا تخیل کچھ کرداروں کو زندگی عطا کر سکا ہے۔

جائسی نے اپنے ہیرو رتن سین کو جیسا کہ اس زمانے کا عام دستور تھا مثالی عشق سے متصف کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ راہ محبت میں رتن سین ہمیشہ ثابت قدم رہتا ہے۔ محبوبہ کے لئے راج پاٹ چھوڑ کر سفر کی بے شمار صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ پھانسی کے تختہ پر چڑھنا قبول کر لیتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے عشق پر غرور نہیں کرتا۔ بلکہ انکسار اور جرأت سے کام لیتا ہے۔ یہ عشق عین فطری ہے۔ مگر اسے روحانیات سے منسلک ہونے کی وجہ سے ایک حد تک حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے۔ رتن سین میں ہمارے لئے کچھ نہ کچھ دل کشی ہے ہی۔

پدماوتی اور ناگ متی کے کرداروں میں مؤخر الذکر کا کردار زیادہ اُبھر آیا ہے۔ اگرچہ قدیم ادب سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر مصنف کا مقصد یہ نہیں ہوتا۔ جائسی نے پدماوتی کا حسن بیان کرنے میں اپنے تخیل اور فکر کی پوری پرواز دکھائی ہے۔ اُسے اپنی سوت کے مقابلہ میں زیادہ فراخ دل بنانے کی کوشش کی ہے۔

پی سو کہو سندیسڑا ہے بھونرا ہے کاگ ۔ سے دھن برہے جر مرئی میتہک دھواں ہم لاگ
(اے بھونرے! اے کوّے! پیارے سے میرا پیغام کہنا کہ وہ عورت (ناگ متی) آتشِ جدائی میں جل مری اور اسی کی آگ کے دھوئیں سے ہم سیاہ ہو گئے ہیں)

راگھو چیتن سنسکرت میں وشاکھ دت کے مشہور ڈرامے "مدرا راکشش" کے چانکیہ کی یاد تازہ کراتا ہے۔ اور ہندوستان کی تاریخ میں ایک خاص قسم کے لوگوں کے رول کو بے نقاب کرتا ہے۔

بحیثیت مجموعی پدماوت ہندی کی بہترین طویل نظموں میں ہے۔ ملک میں اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حسین غزنوی نے اسے فارسی نظم، رائے گوبند منشی نے فارسی نثر اور میر ضیاء الدین عبرت اور غلام علی عشرت نے اردو نظم میں منتقل کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی زبانوں مثلاً بنگلہ میں اس کے تراجم ملتے ہیں۔ خود جائسی کی اصل نظم اردو رسم الخط میں ملی تھی۔ جسے ناگری پرچارنی سبھا نے ہندی لپی میں شائع کیا ہے۔

تلوک چند محرومؔ

غزل

اس کا گلہ نہیں کہ دُعا بے اثر گئی
اِک آہ کی تھی، وُہ بھی کہیں جا کے مر گئی

اے ہم نفس نہ پُوچھ جوانی کا ماجرا
مَوجِ نسیم تھی، اِدھر آئی، اُدھر گئی

دامِ غمِ حیات میں اُلجھا گئی اُمید
ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ احسان کر گئی

اس زندگی سے ہم کو نہ دُنیا ملی نہ دین
تقدیر کا مشاہدہ کرتے گزر گئی

انجامِ فصلِ گُل پہ نظر تھی، وگرنہ کیوں
گلشن سے آہ بھر کے نسیمِ سحر گئی

بس اِتنا ہوش تھا مجھے روزِ وداعِ دوست
ویرانہ تھا نظر میں جہاں تک نظر گئی

ہر مَوجِ آبِ سندھ ہوئی وقفِ پیچ و تاب
محرومؔ جب وطن میں ہماری خبر گئی

یگانہ چنگیزی لکھنوی

یگانہ آرٹ

ہر گام پہ تازہ گُل کھلاتے چلئے
ہر روز کوئی فتنہ اُٹھاتے چلئے
فطرت کے ساتھ ساتھ چلنا ہے اگر
ہر وقت بگاڑتے بناتے چلئے!

کیوں ساری خدائی میں اب اندھیر نہ ہو؟
ایمان پلٹتے بھی کوئی دیر نہ ہو؟
جاتی رہی بھوک پیاس جلوہ ایسا!
دیکھے تو کبھی چشمِ ہوس سیر نہ ہو!

پستی سے بلندی پہ جو چڑھتا جائے
ہر خطرہ پہ لاحول ہی پڑھتا جائے
ایسے کو سہارا نہ ملے، کیا معنی؟
گرتا پڑتا جو آگے بڑھتا جائے

دُوبھر ہو سماج پر حکومت پہ کھلے
جس کا دھندا کبھی چلائے نہ چلے
راس آئے نہ مذہب نہ سیاست ہی پھلے
بیچارہ غریب شاعری لاد نہ لے!

شمشاد احمد

گلیری جی

بہت دن ہوئے انگریزی کہانیوں کے ایک مجموعے میں جب 'تحفۂ مجوسی'[1] مجھے او ہنری سے متعارف کرایا تو مجھے یاد ہے کہ اس افسانہ نگار کی اور تصنیفات ان کے لئے بھی میں تڑپ اُٹھا تھا۔ والہانہ اشتیاق کی بالکل ایسی ہی کیفیات ت چندردھر شرما گلیری کا مشہور افسانہ 'اُس نے کہا تھا' پڑھ کر میرے پر طاری ہو گئی تھیں۔ سوچا کہ اس ہندوستانی موپاساں کے افسانوں سے سے بے بہرہ رہ کر میں نے کتنی بڑی بھول کی ہے۔ انتہائی سرگرمی سے اُن کی تصانیف کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن اپنی تشنگیٔ شوق کو میں جس سے سیراب کرنا چاہتا تھا اُس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اس کے عوض ڈکہانیوں صورت میں دو قطرے پانی ملا جس سے پیاس بجھنا تو درکنار وہ تیز تر ہو — وہ پیاس جس کی شدّت کا احساس مجھ سے کہیں زیادہ ہندی ادب ہے اور جو اب تک اس بات پر کفِ افسوس مل رہا ہے کہ اس پایۂ ناز لیکھک نوں گر قلم صرف تین ہی افسانے لکھ کر رُک گیا۔ دراصل 'اُس نے کہا تھا' ری جی کا چلایا ہوا وہ تیرِ نیم کش ہے جس کی خلش ہندی نثر کے دل و دماغ ہ محسوس کرتے رہیں گے۔

پنڈت چندردھر شرما گلیری کے والد پنڈت شو رام شاستری سنسکرت ایک بڑے عالم تھے۔ علم و فضل کے گہرے ماحول میں گلیری جی نے ۱۸۸۳ء جے پور میں جنم لیا۔ بچپن میں ہندی اور سنسکرت کی تعلیم گلیری جی نے نے والد سے حاصل کی۔ ۱۸۹۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے انٹرنس کے ان میں اوّل آکر اُنھوں نے اپنی قابلیت کا سکّہ جما دیا۔ اس کے بعد ی گلیری جی نے ہندی زبان کی خدمت شروع کر دی۔ ۱۹۰۰ء میں جے پور جین ودیہ جی کی مدد سے اُنھوں نے ناگری بھون قائم کیا اور کئی برس جے پور کا ہندی پرچہ 'سماوچک'، انھیں کی ادارت میں شائع ہوتا ۔ ان مشغلوں کے باوجود ۱۹۰۴ء کے الہ آباد یونیورسٹی کے بی، اے کے امتحان میں گلیری جی پھر اوّل رہے۔ اور اسی سال وہ کھیتڑی کے راجہ جے سنگھ کے معلم اور اتالیق بنا کر میو کالج اجمیر بھیج دئے گئے۔ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۷ء تک کا زمانہ گلیری جی نے وسیع مطالعے اور ادبی خدمات میں صرف کیا۔ ۱۹۲۰ء میں پنڈت مدن موہن مالویہ نے ان کو مہندر چندر نندی اسکالر اور پرنسپل کالج آف اورینٹل لرننگ اینڈ تھیالوجی بنا کر ہندو یونیورسٹی میں بنارس بلا لیا۔ اور اُس کے تھوڑے زمانے کے بعد ہی ۱۱ ستمبر ۱۹۲۲ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

گلیری جی کو ہندی اور سنسکرت میں تو یدِ طولیٰ حاصل تھا ہی لیکن وہ لیٹن، فرینچ، اور جرمن سے بھی واقف تھے اور بنگلہ، مراٹھی، پالی، پراکرت اور ویدک سنسکرت پر بھی پورا عبور رکھتے تھے۔ ہندی زبان کی ترقی تو اُن کا خاص شغل تھا۔ وہ کئی سال تک ناگری پرچارنی سبھا کے صدر رہے اور کافی مدّت تک اُنھوں نے سبھا کے پرچے "لیکھ مالا" کی ادارت بھی کی۔ ان کے گراں بہا مقالات ہندی کے اور بہت سے جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے۔

لیکن گلیری جی کی شہرت اور ہر دل عزیزی اُن کے شاہکار افسانے 'اُس نے کہا تھا' کی بدولت ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے لکھے ہوئے دو اور افسانے دستیاب ہوئے ہیں۔ 'سکھ مے جیون' اور 'بدھو کا کانٹا'۔ 'اور گلیری جی کی امر کہانیاں' کے نام سے شائع کی ہوئی اُن کے صاحبزادے شکتی دھر گلیری کی چھوٹی سی کتاب میں یہ تینوں افسانے ایک جگہ مل سکتے ہیں۔

---

[1] Magi, 'Gift of the Magi'' کے تلفظ کے بارے میں اختلاف ہے۔ یہاں پر O. E. D. کا دیا ہوا تلفظ اختیار کیا گیا ہے۔

'سکھمے جیون' ۱۹۱۱ء میں 'بھارت متر' میں شائع ہوا تھا اور اکتوبر ۱۹۱۵ء میں 'سرسوتی' میں 'اُس نے کہا تھا' شائع ہُوا۔ یہ تحقیق سے نہیں کہا جا سکتا کہ 'بدھو کا کانٹا' کب اور کس پرچے میں چھپا۔ لیکن شکتی دھر جی کا خیال کہ یہ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۵ء کے بیچ میں شائع ہوا ہوگا بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ دراصل 'بدھو کا کانٹا' 'سکھمے جیون' اور 'اُس نے کہا تھا' کی درمیانی کڑی ہے۔

'سکھمے جیون' میں نقشِ اوّل ہونے کے سبب سے نفسیاتی تجزیہ اور عکاسیٔ کردار کی وہ پختگی نہیں جو 'اُس نے کہا تھا' کی نمایاں خوبی ہے۔ لیکن اسلوبِ بیان کی شگفتگی، لوچ، سلاست اور ستھراپن تینوں کہانیوں میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ 'اُس نے کہا تھا' کی تمہید اس لطافتِ بیان کی عمدہ مثال ہے۔ امرت سر کے یکہ تانگہ والوں کی بولی کو جس دلآویز پیرائے میں اُنھوں نے سراہا ہے وہ پڑھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ یہاں بھی اس بات کو سوچ کر تکلیف ہوتی ہے کہ ایسے دلکش خیالات کو کہانیوں کی مختصر تمہید کا روپ دینے کے عوض پنڈت جی نے اُن کو اس قسم کے ہلکے پھلکے چھوٹے سے مقالے کا جامہ کیوں نہ پہنایا جس کے اعلیٰ نمونے انگریزی ادب میں رابرٹ لینڈ، میکس بیر بام، جی، کے چسٹرٹن اور الفا آف دی پلاؤ (اے، جی گارڈنر) نے پیش کئے ہیں۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ کہ گلیری جی نے اگر ایسے مقالات کے لئے قلم اُٹھایا ہوتا تو ہندی نثر کی اس صنف کو وہ ترقی دے کر حدِ کمال تک پہنچا دیتے۔

عصرِ حاضر کے ادب نے لوگوں کو 'یتھارتھ واد' (حقیقت نگاری) سے اس قدر روشناس کر دیا ہے کہ اُس کے لئے اب کوئی خاص جذبۂ تجسس پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن آج سے تقریباً ۴۵ سال قبل جب گلیری جی نے یہ کہانیاں لکھی تھیں تو اُن کے باریک مشاہدے اور اصلیت سے بعینہٖ مطابقت رکھنے والی تفصیلات پر کون انگشت بدنداں ہوئے بغیر رہ سکا ہوگا۔ 'بدھو کا کانٹا' میں ایک مسلمان ٹٹو والے کی داستان اسی کی زبانی تقریباً چار صفحوں میں بیان کی ہے لیکن کیا مجال کہ کہیں ایک لفظ بھی غیر موزوں یا بے جوڑ آ گیا ہو۔ خواہ امرت سر کے تانگہ والوں کی بول چال ہو یا راجپوتانہ کی دیہاتی عورتوں کی ٹھٹھول بازی یا جرمن فرنٹ پر لڑنے والے بہادر سکھ سپاہیوں کا مکالمہ، گلیری جی سے کہیں لغزش نہیں ہوئی ہے۔ ان کی کہانیوں میں اُردو انگریزی اور پنجابی الفاظ کا استعمال موقع اور محل کا لحاظ رکھتے ہوئے اکثر جگہ کیا گیا ہے۔ وہ ہندی کے کتنے ہی دل دادہ کیوں نہ ہوں لیکن خوب واقف تھے کہ عوام کی بات چیت کتابی ہندی میں نہیں ہوتی۔

یہ ظاہر ہے کہ باریک بینی اور ہندوستانی زبانوں پر کامل عبور حاصل کئے بغیر گلیری جی حقیقت نگاری کا اتنا اونچا معیار قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اور پھر اعلیٰ قوتِ تخیل سے اس میں اُن کو اور بھی مدد ملی۔ اس کا کمال 'اُس نے کہا تھا' کے اس واقعے میں دیکھئے جہاں اُنھوں نے بیان کیا ہے کہ ایک جرمن لپٹن صاحب کی وردی پہن کر ہندوستانی فوج میں آ گیا۔ اور یہ کوشش کرنے لگا کہ سکھ سپاہیوں سے اُن کی خندق چھنوا دے جمعدار لہنا سنگھ یہ بات تاڑ گیا اور اپنی رائفل کے کندے سے ضرب پہنچا کر نقلی لپٹن صاحب کو گرا دیا۔ گرتے وقت اس افسر کے منہ سے بے ساختہ "اَنکھ مین گاٹ" نکلا۔ اگر کوئی کم چابکدست فن کار ہوتا تو ان الفاظ کے عوض وہ شاید 'آہ مائی گاڈ' ہی پر قناعت کر لیتا لیکن گلیری جی کے سے منجھے ہوئے ادیب سے یہ چوک ممکن نہ تھی۔ افسوس ہے کہ 'اُس نے کہا تھا' کے کچھ ناشرین اس باریکی کو سمجھنے سے قاصر رہ کر اس غلطی میں مبتلا نظر آتے ہیں اور اُن کی شائع کردہ کہانی میں 'آہ مائی گاڈ' ہی لکھتے ہیں۔

گلیری جی کی کہانیوں کی جاذبیت، ہردل عزیزی اور مقبول عام ہونے کا بڑا سبب اُن کے پلاٹ کی ندرت اور انوکھا پن بھی ہے۔ اُن کا پڑھنے والا آخر میں پہونچ کر (بقول ورڈسورتھ) ہلکے سے استعجاب[1]، کا ایسا خوش گوار جھکولا محسوس کرتا ہے کہ کہانی اس کے دل میں اترے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مختصر افسانہ میں پلاٹ کی ایک اہم حیثیت ضرور ہے لیکن یہ اہمیت افسانہ نویس کے زاویۂ نگاہ کے ساتھ ساتھ گھٹتی یا بڑھتی رہتی ہے۔ سماج کی نکتہ چینی معاشرے پر طنز، اخلاقی تعلیم، توہمات اور ڈھکوسلوں کی پردہ کشائی، سیاسی و اقتصادی کشمکش، نفسیاتی تحلیل، جنسی اُلجھن، جذباتی ترجمانی ——غرضکہ زندگی کا ہر پہلو مختصر افسانے کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے جیسی چاہئیں اپنی کہانیوں میں نفسیاتی تجزیے پر اس قدر زور دیتا ہے کہ اُس کے وہاں پلاٹ تقریباً مفقود ہے۔ موجودہ ترقی پسند افسانہ نگار اُسی کی تقلید کرتے

---

[1] Gentle shock of mild surprise

نظر آتے ہیں۔ اس کے برخلاف اوپندر ناتھ اشک اپنا سارا کمال پلاٹ کی تعمیر ہی میں صرف کر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں گلیری جی کا نظریہ انھیں کے ایک جملے سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے۔ 'بدھو کا کانٹا' کے شروع ہی میں اس فقرے پر کہ ہندی جیسے بولی جاتی ہے بالکل ویسے ہی لکھی جاتی ہے اور جیسے لکھی جاتی ہے بالکل ویسے ہی بولی جاتی ہے چند چھینٹے ڈال کر آپ فرماتے ہیں :-

" ابھی جانے بھی دو، بڑے بڑے بہہ گئے اور گدھا پوچھے کتنا پانی ! کہانی کہنے چلے ہو یا دل کے پھپھولے پھوڑنے ؟ "

دورِ حاضر کے زیادہ تر افسانہ نویس دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں لیکن گلیری جی نے تو کہانیاں کہی اور خوب کہی ہیں۔

گلیری جی کا کوئی افسانہ لے لیجیے اس میں آپ کو پلاٹ کا بھی اچھوتا پن ملے گا۔ 'بدھو کا کانٹا'، رگھوناتھ نامی الہ آباد یونی ورسٹی کے ایک جوان ودیارتھی کی کہانی ہے جس کو طالب علمی کے زمانے میں عملی زندگی کا بالکل بھی تجربہ نہ ہونے کے سبب بھاگونتی کی سی چنچل اور شریر دیہاتی لڑکی کے ہاتھوں خوب اُلّو بننا پڑا۔ رگھوناتھ اپنی شادی کے سلسلے میں گاؤں گیا تھا۔ کنوئیں میں لوٹا ڈال کر پانی نہ نکال سکنے کے سبب سے پنگھٹ کی عورتوں نے اور خصوصاً بھاگونتی نے اُس پر خوب جملے کسے۔

" مامی مامی مجھے بھی اپنے نئے پالتو کے بیاہ میں لے چلنا بیاہتا بننے چلا ہے ..... واہ جی واہ، ایسے بدھو کے آگے بھی کوئی لہنگا پسارے گی؟ "

گاؤں کے دورانِ قیام میں بھاگونتی نے اپنی شوخی، معصوم حسن اور "چھلکتی ہوئی آنکھوں" سے رگھوناتھ کا دل موہ لیا۔ رگھوناتھ کی شادی کی دو تین جگہ بات ہوئی لیکن کہیں گرہ ٹھیک نہ بیٹھتی اور بیٹھتی بھی کیسے۔ قسمت میں تو اس کا بیاہ بھاگونتی سے لکھا تھا۔

دُلھن رخصت ہو کر اپنی سسرال آ گئی۔ اب رگھوناتھ کی باری تھی۔

" ہاں پھر تو کہنا، اس بدھو کے آگے کون لہنگا پسارے گی ؟ "

" کیوں اب مینی کی سی جیبھ کہاں گئی ؟ "

" کہو جی اب پنگھٹ والوں کو عقل سکھانے آئی ہو؟ "

شرم و حیا سے گڑی ہوئی بھاگونتی نئے دُلھناپے سے فائدہ اُٹھا کر رگھوناتھ سے کتراتی رہی۔ لیکن ایک دن رگھوناتھ کا پریم دریا پھوٹ پڑا۔

" میں تو اناڑی ہوں۔ مجھے تو تو تکلف کرنا نہیں آتا، صاف صاف کہنا جانتا ہوں، سنو......

اُس سمے[1] میں جنگلی تھا، وحشی تھا، ادھورا تھا۔ منش[2] جب تک استری کی پرچھائیں نہیں پا لیتا ہے تب تک پورا نہیں ہوتا میرے بدھو پن کو شما کرو۔ میرے ہردے[5] میں تمہارے پریم کا ایک بھینکر کانٹا گڑ گیا ہے۔ جس دن تمہیں پہلے پہل دیکھا تھا اُس دن سے وہ گڑ رہا ہے اور اب تک گڑا جا رہا ہے۔ تمہاری پریم کی درشٹی[6] سے میرا یہ شول[7] ہٹے گا۔ "

" ...... رگھوناتھ نے ایک ہاتھ اُس کی کمر میں ڈال کر اُسے اپنی اور کھینچنا چاہا۔ معلوم پڑا کہ ندی کے کنارے کا قلعہ نیو کے گل جانے سے دھیرے دھیرے دھس رہا ہے۔ بھاگونتی کا بلوان شریر نِڈھال[9] ہو کر رگھوناتھ کے کندھے پر جھک گیا۔ کندھا آنسوؤں سے گیلا ہو گیا

" میرا قصور — میرا گنوارپن — میں اُجڈ — میرا اپرادھ میرا اپرادھ — میرا پاپ — میں نے کیا کہہ ڈالا — گھگھی بندھ چلی۔

" اُس کا مُنہ بند کرنے کا ایک ہی اُپائے[10] تھا۔ رگھوناتھ نے وہی کیا۔ "

اور اس طرح سے بدھو کا کانٹا نکل گیا — ویسے ہی جیسے کہ ایک ایرانی عاشق کے درد کا درماں اس رُباعی میں ہوا ہے۔

دستم بگرفت و حلقہ در گوشم کرد	دلشب صنمے ز غمزہ مدہوشم کرد
لب بر لبِ من نہاد و خاموشم کرد	فریاد بر آوردم و آرے آرے

کہاں ایک ہندوستانی پنڈت اور کہاں ایک فارسی شاعر۔ لیکن خیالات کا تصادم تو دیکھئے ! اللہ اللہ !

اور اُس نے کہا تھا' کا پلاٹ وضع کرنے میں تو گلیری جی نے اپنی تمام صناعی صرف کر دی ہے۔ امرت سر کے چوک کی ایک دوکان پر ایک سکھ لڑکا اور

---

۱ وقت ۲ آدمی ۳ عورت ۴ معاف ۵ دل ۶ نظر ۷ تیز نکیلا آلہ۔ وہ تکلیف جو ایسے آلے کے چبھنے سے ہوتی ہے۔ ۸ بنیاد۔ ۹ نڈھال ۱۰ تدبیر

لڑکی اتفاقاً آن ملے۔ لڑکا جب کبھی اُس لڑکی سے ملتا اُس کو یہ پوچھ کر چھیڑا کرتا "تیری کڑمائی ہو گئی؟" اور لڑکی شرمیلے انداز میں 'دھت' کہہ کر بھاگ جاتی، ایک دن لڑکی نے اس مجوب، ایک نقلی جواب کے بدلے کہا — 'ہاں ہو گئی۔۔۔۔ دیکھتے نہیں یہ ریشم سے کڑھا ہوا سالو۔

"لڑکی بھاگ گئی۔ لڑکے نے گھر کی راہ لی۔ راستے میں
ایک لڑکے کو موری میں ڈھکیل دیا۔ ایک چھابڑی والے
کی دن بھر کی کمائی کھوئی۔ ایک کتے پر پتھر مارا، اور ایک
گوبھی والے کے ٹھیلے میں دودھ انڈیل دیا۔ سامنے
نہا کر آتے ہوئے کسی وشنوی سے ٹکرا کر اندھے کی
اُپادھی پائی تب کہیں گھر پہونچا"

کہانی کے دوسرے باب میں پہلی جنگ عظیم کے جرمن فرنٹ کا جو منظر پیش کیا گیا ہے اُس کا اس واقعے سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ ہندوستانی فوج کا ایک سکھ دستہ خندق میں بیٹھا ہوا دلیری سے غنیم کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے انگریزی کمانڈر لپٹن صاحب کی غیر موجودگی میں صوبہ دار اور اس کے لڑکے کو بچا لیا۔ لہنا سنگھ کے خود ایک کاری زخم لگا لیکن گھایلوں کی گاڑی میں خود جانے کے بدلے اُس نے اصرار کرکے صوبہ دار اور اس کے لڑکے کو پہلے بھجوا دیا چلتے وقت اُس نے صوبہ دار سے کہا۔۔۔۔ صوبہ دارنی ہوماں کو چٹھی لکھو تو میرا متھا ٹیکنا لکھ دینا۔ اور جب گھر جاؤ تو کہہ دینا کہ مجھ سے جو انھوں نے کہا تھا وہ میں نے کر دیا۔

"صوبہ دار نے چڑھتے چڑھتے لہنا سنگھ کا ہاتھ پکڑ کر کہا — تو نے میرے اور بودھا کے پران بچائے ہیں۔ لکھنا کیسا؟ ساتھ ہی گھر چلیں گے۔ اپنی صوبہ دارنی سے تو ہی کہہ دینا۔ اُس نے کیا کہا تھا؟

۔۔۔۔ گاڑی کے جاتے ہی لہنا لیٹ گیا: وزیرا پانی پلا دے اور میرا کمربند کھول دے۔ تر ہو رہا ہے"

اس کہانی کا آخری باب اس قدر مؤثر ہے کہ اس کے ضروری اقتباسات گلیری جی کی زبانی سُنئے۔

"مرتیو کے کچھ سمے پہلے سمرتی بہت صاف ہو جاتی ہے جنم بھر کی گھٹنائیں ایک ایک کرکے سامنے آتی ہیں۔ سارے دِرشیوں کے رنگ صاف ہوتے ہیں۔ سمے کی دُھند بالکل اُن پر سے ہٹ جاتی ہے"

"لہنا سنگھ بارہ ورش کا ہے۔ امرتسر میں ماما کے یہاں آیا ہوا ہے۔ دہی والے کے یہاں، سبزی والے کے یہاں، ہر کہیں اُسے ایک آٹھ ورش کی لڑکی مل جاتی ہے۔ جب وہ پوچھتا ہے کہ تیری کڑمائی ہو گئی تب 'دھت' کہہ کر وہ بھاگ جاتی ہے۔ ایک دن ویسے ہی اُس نے پوچھا تو اُس نے کہا — 'ہاں کل ہو گئی۔ دیکھتے نہیں یہ ریشم کے پھولوں والا سالو؟' سنتے ہی لہنا سنگھ کو دُکھ ہوا۔ کرودھ ہوا۔ کیوں ہوا؟

"وزیرا سنگھ پانی پلا دے"

"پچیس ورش بیت گئے۔ اب لہنا سنگھ ۷۷ رائفلس میں جمعدار ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔ سات دن کی چھٹی لے کر زمین کے مقدمے کی پیروی کرنے وہ اپنے گھر گیا۔ وہاں رجمنٹ کے افسر کی چٹھی ملی کہ فوج لام پر جاتی ہے فوراً چلے آؤ۔ ساتھ ہی صوبہ دار ہزارا سنگھ کی چٹھی ملی کہ میں اور بودھا سنگھ بھی لام پر جاتے ہیں لوٹتے ہوئے ہمارے گھر ہوتے جانا۔ ساتھ چلیں گے"

"۔۔۔۔۔۔ لہنا سنگھ صوبہ دار کے وہاں پہونچا۔ جب چلنے لگے تو صوبہ دار بیڑھے میں سے نکل کر آیا۔ بولا۔ لہنا صوبہ دارنی تم کو جانتی ہیں۔ بلاتی ہیں۔ جا مل آ۔ لہنا سنگھ بھیتر پہونچا۔۔۔۔۔۔ دروازے پر جا کر متھا ٹیکنا، کہا اسیس سنی۔ لہنا سنگھ چپ"

"مجھے پہچانا"؟

"نہیں"

"تیری کڑمائی ہو گئی۔ دھت۔۔۔۔ امرتسر میں"

"بھاوؤں کی ٹکراہٹ میں مورچھا کھلی۔ کروٹ بدلی۔ پسلی کا گھاؤ بہہ نکلا"

"وزیرا پانی پلا" اس نے کہا تھا۔

"سوپن چل رہا ہے۔ صوبہ دارنی کہہ رہی ہے۔ میں نے تیرے کو آتے ہی پہچان لیا۔ ایک کام کہتی ہوں۔ میرے تو بھاگ پھوٹ گئے۔۔۔۔

لہ سگائی ٹہ اوڑھنی ٹہ خونچہ والا ٹہ خطاب ٹہ مرت ٹہ یاد ٹہ مناظر ٹہ صحن ٹہ خیالات ٹہ غشی

تمہیں یاد ہے ایک دن تانگے والے کا گھوڑا دہی والے کی دوکان کے پاس بگڑ گیا تھا۔ تم نے اس دن میرے پران بچائے تھے۔ آپ گھوڑوں کی لاتوں میں چلے گئے تھے۔ مجھے اٹھا کر دوکان کے تختے پر کھڑا کر دیا تھا۔ ایسے ہی ان دونوں کو بچانا۔ یہ میری بھکشا ہے۔ تمہارے آگے میں آنچل پسارتی ہوں"

"روتی روتی صوبہ دارنی اوبرے میں چلی گئی۔ لہنا بھی آنسو پونچھتا باہر آیا"

"وزیرا سنگھ پانی پلا، اس نے کہا تھا۔

"لہنا کا سر اپنی گودی پر رکھے وزیرا سنگھ بیٹھا ہے۔ جب مانگتا ہے تب پانی پلا دیتا ہے۔ آدھ گھنٹے تک لہنا چپ رہا۔ پھر بولا، کون کیرت سنگھ"

"وزیرا نے کچھ سمجھ کر کہا، ہاں،

"بھیا مجھے ذرا اونچا کر لے۔ اپنے پیٹ پر میرا سر رکھ لے.... ہاں اب ٹھیک ہے۔ پانی پلا دے۔ بس۔ اب کے ہاڑ میں یہ آم خوب پھلے گا۔ چاچا بھتیجا دونوں یہیں بیٹھ کر آم کھانا۔ جتنا بڑا تیرا بھتیجا ہے اتنا ہی یہ آم ہے جس مہینے اس کا جنم ہوا تھا، اسی مہینے میں میں نے اسے لگایا تھا"

"وزیرا سنگھ کے آنسو ٹپ ٹپ ٹپک رہے تھے"

"کچھ دن پیچھے لوگوں نے اخباروں میں پڑھا"

"فرانس اور بلجیم — ۶۸ ویں سوچی[1] — میدان میں گھاؤں سے مرا۔ ۷۷[2] سکھ رائفلس۔ جمعدار لہنا سنگھ"

گلیری جی کہانی بڑے نرالے انداز میں کہتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی کہانیوں میں بس پلاٹ ہی پلاٹ ہے۔ دراصل کامیاب پلاٹ کی گاڑی صرف انسانی جذبات کے پہیوں ہی پر چل سکتی ہے۔ سامرسٹ ماہم Somerset Mangham نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "مقبول عوام تصنیف اس لئے مقبول عوام ہوتی ہے کہ مصنف اس کو اپنے خونِ جگر سے لکھتا ہے" اس میں شک نہیں کہ نظم، افسانہ، ناول، ڈرامہ۔ غرضکہ ادب کی خواہ کوئی بھی صنف کیوں نہ ہو جب تک مصنف لوگوں کے سینوں میں ہلچل اور ان کے جذبات میں تلاطم پیدا نہیں کرے گا اس کی اپیل محدود، وقتی اور سطحی ہوگی۔ انسانی قدروں، اور انسانی فطرت۔ اس کی بھاؤ ناؤں، اس کے دل کی دھڑکن اور اس کے احساسات کے زیر و بم سے گلیری جی نہ صرف خوب واقف بلکہ ان کی سچی اور مؤثر ترجمانی بھی کر سکتے تھے۔ پلاٹ کی ندرت اور اچھوتے پن کے علاوہ وہ امتیازی وصف جو اس نے کہا تھا، کو موپاساں Maupassant کے "سونے کا ہار" اور گالز وردی Galsworthy کے "سیب کا درخت" کے ساتھ ساتھ دنیا کے مختصر افسانوں کی صفِ اوّل میں لا کر کھڑا کر دیتا ہے انسان کے جوش اور ولولوں، امنگوں اور تمناؤں، حسرت و یاس اور اس کے نازک، لطیف اور عالمگیر تاثرات کی اعلیٰ آئینہ داری ہے۔

ہندی کے ایک مشہور ادیب نے پنڈت شکتی دھر گلیری کو لکھا تھا کہ اگر وہ ایسی دس کہانیاں لکھ جاتے تو دنیا کے افسانوی ادب میں ان کا رتبہ وکٹر ہیوگو، ٹالسٹائی، موپاساں اور ترگنیو سے کہیں اونچا ہوتا۔ بہت کم اصحابِ ذوق ہوں گے جو اس رائے سے متفق نہ ہوں۔

[1] اسالٹ [2] فہرست

The best seller sells because it is written with the author's life blood.

سنت رام

فریڈرک پیکاٹ

بھارت اندو بابو ہرلشچندر ہندی کے معماروں میں ایک اونچا رتبہ رکھتے ہیں - ان کے زمانے میں جو قابل یا ادیب اس ملک میں ہوئے ہیں ان میں شری فریڈرک پیکاٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں - شروع سے ہی آپ نے چھاپے خانے کے کام کا تجربہ حاصل کیا تھا - اس لئے آپ انگلینڈ کی مشہور پبلشرز کمپنی ڈبلیو - این ایلن کے منیجر بنے -

اپنے روزانہ کام سے چھٹی پاکر آپ باقی وقت سنسکرت، ہندی اور اردو پڑھنے میں لگاتے تھے - آپ کو بھارت کی ان زبانوں سے اتنی زیادہ محبت تھی کہ بھارت میں چھپنے والے سب اخبار اور کتابیں آپ منگاتے رہتے تھے - اتنا ہی نہیں - آپ اپنے وقت کے مشہور ادیب راجا لکشمن سنگھ - بھارتیندو جی - پرتاپ نارائن مشر - کارتکی پرشاد وغیرہ سے خط و کتابت کرکے اہم مضامین پر صلاح مشورہ بھی کرتے رہتے تھے - آچاریہ رام چندر نے اپنی ہندی کی تاریخ میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس زمانے کے ہر ایک ہندی ادیب کے گھر پیکاٹ صاحب کے خط ملیں گے -

بھارت اندو جی کے زمانے سے پہلے سے ہی بنگال اور اتر پردیش میں انگریز پادریوں نے پریس کھول کر اپنا مذہبی پرچار شروع کر دیا تھا - ہندی میں بائیبل کا ترجمہ کرکے یا اس کے اہم حصوں کا سلیس اور آسان زبان میں ترجمہ کرکے وہ لوگ چھوٹی چھوٹی کتابیں تقسیم کرتے تھے - ان پادریوں سے پیکاٹ صاحب کا مقابلہ نہیں ہو سکتا - وہ نہ تو پادری ہی تھے - اور نہ مذہبی جوش کی باتیں ہی کرتے تھے - بکرمی سموت ۱۹۴۳ء میں انہوں نے بابو کارتکی پرساد کو جو خط لکھا تھا اس سے ان کے دلی خیالات کا پتہ لگتا ہے - انہوں نے لکھا تھا کہ آپ کی سمجھ میں ہندی بھاشا کا رائج ہونا شمال مغربی صوبے کے لوگوں کے لئے سب سے بھاری بات ہے - میں بھی پوری طرح سے جانتا ہوں کہ جب تک کسی ملک میں اپنی زبان اور حروف سرکاری اور عملی کاموں میں استعمال نہیں ہوتے ہیں - تب تک اس ملک کی قسمت جاگ نہیں سکتی - اس لئے میں نے برابر ہندی بھاشا کو رائج کرنے کی کوشش کی ہے -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیکاٹ صاحب کالے گورے کی معیوب تمیز سے دور ایک اعلیٰ انسان تھے - وہ بھارت کی سیاسی اور مجلسی حالت پر بھی نظر رکھتے تھے - ایک دفعہ ان کے ایک دوست نے انہیں ہندوستانی پولیس کے مظالم کا حال لکھ بھیجا تھا - اس پر آپ نے کارتکی بابو کو لکھا —— کچھ دن ہوئے میرے ایک ہندوستانی دوست نے ہندوستان کی پولیس کے شدائد کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ میں حیران ہو گیا !!! - اب میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک ہندوستان کی پولیس ویسی نہ ہو جائے جیسی کہ ہمارے انگلستان میں ہے میں اس بات کا پیچھا نہ چھوڑوں گا -

شری پیکاٹ وقتاً فوقتاً ہندی کی کتابیں بھی لکھا کرتے تھے ان میں دو کتابیں مشہور ہیں - آپ نے "بال دیپک" بچوں کے کورس کی دو سے چار حصوں میں لکھی - دوسری کتاب تھی "وکٹوریہ چرت" یہ دو کتابیں پٹنے کے مشہور کھڑگ ولاس پریس میں چھپی تھیں "بال دیپک" بہار کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھی -

سموت ۱۹۴۷ء بکرمی میں آپ نے ایلن کمپنی سے ہٹ کر گلبرٹ اینڈ رو - وی - گنٹی پریس میں کام کرنا شروع کر دیا تھا - اس پریس میں آکر آپ نے اخبار کے ذریعے سے بھی ہندی کی خدمت کی تھی - بات یہ ہے کہ اس پریس سے "آئین سوداگری" نام کا ایک تجارتی اخبار پیکاٹ صاحب کی ایڈیٹری میں نکلتا تھا - اس اخبار میں آپ نے کچھ صفحے ہندی کے

لئے بھی رکھ چھوڑے تھے ۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ اس وقت انگلینڈ میں اس اخبار کے لئے ہندی کا مسالہ کون لکھ کر دیتا تھا ۔ پیکاٹ کو ہی مضمون لکھنے پڑتے تھے ۔ اس اخبار کے ہندی سیکشن میں آپ ہندوستان میں چھپنے والے اخباروں میں سے مفید اقتباس لے کر چھاپتے تھے ۔ جب راجا لکشمن سنگھ نے "شکنتلا" ناٹک کا ہندی ترجمہ کیا ۔ تب آپ بہت خوش ہوئے ۔ اور اس کا تعارف آپ نے لکھا تھا ۔

ہندی میں چھپنے والا یہ پہلا اخبار نہیں تھا ۔ ان سے پہلے بھارت کے راجہ رام پال سنگھ سموت ۱۹۴۰ء بکرمی میں انگلینڈ گئے اور وہاں سے "ہندوستان" نام کا روزانہ اخبار ہندی اور انگریزی میں نکالنے لگے ۔ لیکن دو برس کے بعد راجا صاحب بھارت چلے آئے اور کالا کنکر سے یہ اخبار ہندی میں اسی نام سے نکلنے لگا ۔ بھارت میں یہ ہندی کا پہلا روزانہ اخبار تھا ۔ اس کے ایڈیٹروں میں شری مدن موہن مالویہ، پرتاپ نارائن مشر اور بال مکند گپت کا نام لیا جاتا ہے ۔

ہاں تو پیکاٹ صاحب ہی پہلے انگریز تھے جنہوں نے انگلینڈ میں ہندی کو اخبار میں جگہ دی ۔ اس زمانے میں یہ کوئی معمولی اور آسان کام نہ تھا ۔ دوسری زبان سیکھنے کا اتنا شوق ۔ پھر اخبار کا ہیڈ لکھنے کا استقلال ۔ اور ہندوستانی اخباروں پر نگاہ ۔ اتنی محنت اور استقلال کے بعد وہ اخبار نکل پاتا تھا ۔

شری پیکاٹ نے بھارتیندو بابو ہریش چند کو ایک خط برج بھاشا کی نظم میں لکھا تھا ۔

بشیش نش اوتنس شری بابو ہری چند جُو
پھیر نیر کل ہنس لُوک اوتر لکھ دیو موہیں
شری یت سکل کبند کل نٹ بابو ہری چند
بھارت ہردے ستا شرے اودے رہو جیو چند

یعنی دیش جاتی کے سرتاج شری بابو ہریشچندر جی

اے دودھ اور پانی کو الگ الگ کرنے والے سندر ہنس مہربانی کر کے مجھے تھوڑا سا جواب لکھ دیجئے ۔

اے شاعروں میں ملک الشعراء شری یت بابو ہری چند

اے بھارت کے دل کے سہارے ۔ آپ چاند کی مانند ہمیشہ چمکتے رہیئے ۔

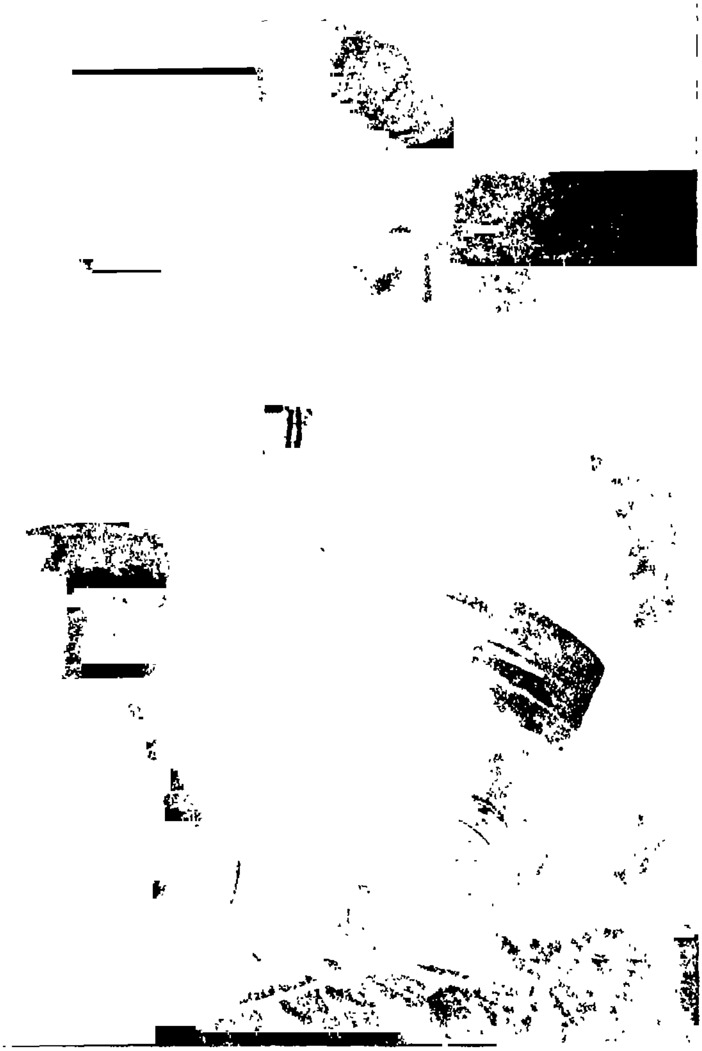
اس نظم سے ظاہر ہے کہ پیکاٹ صاحب بھارت میں بھارت اندو جی کی اہمیت اور ان کی ہندی خدمت سے بخوبی واقف تھے ۔ آپ اپنے اخبار میں ہندوستانی مصنفوں کا حال وقتاً فوقتاً دیتے رہتے تھے ۔ بھارت میں ہی نومبر ۱۸۹۵ء میں پیکاٹ صاحب زیادہ گھاس کی کھیتی کا پرچار کرنے بھارت آئے تھے ۔ آپ یہاں سال بھر ہی رہنے پائے ہوں گے ۔ کہ لکھنؤ میں ۷ فروری ۱۸۹۶ء کو آپ کا انتقال ہو گیا ۔ یہ بھی اتفاق کی بات تھی کہ بھارت کی زبان اور تمدن سے محبت کرنے والا بھارت کی مٹی میں ہی ہمیشہ کے لئے سو گیا ۔

نونہالان کشمیر











کشمیر کے یہ نونہال کشمیر کے نئے دور
اور مقبول عوام جمہوری نظام کے زیراثر
پل رہے ھیں۔ ان کے چہروں پر تازگی
اور عزم مستقل کے آثار ملتے ھیں

جنت کشمیر زندہ باد!



مولانا حسرت موہانی

شاعر، ادیب اور سیاستدان

جو ۱۳ مئی کی شام کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے
حلوہ، جو اس دنیا میں ایک جنس کم یاب ہے
منسوب دے اٹھ جانے سے کم یاب ہو گیا۔ آؤ اب دوں
[illegible]

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

مستقبل کشمیر دے معمار



صفیہ شمیم

دِل

کبھی جلوۂ حُسنِ عرفاں ہے، دِل
کبھی ظلمتوں میں پریشاں ہے، دِل

کبھی موسمِ گُل میں بے برگ و بار
خزاں میں کبھی گُل بداماں ہے، دِل

کبھی قطرۂ اشکِ بیچارگی
کبھی مَوج درمَوج طوفاں ہے، دِل

کبھی خار و خس میں ہے، اُلجھا ہُوا
کبھی تاجدارِ گلستاں ہے، دِل

کبھی سر بہ سر نورِ پاکیزگی
کبھی ظلمتِ شامِ عصیاں ہے، دِل

کبھی گلستانوں سے دامن کشاں
کبھی غنچہ غنچہ میں خنداں ہے، دِل

کبھی ایک سہمی ہوئی تیرگی
کبھی آفتابِ درخشاں ہے، دِل

کبھی فرطِ غم سے فسردہ، خموش
کبھی نغمہ بار و غزلخواں ہے، دِل

کبھی جھلملاتا چراغِ سحر
کبھی شمعِ شامِ غریباں ہے، دِل

کبھی جلوۂ نورِ حُسنِ خودی
کبھی پردۂ حُسنِ عرفاں ہے، دِل

کبھی مرگ آمیز اس کا سکوت
کبھی ہر نفس حشر ساماں ہے، دِل

کبھی نالۂ ہجر و دُودِ فغاں
کبھی غرقِ جشنِ بہاراں ہے، دِل

کبھی عالمِ ظلمت و تیرگی
کبھی مَوجۂ آبِ حیواں ہے، دِل

کبھی اشکِ شبنم سے ہے بیقرار
کبھی فاتحِ جوش و طوفاں ہے، دِل

کبھی داستانِ غمِ زندگی
کبھی زندگانی کا عنواں ہے، دِل

کبھی داستانِ غم و بیکسی
کبھی شادمانی کا عنواں ہے دِل

کبھی جوہرِ علم سے بہرہ مند
کبھی پیکرِ جہل و ناداں ہے، دِل

کبھی دُھندلی دُھندلی سی شامِ خزاں
کبھی رنگِ حُسنِ گلستاں ہے، دِل

کبھی پیکرِ نغمۂ زندگی
کبھی ایک شہرِ خموشاں ہے، دِل

کبھی نازشِ بزمِ فرزانگی
جنوں میں کبھی چاک داماں ہے، دِل

کبھی ذرّے ذرّے پہ ہے حکمراں
کبھی ایک ذرّے سے لرزاں ہے، دِل

کبھی رونقِ بزمِ کون و مکاں
کبھی خاکِ کوئے بیاباں ہے، دِل

کبھی قدسیوں سے بھی بڑھ کر بلند
کبھی حکم بردارِ شیطاں ہے، دِل

کبھی اس کے دامن میں ارض و سما
کبھی مفلس و تنگ داماں ہے، دِل

کبھی ظلمتوں میں ہے گُم کردہ راہ
کبھی رہبرِ نوعِ انساں ہے، دِل

کبھی ایک ذرّے کا محتاج ہے
کبھی سارے عالم کا سُلطاں ہے، دِل

کبھی پستیوں میں ہے کھویا ہُوا
کبھی آسمانوں پہ خنداں ہے دِل

رور دھوبی کے یہاں چلا گیا ہے ۔ تحقیقات کے بعد دھوبی کو یاد آئی کہ ب بقچہ مالک کے کپڑوں کے جیب میں ایک دفعہ ضرور تھا اور اس نے سے بیکار چیز سمجھ کر اسے گھر کے ٹوٹے پھوٹے کاٹ کباڑ میں ڈال دیا ھا - ڈھونڈا تو بقچہ مل گیا سرجان نے کھولا تو اس میں کوہ نور موجود تھا یہ سرجان کی جان میں جان آئی - کوہ نور بعد احتیاط وائسرائے ہند کی خدمت ں بھیجا گیا اور وہ خود اسے لے کر بمبئی پہنچے - اس کے لندن پہنچانے کی عزت فٹننٹ میکسن اور کیپٹن ریمسے کو نصیب ہوئی ان کو ہدایت تھی کہ اس کی حفاظت ں پوری پوری احتیاط رکھیں -

۳ر جولائی ۱۸۵۰ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک حاکم نے کوہ نور لکہ معظمہ وکٹوریہ آنجہانی کو بہ ازتکلف و تزک و احتشام باقاعدہ پیش یا - اس کا وزن اس وقت ۱۸۶ کیرٹ تھا - تراسی قراٹ وزن کی کمی کی جو یہ بیان کی جاتی ہے کہ شاہ زمان اور شاہ شجاع کو جس وقت آفتِ اگہانی ستا رہی تھیں اور وہ مالی پریشانیوں کی گتھیوں میں بُری طرح الجھا وا تھا ان سے سلجھاؤ کی تدبیروں میں اس نے اس ہیرے کے ٹکڑے کر کرکے ئی بار فروخت کر ڈالا تھا - ۱۸۵۱ء میں لندن کی میری نمائش میں کوہ نور عام مشاہدہ کے لئے رکھا گیا اور وہاں کے عوام نے اس کو بڑے شوق سے دیکھا جواہر کی عمدہ تراش خراش اور نمایاں پہلوؤں سے اس کی قدر و منزلت اور قیمت بہت بڑھ جایا کرتی ہے چنانچہ ۱۸۵۲ء میں بلجیم کے ایک مشہور و معروف جوہری کے زیر اہتمام اس کی پھر کاٹ چھانٹ ہوئی - اڑتیس دن تک یہ کام جاری رہا اور ایک لاکھ روپیہ سے زائد اس میں صرف ہوا -

آج یہ ہیرا مملکت انگلستان کے بادشاہ کے تاج میں جڑا ہوا ہے اور چونکہ یہ ہیرا ہندوستان کی ایک پرانی اور قابل قدر یادگار ہے اس لئے کیا تعجب ہے جو ہماری عنانِ حکومت اب ہمارے ہاتھ آنے پر کوہ نور پھر ہمارے ہاتھ لگے - ایک انگریزی کمپنی نے کئی لاکھ روپیہ کے صرفہ سے کوہ نور کی کئی ہزار سال کی زندگی کے واقعات حیرت انگیز کرشمے اس کے مد و جزر شاہی محلات کی محفلوں کی گرم بازاری بیگمات کے ناز و انداز اور جنگ و جدال کے واقعات کو عجب خوبی سے پردۂ سینما کے لئے ایک فلم طیار کی ہے جس کے دیکھنے کے ہم سب مشتاق ہیں کاش کہ کوہ نور کے زبان ہوتی تو یہ جیتا جاگتا چمکدار ہیرا اپنی کہانی خود اپنی زبانی ہمیں سناتا -

---

اُڑیسہ سرکار کی سرگرمیاں

اڑیسہ سرکار نے جنتا کی بہبود کے لئے فروری کے مہینے میں جو کارہائے نمایاں کئے ان کا ایک ہلکا سا خاکہ یہاں پیش کیا جاتا ہے -

بھارت سرکار کے کہنے پر اڑیسہ سرکار نے فوجی سپاہیوں کے بچوں اور اُن کے متعلقین کو تعلیم کی متعدد سہولیات بہم پہنچائی ہیں - چونکہ ان رعائتوں سے ۔مت کے خزانے پر کافی بوجھ پڑا ہے اس لئے حکومت نے اعلان کیا ہے کہ ۳۱ رمئی ۱۹۵۱ء کے بعد ان رعایتوں کے لئے کوئی نئی درخواست قبول نہیں جائے گی - جن لوگوں کو یہ رعایات دی گئی ہیں انہیں یہ رعایات تعلیم کے مکمل کرنے تک ملتی رہیں گی -

گھریلو صنعتوں کی ایک علاقائی نمائش ۲۰ ر ۲۱ رجنوری ۱۹۵۱ء کو شانتی نکیتن (پچھمی بنگال) میں منعقد کی گئی - اڑیسہ سرکار کے صنعتی محکمے پوری طرح اس نمائش میں حصہ لیا - فن اور دستکاری کے نادر نمونے اڑیسہ سرکار کے محکمہ صنعت و حرفت کی طرف سے اس نمائش میں رکھے ئے ہیں جنہیں لوگوں نے بہت پسند کیا اور اکثر چیزیں خریدیں -

اس مہینے میں بھی حسب دستور شرنارتھیوں کو اپنے اپنے کیمپ میں خام مواد دیا گیا اور صنعتی طور پر اُن کی پوری پوری مدد کی گئی - انگل ر سانبل پور کے انڈسٹریل سکولوں میں پانچ دو بار تھیوں کو بڑھئی کا کام سکھانے کا انتظام کیا گیا ہے -

اسی مہینے میں ٹیکسٹائل کمشنر بمبئی نے چھتری کے کپڑے کی بائیس گانٹھیں چھتری کی مختلف فیکٹریوں میں تقسیم کے لئے دی ہیں - یہ گانٹھیں ۱۹۵۱ء کیلئے دی گئی ہیں -

ست پرکاش سنگر

بدلہ

ایک دن شاردا گھبرا کر بھگت سنگھ سے بولی ۔

"چھوٹی بہو خوش نظر نہیں آتی" ۔

"اگر خوش نظر آئے بھی تو ہمیں کیا ملے گا"۔

"گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ۔منوہر اُسے کسی بات سے تنگ نہیں رکھتا ۔ بڑی بہو اس سے کتنا پیار کرتی ہے"۔

"بڑی بہو کے پیار سے کیا ہوتا ہے"۔ بھگت سنگھ نے اسے بیچ میں ٹوکا۔

"رنبیر اُسے پیار کرتا ہے یا نہیں"؟ "کیوں نہیں کرتا"؟ شاردا بولی ۔جیسے اس کے خاوند نے نہایت عجیب بات کی ہو۔ اگر وہ نہ پیار کرے گا تو اور کون کرے گا؟ دوسرے رنبیر تو اس کا غلام ہے لیکن . . . ."

"تو کیوں کوئی خاص بات ہے"؟ اس نے حیرانی سے پوچھا ۔

"شادی ہوئے چار سال ہو گئے لیکن بچہ نہیں ہوا"۔ وہ آہ بھر کر بولی۔

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے"؟

"کیا فضول بات کر دیتے ہیں آپ بھی ۔ آپ کے قصور کی اس میں کیا بات ہے"۔

"میں نے سوچا کہ تم کس کی طرف سے وکالت کر رہی ہو"۔ وہ ہنس کر بولا ۔

"اسے چھوڑو دوسروں کو کہنے سے پہلے اپنی چارپائی کے نیچے تو ڈنڈا پھیرو۔ خود کے بچہ ہے نہیں دوسرے کو دان کی سوچ رہے ہیں"۔

"اس میں تو تمہارا قصور ہے"۔

"ہاں ہر بات میں عورت کا ہی قصور ہوتا ہے"۔ وہ طنزاً بولی۔

"وہاں بھی شاردا کا قصور ہوگا"؟

"نہیں ۔ رنبیر کا"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا"؟

"میں نے تو ویسے ہی کہہ دیا ۔ ہو سکتا ہے ٹھیک ہو"

"لیکن بے چاری اداس ہی رہتی ہے"۔

"صرف اتنی بات پر"؟ بھگت سنگھ نے حیرت سے کہا ۔

"یہ کیا تھوڑی سی بات ہے"؟

"تو تم بھی تو اداس رہتی ہوگی"؟ اس نے پوچھا ۔

"ہٹو بھی"۔ اس کے منہ پر سرخی ناچ رہی تھی ۔ آپ کو تو ہر دم مذاق سوجھتا ہے"۔

"کس پاجی کو مذاق سوجھتا ہے"۔ اس نے اپنے صافے کو ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا۔

"اتنا سنجیدہ معاملہ اور میں مذاق کروں"! پھر ذرا جھنجھلا کر بولا ۔"تم نے بتلایا نہیں کہ اس کی اُداسی کی دوسری وجہ کیا ہے"؟

"وجہ تو کوئی خاص نظر نہیں آتی" وہ بولی "لیکن عورتیں کتنے ہی بڑے گھر کی کیوں نہ ہوں حسد انہیں بہت پیارا ہوتا ہے"۔

تمہارا مطلب ہے کہ وہ بڑی بہو سے حسد کرتی ہے"؟

"ہو سکتا ہے"

"ہو سکتا ہے"! اس نے اس کی بات کو دہراتے ہوئے کہا۔

وہ "مونڈھے پر پلتھی مارے بیٹھا تھا ۔ اور وہ آنگن میں اُس کے پاس بیٹھی پونیاں بنا رہی تھی ۔ شاردا اپنے کام میں معروف تھی۔ اپنے خاوند کی طرف متوجہ نہیں ہوئی ۔ وہ وہاں سے اُٹھا ۔ اور ڈیوڑھی میں آکر چارپائی پر لیٹ گیا"۔

ڈیوڑھی تین کاموں کے لئے استعمال کی جاتی تھی ۔ اس کے ایک طرف تو بھینس بندھتی تھی ۔ہمیشہ نہیں ۔ برسات میں اور سردیوں میں اور دوپہر کو گرمیوں میں ۔ دوسری طرف بھوسہ اُپلے اور ایندھن

پڑا تھا۔ بیچ میں ایک چارپائی پڑی رہتی تھی۔ اس پر کچھ بچھا نہ تھا۔ وہ چت اس پر لیٹ کر چھت کی کڑیاں گننے لگا۔ جیسے کڑیوں میں جان آگئی۔ جنبش ہوئی اور وہ اسے اتنی ہی ناچنے والی عورتیں نظر آئیں۔ کتنی عورتیں ناچ رہی تھیں ان میں صرف چار تھیں۔ چاروں ناچتی رہیں۔ پھر اُن میں سے ایک آگے بڑھ کر بایاں ہاتھ کان پر اور دایاں اوپر ہوا میں اُٹھا کر گانے کا انترہ کہتی۔

"لمبی بانہہ کر کے او لمبی بانہہ کر کے"

دوسری عورتیں اس مصرعے کو اٹھاتیں اور دُہراتیں۔

"لمبی بانہہ کر کے او لمبی بانہہ کر کے"

پھر آگے والی عورت ناچنے لگتی اور باقی تینوں تالیاں بجاتی ہوئی گاتیں

گیڑا دے لمبے ٹیارے' لمبی بانہہ کر کے
گیڑا دے لمبے ٹیارے' لمبی بانہہ کر کے

وہ خوب جوش میں آکر ناچتیں۔ اُن کے ساتھ جیسے برقی قوت سے متحرک ہو کر سارا مجمع بھی جوش میں آجاتا۔ اور گاؤں والے "واہ۔ واہ" کا شور بلند کر دیتے۔ لیکن وہ شہریوں کی طرح سوکھی داد نہ دیتے۔ اس کے ساتھ ہی روپوں کی بارش شروع ہو جاتی۔ مجمع میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا۔ یہ تھا جگت سنگھ بھگت سنگھ کا باپ۔ اس کے دائیں ہاتھ میں روپیہ تھا۔ اور وہ ہاتھ اوپر ہوا میں کر کے ناچ رہا تھا۔ اسے کھڑا دیکھ کر سب سے آگے والی رقاصہ اس کی طرف بڑھی۔ لوگوں نے فوراً اسے راستہ دیا۔ لیکن جب وہ گزری تو کچھ لوگوں نے اُس کے لہنگے کو ذرا سا چھوا پھر اسے چوما۔ دوسرے نے اس کے پاؤں کی مٹی کو اٹھا کر چوما۔ اس سے ان کو بے حد تسلی ہوئی۔ دوسرے اس کی طرف حسرت کی نگاہ سے تک رہے تھے۔ جب وہ جگت سنگھ کے پاس پہنچی۔ تو اس نے اسے روپیہ دیا اور اُسے آنکھ ماری۔ اس پر سارے مجمع میں تالیاں گونج اٹھیں۔ ہُو۔ ہُو کا شور بلند ہوا۔ اس سب کا روپیہ لینے والی پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ تو ایسی باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ ان باتوں سے ناراض نہ ہوتی۔ ہاں ان کے نہ ہوتے سے وہ ضرور مایوس ہوتی۔ لیکن

گاؤں والوں کے لئے اس کی مسکراہٹ' اس کی ہنسی اس کی ایک ایک ادا اعجازِ مسیحا کے برابر سمجھی جاتی۔ جیسے وہ مردہ جسموں میں جان پیدا کر رہی تھی۔ جیسے مرجھائی روحوں میں تازگی بھر رہی تھی۔ وہ پھر لوٹ کر آئی پھر گانا شروع ہوا۔ لیکن ابھی اس نے وہی انترہ اُٹھانا شروع ہی کیا تھا کہ دوسرے کونے سے ملکھا سنگھ روپیہ لے کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ادھر چلی۔ پھر تیسرا آدمی' چوتھا' پانچواں' چھٹا اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ جگت سنگھ اس دن ضرورت سے زیادہ چڑھا چکا تھا۔ اور وہ بھی غالباً خود کشید۔ وہ روپیوں سے جیب بھرے بیٹھا تھا۔ عام طور پر ناچنے والیوں کو لانے کا بندوبست اس کے سر ہوتا۔ اور کم از کم اس وجہ سے وہ دل کھول کر خرچ بھی کرتا۔ کسی کی ہمت نہ تھی کہ اس کو پچھاڑ سکے۔ لیکن مقابلہ کئے بنا ہار ماننے کو طیار نہ تھا۔ چاروں طرف سے روپیوں کی بارش شروع ہو جاتی۔ ناچنے والیاں بہت خوش ہوتیں۔ ایسا مقابلہ انہیں راس آتا۔ تو اس دن جگت سنگھ نے پی رکھی تھی۔ ناچ اور گانا چل رہا تھا۔ روپیوں کا مقابلہ شروع تھا۔ اب لوگوں کی توجہ گانے سے ہٹ کر مقابلے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ اب عام گاؤں والے زیادہ روپے تو دے نہیں سکتے تھے۔ دو دو چار چار تو ہنسی خوشی دے دیتے۔ کیوں کہ رنڈیوں کو فصل کٹ چکنے کے بعد ہی بُلایا جاتا تھا۔ اور سب کی جیب میں پیسے ہوتے تھے۔ لیکن گھر والیوں کا بھی تو خیال ہوتا تھا۔ عموماً اناج بکتے ہی سب روپیہ عورتیں اپنے قابو میں کر لیتی تھیں وہ جانتی تھیں کہ ان کے آدمی روپے کی شکل کو ترستے ہیں۔ اور روپیہ ملتے ہی بے قابو ہو جاتے ہیں۔ وہ گاؤں کی اس بدعت کو تو جانتی تھیں کہ یہ لوگ ان شہر کی سستی عورتوں کے لئے کتنے بھوکے ہوتے ہیں۔ اور محض درشن کے۔ وہ درشن کو ہی بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ اس بات کو جانتے ہوئے اُن کی عورتیں سب روپے کو قابو میں رکھتی تھیں وہ اناج شہر میں بیچنے کے بعد دو چار روپے چھپا کر رکھ لیتے۔ اور اس موقعہ پر خرچ کرتے۔ گندم ان دنوں بہت سستے داموں بکتی تھی اس لئے تھوڑی بکری ہوتی۔ اور بچا بھی تھوڑے روپے ہی سکتے۔ جب ناچ شروع ہوتا۔ اور جگت سنگھ سب سے پہلے روپیہ نکال کر بات شروع کرتا تو سب لوگ روپے نکال کر بیٹھ جاتے' اور ایک ایک کر کے اپنی

اس مطلب کے لئے جمع شدہ پونجی کو صرف کرتے ۔ جب سب لوگ اپنا بیرہ خرچ کر چکتے ۔ تو میدان میں صرف دو آدمی رہ جاتے ملکھا سنگھ اور جگت سنگھ ۔ جگت سنگھ سب کچھ برداشت کر سکتا تھا' اس موقعہ پر مقابلہ برداشت نہ کر سکتا تھا ۔ وہ گالی کھا کر اتنا طیش میں نہ آتا جتنا رنڈیوں کو روپے دینے کے معاملے میں اپنے مقابل کسی اور کو دیکھ کر ۔ ایک زمانہ تھا جب اس کے پاس گاؤں میں سب سے زیادہ زمین تھی پچاس ایکڑ ۔ اب ہر سال رنڈیاں آتیں اور زمین کم ہوتی جاتی ۔ اتنی کہ اس وقت اس کے پاس محض آٹھ ایکڑ رہ گئی تھی' لیکن زمین گھٹنے کے ساتھ اس کا دل کم نہیں ہوا ۔ شاید بڑھتا ہی گیا ۔ پھر اس کا دوسرا کوئی شغل بھی نہ تھا ۔ شراب اور گانا سننا ۔ کسی سے جھگڑا وہ نہ کرتا' جوا وہ نہ کھیلتا' مقدمہ بازی وہ نہ کرتا ۔ اس میں صفات بھی تھیں ۔ وہ نڈر تھا' بہادر تھا' دلیر تھا' غریبوں کا مددگار تھا ۔ اس کے پاس ایک حساس دل تھا ۔ لیکن وہ کبھی دوسرے کو اپنے مقابلے پر نہ دیکھ سکتا' اور خاص کر اس معاملے میں ۔ جب دونوں بیس بیس روپے دے چکے ۔ تو جگت سنگھ نے دو دو روپے کے حساب سے شروع کیا جونہی بانو چکر میں گئی ۔ ملکھا سنگھ نے کھڑے ہو کر اسے آواز دی اور دو روپے اس کی طرف بڑھائے ۔ لیکن وہ چکر میں جانے نہ پائی تھی کہ جگت سنگھ نے اسے اشارہ کیا ۔ جونہی اس نے ان کو مار کر اس کے ہاتھ پر دو پیسے رکھے' تالیاں گونج اٹھیں ۔ پھر ملکھا سنگھ کی باری آئی ۔ لوگوں کے لیے ناچ سے بڑھ کر اس بات میں کہیں زیادہ خوشی تھی ۔ ناچ اور گانا اُن کی جنسی بھوک کو اُبھارتا' اور روپوں کا مقابلہ ان کی جنگجو سپرٹ کو ۔ دیہاتیوں کے لئے یہ شغل زندگی سے بھی پیارا ہوتا ہے ۔ کیوں کہ ایسے موقعوں پر وہ زندگی کی بھی بازی لگا دیا کرتے ہیں ۔ جب لگ بھگ آدھ گھنٹہ مقابلہ چلتا رہا ۔ تو ملکھا سنگھ نے کھڑے ہو کر پانچ روپے کا نوٹ دکھایا ۔ لوگوں نے تالیاں پیٹ کر طوفان بدتمیزی پیدا کر دیا ۔ جگت سنگھ کے تن بدن میں آگ لگ گئی' جیسے ملکھا سنگھ نے پانچ کا نوٹ نہیں دکھایا تھا' اس کے اندر جلتا ہوا تیر چھوڑا تھا ۔ اس کی آنکھوں میں جیسے شعلے بھڑک اُٹھے ۔ ملکھا سنگھ کی اتنی جرأت ! غصے کا پہلا وار زبان پر ہوتا ہے وہ بے قابو ہو کر بولا ۔

" ماں پھرے مانگتی' اور بیٹا کرے دان ۔ ان لوگوں کو کھانے کو ملتا نہیں ۔ اور یہاں خیرات بانٹ رہے ہیں ۔

" ہم کس بھڑوے سے مانگتے ہیں" ؟

" اور سالے تیرے پاس پیسہ کہاں سے آیا چوری کی ہوگی" ۔

" میں تیری ..... بیچ کر پیسے لایا ہوں" ۔

" ٹھہر تیری ......"

جگت سنگھ دو ہاتھ لمبی گالی دے کر ملکھا سنگھ کی طرف لپکا لوگ راستے سے ہٹ گئے ۔ رنڈیاں بھاگ کھڑی ہوئیں ۔ بچے چلاتے ہوئے دوڑے' اور لوگ خوف زدہ ہو کر کھڑے ہو گئے ۔ جگت سنگھ کے ہاتھ میں لاٹھی تھی ۔ جس پر ایک طرف لوہا چڑھا ہوا تھا ۔ وہ ملکھا سنگھ کے پاس جا کر چلایا ۔

" آج میری لاٹھی خون مانگ رہی ہے" ۔

اور لاٹھی بائیں طرف سے گھما کر اس نے ملکھا سنگھ کے سر پر دے ماری ۔ وار سخت تھا ۔ پیشتر اس کے کہ ملکھا سنگھ اپنی لاٹھی کو گردش میں لاتا' ایک دوسرا وار اس کے سر پر آ پڑا سر پھٹ گیا ۔ خون کے فوارے چھوٹ کر زمین کو رنگنے لگے ۔ دھرتی لال ہو اٹھی ۔ ملکھا سنگھ پچھاڑ کھا کر گر پڑا ۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا ۔

" کوئی اس کا اور حمایتی ہو تو نکل آئے میدان میں" جگت سنگھ نے للکار کر کہا ۔

سب خاموش کھڑے رہے ۔

" اگر ہے کسی میں جرأت تو آ جائے ۔ پھر کسی کو گلہ نہ رہے ۔ اگر چاہیں تو اکٹھے ہو کر آ جائیں" ۔

سب لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔ جیسے آنکھوں سے باتیں کر رہے ہوں ۔ لیکن کوئی نہیں بولا ۔ بدقسمتی سے ملکھا سنگھ کے دونوں لڑکے اپنے ماما کے گھر گئے ہوئے تھے ۔ اور آج اُن کے لوٹنے کی توقع تھی لیکن ابھی تک آئے نہ تھے ۔ اگر وہ ہوتے تو جنگ چھڑ جاتی اور جگت سنگھ کو کئے کی سزا مل جاتی ۔ لیکن اب مفت کے جھمیلے میں کون پڑے ۔ بنتا سنگھ ۔ طوطا سنگھ' لکھا سنگھ' نروتم داس اور اچھر و مل بے ہوش ملکھا سنگھ کو اٹھا کر اس کے گھر لائے ۔

اس کی بیوی اپنے خاوند کا یہ حال دیکھ کر غصّے سے لال ہوگئی وہ اسے رنڈیوں کا تماشا دیکھنے سے بہت روکتی تھی - اس سے گھر تباہ ہوجاتے ہیں - اور کُل کا ستیاناس ہوجاتا ہے وہ اسے بھگت سنگھ کی مثال دیتی جو گھر پھونک کر تماشہ دیکھ رہا تھا - لیکن ملکھا سنگھ نے اس کی ایک نہ مانی اور آج سزا بھگت رہا ہے - مگر جگت سنگھ کون ہوتا ہے - سزا دینے والا ؟ اس کی اتنی ہمت ! آج اُس نے اس کے خاوند کو پیٹا کل اس کے بچّوں کو مار ڈالے گا ! نہیں - ایسا کبھی نہیں ہوسکتا - اس نے ایک دفعہ خاص آدمی کو دھرم پور بھیجا - کہ جلد از جلد اس کے لڑکوں کو بُلا کر لائے - ملکھا سنگھ کے سر میں دیسی شراب ڈال کر اس پر پٹّی باندھی گئی اور شراب کی ایک بوتل اس کے اندر انڈیل دی گئی - آدھی رات تک مان سنگھ اور گمبھیر سنگھ لوٹ آئے - اُن کی آنکھوں میں خون اتر آیا - اور وہ اپنی لاٹھیوں کو نکال کر تیل لگانے لگے - کرپانوں کو نکال کر اور بھی تیز کر لیا - اور صبح ہی جگت سنگھ کو مزا چکھانے کا فیصلہ ہوگیا -

اُن کے آنے کی خبر پا کر اُن کی پارٹی کے دوسرے آدمی پوچھنے سے پہلے ان کے گھر آ پہنچے - لڑکوں کے فیصلے کی بات سُن کر بڈھا بکرم سنگھ بولا -

"ہاتھ میں آئے ہوئے شکار کو گنوا نا مورکھتا کی حد ہوگا"-

"آج اس کا سر کہیں اور بے شک ہو - اس کے دھڑ پہ نہیں ہوگا"-

"یہی تو جاہل پن ہے" - بکرم سنگھ بولا -

"کیوں" ؟ پا کھر نے حیرانی سے پُوچھا -

"اُسے مارنے سے یہ دونوں بھی پھانسی چڑھ جائیں گے تین آدمی جان سے جائیں گے - دو گھر تباہ ہوجائیں گے' اور ان کے ہاتھ کچھ نہ پڑے گا"-

"تو پھر کیا کرنا چاہیئے" ؟

"وہی جو موقعہ چاہتا ہے - فوراً رپٹ کرو - ملکھا سنگھ کو چھکڑے پر لاد کر تھانے لے چلو - ہسپتال سے سرٹیفکیٹ لو - تھانہ آئے گا - اور جگت سنگھ کا شکنجہ کسا جائے گا"-

"لیکن جگت سنگھ کے خلاف گواہی دینے کی کس کی جرأت ہے" ؟

"ابھی انصاف اور دھرم کا دنیا سے خاتمہ نہیں ہوا"-

"کیا مطلب" ؟

"لالہ اننت رام جھوٹ نہیں بول سکتے"-

"کیا وہ گواہی دینے چلیں گے" ؟

"پہلے انہیں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی - پولیس یہاں آئے گی اور ان سے پوچھے گی وہ مر تو جائیں گے - لیکن سچ سے انکار نہ کریں گے - پھر پولیس خود بخود انہیں عدالت میں بلوائے گی"-

بکرم سنگھ کی دلیل سے سب کی آنکھوں میں چمک آگئی - مان سنگھ اور گمبھیر سنگھ نے اپنی دونوں لاٹھیاں اور کرپانیں باہر ڈھیروں میں چھپا دیں - تاکہ تلاشی کی نوبت آنے پر کچھ ہاتھ نہ لگ سکے -

اور اگلے دن وہ تھانے پہنچے -

وہی ہوا جس کی بکرم سنگھ کو امید تھی - اننت رام گواہی دینے سے ڈرتے تھے - لیکن وہ موقع پر موجود تھے - جو اُن کی آنکھوں نے دیکھا انہوں نے بیان کر دیا - عدالت میں جا کر بھی وہ جھوٹ نہ بول سکے - اننت رام کی گواہی کی پولیس اور عدالت میں بہت دھوم تھی عدالت سارے گاؤں والوں کی گواہی کو اتنی اہمیت نہ دیتی' جتنی کہ اکیلے اننت رام کی گواہی کو - جگت سنگھ نے اس کی بہت منت سماجت کی' خوشامد کی - کہ وہ اس کے خلاف گواہی نہ دے - لیکن اننت رام کیا کر سکتا تھا - اس کا قصور بھی کیا تھا ؟ وہ اپنی مرضی کے خلاف گواہی دینے گیا - اور اس نے بالکل وہی کہا - جو اس کی آنکھوں نے دیکھا - اس کا نتیجہ جگت سنگھ کو بھگتنا پڑا - اُسے حملہ بارادۂ قتل کے جُرم میں پانچ سال کی قید کی سزا ہوئی -

جب وہ جیل سے لوٹ کر آیا - تو ناچ تماشے بند ہو چکے تھے - اس کی کھیتی تباہ ہو چکی تھی - اس کی بیوی اور خورد سالہ بچہ اُسے سنبھالنے میں ناکام رہے تھے - گھر کا نقشہ بالکل بدل چکا تھا - اس کی جوانی' جوش اور ہمت ختم ہوگئی - پانچ سال اس کے لئے پانچ صدیوں کے برابر تھے -

اور اس کی تباہی کا موجب کون تھا ؟ صرف اننت رام - گاؤں کا

کوئی دوسرا شخص اتنی جرأت نہ کر سکتا تھا - اور اننت رام کی دیکھا دیکھی دوسروں کا حوصلہ کھل گیا -

وہ اننت رام کے اس رویہ کو کبھی نہ بھول سکا - جیل سے لوٹ کر اس نے اننت رام سے بول چال بند نہیں کی - اس سے ظاہرا راہ و رسم رکھی - لیکن اس کے سینے کا داغ کبھی نہ مٹ سکا - جس دن وہ آخری سفر کی طیاری کر رہا تھا - اس نے بھگت سنگھ کو اشارے سے نزدیک بلایا - پھر اس کے کان میں بولا -

" اگر تم اننت رام سے بدلہ نہ لوگے - تو میری آتما کبھی شانت نہ ہوگی - اس سے ضرور بدلہ لینا "

" اگر وہ مر گیا "

" تو اس کے بچوں سے - بھولنا مت "

اور اس نے آنکھیں موند لیں - بدلہ - بدلہ - بدلہ - جیسے بھگت سنگھ کو چھت کی کڑیوں اور شہتیروں میں صرف ایک ہی لفظ نظر آ رہا تھا - اس نے کروٹ لی - سامنے دیوار اور دروازے پر اسے ایک ہی چیز نظر آئی - ' بدلہ ' اننت رام سے بدلہ - اس کے بچوں سے بدلہ - اس کے خاندان سے بدلہ - اس نے محسوس کیا کہ سارا ماحول بدلے کے لفظ سے بھرپور ہے - فقط ایک ہی نقطہ سے معمور ہے - جیسے دوسری دنیا سے وہ آوازیں سن رہا ہے - " بدلہ - بدلہ - بدلہ " اس کے باپ کی آتما چلا چلا کر پکار رہی ہے - " بدلہ - بدلہ " - تم بدلہ نہیں لے رہے اور میں اشانت ہوں - مجھے شانتی چاہیئے - اور شانتی کا مطلب ہے بدلہ ' -

" شاردا " ! وہ چلایا -

" کیا ہے ؟ وہ بھاگی بھاگی آئی گھبرائی ہوئی - تم نے تو میری جان ہی لے لی تھی " -

" بات ہی ایسی تھی " - اس نے اٹھ کر کہا -

" کیسی بات ؟ کیا بات " ؟ وہ بے حد گھبرا رہی تھی -

" پانی کا گلاس لاؤ "

وہ بھاگی بھاگی پانی کا گلاس لائی - جب وہ پی چکا تو اس نے گلاس اس سے لے کر نیچے زمین پر رکھا ' اور اپنے دوپٹے سے اس کے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگی - اور حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی - وہ بولا -

" شاردا ! تمہیں باپو کا آخری پیغام یاد ہے " ؟

" نہیں ! کیا پیغام ؟ کون سا پیغام " ؟

" نہیں یاد ؟ کوئی حرج نہیں ' مجھے یاد ہے " -

" میں نہیں سمجھی "

" ضرورت بھی نہیں - تم کیا کہہ رہی تھیں کہ سشما ناخوش رہتی ہے " ؟

" ہاں - لیکن بات تو بتلاؤ "

" بات یہ ہے شاردا " وہ اس کے چہرے پر آنکھیں جماتا ہوا بولا - منوہر کے باپ نے میرے باپ کو تباہ کیا ' یعنی ہمیں تباہ کیا - اس کا بدلہ منوہر کو چکانا ہوگا - اور سشما اور رنبیر کے ذریعہ - تم سشما سے دوستی گانٹھو - گاڑھی دوستی - اسے اپنی مٹھی میں کرو - پھر اسے نیلما اور منوہر کے خلاف بھڑکاؤ - اتنا زیادہ کہ شعلے لپک کر اس خاندان کا نام و نشان مٹا دیں - سنتی ہو " ؟

" لیکن . . . . . "

" لیکن ویکن کچھ نہیں - وہ چلا کر اور آنکھوں میں چنگاریاں بھرتا ہوا بولا - تم بات کو دھیان سے سن لو - ان معاملوں میں عورتوں کو سمجھنے کی ضرورت نہیں پڑتی - تم عورت ہو - یہ چیز تمہاری فطرت میں ضرورت سے زیادہ موجود ہے - صرف اسے جاگرت کرنے کی ضرورت ہے مجھے روز کی رپورٹ دینی ہوگی - تم سشما کو سنبھالو - میں رنبیر کو سنبھالتا ہوں اور دیکھو " وہ رک کر بولا - " تمہارے رویے سے اس بات کا گمان تک نہ ہو کہ تمہارے دل میں منوہر یا ان کے خاندان کے خلاف کچھ بھی بغض ہے - ظاہرا تم نے نیلما سے بھی دوستی گانٹھ کر رکھنی ہے - دونوں سے ملتے رہنا ہے - لیکن اپنے کام سے نہیں چوکنا " -

اگر ایشور نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا - اتنا کہہ کر وہ رسوئی کی طرف چلی گئی -

محمد شرف الدین

حیدرآباد کی گھریلو صنعتیں

تاریخی پس منظر

بیسویں صدی کی ابتدا تک حیدرآباد نہ صرف زراعتی بلکہ صنعتی ملک بھی تھا۔ آبادی کا ایک بڑا حصہ گھریلو اور دیہی صنعتوں میں مشغول تھا۔ صنعتی ترقی اور ہنرمندی میں حیدرآباد مغربی ممالک سے بخوبی مقابلہ کرسکتا تھا۔ ریل اور پختہ سڑکوں کے زیادہ نہ ہونے سے بیرونی مال زیادہ مقدار میں نہیں آتا تھا۔ تمام سرکاری دفاتر اور مدارس میں سرکاری ضروریات کے لئے عام طور پر ملک کا بنا ہوا سامان استعمال میں لایا جاتا تھا۔ اہل ملک کا طرز تمدن ایسا تھا کہ یورپ کا بنا ہوا سامان استعمال کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ درباری رسومات میں ملکی پارچہ اور ملکی سامان استعمال کیا جاتا تھا۔

ایک صدی پہلے تک حیدرآباد کے کپڑوں کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اورنگ آباد کا ہمرو، مشروع اور کمخواب، پیٹھن کی ساڑیاں اور پگڑیاں خاص طور پر مشہور تھیں۔ ۱۶۰۹ء میں جب سفیر ایران گولکنڈہ کے قطب شاہی دربار میں آیا تو اس کو تحفے کے طور پر ایک نفیس کمخواب کا تھان بھی دیا گیا تھا جس کو پیٹھن کے کاریگروں نے پانچ سال کی طویل مدت میں طیار کیا تھا۔

ناندیڑ کے بیلے اور ململ اپنی ساخت اور نفاست کے لحاظ سے صنعت گری کے کمال میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان پارچوں کی خوبی یہ تھی کہ ایک ایک تھان چودہ چودہ گز لمبائی کا ہوتا تھا اور ایک انگوٹھی کے حلقے میں سے نکال لیا جا سکتا تھا۔ دکن کے ریشمی کپڑوں کی شہرت ہندوستان کے باہر تک پھیلی ہوئی تھی۔ نارائن پیٹ اور سنگا ریڈی کی ریشمی ساڑیاں، سدی پٹ اور آرمور کے ریشمی پیتمبر، جینور اور مہادیو پور کا ٹسر اپنی اچھائی کی وجہ سے قدیم زمانے سے مشہور ہے۔

قدیم دمشق کی تلواریں جن کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے وہ دکن کے فولاد ہی سے بنائی جاتی تھیں۔ اس فولاد سے تلوار، گپتی، بندوق، چاقو، قینچی اور سروتے طیار ہوا کرتے تھے۔ قدیم دور کی بنی ہوئی بڑی بڑی توپیں جو ریاست حیدرآباد کے قلعوں میں رکھی ہوئی ہیں اب بھی دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کردیتی ہیں۔

بیدری برتن، کریم نگر کا چاندی کی تارکشی کا سامان، دولت آباد کا دستی کاغذ، ورنگل کے قالین، عالم پور کی شطرنجیاں اور مٹ پلی کی کھادی بڑی شہرت کے حامل ہیں۔ کھلونا سازی اور روغن کا کام ایک ترقی پذیر گھریلو صنعت ہے نرمل ضلع عدل آباد اس کے لئے مشہور ہے۔ بعض کام نفیس اور عمدہ ہوتے ہیں اور ان میں جانور، پرند، پھول، پتے اور دیہاتی مناظر ہوتے ہیں۔

یورپ میں صنعتی انقلاب اور برطانوی حکومت کی آزاد تجارتی پالیسی کی وجہ سے غیر ملک کی مصنوعات کثرت سے دکن میں بھی آنے لگے اس کی وجہ سے اہل ملک کا طرز تمدن بدل گیا۔ امرا، جاگیردار اور دیس مکھ مغربی لباس کو ترجیح دینے لگے۔ مغربی فرش و فرنیچر سے مکانات کو آراستہ کیا جانے لگا۔ سرکاری دفاتر اور مدارس میں صادر کا سامان اور فرنیچر یورپ کا ساختہ خریدا جانے لگا۔ درباری تقریبوں میں انگریزی لباس زیب تن ہونے لگا۔ غرض ان سب باتوں کا اثر ملکی مصنوعات کے لئے نقصان دینے والا ثابت ہوا اور ان میں تنزل شروع ہو گیا۔

۱۹۱۷ء میں حیدرآباد میں ایک جدید محکمہ صنعت و حرفت کا قیام عمل میں آیا تاکہ ملک کی قدیم صنعتوں کی تجدید اور ان کی امداد کی جائے اور وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکیں۔ نیز جدید بڑی صنعتوں کے ساتھ گھریلو صنعتوں کو ترقی اور فروغ دیا جائے۔ بہرحال حیدرآباد کی جدید صنعتی زندگی کا سنگ بنیاد ۱۹۲۹ء میں رکھا گیا جبکہ ایک کروڑ روپے کے سرمائے سے ایک انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ قائم کیا گیا۔ اب یہ فنڈ جو تقریباً چار کروڑ روپے سے

زاید ہو گیا ہے حیدرآباد کی صنعتی ترقی میں بہت فائدہ مند ثابت ہو رہا ہے چھوٹی اور بڑی دونوں قسم کی صنعتیں اس سرمایے سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اس سرمایے کا کچھ حصہ بڑی صنعتوں کے حصص خریدنے میں صرف کیا جاتا ہے اور اس سے جو منافع ملتا ہے اس سے گھریلو صنعتوں کی مالی امداد قرضوں اور امدادی عطیات کے ذریعے سے کی جاتی ہے۔ صنعتی تعلیم حاصل کرتے کے لئے طلبا کو وظائف دئے جاتے ہیں۔ صنعتی نمائشوں اور دوسری ایسی سرگرمیوں میں حصہ لیا جاتا ہے جن سے حیدرآباد کی صنعتی ترقی میں فروغ ہو۔

دستی پارچہ بافی

حیدرآباد کی گھریلو صنعتوں میں دستی پارچہ بافی سب سے زیادہ اہم ہے: اس صنعت میں تقریباً دس لاکھ اشخاص براہ راست اور بالواسطہ روزگار سے لگے ہوئے ہیں۔ حیدرآباد کی تقریباً تیس فی صد آبادی کا لباس انہیں کی محنت سے مہیا ہوتا ہے۔ یہ گھریلو صنعت نصف صدی سے زیادہ مدت سے بیرونی کپڑا بنانے والے کارخانوں کے شدید مقابلے کے باوجود بھی تک زندہ ہے۔ انہیں وجوہ سے دستی پارچہ بافی کی ترقی ہماری خاص توجہ کی محتاج ہے۔ اس میں مشکلات کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ یہاں کے بافندے خام چیزیں بڑھی ہوئی قیمتوں سے خریدتے ہیں اور اپنی طیار کی ہوئی مصنوعات کو سستے داموں فروخت کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ طیاری کے فرسودہ طریقوں، قدیم آلات و اوزار، فنی تعلیم کے فقدان اور عام ماحول کی وجہ سے بھی اس گھریلو صنعت میں ترقی کے آثار نہیں پائے جاتے۔

محکمۂ صنعت و حرفت حکومت حیدرآباد کی جانب سے دستی پارچہ بافی کو ترقی دینے کی ممکنہ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ مندرجہ بالا خامیوں کو دور کرنے کے لئے مختلف اسکیمیں مثلاً دستی پارچہ بافی کی ترقی کی اسکیم، سوت کی کتائی کی اسکیم۔ بلانکٹ اسکیم، ریشم سازی کی اسکیم، خواتین کے لئے ہوم انڈسٹریز اسکیم، ٹیکسٹائل ڈیزائننگ اسکیم وغیرہ کام کر رہے ہیں۔ قوی امید ہے کہ ان نئی اسکیموں سے ترقی کے اثرات جلد نمایاں ہوں گے۔ ان کے حقیقی مقاصد حسب ذیل ہیں۔

(۱) پیشہ وران کے بچوں کو گھریلو صنعتوں کی تعلیم اور انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے ماہروں کی نگرانی میں تربیت دینا۔

(۲) جدید اور ترقی یافتہ آلات کا مظاہرہ۔

(۳) جدید وضع اور نقوش کے مصنوعات کے طیار کرنے میں مدد دینا۔

(۴) خام اشیاء اور دوسرے ضروری متعلقہ اشیا پیشہ وروں کو فراہم کرنا۔

(۵) طیار ہونے والی چیزوں کی نکاسی کے تدابیر اختیار کرنا اور سہولت بہم پہنچانا۔

اُونی صنعت

اُونی صنعت بھی ریاست حیدرآباد کی ایک اہم گھریلو صنعت ہے اس سے تقریباً ۹ لاکھ اشخاص اپنا روزگار حاصل کر رہے ہیں۔ یہاں سالانہ تقریباً سات لاکھ کمبل طیار کئے جاتے ہیں۔ ان میں تقریباً دو لاکھ کمبل برآمد کئے جاتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں حکومت حیدرآباد نے ہندوستانی افواج کو بلانکٹ فراہم کرنے کے لئے ایک اسکیم منظور کی تھی۔ اس تجربے کے پیش نظر بلانکٹ سازی کی ایک جدید اسکیم منظور کی گئی ہے۔ اضلاع محبوب نگر نظام آباد اور ورنگل میں ان کے مراکز قائم کئے گئے ہیں۔ اس اسکیم کا خاص مقصد یہ ہے کہ دستی اونی صنعت کو صحیح اصول پر ترقی اور ان لوگوں کو موثر امداد دی جائے جن کی روزی اسی گھریلو صنعت پر ہے۔

اس اسکیم کے تحت ترقی یافتہ قسم کے چرخوں کو رواج دیا جا رہا ہے جس سے زیادہ تعداد میں اور بہتر قسم کے کمبل طیار ہوں گے اور بازار میں جلد اور نفع بخش طور پر فروخت ہونگے۔

قالین بافی

قالین بافی حیدرآباد کی ایک مشہور گھریلو صنعت ہے جو کئی صدی سے اپنی شہرت قائم کئے ہوئے ہے۔ ۱۸۵۱ء میں لندن کی نمائش گاہ میں حیدرآباد کے بعض نادر مصنوعات روانہ کئے گئے تھے وہاں وارنگل کے قالین خوبی، نفاست اور نقش و نگار کے لحاظ سے بہترین تسلیم کئے گئے۔ لیکن بعد کے زمانے میں اس گھریلو صنعت پر زوال آ گیا۔ اور تقریباً ختم ہو رہی تھی ایسے نازک وقت میں محکمہ صنعت و حرفت نے اس کو اپنے ہاتھ میں لیا اور قالین سازی کا ایک آزمائشی کارخانہ قائم کیا گیا۔ اس کارخانے میں اونچے درجے کے معیاری قالینوں سے لے کر اوسط اور معمولی قسم کے سستے قالین طیار ہوتے تھے صناعوں کو خام اشیاء اور رقمی امداد دی جاتی تھی۔ حیدرآباد ہاؤس دہلی کے

لئے اعلیٰ قسم کے قالین وارنگل کے اسی فیکٹری میں طیار کئے گئے ہیں ۔ دوسری بڑی جنگ کے زمانے میں قالینوں کی مانگ باقی نہ رہی تھی اس لئے یہ کارخانہ حیدرآباد کے ایک بڑے صنعت کار کے حوالے کر دیا گیا مگر ترقی نہ کر سکا ۔ اس لئے اب پھر محکمہ صنعت و حرفت نے ورنگل کی قالین بافی کو ترقی دینے کی ایک جدید اسکیم طیار کی ہے ۔ جس سے توقع ہے کہ اس صنعت کا معیار اونچا ہوگا ۔ صناعوں کی کثیر تعداد روزگار سے لگ جائے گی اور نوجوان کاریگروں کو صنعتی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے گا ۔

ریشم سازی

ریشم اب کسی خاص طبقے کی زیب و زینت کا لوازمہ نہیں رہا ہے بلکہ دنیا کے ہر ترقی یافتہ ملک میں امیر و غریب کی روزمرہ کی احتیاجات میں سے ہو گیا ہے ۔ لباس سے کہیں زیادہ طبی، برقی سائنس اور فوجی ضروریات میں استعمال ہو رہا ہے جس سے مستقبل میں خام ریشم کی بڑی کھپت کا پتہ چلتا ہے ۔ کاشت کار بھی اپنے فرصت کے اوقات میں ریشم سازی کو ذیلی پیشے کے طور پر اختیار کر سکتے ہیں ۔

حیدرآباد میں ہر سال تقریباً چالیس لاکھ روپے کا ریشم درآمد کیا جاتا ہے ۔ یہاں کے حالات صنعت ریشم کے لئے موزوں ہیں ۔ ایری سلک اور شہتوت کے ریشم کی صنعت کو رائج کرنے اور صنعت ٹسر کی تنظیم کے لیے ایک اسکیم پیش کی گئی ہے ۔ اس کی منظوری کے بعد ریشم کی صنعتوں کا قیام اور تنظیم عمل میں آئے گی ۔ اس سال مانبر پراجیکٹ میں ریشم سازی کے کام کا آغاز کر دیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ کاشتکار جو اپنی زمینوں پر شہتوت کی کاشت اور ریشم سازی کو ترقی دینا چاہتے ہیں ان کو محکمہ صنعت و حرفت کی جانب سے فنی ٹیکنیکل سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں ۔

صنعتِ دباغت و چرم سازی

ریاست حیدرآباد کے تقریباً پانچ لاکھ اشخاص دباغت اور چرمی اشیاء کی تیاری سے اپنی زندگی گزارتے ہیں ۔ لیکن جدید اصول کی ناواقفیت کی وجہ سے زرعی و دیہی ضروریات کے لئے معمولی طریقے پر دباغت کر لیتے ہیں جو بہت ہی خراب اور ناپائیدار ہوتی ہے ۔

حیدرآباد میں صنعت چرم کی خام اشیاء مثلاً چونا، نیل، مختلف قسم کی چھالیں، چمڑے اور کھال کے وسیع ذرائع موجود ہیں ۔ اس کے باوجود چمڑے اور کھالیں دباغت کے بعد مدراس کی بندرگاہ سے انگلستان کو روانہ کر دئے جاتے ہیں ۔ اس قسم کی برآمد میں ملک کا سخت معاشی نقصان ہے ۔ کیونکہ طیار شدہ بوٹ اور شوز اور دوسرا چمڑے کا سامان سالانہ تقریباً پندرہ لاکھ روپے کا درآمد کیا جاتا ہے ۔ مقامی طور پر چرمی سامان مثلاً جوتے، سوٹ کیس اور تھیلیاں وغیرہ طیار کئے جا سکتے ہیں ۔ سرکاری محکمہ جات مثلاً فوج، پولیس اور ریلوے میں ان کی کھپت ہو سکتی ہے ۔ اس طرح ملک کی دولت باہر جانے سے محفوظ ہو جائے گی ۔

تقریباً تمام یوروپی ممالک میں صنعت چرم کافی ترقی یافتہ حالت میں ہے ۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں اس صنعت کو پست قوم کی صنعت سمجھ کر اس طرف ایک مدت تک توجہ نہیں کی گئی ۔ حیدرآباد بھی حال حال تک اس صنعت کی طرف مائل نہ تھا ۔ ۱۹۳۶ء میں انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کی جانب سے اس صنعت کے چند مراکز قائم کئے گئے ۔ محکمہ صنعت و حرفت کی جانب سے ایک جدید اسکیم منظور کی گئی ہے جس کے تحت چار مراکز کا قیام عمل میں آیا ہے ۔ ہر مرکز کے تحت بیس طلباء کو چرم سازی کی تربیت دی جا رہی ہے ۔ دورانِ تعلیم میں ہر طالب علم کو پندرہ روپے ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا ۔ ان مراکز سے مقامی صناعوں کو خام اشیاء بھی فراہم کئے جائیں گے ۔

صنعت بیدری

بیدری صنعت کا نام اپنے مقام کی نسبت سے رکھا گیا ہے ۔ بیدر کی اس گھریلو صنعت کو بہمنی بادشاہوں کے زمانے میں بڑی ترقی نصیب ہوئی اور یورپ تک اس کی قدر ہونے لگی ۔ بیدری برتنوں میں جو ڈیزائن استعمال ہوتے ہیں ۔ وہ مختلف اقسام کے ہوتے ہیں ۔ ان میں سے زیادہ دلکش خاکے قلعۂ بیدر اور اطراف کے گنبدوں کی آرائش و زیبائش سے لئے گئے ہیں ۔ ماضی میں اس زمانے کے رواج اور تمدن کے پیش نظر بیدری برتن، حقے، پان کی تھالیاں، اگالدان اور سلفچی وغیرہ طیار کئے جاتے تھے لیکن اب محکمۂ صنعت و حرفت کی جانب سے صناعوں کو ایسی ہی چیزیں طیار کرنے کے مشورے دئے جاتے ہیں ۔ جن کے استعمال کی عام طور پر ضرورت محسوس کی جاتی ہے مثلاً مختلف وضع کے سگریٹ کیس، ایش ٹرے، گلدان، بٹن، ساڑی پن، چوڑیاں، پاندان اور کاغذ کاٹنے کی چھریاں وغیرہ ۔ بیدری اشیاء نہ صرف ریاست حیدرآباد اور ہندوستان میں مقبول

ہیں بلکہ سمندر پار ممالک میں بھی اس کی خاص شہرت ہے۔ بیدری کام سے ملتا جلتا کام ایک زمانے میں سیالکوٹ اور کشمیر میں بھی ہوتا تھا لیکن جو نفاست اور کاریگری بیدری سامان میں پائی جاتی ہے وہ اُن چیزوں کو میسر نہیں۔ یہ ہنر بیدر کے چند خاندانوں میں سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے اس وجہ سے گھریلو صنعتوں میں بیدری صنعت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔

اس وقت بیدر میں اس صنعت کے چار کارخانے ہیں جہاں تقریباً ساٹھ مزدور کام کرتے ہیں۔ سالانہ تقریباً دو لاکھ روپے کا بیدری سامان طیار ہوتا ہے۔

صنعتِ تارکشی

ضلع کریم نگر کی تارکشی کی اشیا بھی اپنی نوعیت اور ساخت میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ چاندی کے باریک تار طیار کئے جاتے ہیں اور پھر ان تاروں سے مختلف قسم کی چیزیں مثلاً پاندان، عطردان، چوڑیاں، ایزگس ساڑی پن، پوڈر کے ڈبے اور فونٹن پن وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ یہ ہنر بھی پشت ہا پشت سے چلا آرہا ہے۔ اگرچہ ان سے ملتا جلتا کام کٹک میں بھی ہوتا ہے لیکن اس میں بھدّا پن نمایاں ہے۔ جس قدر نزاکت اور نفاست کریم نگر کے تارکشی کے کام میں ہوتی ہے وہ وہاں کے اشیاء میں نہیں ہوتی۔ بیرونی ماہروں نے اس کام کی بے حد تعریف کی ہے۔ بین الاقوامی نمائشوں میں کریم نگر کی اس صنعت کو بے حد پسند کیا گیا۔

اس وقت کریم نگر اور جگتیال میں تقریباً پچاس اشخاص اس گھریلو صنعت میں مصروف ہیں۔ سالانہ ڈیڑھ لاکھ روپے کا سامان بنتا ہے۔

کاغذسازی

جب سلطان محمد بن تغلق نے دہلی کے عوض اپنا پایۂ تخت دولت آباد کو قرار دیا تو دہلی کے کاغذ بنانے والے بڑی تعداد میں دولت آباد منتقل ہوگئے اور یہاں کاغذ سازی کی صنعت مستقل بنیادوں پر قائم ہوگئی۔ اس کے بعد کاغذ بنانے والے اپنے طور پر اس صنعت کو ترقی دیتے رہے یہاں تک کہ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں اس صنعت کو کافی فروغ ہوا۔ ہر قسم کی سرکاری مراسلت اور خط و کتابت کے لئے اسی مقام کا کاغذ استعمال کیا جاتا تھا۔ چھ سات سو گھرانے کاغذ سازی میں مصروف رہتے تھے اور اس کی بدولت خوش حال زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن بیرونی کاغذ کی درآمد کے ساتھ ہی یہاں کی صنعت پر تباہی آگئی اور پہلی جنگ عظیم سے قبل صرف دوسو (۲۰۰) کاغذ ساز اس صنعت میں مشغول تھے۔ ۱۹۱۷ء کے شروع میں محکمہ صنعت و حرفت کے قیام کے ساتھ ایک کیمیاتی اور صنعتی تجربہ خانہ بھی قائم ہوا۔ اس تجربہ خانہ میں چند طالب علموں کو دستی کاغذ سازی کے متعلق ٹریننگ دی گئی۔

موجودہ زمانہ میں دستی کاغذ کی صنعت ریاست حیدرآباد کے آٹھ مقامات میں جاری ہے۔ اس سے تقریباً دو ہزار پانچ سو اشخاص کو روزگار ملتا ہے۔ ہاتھ سے کاغذ بنانے کی صنعت میں سب سے بڑی رکاوٹ پلپ یعنی گودے کی کمی ہے۔ کاغذ سازوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جو کاغذ بنانے کے لئے ردی کاغذ کو دوبارہ کام میں لاتے ہیں اس لئے محکمہ صنعت و حرفت نے یہ انتظام کیا ہے کہ موروثی کاغذ سازوں کو سرکاری دفاتر کی ردّی بلا قیمت حاصل ہوسکے۔ محکمہ صنعت و حرفت کی جانب سے دستی کاغذ سازوں کو کیمیائی اشیاء بھی کنٹرول نرخوں پر فراہم کئے جاتے ہیں۔ محکمہ اسٹیشنری ڈپو اور محکمہ اسٹور پرچیز بھی دستی کاغذ سازوں کی امداد کر رہے ہیں۔ سرکاری گزٹ کی اشاعت انہیں دستی کاغذوں پر ہوتی ہے۔

شہر حیدرآباد میں آج کل دستی کاغذ سازی کی تین چھوٹی فیکٹریاں چل رہی ہیں۔ یہ کارخانے عید، تہوار اور کرسمس کارڈ، شادیوں کے رقعے رائٹنگ پیڈ اور جاذب کارڈ بورڈ کے ڈبے خوشنما بناتے ہیں جن کی آج کل بڑی مانگ ہے۔

حکومتِ حیدرآباد ملک سے ناخواندگی کو دور کرنے، تعلیم بالغاں اور ابتدائی جبری تعلیم کو نافذ کرنے کی جانب بھی متوجہ ہے۔ ملک میں تعلیم کے پرچار سے کاغذ کی مانگ میں بے حد اضافہ ہو رہا ہے۔ کسی ملک کی تہذیب و شائستگی کا اندازہ کاغذ کے صرفے سے ہوسکتا ہے۔ مختلف ملکوں میں سالانہ فی شخص کاغذ کے صرفے کا کچھ اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ امریکہ میں ہر سال فی شخص ۱۵۲ پونڈ کے حساب سے کاغذ صرف ہوتا ہے۔ جرمنی میں یہ مقدار ۴۸ پونڈ سالانہ فی شخص، جاپان میں ۱۸ پونڈ، مصر میں پانچ پونڈ اور ہندوستان میں صرف ایک پونڈ سالانہ فی شخص کاغذ کا صرفہ ہے اس سے معلوم ہوگا کہ کاغذ سازی کی صنعت میں اضافے کی کس قدر وسعت اور ترقی کی گنجائش ہے۔

بٹن سازی

دوسرے گھریلو صنعتوں کے مقابلے میں بٹن سازی حیدرآباد کی ایک

جدید گھریلو صنعت ہے۔ اس کی ابتدا ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ بٹن سازی کے کچے مال میں پیتل اور تانبے کے تار، جرمن سلور، سونا، چاندی، لوہے اور فولاد کے تار، انامل، لاک، سینگ، ہڈی اور دوسرے کیمیائی اشیاء شامل ہیں۔

کوٹ، قمیص اور شیروانیوں کے بٹن تمام کے علاوہ فوجی تمغہ جات۔ مانوگرام انگوٹھی، ایر رنگس، چوڑیاں، ساری پن، موٹر کے نمبر پلیٹس اور ڈبیوں کے تیلی حلقے وغیرہ خوش نما اور دیدہ زیب طیار کئے جاتے ہیں۔ جن کی ہندوستان کے باہر بھی بڑی مانگ ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں بٹن سازی کو خوب ترقی ہوئی۔ شہر حیدرآباد میں اس صنعت میں کام کرنے والوں کی تعداد ۱۹۴۶ء میں دس ہزار ہو گئی تھی اور تقریباً ایک کروڑ ستر لاکھ روپے کی مالیت کے بٹن تمام طیار ہونے لگے تھے۔ لیکن موجودہ زمانے میں حیدرآباد میں سستے بٹنوں کی درآمد، بیرونی بازاروں کے بند ہو جانے، خام اشیاء کی گرانی اور محصول فروخت وغیرہ عائد ہو جانے کی وجہ سے اس صنعت کو زوال آ رہا ہے۔ اب اس گھریلو صنعت میں کام کرنے والوں کی تعداد پندرہ سو ۱۵۰۰ رہ گئی ہے اور سالانہ دس لاکھ روپے مالیت کے بٹن تیار ہو رہے ہیں۔

صنعت تاڑ گڑ

اس سال حکومت ہند کے ایماء پر تاڑ گڑ کی اسکیم محکمہ صنعت و حرفت کے تفویض کی گئی ہے۔ معاشی سروے کے بعد مٹ پلی (ضلع کریم نگر) میں ایک موزوں اراضی کا انتخاب کیا گیا ہے جہاں بڑی تعداد میں کھجور کے درخت ہیں جن سے تاڑ گڑ طیار کیا جا سکتا ہے۔ اس کی طیاری کے لئے ضروری آلات و اوزار خرید لئے گئے ہیں۔ محکمہ صنعت و حرفت حیدرآباد کی جانب سے چھ امیدواروں کو ٹریننگ کے لئے کڈلور (مدراس) روانہ کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ اس اسکیم کے جاری ہونے سے ترک مسکرات کی تحریک کو فروغ حاصل ہوگا۔

ٹیکسٹائل ٹریننگ سنٹر

گورنمنٹ ٹیکسٹائل ٹریننگ سنٹر جو پہلے گھریلو مصنوعات کے ادارے کے نام سے موسوم تھا ۱۹۳۰ء میں محکمہ صنعت و حرفت کی جانب سے قائم کیا گیا۔ اس وقت سے یہ مرکز گھریلو صنعتوں کی ترقی میں اہم حصہ لے رہا ہے۔ اس ادارے نے بیس سال کی مدت میں دو ہزار سے زاید طلباء کو ٹریننگ دی جو اپنا روزگار آپ حاصل کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ یہاں کاریگروں، پیشہ وربافندوں اور رنگ سازوں کو بھی اعلیٰ ٹریننگ دی جاتی ہے تاکہ وہ اچھی مہارت حاصل کریں۔

ٹیکسٹائل ٹریننگ سنٹر کا کام حسب ذیل امور پر مشتمل ہے۔

(۱) ٹیکنیکل ٹریننگ (۲) مصنوعات کی پیداوار (۳) تحقیقاتی کام (۴) فنی امداد (۵) فراہمی آلات و اوزار اور خام اشیاء۔ یہ مرکز اگرچہ صرف پارچہ بافی کے لئے مختص ہے مگر یہاں لاک کا کام، کھلونا سازی، بیدبافی، منبت کاری، شطرنجی اور قالین بافی، اونی کام، بلاک سازی اور چرم سازی کا کام بھی سکھایا جاتا ہے۔

بہر حال ریاست حیدرآباد میں ٹیکسٹائل ٹریننگ سنٹر۔ صنعتی جدوجہد اور فنی تربیت کے لئے اپنی نوعیت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ مقامی صناع اور کاریگر فنی مشوروں اور خام اشیاء کے حصول سے بڑا فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ بیرونی ممتاز مشاہیر نے اس ادارے کے اعلیٰ معیار کی بڑی تعریف کی ہے۔ مختلف نمائشوں میں اس ادارے کے گھریلو مصنوعات نے اپنی صناعی کے کمال کے لئے بڑی شہرت حاصل کر لی ہے۔

مصنوعات کی نکاسی

گھریلو صنعتوں کے ترقی نہ کرنے کی ایک اہم وجہ مصنوعات کی نکاسی کا فقدان ہے۔ ہمارے کاریگر اپنے سامان کے لئے کوئی باقاعدہ اور نفع بخش بازار مہیا کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے محکمۂ صنعت و حرفت نے ۱۹۳۰ء میں فروخت گاہ مصنوعات ملکی کی بنیاد ڈالی۔ اس فروخت گاہ نے بہت سے گھریلو مصنوعات کی نکاسی کا بہترین انتظام کیا ہے۔ جو لوگ اپنا سامان بازار میں فروخت نہیں کر سکتے ان کے لئے یہ سیل ڈپو ایک اچھا خریدار ہونے کے علاوہ بازار میں ان اشیاء کا تعارف اور کھپت کا ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوا ہے۔

یہ سیل ڈپو اپنے کاروبار کو مسلسل بڑھا رہا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں سامان کے فروخت کی مقدار صرف ایک ہزار پچیس روپے تھی تو ۱۹۴۸ء میں چار لاکھ اسی ہزار روپے کی مالیت کا سامان فروخت ہوا۔ اس فروخت گاہ نے پچھلے سالوں میں ہندوستان کی نمائشوں کے علاوہ انگلستان، کینیڈا اور آسٹریلیا کی صنعتی نمائشوں میں حصہ لیا اور حیدرآباد کی

مصنوعات نے خراج تحسین حاصل کیا۔ اس سلسلہ میں گھریلو صنعتوں کی کافی تشہیر اور پرچار کیا جا رہا ہے ۔

ماہ دسمبر ۱۹۴۸ء میں شریمتی وجے لکشمی پنڈت سفیر ہندوستان متعینہ امریکہ نے اس ادارہ کا معائنہ فرمایا اور ہمارے گھریلو مصنوعات سے بے حد دلچسپی کا اظہار فرماتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ حکومت ہند کے توسط سے ان صنعتوں کو بیرون ہند خصوصاً انگلستان اور امریکہ کو روانہ کرنے کا انتظام کیا جائے ۔

حال ہی میں حکومت ہند نے ایک مستقل مرکزی امپوریم نئی دہلی میں قائم کیا ہے اس کے لئے ہمارے اس فروخت گاہ سے دس ہزار روپے کے گھریلو مصنوعات خرید لئے گئے ہیں۔ ہندوستان سے باہر بھی ان کی فروخت کا انتظام کیا جا رہا ہے ۔ ہندوستانی سفارت گھروں میں حیدرآباد کے گھریلو صنعتوں کی نمائش کی جا رہی ہے ۔ چنانچہ بیرونی ملکوں سے مختلف استفسارات وصول ہو رہے ہیں جس سے توقع ہے کہ یہاں کی گھریلو مصنوعات بڑی مقدار میں برآمد ہوا کریں گی ۔

اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ گھریلو صنعتوں کو مستحکم اور مضبوط بنیادوں پر قائم کیا جائے اور ان کو ترقی دی جائے سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ معاشی آزادی بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم صنعتی اشیاء کی طیاری اور اپنی ضرورتیں آپ پوری کرنے کے قابل نہ ہو جائیں ۔

کشمیر کی صحت گاہیں

گلمرگ اگرچہ سرینگر دل کشمیر ہے تاہم اس سے ۳۰ میل کے فاصلے پر حسن و تنہائی کے شیدائی کے لئے گلمرگ بہت زیادہ کشش رکھتا ہے ۔ یہ ایک چھوٹی سی صحت گاہ کوہ پیر پنچال کی بلند ڈھلوانوں کے سینوں پر قدم جمائے ہوئے اس وادی جنت نظیر کی بہترین آب و ہوا اور لا متناہی مناظر کا ہدیہ پیش کرتی ہے ۔ گلمرگ کا نام بھی اس کی سرسبز و شاداب اور گل پوش چراگاہوں کی وجہ سے رکھا گیا ہے اور اس کے نیچے وادی کا ایک خوشنما منظر آتا ہے ۔ ان وسیع چراگاہوں میں آٹھ سوراخ والے گالف کے ایسے میدان واقع ہیں جو دنیا میں بلند ترین ہونے کی وجہ سے بہت مشہور و معروف ہیں موسم سرما میں جب اردگرد کے پہاڑ برف پوش ہو جاتے ہیں تو گلمرگ "سکائی" کے شائقین کی کشش کا باعث ہوتا ہے ۔ وسطی چراگاہوں سے اردگرد کی پہاڑیوں اور خوبصورت سایہ دار جگہوں تک چھوٹی چھوٹی پگ ڈنڈیاں جاتی ہیں ۔ جہاں پر سیاح سیر و تفریح کے واسطے جا سکتے ہیں ۔ صحت بخش آب و ہوا اور دلکش قدرتی مناظر گلمرگ کو ایک معیاری تفریح گاہ کا مرتبہ بخشتے ہیں ۔

پہلگام یہ مقام بہت سی خوبیوں میں گلمرگ کے ہو بہو ہے ۔ پہلگام کا قدرتی حسن ابھی تک انسان کی دست برد سے بچا ہوا ہے ۔ اس مقام کی وسیع خیمہ گاہوں پر آپ کو خیمے اور ٹنٹ قطار در قطار نظر آئیں گے ۔ جہاں پر متوسط حیثیت اور سادہ مزاج لوگ مقیم ہو کر قدرت کی نعمتوں سے بہرہ یاب ہو سکتے ہیں ۔ اس مقام کا نام ہی یعنی "چرواہوں کا گاؤں" اس کے سادہ اور دیہاتی ماحول کی دلیل ہے ۔

یہ مقام وادیٔ لدّر کے قلب میں واقع ہے اور عموماً یورپینوں کی بہ نسبت ہندوستانیوں میں زیادہ مقبول ہے ۔ اس کے ایک پہلو سے برف جیسا خنک دریا لدّر جوش و خروش سے بہتا ہوا نکل جاتا ہے اور مشہور گلیشیر کولاہی کے اردگرد کی بلند چوٹیاں اس سطح مرتفع کے پیچھے سے جھانک رہی ہیں ۔ اس علاقہ میں دور تک پھیلے ہوئے گنجان درختوں میں بڑا شکار کثرت سے ملتا ہے جس کے باعث پہلگام شکاریوں اور تفریح کرنے والوں کے لئے زیادہ باعث کشش بن جاتا ہے ۔

کوکرناگ سرینگر سے پچاس میل کے فاصلہ پر یہ ایک اور صحت بخش مقام ہے جو گندھک کے چشموں کے لئے مشہور ہے ۔ دور سے یہ ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ کہ گویا ایک چٹیل ٹیلے پر لکیریں کھینچی ہوئی ہیں کوکرناگ اپنی ٹراؤٹ قسم کی مچھلیوں کی پرورش گاہ پر فخر کر سکتا ہے اور سیزن میں یہاں مچھلی کے شکاری جوق در جوق نظر آتے ہیں ۔

ذکر و فکر

غزل

جلال ملیح آبادی

اداس اداس ہے دل، اس کلی کو پھر مہکاؤ
گھٹائیں گاتی ہوئی آ رہی ہیں تم بھی آ ؤ

ہوا میں کیف ہے، نرمی ہے، لطف و مستی ہے
ہوا کے دوش پہ شب تاب کاکلیں بکھراؤ

بجھی بجھی سی ہے شمعِ حیات مدت سے
ستارے چھپ گئے، تم مسکرا کے شمع جلاؤ

ہر ایک بوند کھنکتی ہے ساغرِ گل پر
گھٹا نے ساز بجایا ہے تم رباب اٹھاؤ

گھٹائیں جھوم کے اٹھی ہیں کوہسار وں سے
رخِ شگفتہ پہ تم زلفِ عنبریں لہراؤ

بساطِ گل پہ یہ رنگیں خرامیاں تیری
کہ جیسے ڈولتی جاتی ہو موجِ گنگ و جمن

رخِ شفق سے دھنک بن کے اک کرن پھوٹی
کہ جیسے تیرے تبسم کا تیرے لب پہ سبھاؤ

رکی رکی سی ادائیں چھپے چھپے ارماں
قریب میرے ذرا آؤ، دل کے پاس آ جاؤ

جھلک کے سبزۂ رنگیں پہ زلفِ پرافشاں
بساطِ سبزۂ رنگیں پہ کہکشاں برساؤ

یہ رخ، یہ نورِ تبسم، یہ جلوۂ گلنار
کہ لالہ زار میں ہے نرم چاندنی کا بہاؤ

بڑھو، کہ صحنِ گلستاں خنک ہے شبنم سے
اٹھو، فشردۂ انگور سے لہو گرماؤ

غزل

عبدالعزیز فطرت

کیا غم انگیں ہے فضا گل ہیں پریشاں کیسے
سہمے سہمے ہیں طیورِ چمنستاں کیسے

کس نے بکھرا دئے اجزائے کتابِ ہستی
جمع تھے کل یہی اوراقِ پریشاں کیسے

ہم بھی احباب کی مانند ہیں مایوسِ حیات
کس کی امیدِ وفا لطف کے ارماں کیسے

جن میں قائم ہے ابھی محفلِ یارانِ کہن
میرے ماضی کے وہ لمحے ہیں درخشاں کیسے

اپنے دیرینہ غموں ہی سے نہ فرصت تھی مجھے
یہ نئے داغ ہیں سینے میں فروزاں کیسے

کاش گفتار ہی فطرت کا اثر ہے شاید
آج گم سم ہیں فدایانِ گلستاں کیسے

غزل

حیات لکھنوی

اے محبت بس تری آغوش میں سویا کیا
بے وفا کی یاد میں خوابِ وفا دیکھا کیا

یہ نہ پوچھو میں نے فرقت میں تمہاری کیا کیا
داغِ دل کو آنسوؤں سے عمر بھر دھویا کیا

چھیننے والے یہ تو فرما دے خدا کے واسطے
پہلے کیوں نظریں ملائیں تھیں جواب اب کیا کیا

اللہ اللہ رے محبت کی کرم فرمائیاں
لمحہ بھر بھی جو ہنسا وہ عمر بھر رویا کیا

حضرتِ ناصح کا کہنا بھی بجا ہے اے حیات
اس فریبِ حسن نے عالم تہ و بالا کیا

غزل

آصف طرب

خوشی بمنزلۂ غم نہیں تو کچھ بھی نہیں
جبینِ گل پہ جو شبنم نہیں تو کچھ بھی نہیں

نہ دیکھ میرے گناہوں کی وسعتیں واعظ
حیاتِ لغزشِ آدم نہیں تو کچھ بھی نہیں

قدم قدم پہ شکستوں کا ڈر ہے جلوؤں سے
نگاہ و دل جو منظم نہیں تو کچھ بھی نہیں

سمجھ میں آ نہ سکی کیا وسعتِ حدیثِ کرم
تری نگاہ جو برہم نہیں تو کچھ بھی نہیں

مزاجِ غنچہ و گل کی شگفتگی تسلیم
مگر نزاکتِ شبنم نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہزار گرمیٔ بزمِ جہاں ہوا لیکن
بنامِ عشق اگر ہم نہیں تو کچھ بھی نہیں

نصیبِ عشق تو ہوتا ہے غم طرب سب کو
بقدرِ عشق اگر غم نہیں تو کچھ بھی نہیں

نذرانہ

منیب

ہر ایک امروز کے ہمراہ فردا لے کے آیا ہوں
نگاہوں میں مشیت کا اشارا لے کے آیا ہوں

کوئی بھی ساز جس کی ہم نوائی کر نہیں سکتا
لبوں پر ایک ایسا تلخ نغما لے کے آیا ہوں

اب اس کو داغِ تازہ دل کا سمجھو یا چراغِ رہ
شبستانِ الم میں ایک اجالا لے کے آیا ہوں

نئی قدریں منازل ارتقائی طے کریں اپنی
کہن قدروں کو ڈھانے کا میں ذمہ لے کے آیا ہوں

مرے ہمراز اب آ کر مکمل تو ہی کر اس کو
تصور میں ادھورا ایک سپنا لے کے آیا ہوں

زمانہ مجھ کو اپنائے نہ اپنائے اب اس سے کیا
میں اپنے ساتھ اپنا اک زمانہ لے کے آیا ہوں

سلامت اللہ خاں

شمع و پروانہ

اردو زبان میں شمع کو ایک ہمہ گیر رومانی حیثیت حاصل ہے اور جہاں کہیں بھی شمع کا استعمال ہوتا ہے ہمارے ذہن میں بہت سے مفہوم اُجاگر ہونے لگتے ہیں۔ اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شمع کوئی جاندار شے ہے۔ یا جیسے وہ اس درد، تپش اور سوز سے ناآشنا نہیں جس کے باعث وہ جلتی ہے۔ یا جیسے ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کی ٹمٹماتی، جھلملاتی ہوئی لو ہماری زندگی کے غم و اندوہ کی رازداں ہے وہ جلتی ہے تو محض اس لئے نہیں کہ جلنا اس کا کام ہے بلکہ اس لئے کہ بیشتر انسانی زندگیاں بھی سوزِ دروں سے گرم ہیں۔ اسی لئے بعض شعراء نے انسانی زندگی کی غم انگیزی اور گرانی محسوس کرتے ہوئے شمع کی زندگی میں اس کی جھلک دیکھی ہے۔

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
ہم نے تو ساری عمر گزاری ہے اس طرح

جلائیں شمع کی مانند عمر بھر خاموش
تمام عمر کٹی قصہ مختصر خاموش (آتش)

شمع شبِ فراق بنے ہم تو مصحفی
ہم دل جلوں کو عیش کی محفل سے کیا خبر

شمع صفت مصحفی اس بزم میں
جوں بنی توں عمر بسر کر گئے

اور ایک قسم کی تھکی ہاری تسکین محسوس کی ہے کہ کم از کم ایک مثال ایسی تو ہے جو ہماری زندگیوں کی ہمنوا ہے —

غالب نے ایک اور انداز سے اس رشتے کو دیکھا ہے جو ہماری اور شمع کی زندگیوں کے درمیان ہے۔ جلتی ہوئی شمع میں انہیں انسان جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ شمع کی منزل سحر ہے اور انسان کی منزل موت۔ جس کے بعد دونوں اپنے ابدی و لامتناہی غم سے نجات پا جاتے ہیں۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شمع اور پروانے کی کہانی بھی روایتی اور کہنہ ہونے کے باوجود ہمیشہ نئی اور دل نشیں لگتی ہے۔ پروانے کی وارفتگی اور دیوانگی کو شیخ و ناصح کی عقل و خرد یا پند و نصائح پر ترجیح دی گئی ہے۔ اردو شاعری میں اکثر اس کے اشارے بھی ملتے ہیں جہاں پروانہ صرف علامت ہوتا ہے اور بات در پردہ کچھ اور کہتی ہوئی ہے۔ اس طرح پھر شمع ہماری زندگی سے قریب ہو جاتی ہے۔ جلتی ہوئی شمع کے گرد "وارفتگانِ عشق" کا ہجوم بہت کچھ ہماری زندگی سے گھل مل جاتا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ ہمارے سماج میں کتنی شمعیں اس طرح اپنے تابناک آنچل کے اوٹ میں اپنی ادھوری کہانیاں سناتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ سحر کی گود میں ناشاد و نامراد خاموش ہو جاتی ہیں۔ پھر کتنی شمعیں ہیں جن کی زندگی کسی لَو سے شناسا نہیں ہوتی۔ ان کے گرد و پیش کی تاریکی ایک لمحے کے لئے بھی اوجھل نہیں ہوتی اور وہ یونہیں بجھی ہوئی مرجاتی ہیں۔ اسی لئے شمع کی بے زبانی یا خاموشی اردو شاعری میں مختلف رنگ میں اجاگر ہوئی ہے۔

زبانِ شمع ہے اپنی زبان اے محشر
بیانِ سوزِ غم جانگزیں نہیں کرتے

یہ سوزِ شمع ہے کس کی خو کہ جلے دل، ورنہ آئے لو
یہ سکوت دیکھ لو آرزو کہ ہے کس زبانِ دراز میں

زبان تک نہ ہلی ان کے روبرو اے شمع
ترے سکوت نے قصہ مرا تمام کیا

کون قصّہ کہے ان سے شبِ تنہائی کا
شمعِ خاموش کو یارا نہیں گویائی کا

شاید اسی لئے ہم جب کبھی شمع کا نام سنتے ہیں تو ایک پرسکون افسردگی کا احساس ہوتا ہے۔ کہنے کو تو گھی کا چراغ بھی جلتا ہے۔ جس کا تلازم برعکس معنوں میں ہے لیکن آپ گھی کی شمع کسی کو بولتے ہوئے نہیں سنتے۔ شاید یہی سبب ہے زبان دانوں خصوصاً شعراء نے شمع کو ہمیشہ غم و اندوہ سے ہمکنار دیکھنا پسند کیا۔ محلوں کی مسرت آمیز فضا میں شمع کا مسکن نہیں۔ شمع کا رنگ و روپ مفلس کے جھونپڑوں ہی کو زیب دیتا ہے۔ یا پھر اس سنسان و ویران قبر کا تصوّر کیجئے۔ جس پر کچھ دیر کے لئے ہماری نظریں جم جاتی ہیں۔ قبر کے کسی ویران طاق میں ایک شمع جھلملاتی ہوئی نظر آتی ہے جس کے سامنے انسانی زندگی کے تمام ہنگامے اس آہنی نظام کے سامنے حقیر نظر آنے لگتے ہیں۔ اس افسردگی کی تصویر امیر مینائی کے شعر میں دیکھئے۔

کیا بیکسی کا عالم میرے مزار پر ہے
جو آگیا وہ بن کر شمعِ مزار رویا

شمع کی اس غم انگیزی کا شعور شاید غالب کو بہت زیادہ تھا۔ گزری ہوئی صحبتوں کی یاد ایک ٹیس کے ساتھ کسی کے دل میں نہیں آتی خصوصاً وہ صحبتیں جن کی دوبارہ کوئی امید نہ ہو لیکن یہ درد اور گہرا ہوجاتا ہے جب اس کی ہمنوا ایک خاموش شمع بھی ہو۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

میرا ذہن یہ سوچتے سوچتے پھر شمع اور پروانے کی داستان کی طرف منتقل ہورہا ہے۔ پروانے دیوانے' لیکن ان کے رقص میں زندگی کی کتنی بے پناہ حرارت ہے۔ مرمٹنے کا کتنا بے پایاں ذوق ہے۔ زندگی کی بازی لگاکر یہ گمنام پروانے کیسے ہنسی خوشی جل مرتے ہیں اور اس والہانہ رقص میں موت کی خنکی یا جمود کا کبھی احساس بھی نہیں ہوتا۔ اس میں رقص شرر کی کیفیت ہوتی ہے۔

جلے جاتے ہیں اُڑ اُڑ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

اور دراصل اگر پروانوں میں یہ نادانی نہ ہوتی تو ہم شمع کی کتنی بڑی کہانی سے محروم رہتے۔ اس کہانی کا کچھ حصہ شعراء کی زبانی آپ بھی سنئے

جل بجھا خود جب لگی دل کی بجھی
جان سے پروانۂ محفل گیا (جلال)

اب جفا ہے نہ وفا' یادِ وفا باقی ہے
تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانے کی (فانی)

شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا
یادگارِ حسن و عشق اک داغ دل پر رہ گیا (عزیز)

محفل عیش ہو یا مجلسِ غم دونوں میں
شمع کو روتے پتنگوں کو تڑپتے گزری (امیر)

فلسفی شاعر مختلف انداز سے شمع و پروانہ کو دیکھتا ہے۔ جس طرح پروانے تاریکی کے نامعلوم گوشے سے شمع کے اُجالے میں آتے۔ اس کے گرد منڈلاتے ہیں اور اپنا انجام سوچے بغیر جل مرتے ہیں۔ اسی طرح ہم انسان تاریکی سے اس دنیا کی روشنی میں آتے۔ اپنے حوصلے کے مطابق کچھ دیر یہاں جد و جہد کرتے اور پھر اسی ابدی تاریکی کی طرف پلٹ جاتے ہیں جس کا نام موت ہے۔

پروانہ گرد شمع فقط اک نفس رہا
پھر اس کی خاک دیکھی وہاں دو گھڑی کے بعد

ایک اور شاعر نے انسانی فلسفۂ زندگی کو شمع ہی کی داستان بنا کر پیش کیا ہے۔

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

شمع کے کچھ شوخ پہلو بھی ہیں۔ آپ نے محبوب کا مقابلہ ماہ کامل سے اکثر سُنا ہوگا۔ لیکن کیا آپ نے اس تصویر کو بھی غور سے دیکھا ہے۔

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

یہ مقابلہ کتنا انوکھا ہے۔ ایک طرف محبوب کی پوشیدہ حسد شاید شمع کی فتح مندی پر حسرت اور دوسری طرف برسرِ عام اس اعتماد سے چیلنج۔ یہ شعر کتنا ہی پرانا اور زبان زدہ عوام کیوں نہ ہو لیکن یہ تصویر

کتنی لطیف اور اس ناممکن خیال کے باوجود دل بھٹک جاتا ہے کہ شاید پروانے کو رُخِ روشن پر شمع کا دھوکہ ہو جائے - شاید —— اور شاید —— لیکن ایک لمحے کی فکر کے بعد اس خیال کا ناممکن پہلو ہمارے خوش آیند خیال کا ابطال کر دیتا ہے - اس قسم کے مقابلے اردو شاعری میں اکثر ملتے ہیں -

شمع اس چہرۂ پر نور سے کیا رو کش ہو
رتبۂ حسن میں جو شمس و قمر سے گزرا (مصحفی)

بیٹھے وہ جو شب نقاب اٹھا کر
بجھنے لگی شمع جھلملا کر (صبا)

میں نے ابھی کہا ہے کہ زباں دانوں نے شاید شمع کو ہمیشہ غم و اندوہ سے ہمکنار دیکھنا پسند کیا لیکن اس کے لئے کوئی خاص قانون مرتب نہیں ہوا - اکثر شعراء نے چراغ کو افسردہ دیکھا ہے - اقبال کی نظم "شمع و شاعر" میں شمع فلسفی اور ناصح بھی ہے - لیکن میرا دل اس خیال سے بغاوت کرتا ہے کہ ہم شمع کی افسردگی اور چراغ کی مسرت کو ملا دیں - ہندی لفظ دیپ بھی بے حد خوبصورت ہے لیکن اس کے استعمال میں بھی وہی گنجلک ہے - دیوالی کے دیپ جگ مگ بھی جلتے ہیں اور برہ کی آگ میں جلتی ہوئی برتیا کو بھی دیپ سے تشبیہ دیتے ہیں - اور یہ کچھ غلط ہے - میرے نزدیک تو شمع وہی ہے جو اداس ہو، زرد ہو، جو غم کی راز داں ہو، جو درد سے آشنا ہو، جو اپنے ماحول و فضا سے برسر پیکار ہو - جس کی زندگی کا ہر لمحہ شدید اضطراب میں ہو، جو ہوا کے تھپیڑوں سے سہمی ہوئی اپنے مستقبل سے بے پروا تاریکی سے لڑتی رہے - شاید اسی لئے غالب نے کیا خوب کہا ہے -

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں

یوں تو ہر طرح کی شمع آپ نے دیکھی اور سنی ہو گی لیکن ایک شمع اور ہے جسے ہم "شمع امید" کہتے ہیں - زندگی کے ان لمحات میں جب روح حزن و یاس سے بوجھل ہوتی ہے ہم شمع امید ہی کا سہارا لیتے ہیں - آنے والے زمانے کے واقعات کتنے ہی بھیانک کیوں نہ ہوں، زندگی پر چھائی ہوئی شام کتنی تیرہ و تاریک کیوں نہ ہو ہم کچھ دیر کے لئے شمع امید ہی کے سہارے قنوطیت کی زہر آلود تلخیوں سے نجات حاصل کرتے اور بہت کچھ بے خوف ہو کر مستقبل کا خیر مقدم کرتے ہیں - شاید کسی لاعلاج مرض میں آپ نے یہ موہوم شمع امید روشن دیکھی ہو اور آپ کو احساس ہوا ہو کہ وہ روشنی جھوٹی ہے لیکن پھر بھی ہم کتنی کوششوں سے اس شمع امید کو روشن رکھتے ہیں - کتنے بہلاوے - کتنی جھوٹی تسلیاں - ڈاکٹر، نرس، تیمار دار سبھی کوشاں رہتے ہیں کہ مریض مایوس نہ ہو جائے - کتنے لوگ اسی طرح شمع امید کے سہارے زندہ رہتے ہیں -

"تاریکیوں میں غم کے تھپیڑے سہا کئے
شمع امید تیرے سہارے جیا کئے (خورشید الاسلام)

لیکن کیا آپ نے سوچا ہے کہ امید کو اس طرح شمع سے وابستہ کرنے میں کیا راز ہے - راز شاید یہ ہے کہ امید یاس کے مقابلے میں اکثر کمزور ہوتی ہے - اکثر اس کا خطرہ رہتا ہے کہ امیدوں کے محل پاش پاش نہ ہو جائیں - اور مایوسی غالب نہ آ جائے - یہ جدو جہد تقریباً وہی ہوتی ہے جو شمع کی روشنی اور گرد و پیش کی تاریکی یا شمع کی لو اور ہوا کے تھپیڑوں میں ہوتی ہے - کتنی دفعہ شمع کو دیکھتے ہوئے آپ نے یہ خطرہ محسوس کیا ہو گا کہ کہیں ہوا کے جھونکے اسے بجھا نہ دیں اور کتنی دفعہ آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہو گا کہ کہیں آپ کی ساری امیدیں خاک میں نہ مل جائیں - اس خطرے کا اظہار شعراء کی زبانی بھی سنئے -

روح کے ساتھ ہی قالب میں قضا بھی آئی
شمع آئی تو مرے گھر میں ہوا بھی آئی (اسیر)

شب انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ جلا دیا کبھی اک چراغ بجھا دیا (مجروح)

ایک شمع اور بھی ہے جسے ہم شمع محفل یا رونق محفل کہتے ہیں - شاید اس مشہور شعر سے اس ترکیب کے سمجھنے میں آسانی ہو -

محفل میں رات ایک ترے عکس کے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

محفل میں تو سبھی قسم کے لوگ شامل ہو سکتے ہیں اور کم از کم ایک مثال ایسی ہے جب "بزم ناز" "غیر سے تھی" کی تمنا پر ایک صاحب ذوق "ستم ظریف" کے ہاتھوں رسوا ہو چکے ہیں - اس لئے محفل میں عموماً آداب محفل برتنے کے علاوہ اور کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی - اس میں "رب ارنی" بھی ہوتی ہے اور "لن ترانی" بھی لیکن وہ ذات محض ایک ہوتی ہے - جو رونق محفل یا شمع محفل کا لقب پاتی اور جس کے پرتو کے بغیر

ہر ایک بے صنوبر ہے - یا جن کی آمد پر بقول امیر مینائی

بے نقاب آئے جو وہ رات کو محفل میں امیر
شمع نے بڑھ کے کہا رونقِ محفل آئے

پھر شمع زندگی کا ذکر بھی بے محل نہیں کیونکہ جہاں عشاق نے خود کو پروانوں سے تشبیہ دی ہے وہاں محبوب کو شمع بنانے پر مجبور کیا ہے - ایسی شمع جو اُن کی زندگی کے تاریک لمحات کو بھی تابناک بنانے رہتی ہے - یہ آپ کے نزدیک مبالغہ ہو لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہماری زندگیوں میں داخل ہوتے ہیں تو ہمارے وجود کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھتا ہے اور جب جاتے ہیں تو اپنے ساتھ نہ صرف ہماری روح کے اُجالے بلکہ سورج کی شعاعوں کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں اور ہمارے وجود پر ایک پُر اسرار دھندلکا چھا جاتا ہے - اس کے علاوہ شمع آرزو سے کون آشنا نہیں - کتنی تمنائیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ہم تمام سینے سے لگائے رکھتے ہیں اور کتنی آرزوئیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیشہ ناتمام رہتی ہیں - زندگی کے اس طویل سفر میں وہ شمع کے مانند جلتی ہیں اور ہم ہمیشہ اُن کی حسرت انگیز دمک محسوس کرتے ہیں -

نہ کر اے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں (امیر مینائی)

ہوا مہمان آکر رات بھر وہ شمع رو برسوں
رہا روشن مرے گھر کا چراغ آرزو برسوں (انس)

شاید آپ نے غور نہ کیا لیکن شمع میں بہت کچھ خصوصیتیں ہندوستانی دلہن کی ہوتی ہیں - شمع کے مدھم اُجالے کی طرح دلہن اپنے گرد گھونگھٹ کا دھندلکا لئے دھندلائی ہوئی نظر آتی ہے - بہت کچھ شمع کی طرح افسردہ - بہت کچھ شمع کی طرح مستقبل کے دھندلکے میں کھوئی ہوئی - بہت کچھ شمع کی طرح سہمی ہوئی پھر بھی اس کے دل کی دھڑکنوں میں کتنی امنگیں رقصاں ہوتی ہیں - وہ چنچل سپنے جو اس کی سہیلیوں نے سُنا رکھے تھے کیا وہ سچ ہو سکیں گے اور دلہن کے قدم ڈگمگاتے ہیں، پاؤں لڑکھڑاتے ہیں، جھلملاتی ہوئی، کانپتی ہوئی شمع کی لَو کی طرح -

آخر میں لطف خاطر کے لئے چند شعر اور سنیئے -

باغ میں بلبل و گل بزم میں پروانہ و شمع
بھیس بدلے ہوئے پھرتی ہے محبت تیری (اسیر)

ابھی وہی ہے ہماری شبِ فراق کی شام
ہزار بار جلی شمع اور تمام ہوئی (امیر مینائی)

نہ وہ شمع دیکھیں نہ پروانہ دیکھیں
کوئی ہو انہیں دل جلانے سے مطلب (جلیل)

پروانہ جو چپ ہے رہنے دو کیا کہتی ہے شمع ادھر دیکھو
کہنے سے سمجھنا مشکل ہے ہے ایک زباں افسانے دو (آرزو)

شمع و مشعل تو فقط تا بہ سحر جلتے ہیں
دل کو جن کے ہو لگی آٹھ پہر جلتے ہیں

پاس آ مل کے شبِ ہجر گزاریں اے شمع
تو ادھر جلتی ہے تنہا ہم ادھر جلتے ہیں

بشیرالدین

رفعِ جہالت

مسعودہ ایک اَن پڑھ عورت تھی۔ اس کے شوہر رشید کو اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ اس کی بیوی اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتی۔ ایک دن رشید نے اپنی بیوی سے کہا۔

"مسعودہ مجھے یہ سوچ کر بڑی خفت ہوتی ہے کہ میری بیوی اپنا نام تک نہیں لکھ سکتی۔ میری یہ خواہش ہے کہ تمھیں پڑھنا لکھنا آجائے۔ چلو میں تمھیں پڑھانا شروع کروں۔"

"اے ہٹو میں بڑھیا ہونے کو آئی اور تم چاہتے ہو کہ اب میں الف بے شروع کروں۔"

"پڑھنے لکھنے کو عمر سے کیا تعلق۔ بات یہ ہے کہ میرے دوستوں کی بیویاں جن سے میں ملتا ہوں پڑھی لکھی ہیں۔ وہ مجھے طعنہ دیتی ہیں کہ میری بیوی جاہل ہے۔"

"میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ تمہاری توجہ میری طرف سے ہٹ رہی ہے۔ تم پڑھی لکھی عورتوں سے ملتے ہو۔ میری سی اَن پڑھ عورت تم کو کیوں پسند آنے لگی۔"

"یہ تمہاری عادت ہے کہ تم ہمیشہ میری باتوں سے غلط نتیجہ نکالتی ہو۔ تم کو شاید معلوم نہیں کہ ملک میں آزادی ملنے کے بعد سے یہ عام چرچا ہے کہ ہر بچے، بوڑھے، جوان اور عورت کو پڑھنا لکھنا آجائے۔ خاص کر عورتوں کو پڑھنا لکھنا آنا چاہیئے، تاکہ قوم کے بچوں کی پرورش، تعلیم اور تربیت صحیح اور صحت مند طریقوں پر ہو سکے۔"

ارے رہنے بھی دو۔ یہ سب تمہارے بہانے ہیں۔ دوسروں کی عورتوں سے ملنے کے۔ میں تو اب ایسی ہی اَن پڑھ رہوں گی۔"

اس کے باوجود رشید نے ایک روز مسعودہ کو ایک آسان قاعدہ لا دیا۔ مسعودہ نے کتاب کے ورق الٹ پلٹ کر کہا۔

"اچھا تو یہ کتاب صندوق میں بند رہے گی اور نانی پوتوں کے کام آئے گی۔"

رشید ایک دن دفتر میں تھے۔ مسعودہ دھوبی کو کپڑے دینے کے لئے رشید کے کپڑے اکٹھا کر رہی تھی۔ دھوبی کو کپڑے دینے سے پہلے رشید کے کوٹوں کی جیبوں کی تلاشی لینے لگی کہ کوئی چیز دھوبی کے یہاں نہ چلی جائے۔

اتنے میں اُس کو ایک جیب میں ایک لفافہ ملا جس سے خوشبو آ رہی تھی۔ مسعودہ فوراً چونکی اور لفافے میں سے خط نکالا۔ خط کے کاغذ سے اور بھی زیادہ خوشبو آنے لگی۔ خط کھولا پر خط کی عبارت پڑھ نہ سکی۔ اُس کو فوراً شبہ ہوا کہ یہ خط کسی عورت کا لکھا ہوا ہے جس سے رشید خفیہ طور پر خط و کتابت کرتا ہے۔ غصّے سے اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ خط میں کیا لکھا ہے یہ جاننے کے لئے بیقرار ہو گئی۔ مگر افسوس اَن پڑھ تھی۔ اور اس بات کو نامناسب سمجھا کہ کسی غیر سے خط پڑھوا کر خانگی جھگڑوں سے آگاہ کرے۔ اس کو زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا رنج ہوا کہ وہ اَن پڑھ ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے سوچا کہ رشید کو اب اس سے محبّت نہیں رہی۔

خط کو صندوقچے میں بند کیا اور جب رشید دفتر سے پلٹے تو ان سے کہا کہ اس نے اب ارادہ کر لیا ہے کہ وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح پڑھنا سیکھ جائے۔ رشید کو یہ بات سن کر بیحد خوشی ہوئی۔ انھوں نے دوسرے ہی دن ایک آسان قاعدہ لا کر مسعودہ کو دیا۔ مسعودہ نے دل لگا کر پڑھنا شروع کر دیا۔

کچھ دن بعد وہ ہر روز شام کو خوشبودار خط صندوقچے سے نکالتی اور پڑھنے کی کوشش کرتی۔ پر خط کی عبارت اس سے نہیں چلتی۔ تین مہینے کے بعد اس نے خط کو نکالا اور پڑھنے لگی۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

پیارے رشید!

میں تمھیں وہ قاعدہ بھیج رہا ہوں جس کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ دو تین مہینے میں اس قاعدے کی مدد سے تمہاری بیوی کو پوری طرح سے لکھنا پڑھنا آجائے گا۔ اور تمہاری بیوی یہ سمجھ لیں گی کہ جاہل رہنے کے کیا نقصانات ہیں۔ آج کل ہم جہالت مٹانے کی تحریک کی سالگرہ منا رہے ہیں۔ اس موقع پر میں تمھیں یہ خط اور قاعدہ بھیج رہا ہوں۔

تمہارا دوست

مسعودہ نے خط دوبارہ پڑھا اور اپنی حماقت پر اس کو خفّت ہوئی۔

مسئلہ خوراک

پردھان منتری کی نشری تقریر

یکم مئی ۱۹۵۱ء ساڑھے آٹھ بجے رات پردھان منتری نے آل انڈیا ریڈیو سٹیشنوں سے قوم کے نام ایک تقریر براڈکاسٹ کی۔ جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

میں آپ کے سامنے ملک کی خوراک کی حالت کا نقشہ رکھنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے ہمیں یہ جان لینا چاہیئے کہ خوراک کے بارے میں حقیقی صورت حالات کیا ہے۔ ایک طرف تو بہت وسیع علاقوں میں قحط پھیل جانے اور لوگوں کے بھوک سے مرنے کی مبالغہ آمیز خبریں آ رہی ہیں۔ دوسری طرف حالات کی شدت کو کم کرکے بیان کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حقیقت ان دونوں کے بین بین ہے۔ بہار اور مدراس کی ریاستوں میں وسیع علاقوں میں خوراک کی سخت قلت ہے۔ لوگوں کو نسبت کافی مقدار میں خوراک مہیا کی جا رہی ہے۔ اسکے باوجود وہ مسلسل کم خوراک پر جی رہے ہیں۔ ان میں سے جو لوگ بہت مدت تک اس سختی کو برداشت نہیں کر سکتے وہ کمزور ہو کر فوت ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ صحیح معنوں میں ملک بھر میں کہیں بھی اس وقت قحط اپنی بھیانک شکل میں موجود نہیں ہے پھر بھی قحط کا خطرہ ملک پر چھایا ہوا ہے۔

ہمارے سامنے بہت سے ٹھوس اور اہم بین الاقوامی اور گھریلو مسائل ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی قحط کے خطرے کا مقابلہ کرنے سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ اگر ہم اپنے ملک کے لوگوں کو فاقہ کشی کی موت سے نہیں بچا سکتے تو ہماری بڑی بڑی اسکیمیں کسی قیمت کی نہیں ہیں۔ اور ان کی وقعت ہی کیا ہے۔

اس وقت ایک دوسرے پر الزام لگانے میں وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ہمیں تو فوراً ہمت سے اس خطرے کا مقابلہ کرنا ہے۔ جو ہمارے ملک کے لوگوں کے درپیش ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو یہ احساس کرنا چاہیئے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ اور ہر ایک کو اپنی بساط بھر جو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے سدباب کے لئے کرنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اس آفت کو جو ہم پر نازل ہو رہی ہے کچل دینے کا مصمم ارادہ کر لیں اور ہر ایک شخص جتنے اور سے حصہ ادا کرے تو ہم کامیابی سے اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں قحط اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کے خلاف اعلان جنگ کر دینا چاہیئے۔

یہ کوئی سیاسی یا اقتصادی مسئلہ نہیں ہے جس میں کسی کو اختلاف رائے ہو۔ صرف تنگدل لوگ ہی اس صورتِ حالات سے فائدہ حاصل کرنے یا اس سے بھی بدتر اس کو سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس موقعے پر بھی ایک ساتھ مل کر کام نہیں کر سکتے ہیں تو ہم ایسے حقیر مرد و زن ہیں جو کسی بھی نازک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے اہل نہیں ہیں۔

ہم نے دُور دراز ملکوں سے اناج حاصل کرنے کے متعلق بہترین کوششیں کی ہیں۔ جتنا اناج خرید کرنے کی ہم میں استطاعت ہے۔ اتنا ہی ہم نے خریدا ہے اور وہ یکے بعد دیگرے بحری جہازوں میں لدا ہوا بھارت آ رہا ہے۔ پھر بھی یہ کافی نہیں ہے کہ ہم اور زیادہ اناج حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جن ملکوں نے اس بارے میں ہماری مدد کی ہے۔ میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امریکہ کے پاس خوراک کی بہتات ہے اور اس نے ہمیں جہاز بھی مہیا کئے ہیں چین نے اپنی ضروریات کے باوجود ہمیں کئی جہاز اناج سے بھرے ہوئے بھیجے ہیں اور وہ مزید اناج ہمیں بھیج رہا ہے۔

حکومت برطانیہ، مختلف ملکوں کے بے شمار افراد اور امریکہ کی ایک غیر سرکاری ایجنسی امداد کے لئے میں تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

غیر ملکی امداد کی فرمائش کے سلسلے میں ہم نے بات واضح کر دی ہے کہ اس امداد کے ساتھ کوئی سیاسی غرض وابستہ نہیں ہونی چاہیئے اور نہ ہی

کوئی ایسی شرط ہونی چاہیئے جو ایک خود دار ملک کے لئے نامناسب ہو نیز اس امداد کے ذریعے سے ہماری ملکی یا غیر ملکی پالیسی کو بدلنے کے لئے کوئی دباؤ نہیں ڈالا جانا چاہیئے۔ ہماری کوئی ضرورت خواہ کتنی بھی اشد ہو ہم اس کے لئے کسی معمولی سی حد تک بھی اپنے ملک کے وقار یا آزادی کا سودا نہیں کر سکتے۔

اپنی ضرورت کے لئے ہمیں غیر ملکی امداد طلب کرنی پڑی ہے۔ یہ میں ممنون ہے۔ لیکن میں روز بروز زیادہ شدت سے یہ محسوس کر رہا ہوں۔ کہ زندگی کی اس بنیادی شے کے لئے غیر ملکوں کا محتاج ہونا کس قدر خطرناک ہے، یہ ہماری آزادیٔ عمل کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی غذا کے لئے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی انتہائی کوشش کرنی چاہیئے۔

بھارت کے بعض بڑے حصوں میں خوراک کی کمی ہے اور بعض میں قحط کا خطرہ ہے۔ لیکن بھارت میں ایسے حصے بھی ہیں جو اپنی ضرورت سے زیادہ اناج پیدا کرتے ہیں۔ اگر مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو بھارت میں اناج کی اتنی کمی نہیں جتنی تصور کی جاتی ہے۔ قلت کے اس مشکل وقت میں خوراک کا مسئلہ کسی ایک خاص علاقے کا مسئلہ نہیں بلکہ پورے ملک کا مسئلہ ہے۔ ملک کے ایک حصے میں مصیبت ہونے سے سارے ملک میں مصیبت ہوگی ہمیں یہ محسوس کر لینا چاہیئے۔ کہ باہر سے کوئی مدد آئے یا نہ آئے۔ ملک کی خوراک کی ذمے داری صرف ہمارے کندھوں پر ہے۔

پردھان منتری نے ضلع بلند شہر کی مثال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حال ہی میں جب انہوں نے وہاں بہار اور مدراس کی مصیبت کا ذکر کیا تو فوراً بہت سے لوگوں نے اناج اور امدادی رقوم پیش کیں۔ انھوں نے کہا کہ باقی ملک بھی صحیح حالات سے باخبر ہونے پر ایسا ہی کر سکتا ہے۔

ملک کی فوری ضرورت اندرونی ذرائع اناج کا جمع کرنا ہے۔ اس کے لئے سرکاری محکموں، تاجروں، کسانوں اور کاشتکاروں سب کو کوشش کرنی چاہیئے موجودہ مرحلے پر اناج کی ذخیرہ اندوزی کرنا ایک جرم اور قابل ملامت فعل ہے یہ ایک بڑی افسوسناک اطلاع ہے کہ بعض لوگ حصولِ غلہ کی راہ میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو حصول غلہ کے طریق کار سے اختلاف ہے تو وہ بہتر راہ تجویز کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کام کو روکنا تو قحط اور موت کو دعوت دینا ہے۔ لہٰذا حصول غلہ کو سب سے مقدم درجہ ملنا چاہیئے۔ خوش نصیبی سے گندم کی نئی فصل بھی مجموعی طور پر اچھی بتائی جاتی ہے۔

پردھان منتری نے غذائی مشکلات پر عبور پانے کے لئے بھارتی فوج کی سپلیش کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ بہار اور مدراس میں لوگوں کو امداد اور قوتِ خرید کو سنبھالنے کے لئے عوام بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ مثلاً کنوئیں کھودے جا سکتے ہیں۔ گاؤں میں تالاب بنائے اور صاف کئے جا سکتے ہیں اور سڑکیں تعمیر کی جا سکتی ہیں۔ ایسے کاموں کے لئے ملک کے نوجوانوں اور یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلباء کو آگے آنا چاہیئے۔ میری اپنی رائے تو ہے کہ جب تک ایک طالب علم کسی قسم کی مشقت نہیں کرتا۔ اس کی تعلیم مکمل نہیں ہوتی۔ لیکن موجودہ مرحلے پر نوجوانوں اور طلباء کے کام کی باقاعدہ تنظیم کی جانی چاہیئے۔

خوراک کی پیداوار بڑھانے کی بہت سی سرکاری سکیموں پر عمل ہو رہا ہے لیکن لوگوں کو اپنے طور پر غیر مزروعہ دیہاتی علاقوں، یا شہروں، سرکاری عمارتوں کے احاطوں اور نجی رہائش گاہوں میں جہاں کہیں بھی ہو سکے خوراک پیدا کرنی چاہیئے

اناج کی فراہمی کے بارے میں پنڈت نہرو نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ ہر ایک گاؤں میں ایک کمیٹی بنائی جائے جو گاؤں کے ہر ایک شخص کو خوراک مہیا کرنے کا بندوبست کرے۔ یہ کمیٹی امداد باہمی کے اصول کے طور پر کام کرے اور اپنے گاؤں میں کسی اناج کا ذخیرہ چھپا کر نہ رکھنے دے۔ مجھے اعتماد ہے کہ ہمارے ملک کے سب لوگ اس نیک کام میں تعاون کریں گے اور کوئی بھی اپنے ہمسائے کی بدقسمتی سے منافع اٹھانے کی تمنا نہ کرے گا۔ اگر پھر بھی کوئی شخص ذخیرہ بازی کرے تو اس کمیٹی کو حکام کی توجہ مبذول کرانی چاہیئے۔

مجھے خوراک کے کئی تحفے موصول ہوئے ہیں۔ میں نے ان کا سواگت کیا ہے۔ اگرچہ اس طریقے سے ملک کی مصیبت دور نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی ایک دوسرے کی مدد کرنے کی فضا آج بہت ضروری ہے۔ اس لئے میں اس طریقے کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتا ہوں۔ خوراک کے جو تحفے موصول ہوں گے اُن کو بیچا نہیں جائے گا۔ بلکہ یہ بہار اور مدراس بھیجے جائیں گے۔ اس نازک وقت پر خوراک کو ضائع کرنا جرم تصور کیا جانا چاہیئے

ہم میں سے ہر ایک کو ہفتے میں ایک وقت کی خوراک دے کر مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنی چاہیئے۔ یہ کوئی بہت بڑی قربانی نہیں ہے۔

آخر میں پنڈت نہرو نے کہا۔ میں نے آپ کے سامنے کچھ تجاویز پیش کی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ایسا محسوس کریں کہ یہ مصیبت آپ پر نازل ہوئی ہے نہ کہ کسی دور دراز علاقے میں۔ ہم سب بھارت کے بچے ہیں۔ آپ سب بھارت ماتا کی عزت، ناموس اور اس کے بچوں کے دکھوں کا خیال کریں۔ آؤ ہم اپنے تمام ذرائع کو مجتمع کر کے اپنی ساری طاقت اور ہمت کے ساتھ قحط کے خلاف جنگ لڑیں ہم یقیناً جیت لیں گے۔

رفتارِ زمانہ

نہرو لیاقت سمجھوتے کی کامیابی

اِس امر میں اب شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ جس مقصد کے زیرِ تحت نہرو لیاقت پیکٹ وجود میں آیا تھا وہ پورے طور پر حاصل کر لیا گیا ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں مغربی بنگال سے ہندو اور مشرقی بنگال سے مسلمان اپنے اپنے گھروں کو واپس آگئے ہیں۔ اور بلا خوف وخطر اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بھارت پارلیمنٹ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے نائب وزیرِ خارجہ ڈاکٹر کیسکر نے کہا کہ جہاں فروری، مارچ اور اپریل میں ۴۴۴۰۰۰ ہندو پوربی بنگال سے آئے وہاں ۴۹۶۹۲۲ واپس لوٹے۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ جو مسلمان پوربی بنگال چلے گئے تھے اُن کی بہت بڑی تعداد اب بھارت واپس آگئی ہے۔

زمینداری تنسیخ بل کے خلاف اپیل خارج

اُتر پردیش میں زمینداری تنسیخ بل کے بارے میں زمینداروں نے ہائی کورٹ میں جو اپیل دائر کر رکھی تھی وہ نامنظور کر دی گئی ہے۔ ہائیکورٹ نے قرار دے دیا ہے کہ اُتر پردیش کا ۱۹۵۱ء کا زمین کی اصلاح اور زمینداری کی تنسیخ کا قانون آئینی ہے۔ ہائی کورٹ نے یہ بھی فیصلہ دیا ہے کہ اُتر پردیش کی قانون ساز اسمبلی کو اس قسم کے قانون بنانے کا پورا اختیار ہے۔ اور یہ قانون کسی کو نقصان پہنچانے کی غرض سے نہیں بلکہ رفاہِ عام کے پیشِ نظر بنایا گیا ہے۔

پیداوار بڑھانے کے متعلق راشٹرپتی کی اپیل

کل ہند صنعتی وزرعی نمائش اندور کی رسمِ افتتاح ادا کرتے ہوئے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کہا کہ اگرچہ ملک بھر میں اناج کی کمی کا شور ہے لیکن اعداد وشمار معلوم کرنے کے بعد یہ حقیقت ظاہر ہوئی ہے کہ یہ کمی صرف دس فیصدی ہے۔ یہ کمی تو ہمارے کسان بڑی آسانی کے ساتھ دُور کر سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہمیں غیر ممالک کی طرف نہیں دیکھنا پڑے گا۔ راشٹرپتی نے کارخانہ داروں، مزدوروں، زمینداروں اور کسانوں سے اپیل کی کہ وہ خوراک کی پیداوار بڑھانے میں حکومت سے پورا تعاون کریں۔ آپ نے آخر میں فرمایا کہ چاہے ہم ملک کے کسی کونے میں بھی کیوں نہ رہتے ہوں ہمیں سارے دیش کو اپنا سمجھنا چاہیئے، اور مصیبت کے وقت ایک دوسرے کی پوری مدد کرنی چاہیئے۔

اہلِ چین کی بھارت کے تئیں نیک خواہشات

دہلی میں مقیم چینی سفارت خانے کے پہلے کونسلر شری کین ماؤ چاؤ نے بھارت اور چین میں دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کے لئے ایک انجمن کی رسمِ افتتاح ادا کرتے ہوئے کہا کہ بھارت اور چین کے تمدنی تعلقات بہت پُرانے ہیں۔ چینی عوام میں ہندوستانیوں کے لئے نیک خواہشات پائی جاتی ہیں اور وہ تہِ دل سے بھارت کے لوگوں کے ساتھ تعاون کرنے اور دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ خوراک کے متعلق ہندوستان میں پیدا شدہ نازک صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے چینی کونسلر نے کہا کہ چینی سرکار اس سلسلے میں بھارت کی ہر ممکن امداد کرے گی۔ چین بہت بڑی مقدار میں بھارت کو چاول بھجوا چکا ہے اور ابھی تیز رفتاری سے بھجوا رہا ہے۔

حکومتِ پاکستان کے خلاف سازش

حکومت پاکستان کے خلاف سازش کے سلسلے میں ابھی تک گرفتاریاں جاری ہیں۔ جو نئے فوجی افسر گرفتار کئے گئے ہیں اُن میں ہوائی فوج کے ڈائریکٹر ایر کموڈور جانجوا اور بریگیڈیر صادق خان بھی ہیں۔ ان فوجی افسروں کے مقدمے کی سماعت کے لئے ایک خاص ٹریبونل مقرر کیا گیا ہے جس کے اجلاس حیدرآباد (سندھ) میں منعقد ہوں گے۔ اور مقدمے کی کارروائی خفیہ رکھی جائے گی۔

پاکستان اور افغانستان

افغانستان اور پاکستان میں مسلح فوجیوں کی طرف سے سرحدیں عبور کرنے

اور ایک دوسرے کے علاقے میں گھس جانے کی وارداتیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں کراچی سے آمدہ ایک اطلاع کے مطابق پندرہ دنوں کے عرصے میں حکومت پاکستان نے افغانستان کو چوتھی بار افغان فوجیوں کے بلوچستان کی سرحد میں گھس آنے پر احتجاج کا نوٹ روانہ کیا ہے۔ اُدھر افغان گورنمنٹ بھی پروٹسٹ کے کئی نوٹ بھیج چکی ہے۔ جس میں پاکستانی سپاہیوں کی افغانستان کی سرحد میں داخل ہونے کی شکایت کی گئی ہے سیاسی حلقوں میں یہ خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ یہ معمولی وارداتیں کسی وقت بڑے جھگڑے کا باعث نہ بن جائیں۔

ترکی جرنلسٹ کا پاکستان کو مشورہ

ترکی کے مشہور اخبار نویس اور سابق ڈائریکٹر جنرل آف دی پریس نے ایک مضمون میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ جہاں بھارت ایک جمہوری سیکولر اسٹیٹ ہے وہاں پاکستان میں غیر جمہوری اور مذہبی حکومت ہے۔ جس میں اقلیتوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جہاں بھارت کامن ویلتھ میں رہتے ہوئے بھی ایک جمہوری ملک ہے، اور اس نے اپنا جمہوری آئین نافذ بھی کر دیا ہے وہاں پاکستان ابھی ایک طرح سے برطانوی نوآبادی ہی چلا آتا ہے۔ اور ابھی تک وہاں پرانا نظام ہی قائم ہے۔ آپ نے پاکستان کو مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ دنیا کی آزاد اور جمہوری قوموں کی صف میں کھڑا ہونا چاہتا ہے تو اُسے بھی اپنے ملک میں سیکولر آئین ہی نافذ کرنا چاہیئے۔

پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں عملی اقدام

صوبہ دہلی میں باجرے کی فصل کے سلسلے میں ایک انعامی مقابلہ ہوا۔ اس میں ۴۰۰ روپوں کا پہلا انعام چودھری سیارام کو ملا جنہوں نے فی ایکڑ ۳۰ من ۲۷ سیر اور ۸ چھٹانک باجرہ پیدا کیا۔ ۳۵۰ اور ۱۰۰ روپوں کا دوسرا اور تیسرا انعام بالترتیب بدصیلہ گاؤں کے شری بالمکند اور چودھری رگھوبیر سنگھ کو ملا جنہوں نے ۳۰ من اور ۱۵ من ۲۵ سیر باجرہ فی ایکڑ پیدا کیا۔ یاد رہے کہ دہلی میں باجرے کی فی ایکڑ پیداوار سات من ہے۔ اگر ہمارے دیش کے زمیندار اناج کی پیداوار میں اس طرح محنت سے کام لیں تو اناج کے سوال پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مطلق دیر نہ لگے اور ملک دوسروں کا محتاج نہ رہے۔

پاکستان کا صوبہ سرحد

صوبہ سرحد کی مسلم لیگ کے سابق صدر خان امین جان نے ایک انٹرویو میں صوبہ سرحد کو ایک جیل خانے سے تشبیہ دی جس کا حکمران ایک ایسا ظالم انسان ہے جو کسی حالت میں بھی نکتہ چینی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور سیاسی مخالفوں کو کچلنے کے لئے ناجائز سے ناجائز ہتھیار استعمال کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتا۔ اور جس نے پیر زکوڑی اور پیر مانکی شریف ایسے بڑے بڑے لیگی لیڈروں پر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ خان امین جان نے کہا کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد صوبہ سرحد میں ۸۰ فی صدی سے زیادہ اشخاص نے لیگ کو چھوڑ دیا ہے۔ اب پٹھانوں کی نگاہیں انتخابات پر مرکوز ہیں۔ لیکن انتخابات اُسی صورت میں غیر جانبدارانہ ہو سکتے ہیں جب کہ قیوم وزارت کو ہٹا دیا جائے۔

کشمیر کے متعلق مسلم کنونشن کی قرارداد

کلکتہ میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں کشمیر کے متعلق ایک اہم قرارداد اتفاق رائے سے منظور کی گئی۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ کشمیر کے مستقبل کا انحصار مذہبی نہیں بلکہ خالص سیاسی اور اقتصادی بنیادوں پر ہے۔ سیکورٹی کونسل کی طرف سے اس سلسلے میں ڈاکٹر فرینک گراہم کے ثالث مقرر کئے جانے کی بھی کانفرنس میں مخالفت کی گئی، اور اس کے متعلق بھارت سرکار کے رویے کی پُرزور حمایت کی گئی۔ کانفرنس کی رائے میں مسئلہ کشمیر صحیح حل آئین ساز اسمبلی کا قیام ہی ہے۔ کیونکہ کشمیر کے لوگوں کی رائے معلوم کرنے کا یہی سب سے موزوں طریقہ ہے۔ بھارت کے مسلمانوں کی اس نمائندہ جماعت نے شری نہرو پر اپنے کامل اعتماد کا اظہار کیا اور کہا کہ شری نہرو ہی مسلمانوں کے سچے دوست اور صحیح رہنما ہیں۔

بھارت کی صنعتی ترقی

بھارت کے وزیر تجارت و صنعت شری ہری کشن مہتاب نے سونی پت میں ایک سائیکلوں کے کارخانے کا بنیادی پتھر رکھتے ہوئے کہا کہ بھارت کو اپنی صنعتوں کو بنانے کا کام صرف اپنی ضرورتوں تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہیئے۔ بلکہ اپنی مصنوعات سے پڑوسی ممالک کی ضروریات بھی پوری کرنی چاہئیں۔ جب تک ہم ایسا کرنے کے قابل نہیں ہو جاتے تب تک ہمارا مستقبل تاریک ہی رہے گا۔ آپ نے کہا کہ ملک کی تقسیم سے پیشتر ہم غیر ممالک کو کپڑا

مال مہیا کرتے تھے۔ مگر اب صورتِ حال بالکل مختلف ہوگئی ہے۔ اور مصنوعات کے مہیا کرنے میں اب بھارت کا نمبر دنیا کے ممالک میں پانچواں ہے۔ لیکن ہمیں اس پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں غیر ممالک کو مصنوعات بھجوانی چاہئیں۔ اس میں ہماری آئندہ ترقی اور خوشحالی کا راز مضمر ہے۔

شیخ محمد عبداللہ کا بیان

سری نگر میں بمبئی کے طالب علموں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے ریاست جموں و کشمیر کے پردھان منتری شیخ محمد عبداللہ نے کہا کہ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ چونکہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس لئے اسے پاکستان کے ساتھ ملنا چاہیئے۔ اوّل تو بھارت مذہبی بنیادوں پر تقسیم نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ خیال بالکل باطل ثابت ہو چکا ہے کہ دو ممالک کے مابین مذہب یگانگت کی بنیاد بن سکتا ہے۔ پاکستان اور افغانستان کے تعلقات اس نظریے کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیتے ہیں۔ آج کل تو اقتصادی گٹھ بندھن زیادہ مضبوط اور پائدار ہوتے ہیں۔ اس لئے کشمیریوں کو بھارت ایسے غیر فرقہ وارانہ اور ترقی پسند ملک کے ساتھ رہنا زیادہ پسند ہے۔ کشمیر کو خود مختار ملک کی حیثیت دینے کے خیال کو شیخ صاحب نے آج کل کے حالات میں ناممکن بتایا۔

زیادہ خوراک پیدا کرنے کے متعلق حکومتِ پنجاب کی مساعی

حکومتِ پنجاب نے فیصلہ کیا ہے کہ "زیادہ خوراک پیدا کرو" کی مہم کے تحت کاشتکاروں کو . . . لہ ٹریکٹر خریدنے کے لئے قرضے دئے جائیں۔ ہر قرضے کی رقم دس ہزار روپے تک ہوگی اور یہ قرضہ چار لاکھ روپے کی اُس رقم سے دیا جائے گا جو مرکزی حکومت نے حکومتِ پنجاب کو بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنانے کے لئے دی ہے۔ جو زمیندار کوآپریٹو سوسائٹی بنا کر قرضہ کے لئے درخواست دیں گے اُنھیں دوسروں پر ترجیح دی جائے گی۔

مہا پنجاب کا مطالبہ

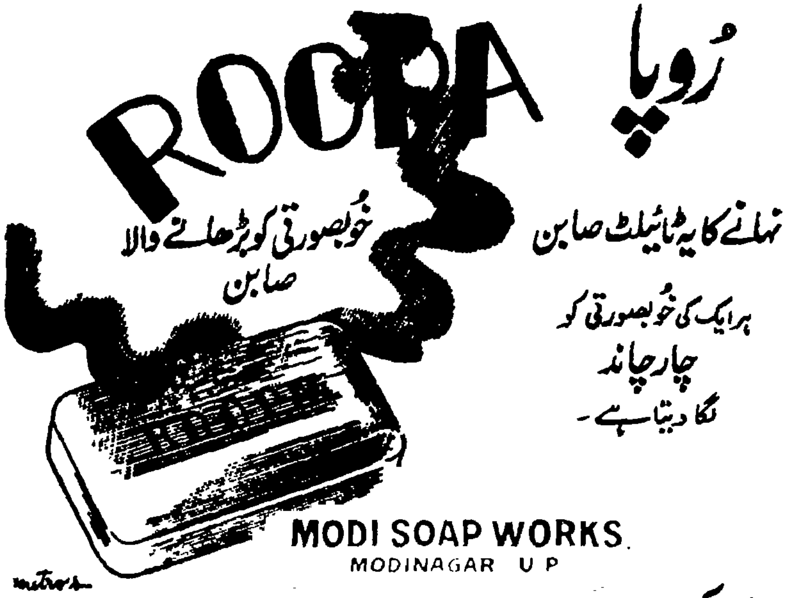
مشہور سکھ لیڈر ماسٹر موتا سنگھ نے لکھنؤ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب کی رہنمائی قابل ہاتھوں میں نہیں۔ اس لئے وہاں تفرقہ بازی اور فرقہ پرستی کا بول بالا ہے۔ اور اس صورتِ حال کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر ماسٹر تارا سنگھ جیسے حضرات سکھستان اور زبان کا سوال اُٹھا کر لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ آپ نے تجویز کی کہ پنجاب، پیپسو، ہماچل پردیش اور اتر پردیش کے سہارن پور، مظفر نگر اور میرٹھ کے اضلاع کو ملا کر ایک مہا پنجاب بنا دیا جائے تو یہ صوبہ اقتصادی طور پر ترقی کر کے بہت زیادہ خوشحال ہو گا۔ اور ہندوستان کی سرحد پر ہونے کی وجہ سے یہ ضروری بھی ہے کہ پنجاب کا صوبہ طاقتور اور خوشحال ہو۔ ماسٹر صاحب سے جب سوال کیا گیا کہ اس طرح سے تو پنجاب میں سکھوں کا تناسب مزید کم ہو جائے گا تو آپ نے کہا کہ اکالی دل کے چند اشخاص اور کچھ خود غرض و جاہ پسند اصحاب کے ماسوا عام سکھ اپنے آپ کو ہندوؤں سے علیحدہ نہیں سمجھتے اور اُن کے ہندوؤں کے ساتھ روٹی اور بیٹی کے تعلقات برابر قائم ہیں۔

تپ دق کے خلاف بھارت سرکار کی مہم

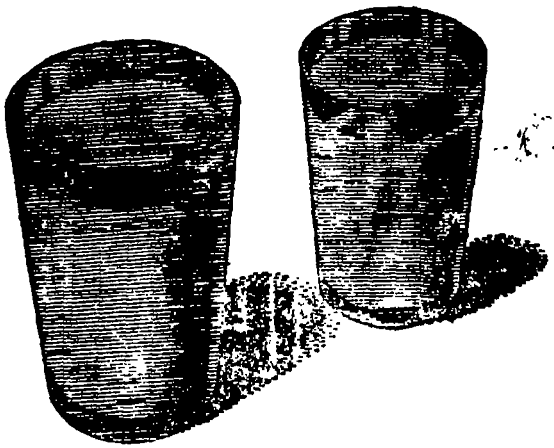
ٹیوبرکلوسس ایسوسی ایشن آف انڈیا کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے بھارت کی وزیرِ صحت راج کماری امرت کور نے بنی نوعِ انسان کے سب سے خطرناک دشمن۔ دق کے خلاف ایک زبردست جہاد کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہر جنگ کی طرح اس جنگ کے لئے بھی ایک مضبوط اور ہار نہ ماننے والے عوامی جذبے کی ضرورت ہے۔ اس جذبے کی تحریک کی ذمّہ داری غیر سرکاری جماعتوں پر ہے۔ تپ دق ملک کے کئی حصّوں میں پھیلا ہوا ہے۔ بھارت کے لوگ ایک عرصے سے اس کے شکار ہیں اور چھوت کا مرض ہونے کی وجہ سے اس کے بڑھنے کا خطرہ موجود ہے۔ ایسی صورت کی روک تھام کے لئے صرف حکومت کی کوششوں سے ہی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے غیر سرکاری جماعتوں کو عوام میں کام کرنا ہوگا اور متمول لوگوں کو ہسپتالوں اور صحت کے مرکزوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مدد کرنی چاہیئے۔

اس مرض کے انسداد کے لئے حکومت نے جو بی سی جی کے ٹیکے کا پروگرام شروع کیا ہے اس میں کافی کامیابی ہوئی ہے۔ اب اقوامِ متحدہ کے بچوں کے ایمرجنسی فنڈ اور صحت کے عالمی ادارہ کے تعاون سے دہلی، ٹراونکور اور پٹنہ میں دق کے ڈاکٹروں، نرسوں، ایکسرے اور لیبارٹری کے ماہروں کی تربیت کے لئے مرکز کھولے جا رہے ہیں۔ پلاننگ کمیشن کی ایک ضمنی کمیٹی نے بھی دق پر قابو پانے کے لئے ایک پانچ سالہ اسکیم تیار کی ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ملک کی فوری ضرورت یہ ہے کہ ہسپتالوں میں دق کے مریضوں کے لئے زیادہ سے زیادہ جگہ کی گنجائش پیدا کی جائے۔ اس کے علاوہ جدید طرز کے ہسپتال، شفاخانے اور مرکزِ صحت جاری کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے۔



ROOPA
رُوپا
نہانے کا یہ ٹائیلٹ صابن
خُوبصورتی کو بڑھانے والا
صابن
ہر ایک کی خُوبصورتی کو
چار چاند
لگا دیتا ہے۔
MODI SOAP WORKS.
MODINAGAR U P



دودھ قریب قریب ایک مکمل غذا ہے...

دودھ کی غذائی قدر کسی بھی ایک غذا کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اسلئے اگر گنجائش ہو تو بالغوں کے لئے دن میں دودھ کے ایک یا دو گلاس نہایت مفید ہیں۔ لیکن بچوں، ضعیف اور بیماروں کیلئے یہ نہایت لازمی ہے۔ پھر بھی، عموماً موزوں غذا ہی ایک بہترین غذا ہے جو کہ ذیل کے ہر ایک حصے کی ایک یا زیادہ غذاؤں سے بنتی ہے: (۱) وٹامن:۔ دودھ، پھل اور خام سبزیاں، پکائی ہوئی سبزیاں، کلیجی۔ (۲) معدنیات:۔ دودھ، انڈے، پنیر، مچھلی، پالک و دیگر ہری سبزیاں اور سخت پوست میوے۔ (۳) پروٹین:۔ دودھ، انڈے، گوشت، دال، مچھلی اور سخت پوست میوے۔ (۴) کاربوہائیڈریٹ:۔ سبھی اناج، چاول، آلو، کیلے۔ پانچویں حصے میں چکنائی ہے۔ بہترین چکنائیوں میں سے ڈالڈا ایک ہے جو کہ خالص اور قوت بخش ہے اور ہر قسم کے کھانے پکانے کے لئے موزوں ہے۔ یہ سیل بند ڈبوں میں تازہ اور صاف رہتا ہے۔



کیا نباتی غذا زیادہ قوت بخش ہے؟

مفت صلاح کے لئے آج ہی لکھئے۔ یا بوقت ضرورت

دی ڈالڈا ایڈوایزری سروس

پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳، بمبئی ۱

HVM. 108-172 UD



"بچوں کا آج کل"



سیدہ فرحت

بھارت دیس

کتنا اچھا، کتنا پیارا   سُندر بھارت دیش ہمارا
پھول ہیں اس میں رنگ برنگے   نیلے، پیلے، سبز اور اُودے
سب سے ہے اس باغ کی شوبھا   باغ کا جیون، سب کا ایکا
بھارت ماتا سب کی ماں ہے   سب میں اٹکی اس کی جاں ہے
ہندو، مُسلم، سِکھ، عیسائی   اس کے پُوت، آپس کے بھائی
سب کے سُکھ سے اس کو سُکھ ہے   کوئی دُکھی ہو اس کو دُکھ ہے
بھارت باغ کی ننھی کلیو   ننھے مُنّے، پیارے بچّو!
باغ کو اپنے خوب سجاؤ   اپنی خوشبو سے مہکاؤ
سب پھولوں کو اپناؤ تُم   پریت بھرے نغمے گاؤ تُم

باغ کی رکھشا فرض ہے تُم پر
دیش کی خدمت قرض ہے تُم پر

جگت سنگھ

حرارت اور اُس کے ماخذ

۔ مادّے کی تینوں حالتیں صرف حرارت کی کمی بیشی قبول کرنے
باعث ہیں۔ برف کی مثال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حرارت
ے سبب سے عملِ تبخیر ہو کر آبی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ سورج
ی حرارت کے طفیل ہر پودا کاربانک ایسڈ گیس کو جذب کرتا اور
س سے اپنے ریشوں کی طیاری کا کام لیتا ہے۔ اگر آگ دریافت
ہوتی تو دنیا کی سطح کا بہت سا حصّہ انسانی بود و باش کے بالکل
قابل ہوتا۔ بہت سی اشیاء جن کو اچھے کھانے اور لذیذ غذا
سے نامزد کیا جاتا ہے نکمی اور بے کار ثابت ہوتیں۔ ہم اپنے
ردگرد، قرب و جوار میں جس قدر کاروبار، حرکت اور طاقت کا
ہورہ دیکھتے ہیں وہ سارے کا سارا حرارت کے اثر سے یا اُس
ی متعلقہ دیگر شکلیں ہونے والی طاقتوں کے وسیلے سے ہے۔
رارت مادّی شے نہیں ہے بلکہ حرارت یا گرمی کسی چیز کے اجزاء
لی اس طرح کی حرکت کا نتیجہ ہے جس کا اثر صرف چھونے کی طاقت ہی
سوس کرتی ہے اور جس کے زیرِ اثر مادّے کی حالت تبدیل ہو
تی ہے۔ اس عمل کے نہایت تیزی اور پھرتی کے ساتھ ہونے
سے حرارت روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

۲۔ اس کے قدرتی مآخذ سورج، زمین اور آگ ہیں۔ ان
سوا رگڑ، ٹکر، دباؤ، عمل کیمیائی اور قوتِ برقی کے ذریعے
بھی حرارت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ قدرتی مآخذ کو چھوڑ کر سب سے زیادہ دلچسپ طریق
ٹکا ہے۔ رگڑ یا کھردرے پن کی رکاوٹ سے وہ مزاحمت مُراد
لی جاتی ہے جس کی وجہ سے ایک چیز کا دوسری چیز پر گھسیٹنا
مشکل ہوتا ہے۔

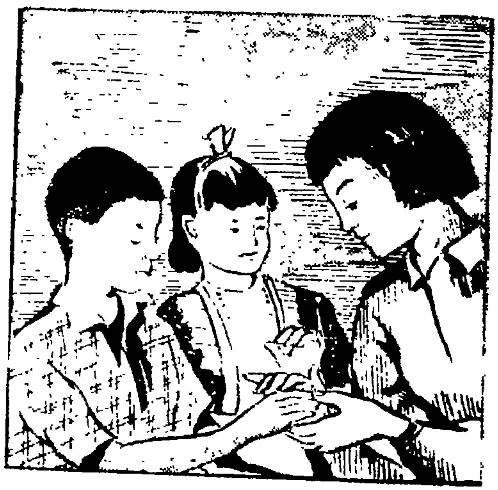
رگڑ سے پیدا ہونے کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سردیوں میں ہاتھوں کو رگڑنا، تختے پر بٹن کو رگڑنا، پیسے
کو صاف کھڑے ہوئے تختے پر رگڑ رگڑ کر ذرا دبائیں تو وہ نیچے
نہیں گرتا۔ کیونکہ رگڑنے سے وہ گرم ہو جاتا ہے اور اُس کے
نیچے کی ہوا گرم ہو کر نکل جاتی ہے اور باہر کی ہوا اس پر دباؤ
ڈالتی ہے۔ گاڑیوں کے پہیے زمین سے رگڑ کھا کھا کر گرمیوں
میں اُتر جاتے ہیں۔ سر پر زور سے تیل کی مالش کی جائے تو
ہتھیلی اور سر گرم ہو جاتے ہیں۔ ایک رسّے پر سے نیچے اُتریں
یا کلہاڑے، کسی اور پھاوڑے سے کام کریں تو ہاتھوں میں چھالے
پڑ جاتے ہیں کیونکہ رگڑ سے گرمی پیدا ہو کر ہتھیلی کا چمڑا اُچھل جاتا
اور آبلہ پڑ جاتا ہے۔ نئی جوتی پہن کر سفر کرنے سے پاؤں میں چھالے
پڑ جاتے ہیں۔ برمے (ورمے) سے کسی لکڑی میں سوراخ ڈالتے
وقت برما سخت گرم ہو جاتا ہے۔ یہ آگ پیدا کرنے کا پُرانا طریق
ہے۔ ٹوٹنے والے ستاروں کا جل اُٹھنا اور روشن ہونا رگڑ کے
باعث ہے۔ بندوق کی گولی جس قدر تیزی سے پھینکی جائے اُسی
قدر زیادہ گرم ہوتی ہے۔ چلتی مشینوں کے پُرزوں کا گرم ہونا
اور جل اُٹھنا اکثر رگڑ کی وجہ سے ہی ہُوا کرتا ہے۔ آتش باز
جب بارود بناتے ہیں تو بے احتیاطی سے رگڑ کھا کر سارا
سامان جل اُٹھتا ہے۔

اسٹولوں، بنچوں اور کرسیوں پر نہیں بیٹھتے بلکہ چٹائیوں پر بیٹھتے ہیں یہ بچے ہماری طرح قلم سے نہیں لکھتے بلکہ برش سے لکھتے ہیں۔ ان کی زبان دائیں سے بائیں طرف اردو کی طرح لکھی جاتی ہے۔ ان کے حروف پھولوں کے سے ہوتے ہیں۔

اسکول میں اُستانی روزانہ بچوں کے ناخن، مُنہ، ناک، آنکھ وغیرہ دیکھتی ہے۔ اگر کسی کے ناخن بڑے ہوں تو اُن کو کاٹتی ہے کسی بالک کا مُنہ، آنکھ، ناک وغیرہ میلا ہو۔ تو اُسے اسپنج سے صاف کرکے تولیہ سے پونچھتی ہے اور بڑے پریم سے کہتی ہے کہ دیکھو دوسرے لڑکوں کا مُنہ کیسا صاف ہے۔ اگر کسی لڑکے کے کپڑے میلے ہوں تو استانی اُسے نوکرانی کے ساتھ گھر واپس بھیجتی ہے کہ صاف کپڑے پہن کر آئے۔

ہر ایک جاپانی بچے کو ہُنر سیکھنا بھی لازمی ہے۔ پرائمری میں ۱۳۴ قسم کے ہُنر سکھانے کا انتظام ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں جس ہُنر کو سیکھنا چاہیں سیکھ سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک جاپانی بچہ ہُنرمند ہوتا ہے۔ اکثر بچے تو اپنے لئے ڈیسک، اپنی کتابوں کی جلدیں۔ قلم دان وغیرہ خود ہی بنا لیتے ہیں۔ جوتوں تو مکانوں کی مرمّت بھی خود ہی کرتے ہیں۔ لڑکیاں ہاتھ سے رنگین پھول کاڑھتی ہیں جو نہایت خوبصورت ہوتے ہیں۔



جاپانی بچے قسم قسم کے کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں۔ ان کے بعض کھیل ایسے بھی ہیں جن میں ان کے ماں باپ بلکہ دلوا، دادی بھی حصّہ لیتے ہیں۔ دادا اسی طرح پتنگ اڑانے کا شوقین ہے جس طرح پوتا۔ لڑکوں کو لٹو گھمانے کا بھی بہت شوق ہے ان کے مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جنگی ہتیاروں سے کھیلنا ان کا خاص مشغلہ ہے۔ مگر جاپانی بچے کھیل کود میں بھی آداب کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں۔ اوّل تو کھیل میں ان کا جھگڑا ہوتا ہی نہیں اگر کسی کو کوئی اعتراض ہو تو کسی بڑے آدمی کا فیصلہ ہر حالت میں قبول کر لیتے ہیں۔ مختلف رنگوں کی ریت سے سڑک پر تصویریں بنانا بھی جاپانی بچوں کا دل چسپ کھیل ہے۔ ان کے حروف تہجی کے پتوں کا کھیل بھی بہت دل چسپ ہوتا ہے۔ بعض پتّوں پر متولے اور کہاوتیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور ہر ایک کے نیچے ہر ایک کے متعلق تصویریں بنی ہوتی ہیں۔ بچے حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور پتے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ ایک لڑکا کوئی کہاوت کہتا ہے تو لڑکوں میں سے کوئی فوراً وہ کہاوت اور تصویر نکال کر رکھ دیتا ہے۔ جو لڑکا سب سے پہلے جیتتا ہے وہ بادشاہ کہلاتا ہے، اور ہارنے والے کو بھنڈی کہتے ہیں۔ بھنڈی کے مُنہ پر سیاہی سے نقش و نگار بنا دئے جاتے ہیں۔ اگر یہ کھیل لڑکیوں میں ہو تو ہارنے والی لڑکی کے بالوں میں تنکے ٹانک دیئے جاتے ہیں۔

جمیلہ خاتون

بھگو چمار

پُرانے وقت میں ایک بادشاہ تھا بہت نیک دل اور بہت ہی خوش مزاج۔ اگلے وقت کے بادشاہ اکثر رات کو شہر کی گشت کرنے نکلا کرتے تھے کہ اگر اُن کی رعایا کو کوئی دُکھ ہو تو اُن کو اچھی طرح سے علم ہو سکے۔ لہٰذا یہ بادشاہ بھی گشت کو نکلا کرتا تھا۔ جب ایک روز بادشاہ باہر کو نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ سڑک کے کونے پر ایک شخص بیٹھا بانسری بجا رہا ہے اور شہر کے بہت سے بچے اس کے گرد بیٹھے تالیاں بجا بجا کر گا رہے ہیں اور سامنے پلاؤ کا پتیلا دم ہو رہا ہے۔ بادشاہ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے لوگوں نے بتلایا کہ یہ بھگو چمار ہے تمام دن جوتے سی کر شام کو لڑکے اکٹھا کر کے پلاؤ پکا کر سب کو کھلاتا ہے۔ اس کی زندگی کی یہی دلچسپی ہے نہ جورو ہے نہ بچے۔



بادشاہ بھیس بدلے ہوئے تھا فوراً بھگو چمار کے پاس گیا۔ بھگو چمار نے فوراً سلام کیا اور کہا سادھو جی آیئے۔ بادشاہ بیٹھ گیا اور سب کرشمہ دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد بادشاہ نے کہا "بھئی بھگو چمار تم جو دن بھر کی کمائی سے لڑکوں کو پلاؤ پکا کر کھلا دیتے ہو۔ اگر کسی دن تمہارا ...م نہ لگے تو....؟" بھگو چمار کو اس بات پر بڑا غصہ آیا۔ مگر کچھ بولے نہیں۔ بادشاہ نے کہا بھئی جواب نہیں دیا۔ کہنے لگے۔ اللہ مالک ہے جیسے آپ کو دیتا ہے۔ ویسے ہم کو بھی دیتا ہے۔ اس کی نظر میں سب ایک ہیں۔ بادشاہ اتنا سُن کر چلا آیا اور اُس کو مذاق سُوجھا۔ صبح سویرے بادشاہ نے تمام شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا کہ جو بھی بھگو چمار سے جُوتے سلائے گا اُس کو قید خانے میں ڈال دیا جائے گا۔ اب بھلا کس کی مجال تھی کہ بھگو چمار سے جوتا سلواتا۔

بھگو چمار نے تمام دن انتظار کیا مگر کوئی بھی گاہک نہ آیا۔ آخر کار بیچارے نے لوگوں سے قسمیں کھائیں کہ میں کسی سے ذکر نہ کروں گا چوری چھپے سلوا لیجئے مگر کوئی بھی راضی نہ ہُوا۔ جب شام ہونے لگی تو بھگو چمار شہر کے گھوروں پر گئے۔ وہاں سے چھپڑے لاکڑیوں کے کھیلنے کی شمعیں بنائیں اور سڑک پر بیٹھ کر اُن کو فروخت کیا۔ اس کے بعد شام کو پتیلا پکا کر لڑکوں کو اکٹھا کیا۔

بادشاہ حسب معمول بھیس بدل کر رات کو پھر آموجود ہوئے کہنے لگے بھائی بھگو چمار کیا کر رہے ہو۔ کہنے لگے۔ اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں۔ وہ بڑا رازق ہے۔ بادشاہ کے منع کرنے کے باوجود میں نے گھوروں پر سے شمعیں بنا کر فروخت کی ہیں اور اب پتیلا گرم ہو

رہا ہے۔ اللہ رزّاق ہے بادشاہ نے چاہا کہ میری روزی بند ہو جائے مگر میں نے مشلیں بنا کر اتنے پیسے بنا لئے کہ اپنا روز کا کام پورا ہو جائے۔ بادشاہ جو سادھو کے بھیس میں تھا۔ یہ سُن کر بڑا حیران ہوُا صبح ہوتے ہی پھر شہر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ تمام گھوروں پر پولیس کا پہرا لگا دیا جائے تاکہ بھگو چمار چیتھڑے نہ لینے پائے۔ اب بے چارا جب گھورے پر جائے۔ پولیس ڈنڈا لے کر پیچھے دوڑتی ۔۔ بچارا بڑا پریشان ہوا۔ حیران تھا کہ آخر کیا کرے۔ کچھ سوچ کر بادشاہ کے باغ میں پہنچا۔ اور وہاں درختوں سے لکڑیاں کاٹ کر بازار میں آ کر فروخت کر دیں۔ آج اُسے زیادہ پیسے ہاتھ لگے اور اسی لئے اُس نے دو پتیلے پلاؤ پکایا۔ تمام لڑکوں کو اکٹھا کیا۔ انھوں نے تالیاں بجائیں اور بھگو چمار بیچ میں بانسری لے کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں بادشاہ بھیس بدلے ہوئے وہاں آ گیا۔ بھگو چمار کہنے لگے آئیے سادھو جی! بادشاہ نے کہا بھگو چمار! آج تمہارے ہاں بہت سا کھانا پک رہا ہے۔ بھگو چمار کہنے لگے۔ سب اُسی کی مہربانی ہے۔ آج تو بادشاہ کے باغ سے ہی لکڑیاں لا کر فروخت کی ہیں۔ بادشاہ یہ سنتے ہی اُلٹے پاؤں واپس چلا آیا۔

دوسرے دن بادشاہ نے حکم دیا کہ بھگو چمار کو کسی باغ سے بھی لکڑی نہ توڑنے دی جائے۔ بھگو یہ حکم سُن کر سخت اداس ہُوا۔ اور چارپائی پر لیٹے لیٹے سوچنے لگا۔ آخر بادشاہ مجھ سے ناراض کیوں ہے۔ جو دوسروں کے دُکھ دُور کرتا ہے وہ میرے کیوں درپے آزار ہے۔ کچھ سوچ کر وہ اُٹھا اور نہا دھو کر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوُا۔ اور ادب سے سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

بادشاہ نے پوچھا۔ کہو بھگو چمار! کیا بات ہے۔ بھگو نے کہا۔ حضور! بے کار ہوں اور آپ کے در کی نوکری کرنے آیا ہوں۔ بادشاہ نے کہا۔ ہم نے تمہاری درخواست قبول کی۔ آج سے تم پھاٹک پر پہرے دار مقرر کئے گئے ہو اور یہ جو چاندی کی تلوار اسے اپنے پاس رکھو، اور اسے سنبھال کے رکھنا۔ اس نوکری کے عوض تمہیں پانچ روپے یومیہ دئے جائیں گے۔ جاؤ اور اپنا کام نہایت ہوشیاری سے ادا کرو۔

بھگو ہاتھ میں تلوار لئے سلام کر کے اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ اُس نے نہایت ہوشیاری سے اپنی ڈیوٹی کو نبھایا۔ شام کو جب چھٹی کا وقت ہُوا۔ تو اُس نے اپنی یومیہ مزدوری طلب کی تاکہ سامان لے کر روز کی طرح عیش کرے۔ ادھر بادشاہ نے سوچا کہ اسے آج کچھ نہ دیا جائے۔ اور دیکھا جائے کہ وہ اپنے روز مرّہ کے کام کو کیسے پُورا کرتا ہے۔ بہت کوشش کے باوجود اسے پیسے نہ مل سکے۔ بھگو آج غم زدہ تھا۔ اُسے بڑا فکر تھا کہ آج کیا ہوگا



کیا آج کچھ نہ پکے گا۔ سوچ بچار کر اُس نے ایک ترکیب نکالی۔ وہاں سے اُٹھا اور سیدھا بازار چلا گیا۔ وہاں جا کر اُس نے چاندی کی تلوار فروخت کر کے ایک ٹین کی تلوار خریدی اور مٹھائی



Regd. No. D.—21

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

مرتضیٰ حسین فاضل

غالب کے تین خط اور ایک تحریر

غالب کی زندگی میں ان کے مایہ ناز خطوط کے تین مجموعے شائع ہوئے اور بے حد پسند کئے گئے ان کے فارسی خط چار مرتبہ ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔ اردو کے دو مجموعے "عود ہندی" اور "اردوئے معلّیٰ" کے نام سے چھپے۔ لیکن چونکہ یہ مجموعے اس وقت شائع ہوئے جب وہ آفتاب لب بام تھے۔ اس لئے ان کی مقبولیت عام کا اندازہ انہیں نہ ہو سکا۔ ان مجموعوں کے علاوہ ایک "انتخاب" خود کیا جو جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کے پاس محفوظ ہے، غالباً یہ مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ اس کے مطابق بعض خطوط "خطوط غالب" میں شائع ہو گئے ہیں۔ "انشائے اردو" کے دس خط جو مجروح کے نام ہیں اس سے مطابق ہیں۔ چونکہ جو مجلۂ "آجکل" غالب کے بہت سے نوادر محفوظ کر چکا ہے۔ اور غالب پسند جماعت نوادر کی تلاش میں ہے لہذا چار تحریریں جو بالکل غائب تھیں پیش کش ناظرین ہیں۔

ادیب سماج کا ایک رکن ہے۔ تہذیب و زبان کی اصلاح و ترقی میں ادیب کی شخصیت معمار کی سی ہے، ایسے ادیب قصیدوں کے محتاج نہیں بلکہ قدریں ان کی رفتار دیکھ کر چولا بدلتی ہیں، ان ادیبوں کی نشانیوں کو بچانا ان کے کارناموں کی یاد قوموں کے لئے باعث فخر ہے۔

مرزا غالب کی ایک ہی تحریر مختلف دوروں میں بدلتی رہی ہے، انہوں نے ایک ہی خط کو دو دو تین تین مرتبہ دیکھا اور اس پر صلاح دی، عرشی صاحب نے اپنے ایک تازہ مضمون میں فارسی خطوط میں کمی اور زیادتی کو ظاہر کیا ہے، اردو مکاتیب میں بھی یہ کمی زیادتی بہت نمایاں ہے، اس کی نظیر "خطوط غالب" میں ملتی ہے پیش نظر کتاب "انشائے اردو" اور "اردوئے معلّیٰ" کے مقابلے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے خطوں میں ترمیم و تنسیخ کی ہے۔ اس کی تفصیلی مثالیں مضمون کو طولانی بنا دیں گی۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ناظرین کو چار ایسی تحریروں سے مطلع کیا جائے جو اگرچہ شائع شدہ صورت میں موجود ہیں لیکن عام طور بالکل مفقود ہیں، اور ماہرین "غالبیات" ان سے شاید بے خبر ہیں، ان تحریروں میں بعض تاریخی اور ادبی اہمیت بھی رکھتی ہیں۔

(۱)

"انشائے اردو" خط شکست میں چھپے ہوئے خطوط کا ایک مجموعہ ہے جس میں ۹۰ صفحے ہیں یہ مجموعہ ۱۸۶۸ء میں "درجہ اعلیٰ کے امتحان کے واسطے" مرتب ہوا اور لاہور کے "مطبع سرکاری" سے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔ خطوط کے علاوہ بھی ایک دو اہم چیزیں ہیں جیسے نواب ضیاء الدین خاں کا سپاسنامہ وغیرہ۔

"انشائے اردو" میں گیارہ خط غالب کے بھی ہیں ان میں ایک خط جو ابھی تک کسی جگہ میں نہیں دیکھا وہ یہ ہے۔

جناب بابو صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت

نیاز مہر کیشانہ و دعائے درویشانہ قبول فرمائیں، ایک دن پہلے لفافہ اور دوسرے دن نسخۂ اعجاز ہنگامہ پہنچا، نظر اس تقدیم و تاخیر پر خط کو پھول اور کتاب کو پھل سمجھا۔ پھول سے نشاط تازہ اور پھل سے لذت بے اندازہ پائی "جام جم"، جہاں نما ہوگا مگر کیا جانئے کیا ہوگا بلکہ ابھی ہی تردد ہے کہ نہ ہوگا یا ہوگا جام جہاں نما یہ کتاب ہے جس سے ہر دیدہ ور بہرہ یاب ہے، یہاں تو میں مدح میں قاصر رہا، یہ میں نے کیا کیا، جس طرح ہر دیدہ ور پڑھ کر حظ اٹھا سکتا ہے نابینا بھی سن کر لطف پا سکتا ہے، فیض اس کتاب کا عام ہے "جام جہاں نما" اس کا سچا نام ہے۔

اسسٹنٹ کمشنر صاحب بہادر کی خدمت گزاری اور اشاعت علم میں مددگاری ذریعۂ عز و افتخار ہے، مگر فقیر میں تین عیب ہیں، ستر برس کی عمر کانوں سے بہرا، ہمیشہ بیمار، آمد و رفت دوام میں قاصر رہے گا، یہ نہیں ہے کہ نہ جاؤں گا مگر حسب الطلب یا حسب ضرورت کارگزار و فرماں بردار رہوں گا، بہر صورت

بچوں کی جنت کے بچے

وی رام چندرا ریڈی

جاپان کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ یہ ہمارے دیس سے بہت دُور کئی جزیروں کا مجموعہ ہے۔ اسی کو "بچوں کی جنت" کہتے ہیں۔ کیونکہ یہاں کے بچے دُنیا کے تمام بچوں سے زیادہ خوش نظر آتے ہیں اُن کے قد ننھے ننھے اور چہرے گول زرد رنگ کے ہوتے ہیں۔ ناک دبی ہوئی، آنکھیں چھوٹی تنگ لیکن چمکیلی ہوتی ہیں۔

یہ جاپانی بچے بڑوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ان کا کہنا مانتے اور اُن کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ وہ اپنے پر پورا قابو رکھتے ہیں۔ اور اگر اُنہیں کوئی دُکھ پہنچے تو رونا تو رونا مُنہ بھی نہیں بناتے۔ یہ ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ مگر قہقہہ نہیں لگاتے البتہ مسکراتے رہتے ہیں۔



مدرسے جانے کی عمر سے پہلے خوب کھیلتے ہیں۔ دیہات اور شہر میں ان کے لئے کھیل کے میدان بنے ہوئے ہیں۔ لڑکیاں اپنے ننھے بھائی بہنوں کو پیٹھ پر اُٹھائے اُٹھائے پھرتی اور دوڑتی کھیلتی ہیں۔ بچوں کا لباس ڈھیلا ڈھالا اور پھول دار ہوتا ہے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے لباس میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ البتہ لڑکیوں کا لباس سُرخ اور لڑکوں کا زرد ہوتا ہے

یہاں کسی بچے کو دو سے زیادہ جوڑے نہیں دیے جاتے۔ یہ لوگ کھڑاویں پہنتے ہیں جو گھر کے باہر اُتار دیتے اور سلیپر پہن لیتے ہیں جاپانی بچے اُستاد کے آگے جھک کر آداب بجا لاتے ہیں۔ اور اُستاد بھی جھک کر اُن کا سلام لیتا ہے۔ ہماری طرح یہاں کے بچے۔ حساب تاریخ، جغرافیہ سب ہی مضامین پڑھتے ہیں اسکول میں لڑکے اور لڑکیاں مل کر پڑھتے ہیں۔ عموماً ان کو پڑھانے والی اُستانیاں ہوتی ہیں۔ ان کے اسکول کھُلے اور سادہ ہوتے ہیں۔ ہر اسکول کے ساتھ ایک باغیچہ اور ایک چھوٹا سا عجائب گھر ہوتا ہے۔ باغ میں سنگترے کیلے اور کئی قسم کے پھلوں کے درخت ہوتے ہیں۔ اس میں کھیلنے کے لئے بھی جگہ ہوتی ہے۔ جہاں بچے خوب اُچھلتے، کودتے اور پھاندتے ہیں۔ مگر آپس میں کبھی گالی گلوچ نہیں کرتے۔ تمہیں یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ جاپانی زبان میں گالی کے لئے کوئی شبد نہیں ہے۔

عجائب گھر میں قسم قسم کے کھلونے، اوزار اور دوسری بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔ جاپانی بچے ہمارے دیہاتی مدرسوں کی طرح

ارے یہ رانا سانگا کی کہانی سنا رہی ہیں آپ نانی اماں، جو بہت بہادر تھا کل ہی تو ماسٹر صاحب نے اسکول میں اس کا حال پڑھایا ہے ہمیں تاریخ میں، اکبر جلد بول اٹھا۔

نانی اماں نے کہا، ہاں اسی کا۔ بس چپ بیٹھے سنتے رہو۔

"اچھا، اب نہیں بولوں گا۔" اکبر نے معافی مانگ لی۔

ہاں تو ایک راجہ تھا رانا سانگا۔ اس کا ایک لڑکا تھا اودے سنگھ ابھی اودے سنگھ چھوٹا ہی تھا کہ رانا سانگا مرگیا اور جب تک اودے سنگھ بڑا ہو اس کا چچا حکومت کرنے لگا۔ کیونکہ اودے سنگھ بہت چھوٹا تھا اور بے چارہ ابھی حکومت کرنا نہیں جانتا تھا۔



بن بیر نے سوچا کہ اودے سنگھ کو قتل کر دیا جائے تاکہ اس حکومت کا کوئی وارث نہ رہے۔ امیروں کو جمع کیا اور سب نے مل کر طے کر لیا۔ کہ اودے سنگھ کو مار ڈالا جائے۔

رانا سانگا راجپوت خاندان سے تھا جو بہت بہادر قوم ہے۔ راجپوتوں کی عورتیں بھی بہت بہادر ہوتی ہیں۔ جب رانا سانگا مر گیا تو میواڑ پر ایک بادشاہ نے حملہ کر دیا اور قریب تھا کہ وہ میواڑ فتح کرے۔ اس سے اودے سنگھ کی ماں اور دوسری راجپوت عورتوں کو ڈر ہوا کہ اگر وہ میواڑ فتح کرے گا تو ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس لئے ان سب نے سوچا کہ قبل اس کے کہ دشمن میواڑ فتح کرلے ہم سب جلتی آگ میں کود کر جان دے دیں۔ جب اودے سنگھ کی ماں ستی ہونے لگی تو اس نے اپنی ایک پرانی خادمہ پنا کو بلایا۔ پنا ایک بہت ہی پرانی اور وفادار خادمہ تھی۔ اس کا بھی ایک بیٹا تھا اور اس کی عمر بھی اودے سنگھ کی عمر کے برابر تھی۔ ہاں تو اودے سنگھ کی ماں نے اسے بلایا اور اودے سنگھ کو سونپتے ہوئے کہا۔ "پنا میں اس پاک امانت کو تیرے سپرد کرتی ہوں۔ خیال رہے کہ ہمارے شہزادے پر کوئی آنچ نہ آئے۔ کیونکہ میواڑ کا تخت اس کے لئے محفوظ ہے۔"

وفادار پنا نے اودے سنگھ کو اپنے بیٹے کی طرح پالنا شروع کر دیا بن بیر اودے سنگھ کا چچا تخت پر بیٹھا۔ ایک دن پنا اودے سنگھ کو شاہی پالنے پر لٹائے اسے سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا بیٹا اس کی گود میں تھا۔ ایک دم کمرے کا دروازہ کھلا اور شہزادے کا ایک وفادار خادم گھبرایا ہوا داخل ہوا۔ اس نے پنا سے کہا۔ "شہزادے کو بچاؤ ظالم چچا اسے مارنے آرہا ہے۔ پنا گھبرا گئی۔ کیونکہ اب اس محل میں شہزادے کا کوئی بھی وفادار نہیں تھا۔ صرف وہ اور ایک ملازم اس کے وفادار رہ گئے تھے۔ جلدی ہی اس نے ایک ترکیب سوچ لی۔ جلدی سے اٹھی اور شہزادے کے قیمتی کپڑے اتار کر اپنے بیٹے کو پہنا دئے اور اپنے بیٹے کے کپڑے شہزادے کو پہنا دیئے۔ اور اس کو شہزادے کے پالنے میں لٹا دیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اپنے بیٹے پر جھکی اور کہا۔ "میرے پیارے، قیمتی ہیرے آج تم شہزادے ہو۔ دیکھو تم آج شاہی لباس پہنے ہوئے ہو۔ اس پالنے میں لیٹ جاؤ تم آج میواڑ کے شہزادے ہو بیٹا۔"